سہ ماہی

اردو ادب

انجمن ترقی اردو ہند

اردو ادب

۱۹۹۱ء

شمارہ (۱و۲)

اردو ادب

(غالب نمبر)

اڈیٹر

خلیق انجم

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دلّی

ترتیب

حرفِ آغاز	خلیق انجم	
غالب کی فارسی غزل	سیّد حامد	۹
غالب کے فارسی قصائد کا مطالعہ لسانی نقطہ نظر سے	پروفیسر نذیر احمد	۱۰۶
کلامِ غالب بہ خطِ غالب		۱۲۶
غالب کے کچھ شعروں کا متن	کمال احمد صدیقی	۱۲۹
خطوط غالب میں طنز و مزاح	خلیق انجم	۱۸۳

حرفِ آغاز

زیرِ نظر مجموعے میں غالب پر چار مقالے شامل ہیں۔ پہلا مقالہ میرے محترم سید حامد صاحب کا ہے، عنوان ہے "غالب کی فارسی غزل" حامد صاحب نے غالب کی فارسی غزل کے اہم پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے۔ اُنھوں نے غالب کے کچھ اشعار منتخب کر کے اُن کی شرح اس انداز سے کی ہے کہ تنقید کا حق بھی ادا ہو گیا ہے۔ حامد صاحب نے مقالے کے شروع میں لکھا ہے کہ

"غالب نے فارسی پر غیر معمولی عبور حاصل کر لیا لیکن وہ غالب کی زبان نہیں تھی اس لیے اُن کی فارسی غزل میں اُردو غزل کی سی بے تکلفی، برجستگی، اور شگفتگی نہیں آئی۔"

حامد صاحب کا یہ خیال بالکل درست ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ غالب نے بارہا اپنی فارسی دانی اور فارسی شاعری پر فخر کیا ہے لیکن ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ جہاں غالب نے واضح الفاظ میں اپنی فارسی شاعری کو اُردو شاعری سے بہتر بتایا ہے، اس میں معاصرانہ چشمک کو دخل ہے۔ "جب کبھی فارسی اور اُردو شاعری کا ذکر آتا ہے تو غالب کا یہ شعر نقل کیا جاتا ہے۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہای رنگ رنگ بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگِ منست

یہ شعر غالب کے انیس 19 اشعار پر مشتمل ایک قطعہ کا ہے۔ اس قطعہ کا مطلع ہے :۔

اے کہ در بزمِ شہنشاہِ سخن رس گفتہ کے بہ پُر گوئی فلاں در شعر ہم سنگِ من است

اس قطعے کے تمام اشعار کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اِس کا مخاطب کوئی ایسا شاعر ہے جو اُردو میں شعر کہتا ہے اور جسے بادشاہ سے قربت حاصل ہے۔ بظاہر ایسے شاعر ذوق ہی تھے۔ میں نے اپنی کتاب "غالب اور شاہانِ تیموریہ" میں ذوق اور غالب کا ادبی معرکہ بیان کرتے ہوئے

اس سے بحث کی ہے۔ حامد صاحب نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ غالب اپنی فارسی شاعری کے بارے میں جو رائے دیتے تھے اِس میں غالب اور ذوق کی معاصرانہ چشمک کو دخل ہوتا تھا۔ انھوں نے اس اُنیس[19] اشعار کے قطعے کو ذہن میں رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ

"غالب نے اپنی اُردو شاعری کو بے رنگ ٹھہرایا ہے۔ دراصل بات کا محل ذوق سے چشمک تھی۔ غالب کا دِل اس فضیلت سے دکھا ہوا تھا جو استادِ شہ کو دربارِ شاہی میں دی جاتی تھی۔ اپنی حق تلفی پر برہم ہو کر اُنھوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ شعر گوئی میں جو کچھ تمہارے لیے سرمایۂ افتخار ہے میرے لیے باعثِ عار ہے"۔

غالب نے اپنی اُردو شاعری کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اُسے غالب کی معاصرانہ چشمکوں اور قلعہ معلّٰی میں ذوق کو حاصل ہوئی عزّت اور اہمیت کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ اگر ہم کہیں کہ غالب اپنی اُردو شاعری کو فارسی شاعری کے مقابلے میں واقعی بے رنگ اور حقیر سمجھتے تھے۔ تو یہ غالب کی سخن فہمی شاعرانہ صلاحیت اور اُن کی عقل کو گالی دینا ہے۔ وہ اپنی اُردو شاعری کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔ یہ اُنھوں نے اپنی اُردو شاعری کے بارے میں کہا تھا ؂

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

غالب کا ایک شعر اور سنیے۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

جو شاعر اپنے کلام کو بے رنگ سمجھتا ہو، کیا وہ یہ شعر کہہ سکتا ہے۔ غالب اپنے ایک دوست منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں۔

"ایک بات تم کو یہ معلوم رہے کہ جب حضور میں حاضر ہوتا ہوں تو اکثر مجھ سے ریختہ طلب کرتے ہیں، سو وہ کہی ہوئی غزلیں تو کیا پڑھوں، نئی غزل کہہ کر لے جاتا ہوں۔ آج میں نے دوپہر کو ایک غزل لکھی ہے۔ کل یا پرسوں جاکر پڑھونگا۔ تم کو بھی لکھتا ہوں داد دینا کہ اگر ریختہ پایۂ سحر یا اعجاز کو پہنچے تو اس کی یہی صورت ہوگی یا کچھ اور شکل ۔"

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے

اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے "

اس بحث کا مقصد صرف یہ ہے کہ غالب اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اپنی شاعری کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔

غالب کی فارسی شاعری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن حامد صاحب کا یہ مقالہ بالکل نئے انداز سے لکھا گیا ہے۔ یہ اُن اساتذہ، طلبہ اور اہلِ ذوق کے لیے بہت مفید ہے جو تھوڑی بہت فارسی تو سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن غالب کے شعر کا پورا مفہوم اچھی طرح نہیں سمجھ پاتے۔

پروفیسر نذیر احمد فارسی اور اُردو کے عالم، محقق اور متین نقاد ہیں۔ اُنھوں نے اِن دونوں زبانوں میں بہت کام کیا ہے۔ اور اِن کی ہر کتاب اور اُن کا ہر مقالہ اُردو اور فارسی تحقیق میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اب ہندوستان تو کیا ایران میں بھی نذیر صاحب کے پائے کا فارسی عالم نظر نہیں آتا۔ نذیر صاحب کا ایک میدان فرہنگ نویسی بھی ہے۔ اُنھوں نے بہت سے مقالوں میں، خاص طور سے غالب کی نظر کے بارے میں جو مقالے لکھے ہیں اُن میں، الفاظ سے حیرت انگیز بحث کی ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں اُنھوں نے غالب کے فارسی قصائد کا مطالعہ کیا ہے۔ غالب جدت پسند تھے۔ اُنھوں نے اگر ایک طرف فارسی شاعری کو بے شمار نئے مضامین سے مالا مال کیا تو دوسری طرف بقول پروفیسر نذیر احمد

"سیکڑوں نئی تراکیب ایجاد کر کے اسلوبِ بیان کو ایسا حسین بنا دیا ہے کہ قاری مبہوت ہو جاتا ہے۔ ان تراکیب سے زبان کا دامن وسیع ہو گیا ہے۔ اور وہ اتنی کثرت سے ہیں کہ اِن کا احاطہ زیادہ فرصت چاہتا ہے۔"

پروفیسر نذیر احمد نے غالب کی تراشی ہوئی بہت سی ترکیبوں سے بحث کی ہے۔ یہ مقالہ غالب کی فارسی شاعری کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔

تیسرا مقالہ کمال احمد صدیقی کا ہے جو اُنھوں نے ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کے مضامین کے مجموعے "غالب پر چند تحریریں" کے متعلق لکھا ہے۔ کمال صاحب بنیادی طور پر شاعر ہیں اور انہیں اُردو میں شاعر ہی کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوئی۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اُنھوں نے اُردو تحقیق اور تنقید میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں میرے خیال میں اُن کا مرتبہ اُن کی

شاعری سے زیادہ بلند ہے۔ اُن کی غالباً پہلی نثری تصنیف "بیاضِ غالب" ہے جس میں انہوں نے نسخۂ امروہہ کے بارے میں اپنے اعلیٰ درجے کی تحقیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔

یادگارِ غالب اور مقدمہ شعر و شاعری میں حالی نے غالب کے جو اشعار درج کیے ہیں اُن میں اکثر اشعار کا متن دیوانِ غالب کے مروجہ نسخوں سے خاصا مختلف نظر آتا ہے۔ سعادت صاحب کا خیال ہے کہ:۔

"۱۔ محمد حسین آزاد کی طرح حالی نے بھی اپنے استاد کے کلام میں تحریف کی۔ ۲۔ غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر حالی سے کلامِ غالب میں تحریفیں ہوئیں۔ یادداشت نے دھوکا دیا ہو اور کچھ شعر حالی نے الفاظ میں تصرفات کر کے اپنے مذاقِ سلیم کے مطابق لکھے ہوں گے۔" کمال صاحب نے سعادت صاحب کے ان خیالات سے اختلاف کیا ہے اور بہت مدلل انداز میں اپنی بات کہی ہے۔ بڑی بات یہ کہ اُن کے لب و لہجہ میں تلخی نہیں۔ ایک عالمانہ خاکساری ہے۔ میں نے جب سعادت صاحب نے مسودہ پڑھا تھا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ سعادت صاحب نے جو کچھ کہا ہے وہ صحیح ہے۔ میں نے اس کتاب کا جو پیش لفظ لکھا تھا اُس میں کہا تھا کہ:۔

"سعادت علی صدیقی صاحب نے ایسے (۴۷) سینتالیس اشعار کی نشاندہی کی ہے جو یادگارِ غالب میں شامل نہیں اور جن میں حالی نے تصرف کیا ہے۔ کمال صاحب کا مضمون پڑھ کر رائے میں تبدیلی کرنی پڑی۔"

مجھے خوشی ہے کہ اِس مجموعے میں پروفیسر نذیر احمد جیسے محقّق، ماہرِ لسانیات، سید حامد صاحب جیسے فارسی کے ماہر اور روشن فکر ادیب اور کمال احمد صدیقی جیسے تخلیق کار نقّاد کے مضامین شامل ہیں۔

خلیق انجم

سید حامد

غالب کی فارسی غزل

غالب نے اپنی فارسی غزل پر بہت ناز کیا ہے۔ اسے اپنی اردو غزل سے بہتر بتایا ہے۔ نقشہائے
رنگ رنگ اپنی فارسی شاعری سے منسوب کیے ہیں۔ جس کے مقابلہ میں اردو شاعری کو بے رنگ ٹھہرایا
ہے۔ اب قارئین کیا کریں؟ کیا غالب نے اپنی فارسی شاعری کی تعظیم اور اردو شاعری کی تخفیف میں جو
کچھ کہا ہے اسے تسلیم کرلیں یا بات کے محل اور انداز بیان کی رعایت کریں، یا شاعر کی رائے کو نظر انداز کرتے
ہوئے فیصلہ اپنے طور پر کریں؟ وہ شاعری کے بارے میں خود اس کی رائے کو ماننے کے لیے
مجبور تو نہیں۔ شاعر کی رائے کو کسی ناقد کی رائے سے زیادہ وزن تو کسی حال میں دینا مناسب نہ ہوگا۔ یہاں
بات کا محل اور اندازِ بیان دونوں قارئین کو اشارہ کر رہے ہیں کہ "احتیاط" "بہرحال احتیاط"۔ بات کا محل
ذوقؔ سے چشمک تھی۔ غالبؔ کا دل اس فضیلت سے دکھا ہوا تھا جو استاد شہ کو دربار شاہی میں دی
جاتی تھی۔ اپنی حق تلفی پر برہم ہو کر انھوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ شعر گوئی میں جو کچھ تمہارے لیے سرمایہ
افتخار ہے، میرے لیے باعث عار ہے۔ انداز بیان کی رعایت کرنا بھی واجب ہے۔ شاعر اپنے کلام پر
تنقید کرنے نہیں بیٹھا تھا۔ وہ مختلف المضامین غزل کہتے کہتے دو ایک شعر اپنی اردو اور فارسی شاعری کی بابت
ایک رو میں کہہ گیا۔ وہ کسی تفصیلی اور معروضی موازنہ کے بعد اس فیصلہ پر نہیں پہنچا تھا۔ انسان فطرتاً اپنی
محنت اور جفاکشی کی لاج رکھنا چاہتا ہے۔ جو چیز سہل الحصول ہو قدر کی ترازو میں وہ عیر الحصول شے سے
ہلکی پڑتی ہے۔

یہاں جستجو کو غزل تک محدود رکھنے میں سہولت ہوگی۔ مقصد غالب کو غالبؔ سے ٹکرانا اور ان کی
فارسی غزل کا اردو غزل سے مقابلہ کرنا نہیں ہے۔ مقصد غالبؔ کی فارسی غزلوں کو پڑھ کر حظ اندوز ہونا اور

اپنے حظ میں قارئین کو شریک کرنا ہے۔ شریک کرنے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ فی زمانہ اردو جاننے والوں کی غالب اکثریت فارسی نہیں جانتی۔ اسی لیے جو اشعار منتخب کیے گئے ہیں اُن کا ترجمہ بھی دے دیا گیا ہے۔ تنقید کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ یہاں تنقید سے سروکار بھی نہیں، ان سطور کو ایک طویل تعارف سمجھیے ضمناً کبھی کبھی موازنہ ہو جائے تو اسے گوارا کر لیجیے۔

غالب کی فارسی غزلیں حجم میں اردو غزلوں سے بہت زیادہ ہیں۔ غالب نے فارسی پر غیر معمولی عبور حاصل کر لیا لیکن وہ غالب کی زبان نہیں تھی۔ اس لیے ان کی فارسی غزل میں اردو غزل کی سی بے تکلفی، برجستگی اور شگفتگی نہیں آئی۔ لیکن اور بہت کچھ آیا جس کا تذکرہ ان سطور میں وقتاً فوقتاً ہوتا رہے گا۔

ہماری بھر کم لوگوں کی طرح غالب کی فارسی غزل پہلی نظر میں نہیں کھلتی۔ شروع میں آپ کچھ اشعار پر رُکیے گا، باقی سے سرسری گزر جائیے گا۔ بعض اشعار کے بارے میں خیال ہوگا، یہ کیا بات ہوئی؟ بعضوں پر مشاقی اور خیال بندی کا گمان ہوگا، کچھ اشعار کو نری موشگافی سمجھیے گا، بہت سوں پر ذوق مشکل گوئی برائے مشکل گوئی کی تہمت رکھیے گا، کچھ پر آورد کا دھبہ لگتا ہوا نظر آئے گا، کچھ سے زورِ بیاں کے اظہار کو منسوب کیا جائے گا۔ کہیں رعایت لفظی آپ کو چیں بہ جبیں کرے گی، کہیں رعایتِ معنوی کے اہتمام پر مسکرائیے گا، کہیں کہیں خودستائی پر طبیعت رُکے گی۔ کبھی اس تذبذب میں پڑ جائیے گا کہ یہ شکوہ، یہ زور، یہ بلند پروازی، یہ لب ولہجہ، یہ آہنگ، شاید قصیدہ کو زیادہ زیب دیتا، یہ غزل ہے یا کسی قصیدہ کی تشبیب؟

لیکن ایک بار اگر آپ کے ذوقِ شعر اور خلوصِ طلب نے ان شبہات کی مدافعت کر لی اور ان سطحی تاثرات کو سر چڑھانے سے انکار کر دیا، اور خوش خرامی اور سکون کے ساتھ ان غزلوں میں ڈوب کر ان سے حظ اندوز ہونا شروع کر دیا، تو عالم ہی دوسرا ہوگا۔ پھر آپ کسی شعر سے سرسری گزرنے نہیں پائیں گے۔ ہر شعر میں ایک نیا مضمون، ہر ترکیب میں ایک نیا مفہوم، ہر لفظ میں ایک نیا حظ آپ کے پاؤں پکڑے گا۔ بے نیازانہ آگے بڑھنے کی روش کو خیرباد کہنا پڑے گا۔ کسی غزل سے بے مہری برتنے یا کسی دور از کار خیال پر چیں بہ جبیں ہونے کا یارا نہ رہے گا۔ ہر بڑے شاعر کی دنیا میں داخل ہونے اور وہاں زندگی گزارنے کے اپنے الگ آداب ہوتے ہیں۔ انھیں برتنے لگیے تو انکشافات کے حیرت انگیز اور معنی خیز ابواب کھلتے چلے جائیں گے۔ آپ حیران رہ جائیں گے کہ وہ اشعار بھی جنھیں نادانی کی تاریکی یا ہمہ دانی کے زعم میں آپ نے خاکستر سمجھ رکھا تھا وہ بھی چنگاریوں اور لعل و گہر سے بھرے ہوئے ہیں۔ راقم سطور پر کچھ ایسی ہی گزری۔ پہلے اس نے

ان غزلوں کو چند نشستوں میں فرفر پڑھنے کی کوشش کی۔ اس تیز روی میں بھی بعض اشعار دامنِ دل کو چھوتے ہوئے چلے گئے، بعض ایک خلش چھوڑ گئے لیکن بیشتر اشعار نے نووارد کا اجنبی پن اور سطح بینی دیکھ کر ان پھولوں کی طرح جو رات کے آنے پر کلی بن جاتے ہیں، اپنی بساط لپیٹ لی، نامحرم کو دیکھ کر اپنے روئے زیبا پر نقاب ڈال لی۔ حظ اندوزی ذوق، ظرف اور فرصت کے بقدر ہی ہوتی ہے۔

حسنِ اتفاق کہ دل اس سرسری ملاقات سے مطمئن نہیں ہوا۔ نووارد کو دوبارہ ادھر آنے کا موقع ملا اور ان آداب کو برتنے کی بھی توفیق ہوئی جنھیں برتنے بنا کسی قلم و شعر کا حق ادا نہیں ہوتا۔ پھر کیا تھا۔ انکشافات کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اب ہر شعر پر حریصانہ نگاہ پڑتی ہے، نہ جانے اس کے اندر کیا چھپا ہوا ہے۔ زیں کھرچ کر تو دیکھو۔

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچین تو از تنگیِ داماں گلہ دارد

نظر کا دامن تنگ ہے اور تیرے حسن کے گلہائے رنگارنگ بے شمار، تیرا گلچیں تنگیِ داماں کا شاکی ہے۔

اب یہ بات سمجھنے میں آنے لگی کہ اپنی فارسی شاعری پر غالب نے جابجا جو فخر کیا ہے۔ وہ محض معاصرانہ چشمک کے بطن سے پیدا نہیں ہوا:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

میرا فارسی کلام دیکھو تاکہ صد رنگ نقوش تمہاری نگاہ کا خیر مقدم کریں۔ میرے اردو دیوان کو چھوڑو کہ میرے نزدیک یہ بے رنگ ہے۔

جسے غالب نے زودِ ریاں اور فارسی گوئی کے نشہ میں بیرنگ کہہ دیا تھا اس کی رنگا رنگی نے ایک عالم کو مسحور کر رکھا ہے۔ لیکن مضامین نو کا جو انبار غالب نے فارسی غزلوں میں لگا دیا ہے، اردو میں ان کا وہ ہجوم نہیں ملے گا، ہر شعر میں ایک نیا مضمون ایک نیا پیرایۂ بیان۔

معنیِ غریب مدعی وخانہ زادِ ماست
ہر جا عقیق نادر و اندر یمن بسی است

ہمارے حریف کے خانۂ دل میں مضمونِ نو اجنبیانہ داخل ہوتا ہے اس کے لیے مضمون اجنبی

ہے جو بھول کر ہی ادھر کا رخ اختیار کرتا ہے۔ ادھر یہ عالم ہے کہ مضامین تو ہمارے گھر میں پیدا ہوتے ہیں اور پروان چڑھتے ہیں اور ہاتھ باندھے ہوئے ہماری چشمِ التفات کے منتظر رہتے ہیں۔ عقیق ہر جگہ کم یاب ہے اور یمن میں بہ کثرت ملتا ہے۔

در صفحہ نبود ہمہ آں چہ در دل است

در بزم کتر است گل و در چمن بسی است

میرے خانۂ دل میں مضامین کا ازدحام ہے، صفحۂ قرطاس پر جو مضامین قلم بند ہو پاتے ہیں وہ ان کا عشرِ عشیر ہوتے ہیں۔ محفل میں چند ہی پھول سجائے جا سکتے ہیں حالاں کہ چمن میں وہ فراواں ہیں۔

مضامین کے اس بحرِ بیکراں کے لیے جو غالبؔ کی فکرِ خلاق میں موجزن ہے سفینۂ اشعار ناکافی ہے۔ شاعر کے دل پر کیا گزرتی ہو گی جب افکار و احساسات کا ساتھ الفاظ نہ دے سکتے ہوں۔ جب تخیّل پیرایہ ہائے اظہار کو بہت پیچھے چھوڑ جاتا ہو۔ غالبؔ زندگی بھر سرگرداں رہے بیان میں کچھ اور وسعت کے لیے اپنی فارسی غزل کے روبرو ان کا یہ احساس اور شدید ہو جاتا ہو گا۔

غالب ہنگامِ تفاخر عرفیؔ، نظیریؔ، ظہوری اور شیخ علی حزیںؔ کا تذکرہ کرتے نہیں تھکتے۔

چوں نہ نازد سخن از مرحمتِ دہر بہ خویش

کہ برد عرفیؔ و غالبؔ بہ عوض باز دہد

شاعری اس جود و عطا پر جو لیل و نہار نے اس کے ساتھ کی ہے کیوں نہ ناز کرے۔ زمانہ عرفیؔ کو جہاں سے لے گیا تو اس کی جگہ غالبؔ کو لے آیا۔ خوب سے خوب تر کی طرف یہ سفر شاعری کے لیے سرمایۂ ناز ہے۔

بہ فیضِ نطقِ خویشم یا نظیریؔ ہمزباں غالبؔ

چراغی را کہ دودی ہست در سر زود در گیرد

غالبؔ میں اپنی قادر الکلامی کے فیض سے نظیریؔ کا حریف ہوں۔ جس چراغ کے سر میں دھواں ہوتا ہے وہ آگ جلد پکڑ لیتا ہے۔

کیفیتِ عرفیؔ طلب از طینتِ غالبؔ

جامِ دگراں بادۂ شیراز ندارد

عرفی کے حسنِ بیان کے اگر طالب ہو تو غالب سے رجوع کرو۔ اور کسی کے یہاں صہبائے شیراز ملنے سے رہی۔

تو بدیں شیوۂ گفتار کہ داری غالب
گر ترقی نہ کنم شیخ علی را مانی

غالب اگر ترجیح نہ دوں تو تم اپنے اسلوبِ سخن میں شیخ علی حزیں کے مانند ہو۔
غالب کو اس میں تو کوئی شبہ ہی نہ تھا کہ وہ اپنے ہمعصروں سے بمراتب بالاتر تھے نیشمن بسی است، چمن بسی است والی غزل کے مطلع و مقطع میں انھوں نے پُر لطف انداز سے اپنی برتری کا اعلان کر دیا۔

گفتم بہ روزگار سخنور چو من بسی است
گفتند اندریں کہ تو گفتی سخن بسی است

میرا یہ کہنا تھا کہ زمانہ میں مجھ جیسے شاعر بہت سے ہیں کہ ہر طرف سے صدائیں بلند ہوئیں "تم جو کہہ رہے ہو اس میں ہمیں بہت کلام ہے"۔

غالب نخورد چرخ فریب ار ہزار بار
گفتم بروزگار سخنور چو من بسی است

غالب میں نے ہزار کہا کہ اس زمانہ میں میرے جیسے بہت سے شاعر ہیں، لیکن آسمان کب دھوکا کھانے والا تھا۔ اس نے مان کر نہیں دیا۔

ای کہ راندی سخن از نکتہ سرایانِ عجم
چہ بما منّت لب یار نہی از کم شان

تم جو سخنورانِ عجم کی بات کر رہے ہو ان کی کم بضاعتی کا بوجھ ہم پر کیوں ڈال رہے ہو۔
یہ اشعار بتا رہے ہیں کہ غالب کو فارسی شاعری میں اپنی عظمت کا احساس تھا۔ غالب کی غزلوں میں اس کے طرزِ سخن کے بارے میں اشارے ملتے ہیں:

در تہِ ہر حرف غالب چیدہ ام میخانۂ
تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن

غالبؔ، میں نے ہر حرف کی تہ میں میخانہ سجا رکھا ہے۔ دیکھیں تو اس میکدہ سے کس کس کو ذوقِ سخن کے ساغر ملتے ہیں۔

شاعر قارئین کو دعوت دے رہا ہے کہ ڈھونڈھ کر ان مفاہیم و محاسن کو نکالیں جو اس نے ہر حرف کی تہ میں سجا رکھے ہیں۔ شاعر کو اپنی مضمون آفرینی اور تہ داری پر بجا طور پر ناز ہے

دوسرا وصف جسے تفصیل درکار ہوگی آتش نفسی اور شعلہ آبی ہے۔

زشعلہ خیزیٔ دل بر مزارِ ما چہ عجب
کہ برقِ مرغِ ہوا را زبال و پر گزرد

مرنے کے بعد بھی ہمارے دل کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ اس سے اب بھی شعلے اٹھ رہے ہیں۔ کیا عجب کہ ہوا میں اُڑتے ہوئے پرندوں کے بال و پر سے وہ آگ بجلی کی طرح گزر جائے جو میرے دل سے شعلے اٹھا رہی ہے۔

سوزم از تابِ سموم دِل گرمم غالبؔ
دل گرش تازگی از اشکِ دمادم نرسد

اگر دل کو آنسوؤں کی جھڑی سے طراوت نہ پہنچتی رہی تو وہ اس بادِ سموم کی حرارت سے جل جائے گا جو آہ کی شکل میں میرے بہتے ہوئے دل سے نکل رہی ہے۔

ذوقم بہ ہر شرارہ کہ از داغ می جہد
دل را نوائی دیر بماندمی زند

میرے آتش کدۂ دل سے جو چنگاریاں اٹھ رہی ہیں، میرا ذوقِ آتش آشامی دل سے منت کر رہا ہے کہ انھیں دیر تک آتش بار رکھو۔

چوں نیست تابِ برقِ تجلی کلیم را
کی در سخن بہ غالبؔ آتش فشاں رسد

حضرت موسیٰ برقِ تجلی کو ہی برداشت نہ کر سکے، وہ غالبؔ کی شعلہ نوائی کی تاب کیوں کر لا سکیں گے۔

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ ای کلیم یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا

شرارِ آتشِ زردشت در نہادم بود   کہ ہم بہ داغِ مغاں شیوہ دلبرانم سوخت

ایسا لگتا ہے کہ زردشت کی آگ کی چنگاریاں میرے مزاج میں تھیں، جنھوں نے مجھے مغاں شیوہ اور شعلہ خو محبوبوں کی محبت میں جلا کر خاکستر کر ڈالا۔

یہ پوری غزل جس کی ردیف سوخت ہے شرار انگیز آتش کدہ بنی ہوئی ہے۔

فغاں کہ برقِ عتاب؛ تو آنچنانم سوخت
کہ راز در دل و مغز اندر استخوانم سوخت

فریاد، کہ تیرے عتاب کی بجلی نے مجھے اس طرح جلا ڈالا کہ راز دل میں اور مغز ہڈیوں میں جل کر رہ گیا۔

چو وا رسید فلک کاب در متاعم نیست
ز جوشِ گرمیٔ بازارِ من دو کانم سوخت

آسماں کو کہیں سے پتا چل گیا کہ میرے اثاثہ میں پانی نہیں رہا کیوں کہ آنسو کبھی کے خشک ہو چکے۔ یہ پتا چلنا تھا کہ اس نے میری دوکان کو میری ہی گرمیٔ بازار سے جلا دیا۔

شنیدہ ای کہ بہ آتش نہ سوخت ابراہیم
بہ بیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت

تم نے سنا ہوگا کہ ابراہیم علیہ السلام آگ سے نہ جل پائے۔ مجھے دیکھو کہ بن بغیر شعلہ اور شرر کے خود کو جلا سکتا ہوں۔

غالب کی مضمون آفرینی کا یہ خاص انداز ہے کہ کمتری کو برتری میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا۔ ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے۔

سوخت کی ردیف شاعر کی گرمیٔ خو کو اس قدر بھا گئی کہ ایک اور دہکتی ہوئی غزل اسی ردیف میں کہہ ڈالی

نہ بر جستہ شرار و نہ بجا ماندہ رماد
سوختم لیک نہ دانم بہ چہ عنوانم سوخت

نہ تو کوئی چنگاری ہی اڑی اور نہ راکھ ہی بچی۔ اس نے مجھے جلا ڈالا لیکن سمجھ میں نہیں آتا کس ڈھب سے۔

دور باش از ریزہ ہائی استخوانم ای ہما
کیں بساطِ دعوتِ مرغانِ آتش خوار است

اے ہما، میری ہڈیوں کے ریزوں سے دور رہو جو چٹخ کر ہوا میں چنگاریوں کی طرح اُڑ رہے ہیں، میں نے یہ دسترخوان ان طیور کے لیے چنا ہے جن کی غذا آگ ہے۔

نعش مرا بہ سوز کم از برہمن نیم
ننگِ نہ سوختن نہ تواں در مزار بُرد

میری نعش کو جلا دو، میں برہمن سے کم نہیں ہوں جلائے جانے کا داغ قبر میں لے کر نہیں جاؤں گا۔

سرگرمیٔ خیالِ تو از نالہ باز داشت
دل پارہ آتشت کہ دُودش نماندہ است

تیرے خیال کی گرمی نے مجھے نالہ کرنے سے باز رکھا، دل آگ کا ٹکڑا بن گیا ہے۔ لَو دینے لگا ہے، اب اس میں دھواں کہاں۔

سلگنا، جلنا، دھواں دینا، لو دینا، چنگاریاں اڑانا، بھڑکنا، تڑکنا، گھُلنا، پگھلنا، گھولنا ـــــ ان سب کا مخزن کیا ہے۔ کیا یہ آگ صرف وہی آگ ہے جس کے لیے غالبؔ نے کہا تھا۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

یا شیفتہ کی زبان میں: شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہؔ ۔ اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی۔

غالبؔ کی اردو غزلوں میں بھی یہ آگ فروزاں نظر آتی ہے۔ لیکن وہاں فارسی غزلوں کی سی تمازت، حرارت اور شدت نہیں ہے۔ وہاں آگ اکثر ایک استعارہ ہے جو تفکر اور ارتفاع کے ذریعہ اکثر آنچ کو دھیما کر دیتا ہے۔ کیا یہ فارسی کا محاورہ تھا جس نے شعلہ کو بھڑکا دیا، یا ایک ایسی زبان میں جو شعری قدرت کے باوجود غالبؔ کی مادری زبان نہ تھی۔ اس انداز سے مشقِ سخن کرنے میں کہ اساتذہ کو رشک آئے، فکر اور تخیل کو جو جگر گداز ریاضت کرنا پڑی تھی اس نے دل و جگر کو دہکا دیا، پھونک ڈالا، غالبؔ کا ذہن فارسی کے متاخرین شعرا کے ذہنوں سے ٹکرایا اور چنگ ریاں اڑنے لگیں۔ کیا شاعر کا دل ناقدریٔ ابنائے زمانہ کی وجہ سے سلگ رہا تھا؟

غالبؔ سخن از ہند بروں بر کہ کس ایں جا
سنگ از گہر و شعبدہ ز اعجاز ندانند

غالبؔ اپنے کلام کو اس ہندوستان سے باہر لے جاؤ کہ یہاں کوئی شخص نہ کنکر اور موتی اور نہ شعبدہ اور اعجاز کے درمیان امتیاز کر سکتا ہے۔

اس نے اردو کے مجموعے کو بے رنگ کہہ کر زورِ تخلیق فارسی شعر گوئی پر صرف کر دیا۔ یہ احساس ضرور رہا ہوگا کہ فارسی زبان شیر مادر کے ساتھ غالب کے ذہن اور نطق کا جزو نہیں بنی تھی۔ اور اس کے باوجود غالب کو اسی زبان میں عرفی، نظیری، ظہوری اور علی حزیں کی زمینوں میں غزلیں کہنی تھیں اور قدرت کلام اور پرواز تخیل کے پرچم بلند کرنے تھے۔ خود یہ خیال ہی اس شخص کو بے تاب اور آتش زیر پا کرنے کے لیے کافی تھا جو بجا طور پر خود کو یگانہ روزگار سمجھتا تھا اور جو یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ شعر و شاعری کے میدان میں متاخرین اور معاصرین میں سے کوئی اس سے آگے نکل سکتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ متاخرین کے روبرو وہ اعتماد اور افتخار کے ساتھ دادِ سخن دیتا ہے، لیکن متقدمین اور متوسطین سے شاید ہی کبھی اس نے آنکھ ملائی ہو۔ غالب کے ذوقِ نقد نے یہ بات اس پر واضح کر دی ہوگی کہ سعدی اور حافظ کا دور ختم ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ سخن پر قدرت کے وہ امکانات اور بیان کے وہ اسالیب بھی۔ سعدی کی سی در و لبست اور درد و گداز اور حافظ کا سا آہنگ اور انتخاب و ترتیب و امتزاجِ الفاظ و حسنِ اصوات و سحرِ حلال۔ یہ سب کچھ لاریب معراجِ سخن تھا۔ اس تک متاخرین میں سے کسی کی رسائی نہ ہو سکی تا بہ غالب چہ رسد۔ اور پھر زمانہ بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ وہ پرکاری جو سادگی کی کوکھ اور والہانہ محبت کے بادۂ سرجوش سے پیدا ہوتی ہے متاخرین تک جن کا زمانہ ذہنی پیچ و خم کا تھا، پہنچ نہیں پائی۔ اب دور دورہ اس پرکاری کا تھا جو ذہن کے نشیب و فراز اور فکر کے پُرپیچ اتار چڑھاؤ طے کرتی ہوئی آتی ہے۔ غالب کی مشکل پسند طبیعت کو اڑان کی کج نودیاں اور اس کے زیر و بم راس آئے۔ نکتہ سنجیاں، موشگافیاں، بلند پروازیاں، مشکل گوییاں، اقلیم مضامین میں، اختراعات، انکشافات اور طالع آزمائیاں اور رہ جوئیاں، غالب کے حصے میں آئیں اور اس نے متاخرین و معاصرین کو للکارا کہ جو دادِ نبرد دے سکتا ہو سامنے آجائے۔

جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے وہ مقام بھی آئے ہیں جہاں غالب نے تفاخر میں توازن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ہر زہ مشتاب و پئی جادۂ شناساں بردار۔ ای کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت بے کار ادھر اُدھر مت دوڑو، ان کے پیچھے چلو جو راستے سے واقف ہیں۔ تم جیسے ہزاروں شاعری کی اس راہ سے گزرے ہیں۔

بہر کیف یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ فارسی کے مزاج سے طبعی مطابقت کے باوجود غالب کو اہلِ زبان نہ ہونے کا احساس تھا۔ اس نے غیر معمولی کاوش کے بعد فارسی محاورہ پر قدرت حاصل کی۔ پھر بھی اہلِ زبان کی سی

فارسی دانی کے دعوے کی تائید میں اسے مُلّا عبدالصمد کی شکل میں دلیل اختراع کرنی پڑی، اور قتیل سے محاورہ شناسی کی بحث میں الجھنا پڑا۔ غالب کے فارسی اشعار کی در و بست اور ان کا شعلہ بہ پیراہن ہونا بتا رہا ہے کہ فارسی غزلیں فکری اور ذہنی تناؤ کے عالم میں کہی گئی ہیں۔

ابھی تک جن اسباب کا ذکر ہوا ہے وہ غالب کی آتش نوائی کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن اس کی مکمل توجیہ نہیں کرتے۔ غالب کے مزاج کی تشکیل شعلۂ و شرار سے ہوئی تھی اس پر مستزاد نوابغِ روزگار کی وہ بے تابی جو انہیں حصولِ کمال کے لیے آتش زیر پا رکھتی ہے۔ زندگی کے اختصار کا احساس عزائم کے طول سے ٹکراتا ہے تو چنگاریاں ہوا میں اڑنے لگتی ہیں۔

غالب کے پُر پیچ ملکۂ شعر اور اس کے اوصافِ شاعری کی تشکیل میں نہ جانے کتنے اسباب و عوامل شریک ہوئے ہوں گے۔ ہمارے سوال کا آخری جواب لسان الغیب کی زبانی سنیے۔

ازاں بہ دیرِ مغانم عزیز می دارند
کہ آتشی کہ نہ میرد ہمیشہ در دلِ ماست

آتش پرست مجھے اس لیے عزیز رکھتے ہیں کہ وہ آگ جو کبھی نہیں بجھتی ہمارے دل میں فروزاں ہے۔

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا — آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا
دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں — آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

اردو کی طرح فارسی میں بھی غالب جو بات کہتے تھے اس میں کہیں خفیف السخنی کا شائبہ تک نہیں ہوتا تھا، ہر بات ایک خاص ڈھب سے، ایک بناؤ کے ساتھ، اچھوتے، انوکھے، وقیع، بھاری بھرکم انداز سے، جس کی ایرے غیرے تقلید نہ کر سکیں، نقل نہ اتار سکیں، جس کا منہ نہ چڑھا سکیں۔

تا تنک مایہ بہ دریوزہ خود آرا نہ شود
نرخِ پیرایۂ گفتار گراں می بایست

پیرایۂ بیان کو باوزن ہونا چاہیے تاکہ کم بضاعت شعرا اس کی نقل اتار کر اپنی دکان نہ سجا سکیں۔

عیارِ فطرتِ پیشینیاں زما خیزد
صفائی بادہ ازیں دُردِ تہ نشیں پیداست

پہلے آنے والوں (اکابر متقدمین) کے منصبِ سخن اور وضعِ کلام کو جانچنے کی کسوٹی ہمارا سخن ہے۔

زمیں بیٹھ جانے والی اس تلچھٹ سے اندازہ لگالو کہ شراب ناب کیسی تھی۔ غالب کبھی سیدھی سادی بات تو کہتے ہی نہیں، ہر بظاہر سادہ بات کی تہ میں وہ کئی مفاہیم چھپا دیتے ہیں "تہ نشیں" سے ترتیبِ زمانی کی طرف ذہن جاتا ہے "تلچھٹ" سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ ہم سے پہلے آنے والے شعرا کے حصے میں مضامین کی صہبائے ناب آگئی۔ اب جو کچھ بچا کھچا رہ گیا ہے، ہم اسی پر طبع آزمائی کر سکتے ہیں یہاں افتخار اور اعتذار اور انکسار شیر و شکر ہو گئے ہیں: افتخار، ہمارا یہ سلسلۂ نسب فارسی کے اگلے اکابر شعرا سے ملتا ہے۔ ہم نے ان کے دواوین کھنگالے ہیں، اور اپنے ملکۂ شعری کو ان کی وضعِ سخن پر ڈھالا ہے۔ ہم ایران کی طویل شعری روایت اور تسلسل کے امین اور ترجمان ہیں، انیسویں صدی کے ہندوستان کے کوئی خودرو خودساختہ قافیہ پیما نہیں ہیں۔ علاوہ بریں دردِ تہ جام کے نشے کو کچھ رنداں سالخوردہ ہی جانتے ہیں۔

اعتذار، ہمارے سخن پر نقد کرنے اگر بیٹھو تو یہ نہ بھولو کہ ہم آخر میں آئے ہیں، اگلوں نے ہمارے لیے چھوڑا ہی کیا تھا؟

انکسار، پہلے ہمارے کلام سے عہدہ برآ ہو لو، پھر اگلے شاعروں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ دیکھا آپ نے انکسار سے افتخار دست و گریباں ہے۔ یہاں زنگار اور آئینہ کارشتہ ملحوظ ہے ہر چند کہ ملفوظ نہیں زمان و مکاں کے اختلاط کا ہوشربا سماں دیکھیے۔ گردشِ لیل و نہار کو جام بادہ میں اسیر کر لیا ہے۔ اردو میں لے لغواً بلکہ شکلاً دور بینی انداز کہیں تو بے محل نہ ہوگا۔ اس طریق کو انگریزی محاورہ میں Telescoping کہا جاتا ہے، مراد یہاں دور تک دیکھنے سے نہیں، اس آلہ کی ساخت سے ہے جس سے دور کی چیز دیکھی جاتی ہے۔ اور جس کے پھیل جانے والے اجزا سمٹ کر ایک دوسرے کے اندر گھستے چلے جاتے ہیں۔

اسی غزل کا ایک اور شعر ہمیں پھر غالب کی آتش بیانی اور ان کے گنجینۂ معانی کی طرف لے جاتا ہے:

نہادِ گرم ز شیرینیِ سخن غالب
بسانِ موم ز اجزائی انگبیں پیداست

ہماری شیریں کلامی سے ہماری گرمیِ طبع اس طرح نمودار ہو رہی ہے جس طرح شہد کے اجزا سے موم۔ شاعر کہہ رہا ہے کہ دہکتے ہوئے دل سے جو شعر اُبل رہے ہیں ان کی گرمی دلوں میں حرارت پیدا کرتی ہے، اور ان کی شیرینی لبھاتی ہے۔ دیکھیے کہ غالب نے موم سے شمع کو شکل پذیر کر کے حرارت کو بھی روشنی میں تبدیل کر دیا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ اس کے اشعار میں گرمی روشنی اور حلاوت بہم پیوست ہیں۔ ان

دلکش خیالات کا سرچشمہ شہد کی مکھی کا چھتہ ہے جہاں شہد اور موم بہم شیر و شکر ہیں۔ گرمی فیض ہے جذبہ کا، روشنی بصیرت کا اور حلاوت ثمرہ ہے الفاظ و آہنگ کا۔

دُردِ تہِ جام کا ذکر غالبؔ کی اردو اور فارسی شاعری دونوں میں آیا ہے اور کئی بار آیا ہے:

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ ــ ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

چوں کہ کئی بار آیا ہے اس لیے اس سے سرسری گزر بھی نہیں سکتے۔

ہر گونہ حسرتی کہ ز ایام می کشیم
دُردِ تہ پیالۂ امید بودہ است

حسرتیں کیا ہیں، صہبائے امید کی تلچھٹ۔ امید ختم ہو جاتی ہے تو باقی کیا رہتا ہے حسرت۔ تخیل کے جادو نے یہاں بھی ظرفِ زماں کو ظرفِ مکاں میں تبدیل کر دیا، وہ بھی آنکھ جھپکاتے۔ غالبؔ کو اپنی صلاحیت کا احساس اور اپنی قسمت سے گلہ تھا۔ دُردِ تہِ جام، ایک استعارہ تھا زمانہ کی تنگ بخشی اور اپنی محرومی کے لیے۔

لیکن ابھی ہم نے اس غزل کو خیر باد نہیں کہا ہے:

ناداں حریفِ مستی غالبؔ مشو کہ او
دُردی کشِ پیالۂ جمشید بودہ است

ارے ناداں، غالبؔ کے نشہ میں شرکت کا دعویٰ نہ کر، تو ویسا نشہ کہاں سے لائے گا؟ وہ بلانوش تو سرشار ہے اس تلچھٹ کے تلخ و تند جرعہ سے جو جامِ جم کی تہ میں باقی رہ گئی تھی۔

دُردی کش میں ایک طرف دیر سے وجود میں آنے کا پُر حسرت ذکر ہے، دوسری طرف یہ شانِ افتخار کہ ہمارے اقران و امثال یعنی معجز بیانانِ پیشیں کبھی کے آکر چلے گئے۔ ایک میں ہی رہ گیا ہوں، اگلے وقتوں اور عظمتِ دوشینہ کی یادگار۔ مجھے وہ دور ملا جس میں شعر سمجھنے اور اس کی قدر کرنے والے بھی نظر نہیں آتے۔

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک ــ اس کے سینہ میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

لیکن غالبؔ نے ایک مفہوم پر کبھی قناعت نہیں کی۔ جمشید کہہ کر غالبؔ نے اپنی فارسی شعر گوئی کی عظمت کا پرچم بلند کیا، ایک گراں قدر شعری روایت کی نشاندہی کی اور یہ بات بھی کہہ دی کہ جس پیالہ نے

اسے مدہوش کر رکھا ہے وہ جامِ جم ہے۔ دوسرے شاعر کے الفاظ ہیں:

ما در پیالہ عکسِ رُخِ یار دیدہ ایم
ای بی خبر ز لذتِ شُربِ مدامِ ما

(ہم نے پیالہ میں رُخِ یار کا عکس دیکھ لیا ہے۔ تمھیں کیا خبر کہ ہماری پیہم مے نوشی میں کیسی لذت ہے۔)

پیالہ جمشید کو درمیان میں لا کر غالب نے اس رمز کا اعلان کر دیا کہ بڑا شاعر وہی ہو سکتا ہے جس کی چشمِ بصیرت پر حیات و کائنات کے عقدے وا ہو گئے ہوں، جو ہر لمحہ دیکھ رہا ہو کہ دنیا میں کیا کیا حوادث وقوع پذیر ہو رہے ہیں، اس میں رہنے والوں پر کیا بیت رہی ہے، ان کے دلوں پر کیا گزر رہی ہے، زمین چمن کیا گل کھلا رہی ہے اور آسمان کیسے کیسے رنگ بدل رہا ہے۔ ارفع شعر وہی کہہ سکتا ہے جس کی فکر عالمگیر ہو اور جس کی تخیئل فلک پرواز، جو انسان کی نفسیات سے طبعی طور پر آگاہ ہو، جو دلوں کے اندر جھانک سکتا ہو۔ جو ان سارے امور کے خشک تجزیہ میں اپنے گراں قدر لمحات ضائع نہ کرتا ہو بلکہ جو صہبائے آگہی سے مدہوش ہو۔ شاعری قافیہ پیمائی، استدلال، موشگافی یا قادر الکلامی کو نہیں کہتے۔ ایک دوسرا شاعر کہہ گیا ہے۔

دلی بادۂ بعضی حریفاں	خمارِ چشمِ ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعارِ ایں قوم	ورائے شاعری چیزی دگر ہست

(لیکن بعض حریفوں کی شراب میں چشمِ ساقی نے خمار گھول دیا ہے۔ اب اس سے انکار نہ کرو کہ اس قبیل کے شعراء کے کلام میں شاعری کے علاوہ کچھ اور بھی ہے، غالب نے جو پیالہ جمشید کی بات کی تو اس کا روئے سخن (اور یہ ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ شعر غالب کے کئی چہرے ہیں لہٰذا روئے سخن بھی کئی طرف رہتا ہے) خمار چشم ساقی کی طرف تھا۔ شاعر ایک پل میں استدلال اور ادراک کی گرہیں کھول دیتا ہے اور حواس اور عقل اور منطق کی نارسائی اور حجاب افگنی کے طلسم کو توڑ دیتا ہے، اس کی بدولت پرانی چیزیں نئی ہو جاتی ہیں ویرانہ چمن بن جاتا ہے۔ نظر ظواہر کو چیرتی ہوئی حقیقت کی تہہ تک پہنچ جاتی ہے۔

مضمون آفرینی اور ندرت بیان کی مثالیں دیوان میں ہر طرف بکھری ہوئی ہیں۔ ان سے اغماض برت کر آگے بڑھنا آسان نہیں لیکن ہمیں یہی کرنا پڑے گا۔ جاتے جاتے چند شعر اور سناتے

جاتے ہیں تاکہ غالب کی فارسی غزل سے فارسی ناشناس قارئین واقف اور حظ اندوز ہو سکیں :

داغم از مور د نظر بازئ شوقش بہ شکر
کش بود دیدیہ بداں پائی کہ مژگاں شدہ است

چیونٹی جس شوق سے شکر کے دانے کو دیکھتی ہے اس پر مجھے رشک آتا ہے۔ وہ محبوب کی طرف ان پیروں سے دوڑ رہی ہے جو پلک بن گئے ہیں۔ یعنی دیوانہ وار اس طرح دوڑ رہی ہے کہ نظر ہر لمحہ شکر کے دانہ پر ہے۔ پاؤں کا مژگاں ہو جانا مؤثر اور دلکش پیرایۂ بیان ہے محبوب اور مقصود کی طرف بہ یک وقت نگراں اور جادہ پیما ہونے کے لیے یہاں جذبۂ دل پائے نگاہ کے ساتھ گتھا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ محبوب سے غالب کو بات کرتے ہوئے دیکھیے، لاکھوں بناؤ نظر آئیں گے۔ حسن و عشق کے معاملات اور واردات کا اظہار غالب کے اشعار میں طرحداری اور بانکپن کے ساتھ ہوا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ دل کی بات ذہن سے گزرتی ہوئی قلم تک پہنچی ہے۔ جذبہ کو جوں کا توں صفحۂ قرطاس تک منتقل کر دینا غالب کے آئین شعر گوئی اور افتادِ طبع کے خلاف تھا۔ وہ جب جذبہ کو شعر کا قالب عطا کرتا ہے تو پہلے اسے ذہن کے دل فریب پیچ و خم سے گزارتا ہے۔ وقوع گوئی کو غالب نے شائستگی، بلندی اور لطافت سے مرصع کیا ہے۔

مرا دمیدنِ گل در گماں فگند امروز
کہ باز بر سرِ شاخ گل آشیانم سوخت

گلاب کھلے تو محسوس ہوا کہ چمن میں آگ لگ گئی ہے، شاعر کو شبہ ہوا کہیں دوبارہ شاخ گل پر اس کا آشیاں تو نہیں جل گیا۔

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

نگہ بہ چشم نہان و زجبہ چیں پیدا ست
شگرفئ تو ز اندازِ خشم و کیں پیداست

ایک اور ہوشربا تصویر چشم تصور کے سامنے آ گئی۔ نگہِ التفات آنکھوں کے اندر چھپی ہوئی ہے اور جبیں شکنوں سے بھری ہوئی ہے۔ محبوبی کے تہارے نرالے انداز تمہاری محبت اور اس کے عقب میں خفگی سے ہویدا ہیں

رسید تیغِ تو ام بر سر و ز سینہ گزشت
زہی شگفتگئ دل کہ از جبیں پیداست

تمہاری شمشیر میرے سر کو دو نیم کرتی ہوئی سینہ سے گزر گئی۔ دل کا کھل جانا بڑی خوشنمائی کے ساتھ جبیں سے ظاہر ہو رہا ہے۔

غالبؔ کی فارسی غزل کہہ رہی ہے کہ دروبست کی آن بان الفاظ میں ہی نہیں افکار میں بھی ہے اور یہ اس کا نشانِ امتیاز ہے۔

بہ جرمِ دیدۂ خونبار کشتہ ای مارا

ترا ز دامن و ما را ز آستیں پیداست

بظاہر سادہ سا شعر ہے لیکن کتنا پُر لطف۔ تم نے مجھے اس جرم کی پاداش میں قتل کر دیا کہ میں تمہارے راز کو مخفی نہ رکھ سکا۔ شدت درد سے میری آنکھوں سے لہو کے آنسو ٹپک پڑے جو میری آستین کو خون آلود کر گئے۔ تمہارا دامن اور میری آستین میرے قتل کی گواہی دے رہی ہے۔ شاعر محبوب کے تغافل یا ستم کی بنا پر خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اس خطا پر غضب ناک محبوب نے اسے تہ تیغ کر دیا۔ شاعر کی آستین اشکِ خونیں کی گواہ ہے، اور محبوب کا دامن جو مقتول شاعر کے خون سے داغدار ہے۔ غالبؔ کہنا یہ چاہ رہے ہیں کہ شاعر جو محبوب پر فریفتہ تھا اس کو دیکھ کر بالکل ہی گھائل ہو گیا ہے۔

فتیلۂ رگِ جاں سر بہ سر گداختہ شُد

ز پیچ و تابِ نفسہائی آتشیں پیداست

شرارہ بردوش سانسوں کے پیچ و تاب سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ رگ جاں کا فتیلہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک پگھل گیا ہے۔ رگ جاں کو فتیلہ سمجھنے سے جو آگ پکڑ چکا ہے سوزِ نہاں کی تباہ کاریوں کا سراغ ملتا ہے۔

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است

بردار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

وہ راز جو سینہ میں نہاں ہے کوئی وعظ تو نہیں جسے منبر پر کہہ ڈالیں۔ اسے سولی پر چڑھ کر ہی افشا کر سکتے ہیں

جوشِ حسرت بر سرِ خاکم ز بس جا تنگ کرد

ہمچو نبضِ مردہ دودِ شمع جُنبیدن نداشت

اتنی حسرتیں لے کر میں دنیا سے گیا ہوں کہ قبر پر حسرتوں کی بھیڑ لگ گئی ہے جس میں سانس لینا تک دو بھر ہے۔ ایسے میں شمع مزار کیوں کر جلتی، اس کے دھوئیں کو ہلنے تک کی جگہ نہیں ہے۔ چناں چہ جس طرح زیرِ خاک میری نبض میں حرکت نہیں تھی، اسی طرح میرے بالیں پر جو شمع جلائی گئی۔ اس کا دھواں بھی حسرتوں کے ہجوم کی وجہ سے اٹھ نہیں پایا۔ بعد مرگ بھی میں تصویرِ حرماں بنا ہوا تھا۔ جو شمع میرے مزار پر جلائی گئی وہ حسرتوں کے ہجوم سے کچھ اس طرح بجھی کہ دھوئیں کو بھی اٹھنے کے لیے جگہ نہ ملی۔

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

بدیں نیاز کہ باتست ناز می رسدم
گدا بہ سایۂ دیوارِ پادشہ خفت است

تمہاری محبت میرے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ سائل قصر شاہی کی دیوار کے سایہ میں سو رہا ہے۔

بو گا کسی دیوار کے سایہ کے تلے میرؔ کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

اس طرح کی تشبیہات جو فکری کو مرئی سے جوڑتی ہیں حواس اور تفکر دونوں کا احاطہ کرنے کی وجہ سے خصوصاً دل پذیر ہوتی ہیں۔ غالب کے اردو کلام میں اس قسم کی تشبیہات نسبتاً کمیاب ہیں۔ فارسی غزلوں میں کہیں کہیں نظر آتی ہیں تو لطف دے جاتی ہیں۔

غالب کی اردو اور فارسی غزلوں میں بہت سی مشابہتوں سے قطع نظر ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اردو کی غزلیں بظاہر سکون اور عافیت کے ساتھ فراغت میں کہی گئی ہیں۔ ان میں کشادگی، فرحت اثری اور شگفتگی ہے۔ یہاں شاعر تنہا تھا وہ جانتا تھا کہ اس کی اردو غزلیں نام نہاد "بے رنگی" کے باوصف، اردو کی شاعری میں عدیم المثال ہیں۔ سوداؔ کی غزلوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ خدائے سخن میرؔ کا اسلوب اور مرتبہ الگ ہی تھا۔ جہاں مضمون آفرینی، موشگافی اور بلند پردازی کے مواقع کم تھے اور ان باتوں کی طرف اس نابغۂ روزگار کا دھیان بھی نہ تھا۔ معاصرین میں مومن خاں کے یہاں نازک خیالی نغز گوئی اور ندرت آرائی اور طباعی ملتی ہیں۔ لیکن ان کے یہاں بھی ایسے اشعار کم ہیں جن میں جذبہ، فکر اور اظہار باہم مل کر استعاراتی انداز کے سائے میں تخلیق جمال کے لیے مامور ہو گئے ہوں۔ ذوقؔ کو قصیدہ سے الگ کر لیجیے تو وہ کسی شمار و قطار میں نہیں تھے۔ چناں چہ قیاس یہ کہتا ہے کہ اردو غزل کہتے ہوئے غالبؔ کو شاید کبھی یہ خیال نہ ہوا ہو کہ ان کا کوئی حریف یا اسالیبِ بیان میں ان کا کوئی شریک ہے فارسی غزل کی بات الگ

ہے۔ یہاں عصر سے قطع نظر غالب کے گرد و پیش زمانی نہ سہی شعری قرب کی وجہ سے عرفی، نظیری، صائب، ظہوری، کلیم، حزیں، بیدل تھے۔ غالب نے اپنی فارسی غزلیں بالعموم حریفانہ انداز میں کہی ہیں، اس تناؤ کی کیفیت میں جس سے کھلاڑی اہم میچ یا مقابلے سے بہت پہلے سے گزرنے لگتا ہے، جس کا تجربہ امتحان یا انٹرویو کی شام کو ہر اچھا امیدوار کرتا ہے، اور جو گھوڑ دوڑ سے پہلے سمند کے رگ و پے سے شدتِ ارتکاز کی شکل میں ٹپکنے لگتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ غالب کی فارسی غزلوں میں بسا اوقات اردو غزلوں سے زیادہ معنویت، سمٹاؤ، ایجاز، تہ داری، مضمون آفرینی اور در و بست ہے۔ لیکن ان میں بصیرتیں اور تحیر آفرینیاں، عقدہ کشائیاں، عادت شکنیاں، رہنمائیاں اور شگفتگیاں، اردو غزل کے مقابلہ میں کم دستیاب ہیں۔ نہ وہ زیرِ لب تبسم جو دنیا کو بہ حیثیت ایک بازیچۂ اطفال کے سمجھتا ہے اور شاعر کے نہاں خانۂ دل کو منور کر دیتا ہے۔ غالب کی اردو غزلیں اس کی فارسی غزل گوئی کی رہینِ منت ہیں، مضمون آفرینی، زبان، تراکیب اور بندش کے لیے لیکن اس کے برعکس کہنا صحیح نہ ہوگا۔ غالب کا کائنات فہم تبسم اور کبھی کبھی اس کا خندہ دنداں نما، اردو شاعری میں اپنی فرح بخش، پُر مغز اور رمز شناس آفاق پیمائی کے لیے منفرد ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ فارسی غزل میں غالب کا تخیل نسبتاً کائنات سے زیادہ اپنی ذات کا طواف کرتا ہو۔ (طواف نہ بھی کرتا ہو تو اس خیال سے اثر پذیر ہوتا ہو کہ سخنوری میں اقران و امثال سے نبرد آزمائی کا موقع ہے۔) اور اردو غزل میں یہ وضع التفات الٹ جاتی ہو۔ اردو میں اسے اپنے اسلوب میں کوئی حریف نظر نہیں آیا۔ یہاں غالب کو ناقدردانیٔ ابنائے زمانہ کے ہوتے ہوئے بھی اپنی فوقیت پر اعتماد ہے۔ لیکن فارسی غزل گویوں کو کیا کیجیے کہ ہر ایک ایک اونچی سطح سے چشمک پر تُلا ہوا ہے۔ کسی کو اہلِ زبان ہونے پر ناز ہے، کسی کو سخن ساز ہونے پر اور غالب کو یہ زعم ہے کہ ان کے مطالعہ اور مشق نے انھیں فارسی اللسان شعرا کی صف میں امتیاز کی جگہ دے دی۔ معاصرانہ چشمکیں ایک آدھ اردو معاصر کے ساتھ رہیں لیکن مقابلہ اور رشک و رقابت اور فخر و مباہات کا کاروبار متاخرین شعرائے فارسی کے ساتھ تھا۔

جہاں تک شعر گوئی کا تعلق ہے اہلِ زبان ہونے کی اہمیت کو نظر انداز کرنا شاید روا نہ ہو۔ زبان اور انسان کو ایک نامیاتی وحدت مان کر چلنے میں ہی صواب ہے۔ جس طرح گلے اور زبان کی ساخت کسی دوسری زبان کے الفاظ کو خندہ پیشانی سے قبول نہیں کرتی اور ان میں تلفظ اور

ب ولہجہ کی کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور کردیتی ہے، اسی طرح وہ ذہن جو اپنے معاشرہ اور تمدّن کے زیر سایہ پلا بڑھا ہے وہ اپنے آپ کو دوسری زبان سے مربوط جذبات، افتادِ طبع اور انداز فکر کے سانچے میں نہیں ڈھال سکتا۔ انسان دراصل اپنی ہی زبان میں سوچتا ہے اور تجربات کو اپنے حواس اور طریقہ اظہار کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ کسی اجنبی کے لیے اپنی زبان کو مقفل کرکے نئی زبان کو اپنے نہاں خانۂ دل اور طلسم خانۂ دماغ میں بسا لینا بہت مشکل کام ہے۔ شاعری، بے تکلف، بامحاورہ شاعری جو زبان کی ساخت اور اس کے مزاج کی ہمنوا ہے۔ کسی غیر اہل زبان سے وجود میں نہیں آسکتی، اور اگر آئی بھی تو اس میں وہ روانی، بے تکلفی، شگفتگی اور آمد نہ ہوگی جو مادری زبان کی دین ہوتی ہے۔ اگر اس بات کو آپ تسلیم کرلیتے ہیں تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہم کسی شاعر کے متعلق اہل زبان کی رائے کو یک قلم رد نہیں کرسکتے تاآنکہ دو صورتوں میں سے ایک ہمارے علم میں نہ آجائے۔ (۱) اہلِ زبان کے ادب شناسوں کی اکثریت لسانی عصبیت میں مبتلا ہے۔ یا (۲) یہ گروہ شئے لطیف سے محروم اور ذوقِ شعر سے معصوم ہے۔

ایرانی ناقد خسروؔ کے بعد کسی ہندوستانی شاعر کو تمام وکمال تسلیم نہیں کرتے۔ ہمارے دور میں انھوں نے اقبالؔ کو اپنے شعرا بلکہ بڑے شعرا کی صف میں جگہ دے دی ہے لیکن شمولوں کی وجوہات خارجی بھی ہیں۔ آیت اللہ خمینی کا ایران اقبالؔ کا گرویدہ ان کے شعری محاسن کی وجہ سے اتنا نہیں ہے جتنا کہ اس کی اسلامی فکر کی بنا پر۔ ہمیں اقبالؔ اور غالبؔ دونوں کے سلسلہ میں اس بات کا انتظار کرنا پڑے گا کہ ایرانی ناقدین کی رائے ان کے متعلق پایۂ ثبات کو پہنچ جائے۔ قرائن یہ کہتے ہیں کہ اسلامی انقلاب کے ردعمل کے بطور مذہب سے شغف کم ہوگا۔ تو ایران میں اقبالؔ کی مقبولیت گھٹے گی اور فکر شاعر کی پیچیدگی اور تخیل کی بالادستی کا جب شعور پیدا ہوگا تو غالبؔ کی جسے ایرانی کوئی خاص درخور اعتنا نہیں سمجھتے قدر بڑھے گی۔ یہ بات یقیناً حیرت کی ہے کہ ایرانی نقد نے سبکِ ہندی کو منصب اعتبار کیوں نہیں دیا۔ کیا وہ شعر میں فکر کے پیچاک کو قبول نہیں کرسکتے؟

بار بار ہمیں احساس ہوتا ہے کہ غالبؔ کے وہ اشعار جو پردہ برانداز ہیں، جو زندگی کو دیکھنے پرکھنے اور بوجھنے کے نئے ڈھنگ سکھاتے ہیں۔ جو تھوڑے سے لفظوں میں بہت، بڑی بات نہایت سلیقے سے کہہ جاتے ہیں۔ جو دل میں اتر جاتے ہیں۔ جن پر گماں ہوتا ہے کہ یہ تو ہمارے دل کی بات ہے۔ جو روشنی اور رہبری کا کام دیتے ہیں۔ جو ہمیں تحیر سے دوچار کردیتے ہیں۔ اگر ایسے اشعار کو ڈھونڈنے نکلیے تو اردو غزل کی

قلمرو میں جستجو کا دامن جلد ہی موتیوں سے بھر جائے گا کچھ تو اردو اشعار کی تعداد نسبتاً کم ہونے کے باعث کچھ کچھ اس بنا پر کہ فارسی غزلوں میں غواصی کر کے موتی نکال لانا دقت طلب ہو گا۔

لیکن غالبؔ کی فارسی غزلوں کا کوئی شعر جستجو کو ناکام نہیں لوٹاتا۔ اظہار محبت کو نئے ڈھب اور دل پذیر چھب سے بات کہنا راس آیا ہے۔

بہ ہر جا می خرامی جلوہ ات در ماست پنداری
دل از آئینہ داری ہائے شوقت دیدہ را ماند

تم کہیں بھی محوِ خرام ہو۔ تمہارا جلوہ ہمارے دل میں ہو گا۔ ہمارے دل کا آئینہ کتنے شوق سے ہر لمحہ تمہاری تصویر اتار رہا ہے۔ دل گویا آنکھ میں بس گیا ہے جس کے سامنے ہر وقت تم ہی تم ہو۔

منم بہ وصل بہ گنجینہ یافتہ دزدی
کہ در ضمیر بود بیم پاسبانش و لرزد

وصال یار میں میری وہی کیفیت ہے جو ایک چور کی جو خزینہ تک پہنچ گیا ہو اور پاسبان کے خوف سے کانپ رہا ہو۔ غالبؔ کی فارسی غزل میں مشاہدہ کا انعکاس اور اس سے استفادہ اردو غزل کی بہ نسبت زیادہ ہے۔

لبم از نام تو آں مایہ پرستی کہ اگر
بوسہ بر غنچہ زنم غنچہ نگینِ تو شود

میرے ہونٹ تیرے نام سے اس قدر بھر گئے ہیں کہ اگر میں کلی کو پیار کر لوں تو نگیں کی طرح اس پر تیرا نام نقش ہو جائے۔

بستند رہِ جرعۂ آبی بہ سکندر
دریوزہ گر میکدہ صہبا بہ کدو برد

چشمۂ حیواں سے سکندر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہیں ملا، اور میخانہ سے سائل کدو بھر کر شراب لے گیا۔ یہاں آبِ حیات پر شراب ناب کو غالبؔ نے اسی انداز سے ترجیح دی ہے جیسے جام جم پر جام سفال کو۔

پیمانہ بر آں رند حرامست کہ غالبؔ
در بے خودی اندازۂ گفتار نداند

غالبؔ اس رندپرمے نوشی حرام ہے۔ جو پی کر بہکنے لگے۔ پینے کے لیے ظرف درکار ہے تاکہ نہ زبان بہکے نہ قدم لڑکھڑائیں۔ یہ شعر بھی غالبؔ کے مسلکِ شاعری کی وضاحت کرتا ہے۔ زبان میں وزن اور الفاظ اور لہجہ میں وقار ہونا چاہیے۔ جذبہ کی طغیانی کو شعر کے شیشہ میں اس طرح اتارنا ہوگا کہ سطح پر سکون رہے۔

دل اسبابِ طرب گم کردہ دربندِ غمِ ناں شد
زراعتگاہِ دہقاں می شود چوں باغ ویراں شد

عیش وطرب کے اسباب کھوکر دل روٹی کی فکر میں لگ گیا۔ باغ ویران ہوجاتے تو اس میں کھیتی کرنے لگتے ہیں۔ باغ سے مراد گل وگلزار ہے جو علامت ہے عیش وعشرت کی زراعتگاہِ دہقاں کا جوڑ بندِ غمِ ناں سے ہے۔ یعنی روزی کی فکر دامن گیر ہوجائے تو تخلیق کے سوتے خشک ہوجاتے ہیں۔ اس شعر میں بھی زندگی کا مشاہدہ اور تجربہ صرف ہیں آیا ہے۔

چہ پرسی وجہ حیرانی کہ ہنگامِ تماشایت
نگہ از بےخودی ہادست وپاگم کردو مژگاں شد

حیرت کا سبب کیا پوچھتے ہو، تم پر آنکھ پڑتی تھی کہ نگہ نے بےخودی میں ہاتھ پیر گم کردیے اور پلکوں کی شکل اختیار کرلی۔ فرطِ حیرت سے سکتہ کا یہ عالم ہوگیا کہ نظر صفِ مژگاں سے آگے نہ بڑھ پائی۔

کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب وہ نگاہیں دل کے پار جو مری کوتاہئ قسمت سے مژگاں ہوگئیں

بعض مصرعوں میں اضافتوں کا تواتر اور طوالت گراں گزرتی ہے۔ ترکیب کی دولت نے فارسی زبان کو بےحد متمول کردیا ہے اور جس طرح اردو نے فارسی تراکیب اور فارسی طرزِ ترکیب سے فائدہ اٹھایا ہے، ایسے استفادہ کی شاید دوسری مثال دنیا کی زبانوں میں نہ ملے۔ تراکیب اضافی وتوصیفی خصوصاً اضافی تعمیرات کی اصطلاح میں گویا بلڈنگ بلاکس ہیں۔ Building Blocks وہ خوش نما اور کارآمد جبھی تک رہتے ہیں جب وہ ایک متعینہ حجم کا اتباع کریں اگر حجم زیادہ بڑھ گیا تو کیا عجب کہ معنویت بھی بڑھ جائے لیکن حسن اور شعریت، روانی اور شگفتگی، توازن اور تناسب میں کمی آجائے گی۔ غالبؔ کی غزلوں میں ترکیب کبھی کبھی (گوکہ اس کی مثالیں زیادہ نہیں ہیں) جادۂ اعتدال سے ہٹ گئی ہے۔ لیکن یہ ایک بڑے کمال کا نقص ہے۔

غالب نے فارسی زبان و بیان، صوت و آہنگ، محاورہ اور طرزِ فکر اور ترتیبِ الفاظ پر غیر معمولی قدرت حاصل کرلی تھی۔ ان کی فارسی غزل کا ہر شعر اس کی شہادت دے رہا ہے کہ وہ فارسی کے مزاج شناس تھے اور اس میں قادر الکلامی کے ساتھ شعر کہتے تھے۔ اس کے برعکس اقبال کو فارسی کے محاورہ اور طرزِ بیان میں زیادہ دخل نہ تھا۔ ان کی فکر کا تسلسل اور بلندی، جذبہ کا زور اور مضمون کا شکوہ ان کے اشعار کو ایک تیز رو ندی کی طرح بہائے جاتا ہے۔ قاری مضمون اور نظامِ فکر میں جذب ہوجاتا ہے اور اس کا دھیان زبان اور محاورہ کی طرف نہیں جاتا، اور مضمون خود بھی محاورہ اور زبان کی شاعری کا مطالبہ نہیں کرتا اور نہ غالب کی فکر کو فارسی شعر سے جو مطابقت اور موانست اور فارسی آہنگ اور لب و لہجہ پر جو قدرت ہے۔ اقبال اس سے بے بہرہ رہے ہیں۔ لیکن ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ فارسی پر غالب کا عبور اہلِ زبان کے مساوی یا ان کی طرح بے محابا تھا۔ فارسی غزل میں انھیں اردو کے مقابلہ میں ہمیشہ زیادہ کوشش کرنی پڑی اور اس میں شک نہیں کہ یہ کوشش بہار کے برگ و بار لائی۔ فارسی نثر انھوں نے اس وقت ترک کی اور اردو میں نثر لکھنا شروع کی جب ان کے قوا میں اضمحلال آگیا۔ لہٰذا ناقد کو اس نتیجہ سے مفر نہیں کہ غالب کی فارسی غزل میں کاوش کا اثر اردو غزل سے زیادہ ہے۔ اس کے معانی (مضامین) کے پیچ و خم پر کہیں کہیں آورد کا سایہ پڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ قیاس کرنا شاید بعید از حقیقت نہ ہو کہ فارسی غزل انھوں نے اس طرح آزادانہ اور مختلع بالطبع ہو کر نہیں کہی جس طرح کہ اردو غزل۔

موازنہ تاہم یہاں ختم نہیں ہوتا۔ فارسی غزلوں کا جستہ جستہ، حظ اندوزی کے انداز سے اور خوش خرامی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو حیرت انگیز انکشافات ہوتے ہیں۔ ہر شعر میں گنجینۂ معنی کا طلسم نظر آتا ہے۔ جس قدر غور کیجیے نئے نئے مفاہیم الفاظ کے پردوں سے جھانکنے لگتے ہیں۔ جو کچھ کہا ہے اور جو کچھ کہنے سے رہ گیا ہے۔ ان دونوں کی آویزش کی دھوپ چھاؤں اور الفاظ و افکار کا جذبہ اور احساس سے ٹکراؤ، اشعار کو دہکا دیتا ہے، چمکا دیتا ہے۔ جا بجا آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلتا ہوا نظر آتا ہے۔

ردیف کے بارے میں یہ بات کانوں میں پڑتی چلی آئی ہے کہ ردیف کا، غیر معمولی ردیف کا، برتنا بہت دشوار ہوتا ہے، اور ردیف قادر الکلامی کا ایک پیمانہ ہے۔ ردیف شانِ کج کلاہی کے

ساتھ آتی ہے اور اپنے ہم نفسوں سے آداب وکورنش کا تقاضہ کرتی ہے۔ شاعر کو ردیف کی نوک پلک درست رکھنے اور اس کے لفظی ومعنوی تشخص کو برقرار رکھنے اور نمایاں کرنے کے لیے داد ملتی ہے، ردیف دب گئی تو شاعر کی کور بھی دبتی ہوئی نظر آتی ہے۔ بعض اوقات شاعر خود ردیف کے بوجھ کے نیچے دب جاتا ہے۔ ردیف تخیل کی پرواز اور تکمیل مضمون کی راہ میں حائل ہونے لگتی ہے۔ ردیف کو غالبؔ نے فارسی غزلوں میں تسلسل اور آہنگ کے لیے استعمال کیا ہے۔ غزل کے مزاج کا تقاضہ ہے کہ ہر شعر ایک نئے مضمون پر ناز سے سر اٹھاتا ہوا نظر آئے۔ غالبؔ کی ردیف اردو میں کم فارسی میں زیادہ، ان سرافراشتہ اشعار کو انفرادیت کی بے اعتدالی اور بے راہ روی سے بچاتی ہے۔ ان کو حسن بیان زور بیان اور صوت ومعنی کی یکرنگی کی لڑیوں میں پرو دیتی ہے۔ ان کو وہ غزل گیر معنویت اور تسلسل اور ہم آہنگی دیتی ہے جو مختلف اشعار کے انفرادی معنی ومفہوم سے بالاتر ہوتی ہے۔ انفرادی معنی اور اجتماعی کیفیت دونوں کو ساتھ لے کر چلنا، اس طرح چلنا کہ دونوں کے ٹکراؤ سے چنگاریاں اڑتی چلیں۔ لیکن نہ اشعار کی انفرادیت جھلس پائے نہ غزل کے مجموعی حسن اور کیف پر آنچ آئے۔ یا غزل گوئی کا یہ ملکہ سرافرازانِ سخن کو آسانی سے میسر نہیں ہوتا۔ غالب کی فارسی غزل میں یہ ملکہ اپنی پوری تاب وتوا ں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

اردو میں بھی کچھ غزلیں اس رنگ وآہنگ سے کہی گئی ہیں لیکن اس دشوار گزار راہ میں اردو زیادہ دیر تک شاعر کا ساتھ نہیں دے پائی۔ غالبؔ کی اردو غزل ان کی فارسی غزل کی طرح طرح سے احسان مند ہے۔ اس کے محاسن بلکہ رنگ وآہنگ اور ساخت اور اٹھان اور طرزِ ادا بڑی حد تک فارسی سے متاثر اور مستعار ہیں۔ اقبال نے اپنی شاعری میں فارسی کو معنویت، وسعتِ اظہار، اور سبک روی کے لیے استعمال کیا ہے۔ غالبؔ نے فارسی میں غزل اس لیے کہی دمنجملہ اور وجوہ کے، کہ فارسی ان کی طرزِ ادا کے پر پیچ وخم تحول،، تہ بہ تہ معنویت، افکار کی آمیزش وآویزش، مفاہیم کے تصادم واختلاط، جزو کل کے درمیان ٹکراؤ اور ارتباط، الفاظ اور انبوہِ الفاظ کے مابین تصادم اور مفاہمت توازن اور ملاطفت، افکار کی پرواز اور زبان کی سجاوٹ، سیل معانی اور شکوہ الفاظ ——— فارسی غزل کرا ہے بغیر ان سب کا بار اٹھا سکتی تھی۔ غالب کے فارسی کلام کو جرعہ جرعہ، بتدریج بالاحتیاط اور لطف لے لے کر پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ معاصرانہ چشمک ہی نہیں تھی جس نے

ان سے یہ کہلوایا:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بی رنگِ من است

میرا فارسی کلام دیکھو تاکہ تمہاری آنکھیں گوناگوں نقوش سے دوچار ہوں۔ اردو مجموعے سے گزر جاؤ کہ فارسی دیوان کے سامنے وہ بے رنگ ہے۔

بلکہ یہ طغیانِ افتخار تھا جسے رقابت کا احساس بھی ناگوار ہوتا ہے۔ اس کے مقابل میں ہم اس شعر کو رکھ سکتے ہیں۔

وہ جو کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

بظاہر ایک شعر دوسرے کے برعکس ہے لیکن دونوں شعر نہ صرف حقیقت بلکہ شاعر کے احساس کے ترجمان ہیں دوسرا شعر کہہ رہا ہے کہ غالبؔ کو اردو شعر کہتے وقت آزادی، شگفتگی، روانی اور بے بندشی کا احساس ہوتا ہے اردو میں وہ کھل کے بے تکلفی کے ساتھ بات کرتے تھے۔ یہاں ظرافت بھی کبھی کبھی در آتی تھی۔ فارسی غزل میں ظرافت کو بار کم ہی ملتا تھا۔ اردو میں غالبؔ کبھی کبھی ہنسوڑ (ہنسوڑ تو نہیں پر مذاق) بن جاتے تھے۔ فارسی میں (کیا نظم کیا نثر) وہ بیشتر مقطع رہتے تھے۔ عبا و چغہ اور چوگوشہ ٹوپی کے ساتھ۔ اردو میں گھر کے ماحول میں ململ کا کرتہ پہنے ہوئے بے تکلف بیٹھنے کا سا انداز تھا۔ غیب سے مضامین آنے کے لیے یہاں راہیں زیادہ کھلی ہوئی تھیں۔ وضع یہاں چمن میں خوش خرامی کی سی تھی۔ اردو غزل کے بعض اشعار اس بے تکلفی اور شوخی کی خبر لاتے تھے جو غالبؔ کے اردو خطوط کو باغ و بہار بنا رہی ہے۔ موازنہ کرتے وقت بعض اوقات وردی اور مفتی کے فرق کا احساس ہوتا ہے۔ فارسی غزل میں بالعموم زیادہ اہتمام ہے۔ اور اہتمام کی لائی ہوئی کاوشیں، بندشیں اور آرائشیں۔ البتہ ایک استثنا کا ذکر کر دینا قرینِ انصاف ہوگا۔ بندشوں کے باوجود گرمیٔ اختلاط کے اشارے یا صراحتیں فارسی غزل میں زیادہ ملیں گی۔ اگرچہ مجموعے کے تناسب میں وہ پھر بھی نظر انداز کرنے کے قابل ہیں۔

غزل کا حسن اس آمیزہ یا ترکیب یا امیلگم سے بہت فزوں ہو جاتا ہے۔ جو مضمون آفرینی اور آرائش کے درمیان ترتیب پاتا ہے۔ یہ آمیزہ بڑی کشمکش کے بعد شکل پکڑتا ہے مضمون اور تزئین کے مطالبات متضاد ہیں۔ دونوں اپنا حق زور و شور کے ساتھ مانگتے ہیں۔ ہر کام یہ

اندیشہ رہتا ہے کہ سجاوٹ اظہارِ مطالب میں حائل نہ ہوجائے۔ لیکن یہ اندیشہ مستقل بالذات نہیں ہوتا بلکہ گرمیٔ تخلیق کے اثر سے پگھلا پگھلا رہتا ہے۔ ان دونوں کی باہمی صلح کا بیش خیمہ جنگ ہے۔ شاعر کے خصوصاً ایسے شاعر کے، دماغ میں جس کا حافظہ اور جس کا تحت الشعور احساسات، جذبات، مشاہدے اور مطالعے اور تخیل کی بالادست پروازوں سے مالا مال ہو، بے شمار تضادات، اور مضامین ومفاہیم کی کبھی نہ ختم ہونے والی نہیں سراٹھاتی ہوئی۔ یا جھانکتی ہوئی نظر آتی رہیں ان سب کو ذوقِ تناسب کے ساتھ نہایت اختصار اور غایتِ جمال کے ساتھ موزوں ترین پیرایۂ بیان کا پیرہن دے دینا شاعر کی عظمت اور اس کی خلاقی کی کسوٹی ہے۔ غالب کی فارسی غزل اس معیار پر پوری اترتی ہے۔

فارسی دیوان کی غزلوں کو مطلع سے مقطع تک باریک بینی کے ساتھ پڑھ جائیے۔ ہر شعر انتخاب ہے۔ بھرتی یہاں متروک ہے۔ غزل کے مضامین اس کی ساخت کے تحت محدود ہوتے ہیں۔ پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے کہ اس کے باوجود تکرار ڈھونڈے سے نہ ملے گی۔ ہر مضمون میں ایک نئی راہ نکالی ہے لاریب کہ یہ مضمون آفرینی کا اعجاز ہے۔ غالب نے کہا تھا :

رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور۔ ان کی طبع بندشوں اور رکاوٹوں کے درمیان سے کثرت مضامین ومفاہیم واحساسات کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لیے اس طرح سے گزر جاتی ہے جیسے بادِ صبا چمن سے یا رود بار چٹانوں سے۔ اگر انصاف کی ترازو پر غالب کی فارسی غزل اور اردو غزل کو تولا جائے تو مضامین، آرائش، دروبست اور زورِ بیان کے لحاظ سے پہلی کا پلہ بھاری نکلے گا۔ یہ اور بات ہے کہ اردو کی غزل ہمارے دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ ہمیں زیادہ بھاتی ہے، ہماری سمجھ میں رجہاں تک کہ مفہوم کی پہلی تہ کا تعلق ہے)، نسبتاً آسانی سے آجاتی ہے۔ ہمیں حیرتوں اور بصیرتوں سے ہمکنار کرتی چلتی ہے! اور ہم اپنی زبان کا پرچم بھی بلند کرنا چاہتے ہیں۔ غالب کی فارسی غزل کا مجموعی وزن ریہاں حجم کی طرف اشارہ نہیں ہے جو دس گنا ہے)، اردو غزل سے زیادہ ہے، اور تموّل بھی۔ یہاں تخیل کی پرواز اور مضمون آفرینی کی مثالیں بھی زیادہ ہیں، لیکن جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، اعلیٰ بصیرتیں، روشنیاں اور حیرتیں اردو غزل میں زیادہ ملیں گی۔ نوائے سروش سے واسطہ اردو غزل میں زیادہ پڑتا ہے۔ لیکن قادرالکلامی، دروبست، مضمون آفرینی فضا بندی اور تسلسل اور تموّل میں فارسی غزل اردو غزل پر بھاری ہے۔ یہ امید کرنے کو جی چاہتا ہے کہ ایران کے اربابِ ذوق کے مزاج کو سبکِ ہندی اور مضمون آفرینی، پہلوداری اور پنہاں نگاری اور

آزمائی سے جو بُعد رہا ہے وہ آگے چل کر کسی دور میں مٹ جائے اور غالبؔ کی غزل کی توانائی اور معنویت اس پر ظاہر ہو جائے۔ انگریزی تنقید میں ظن و تخمین تجزیہ اور تحلیل کے معیار اور پیمانے بدلتے رہے ہیں اور ان کے ساتھ کسی شاعر یا کسی دور کے شعرا بلکہ اہل قلم کی مقبولیت اور قدر۔ غالب کی فارسی غزل اس دیر فہم زود پشیماں کی پشیمانی کا انتظار کر رہی ہے۔

ہمارا مقصد اس وقت تخمینہ اور تبصرہ سے بڑھ کر تعارف اور رونمائی ہے۔ ہم اپنی تہی مائگی کے باوصف، تھوڑی دیر کے لیے اس پردہ کو اٹھا دینا چاہتے ہیں جس نے گزشتہ ۷۰ سال میں بالعموم اور پچھلے ۴۵ سال میں بالخصوص غالبؔ کی فارسی غزل کو ڈھانک لیا ہے۔ غالب کی فارسی غزل کا سفر ہم قارئین کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔ تھوڑا بہت تبصرہ جو کیا گیا ہے یا کیا جائے گا اسے ٹی وی کی وضع پر سمجھیے نہ کہ ریڈیو کے انداز پر۔ ہم اپنی بے بساطی اور تنگ ذوقی کے باوجود آزاد اور رواں دواں ترجمے کے ذریعہ، لیل و نہار کے ڈالے ہوئے پردوں کو ہٹا کر، ہندوستان کے اردو داں طبقے کے سامنے غزلِ غالبؔ کے ایرانی پیکر کی رونمائی کر رہے ہیں۔ "اناورن" کا ہمیں حق تو نہیں، نہ اس کی صلاحیت لیکن نیت بخیر ہو تو کچھ پردہ کشائی کرنا ہی اچھا ہے۔ تو لیجیے غالبؔ کے اور اشعار سنیے، ترجمہ کے ساتھ لیکن بدون تبصرہ۔ تبصرہ بالعموم ساتر ہوتا ہے، کاشف شاذو نادر۔

نہ می بینم در عالم نشاطی کاسماں مارا
چو نور از چشم نابینا زساغر رفت صہبارا

ہمیں دنیا میں کہیں خوشی نظر نہیں آتی، کیوں کہ ہمارے جام سے آسماں نے شراب اس طرح پونچھ لی ہے جیسے نابینا کی آنکھ سے روشنی۔ تشبیہ میں ندرت بھی ہے اور بے چارگی کا درد بھی مشبہ بہ کی پرتاثیر معنویت کے آگے خود مشبہ خجل ہے۔ یہاں تشبیہ کی عمومی ساخت کو الٹ دیا گیا ہے، جس نے حیرت کے تاثر کو دوچند کر دیا ہے۔

سراب آتش از افسردگی چوں شمع تصویرم
فریب عشق بازی می دہم اہل تماشا را

مجھے دیکھ کر لوگ سمجھتے ہیں کہ میرے دل میں محبت نے آگ لگا دی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ آگ نہیں آگ کا دھوکا ہے۔ کیوں کہ میں بجھ کر رہ گیا ہوں اور میرا حال تصویر کی شمع (یا شمع کی تصویر) کا سا ہے جس

میں گرمی نام کو نہیں۔ میں ہنوز دنیا کو اپنی سرگرمیٔ عشق کا فریب دے رہا ہوں۔ سرابِ آتش کی ترکیب تاثیر سے بھری ہوئی ہے۔ پیاسا جو ریگستان میں پانی کے لیے بے تاب ہے، اسے بہتے ہوئے ذرّوں پر اچانک پانی کا گمان ہوتا ہے۔ وہ آنکھیں لگائے ہوئے اور زبان نکالے ہوئے اس کی طرف بڑھتا ہے۔ جیوں جیوں وہ آگے بڑھتا ہے، سراب پیچھے ہٹتا جاتا ہے۔ شاعر نے سراب کو پانی سے منتقل کر کے اس کی ضد آگ کے ساتھ پیوست کر دیا۔ شمعِ تصویر کی ترکیب اسی مفہوم کو اور گہرا کر دیتی ہے۔ ہم شمع کو دیکھ رہے ہیں، لیکن وہ گرمی، روشنی اور سوز سے محروم ہے۔

دلِ مایوس را تسکیں بہ مردن می تواں دادن

چہ امید است آخر خضر و ادریس و مسیحا را

شدتِ یاس میں عام انسان دل کو تسلی دے دیتا ہے کہ موت آجائے گی تو سارا بکھیڑا ختم ہو جائے گا خضر، ادریس اور مسیحا کو یہ راہِ عافیت، یہ سامانِ تسکین بھی میسّر نہیں۔ ساری مصیبتوں کا خاتمہ کر دینے والی موت ان کی دسترس سے باہر ہے۔

جیسا کہ ہم آگے بھی دیکھ چکے ہیں، غالبؔ کے تخیل کی یہ مخصوص کارفرمائی ہے کہ وہ فروتری کو برتری میں بدل دینے کے پہلو نکال لاتا ہے۔ خضر پر ایک جگہ اور ترس کھایا ہے۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر — نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

لیکن ہم یہ کہہ کر خاموش نہیں ہو سکتے کہ یہ شاعر کے تخیل کی شگرف کاریاں ہیں، وہ سیاہ کو سفید بنا سکتا ہے۔ بات اس سے زیادہ اہم ہے۔ اور اسے ذہن نشین کرانے کے لیے ہمیں غالبؔ ہی کو یاور بنانا پڑے گا۔

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے۔

زندگی کھیل ہی خیال، فکر، اقدار اور زاویۂ نگاہ کا ہے۔ دیکھنے والے کے زاویۂ نظر اور دیکھنے کے مقام اور ڈھنگ میں تبدیلی آنے کے ساتھ افراد اور اشیا کی اہمیت اور حیثیت بالکل بدل جاتی ہے، جن باتوں پر رشک کیا جاتا تھا وہ قابلِ رحم بن جاتی ہیں اور اس کے برعکس بھی۔ زندگی جو نقطۂ نظر کے تحت اس قدر تغیر پذیر ہے، ہرگز اس لائق نہیں کہ اس کے حوادث اور ترجیحات کی بنا پر کوئی ملول، اداس یا مایوس ہو، یا کسی شخص پر رشک یا اس سے حسد کرے۔

ہر خراشی کہ زرشکِ تنم افتد بر دل

در سپاس دمِ تیغِ تو زبانست مرا

تم تلوار سے پیاپے مجھ پر وار کر رہے ہو، میرا بدن گھاؤ کے داغوں سے بھر گیا ہے۔ دل کو میرے جسم پر رشک آرہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے، کاش تمہاری تلوار کے وار میرے نصیب میں ہوتے۔ گویا رشک وحسرت کا ہر داغ، ہر وہ خراش جو میرے دل کو تمہاری ضربِ شمشیر سے محرومی کی بنا پر لگی ہے، ایک زبان بن گئی ہے۔ جو تمہاری تلوار کی دھار کی شکر گزار ہے۔ اگر تمہاری تلوار کی دھار سے لگی ہوئی خراش اتنی مطلوب ومرغوب نہ ہوتی تو دل اس کی حسرت سے خلش اندوز کیوں ہوتا۔ شکر وشکوہ، شادی وحرماں، تشفی ومحرومی کو شاعر کے کیمیا گر تخیل نے باہم شیر وشکر کر دیا ہے۔ گھاؤ کے نشان میں جو ظاہری مشابہت شاعر نے زبان کے ساتھ ڈھونڈی ہے۔ وہ اس کے تخیلی مشاہدہ کی نادرکاری پر دلالت کرتی ہے۔

چوں پری زاد کہ در شیشہ فرودش آرند

روئے خوبت بدل از دیدہ نہانست مرا

اس پری کی طرح جسے شیشہ میں اتار دیا جائے، تمہارا مکھڑا دل میں جلوہ فگن ہے لیکن آنکھوں سے پنہاں۔ تم چشمِ ظاہر سے اوجھل ہو اور چشمِ باطن کے روبرو۔

بی تو چوں بادہ کہ در شیشہ ہم از شیشہ جدا ست

نبود آمیزشِ جاں در تن ما با تنِ ما

اس شعر میں الفاظ کی چابکانہ طلسم بندی تو ظاہر ہے، لیکن مفہوم کی دلکشی اس سے بڑھ کر ہے۔ شراب کو دیکھو کہ ساغر میں ہے اور ساغر سے الگ، انسان کا جسم ساغر ہے اور جان شراب۔ اگر تم نہ ہوتے، اگر تم سے محبت نہ ہوتی، اگر یہ محبت جان وتن کو پگھلانے والی نہ ہوتی۔ اگر آبگینہ تندیٔ صہبا سے نہ پگھلتا تو میرا بھی صہبا اور ساغر کا سا حال ہوتا، جسم الگ، جان الگ، دونوں ارتباط، اختلاط، آمیزش اور شیر وشکر ہونے سے محروم رہتے یہ تمہاری محبت ہے جس نے دونوں کو ملا دیا ہے۔ جان وتن کی دوئی اسی وقت تک بنی رہتی ہے جب تک کہ دل محبت سے محروم ہو۔

سخن ما ز لطافت نہ پذیرد تحریر

نہ شود گرد نمایاں ز رمِ توسنِ ما

جو بات ہم کہنا چاہتے ہیں، وہ غایت لطافت سے الفاظ میں نہیں ڈھالی جا سکتی۔ ہمارا اشہبِ فکر جب گرمِ سفر ہوتا ہے تو گرد بھی نہیں اٹھتی۔ اس کی تیز گامی صبک سیری کی ہمعناں ہے۔ وہ جب گرمِ جولاں ہوتا ہے تو پاؤں زمین پر نہیں رکھتا۔ ہواؤں میں اڑتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ انسان کی فہم اس تک کیسے پہنچ سکتی ہے۔ ہماری فکر فلک رس تک نہ ہمارے خامۂ گہر بار کی رسائی ہے۔ نہ طاقتِ گویائی کی۔ غایت لطافت سے ہمارے بیشتر افکار قلمبند نہیں ہو پاتے۔ وہ ہمارے نسبتاً کم لطیف افکار ہوں گے جنھوں نے شعر کا قالب اختیار کر لیا ہے۔

مشرقی تخیل کو حسنِ تعلیل بھاتا ہے۔ غالبؔ کے یہاں اس کی مثالیں بار بار سامنے آتی ہیں:

طوطیاں را نہ بود ہر زہ جگر گوں منقار
خوردہ خونِ جگر از رشکِ سخن گفتنِ ما

طوطیوں کی چونچ مفت میں لہو رنگ نہیں ہو گئی ہے۔ شیریں زبانی کے ہوتے ہوئے وہ ہماری حلاوتِ سخن کو نہ چھو سکیں۔ جلن میں ان کا جگر خوں ہو گیا، انھوں نے شدتِ محرومی میں اپنے جگر کو اپنی چونچ سے چھید ڈالا۔

افتخار کی لے اگلے شعر میں اور تیز ہو گئی ہے۔

ما نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

غالبؔ اس حیثیت پر ہم راضی نہیں تھے، نہ ہمارا کوئی ارادہ تھا شاعری کے منصب کو قبول کرنے کا۔ لیکن خود شعر نے خوشامد کی کہ ہمیں قبول کر لیجیے تو مجبور ہو گئے۔

خاکِ وجودِ ماست بخونِ جگر خمیر
رنگینیٔ تماشِ غبار خودیم ما

ہمارے وجود کی مٹی جگر کے خون سے گوندھی گئی ہے۔ اپنے غبار وجود کے پیرہن کی رنگینی ہم سے ہے۔ یعنی اگر محبت نے ہمیں جگر خوں کرنا نہ سکھایا ہوتا تو ہماری ہستی مٹ میلی خاک سے زیادہ نہ ہوتی۔ ہماری ہستی اور ہستیٔ کائنات میں بہار خونِ جگر سے، دردِ دل سے آئی ہے۔ شاعر کی رنگینیٔ تخیل اور سرعتِ فکر کو کیا کہیے۔ استعارہ سے استعارہ سر اٹھاتا ہے۔ فکر کی معنی آفریں دروبست میں غالبؔ کی

فارسی غزل ان کی اردو غزل کو پیچھے چھوڑ گئی ہے۔

غالب چو شخص و عکس در آئینہ خیال

با خویشتن یکے و دوچارِ خودیم ما

غالب ہمارا حال انسان اور اس کی پرچھائیں کا سا ہے۔ خیال کے آئینہ میں ہم اپنا عکس دیکھتے ہیں۔ ہم اور ہمارا وجود ایک ہے لیکن ہم اپنے روبرو بیٹھے ہوئے ہیں۔ سبک صنعتی کی شان دیکھیے۔

زخوئے تست نہادِ شکیب نازک تر

بیا کہ دست و دلم می رود ز کار بیا

صبر کا مزاج تمہارے مزاج سے بھی زیادہ نازک ہے۔ آجاؤ کہ میرا ہاتھ اور میرا دل کام سے جا رہا ہے۔ آ بھی جاؤ۔

وداع و وصل جداگانہ لذتی دارد

ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

جدائی اور ملاپ کا مزہ الگ الگ ہے۔ ہزار بار جاؤ، لاکھ بار آؤ

خویش را چوں موجِ گوہر گرچہ گرد آوردہ ام

دل پر است از ذوقِ اندازِ پرافشانی مرا

عاشق کی شخصیت محبت کے فشار میں آکر بکھرنے والی ہے۔ وہ اپنے آپ کو سنبھال رہا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو موتی کی لہر کی طرح سمیٹ لیا ہے۔ جمع کر لیا ہے۔ ورنہ دل تو فرطِ بے تابی سے بکھر جانے پر تلا ہوا ہے۔

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم

گر بہ موج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

میں پیاس سے بے تاب ہوں اور پانی کی تلاش میں ندی کے کنارے پہنچا ہوں لیکن میری نگاہ اچانک ان شکنوں کی طرف گئی جو ندی کی پیشانی پر پڑ رہی تھیں۔ غیرت نے اپنے نیزے کی انی میرے جگر کے پار کر دی۔ غیرت مند انسان انتہائی مجبوری کی حالت میں بھی غیرت پر آنچ نہیں آنے دیتا۔ ندی کے ہاتھوں تحقیر برداشت کرنے سے تو میں پیاس سے جان دینے کو بہتر سمجھوں گا۔

نگشت از سجدۂ حق جبۂ زُہاد نورانی
چناں کافروخت تابِ بادہ روئی بادہ خواراں را

بارگاہِ خداوندی میں سجدہ کرنے سے عبادت گزاروں کی جبیں اتنی نورانی نہیں ہو پائی جتنا روشن صہبائے ناب نے مے خواروں کے چہروں کو کر دیا۔ تخیل نے پھر قدروں اور نقاطِ نظر کو فرح بخش انداز سے الٹ کر رکھ دیا ہے۔

سوارِ توسنِ نازست و بر خاکم گزر دارد
ببال ای آرزو چنداں کہ دریابی رکابش را

محبوب سمند ناز پر سوار ہو کر میری قبر پر سے گزر رہا ہے۔ اے نخلِ آرزو تو بڑھ کر اس کی رکاب کو چوم کیوں نہیں لیتا۔ دیکھیے یہاں سارا ساز و سامان خیالی ہے۔ یہ ساری کارفرمائیاں تخیل کی ہیں۔ میں نے اس کی محبت میں جان دے دی، لیجیے سمندِ ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا۔ وہ ناز و انداز کے ساتھ میرے سرہانے سے گزر رہا ہے۔ انسان کے لیے کوئی وضع مظہرِ افتخار اس قدر نہیں ہوتی جتنا گھوڑے پر سوار ہونا۔ توسنِ ناز خود ایک معنی خیز استعارہ ہے۔ ناز ایک طرف حسن و شباب پر، دوسری طرف تسخیرات پر کہ ہماری محبت میں عاشق نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ فتراک میں ایک نخچیر کا اضافہ ہوا۔ لیکن محبت ہار ماننے والی نہیں۔ عاشق نے قبر میں کروٹ لی اور آرزو کو پکارا کہ اپنی پوری قامت کو پاجا، اٹھ اور محبوب کے گھوڑے کی رکاب کو چھو لے۔ دوسرا استعارہ شجر اور نمو سے ہے۔ رکاب کو چھو لینے یا پا جانے میں احترام اور اشتیاق دونوں شامل ہیں اور بالیدن میں اشتیاق اور بے تابی اور یہ آرزو کہ محبوب کے توسن کو روک لیا جائے، اسے جانے نہ دیا جائے۔

چمن طرازِ جنونیم و دشت و کوہ از ماست
بہ مُہرِ داغِ شقایق بود قبالۂ ما

جنونِ محبت کے چمن کی بنا ہم نے ڈالی ہے۔ پہاڑ اور صحرا ہماری جاگیر ہیں۔ چناں چہ ہماری ملکیت کی دستاویز پر لالہ کے داغوں سے مُہریں لگی ہوئی ہیں۔ جنون کی چمن طرازی، اور دستاویز پر مہروں کا ثبت ہونا ہمیں ایک ہی لمحہ میں عالم فطرت اور ایوان عدالت کی سیر کرا دیتا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ محبت اور جنون کی اقالیم پر ہماری حکمرانی مسلّم ہے۔ زمینِ شعر سے استعارے لالہ ساں سر اٹھا رہے ہیں۔

حشرِ مشتاقاں ہماں برصورتِ مژگاں بود
سر ز خاکِ خویشتن چوں سبزہ می روئیم ما

تمہاری دید کے مشتاق قیامت کے روز پلکوں کی شکل میں اٹھیں گے، یعنی خاک پر سبزہ کی طرح اُگیں گے۔ جسے دنیا سبزہ سمجھ رہی ہے وہ عشاق کی پلکیں ہیں۔ تمہارے عاشق زندگی بھر ٹکٹکی لگائے ہوئے تمہیں دیکھتے رہے۔ ادب نے نگاہوں کو مژگاں بنا دیا یعنی وہ پلکوں سے آگے بڑھنے نہ پائیں۔ مرنے کے بعد ان پلکوں نے جو قتیلِ حسرتِ تمنا تھیں سبزہ کی شکل اختیار کر لی اور وہ اسی طرح تمہاری جانب نگراں رہیں۔

نویدِ التفاتِ شوق دادم از بلا جاں را
کمندِ جذبۂ طوفاں شمردم موجِ طوفاں را

مصیبت آئی تو میں نے خود کو بشارت دی کہ محبوب میری طرف ملتفت ہو رہا ہے۔ موجِ طوفاں کو میں یہ سمجھا کہ طوفاں نے مجھے اپنے پاس کھینچنے کے لیے کمند پھینکی ہے۔ موجِ طوفاں پر شاعر کو کمند کا گماں ہوا۔ (ساحل پر لہروں کو آتے ہوئے جنھوں نے دیکھا ہے وہ اس استعارہ کی موزونیت کو داد دیں گے) کہ اس کی طرف کشاں کشاں چلی آ رہی ہے۔ طوفان کے مرکز یا قلب میں گرد و پیش کی اشیا کو اپنے اندر گرداب وار کھینچ لینے کی جو طاقت ہے وہی کمند آسا میری گردن کا پھندا بن گئی ہے اور مجھے اپنی جانب کھینچے جا رہی ہے۔ مجھ پر بلا آئی تو میں سمجھا کہ یہ جفا پیشہ محبوب کی نگہ التفات ہے۔

بجرمِ تابِ ضبطِ نالہ با من دادری دارد
ز شوخی می شمارد زیرِ لب دزدیدن افغاں را

محبوب میرے خلاف دادرسی چاہتا ہے۔ جرم یہ ہے کہ میں نے نالہ کو ضبط کیا۔ اس کے حضور نالہ کھینچنا میں بے ادبی سمجھتا تھا۔ وہ یہ سمجھا کہ میں نے اس کا وار خالی کر دیا۔ نالہ ہونٹوں تک آ گیا تھا میں نے اسے ضبط کیا، دبایا تو ہونٹوں کو ہلکی سی جنبش ہوئی۔ وہ یہ سمجھا کہ میں مسکرا رہا ہوں، اس کے ساتھ مذاق کر رہا ہوں۔ اس کے اقتدارِ حسن کی تحقیر کر رہا ہوں۔

تکلف برطرف لب تشنۂ بوس و کنار ستم
زراہم بازچیں دامِ نوازشہائے پنہاں را

ڈھکی چھپی عنایتیں بہت ہوگئیں، دل لبھانے کے طریقے بھی ہم نے دیکھ لیے۔ ان سے دل بھر گیا۔ ان کا وقت گزر گیا۔ ان کے جال کو میرے راستے سے ہٹا لو۔ ایسی عنایتوں سے میری تشفی ہو چکی، ان سے تو بے تابی اور بڑھ جاتی ہے۔ ان منزلوں سے تو میں پہلے ہی گزر چکا ہوں۔ اب مجھے بے تکلف بر طرفہ بوس در کنار درکار ہیں۔ وہی مجھے دو۔ ہر بات کا ایک محل ہوتا ہے۔ وہ دور ایک عرصہ ہوا گزر گیا جب تم در پردہ مجھے موہ لینے کے لیے عنایتیں کیا کرتے تھے۔ اب ہمارا معاملہ اس سے آگے بڑھ چکا ہے۔

چمن ساماں تہی دارم کہ دارد وقتِ گل چیدن
خرامی کز ادائی خویش پُر گل کردہ داماں را

میرا حشر ساماں محبوب اپنے ساتھ چمن لے کر چلتا ہے۔ جب وہ گل چینی کے لیے نکلتا ہے تو اس کا دامن تو بعد میں بھرتا ہے۔ پہلے اس کے پرستار اس کی خوش خرامی کے پھولوں سے اپنے دامن بھر لیتے ہیں۔

دیکھو تو دل فریبیٔ اندازِ نقشِ پا		موجِ خرامِ ناز بھی کیا گل کتر گئی

لیکن فارسی کا یہ شعر اردو کے مذکورہ شعر سے، باوجود اس کی بے ساختگی کے زیادہ دلکش اور متمول ہے۔

کبابِ نوبہار اندر تنورِ لالہ می سوزد
چہ فیض از میزبانِ لاابالی پیشہ مہماں را

محبوب نے عاشق کو دعوتِ گل گشت دی ہے لیکن وہ خود اتنا الڑھ اور لاپرواہ ہے کہ لالہ کے تنور (لالہ کی شکل اور اس کے دہکتے ہوئے سرخ رنگ کو دیکھ کر اس پر تنور گماں ہوتا ہے) میں نوخیز بہار کا کباب جل کر کوئلہ ہو گیا اور اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ بیچارے مہمان کے لیے اب کیا بچا۔ لالہ کی تہ میں جو سیاہ نشان ہے اسے کوئلے سے تشبیہہ دی گئی ہے۔

نہ باشد دیدہ تا حق بیں مدہ دستوریٔ اشکش
چو گوہر سنج کو بینش از گہر سنجد ترازو را

جب تک کہ آنکھ حق بیں نہ ہو جب تک کہ وہ سچ اور جھوٹ، بھلے اور برے میں امتیاز نہ کر سکتی ہو، اس وقت تک اشکوں کو اجازت نہ دو کہ وہ آنکھ میں داخل ہوں۔ تم نے دیکھا نہیں کہ موتیوں کا سوداگر موتی کو کلنٹے میں رکھنے سے پہلے اطمینان کر لیتا ہے کہ کانٹا سچا ہے۔ آنسوؤں کی اس سے زیادہ ناقدری

اور رسوائی کیا ہوگی کہ وہ ان آنکھوں میں دکھائی دیں جو حق شناس نہیں۔ جو نہ سچی ہیں، نہ سچ کو پہچان سکتی ہیں۔ ترازو اگر سچی نہیں ہے تو تول لامحالہ غلط ہوگی۔ معمولی اجناس میں کچھ ہیر پھیر ہو جائے تو گوارا کیا جا سکتا ہے لیکن آنسو جیسے بے بہا گوہر کو تولنے کے لیے ہمیشہ یہ شرط ہوگی کہ ترازو سچی ہو۔ وہ آنکھیں جو پاک نہیں اور حق شناس نہیں ہیں وہ صرف ریائی آنسوؤں اور جھوٹے موتیوں کے لیے موزوں ہیں۔ استعارہ کی بلاغت، پاکیزگی، سادگی، خوب صورتی اور تاثیر پر کوئی تبصرہ کرنا بیکار ہوگا۔

حسرتِ وصل از چہ رو، چوں بہ خیال سرخوشیم

ابر اگر بہ ایستد برلبِ جو ست کشتِ ما

ہم تو محبوب کے خیال میں سرشار ہیں، ہمیں وصالِ یار کی حسرت کیوں ہونے لگی۔ ابر اگر تھم بھی جائے رک جائے، نہ برسے تو بھی ہمارا کوئی خاص نقصان نہ ہوگا۔ ہماری کھیتی تو نہر کے کنارے ہے، اسے نمی کی کیا کمی۔ ہمارے لیے ہمارا تخیل حقیقت سے بڑھ کر ہے۔ محبت کی اپنی الگ دنیا ہے، بیرونی عناصر اور اثرات سے بے نیاز۔ محبوب کی آمد کا انتظار وہ شخص کیوں کرے جس کا تخیل محبوب سے ایک پل کے لیے بھی جدا نہیں ہوا۔ وصل کی خارجی شکلیں نو گرفتاروں، نو آموزوں کو مبارک ہوں، جو ابھی تک نہ اپنی ہستی کو مٹا سکے ہیں نہ فاصلے کو۔ ہم تو ہر لمحہ خود کو اس کے روبرو پاتے ہیں۔

گر مہر وگر کیں ہمہ از دوست قبول ست

اندیشہ جز آئینۂ تصویر نما نیست

خواہ محبت ہو، خواہ عداوت، دوست سے جو کچھ ملے ہم اسے بخوشی قبول کرتے ہیں۔ ہمارا دل ایک آئینہ ہے جو ہر تصویر کو اپنے دامن میں جگہ دیتا ہے، خواہ وہ اچھی ہو خواہ بری۔ آئینہ اس شکل کو جو اس کے سامنے آتی ہے، بلا تامل اور بے کم و کاست قبول کر لیتا ہے۔

شکستہ رنگِ تو از عشق خوش تماشائیست

بہارِ دہر بہ رنگینیٔ خزانِ تو نیست

عشق میں تمہارے رنگ کا اڑنا قابل دید ہے۔ تمہاری خزاں پر دنیا کی بہاریں قربان ہو کے عاشق وہ پری رُو اور نازک بن گیا۔ رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے۔

مضمون دونوں شعروں میں مشترک ہے لیکن اردو شعر میں فارسی شعر جیسی نہ معنویت ہے نہ زور، نہ

تہ داری۔

ستم کشِ سرِ ناموس جوئی خویشتنم
کہ تا ز جیب بر آمد بہ بندِ دستار است

میرا سر جسے حفظ آبرو کا سودا ہے مجھ پر ظلم ڈھا رہا ہے۔ گریباں کی قید سے نکلا تو دستار کے بند میں گرفتار ہو گیا۔ غم سے رہائی ملی تو نخوت نے دامن پکڑ لیا۔

بہ قامتِ من از آوارگیست پیرہنی
کہ خارِ رہگزرش پود و جادہ اش تار است

آوارہ گردی کے طفیل میری قامت پر وہ قبا راست آئی ہے جس کا تانا راستہ ہے اور بانا راستے کے کانٹے۔ حواس اور تخیل، مشاہدہ اور اندیشہ عجب حسین انداز سے دست و گریباں ہیں۔ ایسے اسالیب تک غالبؔ کے سوائے کس کو دسترس ہے؟

بیا کہ فصل بہار است و گل بہ صحن چمن
کشادہ روی تر از شاہدان بازار ست

آ بھی جا کہ فصل بہار آگئی اور صحن چمن میں گلاب شاہدانِ بالا نیشں سے بھی کچھ زیادہ ہی بے حجاب اور بے نقاب نظر آتے ہیں۔ تشبیہ کی سمت کتنے دل نشین انداز سے بدل دی ہے۔

قوی فتادہ چو نسبت ادب مجو غالبؔ
ندیدۂ کہ سوئی قبلہ پشتِ محراب است

اگر نسبت مضبوط ہو تو ادب کا اہتمام لازم نہیں۔ تم نے دیکھا نہیں کہ محراب کعبہ کی طرف پیٹھ کیے ہوئے ہے؟ مشاہدہ کے سرچشمہ سے شعری استدلال کی لہریں بہ آسانی نکالی جاتی ہیں۔ مضمون آفرینی نے غالبؔ کے اشعار میں جو بہت سے بہروپ بھرے ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے۔

"تا در آب افتادہ عکس قدِ دلجویش
چشمہ ہمچو آئینہ فارغ از روانی ہاست

جب سے اس کے قد دلکش کا عکس پانی میں پڑا ہے، چشمہ آئینہ کی طرح حیران اور ساکت رہ گیا ہے۔

مے نوش و تکیہ بر کرمِ کردگار کن

خطِ پیالہ را رقمِ چون و چند نیست

جی بھر کے پیو اور پروردگار کے کرم پر بھروسہ رکھو۔ کیسے اور کب تک کی عبارت پیالہ کی لکیر میں ہے ہی نہیں۔ پیالہ کی لکیر کو صراطِ مستقیم سمجھ کر اس پر چلو۔

شوخیٔ اندیشۂ خویشست سرتاپائی ما

تار و پودِ ہستیٔ ما پیچ و تابی بیش نیست

ہمارا سراپا، ہمارا سارا وجود منحصر ہے ہماری فکر کی شوخی اور تازگی پر۔ ہمارے جامۂ ہستی کا تانا بانا پیچ و تاب کے سوا کچھ نہیں۔ زندگی نام ہے پیچ و تاب اور حرکت کا۔ زندگی عبارت ہے گرمیٔ فکر سے۔ اہل ذوق غالب کے مصرع پر کہ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے۔ سر دھنتے چلے آئے ہیں۔ لیکن شوخیٔ اندیشہ والے شعر کے آگے وہ پھیکا اور ہلکا نظر آتا ہے۔ لاریب کہ یہ بیان کا اعجاز ہے۔

ہم بقدرِ جوششِ دریا تنومند است موج

تیغ سیراب از روانی ہائی خونِ بسمل ست

موج اتنی ہی قدآور ہوتی ہے جتنا دریا میں جوش ہوتا ہے۔ شمشیر سیراب ہوئی ہے بسمل کے خون کی روانی کے بقدر۔ موج کا شمشیر سے استعارہ بر سبیل محاکات تو ہے ہی۔ لیکن جوششِ دریا اور روانیٔ خونِ بسمل میں شاعر نے جو مماثلت ڈھونڈی وہ قضا و قدر کے اسرار کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ بسمل کے تڑپنے اور موج کے تڑپ کر ساحل کی طرف بڑھنے میں جو مشابہت ہے غالب کے مشاہدۂ تخیل آگیں سے مخفی نہیں رہی۔ نظام کائنات میں انسان اور قدرت کے مابین جو ہم آہنگی ہے وہ ظاہر بیں نظروں سے لاکھ پنہاں رہے شاعر کی خارا شگاف اور آفاق گیر نگاہ اُسے فکر کی ایک اڑان میں پا جاتی ہے۔

شادم ز دردِ دل کہ بہ مغزِ شکیب ریخت

نومیدیٔ کہ راحتِ جاوید بودہ است

میں اپنے دل کے درد سے خوش ہوں کہ اس نے صبر کے دماغ میں اس نا امیدی کو پیوست کر دیا جو میرے لیے لازوال راحت بن گئی۔ مایوسی نے مجھے امید و بیم کے مدّ و جزر اور خلفشار سے چھٹکارا

دلادیا۔

سرمایۂ ہر قطرہ کہ گم گشتہ بہ دریا

سودیست کہ مانا بزیانست وزیاں نیست

وہ بوند جو سمندر میں گم ہو گئی اس کا سرمایہ وہ نفع ہے جو بظاہر نقصان نظر آتا ہے لیکن دراصل نقصان ہے نہیں۔ بوند نے بظاہر ٹوٹے کا سودا کیا، وہ اپنا وجود سمندر میں داخل ہو کر کھو بیٹھی لیکن پہلے وہ ذراسی بوند تھی، اب بحرِ زخار بن گئی ہے۔ کھوئی اس نے ایک بوند اور پاگئی سمندر۔

در شاخ بود موجِ گل از جوشِ بہاراں

چوں بادہ بہ مینا کہ نہانست ونہاں نیست

بہار کے اثر سے موجِ گل شاخِ شجر میں رواں دواں ہے۔ مینا میں صہبا کی طرح جو پنہاں ہے۔ بھی اور نہیں بھی۔ شاعر اس جوشِ نمو، اس شوقِ اظہار کا تصور کر رہا ہے جس کی حامل بہار ہے۔ وہ بہار جو شاخِ شجر کی نسوں میں رس کی طرح رواں دواں ہے۔ جوشِ بہاراں کا عالم صہبا کا سا ہے جو مینا میں مستور ہے اور اس میں سے جھلک بھی رہی ہے۔ جوشِ نمو اور ذوقِ بہار جب اظہار پر آمادہ ہوتا ہے تو شاخ پھولوں سے لد جاتی ہے۔ بوجھل ہو جاتی ہے، کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ کلیاں چٹکنے لگتی ہیں، پیڑ لہلہانے لگتے ہیں۔ گویا قدرت اعلان کر رہی ہے کہ چمن میں بہار آگئی ہے اور اظہار کے لیے بے قرار ہے۔

عمت بہ شہر شبیخوں زناں بہ بنگہ خلق

عسس بخانۂ وشہ در حرم سرا خفت است

ایسے میں جب کہ کو تواں گھر میں اور بادشاہ حرم سرا میں محوِ خواب ہے۔ . . ترجمہ کرنا اس شعر کا خون کرنا ہے عجب کیفیت ہے اس شعر میں، تشریح و توضیح سے بالاتر۔

بہ بیں ز دور، محو قربِ شہ کہ منظر را

دریچہ بازو بہ دروازہ اژدہا خفت است

پہلے شعر کی طرح یہ بھی حظ اندوز ہونے کے لیے ہے، بغیر ترجمہ کے دخل در معقولات کے۔

خود اولیں قدحِ می بنوش و ساقی شو

کہ آخر از طرف تست اگر حجابی ہست

اٹھ کر پہلا ساغر کیوں نہیں پی لیتے، خود ساقی کیوں نہیں بن جاتے، تکلف اور تامُّل تمہاری طرف سے کیوں ہو۔ شادؔ نے بعد میں اسی طرح کی بات کی۔

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی　　جو خود بڑھ کر اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

بہارِ ہند بود برشگال یاں غالبؔ

دریں خزاں کدہ ہم موسم شرابی ہست

برسات ہندوستان کا موسم بہار ہے۔ گویا اس خزاں آباد میں بھی ایک فصل مے نوشی کی آتی ہے۔ ہندوستان میں فارسی کے پہلے اہم شاعر امیر خسروؔ کو ہندوستان سے والہانہ عقیدت تھی۔ یہی بات فارسی کے آخری اہم ہندی شاعر کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی غالبؔ ہندوستان کے موسم سے بدگماں تھے۔ اور یہاں کے باشندوں کو وہ ذوقِ شعر سے بالعموم عاری سمجھتے تھے۔

ہجوم گل بہ گلستاں ہلاکِ شوقم کرد

کہ جا نماندہ وجائے تو ہمچناں خالی ہست

چمن میں پھولوں کے ہجوم نے میرے دل میں تیری چاہت کی آگ کو اور بھڑکا دیا۔ چمن پھولوں سے پٹا پڑا ہے، تل دھرنے کی جگہ نہیں ہے، لیکن تیری جگہ ہنوز خالی ہے یعنی تیری جیسی زیب و زینت رعنائی اور جمال کا ایک پھول گلستاں میں نہیں۔ گلستاں پھولوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ تیری جگہ پھر بھی خالی ہے، عجب ماجرا ہے۔

ایمنیم از مرگ تا تیغت جراحت بار ہست

روزیٔ ناخوردۂ ما در جہاں بسیار ہست

جب تک تمہاری شمشیر جراحتیں برسا رہی ہے، اس وقت تک ہمیں موت سے کوئی خطرہ نہیں ہے ہماری روزی ہی وہ جراحتیں ہیں جو تم ہمیں پہنچا رہے ہو۔ اور ابھی جراحت پہنچانے کے نہ معلوم کتنے پہلو ہیں جو تمہاری تلوار کے پھل میں مخفی ہیں اور نکلنے کے لیے بے چین۔ یہی جراحتیں ہماری روزی ہیں۔ جب تک ہماری روزی ہے ہمیں کون مار سکتا ہے۔

. درخموشی تابشِ روئی عرق ناکش نگر
تا چہا ہنگامۂ سرگرمئ گفتار ہست

وہ خاموش ہے اور پسینہ کے موتی اس کے رخِ تابناک پر چمک رہے ہیں۔ خموشی میں جب یہ کیفیت ہے تو گرمئ گفتار کے وقت کیا عالم ہوگا، یا یوں کہیے کہ نہ معلوم دل ہی دل میں کیا کیا باتیں ہو رہی تھیں، کیا خواب دیکھے جا رہے تھے، جن کی گرمی رخ تاباں پر چھلک آئی ہے۔ جگر نے اس یا اس سے ملتی جلتی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے۔

ہم سے پوچھا اے ناصح دل گرفتگی ان کی — ہم نے چھپ کے دیکھا ہے عالمِ پرآب ان کا

کام نہ بخشیدہ ای گنہ چہ شماری
غالبِ مسکیں بہ التفات نیرزد

پروردگار، تو نے میری کوئی مراد پوری نہیں کی۔ اب میرے گناہوں کا شمار کرنے کیوں بیٹھ گیا ہے؟ غالب کے پیچھے نہ پڑ۔ اس کی فریاد نہیں سنی تو اس پر بیداد کیوں! اس کی خواہشیں جب درخورِ التفات نہیں تھیں تو اس کی خطاؤں پر باز پرس کیوں کر رہا ہے۔؟

چوں عکسِ پل بہ سیل بہ ذوقِ بلا برقص
جارا نگاہ دار وہم از خود جدا برقص

باڑھ آتی ہے تو پل کی پرچھائیں پانی میں ناچتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ مصیبت آئے تو مزے لے لے کر اسی طرح تم بھی ناچو۔ اپنی جگہ کا دھیان رکھو اور خود سے الگ ہو کر اپنے کو فراموش کرتے ہوئے ناچو، عکسِ پل کی تشبیہ کتنی قدرتی ہے۔ اور شاعر کا مشاہدہ کس قدر تخیل آگیں۔ وہ اشعار شاعر کا مشاہدہ جن میں انعکاس پذیر ہوا ہے اپنا الگ لطف رکھتے ہیں۔ فکری افق کو ارضی استعارات وسیع کر دیتے ہیں۔

ذوقیست جستجو، چہ زنی دم ز قطع راہ
رفتار گم کن و بہ صدائی درا برقص

مزا تو جستجو میں ہے، راہ طے کرنے کی بات کیوں کرتے ہو۔ رفتار کو گم کر دو اور آوازِ درا پر آگے بڑھنے کے بجائے رقص میں آجاؤ۔

در عشق انبساط بہ پایاں نمی رسد
چوں گرد باد خاک شو و در ہوا برقص

عشق میں خوشی ختم ہوتی ہی نہیں۔ بگولہ کی طرح خاک ہو جاؤ اور ہوا میں ناچو۔

از سوختن الم ز شگفتن طرب مجوی
بے ہودہ در کنارِ سموم و صبا برقص

جلنے سے تکلیف، کھلنے سے خوشی کی امید نہ رکھو۔ سموم و صبا کی بغل میں بے مقصد، بے محابا ناچتے رہو، انجام سے بے نیاز ہو کر سر دھنتے رہو، وجد کرتے رہو۔ یہ زندگی اس لائق نہیں اس کے لیے گریباں میں منہ یا ماتھے پر بل ڈال کر بیٹھو۔ زندگی کی بے ثباتی کا جواب، اور ذوقِ حیات کا تقاضا یہی ہے کہ عمر کو بے محابا رقص کرتے ہوئے پایان تک پہنچادو۔

ہنگامِ بوسہ بر لبِ جاناں خورم دریغ
در تشنگی بہ چشمۂ حیواں خورم دریغ

پیار کرتے وقت محبوب کے ہونٹوں پر رحم آجاتا ہے کہ محبت کی جارحانہ یورش میں ان کا کیا حال ہو گا۔ اپنی قلزم آشام پیاس کو دیکھتا ہوں تو آبِ حیات کے چشمہ پر ترس آتا ہے کہ یہ ذرا دیر میں خشک ہو جائے گا۔ اور پیاسے کی پیاس بجھنے نہ پائے گی۔

آں سادہ روستائی شہر محبتم
کز پیچ و خم بہ زلف پریشاں خورم دریغ

میں ایک سادہ دل، ناتراشیدہ دہقان ہوں جس کو زلفِ پریشاں کے پیچ و خم پر ترس آرہا ہے مجھ میں وہ صبر اور شائستگی کہاں کہ خود کو زلف کے سر ہونے تک روک سکوں ایک ندیدہ، ضبط نا آشنا دیہاتی التہابِ شوق میں زلف جاناں کے پیچ و خم کے ساتھ نہ جانے کیا کر ڈالے۔ مجھے ان پر رحم آرہا ہے۔

رفتار گرم و تیشۂ تیزم سپردہ اند
از خویشتن بکوہ و بیاباں خورم دریغ

مجھے تیشۂ تیز اور رفتارِ گرم عنایت کی گئی ہے۔ ڈر رہا ہوں کہ میرے ہاتھوں کوہ و بیاباں کا کیا

حشر ہوگا۔ نہ پہاڑ بچے گا، نہ صحرا بے عبور رہے گا۔ دنیا جو کچھ محسوس کرتی ہے، سوچتی ہے، باور کرتی ہے میری فکر کا تیشہ اسے گراتے ہوتے، اور میرا قدم اسے روندتے ہوئے آگے بڑھ جائے گا۔

دل ز آنِ تُست ہدیۂ تن کن کنار و بوس
چنداز تو بر نوازشِ پنہاں خورم دریغ

میرا دل تو خود تمہاری ملکیت ہے، اس کو اپنی محبت سے بھر دیا تو کیا۔ ہاں جسم ابھی تک میرا ہے مجھ پر عنایت کرنی ہے تو میرے جسم کو جو ہنوز تم سے الگ ہے نواز دو، بوس و کنار سے سیراب کر دو۔ میں کب تک اس خلش سے بے چین رہوں کہ مجھ پر صرف در پردہ، اشارت و کنایت میں نوازشیں ہو رہی ہیں۔ ان عنایتوں کا روئے سخن تو دل سے ہے جو تمہارا ہے، مجھے کیا ملا۔

آمدی دیر بہ پرسش چہ بشارت آرم
من و عمری کہ بہ اندوہ وفا گشت تلف
رنگ و بو بود ترا، برگ و نوا بود مرا
رنگ و بو گشت کہن، برگ و نوا گشت تلف
گیرم امروز دہی کام دل، آں حسن کجا
اجرِ ناکامیِ سی سالۂ ما گشت تلف

قارئین آج بھی اس غزل میں جس کے تین شعر نقل کیے گئے ہیں، درد کی کراہ سن سکتے ہیں شاعر کے دل پر حسرت نشتر لگا رہی ہے۔ اسے گوہر مراد جس کی آرزو میں اس نے جوانی ضائع کر دی کب حاصل ہوا، جب نہ گوہر میں وہ تابانی رہی، نہ گوہر پرست کی آنکھوں میں وہ روشنی۔ تیس سال کے مسلسل انتظار کے بعد محبوب ہاتھ آیا تو اس وقت جب نہ ان ہاتھوں میں عنفوانِ محبت کا جوش اور ولولہ اور بے تابی باقی رہ گئی تھی، نہ خود محبوب میں وہ بانکپن، وہ شادابی، وہ حسن و شباب۔

تو نے میری پرسش کے لیے آنے میں دیر کر دی۔ اب میں ہوں اور عمر جو غم محبت میں ضائع ہو گئی۔ جیتے جی آتا تو میں بھی قربان ہو جاتا اور عمر کو بھی ہدیہ کر دیتا۔ اب کچھ باقی نہیں رہا جسے تجھ پر نچھاور کر دوں۔

تیرے پاس رنگ و بو تھی، میرے پاس ساز و ساماں۔ رنگ و بو کہنہ ہو گئے۔ ان میں تازگی

اور شادابی باقی نہیں رہی، اور میرے پاس جو سازو سامان، جو ذوق و شوق، جو دم خم تھا، سب ختم ہوگیا فرض کر لیجیے کہ تم آج میرے دل کی مراد دے دینے کو تیار ہوجاؤ گے، تو اب وہ حسن کہاں، ہماری تیس سال کی ناکامی کی جو تلافی ہونا تھی وہی برباد ہوگئی۔

کاش پائی فلک از سیر بماندی غالبؔ
روزگاری کہ تلف گشت چراگشت تلف

کاش آسمان کے پاؤں گردش سے رک گئے ہوتے۔ وہ زمانہ جو برباد ہوا آخر کیوں برباد ہوا؟

بمن گرائی و وفا جو کہ سادہ برہمنم
بہ سنگ ہر کہ دہد دل بغمزہ چوں نہ دہد

میری طرف مائل ہوجاؤ اور مجھ سے وفاداری کا تقاضا کر کے دیکھو۔ میں ایک سادہ دل برہمن ہوں۔ جو شخص پتھر کو دل دے سکتا ہے اسے ایک جیتے جاگتے محبوب کے ناز و ادا پر فریفتہ ہونے سے کون روک سکتا ہے۔

فراغت بر نتابد ہمتِ مشکل پسندِ من
ز دشواری بجاں می افتدم کاری کہ آساں شد

میری مشکل پسند طبیعت آسانی برداشت نہیں کر سکتی۔ جو کام آسان ہوگیا وہ میرے لیے جی کا جنجال بن جاتا ہے۔ بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا۔

زما گرمست ایں ہنگامہ بنگر شور ہستی را
قیامت می دمد از پردۂ خاکی کہ انساں شد

وجود کی چہل پہل کو دیکھو، یہ ساری گرمیٔ ہنگامہ ہماری وجہ سے ہے۔ قیامت اس خاک کے پردہ سے سر اٹھاتی ہے جس کا نام انسان ہے۔

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

سوخت آتش کدہ ز آتش نفسم بخشیدند
ریخت بت خانہ ز ناقوس فغانم دادند

گہر از رایتِ شاہانِ عجم برچیدند
بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند

گوہر از تاج گسستند و بہ دانش بستند
ہرچہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند

غالب کو یہ خلش ستاتی رہی کہ وہ اس زمانہ میں پیدا نہیں ہوئے جس میں ہونا چاہیے تھا انھیں یہ احساس تھا کہ وہ اپنے زمانہ سے آگے ہیں، زمانۂ حال ان کی وسعتِ نظر اور بیکرانیٔ افق کے لیے تنگ تھا، ان کی خار اشگاف نگاہ حال کی دیواروں کو چیرتے ہوئے آگے نکل جاتی تھی۔ شاعر محسوس کرتا ہے کہ اس کا مزاج اور زاویۂ نگاہ آنے والے زمانہ سے ہم آہنگ اور مستقبل کے ساتھ ہم قدم ہے۔

کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

میرے مقدر کے ستارہ کو عروجِ اعتراف عدم میں حاصل ہوا ہے۔ دنیا میں میری شاعری کی قدر میرے بعد ہوگی۔ لیکن وہ کائنات گیر اور بے تاب روح مستقبل میں بھی اسیر نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ اپنی فکر کی مستقبل شناسی پر ناز کرتا ہے۔ زمانہ نے جو کروٹ لی ہے، اس کے امکانات اس کی دوربین فکر کو ازبر ہیں لیکن وہ کسی قیمت پر اپنے ورثہ سے جدا ہونے کے لیے تیار نہیں۔ یہ ورثہ مشتمل ہے۔ تہذیب و تمدن اور علم و دانش پر جنھوں نے ماضی میں اسلاف کے زمانہ میں فروغ پایا ہے۔ مذکورہ بالا غزل کہہ رہی ہے کہ شاعر وقت کے اس موڑ پر آیا جب کواکب اپنی بساط لپیٹ رہے تھے۔ اور مہر عالمتاب کی آمد آمد تھی۔ اسے ہم دورِ جدید کے آغاز سے منسوب کر سکتے ہیں۔ وہ ماضی اور مستقبل کے درمیان اس انداز سے کھڑا تھا کہ ماضی کا ثقافتی اور شعری سرمایہ لہو کے ساتھ اس کے رگ و پے میں جاری و ساری تھا اور ایک نئے عہد کے طلوع کا اعلان خورشید کی شعاعیں کر رہی تھیں۔ شاعر جانتا ہے کہ وہ شعری وراثت کا امین اور غالباً آخری ترجمان ہے۔ اسے اپنی شعری عظمت اور تاریخی اہمیت اور رُخ بہ مستقبل ہونے پر ناز ہے۔

ان اندھیری راتوں میں مجھے صبح کی بشارت دی گئی۔ خورشید کی پذیرائی کے لیے شمعیں بجھا دی گئیں۔ یہاں ایک زاویہ خودستائی کا بھی ہے۔ جو کام غالب سدا اعتماد کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔

ایران کا آتش کدہ جل کر راکھ کا ڈھیر ہوگیا تب جا کر تلافیٔ مافات کے طور پر میری سانسوں کو شعلہ بار کیا گیا۔ بت خانہ مٹی کا ڈھیر ہوگیا تو ناقوس کی لاج رکھنے کے لیے مجھے مامور کیا۔ ایران کے شہنشاہوں کے پرچم سے موتی چھڑائے گئے اور ان کے بدلے میں مجھے وہ قلم عنایت ہوا جو خزانہ بکھیرتا ہوا چلتا ہے گویا ایران کو معاوضہ دے دیا گیا۔ ان زر و جواہر کے نقصان کا جنھیں شاہی پرچموں سے چھڑا لیا گیا تھا تاج سے موتی توڑ کر علم کے دامن میں ٹانک دئے گئے۔ جو کچھ برملا چھین لیا گیا تھا مجھے چھپ کر بخش دیا

گیا۔ شاہی کا دور ختم ہوا، علم، سائنس، ٹکنولوجی کی حکومت شروع ہوگئی۔ پہلے ایران کے لیے مایۂ امتیاز شہنشاہیت تھی اب اس کے لیے سرچشمۂ افتخار علم ودانش کا وہ سرمایہ ہے جو غالب کے اشعار پر مشتمل ہے۔ اپنی ستایش غالب اس انداز سے نہیں کرتے جس انداز سے وہ ممدحین کی شان میں قصائد لکھتے تھے۔ یعنی ایک صنفِ شعر کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے۔ یہ رسمی تعلی نہ تھی۔ اپنی عظمت، اپنے نابغۂ روزگار ہونے کا احساس ان سے وہ اشعار کہلواتا تھا، جنھیں خودستائی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ غالب کے یہاں خودستائی اور خودشناسی کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ شاعر کہہ رہا ہے کہ عجم کے تمدن اور تہذیبی ورثہ کا نقطۂ عروج دیکھنا چاہتے ہو تو اس کی شاعری خصوصاً غالب کے کلام کا مطالعہ کرو۔

قیاس کہتا ہے کہ مذکورہ بالا غزل، حافظ کی اس غزل کے زیر اثر لکھی گئی جس کا مطلع ہے۔

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند

واندراں ظلمتِ شب آب حیاتم دادند

غالب نے صرف قافیہ بدلا ہے، وہ طریقہ کہ ہم زمین اشعار کا موازنہ کیا جائے۔ اب متروک ہوچلا ہے، اور جب رائج تھا اس وقت بھی تخمینِ شعرا اور سخنوروں کے مرتبہ کی تعیین کے لیے معاون نہ تھا حافظ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے، ویسے غالب کی غزل بھی خوب ہے۔

مالذتِ دیدار زپیغام گرفتیم

مشتاق تو دیدن زشنیدن نشناسد

تمہارا پیغام کیا آیا، تم خود روبرو آگئے۔ تمہارا عاشق تمہاری محبت سے اس قدر سرشار ہے، تمہاری ذات میں اس قدر محو ہے کہ اس کے لیے جہاں تک تمہارا تعلق ہے دیکھنے اور سننے میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ محبت جب فرطِ اشتیاق سے محبوب کا طواف کرتی ہے، اس کی بلائیں لیتی ہے، جب حواس اور خیال شیر وشکر ہوجاتے ہیں تو دیکھنے اور سننے، سوچنے اور محسوس کرنے چھونے اور سونگھنے قریب آنے یا دور ہونے میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

غالب ظلمت پردہ کشائی دمِ عیسٰی ست

چوں بر روشِ طرزِ خدا داد بہ جنبد

غالب تیر اخانۂ معجز نگار دمِ عیسیٰ کی پردہ کشائی کرتا ہے، وہ چلتا ہے تو فرسودہ اور مرجھائے ہوئے مضامین لہلہانے لگتے ہیں، تیرے اشعار جاں بخشی کے لیے ممتاز ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ اسی وقت ہوتا ہے جب تیر اقلم اس انداز سے چلتا ہے جو خدا نے اسے ودیعت کیا ہے۔ یہاں شاعر آمد اور آورد کے درمیان فرق کر رہا ہے۔ یہ شاعر کے ذوقِ نقد کا ثبوت ہے۔ یہاں یہ مان لینا بعید از کار نہ ہوگا کہ غالب خود اپنے اشعار کو دو خانوں میں رکھتے تھے۔ ایک وہ اشعار جو انھوں نے اپنے مزاج کے مطابق جذبہ اور احساس کی رو میں، ایک حد تک برجستہ تاہم پر پیچ و متمول طرز خداداد میں صوت و آہنگ کے ساتھ کہے تھے۔ دوسرے وہ اشعار جن پر آورد اور کاوش کا گمان ہوتا ہے۔ جن کی تشکیل میں ردیف و قافیہ شریکِ غالب رہے تھے۔

نازم بہ امتیاز کہ بگزشتن از گناہ
بادیگراں زعفو و بما از غرور بود

میں اس شانِ امتیاز پر نازاں ہوں کہ گناہوں سے اس نے جو درگزر کی وہ دوسروں کے ساتھ بطورِ معافی اور ہمارے ساتھ بوجہِ ناز و انداز۔ قارئین شاید اس بات کی طرف دھیان دیں کہ غالب نے محبت کے مضامین میں نئی نئی راہیں نکالی ہیں۔ ایسا کرنے میں ان کے رفیق دو تھے، جذبہ یا تجربہ اور تخیل یا باریک بینی۔ خود محبت کے مضمون کا استعمال بطور بادہ و ساغر کیا گیا ہے۔ برتاؤ یا عمل بظاہر ایک سا ہو تو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ عمل کرنے والے کی نیت سب کے ساتھ ایک ہی ہے۔ محرک بہت مختلف ہو سکتے ہیں لہٰذا دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اس جذبہ یا نیت کی کھوج لگائے جو کسی فعل یا عمل کے پیچھے ہے۔ ہر بڑے شاعر کے یہاں، غالب کے یہاں خاص طور پر، محبت کے آئینہ میں زندگی کے ہزاروں پہلوؤں کی تصویریں اتاری گئی ہیں۔

خیال یار در آغوشم آنچناں بفشرد
کہ شرم امشبم از شکوہ ہائی دوش آمد

محبوب کے خیال نے مجھے اپنی آغوش میں اس طرح بھینچ لیا کہ مجھے آج رات ان شکایتوں سے شرم آئی جو میں نے کل کی تھیں۔

از بس بہ شوق روی تو مستست نوبہار
بوئی می آید از دہنِ غنچہ بو کنند

تمہارے رخ کے اشتیاق میں نو بہار اس قدر سرشار ہو گئی ہے کہ اگر کلی کے منہ کو سونگھیں تو اس سے شراب کی بو آئے۔

ہائی پرکاری ساقی کہ بہ اربابِ نظر
می بہ اندازہ و پیمانہ بہ انداز دہد

ساقی کی ہوشیاری دیکھو کہ وہ اہل نظر کو شراب اندازہ لگا کر یعنی بقدرِ ظرف دیتا ہے اور ان کی طرف پیمانہ بڑے ناز و انداز سے بڑھاتا ہے۔

پردہ داراں بہ نی و ساز فشارش دادند
نالہ می خواست، شرحِ ستمش ساز دہد

نالہ چاہتا تھا کہ محبوب نے فرطِ ناز میں جو ستم ڈھائے ہیں ان کا ذکر کرے۔ لیکن ان لوگوں نے جو محبت کا پردہ اور بھرم رکھنا چاہتے تھے انھوں نے نالہ کو نے اور ساز کے شکنجہ میں دے دیا۔ نالہ نغمے میں بدل گیا۔ غم ہی دراصل سرچشمہ ہے شاعری اور موسیقی کا۔

چہ خیزد از سخنی کز درونِ جاں نہ بود
بریدہ باد زبانی کہ خونچکاں نہ بود

ایسے کلام سے کیا حاصل جو دل کی گہرائیوں سے نہ نکلا ہو۔ وہ زباں جس سے دل کا لہو نہ ٹپکے کٹ جائے تو اچھا۔ وہ سخن جو دل سے نہیں نکلتا بے تاثیر رہتا ہے۔ ایسی زباں جو درد کی ترجمان نہ ہو، جس سے ہمدردی کے کلمات نہ نکلیں ذہن کے لیے باعث ننگ ہے۔

پئ عتاب ہما نا بہانہ می طلبد
شکایتی کہ زما نیست ہم بما دارد

عتاب کے لیے وہ شاید بہانہ ڈھونڈ رہا ہے، جو شکایت کہ ہم سے نہیں وہ بھی ہم سے منسوب کی جا رہی ہے۔ اس شعر کو محبت کے سیاق تک محدود کرنا اس کے ساتھ ظلم ہوگا۔ ابتدائے آفرینش سے اب تک اہلِ ستم جفا کے جواز کے لیے طرح طرح کے بہانے تراشتے اور الزام لگاتے رہے ہیں۔ یہ شعر بھی وسیع الاطلاق ہے۔

غالب کی مشکل پسندی شعر گوئی تک محدود نہیں ہے۔ زندگی میں وہ خطر طلبی کی وکالت کرتی ہے۔

چہ ذوقِ رہروی آں را کہ خارخاری نیست
مرو بہ کعبہ اگر راہ ایمنی دارد

اگر راہ میں کانٹے نہیں تو راہ چلنے میں مزا ہی کیا۔ اگر کعبہ کی راہ پُرامن ہو تو وہاں کی بھی نیت نہ کرو۔

بیروں میا زخانہ بہ ہنگام نیمروز
رشک آیدم کہ سایہ بہ پابوس می رسد

جب آفتاب نصف النہار پر ہو تو گھر سے باہر نہ آؤ۔ میں دیکھوں گا کہ پرچھائیں تمہارے پاؤں چوم رہی ہے تو رشک سے بے چین ہو جاؤں گا۔ مشاہدہ نے غالب کو بتایا تھا کہ دن کے بارہ بجے پرچھائیں چھوٹی ہو کر پیروں کے نیچے آجاتی ہے اس کی فارسی غزل میں مشاہدہ سے شعری استفادہ کے شواہد بار بار ملتے رہیں۔

چہ جویم مراد از شنگرفی کہ ادرا
نشستن زشنگی برفتار ماند

اس نادرہ کار حسینہ سے گوہر مراد کیوں کر حاصل ہو جس کا بانکپن کے ساتھ بیٹھنے کا انداز چلنے سے ملتا ہے۔ فردوسی نے سہراب کی شخصیت کی شبیہ ایک چھوٹے سے مصرع میں اتاری تھی: "تو گوئی ہمہ تحت سہراب بود"۔ غالب نے محبوب کے ساتھ یہی کر دکھایا۔ نشستن زشنگی برفتار ماند۔ غرورِ حسن، بے صبری، بے تابی، التہاب، سیمابی کیفیت، ناز و غمزہ کی لہریں، پہلو بدلنے کی ادائیں، غلبہ کی خواہش، تسخیر کی تمنا، حیا و شوخی کی آویزش، بوقلموں جذبات کی داخلی کشمکش، بیٹھنے کا یہ انداز گویا بحرِ زخار موجیں مار رہا ہے۔

بامن میاویزای پدر فرزندِ آدم رانگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

والدِ محترم! مجھ سے میری روش پر نہ الجھئے! آذر کے بیٹے حضرت، ابراہیم کو دیکھیے۔ جس شخص کو بھی خالق نے اہلِ نظر بنایا، اسے آبا و اجداد کا دین کبھی نہ بھایا۔ اس شعر میں غالب نے اپنی آزادیٔ فکر کی وثوق کے ساتھ وضاحت کی ہے۔

شاہد ما ہمنشیں آرائی ور نگین محفل است

لاجرم در بند خویشت آنکہ در بندش بود

ہمارا معشوق اپنے ہم نشینوں کو بھی سجا کر رکھتا ہے، اس کی محفل آرائی کے چرچے ہیں جو شخص اس کی طلب میں ہے اور اس پر جان دیتا ہے اسے پہلے اپنی فکر کرنی ہوگی، خود کو بھی اسی کی طرح سوارنا ہوگا ورنہ اس کی محفل میں بار کیسے پائے گا۔ وسعت اطلاق کی یہ ایک اور مثال ہے۔ جن انسان کو آپ خوش رکھنا چاہتے ہیں خود کو لا محالہ اور بالقصد اس کی وضع پر ڈھالنے کی کوشش کریں گے۔

یہاں شاعر تھوڑی دیر کے لیے تازگی بخش طور پر، اس دیرینہ اور فرسودہ اسلوبِ فکر، اس شعری روایت سے انحراف کر رہا ہے جو عاشق کو خستہ حال اور گریباں دریدہ دکھاتی چلی آئی ہے۔ پھر یہ ایک نفسیاتی حقیقت بھی ہے کہ عاشق، اگر وہ جنوں سے از کار رفتہ نہ ہو گیا ہو۔ محبوب کے سامنے بن سنور کر اپنی بہترین شکل میں جاتا ہے شیکسپیر کے بقول دس دس بار شیو کر کے (حجامت بنا کر)

با خرد گفتم نشانِ اہلِ معنی باز گوئی

گفت گفتاری کہ با کردار پیوندش بود

میں نے عقل سے پوچھا کہ اہلِ دل کی پہچان کیا ہے۔ اس نے کہا وہ اقوال جو افعال کے ساتھ جڑے ہوئے ہوں۔

بدیں قدر کہ لبی تر کنی و من بمکم

تُرا ز بادہ نوشیں چہ مایہ کم گردد

تمہاری صہبا میں کیا کمی ہوگی اگر تم اپنے ہونٹ تر کر لو اور مجھے انھیں چوسنے کا موقع دیدو۔

غالب نے ''مکیدن'' یعنی چوسنے کا تذکرہ فارسی غزلوں میں کئی بار کیا ہے۔ لمس آمادگی کا یہ مظاہرہ لطافت تصور، تہذیبِ محبت اور ذوقِ سلیم پہ بار گزرتا ہے۔ اردو غزلوں میں بالعموم احتیاط برتی ہے۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ سہوی عریاں نگاری قافیہ کی لائی ہوئی ہے۔ شاید یہ قیاس بے محل نہ ہو کہ اس زمانہ میں بھی جب فارسی شعر گوئی کا چلن باقی تھا۔ فارسی سے اخفائے حال کا فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ اردو میں ایسی باتیں کھل کر کہتے تو فوراً گرفت کی جاتی۔ سماج اور معاصرین انگلیاں اٹھاتے لیکن غالب کی فارسی غزل میں بھی لمسیات کا یہ سلسلہ آگے نہیں بڑھنے پایا، چند مثالوں پر ختم

ہوگیا۔ البتہ کبھی کبھی محبوب سے عامیانہ شوخیاں سرزد ہو گئی ہوں تو قارئین احتساب کرنے کیوں بیٹھ جائیں۔ سنیے۔

اگر نہ مایلِ بوسِ لب خودست چرا
بہ لب چو تشنہ، دمادم زباں بگرداند

معشوق اگر اپنے ہونٹوں کا بوسہ لینا نہیں چاہتا تو کیوں پیاسے کی طرح اپنے ہونٹوں پر متواتر زبان پھیرتا رہتا ہے۔ عالمی تفریح گاہوں میں یہ ادائے بے حجابی، یہ اشارۂ حسنِ طلب، شاہدانِ رہ نوردسے سرزد ہوتا رہتا ہے۔

تو بہ یک قطرۂ خوں ترکِ وضو گیری و ما
سیلِ خوں از مژہ رانیم و طہارت نرود

خون کی بوند کا ایک دھبہ لگ جائے تو تمہارا وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ہمارا یہ حال ہے کہ پلکوں سے خون کا سیلاب بہہ جائے پھر بھی طہارت باقی رہتی ہے۔ غالبؔ کا یہ مخصوص انداز ہے۔ فروتر کو برتر ثابت کرنے کا۔

اس شوخی سے قطع نظر کیجیے جو سطح کو چھو رہی ہے، تو شریعت اور طریقت، ظاہر اور باطن کا موازنہ ذہن کی گرفت میں آجائے گا:

مرا گوئی کہ تقویٰ ورز، قربانت شوم خود را
بیارائی و بخلوت خانۂ تقویٰ شعاراں بر

مجھ سے تم کہتے رہتے ہو کہ حد کے اندر رہو، اپنی عناں محبت کے ہاتھ میں نہ دو، تقویٰ اختیار کرو۔ میری جان تم پر قربان، ایک بار اہلِ تقویٰ کو بھی آزما کر دیکھ لو۔ ذرا بن سنور کر ان کی محفل میں چلے جاؤ۔ شاعر یہ بے ضرر سی فرمائش کر کے خاموش ہو جاتا ہے، لیکن قارئین کی چشمِ تصور کے سامنے وہ سماں آجاتا ہے جب زلیخا اپنی سہیلیوں کے ساتھ محفل میں بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ یوسف کے ساتھ زلیخا کی دلبستگی اور فریفتگی پر نکتہ چیں اور چیں بہ جبیں تھیں۔ اس وقت یوسف کا اس محفل میں گزر ہوتا ہے۔

نازم آئینِ کرم را کہ بہ سرگرمیٔ خویش
دشت را شمع و چراغ شبِ تار است بہار

در عنت غازۂ رخسارۂ ہوشست جنوں
در رہت شانۂ گیسوئے غبار است بہار

ہم حریفانِ ترا طرفِ بساطت چمن | ہم شہیدانِ ترا شمع مزارست بہار
جعد مشکینِ ترا غالیہ سالیت نسیم | رُخِ رنگین ترا غازہ نگارست بہار

بیان کا زور، تراکیب کی طلسم بندی، آہنگ کی نرمی، لطافت، شگفتگی۔ وہ سماں بندھ گیا ہے جو قادر الکلامی کی معراج ہے۔ اِستعاروں کا ہجوم آنکھوں کو خیرہ کر رہا ہے۔

تمہاری محبت نے جنوں کی جو شکل اختیار کی ہے وہ ہونٹوں کے رخسار کے لیے گل گونہ بن گئی ہے تمہاری راہ میں جو غبار اٹھ رہا ہے، بہار اس پر مامور ہے کہ اس غبار کی زلفوں میں شانہ کرے انھیں سنوارے۔ نسیم تمہارے مشکبو گیسوؤں کی عطر فروش بادِ نسیم ہے۔ ان کی خوشبو اس نے ایک جہاں میں پھیلا دی ہے تمہارے رخ زیبا کو بہار نے گلگونہ سے فروزاں کر دیا ہے۔ یہ غزل شالیمار کو آئینہ دکھائی ہے۔ پھولوں کے تختے حسن ترتیب کے ساتھ آراستہ ہیں۔ بہار نے اس میں ایک طوفانِ رنگ و بو برپا کر دیا ہے۔

سراسر مرصع ہونے کے ساتھ ساتھ غزل شگفتہ، شاداب اور پُر بہار ہے۔

بیا و جوشِ تمنائے دیدنم بنگر | چو اشک از سرِ مژگاں چکیدنم بنگر
زمن بجرمِ تپیدن کنارہ می کردی | بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر
شنیدہ ام کہ نہ بینی و نا امید نیم | ندیدنِ تو شنیدم شنیدنم بنگر
دمید دانہ و بالید و آشیاں گہ شد | در انتظار ہما دام چیدنم بنگر
نیاز مندیِ حسرت کشاں نمی دانی | نگاہ من شو و زدیدہ دیدنم بنگر
بہار من شو و گُل گل شگفتنم دریاب | بخلوتم برو ساغر کشیدنم بنگر
بدادِ من نرسیدی زدرد جاں دادم | بدادِ طرزِ تغافل رسیدنم بنگر
تواضعی نکنم بی تواضعی غالبؔ | بہ سایۂ خم تیغش خمیدنم بنگر

آؤ اور دیکھو کہ تمھیں دیکھنے کی تمنا کیا غضب ڈھا رہی ہے۔ اشتیاق دید میں میرا سارا وجود پلکوں پر آگیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میں آنسوؤں کی طرح پلکوں سے ٹپک جاؤں گا۔ اس جرم پر کہ میں بے تابی میں تڑپتا رہتا ہوں تم نے مجھ سے کنارہ کر لیا تھا اب میری قبر پر آؤ اور دیکھو کہ میں کتنے سکون کے ساتھ محوِ خواب ہوں۔

کیا عجب کہ فانی کو اپنی غزل "دیکھتے جاؤ" کے لیے روشنی یہیں سے ملی ہو۔

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

"دیکھو" یا "دیکھ لو" کو فانی نے "دیکھتے جاؤ" کر دیا ہے۔ فانی کی اتنی اثر انگیز غزل غالب کی اس غزل کے سامنے پھیکی اور بے تاثیر نظر آتی ہے۔

میں نے سنا ہے کہ تم میری طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھو گے، مگر میں نا امید نہیں ہوں۔ میں نے تمہارا نہ دیکھنا سن لیا۔ اب تم میرا سننا (اور یقین نہ کرنا) دیکھو۔

تمھیں اندازہ ہی نہیں کہ جنھیں دید کی حسرت ہے وہ تمھیں کتنی نیازمندی، کیسے اشتیاق کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ ذرا دیر کے لیے میری نگاہ بن جاؤ اور دیکھو کہ ان آنکھوں سے میں کس طرح (کس محبت اور محویت کے ساتھ) دیکھتا ہوں۔

میری بہار بن جاؤ دیکھو کہ میرے دل میں کس طرح بہار آئی ہے۔

دیکھو تو میں کس طرح پھول پھول کھلتا ہوں۔ میرا سارا وجود کلی کی طرح آہستہ آہستہ شگفتہ ہوتا ہے۔

مجھے خلوت میں لے جاؤ اور دیکھو کہ میں جرعہ جرعہ میکشی کیسے کرتا ہوں۔

تم میری داد کو نہیں پہونچے، میں نے مایوس ہو کر تکلیف میں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ میں نے تو جان دے کر تمہارے تغافل کو داد دی ہے۔

جب تک میرے ساتھ تواضع نہیں کی جاتی، میں بھی تواضع نہیں کرتا۔ اس کی تلوار نے خم ہو کر میری پذیرائی کی تو میں بھی اس کے سایہ میں جھک گیا۔ یہ غالب ہی کا ظرف تھا کہ نیازمندی کے دوران بھی آزادگی و خود بینی کو نہیں چھوڑا۔

سخن سادہ دلم را نفریبد غالب
نکتۂ چند ز پیچیدہ بیانی بمن آر

غالب کا دل سیدھی سادی بات کے فریب میں نہیں آتا۔ پیچ در پیچ، تہ بہ تہ بیان سے کچھ نکات اس کی ضیافت طبع کے لیے نکال کر لاؤ۔ فارسی دیوان میں غالب نے اپنے نظریۂ شاعری کی بار بار وضاحت کی ہے۔

یارب ایں مایہ وجود از عدم آوردۂ تُست
بوسۂ چند ہم از گنجِ دہانی بمن آر

یارب یہ تمام وجود، یہ ساری کائنات تو نے عدم سے پیدا کی ہے۔ کیا اس عدم سے جس کا نام دہن ہے۔ تو میرے لیے چند بوسے بھی نہیں لا سکتا؟ کمر اور دہن کے روایتی مضمون کا اتنا شوخ و دلکش ارتفاع اس سے پہلے کسی کے تصور میں بھی نہیں آیا تھا۔

ایسی غزلیں سامنے آجائیں جو بہ یک وقت معیار اور تسلسل کے تقاضوں کو پورا کرتی ہوں تو مضمون نگار کی نگاہ انتخاب معطل ہو جاتی ہے۔ سنیے۔

شدم سپاس گزار خود از شکایت شوق | زہی زمن بدل بے غمش سرایت شوق

بہ بزم بادہ گریباں کشود نتش نگرید | خوشا بہانۂ مستی خوشا رعایت شوق

ہر آں غزل کہ مرا خود بخاطر است ہنوز | بہ بانگ چنگ ادا می کند زغایت شوق

دخاں ز آتش یاقوت گر دمد عجب است | عجب تر است ازیں ابر لبش حکایت شوق

متاع کاسد اہل ہوس نہم بر زن | کنوں کہ خود شدہ شحنۂ ولایت شوق

مکن بہ ورزش ایں شغل چند می ترسم | کہ چوں رسی بہ خط خطوۂ نہایت شوق

تراز پرسش احباب بی نیاز کند | غرور یک دلی و نازش حمایت شوق

سر تو بر تراز حرف غالبؔ است بدہر | خجستہ باد بہ فرق تو ظل رایت شوق

ساری غزل اس مضمون کے محور پر گردش کر رہی ہے کہ محبوب کو خود کسی سے عشق ہو گیا ہے۔ شاعر خوش ہے کہ محبوب اب محبت کی قدر کرنا سیکھ جائے گا۔ جو کچھ شاعر پر گزری تھی اب اس کے محبوب پر بیت رہی ہے۔ محبت کو وہ شراب ناب میں ڈبو رہا ہے۔ سرشاری کے عالم میں اس کا گریبان کھل جاتا ہے۔ یہ سماں شاعر کے لیے جنت نگاہ ہے۔ جو عاشقانہ غزلیں محبوب نے شاعر سے سنی تھیں اب وہ انھیں خود گا رہا ہے کہ دل کی بھڑاس کسی طرح تو نکلے۔ غالبؔ کو اس کی خوشی بھی ہے کہ اب محبوب اہل نظر اور بوالہوسوں میں امتیاز کرنا سیکھ جائے گا۔ یہ امید بھی بندھ گئی ہے کہ وہ اپنے معشوق کی تلاش میں شب کو نکلے تو راستہ بھول کر اپنے عاشق کے ہاں پہونچ جائے۔ لیکن پھر اچانک یہ اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ سودائے عشق اگر بڑھ گیا تو وہ ہمیں بالکل ہی بھول جائے گا۔

ہمت ز دم شیشۂ فرہاد طلب کن | مجنوں مشو و مردن دشوار میاموز

از ذوق میان تو شدن سر بہ سر آغوش | بی جھرفن ماست بزنار میاموز

بلبل زخراشِ رخِ گلبرگ بہ اندیش	شغلِ نگہ شوق بہ منقار میاموز

مرنا ہے تو مجنوں کی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان مت دو۔ فرہاد کی مانند تیشہ کی ایک ضرب سے کام تمام کرلو۔

اے بے مہر اس دلربا کمر کے لیے سراپا آغوش بن جانے کا گر تو ہمیں آتا ہے تو زنار کو اس جسارت کی اجازت کیوں دے رہا ہے؟

اے بلبل تو گلاب کی پنکھڑیوں پر چونچ کیوں مار رہی ہے، وہ چھلنی ہو جائیں گی۔ ہماری نگاہ شوق کا مشغلہ اپنی چونچ کو کیوں سکھا رہی ہے؟

در گریہ از بس نازکی رخ ماندہ بر خاکش نگر	آں سینہ سودن از تپش بر خاک نمناکش نگر
برقی کہ جانہا سوختی دل از جفا سردش بہ بیں	شوخی کہ خونہا ریختی دست از حنا پاکش نگر
آں سینہ کز چشم جہاں مانند جاں بودی نہاں	اینک بہ پیراہن عیاں از رونقِ چاکش نگر
با خوبیِ چشم و دلش با گرمیِ آب و گلش	بہ چشم گہر بارش بہ بیں، آہ شرر ناکش نگر

یہ غزل بھی مسلسل ہے، ایک حسینہ کے خدوخال آنکھوں کے سامنے آتے ہیں جس نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے اور جو شباب، مال اور جمال سے ایک ساتھ محروم ہو گئی۔

وہ اتنی نازک ہے کہ روتے روتے اس کا چہرہ زمین سے لگ گیا ہے۔ اس مٹی پر جو اس کے آنسوؤں سے تر ہو گئی ہے وہ بے تابی میں اپنی چھاتی رگڑ رہی ہے۔ وہ ایک بجلی تھی جو دلوں پر گرتی اور انھیں جلا ڈالتی تھی۔ وہ ٹھنڈی ہو گئی ہے جفا سے اُسے ٹھنڈا ہوتے ہوئے دیکھو۔ شوخ و شنگ محبوبہ جو رات دن خونریزی کرتی تھی، اس کے ہاتھ حنا کو ترس رہے ہیں۔ وہ جو تنہائی میں خدا سے بھی التجا کرنے کو راضی نہ ہوتی، آسماں کے جور نے اسے ہر کس و ناکس کے سامنے گریہ وزاری کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ وہ

جو دنیا کی نگاہوں سے اس طرح چھپا ہوا تھا جیسے جسم کے اندر روح، وہ اس کے پیرہن کے چاک سے جھانک رہا ہے۔ اس کی شرربار آہ کو دیکھو۔ اس کی موتی برسانے والی آنکھ پر نظر کرو۔ حیرت یہ ہے کہ یہ سب گریہ وزاری، یہ شعلہ افشانی ایک ایسے محبوب سے سرزد ہو رہی ہے جو حسن و جمال کا پیکر ہے اور جس کی سرشت میں دل گرمی اور ولولہ ہے۔ اس کا اب یہ حال ہوا ہے۔

حذر از زمہریر سینۂ آسودگاں غالبؔ
چہ منتّہا کہ بر دل نیست جانِ ناشکیبا را

آسودگی دلوں کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ ان دلوں کے زمہریر سے بچو جو آسودہ مزاج ہیں۔ بےتابی کے دل پر ہزارہا احسان ہیں۔ اس کی بدولت دل زندہ ہے، دھڑکتا ہے، روشن ہے اور امید و بیم سے تابندہ ہے۔

غالبؔ کو اس بات پر سدا فخر رہا کہ ان کا تخیل نئے نئے مضامین اور اسالیب ڈھونڈھ کر لاتا تھا۔ جہاں ان کے علاوہ کسی کو دسترس نہیں تھی۔

در بزم غالبؔ آئی و بہ شعر و سخن گرائی
خواہی کہ بشنوی سخنِ ناشنیدہ ای

اگر تم چاہتے ہو کہ ایسے اشعار سنو جو پہلے کسی نے نہ سنے ہوں تو غالب کی بزم میں شعر و سخن کا ذکر چھیڑو۔

ہفت دوزخ در نہادِ شرمساری مضمر است
انتقامست ایں کہ با مجرم مدارا کردہ ای

مجرم کو سزا نہ دینا بلکہ تواضع کر کے رخصت کر دینا، بہت بڑا انتقام ہے اب وہ زندگی بھر شرمساری سے دوزخ میں جلتا رہے گا۔ انسانی نفسیات کا غالبؔ رازداں ہے۔

در زمہریر سینۂ آسودگاں نہ ای
ای دل بدیں کہ غمزدہ ای شادماں نہ ای

وہ لوگ جو آسودہ ہیں، غم سے بے نیاز، ان کا ٹھکانا گویا جہنم کا درکِ اسفل جہاں سردی ہی سردی ہے، جہاں حرارت کا گزر نہیں۔ اس سے بڑی سزا انسان کے لیے کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا دل غم کی دولت سے محروم ہو، اسے نہ کوئی تکلیف ہو، نہ فکر۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو غم سے ناآشنا نہیں ہیں غم اپنے غم کے علاوہ انسانوں کے غم کا احاطہ کرنا ہے دراصل انسانیت اسی سے عبارت ہے۔

گوئی یکیست پیش تو بود و نہ بود من
با من نشستہ ای و زمن سرگراں نہ ای

تیرے لیے میرا قرب اور میری دوری کیا برابر ہو گئے ہیں؟ تو میرے پاس بیٹھا ہوا ہے اور مجھ پر برہم نہیں ہے۔ عاشق محبوب کی آزردگی اور برہمی کو اپنے لیے نشانِ امتیاز سمجھتا ہے۔ لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ۔ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا۔

دلم در نالہ از پہلوئی داغ سینہ تا بستی　　　بر آتش پارہ چپیدہ لختی از کبا بستی

مغانم را نوائی شورِ محشر ہمعنا نستی　　　بیانم را رواج شور طوفاں در رکابستی

میرا دل آہ و زاری کر رہا ہے، تڑپ رہا ہے کہ محبت کی آگ نے اسے جھلسا ڈالا ہے۔ اسے اس طرح دہکا دیا ہے کہ سارا سینہ اس کی تابش سے چمک اٹھا ہے۔ چناں چہ دل کی اب یہ حالت ہے جیسے کباب کا ایک ٹکڑا آگ کی لو سے لپٹ گیا ہو۔

ایک شورِ قیامت ہی میرے نالہ و فریاد کا ساتھ دے پاتا ہے۔ طوفان کا ہنگامہ میرے سخن کا ہم رکاب ہے۔ زورِ بیان کا یہ عالم جیسے طوفاں آگیا ہو۔

دلم صبحِ شبِ وصل تو بر کاشانہ می لرزد

در و بامم بوجد از ذوق بوی رخت خوابستی

میرا دل شبِ وصل کی صبح کو میرے گھر کی خیر منا رہا ہے۔ اندیشہ سے کانپ رہا ہے۔ اس کے در و بام محبوب کے رختِ خواب کی خوشبو پر ہنوز وجد کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مکان اس حالت میں زیادہ دیر تک کھڑا نہیں رہ سکتا۔ غالب کے یہاں جذبہ اور فکر کی آمیزش نئے نئے زاویوں سے ہوئی ہے سر جوشِ محبت کی کیفیت کو تصورِ شاعر کے دل سے در و بام تک منتقل کر دیتا ہے، جذبہ کی اس طغیانی کو کیا کہیے جو آسودگی کے بعد بھی تشنہ کام ہے، اندیشہ مند ہے۔

گلویم تشنہ و جان و دلم افسردہ ہی ساقی

بدہ نوشینہ داروئی کہ ہم آتش ہم آبستی

میرا حلق پیاسا ہے اور میرے جان و دل افسردہ ساقی مجھے وہ شراب پلا جو آگ بھی ہے اور پانی بھی تاکہ حلق تر ہو جائے اور افسردگی دور ہو جائے۔ کون نہیں جانتا کہ شراب پانی بھی ہے اور آگ بھی، لیکن شاید اس انداز سے پہلے کسی نے یہ بات کہی نہ ہو۔ اور پھر یہ اہتمام، یہ سجاوٹ کہ وہی جرعہ ایک طرف حلق کی پیاس بجھا رہا ہے، دوسری طرف دل میں آگ لگا رہا ہے۔

نگویم ظالمی اما تو در دل بودہ ‌وٓ ان گہ
دلی دارم کہ ہمچوں خانۂ ظالم خرابستی

میری یہ مجال نہیں کہ کہہ سکوں کہ تم ظالم ہو۔ لیکن اس بات پر غور کرو کہ تم میرے دل میں مکیں کی حیثیت سے رہے ہو، اور میرا دل ظالم کے گھر کی طرح تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ ایک ابدی اور اخلاقی حقیقت کو لے کر کہ ظالم کا گھر برباد ہو کے رہتا ہے شاعر نے یہ خیال پیدا کیا کہ میرے دل میں محبوب نے گھر کیا تھا۔ وہ چلا گیا اور میرا دل تباہ ہو گیا۔ مکیں ظالم رہا ہوگا۔ جبھی تو مکان برباد ہوا۔ عاشق نے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے معشوق پر لطیف انداز سے ظلم اور بے وفائی کی تہمت لگا دی۔

زبسکہ با تو بہر شیوہ آشنا ستمی
بہ عشق مرکز پرکارِ فتنہ ہاستمی

تمہارے ظلم و ستم کے ہر شیوہ سے تجربہ کی بدولت اس قدر آشنا ہو گیا ہوں کہ میں بیچ میں ہوں اور میرے گرداگرد فتنوں کے لامتناہی دائرے کھنچے ہوئے ہیں میری حیثیت دائرہ ہائے ستم کے مرکز کی ہے کہ دائروں سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔ تمہارے جور و ستم نے مجھے ہر طرف سے گھیر لیا ہے۔

امیدگاہِ من و ہمچو من ہزار یکیست
زرشک در صددِ ترکِ مدّعا ستمی

یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ میری طرح ہزاروں دوسرے بھی تیرے در سے امید لگائے بیٹھے ہیں انھیں اس کا کیا حق تھا۔ رشک نے مجھے اس پر مجبور کر دیا کہ تجھ سے آس لگانا چھوڑ دوں۔ رشک کا اعتراف تو غالب نے اپنی زبان سے کیا ہے، یہاں اس انفرادیت اور غیرت کا ذکر کرنا وہ بھول گئے جو ان کے خانۂ دل کو ذرا دیر کے لیے بھی نہیں چھوڑتی اور جو کسی طرح کی شرکت کو گوارا نہیں کرتی۔

بہ سرمہ غوطہ دہیدم کہ در سیہ مستی
زسرمگینیِ چشمی سخن سرا ستمی

حوض میں سرمہ گھول کر مجھے اس میں غوطہ دے دو کہ سیہ مستی میں، میں اس چشم سرمگیں کی بات کرنے لگا ہوں۔ سرمہ میں غوطہ دینے میں لطف یہ ہے کہ یہ سزا بھی ہے اور جزا بھی۔ جزا اس لیے کہ اس طرح مجھے اپنے محبوب مشغلہ میں مدد ملے گی، میں کچھ نہ کچھ اس چشم سرمہ سا کا حق اپنے بیان سے ادا کر سکوں گا۔

سزا اس لیے کہ مجھ تو گرفتار سے بڑا جرم یہ سرزد ہوا کہ بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی۔ ان سرگیں آنکھوں کا تذکرہ برملا کر دیا۔ سرمہ کے بارے میں یہ روایت بھی ہے کہ سرمہ کھلا دیجیے تو آواز بیٹھ جاتی ہے۔ اس جرم کے لیے جو ظرف کی کمی اور نو عاشقی کے سبب داستانِ محبت کو دہرا رہا ہے، یہی نہیں محبوب کی طرف برملا اشارہ کر رہا ہے، موزوں سزا یہی ہے کہ اسے گویائی سے محروم کر دیا جائے وہ بھی اسی شے کے ذریعہ جس کی طرف اشارہ افشائے راز کا باعث بن گیا تھا۔

چگونہ تنگ توانم کشیدنت بکنار
کہ با تو در گلہ از تنگیٔ قبا ستمی

تجھے اپنی آغوش میں کس طرح نہ بھینچ لوں، مجھے تجھ سے تنگیٔ قبا کی شکایت ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

گرچہ پیرم تو شبی تنگ در آغوشم گیر
کہ سحر گہ زکنار تو جواں بر خیزم

میں ہرچند بوڑھا ہوں، تو ایک رات مجھے اپنی آغوش میں کس کر کھینچ لے تاکہ میں صبح کو تیرے پہلو سے جوان اٹھوں۔

غالبؔ کا کہنا ہے کہ جب طغیانیٔ محبت میں، میں تجھے اپنی باہوں میں جکڑ لیتا ہوں اس وقت مجھے یہ بھی گوارا نہیں ہوتا کہ ہمارے درمیان تیری چست قبا حائل ہو۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرا حصہ تیری قبا مجھ سے پہلے اڑا لے گئی۔ یہ ایک نیا رقیب پیدا ہو گیا جو تجھ سے قرب میں مجھ سے بازی لے گیا۔ کہیں رقابت کا یہ احساس ہم آغوشی کے لطف کو کرکرا نہ کر دے۔ ناگواری کے اس اظہار میں حسنِ طلب پنہاں ہے کہ اپنی تنگ قبا کو جو میری رقیب بن گئی ہے حائل کیوں رہنے دیتے ہو۔ لمس کی راہ میں رکاوٹیں کیوں کھڑی کرتے ہو۔ قبا کی یہ مجال کہ میرے سامنے تمھیں اپنی آغوش میں کھینچ لے۔

دیدہ ور آں کہ تا نہد دل بہ شمار دلبری
در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آذری

فیضِ نتیجۂ ورعِ از می و نغمہ یافتیم
زہرۂ ما بریں افق دادہ فروغِ مشتری

ای تو کہ ہیچ ذرہ را جز بہ رہِ تو روئے نیست
در طلبت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری

رشکِ ملک چہ و چرا چوں بہ تو رہ نمی برد
بیہدہ در ہوائے تو می پرد از سبکسری

حیف کہ من بخوں تپم وز تو سخن رود کہ تو | اشک بدیدہ بشمری نالہ بہ سینہ بنگری
بینیم از گداز دل، در جگر آتشی چو سیل | غالب اگر دم سخن رہ بہ ضمیر من بری

دیدہ ور اس شخص کو کہتے جس کی نظر جستجوئے جمال کے ہنگام پتھر کے دل کو چیرتی ہوئی ان مجسموں کو جو اس میں چھپے ہوئے ہیں رقصاں دیکھ لیتی ہے۔ فن کار کی اس سے زیادہ حسین اور معنی خیز تعریف شاید کبھی نہ کی گئی ہو۔ وہ پہلی نظر میں حُسن کو بھانپ لیتا ہے۔ خواہ وہ خوابیدہ ہو، خواہ نہفتہ، خواہ موجود ہو خواہ ممکن۔ میڈیم کے تخلیقی امکانات کو فن کار کا تخیل چشم زدن میں پا جاتا ہے۔ یہاں مشاہدہ تخیل اور تشکیل ——— یہ تینوں عمل ایک ساتھ شروع ہو جاتے ہیں۔ فن کار چاہے وہ صورت گر ہو یا سنگ تراش، شاعر ہو یا نغمہ پرداز، محسوسات کو حسن کے انکشاف اور تخلیق و تجسیم کا روپ دینے پر قادر ہو جاتا ہے، چٹان میں لے ہو شربا مورتیاں ناچتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

تجھ تک پہنچنے کے لیے ہم کسی مرشد کامل کی تلاش میں کیوں بھٹکتے رہیں۔ جب حقیقت یہ ہے کہ ہر ذرّہ تیری سمت رواں ہے تو ہم خود صحرائے جس میں ہم بیکار بھٹک رہے ہیں تیری جانب رہنمائی کا کام کیوں نہ لیں۔ دنیوی زندگی کی بیڑیوں کو کاٹ کر جو شخص تلاش حق میں صحرا کی طرف نکل گیا اسے کوئی راہبر درکار نہیں۔

جس کسی کے سینہ میں دل ہوتا ہے اس کے دل کو تیری محبت کی آگ سے داغ دیتے ہیں، کہ اگر اس کی نیت میں خرابی آئے اور اگر دل وہ تجھ سے ہٹا لے اور کسی دوسرے محبوب کے حوالے کر دے تو تیرے پاس عدالت میں اپنی ملکیت ثابت کرنے کے لیے ثبوت موجود ہو۔ غلاموں اور گھوڑوں اور دوسرے چوپایوں کو شناخت کے لیے مالک کے نشان سے داغ دیا جاتا تھا۔

ہم فرشتوں پر رشک کیوں کریں، وہ تجھ تک تو پہنچ نہیں پاتے، ہوا میں بے کار پر مارتے رہتے ہیں۔ ذہن اس تبصرہ کی طرف جاتا ہے جو غالب کے ہمعصر شیلی پر میتھو آرنلڈ نے کیا تھا:

An in effectual angel beating in the void his
luminous wings in vain.

ایک بے اثر فرشتہ جو خلا میں اپنے چمکدار پر بے کار مارتا رہتا تھا۔

پروردگار، دنیا یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتی کہ تو عالم الغیب ہے، دانا اور بینا ہے۔ تیرے حکم کے بغیر پتہ کبھی نہیں ہلتا۔ اور کوئی شے ایسی نہیں ہے جو تیرے احاطۂ علم سے باہر ہو۔ تو دلوں کا راز جانتا ہے۔

تو سینہ میں نالہ کو الجھتے ہوئے دیکھ لیتا ہے اور آنکھوں میں ڈبڈباتے ہوئے اشکوں کو شمار کر لیتا ہے۔ الٰہی پھر یہ کیوں ہو رہا ہے کہ میں خاک و خون میں تڑپ رہا ہوں، اور تو میری خبر نہیں لیتا۔ کتنی پر درد ہے یہ فریاد گویا ایک مصیبت زدہ انسان اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے گڑگڑا رہا ہے، بلک بلک کر اپنے حال زار کی طرف اس کا دھیان دلا رہا ہے۔ غالبؔ کی آزاد منشی کا عام تصور اس تصویر کو آسانی سے قبول نہیں کرے گا۔

جب میں فکر شعر میں ڈوبا ہوا ہوں اس وقت اگر آپ میرے نہاں خانۂ دل میں جھانک کر دیکھیں تو آپ کیا پائیں گے؟ میرے دل کے سوز و گداز سے جگر میں آگ کی وہ لپٹیں جو سیلاب کی طرح موجزن ہیں بڑھتی ہوئی چلی آ رہی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے وجود کو پگھلا کر اپنے ساتھ بہالے جائیں گی۔ تخلیق کا عمل ٹھنڈی فکر، سطحی مضمون آفرینی اور سرد قافیہ پیمائی پر مشتمل نہیں ہوتا۔ جذبہ کی شدت، فکر کی حرارت، الفاظ اور تراکیب کی تمازت شاعر کے وجود کو دہکا دیتی ہے، پگھلا دیتی ہے، اور اپنے پگھلے ہوئے وجود کو وہ اشعار کے سانچے میں انڈیلنے لگتا ہے، اس طرح کہ خود وہ سانچہ وہ آبگینہ بھی اس آنچ سے پگھل جاتا ہے۔ اس غزل کے مطلع اور مقطع میں غالبؔ نے عمل تخلیق سے نقاب اٹھائی ہے اور قارئین کو اپنے تخلیقی تجربہ کے اول و آخر سے روشناس کر دیا ہے۔ اور اس تصور کی تردید کر دی ہے کہ مضمون آفرینی اور موشگافی اور بلند پروازی میں پارہ ہائے دل شامل نہیں ہوتے۔ فکر شعر سارے وجود کو ہلا ڈالتی ہے۔ جذبات، احساسات اور افکار کو الفاظ، وزن، صوت اور آہنگ کے سانچوں میں ڈھالنا جگر گداز ارتکاز اور یکسوئی کا طالب ہوتا ہے۔

آنکہ جوید از تو شرم و آنکہ خواہد از تو مہر
تقویٰ از میخانہ و داد از فرنگ آرد ہمی

جو کوئی تم سے حیا کی امید رکھے، اور محبت تم سے چاہے، وہ گویا خرابات میں پارسائی ڈھونڈھ رہا ہے اور فرنگیوں سے انصاف مانگ رہا ہے۔ غالبؔ کے یہاں بالانشینوں کی محبت کے شواہد ملتے ہیں۔ یہ شعر تو خیر بہت واضح ہے، لیکن شاہدانِ زر طلب کا چہرۂ رشک کے آنچل میں اکثر جھلکتا ہے اور ان کا روئے زیبا اس آئینہ در آئینہ صورت حال میں چلمنوں کو رنگین کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ معشوق کا رنگ عاشقی کی تابش سے کھلتا اور نکھرتا جاتا ہے۔ اردو فارسی غزلوں میں معشوق کسی دوسرے پر

عاشق ہوتا ہے۔ فارسی میں جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں غزلوں کی غزلیں اس کیفیت کی صورت گری کے لیے وقف ہیں۔

دوسرے مصرع میں غالب نے قطعیت کے ساتھ کہا ہے کہ فرنگیوں سے انصاف کی امید رکھنا سراسر نادانی ہے۔ اس میں شاید قومی اور انفرادی دونوں نقاطِ نظر سما گئے ہیں۔ وہ انگریز جو تجارت کرتے ہوئے آئے اور مکر و فریب اور زور و ظلم سے ہندوستان کے حاکم بن بیٹھے، ان کا تصرف ہی غیر منصفانہ اور غاصبانہ ہے۔ کیا عجب کہ ان کے پیش نظر وہ شخصی ناکامی بھی رہی ہو۔ جس سے انھیں پنشن میں اضافہ کی مانگ پر سابقہ پڑا۔

بنمائی بہ گوسالہ پرستاں یدِ بیضا
غالبؔ بہ سخن صاحب فرتاب کجائی ؟

گوسالہ کی پرستش کرنے والے گرم نوا ہیں۔ پیغمبرِ سخن، کلیم معجز بیاں، اسد اللہ خاں غالبؔ کہاں چلا گیا کہ ان گوسالہ پرستوں، ان سامری نژادوں، ان چھوٹے موٹے پرُ صدا شاعروں کے طلسم کو اپنے یدِ بیضا کے اعجاز سے توڑ ڈالتا۔

سیرم نہ تواں کرد ز دیدارِ نکویاں
نظارہ بود شبنم و دل ریگ رواں ہائی

خوبروؤں کی دید سے میرا دل بھرتا ہی نہیں کہ وہ ریگ رواں کی طرح ہے، پانی کا پیاسا۔ اور دیدار جیسے شبنم کی چند بوندیں۔ شوقِ نظارۂ خوباں کی آگ ان چند بوندوں سے کیا بجھے گی۔ ذوق جمال جب شوق نظارہ کی طرف لے جائے تو کلیجہ منہ کو آجاتا ہے۔

از جنت و سرچشمۂ کوثر چہ کشاید
خوں گشتہ دل و دیدۂ خونابہ فشاں ہائی

میرا دل خوں ہو چکا ہے، آنکھیں لہو کے آنسو رو رہی ہیں۔ جنت اور چشمہ کوثر ان زخموں کو بھرنے سے قاصر رہیں گے:

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

ای کہ گفتم نہ دہی داد دل آری نہ دہی | تا چو من دل بہ مغاں شیوہ نگاری نہ دہی
چشمۂ نوشش ہمانا نہ ترا دد ز دلی | کش نگیری و در اندیشہ فشاری نہ دہی
ماہ و خورشید دریں دائرہ بیکار نیند | تو کہ باشی کہ بخود زحمتِ کاری نہ دہی
سر بہ راہ دمِ شمشیر جوانی نہ نہی | تن بہ بند خم فتراکِ سواری نہ دہی
آخر کار نہ پیداست کہ در تن فرد | کفِ خونی کہ بداں زینتِ داری نہ دہی
حیف گر تن نہ بہ سگاں سر کوئی نہ رسد | وای گر جاں بہ سر راہگزاری نہ دہی
گر تنزی نہ بود، ابر بہاری غالبؔ | کہ دُرِ افشائی وز افشاندہ شماری نہ دہی

زندگی بچا بچا کر رکھنے کے لیے نہیں دوسروں کے کام آنے کے لیے ہے۔ کائنات قائم ہی انھی اصول پر ہے۔ تم جو خود کو بچا بچا کے رکھتے ہو اس سے کیا حاصل۔ جو خون سولی کی زینت نہیں بنتا وہ رگوں میں ٹھٹھر کر رہ جاتا ہے۔ آگے چل کر اسی مضمون پر سان رکھتے ہوئے، اس کے مفہوم کو محدود کرتے ہوئے، اسے نئی معنویت دیتے ہوئے اقبال نے کہا:

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

اقبالؔ نے بات دل تک محدود کر دی، غالبؔ نے پورے انسان کا احاطہ کیا تھا۔ ایک شعر کی طرف اور دھیان دیجیے۔ جہاں غالبؔ نے بہ کمال ہنر شیخ شیراز کے اس قطعے کی تلخیص کی ہے۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند | تا تو نانی بکف آری و بہ غفلت نہ خوری
ہمہ از بہر تو سر گشتہ و فرماں بردار | شرطِ انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نہ بری

غالبؔ نے ایک شعر میں کہہ دیا کہ دائرہ کائنات میں چاند اور سورج تک بیکار نہیں بیٹھتے۔ پھر تو کون ہوتا ہے کہ خود کو کام کرنے کی زحمت نہیں دیتا۔ آگے چل کر غالبؔ نے اس مضمون میں بانکپن کا اضافہ کر دیا ہے، فرماں برداری کے تصور کے ساتھ جاں نثاری کے دستور کو بڑے حسن کے ساتھ جوڑ دیا ہے، جاں نثاری، پروانہ واری، دل افگاری۔ ان اشعار میں وہی زور بیان، وہی شکوہِ ادا، وہی ترصیع وہی تساوی وہی وقار جلوہ گر ہے جسے ہم غالبؔ کی فارسی غزل سے عام طور پر منسوب کرتے ہیں۔ ایک بحرِ زخار ہے جسے قاری الفاظ و افکار کے دوہرے آئینہ میں موجزن دیکھتا ہے۔ خود شاعر اپنے آپ کو

قادرالکلامی، مضمون آفرینی اور گنج بخشی کے افتخار سے، بچا نہیں پایا۔ کہتا ہے، تجھے ابر بہاری سے تشبیہہ دینا کہ تو موتی لٹاتا ہے اور ان کا شمار نہیں رکھتا۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ تشبیہہ تیرے شایانِ شان نہیں، مضمون آفرینی محض فکر کا عمل نہیں ہے۔ اس کے لیے جو پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دل کو تخیل کے شکنجہ میں کس کے نچوڑ ڈالنا۔ یہاں بھی غالب نے آشوبِ تخلیق پر سے نقاب اٹھائی ہے۔ جس فلسفۂ حیات پر یہ غزل مشتمل ہے، اس کا اجمال ہے۔ فرض شناسی، ہمدردی، جاں نثاری، سرفروشی، حرکت۔

می چکد خونم رگِ ابرست آں فتراک ہائی	می تپد خاکم رمِ بادست آں شبدیز ہئی
ننگ باشد چشم بر ساطور و خنجر دو ختن	غنچہ آسا سینۂ خواہم جراحت خیز ہئی
غمزہ رازاں گوشۂ ابرو کشادِ دیگراست	آں خرامِ توسن وایں جنبش مہمیز ہئی
گفتم آری رونق بازارِ کسریٰ بشکنی	گرم کردی درجہاں ہنگامۂ چنگیز ہئی
غالب از خاک کدورت خیز ہندم دل گرفت	اصفہاں ہی، یزد ہی، شیراز ہی، تبریز ہئی

برق رفتار محبوب نے مجھے شکار کر کے فتراک میں ڈال دیا ہے، میرا خون ٹپکتا جا رہا ہے، میری مٹی بکھرتی جا رہی ہے۔ دشنہ اور خنجر سے امید باندھنا میرے لیے شرم کا باعث ہے۔ ان سے تو آس وہ لگائے جو محبت کی جراحتوں کا ذوق نہ رکھتا ہو، میں تو کلی کی طرح آہستہ آہستہ جگر چاک ہونے سے لذت اندوز ہوتا ہوں۔ اس کے گوشۂ ابرو سے غمزہ کس آن بان کے ساتھ رونما ہوتا ہے۔ ہائے رخش کا وہ خرام، مہمیز کی وہ جنبش۔

غالب میرا دل ہندوستان کی کدورت خیز زمیں سے اکتا گیا ہے۔ یہاں جس دل کو دیکھو کدورت سے بھرا ہوا ملے گا۔ ہائے اصفہاں، ہائے یزد، ہائے تبریز۔ غالب کی افتادِ ذوق اور ان کی شعری دل چسپیاں ایران سے وابستہ تھیں اور اہلِ ہند کے بارے میں اپنے تجربات کے تحت وہ خوش عقیدہ نہیں تھے۔

ذیل کی غزل میں شاعر نے مکالمہ کے بل پر قافیہ اور ردیف کو کتنے پر لطف پیچ وخم دیے ہیں

ای کہ گفتی غم درونِ سینہ جانفرساست ہست	خامشیم اما اگر داری گمانِ حق باماست ہست
ایں سخن حق بود گاہی بر زبانِ ما رفت	چوں تو خود گفتی کہ خوباں را دل ازخارا ست ہست

باری از خود گو کہ چونی، ورز من پرسی بپرس | بخت ناساز است آری یار بی پرواست ہست
نظم و نثر شور انگیزی کہ می باید بخواہ | ای کہ می پرسی کہ غالبؔ در سخن یکتاست ہست

یہ بات سچ ہے لیکن کبھی بھی ہماری زبان پر نہیں آئی ۔ اب جو تم نے خود ہی کہہ دیا کہ حسینوں کا دل پتھر کا ہوتا ہے تو میں بھی کہتا ہوں کہ ہاں ایسا ہی ہے ۔

پہلے تو اپنا حال بتاؤ کہ تم کیسے ہو پھر اگر میرا حال پوچھنا چاہتے ہو تو پوچھ دیکھو ۔ یہاں حال یہ ہے کہ قسمت ناموافق ہے اور محبوب تغافل برت رہا ہے ۔ محبوب کی احوال پرسی گویا تقریب تھی، اپنی بپتا دہرانے کی۔

اگر ایسی نظم و نثر کی تلاش ہے جو دل میں حشر برپا کر دے تو غالبؔ کے پاس جاؤ، تم یہ جو پوچھ رہے ہو کہ غالبؔ شاعری میں یگانۂ روزگار ہے، تو اس میں کسے کلام ہوگا ۔ اپنی نظم و نثر کے تعارف کے لیے غالبؔ نے شور انگیزی کو چنا ہے، یعنی وہ وصف جو دل میں ایک تہلکہ برپا کر دے ۔

بزمت بہشت و بادہ حلالست در بہشت | گر باز پرس رود ہد از من جواب خواہ
در روز ہائی فرخ و شبہائی دل فروز | صہبا بروز ابر و شبِ ماہتاب خواہ
گل بوئی و شعر گوئی و گہر پاش و شاد باش | مستی ز بانگِ بربط و چنگ و رباب خواہ
خونِ سیاہِ نافۂ آہو چہ بو دہد | از حلقہ ہائی زلفِ بتاں مشکِ ناب خواہ
در تنگنائی غنچہ کشایش ز باد جوئی | در جویبار باغ روانی ز آب خواہ
از شمعِ طور خلوت خود را چراغ نہ | از زلفِ حور خیمۂ خود را طناب خواہ

ساری غزل دامانِ باغباں و کفِ گل فروش بنی ہوئی ہے ۔ جوش و خروش کے ساتھ ٹھہراؤ اور دھیما بہاؤ ۔ یہ جرعہ جرعہ لطف اندوزی ۔ کیسا سماں ہے کیا محفل ہے جو غالبؔ کی غزل کی طرح سجی ہوئی ہے گل خوشبوی، شعر آبدار، گہر شا ہوا کر شرابِ ناب اور بربط و چنگ و رباب، حلقۂ گیسوئے صنم، شمع طور نے اس بزم میں چراغ روشن کیا ہے ۔ حوروں کی زلفیں، خیمہ کے لیے طناب کا کام کر رہی ہیں عیش و نشاط حسن و طرب کا بازار گرم ہے ۔

شعر کہو، موتی بکھیرو اور خوش رہو ۔ بربط و چنگ و رباب کی نوا سے مدہوش ہو جاؤ کہ زندگی کا حاصل اور شادمانی کی معراج یہی ہے ۔ مشکِ نافہ کی جو بگڑا ہوا خون ہے، کیا حقیقت ہے ۔ اگر خوشبو کی جستجو ہے تو معشوق کی زلفوں میں تلاش کرو ۔

حذر از زمہریر سینۂ آسودگاں غالبؔ

چہ منتہا کہ بردل ست جانِ ناشکیبارا

غالبؔ آسودہ حال لوگوں کی صحبت سے پرہیز کرو۔ ان آسودوں کا سینہ زمہریر کی طرح ٹھنڈا ہے۔
اس میں نہ ولولہ ہے نہ امنگ، نہ خلش ہے، نہ اضطراب، نہ درد نہ محبت نہ آرزو، نہ جستجو۔ بے صبری اور بے تابی
کے دل پر لاکھوں احسان ہیں کہ دل زندہ ہی ان کی بدولت ہے۔

بروئی برگ گل تا قطرۂ شبنم نہ پنداری

بہار از حسرتِ فرصت بدنداں می گزد لبہا

پھول کی پتی پر موتی چمکتے ہوئے دیکھ کر یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ یہ شبنم کی بوندیں ہیں۔ یہ تو فصل بہار کے
دانت ہیں جن سے وہ اپنے گل رنگ ہونٹوں کو کاٹ رہی ہے۔ اس حسرت میں کہ کاش چمن میں ٹھہرنے
کی مہلت مل جاتی۔ حسن تعلیل کس قدر دلکش ہے۔

بہ فیضِ شرع بر نفس مزوّر یافتی دستی

چوں آں دزدی کہ گیرد شحنہ ناگاہاں بہ مہتابش

یہ شرع کا احسان ہے کہ اس کی بدولت میں نے اپنے فریب کار نفس پر قابو پا لیا ہے، اس چور کی
طرح جسے چاندنی رات میں کوتوال نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔ شرع کی روشنی کو چاندنی رات سے تشبیہ دی
گئی ہے۔ یہ کون کہہ رہا ہے؟

خرابی چوں پدید آمد، بطاعت داد تن زاہد

خمید نہائی دیوار سرا گردید محرابش

جب خرابی ظاہر ہونے لگی۔ عمر کے بوجھ سے کمر جھک گئی تو زاہد نے اطاعت کا راستہ اختیار کر لیا
مکان کی دیوار میں خم آگیا تو مکیں نے اسے محراب بنا لیا۔

وہم خاکی ریخت در چشمم بیاباں دیدمش	قطرۂ بگداخت، بحر بیکراں نامیدمش
بود غالبؔ عندلیبی از گلستانِ عجم	من ز غفلت طوطیٔ ہندوستاں نامیدمش

غالب تو ایران کے چمن کا بلبل تھا۔ مجھ سے سہو ہوا کہ میں اسے طوطیٔ ہند کہہ کر پکارنے لگا۔

در فصلِ دی کہ گشت جہاں زمہریر از و	بنشیں کہ آبِ گردشِ ساغر کنیم طرح

تا چند نشنوی تو و ما حسبِ حالِ خویش — افسانہ ہائی غیر مکرر کنیم طرح

از تار و پود نالہ نقابی دہم ساز — وز دودِ سینہ زلف معنبر کنیم طرح

غالبؔ مشکل زمینوں کو فاتحانہ انداز سے زیر قدم لاتا ہے۔ اس کی غزلیں آہنگ افتخار سے پر صدا ہیں۔ غالبؔ کی قادر الکلامی اور اس کے اشعار میں مضامینِ نو کے انبار دیکھیے تو محسوس ہوتا ہے کہ افتخار کی لَے برحق ہے۔ جس شاعر کی غزل کا ہر شعر ظاہری در و بست کے علاوہ معانی کا ایک جہاں اپنے اندر رکھتا ہو۔ جس کی فکر کے پیچ و خم کا ساتھ دینا قارئین کے لیے دشوار ہو، وہ اگر فخر و مباہات کا ساز چھیڑے اور پیغمبرئ سخن کا دعویٰ کرے تو کیا عجب۔

اس وجہ سے غالبؔ کی بہت سی فارسی غزلوں میں قصیدہ کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ تراکیب کی معنی خیزی شکوہِ الفاظ کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے۔ اسے بجا طور پر ناز ہے کہ وہ ایک ہی بات کو ایک ہی انداز سے دوبارہ نہیں کہتا۔ وہ گلدستۂ معنی کو ہمیشہ نئے ڈھنگ سے باندھتا ہے۔ مذکورہ بالا اشعار میں سے دوسرے شعر میں دیکھتا ہے۔ تم کب تک نہیں سنو گے میں اپنی داستان سنائے جا رہا ہوں ہر بار نئے انداز سے۔ داستان نہیں سنتے تو انداز بیان کی داد تو دو تخاطب بہ یک وقت معشوق اور قاری سے ہے۔

شاعر کو درد اور تخیل کی دولت کیا مل گئی دنیا جہان کا خزانہ مل گیا تخیل نے اسے وہ ذرائع ارزاں کر دیے ہیں کہ وہ خود محبوب کی تشکیل و تخلیق کر سکتا ہے۔

تیسرے شعر میں ہم اسے کارِ تخلیق میں منہمک پاتے ہیں۔ اس کے سینہ سے درد کی شدت میں جو دھواں اٹھ رہا ہے شاعر اس دھوئیں کو گیسوئے مشکبو بنانے کے کام میں لا رہا ہے، آہ و زاری کا تانا بانا محبوب کی نقاب کی شکل اختیار کرنے والا ہے۔ اس شعر میں ایک اشارہ یہ بھی ہے کہ محبت جیسے جیسے بڑھتی ہے محبوب کا تصور آسان ہوتا جاتا ہے۔

پیمانۂ رنگیست دریں بزم بہ گردش
ہستی ہمہ طوفان بہار است خزاں ہیچ

محفلِ کائنات میں ایک پیمانہ جو رنگوں سے لبریز ہے گردش میں ہے۔ ہستی طغیانی بہار کا نام ہے، خزاں کا اپنا کوئی وجود نہیں۔ یہ وہی سحر کی تصور ہے جس نے ناقدین کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا ہے۔

بادہ پرتو خورشید و ایاغ دمِ صبح | مفت آناں کہ در آیند بہ باغ دمِ صبح
آفتابیم بہم دشمن و ہمدرد ای شمع | ماہلاکِ دمِ شامیم و تو داغ دمِ صبح
غالب امروز بہ وقتی کہ صبوحی زدہ ایم | چیدہ ایم ایں گل اندیشہ زباغ دمِ صبح

صبح کا وقت ہے، شاعر میکشی کر رہا ہے۔ سحر خیز لوگ چہل قدمی کے لیے نکلے ہیں۔ آفتاب طلوع ہو رہا ہے، شمعیں بجھائی جا رہی ہیں۔ مقطع میں شاعر قارئین کو بتا رہا ہے کہ یہ اشعار اس نے صبوحی کی صحبت میں کہے ہیں۔

صبح کے پیالے سے نورِ خورشید کی شراب چھلک رہی ہے۔ یہ دولت ان لوگوں کو ملتی ہے جو صبح کے چمن میں داخل ہوتے ہیں۔

اے شمع تمہارا رشتہ ہم سے کہ مانند خورشید درخشندہ ہیں بہ یک وقت دشمنی اور ہمدردی کا ہے۔ ہم طلوع ہوتے ہیں تو تم بجھا دی جاتی ہو۔ یہ تو دشمنی کی بات ہوئی کہ ایک کے وجود کو دوسرا گوارا نہیں کرتا۔ ہمدردی اس بنا پر کہ شام ہمارے لیے صبح تمہارے لیے پیغامِ موت بن کر آتی ہے مرگِ ناگہاں دونوں کا مقدر ہے۔

ہر ذرہ محوِ جلوہ حسنِ یگانہ ایست | گویا طلسمِ شش جہت آئینہ خانہ ایست
حیرت بہ دہرِ لی سر و پا می برد مرا | چوں گوہر از وجودِ خودم آب و دانہ ایست
پا بستۂ نوردِ خیالی چو وا رہی | ہر عالمی زعالمِ دیگر فسانہ ایست
خود داریم بہ فصلِ بہاراں عناں گسیخت | گل گونِ شوق را رگِ گل تازیانہ ایست
ہر ذرہ در طریقِ وفائی تو منزلی | ہر قطرہ از محیطِ خیالت کرانہ ایست
در پردہ تو چند کنم نازِ عالمی | دائم زر روزگار و جراحت بہانہ ایست

کائنات کا ذرہ ذرہ معشوقِ حقیقی کے حسنِ بے مثال میں محو ہے۔ گویا کائنات ایک آئینہ خانہ ہے جس میں جس جہت سے جس زاویہ سے دیکھیے معشوق کا پرتو پڑ رہا ہے۔

خود انحصاری کے مضمون کو پھر دہرایا جا رہا ہے۔ انسان گوہر ہے، بذاتِ خود ایک دانہ جس کی چمک اس کی آب ہے۔ آب و دانہ دونوں فراہم ہیں۔ پھر کیا ضرورت کہ آب و دانہ کی تلاش میں انسان دیوانہ وار گھومتا رہے۔

ویسے تو میں لیے دیئے رہتا ہوں، خود کو سنبھالے ہوئے۔ لیکن موسمِ بہار میں میری خودداری خود نگہداری عناں تڑا لیتی ہے۔ سمندِ شوق کے لیے رگِ گل (پھولوں کا نظارہ) تازیانہ کا کام کرتا ہے۔

صبتی دارم کہ گوئی گر بروئی سبزہ بخرامد   زمیں چوں طوطی بسمل تپد از ذوقِ رفتارش

بنائی خانہ ام ذوقِ خرابی داشت پنداری   کز آمد آمدِ سیلاب در رقصست ہر دیوارش

اپنے محبوب کی خوبی کیا بیان کروں، یہ عالم ہے کہ اگر وہ سبزہ پر دمِ گل گشت خرام ناز میں آجائے تو اس کے حسن خرام پر فریفتہ ہو کر زمیں طوطی بسمل کی طرح تڑپنے لگے۔ مضمون میں جو غلو ہے اس پر نہ جائیے۔ یہ دیکھیے کہ محبوب کے حسنِ خرام سے شاعر کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ اندازِ خرام کا تذکرہ غالب نے کئی بار ستایشانہ اور حریصانہ کیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے میرے گھر کی بنیاد میں بربادی کا ذوق پنہاں کر دیا گیا تھا۔ سیلاب کو آتے دیکھ کر اس کی دیواریں وجد میں آگئیں، رقص کرنے لگیں۔ شاعرانہ استدلال غالب کو مرغوب ہے کہ وہ تخیل کو کارفرمائی کا موقع دیتا ہے۔ مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی۔

غمم افگند در دشتی کہ خورشید درخشاں را
گداز زہرہ وقت جذب شبنم از رخارش

غم نے مجھے ایسے بیاباں میں لا ڈالا ہے جہاں خورشید اوس کے قطرہ کو اٹھانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔

زرشکِ سینۂ گرمی کہ دارم
کشد از شعلہ بر خود خنجر آتش

میرے دہکتے ہوئے سینہ کے رشک میں آگ شعلہ کا خنجر اٹھا کر اپنے پہلو میں بھونک لیتی ہے۔ تشبیہ میں کتنی ندرت ہے۔

بسانِ موج می بالم بہ طوفاں
برنگِ شعلہ می رقصم در آتش

موج کی طرح میں طوفان میں فروغ پاتا ہوں۔ آگ کے اندر شعلوں کی طرح ناچتا ہوں۔
غالب کی ہنگامہ پسند اور شعلہ خو طبیعت کو سکون، سکوت، ٹھنڈک، سناٹا اور خاموشی

راس نہیں آتی۔ گھر کی رونق ایک ہنگامہ پر موقوف ہے۔ آگ ایک استعارہ بن گئی ہے گرمیٔ محفل اور دل گرمی اور حرکت اور نشوونما کے لیے، وجد، اور رقص کے لیے اضطراب، خلش، اندیشہ اور بے تابی کے لیے۔ حرکت، خرام، وجد، رقص، موج، طوفاں، بالیدن و کاہیدن، ذوق، شوق، آرزو، جستجو، رشک، بے تابی، شعلہ، داغ، سوز، گداز، آتشِ سیال، تشنگی ـــــ یہ کردار غالب کے جہانِ تخیل میں خفیہ یا علانیہ گرمِ کار نظر آتے ہیں۔

امشب آتشیں روی گرمِ زند خوانی ہاست | کز لبش نوا ہردم در شرر فشانی ہاست
درکشاکشِ ضعفم نگسلد رواں از تن | اینکہ می نمی میرم ہم ز ناتوانی ہاست
از خمیدنِ پشتم روی بر قفا باشد | تا چہا دریں پیری حسرتِ جوانی ہاست
کشتۂ دلِ خویشم کز ستمگراں یکسر | دیدہ دلفریبی ہا گفت مہربانی ہاست
سوی من نگہ دارد چیں فگندہ درابرو | باگراں رکابی ہا خوش سبک عنانی ہاست
باچنیں تہی دستی بہرہ چہ بود از ہستی | کارسازِ سرمستی آستیں فشانی ہاست
آیکہ اندریں وادی مژدہ از ہمادادی | بر سرم ز آزادی سایہ را گرانی ہاست
ذوقِ فکرِ غالب را بردہ ز انجمن بیروں | با ظہوری و صائب محو ہمزبانی ہاست

مطلع سے مقطع تک غزل پڑھ جایئے۔ ہر شعر میں کوئی نئی بات ہوگی، نیا مضمون ہوگا، بات کو کہنے کا انداز نیا ہوگا۔ ہر غزل کا یہی حال ہے۔ غالب کے ساتھ تیز روی کی کوشش بہت پرخطر ہے۔ کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ امریکن سیاحوں کی طرح دھیا چھوتے ہوئے نکل جایئے گا۔ عبرت کے لیے نہیں، حیرت کے لیے، حظ اندوزی کے لیے یہاں ہر قدم پر خاکِ راہی کر براں می گزری ساکن باش ہر شعر پر رکے بنا کام نہیں چلے گا۔ رکیے، غور کیجیے، لفظی اور معنوی محاسن اور مضمرات اور مفاہیم تلاش کیجیے۔ پھر آگے بڑھیے۔ پہلی بار تیزی کے ساتھ ورق گردانی کرتا چلا گیا۔ اکثر آگے نکل جانے کے بعد خیال آیا کہ جس شعر کو ہلکا سمجھ کر چھوڑ آئے تھے وہ گنجینۂ معنی کا طلسم تھا۔ چناں چہ واپس گیا۔

آج شب وہ شعلہ رو آتش پرستوں کی مقدس کتاب ژند کا مطالعہ کر رہا ہے۔ اس کے دہن سے ہر لمحہ چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ جو تصویر کھینچی جا رہی ہے اس کے آب و رنگ ہیں،

"آتشیں ردی" "گرم" "شرر فشانی"۔ "دم" اور "نوا" کے سپرد یہ خدمت ہے کہ وہ آگ کو بھڑکاتے رہیں، چنگاریاں اڑاتے رہیں۔ غالب کے یہاں جو بات کہی جاتی ہے وہ منطقی اعتبار سے استوار ہوتی ہے خواہ استدلال شاعرانہ ہو۔ اور قاری کا ذہن تزئینات اور ترصیعات کی طرف نہیں بھٹکتا، لیکن سجاوٹیں اور بناوٹیں خموشی کے ساتھ اپنا کام کر جاتی ہیں۔ صرف سنوارتی اور سجاتی ہی نہیں بلکہ شعر کے حسن، تاثیر اور تموّل کو بڑھا جاتی ہیں۔

میری کمزوری کی کشاکش کے باعث جاں کنی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ روح کا جسم کے ساتھ رشتہ ٹوٹنے نہیں پاتا۔ یہ کمزوری کا ثمرہ ہے کہ میں ابھی تک مر نہیں پایا۔ قولِ محال کا انداز دیکھیے کہ کمزوری جو موت کی معاون اور اس کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ موت کے لیے سدِّراہ بن گئی ہے کمزوری کے زیرِ اثر مرنے والا اس رشتہ کو توڑ نہیں پایا۔ جو جان کو جسم سے جوڑ رکھتا ہے۔ شاعر کا محبوب مشغلہ یہ ہے کہ بہت سے مسلّمات کو الٹ پلٹ دے ہمیں نئے سرے سے سوچنے پر مجبور کر دے، اور یہ سمجھا دے کہ اشیا اور حقیقت کا ادراک زاویۂ نگاہ کی تبدیلی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

سوال و جواب کے انداز میں کسی نے کہا تھا۔

چرا خم گشتہ می گردند پیرانِ جہاندیدہ
بزیرِ خاک می جویند ایام جوانی را

جہاندیدہ بوڑھے جھکے ہوئے کیوں چل رہے ہیں، اپنی جوانی کے ایام کو خاک کے نیچے ڈھونڈ رہے ہیں۔ غالب کہتا ہے کہ بڑھاپے کی وجہ سے میں اس قدر جھک گیا ہوں کہ چلتا آگے کی طرف ہوں اور دیکھتا پیچھے کی طرف ہوں۔ مشرق کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو جائیے، پھر دوہرے ہو کر دیکھیے بہ ظاہر سامنے آپ کے مشرق ہے لیکن نظر مغرب آئے گا۔ برازیل کے شہرہ آفاق کھلاڑی "پیلے" نے ایک میچ میں گول اسی انداز سے کیا تھا۔ گیند (فٹ بال) لے کر اس نے اپنے گول کی طرف رخ کیا۔ مخالف سمجھے کہ اپنے کسی ساتھی کو جو پیچھے سے آرہا ہے، بال دے کر خود آگے بڑھے گا۔ ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی جب اس نے دوہرا ہو کر گیند مخالف ٹیم کے گول میں ڈال دی۔ شاعر کہتا ہے کہ میں بڑھاپے میں جو جھک گیا ہوں، دوہرا ہو گیا ہوں، وہ اس وجہ سے ہے کہ میں پیچھے کی طرف جوانی کی حسرت میں دیکھ رہا ہوں۔

دل نے مجھے مار رکھا ہے، دھوکے پر دھوکہ دیتا رہا ہے۔ معشوق نے مجھے دھوکہ دیا، دل نے کہا کہ وہ تم پہ

کرم کر رہا ہے۔ میں ایک ہی سوراخ سے دو بار ڈسا گیا۔ پہلے معشوقوں نے فریب دیا، پھر خود میرے دل نے۔

اس کی نگہ التفات میری طرف ہے لیکن ابرو پر بل پڑے ہوئے ہیں۔ رکاب اس قدر بھاری اور عنان اس قدر ہلکی۔ نگہ التفات سے ذوق و شوق کی خبر ملتی ہے۔ ہلکی عنان سرپٹ دوڑانے کا پتہ دیتی ہے۔ چین جبیں کی آڑ میں نگہ التفات برق کی سرعت کے ساتھ اپنا کام کر کے چلی گئی۔ چین ابرو کو گراں رکابی سے استعارہ کرنے کا کوئی صوری جواز نہیں ہے۔ لیکن استعارہ حسن تاثیر سے مملو ہے کیونکہ یہاں ذہنی اور وجدانی کیفیات کی تمثیل ملحوظ ہے۔ یہاں نہ قصد کو دخل ہے نہ ظاہری مشابہت کو۔

رقیب کے ساتھ عتاب، میرے ساتھ حجاب۔ کیا خوب ہے دلربائی کی وہ ادا، کیا قاتل ہے جانفشانی کا یہ انداز۔

ہم تو خالی ہاتھ ہیں، ہمیں زندگی سے کیا ملنے والا ہے۔ ہمارا شیوہ ہے سرمستی میں، عالم وجد و رقص میں آستین جھاڑ دینا۔ سعدی نے کہا تھا:

قرار در کفِ آزادگاں نہ گیرد مال
نہ صبر در دلِ عاشق نہ آب در غربال

آزاد منش لوگوں کے ہاتھ میں روپیہ نہیں ٹھہرتا جیسے عاشق کے دل میں صبر جیسے چھلنی کے اندر پانی۔
آستین جھاڑنے کے دو مفہوموں نے شعر کے لطف کو بڑھا دیا ہے اور اس میں تاثیر پیدا کر دی ہے۔ دعوے کو دلیل سے کمک ملی ہے۔

تم نے مجھے بشارت دی ہے کہ میرے سر پر ہما سایہ فگن ہوگا یعنی اقلیم سخن کی تاجداری میری قسمت میں لکھی ہے۔ میری شعری عظمت کا ایک عالم اعتراف کرے گا۔ لیکن مجھے اس سے کیا، میرے جیسے آزاد مزاج انسان کو ہما کا سایہ بھی گراں گزرے گا۔

خارج از ہنگامہ سرتاسر بہ بیکاری گزشت
رشتۂ عمر خضر مد حسابی بیش نیست

خضر کی طویل عمری کی اہمیت حساب لگانے سے زیادہ نہیں ہے۔ اُن کی ساری زندگی بیکاری میں اور بے کیف اور بغیر زیر و بم گزری۔

شوخیٔ اندیشۂ خوش شست سرتا پائی ما   تار و پود ہستیٔ ما ہیچ و تابی بیش نیست

ہمارا وجود سر سے پیر تک شوخیٔ اندیشہ، پروازِ فکر، قدرتِ تخیل سے عبارت ہے۔ پیچ و تاب ہی ہماری زندگی کا تانا بانا ہے۔ وہ زندگی ہی کیا جس میں مدّو جزر اور نشیب و فراز نہ ہوں۔

گرپس از جور بہ انصاف گراید چہ عجب　　از حیا روی بما گر ننماید چہ عجب

بود شِ از شکوہ خطر ورنہ سری داشت بمن　　بمزارم اگر از مہر بیاید چہ عجب

آنکہ چوں برق بہ یکجائی نہ گیرد آرام　　گلہ اش در دل اگر دیر نپاید چہ عجب

اگر وہ ظلم کے بعد انصاف کی طرف مائل ہو۔ یعنی اپنے جور و ستم پر منفعل ہو تو حیرت کی کیا بات ہے پشیمانی اور شرساری کی وجہ سے۔ اگر وہ ہمیں منہ نہ دکھائے تو یہ کوئی ایسی بے محل بات نہیں ہے۔ حیا سے ہماری طرف رخ نہ کرے تو کیا تعجب۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ ہمارا دلبر جور پر پشیمان ہوا تو ہم سے چھپ کر اس نے جور میں اور اضافہ کر دیا۔

دوسرے شعر میں بھی شاعر نے محبوب کی ستم ظریفی کو شکوہ کا خراج ادا کیا ہے۔ محبت اسے میری قبر کی طرف کشاں کشاں لے آئی۔ زندگی میں وہ اس لیے نہیں آیا کہ اُسے ڈر تھا کہ میں شکوہ کر کر کے اسے عاجز کر دوں گا۔ حُسنِ تلافی دیکھیے کہ میرے مرنے کے بعد میرے پاس آیا ہے۔

غالب نے معشوق کی ستم ظریفی کا تذکرہ ہمیشہ بڑے دلکش انداز میں کیا ہے۔ بالغ نظر شاعر جب کچھ کہتا ہے تو اس کا زاویۂ تخاطب سامنے کے سیاق و سباق سے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ مجازی معشوق کی ستم ظریفی ذہن کو اس معشوق کی ستم ظریفی کی طرف لے جاتی ہے جو پردۂ زنگاری میں چھپا ہوا ہے۔ انسانوں کو ستم ظریفی کا تختۂ مشق بنانا قدرت کا محبوب مشغلہ ہے۔

وہ جو بجلی کی طرح ایک پل نہیں ٹھہرتا، اس کی شکایت بھی اگر دل میں نہ ٹھہرے تو یہ حیرت کی بات نہیں ہے۔ یہاں بھی شاعر نے عام ردِ عمل اور روایتی طرزِ فکر کو پلٹ دیا ہے۔

از ہر بنِ مو چشمۂ خوں باز کشادم

آرایش بستر ز شفق می کنم امشب

میرے ہر بنِ مو سے چشمۂ خوں کا فوارہ چھوٹ رہا ہے۔ آج میں بستر کو شفق سے سجا رہا ہوں۔

مضمون فرسا ردیف اور دشوار قوافی سے عہدہ برآ ہونے کے بعد غالب کو احساس ہوتا ہے کہ اس کے بلکہ شعر کو قافیہ پیمائی زیب نہیں دیتی، چناں چہ غزل کے اختتام پر لاحول پڑھنے کے انداز سے وہ

اعتراف کرتا ہے کہ قافیہ پیمائی کر کے وہ قلم اور کاغذ پر ظلم کر رہا ہے۔

آمد و آورد، اخلاص و تصنع کا فرق اس کی نگاہ سے مخفی نہیں ہے۔ موشگافیاں اور مضمون آفرینیاں برحق، جذبہ اور تخیل اور ابداع و اختراع پر پابندیاں ناروا۔ کوئی بڑا شاعر اس بات پر راضی نہیں ہو سکتا کہ قافیہ کو مضمون کا سرچشمہ ٹھہرائے اور قافیہ کے سایہ کے تحت مضمون آفرینی کرے۔ "شفق"، "طبق"، "ورق" کے قافیوں کے تحت ردیف "امشب" کی تاریکی میں درخشاں شعر نکالنے کے باوجود غالب کو یہ بات کھٹک رہی تھی کہ مضمون قافیہ کا تابعِ فرمان بن جائے۔ اسدِ خستہ جاں کی آزاد مردی تخلص میں رنگ لائی اور شاعر نے اس طرز شعر گوئی سے اپنی برارت کا اعلان کر دیا۔ جس میں قافیہ شعر کی اساس ہو۔ قافیہ شعر کا جزو ہے۔ ایک اہم جزو، اور یہ زور، آہنگ اور زینت کے کام آتا ہے۔ یہ سب تسلیم لیکن اگر قافیہ کو فکر کا سرچشمہ بنا دیا تو فکر مرجھا جائے گی۔ تسلسل تو ٹوٹے گا ہی، وحدت تاثیر بھی متاثر ہو جائے گی۔ قافیہ سے تخیل کی فرماں دہی کا کام لیا گیا تو تخیل کے پَر کٹ جائیں گے۔

یاد از عدو نیارم و ایں ہم ز دوربینی است	کاندر دلم گزشتن یا دوستم نشستنی ست
در عالمِ خرابی از خیل منعمانم	سیلم برخت شوئی، برقم بخوشہ چینیست
میرم دلی بہ ترسم کز فرطِ بدگمانی	داند کہ جاں سپردن از عافیت گزینیست
در بادہ دیر مستم، آری ز سخت جانیست	در غمزہ زود رنجی، آری ز نازنینیست
من سوئی او بہ بینم، داند ز بی حیائیست	او سوئی من نہ بیند دانم ز شرمگینیست
ذوقیست در ادایت، قاصد تو خدایت	در جیب من بیفشاں خلدی کہ آستینیست
زیں خونچکاں نواہا دریاب ماجرا ایم	ہنگامہ ام اسیری، اندیشہ ام حزینیست
نازم بزود یابی نازد بگوش و گردن	چنداں کہ ابر نیساں در گوہر آفرینیست

کتنی پر لطف ہے یہ غزل، عجیب کیفیت ہے۔ مضمون ہر شعر کا مختلف لیکن فضا پوری غزل کی واحد۔

رقیب کا خیال بھی میں نے دل میں نہیں آنے دیا۔ میرا یہ طرز عمل دور اندیشی کی بنا پر ہے۔ رقیب کو یاد کروں گا، میرے دل میں اس کا گزر ہو گا۔ وہاں اسے میرے محبوب کے ساتھ بیٹھنے کا موقع مل جائے گا جو ہر وقت میرے دل میں رہتا ہے۔ بظاہر شعر کا حسن خیال آرائی پر مبنی ہے، لیکن ہمارا ذہن اس بنیادی

سچائی کی طرف کیوں نہیں جاتا کہ ہم ایسے دل کو جو محبوب کا مسکن ہے کدورت اور عداوت سے ناپاک کیوں کریں۔ محبت، پاکیزہ محبت یکسوئی کی طالب ہوتی ہے۔

اس خراب اور ویران دنیا میں میرا شمار صاحبانِ زر میں ہوتا ہے۔ جبھی تو مجھے سیلاب اور بجلی جیسے ملازمین کی خدمات حاصل ہیں۔ ایک میرے کپڑے دھونے اور دوسرا میرے بچے کھچے سامان کو ٹھکانے لگا دینے پر مامور ہے۔ یہ داستانِ عبرت تھی جو طنز کے پیرایہ میں بیان کی گئی۔

مرنے میں تو مجھے کوئی تامل نہیں لیکن یہ ڈر ضرور ہے کہ بدگماں محبوب مر جانے کو عافیت طلبی پر محمول کرے گا۔

شراب کا نشہ مجھے دیر سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ میری سخت جانی کی وجہ سے ہے۔ ہنگام ناز ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہو جانا تمہارے نازنین ہونے کی بنا پر ہے۔

میں اس کی طرف دیکھتا ہوں تو وہ سوچتا ہے کہ میں بے حیائی کی وجہ سے اسے گھور رہا ہوں۔ وہ میری طرف نظر نہیں کرتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ حیا حائل ہے۔ اس کی بدگمانی میری محبت کو بے حیائی قرار دیتی ہے۔ میرا حسنِ ظن اس کی بے مہری کو حیا پر محمول کرتا ہے۔ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا۔

میرے قاصد آج تو تمہارے انداز میں طرب کا عالم ہے۔ خدارا اس فردوس کو جیسے تم آستیں میں چھپائے ہوئے ہو۔ میرے گریباں میں ڈال دو۔ نامۂ محبوب کی شمیم عاشق کے مشام تک پہنچ گئی ہے اس کے ذوقِ طلب کی سرمستی قاصد کو پُر امید نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔

ماہ نیساں کا بادل موتی پیدا کرنے میں کیا مصروف ہو گیا کہ ہم دونوں کی عید ہو گئی۔ میں تو اس پر نازاں اور وجد کناں ہوں کہ ہرا رمغاں گہر ہائے شہوار دستیاب ہو گئے اور محبوب اپنے کانوں اور گردن پر نازاں ہے کہ ان کے حسن کو موتیوں نے اور چمکا دیا۔

بہ عرضِ شہرتِ خویش احتیاجِ ما دارد	چو شعلہ کہ نیاز او فتد بہ خار و خسش
صفا نیافتہ قلب از غش و مرا عمریست	کہ غوطہ می دہم اندر گداز ہر نفسش
ز رنگ و ... بوئے گل و غنچہ در نظر دارم	غبار قافلۂ عمر و نالۂ جرسش
جگر ز گرمی ایں جرعہ تشنہ تر گردید	فغاں ز طرزِ فریب نگاہِ نیم رسش
بہار پیشہ جوانی کہ غالبش نامند	کنوں ببیں کہ چہ خوں می چکد ز ہر نفسش

اپنی شہرت (کے اظہار) کے لیے اسے ہماری ضرورت ہے۔ شعلہ کی طرح کہ اسے ظاہر ہونے کے لیے خار وخس کی احتیاج ہوتی ہے۔ استدلال بردوش تشبیہ کس قدر فیصلہ اثر ہے۔

ایک عمر گزری میں اپنے دل کو ہر پگھلتی ہوئی سانس میں غوطہ دے رہا ہوں۔ لیکن ابھی تک وہ آلائش سے پاک نہیں ہوا۔ حیرت انگیز ہے شاعر کے ذہن کی رسائی اور صلاحیتِ ادا، چند لفظوں میں کتنی بڑی بات کہہ دی، کتنی سچی بات جو لفظاً بھی صحیح ہے اور معناً بھی۔

پھول اور کلی کے رنگ و بو کو دیکھ کر میرا ذہن عمر کے قافلے کی گرد اور کوچ کی گھنٹی کی طرف جاتا ہے۔ عمر کو اتنی ہی ثبات ہے جتنی پھولوں کو۔

اس کی نیم نگاہ کیسا فریب دے گئی۔ اس جرعہ نے جگر کی پیاس کو اور بڑھا دیا۔

وہ باغ و بہار جوان جس کا نام غالب ہے، ہائے ہائے دیکھو اب اس کی ہر سانس سے لہو ٹپک رہا ہے۔

چوں نہ میرد قاصد اندر رہ کہ رشکم بر نہ تافت
از زبانت نکتہ ہائی دلنواز آوردنش

قاصد کے راستہ میں مارے جانے پر حیرت کیوں کرتے ہو۔ رشک نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ تمہاری زبان سے دلنواز باتیں سنتا پھر مجھے سناتا۔ غالب نے رشک کے مضمون کو بہت سے اردو اور فارسی اشعار میں باندھا ہے لیکن یہ شعر اس لیے منفرد ہے کہ یہ رشک کی اس شدت کی خبر دیتا ہے جس نے قاصد کو قتل کروا دیا۔ محبت جو نہ کروا دے وہ کم ہے۔

آنچہ ہمدم ہر شب غم بر سرم می بگزرد	ہر سحر یکسر بہ دیوار سرایش می نویس
ای کہ با یارم خرامی گر دل و دستیت ہست	نامِ من در رہگزر بر خاک پایش می نویس
ہر کجا غالب تخلص در غزل بینی مرا	می خراش آں را و مغلوبی بجایش می نویس

اے ہم نشیں میرا ایک کام کر دیا کر۔ ہر شبِ غم مجھ پر جو گزرتی ہے۔ علی الصباح اسے اس کے مکان کی دیوار پر لکھ دیا کر۔ محبوب کو اپنے حالِ زار سے ہر روز باخبر رکھنے کی یہ تدبیر پہلے کسی کو نہیں سوجھی تھی۔ دیوار پر تحریر کی یہ نئی تعبیر ہے۔

تم تو میرے محبوب کے ساتھ ٹہلنے جاتے ہو۔ اگر ہمت اور دسترس ہو تو راہ میں اس کی خاک پا پر

میرا نام لکھ دیا کرو، مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔

غزلوں میں جس جگہ میرا تخلص غالب دیکھو اسے چھیل ڈالو اور اس کی جگہ مغلوب لکھ دو۔ لیل و نہار اور آلام روزگار نے غالب کی کمر توڑ دی۔ وہ شاعر سرافرازی اور افتخار جس کا شیوہ تھا۔ ہتھیار ڈال بیٹھا اور خود کو مغلوب سمجھنے لگا۔

یا پیش ازیں بلائی جگر تشنگی نہ بود | یا چوں من التفات بہ جیحوں نہ کردہ کس
یارب بزاہدازچہ دہی خلد رائگاں | جور بتاں ندیدہ و دل خوں نہ کردہ کس

یا تو اس سے پہلے جگر کی پیاس کا وجود ہی نہ تھا، یا کوئی میری طرح تونسا ہوا نہ تھا کہ دریا کا دریا پی جائے اور پیاس نہ بجھے۔ محبت کی پیاس، اعتراف کی طلب، شہرت کی تمنا، قدر کی آرزو۔ ان سب نے مل کر پیاس کو چہار آتشہ کر دیا تھا۔

یارب زاہدوں کو مفت میں جنت کیوں دی جا رہی ہے۔ پھر یہ کاہے کا انعام ہے، کس بات کی تلافی ہے؛ انھوں نے نہ تو حسینوں کا ظلم دیکھا ہے، نہ محبت میں دل خوں کیا ہے۔

لطفی بہ تحت ہر نگہ خشمگیں شناس | آرائش جبینِ شکر خاں زچیں شناس
بی پردہ تابہ مجرئ رازِ ما مجو | خوں گشتنِ دل از مژہ دآستیں شناس
آرایشِ زمانہ زبیداد کردہ اند | ہر خوں کہ ریخت غازۂ روئی زمیں شناس
بی غم نہاد مرد گرامی نمی نبود | زنہار قدر خاطر اندوہگیں شناس
غالب مذاق ما نتواں یافتن زما | روشیوۂ نظیریؑ وطرز حزیں شناس

مطلع کتنا درخشاں ہے۔ ہر غضب آلود نگاہ کے نیچے ایک عنایت چھپی ہوئی ہے۔ اسے پہچاننے کی کوشش کرو۔ ان طرحدار حسینوں کا جمال چیں جبیں سے دوبالا ہو جاتا ہے۔

دنیا کو ظلم سے زینت دیتے چلے آئے ہیں۔ بہتے ہوئے ہونے سلازیں کے چہرہ کے لیے غازہ کا کام کیا ہے۔ خونریزیوں کے عقب میں بہار آئی ہے۔ تہذیب کی گلکاری شہیدوں کے لہو سے ہوئی ہے۔ یہ پردہ بر انداز شعر انسانی تہذیب کے ارتقا کا اجمال ہے۔

غم کے بغیر انسان کی طبیعت کو وزن اور وقار نہیں ملتا، خدارا غم آشنا دل کی قدر کرنا سیکھو۔ یہ بات وہی اہل نظر کہہ سکتا ہے جو انسانی نفسیات پر عبور رکھتا ہو، اور جس نے معنی خیز نگاہوں سے زندگی کو

دیکھا ہو۔

غالب ہمارا ذوق ہم سے پا جاؤ، یہ ممکن نہیں۔ جاؤ پہلے نظیری کے اسلوب اور علی حزیں کے پیرایۂ بیان کو پہچانو۔ یہاں بھی زبان کو غدار تلے دبا کر بات کی جا رہی ہے۔ ایک تو سیدھا سادا مفہوم ہے کہ ہم شاعری میں نظیری اور علی حزیں کی روایت کے امین ہیں۔ دوسرے شوخی کے ساتھ وہی افتخار کی لَے جبت لگانا ٹھیک نہیں۔ ہم تک پہنچنا ہے تو منزل بہ منزل آؤ۔ پہلے علی حزیں اور نظیری کو سمجھو، پھر غالب کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ رستم زماں گاما کا یہی دستور تھا۔ کوئی پہلوان مبارز ہونا چاہتا تھا تو جواب ملتا کہ پہلے حمیدا سے لڑ کر دیکھ لو۔

مضمون کے خاتمہ پر اگر یہ امید کی جائے کہ غالب کی فارسی غزل کی یہ رونمائی ان قارئین کو جو فارسی زبان سے واقف ہیں غالب کے فارسی دیوان کو پڑھنے پر آمادہ کرے گی۔ تو یہ بات کوئی بے محل نہ ہوگی۔ معذرت البتہ ان قارئین سے کرنا ہے جس کی دسترس فارسی زبان تک نہیں (اور جن کی تعداد زیادہ ہے) کہ اشعار کا دوسری زبان میں منتقل کرنا بالعموم سعیٔ لاحاصل ہوتا ہے۔ بالخصوص جب وہ اشعار غالب کے ہوں جس کے پیچ وخم، زیر وبم کا ساتھ دینا آسان نہیں۔ غالب کی فارسی غزل، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ طلسم بندیٔ الفاظ اور سجاوٹوں اور بناوٹوں کے ساتھ مضامین کا خزینہ اور معانی کا گنجینہ لے کر چلتی ہے! اس کا تخیل بہ یک وقت بلند پرواز اور طرحدار ہے نئے انداز سے بانکپن کے ساتھ بات کہنے میں غالب کو خاص ملکہ ہے۔ اسلوب کی تراش خراش، پیرایۂ بیان کی کج کلاہی وہ وصف ہے جو غالب پر ختم ہو گیا۔ اس کی اردو غزل میں یہ عمل فارسی غزل سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ غالب کا یہ پُر اعتماد اعلان برحق ہے کہ وہ کسی بات کو دو بار ایک ہی ڈھنگ سے نہیں کہتا۔ اس کا تخیل کان ہے، لعل یمن کی، اس کے افکارِ آسمان پیما کا ایک قلیل حصہ اشعار کا پیکر اختیار کر پاتا ہے۔ اس کارخانے میں جہاں وہ شعر ڈھالتا ہے مشاہدہ اور تخیل باہم مل کر ایک آمیزہ تیار کرتے ہیں جو ہر آن نئی شکل اختیار کرتا ہے نئے سانچے قبول کرتا ہے، جہاں حواس کی دریافتیں فکر کی اڑانوں کے ساتھ گرم اختلاط نظر آتی ہیں۔ جہاں مرئی اور غیر مرئی کا اختلاف ختم اور ارتباط شروع ہو جاتا ہے۔ شاعر نے انسانی نفسیات کا جو ادراک تجربہ کے وسیلے سے حاصل کیا ہے، وہ اشعار میں لطافت کے ساتھ منعکس ہوتا ہے۔ جس دیار کی سیر ہم دیوان کے صفحات میں کرتے ہیں وہاں یاس اور افسردگی کا گزر ہی نہیں۔ وہ دیار ولولے، امنگ، محبت، حرکت اور شعلۂ وشرار سے تابناک ہے۔ یہاں

خلش ہے، رشک ہے، بدگمانیاں ہیں، شکوہ ہے، شوخی ہے، شگفتگی ہے، چھیڑ چھاڑ ہے، محبت ہے جس میں سے کبھی کبھی بے حجابی جھانکتی ہے۔ لیکن بات وزن اور وقار کے ساتھ کہی جاتی ہے۔ کس طرح کہا جارہا ہے، یہ کیا کہا جارہا ہے سے کم اہم نہیں۔ بات کس طرح کہی جائے، غالب کو اس کا حیرت انگیز اور حسن خیز سلیقہ ہے۔ فارسی میں غزل حریفانہ انداز سے کہی گئی ہے، گویا شعرائے متاخرین سے مبارز ہونا ہے۔ تفاخر کی لَے تیز ہونے کے باوجود گراں نہیں گزرتی۔

پانچسو ساٹھ غزلیں ہیں، ۳۰۷ صفحات پر پھیلی ہوئی، کوئی چھ ہزار اشعار پر مشتمل۔ فارسی پر شاعر کو تقریباً اہلِ زباں کی سی قدرت ہے۔

ای کہ نبوی ہرچہ نبود در تماشایش مپیچ نیست غیراز سیمیا عالم بہ سودایش مپیچ

موجہ از دریا شعاع از مہر حیرانی چراست محو اصل مدعا باش و براجزایش مپیچ

آخر از مینا بجاہ و پایہ افزوں نیستی بندۂ ساقی شود گردن زایمایش مپیچ

خود جب تیرا ہی وجود نہیں تو ان کی طرف گوشۂ خاطر کیوں، ان کی فکر کس لیے، جو تیری طرح بے وجود ہیں۔ دنیا تو فریبِ نظر ہے۔ اس کی تمنا میں کیوں پھنستا ہے۔

موج دریا سے اٹھتی ہے، کرن خورشید سے پھوٹتی ہے۔ تم اس میں حیران کیوں ہو، اصل مقصود میں خود کو محو کرلو۔ اس کے اجزا اور مظاہر سے نہ الجھو۔

آخر، تم مرتبہ اور حیثیت میں مینا سے بڑھ کر نہیں ہو، پھر ساقی کے غلام کیوں نہیں ہوجاتے، اس کے اشارے سے سرتابی کیوں کرتے ہو۔ مینا کے تصور کا تاثر ساقی کی گردن تک پہنچتا ہے۔

بادۂ پرتوِ خورشید وایاغِ دمِ صبح مفتِ آناں کہ در آیند بہ باغِ دمِ صبح

آفتابیم بہم دشمن و ہمدرد ای شمع ما ہلاکِ دمِ شامیم و تو داغِ دمِ صبح

غالب امروز بہ وقتی کہ صبوحی زدہ ایم چیدہ ام ایں گل اندیشہ زباغِ دمِ صبح

وہ لوگ جو منہ اندھیرے باغ کی سیر کو جاتے ہیں۔ انھیں شعاعِ خورشید کی صہبا اور جامِ سحر مفت ہاتھ آتے ہیں۔ شاعر کو طلوعِ خورشید کا حسن مخمور کردیتا ہے۔

اے شمع تم اور ہم ایک دوسرے کے ہمدرد ہیں اور دشمن بھی۔ ہمدرد اس لیے کہ ہمارے وجود کا آفتاب شام کی پھونک سے بجھ جاتا ہے اور شمع طلوعِ سحر کی روشنی کی نذر ہوجاتی ہے۔ دشمن اس لیے کہ

شمع روشن ہی جب کی جاتی ہے جب آفتاب غروب ہوتا ہے اور بجھائی اس وقت جاتی ہے جب آفتاب طلوع ہوتا ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کے وجود سے بَیر ہے۔ ہمدرد اس لیے کہ دونوں مظلوم ہیں، دونوں کو ناکردہ گناہ کی سزا دی جاتی ہے۔

ہر ذرہ محوِ جلوۂ حسنِ یگانہ ایست — گوئی طلسمِ شش جہت آئینہ خانہ ایست

حیرت بدہر بی سر و پا می برد مرا — چوں گوہر از وجودِ خودم آب و دانہ ایست

پا بستۂ نوردِ خیالی چو وارسی — ہر عالمی ز عالمِ دیگر فسانہ ایست

خود داریم بفصلِ بہاراں عناں گسیخت — گلگونِ شوق را رگِ گل تازیانہ ایست

ہر ذرہ در طریقِ وفائی تو منزلی — ہر قطرہ از محیطِ خیالت کرانہ ایست

در پردۂ تو چند کشم نازِ عالمی — داغم ز روزگار و فراقت بہانہ ایست

کائنات کا ذرہ ذرہ معشوقِ حقیقی کے حسنِ بے مثال میں محو ہے۔ گویا کائنات کا طلسم ایک آئینہ خانہ ہے جس میں جس زاویے سے دیکھیے معشوق کا پرتو پڑ رہا ہے۔

حیرت مجھے بیکار، دیوانہ وار دنیا میں لے جا رہی ہے۔ باوجود اس کے کہ میں موتی کی طرح قائم بالذات ہوں۔ آب و دانہ کی طلب لوگوں سے دنیا کی خاک چھنواتی ہے۔ موتی کی طرح گوہر یک دانہ میں خود ہوں۔ گوہر کی آب اس کے لیے آب و دانہ فراہم رکھتی ہے۔

زلکنت می تپد نبضِ رگِ لعل و گہر بارش — ہمہ تن انتظارِ جلوۂ نو رستہ گفتارش

ندانم راز دار کیست دل کز نا شکیبائی — کشم تا یک نفس لرزد بخود صد رہ زہنجارش

چو بینم زلف خم در خم بعارض ہشتہ گویم — کہ اینک حلقہ در گوش کمندِ عنبریں تارش

زہم پاشیدنِ گل افگند در تاب بلبل را — اگر خود پارہ ہائی دل فرو ریزد ز منقارش

ہتی دارم کہ گوئی گر بروئی سبزہ بخرامد — زمیں چوں طوطیٔ بسمل تپد از ذوقِ رفتارش

بنائی خانہ ام ذوقِ خرابی داشت پنداری — کہ آمد آمدِ سیلاب در رقصست دیوارش

غمم افگند در دشتی کہ خورشید درخشاں را — گداز زہرہ وقتِ جذبِ شبنم از سر خارش

اس کے موتی برسانے والے لبِ لعلیں کی رگ رگ کر دھڑک رہی ہے اس کی گفتگو اپنے جلوہ کے انتظار سے گھائل ہے۔ معلوم نہیں کہ شاعر کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ کیا محبوب کے ہکلانے

کی یہ ایک حسین توجیہ ہے۔

پتہ نہیں دل نے کس کے راز کو چھپا رکھا ہے، میں ایک سانس بھی لیتا ہوں تو دل خود بخود سو بار دھڑکنے لگتا ہے، اس فکر میں کہ راز فاش نہ ہو جائے۔ جب دیکھتا ہوں کہ تم نے خم کھائی ہوئی زلفوں کو رخساروں پر چھوڑ رکھا ہے تو عارض سے کہتا ہوں کہ اس کے عطر آگیں گیسوؤں کا یہ حلقۂ گوش ہے۔

گل کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھ کر بلبل بے تاب ہو جاتی ہے، کیا عجب کہ اس کی چونچ سے دل کے ٹکڑے ٹپک کر گرنے لگیں، یا یہ پھول کی پنکھڑیاں نہیں ہیں، بلبل کے دل کے ٹکڑے ہیں جو اس کی منقار سے گرے ہیں۔

اپنے محبوب کی خوبی کیا بیان کروں، یہ عالم ہے کہ اگر وہ سبزہ پر خرام ناز میں آئے۔ تو اس کے حسنِ خرام پر فریفتہ ہو کر زمین طوطیٔ بسمل کی طرح تڑپنے لگے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ میرے گھر کی بنیاد میں بربادی کا ذوق پنہاں کر دیا گیا تھا۔ سیلاب کو آتے دیکھ کر اس کی دیواریں وجد میں آگئیں، رقص کرنے لگیں۔

غم نے مجھے ایسے بیاباں میں لا ڈالا ہے کہ جب آفتاب اس کے کانٹوں کی نوک سے شبنم کے قطرہ کو اٹھانے کی کوشش کرتا ہے تو آفتاب کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔

خوشا عالم تن آتش بستر آتش	سپندی کو کہ افشانم بر آتش
ز رشک سینۂ گرمی کہ دارم	کشد از شعلہ بر خود خنجرِ آتش
بہ خلد از سردیٔ ہنگامہ خواہم	بر افروزم بگردِ کوثر آتش
دلی دارم کہ در ہنگامۂ شوق	سرشتش دوزخ ست و گوہر آتش
بسانِ موج می بالم بہ طوفاں	برنگ شعلہ می رقصم در آتش

کیا ہی اچھا یہ عالم ہے کہ میرا بدن آگ ہے اور بستر بھی آگ۔ نظر نہ لگ جائے، سپند لاؤ کہ آگ پر چھڑک دوں۔

میرے دہکتے ہوئے سینہ کے رشک میں آگ شعلہ کا خنجر اٹھا کر اپنے پہلو میں بھونک لیتی ہے۔

جنت میں اتنی خاموشی، ایسی ٹھنڈک ہے کہ جی چاہتا ہے کہ کوثر کے پہلو میں آگ جلا دوں، کچھ گرمی تو آئے، کچھ گہما گہمی تو ہو۔ میرا دل اس وضع کا ہے کہ گرمیٔ شوق سے اس کی سرشت میں دوزخ ہے

اور اس کا خمیر آگ سے اٹھا ہے۔

موج کی طرح میں طوفان میں فروغ پاتا ہوں۔ آگ کے اندر میں شعلوں کی طرح ناچتا ہوں۔

غالب کی ہنگامہ پسند اور شعلہ خو طبیعت کو سکوت، سکون، ٹھنڈک اور خاموشی راس نہیں آئی تھی۔ گھر کی رونق ہنگامہ پہ موقوف تھی۔ گرمیٔ محفل اور دل گرمی اور بزم کی رونق کے لیے حرکت اور نشوونما کے لیے، وجد اور رقص کے لیے، آگ ایک استعارہ بن گئی تھی جو اس کے اشعار میں نئے نئے پہلوؤں سے سرایت کیے ہوئے ہے۔ حرکت، خرام، وجد، رقص، موج، طوفان، نشوونما، شوق، ذوق، شعلہ، آتش، داغ، سوز، رشک، بے تابی، آتشِ سیال، تشنگی، یہی کردار شاعر کی دنیائے تخیّل میں خفیہ یا علانیہ گرمِ کار نظر آتے ہیں۔

امشب آتش روی گرم ژند خوانی ہاست	کز لبش نوا ہر دم در شرر فشانی ہاست
در کشاکش ضعفم نگسلد روان از تن	اینکہ من نمی میرم ہم زناتوانی ہاست
از خمیدنِ پشتم روی بر قفا باشد	تا بجہا دریں پیری حسرتِ جوانی ہاست
کشتۂ دلِ خویشم کز ستمگران یکسر	دیدِ دل فریبی ہا، گفت مہربانی ہاست
سوئی من نگہ دارد چیں فگندہ در ابرو	با گراں رکابی ہا خوش سبک عنانی ہاست
شوخیش در آئینہ محوِ آں دہن دارد	چشمِ سحر پرداز ش باب نکتہ دانی ہاست
با عدو عتا بستی وز منش حجا بستی	وہ چہ دلربائی ہا ہی چہ جانستانی ہاست
با چنیں تہی دستی بہرہ چہ بود از ہستی	کار ما ز سر مستی آتیں فشانی ہاست
ابکہ اندریں وادی مژدہ از ہما دادی	بر سرم ز آزادی سایہ راگرانی ہاست
ذوق فکر غالب را بردہ ز انجمن بیروں	با ظہوری و صائب محو ہمزبانی ہاست
تا در آب افتادہ عکس قدِ دلجویش	چشمہ ہمچو آئینہ فارغ از روانی ہاست

ایسا لگتا ہے کہ آج شب وہ شعلہ رو معشوق آتش پرستوں کی مقدس کتاب ژند کا مطالعہ کر رہا ہے۔ اس کے دہن سے ہر لمحہ چنگاریاں نکل رہی ہے۔ آتش روی، گرم، شرر فشانی سے محبوب کی شعلہ فشانی کا سماں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ جو تصویر کھینچی جا رہی ہے اس کے یہ آب و رنگ ہیں۔ "دم" اور "نوا" کے سپرد یہ خدمت ہے کہ وہ آگ کو بھڑکاتے رہیں چنگاریاں

اڑاتے رہیں۔ غالب کے یہاں جو بات کہی جاتی ہے وہ منطقی اعتبار سے واضح ہوتی ہے، اور قاری کا ذہن تزئینات کی طرف نہیں بھٹکتا۔ لیکن تزئینات خاموشی کے ساتھ اپنا کام کر جاتی ہیں۔ نہ صرف کارِ تزئین بلکہ شعر کے حسن، وزن، تاثیر اور تموّل کو بڑھانے کا کام بھی۔

کمزوری کی کشاکش کی وجہ سے سانس کا ڈورا ٹوٹنے نہیں پاتا۔ روح جسم سے الگ نہیں ہوپاتی یہ بھی کمزوری کا ثمرہ ہے کہ میں ابھی تک مر نہیں پایا۔ تخلیقِ شعر میں جب ذہانت کارفرما ہوجاتی ہے تو قارئین کا سابقہ قولِ محال کی دلکش مثالوں سے پڑتا ہے۔ اسے صنعت کہہ کر بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ شاعر کا محبوب شغلہ یہ ہے کہ بہت سے مسلّمات کو الٹ پلٹ دے، ہمیں نئے سرے سے سوچنے پر مجبور کر دیے اور یہ سمجھا دیے کہ اپنا اور حقیقتوں کا ادراک زاویۂ نگاہ کی تبدیلی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ عام تصور تو یہ ہے کہ فلاں شخص اتنا کمزور ہو گیا کہ مرض کی تاب نہ لاسکا اور مر گیا۔ شاعر یہ کہہ رہا ہے کہ میرے مرنے میں دیر اس لیے لگ رہی ہے کہ مجھ میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی کہ جسم اور روح کے رشتہ کو توڑ سکوں۔

سوال و جواب کے انداز میں کسی نے کہا تھا۔

چرا خم گشتہ می گردند پیران جہاں دیدہ
بہ زیر خاک می جویند ایام جوانی را

سوال: جہاں دیدہ بوڑھے جھکے ہوئے کیوں چل رہے ہیں؟ جواب: اپنے جوانی کے زمانے کو زمین کے نیچے ڈھونڈھ رہے ہیں۔ غالب کہتا ہے کہ بڑھاپے کی وجہ سے میں اس قدر جھک گیا ہوں کہ چلتا آگے کی طرف ہوں اور دیکھتا پیچھے کی طرف ہوں۔

مشرق کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو جائیے، پھر دوہرے ہو کر دیکھیے، بہ ظاہر سامنے آپ کے مشرق ہے لیکن نظر مغرب آئے گا۔ برازیل کے شہرۂ آفاق کھلاڑی 'پیلے' نے کانٹے کے ایک میچ میں گول اسی انداز سے کیا تھا۔ گیند لے کر بظاہر اس نے اپنے گول کی طرف رخ کیا۔ مخالف سمجھے کہ اپنے کسی ساتھی کو جو پیچھے سے آرہا ہے بال دے کر خود آگے بڑھے گا۔ ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ جب اس نے دوہرا ہو کر گیند مخالف ٹیم کے گول میں ڈال دی۔ شاعر کہتا ہے کہ میں بڑھاپے میں جو جھک گیا ہوں دوہرا ہو گیا ہوں، وہ اس وجہ سے ہے کہ میں پیچھے کی طرف جوانی کی حسرت میں دیکھ رہا ہوں۔

بس تو اپنے دل کا مارا ہوا ہوں، اسی نے مجھے ہمیشہ دھوکے میں رکھا اس نے یہ دیکھتے ہوئے

بھی کہ معشوق مجھے متواتر فریب دے رہے ہیں، کہا تو ہمیشہ یہی کہا کہ وہ مجھ پر مہربانی کر رہے ہیں مجھے دو بار دھوکا دیا گیا، پہلے معشوقوں نے فریب دیا پھر خود میرے دل نے، میں دو دفعہ ڈسا گیا۔

وہ ابرو پر بل ڈال کر میری طرف نگاہ کرتا ہے رکابی اس قدر بھاری اور عناں اس قدر ہلکی چینِ جبیں سے تامل، فکر خفگی اور بے دلی کا اعلان ہوتا ہے۔ نگاہ سے التفات، بے تکلفی اور ذوق و شوق کی خبر ملتی ہے۔ ہلکی عناں سرپٹ دوڑانے کا پتہ دیتی ہے۔ چین جبیں کی آڑ میں نگہ التفات برق کی سرعت سے ساتھ اپنا کام کر کے چلی گئی۔ چینِ ابرو کو گراں رکابی سے استعارہ کرنے کا کوئی صوری جواز نہیں ہے۔ لیکن استعارہ حسن تاثیر سے مملو ہے کہ یہاں ذہنی اور وجدانی کیفیات کی تمثیل ملحوظ ہے، یہاں نہ قصد کو دخل ہے نہ ظاہری مشابہت کو۔

اس کی شوخی دیکھیے، آئینہ میں اس کی نگاہ دہن سے ذرا دیر کے لیے نہیں ہٹتی۔ دہن سے وابستہ نہ جانے کیا کیا خیالات اس کے ذہن میں آتے ہیں۔ اس کی جادوئی آنکھیں گویا دروازہ ہیں نکتہ سنجی کا نکتہ سنجی سے اشارہ غنچہ دہنی کی طرف ہے۔

رقیب کے ساتھ عتاب، میرے ساتھ حجاب

کیا خوب ہے دلربائی کی وہ ادا، کتنا قاتل ہے جانستانی کا یہ انداز۔ ہم تو خالی ہاتھ ہیں، ہمیں زندگی سے کیا ملنے والا ہے۔

ہمارا شیوہ سرمستی میں آستیں جھاڑ دینا ہے۔ سعدی نے کہا تھا۔

قرار در کفِ آزادگاں نگیرد مال
نہ صبر در دلِ عاشق نہ آب در غربال

آزاد منش لوگوں کے ہاتھ میں مال نہیں ٹھہرتا۔ وہ پہلی فرصت میں آستین جھاڑ کر الگ ہو جاتے ہیں۔

تم نے مجھے بشارت دی ہے کہ مرے سر پر ہما سایہ فگن ہوگا یعنی اقلیم سخن کی تاجداری میری قسمت میں لکھی ہے، میری عظمت کا دنیا اعتراف کرے گی۔ لیکن مجھے اس سے کیا؟ میرے جیسے آزاد مزاج انسان کو تو سایہ بھی گراں گزرتا ہے، خواہ وہ سایہ ہما کا ہی کیوں نہ ہو۔

خارج از ہنگامہ سرتا سر بہ بیکاری گزشت
رشتۂ عمر خضر مدِّ حسابی بیش نیست

خضر کی عمر کا طول دنوں کو جوڑنے سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ زندگی ہی کیا جس میں ہنگامہ نہ ہو۔ زندگی کی رونق ہنگاموں پر موقوف ہے۔

شوخیٔ اندیشۂ خویشست سرتاپائی ما
تار و پودِ ہستیٔ ما بیچ وتابی بیش نیست

ہمارا وجود سر سے پیر تک، شوخیٔ اندیشہ سے عبارت ہے۔ پیچ وتاب ہی ہماری زندگی کا تانا بانا ہے۔ وہ زندگی ہی کیا جس میں پیچ وتاب نہ ہو۔

جلوہ کن منّت منہ از ذرّہ کمتر نیستم
حُسن باایں تابناکی آفتابی بیش نیست

سامنے آ، جلوہ دکھا، میں ذرہ سے کمتر نہیں ہوں۔ تمہارا روئے تاباں ہر چند درخشاں سہی، خورشید سے بڑھ کر نہیں ہے۔ میں ذرہ سے کمتر نہیں، تم خورشید سے برتر نہیں، تو وہ تعلق تو رکھو جو خورشید ذرہ کے ساتھ رکھتا ہے۔ مجھے اسی طرح منور کردو۔

ریگ در بادیۂ عشق روا نست ہنوز
تاچہا پائی دریں راہ بفرسودن رفت

نہ معلوم کتنے پانو اس راہ پر چلتے چلتے گھس گئے۔ عشق کے صحرا میں ریت کے گرمِ سفر رہنے کا وہی انداز ہے۔

خیال کی بساط نے تمھیں اسیر کرلیا ہے، اگر اس گرداب سے نکلو تو پتہ چلے گا کہ ہر دنیا کسی دوسری دنیا کی داستان ہے۔

فصل بہاراں میں میری خودداری نے مجھے عناں تڑانے پر مجبور کردیا۔ سمندِ گلگونِ شوق پر رگِ گل نے تازیانہ کا کام کیا۔

ہر ذرہ تیری وفا کی راہ میں ایک منزل ہے۔ ہر قطرہ تیرے خیال کے قلزم کا ساحل ہے۔

تمہارے پردہ میں دنیا کی ناز برداری کب تک کروں؛ میں تو زمانہ کا مارا ہوا ہوں، لیکن بہانہ بنا لیا ہے میں نے تمہارے ہجر کو۔

اور بھی غم ہیں زمانہ میں محبت کے سوا

شاعر اس نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ہمارے احساسات اور ہمارے جذبات اور افعال کے محرکات اس طرح دست و گریباں اور شیر و شکر ہو جاتے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنا اور اعتماد کے ساتھ یہ کہنا کہ اس احساس یا عمل کا سرچشمہ کیا ہے، دشوار ہو جاتا ہے۔ اکثر محرکات اور نیتیں باہم گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔

گر پس از جور بانصاف گراید چہ عجب — از حیا روئی بہ ما گر نہ نماید چہ عجب
بودش از شکوہ خطر، ورنہ سری داشت بمن — بمزارم اگر از مہر بیاید چہ عجب
آنکہ چوں برق بہ یکجائی نگیرد آرام — گلہ اش در دل اگر دیر نپاید چہ عجب

اگر وہ ظلم کے بعد انصاف کی طرف مائل ہو تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ حیا سے ہماری طرف رخ نہ کرے تو کیا تعجب وہ جور پر پشیماں کیا ہوا جور میں اور اضافہ کر دیا۔

یہ ہمارے مقدر کی خوبی ہے اور محبوب کی ستم ظریفی کہ وہ ہمارے ساتھ انصاف کرنا چاہتا ہے تو وہ انصاف ظلم کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

محبت اگر اسے میری قبر کی طرف کشاں کشاں لے آئے تو یہ حیرت کی بات نہ ہوگی۔ زندگی میں جو وہ میرے پاس آنے سے گریز کرتا تھا اس کی وجہ یہ تھی وہ ڈرتا تھا کہ میں چھوٹتے ہی اس کی شکایت شروع کر دوں گا۔

غالب نے معشوق کی ستم ظریفی کا تذکرہ ہمیشہ بڑے دلکش انداز میں کیا ہے۔ بالغ نظر شاعر جب کچھ کہتا ہے تو اس کا زاویہ تخاطب سامنے کے سیاق و سباق سے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ مجازی معشوق کی ستم ظریفی ذہن کو اس معشوق کی ستم ظریفی کی طرف لے جاتی ہے جو پردۂ زنگاری میں چھپا ہوا ہے۔ انسانوں کو ستم ظریفی کا تختۂ مشق بنانا قدرت کا محبوب مشغلہ ہے۔

وہ جو بجلی کی طرح ایک پل نہیں ٹھہرتا اس کی شکایت بھی اگر دل میں نہ ٹھہرے تو یہ حیرت کی بات نہیں ہے۔

از ہر بُنِ مو چشمۂ خوں باز کشادم — آرایش بستر ز شفق می کنم امشب
مَی می چکد از لعلِ لبش در طلب نقل — مشتی ز کواکب بہ طبق می کنم امشب
نازم سخنش را و نیابم دہنش را — خوش تفرقہ در باطل و حق می کنم امشب
غالبؔ نبود شیوۂ من قافیہ بندی — ظلمیست کہ بر کلک و ورق می کنم امشب

ہر بُنِ موسے لہو کا فوّارہ چھوٹ رہا ہے ۔ آج میں بستر کو شفق سے سجا رہا ہوں، نُقل کی فرمائش کرتے ہوئے اس کے لب لعلیں سے شراب ٹپک رہی ہے لہٰذا میں مٹھی بھر ستارے طبق میں لیے کھڑا ہوں۔

اس کی بات پر مجھے ناز ہے لیکن اس کے دہن تک میں نہیں پہنچا ہوں۔ یعنی میں حق و باطل میں بخوبی امتیاز کر رہا ہوں۔

یاد از عدو نیارم و انہم زدور بینیست	کاندر دلم گزشتن با دوست ہم نشینیست
در عالمِ خرابی از خیل منعما نم	سیلم بر رخت شوئی، برقم بخوشہ چینیست
میرم ولی بتر سم کز فرطِ بدگمانی	داند کہ جاں سپردن انعافیت گزینیست
در بادہ دیر مستم آری ز سخت جانیست	در غمزہ زود رنجی آری ز ناز نینیست
من سوئے او بہ بینم داند ز بی حیائیست	او سوئے من نہ بیند دانم ز شر گینیست
ذوقیست در ادایت قاصد تو در خدایت	در جیب من بیفشاں خلدی کہ آستینیست
زیں خوں چکاں نواہا دریاب ماجراہا	ہنگامہ ام اسیری اندیشہ ام حزینیست
نازم بزود یابی تا زد بگوشش در گردن	چنداں کہ ابر نیساں در گوہر آفرینیست

کتنی پر لطف ہے یہ غزل۔ ہر شعر میں رس بھرا ہوا ہے۔ عجب کیفیت ہے۔ مضمون ہر شعر کا مختلف لیکن فضلِ پوری غزل کی واحد۔ ایک بظاہر بہت اچھا شعر حذف ہو گیا کہ اس کے معنی اطمینان کی حد تک سمجھ میں نہیں آئے۔ راقم سطور نے یہ برتاؤ مختلف غزلوں میں متعدد اشعار کے ساتھ کیا ہے۔ مفہوم سمجھ میں نہ آئے تو کس سے پوچھنے جائیے۔ فارسی دانی، تِس پر غزل فہمی، کمیاب جنس ہے۔ طلب صادق اور فرصت مساعد ہو تو اسی دلّی شہر میں یا علی گڑھ یا لکھنؤ یا پٹنہ یا حیدر آباد میں ایسے لوگ مل جائیں گے جو شعر فہمی کی مشکلات کو پانی کر دیں گے۔ طلب تو شاید غیر صادق نہیں لیکن فرصت ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ تکمیل میں اس مضمون کے دیر ہو گئی تو ڈر کیا یقین ہے کہ یہ بھی عمرو عیار کی اس زنبیل میں پہونچ جائے جس میں واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے حذفِ اشعار کو تو شاید قارئین معاف بھی کر دیں لیکن شارح کی اس خلش کو کیا کیجیے کہ بعض جگہ مفاہیم غلط بیان ہو گئے ہوں یا تشریح ناکافی رہ گئی ہو یا اشعار دُہرا دیے گئے ہوں تشریح کی وسعت تو خیر اس مضمون میں نکل نہیں پائی لیکن اس کا غالب امکان ہے کہ شعر کے ادراک میں دقتاً فوقتاً سہو ہوا ہو۔

میں رقیب کا خیال بھی میں دل میں نہیں آنے دیتا۔ اس لیے نہیں کہ مجھے رقیب سے کوئی نفرت ہے۔

میرا یہ طرزِ عمل دور اندیشی کی بنا پر ہے۔ میں رقیب کو یاد کروں گا، میرے دل میں اس کا گزر ہو گا۔ وہاں اس کی مڈبھیڑ محبوب سے ہو جائے گی جو ذرا دیر کے لیے بھی میرے دل سے دور نہیں ہوتا۔ اور یہ میں کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا۔

اس خستہ حال دنیا میں میرا شمار خوشحالوں کے طبقہ میں ہوتا ہے۔ کیوں کہ سیلاب میرے سامان کو دھونے اور بجلی میری خوشہ چینی پر مامور ہے۔

مجھے مرجانے میں کوئی تامل نہیں کہ اس کے علاوہ میرے لیے کوئی چارہ نہیں رہا ہے، لیکن مجھے ڈر ہے کہ بدگماں محبوب سمجھے گا کہ میں ایسا آرام طلبی کی وجہ سے کر رہا ہوں اور محبت کی تکلیفیں میری برداشت سے باہر ہیں۔

شراب کا نشہ مجھے دیر سے ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ میری سخت جانی کی وجہ سے ہے۔ ہنگامِ ناز ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہو جانا تمہارے نازنین ہونے کی بنا پر ہے۔

میں اس کی طرف دیکھتا ہوں، سوچتا ہے کہ میں بے حیائی کی وجہ سے اُسے گھور رہا ہوں۔ وہ میری طرف نظر نہیں کرتا، میں سمجھتا ہوں کہ حیا حائل ہے۔

میرے قاصد آج تو تمہارے انداز میں طرب کا عالم ہے، خدارا اس فردوس کو جسے تم آستین میں چھپائے ہوئے ہو، میرے گریبان میں الٹ دو۔ نامۂ محبوب کی شمیم عاشق کے مشام تک پہنچ گئی ہے۔ اس کی پر امید نگاہیں اپنے ذوقِ طلب کی سرمستی کو قاصد تک منتقل کر دیتی ہیں۔

ان صداؤں سے جو ہو چکا رہی ہیں، تم پر ساری کیفیت روشن ہو جائے گی۔ اگر شور برپا دیکھو تو جان لو کہ نواسیر تڑپ رہا ہے، اور اگر نسبتاً خاموشی ہے تو سمجھ لو کہ وہ مغموم اور فکرمند بیٹھا ہے۔

ماہِ نیساں کا بادل موتی پیدا کرنے میں کیا مصروف ہو گیا کہ ہم دونوں کی عید ہو گئی، میں تو اس پر فخر اور وجد کر رہا ہوں کہ گہر ہائے شہوار اتنی آسانی سے دستیاب ہو گئے اور محبوب اپنے کانوں اور گردن پر ناز کر رہا ہے کہ ان کے حسن کو موتیوں نے اور چمکا دیا۔

بہ عرضِ شہرتِ خویش احتیاج ما وارد	چو شعلہ کہ نیاز او فتد بخار و خسش
صفا نیافتہ قلب از عشق دمِ اعمر یست	کہ غوطہ می دہم اندر گدازِ ہر نفسش
ز رنگ و بوی گل و غنچہ در نظر دارم	غبارِ قافلۂ عمر و نالۂ جرسش

جگر زگرمیٔ ایں جرعہ تشنہ تر گردید　　　فغاں زطرزِ فریب نگاہ نیم رسش

بہار پیشہ جوانی کہ غالبش نامند　　　کنوں بہ بیں کہ چہ خوں می چکد زہر نفسش

اپنی شہرت کے لیے اسے ہماری ضرورت ہے۔ شعلہ کی طرح کہ اسے خار و خس کی احتیاج ہوتی ہے۔

ایک عمر گزری میں اپنے دل کو ہر پگھلتی ہوئی سانس میں غوطہ دے رہا ہوں لیکن ابھی تک وہ آلایش سے پاک نہیں ہوا۔

پھول اور کلی کے رنگ و بو کو دیکھ کر میرا ذہن عمر کے قافلہ کی گرد اور کوچ کی گھنٹی کی طرف جاتا ہے۔ عمر کو اتنی ہی ثبات ہے جتنی پھول کو۔

اس کی نیم نگاہ کیسا فریب دے گئی، الاماں۔ اس گھونٹ نے تو جگر کی پیاس کو اور بڑھا دیا۔

وہ باغ و بہار جوان جسے غالب کہتے ہیں۔ ہائے ہائے دیکھو اس کی ہر سانس سے لہو ٹپک رہا ہے۔

امتحانِ طاقتِ خویشت از بیداد نیست

خلق را در نالہ ہائی جاں گداز آوردنش

اس نے جو خلق خدا کو ایسے نالہ و فریاد میں مبتلا کر دیا ہے جو دل کو پگھلا دیتی ہے، یہ نہ سمجھنا کہ اس کا مقصود ظلم و ستم ہے۔ وہ تو اپنی طاقت کی آزمائش کر رہا ہے۔

چوں نمیرد قاصد اندر رہ کہ رشکم برنتافت

از زبانت نکتہ ہائی دلنواز آوردنش

قاصد کے راستہ میں مارے جانے پر حیرت کیوں کرتے ہو۔ رشک نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ تمہاری زبان سے دلنواز باتیں سنتا۔ غالب نے رشک کے مضمون پر بہت سے اشعار کہے ہیں، لیکن یہ شعر اس لیے منفرد ہے کہ شدتِ رشک نے انھیں قاصد کے قتل پر آمادہ کر دیا ہے۔

آنچہ ہمدم ہر شب غم بر سرم می بگذرد　　　ہر سحر یکسر بہ دیوارِ سرایش می نویس

خواری کاندر طریق دوست داری رو دہد　　　از مدادِ سایۂ بالِ ہمایش می نویس

ای کہ با یارم خرامی گر دلت در شست ہست　　　نام من در رہگذر بر خاکِ پایش می نویس

هر کجا غالب تخلص در غزل بینی مرا	می تراش آزاد و مغلوبی بجایش می نویس

اے ہم نشیں میرا ایک کام کر دیا کر، ہر شب غم مجھ پر جو گزرتی ہے، علی الصباح اُسے اس کے مکان کی دیوار پر لکھ دیا کر۔

دوستی کے راستے میں جو ذلت ہم کو اٹھانی پڑتی ہے۔ اس کو لکھنے کے لیے بال ہما کے سایہ سے سیاہی بنا اور بے کم و کاست قلم بند کر دے۔ تاکہ اس کا اقبال اور ہمارا ادبار یک قلم الم نشرح ہو جائے۔

تم کہ مرے محبوب کے ساتھ ٹہلنے جاتے ہو، اگر ہمت اور دسترس ہو تو راستہ میں اس کی خاک پا پر میرا نام لکھ دو کہ میرے لیے یہ خوش بختی کی انتہا ہوگی۔

غزل میں جس جگہ بھی میرا تخلص غالب دیکھو اسے چھیل ڈالو اور اس کی جگہ مغلوب لکھ دو۔ لیل و نہار اور آلام روزگار نے غالب کے ولولوں کو اس درجہ پست کر دیا کہ وہ شاعر سرافرازی و افتخار جس کا شیوہ تھا ہتھیار ڈال کر خود کو مغلوب سمجھنے لگا۔

یا پیش ازیں بلائی جگر تشنگی نہ بود	یا چوں من التفات بہ جیحوں نکردہ کس
یارب بزاہدان چہ دہی خلد رائگاں	جور بتاں ندیدہ و دل خون نکردہ کس
غالب زحیرتی چہ سرائی کہ در غزل	چوں او تلاش معنی و مضمون نکردہ کس

یا تو اس سے پہلے جگر کی پیاس کی بیماری کا وجود ہی نہ تھا، یا میری طرح کسی نے خود کو جیحون آشامی پر مجبور نہیں پایا۔ نتیجہ واحد ہے۔

اس سے پہلے عشق کی آگ نے کسی کے دل و جگر کو اس طرح جھلسا نہیں تھا کہ وہ دریا پی جائے اور پیاس نہ بجھے۔

یارب زاہدوں کو مفت میں جنت کیوں دی جا رہی ہے۔ انھوں نے نہ تو حسینوں کا ظلم دیکھا ہے، نہ محبت میں دل خوں کیا ہے۔ غالب حسرتی (مصطفٰے خاں شیفتہ) کی کیا بات کرتے ہو کہ غزل میں اس کی طرح معنیٰ و مضمون کی تلاش کسی نے نہیں کی۔

لطفی بہ تحت ہر نگہ خشمگیں شناس	آرایش جبیں شکرفاں زچیں شناس
بی پردہ تاب محرمی راز ما مجوئی	خوں گشتن دل از مژہ و آستیں شناس
آرایش زمانہ ز بیداد کردہ اند	ہر خوں کہ ریخت غازۂ روئی زمیں شناس

در راہ عشق شیوۂ دانش قبول نیست　　حیف است سعی رہروِ پا از جبیں شناس

بی غم نہادِ مرد گرامی نمی شود　　زنہار قدرِ خاطرِ اندوہگیں شناس

غالب مذاق ما نتواں یافتن زما　　رو شیوۂ نظیری و طرزِ حزیں شناس

مطلع کتنا درخشاں ہے۔ ہر غضب آلود نگاہ کے نیچے اک طرزِ التفات چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ اسے پہچاننے کی کوشش کرو۔ ان طرحدار حسینوں کا حسن چین جبیں سے دوبالا ہوتا ہے۔

یہ جاننے کے لیے کہ ہم محرم راز ہیں یا نہیں، اس کی امید نہ رکھو کہ ہم اس کا برملا اعلان کریں گے۔ اگر یہ دیکھنا ہے کہ ہمارا دل خون ہوا ہے تو نہ دل میں جھانکو نہ زباں ٹٹولو۔ یہ راز پلک سے پوچھو یا آستیں سے۔

دنیا کو ظلم سے زیب و زینت دیتے چلے آئے ہیں، بہتے ہوئے لہو نے زمیں کے چہرہ کے لیے غازہ کا کام کیا ہے۔ خوں ریزیوں کے عقب میں بہار آئی ہے۔ فردوس بروئے زمین میں خوں ریزی بہار دیکھیے۔ غم کے بغیر انسان کی طبیعت کو وزن و وقار نہیں ملتا۔ خدارا، غم آشنا دل کی قدر پہچانو۔

غالب، ہمارا ذوق ہم سے پا جاؤ یہ ممکن نہیں۔ جاؤ پہلے نظیری کے اسلوب اور علی حزیں کے پیرایۂ زباں کو پہچانو۔

داغ تلخ گویانم، لذتِ سم از من پرس　　محوِ تند خویانم حیرتِ رم از من پرس

موجی از شرابستم لختی از کبابستم　　شورِ من ہم از من جوئی سوزِ من ہم از من پرس

بوسہ از لبانم دہ عمرِ خضر از من خواہ　　جام می بہ پیشم نہ، عشرتِ جم از من پرس

میں تلخ گویوں پر فریفتہ ہوں، زہر کی لذت مجھ سے دریافت کرو، میں تند خو معشوقوں پر فدا ہوں، رم کی حیرت کی لذت مجھ سے پوچھو۔

میں شراب کی ایک موج ہوں، کباب کا ایک ٹکڑا ہوں میرے ہنگامہ کی کیفیت مجھ سے ہی پوچھو، میرے دل کے سوز و گداز کا حال مجھ سے ہی دریافت کرو۔

اپنے ہونٹوں کا بوسہ مجھے دے دو، پھر عمرِ خضر کے بارے میں مجھ سے سوال کرو۔ میرے سامنے جام رکھ دو پھر مجھ سے عشرتِ جمشید کی بات کرو۔

پھر دیکھیے اندازِ گلفشانیٔ گفتار　　رکھ دو کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

عشرتِ جم سے مراد عیش و عشرت اور شان و شکوہ ہے اور اشارہ ہے اس باخبری اور بصیرت کی طرف جام جم

سے جو حاصل ہوتی تھی۔

داغِ شوق تو بہ آرائشِ دلہا سرگرم | زخمِ تیغِ تو بہ گلگشتِ جگر ہا گستاخ
باخبر باش کہ دردی کہ زبیدردئ تست | نالہ را کرد ز اظہارِ اثر ہا گستاخ
شادگردم کہ بہ خلوت نہ رسید ست رقیب | بینمش چوں بہ تو در راہ گزر ہا گستاخ
ہای ایں پنجہ کہ باجیب کشا کش دارد | بود با دامنِ پاکت چہ قدر ہا گستاخ
طوطیاں در شکر آبند بہ غالبؔ کاوراست | بے از نطق بہ تاراج شکرہا گستاخ

تمہاری محبت کے داغ دلوں کی زینت بن رہے ہیں۔ تمہاری تلوار کے زخم گلگشتِ جگر میں بے باک ہیں۔

نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں | یہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے

یہاں تیغ جگر کشائی کا کام کر رہی ہے۔ تیغ کے وار سے جگر کیا کھلا چمن بن گیا جس کی سیر تلوار کے لگائے ہوئے زخم کر رہے ہیں۔

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ | زخموں نے ہی جگر کو گلزار بنایا

اور زخم ہی اس گلزار کی سیر کر رہے ہیں۔ عمل اور اثر، فعل اور انجام اس طرح دست و گریباں ہوگئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا دشوار ہے۔ یہ اندازِ بیان اختصار اور بلاغت کی معراج ہے۔ اس پر مستزاد شکوہ دروبست اور ترصیع۔ سنگلاخ زمین کو کس قادر الکلامی کے ساتھ پانی کر دیا ہے۔

ذرا ہوشیار رہنا اس درد سے جو تمہاری بے دردی نے ہمیں دیا ہے۔ اب نالہ بندشوں سے آزاد ہوگیا ہے، لہٰذا بے باکی کے ساتھ اثر کر کے رہے گا۔

رقیبِ بوالہوس سرِراہ تمہارے ساتھ بے باکی اور بے حجابی کا برتاؤ کر رہا ہے۔ افرنگ کی رہگزاروں میں یہ منظر بہت عام ہے، لیکن مجھے یہ گستاخی ناگوار نہیں، میں تو یہ سوچ کر مطمئن ہوں کہ وہ تمہاری خلوت تک نہیں پہنچا ہے۔ اگر اختلاط سے آسودہ ہو چکا ہوتا تو یوں ننگوں بھوکوں کی طرح سرِراہ بے تابی بے حجابی کی باتیں نہ کرتا۔ دیکھیے شاعر نے عام ردعمل کو کس طرح الٹ دیا ہے۔ مضمون مختلف ہے لیکن انداز وہی ہے۔

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے | ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

حیف کہ یہ ہاتھ جو تیرے دامن سے بے باکیاں کرتے تھے اب میرے گریبان میں الجھے ہوئے جنوں میں جامہ دری کر رہے ہیں۔

طوطیوں کو غالب سے شکر رنجی ہے اس کی شکر شکنی کی بنا پر۔ غالب کی سی شیریں گفتاری وہ کہاں سے لائیں۔

حافظ نے کہا تھا۔

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند
زیں قندِ پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

شاید غالب کو گمان ہے کہ قندِ پارسی کو جو بنگال جا رہی تھی اس نے دلّی میں روک لیا لیکن گمانِ غالب یہ ہے کہ ایسا ان سے پہلے نظیری کر چکا تھا۔ جس کا ذکر غالب کی فارسی غزل میں کئی بار آیا ہے ہم آگے چل کر دکھائیں گے کہ نظیری کا اسلوب سخن کیا ہے۔

غالب کے کلام کی، عام اس سے کہ وہ فارسی ہے یا اردو، سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے، بڑی سج دھج، لوک پلک اور بانکپن کے ساتھ کہتا ہے۔ تخیل کا عمل خیال یا فکر تک محدود نہیں رہتا وہ اپنی شگرف کاری اندازِ بیان میں بھی دکھاتا ہے فکر اور پیرایہ بیان کے لیے ہر شعر میں ایک نئی راہ نکلتی ہے۔ فارسی اشعار میں اس وصف کا رنگ کچھ اور زیادہ گہرا ہے۔ نازک خیالی ہے، بلند پروازی ہے۔ استدلال ہے، شعری منطق اپنے کمالات کا اظہار کرتی ہے۔ یہ اشعار اصرار کرتے ہیں کہ قارئین کے دل و دماغ دونوں بہ یک وقت حظ اندوز ہوں، جو نشتر دل پر لگتے ہیں وہ دماغ سے گزرتے ہوئے اپنی دھار تیز کرتے جائیں۔ لیکن دور از کار پیچیدگیاں اور موشگافیاں ان اشعار میں آپ کو نہیں ملیں گی۔ غالب کا ملکۂ شعر اُسے شعری کرتب سے دور رکھتا ہے۔ فارسی غزل میں ڈھونڈنے پر بھی ایسے اشعار نظر نہیں آتے جو مشکل گوئی کی خاطر کہے گئے ہوں یا جہاں جذبہ اور احساس کو نچوڑ کر ٹپکا دیا گیا ہو۔ خشک عقلیت اور بے جان استدلال اور بے رس پرواز سے شاعر کا دامن کمال بے داغ ہے۔ غالب کی فارسی غزل کو پڑھتے وقت قارئین کا ردعمل سرسری ہو ہی نہیں سکتا کیوں کہ وہ پوری یکسوئی اور ارتکاز کا مطالبہ کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اس کی پذیرائی ادھوری شخصیت یا ادھوری توجہ سے نہیں ہوتی۔ جو میں کہنا چاہتا ہوں اس کو واضح کرنے کے لیے طب سے مدد لینا شاید ناروا نہ ہو۔ شعر اور طب میں

کوئی ایسی مغائرت بھی نہیں ہے۔ پہلے ہمارے یہاں نصابِ تعلیم میں شعروادب اور طب کو یکساں اہمیت دی جاتی تھی۔ یوں بھی طب کا طریقِ کار جسمانی بیماریوں کا بالقصد علاج ہے، اور شعر بلا ارادہ بلکہ ضمناً اخلاق کو سنوارتا ہے یا کم ازکم احساسات، تجربات اور خیالات سے اثر لینے کی صلاحیت کو بڑھاتا ہے۔ دلّی اور لکھنؤ میں اطبّا کے دو بڑے خاندان یا یونانی طب کے دو ممتاز دبستان گزرے ہیں۔ شریفیہ اور عزیزیہ۔ لکھنؤ میں علاج بالعموم مفردات سے کرتے تھے اور دلّی میں مرکبات سے۔ غالبؔ کے اشعار دل ودماغ پر یلغار مرکبات کے ذریعہ کرتے ہیں، جذبہ فکر کا ساتھ نہیں چھوڑتا، نہ تخیل ان دونوں کا۔ جذبہ اور فکر کا اتنا متوازن آمیزہ اور تخیل اور اظہار کا ایسا متناسب اتحاد کہ اگر اس کی فضا میں کچھ عرصے سانس لے لیں تو پھر دوسروں کی تخلیقات کی دنیا میں دل نہیں لگتا۔ راقم سطور کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ غالبؔ کو پڑھنے کے بعد نظیریؔ کے دیوان کی ورق گردانی کی۔ دل بستگی اس درجۂ حرارت کو نہ چھو پائی۔ جہاں غالبؔ نے پہنچا دیا تھا۔ حالاں کہ نظیریؔ کا مرتبہ غزل گوئی میں غالبؔ سے بڑھ کر ہے۔ نیت یہاں موازنہ کی نہیں۔ ہر شاعر قاری سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس کی بسائی ہوئی دنیا میں بود وباش اختیار کرے۔ وہاں کی فضا میں سانس لے، وہاں کے لب ولہجہ اور ریت رواج کو پہچانے بلکہ انھیں اختیار کرلے۔ اس کے بعد وہ اس کی شاعری سے لطف اٹھا سکتا ہے۔ اور اس کی قدر شناسی کا حق ادا کر سکتا ہے۔ موازنہ اس لیے تنقید کے ان بہت سے عوامل میں سے ہے جو شعر کا خون کر دیتے ہیں۔

تبدیلِ ذائقہ کے لیے نظیریؔ کے چند شعر سن لیجیے۔

از کفم سر رشتۂ گفتار بیروں رفتہ است　　　ہر گرہ کز دل گشادم بر زباں انداختم
راہبر دلاّل کالا بود و رہزن مشتری　　　درمیانِ راہ بارِ کارواں انداختم

میرے ہاتھ سے گفتگو کا سرا نکل گیا ہے۔ دل سے جو گرہ بھی میں نے کھولی وہ زباں پر لگا دی۔
رہزن میرے مال کا گاہک تھا اور رہبر دلاّل۔ اس لیے میں نے راستہ میں ہی اپنا سامان گرا دیا۔

درچمن معذور دارندم اگر گردم ملول
نغمہ سنج کوہ و دشتم از گلستاں نیستم

اگر چمن میں مجھے افسردہ دیکھو تو مجھے معذور سمجھو۔ میں کوہ وصحرا میں نغمہ سنجی کرتا چلا آیا ہوں، میرا تعلق گلستاں سے نہیں۔

کتنی بڑی بات کتنے دھیمے لہجہ میں کہہ دی گئی۔

ترا فریضہ بود رفتنی بخانۂ دوست

دروں اگر نگزارند آستاں دریاب

تمہارا فرض تو یہ ہے کہ درِ حبیب پر جاؤ۔ اگر اندر نہ جانے دیں تو چوکھٹ پکڑ لو۔

ہمہ شب برلب و رخسار و گیسوی زنم بوسہ

گل و نسرین و سنبل را صبا در خرمن است امشب

رات بھر لب و رخسار و گیسو کو پیار کرتا رہا ہوں۔ آج رات ہوا گلاب، چمیلی اور سنبل کے خرمن میں چلتی رہی۔ محبت کی پُر التہاب وارفتگی کو اندازِ بیان کی لطافت، خوب صورتی اور شائستگی نے ڈھانک لیا ہے۔

بدل طرحِ وصال جاودانی نقش می بندم

گرم خود دوست می آید بخلوت دشمن است امشب

اپنے دل میں وصال جاودانی کی نیو ڈال رہا ہوں۔ ایسی حالت میں اگر خود محبوب میرے پاس آجائے تو میرے لیے وہ غیر ہوگا۔

فرض و سنت زتماشائی تو از یادم رفت

پردہ بر روی فگن یا زمن ایماں مطلب

تمھیں دیکھ کر میں فرض اور سنّت سب بھول گیا۔ یا تو چہرہ پر نقاب ڈال لو یا مجھ سے ایمان کا مطالبہ نہ کرو۔

آبِ حیواں زکفِ دُرد کشاں می جوشد — گو خضر دشت مپیما و بیاباں مطلب

لختِ دل قُوت کن و شکرِ احباب مخواہ — دود دِل سرمہ کن و کحلِ صفاہاں مطلب

جلوہ از حوصلہ بیش است نظیری ہشیار — کشتئ نوح نہ شد ساختہ طوفاں مطلب

بلانوشوں (تلچھٹ پی جانے والوں) کے ہاتھ سے آبِ حیات اُبلتا ہے۔ خضر سے کہہ دو کہ آبِ حیات کی تلاش میں صحرا و بیاباں کی خاک چھاننا بند کر دیں۔

احباب سے شکر مانگنے کے بجائے دل کے ٹکڑے کو اپنی غذا بنا لو۔ اصفہان سے سرمہ طلب

کرنے کی جگہ سُلگتے ہوئے دل کے دھوئیں سے سُرمہ کا کام لو۔

نظیری ہوشیار، جلوہ، حوصلے اور تاب و تواں سے بڑھا جارہا ہے۔ پہلے کشتی نوح بنا رکھو پھر طوفان کو دعوت دو۔

از حلقہ ہائی زُلف طلسمی بہ چنگ آر
وز شغل آں ز وسوسۂ دل اماں طلب
ہر گاہ یوسفی ز تو در راہ ماندہ است
شیون کُن وز گمشدۂ خود نشاں طلب

زُلف کے حلقوں سے ایک سحر بنا لو جس کے اثر سے دل بہلا رہے اور وسوسوں میں گرفتار نہ ہونے پائے۔

جس وقت تمہارا یوسف راستے میں رہ جائے تو نالہ و زاری کی مدد سے اپنے کھوئے ہوئے محبوب کا نشان مت ڈھونڈو۔

ننگست در طریقِ کریماں معاملت
جاں از نظیری ار طلبی رایگاں طلب

کریموں کے مسلک میں معاملہ کرنا شرم کی بات ہے۔ اگر نظیری سے جان طلب کر رہے ہو تو اس کے عوض میں کچھ دینے کا خیال بھی دل میں نہ لاؤ۔

خمارِ مے بہنم قُفل زد ایاغ کجاست
کلیدِ میکدہ گُم کردہ ام چراغ کجاست

شراب کے خمار نے میرے ذہن پر قُفل لگا دیا ہے۔ ساغر کہاں ہے، میرے ہاتھ سے میخانہ کی چابی گر گئی، چراغ لاؤ کہ اسے ڈھونڈیں۔ استعاروں کا جمال گرمی اور روشنی دیدنی ہیں۔

شہر ویراں شدۂ گریۂ مستانۂ ماست
ہر کجاہست غمی در بدرِ خانۂ ماست

از ہمہ شور رہ بغولۂ وصحرا ایستند
ہر کرامی نگری در جولٔی دیوانۂ ماست

بال و پر سوختہ ہر یک بکناری رفتند
آنکہ نباید بدراز نرم تو پروانۂ ماست

بہ تماشائی جہاں باز نمانیم از تو
آنچہ دام دگراں ساختہ ای دانۂ ماست

ماکہ خورشید بہ بستیم بہ محفل چہ کنیم
آفتاب از ہمہ جا روئی بہ ویرانۂ ماست

شہر ہمارے گریۂ مستانہ سے ویراں ہو گیا۔ جہاں کہیں بھی غم کو دیکھو جان لو کہ ہمارے گھر سے نکالا ہوا ہے۔

ہر طرف سے صحرا اور بیابان کی راہ بند کر دی گئی ہے۔ غریب دیوانہ اب کہاں جائے۔ جسے دیکھو دیولانے کے درپے ہے۔

سارے پروانے تمھاری محفل میں پر جلا کر ایک کنارے ہو گئے۔ ہم ہی ایک ایسے پروانے ہیں جو تمھاری بزم کو چھوڑنے کا نام نہیں لیتے۔

دنیا کے نظارے ہمارے دھیان کو تم سے ہٹا نہیں سکتے، دوسروں کے لیے جس شے کو تم نے دام بنایا ہے کہ اس میں پھنس کر رہ جائیں، ہمارے لیے وہی قوتِ لایموت ہے۔ دنیا کے نظارے اور تماشے ، گہما گہمی اور چہل پہل تمھاری ذات سے ہماری وابستگی اور انہماک اور تمھاری کشش کو اور بڑھا دیتے ہیں۔

ہم جو خورشید سے لَو لگائے ہوئے ہیں، محفل ہمارے کس کام کی۔ ہمیں تو ویرانہ ہی راس آتا ہے جہاں سورج کی کرنوں کی راہ میں نہ چھت حائل ہے، نہ دیواریں۔ ہر زاویہ اور ہر سمت سے آفتابِ عالمتاب ہماری طرف رُخ کرتا ہے۔ حقیقی محبّت اور جذب کی لَے نظیریؔ کے یہاں کتنی معتبر اور مستند ہے۔ غالبؔ کے یہاں یہ لَے اس وثوق اور بانکپن کے ساتھ نہیں ملے گی۔ محبّت ہر دو طرف سے جلوہ گر ہے۔ شاعر نے مجلس و محفل، دنیاوی تزئینات و روابط، آسائشوں اور ہمہو ل کو ترک کر کے محبوب سے لَو لگائی ہے۔ اور خود محبوب کا یہ عالم ہے کہ شاعر کو ہمہ وقت اور ہمہ جہت انداز سے تحتِ نظرِ التفات رکھ رہا ہے۔ حالاں کہ غالبؔ کے یہاں موشگافی، استدلال اور باریک بینی زیادہ ہے تاہم اس کے اشعار نظیریؔ کے اشعار کی سادہ بلاغت کو شاذ ہی پہنچ پاتے ہیں۔

آسودمی اگر نخودم کس گزاشتی

از جورِ او کُشندہ ترم رحمِ مردُمست

میں آرام سے رہتا اگر لوگ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیتے۔ میرے لیے محبوب کے ظلم سے زیادہ قاتل مہربانوں کا رحم اور دوستوں کا اظہارِ ہمدردی ہے۔ ایک عالمگیر نفسیاتی حقیقت کو

نظیری نے محبت کے رنگ و آہنگ میں بیان کر دیا ہے۔ جن لوگوں کو مصیبتوں اور سانحوں سے پالا پڑا ہے، اور کس کو نہیں پڑا ہے، وہ جانتے ہیں کہ اظہارِ ہمدردی کتنے ہی اخلاص اور خوش نیتی کے ساتھ کیا گیا ہو وہ غم کو طول دیتا ہے، زخموں کو کریدتا ہے اور دل کو بہلنے اور سنبھلنے نہیں دیتا۔ جس کے ساتھ بار بار ہمدردی کی جاتی ہے وہ غریب عاجز آجاتا ہے، جھنجھلا اٹھتا ہے۔

آں دہد در گریہ پندِ ما کہ با ما دشمن است

ہر کہ می گیرد شناور را بدریا دشمن است

اور مصیبت زدوں کے لیے اظہارِ ہمدردی سے زیادہ تکلیف دہ، بلکہ مہلک، ہجومِ نصائح ہوتا ہے۔ ہمارے دل کو چوٹ لگی ہے اور وہ پھوٹ بہا ہے، ایسے میں ناصحانِ مشفق ترکِ گریہ و ترکِ محبت کی ہدایت کرتے ہیں۔ یہ بے وقت کی راگنی دل کو چھیدتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ جی بھر کے رو لیتے تو دل کو قرار آجاتا۔ یہ ظالم پند گو یہ بھی گوارہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ضبطِ گریہ سے دل گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ ہمیں روتے ہوئے دیکھ کر جو شخص ضبط کی تلقین کرتا ہے وہ ہمارا دشمن ہے۔ تیراک کو سمندر میں پکڑ لینے والا اس کی جان لے کر رہتا ہے۔

مجرّدانِ سبک سیر از جہاں رفتند

گہر بہ قعرِ یم و خس بہ ساحل افتادست

جو لوگ کہ دنیا سے بے نیاز ہیں، وہ بغیر کسی رکاوٹ کے یہاں سے چلے جاتے ہیں۔ موتی ڈوب کر سمندر کی تہ میں پہنچ جاتا ہے اور وہیں مقید رہتا ہے۔ خس و خاشاک سمندر کی سطح کے اوپر بے نیازانہ تیرتے ہوئے لہروں کے ساتھ ساحل پر پہنچ جاتے ہیں، سمندر کے قید و بند اور علایق سے آزاد۔ یہاں وہی غالب کا سا انداز ہے کہتر کو بہتر بنا دینے کا۔ اس پر مستزاد ہے قلندری انداز اور تجریدی شان جہاں تک غالب کی دسترس نہیں تھی۔ یہ بات شاید معنی خیز ہے کہ جس طرح غالب کے لیے سرمایۂ افتخار اس کا ملکۂ شعر ہے، اسی طرح نظیری کو دنیا سے بے نیازی اور رستگاری فخر کا باعث ہے۔

اندیشہ از فرازِ ثریا گذشتہ ایست

کوتاہیٔ کہ ہست ز تقریرِ پست ماست

غالب اور دوسرے بڑے شاعروں کی طرح نظیری کو بھی یہ احساس رہا کہ الفاظ اور اشعار فکر اور تخیل کا ساتھ نہیں دے پاتے۔ ہماری فکر تو ثریا سے آگے نکل گئی۔ کمی جو کچھ ہے وہ ہمارے بیان میں ہے۔

مال و عصمت راز لیخا بد دریں سودا نہ باخت
ماہِ کنعان بُردن از خیلِ خریداراں خوش است

اس سودے میں عصمت اور مال کو لٹا کر زُلیخا ٹوٹے میں نہیں رہی۔ خریداروں کے ہجوم میں سے ماہِ کنعاں (یوسف) کو اڑا کرلے جانا بڑی بات ہے۔

تمنایش چو گردد گردِ خاطر مضطرب گردم
چو محتاجی کہ گردد در سرایش مہماں پیدا

اس کی تمنا جب میرے دل میں داخل ہوتی ہے تو میں بے چین ہو جاتا ہوں اس محتاج کی طرح جس کے گھر اچانک مہمان آجائے۔ تشبیہ کی دلکشا سادگی سے قطع نظر، سارے ارمان اور جذبات چند الفاظ میں کھنچ کر چلے آئے ہیں' وہ 'آئیں گھر میں ہمارے' سے لے کر 'آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا' تک۔ اشتیاق اور اہتمام پذیرائی ہر لفظ میں پُرفشاں ہے۔

نظیری خاطری از داغِ دل آزردہ تر دارد
قدم ہشیار نہ اینجا کہ در خوں می نہی پارا

نظیری کا دل روٹھا ہوا ہے' زخموں سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے دل میں قدم رکھ تو رہے ہو، لیکن خدارا ہوشیاری کے ساتھ، نہیں تو پاؤں خون میں لت پت ہو جائیں گے۔

نوازشی ز کرم می کُند محبت نیست
تواں شناختن از دوستی مدارا را

اس کی عنایت سے دھوکے میں نہ آجانا، مُدارات اور محبت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

اس طویل مضمون کا مقصد نقد و نظر نہیں صرف نظر ہے۔ راقم سطور نے کتاب اس مطلب سے کھولی اور قلم اس نیت سے اٹھایا تھا کہ غالب کی فارسی غزلوں سے حظ اندوز ہو اور اس حظ میں قارئین کو اپنے ساتھ شریک کرے۔ نظیری کے چند اشعار اس لیے نقل کر دیے گئے کہ قارئین کو

دو اساتذہ کی افتادِ طبع، زاویۂ نظر اور اسلوبِ نگارش کا کچھ اندازہ ہو جائے۔ موازنہ ملحوظ نہ تھا۔ لیکن مضمون کے بیشتر صفحات میں ہوش و گوش غالب کو رہن کر دینے کے باوصف آخر اخیر میں وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ بحیثیت غزل گو کے نظیری کو غالب پر نمایاں فوقیت حاصل ہے۔ "دل و دماغ" والی فرسودہ لیکن بکار آمد اصطلاح کو اگر استعمال کیا جائے تو یہ کہنا شاید حقیقت سے بعید نہ ہو کہ نظیری کی پروازِ تخیل میں دل کا عمل دخل زیادہ ہے اور غالب کے یہاں دماغ کا۔ نظیری کی غزلیں دل گداختگی کا پتہ دیتی ہیں، غالب کی غزلیں ذہنِ ساطع کا۔ غالب کے یہاں کاوش اور آورد کا سراغ لگانا مشکل نہیں ہے۔ نظیری کے یہاں آمد کا عمل دخل ہے۔ یا شعر کی تکمیل تک کاوش کے نقشِ قدم مٹ جاتے ہیں۔ نظیری کی سادہ بلاغت بنیادی حقیقتوں کا انعکاس مسحور کن انداز سے کرتی ہے۔ اس کے یہاں نظر کی تازگی تصوّف مزاجی کے سرچشمہ سے پھوٹتی ہے۔

پروفیسر نذیر احمد

غالب کے فارسی قصائد کا مطالعہ لسانی نقطۂ نظر سے

غالب فارسی قصیدہ گوئی میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں، ان کے قصیدوں میں قدما کے قصائد کی پیروی ملتی ہے، اور اس حد تک کامیاب ہیں کہ بعض قصائد پر فارسی کے قدیم بڑے شاعروں کے قصیدوں کا دھوکا ہوتا ہے، یہ تو سبھی جانتے ہیں غالب کا خاص میدان غزل گوئی ہے اور اس میدان میں ان کے مقابل کم شاعر نظر آتے ہیں، اور ان کی قصیدہ نگاری کا ایک قابلِ ذکر وصف یہ ہے کہ ان میں غزل کے آداب کی پوری رعایت ملتی ہے، ان کا ایک قصیدہ حافظ کی ایک غزل کی پیروی میں نظم ہوا، اور حافظ کے ایک مصرعے کی تضمین کی ہے:

هم ازینجاست که دانا دل شیراز سرود
بندهٔ طلعت آں باش که آنی دارد

حافظ کی غزل اور غالب کے قصیدہ کے چند اشعار بالمقابل درج کیے جاتے ہیں،[۱] ان سے غالب کے مرتبے کا کسی قدر اندازہ ہو جائے گا۔

غالب (۲۴۱، ۲۳۷)	حافظ دیوان ص ۸۵
در بہارانِ چمن از عیش نشانی دارد	شاہد آں نیست کہ موئی و میانی دارد
برگ ہر نخل کہ بینی رگ جانی دارد	بندہ طلعت آن باشں کہ آنی دارد
غنچہ مشکین نفس و لالہ بخورش گلبوی	شیوۂ حور و پری گرچہ لطیف ست ولی
انجمن مجمرہ و غالیہ دانی دارد	خوبی آنست و لطافت کہ فلانی دارد
بادرا راہ بہ خلوت کدۂ غنچہ چراست	چشمۂ چشم مرا ای گل خنداں دریاب
گرنہ با شاہد گل راز نہانی دارد	کہ بامید تو خوش آب روانی دارد

سبزہ را نامیہ انداختہ بادی درسر
بر خود از ہمسری سرو گمانی دارد

گوی خوبی کہ برداز تو کہ خورشید آنجا
نہ سواریست کہ در دست عنانی دارد

گریہ ہرچند زشادیست ولی ابر بہار
نیز چوں من مژۂ اشک فشانی دارد

دل نشان شد سخنم تا تو قبولش کردی
آری آری سخن عشق نشانی دارد

برنخیزد ز رہش گرد دم قطرہ زدن
ادھم ابر کہ از برق عنانی دارد

خم ابروی تو در صنعت تیر اندازی
بردہ از دست ہر آں کس کہ کمانی دارد

تاک از باد خورد آب خوشا بادہ فروش
مایہ در باغ و بہ بازار دکانی دارد

در رہ عشق نشد کس بہ یقین محرم راز
ہر کسی بر حسب فکر گمانی دارد

لامکاں گر نتواں گفت تواں گفت کہ شاہ
برتر از ہرچہ تواں گفت مکانی دارد

با خرابات نشیناں ز کرامات ملاف
ہر سخن وقتی و ہر نکتہ مکانی دارد

روی خوش باید و تاب کمر و طرز خرام
نبرد دل زکف ار موی و میانی دارد

مرغ زیرک نزند در چمنش پردہ سرای
ہر بہاری کہ بدنبال خزانی دارد

نطق تنہا نبود مشق سخن را کافی
سخن اینست کہ ایں تیر کمانی دارد

مدعی گو لغز و نکتہ بحافظ مفروش
کلک ما نیز زبانی و بیانی دارد

حال ہی میں راقم السطور پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی خواہش پر غالب کی فارسی قصیدہ نگاری پر لکھنے بیٹھا تو خیال ہوا کہ فارسی قصیدہ نگاری کے جائزے کے بغیر غالب کی فارسی قصیدہ نگاری پر تنقید نامکمل رہے گی، چناں چہ پہلے قصیدہ نگاری پر لکھا تو وہ ضخیم ہو گیا اور اس کو غالب والے مضمون سے الگ ایک کتابچہ کی شکل میں شایع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی چناں چہ اسلامک اسٹڈیز ڈپارٹمنٹ کے تحت وہ چھپ رہا ہے۔ غالب کی قصیدہ نگاری پر مقالہ بھی کافی طویل ہو گیا اس کے دو حصے تھے، پہلا حصہ ان کے قصیدوں کی ادبی، تاریخی اور شعری خصوصیات پر مشتمل اور دوسرا حصہ لسانی خصایص کا حامل تھا۔ اسلوب احمد صاحب نے اپنے لیے پہلا حصہ مخصوص کر لیا، اور یہ دوسرا حصہ اردو ادب میں بغرض اشاعت روانہ کیا جا رہا ہے۔

لسانی اعتبار سے غالب کے قصائد کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں، انھوں نے اس صنف

کے ذریعہ فارسی زبان کی بڑی خدمت انجام دی ہے، یہ تو معلوم ہے کہ غالب بڑے جدت طراز شخصیت کے مالک تھے، بات میں بات پیدا کرنا، ان کی مبتدعانہ طبیعت کا خاصہ تھا۔ اور جس طرح انھوں نے اختراع مضامین سے شاعری کو دلکش و جاذب نظر بنا دیا ہے۔ ان کی جدت پسند طبیعت نے سیکڑوں نئی نئی تراکیب ایجاد کر کے اسلوب بیان کو ایسا حسین بنا دیا ہے کہ قاری مبہوت ہو جاتا ہے۔ ان تراکیب سے زبان کا دامن وسیع ہو گیا ہے۔ اور وہ اتنی کثرت سے ہیں کہ ان کا احاطہ زیادہ فرصت چاہتا ہے۔

پردۂ رسم پرستش ۱، حسن بی نشان ۱، نطع پیدائی ۱، قالب ابداع ۱، پویۂ دشت خیال ۲، شبگیر دست ۲، نشۂ وصف جلال ۲، نزہتگاہ تسلیم رسول ۲، قرعۂ عرض شکوہ ۲، سودا پیشگان ہست و بود ۲، آوازۂ سود و زیان ۳، شحنۂ عشق ۳، گلخن افروزان داغ ۳، گدازنالۂ آتش فشاں ۳، ساغر معنی ۴، کاسۂ دریا وکان ۴، سرمایۂ کردار ۵، داغ ناشکیبی ۵، لذت جگر خواری ۶، مایۂ بخشش دل ۶، بذلہ پالائی ۷، خصم گداز ۷، ہنگار سنج خویشتن ۷، دوزخ پشیمانی ۷، سومنات خیال ۷، کارگاہ ارژنگی ۷، شر ربکاری ۷، دفتر جاہ ۸ عین بیداری ۸، مغاثر شماری ۸، جادۂ مقصود ۸، چراغ غم خواری ۸، جلوۂ حجاب گداز ۹، سایۂ شرع ۹، اثر سنجی ۱۵، فیض کحل ولا ۱۰، جامع قانون عالم آشوب ۱۱، صاحب فرہنگ مردم آزاری ۱۱، نخل امید ۱۱، اشتلم بخت ۱۱، رنگ رنگ نثر ندی ۱۱، بند بند فتنہ ۱۱، بلند و پست سرفرازی و نگونساری ۱۱، ادای مغان ۱۳، روزنامۂ اندوہ وا نتظار ۱۳، نرخ چمن ۱۳، جریدہ رقم آرزو ۱۳، قلمرو ہوس مژدہ کنار ۱۳، گلشن نظارہ ۱۳ لالہ کار ۱۳، درآستین ۱۳، کرشمہ بار ۱۳، تردستی مژہ ۱۴، آشوبگاہ بیم ۱۴ گردفتنہ ۱۴ وقف شکن ۱۴ متاب لالہ زار ۱۵ ایپچ و تاب عجز ۱۵ دلفریبی شوق جنوں مزاج، پشت گرمی جان امیدوار ۱۵ زہر عریدہ ۱۵ پردۂ چنار ۱۶ دوش شوق، چشم بخت ۱۶، منتہای ہمت ہستی ۱۶ جہان جہان گلہای شیشہ ۱۶ مغز کوہسار ۱۶ زماں زمان ۱۷، قانون نطق ۱۷، فیض بخشی نفس، دلنوازی کرم ۱۷ فرہنگ آفرینش، شرح رموز کار ۱۸ دفتر جود ۱۸ برات بار ۱۸ عشرت رضا ۱۹ سپیدہ روی سیہ کار ۱۹ شاہد مدح ۱۹ تیپچ و تاب عرض جنون شمار شوق ۱۹ نہیب توصد آز ۱۹ نمک دورباش ۱۹ کسوت وجود ۲۰ محیط نور ۲۰ خم و پیچ فغان واہ ۲۰ جیب سواد شب ۲۰ گوہر کدۂ راز ۲۱ سیمای بیان ۲۱ تلخاب رگ تلزم ۲۲ خونابہ کان ۲۲ کشور لطف ۲۳

رواج زر و بیکاری آہن ۲۳، بی برگی ایمان ۲۴ پیچ و خم ہستی موہوم ۲۵ رخ ناشستۂ صنم ۲۶ غوغای روز ۲۶
انبساط وجد ۲۷، جوشش بہمن ۲۸ جبین دل ۲۸ بطانۂ توفیق ۲۹ کافور فرایزدی ۲۹ خستگی بند اہرمن ۲۹
گرانمایگی دل ۳۱ پرواز سویدا ۳۱ شرر اندا ۳۱ رگ ابر گداز جگر ۳۲ رگ مہتاب ۳۳ اعجاز اثر ہای
قبول ۳۳ نظارگی جلوۂ اسرار خیال ۳۴ گل کدہ گل ۳۴ راہ تمنا ۳۴ رگ خارا ۳۴ افسانۂ آوارگی آدم
و حوا ۳۵ طرفی نتوان بست ۳۵ خمکدۂ لا، رشحۂ الا ۳۵ گرانمایگی ناز ۳۵ آئینہ تصویر نمائی ۳۵ انگارۂ
دل ۳۶ خمخانۂ تولا ۳۶ افسر منا ۳۶ خط غبرا ۳۷ ذوق ظہور ۳۷ شفق زا ۳۷ الف صیقل ایمان"
جلوۂ الا ۳۷ کوکبۂ کفر ۳۷ گرانمایگی قدر ۳۸ ذوق رخ یوسف، رگ خواب زلیخا ۳۸ طربگاہ سپہبد
(۴۰) آئینہ اسرار نبوت ۳۹ سوداگر ایمان ۳۹ حاصل دریوزۂ فردا ۳۹ سبزۂ گفتار ۴۰ آرایش دعوی
۴۰ آلایش غوغا ۴۰ باسلیق شکایت ۴۱ رگ مژۂ تر ۴۱ نوردبال کبوتر ۴۱ طومار شکوۂ نفس ۴۱
دست تظلم ۴۲ ستیزہ کاری اختر ۴۲ لجۂ خیال ۴۳ پیچ و خم نقش ۴۳، منشور سرفرازی سنجر ۴۳
اندوہ چہرہ دستی اعدا ۴۳ رقص شرر ۴۳ غوغای پایہ سنجی قیصر ۴۴ درد تغابن ۴۵ خار حسرت ۴۵
جلوہ گہ مدعا ۴۵ نیایش نگار ۴۶ داغ غم ۴۶ منع ریزش راز ۴۷ گنج گہر ہای راز ۴۷ مشت گل ۴۷
گنج لب ۴۷ دجلۂ خون ۴۷ ترکش سخن ۴۸ ناصیۂ ارغوان ۴۸ نہال قد خار زار خوی، ستارہ وش
آسمان نہاد ۴۸ خون آشتی ۴۹ پروردگار ناطقۂ عارفان ۴۹ متاع نظر بردکان ۵۰ کوس بلندپایگی جاہ
۵۰ قہرمان سنبلہ و توامان ۵۰ عنقای قاف قدر ۵۰ قحط خریدار ۵۱ نرخ گوہر نطق ۵۱ مزد جگر
کاوی ۵۱ سپاس ہزار ارمغان ۵۱ مسند فراز تخت گہ خاوران ۵۲ ہمشارۂ ریگ رواں ۵۲ شاہراہ
مدح ۵۳ پایہ سنج مستی ۵۳ باغ وجود ۵۴ خروش مرگ، عزیو یاس ۵۴، طوفان ناامیدی ۵۴
خروش مرگ ۵۴ طلوع نشۂ بیم ہلاک ۵۴ ہیلاج دیدۂ حسّاد ۵۴ ناوک غم ۵۵ رخ نقد قبول۔ گرد
کساد ۵۵ انتقام ہاروت ۵۵ سیلی کیوان ۵۵ دورباش موکب ۲۳۵ گزارش ہوس ۵۶ ماتم دانش ۵۶
بادنہیب ۵۶ سرمایۂ گرانی کوہ ۵۷ نیروی تیشۂ فرہاد ۵۷ نطع ادیم، تاب سہیل ۵۷ حوصلۂ دل،
ناصیہ بخت ۵۷ گوش تاب طبیعت ۵۷ جور توبۂ تغافل ۵۸ معانقۂ داد، سنگلاخ شکایت، مرغزار
و داد ۵۸ آب روی دانش و داد ۵۸ باج تشنہ لبی ۵۹ محراب سازی اقطاب، سجادہ بافی اوتاد ۵۹،
چراغ بزم عزا ۵۹ عتبہ بوسی مہر ۵۹ لوای قدر، جہان جاہ ۵۹، اجل نہیب ۵۹ قوی اساس ۵۹

صورت کشای صلح ۶۰، معنی نمای جہد ۶۰، نیر مہر ۶۰، حوصلۂ لطف ۶۰، شوخی ابرام ۶۰، قسم راستی بنیاد ۶۰، گدایان کوی غفلت ۶۱، طریقِ استبعاد ۶۱، تازہ روئی بستانیان مہر و وفاق، زندانیان بغض وعناد ۶۱، شہرت رم برق درخش ۶۲، انتشار شمیم، انتعاش مشام، اہتزاز نبات وانقباض جماد ۶۲، ۱۰۶ استواری دانش، سست عہدی وہم، آب در غربال، عید دراشتاد ۶۲، فرو رفتگان باغ مراد ۶۳، مشیمۂ غیب ۸۷، صومعۂ مدح، محراب دعا ۵، زاغان دژم ۵۷، فراز بام امید ۸۷، شہ سوار نظرگاہ لافنی ۹۷، صحرای خیال ۱۱۳، کارگہ روز وشب ۱۲۹، دیدۂ امید ۱۲۹، شاہد افعال ۱۲۹، ہواداری بلبل ۱۱۳، لذت آزار ۱۱۳، رنج جلو داری مجنوں ۱۱۴، نازش جادو رقمی ۱۱۵، شمع بخت جگر تشنہ ۱۱۶، منظر اوج قبول، عیدنگاہ ۱۱۹، رہ اندیشۂ وصف، ۱۱۷، نافۂ شوق ۱۵۵، تاجر نطق، کشورجان ۱۵۶، خلوت گہ فکر ۱۵۶، کشتۂ تیغ وفا ۱۵۷، ہفتمیں خرگاہ، سرمہ آرزوی عیون ۱۵۹، سجدہ ابروی جباہ ۱۵۹، رنج جلو داری مجنوں ۱۱۴، تنگ ہم طرح مرغان گرفتار ۱۱۴، ولولہ نازش جادو رقمی ۱۱۵، اوج قبول، عیدنگاہ ۱۱۷، لب تشنگی بادۂ گل رنگ ۲۰۷، دائرہ دور مدح ۲۰۸، طراز صورت دی ۲۱۲، ہندوی غم، کعبۂ دل ۲۱۲، حجرالاسود سویدا ۲۱۲، زہراب غم ۲۱۲، متاع یغما ۲۱۲، ولولۂ رستخیز، معرکۂ شوق ۱۵۷، خضر بیابان ۱۵۷، ایلچی گری خامہ ۱۵۷، تشنہ لبان نبات ۱۲۹، شاداب فیض ۱۲۲، جرعہ فشانی می ۲۷۴، سرزمین خیال ۲۷۲، جگرگاہ دیو ۲۷۹، آغوش روزگار ۲۷۹، درخواہ ابرو ۲۷۱، بیندار بہار ۲۷۷، سرخوش خواب عدم ۳۲۸، پرستش پنہاں ۳۰۵، قرطاس استغنا ۱۸۲، خار خار غم ۲۲۴، خار خار چاک ۳۵۷ . . .

ان کے یہاں ایسی تراکیب اتنی ہیں کہ اگر سارے کلام سے اکٹھے کر لی جائیں تو ایک کتابچہ تیار ہو سکتا ہے، اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ ان کی کوششوں سے فارسی زبان میں بڑی وسعت پیدا ہو گئی ہے، غالب کے کلام کا اس حیثیت سے مطالعہ بڑا مفید ہے۔

اب، غالب کے قصائد میں ایسے الفاظ کافی مل جاتے ہیں جو قدما کے یہاں عام طور پر مستعمل ہیں، مگر ۱۸، ۱۹ اصدی میں وہ اتنے عام نہ تھے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

وایہ : مراد و مقصد و حاجت،

دیگر آں وایہ و من مزد دعا می خواہم	بر در دوست سوالم بہ تقاضا ماند (۱۴۵)
گر وایہ رسد بمن ز سویت	با غالب خستہ جان نگوییم (۳۶۶)

پنہاں دہند وایہ بیاران تنگدست (۶۵)

ہجیر : بضم بمعنی خوب ونیک وزبدہ وخلاصہ :

گر بایہ چنان خوش وآبی چنان نکو روزی چنیں مبارک وقتی چنیں ہجیر (۳۰۲)

منوچہری کے دیوان ص ۴۴ ہجیر بار ہا بہمین معانی آمدہ

اشتلم : زبردستی کوئی چیز لے لینا، تندی، تعدی وظلم

اگرچہ ز اشتلم بخت می زیم ناکام (۱۱)

اشتلم انتظار گل بو دارنہ دیدۂ نرگس زحدقہ چو ں برون آمد (۲۶۴)

ترسم چرا ز اشتلم منکر ونکیر (۳۸۵)

پاساد : صیانت، برہان میں ہے مگر فرہنگ معین میں نہیں آیا۔

دوئی نبود دسرش ہمچناں بہ سجدہ فرود زہی امام وزہی استواری پاساد (۵۸)

برہان میں اس کے یہ معانی درج ہیں :

پاساد بمعنی صیانت باشد وآں محافظت کردن است خودرا از سخنان ہزل وقبیح وافعال شنیعہ وقبیحہ، غالب کے شعر میں استواری پاساد بمعنی استواری صیانت۔

بُندار : بضم اول کیسہ دار خانہ دار، صاحب تجمل ومکنت : غالب

وقت آنست کہ بندار بہار آراید نونہالان چمن را بعروسانہ حلل (۳۷۷)

جہانگیری ۶۹، ۱۷ پر یہی معنی درج ہیں، ناصر خسرو :

بر سر گنجی کہ یزدانش در دل احمد نہاد جز علی گنجور نبود جز علی بندار نیست

حاشیہ میں یہ اشعار درج ہوئے ہیں :

گرگ مال وضیاع تو بخورد گرگ صعب تو میر وبندار است (نظامی)

بر سر دار دان بسر سرہنگ در بن چاہ بیں تن بندار (سنائی)

حیف نبود کہ چوں تو سرداری طلبد کہنہ کفش از بندار (خواجو)

اوباریدن : غالب کے یہاں آدم اوباری اس طرح آیا ہے :

چو ساحران ہمہ را شغل آتش افشانی چو اژدہا ہمہ را ذوق آدم اوباری

اوباریدن بمعنی ناچار دیدہ فرو بردن، یوباریدن نیز بہمین معنی

سنائی: نیست اندر نگار خانۂ کن صورت و نقش مومن و کفار
زانکہ در شرط بحر الا اللہ لانہنگی است کفر و دین اوبار

خواجہ: غوطہ خور در محیط استغنا خیمہ زن در جہان استغفار
تا نہنگی شوی محیط آشام تا پلنگی شوی جہاں اوبار (جہانگیری ۱۹۲)

یوباریدن فرو بردن، اوباریدن نیز، عربی بلع، منوچہری:

خشم او چوں ماہی فرزند داود النبی گر یوبار دجہاں گوید کہ ہستم گرسنہ (ایضاً ۲۲۳)

سنائی: گر آں ماہی کہ یونس را یوبارید در دریا یوبار د ترا چوں او وازیں سفلی علا یابی

(دیوان ص ۳۱۸)

مکاتیب سنائی: نہنگ لا الہ الا اللہ ہمہ رویہا و سویہا در پیش سرا پردۂ سبحانیت یوباریدہ است

(ص ۱۰۲)

ذیل میں چند اور الفاظ جو قدما کے یہاں برابر استعمال ہوتے ہیں درج کیے جاتے ہیں:
نیا ۸، ۸۶، روسپید ۵۹، خلقد ۵۹، غزیو ۵۴، انباز ۴۸، بہینہ ۸۳، جباہ، زاور ۱۳۱، باد افراہ ۹۵ ساو ۵۰، خیزران ۱۰۸، راوق ۱۰۹، سبیکہ ۱۰۶، نوا مندی ۲۱۱، چنبر ۲۲۲، بے مر ۲۳۲، زرینہ ۲۰۸، سفالینہ ۲۰۷، بی نوایانہ ۲۲۷، کچ و یار ۲۳۰، سطح اغبر ۲۳۰، مرغولہ ۲۲۸، جنیبت ۲۳۴، گونہ رو ۲۸۴، لامی پالا ۲۱۱، نگاور ۲۳۴، اخلگند ۲۳۳، گونہ رو ۳۸۴، وسادہ ۴، ۲، درخورد ۲۹۰، ستوہ ۲۴۳

(ج) غالب کے قصیدوں میں علمی اصطلاحات کی بھرمار ہے، اس وصف کی وجہ سے ان کا وقار بڑھ جاتا ہے انھوں نے متداول تلمیحات میں نئے نئے نکتے پیدا کیے ہیں۔ مثلاً

با سلیمان زند دم از بلقیس در رہ مور شکر انداز د
با زلیخا اگر شود ہمراز طرح کاخ مصور انداز د (۲۳۵)

وحشت تفرقہ در کاخ مصور سنجند جمع انس بہ نی بست زلیخا بینند
نستوہند اگر ہمرہ مجنوں گردند نخروشند اگر محمل لیلا بینند (۲۴۳)

جام جوئید و زرندی نگرائید بہ زہد　　سبحۂ انجم اگر در ید بیضا بینند (۲۴۳)

نظم را موجۂ سرچشمۂ حیوان فہمند　　نثر را نسخۂ اعجاز مسیحا بینند (۲۴۴)

زبسکہ بندگیش دارد آرزو محمود

برآں سرست کہ خود را بدل کند بہ ایاز (۲۴۶)

اگر نہ چرخ پی پایۂ سریر آورد　　طلای دہ دہی آفتاب را بگداز (۲۴۸)

گمان کنم کہ خدا خود نیافریدہ بہشت　　در بہشت برویم اگر کنند فراز (۲۴۹)

چوں بدانند کہ عامت ندانند زبہر　　روی گرمی اگر از مہر بخور بینند

قشقہ را رونق ہنگامۂ ہندو خوانند　　بادہ را شمع طربخانۂ ترسا بینند

برسم و زمزمہ و قشقہ و زنار و صلیب　　خرقہ و سبحہ و مسواک و مصلا بینند (۲۴۳)

آں موحد کہ ہیبتش دم کار　　تیشہ از دست آزر اندازد

بگمانی دوئی عطارد را　　از فراز دو پیکر اندازد (۲۳۳)

(د) غالب کے اشعار میں نئے نئے تجربات ملتے ہیں، مثلاً انتہائی سردی میں شراب پینے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے:

عبارتم بہ طراوت چو لالہ در بستاں　　معانیم بہ لطافت چو بادہ در دیماہ (۹۷)

اس کے ساتھ بعض قدیم روایت کی جھلک ان کے یہاں مل جاتی ہے، مثلاً مے خوار جب شراب پیتا ہے تو کچھ شراب زمین پر ڈھال دیتا ہے۔ شعرا نے اس سے عجیب عجیب نکتے پیدا کیے ہیں۔ حافظ کہتے ہیں:

اگر شراب خوری جرعہ، فشاں بر خاک

از آں گناہ کہ نفعی رسد بغیر چہ باک (دیوان طبع فرد بہی ۲۰۸)

غالب کہتے ہیں :

رشحہ بر من بچکان بادۂ گلرنگ بنوش

جرعہ بر خاک فشاندن روش اہل صفاست (ص ۲۰۳)

اس امر سے کہ چاند سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے، غالب نے اس طرح فائدہ اٹھایا ہے۔

زحق عطیہ پذیرد چو ماہتاب زمہر

بہ خلق بہرہ رساند چو آفتاب بہ ماہ

(۵) بعض الفاظ ہندوستانی معنی میں بھی نظر آئے جیسے شایگان جس کے معنی مفت کے ہیں۔

بہ مشتری چہ رسم ترک چرخ در راہ است

کہ جان وجامہ دجاہرسہ رایگان گیرد ص ۳۵۴

لیکن ص ۵۲ پر رایگان بمعنی بیکار سا ہے :

دود چراغ در شب و خون جگر بروز سی سال خوردم و فلکش رایگان نہاد۔

یہاں رایگان بمعنی مفت نہیں ہے

غصّہ جس کے معنی اردو میں غیظ و غضب ہیں

چوں خود مرا بغصّہ فنا کرد روزگار (کلیات ص ۱۲۶)

فرہنگ معین میں غصّہ اور اس سے متعلق الفاظ کے یہ معانی ہیں :

غصّہ :	جو گلے میں پھنس جائے، حزن وملال
غصّہ افزودن	غم واندوہ زیادہ کرنا
غصّہ خور	اندوہ گیں، جو رنج وغم دل میں رکھتا ہے اور ظاہر نہیں کرتا۔
غصّہ خوردن	غم کھانا، رنج وغم دل میں رکھنا
غصّہ خوری	غمخواری، دل سوزی
غصّہ دار	مغموم
غصّہ فرو خوردن	غم کھانا
غصّہ کاہ	جو غم واندوہ کم کرتا ہے۔

غصہ کشیدن　رنج اٹھانا

غصہ گسار　غم خوار، غمگین

غصہ مرگ شدن　غم سے مرجانا

غصہ مند و غصہ ناک : اندوہ گیں

ان مثالوں سے واضح ہے کہ غصہ بمعنی غیظ و غضب فارسی میں مستعمل نہیں۔ لیکن غالب نے غصہ بمعنی غم و اندوہ بھی لکھا ہے : کمال بین کہ بدین غصہ ہای جانفرسا۔ ص ۹۰

شبگیر : سحرگاہ، ہنگام سحر، صبح زود، شبگیری : سفر کردن بہ سحرگاہ

ہزار قافلہ شوق می کند شبگیر　(عرفی)

یعنی شبگیر کردن = سفر کردن　(فرہنگ معین)

غالب کے ان دو نوں شعروں میں یہ لفظ ان دونوں میں سے کسی میں نہیں آیا۔ بظن قوی بمعنی شب،

شبگیر مدح فوت بخت سخنوریست　راہی بروشنائی اختر گرفتہ ایم　(۹۳)

پای خوابیدہ مدد کرد سر آمد شبگیر　ہمچو شمع آخر ازین انجمنستان رفتم　(۱۱۴)

لیکن ان دونوں ابیات میں شبگیر بمعنی سفر میں ہے :

وہم در شبگیر دشتتش برعنان انداختہ　گوئی رمضان رفت بہ شبگیر و درین راہ الخ (ص ۲۰۷)

(و)　تکرار الفاظ جس سے کثرت کے معنی لیے جاتے ہیں، ان کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں، چند مثالیں یہ ہیں :

کاوکاو ۲۰ خارخار ۲۰، پایہ پایہ ۲، رقعہ رقعہ ۳، بند بند فتنہ ۱۱، چمن چمن ،،، طبق طبق ،، رنگ رنگ ۱۱، پوی پوی ۲۱۸، فوج فوج ۱۲۹، خار خار غم ۲۲۴، گونہ گونہ ۲۶۱، دجلہ دجلہ ۲۸۱، قطرہ قطرہ ۲۸۱، خار خار خاک ۳۵۷، عضو عضو ۳۸۴ وغیرہ، کبھی کبھی دونوں لفظوں کے درمیان الف کا اضافہ ہو جاتا ہے جیسے گوناگوں رنگا رنگ، مالامال، اور کبھی بہ کے اضافے سے دونوں لفظ جڑ جاتے ہیں جیسے روز بروز، رنگ برنگ، یہ صورتیں اردو میں بھی یکساں رائج ہیں۔ البتہ خار خار سے کثرت کے بجائے خواہش مراد ہے۔

(ز)　وسائیری الفاظ جیسے سمراد ص ۵۰، فرتاب ص ۱۹۵، ۲۷۸، ۳۷۹۔

(ح) غالب نے ایک جگہ باسلیق کا لفظ استعمال کیا ہے، یہ اصلاً یونانی ہے جو ایک مخصوص رگ کا نام ہے، غالب کا شعر یہ ہے

نشتر بہ باسلیق شکایت فرو برم
خونِ دل از رگ مژۂ تر برآمدم (ص: ۴۱)

فرہنگ معین میں "باسلیق" یونانی لفظ BASILKOS سے معرب ہے جس کو VEINE BOSILIQUE کہتے ہیں، بمعنی سیاہ رنگ جو محور بازو کے مقابل جلد کے نیچے ہوتی ہے۔

WEBSTER میں اس کے لیے BASILIC ہے۔

دستورِ زبان کے بعض مسائل غالب کے قصائد میں قابلِ توجہ ہے۔

(ا) بعض فعل قدیم انداز کے ہیں جیسے ندیدستی، درخرابا تم ندیدستی خراب۔ یا منستی بجائے منی = من ہستی (۲۰۸)

(ب) اضافت ابنی مانند یوسفِ یعقوب یعنی یوسف بن یعقوب، گہم چو یوسفِ یعقوب درچہ اندازد (غالب ص ۳۱۸)

ناموں میں اس اضافت کا کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ جیسے مسعود سعد سلمان یعنی مسعود بن سعد بن سلمان۔

(ج) اضافت مقلوب کی مثال: دعوی ہستی ہمہ بت بندگیست ۳۵، بت بندگی = بندگی بت۔

بالش زمخمل ار نبود خشت قحط نیست
باری بود سری کہ بہ بالیں تواں نہاد (ص ۵۲)

خشت قحط یعنی قحط خشت، اور اضافت کی صورت میں یہ ترکیب درست بیٹھتی تھی، مگر نہ جانے کیوں غالب نے صورت بدل دی۔ غالب مضاف مضاف الیہ کی ترکیب کو الٹنے اور دونوں کے درمیان علامت را کے اضافے کے شائق تھے، چناں چہ ان کی فارسی کی نثری اور منظوم تصانیف میں یہ عمل دیکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں:

ایں عبودیت نامہ را قماش سلام روستائی است و دائرہ ہر حرفش را پرداز کاسہ گدائی۔

یعنی قماش ایں عبودیت نامہ، پرداز دائرہ ہر حرف

قصائد غالب سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں

تا عامہ را متاع نظر بر دکان نہاد (۵۰

یعنی متاع نظر عامہ

چوں خواست بام کاخ ترا نردبان نہاد (۵۰)

یعنی برای بام کاخ تو

رنج والم را فزایش اعداد (ص ۵۵)

یعنی فزایش رنج والم

بہ پشت چشم نہادیم شکوہ را بنیاد (۵۸)

یعنی بنیاد شکوہ نہادیم

بود ز لخت جگر نالہ را براہ تو زاد (۵۹)

یعنی براہ تو از لخت جگر برای نالہ زاد بود

اندیشہ را عناں تنگاور گرفتہ ایم (۹۳)

یعنی عنان تنگاور اندیشہ

اندیشہ را نقاب ز رخ ۹۳

یعنی نقاب از رخ اندیشہ

سبزۂ پژمردہ را روح بقالب دوید (۱۲۹)

یعنی روح سبزہ پژمردہ

طائر اندیشہ را شعلہ بہ شہپر گرفت ۱۳۲

یعنی بہ شہپر طائر اندیشہ شعلہ گرفت

دلیران سپاہش را ہنرہا جملہ بہرامی فرازستان جاہش را بناہا جملہ کیوانی (۱۳۴)

یعنی ہنرہای دلیران سپاہ ، بناہای فرازستان جاہ

تا ناطقہ را روی دہد نادرہ زائی (۱۵۱)

یعنی نادرہ زائی ناطقہ روی دہد

خاک را سبزہ بر آینہ بہ گردون رو کش   تاک را خوشہ ہمانا بہ ثریا مانا ست (۲۰۲)

یعنی سبزۂ خاک، خوشۂ تاک

گفتار مرا جائزہ (۲۰۹)

یعنی جائزہ گفتار من

(د) بعض اضافی ترکیبوں میں مضاف الیہ انگریزی زبان کے لفظ ہیں جیسے:

کارگہ روز و شب نقش دسمبر گرفت (۱۲۹)

تا اسداللہ خان نام گورنر گرفت (۱۳۱)

(ھ) صفت مقلوب کی چند مثالیں قصائد سے پیش کی جا رہی ہیں: فارسی میں موصوف پہلے اور صفت بعد میں آتی ہے لیکن ترتیب بدلنے کی صورت میں بعض جگہ وہ لفظ مفرد بن جاتا ہے جو اسم فاعل قرار پاتا ہے، جیسے بوے خوش ۔ خوشبو (یعنی اچھی مہک والا) سعدی: گل خوشبوی در حمام روزی یعنی مہکنے والی مٹی ۔ غالب نے ترک تباہ اندیشہ (۵) میں یہی صورت اختیار کی ہے یعنی بیکار خیالات والا ترک صفت مقلوب کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

اما پی کشایش ایں معنوی طلسم   فطرت شگرف قاعدہ کرد اختیار (۱۷)

معنوی طلسم ۔ طلسم معنی، شگرف قاعدہ ۔ قاعدۂ شگرف

چاک افگنم زنالہ بریں نیلگون پرند (۵۰) یعنی پرند نیلگون نیلے رنگ کی حریر

فرخی سیستانی: چون پرند نیلگوں برروی پوشد مرغ زار

پرنیان ہفت رنگ اندر سر آرد کو ہسار

حمام را بحوض از آں فرخ آبگیر (۳۸۲)، فرخ آبگیر ۔ آبگیر فرخ۔ ایں خسروی نوا غزل از بر گرفتہ ایم (ص ۹)

یعنی غزل خسروی نوا، خسروی نوا میں بھی صفت مقلوب ہے یعنی نوای خسروی

(ح) قدیم شعرا کی طرح غالب کے یہاں کبھی کبھی مجرور جار سے پہلے آتا ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

فلک بہ لرزہ درازوی ز دستبرد علم (۹۶)

مہر بجدی اندرون عرض دو پیکر گرفت (۱۲۹)

پر بکلاہ اندرش جنبش پر بر سرش (۱۳۰)

بسکہ بہ بزم اندرش بذلہ فشانست لب (۱۳۰)

بسکہ بہ رزم اندرش حربہ گذارست کف (۱۱)

ہمتای جہاندار نہ بینی بہ جہاں در (۱۴۴)

ان مثالوں میں در، اندروں، اندر، اندر، اندر، در حروف جار ہیں جو مجرور کے بعد آئے ہیں، قدما کے یہاں کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

سراجی خراسانی کا ایک قصیدہ ہے جس میں ردیف اندر ہے، اندر جار ہے اور سارے مجرور جو مقدم ہیں قافیہ کے طور پر آئے ہیں (ص ۱۷۷ بعد)

چہ آفتست بداں جزع دلستان اندر

چہ حالتست بدان لعل جانفشان اندر

مجرور مقدم کی صورت میں بھی ان کے پہلے حرف جار "بہ" برابر آتا رہا ہے، گویا دو جار ہیں، ایک مقدم بر مجرور اور دوسرا موخر۔

مونس الاحرار ج ا ص ۲۱۴ تا ۲۲۳، پانچ قصیدے نقل ہیں اور ان پانچوں میں جار مجرور کے بعد آیا ہے، قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ قصیدے "رائیہ" ہیں اور تشبیہات کے ذیل میں نقل ہوئے ہیں۔ ہر قصیدے کے مطلع درج ذیل ہیں :

نوروز فراز آمد و عیدش باثر بر ۔۔۔ بر یکدگر و ہر دو زدہ یک بدگہ بر (عنصری)

ای تازہ تر از برگ گل تازہ ببر بر ۔۔۔ پروردہ ترا خازن فردوس ببر بر (معزی)

ای سلسلۂ مشک فگندہ بہ قمر بر ۔۔۔ وای قفل زمرد زدہ بر درج درر بر (مختاری)

ای خندہ زنان نوش تو بر تنگ شکر بر ۔۔۔ وای طنز کنان بوس تو بر رنگ قمر بر (سنائی)

ای بند نہادہ سر زلفت بہ سحر بر ۔۔۔ عناب تو آوردہ قیامت بشکر بر (سیف اعرج)

(ط) صنائع شعری میں غالب حسن تعلیل و لف و نشر کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

حسن تعلیل کی مثالیں :

گوہر فشان گلوی کر ابر بہار را ۔۔۔ از بس شتاب آبلہ پا کرد روزگار (۱۲۳)

از شکل ماہ نو بہ گمانم کہ ماہ را ۔۔۔ بر درگہ تو ناصیہ سا کرد روزگار (۱۲۵)

گر از بیم عدلش نباشد ہراسان چرا شعلہ بر خویش خنجر بر آرد (۱۶۶)

گر جنونی ہست گو باش، این ہمہ سوز از کجاست
نیست گر از خاک گلخن عنصر سودای من (۱۷۷)

ای کہ در نطقم روانی دیدہ دانی کہ چیست
می خورم خون دل و می ریزد از لبہای من (۱۷۸)

بود از گہر بہ بطن صدف نقشبند ابر
گشت از شفق بر اوج ہوا لالہ کار باد (۲۱۷)

عیار کعبہ رواں تا بہ تشنگی گیرند
ندادہ اند دران دشت راہ دریا را (۲۱۱)

لف و نشر کے نمونے

بہ نقد و نسیہ جہاں شاد شد کہ داد خدا
بہ من شراب و بزاہد مژدۂ تسنیم (۸۴)

از برون سوآبم اما از درون سو آتشم
ماہی از جوئی سمندر یابی از دریای من (۱۷۷)

جادۂ راہ و پرچم علمش
افق غربی و طلوع ہلال (۲۷۳)

غم چو گیرد سخت نتواں شکوہ از دلدار کرد بہر آسانی اساس آسماں انداختہ
گل چو ماند دیر، گرد و برد لش بازار سرد بہر تجدید طرب طرح خزاں انداختہ

(ی) تفنن طبع کے لیے غالب گاہے ایک حرف سے شروع ہوے الفاظ ایک سلسلے میں لاتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

داوران داور عدیم مثال سروران سرور محال همال (۲۷۳)

دارای فریدوں فرفرزانہ فرخ کز فر فراوان لقبش بو ظفر آمد

ہمتاے جہاندار نہ بینی بہ جہاں در کز فرہ و فرہنگ جہانی دگر آمد (۱۶۴)

چو صلح اصل صلاحست فتح چوں نبود صلاح بین کہ ہماں فتح دار داز اعراب (۲۷۷)

سکندر در دارا دربان (۲۲۷)

فرد فرہنگ فریدوں دہ آسایش خلق (۱۴۷) کہ جان وجامہ وجا ہر سہ رائیگاں گیرد (۳۶۴)

اس مصرع میں دال کی تکرار قابل توجہ ہے :

در دایرۂ دور قدح دیر نگنجد ۲۰۸

ایک ایک لفظ کی تکرار کی مثالیں :

در حضرت شاہ ہمہ داں وہمہ آرای کاندر ہمہ جا در ہمہ بخشی سمر آمد (۱۶۴)

حق جوی وحق شناسم وحق گوی وحق گزار (۳۸۵)

اسی سلسلہ میں یہ مثالیں بھی قابل توجہ ہیں :

ایمن از فتنہ عیاری عیارانم باچنیں تجربہ کز یاری یاران رفتم (۱۱۴)

نہ بکاشانہ کشیدم نہ بکاشانِ رفتم (۱۱۵)

برمکید ند ہمہ برمکیان زہر ز رشک (۱۱۹)

قافیہ کے سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ غالب نے واو معروف ومجہول کے قوافی ساتھ ساتھ استعمال کیے ہیں۔ مثلاً ایک قصیدہ کا مطلع یہ ہے

تجلئی کہ زموسی ربود ہوش بطور بشکل کلب علی خاں دگر نمود ظہور

اس کے دوسرے قوافی یہ ہیں :

نور، سطور، سرور، منصور، ظہور، ماموں، طہور، دستور، مزدور، شعور، کافور، زنبور،

قبور، گورِ، مشہور، ساطور، صدور، زبور، دیجور، گنجور، مغفور، دہور، معذور، صبور، مورِ، قصور، دور، شکور، سور، حور، طنبور۔

ان میں گور بمعنی قبر اور مور بمعنی چیونٹی واو مجہول سے ہیں، بقیہ تمام قوافی میں واو معروف آیا ہے، واو مجہول والے دو شعر یہ ہیں:

جہاں فانی و جان جہاں عجب نبود
کہ از ورود تو ہر مردہ رقصد اندر گور

کفی بدست تہی تر ز کیسۂ دلاک
دلی بسینہ بسی تنگ تر ز دیدۂ مور

مگر قدما کے یہاں مجھے معروف و مجہول کے قافیے نظر نہیں آئے، مثلاً

نجیب جرباد قانی کا قصیدہ — پو چتر روز فروگشت ازیں حدیقۂ نور
رشید وطواط کا قصیدہ — زہے بجود تو ایام مکرمت مشہور
ظہیر فاریابی کا قصیدہ — سپیدہ دم کہ شدم محرم سرای سرور
نجیب جرباد قانی کا قصیدہ — بباغ صورت بادام و خوشۂ انگور

عرفی نے ۸۷ شعر کا ایک قصیدہ اس مطلع کے ساتھ تحریر کیا ہے:

سپیدہ دم کہ زدم آستیں بشمع شعور
شنیدم آیت لا تقنطوا ز عالم نور (۱۷۔۷۹)

اس میں کوئی قافیہ واو مجہول سے نہیں ملتا۔

فارسی شاعری میں صنف قصیدہ اس کا طرۂ امتیاز ہے، فارسی شاعروں نے اس صنف کو ہر قسم کے خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا تھا۔ عارفانہ، اخلاقی، سیاسی، ملکی و ملی، تاریخی موضوعات پر اظہار خیالات کے لیے قصیدہ سے بہتر کوئی اور صنف نہیں، اور حق تو یہ ہے کہ ایرانی شاعروں نے اس صنف کی ترقی میں جو رول ادا کیا وہ محتاج بیان نہیں، فارسی قصیدے مضامین و موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتے، غالب کی قصیدہ نگاری کو

اگر فارسی قصیدہ گوئی کے پس منظر میں دیکھا جائے تو ان کا شمار بڑے قصیدہ نگاروں میں نہیں ہوسکتا اس لیے کہ موضوعات کے اعتبار سے ان کا دائرہ محدود رہا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کی ذہانت وطباعی قدم قدم پر اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ ان کے قصائد مضمون آفرینی نازک خیالی، جدت ادا کے نمونوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اسی بنا پر یہ قصیدے اکثر غزل کے حدود میں داخل ہوگئے ہیں۔ چناں چہ انھوں نے بعض اوقات غزل کی زمینوں میں قصیدے لکھے ہیں۔ اس سلسلے کی ایک مثال حافظ کی ایک غزل ہے۔ جو قبلاً نقل ہوچکی ہے غالب نے اس کے جواب میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔ جس کے ہر شعر میں آداب غزل کی پوری روایت ملحوظ رکھی گئی ہے، اور یہ بات محتاج ثبوت نہیں کہ غالب کا مزاج غزل کے لیے سازگار تھا خودداری، خودستائی ان کی طبیعت کا خاصّہ تھا۔ مگر حالات سے مجبور ہوکر انھوں نے قصیدے لکھے اور مستحق اور غیر مستحق سب کی مدح کی، مگر اس مدح میں اخلاص نہ تھا۔ وہ فطری تقاضے سے مدحیہ شاعری نہیں کرتے، خلاصہ یہ کہ غالب غزل گو شاعر کی حیثیت سے اپنا جواب نہیں رکھتے، لیکن قصیدہ گوئی میں وہ اس بلند مقام تک نہیں پہنچ سکے جہاں قدیم فارسی شاعر پہنچ چکے تھے۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ شاعری کا ملکہ ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اس لیے قصیدہ میں بڑے خوب صورت اشعار ملتے ہیں۔ مگر یہ اشعار قصیدے کے مزاج سے کتنے سازگار ہیں اس کا فیصلہ نقّادِ سخن ہی کرسکتا ہے۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ غالب کا کلام مطالعے کا وافر سامان اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ جتنا غور کیجیے زبان و ادب کے تعلق سے نئے نئے نکتے مل جاتے ہیں یہ اس شاعر کا کمال ہے جس میں وہ یگانہ و یکتا ہے۔ اس کی داد نہ دینا بڑی ناانصافی ہوگی۔

حواشی:

لہ بندار رازی نامی ایک شاعر ہے جو مجدالدولہ دیلمی کا مداح تھا (وفات ۴۰۱ھ)

ٹہ کلیات غالب ج ۲ ص ۲۹۳ آدم اوباری کے بجائے آدم ادباری ہے اور اس کتاب کے مصحح جناب فاضل لکھنوی نے اس پر یہ حاشیہ لکھا ہے:

"قصیدہ کے دونوں ماخذ میں "ادباری" ہے لیکن جناب وزیر الحسن عابدی نے خلاف نسخہ، قلمی "او باری" بنایا ہے، حاشیہ مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے اصل قصیدے میں اس کے یہ معنی لکھے تھے:

"آدم ادباری" ادباریدن بمعنی ناخائیدہ فرو بردن، ادبار صیغۂ امر و در آخر تحتانی مردم آ ارمثلہ۔

فاضل مصحح کی فارسی دانی تو ملاحظہ ہو کہ باوجود پروفیسر وزیر الحسن عابدی کے توجہ دلانے کے وہ آدم اوباری کو غلط اور آدم ادباری کو صحیح قرار دے کر اُسے متن ٹھہرایا، پھر غالب پر یہ تہمت دھری کہ انھوں نے بھی آدم ادبار۔ ادباریدن لکھا تھا، مصحح صاحب اگر کوئی فارسی کا لغت دیکھ لیتے تو ان کی ساری الجھن ختم ہو جاتی، لیکن اتنی زحمت کون گوارا کرے۔ فاضل محترم کے تصحیح شدہ نسخے میں تصحیف اور غلط خوانی کی متعدد اور بھی مثالیں مل جاتی ہیں مثلاً

ص ۱۶۸ بجائے دروا کے دردا : دل دردای من

ص ۲۰۳ پھر بجائے دروا دردا : ورنہ در سینۂ دل ہر کہ ببینی درد است

ص ۳۰۶ بجائے آذر برزین کے آور برزین : مغاں آور برزین

ص ۵۶ بجائے دیاہ کے دروی ماہ : گزارش ہو سم نو بہار دروی ماہ

۳ؔ ان اصطلاحات میں بڑا تنوع ہے، تصوف و عرفان، مذاہب و ادیان، فلسفہ و علوم وغیرہ کی سیکڑوں اصطلاحات سے نئے نئے مضامین پیدا کیے ہیں، یہ خود الگ بحث کا موضوع بن سکتا ہے۔

۴ؔ غالب کے ایک شعر میں رایگان دو بار آیا ہے، ایک بار ہندوستانی معنی میں، دوسری بار فارسی معنی میں:

در اجر اینکہ کوشش ما رایگان نرفت   خواہم زحق حیات ابد رایگان تو (۱۳۹)

دوسرے مصرع میں رایگاں برای تو ہونا چاہیے۔ پہلے مصرع میں رایگان بمعنی برباد و ضائع دوسرے میں بمعنی مفت ہے۔

۵ؔ پنج آہنگ، آہنگ پنجم نامہ بنام نواب سید اکبر علی خاں متولی امام بارہ ہوگلی بندر

۶ؔ شمس الدین التمش کے دور میں وارد ہند ہوا تھا، اس کے دیوان کے دو نسخے ملتے ہیں، راقم نے ان کی مدد سے اس کا دیوان مرتب کر کے ۱۹۷۱ء میں شائع کر دیا ہے۔ یہ شاعر عہد مملوک کا شاید

سب سے قدیم حقیقی صاحب دیوان شاعر ہے۔

۷ ای بطبع باغ کون از بہر برہان حدوث　　طرح رنگ امیزی فصل خزاں انداختہ (عرفی)

فصل خزاں کی طرح رنگ آمیزی کی جو علت عرفی نے بتائی ہے وہ زیادہ حکیمانہ ہے۔

۸ مونس الاحرار ج ا ص ۱۷۸ - ۱۸۱

۹ ایضاً　　ص ۱۸۱ - ۱۸۳

۱۰ ایضاً ج ۲ ص ۵۷۴ - ۵۷۶

۱۱ ایضاً　　ص ۵۸۵ - ۵۸۸

۱۲ مرزا محمد قزوینی نے لکھا ہے کہ حافظ یای مجہول اور یای معروف کے قافیے نہیں لاتے ہیں

یادداشتہای قزوینی ج ۱۰ ص ۲۴۶ - ۲۴۷۔

کلامِ غالب بہ خطِ غالب

کمال احمد صدیقی

غالبؔ کے کچھ شعروں کا متن
حالیؔ کی تحریروں میں

غالب پر چند تحریریں" ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کے مضامین کا مجموعہ ہے، جو انجمن ترقی اردو (ہند) نے اپنی روایات کے مطابق بہت خوب صورت چھاپا ہے۔ سب سے اہم اس کتاب کا پہلا مضمون ہے یادگارِ غالب اور مقدمۂ شعر و شاعری میں غالبؔ کے بعض اشعار۔ فاضل مصنّف تحقیق کے طریقۂ کار اور آداب سے واقف ہیں۔ آپ نے ایم لٹ اور پی ایچ ڈی کی ڈگریوں کے لیے رسمی اور باقاعدہ تحقیق کی ہے، اس لیے انھوں نے یقیناً بہت چھان پھٹک کر، ماخذوں سے کام کی باتیں نکالی ہوں گی۔ آیئے مصنّفِ موصوف کی چھان بین سے استفادہ کریں — لیکن پہلے، اُن کا نقطۂ نظر سمجھ لیں۔ مصرعوں میں اختلافِ نسخ کی نشاندہی کرنے سے پہلے، کچھ اہم باتیں انھوں نے لکھی ہیں:

> "یادگار غالب اور مقدمۂ شعر و شاعری میں، حالیؔ نے غالبؔ کے جو اشعار درج کیے ہیں، ان میں اکثر اشعار کا متن، آج کے مصدقہ نسخوں میں موجود متن سے خاصا مختلف نظر آتا ہے۔ . . . (محمد حسین) آزادؔ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے استاد، ذوقؔ کے کلام کو جب مرتّب کیا، تو جگہ جگہ اس میں لفظی تصرفات کرتے گئے۔ . . . کبھی کبھی سماعت، یا جس چیز کو مذاقِ سلیم یا خوش مذاقی کہا جاتا ہے، اور جو دراصل انسان کی ذاتی پسند یا ناپسند کا دوسرا نام ہے، اس کی کرشمہ کاریاں بھی ایسے اختلافات کی ذمہ دار ہوتی ہیں مولانا حالیؔ کو مرزا غالبؔ سے جو ربطِ خاص تھا، وہ جس قدر اُن کے قریب تھے۔ اور کلامِ غالب سے ان کو جو تعلّقِ خاطر تھا، ان سب کی بنا پر، ان کے درج کردہ اشعار کے متن کو بھی اہمیت حاصل

ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اِن اختلافات کو ترجیح (کذا) نہ دی جا سکے، اور اصل متن کا درجہ انھیں حاصل نہ ہو سکے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مصنف موصوف نے بڑی شائستگی سے ان باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

۱۔ محمد حسین آزاد کی طرح حالی نے بھی اپنے استاد کے کلام میں تحریف کی۔

۲۔ غیر شعوری، اور غیر ارادی طور پر حالی سے کلامِ غالب میں تحریفیں ہوئیں۔ کچھ یادداشت نے دھوکا دیا ہوگا، اور کچھ شعر حالی نے الفاظ میں تصرفات کر کے، اپنے مذاقِ سلیم کے مطابق لکھے ہوں گے۔

مصنّف موصوف نے موثر انداز میں، انشا پردازی یا لفاظی کے بغیر شہادتیں پیش کر دی ہیں۔ اگر مزید چھان بین نہ کی جائے، تو قاری ان کے ہمنوا ہو جائیں گے، جس کی مثال اور ثبوت حرفِ آغاز ہے۔ لیکن اس کے بارے میں معروضات آخر میں پیش کی جائیں گی، جن اختلافاتِ نسخ کی نشاندہی کی گئی ہے، ان کے مطالعے کے بعد۔

مالک رام اور امتیاز علی خاں کے مرتب کیے ہوئے دیوانِ غالب کے نسخوں کو مصنّف موصوف مصدّقہ سمجھتے ہیں۔ مالک رام کا خیال ہے کہ مفتی محمد انوار الحق کا مرتب کیا ہوا دیوانِ غالب جدید (نسخۂ حمیدیہ) جامع الاغلاط کہلانے کا مستحق ہے۔" حقیقت یہ ہے کہ مفتی صاحب کا کام اولین اور بنیادی ہے۔ اگرچہ اغلاط سے پاک نہیں ہے، لیکن اتنی غلطیاں نسخۂ حمیدیہ میں نہیں ہیں، جتنی ہر دو فاضل مرتبین کے نسخوں میں ہیں۔ "علم و دانش" (سری نگر) کی جلد اول (شمارہ ۱)، جنوری ۱۹۷۳ء میں اس عاجز کی کتاب "رموزِ غالب" کا ایک باب شائع ہوا تھا۔ اس میں کچھ ایسے اشعار کی نشاندہی، تقطیع کے ساتھ کی گئی تھی جو اِن دو نسخوں میں غلط قرأتوں کے ساتھ درج ہوئے ہیں۔ سب مثالوں کو نقل کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔ مصنّف موصوف سے گزارش ہے کہ جن نسخوں کو وہ مصدّقہ تصور فرماتے ہیں، اُن میں اِن اشعار کی قرأت دوبارہ ملاحظہ فرمائیں:

صد سالہ یادگارِ غالب ایڈیشن میں غزل نمبر ۹، میں ص ۷، پر شعر یوں لکھا ہے:

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اِک رقصِ شرر ہوتے تک

نسخۂ عرشی میں ص ۵۰۷، پر اسی غزل کا مطلع یوں لکھا ہے:

آہ کو چاہیے ایک عمر اثر ہوتے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک

رمل مثمن مخبون محذوف: فاعلاتن فعِلاتن فعِلاتن فعلن (۲ بار)، میں دونوں مصرعوں کی تقطیع ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ گرمیٔ بزم (فاعلاتن)، م ہ اک رق (فعِلاتن) ص شرر ہو (فعِلاتن)، تے تک (فعلن)،

۲۔ آہ کو چا (فاعلاتن)، ہیے اک عم (فعِلاتن)، ر اثر ہو (فعِلاتن)، تے تک (فعلن)

ایک دونوں جگہ واضح طور سے غلط ہے۔ پہلی مثال میں اک فعِلاتن میں لا کے مقابل ہے۔ دوسری مثال میں بھی اک اسی مقام پر لا کے مقابل ہے۔ جب اعراب بالحروف لکھے جاتے تھے۔ تو اک اور ایک، دونوں کی کتابت ایک ہوتی تھی۔ دوسری مثال میں غلطی دوہری عبرتناک ہے، اس لیے عرشی مرحوم عین صحیح مخرج سے بولنے پر قادر تھے۔ عام طور سے اردو میں عین اور الف کی ایک ہی صوت ہے یہاں عین کو الف کی طرح پڑھ کر عین موصول بنا دیا گیا۔ حالاں کہ عین کی صوت موصول نہیں ہوتی۔ الف مصوّتہ ہے (اگرچہ اور کوئی مصوّتہ، واوِ عطف بکسر، جو دراصل الف مضموم ہے، موصول ہوتا ہے۔ عین مصمتہ ہے۔ یہ موصول نہیں ہوتا۔ نسخۂ عرشی کی اس قرارت کی وجہ سے اگر کوئی یہ نتیجہ نکالے کہ غالب عین موصول کے قائل تھے، تو نادرست ہوگا۔

صرف ایک ایک مثال نقل کی گئی ہے۔ یہ کوئی نادر مثال نہیں۔ دونوں نسخوں میں بہت سے مقامات ایسے ہیں، جن سے واضح ہوتا ہے کہ شعر آہنگ میں نہیں پڑھے گئے۔ اعراب بالحروف کو حروفِ اصلی پڑھا گیا یائے معروف و مجہول کا خلط کثرت سے ہوتا تھا۔ اس سلسلہ میں بھی ان فاضل مرتبین سے تسامح ہوا۔ مثلاً ایک شعر ہے:

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئی
اُٹھا، اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے!

دونوں نسخوں میں شامت آئی کی جگہ شامت آئے لکھوایا گیا ہے۔ حالاں کہ اس سے مصرع کا مضمون خبط ہو جاتا ہے۔ نظم طباطبائی (مرحوم)، شرح میں اس شعر کی صحیح قرارت بہت پہلے درج کر چکے تھے۔[۲۵]

اعراب بالحروف پڑھنے میں جو تسامح، ان فاضل مرتبین سے ہوا، اس کی وجہ سے ڈاکٹر سعادت علی صدیقی سے بھی لغزش ہوئی، اور انھوں نے اک کی جگہ نسخۂ عرشی میں ایک — دیکھ کر، اسے اختلافِ نسخ سمجھا۔[۲۶] یہ مفروضہ بھی گمراہ کن ہے کہ اس نسخے میں اختلافِ نسخ کے تحت شعر کی تمام قراتوں کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ عرشی

نے "یادگارِ غالب" کو بھی معتبر ماخذ تسلیم کیا ہے، اور اختلافات کی نشاندہی کی ہے، اگرچہ سب کی نہیں۔

اب ہم ان اشعار کو لیتے ہیں، جن کی قرارت میں مصنّف موصوف نے یادگارِ غالب اور نسخۂ عرشی کے درمیان اختلاف دکھایا ہے:

آئے ہو کل، اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا کوئی دن اور

یہ قرارت نسخۂ عرشی (ص ۱۷۰)، اور نسخۂ مالک رام (ص ۵۹) کی ہے۔ یادگارِ غالب میں حالی نے دوسرا مصرع یہ لکھا ہے:

مانا کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دن اور

دیوانِ غالب جدید، یعنی نسخۂ حمیدیہ میں مفتی محمد انوار الحق نے بھی ص ۷۷ پر یہی مصرع لکھا ہے۔ مفتی صاحب کا ماخذ دیوانِ غالب کا کوئی نسخہ تھا، یادگار نہیں۔ عرشی نے یادگار کا اختلافِ نسخ تو دکھایا ہے، لیکن حمیدیہ کا نہیں۔

مالک رام اور عرشی کے نسخوں میں ایک شعر یوں ہے:

۲۔ تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

یادگار میں حالی نے پہلا مصرع یوں نقل کیا ہے:

تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے

عرشی نے اس اختلافِ نسخ کی نشاندہی نہیں کی ہے، جو اُن کے نسخے کے اس اعتبار سے کامل نہ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

۳۔ ناداں ہو، جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

حالی نے یادگار میں پہلا مصرع یہ نقل کیا ہے:

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب

عرشی نے اس اختلافِ نسخ کی نشاندہی کی ہے۔

یہ غزل عارف کا مرثیہ ہے۔ متداول دیوان میں، بشمولِ مطلع و مقطع، یہ دس شعروں کی غزل ہے۔ یادگار میں حالی نے نو شعر نقل کیے ہیں۔ یہ شعر متداول دیوان کا اس میں نہیں ہے:

مٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

یہ شعر غزل کا ہے، اور اگرچہ قنوطی فضا کا ہے، لیکن عارف کا مرثیہ یقیناً نہیں ہے۔ شاید اسی وجہ سے حالی نے نقل نہیں کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی شعر اس کاغذ یا حافظے میں رہے ہوں گے، جو حالی کے پیش نظر تھا۔ حالی نے یہ بھی لکھا ہے:

"زین العابدین خاں عارف سے مرزا کو غایت درجے کا تعلق تھا۔۔۔۔ اسی لیے جب وہ جوان عمر میں فوت ہو گئے، تو مرزا اور ان کی بی بی پر سخت حادثہ گزرا۔ مرزا نے ان کے مرنے پر ایک غزل بطور نوحے کے لکھی ہے، جو نہایت بلیغ اور دردناک ہے۔ چناں چہ اس کے چند شعر ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔"

ظاہر ہے اگر یہ غزل صرف دس شعروں پر مشتمل ہوتی، اور نو شعر نقل کیے گئے ہوتے۔ تو حالی چند شعر نقل کرنے کی بات نہ کرتے، حالی کے بیان پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ان کے بیان سے یہ نتیجہ اخذ کرنا حقیقت سے دور نہ ہوگا کہ اس غزل میں پندرہ، سترہ یا اس سے بھی زیادہ شعر رہے ہوں گے۔ چند کا مطلب یہ ہے کہ جتنے شعر نقل کیے گئے، ان سے کہیں زیادہ نہیں، تو خاصی تعداد میں شعر چھوڑ دیے گئے۔ حالی نے ظاہر ہے اپنی یادداشت سے یہ شعر نہیں لکھے ہوں گے۔

اپنے عجز کا اقرار: اس ذیلی سرخی کے تحت (ص ۴۰ اپر) حالی نے ذکر کیا ہے کہ غالباً مجتہد العصر سیّد محمد صاحب کی فرمائش پر مرزا نے مرثیہ لکھنا چاہا۔ مشکل سے تین بند لکھ سکے:

"۔۔۔ قویٰ میں انحطاط شروع ہو گیا تھا۔ مشکل سے مسدس کے تین بند لکھے، جن میں سے پہلا بند ہم کو یاد ہے، اور یہاں نقل کیا جاتا ہے۔"

حالی نے ایک بند اپنی یادداشت سے لکھا ہے، اس لیے اس بات کا ذکر کر دیا، کہ ایک محتاط ادیب کی حیثیت سے یہ ان کا فرض تھا۔ یہ اس خیال سے کیا کہ مبادا مرثیے کے یہ بند کہیں نقل کیے جائیں، اور ایک آدھ لفظ میں اختلاف ہو، تو ان پر تحریف کا الزام نہ لگایا جائے۔

۴۔ وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبِ آشفتہ نوا، کہتے ہیں

یادگار میں شاگردوں کی کثرت کے تحت حالی نے لکھا ہے :

"۔ ۔ ۔ ۔ نواب مصطفےٰ خاں مرحوم، جنھوں نے مومن خاں مرحوم کی وفات کے بعد ہمیشہ اپنا کلام فارسی ہو یا اردو، مرزا ہی کو دکھایا۔ یا جیسے سیّد غلام علی خاں مرحوم متخلّص بہ وحشت، جو مرزا کے حد سے زیادہ ماننے والے اور معتقد، اور ان کی صحبت سے مستفید رہے تھے، مرزا نے انھیں دو صاحبوں کی طرف اپنی ایک اردو غزل کے مقطع میں اشارہ کیا ہے، اور کہا ہے :

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید

یادگار لکھتے وقت مرزا کا جو کلام حالی کے پیشِ نظر رہا ہوگا۔ اس میں کہویں نہیں لکھیں ہی رہا ہوگا اس ایک لفظ کی تبدیلی سے شعر زمین سے آسمان پر نہیں پہنچ جاتا۔ حالی نے اپنے استاد کے کلام میں اصلاح کی ہو، ایسا سوچنا بھی، کسی شہادت یا سراغ کے بغیر زیادتی ہوگی۔

نسخۂ عرشی میں زیرِ نظر شعر میں اختلافِ نسخ نہیں دکھایا گیا ہے۔ یہ ایک اور اشارہ اس نسخے کے کامل نہ ہونے کی طرف ہے۔

یادگار لکھتے وقت خواجہ الطاف حسین حالی کے سامنے کوئی ایسی بیاض بھی شاید تھی۔ جو فوجدار محمد خاں کے کتب خانے والا نسخہ (نسخۂ بھوپال)، لکھے جانے سے پہلے کی تھی۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ اس میں مرزا کا کلام جمع کیا، لکھا جاتا تھا۔ یادگار میں کچھ اشعار کی قرأت، ان کے کلام کے نسخوں کی قرأت سے کہیں کہیں مختلف ہے۔ یادگار میں کہیں کہیں ابتدائی قرأت ان اشعار کی ہے، جب کہ دوسرے نسخوں میں اصلاح/ اصلاحوں کے بعد کی ہے۔

یادگار کے دیباچے میں حالی نے لکھا ہے :

"۔ ۔ ۔ ۔ کبھی کبھی مجھ کو اس بات کا خیال آتا تھا کہ مرزا کی زندگی کے عام حالات، جس قدر معتبر ذریعوں سے معلوم ہو سکیں، اور ان کی شاعری و انشا پردازی کے متعلق جو امور کہ احاطۂ بیان میں آسکیں، اور ابنائے زماں کے فہم سے بالاتر نہ ہوں، ان کو اپنے سلیقے کے موافق قلم بند کروں۔ پچھلے برسوں جب میں دلّی میں مقیم تھا، بعض احباب کی تحریک سے اس

خیال کو اور زیادہ تقویت ہوئی۔ میں نے مرزا کی تصانیف کو، دوستوں سے مستعار لے کر، جمع کیا، اور جس قدر اس میں ان کے حالات اور اخلاق و عادات کا سراغ ملا، ان کو قلم بند کیا، اور جو باتیں اپنے ذہن میں محفوظ تھیں، یا دوستوں کی زبانی معلوم ہوئیں، ان کو بھی ضبط تحریر میں لایا، مگر ابھی ترتیب مضامین کی نوبت نہ پہنچی تھی کہ اور کاموں میں مصروف ہو گیا، اور کئی برس تک وہ یادداشتیں کاغذ کے مٹھوں میں بندھی ہوئی رکھی رہیں۔"

خواجہ حالی دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ دوبارہ جب دوستوں نے اس طرف توجہ دلائی تو:

"میں نے ان مٹھوں کو کھولا، اور ان یادداشتوں کو مرتّب کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر ان کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مرزا کی تصنیفات پر پھر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی۔ اور اس کے سوا کچھ اور کتابیں بھی درکار ہوں گی۔ میں نے دلّی کے بعض بزرگوں اور دوستوں کو لکھا، اور انھوں نے مہربانی فرما کر میری تمام مطلوبہ کتابیں، اور جس قدر مرزا کے حالات ان کو معلوم ہو سکے، لکھ کر میرے پاس بھیج دیے۔ . . ."

حالی نے اگر تفصیل دی ہوتی کہ ان کے پیشِ نظر کیا میٹیریل تھا، تو آج مرزا کے بارے میں خود ان کے بارے میں، اور اس عہد کے بارے میں تحقیق کرنے والوں کو بڑی مدد ملتی۔ ان اطلاعات کے براہِ راست فراہم نہ ہونے کے باوجود ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے ماخذ معتبر ذرائع سے جمع کئے تھے، اور ان کی چھان بین بھی کی ہوگی۔

دیوان کی اشاعت کے لیے مرزا نے خود اپنے کلام کا انتخاب کیا تھا۔ ایک دوسرے زاویہ سے انھوں نے شعر میں کہا۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

جو کلام مرزا نے نظری کر دیا تھا وہ ضائع نہیں ہوا۔ سب نہیں تو اس کا بڑا حصہ حالی کے مٹھوں تک پہنچا اس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے ابتدائی کلام کے نمونے کے طور پر سات شعر یادگار میں پیش کیے ہیں۔

(۱) کرے ہے گر فکرِ تعمیر خرابیہائے دل گردوں
نہ نکلے خشت مثلِ استخواں بیروں رقا لبہا

یہ شعر، بلکہ یہ غزل نسخۂ شیرانی میں نہیں ہے۔ نسخۂ حمیدیہ (ص ۱۳۱) میں نسخۂ بھوپال کا یہ مصرع درج ہے:

نہ نکلے خشت مثلِ استخواں بیرونِ قالبہا

یادگار میں ظاہر ہے نسخۂ بھوپال سے پہلے کا مصرع ہے۔ نسخۂ عرشی میں، نسخۂ بھوپال کے حوالے سے، دوسرا مصرع وہی لکھا گیا ہے، جو یادگار میں حالی نے دیا ہے۔ کسی اختلافِ نسخ یا اصلاحِ بعدِ کتابت کی نشاندہی بھی نہیں کی گئی ہے۔ نسخۂ بھوپال غائب کر دیا گیا ہے، اور حوالے کے لیے فراہم نہیں ہے۔ نسخۂ شیرانی کا عکس مہیا ہے، لیکن نسخۂ بھوپال کا نہیں۔ اس لیے ہم مفتی انوار کے نسخۂ حمیدیہ اور عرشی کے نسخے میں ان کے اظہار پر اکتفا کرنے پر مجبور ہیں۔ حمیدیہ اور نسخۂ عرشی، دونوں اغلاط سے پاک نہیں ہیں۔ عرشی نے حمیدیہ/نسخۂ بھوپال کی قراتوں میں اس واضح اختلافِ نسخ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ دو ہی نتیجے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ ۱۔ نسخۂ بھوپال میں ابتدائی قرأت "بیروں ز قالبہا"، تھی، جو "بیرونِ قالبہا" اصلاح سے کی گئی۔ لیکن اگر ایسا ہوتا، تو کیسے ممکن تھا کہ مفتی انوار اور عرشی، دونوں اس کا اظہار کرنا بھول جاتے! ۲۔ عرشی نے یادگار کی قرأت کو مرجّح سمجھ کر اپنے نسخے میں لکھا۔ لیکن اختلافِ نسخ کے تحت اس کا اظہار کرنا بھول گئے۔ کوئی تیسری صورت ممکن نہیں ہے۔ دونوں صورتوں میں حالی نے جو مصرع لکھا ہے، وہ ابتدائی قرأت ہے، نسخۂ بھوپال سے پہلے کی۔ دونوں صورتوں میں سے جو بھی درست ہو، حمیدیہ اور یادگار کی قراتوں میں اختلاف کا نہ دکھایا جانا نسخۂ عرشی کے کامل نہ ہونے کی دلیل ہے۔

یادگار کا جو نسخہ میرے سامنے ہے، اس کے فٹ نوٹ میں اس بات کا اظہار ہے کہ مرزا نے اپنی ایک فارسی غزل میں مندرجہ صدر زیرِ بحث شعر کو یہ روپ دیا:

کند گر فکر تعمیرِ خرابیہاے ما گردوں
نیاید خشت مثلِ استخواں بیروں ز قالبہا

یہ ناممکنات میں سے نہیں اس کی وجہ سے عرشی نے یادگار کی قرأت کو مرجّح جانا، گو اس کا حوالہ نہیں دیا۔

طوالت سے بچنے کے لیے باقی شعر نظر انداز کیے جاتے ہیں۔ ساتویں شعر کا ذکر آگے آئے گا۔

۵۔ شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

یادگار میں مصرع اولیٰ ہے:

شب خمارِ چشمِ ساقی رستخیز اندازہ تھا

(سعادت علی صدیقی کے مضمون میں شوق اور چشم، دونوں کسرۂ اضافت سے محروم ہیں۔ یادگار والے مصرع میں خمار بھی بے کسرۂ اضافت ہے)

مصرع اولیٰ جیسا کہ مروجہ دیوان میں ہے، ویسا ہی نسخۂ حمیدیہ (ص ۱۳) اور نسخۂ شیرانی (ورق ۱۵) میں ہے نسخۂ عرشی اختلافِ نسخ کے باب میں ناقص ہے، کہ اس میں یادگار کی قرأت کے بارے میں کوئی اظہار نہیں ہے یادگار کے مصرع میں چشم کی وجہ سے ارضیت زیادہ ہے، جب کہ متداول دیوان کا مصرع شوق کی وجہ سے زیادہ بالیدہ اور بلند آہنگ ہے۔ چشم، نسخۂ بھوپال سے پہلے کی قرأت ہوگی، ورنہ حالی اس مضمون کو روایتی تلازمے (خمار چشم ساقی، کی سطح پر نہ لاتے۔ غالب کی فکر کا سفر ہے لفظ آفرینی سے خیال آفرینی کی طرف۔ حالی جیسا عزیز شاگرد، اور عقیدتمند جو مرثیہ میں کہتا ہے:

شعر میں ناتمام ہے حالی

غزل اس کی بنائے گا اب کون

نہ صرف استاد کی غزل بناتا، بلکہ استاد کے ذہنی سفر کا رخ، اور وہ بھی ماضی میں بدلنے کی کوشش کرتا۔ حالی کا مقصد اصلاحِ معکوس سے ماقبل کی قرأت دکھانا نہیں ہو سکتا۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ حالی کے پاس جو کلام مرزا کا تھا، اس میں اسی طرح مصرع ہوگا۔ اگلی مثال سے اس کی وضاحت ہوگی:

۶۔ ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہو گیا

تو کہے صحرا غبارِ دامنِ دیوانہ تھا

حمیدیہ میں ص ۳۲ پر اور نسخۂ عرشی میں ص ۲۵ پر (گنجینہ معنی)، یہی قرأت ہے۔ نسخۂ شیرانی (ورق ۱۳ ب) میں بھی شعر کے الفاظ یہی ہیں۔ آغازِ معروضات میں یادگار میں، مرزا کے ابتدائی کلام سے مثالوں میں، جو سات اشعار کا ذکر کیا گیا تھا، ان میں ساتواں اور آخری شعر حالی نے یہ لیا تھا۔

۷۔ ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہو گیا

گویا صحرا غبارِ دامنِ دیوانہ تھا

مصنف موصوف نے ایک تو گویا کو گوِیا لکھا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سہوِ کتابت ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ اس لفظ کو حالی کی اصلاح / تحریف سمجھتے ہیں۔ عرض ہے کہ یہ مصرع گویا کے ساتھ ہی نسخۂ بھوپال کے متن میں لکھا گیا تھا۔ پروف خود غالب نے پڑھا، اور ساتھ ساتھ نظرِ ثانی بھی کی۔ اور اس وقت گویا قلمزد کر کے تو کہے لکھا گیا۔

نسخۂ حمیدیہ میں اس بات کا اظہار ہونے سے رہ گیا ہے۔ لیکن عرشی نے نسخۂ بھوپال دیکھنے کے بعد جو یادداشتیں مرتّب کی تھیں، ان کی بنیاد پر انھوں نے اپنے نسخے کے اختلافِ نسخ کے باب میں ص ۲۰۴ پر اس حقیقت کی نشاندہی کی ہے۔ اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے ؟

اس سے ثابت ہوتا ہے، اور کسی شک و شبہ کے بغیر، کہ حالی کے سامنے جو مخطوطہ/مخطوطے تھے، اُس/اُن میں مرزا کا ابتدائی کلام بھی تھا، نسخۂ بھوپال کی اصلاح یافتہ صورت سے پہلے کا۔

جب یہ ثابت ہے، تو دوسرے اشعار کے سلسلہ میں بھی یہ گمان کرنا کہ حالی نے کوئی تحریف کی ہوگی، درست نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حالی نے بعض شعروں کی منسوخ قرأت دی ہے۔ اصلاح سے پہلے کی، لیکن یہ کوئی ایسی لائقِ مواخذہ بات نہیں۔ منسوخ قرأت ایک بات ہے، اور اصلاحِ غیر بالکل دوسری نوعیت کی بات ہے۔ جو فعلِ قبیح ہے۔ حالی نے اپنے استاد کا کوئی مجموعہ مرتّب کیا ہوتا، اور بعد کی قرأتوں کے بجائے، قبلِ اصلاح کی قرأتیں دی ہوتیں، تو بات قابلِ گرفت ہو سکتی تھی۔ انھوں نے تو غالب کے کلام کی خصوصیات، اور ان کے ذہنی ارتقا اور ذہنی رویّے کی بات کی ہے، اور مثالیں اسی سلسلہ میں پیش کی گئی ہیں۔

کثرت سے تو مرزا نے اپنی اصلاحوں کو کالعدم نہیں کیا ہے، لیکن اپنی کچھ اصلاحوں کو بھی انھوں نے منسوخ کیا ہے۔ ایسا بھی ہوا کہ ایک شعر میں پورا مصرع بدل کر ایک ناشر کو دیوان چھاپنے کے لیے دیا۔ اور دوسری جگہ سے اسی زمانے میں جو دیوان چھپا، اس میں اصلاح سے پہلے کا مصرع برقرار رہا۔ اگرچہ اس میں معنوی سقم تھا۔ لیکن مرزا خود اصلاح کر کے بھول گئے!

۷۔ بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

یادگار میں اس مطلع کا پہلا مصرع یہ ہے :

بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا

نسخۂ بھوپال کی اس غزل کی ایک اہم بات یہ ہے کہ نسخۂ بھوپال میں لکھے جانے کے بعد، مرزا نے کبھی کسی شعر میں کوئی لفظ نہیں بدلا، نسخۂ شیرانی میں یہ غزل ورق ۱۲ ب اور ۱۳ الف پر ہے۔ متداول دیوان کے سب نسخوں میں غزل وہی ہے۔ دشوار فارسی لغت ہے اور مشکل عربی۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے مرادف ہیں۔

حالی کے سامنے مخطوطہ یا کاغذات ہیں، اس غزل کے مطلع میں "مشکل ہے ہر اک" نسخۂ بھوپال سے پہلے کی قرأت ہوگی۔ نسخۂ بھوپال اور متداول دیوان کا مصرع زیادہ رواں اور چست ہے، اور یادگار کے مصرع کی اصلاح یافتہ شکل ہے۔ اس لیے یہ احتمال بے بنیاد ہوگا کہ حالی نے مصرع میں تحریف یا اصلاح کی۔

یہ اختلافِ نسخ بھی نسخۂ عرشی میں نہیں دکھایا گیا ہے، اور یہ بات بھی اس کے کامل نہ ہونے کی ایک دلیل ہے۔

۸۔ رنج سے خوگر ہوا انساں، تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یادگار میں دوسرا مصرع ہے:

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

پہلی بات جو توجہ کی مستحق ہے، یہ ہے کہ نسخۂ عرشی میں ص ۱۹۲ پر دوسرا مصرع یوں لکھا ہے:

مشکلیں مجھ پر پڑی اتنی کہ آساں ہوگئیں

غلط نامہ جو بڑی محنت سے تیار کیا گیا ہے، اس میں طباعت کی کوئی غلطی اس مصرع میں نہیں بتائی گئی ہے۔ مصنف موصوف نے نسخۂ عرشی کا حوالہ دے کر پڑی کے بجائے پڑیں لکھا ہے۔ یہ تحقیق کے آداب کے منافی ہے۔

یادگار لکھتے وقت حالی کے پیشِ نظر جو نسخہ تھا/رہا ہوگا اسی سے انھوں نے اس قرأت کے ساتھ یہ مصرع نقل کیا ہوگا۔ یہ قرأت صرف حالی کے تصنیف میں نہیں۔ یہی مصرع نسخۂ حمیدیہ میں ہے۔ ملاحظہ فرمائیں ص ۱۳۹ پر نواں مصرع!

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے بارے میں مفتی محمد انوار الحق نے نسخۂ حمیدیہ میں ص ۲۸ پر لکھا ہے:

"۔۔۔ جب انجمن ترقی اردو نے دیوانِ غالب اردو کی ایک نئی اشاعت کا ارادہ کیا، تو نظرِ انتخاب مرحوم ہی پر پڑی، اور انھوں نے بھی اِس ملکی اور ادبی خدمت کو بطیب خاطر قبول کیا۔

۔۔ مرحوم نے بڑے اہتمام سے اس کے سرانجام کا قصد کیا۔ سب سے پہلے دیوانِ غالب کے مختلف اور متداول نسخے بہم پہنچا کر، نہایت احتیاط سے اس کی تصحیح کی، اور اس کے ساتھ ہی غالب کی شاعری پر ایک ضخیم اور بسیط تبصرہ لکھنا شروع کیا۔۔۔"

انجمن ترقی اردو نے بجنوری کا مرتب کیا ہوا متداول دیوان شائع نہیں کیا، ان کا لکھا ہوا تبصرہ نسخۂ حمیدیہ میں

شامل ہے۔ بجنوری ۔۔ ۱۱ ، نومبر ۱۹۱۸ء کو ہوا تھا۔ نہ ان کے مقدمہ پر جو محاسنِ کلامِ غالب کے نام سے شائع ہوا ، اور نہ مفتی محمد انوار الحق کی تمہید یا بجنوری کے تعارف کے خاتمہ پر کوئی تاریخ یا سنہ ہے۔ البتہ دو باتیں ہمیں معلوم ہیں۔ ایک یہ کہ نسخۂ حمیدیہ ۱۹۲۱ء میں آگرہ کے ایک پریس میں چھپا تھا۔ دو: یہ کہ بقول مفتی بجنوری وفات سے دو برس قبل بھوپال پہنچے تھے۔ "یادگارِ غالب" کی اشاعت کا سنہ ۱۸۹۷ء ہے۔ تقریباً اسی زمانے میں بجنوری نے متداول دیوان کے نسخے جمع کر کے تصحیح و ترتیب کا کام شروع کیا ہوگا ، ان کے مقدمہ میں حالی سے استفادہ واضح ہے۔ ان کے مقدمہ کا ایک اہم حصہ یادگار کی گونج ہے ، اگرچہ حالی متین تھے اور بجنوری شعلہ جوالہ۔ اشعار کی قرأت کے سلسلے میں بجنوری نے یادگار سے زیادہ اثر نہیں لیا۔ نسخۂ حمیدیہ میں ، نسخۂ بھوپال (مخطوطے) کے علاوہ متداول کلام بھی شامل ہے۔ بجنوری نے جو ذخیرہ جمع کیا تھا ، اور جو دیوان مرتب کیا تھا ، اگر یہ کام مکمل ہوا ہو ، اس سے مفتی نے استفادہ نہ بھی کیا ہو ، تو بھی ان کے سامنے غالب کے کلام کے مختلف ایڈیشن رہے ہوں گے۔ اس پس منظر کے بعد ہم موضوعِ حاضر پر واپس آتے ہیں۔

۱۔ نسخۂ حمیدیہ میں ص ۱۳۹ پر اس شعر کا مصرعِ ثانی وہی ہے ، جو یادگار میں حالی نے لکھا ہے۔

۲ "غالب کے خطوط" (غالب انسٹی ٹیوٹ ، جلد اول میں ص ۱۹۷ پر مرتب خلیق انجم نے بھی یہ شعر "اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے" کے تحت) یادگار اور حمیدیہ کی قرأت کے مطابق لکھا ہے۔

۹۔ اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

یادگارِ غالب میں مصرعِ ثانی یہ ہے :

جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

حالی کے پیشِ نظر جو ماخذ ہوگا ، اس میں یہ مصرع اس طرح لکھا ہوگا۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان دونوں میں سے کون سا مصرع بہتر ہے۔ یادگار کی مختلف قرأت کے بارے میں کوئی اندراج نسخۂ عرشی میں نہیں ہے ، یہ ایک اور نقص اختلافِ نسخ کے باب میں ہے۔ ایک نقص اور بھی ہے ، جو نہایت گمبھیر ہے اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ کلامِ غالب کے مرتب مصرع آہنگ میں پڑھنے پر قادر نہیں تھے۔ غیر موزوں کر کے مصرع متن میں لکھے ہیں اور دوسرے نسخوں کے موزوں مصرعوں کو غیر موزوں سمجھ کر سہوِ کتابت کا شکار بتایا ہے۔ چناں چہ اس شعر کے سلسلے میں "اختلافِ نسخ" کے باب میں ایک گمراہ کن اندراج ہے۔ پہلے

مصرع میں آئے (ہمزہ کے ساتھ)، دوسرے مطبوعہ ایڈیشن (۱۸۴۷ء) کے آخر میں، نسخۂ رام پور جدید (۱۸۵۵ء) اور پانچویں مطبوعہ ایڈیشن (۱۸۶۳ء) میں عرشی نے سہو کاتب بتایا ہے۔ جنھیں عروض کی شُدبُد ہے وہ بھی اسے سہو کاتب نہیں سمجھیں گے۔ خود ان کے اور مالک رام کے نسخے میں کئی مقامات پر، جہاں ہمزہ ہونا چاہیے، نہیں ہے، اور جہاں نہیں ہونا چاہیے، ہے۔

اس مصرع میں آے بھی درست ہے آئے بھی۔ اگر کا الف موصول ماقبل کے ایک زائد مصمتے یا مصوتے کو خود میں ضم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ تقطیع کے آئینے میں پہلا مصرع دیکھ لیں۔

۱۔ اور بازا (فاعلاتن)، رس لے آ (فعلاتن)، ے اگر ٹو (فعلاتن)، ٹ گیا (فعلن)

ے ہر گر ٹو (فعلاتن)۔

۲۔

مصنف موصوف نے ایسے نسخے کو کامل سمجھ کر، اسے حوالے کی کتاب سمجھا، تو یہ ان کی صواب دید کی بات ہے۔

۱۰۔ ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم

قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

یہ شعر مرزا کا ہے، اور اسی قرأت سے حالی نے یادگار میں رکھا ہے۔ مصنف موصوف نسخۂ عرشی کی قرأت

ترے سروِ قامت سے یک قدِ آدم

کو مرجح اور درست سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے:

۱۔ نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) میں ورق ۴۹ الف پر یکقد آدم ہے

۲۔ چوتھے مطبوعہ ایڈیشن (۱۸۶۲ء) میں اک ہے

۳۔ پانچویں مطبوعہ ایڈیشن (۱۸۶۳ء) میں اک ہے

تدوین کا اصول یہ ہے کہ متداول دیوان کو مرتب کرتے وقت اس قرأت کو متن میں رکھا جائے، جو آخری ہو، اور جس پر مرزا نے صاد کیا ہو۔ آخری قرأت مطبع نظامی کانپور (۱۸۶۲ء)، اور مطبع مفید الخلایق آگرہ (۱۸۶۳ء) والے ایڈیشنوں کی ہے۔ عرشی نے ۱۸۶۲ء کی قرأت پر ۱۸۲۶ء کی قرأت کو ترجیح دی اور مصنف موصوف نے نہ اس پر تبصرہ کیا، اور نہ اس کی تحقیق کی۔ شاید اختلافِ نسخ کے باب میں ص ۱۴۴ پر اندراج بھی ملاحظہ نہیں فرمایا۔ عرشی نے اظہار کیا ہے کہ پہلے مطبوعہ ایڈیشن (۱۸۴۱ء) میں ایک ہے۔

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

مصرع یہ تھا:

تیرے سروِ قامت سے ایک قدِ آدم

مخطوطہ شناس اس بات سے واقف ہیں کہ اس زمانے میں اعراب بالحروف کا رواج تھا۔ اس کو اوس لکھتے تھے۔ ترے کو تیرے، اور تیرے کو بھی اسی طرح لکھتے تھے۔ اک اور ایک دونوں کو ایک لکھتے تھے۔ موزوں طبع اس زمانے کی تحریر کو درست پڑھنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ اس مصرع کو:

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم

ہی پڑھیں گے۔ بے شک تیرے اور ایک کتابت کیا ہوا ہو۔ یہاں ایک میں یائے مجہول نہیں، بائے کسرہ ہے۔ یائے مجہول پڑھیں تو مصرع وزن سے خارج ہے۔ عرشی کے نسخے میں ایسے اندراج اور بھی ہیں۔

۱۱۔ کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

یادگار میں مصرعِ اولیٰ ہے:

کرنے لگا ہے باغ میں تو بے حجابیاں

یادگار میں اتنے شعر ہیں، اور ایک ترتیب کے ساتھ، کہ یادداشت سے کھنگال کر ان کو نکالنا اور لکھنا قرینِ قیاس نہیں۔ پہلا مصرع حالی نے ماخذ ہی سے نقل کیا ہوگا۔ اس ماخذ میں اشعار کی وہ صورت ہوگی، جو نسخۂ بھوپال کی کتابت سے قبل تھی۔ نسخۂ شیرانی میں بھی ورق ۷، الف پر الفاظ وہی ہیں، جو متداول دیوان کی غزل کے اس شعر کے ہیں۔

۱۲۔ نہ مارا جان کر بے جرم غافل، تیری گردن پر
رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا

یادگار میں، پہلے مصرع میں غافل کی جگہ قاتل ہے۔ یہ شعر نسخۂ بھوپال کا ہے۔ حمیدیہ میں ص ۱۲ پر دو ہم طرح غزلیں ہیں۔ شیرانی میں بھی ورق ۱۵ ب، ۱۶ الف اور ب رخوں پر دو غزلیں ہیں۔ حمیدیہ، شیرانی اور متداول دیوان میں اس زمین کے اشعار پر نظر ڈالیں تو شیرانی کے اس شعر پر ٹھہر جاتی ہے

دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو، زنجیرِ رسوائی
عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا

متداول کلام میں غوغا نہیں چرچا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ مرزا نے اصلاح سے غوغا کو چرچا کیا، گو ایک معنوں میں یہ اصلاحی قرأت کا حصہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا نے نسخۂ بھوپال کے شعر میں جو اصلاح کی تھی، وہ متداول دیوان کے لیے کلام کا انتخاب کرتے وقت کالعدم کر دی۔ نسخۂ بھوپال میں چرچا تھا۔ ایسی مثالیں کثرت سے نہیں، لیکن ہیں کہ مرزا نے اصلاح کالعدم کر کے پچھلی خواندگی کو برقرار رکھا۔ نسخۂ بھوپال کی کتابت سے پہلے بھی انھوں نے یقیناً کچھ اصلاحیں کی ہوں گی۔ یہ باور کرنے میں کوئی موانع نہیں کہ حالی کے پاس جو ذخیرہ مرزا کے کلام کا تھا، اس میں سے کچھ نسخۂ بھوپال سے پہلے کا بھی تھا۔

۱۴۔ جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یادگار میں اس طرح شعر لکھا ہے۔ مصنف موصوف کو دوسرے مصرع میں یہ کھٹکتا ہے۔ رکیوں نسخۂ عرشی میں یوں ہے بجنوری جو کام متداول دیوان کی تصحیح کا کر رہے تھے، اور جو تبصرہ انھوں نے لکھا تھا۔ اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس میں ص ۱۱۶ پر شعر اسی طرح لکھا ہے، جیسا یادگار میں ہے، اگرچہ حمیدیہ کی غزل کے متن میں ص ۷۴ پر یوں ہے۔

نسخۂ عرشی میں یادگار یا بجنوری کی قرأت، اختلافِ نسخ میں نہیں دکھائی گئی ہے۔ اور یہ اس کے کامل نہ ہونے کا ایک اور ثبوت ہے۔ مالک رام نے آزاد کتاب گھر والے نسخے میں، یوں کی جگہ یہ دکھایا ہے۔ اسی صفحے (۷۴) پر اور اختلافات کے لیے فٹ نوٹ میں ماخذوں کے حوالے ہیں، اس کے لیے خاموشی ہے۔

اس غزل کا ایک شعر مالک رام کے دونوں نسخوں میں اس قرأت کے ساتھ ہے:

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو

ایک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا

علامت کسرہ کو یائے مجہول پڑھنے کی وجہ سے اک، کو ایک لکھا گیا ہے۔ اور اس کی وجہ سے دوسرا مصرع وزن سے ساقط ہے۔ پہلا رکن فاعلاتن ہے۔ اک تماشا کا وزن فاعلاتن ہے۔ ایک، کا وزن فاع ہے۔ پھر تماشا نہیں سکتا۔ کیوں کہ لاتن (فعلن)، وزن ماشا کا ہے۔ ت کی گنجائش نہیں رہتی۔ اک ت کا وزن فاع ہے۔ اس لیے اک سے مصرع موزوں ہے۔

ایسے بہت سے مقامات مالک رام اور عرشی کے نسخوں میں ہیں۔ حالی شاعر ہی نہیں، بڑے شاعر تھے۔ سے قربت رکھتے تھے، اور شاعری کو پرکھنے کے لیے انھوں نے کسوٹی مقرر کی۔ ان کے نقل کیے ہوئے

اشعار کو ایسے نسخوں سے ملانا، جن میں وزن سے ساقط کلام ہو، کچھ بہت خوب نہیں۔

۱۴۔ غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ گل مت دو
مجھے دماغ نہیں خندہائے بیجا کا

اس طرح مرزا کا شعر یادگار میں لکھا ہے۔ مصنف موصوف نے پہلا مصرع تینوں اضافتوں کے بغیر لکھا ہے یہاں تک اضافت کا کوئی محل نہیں ہے۔ پہلی اضافت کے بغیر تو مصرع ساقط الوزن بھی ہو جاتا ہے۔ موصوف نے یہ مصرع، نسخۂ عرشی کے متن سے ملایا ہے۔ جو اس طرح نقل کیا ہے۔

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ مت دو

ایک تو تینوں اضافتیں، جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، ضروری ہیں۔ مت نادرست قرأت ہے۔ اس کی جگہ نہ ہے۔

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو

یادگار میں حالی نے جو مصرع لکھا ہے، وہی نسخۂ بھوپال میں بھی تھا۔ نسخۂ حمیدیہ میں ص ۴۴ پر ملاحظہ فرمائیں نسخۂ شیرانی میں یہ غزل نہیں ہے۔

اس شعر سے یہ حقیقت اور بھی مستحکم ہو جاتی ہے کہ حالی کی دسترس میں ایسے ماخذ تھے، جن میں مرزا کا ابتدائی کلام بھی تھا۔ اور آخری دور کا کلام بھی۔ اگر یہ ذخیرہ مہیا ہوتا، یا حالی نے مثالوں میں اور زیادہ کلام نقل کیا ہوتا، تو اس کی بنیاد پر ہم مرزا کے شعروں کی ابتدائی قرأت تک پہنچ سکتے تھے۔ حالی جیسا ثقہ آدمی نادرست مصرع کیوں لکھتا!

۱۵۔ مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر، کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

یہ قرأت یادگار میں ہے۔ مصنف نے مصرعِ ثانی، نسخۂ عرشی سے ملایا، اور اختلاف پایا۔ عرشی نے یہ مصرع نقل کیا ہے:

شایانِ دست و خنجرِ قاتل نہیں رہا

نسخۂ شیرانی کے ورق ۱۹ کے رخِ الف پر مصرع ہے:

اب لائقِ توجہِ قاتل نہیں رہا

عرشی نے ص ۲۹۴ پر اختلافِ نسخ کے تحت اظہار کیا ہے کہ نسخۂ بھوپال میں بھی یہی مصرع تھا۔ یہ اظہار بھی ہے کہ گلِ رعنا (۱۸۲۹ء) نسخۂ رام پور (۱۸۳۳ء) پہلے مطبوعہ ایڈیشن (۱۸۴۱ء) تیسرے ایڈیشن (۱۸۶۱ء) اور چوتھے ایڈیشن (۱۸۶۲ء) میں مصرع وہی ہے، جو یادگار میں ہے، لیکن عرشی نے یادگار کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ جو خامی ہے!

حمیدیہ میں ص ۲۶ پر شعر کی قرأت وہی ہے، جو حالی نے یادگار میں دی ہے۔ عرشی نے اظہار کیا ہے کہ یہ قرأت حاشیے پر ہے۔ متن میں مصرع وہی تھا۔ جو نسخۂ شیرانی میں نقل ہوا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوا کہ حالی نے جو قرأت دی ہے، وہ قدیم ترین ہے "دست و بازوے" کی جگہ "لائقِ توجہ" (بھوپال اور شیرانی میں) اور "دست و خنجر" عرشی کے اظہار کے مطابق حاشیۂ نسخۂ بھوپال پر تھا۔ لیکن یہ نسخہ فراہم نہیں ہے۔ اس لیے تصدیق نہیں ہوسکتی۔ البتہ مالک رام نے صدسالہ یادگارِ غالب ایڈیشن میں حالی کا مصرع چوتھے (مطبع نظامی کانپور) ایڈیشن سے نقل کیا ہے۔ بازوے کی جگہ خنجر شیونراین والے ایڈیشن میں ہے۔ ایک بات اور عرض کردی جائے کہ نظم طباطبائی نے اپنی شرح میں ص ۳۸ پر حالی کی قرأت ہی رکھی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ حالی نے تحریف نہیں کی۔ انھوں نے ابتدائی قرأت لکھی، اور اسی پر، اصلاحیں کالعدم کرکے، بالآخر مرزا واپس آئے۔

۱۶۔ حریفِ جوششِ دریا نہیں خود داریِ ساحل
جہاں ساقی ہو تو، دعویٰ ہے باطل ہوشیاری کا

نسخۂ بھوپال (حمیدیہ ص ۱۸) نسخۂ شیرانی (ورق ۲۱ رخ ب) سے متداول دیوان کے نسخوں تک، دوسرا مصرع ہے:

جہاں ساقی ہو تو، باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

حمیدیہ میں ہو کی جگہ ہے قرأت ہے۔ نسخۂ بھوپال کی بازیافت کے بعد ہی تصدیق ہوسکے گی کہ اس میں کیا لفظ ہے۔ حالی ثقہ اور ذمہ دار ادیب تھے۔ انھوں نے جو مصرع لکھا ہے، اسے محرّف نہیں، بلکہ ابتدائی قرأت تصور کرنا چاہیے۔

۱۷۔ یارب نہ وہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور

مصنف موصوف نے پہلا مصرع نسخۂ عرشی میں درج مصرع سے ملایا ہے:

یارب وہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات

حالی نے جو مصرع لکھا ہے، وہی مرزا کے ذہن میں بھی گونجتا رہا۔ نہ صرف حالی کے ماخذ میں یہ مصرع تھا، بلکہ انھوں نے اپنے استاد سے بھی اسی طرح سنا ہوگا۔ دیوان میں وہ نہ لکھے جانے کے باوجود مرزا کی زبان پر نہ وہ چڑھا رہا۔ انھوں نے ذی الحجہ ۷۷، ۱۲ھ، جون ۱۸۶۱ء کے خط میں علاء الدین خان علائی کو فارسی اور اردو کا جو کلام بھیجا۔ اس میں وہ غزل بھی تھی۔ جس میں یہ شعر ہے۔ اور پہلا مصرع وہی ہے۔ جو یادگار میں ہے۔ ۱۸۶۱ء کے خط میں مرزا کا خود اپنے قلم سے مصرع اس طرح لکھنا، اس بات کا ثبوت ہے کہ حالی کی کتاب میں درج شعر کا متن مستند ہے، استناد کا اعلیٰ ترین درجہ رکھتا ہے۔

۱۸۔ قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں

میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

شعر اس طرح یادگار میں لکھا ہے۔ مصنف موصوف نے پہلے مصرع کو نسخۂ عرشی میں درج مصرع سے ملایا ہے، جو یہ ہے:

قاصد کے آتے آتے خط ایک اور لکھ رکھوں

مطبع نظامی (کانپور) کے ایڈیشن میں چوں کہ اک ہے، اس لیے مالک رام نے اک رکھا ہے۔ لیکن آزاد کتاب گھر والے ایڈیشن میں ص ۲۳ا کے فٹ نوٹ میں بتایا ہے کہ شیونرائن (آگرہ) والے ایڈیشن میں ایک ہے۔ عرشی نے اختلافِ نسخ کے تحت اس بات کا اظہار کیا ہے کہ چوتھے ایڈیشن میں (جو مطبع نظامی کانپور میں چھپا تھا) اک ہے۔ لیکن عرشی نے اپنے نسخے کے متن کے لیے، ۱۸۴۷ء کے (دوسرے ایڈیشن) کا ایک چنا۔

تیسرے (احمد جان والے) ایڈیشن اور چوتھے (مطبع نظامی) ایڈیشن کے جو عکس میرے سامنے ہیں، ان سے ایک بات واضح ہوتی ہے۔ یائے مجہول اور یائے معروف کا خلط تو چوتھے ایڈیشن میں ہے، لیکن تیسرے ایڈیشن تک جو اعراب بالحروف کا طریقہ تھا۔ وہ چوتھے ایڈیشن میں یا کسرہ کی حد تک ترک کیا گیا۔ آخر مصرع میں اک اور ایک دونوں آسکتے ہیں۔ لیکن آخرِ مصرع میں ایک ہی مرجح ہے۔ شروع یا درمیانِ مصرع میں ایک اور اک، ایک ہی مقام پر صرف اس صورت میں آسکتے ہیں، جب اس لفظ کے بعد کا لفظ الف سے شروع ہوتا ہے تاکہ سببِ خفیف کے مقام پر ایک رکھا گیا ہو، تو کاف کی صوت الف میں موصول ہو جائے۔ ورنہ ایک سبب خفیف کے مقام پر، یعنی اک کے بجائے نہیں رکھا جاسکتا۔ غالب کو اپنے

کلام کے جو مرتبین، خاص طور سے اس عہد میں ملے، ان سے تدوین کے بعض بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی ہوئی۔ شاید شعوری طور پر ان سے ایسا نہ ہوا ہو۔

۱۔ چوں کہ تیسرے ایڈیشن تک اک اور ایک کی کتابت کا روپ ایک تھا، اور چوتھے ایڈیشن سے ایک اور اک الگ الگ طرح سے لکھے جانے لگے۔ اس لیے یہ طے ہو گیا کہ مرزا نے کہاں ایک رکھا ہے اور کہاں اک۔ جب مرزا کا عندیہ واضح ہو گیا۔ تو جہاں مرزا نے اک رکھا وہاں ایک رکھنا کلامِ غالب پر اصلاح کرنا، اس میں تحریف کرنا ہے۔ یہ تحریف مرتبین نے کی ہے۔ اور اس کی قباحت کا انھیں احساس نہیں۔

۲۔ عہدِ غالب کے املا کے بارے میں ایک اہم گزارش، ان معروضات کے ساتھ کہ شعری نسخوں کی تدوین اور تدوین سے متعلق تنقید کے لیے عروض کی بنیادی باتوں سے آگہی لازمی ہے، ورنہ ایسی افسوسناک اور عبرتناک پچویشن پیدا ہوتی ہے، جیسی یہاں ہے۔

مطبع احمدی دہلی (اموجان) ایڈیشن ۱۸۶۱ء میں غالب کی غزل۔ آٹھویں شعر کے پہلے مصرع میں ایک ہے: (دیوان سے عکس، ص ۳۰)۔ تیسرا ایڈیشن۔

کلکی لیی کر آج نہ خست شراب مین — یہہ سوء ظن ہی ساقی کوثر کی باب مین
ہین آج کیون ذلیل کہ کل تک تہی پسند — گستاخی فرشتہ ہماری جناب مین
جان کیون نکلنے لگتی ہی تن سی دم سماع — گر وہ صدا سمائی ہی چنگ ورباب مین
رو مین ہی رخش عمر کہان دیکہیی تہمیی — نی ہاتہہ باگ پر ہی نہ پا ہی رکاب مین
اتنا ہی مجکو اپنی حقیقت سی بعد ہے — جتنا کہ وہم غیر سی ہون پیچ و تاب مین
اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیران ہون پہر مشاہدہ ہی کس حساب مین
ہی مشتمل نمود صور پر وجود بحر — یہان کیا دہرا ہی قطرہ و موج حباب مین
شرم اک ادای ناز ہی اپنی ہی سی سہی — ہین کتنی بی حجاب کہ ہین یون حجاب مین
آرایش جمال سی فارغ نہین ہنوز — پیش نظر ہی آئینہ دایم نقاب مین
ہی غیب غیب جسکو سمجہتی ہین ہم شہود — ہین خواب مین ہنوز جو جاگی ہین خواب مین
غالب ندیم دوست سی آتی ہی بوی دوست — مشغول حق ہون بندگی بوتراب مین

مطبع نظامی کانپور ایڈیشن ۱۸۶۲ء میں غالب کی غزل آٹھ شعر میں اک پہلے مصرع میں ہے۔ (دیوان سے عکس، ص ۳۶)؛ چوتھا ایڈیشن۔ غزل ۹۳:

کل کی لیی کر آج نہ خست شراب مین ۔۔۔ یہ سوء ظن ہی ساقیِ کوثر کی باب مین

ہین آج کیون ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند ۔۔۔ گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب مین

جان کیون نکلنی لگتی ہی تن سی دمِ سماع ۔۔۔ گر وہ صدا سمائی ہی چنگ و رباب مین

رَو مین ہی رخشِ عمر کہان دیکھیی تھمی ۔۔۔ نی ہاتھ باگ پر ہی نہ پا ہی رکاب مین

اُتنا ہی مجھکو اپنی حقیقت سی بعد ہی ۔۔۔ جتنا کہ وہمِ غیر سی ہون پیچ و تاب مین

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہی ۔۔۔ حیران ہون پھر مشاہدہ ہی کس حساب مین

ہی مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر ۔۔۔ یان کیا دہرا ہی قطرہ و موج و حباب مین

شرم اک ادای ناز ہی اپنی ہی سی سہی ۔۔۔ ہین کتنی بی حجاب کہ ہین یون حجاب مین

آرایشِ جمال سی فارغ نہین ہنوز ۔۔۔ پیشِ نظر ہی آینہ دایم نقاب مین

ہی غیب غیب جسکو سمجھتی ہین ہم شہود ۔۔۔ ہین خواب مین ہنوز جو جاگی ہین خواب مین

غالب ندیمِ دوست سی آتی ہی بوی دوست ۔۔۔ مشغولِ حق ہون بندگیِ بوتراب مین

اک کا وزن فع (سبب خفیف) ہے۔ ایک کا وزن فاع (وتد) ہے۔ ایک درمیانِ مصرع میں واقع ہو، تو کاف متحرک ہو جاتا ہے، اس طرح فاعِ وزن پر ہو جاتا ہے، جس میں عین بھی متحرک ہو۔

آخرِ مصرع میں، اک اور ایک، دونوں رکھے جا سکتے ہیں۔ (متبادل کی حیثیت سے) کیوں کہ دو متّصل ساکن ختمِ مصرع پر ہوں، تو یہ مغیرِ وزن نہیں، اور اس کی اجازت ہے۔ سالم اور مسبغ / مذال، محذوف اور مقصور، مکسوف اور موقوف وغیرہ کا خلط جائز ہے۔

منعم و مفلس کا ہے میخانہ ایک

ایک ساقی، ایک خم، پیمانہ ایک

منعمومف (فاعلاتن) لس کَ ہے مے (فاعلاتن) خانَ ایک (فاعلان)

ایک ساقی (فاعلاتن)، ایک خم پے (فاعلاتن)، مانَ ایک (فاعلان)

اسی بحر میں ردیف اک ہو، تو آخری رکن فاعلان (مقصور) کے بجائے فاعلن (محذوف) ہوگا۔

منعم و مفلس کا ہے میخانہ اک

خم بھی اک، ساقی بھی اک، پیمانہ اک

یہ مثال صرف نکتہ کی وضاحت کے لیے دی گئی ہے۔ مصرع کا آخری لفظ ایک ہی رکھا جاتا ہے۔ مصرع کے شروع یا درمیان میں اک کی جگہ ایک بھی رکھا جا سکتا ہے، اگر فوراً بعد الف سے شروع ہونے والا لفظ ہو۔ درمیان مصرع میں اک اور ایک موضوعِ حاضر ہے۔ غالبؔ کے شعر کی مثال سامنے ہے۔ شروعِ مصرع کی مثال دیکھ لیں:

اُمّید کی خوشی نے نہ مرنے دیا ہمیں

ایک اور رات وصل کی شاید نصیب ہو

اک اور رات وصل کی شاید نصیب ہو

اک اور (مفعول)، رات وصل (فاعلات)، کِ شاید نَ (مفاعیلُ)، صیب ہو (فاعلن)

اے کور (مفعول) . . . . ایضاً . . . .

غالبؔ کا زیرِ گفتگو شعر عروضی اعتبار سے اسی نوعیت کا ہے۔ ایک کے بعد اَور ہے، جس کا الف ماقبل کے کاف کی صوت کو موصول کر لیتا ہے۔ اک تو واضح طور سے بحر میں ہے۔ ایک بھی مابعد کے اَور کے الف موصول کی وجہ سے بحر میں ہے۔

قاصد کِ (مفعول)، آت آتِ (فاعلاتُ)، خ طک اور (مفاعیلُ) لکھ رکھوں (فاعلن)

. . . . . ایضاً . . . . . . خ طے کور (مفاعیلُ)، . . . ایضاً . . .

خط کی ط کی صوت بھی اک اور ایک کے الف میں ضم ہو جاتی ہے۔

آج اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہو تا کہ غالبؔ نے اَور کے الف موصول سے عروضی فائدہ اٹھا کر ایک رکھا تھا یا اک، اگر ان کے عہد کے چھپے ہوئے دیوان کے ایڈیشن میں یا یادگار میں اک نہ ہوتا۔

نامناسب نہ ہو گا، بلکہ مفید ہو گا، اگر اس بات کی طرف ایک بار پھر توجہ دلائی جائے کہ عہدِ غالبؔ میں اعراب بالحروف لکھے جاتے تھے۔ اس لیے ایک اور اک، دونوں کا املا یکساں تھا۔ انھیں کے آخری زمانے میں املا میں فرق کیا جانے لگا۔ خود غالبؔ ان دو کے یکساں طور سے لکھے جانے سے پریشان تھے۔ چناں چہ، ان کی اس پریشانی کا اظہار والیِ رامپور، یوسف علی خاں ناظم کے خطوں میں ہے۔ یہ خط امتیاز علی خاں عرشی نے مرتب کر کے "مکاتیبِ غالب" کے نام سے چھاپے تھے۔ یہ مجموعہ اس وقت مہیا نہیں ہے، لیکن اس کا حوالہ میں نے "تحقیقی جائزہ" میں ۱۹۷۱ء میں دیا تھا۔ یہ عبارت وہیں سے نقل کی جاتی ہے:

"مکاتیبِ غالب، مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی کے چھٹے ایڈیشن (۱۹۴۹ء) کے ص ۴۰ اپر

ناظم کے کلام پر اصلاحیں درج ہیں۔ ناظم کا ایک مطلع تھا:

یوں تو ہو جاتا ہے ہر ایک عیش و عشرت کا شریک

دوست کہتے ہیں اُسے، جو ہو مصیبت کا شریک

غالبؔ نے پہلے مصرع میں ہر ایک کو ہریک کر دیا، اور لکھا۔ جہاں ہر ایک اچھی طرح نہ آئے وہاں ہریک لکھیے۔

ناظم کا ایک اور مطلع تھا:

پیری میں بھی بے ولولۂ شوق نہیں ہم

رکھتے ہیں ابھی ایک دلِ ہنگامہ گزیں ہم

غالبؔ نے دوسرے مصرع میں ایک کو اک سے بدل دینے کا مشورہ دیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے لکھا ـــ: یہاں ایک کی جگہ اک بے یای تحتانی درست ہے۔ مگر ہر کے ساتھ ہریک ہو، نہ ہر اک۔ غالب"

دربار رامپور سے غالبؔ کے تعلقات اوائل ۱۸۵۷ء میں قائم ہوئے تھے۔ اعراب بالحروف لکھے جانے سے غالبؔ خوش نہیں تھے۔ اگرچہ یہ سلسلہ ان کے دیوان کے چوتھے ایڈیشن میں ترک کیا گیا۔ تیسرے ایڈیشن میں بھی شاید وہ یہی چاہتے تھے، لیکن کاپی میں جو درستی انھوں نے کی تھی۔ اس پر عمل نہیں ہوا تھا۔ اسی لیے وہ اس سے شاکی تھے۔ ناظمؔ کے اس پہلے شعر میں ایک پڑھا جائے تو عیش کا عین، الف کی طرح موصول ہوگا، اور یہ بات غالبؔ کے نظریے کے خلاف ہے۔ دوسرے شعر میں اک ہی ہے، جو یار کسرہ سے لکھا گیا ہے۔

غالبؔ کے زیرِ مطالعہ شعر:

قاصد کے آتے آتے خط ایک اور لکھ رکھوں

میں جانتا ہوں، جو وہ لکھیں گے جواب میں

عرشیؔ نے علامتِ کسرہ کو یارِ مجہول پڑھا ہے۔ جب بعد کے مطبوعہ دیوان میں صاف اک ہے۔ تو انھیں سمجھ لینا چاہیے تھا کہ ایک قرأت، غالبؔ کے منشا کے مطابق نہیں ہے۔ انھوں نے تیسرے ایڈیشن میں یار کسرہ کو یارِ مجہول پڑھا اس لیے بعد کے ایڈیشن میں اک کو اختلافِ نسخ سمجھا۔ یہ واضح غلطی ہے۔ کم از کم یادگار کی قرأت کا تو احترام کرنا ہی چاہیے تھا۔ لیکن انھوں نے اسے لائقِ توجہ اور قابلِ اعتنا نہ جانا۔

ایسے ناقص نسخے کی شہادت پر حالی کی قرأت کو درست یا نادرست قرار دینے کا خیال بھی جرأتِ بے جا ہے۔ تیسرے مطبوعہ ایڈیشن میں نہ صرف اس شعر میں ایک ہے۔ بلکہ دو اور شعروں میں بھی ایک ہے " ہے ایک شکن . . . الخ" میں اک نہیں، ایک پڑھیں تو مصرع ساقط الوزن ہو جائے گا۔

دیوانِ غالب/ تیسرے مطبوعہ ایڈیشن: مطبع احمدی، دلّی: ۱۸۶۱ء کے ص ۳۰ کا عکس۔
تین شعروں میں ایک ہے۔ اک بھی یا ر کسرہ سے ایک ہی لکھا ہے۔

قاصد کی آتی آتی خط ایک اور لکھہ رکھون
مین جانتا ہون جو وہ لکھینگے جواب مین

مجہ تک کب اونکی بزم مین آتا ہا دور جام
ساقی نی کچہہ ملا نہ دیا ہو شراب مین

جو منکر وفا ہو فریب اوسپہ کیا چلی
کیون بدگمان ہون دوست سے دشمن کے باب مین

مین مضطرب ہون وصل مین خوف رقیب سے
ڈالا ہی تمکو وہم نی کس پیچ و تاب مین

مین اور حظ وصل خدا ساز بات ہی
جان نذر دینی بہول گیا اضطراب مین

ہی تیوری چڑہی ہوئی اندر نقاب کے
ہی ایک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب مین

لاکہون لگاو ایک چرانا نگاہ کا
لاکہون بناو ایک بگڑنا عتاب مین

وہ نالہ دلمین خس کی برابر جگہہ نپائی
جس نالہ سی شگاف پڑی آفتاب مین

وہ سحر مدعا طلبی مین نہ کام آئی
جس سحر سی سفینہ روان ہو سراب مین

غالب چھٹی شراب پر اب بہی کبہی کبہی
پیتا ہون روز ابر و شب ماہتاب مین

نسخۂ شیرانی کے ورق ۱۰۹ الف کا عکس۔ یار مجہول کی جگہ بھی یار معروف لکھی گئی ہے
ان دونوں کا خلط روا تھا، اور اعراب بالحروف لکھے جاتے تھے۔

داد دیوانگی دل کہ ترا مدحتگر
ذرہ سی باندہی ہی خورشید فلک پر امین

کس سی ہو سکتی ہی مداحی ممدوح خدا
کس سی ہو سکتی ہی آرائش فردوس برین

یا علی جنس معاصی ہے اسد الله اسد
کہ سوا تیری کوئی اوسکا خریدار نہین

شوخی عرض مطالب مین ہی گستاخ طلب
ہی تیری حوصلہ فضل پہ از بسکہ یقین

دی دعا کو میری وہ مرتبہ حسن قبول
کہ اجابت کہی ہر حرف پہ سو بار امین

غم شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز	کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگین
طبع کو الفتِ دلدل میں یہ سرگرمیِ شوق	کہ جہاں تک چلے اوس سے قدم اور مجھ سے جبین
دل الفت نسب و سینہ توحید فضا	نگہہ جلوہ پرست و نفس صدق گزین

صرف اعدا اثر شعلہ و دودِ دوزخ
وقف احباب گل و لالۂ فردوس بریں

۱۹: چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

یادگار میں حالی نے شعر کی یہی قرأت دی ہے۔ اختلافِ نسخ کے باب میں ص ۲۴۴ پر عرشی کے نسخے میں اندراج ہے کہ "دیوانِ غالب کے دوسرے ایڈیشن سے پانچویں ایڈیشن تک اک تھا۔ لیکن تیسرے ایڈیشن کے غلط نامے میں غالب نے یک بنایا۔ لیکن بعد کے دونوں ایڈیشنوں میں اس کی تعمیل نہیں ہوئی۔"

عرشی نے جو اظہار کیا ہے، وہ نادرست نہیں ہوگا۔ ناظم کے نام ایک خط میں بھی، جس کی متعلقہ عبارت پہلے نقل کی گئی ہے۔ غالب نے مشورہ دیا ہے کہ ہر اک نہیں، ہر یک لکھنا چاہیے۔ لیکن خود انھوں نے اس پر کتنا عمل کیا، یہ اس بات سے واضح ہے کہ کانپور سے دیوان چھپ کے آیا، تو انھوں نے ایک دوست کو بھی نہیں لکھا کہ ہر اک کو ہر یک پڑھیں۔ تیسرے ایڈیشن کے غلط نامے میں جو ہدایت ہے اس پر عمل ہوتا تو چوتھے ایڈیشن میں ہوتا، جو مطبع نظامی کانپور میں چھپا تھا۔ پانچواں ایڈیشن، جو شیو نراین نے آگرہ سے چھاپا تھا۔ اس کی بنیاد وہ قلمی دیوان تھا۔ جو مرزا رامپور سے نقل کرا کے لائے تھے۔ اور میرٹھ میں چھپنے کے لیے شیفتہ کو دیا تھا۔ شیفتہ کو یہ نسخہ دینے سے پہلے یقیناً مرزا نے اس کی تصحیح کی تھی۔ ایک مصرع کی تبدیلی پر اسی مضمون میں گفتگو ہے۔ نہ شیفتہ کو نسخہ دیتے وقت، اور نہ ان سے منگوا کر شیو نراین کو بھیجتے وقت مرزا نے ہر اک کو ہر یک کیا۔ تیسرے ایڈیشن کی تصحیح بہت جلدی میں ہوئی تھی۔ لیکن آگرہ سے چھپنے والے دیوان پر بہت توجہ سے نظرِ ثانی کی گئی تھی۔ اس لیے ہر اک ہی کو درست قرأت سمجھنا چاہیے۔

شعر کے متن کے بارے میں عرشی کے نسخے کو کامل ترین نسخہ سمجھنا، خوش عقیدگی نہیں، ایمان کا تقاضہ کرتا ہے۔ شعر کے الفاظ کیا، نثر کی عبارتوں کے الفاظ بھی نادرست ہیں۔ تیسرے رامپور والے، ایڈیشن میں تصحیح کرنے کے بعد، جب کانپور سے چوتھا ایڈیشن چھپنے والا تھا، تو مرزا نے محمد حسین خاں مالک مطبع احمدی کو ایک خط لکھا تھا غلام رسول مہر کی کتاب سے جو عبارت اس خط کی نسخۂ عرشی کے دیباچے میں ص ۱۰۵ پر نقل ہوئی ہے، وہ بھی نادرست ہے، اور آزاد کتاب گھر والے مالک رام کے نسخے کے مقدمے میں ص ۲۶ پر جو عبارت ہے، وہ بھی نادرست ہے، یہ خط دیوان ۱۸۶۱ء کے آخری صفحے کے حاشیے پر مرزا نے لکھا تھا۔ اس کا عکس اس حقیر کو مرحوم دوست، محبی عبدالقادر سروری نے حیدرآباد سے لاکر دیا تھا۔ تحقیقی جائزہ میں اس کا عکس شامل کردیا گیا ہے، اور اس حقیر نے اپنے قلم سے یہ وضاحتیں کردی ہیں

۱۔ خط کے مخاطب ہیں " جناب محمد حسین خان "
۲۔ نسخۂ مالک رام کے مقدمے میں " مولوی " الحاقی لفظ ہے۔
۳۔ نسخۂ عرشی کے دیباچے میں دو جگہ اسی کے بجائے اس ہے۔
۴۔ نسخۂ عرشی میں " بیکار محض " کی جگہ صرف بیکار ہے
۵۔ " " نسخہ کو نسخے لکھا گیا ہے۔
۶۔ " " " چھاپی جائے گی " کی جگہ چھپے گی لکھا ہے

جو حضرات نثر کی چار سطر کی عبارت کا متن درست نہ نقل کرا سکیں، اور ماخذ سے رجوع کرنا ضروری نہ سمجھیں، ان کے نسخے اگر اشعار کے نادرست متن رکھتے ہیں۔ تو کوئی ایسی حیرانی کی بات نہیں۔ لیکن یہ بات حیرانی کی ضرور ہے کہ تحقیق کے آداب کی باقاعدہ تربیت پایا ہوا کوئی اسکالر، چھان بین کئے بغیر، ان نسخوں کو غالب کا مل یا صحیح غالب سمجھ لے، اور ان کو کسوٹی بنا کر حالی کو پرکھے۔

یہاں اطلاعاً عرض کردیا جائے کہ نسخۂ عرشی کے دوسرے ایڈیشن میں اس حقیر کی کتاب ' بیاضِ غالب: تحقیقی جائزہ " سے ملا کر، دیباچے کی عبارت درست کردی گئی ہے، اور یہ اہم کام خود عرشی نے کیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ موصوف نے تدوین کے آداب سے روگردانی کی، اور اس تصحیح کے لیے اس حقیر کے کام کا حوالہ نہیں دیا۔ استفادہ کرنا اور حوالہ نہ دینا، ایک عالم کے شایانِ شان نہیں، اور نہ یہ وسیع القلبی کا ثبوت ہے۔

یہ تو بات درمیان میں آگئی، لیکن گزارش کرنا ضروری تھی، کیوں کہ موضوعِ حاضر سے اس کا گہرا تعلق ہے،

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مصنّف موصوف نے خوش عقیدگی کے ساتھ جس طرح متداول کلامِ غالب کے ان دونسخوں پر تکیہ کیا ہے، وہ ایک محقق کا شیوہ نہیں ہونا چاہیے۔ ان دونسخوں میں آج کے اسلوب میں، بہت سے اشعار کا متن، غالب کا متن نہیں، مرتّبین کا متن ہے۔ اس لیے محرّف ہے۔ غزل "کل کے لیے کر آج نہ خست... الخ" جس طرح دیوانِ غالب کے تیسرے اور چوتھے ایڈیشنوں میں چھپی ہے۔ ان کے عکس جو پہلے نظر سے گزرے ہوں گے ایک بار پھر ملاحظہ فرمائیں۔ یہ غزل کا آٹھواں شعر ہے۔ تیسرے ایڈیشن میں شعر کا متن یہ ہے:

شرم ایک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب، کہ ہیں یوں حجاب میں

ایک بعد ادائے ... کا الف موصول ہے، اس لیے ایک کے ساتھ بھی شعر موزوں ہے:

شرمے ک (مفعولُ)، دائے ناز فاعلاتُ)، ہَ اپنے ہِ (مفاعیلُ)، سے سہی (فاعلن)

لیکن جب مطبعِ احمدی میں دیوان چھپ جانے کے بعد مرزا نے اپنے قلم سے اک کر دیا، اور چوتھے ایڈیشن میں اک چھپا، جس میں یا، علامتِ کسرہ کے طور پر نہیں لکھی گئی، تو یہ طے ہو گیا کہ تیسرے ایڈیشن تک بھی لفظ ایک نہیں تھا۔ بلکہ علامتِ کسرہ، حرف یا، ے لکھے جانے کی وجہ سے ایک املا تھا۔ یہاں یا، مکتوبی تھی، یا ملفوظی نہیں، اک ہی شیونراین (آگرہ والے)، پانچویں ایڈیشن میں بھی ہے۔

عرشی نے اپنے نسخے میں (پہلے ایڈیشن، ص ۱۸۹) اک کے بجائے ایک لکھا ہے۔ یہ غالب کے شعر کا درست متن نہیں، محرّف متن ہے:

۲۰۔ چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

مصنّف موصوف نے نسخۂ عرشی میں پہلا مصرع ص ۱۹۰ پر یہی ہونا دکھایا ہے۔ یہ واضح طور سے کتابت کی غلطی ہے اگر مصنّف موصوف کو عرشی کی اس بھیانک غلطی سے چشم پوشی کرنا مقصود ہوتی۔ تو وہ اس مصرع (اولیٰ) کو نظر انداز ہی کر دیتے۔ عرشی نے اپنے نسخے میں پہلا مصرع یہ رکھا ہے:

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک تیز رو کے ساتھ

عرشی نے ایک بہت سوچ سمجھ کر رکھا ہے۔ اختلافِ نسخ کے باب میں ص ۴۴۴ پر اظہار کیا ہے کہ مطبع نظامی کانپور والے ایڈیشن میں یعنی چوتھے ایڈیشن میں "ہر اک" لکھا ہے۔ اس بات کی اطلاع انھیں تھی اس

کے باوجود انھوں نے تیسرے ایڈیشن اور اس کے قبل کے نسخوں میں جب اعراب بالحروف کی وجہ سے اک کو ایک لکھتے تھے، کیوں کر یا علامتِ کسرہ تھی۔ اس شعر میں لفظ اک ہی ہے ایک میں یا کسرہ مکتوبی ہے، ملفوظی نہیں ایک سے مصرع ساقط الوزن ہو جاتا ہے، اس کے باوجود عرشی نے اختلافِ نسخ سمجھ کر ایک کو بہتر لفظ متن کے لیے سمجھا۔ تیسرے اور چوتھے ایڈیشنوں میں اس غزل کے عکس ملاحظہ فرمائیں۔

مطبع احمدی دلی سے طبع ہونے والے دیوانِ غالب کے تیسرے ایڈیشن سے عکس

حیران ہون دلکو روؤن کہ پیٹون جگر کو مین
مقدور ہو تو ساتہہ رکھون نوحہ گر کو مین

چہوڑا نہ رشک نے کہ تری گہر کا نام لون
ہر ایک سے پوچہتا ہون کہ جاؤن کدہر کو مین

جانا پڑا رقیب کے در پہ ہزار بار
ای کاش جانتا نہ تری رہگذر کو مین

ہی کیا جو کس کے باندہیے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہین ہون تمہاری کمر کو مین

لو وہ بہی کہتی ہین کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گہر کو مین

چلتا ہون تہوڑی دور ہر اک تیز رو کی ساتہہ
پہچانتا نہین ہون ابہی راہبر کو مین

خواہش کو احمقون نی پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہون اوس بت بیداد گر کو مین

پہر بیخودی مین بہول گیا راہ کوی یار
جاتا وگرنہ ایکدن اپنی خبر کو مین

اپنی پہ کر رہا ہون قیاس اہل دہر کا
سمجہا ہون دلپذیر متاع ہنر کو مین

غالب خدا کری کہ سوار سمند ناز
دیکہون علی بہادر عالی گہر کو مین

مطبع نظامی کانپور سے چھپنے والے دیوانِ غالب کے چوتھے ایڈیشن سے عکس

حیران ہون دلکو روؤن کہ پیٹون جگر کو مین
مقدور ہو تو ساتہ رکھون نوحہ گر کو مین

چہوڑا نہ رشک نی کہ تری گہر کا نام لون
ہر اک سی پوچہتا ہون کہ جاؤن کدہر کو مین

جانا پڑا رقیب کی در پہ ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو مین

ہی کیا جو کس کی باندہیی میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہین ہون تمہاری کمر کو مین

لو وہ بہی کہتی ہین کہ یہ بی ننگ و نام ہی
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گہر کو مین

چلتا ہون تہوڑی دور ہر اک تیز رو کی ساتہ
پہچانتا نہین ہون ابہی راہبر کو مین

خواہش کو احمقون نی پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہون اوس بت بیداد گر کو مین

جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو مین سمجھا ہون دلپذیر متاعِ ہنر کو مین	ہر بیخودی مین بھول گیا راہِ کوئی یار اپنی پہ کر رہا ہون قیاس اہلِ دہر کا

غالب خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھون علی بہادرِ عالی گہر کو مین

متن کی تدوین واقعی جوکھوں کا کام ہے۔ املا کے اسلوب کے عہد بہ عہد ارتقا کی پوری واقفیت پہلی شرط ہے اسی کے ساتھ نسخوں کو ترتیبِ زمانی سے رکھ کر دیکھنا ضروری ہے۔ اعراب بالحروف کا دستور رہا ہو، اور کلامِ موزوں کی تدوین ہو تو آہنگ کا لحاظ رکھنا بھی لازمی ہے۔ اگر چوتھے اور پانچویں ایڈیشن فراہم نہ بھی ہوتے، تو یہ مقام ایسا ہے کہ یہاں ایک ہو ہی نہیں سکتا، کیوں کہ غالب نے ساقط الوزن شعر نہیں کہے ہیں، اور بحر میں صرف اک رکھا جا سکتا ہے۔ ایک نہیں۔ عرشی سے دو افسوسناک غلطیاں اس شعر کے سلسلہ میں ہوئی ہیں: ۱۔ انھوں نے ایک متن میں رکھ کر، ناموزوں مصرع پسند کیا۔ ۲۔ جب مطبع نظامی والے ایڈیشن میں واضح طور سے اک قرأت ہے، تو انھیں اس سے پہلے کی تحریر میں ایک کی یا کو مصوّتہ نہیں، علامتِ کسرہ ہی پڑھنا چاہیے تھا۔

فاضل مصنّف موصوف نے اعراب بالحروف کو حرفِ صحیح پڑھا، اور وہاں اختلافِ نسخ انھوں نے دریافت کیا، جہاں اختلافِ نسخ تھا ہی نہیں۔ چوتھے ایڈیشن سے قبل کے نسخوں میں بھی اک ہی ہے۔ اگرچہ مکتوبی شکل ایک کی ہے!

غالب کی اسی غزل کے مطلع کا مصرعِ ثانی پڑھنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے۔

۲۱ وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نسخۂ عرشی میں پہلا مصرع ہے:

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے

یادگار میں "وہ آئیں گھر میں . . . الخ" ہے۔ یہی مصرع نسخۂ حمیدیہ میں بھی ص ۱۳۶ پر ہے۔ آزاد کتاب گھر والے ایڈیشن میں مالک رام نے بھی متن میں آئے (ایک زاید شوشے، اور اس پر ہمزہ کے ساتھ) دکھایا ہے۔ لیکن فٹ نوٹ میں حمیدیہ میں آئیں (ایک زاید شوشے اور ہمزہ کے ساتھ) اختلافِ نسخ دکھایا ہے۔ عرشی نے

اختلافِ نسخ میں یادگار اور حمیدیہ میں آئیں ہونے کا اظہار نہیں کیا ہے، اور اس اعتبار سے یہ نسخہ ناقص ہے۔

البتہ انھوں نے ص ۴۴۳ پر ایک ماخذ میں مصرع کی یہ قراءت دکھائی ہے:

وہ گھر میں آئے ہمارے، خدا کی قدرت ہے

۲۲۔ نینداس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

یادگار میں شعر کی یہ قراءت ہے۔ لیکن نسخۂ عرشی میں دوسرا مصرع ہے:

تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

نادراتِ غالب (مرتبہ آفاق حسین: ادارۂ نادرات، کراچی: ۱۹۴۹ء) میں منشی نبی بخش حقیر کے نام غالب کے خط ہیں۔ ایک خط میں ۱۶ شعروں کی یہ غزل بھی غالب نے بھیجی تھی، اِس تعلّی کے ساتھ:

"بھائی، خدا کے واسطے غزل کی داد دینا۔ اگر ریختہ یہ ہے، تو میر و میرزا کیا کہتے تھے؟ اگر وہ ریختہ تھا، تو پھر یہ کیا ہے۔ صورت اس کی یہ ہے کہ ایک صاحب شہزادگانِ تیموریہ میں سے، لکھنؤ سے یہ زمین لائے۔ حضور نے خود بھی غزل کہی، اور مجھے بھی حکم دیا۔ سو میں حکم بجا لایا، اور یہ غزل لکھی۔..."

زیرِ بحث شعر کی قراءت یہ ہے:

نینداس کی ہے، نصیب اس کے ہیں، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

اس خط کے لکھنے کا زمانہ اگست/ستمبر ۱۸۵۲ء مقرر کیا گیا ہے۔

نسخۂ عرشی میں یہ غزل، نسخۂ لاہور کے حوالے سے ص ص ۱۹۱، ۱۹۲ پر نقل ہوئی ہے۔ زیرِ بحث شعر کے بارے میں، اختلافِ نسخ کے باب میں، نادرات میں مختلف خواندگی ہونے کا اظہار کیا گیا ہے، لیکن یادگار کی خواندگی کا ذکر نہیں ہے۔ اس اعتبار سے نسخۂ عرشی ناقص ہے۔

اس غزل کے بعد کی کوئی غزل اس نسخے میں نہیں ہے، اور اس کا ۱۸۵۲ء میں لکھا جانا ثابت ہے۔ نبی بخش حقیر کے خط کے علاوہ یہ غزل ۲۸ اگست ۱۸۵۲ء کے اردو اخبار دلّی، میں بھی ملتی ہے (دیباچہ نسخۂ عرشی ص ۸۵)۔ "نصیب اس کے ہیں" کسی مطبوعہ نسخے میں نہیں، اس لیے اسے پہلی قراءت سمجھنا شاید نادرست نہ ہوگا۔ نسخۂ لاہور میں مصرع مطبوعہ متداول دیوان والا ہی ہوگا، ورنہ نسخۂ عرشی میں 'نادرات' (حقیر کے نام

مرزا کے خط، کا حوالہ نہ دیا جاتا۔ یہ نسخہ قاضی عبدالودود نے بھی دیکھا تھا۔ اور اس کے بارے میں 'متفرقات'' کے عنوان سے، نقوش (لاہور) کے اکتوبر ۱۹۵۸ء کے شمارے میں لکھا تھا۔ [۱]

نسخۂ لاہور' لاہور یونیورسٹی کی لائبریری میں تھا۔ لیکن نسخہ بھوپال کی طرح اٹھایا جاچکا ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی ایک تعارفی مضمون ۱۹۵۴ء میں لکھا تھا۔ ۱۹۶۸ء میں جب سید معین الرحمٰن نے اسے دیکھنا چاہا، تو یہ مخطوطہ کتب خانے میں نہیں تھا۔ انھیں بتایا گیا کہ سید عبداللہ کی تحویل میں ہے۔ [۲]

نسخۂ لاہور کے فوراً آگے پیچھے کا ایک اور مخطوطہ ہے، جو سید معین الرحمٰن کے پاس ہے۔ اس کا تعارف انھوں نے "نسخۂ خواجہ" کی حیثیت سے کرایا ہے۔ [۳] سولہ شعروں کی یہ غزل اس میں بھی ہے۔ لیکن تفصیل سامنے نہیں آئی ہے۔ اگر حقیر کے خط میں درج غزل کا زیرِ بحث مصرع، اس نسخے میں ہے، تو یہ واضح ثبوت اس کے نسخۂ لاہور پر تقدم کا ہوگا۔ نسخۂ خواجہ، نسخۂ لاہور سے فوراً پہلے کا ہے۔ تو اس میں اگر مصرع وہ نہیں ہے، جو حقیر کے خط میں ہے، تو اس مصرع کے ہونے کا امکان بھی ہے، جو یادگار میں ہے۔ اگر ایسا نہ ہو، تو بھی حالی کے تحریف کرنے کا تصور بلاوجہ کی قیاس آرائی ہوگی، کیوں کہ حالی سنجیدہ اور ثقہ شاعر، مبصر، ناقد اور سوانح نگار تھے۔

۲۳ ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ صواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط، قلمِ سرنوشت کو

متداول دیوان میں مصرع ہے:

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے

نسخۂ عرشی میں کسی اختلافِ نسخ کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے —— یادگار کی بھی نہیں! —— اور یہ واضح نقص ہے۔ حالی نے جو مصرع نقل کیا ہے معنے کے اعتبار سے وہ یقیناً بہتر ہے۔ یادگار لکھتے وقت حالی کے سامنے جو ماخذ تھا رہے تھے، یقیناً وہاں صواب ہی رہا ہوگا۔ یہ بات بعید از امکان نہیں کہ مرزا نے

---

[۱] غالب انسٹی ٹیوٹ، دلی کا مجلہ غالب نامہ (جلد ۹ شمارہ ۲)، غالب کے اصلاحی دیوان کا نادر قلمی نسخہ از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔
[۲] ایضاً [۳] ایضاً۔

خود صواب لکھا ہو، یا اگر کسی اور نے یہ غزل لکھی۔ تو مرزا نے ثواب بولا، اور لکھنے والے نے صواب لکھا۔ موضوع حاضر سے جڑا ہوا موضوع یہ ہے کہ حالی کے سامنے غالب کے کلام کا جو ذخیرہ تھا، کیا وہ مستند تھا؟ کیا حالی مستند اور غیر مستند — معتبر اور غیر معتبر متن میں، اور وہ بھی اپنے استاد کے کلام میں تمیز نہیں کر سکتے تھے؟

۲۴۔ سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

مالک رام اور عرشی کے نسخوں میں تری جلوہ گاہ نہیں، ترا جلوہ گاہ ہے۔ آزاد کتاب گھر والے دیوان میں مالک رام نے ماخذ کی نشاندہی کیے بغیر، فٹ نوٹ میں اختلاف نسخ تری دکھایا ہے۔ عرشی نے کوئی اختلافِ نسخ نہیں دکھایا ہے، اور اس اعتبار سے ان کا نسخہ ناقص ہے۔ نسخۂ حمیدیہ کے متن میں بھی تری ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے اپنے مقدمہ (محاسنِ کلامِ غالب) میں "تری جلوہ گاہ" رکھا ہے۔ بجنوری چوں کہ متداول کلام مرتّب کر رہے تھے، اس لیے انھوں نے کلامِ غالب کے نسخے اور ماخذ جمع کیے تھے۔ غالب راہ گزر کو مذکر باندھ سکتے تھے، تو جلوہ گاہ کو بھی مذکر نظم کر سکتے تھے۔ ترا کا درست ہونا شبہ سے بالاتر ہے۔ لیکن تری کا فرمودۂ غالب ہونا بھی، خاص طور سے آخری دور میں، جب دیوان مرتب ہو رہے تھے، اور چھپ رہے تھے، اور وہ خطوں میں بھی احباب کو کلام بھیج رہے تھے، نا درست نہیں ہو سکتا۔ تری صرف یادگار میں نہیں ہے۔ اس لیے حالی کی تحریف تو ہو ہی نہیں سکتی!

۲۵ زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

آج کے مروجہ نسخوں میں پہلا مصرع ہے:

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب

عرشی نے اپنے نسخے میں ص ۲۶۰ پر اظہار کیا ہے کہ گل[1] میں، پہلے مصرع میں "اس رنگ سے" ہے۔ یعنی مصرع وہی ہے، جو یادگار میں حالی نے لکھا ہے۔ گویا یہ بھی حالی کی تحریف نہیں ہے، واضح طور سے!

متداول دیوان میں صرف یہ مقطع اس طرح میں ہے۔ اس کلام میں، جو دیوان کے لیے انتخاب کے وقت نظر کر دیا گیا تھا۔ اس طرح میں کوئی شعر نہیں ہے۔ گویا یہ متفرق شعر ہے۔ بہت ممکن ہے یہ شعر برجستہ ہو گیا ہو،

---

[1] شاید گلشنِ بے خار (نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کا لکھا ہوا تذکرہ)، ترجمہ کے لیے کلام کا انتخاب خود مرزا نے کیا تھا۔

اور خط میں لکھنے کے لیے تو یہ موزوں نہیں کیا گیا ہوگا۔ کیوں کہ جب یہ وجود میں آیا مرزا خط فارسی میں لکھتے تھے۔ ہاں بات چیت میں استعمال کے لیے یہ یقیناً استعمال ہوتا رہا ہوگا۔ اور جب مرزا نے اردو میں خط لکھنا شروع کیے، تو ان میں بھی یہ موقع محل پر کام کیا ہوگا۔ اس شعر میں ضرب المثل ہو جانے کی تمام خصوصیات موجود ہیں، چناں چہ اسے یہ درجہ مل بھی گیا۔ البتہ، کسی باقاعدہ غزل کا شعر نہ ہونے کی وجہ سے اس کی قرأتیں بدلتی رہیں۔ اسی شکل اور اسی رنگ، تو مرزا کی خواندگی کا حصہ تھے، اور اس کا دستاویزی ثبوت بھی ہے۔ لیکن طور سے اسی ڈھب سے جو اسی طرح جو بھی سننے میں آیا، اور ان فقروں کے ساتھ شعر لکھا ہوا بھی مختلف تحریروں میں دیکھا گیا۔ صاحب عالم مارہروی کے روزنامچے میں "اسی طرح جو" ہے۔ عرشی نے ص ۴۴۰ پر اس روزنامچے کی قرأت کا اظہار کیا ہے۔

۲۶۔ فرداودی کا تفرقہ اک بار مٹ گیا
تم کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

یادگار میں شعر کی یہ صورت ہے۔ لیکن مروجہ دیوان میں، جن میں حمیدیہ بھی شامل ہے، شعر یوں ہے:

فرداودی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گیے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی (گزر گئی)

مالک رام کے نسخوں میں ذ اور باقی نسخوں میں ز قافیوں میں ہے۔ عرشی نے اپنے نسخے میں یادگار کی خواندگی اختلاف نسخ میں نہیں دکھائی ہے ـــــ اور یہ نقص ہے۔ مصنّف موصوف کی نظر بھی مصرعِ اولیٰ میں اک اور ایک کے اختلاف پر نہیں گئی۔ حالی کے ماخذ میں شعر اسی طرح ہوگا، جیسا انھوں نے یادگار میں نقل کیا۔ ظاہر ہے، ایک مرتب کتاب غالب پر لکھنے کے لیے مثالیں انھوں نے ماخذ / ماخذوں سے چنی ہوں گی۔ زبانی سنے ہوئے اشعار اپنی یادداشت سے یقیناً انھوں نے نہیں لکھے۔ مٹھوں کا ذکر انھوں نے کیا ہے، اور دوستوں سے مرزا کی تصانیف اور کلام جمع کرنے کا بھی، حالی نے شعر جس طرح لکھا ہے، وہ اس کی پہلی خواندگی بھی ہو سکتی ہے۔ اور پانچویں ایڈیشن کے چھپنے کے بعد کی بھی۔

۲۷۔ اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

یادگار میں پہلا مصرع ہے:

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعدِ قتل

غالب نے اپنے خطوں میں، الفاظ کی نشست میں ایسی تبدیلیاں کی ہیں۔ حالی کے پیشِ نظر ماخذ میں مصرع کا اسی طرح ہونا ناممکنات میں سے نہیں، بلکہ عین ممکن ہے۔ خواہ مخواہ ایسی تحریف وہ کیوں کرتے، جس سے شعر فنی اور معنوی حیثیت سے شمہ برابر بلند نہیں ہوتا۔ اپنے استاد کے کلام پر اصلاحیں کرنا، جیسی محمد حسین آزاد نے اپنے استاد کے کلام میں کی تھیں، حالی کی افتادِ طبع سے بعید ہے۔ آزاد نے اپنے استاد کے کلام کے حجم میں بھی اضافہ کیا۔ حالی نے ایک مصرع بھی گڑھ[1] کر اپنے استاد کو نہیں "بخشا"۔ جو مرثیہ میں یہ اعتراف کرے:

شعر میں ناتمام ہے حالی　　　　غزل اس کی بنائے گا اب کون،

وہ اپنے استاد کی غزلیں بناتا؟

۴۸۔　　ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت، لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

متداول دیوان میں مقطع کی قرأت یہ ہے۔ مصنّف موصوف نے اظہار کیا ہے کہ یادگار کے پہلے ایڈیشن (سالِ اشاعت ۱۹۱۷ء کے ص ۱۵۹) میں مصرعِ ثانی ہے:

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

مصنّف موصوف نے ص ۴ پر لکھا ہے: "یادگارِ غالب پہلی بار ۱۹۱۷ء میں نامی پریس کانپور سے شائع ہوئی اور مقدمۂ شعر و شاعری" ۱۸۹۳ء میں مطبع انصاری، دہلی سے۔ میں نے انھیں اوّلیں ایڈیشنوں کو بنیاد بنایا ہے۔"

مصنّف موصوف کا بیان حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ "یادگارِ غالب" پہلی بار محمد رحمت اللہ رعد کے نامی پریس کانپور میں، ۱۸۹۷ء میں چھپی تھی[2]، نہ کہ ۱۹۱۷ء میں۔ مصنّف موصوف نے اپنا ماخذ یادگار کا پہلا ایڈیشن بتایا ہے۔ دکھ کی بات ہے کہ یہ بیان درست نہیں ہے۔

"مقدمۂ شعر و شاعری" کے بارے میں بھی مصنّف موصوف کا بیان حقیقت نہیں ہے۔ ۱۸۹۳ء میں مطبع انصاری دہلی سے حالی کا دیوان پہلی بار چھپا تھا، اور مقدمہ اسی میں شامل ہے۔ مقدمہ بعد میں الگ سے کتاب کی

---

[1] لکھنؤ میں گھڑ نہیں گڑھ بولتے ہیں

[2] یہ ایڈیشن اور مسدس مدوجزر اسلام، دونوں کتابیں زمانۂ طالب علمی کے اوائل میں پڑھی تھیں۔ اب تفصیل یاد نہیں۔ یہ حوالہ "یادگارِ غالب"، مکتبہ جامعہ: ستمبر ۱۹۸۱ء ص ۱۰ سے نقل کیا جا رہا ہے۔

صورت۔ سے چھاپا گیا (جس طرح نسخۂ حمیدیہ میں شامل بجنوری کا مقدمہ، کتابچے کی صورت میں چھاپا گیا، اور نام اس کا "محاسنِ کلامِ غالب" رکھا گیا)۔

ہم شعر کے مصرعِ ثانی پر واپس آتے ہیں۔ یادگارِ غالب (حصہ اردو) میں جو مکتبہ جامعہ نے ستمبر ۱۹۸۱ء میں شائع کی، اس کے اندرونی ٹائٹل پر "بتصحیح مالک رام" لکھا ہے اس میں ص ۱۸۰ پر دوسرا مصرع وہی ہے، جو آج کے متداول کلام کے نسخوں میں ہے:

دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

یادگار کے پہلے عکسی ایڈیشن میں، جو غالب انسٹی ٹیوٹ نے ۱۹۸۶ء میں چھاپا ہے، ص ۱۵۹ پر مصرع ہے:

دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

مصنف موصوف نے بھی اس مصرع کے لیے ص ۱۵۹ کا حوالہ دیا ہے۔ شاید ان کے پیشِ نظر یہی ایڈیشن رہا ہو قطع نظر اس کے مالک رام نے یادگار کے متن میں جو تصحیح کی ہے۔ اس کی وجہ سے مکتبہ جامعہ کا یہ ایڈیشن مشتبہ، غیر معتبر اور تحریف کا شکار ہو گیا ہے۔ تدوینِ متن کے سلسلے میں، یہ تصحیح نہیں، بلکہ کھلی ہوئی تحریف ہے۔ متن میں مصرع اسی طرح رہنا چاہیے تھا، جیسا کہ حالیؔ نے درج کیا تھا۔ حاشیہ میں متداول کلام کا متن دکھایا جا سکتا تھا۔ یہ خاصی پیچیدہ اور محال قسم کی صورتِ حال ہے۔ ایک طرف آج کے متداول کلام کے کچھ نسخوں میں یادگار سے قرأت حاشیوں میں نقل کی جاتی ہے۔ اور مالک رام نے یادگار کے متن میں مصرع بدل دیا۔ اگر اسی قسم کی تصحیح خطوطِ غالبؔ میں بھی کر دی جائے تو کیا ہو گا؟ کیا خطوطِ غالبؔ اس تحریف کے بعد معتبر رہیں گے؟

حالیؔ نے "دل کے بہلانے" یقیناً ماخذ سے نقل کیا ہو گا، اور ان کا ماخذ معتبر تھا۔ اس کے بارے میں شک نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بارے میں بھی شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ دیوان کے پانچویں ایڈیشن کی اشاعت کے بعد مرزا نے خود مصرع میں ترمیم کی ہو گی، یہ نہیں کہ حالیؔ اس بات سے ناواقف تھے کہ مطبوعہ دیوان میں مصرع "دل کے خوش رکھنے ۔ ۔ ۔ الخ" ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یادگار کے پہلے ایڈیشن کے ص ۵۸، پر سطر ۶ میں مقطع "دل کے خوش رکھنے ۔ ۔ ۔ الخ" قرأت رکھتا ہے۔ صرف اس وجہ سے بھی "دل کے بہلانے ۔ ۔ الخ" والا مصرع، جوں کا توں رکھنا چاہیے تھا۔ کسی مخطوطے یا مطبوعہ نسخے کی تصحیح اس طرح کرنا شاید تدوین کے آداب کے عین مطابق نہیں۔ کلیات مرتب کرتے وقت، مصنف کی لغزشِ قلم، یا سہوِ کتابت درست کرنا بالکل دوسری بات ہے۔ دیوان مرتب کرتے وقت آخری قرأت متن میں رکھنا، اور ماقبل کی قرأتیں حاشیے میں دکھانا

چاہیے ۔غالب کے مقتدر مرتبین نے تدوین کے اس بنیادی اصول سے ایک جگہ نہیں کئی جگہ انحراف کیا ہے، کچھ مثالیں اس مضمون میں پیش کی جاچکی ہیں ۔ ایک مثال اور :

مرزا نے ۴ نومبر ۱۸۶۱ء کے خط میں عباس رفعت کو ایک مشہور غزل کا مطلع یوں لکھا :

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں

صورتیں، کیا خاک میں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

بعض نسخوں میں کہ بجائے جو ہے ۔ لیکن دوسرا مصرع دیوان میں یہ ہے :

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

نسخۂ عرشی میں غالب کے خط میں دوسرے مصرع کی ہیئت کو اختلافِ نسخ کے باب میں درج کے لائق بھی نہیں سمجھا گیا ۔ اس نسخے کے کامل یا ناقص ہونے کے بارے میں فیصلہ اس بات سے بھی کیا جاسکتا ہے، کہ اس مصرع کو اہم نہیں سمجھا گیا ۔

۴ نومبر ۱۸۶۱ء وہ تاریخ ہے، کہ کئی مہینے پہلے مطبع احمدی (دلّی) سے دیوان کا تیسرا ایڈیشن چھپ چکا تھا ۔ اور اسے دیکھ کر ان کا خون کھولا تھا کیوں کہ اس میں وہ اغلاط درست نہیں کی گئی تھیں، کاپی میں مرزا نے جن کی تصحیح کی تھی ۔ اسی دیوان کے آخری صفحے پر محمد حسین خاں کے نام خط ہے ۔ ایک نسخے میں غلطیاں درست کی گئیں ۔ یہ سارا کام دو دن میں، اور دیوان کی اشاعت کے فوراً بعد ہی ہوا ۔ ۴ نومبر ۱۸۶۱ء سے پہلے کیوں کہ مطبعِ نظامی کانپور سے پانچواں ایڈیشن، جون ۱۸۶۲ء میں چھپ کر تیار ہوگیا ۔ دلّی سے تصحیح کیے ہوئے دیوان کے کانپور جانے، اور وہاں لکھے جانے، اور اس کی تصحیح میں وقت تو لگا ہی ہوگا ۔ پھر تیسرا ایڈیشن غلط چھپنے کی وجہ سے مرزا دل برداشتہ تھے، اس لیے صحتِ متن پر زیادہ توجہ دی گئی ہوگی ۔ اور ظاہر ہے اس میں وقت لگا ہوگا، پانچواں ایڈیشن آگرہ سے چھپا تو ۱۸۶۳ء میں لیکن قلمی نسخہ شیو نراین کو جون ۱۸۶۰ء میں بھیجا جاچکا تھا [۲]

عباس رفعت کے نام خط میں مطلع کی جو قرات ہے، وہ آخری ٹھہرتی ہے، اور متداول دیوان میں وہی دکھائی جانا چاہیے، متن میں ۔ اور اگر متن میں نہیں، تو حواشی میں ضرور دکھائی جانا چاہیے ۔

---

[۱] غالب کے خطوط : غالب انسٹی ٹیوٹ : ص ۳۳۷

[۲] شیو نراین کے نام خط (غالب کے خطوط : غالب انسٹی ٹیوٹ ص ص ۱۰۸۳، ۱۰۸۴)

اگر مرزا نے خود اپنے شعروں میں ایسی اصلاحیں کی ہیں، تو وہ مصرع بھی یقیناً مرزا ہی کا ہے، جو حالی نے یادگار میں لکھا ہے۔ جو ماخذ حالی کو فراہم تھے، وہ ہمیں نہیں ہیں۔ یہ ہماری محرومی ہے، اور اس محرومی کی وجہ سے حالی پر شک کرنا مناسب نہیں ہے۔

۲۹ رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل

جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے؟

متداول دیوان میں دوسرا مصرع ہے:

جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے؟

عرشی نے یادگار کی قرأت کو اس لائق نہ سمجھا کہ اختلافِ نسخ میں اسے دکھاتے۔ البتہ ہیدر لے کو اہم تر سمجھا، اور بتایا کہ پہلے مصرع میں ڈوڑتے اور دوسرے مصرع میں پہلا لفظ گر ہے

اشاریے میں اشخاص کے تحت حالی اور کتب کے تحت یادگار غالب کا اندراج ہے۔ لیکن ہیدر لے کے بارے میں خاموشی ہے۔ غالب نے، وہ غزل، جس میں یہ شعر ہے ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء کے خط میں شیو نراین کو بھیجی تھی[1] شعر کی قرأت بعینہ وہی ہے، جو یادگار میں ہے۔ نسخۂ حمیدیہ میں بھی دوسرا مصرع یادگار کے مطابق ہے، لیکن پہلے مصرع میں دوڑتے ہے۔ حمیدیہ کی قرأت بھی عرشی نے اختلافِ نسخ میں نہیں دکھائی ہے۔ ان کے نسخے کا یہ نقص ہے۔

حالی کے یہاں مصرع چوں کہ وہی ہے۔ جو مرزا نے اپنے قلم سے لکھ کر، غزل میں شیو نراین کو ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء کے خط میں بھیجا، اس لیے حالی نے جو قرأت دی ہے، وہ مرجّح ہے!

۳۰۔ پلادے اوک سے ساقی، جو ہم سے نفرت ہے

پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

یادگار میں پہلا مصرع ہے:

پلادے اوک سے ساقی، جو منہ سے نفرت ہے

معنی تو خیر اس مصرع سے بھی کھینچ تان کر نکالے جا سکتے ہیں۔ بے معنی اور جعلی کلام کی بھی آخر شرحیں

---

[1] شیو نراین کے نام خط (غالب کے خطوط: غالب انسٹی ٹیوٹ ص ۱۰۷۱

لکھی گئی ہیں۔ اور ہمارے ایک دوست نے تو اس میں اس حد تک ید طولیٰ حاصل کر لیا ہے کہ شعوری طور پر بے معنی شعر، الفاظ توپ تھاپ کر ان کی خدمت میں کلامِ غالب کہہ کر پیش کر دیجیے۔ وہ معنے ڈال دیں گے۔ یادگار میں سہوِ کتابت کا ہونا ناممکن نہیں۔ قیاسی اصلاح ہرگز مقصود نہیں۔ ہم کی جگہ میں یا جھ اور تم کی تجھ، غالب کے شعروں میں، اختلافِ نسخ کوئی نادر بات نہیں ہو سکتا ہے حالی نے اس زمانے کے اسلوبِ املا میں مجہہ لکھا ہو، کہ جھ قرات کے ساتھ یہ شعر انھیں ملا ہو۔ کاتب نے مجہہ کو منہہ کر دیا۔

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے

شیونراین کو مرزا نے یہ غزل بھیجی، تو اس میں تم نہیں تجھ ہے۔ اور اس زمانے میں تجہہ یا تجہ لکھا جاتا تھا۔ حالی اس شعر میں ہم کی جگہ منہہ نہیں رکھتے۔ انھیں مجہ یا مجہہ قرأت کے ساتھ یہ شعر ملا ہوگا۔ مطبع مجتبائی (دلی) سے چھپنے والے خطوطِ غالب کے مجموعۂ "اردوے معلیٰ" کی ترتیب اور طباعت کی نگرانی میں حالی کا ہاتھ بھی تھا۔ ۱۸۹۹ء کا یہ نسخہ ۱۹۶۰ء، ۷۰ء میں دیکھا تھا۔ اب تفصیل ذہن میں نہیں۔ اس ماخذ سے نقل ہوئے خطوط اور اقتباسات مختلف مجموعوں اور تالیفوں میں ہیں۔ یہ بات یقیناً حالی کے علم میں رہی ہو گی کہ مرزا نے علاءالدین خان علائی کو لکھا تھا[1]

"۔۔۔ پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں[2] مرحوم نے زمین نکالی حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ:

پلادے اوک سے ساقی، جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے۔"

یادگار کے دیباچہ میں حالی لکھتے ہیں:

"میں نے مرزا کی تصنیفات کو دوستوں سے مستعار لے کر جمع کیا، اور جس قدر اس میں ان کے حالات اور اخلاق و عادات کا سراغ ملا، ان کو قلمبند کیا، اور جو باتیں اپنے ذہن میں محفوظ تھیں

---

[1] غالب کے خطوط (غالب انسٹی ٹیوٹ)، ص ۳۹۵

[2] غالب کے خسر الٰہی بخش خاں معروف

یا دوستوں کی زبانی معلوم ہوئیں، ان کو بھی ضبطِ تحریر میں لایا . . . کئی برس تک وہ یادداشتیں کاغذ کے مٹھوں میں بندھی ہوئی رکھی رہیں . . . میں نے ان مٹھوں کو کھولا، اور ان یادداشتوں کے مرتب کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر ان کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مرزا کی تصنیفات پر پھر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی، اور اس کے سوا کچھ اور کتابیں بھی درکار ہوں گی۔ میں نے دلّی کے بعض بزرگوں اور دوستوں کو لکھا، اور انھوں نے مہربانی فرما کر، میری تمام مطلوبہ کتابیں اور جس قدر مرزا کے حالات ان کو معلوم ہو سکے، لکھ کر میرے پاس بھیج دیے۔"

حالیؔ نے ایک محتاط ادیب کی طرح، معتبر ماخذوں سے میٹیریل جمع کیا۔ اور اس شعر کے بارے میں تو ان کی وابستگی دوہری تھی، بلکہ سوا۔ ان کے ماخذ میں ہم کی جگہ مجہ یا مجھ تھا۔ (یہ بات کسی قدر یقین سے شواہد کے بغیر عرض کی جا رہی ہے)، نہ ہوتا تو وہ چونکتے۔ علائی کے نام یہ خط ان ۵۶ خطوں میں سے ہے، جو اردوے معلّیٰ کے پہلے ایڈیشن میں شامل تھے۔ اس ایڈیشن کا دیباچہ حالی کے ہم وطن اور خواجہ تاش، میر مہدی مجروحؔ نے لکھا تھا۔ خطوں پر ایک نظر غالب نے بھی ڈالی۔ قراین اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اگرچہ اردوے معلّیٰ کا پہلا ایڈیشن مرزا کی وفات کے دو روز کم تین ہفتے بعد شائع ہوا، لیکن اس بات کا امکان قوی ہے کہ کچھ فرمے چھپے ہوئے ان کی نظر سے بھی گزرے ہوں، کیوں کہ عودِ ہندی، اور اردوے معلّیٰ، دونوں کی ترتیب میں ان کی سرگرم شرکت رہی تھی۔ خود حالی کی بھی سرگرم شرکت کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تیس برس بعد، جب دو حصّوں میں یہ کتاب پھر چھپی، تو حالی کا ہاتھ اس کام میں تھا۔ دوسرے حصّہ میں تو مہتمم مطبع مجتبائی (دلّی)، نے اعلان کیا:[1]

"... جب اردوے معلّیٰ مرزا غالب، ہندوستان کے سعدی، مولانا حالی کی اجازت سے مطبع میں چھپی، تو مولانا موصوف نے ایک قلمی مسوّدہ مرزا غالب کے رقعات کا اپنے پاس سے بھی عنایت فرمایا، جس کو احقر نے حصّہ دوم اردوے معلّیٰ کے نام سے نامزد کر کے اس کے آخر میں شامل کر دیا۔"

حالی یقیناً اس شعر کی قرأت سے واقف تھے۔ ہم کی جگہ مجہ یا مجھ ان کے ماخذ میں ہو سکتا تھا۔ نہ ہوتا، تو وہ

---

[1] غالب کے خطوط مرتبہ خلیق انجم: ص ۳۶ (غالب انسٹی ٹیوٹ)

اس کی تصحیح کرتے، نہ کہ غلط مصرع یادگار میں رکھتے۔ یہ چند ناقص خیالات ہیں، جو پیش کیے گئے۔ اردوے معلّٰی کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن تک رسائی ممکن نہ ہو سکی۔ وثوق سے بات تو اصل ماخذ کو دیکھنے کے بعد ہی کی جا سکتی ہے۔[۱]

۳۱۔ وائے، واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

یادگار (پہلے ایڈیشن ۱۸۹۷ء) میں مصرعِ اولیٰ ہے:

ہائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا

دوسرا لفظ "واں"، ہائے ہوز سے اس لیے لکھا گیا ہے کہ ہاے ہوز اور دو چشمی کا خلط ہوتا تھا۔ آج کے اسلوب میں یہ "واں" لکھتے ہیں۔

مصنف موصوف نے دونوں جگہ "شورِ محشر" میں فکِ اضافت سے کام لیا ہے، ہو سکتا ہے یہ سہوِ کتابت ہو۔ یادگارِ غالب (مکتبہ جامعہ ایڈیشن) میں مالک رام نے، متن کی تصحیح کرتے ہوے، وہ سہو ہوا ہے۔ جو غالب کے دیوان کے مرتّب کی حیثیت سے ایک طرح سے ان کی پہچان بن گیا ہے۔ چناں چہ ص ۱۸۳ پر پہلا مصرع یوں لکھا ہے:

ہائے، وہاں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا

وہاں سے مصرع آہنگ میں سلامت نہیں رہتا۔ آج کے اسلوب میں "واں" چاہیے، اور "ہاے"، ہمزہ کے بغیر:

ہاے واں بھی (فاعلاتن)، شورِ محشر (فاعلاتن)، نے نَ دم لے (فاعلاتن)، نے دیا (فاعلن)

حالی کے سامنے جو ماخذ رہا ہوگا، اس میں ہاے ہی رہا ہوگا۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ تحریف کرتے۔
اگر اسے حالی کی تحریف تسلیم کر لیں، تو اردوے معلّٰی تو سراسر مشتبہ قرار پاے گی، اور وہ خطوط حالی کی تصنیف قرار پائیں گے جو انھوں نے مہتممِ مطبع کو فراہم کیے تھے۔

---

[۱] غالب انسٹی ٹیوٹ کے لیے غالب کے خطوط مرتب کرتے وقت ڈاکٹر خلیق انجم نے یہ نسخے یا ان کے فوٹو اسٹیٹ دیکھے ہوں گے۔ اپنی یادداشتیں دیکھ کر وہ اس پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ (کمال)

۳۲ وہ نیشتر سہی، پر دل میں جب اُتر جاوے

نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے؟

متداول دیوان میں شعر اس طرح ہے۔ لیکن یادگار میں پہلے مصرع کا آخری لفظ جاوے کے بجائے جائے ہے۔ اسے تحریف سمجھا گیا ہے!

نبی بخش حقیر کو مرزا نے ۲۲ اپریل ۱۸۵۳ء کو جو خط لکھا تھا، اس کے ساتھ اپنی تین غزلیں بھیجی تھیں۔ دو لال قلعے کے طرحی مشاعرے کی، ایک فارسی، اور ایک اردو، اور ایک اردو غزل کی زمین میں، جس میں ردیف کے ایک حصے کو قافیہ کیا۔ یہ شعر اسی غزل کا ہے، اور پہلا مصرع ہے۔

وہ نیشتر سہی، پر دل میں جب اتر جائے

نادراتِ غالب سے یہ خط "غالب کے خطوط" میں نقل ہوا ہے۔ غزل مذکورہ ص ۱۱۲۷ (جلد سوم) پر ہے۔

ایک بات جاوے، جائے اور جاَے کے بارے میں: جاوے اور جاَے (ہمزہ کے ساتھ) ہم وزن ہیں۔ اور ان کی عروضی قیمت فعْلن (بہ سکونِ عین) ہے۔ جاَے، ہمزہ کے بغیر، شروع یا درمیانِ مصرع میں فعل (بہ سکون دوم و تحریکِ آخر) ہے۔ آخر مصرع میں جاَے کا وزن فاع / فعْل (بہ سکونِ دوم و آخر) ہے۔ غالب نے جہاں ایسے الفاظ (جاَے، آَے، آَی وغیرہ) واو کے بغیر لکھے ہیں، ان کے کلام کے مرتبین نے یا پر ہمزہ لگا کر بہت سے مقامات پر نادرست اشباع کیا ہے اور اگر مکتوبی حروف کو پڑھا جاے تو شعر آہنگ میں نہیں رہتا۔ لیکن وہ دوسری کہانی ہے۔ غالب اپنے عہد کے املا سے مطمئن نہیں تھے۔ خود ان کی وجہ سے نیا املا نمو پذیر ہوا۔ یہ بھی دوسری کہانی ہے، لیکن کلی طور پر غیر متعلق نہیں۔ فعْلن (بہ سکونِ عین)، وزن پر آوے طرح کے الفاظ لکھے جاتے تھے، اور بولے بھی جاتے ہوں گے۔ لیکن غالب نے آئے، جائے چھپائے، لگائے، بنائے، سنائے، لکھنا اور بولنا شروع کر دیا تھا۔

نکتہ چیں ہے غمِ دل، اس کو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

یہ غزل غالب کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی فراہم ہے[۱]۔ یائے مجہول اور یائے معروف کا خلط ہے۔ یائے مجہول کثرت لکھی

---

[۱] غالب کے خطوط (غالب انسٹی ٹیوٹ): ص ۳۹۰

گئی ہے۔ غالب کی یہ تحریر اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ واؤ کے ساتھ لکھے جانے والے آوے قسم کے لفظ انھوں نے یا پر ہمزہ کے ساتھ، واو کو خارج کر کے لکھنا شروع کر دیے تھے۔ یہ غزل مرزا نے علاء الدین خان علائی کو ۱۹ جون ۱۸۶۲ء کے خط کے ساتھ بھیجی تھی۔ اس سے غالب کا یہ منشا بھی اخذ ہوتا ہے، کہ جس طرح انھوں نے کسو کو (جب وہ قافیہ نہ ہو) ترک کر کے کسی کو اپنایا، اسی طرح آوے، جاوے وغیرہ کو واو خارج کر کے آئے، جائے وغیرہ یا پر ہمزہ کے ساتھ اپنا لیا تھا۔ اگر یہ شہادت فراہم نہ بھی ہوتی، تو اگر وہاں اور یہاں کو آج کے اسلوبِ املا میں واں اور یاں لکھنا تحریف نہیں ہے۔ تو جاوے کو جائے لکھنا تحریف کیوں سمجھا جائے؟ یہ کوئی بہت اچھا تاثر نہیں ہے کہ حالی پر کلامِ غالب میں تحریف کا مقدمہ قائم کیا گیا ہے۔ اور بے جان، کمزور، بودی شہادتیں جمع کی جا رہی ہیں۔

نکتہ چیں ہے غم دل اوسکو سنائی نہ بنی کیا بنی بات جہاں بات بنائی نہ بنی

[illegible]

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب کہ لگائی نہ لگی اور بجھائی نہ بنی

اگر علائی کے نام خط کے ساتھ غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ غزل فراہم نہ ہوتی، تو بھی جاوے اور جائے کو ایک ہی لفظ کے دو مکتوبی روپ تسلیم کرنے میں کیا قباحت ہے؟

۳۳ رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

یادگار میں حالی نے دوسرا مصرع یہ لکھا ہے:

دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

نسخۂ عرشی میں اتنے ہے، اور مالک رام کے نسخوں میں ایسے ہے۔ نسخۂ عرشی میں وہ قرأت ہے، جو نسخۂ شیرانی میں ورق ۹۴ رخ ب پر ہے۔ نسخۂ بھوپال میں یہ غزل نہیں تھی۔ عرشی نے یہ اظہار بھی کیا ہے کہ (شیفتہ کے گلشنِ بے خار) گب[1] میں اتنے نہیں ایسے ہے۔ نسخۂ شیرانی کی یہ غزل ۱۸۲۱ء اور ۱۸۲۶ء کے کے درمیان کی ہے۔ اور عرشی نے اس کی قرأت کو ۱۸۶۲ء کے چوتھے مطبوعہ ایڈیشن (مطبع نظامی کانپور) کی قرأت پر ترجیح دی! یہ تدوین کے اصول کے مطابق نہیں ہے۔ عرشی کا ذوق، اور ان کی پسند تدوین کے بنیادی اصول سے زیادہ اہم ان کے لیے ہوں تو ہوں، کلامِ غالب کے طالب علموں کے لیے نہیں۔

حالی نے جو قرأت دی ہے۔ وہ مرجح ہے۔ اور عرشی نے جو قرأت دی ہے۔ وہ زاید المیعاد ہے اور اختلافِ نسخ میں دکھائی جانا چاہیے تھی، متن میں نہیں! تحریف حالی سے نہیں، عرشی سے ہوئی ہے!

۳۴۔ روک دو گر غلط چلے کوئی
ڈھانک لو، گر خطا کرے کوئی

یادگار میں شعر اس طرح ہے۔ جب کہ مروجہ دیوان میں شعر یوں ہے۔

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

حالی نے جو میٹیریل معتبر لوگوں سے جمع کیا تھا اس میں شعر اسی طرح ہوگا۔ جیسا حالی نے نقل کیا ہے۔ حالی کو اصلاح ہی کرنا ہوتی تو وہ جزوی تقابلِ ردیفین کا عیب اپنے استاد کے کلام سے دور کرتے۔ ایسی تحریف کیوں کرتے، جسے نہ پن کے کھاتے میں ڈالا جا سکتا ہے، اور نہ پاپ کے۔

۳۵ بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پر پیچ وخم کا پیچ وخم نکلے

یادگار میں شعر اسی طرح لکھا ہے۔ مروجہ نسخوں میں پہلا مصرع یہ ہے:

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا

مصنف موصوف کو اختیار ہے کہ وہ تیری اور تیرے کو اختلافِ نسخ سمجھیں۔ عرشی نے بھی کچھ

---

[1] عرشی نے اپنے نسخے میں مخفف گب کی کلید فراہم نہیں کی ہے کہ نسخہ کا پورا نام کیا ہے۔

مقامات پر ایسا ہی سمجھا ہے، جب وہ یارِ مجہول اور یارِ معروف کے خلط کو اختلافِ نسخ سمجھے۔

ایک غزل جو ۱۸۶۱ء کے تیسرے مطبوعہ ایڈیشن میں ہے، اس کا عکس ملاحظہ فرمائیں:

ذکر میرا بہ بدی بھی اوسی منظور نہین — غیر کی بات بگڑ جای تو کچھہ دور نہین
وعدۂ سیر گلستان ہی خوشا طالع شوق — مژدۂ قتل مقدر ہی جو مذکور نہین
شاہد ہستی مطلق کی کمر ہی عالم — لوگ کہتی ہین کہ ہی پر ہمین منظور نہین
قطرہ اپنا بھی حقیقت مین ہی دریا لیکن — ہمکو تقلید تنک ظرفی منصور نہین
حسرت ای ذوق خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی — عشق پر عربدہ کی گون تن رنجور نہین
مین جو کہتا ہون کہ ہم لینگے قیامت مین تمہین — کس رعونت سی وہ کہتی ہین کہ ہم حور نہین
ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو — تو تغافل مین کسو رنگ سے معذور نہین
صاف دردی کش پیمانۂ جم ہین ہم لوگ — وای وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہین
ہون ظہوری کی مقابل مین خفای غالب — میری دعوی پہ یہہ حجت ہی کہ مشہور نہین

مطبع نظامی کانپور میں چوتھا ایڈیشن ۱۸۶۲ء میں چھپا تو، اس میں یہ غزل یوں چھپی۔ عکس ملاحظہ فرمائیں:

ذکر میرا بہ بدی بھی اوسی منظور نہیں — غیر کی بات بگڑ جای تو کچھہ دور نہیں
وعدۂ سیر گلستان ہی خوشا طالع شوق — مژدۂ قتل مقدر ہی جو مذکور نہیں
شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم — لوگ کہتی ہین کہ ہی پر ہمین منظور نہیں
قطرہ اپنا بھی حقیقت مین ہی دریا لیکن — ہمکو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں
حسرت ای ذوق خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی — عشق پر عربدہ کی گون تن رنجور نہیں
مین جو کہتا ہون کہ ہم لین گی قیامت مین تمہیں — کس رعونت سی وہ کہتی ہین کہ ہم حور نہیں
ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو — تو تغافل مین کسی رنگ سی معذور نہیں
صاف دردی کش پیمانۂ جم ہین ہم لوگ — وامی وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں
ہون ظہوری کی مقابل مین خفائی غالب — میری دعوی پہ یہہ حجت ہی کہ مشہور نہیں

آج کے اسلوبِ املا اور اسلوبِ کتابت کے حساب سے پڑھیں تو بڑی افراتفری ہو گی۔ یارِ مجہول اور یارِ معروف کے خلط کی حقیقت کو نظر انداز کر کے اُس عہد کے نسخے نہیں پڑھے جا سکتے۔ ہر شعر پر گفتگو طوالت کا باعث ہو گی۔ تیسرے شعر کو لیں۔

چوتھے ایڈیشن میں پہلا مصرع ہے :

شاہدِ ہستی مطلق کی کمر ہے عالم

تیسرے ایڈیشن میں پہلا مصرع ہے :

شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم

کیا اسے اختلافِ نسخ سمجھنے کا جواز ہے ؟

تیسرے ایڈیشن میں چھٹا شعر یوں لکھا ہے :

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمھیں
کس رعونت سے وہ کہتی ہیں کہ ہم حور نہیں !

کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ غالب کے محبوب نے تانیث کے صیغے میں گفتگو کی ؟

عرشی اور مالک رام، دونوں سے ایک شعر کے سلسلے میں افسوسناک غلطی ہوئی۔ شعر یہ ہے :

گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا، مری جو شامت آئی
اُٹھا، اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

ان دونوں نے شامت آئے کے ساتھ پہلے مصرعوں کی قرأت اپنے نسخوں میں رکھی ہے، حالاں کہ اس کی وجہ سے شعر کا مفہوم خبط ہو گیا ہے۔

ایک اور مثال۔ مالک رام کے یادگار (صدی) ایڈیشن میں ایک شعر ہے :

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ
یہاں عرض سے رتبۂ جوہر کھلا

عرشی کے نسخے میں پہلا مصرع یہی ہے۔ لیکن دوسرے مصرع کا پہلا لفظ یاں ہے، اور وزن سے ساقط نہیں۔ ان دونوں مقتدر مرتّبینِ غالب نے نہ معنی پر غور فرمایا، اور نہ اس بات پر کہ شکوہ مذکر اسم صفت ہے۔ یہاں تسامح یہ ہوا کہ یاء مجہول کے بجائے یاء معروف پڑھی۔ میری ناقص رائے میں، درست قرأت شعر کی یہ ہے۔

مدح سے ممدوح کی دیکھے شکوہ
یاں عرض سے رتبۂ جوہر کھلا

حالی نے چوں کہ غالب کی آنکھیں دیکھی تھیں، ان سے گفتگو کا شرف انھیں حاصل تھا۔ اس لیے اگر حالی کے نسخے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے قامت کو تانیث کے صیغے میں نظم کیا ہے، تو ہمیں چاہیے کہ جو دیوان ہمارے پاس ہے، اس کی قرأت درست کرلیں۔

۳۶۔ کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے، ورنہ
ہے یوں، کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

یادگار میں پہلا مصرع ہے:

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے مجھ کو

ورنہ کے ساتھ، متداول دیوان کی قرأت اصلاحی — بعد کی معلوم ہوتی ہے۔ مجھ کو کے بغیر بھی بات پوری ہوتی ہے، اس لیے یہ حشو تھا، اگرچہ قبیح نہیں۔ ورنہ سے یہ سقم دور ہو جاتا ہے۔ سوا اس کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ حالی کے پاس یادداشتوں میں اوّلین قرأت کے ساتھ یہ غزل تھی۔

اگر حالی کو اصلاح ہی مقصود ہوتی، تو وہ حشو، مجھ کو، نہ رکھتے۔ اور آتی کو آئے کرتے، کیوں کہ آتی کی ی ساقط ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کے سقوط کی اجازت ہے، لیکن یہ سقوط گراں گزرتا ہے۔

۳۷۔ دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمّل حسین خاں کے لیے

متداول دیوان کے نسخوں میں شعر اس طرح ہے، لیکن یادگار میں پہلا مصرع ہے:

دیا ہے اَور کو بھی تا اسے نظر نہ لگے

یہ مرزا کے آخری عہد کی غزل ہے۔ حالی نے جو مصرع لکھا ہے، اسے پہلے مسودوں میں سے سمجھنا چاہیے۔ مروّجہ دیوان میں اصلاح کے بعد خلق رکھا گیا ہوگا۔ صیغۂ واحد میں اَور کھٹکا ہوگا۔ جمع اَوروں رکھنے سے مصرع سقوطِ صوتِ آخر کی وجہ سے رواں نہیں رہتا۔ شاید اسی لیے خلق رکھا گیا ہوگا۔ اَور کو ابتدائی قرأت کا حصہ سمجھنا چاہیے۔ اس سے ایک بات اور بھی ابھرتی ہے کہ حالی کے پاس، یادداشتوں میں غزلوں کی ابتدائی قرأتیں بھی تھیں، یا مرزا غزل سرانجام پانے کے بعد خود مخصوص احباب کو بھیجتے تھے، یا لکھوا دیتے تھے۔ یادگار لکھتے وقت کوئی ایسا بستہ یا بیاض، حالی کو کسی نے بھیج کر، ان کی مدد کی۔

۳۸۔ زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

یادگار میں پہلا مصرع ہے:

زمانہ عہد میں ہے اس کے محوِ آرائش

ماقبل کے شعر کی طرح یہ مصرع بھی پہلی قرأت کا حامل معلوم ہوتا ہے۔ الفاظ وہی ہیں، اور حالی کا مصرع بہتر نہیں ہے، اس لیے اصلاح اور تحریف کا الزام لگانے کی گنجائش نہیں۔

۳۹ گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں
دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام
اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

مصنّف موصوف نے دوسرے شعر میں اختلافِ نسخ کی نشاندہی کی ہے۔ یادگار میں مصرعِ اولیٰ میں دھرتے کی جگہ رکھتے ہے۔ اور دوسرے مصرع کی ابتدا یوں ہوتی ہے: "ہے اس سے ... الخ" اگر موصوف نے توجہ فرمائی ہوتی تو پاتے کہ پہلے مصرع میں بادشاہ نہیں پادشاہ ہے۔

عرشی کے نسخے میں یہ تینوں اختلافِ نسخ دکھائے گئے ہیں۔ بادشاہ کے بجائے پادشاہ ہونا، اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ یادگار میں ابتدائی قرأت ہے، جو نظرِ ثانی کے بعد دیوان میں لکھی گئی۔

۴۰۔ افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

مصنّف موصوف نے اس بات کی درست نشاندہی کی ہے کہ یادگار کے چوتھے مصرع میں نہ کھائے کی جگہ نہ کھاوے ہے۔

منشی نبی بخش حقیر کو دو خطوں میں (جون ۱۸۵۴ء اور جولائی ۱۸۵۴ء) مرزا نے یہ قطعہ بھیجا۔ پہلا مصرع ہے:

افطارِ سوم کی جسے کچھ دستگاہ ہو

باقی تینوں مصرعے وہی ہیں، جو متداول دیوان میں ہیں، اور اوپر نقل ہوتے ہیں۔

نسخۂ عرشی میں یہ قطعہ نسخۂ رامپور جدید کے حوالے سے نقل ہوا ہے، جس کی ترتیب رکتابت کا سنہ ۱۸۵۵ء ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عرشی کے نسخے میں اصلاح کے بعد کا متن ہے۔ حقیر کے خط میں جو متن ہے، وہ پہلے کا ہے، اور یہ پہلے مصرع کی ساخت سے واضح ہے۔ نادرات کے خطوط کے عکس فراہم نہیں ہیں۔ قیاس چاہیے کہ ان میں کھاوے ہوگا۔ جو موجودہ اسلوب میں کھائے لکھا گیا۔ یادگار میں ابتدائی قرأت ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ پہلے مصرع میں جسے کی یے ساقط ہے۔ اور مصرع گھٹل ہو جاتا ہے۔ اور چوتھا مصرع کھاوے کی یے ساقط ہونے کی وجہ سے رواں نہیں رہتا۔

(۱) افطار (مفعول) صوم کی جِ (فاعلاتُ) سِ کچھ دست (مفاعیلُ) گاہ ہو (فاعلن)

(۲) روزہ اَ (مفعولُ) گرنَ کھاوِ (فاعلاتُ) تَ ناچار (مفاعیلُ) کیا کرے (فاعلن)

اصلاحی قرأت میں یہ دونوں سقم دور ہو گئے۔ کچھ کے بعد اگر کا الف موصول ہے اور کھائے میں واو نہیں ہے۔ اس لیے اس کی جگہ یار مجہول نے لے لی۔

یادگار کی قرأت، نادرات اور نسخۂ رامپور جدید کے درمیان کی ہے۔

(۱۴) بھیجی ہے مجھے جو شاہِ جمجاہ نے دال
ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال، بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

یادگار میں غالب کی رباعی کی یہ صورت ہے۔ مصنف موصوف نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ نسخۂ عرشی میں پہلا مصرع یہ ہے:

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جمجاہ نے دال

رباعی کے چوبیس اوزان ہیں۔ ایک وزن مفعولُ مفاعلن مفاعیلُ فعول ہے۔ یادگار اور نسخۂ عرشی میں اس رباعی کے پہلے مصرعے اسی وزن پر ہیں:

۱۔ بھیجی ہَ (مفعولُ) مجھے جُ شا (مفاعلن) ہِ جم جاہ (مفاعیلُ) نِ دال (فعول)

۲۔ بھیجی ہَ (مفعولُ)، ر جُ مجھ کُ ثنا (مفاعلن)، ہِ جم جاہ (مفاعیلُ)، نِ دال (فعولُ)،
دوسرے مصرع کے متن میں بھی اختلاف ہے، لیکن مصنف موصوف کی نظر اس پر نہیں گئی۔ نسخۂ عرشی میں دوسرا مصرع ہے:

ہے لطف و عنایتِ شہنشاہ پہ دال

یادگار میں عنایات ہے۔ نسخۂ عرشی میں عنایت ہے۔ عرشی نے نشاندہی کی ہے کہ چوتھے ایڈیشن میں عنایات ہے۔ مالک رام نے عنایات ہی رکھا ہے۔ عنایت پہلے مطبوعہ ایڈیشن کی قرأت ہے۔ اور عرشی نے چوتھے ایڈیشن کی قرأت پر پہلے ایڈیشن کی قرأت کو ترجیح دے کر، اصولِ تدوین کی خلاف ورزی کی ہے۔ متن میں چوتھے ایڈیشن کی، یعنی مرزا کی طے کی ہوئی آخری قرأت ہی رکھنا تھی۔ پہلے کی قرأت اختلاف نسخ میں دکھانا تھی۔ لیکن عرشی نے اس کے برعکس کیا۔ اور یہ بڑی خامی، اور بڑا نقص ہے۔ ۱۸۶۲ء کے اصلاحی مصرع کے بجائے ۱۸۴۱ء کے نسخے کے مصرع کو ترجیح دینا نسخۂ عرشی کو پایۂ اعتبار سے اتار دیتا ہے۔

رباعی کے دو بنیادی اوزان ہیں۔ مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعولُ اور مفعولُ مفاعلن مفاعیلُ فعولُ۔ یادگار کا مصرع، جو چوتھے مطبوعہ ایڈیشن میں بھی ہے۔ پہلے وزن میں ہے، اور نسخۂ عرشی کا مصرع دوسرے وزن میں ہے۔

۱۔ ہے لطف (مفعولُ)، عنایاتِ (مفاعیلُ)، شہنشاہ (مفاعیلُ)، پہ دال (فعولُ)،

۲۔ ہے لطف (مفعولُ)، عنایتے (مفاعلن)، ——— ایضاً ———

حقائق سامنے ہیں۔

۴۲۔ کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر
جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار
میری تنخواہ میں تہائی کا
ہو گیا ہے شریک ساہوکار

یادگار میں قطعہ کے دو شعر (جو ذرا فاصلے پر ہیں)، اس طرح ہیں۔ مصنف موصوف نے درست نشاندہی کی ہے کہ نسخۂ عرشی میں شعر یوں ہیں:

کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر

تا نہ دے بادِ زمہریر آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش

جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار

میری تنخواہ میں چہارم کا

ہوگیا ہے شریک ساہوکار

یہ بات واضح ہے کہ حالی نے تحریف نہیں کی۔ درمیان کا ایک مصرعِ ثانی اور ایک مصرع اولیٰ لکھنے سے رہ گیا۔ گمانِ غالب یہی ہے کہ یہ تسامح خود ان سے ہوا، یا کاتب سے سہو ہوا۔ عرشی نے اختلافِ نسخ کے باب میں ص ۸۸ پر اظہار کیا ہے۔

"سہواً اگلے شعر کا دوسرا مصرع لکھ دیا۔" عرشی نے اس بات کی نشاندہی بھی کی ہے کہ چار نسخوں میں تہائی ہے۔ ان چار نسخوں میں یادگار بھی شامل ہے۔ حالی صرف اپنے نسخے میں تحریف کرنے پر قادر تھے، باقی تین نسخوں میں نہیں۔ واضح ہے کہ حالی کی قرأت تین اور نسخوں میں بھی ہے۔ اس لیے تحریف نہیں ہے!

مصنّف موصوف نے "مقدمۂ شعر و شاعری" اور متداول کلام کے نسخوں میں بھی اختلافِ نسخ کی نشاندہی کی ہے۔ یادگار سے تقابل کے تحت، مروجہ دیوان سے جو مصرعے لیے گئے تھے۔ ان ہی پانچ کی انھیں قرأتوں کو "مقدمۂ شعر و شاعری" کے تحت بھی لیا گیا ہے۔ یہ مصرعے ہیں۔

۱۔ جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے۔

۲۔ اُن کے آنے سے جو آجاتی ہے رونق منہ پر

۳۔ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

۴۔ زمانہ عہد میں ہے اس کی محوِ آرائش

یاء مجہول اور یاء معروف کا خط اُس زمانے میں عام تھا۔ عادتاً مقدمہ کا کاتب اس کے کو اس کی لکھ گیا۔ اُس زمانے میں یہ بھی اس کے پڑھا جاتا تھا۔ مصنّف موصوف اسلوبِ املا سے واقف نہیں اس لیے ان سے یہ نادانستہ غلطی ہوئی۔

(۵) دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

ان اشعار کے سلسلے میں، جن کے یہ مصرعے ہیں، معروضات پیش کی جا چکی ہیں، اس لیے ان سے دوبارہ بحث نہیں کی جائے گی۔ ہاں ایک بات کی طرف قارئینِ کرام کو توجہ ضرور دلانا چاہوں گا کہ اپنے دیوان کے مقدّمہ میں حالی نے، مرزا کے ان شعروں کو، اسی متن کے ساتھ لکھا، جو سوانح حیات میں درج شعروں کا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے یادداشت سے شعر نہیں لکھے تھے۔ ان کے پیشِ نظر غالب کا کلام تھا۔ مقدّمہ اور مروّجہ دیوان میں جس اختلاف نسخ کے بارے میں مصنّف موصوف نے لکھا ہے، ان کا مطالعہ کریں:

۱۔ جلّاد سے لڑتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس رنگ میں جو آئے

مقدّمہ میں حالی نے شعر یوں نقل کیا ہے۔ متداول کلام کے نسخوں میں شعر یوں ہے:

جلّاد سے ڈرتے ہیں، نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے، جس بھیس میں جو آئے

اس غزل میں مرزا نے خاصی اصلاحیں کی تھیں، حالی نے یہ شعر معتبر ماخذ سے نقل کیا ہوگا۔ یہ ماخذ ہمارے علم میں نہیں ہے، لیکن صرف اس وجہ سے مقدّمہ کی قرأت کو ہم غیر معتبر یا غیر اہم قرار نہیں دے سکتے۔ مرزا کے مطبوعہ دیوان اُس وقت موجود تھے، جب حالی کا دیوان چھپا۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ مرزا نے دیوان کی ایک جلد، اپنے ہاتھ سے مصرعوں میں کچھ تبدیلیاں کر کے کسی کو دی ہو، اور وہ حالی تک پہنچا ہو۔ یہ صرف ایک امکان ہے، اور بہت دور کا امکان نہیں۔ یا کچھ خط ان کے پاس ایسے بھی ہوں، جنھیں اردوے معلّٰی کے دوسرے حصّہ میں شامل نہیں کیا گیا، لیکن ان میں مرزا نے شعر لکھے ہوں۔ یہ بھی صرف ایک امکان ہے۔ اور قابلِ غور بھی ہے۔

نادرات میں حقیر کے نام ۱۸۵۱ء کے ایک خط کے ساتھ وہ غزل ہے۔ جس میں یہ شعر ہے "غالب کے خطوط" میں مرتّب خلیق انجم نے حواشی میں ص ۳، ۱۳ پر یہ اظہار کیا ہے کہ یہ غزل دہلی اردو اخبار کے ۱۱ مئی ۱۸۵۱ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ عرشی نے اپنے نسخے میں "شرحِ غالب" کے تحت ص ۳۶۳ پر یہی اظہار کیا ہے۔

حقیر کو مرزا نے یہ بھی خط میں لکھا:

"ایک بات تم کو یہ معلوم رہے کہ جب حضور میں حاضر ہوتا ہوں، تو اکثر بادشاہ مجھ سے ریختہ

طلب کرتے ہیں۔ سو، وہ کہی ہوئی غزلیں تو کیا پڑھوں، نئی غزل کہہ کرلے جاتا ہوں۔ آج میں نے دوپہر کو ایک غزل لکھی۔ کل یا پرسوں جا کر غزل پڑھوں گا۔ تم کو بھی لکھتا ہوں۔ داد دینا۔ اگر ریختہ پایۂ سحر یا اعجاز کو پہنچے، تو اس کی یہی صورت ہوگی، یا کچھ اور شکل۔"

اور پھر غزل ہے:

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مُو آئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

نسخۂ عرشی میں ص ۲۶۰ پر اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ نادرات، یعنی حقیر کے خط میں اور دیوان کے پانچویں (۱۸۶۳ء کے) ایڈیشن میں، دوسرے مصرع کا پہلا لفظ اک ہے۔ پھر بھی عرشی نے اپنے نسخے میں یک رکھا ہے۔ مالک رام نے بھی اپنے نسخوں میں یک رکھا ہے۔ آزاد کتاب گھر والے نسخے میں البتہ فٹ نوٹ میں آگرہ والے ایڈیشن میں اک ہونا دکھایا گیا ہے۔ ان دونوں نسخوں میں اک کے بجائے یک کا متن میں رکھا جانا، تدوین کے اصول کے منافی ہے۔

ایک بار پھر اس حقیقت پر توجہ دلائی جائے کہ آگرہ والا ایڈیشن، اس مخطوطے سے لکھا گیا تھا۔ جو رام پور کے نسخے سے نواب ضیاء الدین خاں نیر و رخشاں کے لیے مرزا نے نقل کرایا تھا، اور اطمینان سے اس پر نظرِ ثانی کی تھی۔ یہی وہ ماخذ ہے۔ جو میرٹھ سے دیوان کی اشاعت کے لیے مصطفےٰ خاں شیفتہ کو، اور پھر واپس منگا کر شیو نراین کو آگرہ بھیجا گیا تھا۔ اک مرزا کا کیا ہوا متن ہے اور چوں کہ یک کو اک مرزا نے اطمینان سے نظرِ ثانی کے بعد کیا تھا۔ اس لیے اک مرجح قرأت ہے۔ ۱۸۶۱ء میں مطبع احمدی دتی سے جو تیسرا ایڈیشن چھپا تھا۔ اس کا ماخذ ان معنوں میں مجہول ہے، کہ دیوان کے آخر میں مرزا نے جو کچھ لکھا، اس میں یہ جملے بھی ہیں:

"۔۔۔۔ اگرچہ یہ انطباع میری خواہش سے نہیں، لیکن ہر کاپی میری نظر سے گزرتی رہی ہے، اور اغلاط کی تصحیح ہوتی رہی ہے۔۔۔"

جب دیوان چھپ کر آیا، اور مرزا نے دیکھا، تو جھنجھلا گئے۔ میر مہدی مجروح کو لکھا:

لہ غالب کے خطوط (غالب انسٹی ٹیوٹ)، ص ۱۰۹۸

"۔ ۔ ۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں۔ کاپی نگار اور تھا۔ متوسط، جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا، وہ اور تھا۔ اب جو دیوان چھپ چکے، حقِ تصنیف ایک مجھ کو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ جوں کے توں ہیں۔ یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔"

اس سے کچھ عرصہ پہلے ہی انھوں نے آگرہ سے چھپنے والے دیوان کے لیے نسخہ دیکھا تھا۔ اور بڑی توجہ سے اس کا متن فائنل کیا تھا۔ نسخہ میرٹھ سے منگا کر ۲۵ جون ۱۸۶۰ء کو پارسل سے شیو نراین کو بھیجا۔ دو شنبہ ۲۵ جون (۱۸۶۰ء) کے خط میں انھوں نے شیو نراین کو لکھا:

"میں تمہارا گناہگار ہوں، تمہاری کتاب میں نے دبا رکھی ہے۔ بڑی کوشش سے اس (دیوان) کو وہاں (میرٹھ میں) چھپنے نہ دیا، اور منگوا لیا۔ آج پیر کے دن ۲۵ جون کو پارسل کی ڈاک میں روانہ کیا ہے۔ ۔ ۔" [1]

مطبعِ احمدی سے جو دیوان ۱۸۶۱ء میں چھپا۔ اس کا ماخذ آگرہ سے چھپنے والے دیوان سے زیادہ معتبر نہیں تھا۔ کاپی کی تصحیح کے مرحلے پر کتنی تبدیلیاں کی جاسکتی ہیں؟ — بہت ہی محدود! اور پھر غضب یہ ہوا کہ مرزا نے جو تصحیح کی، اس پر عمل نہیں ہوا۔ مرزا کے بیان سے ایسا ہی لگتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ بیان حتمی ہو، ہو سکتا ہے مرزا نے روا روی میں کاپیاں دیکھی ہوں، اور کام نپٹایا ہو، کاپی کی غلطی مصنف کو اتنی نظر نہیں آتی۔ جتنی دوسروں کو، اگر وہ کم استعداد نہ ہوں۔ بہر کیف! اس ناقص چھپے ہوئے دیوان پر "دو دن رات" میں تصحیح کی، اور پھر کانپور میں چھپا۔ آگرہ چھپنے کے لیے جو مخطوطہ انھوں نے بھیجا تھا اور جس میں کئی اہم تبدیلیاں کی تھیں وہ ظاہر ہے ان کے ذہن میں نہیں تھیں، ورنہ وہ تبدیلیاں بھی کانپور والے دیوان کے لیے کی جاتیں، ان تبدیلیوں میں یک کو اک کرنا بھی ہے۔ اک کو ہی آخری قرأت سمجھنا چاہیے۔ ایک مثال اور:

حقیر کو جو غزل بھی ہے، اس میں تیسرا شعر ہے:

ہے ساعقہ وشعلہ وسیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آے

شیو نراین کے مطبع مفید الخلائق، آگرہ کے ایڈیشن میں پہلا مصرع ہے:

---

[1] غالب کے خطوط (غالب انسٹی ٹیوٹ) ص ۱۰۸۳

ہے زلزلہ و صرصر و سیلاب کا عالم

ظاہر ہے یہ اصلاح مرزا کو یاد نہیں رہی۔ اسی وجہ سے مطبع نظامی کانپور سے چھپنے والے چوتھے، ایڈیشن میں پہلے ہی کا مصرع بحال رہا کیوں کہ مطبع احمدی کے ایڈیشن میں ایسا تھا۔ اپنی اس اصلاح کے یاد نہ رہنے سے پانچویں ایڈیشن میں اس شعر کے پہلے مصرع کا متن مسترد نہیں ہوتا۔ بلکہ وہی مصرع مرجح ہے۔

یہ اصلاح مرزا نے کیوں کی؟ غور کریں تو وجہ سمجھ میں آجاتی ہے۔ بجلی چمک کر معدوم ہو جاتی ہے۔ اسی بجلی کا وجود باقی نہیں رہتا۔ پھر چمکتی ہے، تو دوسری بجلی چمکتی ہے۔ شعلہ بھی بجھ جاتا ہے۔ دوبارہ جو بھڑکتا ہے، وہ دوسرا شعلہ ہوتا ہے۔ نہ صاعقہ آتا ہے، نہ شعلہ آتا ہے اور نہ سیماب آتا ہے۔ زلزلہ آتا ہے، گزر جاتا ہے، صرصر چلتی ہے، آتی ہے، گزر جاتی ہے۔ سیلاب بھی آتا ہے، گزر جاتا ہے۔ دوسرے مصرع میں آنا ہے۔ صاعقہ، شعلہ اور سیماب، تینوں میں آنا سے مطابقت نہیں۔ متداول دیوان میں آگرہ (پانچویں) ایڈیشن کا پہلا مصرع متن میں رکھنا چاہیے۔ صاعقہ ۔۔۔ الخ والا مصرع حواشی میں دکھایا جانا چاہیے۔

یہ کوئی اطمینان کی بات نہیں کہ غالب کے نام پر اتنے ادارے ہیں، لیکن نہ ابھی تک غالب پر تنقید ہوئی، اور نہ ان کے کلام کا صحیح متن کسی دیوان میں رکھا گیا۔ متن کی تدوین کے نام پر کاپی نویسی ہو رہی ہے۔ جن اغلاط کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ اگلے ایڈیشن میں، حوالے کے بغیر درست کر دی جاتی ہیں۔ یہ تو امانت کا عالم ہے اور دیانت کا!

پانچواں شعر متداول دیوان میں ہے:

جلاد سے ڈرتے ہیں، نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

حقیر کے خط میں دوسرا مصرع ہے:

سمجھے ہوئے ہیں ہم اسے جس بھیس میں جو آئے

گویا مختلف اوقات میں مرزا نے مختلف قراتیں رکھیں۔ یادگار میں حالی نے مصرعِ اولیٰ میں ڈرتے کی جگہ لڑتے، اور مصرع ثانی میں رنگ رکھا، تو ان کے ماخذ میں یہی الفاظ ہوں گے۔ کسی مرحلے پر غالب نے یہ قرأت بھی رکھی ہوگی، جو انھوں نے کسی کو خط میں لکھی، یا کسی نے اپنی یادداشت بیاض میں لکھی۔

۲۔ کوئی ویرانی سے ویرانی ہے

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

مصنّف موصوف کی نظر یادگار کے پہلے مصرع میں سے پر ٹھہری، اور انھوں نے متداول دیوان میں سی سے موازنہ کیا! نسخۂ شیرانی میں ورق ۱۸ الف پر یہ شعر اس املا سے لکھا ہے:

کوئی ویرانی سی ویرانی ہی

تہا میں صحرا میں کہ گھر یاد آیا

دوسرا مصرع معرضِ بحث میں نہیں ہے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ شاید حالی، اور کاتب (یقیناً) املا کے نئے اسلوب کے باوجود، کہیں کہیں یارِ مجہول اور یارِ معروف کا خلط کر جاتے تھے۔ عادتیں دیر میں چھوٹتی ہیں لیکن آج متنی تنقید کرنے والوں کو اُس عہد کے اسلوبِ املا سے تو واقف ہونا ہی چاہیے۔ یادگار میں سے نہیں سی ہی لکھا ہے، اور نسخۂ شیرانی میں ہی نہیں بلکہ سے لکھا ہے۔ اسی کو یارِ مجہول اور یارِ معروف کا خلط کہتے ہیں۔

یہ معروضات اس لیے پیش کی گئیں کہ آج ادبی تنقید اور متنی تحقیق بھی، کتابوں سے کتابیں بنانے والے گروہوں کی مہربانی سے باقاعدہ کاروبار ہیں۔ ذاتی منفعت نے علمی کاوش کو پسپا کر دیا ہے، اور تحقیق و تنقید باقاعدہ اجناس ہیں۔ ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کی تحریریں اگر متاثر کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی تو یہ مضمون تحریر کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ جب غالب کے خطوط کے مرتّب، ڈاکٹر خلیق انجم وہ رائے قائم کر سکتے ہیں، جس کا اظہار انھوں نے "غالب پر چند تحریریں" کے حرفِ آغاز میں کیا ہے، تو غیر تربیت یافتہ قاری نے حالی کے بارے میں نہ جانے کیا رائے قائم ہوگی۔ خلیق انجم نے اس کتاب کے حرفِ آغاز میں لکھا ہے:

"سعادت علی صدیقی صاحب نے ایسے ۴۹ اشعار کی نشاندہی کی ہے، جو یادگارِ غالب میں شامل ہیں، اور جن میں حالی نے تصرف کیا ہے۔ اسی طرح صدیقی صاحب نے، غالب کے وہ آٹھ اشعار نقل کیے ہیں، جو حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں شامل کیے تھے، اور جن میں تصرف کیا ہے۔ صدیقی صاحب نے دیوانِ غالب، مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، اور دیوان غالب مرتبہ مالک رام سے ان اشعار کا موازنہ کر کے، اختلافِ نسخ بیان کیے ہیں۔

اگرچہ سعادت صاحب کا یہ مضمون بہت چھوٹا ہے، لیکن غالبیات میں ایک اہم اضافہ ہے، اور حالی کو سمجھنے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ یہاں میں اپنی اس کوتاہی کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ اتنی اہم حقیقت کا علم مجھے سعادت صاحب کے اس مضمون سے ہوا۔"

ڈاکٹر خلیق انجم کو، اور ان کی طرح دوسروں کو، یہ مضمون پڑھنے کے بعد حالی کے بارے میں بدگمان نہ ہونا چاہیے۔ حالی ثقہ، سنجیدہ اور ایماندار شاعر، محقق، نقاد اور سوانح نگار تھے۔ شبلی نے حیات جاوید کو مدلل مداحی، حالی کی ضد سے زیادہ سرسید کی ضد میں قرار دیا تھا۔ شبلی کا فقرہ جتنا مشہور ہے، شاید اتنا ہی حقیقت سے دور بھی۔ حالی کے نظریات سے اختلاف کرنے کا حق یہ لائسنس کسی کو نہیں دیتا کہ ان کی دیانت پر شک کیا جائے۔

ان معروضات میں جو شہادتیں پیش کی گئی ہیں، ان سے حالی کے ثقہ اور معتبر ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں رائے قائم کرنے میں شاید مدد ملے۔

آخر میں شیونراین کے نام غالب کے ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء کے خط کے ایک اقتباس پر توجہ دلانا چاہتا ہوں:

> "صاحب! میں ہندی غزلیں بھیجوں کہاں سے۔ اردو دیوان چھاپے کے ناقص ہیں۔ بہت غزلیں اس میں نہیں ہیں۔ قلمی دیوان جو اتم اور اکمل تھے، وہ لٹ گئے۔ یہاں سب کو کہہ رکھا ہے کہ جہاں بکتا ہوا نظر آجائے، لے لو۔ تم کو بھی لکھ بھیجا۔ . . . ایک دوست کے پاس اردو کا دیوان چھاپے سے کچھ زیادہ ہے۔ اس نے کہیں کہیں سے مسودات متفرق بہم پہنچا لیے ہیں۔ چناں چہ پنہاں ہوگئیں، ویراں ہوگئیں، یہ غزل مجھ کو اُسی سے ہاتھ آگئی ہے۔ اب میں نے اس کو لکھا ہے، اور تم کو لکھا ہے، اور تم کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ خط لکھ کر رہنے دوں گا۔ جب اُس کے پاس سے ایک غزل یا دو غزل آجائے گی، تو اسی خط میں ملفوف کر کے بھیج دوں گا . . ."

یہ بات بعید از امکان نہیں کہ "یادگارِ غالب" اور اپنے مجموعۂ کلام کا مقدمہ لکھتے وقت یہ ذخیرہ حالی کو فراہم رہا ہو!

خلیق انجم

خطوطِ غالب میں طنز و مزاح

غالب سے قبل اردو زبان طبع زاد اور تخلیقی نثر سے محروم تھی۔ داستانوں اور مذہبی موضوعات پر بہت کچھ لکھا جا چکا تھا لیکن یہ نثر فارسی یا دوسری زبانوں سے ترجمہ تھی یا پھر دوسری زبانوں کے مذہبی اور داستانوی ادب پر مبنی تھی۔ ہاں اردو شاعری میں طنز و مزاح بھرپور شکل میں موجود تھا۔

زندگی کی پیچیدگیوں اور مشکلات اور ان کے تضادات کے عرفان سے ایک ایسا ادبی رویہ بھی جنم لیتا ہے جسے ہم طنز و مزاح کا نام دیتے ہیں۔

غالب کے سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے ابتدائی دور کے فارسی خطوط میں طنز و مزاح کی وہ چاشنی نہیں ہے جو آگے چل کر ان کے اردو مکتوبات کی ایک امتیازی خصوصیت قرار پائی۔ اس کا سبب شاید یہ ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے زندگی کے تجربات اور مشاہدات میں اضافہ ہوا۔ غالب کے فکر و خیال میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی گئی اور زندگی کے تلخ حقائق سے دوچار رہنے کی کیفیت کا احساس شدید ہوتا گیا۔ غالب تقریباً ساری زندگی مصائب و آلام سے نبرد آزما رہے۔ عمر کے آخری حصے میں ان کے بہترین ہتھیار طنز و مزاح تھے۔

مردانہ وار زندگی گزارنے کا جوہر اور سلیقہ شاید یہی ہے کہ انسان نہ تو زندگی کے حقائق سے منہ موڑ کر بیٹھ جائے۔ نہ صرف زندگی بھر ان کے خلاف دفاع میں مصروف رہے اور نہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہو کہ وہ اپنی اعلا حوصلگی سے ان کو شکست دے دے گا۔ یہ تلخیاں انسانی زندگی کا ایک ایسا حصہ ہیں جو زندگی بھر ہمارے ساتھ رہتا ہے اور جس کے لیے غالب نے مختلف اشعار میں یہ بات کہی ہے کہ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟ یا وہ مصرع ”شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک“

یادہ شعر:

نغمہ ہائے غم کو ہی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

غالب ساری زندگی پورے توازن کے ساتھ غم و آلام سے نبرد آزما رہے۔ جس کی مکمل تصویریں ہمیں ان کے طنز و مزاح میں نظر آتی ہیں۔ ان کے مصائب و آلام کی داستان اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب کہ وہ ابھی نوجوان تھے۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان کی مصیبتوں میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ پنشن کے مقدمے میں ان کی شکست، دو دفعہ کا حادثۂ اسیری، ۱۸۵۷ء کا ناکام انقلاب اور اس میں بے شمار دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کا قتل، جو باقی بچے تھے، ان کی مفارقت، زندگی بھر کی تنگ دستی اور بڑھاپے کی مسلسل بیماریاں غالب جیسے حساس انسان کو پاگل کر دینے یا کم سے کم انھیں دنیا سے متنفر کر دینے اور قنوطی بنانے کے لیے کافی تھیں لیکن زندگی کے آخری دنوں تک غالب کے ہوش و حواس اس لیے قائم رہے کہ ان میں غیر معمولی قوتِ ارادی تھی جس کی وجہ سے انھوں نے زندگی کے ساتھ مکمل طور پر مفاہمت کر لی تھی۔ یہ صرف ان کا خیال ہی نہیں بلکہ عقیدہ تھا کہ زندگی کا پودا حقیقی معنوں میں غم اور خوشی کی دھوپ چھاؤں میں ہی پروان چڑھتا ہے اور اِن میں بھی دھوپ یعنی غم کو ہی خوشی پر فوقیت اور برتری حاصل ہے۔ غالب کا ایک شعر ہے:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اس شعر میں محض شاعرانہ مضمون نہیں باندھا گیا بلکہ یہ غالب کی زندگی کی تفسیر ہے۔ غالب زندگی اور اُس کے مسائل کو ایک باشعور اور دانشور انسان کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، اسی لیے مسلسل مایوسیوں اور ناکامیوں سے تنگ آ کر انھوں نے زندگی سے فرار حاصل نہیں کیا۔ زندگی کے مصائب و آلام نے اُن کی فکر میں بالیدگی پیدا کی اور ان میں زندہ رہنے کا عزم اور حوصلہ جگایا اور وہ صبر و تحمل اور استقلال پیدا کیا جو ہر کڑی سے کڑی مصیبت کو ہنس کر جھیلنا سکھاتا ہے۔ ایسا ہی آدمی یہ شعر کہہ بھی سکتا تھا:

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

غالب نے "جانِ عزیز" کے لیے آرزو اور شکست آرزو، خوشی اور غم، کامیابی اور ناکامی کے درمیان زندہ رہنے کا سلیقہ سیکھ لیا تھا۔ اسی لیے تو وہ اپنے آپ کو "ہدفِ ستم ہائے روزگار" نہیں بلکہ "رہینِ ستم ہائے روزگار" کہتے ہیں۔ اس "ستم ہائے روزگار" سے ان کی زندہ دلی اور بذلہ سنجی اور ان کی حسِ مزاح ماند نہیں پڑی بلکہ اور تیکھی ہوتی چلی گئی۔ ایک حقیقی مزاح نگار کی طرح غالب زندگی کی ان تمام ناہمواریوں اور کھردرے پن پر سے ہنستے ہوئے برہنہ پا گزر جاتے ہیں، جن پر چلتے ہوئے پاؤں لہولہان ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے تضادات کا احساس اور عرفان ہی ان تضادات کی نشتریت بھی ہے اور اس نشتریت کا اندازہ غالب نے ہمیں اپنی تحریروں میں خوب خوب کرایا ہے۔ غالب کے مزاح میں پھکڑپن نہیں بلکہ زندگی کی بصیرتوں کا اور اس کی تلخ اور شیریں حقیقتوں کا، تلخ زیادہ اور شیریں کم، حوصلہ مندانہ اور برملا اظہار ہے۔ غالب کے طنز اور ان کی شوخیِ طبع دونوں کا سرچشمہ زندگی کی محرومیاں اور غم و آلام ہیں۔ اسی لیے ان کا مزاح توانا اور جاندار ہے۔

غالب خط لکھتے ہوئے کوشش کرتے ہیں کہ اپنی مصیبتوں کے بیان سے دوسروں کو بے وجہ پریشان نہ کریں۔ وہ اپنے دکھڑے بڑے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ میر سرفراز حسین کے نام خط میں اپنی تنہائی کا ماتم کرتے ہیں، ان دوستوں کا ذکر کرتے ہیں، جنھیں انقلابِ زمانہ نے ان سے جدا کر دیا۔ پھر ایک دم بات کا رُخ بدل دیتے ہیں:

> اللہ، اللہ، اللہ، ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں، میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا۔ سنو غالب! رونا پیٹنا کیا، کچھ اختلاط کی باتیں کرو۔"

غالب کی ساری زندگی اپنی انا کی نگہداری میں گزری۔ لیکن عملی زندگی میں جب غالب کی انا بادِ حوادث کے تھپیڑے کھاتی ہے تو غالب اپنا مذاق اڑانے سے بھی باز نہیں آتے۔ مرزا قربان علی بیگ خاں سالک کو اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

> یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر، کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں، رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں، یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں کہ لو، غالب کے ایک اور جوتی لگی، بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں، آج دور دور تک میرا جواب

نہیں۔ لے، اب تو قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہِ تعظیم، جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے "جنت آرام گاہ" و "عرش نشیمن" خطاب دیتے ہیں، چوں کہ یہ اپنے کو "شاہ قلمروِ سخن" جانتا تھا۔ "سقر مقر" اور "ہاویہ زاویہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے۔

آیئے، نجم الدولہ بہادر ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔ اجی، حضرت نواب صاحب کیسے، اوغلان صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے، کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا ہے۔ یہ بھی تو سونچا ہوتا، کہاں سے دوں گا۔"

اس خط میں غالب کی انا کے شیش محل کے چکنا چور ہونے کی جھنکار صاف سنائی دے رہی ہے۔ بہ ظاہر غالب نے اپنی کمزوریوں، معاشی بدحالیوں اور محرومیوں کا مضحکہ اڑایا ہے، لیکن اس بذلہ سنجی اور شوخیِ بیان کی تہہ میں ناقابلِ بیان ذہنی کرب اور محرومی کا شدید احساس ہے۔ یہ صرف غالب کی داستان نہیں بلکہ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد کے اس پورے طبقے کی داستان ہے، جو کبھی مسندِ اعتبار پر جلوہ افروز تھا، جسے سلجوقی اور افراسیابی ہونے پر ناز تھا، جسے اپنی ذہنی صلاحیتوں پر گھمنڈ تھا اور جواب قرض پر زندگی بسر کر رہا تھا۔

کامیاب ترین طنز وہی ہے جس کا شکار طنز نگار کی اپنی ذات ہو۔ کوئی دوسرا شخص ایسی بے رحمی سے غالب کا مذاق نہیں اڑا سکتا تھا جیسا کہ اس خط میں خود غالب نے اپنا مذاق اڑایا ہے۔

غالب نے نواب علاء الدین خاں علائی کے نام ایک خط میں اپنی غربت اور معاشی بدحالی کا اس طرح مضحکہ اڑایا ہے:

"بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا، اُدھر درباری مل کو مارا، ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر ایک پاس تمسک مہری موجود۔ شہد لگاؤ، چاٹو۔ نہ مول نہ سود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ

بالکل پھوپھی کے سر۔ بایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا۔ کبھی الور سے کچھ دلوا دیا۔ کبھی ماں نے کچھ آگرے سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے، سو روپے رام پور کے۔ قرض دینے والا ایک میرا مختار کار۔ وہ سود ماہ بہ ماہ لیا چاہے۔ مول میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا، چوکی دار جدا، سود جدا، مول جدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آگیا۔ گزارا مشکل ہوگیا۔ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں، کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہر درویش بہ جان درویش صبح کی تبرید؟ متروک، چاشت کا گوشت آدھا، رات کی شراب وگلاب موقوف، بیس بائیس روپیہ مہینا بچا۔ روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید وشراب کب تک نہ پیو گے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا کہ نہ پیو گے تو کس طرح جیو گے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینا پورا نہیں گزرا تھا کہ رام پور سے علاوہ وجہ مقرری اور روپیہ آگیا، قرض مقسط ادا ہو گیا۔ متفرق رہا خیر ہو۔ صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہو گئی، گوشت پورا آنے لگا۔"

برسات کا موسم ہے اور غالب کا مکان بوسیدہ ہے۔ ان کے کمرے کی چھت چھلنی ہو گئی ہے۔ غالب نے ایک خوبصورت استعارے کی مدد سے انداز بیان کو کیسا دلچسپ بنا دیا ہے۔ مرزا ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں،

مہینہ شروع ہوا۔ شہر میں سینکڑوں مکان گرے اور مہینہ کی نئی صورت، دن رات میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہ نکلیں۔ بالاخانے کا جو دالان میرے بیٹھنے اٹھنے، سونے جاگنے، جینے مرنے کا محل ہے؛ اگرچہ گرا نہیں، لیکن چھت چھلنی ہو گئی۔ کہیں لگن، کہیں چلمچی، کہیں اگالدان رکھ دیا۔ قلم دان، کتابیں اٹھا کر توشے خانے کی کوٹھری میں رکھ دیے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتی نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اب نجات ہوئی۔"

مزے لے لے کر اپنی پریشانیوں اور مصیبتوں کا ذکر کرنے کے لیے بہت بڑا کلیجا چاہیے۔ لیکن اپنی بات میں تاثیر محض کلیجے کے زخم بیان کر دینے سے نہیں پیدا ہو جاتی اس کے لیے کلیجا چیر کر دکھانا پڑتا ہے

اور غالب ہم کو اپنا طرف دار، بنانے کے لیے یہی تو کرتے ہیں۔
غالب کی صرف بڑھاپے کی تصویریں ہم تک پہنچی ہیں۔ ان تصویروں سے اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ جوانی میں وہ بہت وجیہہ اور خوبصورت آدمی رہے ہوں گے۔ غالب کی جوانی کا حلیہ انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے . . . . جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستایش کرتے تھے۔ اب جو کبھی وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔"

بنام مرزا حاتم علی مہر

بڑھاپے کا آغاز ہوا، نوجوانی کے ساتھ ساتھ چہرے اور جسم کا حسن بھی رخصت ہونے لگا، ڈاڑھی اور مونچھ میں بھی سفید بال آنے لگے۔ دانت ٹوٹنے شروع ہو گئے، غالب نے مرزا حاتم علی مہر کے نام خط میں بدلتے ہوئے حلیے کا نہ صرف مضحکہ اڑایا ہے بلکہ اپنی شخصیت کی انفرادیت کا بھی اظہار کیا ہے۔ غالب لکھتے ہیں:

"جب ڈاڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی، مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام، ملا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقا، بھٹیارہ، جولاہا، کنجڑا، منہ پر داڑھی، سر پر بال' فقیر نے جس دن داڑھی رکھی، اسی دن سر منڈوایا۔"

غالب کے ایک دوست مرزا حاتم علی مہر نے غالب کو خط لکھا اور خط میں کچھ ایسی باتیں لکھیں جن سے غالب کو اندازہ ہوا کہ مہر کو کسی معاملے میں اور غالباً عشق میں ناکامی ہوئی ہے۔ اس لیے غم واندوہ کا شکار ہیں۔ غالب خط کا جواب لکھتے ہیں اور اپنے خط کے پہلے فقرے ہی سے مہر کا موڈ بدلنے کی کوشش کرتے ہیں لکھتے ہیں:

"بندہ پرور! آپ کا خط پہنچا۔ آج جواب لکھتا ہوں۔ داد دینا کتنا شتاب لکھتا ہوں۔ مطالب مندرجہ کے جواب کا بھی وقت آتا ہے۔ پہلے تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ برابر کئی

خطوں میں تم کو غم واندوہ کا شکوہ گزار پایا ہے۔ پس اگر کسی بے درد پر دل آیا ہے تو شکایت کی کیا گنجائش ہے، بلکہ یہ غم تو نصیبِ دوستاں در خورِ افزائش ہے۔ بہ قولِ غالب علیہ الرحمہ

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

ہے ہے حسنِ مطلع:

بہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

افسوس ہے کہ اس غزل کے اور اشعار یاد نہ آئے اور اگر خدا نخواستہ باشد غمِ دنیا ہے تو بھائی ہمارے ہم درد ہو۔ ہم اس بوجھ کو، مردانہ اٹھا رہے ہیں۔ تم بھی اٹھاؤ، اگر مرد ہو۔ بقول غالب مرحوم

دلا یہ دردو الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے، نہ آہِ نیم شبی ہے"

غالب نے اس خط میں جو کچھ لکھا ہے، وہ مہر کو تسلی دینے کی باتیں نہیں یہ ان کا عقیدہ ہے۔ وہ واقعی بڑے سے بڑے غم کو مردانہ وار جھیل جاتے ہیں۔ اس خط کے آخر میں غالب نے جو شعر نقل کیا ہے۔ اس کا مفہوم انھوں نے اردو اور فارسی کے بہت سے اشعار میں ادا کیا ہے۔ اس مفہوم کا ایک اور شعر ہے۔

نغمہ ہائے غم ہی کو اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

دنیا میں شاید ہی کسی نے ایسے خطوط لکھے ہوں، جن میں کسی کی موت کی اطلاع دی گئی ہو یا جو تعزیت نامے ہوں اور ان میں مکتوب الیہ کا موڈ بدلنے کے لیے مزاح سے کام لیا گیا ہو۔ غالب کوشش کرتے تھے کہ ان کے خطوط غم آگیں مضامین سے زیادہ بوجھل نہ ہو جائیں۔ غالب کے ایک رشتہ دار اور عزیز دوست تھے علی بخش خاں۔ ممکن نہیں کہ غالب کو ان کی وفات کا صدمہ نہ ہوا ہو۔

علی بخش خاں کو دروغ گوئی کی عادت تھی اور بعض اوقات ان کی دروغ گوئی سے دلچسپ صورتِ حال پیدا ہو جاتی تھی۔ نواب علاء الدین خاں علائی کے نام ایک خط میں چند لفظوں میں علی بخش خاں کی وفات کا ذکر کر کے اس صدمے کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے علی بخش خاں کی دروغ گوئی کا ایک دلچسپ

واقعہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"علی بخش خاں مجھ سے چار برس چھوٹا تھا۔ میں ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا ہوں۔ اب کے رجب کے مہینے سے انہتر واں برس شروع ہوا ہے۔ اس نے چھیاسٹھ برس کی عمر پائی۔ نئی تقریر و تحریر کا آدمی تھا۔ اکبرآباد میں میور صاحب سے ملے۔ اثنائے مکالمت میں کہنے لگے کہ "یا چچا جان کے ساتھ جنرل لارڈ لیک صاحب کے لشکر میں موجود تھا اور ہولکر سے جو محاربات ہوئے ہیں، اس میں شامل رہا ہوں۔ بے ادبی ہوتی ہے، ورنہ اگر قبا و پیرہن اتار کر دکھلاؤں تو سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہے۔ جا بجا تلوار اور برچھی کے زخم ہیں۔ وہ ایک بیدار مغز اور دیدہ ور آدمی۔ اُن کو دیکھ دیکھ کر کہنے لگا کہ نواب صاحب ہم ایسا جانتے ہیں کہ تم جرنیل صاحب کے وقت میں چار یا پانچ برس کے ہوگے۔ یہ سن کر آپ نے کہا کہ درست، بجا ارشاد ہوتا ہے خدا ایشں بیامرزاد و بدین دروغ ہائے بے نمک مگیراد۔

(بنام نواب علاء الدین خاں علائی)

مرزا حاتم علی بیگ مہر کی محبوبہ کا انتقال ہو گیا۔ مہر نے خود غالب کو لکھا یا کہیں سے اطلاع ہو گئی غالب کو یہ بھی معلوم ہوا کہ مہر کو اپنی محبوبہ کی موت کا بہت صدمہ ہے۔ غالب خط میں محبوبہ کی موت کی تعزیت کرتے ہیں۔ مگر دیکھیے کس انداز میں۔ لکھتے ہیں:

"مرزا صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی ہے۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے یہ نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانعِ فسق و فجور نہیں، پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو، میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے، کیسی اشک فشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی آزادی کا شکر بجا لاؤ۔ غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو "چنا جان" نہ سہی "منا جان" سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی۔ اقامتِ جاودانی ہے

اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجا منہ کو آتا ہے۔ ہے، ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشم بد دور وہی ایک حور، بھائی ہوش میں آؤ۔ کہیں اور دل لگاؤ۔

زنِ نو کن، اے دوست در ہر بہار
کہ تقویم پارینہ ناید بکار"

میر کے نام غالب نے یہ تعزیت نامہ ایسے دلچسپ انداز میں لکھا ہے کہ اس میں تعزیت بھی ہو گئی، غم واندوہ کا اظہار بھی ہو گیا اور کچھ چھیڑ چھاڑ بھی۔ مقصد غالب کا یہ تھا کہ میرؔ کا غم کچھ ہلکا ہو اور ان میں صبر وضبط کا حوصلہ اور غم و آلام کی اس دنیا میں زندہ رہنے کا سلیقہ پیدا ہو۔

غالب کے ایک دوست تھے امراؤ سنگھ۔ ان کی دوسری بیوی کا بھی انتقال ہو گیا۔ غالباً مرزا تفتہ نے غالب کو لکھا کہ امراؤ سنگھ تیسری شادی کر رہے ہیں۔ غالب جواباً لکھتے ہیں۔

"امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ، اللہ ایک وہ ہیں کہ دوبار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے، اس کو سمجھاؤ کہ تیرے بچے کو میں پال لوں گا، تو کیوں بلا میں پھنستا ہے۔"

غالب کی ایک عزیزہ کا جو رشتے میں پھوپھی تھیں، انتقال ہو گیا۔ غالب منشی نبی بخش حقیر کو ان کی وفات کی اطلاع کس انداز میں دیتے ہیں۔

"بھائی صاحب!

میں بھی تمہارا ہمدرد ہو گیا۔ یعنی منگل کے دن اٹھارہ ربیع الاول کو شام کے وقت وہ پھوپھی، کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھیں، مر گئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے۔ تین پھوپھیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا۔ یعنی اس

مرحوم کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اس کے مرنے سے
میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج یک بار مر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

(بنام منشی نبی بخش حقیر)

طنز و مزاح سے کام لے کر غالب اپنے چھوٹے چھوٹے مسئلے حل کر لیا کرتے تھے۔ مرزا ہر گوپال تفتہ کا پہلا دیوان مرتب ہوا تو غالب نے اس کا دیباچہ لکھا، لیکن جب تفتہ نے دوسرا دیوان مرتب کر کے غالب سے دیباچے کی فرمائش کی تو غالب نے معذرت کر لی۔ منشی نبی بخش حقیر نے دیباچے کی سفارش کی تو غالب انھیں لکھتے ہیں:

"واللہ تفتہ کو میں اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں اور مجھ کو ناز ہے کہ خدا نے مجھ کو ایسا قابل فرزند عطا کیا ہے۔ رہا دیباچہ، تم کو میری خبر ہی نہیں۔ میں اپنی جان سے مرتا ہوں ؎

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل
کہاں کی رباعی، کہاں کی غزل

یقین ہے کہ وہ اور آپ میرا عذر قبول کریں اور مجھ کو معاف رکھیں۔ خدا نے مجھ پر روزہ نماز معاف کر دیا ہے کیا تم اور تفتہ ایک دیباچہ معاف نہ کرو گے۔"

(بنام منشی نبی حقیر)

غالب عام طور سے خیال رکھتے ہیں کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھ دیں، یا کوئی ایسا واقعہ یا لطیفہ بیان کر دیں جسے پڑھ کر مکتوب الیہ کچھ دیر کے لیے خوش ہو جائے۔ غالب نواب یوسف مرزا کے نام خط کے شروع میں یوسف مرزا کے لڑکے کی موت پر اظہار افسوس کرتے ہیں۔ پھر مولانا فضل حق کی دوام حبس کی سزا کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر سکہ کہنے کے اس الزام کا ذکر کرتے ہیں، جو ان پر عائد ہوا تھا اور جس کی وجہ سے انھیں بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ خط بہت بوجھل ہو گیا تھا، اس لیے غالب ایک ایسا واقعہ بیان کرتے ہیں، جس سے یوسف مرزا کا غم کچھ کم ہو سکے۔ لکھتے ہیں:

"ایک لطیفہ پرسوں کا سنو۔ حافظ ممو بے گناہ ثابت ہو چکے، رہائی پا چکے، حاکم

کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں۔ املاک اپنی ملنگتے ہیں۔ قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا ہے۔ صرف حکم کی دیر۔ پرسوں وہ حاضر ہیں، مسل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا۔ حافظ محمد بخش کون؟ عرض کیا کہ میں۔ پھر پوچھا کہ حافظ ممو کون؟ عرض کیا کہ میں اصل نام میرا محمد بخش ہے۔ ممو ممو مشہور ہوں۔ فرمایا یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم۔ حافظ ممو بھی تم۔ سارا جہاں بھی تم، جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں۔ مسل داخل دفتر ہوئی۔ میاں ممو اپنے گھر چلے آئے۔"

خواجہ بخش درزی بہت موٹے تھے۔ کسی کام سے غالب سے ملنے آئے دیکھیے غالب کس انداز میں یوسف مرزا کو اس واقعے کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ہاں صاحب، خواجہ بخش درزی کل سہ پہر کو میرے پاس آیا میں نے جانا کہ ایک ہاتھی کوٹھے پر چڑھ آیا۔ کہتا تھا کہ آغا صاحب کو میری بندگی لکھ بھیجنا۔"

غالب اپنے دوست خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کے نام خط میں لکھتے ہیں:

"حضرت وہ شعر بنگالی زبان کا ہو۔ ۱۸۲۹ء میں ضیافتِ طبعِ احباب کے واسطے کلکتے سے ارمغاں لایا ہوں۔ صحیح یوں ہے:

تم کہتے تھے رات میں آئیں گے سو آئے نہیں
قبلہ بندہ رات بھر اس غم سے کچھ کھائے نہیں"

غالب نے شہزادہ بشیر الدین کو اپنی تصویر ڈاک سے بھیجی۔ خط آیا کہ وہ تصویر نہیں ملی اس اطلاع پر غالب کا ردِ عمل اور اندازِ بیان ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں۔

"آج منگل، ۱۶ جون ۱۸۶۷ء بارہ بجے عنایت نامہ آیا۔ سرنامہ دیکھ کر سفیدۂ صبح مراد سمجھا ننگا ایک چھوٹی سی خس کی ٹٹی کے بیٹھا ہوا تھا خط پڑھ کر وہ حال طاری ہوا کہ اگر ننگا نہ ہوتا تو گریبان پھاڑ ڈالتا۔ اگر جان عزیز نہ ہوتی تو سر پھوڑتا اور کیوں کر اس غم کی تاب لاتا کہ میں نے اپنے کو کھچوا کر بصورتِ تصویر آپ کی خدمت میں بھیجا۔ لفافہ انگریزی، اقبال نشان شہاب الدین خاں سے لکھوا کر بیرنگ ارسال کیا۔ اس فرمان میں اس لفافے کی رسید نہ پائی۔ ظاہراً ڈاک پر ڈاکو گرے اور میرے پیکرِ بے روح کے

ٹکڑے اڑا دیے۔ بے تاب ہو کر یہ عبارت حضرت کی بھیجی ہوئی، لفافے میں لپیٹ کر روانہ کی۔ اب جب آپ اور لفافہ بھیجیں گے تو مطالب باقی کا جواب مع اوراقِ اشعار بھیجوں گا۔"

ص ۵۳،

نواب انوارالدولہ سعدالدین خاں بہادر شفق کے نام خط ایک خط میں تقریباً یہی اندازِ بیان ملاحظہ ہو:

"پیر و مرشد!
بارہ بجے تھے، میں ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا کہ آدمی نے آکر خط دیا۔ میں نے کھولا، پڑھا، بھلے کو انگرکھا یا کرتا گلے میں نہ تھا۔ اگر ہوتا تو میں گریبان پھاڑ ڈالتا۔ حضرت کا کیا جاتا، میرا نقصان ہوتا۔"

غالبؔ کی ایک ملازمہ تھیں، بی وفادار۔ بہت دلچسپ شخصیت کی مالک۔ علائی کے نام ایک خط میں غالبؔ نے ان کی شخصیت کا دلکش خاکہ کھینچا ہے۔ لکھتے ہیں۔

بی وفادار، جن کو تم کچھ اور بھائی خوب جانتے ہیں۔ اب تمہاری پھوپھی نے انھیں وفادار بیگ بنا دیا ہے۔ باہر نکلتی ہیں، سودا تو کیا لائیں گی مگر خلیق اور ملنسار۔ رستہ چلنوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب وہ محل سے نکلیں گی، ممکن نہیں کہ اطرافِ نہر کی سیر نہ کریں گی۔ ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں گی۔ ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی۔ بی کو لے جا کر نہ دکھائیں۔ اور نہ کہیں کہ: "یہ پھول تائی چچا کے بیٹے کی کائی کے ایں" شرح (تمہارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں)

میر مہدی مجروح نے اپنے ایک دوست حکیم میر اشرف کو غالبؔ کے پاس ملاقات کے لیے بھیجا غالبؔ مجروح کو اس ملاقات کا حال کس دلچسپ انداز میں لکھتے ہیں:

"دو خط تمہارے بہ سبیل ڈاک آئے۔ کل دوپہر ڈھلے ایک صاحب اجنبی، سانولے سلونے، ڈاڑھی منڈے، بڑی بڑی آنکھوں والے تشریف لائے۔ تمہارا خط دیا صرف ان کی ملاقات کی تقریب میں تھا۔ بارے ان سے اسم شریف پوچھا گیا۔ فرمایا "اشرف علی" قومیت کا استفسار ہوا معلوم ہوا سید ہیں۔ پیشہ پوچھا۔ حکیم نکلے، یعنی حکیم میر اشرف علی، میں ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ خوب آدمی ہیں اور کام کے آدمی ہیں۔"

کچھ ہی دن بعد غالب نے انہی حکیم میر اشرف علی کے بارے میں لکھا:

"کل حکیم میر اشرف علی آئے تھے۔ سر منڈا ڈالا ہے۔ مُحَلِّقِینَ رُؤسَکُم پر عمل کیا ہے میں نے کہا کہ سر منڈوایا ہے تو داڑھی رکھو۔ کہنے لگے دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم۔ واللہ ان کی صورت قابل دیکھنے کے لیے۔"

ایک دفعہ ڈاکیے نے غالب کو کپتان ہونے کی مبارک دی۔ اس کی داستان غالب کی زبانی سنیے۔ نواب انوار الدولہ شفق کو لکھتے ہیں:

ایک لطیفہ نشاط انگیز سنیے۔ ڈاک کا ہرکارہ جو بلّی ماروں کے محلے کے خطوط پہنچاتا ہے۔ حویلی میں آکر اس نے داروغہ کو خط دیا اور اس نے خط دے کر مجھ سے کہا کہ ڈاک کا ہرکارہ بندگی عرض کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مبارک ہو آپ کو جیسا کہ دلّی کے بادشاہ نے نوابی کا خطاب دیا تھا۔ اب کالپی سے خطاب "کپتانی" کا ملا۔ حیران، کہ یہ کیا کہتا ہے۔ سرنامے کو غور سے دیکھا۔ کہیں قبل از اسم مخدوم نیاز کیشاں" لکھا تھا۔ اس قرم ساق نے اور الفاظ سے قطع نظر کرکے "کیشاں" کو "کپتان" پڑھا۔

دوجانے میں غالب کے کسی سسرالی عزیز کی شادی تھی۔ غالب کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ غالب نہیں پہنچے۔ غالب کے وہاں نہ جانے کی غالباً کوئی وجہ بھی تھی۔ علائی نے خط لکھ کر شکایت کی تو غالب پھٹ پڑے۔ لکھتے ہیں۔

"دوجانے میں میرا انتظار اور میرے آنے کا تقریب شادی پر مدار، یہ بھی شعبہ ہے انھی ظنوں کا، جس سے تمہارے چچا کو گمان ہے مجھ پر جنوں کا۔ جاگیردار میں نہ تھا کہ ایک جاگیردار مجھ کو بلاتا۔ گویّا میں نہ تھا کہ اپنا ساز و سامان لے کر چلا جاتا۔ دوجانے جا کر شادی کماؤں اور پھر اس فصل میں کہ دنیا کرۂ نار ہو۔ لوہارو بھائی کے دیکھنے کو نہ جاؤں اور پھر اس موسم میں کہ جاڑے کی گرمی بازار ہو۔"

"برہان قاطع" کے ادبی معرکے میں میرٹھ کے رحیم بیگ نے غالب کے خلاف ایک رسالہ "ساطع برہان" لکھ کر شائع کیا تھا۔ اس لیے غالب ان سے بہت ناراض تھے۔ "ساطع برہان" کے جواب میں غالب نے "نامۂ غالب" نام سے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی۔ اس کتاب کا ذکر کرتے ہوئے

عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہیں۔

نامہ غالب کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا، سن لیتا ہے، عبارت لکھ نہیں سکتا لکھوا دیتا ہے بلکہ اس کے ہم وطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوتِ علمی بھی نہیں رکھتا، اوروں سے مدد لیتا ہے اہلِ دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے۔ اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وائے اس ہیچ پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجب عزّ و وقار ہو۔

(بنام عبدالرزاق شاکر)

ایک دفعہ غالب رام پور سے واپسی پر میرٹھ ٹھہرے۔ یہاں عظیم الدین احمد نامی ایک شخص نے غالب کا دیوانِ اردو شائع کرنے کی ذمہ داری لے لی۔ غالب نے دلی آکر دیوان عظیم الدین کو بھیج دیا۔ نجانے کیوں عظیم الدین نے خاموشی اختیار کر لی۔ دیوان واپس کیا نہ اسے چھاپا۔ غالب ایک خط میں اس واقعے کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"دیوان کا چھاپا کیسا؟ وہ شخص ناآشنا، موسوم بہ عظیم الدین جس نے مجھ سے دیوان منگا بھیجا، آدمی نہیں ہے، بھوت ہے، پلید ہے، غول ہے، قصہ مختصر، سخت نامعقول ہے۔ مجھ کو اس کے طور پر انطباعِ دیوان نامطبوع ہے۔ اب میں اس سے دیوان مانگ رہا ہوں اور وہ نہیں دیتا، خدا کرے ہاتھ آجائے، تم دعا مانگو۔ زیادہ کیا لکھوں۔"

غالب خط میں اِدھر اُدھر کی بے مقصد باتیں پسند نہیں کرتے۔ ان کے خط ہمیشہ مختصر ہوتے اور ان میں مطلب کی بات کہی جاتی۔ میر مہدی مجروح نے ایک خط میں طوالت سے کام لیا اور مطلب کی کوئی بات نہیں کی۔ غالب غصے میں مجروح کو جواب دیتے ہیں:

"واہ حضرت! کیا خط لکھا ہے، اس خرافات کے لکھنے کا فائدہ؟ بات اتنی ہے کہ میرا پلنگ مجھ کو ملا، میرا بچھونا مجھ کو ملا، میرا حجام مجھ کو ملا، میرا بیت الخلا مجھ کو ملا، رات کو وہ شور کوئی آئیو، کوئی آئیو ــــ فرد ہو گیا۔ میری جان بچی، میرے آدمیوں کی جان بچی۔ لاحول ولا قوۃ

(بنام میر مہدی مجروح)

مرزا تفتہ اصلاح کے لیے اپنا کلام غالب کو بھیجتے رہتے تھے۔

غالب نے کئی بار معذرت کی، لیکن تفتہ نہیں مانے۔ دیکھیے غصے میں کیسے آگ بگولا ہو رہے ہیں۔ تفتہ کو لکھتے ہیں۔

"لاحول ولا قوہ! کس ملعون نے بہ سبب ذوقِ شعر، اشعار کی اصلاح منظور رکھی؟ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے تو بہ طریق قہر درویش بجانِ درویش لکھا تھا۔ جیسے اچھی جورو بُرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے۔ میرا تمہارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔"

اگر کوئی شخص غالب کا پتا بہت تفصیل سے لکھ دیتا، یا غالب سے ان کا پتا پوچھ لیتا، تو ان کی انا کو بہت ٹھیس پہنچتی پوچھنے والے سے کہتے کہ میرا نام اور دلی لکھ دو، خط پہنچ جائے گا۔ ایک دفعہ ان کے قریبی رشتہ دار اور شاگرد مرزا علاء الدین علائی نے خط میں ان کا پتا پوچھ لیا غالب کو علائی سے یہ امید نہیں تھی۔ غصے سے آگ بگولا ہو گئے۔ لکھتے ہیں:

"سنو صاحب! حسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے کہ وہ امرد کو دو چار برس گھٹا کر دیکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ جوان ہے لیکن بچہ سمجھتے ہیں۔ یہ حال تمہاری قوم کا ہے۔ قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور متحقق ہے اور تم صاحب بھی جانتے ہو مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرو اور اس مسخرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھ لو تم کو چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلی میں رہتا ہوں۔ ہزار ہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ نہیں لکھتے۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوط فارسی اور انگریزی۔ یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے صرف شہر کا نام اور میرا نام، یہ سب مراتب تم جانتے ہو۔ اور ان خطوط کو تم دیکھ چکے ہو۔ اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ اپنا مسکن بتا۔"

نواب انور الدولہ شفق نے غالب کا پتا ذرا تفصیل سے لکھ دیا۔ اب دیکھیے گل افشانیِ گفتار لکھتے ہیں:

"خط کا عنوان دیکھ کر میں سمجھا کہ شاید شہر کے محلوں، محلات کی کوئی فہرست یا پڑوسیوں
کے جمع وخرچ کا حساب ہے۔"

مرزا قتیل کی وجہ سے غالب کو کلکتے میں خاصی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اگرچہ قتیل کے انتقال کو عرصہ ہو چکا تھا۔ اور غالب کی ان سے ملاقات بھی نہیں ہوئی پھر بھی غالب ساری زندگی قتیل کی مخالفت کرتے رہے۔ بلکہ نوبت یہاں تک آگئی کہ ان کا نام آتے ہی بھڑک جاتے اور کبھی کبھی تو گالیوں پر اتر آتے۔ مرزا تفتہ نے "یک زماں" کے بارے میں غالب سے استفسار کیا۔ غالب جھلاکر جواب دیتے ہیں۔

"سنو میاں! میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادیِ فارسی دانی میں دم مارتے ہیں وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں۔ جیسا وہ گھاگھس، الو عبدالواسع ہانسوی لفظ "نامراد" کو غلط کہتا ہے اور یہ الو کا پٹھا قتیل "صفوت کدہ وشفقت کدہ" و "نشتر کدہ" کو اور "ہمہ عالم" و "ہمہ جا" کو غلط کہتا ہے۔ کیا میں بھی ویسا ہی ہوں جو "یک زماں" کو غلط کہوں گا؟"

مرزا تفتہ سے کچھ الفاظ پہ بحث ہو گئی۔ ان الفاظ پر گفتگو کر کے غالب لکھتے ہیں:

"یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں۔ وہ حق ہے۔ کیا آگے آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے۔"

مرزا گوپال تفتہ اپنی تصانیف چھاپنے پر تلے ہوئے تھے۔ غالب کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ انھوں نے تفتہ کو سمجھایا بھی، مگر وہ باز نہیں آئے "مراۃ الصحائف" چھپ چکی تھی اور "سنبلستاں" زیر طبع تھی۔ تفتہ نے غالب کو اس کی اطلاع دی۔ انھیں غصہ آگیا، لیکن قلم سنبھال کر دل کی بات کہہ ہی دی مرزا تفتہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"صاحب!
تمہارا خط میرٹھ سے آیا "مراۃ الصحائف" کا تماشا دکھیا۔ "سنبلستان" کا چھاپا خدا تم کو مبارک کرے۔ اور خدا ہی تمہاری آبرو کا نگہبان رہے۔ بہت گزر گئی تھوڑی رہی اچھی گزری ہے۔ اچھی گزر جائے گی۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ عرفی کے قصائد کی شہرت سے

عرفی کے کیا ہاتھ آیا۔ جو میرے قصائد کے اشتہار سے مجھ کو نفع ہوگا؟ سعدی نے "بوستاں" سے کیا پھل پایا، جو تم "سنبلستاں" سے پاؤ گے؟ اللہ کے سوا جو کچھ ہے، موہوم و معدوم ہے۔ نہ سخن ہے، نہ سخنور ہے، نہ قصیدہ ہے نہ قصد ہے۔"

غالب کو جب غصہ آتا ہے تو گل افشانیِ گفتار میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

شہاب الدین خاں ثاقب اور غلام نجف خاں غالب کے فارسی دیوان کی نقل کرا رہے تھے انھوں نے دیوان میں کچھ ایسے اشعار بھی شامل کر دیے، جو غالب کے نہیں تھے۔ غالب کو جب اس کا علم ہوا تو انھوں نے شہاب الدین ثاقب کو خط میں لکھا:

"بھائی شہاب الدین خاں، واسطے خدا کے یہ تم نے اور حکیم غلام نجف خان نے میرے دیوان کا کیا حال کر دیا ہے۔ یہ اشعار جو تم نے بھیجے ہیں خدا جانے کس ولد الزنا نے داخل کر دیے ہیں۔ دیوان تو چھاپے کا ہے۔ متن میں اگر یہ شعر ہوں تو میرے ہیں اور اگر حاشیے پر ہوں تو میرے نہیں ہیں۔ بالفرض اگر یہ شعر متن میں پائے بھی جاویں تو یوں سمجھنا کہ کسی ملعون نے اصل کلام کو چھیل کر یہ خرافات لکھ دیے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس مفسد کے یہ شعر ہیں، اس کے باپ پر اور دادا اور پردادا پر لعنت اور ہفتاد پشت تک ولد الحرام۔ اس کے سوا اور کیا لکھوں۔ ایک تو لڑکے میاں غلام نجف خاں اور دوسرے تم۔ میری کم بختی بڑھاپے میں آئی کہ میرا کلام تمہارے ہاتھ پڑا۔

(بنام شہاب الدین ثاقب)

غالب بہت دلچسپ انداز میں حسنِ طلب سے کام لیتے ہیں۔ انھیں غالباً بیکانیر کی مصری بہت پسند تھی اور جانتے تھے کہ نواب علاء الدین خاں علائی کے ہاں اعلیٰ درجے کی مصری ہوتی ہے اب ان کا حسنِ طلب ملاحظہ ہو۔ علائی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"خصّی بکروں کے گوشت کے قلیے، دوپیازے، پلاؤ، کباب، جو کچھ تم کھا رہے ہو، مجھ کو خدا کی قسم اگر اس کا کچھ خیال بھی آتا ہے۔ خدا کرے بیکانیر کی مصری کا کوئی ٹکڑا تم کو میسر نہ آیا ہو۔ کبھی یہ تصور کرتا ہوں کہ میر جان صاحب اس مصری کے ٹکڑے

چار ہے ہوں گے تو یہاں میں رشک سے اپنا کلیجا چابنے لگتا ہوں۔

اس حسنِ طلب کا نتیجہ یہ ہوا کہ علائی نے کچھ ہی دن بعد ایک تھلیا میں سوا دو سیر مصری بھیج دی۔

غالب کے ایک شاگرد میر احمد حسین میکش کے ہاں خرمے بنے۔ نہ جانے میکش کے جی میں کیا آئی کہ ان خرموں کا قطعۂ تاریخ کہا اور اصلاح کے لیے فوراً غالب کو بھیج دیا۔ غالب کو جب خرمے بننے کا علم ہوا تو ان کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی۔ دین محمد، میکش کا خط لائے تھے غالب نے انھی کے ہاتھ جواب بھجوایا۔ جواب میں لکھا:

بھائی میکش، آفریں، ہزار آفریں۔ تاریخ نے مزا دیا۔ خدا جانے وہ خرمے کس مزے کے ہوں گے، جن کی تاریخ ایسی ہے۔ دیکھو صاحب

قلندر ہر چہ گوید، دیدہ گوید

تاریخ دیکھی اس کی تعریف کے، خرمے کھائیں گے، اس کی تعریف کریں گے۔ کہیں یہ تمہارے خیال میں نہ آوے کہ یہ حسنِ طلب ہے کہ ناحق تم دین محمد غریب کو دوبارہ تکلیف دو۔ ابھی رقعہ لے کر آیا ہے۔ ابھی خرمے لے کر آوے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ اگر یہ فرضِ محال تم یوں ہی عمل میں لاؤ گے اور میاں دین محمد صاحب کے ہاتھ خرمے بھجواؤ گے تو ہم بھی کہیں گے۔ تازہ شے بہتر بارہ سے بہتر۔

کوئی صاحب تھے، جن سے غالب اور ان کے شاگرد مرزا ہر گوپال تفتہ کو کسی ادبی معاملے میں اختلاف تھا۔ غالب نے اس سلسلے میں ان صاحب کو خط لکھا اور پھر تفتہ کے نام خط میں اس خط کا ذکر کیا۔ ایک محاورہ کیا بے تکلف اور شگفتہ انداز میں استعمال کیا ہے۔ غالب لکھتے ہیں:

"بہر حال وہ جو میں نے خاقانی کا شعر لکھ کر اس کو بھیجا۔ اس کی ماں مرے اگر میرے اس خط کا جواب لکھا ہو۔"

غالب انسانی رشتوں کا بہت احترام کرتے تھے۔ انھیں ہمیشہ یہ خیال رہتا تھا کہ ان سے کوئی ایسی بات نہ ہو، جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ اسی طرح اگر کوئی دوست یا شاگرد ایسی بات کرتا، جس سے غالب کو ذہنی تکلیف ہوتی تو وہ طنز و ظرافت کے پردے میں اپنی ناراضگی یا ناپسندیدگی کا

اظہار کر دیتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ غالبؔ کسی پر برس پڑے ہیں۔ لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے۔ کسی نے نواب انورالدولہ شفقؔ کو غالبؔ کی وفات کی غلط خبر دے دی۔ شفقؔ نے بہت دن سے غالبؔ کو خط نہیں لکھا تھا۔ جب یہ خبر غلط ثابت ہو گئی تو انھوں نے غالبؔ کو خط لکھا اور اس میں اس افواہ کا ذکر کر دیا۔ اس واقعے پر غالبؔ کا حسنِ اظہار ملاحظہ ہو:

"آپ کی پرسش کے کیوں نہ قربان جاؤں کہ جب تک میرا مرنا نہ سنا، میری خبر نہ لی۔"

علی گڑھ کے صدر امین، شیخ مومن علی دہلی آئے ہوئے تھے۔ اور غالب سے ملے بغیر واپس چلے گئے۔ شیخ صاحب کی اس حرکت سے غالبؔ کی اَنا کو ٹھیس پہنچی۔ علی گڑھ کے اپنے ایک دوست منشی نبی حقیر کو غالب لکھتے ہیں:

"اگر آپ سے (شیخ مومن علی کی) ملاقات ہو تو فرمایئے گا کہ اسداللہ روسیاہ بعد سلام عرض کرتا ہے کہ وہ رتبہ میرا تو کہاں کہ میں آپ سے شکوہ کروں کہ مجھ سے مل کر آپ نہ گئے، مگر ہاں افسوس کرتا ہوں کہ مجھ کو خبر کیوں نہ ہوئی، ورنہ تودیع کو پہنچتا۔"

غالبؔ اپنے چھوٹوں سے بھی چھیڑ چھاڑ کر کے دل کو بہلاتے رہتے۔ جس شخص کے سر سے موجِ خوں گزر گئی ہو۔ اس کے لیے ہنسنے ہنسانے کی باتوں کے لیے واقعی بڑا حوصلہ چاہیے۔ میرن صاحب کی سسرال غالبؔ کے گھر کے پاس ہی تھی۔ میرن صاحب دلّی سے پانی پت روانہ ہوئے۔ رخصت ہونے کے واقعات غالبؔ کی زبانی سنیے۔ میر مہدی مجروحؔ کو لکھتے ہیں:

"یہاں ان کی سسرال میں قصے کیا کیا نہ ہوئے۔ ساس اور سالیوں نے اور بی بی نے آنسوؤں کے دریا بہا دیے۔ خوش دامن صاحبہ بلائیں لیتی ہیں۔ سالیاں کھڑی ہوئی دعائیں دیتی ہیں۔ بی بی مانند صورتِ دیوار چپ، جی چاہتا ہے چیخنے کو مگر ناچار چپ۔ وہ غنیمت تھا کہ شہر ویران، نہ کوئی جان نہ پہچان۔ ورنہ ہم سائے میں قیامت برپا ہو جاتی۔ ہر ایک نیک بخت اپنے گھر سے دوڑی آتی۔ امام ضامن علیہ السلام کا روپیہ بازو پر باندھا گیا۔ گیارہ روپے خرچ راہ دیے، مگر ایسا جانتا ہوں کہ میرن صاحب اپنے جد کی نیاز کا روپیہ راہ ہی میں اپنے بازو پر سے کھول لیں گے اور تم سے

صرف پانچ روپے ظاہر کریں گے۔ اب سچ جھوٹ تم پر کھل جائے گا۔ یہی ہو گا کہ میرن صاحب تم سے بات چھپائیں گے۔ اس سے بڑھ کر ایک بات اور ہے۔ اور وہ محلِ غور ہے۔ اس عزیب نے بہت سی جلیبیاں اور تودۂ قلاقند ساتھ کر دیا ہے اور میرن صاحب نے اپنے جی میں یہ ارادہ کر لیا ہے کہ جلیبیاں راہ میں چٹ کریں گے۔ اور قلاقند تمہاری نذر کر کر تم پر احسان دھریں گے۔ بھائی میں دلی سے آیا ہوں، قلاقند تمہارے واسطے لایا ہوں، زنہار باور نہ کیجیو۔ مال مفت سمجھ کر لے لیجو۔ کون گیا ہے؟ کون لایا ہے؟ کلو ایاز کے سر پر قرآن رکھو۔ کلیان کے ہاتھ گنگا جلی دو۔ بلکہ میں بھی قسم کھاتا ہوں کہ ان تینوں میں سے کوئی نہیں لایا۔"

غالب کی ذاتی زندگی تو رنج والم کی ایک داستان تھی ہی، ان کا پورا معاشرہ بھی غم اور افسردگی کا شکار تھا قتل، غارت گری، لوٹ مار اور ان سب کا نتیجہ بربادی، ویرانی اور بے رونقی ، ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب میں غالبؔ موت کا شکار ہونے سے بچ گئے، لیکن انھیں موت سے بڑی سزا ملی، یعنی ان جیسے حساس انسان کو ان تمام خونی واقعات کا پہلے خاموش تماشائی اور پھر اجڑی ہوئی دلی کا ماتم دار بننا پڑا۔ اپنے ماحول اور معاشرے کی بربادی اور تباہی پر غالبؔ خون کے آنسو روئے ہیں لیکن انھوں نے صبر و ضبط سے بھی کام لیا ہے۔ حادثات کی ان تند و تیز آندھیوں میں بھی انھوں نے اپنی شوخی و ظرافت اور حسِ مزاح کے چراغ کو بجھنے نہیں دیا۔

غالبؔ زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں کو جس شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں اتنی ہی جرأت مندی سے اُن کے ساتھ جینے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ اور جینے کا یہی حوصلہ وہ اپنے ان احباب کے اندر پیدا کرنا چاہتے ہیں، جن سے وہ اپنے خطوط میں مخاطب ہیں۔ آج جب کہ خطوطِ غالب اردو نثر کا ایک گراں قدر سرمایہ بن چکے ہیں، خطوطِ غالب کے مخاطب بھی صرف وہ لوگ نہیں رہے۔ جن کے نام یہ خطوط ہیں۔ بلکہ آج خطوط غالب کا ہر قاری ان کا مخاطب ہے۔ اور غالبؔ کی حوصلہ مندی ان سب کی مشترکہ میراث۔

URDU ADAB

QUARTERLY

EDITOR

Khaliq Anjum

ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)
NEW DELHI

سہ ماہی

اردو ادب

انجمن
ترقی
اردو
ہند

اردو ادب

۱۹۹۱ء

شمارہ (۳)

اردو ادب

ایڈیٹر

خلیق انجم

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دلّی

۱۹۹۱ء شمارہ (۳)

سالانہ قیمت پینتالیس روپے
فی شمارہ پندرہ روپے

پرنٹر پبلشر ایم۔ حبیب خاں نے نشر آفسٹ پرنٹرس دلّی میں چھپوا کر انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دلّی سے شایع کیا۔

ترتیب

عنوان	مصنف	صفحہ
حرف آغاز	خلیق انجم	۷
علامہ اقبال سے منسوب کچھ خطوط ایک مطالعہ	کمال احمد صدیقی	۹
مول چند منشی کی ایک نادر تصنیف	ڈاکٹر گوہر نوشاہی	۷۱
بہار کی دانش گاہوں میں اردو تحقیق (آغاز سے ۱۹۹۰ تک)	ڈاکٹر سید شاہد اقبال	۹۰

حرف آغاز

اردو ادب ۱۹۹۱ء کا یہ تیسرا شمارہ ہے۔ اس میں تین مقالے شامل ہیں۔ پہلا مقالہ "علامہ اقبال سے منسوب کچھ خطوط" کمال احمد صدیقی صاحب نے تحریر کیا ہے کمال احمد صاحب شاعر، نقاد اور محقق ہیں۔ ان کی تحقیقی صلاحیتوں کا اظہار غالباً پہلی بار اس وقت ہوا جب انھوں نے "بیاض غالب" کے نام سے کتاب شایع کی جس میں غالب کے "نسخۂ امروہہ" کا تفصیلی جایزہ لیا گیا ہے۔ اور جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ یہ مخطوطہ جعلی ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ لمعہ حیدر آبادی کے نام اقبال کے خطوط جعلی ہیں۔ اس مقالے کی اشاعت سے بعض پیشانیوں پر بل پڑیں گے لیکن اس جعل سازی کا انکشاف کرنا محقق اور مدیر دونوں کی ذمہ داری ہے۔ اگر کوئی حقیقت ان دونوں کے سامنے آئے اور وہ کسی مصلحت سے اس کو چھپالیں تو اس سے بڑا اور کوئی جرم نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مقالہ شایع کیا جارہا ہے۔

دوسرا مقالہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا "مول چند منشی کی ایک نادر تحریر" ہے۔ مول چند اپنے زمانے کے ایک ممتاز شاعر تھے مگر افسوس ہے کہ تاریخ ادب اردو نے ان کے ادبی کارناموں کو یکسر فراموش کر دیا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ کچھ دنوں سے ہمارے محققین نے ان کی طرف توجہ کی ہے اور ان پر کچھ تحقیقی مضامین شایع ہوئے ہیں لیکن ابھی تک منشی مرحوم شاہ نصیر دہلوی جیسے صف اول کے شاعر کے شاگرد اور شاہ عالم آفتاب سے متوسل تھے۔ ۱۸۳۲ء میں ان کا انتقال ہوا۔ عہد شاہجہانی میں توکل بیگ بن تولک بیگ حسینی نے شاہنامہ فردوسی کا "تاریخ دلکشائے شمشیر خانی" کے نام سے شاہنامہ فردوسی

سکا خلاصہ کیا تھا۔ اس خلاصے کو شمشیر خانی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ مول چند مرحوم نے اس خلاصے کا منظوم ترجمہ کیا جس کا ڈاکٹر نوشاہی نے تعارف کرایا ہے۔ میں نے مول چند منشی کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ معلومات بھی گوہر نوشاہی صاحب کی فراہم کردہ ہیں۔

بہار کی یونیورسٹیوں میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے جو مقالے منظور ہو چکے ہیں شاہد اقبال صاحب نے ان کی فہرست اس طرح مرتب کر دی ہے کہ اس میں مقالوں کے موضوعات، مقالہ نگاروں اور نگراں حضرات کے نام شامل ہیں۔ مقالہ نگار کو کس سن میں پی۔ ایچ۔ڈی کی ڈگری دی گئی تھی۔ تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ فہرست بہت اہم ہے۔

خلیق انجم

اڈیٹر

کمال احمد صدیقی

علامہ اقبال سے منسوب کچھ خطوط
ایک مطالعہ

شاعر (بمبئی) کے شاندار اقبال نمبر جلد اول (۱۹۸۸) میں اکبر رحمانی کے مرتب کیے ہوئے "انتخاب کلام لمعہ حیدر آبادی" اور موصوف ہی کے مضمون "اقبال بنام لمعہ حیدر آبادی" سے ذہن کو جھٹکا لگا تھا۔ ۸ر جولائی کے ہماری زبان میں موصوف کا مضمون "عکسی مکتوب اقبال بنام لمعہ حیدر آبادی کا تنقیدی جائزہ" پڑھنے کے بعد مندرجہ صدر عنوانوں کے تحت چھپنے والے دونوں مضامین کی طرف دھیان گیا۔ ماسٹر اختر کی معرکتہ الآرا تصنیف "اقبال کے کرم فرما" کی طرف بھی دھیان گیا، جس میں انھوں نے بڑی عرق ریزی سے چھان بین کی ہے۔ اور دیدہ وری کا ثبوت دیا ہے۔

ہماری زبان کے ایڈیٹر، ڈاکٹر خلیق انجم خطوط کے متن اور عکس کی اہمیت سے واقف ہیں۔ انھوں نے "غالب کے خطوط" مرتب کیے ہیں۔ تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ انھوں نے بنیادی نسخوں کے متون کے ساتھ ساتھ، دوسرے نسخوں میں پائے جانے والے اختلافِ نسخ کی نشاندہی کی ہے۔ اور جن خطوں کے عکس فراہم ہیں، وہ بھی اس تالیف میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ مصنف کے قلم سے لکھی ہوئی عبارت سے بڑھ کر، کوئی اور عبارت مستند نہیں ہوتی۔ ہماری زبان میں اقبال کے عکسی مکتوب کا ذکر ہے۔ (عکسی مکتوب کی ترکیب میری ناقص رائے میں نادرست ہے ـــــ لیکن میں لسانی پہلو پر گفتگو نہیں کروں گا)، اقبال کے خط کا عکس اگر موضوع ہے تو مضمون کے شروع میں یہ عکس دیا جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس کے بجائے، چوکھٹے میں "اصل خط کا متن" دیا گیا ہے۔ خط کا عکس دیے جانے میں نہ کوئی قباحت تھی، اور نہ کوئی موانع تھے۔ بلکہ اردو کاتب کو انگریزی میں سرنامہ، بھونڈے خط

میں لکھنے کی زحمت نہ کرنا پڑتی۔ لیتھو کے زمانے میں بھی ایسے اہم موضوع پر بلاک کے چربے دیے جاتے تھے۔ اب تو فوٹو آفسٹ کا دور ہے۔

اقبال کے اس خط کا عکس شاعر اقبال نمبر میں ص، ۱۵ پر ہے۔ اس میں نیچے کے دائیں گوشے میں بخطِ غیر، لکھا ہے:

(نوٹ)

"حضرت اقبال کا گرامی نامہ

ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ کے نام"

ہماری زبان میں پروفیسر اکبر رحمانی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اقبال کے اس خط کے مکتوب الیہ واقعی لمعہ ہی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقوی دسنوی اور ماسٹر اختر نے جس شبہ کا اظہار کیا ہے، وہ بلاوجہ ہے۔ اکبر رحمانی لکھتے ہیں:

آج تک کسی محقق نے مکتوب الیہ کا نام نہ ہونے کی بنیاد پر کسی مکتوبِ اقبال کو مشتبہ نہیں قرار دیا ہے۔ یہ نئی تحقیق صرف عبدالقادر دسنوی اور ماسٹر اختر ہی نے دنیا سے اقبالیات میں پیش کی ہے۔ کمال یہ ہے کہ انھوں نے اقبال نامہ کے عکسی مکتوب میں درج نوٹ کو بھی شعوری طور پر نظر انداز کر دیا، جب کہ مولف اقبال نامہ نے اس نوٹ میں واضح طور پر تحریر کیا ہے: حضرت اقبال کا گرامی نامہ ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ کے نام' اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ خط لمعہ ہی کے نام ہے۔ پھر یہ مذکورہ بالا مکتوب اقبال نامہ اوّل میں اس مقام پر شائع ہوا ہے۔ جہاں مکاتیبِ اقبال بنام لمعہ شائع ہوئے ہیں۔ مزید اس کے مقابل صفحہ پر نقل کردہ متن ہے۔

محولہ بالا عکسی مکتوبِ اقبال کے لمعہ حیدرآبادی کے نام ہونے کی تائید درجِ ذیل تاریخی شواہد سے ہوتی ہے:

(۱) راقم الحروف کو اصلی خط لمعہ کے ورثا سے دستیاب ہوا ہے۔ اقبال نامہ کے عکسی مکتوب، اور اصل خط میں کوئی فرق نہیں ہے۔ خط کے آخر میں، دائیں گوشے میں وہی نوٹ درج ہے، جو عکسی مکتوب میں ہے۔ اس خط کے لمعہ کے نام ہونے کا مزید

ثبوت اس لفافے سے ملتا ہے، جس میں یہ خط لمعہ کو بھیجا گیا تھا۔ اس لفافے پر انگریزی
میں لمعہ کا درجِ ذیل پتہ تحریر ہے، اور یہ انگریزی تحریر بھی علامہ اقبال ہی کی ہے۔

لفافے کا ڈاک ٹکٹ کسی شوقین نے نکال لیا ہے۔ اس لیے پتہ نہیں چل سکا کہ یہ خط
لاہور کے ڈاک خانے سے کب روانہ ہوا۔ لفافے کی پشت پر خط کی تاریخِ آمد ١٦ جون
١٩٣٢ء وقت صبح آٹھ بجے درج ہے۔ اور دوسری مہر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خط اسی
تاریخ کو یعنی ١٦ جون ١٩٣٢ء کو تونڈہ پور پہنچا۔ ۔ ۔ "

اکبر رحمانی کے بیان کو رد، یا نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ مثبت نہیں، منفی بات ہے۔ اکبر رحمانی کے بیان کو نہ مصدقہ سمجھا جاسکتا ہے، اور نہ قبول کیا جاسکتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اقبال کا زیرِ گفتگو خط ان معنوں میں مشتبہ ہے کہ ہے تو اقبال کی تحریر، لیکن مکتوب الیہ کے بارے میں شکوک کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور اکبر رحمانی نے جو ثبوت فراہم کیا ہے، اس نے شکوک کم کرنے کے بجائے، ان میں اضافہ کیا ہے۔ موصوف نے متنازع فیہ خط کے سلسلے میں اپنے موقف کی تائید میں یہ دستاویزی ثبوت پیش نہیں کیے۔ جو پیش کیے جانا چاہیے تھے کہ ان کے بغیر اُن کے کسوٹی نہیں بن سکتے:

١۔ اقبال کے خط کا جو عکس شائع ہوا ہے، وہ براہ راست خط کے بلاک سے نہیں چھپا ہے خط کے فوٹو گراف سے بلاک تیار کیا گیا تھا۔ جو اقبال نامہ میں شائع ہوا۔ ہو سکتا ہے یہ بلاک فوٹو گراف پر نٹ کے فوٹو گراف سے تیار کیا گیا ہو۔ شاعر میں جو عکس ہے، وہ شارپ نہیں ہے۔ یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ اقبال نامہ میں بلاک جس پرنٹ سے بنا، اس میں کوئی قطع و برید یا حرفت کام میں نہیں لائی گئی تھی۔

اکبر رحمانی نے اعتراف کیا ہے کہ اصل خط ان کو لمعہ کے ورثا سے دستیاب ہوا۔ انھیں حق ہے کہ وہ اس خط کو اپنے ذخیرے میں رکھیں، لیکن انھیں اپنے ذخیرے کے بارے میں معلومات فراہم

کرنا چاہیے تھیں۔

اقبال کی ولادت کا صد سالہ جشن اتنے بڑے پیمانے پر ایک سال نہیں، سنہ ولادت میں اختلاف کی وجہ سے کئی برس منایا گیا۔ ہندوستان میں بھی، اور پاکستان میں بھی۔ کیا اس نادر اور قیمتی دستاویز کو ہوا لگنے دی گئی؟ یہ خط نمائش کے لیے کہیں رکھا گیا؟ اس کا جواب اگر نفی میں ہے، اور یقیناً نفی میں ہے۔ تو اس کی وجہ؟

۲۔ اکبر رحمانی کو اس بات پر اصرار ہے کہ لفافے پر انگریزی میں پتہ خود اقبال نے لکھا ہے۔ "لیکن ٹکٹ کسی شوقین نے نکال لیا" (اتفاقات ہیں زمانے کے) لفافے کا عکس پھر بھی پیش کیا جانا چاہیے تھا۔ اس لفافے کو بھی خط کے ساتھ کسی نمائش کی زینت ہونا چاہیے تھا۔

اگر محمد عباس علی خاں لمعہ نے ڈاکٹری پاس کر لی تھی، تو پتے پر اُن کے نام سے پہلے ڈاکٹر کیوں نہیں ہے۔ شاعر کے ص ۱۷۴ پر اکبر رحمانی کے نام لمعہ کے دو خطوں کے عکس ہیں۔ ظاہر ہے یہ عکس اکبر رحمانی نے فراہم کیے ہوں گے۔ ۵ اکتوبر ۶۸ء کے خط میں مکتوب نگار نے خط یوں ختم کیا ہے:

"خاکسار ڈاکٹر محمد عباس علی لمعہ"

شاعر ہی میں اکبر رحمانی نے لمعہ کے نام لاہور سے "لکھا ہوا" پہلی فروری ۱۹۳۱ء کا اقبال کا خط نقل کیا ہے۔ جو ص ۱۷۳ پر ہے۔ اس کی عبارت اقبال سے منسوب کرنے کے لیے اقبال کو اردو اور عربی سے نابلد تسلیم کرنا ہوگا۔ ایسی جرأت اکبر رحمانی کی قبیل کے علما اور فضلا کر سکتے ہیں کسی قدر تفصیل سے گفتگو آگے آئے گی۔ یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ مکتوب الیہ کو اس طرح مخاطب کرایا گیا ہے:

"مائی ڈیئر ڈاکٹر عباس علی خاں"

کام "مائی ڈیئر لمعہ یا مائی ڈیئر عباس یا مائی ڈیئر عباس علی خاں سے بھی چل سکتا تھا۔ لیکن یہاں ڈاکٹر موجود ہے۔ اور پتے میں، جہاں ڈاکٹر ہونا چاہیے تھا، نہیں ہے۔

خطوں کے عکس، اور لفافوں کے عکس پیش کرنے سے اس درجہ احتراز کیوں؟ کس بات کی پردہ داری مقصود ہے؟

اکبر رحمانی نے ایک اور استدلال پیش کیا ہے:

(۲) دوسرا اہم اور ٹھوس ثبوت یہ ہے کہ محولہ بالا خط میں قرآن شریف کے جس

تحفے کا ذکر ہے، وہ آج بھی علامہ اقبال میوزیم لاہور میں محفوظ ہے۔ پہلے یہ جاوید منزل تھی، جہاں علامہ نے اپنی زندگی کے آخری ایام گزارے تھے۔ اس میوزیم میں علامہ سے متعلق تمام اشیاء جن میں ان کی ڈگریاں۔ سندیں، خطوط، لباس، تصاویر، کتابیں، فرنیچر وغیرہ محفوظ ہیں۔ راقم کو گزشتہ سال (مئی / جون ۱۹۸۹ء) اپنے دورۂ پاکستان کے وقت یہ میوزیم دیکھنے کا موقع ملا۔ میرے ہمراہ پروفیسر ظفر حجازی، (لکچرار، گورنمنٹ کالج سمندری فیصل آباد) تھے۔ اس میوزیم میں علامہ کی خواب گاہ میں، مسہری کے قریب ایک آبنوسی الماری ہے، جس میں وہ منتخب کتابیں ہیں، جو اکثر علامہ کے زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔ انھی میں قرآن کریم کا وہ تحفہ بھی ہے جسے لمعہ نے علامہ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ اس قیمتی تحفے کے بارے میں میوزیم کے کیٹلاگ میں درجِ ذیل تفصیل تحریر ہے۔

IV-5 HOLY QURAN
AN ILLIMINATED COPY

PRESENTED TO ALLAMA IQBAL
BY MR. ABBAS ALI KHAN IN 1932

(غیر ضروری تفصیل، جس کا موضوعِ حاضر سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن اکبر رحمانی نے درج کی ہے، حذف کی گئی ہے: کمال)

قرآنِ کریم کا یہ نسخہ کس قدر قیمتی تھا، اس کا اندازہ شیخ عطاء اللہ کے بیان سے ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"یہ نسخہ ڈاکٹر لمعہ کو مولانا محمد علی مرحوم سے ملا تھا۔ اور ایک بلند تاریخی قدر و منزلت کا حامل تھا۔ کیونکہ حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا تھا اقبال کی نظر میں یہ تحفہ کس قدر محبوب ہوگا۔ اس کا اندازہ اہلِ دل ہی کر سکتے ہیں حضرت عالمگیر کو اقبال نے

چوں براہیم اندریں بت خانہ بود

کہہ کر یاد فرمایا تھا، (حواشی میں حوالہ: دیباچہ اقبال نامہ اوّل، صفحہ ز) بظاہر استدلال منطقی

معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقتاً ایسا ہے نہیں۔ شیخ عطاء اللہ، اقبال کے بڑے بھائی تھے۔ محقق نہ تھے۔ اقبال کے خطوط جمع کرنے میں انھیں جذباتی دلچسپی تھی، اور انھوں نے اس سلسلے میں اہم کام کیا۔

سر عبد القادر ایڈیٹر مخزن کی سرپرستی میں ادارۂ اقبال قائم کیا گیا تھا۔ ادارے کے صدر میر اکبر علی خاں اور نائب صدر عباس علی خاں لمعہ تھے۔ شیخ عطاء اللہ اس کے سرگرم رکن تھے۔ وہ خطوط جمع کرنے کے لیے حیدر آباد بھی گئے، اور وہیں لمعہ سے ملاقات ہوئی۔ لمعہ نے خطوط جمع کرنے میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ اقبال نامہ کے دیباچے میں شیخ عطاء اللہ نے لکھا ہے کہ لمعہ نے نہ صرف مکاتیبِ اقبال کا ایک گراں قدر مجموعہ مرحمت فرمایا، بلکہ دوسروں سے مکاتیب حاصل کرنے میں تعاون کیا۔"

لمعہ نے اپنے نام اقبال کے ساٹھ خطوں کی نقلیں شیخ عطا محمد کو دی تھیں۔ اس میں سے انتیس خط اقبال نامہ میں شامل کیے گئے۔ جب اہلِ علم اور اقبالیات کے ماہروں نے ان خطوں کی ببلیوگرافیکل تفصیلات کا مطالعہ کیا، تو تضاد پائے، اور یہ خطوط، جو لمعہ کے نام ہیں مشتبہ، جعلی اور وضعی قرار پائے۔ زیرِ بحث خط لمعہ کے نام لکھا گیا تھا۔ اس بات کا تشفی بخش ثبوت فراہم نہیں ہے۔ یہ خط کس کے نام لکھا گیا تھا۔ یہ بات ابھی تک عقدہ ہے۔

اقبال کے کرم فرما میں ص ص ۱۴، ۱۵ پر ماسٹر اختر نے اقبال ریویو، جنوری ۷۴، ۱۹ء (ص ۶۲) کے حوالے سے عبد الواحد معینی کا یہ اقتباس دیا ہے:

"لمعہ صاحب کے نام، علامہ کے خطوط بیشتر جعلی ہیں، اور خود عطاء اللہ صاحب (کذا) اس کے معترف تھے۔"

ماسٹر اختر نے اقبال کا فکر و فن (ص ۱۵) کے حوالے سے اس موضوع پر ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی تحریر کا اقتباس بھی دیا ہے:

"مؤلف (شیخ عطا محمد) نے اصل خطوط نہیں دیکھے۔ حیدر آبادی صاحب (لمعہ) نے خود نقل کر کے بھیج دیے، اور اسی طرح شائع کر دیے گئے۔"

لمعہ کا انتقال ۷۷، ۱۹ء میں ہوا۔ اقبال نامہ کا پہلا حصہ ۴۴ ۱۹ء/ ۴۵ ۱۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اگرچہ برصغیر سیاسی اتھل پتھل میں تھا۔ تقسیم اور فسادات کی قیامتیں گزریں ـــــ لیکن ان کے باوجود ان خطوں کا بڑی توجہ اور باریک بینی سے مطالعہ کیا گیا۔ اور لمعہ کے نام خطوطِ اقبال وضعی قرار

پائے۔ لمعہ کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ اپنے نام پر لگا ہوا یہ کلنک دھوتے، اور اپنی صفائی میں ان خطوں کی نمائش کرتے۔ اور ان خطوں کے عکس شائع کرتے۔ وہ مدعی تھے۔ لیکن انھوں نے خاموش رہ کر اقبال مجرم کا رول ادا کیا۔ ان کی خاموشی ان کے ادبی جعل کے اعتراف کا ثبوت ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اکبر رحمانی لمعہ کی طرف سے بڑی چستی کے ساتھ گواہی بھی دے رہے ہیں، اور سرگرمی سے وکالت بھی کر رہے ہیں۔

رحمانی نے اقبال میوزیم کی غیر ضروری تفصیلات دی ہیں۔ شاید موصوف پروفیسر اور "لکچرار" کے فرق سے بھی واقف نہیں۔ اس مضمون پر مصنف کی حیثیت سے ان کے نام سے پہلے پروفیسر مرقوم ہے۔ اور اقبال میوزیم میں ان کے ہمراہ پروفیسر ظفر حجازی (لکچرار گورنمنٹ کالج سمندری فیصل آباد) "تھے"۔ غیر ضروری تفصیل اس وقت دی جاتی ہے، جب اہم اور ضروری معلومات کا فقدان ہو۔ جب لمعہ کے نام اقبال کے خطوط وضعی قرار پائے۔ اور جو خط واقعی اقبال کی تحریر ہے، اس کا لمعہ کے نام لکھا جانا یقینی نہیں۔ دوسروں کے نام اقبال کے جو خطوط انھوں نے جمع کیے تھے۔ انھی میں سے ایک کا مکتوب الیہ خود کو بتایا۔ اور چوں کہ شیخ عطا محمد نے لمعہ پر اعتماد کر کے خطوط کو اقبال نامہ میں شامل کر لیا تھا، اس لیے اسی کی بنیاد پر کلامِ پاک کے اس نسخے کا الحاق میوزیم میں ہوا تو لمعہ کا نام بھی کیٹلاگ میں درآیا۔ تھوڑے یا زیادہ عرصے کے لیے نادرست انتسابات بھی ہو جاتے ہیں۔ اقبال میوزیم کوئی استثنیٰ نہیں۔ لات، منات، عزیٰ جیسی دیویوں کو وسیلہ بنانے کی شیطانی آیات جب آیاتِ ربانی کا درجہ پا گئیں ـــــ اور بعد میں منسوخ کی گئیں، تو اقبال میوزیم کے کیٹلاگ میں یہ اندراج کیا حقیقت رکھتا ہے؟ جس بنیاد پر یہ اندراج ہوا ہے، جب وہی معرضِ نزاع میں ہو تو، اسے ثبوت کے طور پر پیش کرنا اعلیٰ معیار کی وکالت یقیناً نہیں۔

لمعہ کے نام اقبال کے وضعی خطوں کے بارے میں جو وقیع کام ماسٹر اختر اور ڈاکٹر عبدالقوی دسنوی نے کیا ہے۔ اس میں اضافے کی گنجائش ہے۔ ان خطوط کے متن کا اور گہرائی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ماسٹر اختر نے فرداً فرداً ہر خط کا جائزہ لیا ہے۔ کچھ اور بھی ایسے نکات ہیں، جن پر غور کیا جانا چاہیے تھا۔ مثال کے طور پر تیسرا خط، جو انگریزی سے ترجمہ بتایا گیا ہے۔ ترجمہ کا متن یہ ہے: (اقبال نامہ فراہم نہیں ہے۔ متن ماسٹر اختر کی کتاب سے نقل کیا جا رہا ہے):

لاہور

۲۰ مئی ۱۹۳۰ء

مائی ڈیئر عباس علی خاں

آپ کا نوازش نامہ ابھی ابھی موصول ہوا، جس کے لیے ممنون ہوں۔ میں نے آپ کی کتاب جو آپ نے مجھے تحفتہً بھیجی، مطالعہ نہیں کی۔ لیکن میں اسے نہایت خوشی سے پڑھوں گا۔ اور امید ہے اس سے منفعت بھی حاصل کروں گا۔ آپ کے والد بزرگوار کے انتقال کی اطلاع سے قلق ہوا۔ جسے آپ نیچر کہتے ہیں، اس کے سپرد ایک بہت بڑی کائنات کا اہتمام ہے۔ اور ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ وہ اپنے وظیفہ کی نوعیت سے کماحقہٗ آگاہ ہے۔

RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHTS IN ISLAM

پر میرے لکچر شائع ہو گئے ہیں۔ اگر آپ کا امریکن دوست زمانۂ حال کے اسلام سے دلچسپی رکھتا ہے، تو اسے ان کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ مبارک علی، تاجر کتب، لوہاری گیٹ سے یہ کتاب مل سکتی ہے۔

مخلص محمد اقبال

ماسٹر اختر کا خیال ہے:

"اس تحریر کو انگریزی خط کا ترجمہ بتایا گیا ہے۔ اس لیے القاب و آداب اور زبان و بیان پر توجہ دینے کا کوئی مطلب نہیں۔ متن کے اعتبار سے بھی اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ اس لیے اس تحریر کو علاّمہ اقبالؔ کے خط کا ترجمہ نہ ماننا آسان نہیں۔"

قطع نظر اس کے، کہ اقبالؔ کے خط کی اہمیت ان کے الفاظ اور اُن کی تحریر کی وجہ سے ہے۔ شیخ عطا محمد اپنے برادرِ خرد کے سلسلے میں جذباتی تھے۔ اصول اور ترجمہ کی قدر و قیمت میں جو فرق ہوتا ہے، اس سے واقف نہیں تھے۔ اس لیے وہ لمعہ کے دام میں آ گئے، اور انھوں نے یہ ترجمہ اقبال نامہ میں شامل کر لیا۔ انگریزی میں کوئی ایسا فقرہ نہیں ہے جس کا ترجمہ "والد بزرگوار" ہو یہی بات "وہ اپنے وظیفہ کی نوعیت سے کماحقہٗ آگاہ ہے" کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ یہ کہہ کر بھی پیچھا نہیں چھوٹ سکتا کہ ترجمے کی

غلطی ہے، کیوں کہ کتاب کا نام انگریزی میں لکھا ہے ــــــ اور یہ نام غلط ہے۔ اقبال اپنی کتاب کا نام غلط نہیں لکھ سکتے تھے۔ لمعہ جیسا کم استعداد شخص ہی THOUGHTS جمع کے صیغے میں لکھ سکتا تھا۔ اور پھر کتاب کا نام THE سے شروع ہوتا ہے۔ کتاب کا نام ہے:

THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHTS IN ISLAM

اگر کتاب کا نام انگریزی حروف میں نہیں لکھا گیا ہوتا، تو اسے مترجم کی غلطی ماننے میں کوئی قباحت نہیں تھی، یہ انگریزی میں لکھا گیا ہے۔ اس لیے مبینہ انگریزی خط سے نقل کیا جانا ظاہر کیا گیا ہے۔ مبینہ خط، جس میں کتاب کا نام غلط ہو۔ اقبال کے قلم سے نہیں ہو سکتا۔ شیخ عطا محمد کی زندگی کا بڑا حصہ نقشوں اور ٹنڈروں میں گزرا تھا۔ اقبال نامہ کو انھوں نے ادبی دستاویز کے بجائے MANUAL زیادہ سمجھا۔ جب ذہنی تربیت اور رویہ سب سے کم رقم کا ٹنڈر منظور کرنے کا ہو، تو دستاویز کے استناد کی طرف دھیان ہی نہ جانا قدرتی ہے۔ اور نتیجہ ظاہر ہے۔ وہ حیدرآباد گئے بھی، اور لمعہ کی فراہم کی ہوئی خطوں کی نقلوں کو اصل سے ملانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ انگریزی کا وہ خط بھی نہ دیکھنا چاہا، جس کا یہ ترجمہ ہے!

شیخ عطا محمد سابق سب ڈویژنل آفیسر، ملٹری ورکس نے لمعہ کے نام مبینہ خطوں کو اقبال نامہ میں شامل کرنے سے پہلے معمولی سی احتیاطیں بھی نہیں برتیں۔ ماسٹر اختر کی کتاب اقبال کے کرم فرما سے دوسرا خط، اور اس پر تبصرہ نقل کیا جاتا ہے!

جنابِ من ڈاکٹر لمعہ

السلام علیکم۔ آپ کا خط مل گیا ہے۔ فی الحال اصلاحِ اشعار سے معاف فرمائیے کہ فرصت بالکل نہیں ہے۔ کسی فرصت کے وقت دیکھوں گا۔ امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔

مخلص محمد اقبال لاہور

۷، مئی ۱۹۲۹ء

یہ خط دو خاص وجوہات کی بنا پر قابل بھروسہ نہیں ہے۔ اوّل تو یوں کہ اس خط میں لمعہ کو ڈاکٹر لمعہ کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے، جو غلط ہے۔ کیوں کہ لمعہ اس وقت ڈاکٹر

نہیں تھے۔ اکبر رحمانی صاحب کی زبانی لمعہ فرماتے ہیں (حوالہ تحقیقات وتاثرات ص۴۶):

"اقبال سے میری ملاقات جنوری یا فروری ۱۹۲۹ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔
اس وقت میں انٹر نس کا طالب علم تھا۔"

کسی مزید تبصرے کی گنجائش نہیں، سوا اس کے کہ ہوسکتا ہے اقبال نے یہ خط کسی اور کو لکھا ہو، جو اقبال سے اصلاح لینے کا متمنی ہو۔ لمعہ نے جو خط اکٹھا کیے۔ ان میں یہ خط بھی ہو ــــ اور انھوں نے خود کو، اس نقل میں مخاطب قرار دیا، جو عطا محمد کو دی گئی۔ اگر ایسا نہیں ہے، تو یہ خط وضعی اور جعلی ہے۔

چوتھا خط شاعر میں ص ۳، ۲ پر نقل ہوا ہے:

"لاہور

یکم فروری ۱۹۳۱ء

مائی ڈیر ڈاکٹر عباس علی خاں

نوازش نامہ، اور اس کے ملفوظات[1] کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ مسٹر محمد علی کا خاتمہ بخیر ہوا۔ اگرچہ اُن کی سیاست کا کبھی مداح نہ تھا، لیکن ان کی اسلامی سادگی، اور آخری سالوں میں اپنی بعض آرار کے بدل لینے میں، جس امانت و دیانت کا انھوں نے ثبوت دیا۔ بہت احترام کرتا ہوں۔ اپنے متعلق ان کی پیش گوئی بھی درست ثابت ہوئی،[2] اور اس سے بھی قوم میں ان کا وقار بڑھ گیا ہے۔ مسجدِ اقصیٰ میں آخری آرام گاہ کا میسّر آنا، ان کی خوش نصیبی ہے، جس سے ان کا رتبہ بلند تر ہوگیا ہے۔
اب تو محض ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے اُن کا رتبہ نہایت ارفع ہو چکا ہے۔
اللہ تعالیٰ اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔
امید ہے آپ آج کل سیاست سے اپنے آپ کو بچائے ہوئے ہوں گے۔

مخلص

محمد اقبال

---

[1] شاعر میں یہ لفظ ملفوظات ہی ہے۔ ماسٹر اختر نے اپنی کتاب میں ص ۴۰ پر ملفوفات نقل کیا ہے (کمال)۔

[2] شاعر کی نقل میں جملہ یہیں ختم ہوتا ہے، لیکن ماسٹر اختر کی کتاب میں ہوئی کے بعد ہے بھی لکھا ہے۔ (کمال)

ماسٹر اختر نے، اس انٹرویو کے حوالے سے، جو لمعہ نے اکبر رحمانی کو دیا تھا، لمعہ کا سنہ ولادت سنہ ۱۹۱۱ء بتایا ہے[۱]۔ جو شخص سنہ ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوا ہو، اور سنہ ۱۹۲۹ء میں، یعنی اٹھارہ برس کی عمر میں میٹرک میں ہو، اس کی ذہنی استعداد کے بارے میں کچھ کہنا ضروری نہیں۔ سنہ ۱۹۲۹ء ہی میں انھوں نے میٹرک کرنے کے بعد بمبئی میڈیکل کالج میں ڈپلومہ کورس میں داخلہ لیا۔ لیکن چند ماہ بعد ہی کالج چھوڑ دیا یا وہاں سے خارج کردیے گئے[۲]۔ اور یہ اطلاع اُس بیان پر مبنی ہے، جو لمعہ نے معین کو دیا تھا۔ جب لمعہ نے سنہ ۱۹۲۹ء ہی میں میڈیکل کالج چھوڑ دیا تھا تو اس خط میں وہ ڈاکٹر کی حیثیت سے کیوں مخاطب ہیں؟ یہ تو سنہ ۱۹۳۱ء کا خط ہے۔ کیا لمعہ اپنے بارے میں اقبالؔ کو دھوکا دیتے رہے؟ جس شخص کا کردار یہ ہو، اس کے ہاتھ کی نقل کی ہوئی کوئی دستاویز، اس وقت تک قابلِ قبول نہیں ہو سکتی، جب تک اصل سے اسے ملایا نہ جائے۔ حیرت ہے کہ اقبالؔ کے برادرِ اکبر نے اپنے مرحوم بھائی کی محبت کے جوش میں تحریرِ غیر کو بھائی کی تحریر سمجھ لیا۔ اور پرکھے بغیر اسے اقبال نامہ میں شامل کرلیا۔

خط کا پہلا جملہ ہی بے معنی ہے۔ اقبال ترسیل کے فن کے ماہر تھے۔ نثر میں بھی اور نظم میں بھی۔ "نوازش نامہ اور اس کے ملفوظات / ملفوفات کے لیے سراپا سپاس ہوں" اقبالؔ کے قلم سے نکلی ہوئی تحریر نہیں ہو سکتی۔ ملفوفات کی غرابت اور مضحکہ خیزی، پٹواریوں اور دیہی تھانوں میں روزناچوں یا رپٹ کی زبان ہے۔ "ملفوفات کے لیے فدوی سراپا سپاس ہے"۔ بھی اقبال سے لکھوایا جا سکتا تھا۔ نہ جانے کیوں نہیں لکھوایا گیا۔ لیکن ہم ماسٹر اختر کی کتاب کو نظر انداز کر سکتے ہیں، چاہے یہ لفظ اقبالؔ نامہ ہی میں کیوں نہ واقع ہوا ہو، کیوں کہ اقبالؔ نامہ ثانوی ماخذ ہے۔ جہاں تک اقبالؔ کے خطوط بنام لمعہ کا تعلق ہے۔ غلطی دو جگہوں پر ہو سکتی ہے۔ لمعہ سے نقل کرنے میں غلطی ہو سکتی تھی۔ اقبال نامہ کے کاتب سے غلطی ہو سکتی تھی۔ اکبر رحمانی کا دعویٰ ہے کہ انھیں لمعہ سے قرب حاصل تھا لمعہ نے اپنی ادبی تخلیقات کے علاوہ کچھ اصل خطوط بھی ان کے حوالے کردیے تھے۔ اور نقلیں تو بہرحال ان کے دسترس میں تھیں۔ اس لیے ملفوظات کو ترجیح دینی چاہیے۔ لفافے میں نوازش نامے کے ساتھ ملفوظات تو بھیجے جا سکتے تھے لیکن اقبالؔ نے یہ بات نہیں لکھی ہے۔ اقبال یقیناً

---

[۱] ص ۱۳۰ [۲] عبدالواحد معین: اقبال ریویو، جنوری ۸۴، ۱۹ (ص ۸۴)، بحوالہ اقبال کے کرم فرما (ص ۱۳)

ملفوظات کے معنیٰ سے واقف تھے۔ لمعہ بیس برس کی عمر میں کسی ایسے روحانی مرتبے پر فائز تھے نہیں کہ ان کے نوازش نامے کے مندرجات کو اقبال ملفوظات کا درجہ دیتے۔ یہ قطعاً جعلی خط ہے۔ یا یہ جملہ الحاقی ہے۔

لمعہ نے ابھی دو برس پہلے میٹرک کا اعلیٰ امتحان پاس کیا تھا۔ ادب پر جوان کی نظر تھی، وہ تو ان کے کلام سے ظاہر ہے۔ سیاست پر ان کو کتنا عبور ہو سکتا تھا۔ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ غلو قیاس کر لیں۔ تب بھی محمد علی کی وفات پر اقبال کا ان سے تبادلہ خیال کرنا تصور نہیں کیا جا سکتا سر اکبر حیدری کو تو یہ خط لکھا جا سکتا تھا۔ سر راس مسعود کو بھی ایسا خط لکھا جا سکتا تھا۔ لیکن لمعہ کو؟ لمعہ کون سے ایسے دانشور اور سیاسی رہنما تھے کہ اقبال یہ امید کرتے کہ موصوف اپنے آپ کو سیاست سے بچائے ہوئے ہوں گے۔ ۱۹۳۱ء تو اقبال کا وہ زمانہ ہے، جب وہ بڑی سرگرمی سے سیاست میں حصہ لے رہے تھے۔

امیر خسرو اور حسن سنجری کے تعلقات کے بارے میں ایک ناقابلِ اشاعت قصہ بھی ہے۔ اور اس کا ذکر، تردید کے ساتھ، شبلی اور ڈاکٹر وحید مرزا دونوں نے کیا ہے۔ لمعہ کے نام اقبال کے خطوط سے کچھ ایسا ہی تاثر پیدا کیا گیا ہے۔ شاید شعوری طور پر۔ خسرو اور حسن، ہم عمر تھے۔ اقبال اور لمعہ میں کئی پیڑھیوں کا فرق تھا۔ روایت ہے کہ حسن کو (شاید) پشاور میں کوڑے لگوائے گئے تو نشان خسرو کے ہاتھ پر پڑے، اگرچہ وہ وہاں موجود نہ تھے۔ لمعہ کے جعل کو برہنہ کر کے، جو کوڑے لفظوں کے لگائے جا رہے ہیں، ان سے اقبال کی سیرت (جو وضعی خطوں کی وجہ سے داغدار ہوئی ہے) بے داغ ہو جائے گی۔

خط ۵[1]

لاہور

۷ ستمبر ۱۹۳۱ء

مائی ڈیئر عباس علی خاں صاحب

---

[1] اقبال کے کرم فرما: ص ۴۱

ڈاکٹر کلیو فورڈ مانشرڈٹ کی کتاب کے تحفے کے لیے دلی شکریہ قبول فرمایئے۔ مجھے اس کتاب "عالمگیر انسانی برادری" BROTHERHOOD کی بہت ضرورت تھی۔

نظم کے لیے بھی، جو آپ نے بھیجی ہے، اور جو میں نے بے حد پسند کی ہے، شکریہ قبول کیجیے۔ امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص محمد اقبال

ماسٹر اختر نے ص ۴۲ پر زندہ رود (ص ۴۳)، جاوید اقبال کا بیان شہادت میں پیش کیا ہے:

"اقبال کا ارادہ تھا کہ سفر یورپ کے لیے یکم ستمبر ۱۹۳۱ء کو لاہور سے روانہ ہو کر ۵ ستمبر ۱۹۳۱ء کو بمبئی پہنچیں گے۔ ۔ ۔ لیکن پروگرام ۵ ستمبر کا بنا۔ لاہور سے چلنے سے چند گھنٹے قبل اقبال کو بخار آ گیا۔ اس لیے ۵ ستمبر ۱۹۳۱ء کو روانگی ملتوی کرنا پڑی آخر کار وہ ۸ ستمبر کو لاہور سے روانہ ہوئے۔"

اس شہادت سے لمعہ کے نام یہ خط جعلی قرار پاتا ہے۔ چوں کہ اس خط کی نقل خود لمعہ نے عطا محمد کو فراہم کی تھی اس لیے دوسرے خط بھی اس وقت تک مستند تسلیم نہیں کیے جا سکتے، جب تک اقبال کے قلم کی تحریر پیش نہ کی جائے۔

یہ شہادت زندہ رود سے فراہم نہ بھی ہوتی، تو بھی یہ خط جعلی ہی قرار دیا جاتا۔ اگر اقبال کو کتاب مذکور درکار ہوتی، اور وہ اس کی فراہمی کے لیے خط لکھتے تو کتاب کے نام کے ترجمے کے ساتھ انگریزی میں وضاحت کرتے۔ یہ بات کسی حد تک (صرف کسی حد تک)، قابل قبول ہو سکتی تھی۔ جب BROTHERHOOD انگریزی میں لکھ سکتے تھے، تو پورا نام انگریزی میں کیوں نہ لکھتے؟ کتاب کی رسید اور شکریہ کے لیے "عالمگیر انسانی برادری" ترجمہ کیوں کیا گیا؟ صرف اس لیے کہ خط چھپے تو اردو خواں سمجھ سکیں؟ یہ نجی خط تھا۔ یا قارئین کے لیے وضع کیا جا رہا تھا؟ یہ اندرونی شہادت، جاوید اقبال کی شہادت سے زیادہ اہم ہے۔ اکبر رحمانی کو یقیناً یہ کتاب اقبال میوزیم میں نہیں ملی ہوگی، اور نہ کیٹلاگ میں اندراج ہوگا کہ لمعہ حیدر آبادی یا عباس علی خاں نے تحفے میں علامہ کو بھیجی تھی! لیکن چوں کہ موصوف اس خط کو جعلی یا وضعی نہیں سمجھتے، اس لیے اُنھیں استدلال پیش کرنے کی دعوت دی جاتی ہے۔

اقبال کی طرف سے اپنے نام خط لکھنے کی تاریخ کا تعین لمعہ نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ ہوا یہ کہ اقبال ۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کو جو لاہور سے روانہ ہوئے، تو بمبئی اُن کی آخری منزل نہیں، درمیان کی منزل تھی۔ انھیں دوسری گول میز کانفرنس میں شریک کے لیے لندن جانا تھا[۱]۔ وہ ۱۰ ستمبر کو بمبئی پہنچے اور خلافت ہاؤس میں ٹھہرے۔ ان کے اعزاز میں عطیہ فیضی نے ایوانِ رفعت میں ایک عصرانہ دیا۔ ضیاء الدین برنی نے اس پارٹی کی روداد لکھی۔ ان سے ایک غلطی ہو گئی۔ یہ عصرانہ لندن جاتے وقت دیا گیا تھا۔ لیکن انھوں نے لکھا:

"گول میز کانفرنس سے لوٹتے وقت، علامہ موصوف نے بمبئی میں چند دن قیام فرمایا تھا۔ اس موقع پر محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ نے ان کے اعزاز میں اپنے تاریخی مکان ایوانِ رفعت میں ایک شاندار پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔"

برنی نے جو روداد لکھی، وہ ۱۹۵۶ء میں، اقبال میں بھی شامل کی گئی۔ گول میز کانفرنس سے واپسی کی جو بات ہے، اس کا تدارک تاریخ سے ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ برنی نے ۱۰ ستمبر کی تاریخ دی ہے۔ اس فروگزاشت کا احساس انھیں بعد میں ہوا، لیکن اس وقت تک لمعہ اپنے نام اقبال کا خط تحریر کر چکے تھے۔ اور عطا محمد اقبال نامہ میں اسے شائع کر چکے تھے، اور اکبر رحمانی قلم کی شمشیر برہنہ لے کر لمعہ کی حمایت میں نہ صرف سینہ سپر ہو چکے تھے۔ بلکہ محققوں پر حملہ آور بھی ہو چکے تھے۔

عطیہ فیضی کی کتاب اقبال کے اردو ترجمہ میں بھی اس عصرانہ کا ذکر ہے۔ اس بنیاد پر لمعہ نے ایک کہانی بھی بنالی، ۱۹۷۵ء میں اپنے کاتبِ الہام وحدیث اکبر رحمانی کو سنائی۔ وہ نہ صرف خود اس پر ایمان لے آئے، بلکہ یہ ایمان دوسروں پر لادنے کے لیے تحقیقات و تاثرات (ص ۵۰ ببعد) یہ حدیث بیان کی ہے۔ لمعہ کی زبان سے:

"عطیہ فیضی نے اپنے دولت کدہ ایوانِ رفعت میں اُن (اقبال) کے اعزاز میں ایک چائے پارٹی دی تھی۔ مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس پارٹی میں شہر کے اکابرین اور فضلا شریک تھے۔ یہ پارٹی ایک حسین اور خوب صورت لان پر دی گئی تھی . . .

---

[۱] اقبال کے کرم فرما (ص ۲۴۔ ۲۷) سے اخذ۔

لان سے پھر حاضرین ہال میں پہنچے۔ وہاں رقص و سرود کا انتظام تھا اس محفلِ رقص و سرود میں علامہ اقبال کی موجودگی سے میرے دل کو بڑی تکلیف پہنچ رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کس طرح اپنے جذبات کو علامہ تک پہنچاؤں کہ عطیہ فیضی میرے پاس آئیں۔ اور ایک کاغذ مجھ کو تھما دیا۔ جس پر ذیل کے اشعار درج تھے ؎

ترسم کہ تو می رانی زورق بہ سراب اندر
زادی بہ حجاب اندر میری بہ حجاب اندر
برکشت و بیاباں پیچ برکوہ و بیاباں پیچ
برقے کہ بخود پیچد میرد بہ سحاب اندر
ایں صوتِ دلاویزے از زخمۂ مطرب نیست
مہجورِ جہاں حورے نالد بہ رباب اندر

یہ اشعار اقبال نے تحریر کیے تھے۔ پڑھ کر فوری طور پر ایک شعر نے میرے ذہن میں جنم لیا، جسے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے، اس چِٹ کو عطیہ فیضی کی طرف بڑھا دیا۔ اقبال نے وہ چِٹ اقبال تک پہنچا دیا (کذا!)، اقبال کچھ دیر تک وہ شعر پڑھنے کے بعد گم سم رہے۔ آج بھی وہ شعر مجھے یاد ہے ؎

از مطرب و نے لمعہ مارا چہ سروکار یم[1]
با چشمِ جنوں دیدم مطرب بہ رباب اندر

عطیہ بیگم سے انھوں نے دریافت کیا کہ لمعہ کہاں ہے۔ مجھے بلایا، اور برمحل و موزوں شعر کہنے پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ مجھے طاؤس و رباب سے کبھی سروکار نہیں رہا۔ مگر آج یہاں صرف میزبان کے جذبات کے احترام میں بیٹھا ہوں۔"

ماسٹر اختر نے یہ نہایت معقول اور جائز نکتہ اٹھایا ہے!

---

[1] موصوف اپنا تخلص عام طور سے ہائے مختفی کے ساتھ نظم کرتے ہیں، فاع / فعل کے وزن پر۔ یہاں ہائے ہوز کے ساتھ فعلن وزن پر لکھا ہے۔ (کمال)

عطیہ فیضی کی محفل میں اول تو اٹھارہ سالہ طفلِ دلبستاں، لمعہ کی موجودگی ہی حیرت انگیز ہے، جہاں وقت کے بلند پایہ سیاست دانوں، دانشوروں، نوابوں اور راجاؤں کا جم گھٹا تھا۔ ۔ ۔ اس مضحکہ خیز صورت حال کا اندازہ فرمائیں کہ ان سب کی موجودگی میں اقبال کو اپنے وقار کا خیال بھی نہ رہا۔ اور لمعہ سے پرچہ بازی کی سوجھی، اور اس پرچہ بازی کا ذریعہ کون بنا؟ بیگم عطیہ فیضی ۔ ۔ ۔"

اختر نے رحمانی اور لمعہ کے ساتھ بہت رعایت برتی ہے۔ اور ان کو ہلکا چھوڑ دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سراسر من گھڑت کہانی ہے۔ اور تحقیق طلب یہ امر ہے کہ اس کہانی کے مصنف لمعہ ہیں یا رحمانی۔ یہ عبارت ان وجوہ سے قابلِ قبول نہیں:

۱۔ رحمانی اور لمعہ، دونوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اقبال سے لمعہ کی یہ دوسری ملاقات تھی۔

۲۔ ۱۹۲۹ء میں پہلی ملاقات حیدرآباد میں ہونا بیان کیا گیا، جب عباس علی خاں (لمعہ) میٹرک کے طالب علم تھے۔

۳۔ موصوف نے اسی سال میٹرک کا اعلیٰ امتحان پاس کرنے کے بعد بمبئی میں میڈیسن کے ڈپلومہ کورس میں داخلہ لیا تھا۔ لیکن یہ گاڑی ایک ٹرم بھی نہ کھینچی۔ کوئی حرج نہیں لمعہ بمبئی میں کرتے کیا تھے؟ رحمانی اُن کے سیرت نگار ہیں۔ وہ اس بارے میں خاموش ہیں، اور یہ بھی نہیں بتاتے کہ عطیہ فیضی اور ان کے ممدوح کے درمیان قدرِ مشترک کیا تھی؟ اقبال نے موصوف کے نام کسی مبینہ خط میں عطیہ فیضی کا ذکر نہیں کیا۔ اور نہ عطیہ فیضی سے اُن کا تعارف کرایا۔ اس خاتون سے موصوف کی ایسی یگانگت کیسے ہوئی کہ اقبال تو محفل میں انھیں پہچان نہ سکے، اور عطیہ پرچہ لے کر ان کے پاس سیدھی پہنچیں۔

۴۔ اور اب لمعہ کے بیان بقلم رحمانی میں وہ اندرونی شہادتیں، جو اسے جھوٹ کا پلندہ ثابت کرتی ہیں:

۱۔ اگر لمعہ پہلے پہنچے تھے تو ـــــ اور بعد میں پہنچے تو ـــــ اقبال سے جاکر نیاز مندانہ کیوں نہیں ملے؟

ب۔ لمعہ یا رحمانی اگر ذرا اور ہمت کرتے، تو نیپکن پر شعر لکھ کر اقبال کو عطیہ فیضی کے توٹ سے بھجواتے، اور اقبال سر دھننے کے بعد اپنے اشعار موزوں کرتے اسی وقت، وہیں جب کہانی ہی لکھنا تھی، تو زیادہ چٹ پٹی لکھتے!

ج۔ معلوم نہیں یہ شعر کس سے موزوں کرایا گیا تھا اور کب؟ پہلے مصرع میں "ماراچہ سرو کاریم" جمع کے صیغے میں ہے، اور دوسرے مصرع میں "با چشم جنوں دیدم" واحد کے صیغے میں ہے۔ اگرچہ اقبال شاہد پرستی میں دوسرے گون کے نہ تھے، اور لمعہ کے ساتھ خلوتِ خاص میں بھی نہ تھے ___ لیکن لمعہ کی تحریر دیکھ کر اور پھر لمعہ کا چہرۂ زیبا دیکھ کر اس حد تک ہوش و حواس کھو بیٹھے کہ فارسی بھول گئے، اور بر محل و موزوں شتر گربائی شعر کہنے پر مبارکباد دی!

د۔ ایک کاغذ مجھے تھما دیا، جس پر ذیل کے اشعار درج تھے ہے" یہ بولی جانے والی نہیں، لکھی جانے والی زبان ہے۔ مندرجہ صدر اور مندرجہ ذیل کون بولتا ہے؟ میں تیس برس سے زیادہ الکٹرانک میڈیا سے وابستہ رہا ہوں۔ اہم ذمہ داریاں میرے سپرد رہی ہیں۔ اسٹاف ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں انفرادی لکچروں کے علاوہ قومی پیمانے پر پروڈیوسروں اور پروگرام اگزیکیٹوٹوز کے لیے ورکشاپ اور سیمی ناروں کی ترتیب اور نگرانی بھی میرے فرائض میں شامل تھی۔ غلط یا صحیح، ابلاغِ عامہ کی زبان کے سلسلے میں مجھے معتبر سمجھا گیا۔ اخباروں میں مضامین کے علاوہ ہفتہ وار اور روزانہ کالم بھی لکھتا رہا ہوں۔ مختلف یونیورسٹیوں میں فیلو یا مہمان استاد کی حیثیت سے ابلاغ عامہ سے متعلق مضامین بھی پڑھاتا رہا ہوں۔ لکھی جانے والی زبان اور بولی گئی عبارت کی زبان پہچاننے میں کسی کو بھی دشواری نہیں ہوتی، سوا اس کے جو جعل کرتا ہے۔ ابلاغِ عامہ کے پیشے میں جو رہا ہو، وہ فوراً اسے پہچان لیتا ہے، اور جب اس کی نشاندہی کرتا ہے، تو لوگ بھی اس نکتے تک فوراً پہنچ جاتے ہیں۔ (ڈاکٹریٹ کے لیے میرا تحقیقی مقالہ بھی ترسیل کی زبان کے بارے میں تھا)

ذیل کے اشعار درج تھے۔ بولی جانے والی زبان نہیں ہے۔ اکبر رحمانی کا یہ بیان سراسر نادرست ہے کہ لمعہ نے کوئی انٹرویو دیا تھا جو انھوں نے قلمبند کرلیا۔ اگر مسیلمہ کذاب پیغمبر نہیں تھا تو اکبر رحمانی بھی حدیثِ لمعہ کے کاتب نہیں ہیں۔

اکبر رحمانی کو یہ اطلاع نہ تھی کہ ضیاء الدین احمد برنی سے، جو غلطی ہوگئی تھی، وہ بعد میں انھوں نے درست کردی تھی۔ اور ۲۷ اپریل ۱۹۴۶ء کو یوم اقبال پر جو مضمون انھوں نے انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی کے ہال میں پڑھا تھا، اس میں یہ درستی موجود ہے۔ یہ مضمون شاعر کے اقبال نمبر میں شامل ہے۔ ص ص ۵۳۸ - ۵۳۹ سے یہ عبارت نقل کی جاتی ہے:

گول میز کانفرنس کے لیے جاتے وقت علامہ موصوف نے بمبئی میں چند دن قیام فرمایا تھا، اس موقعہ پر محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ نے ان کے اعزاز میں اپنے تاریخی مکان ایوانِ رفعت میں ایک شاندار پارٹی کا انتظام کیا تھا۔ جس میں رؤساو مہاراجگان کے علاوہ اسلامی ممالک کے قونصل اور مرزا علی اکبر خاں مرحوم جج ہائی کورٹ بمبئی، مولانا محمد عرفان مرحوم، ڈاکٹر جی ایم ڈی صوفی جیسے بہت سے فاضل حضرات بھی تشریف فرما تھے۔ اس وقت جب حاضرین سے ان کا تعارف کرایا جارہا تھا، تو میں دیکھ رہا تھا کہ لوگ ان سے نہایت عقیدتمندانہ احترام سے مل رہے تھے حالاں کہ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے، جنھوں نے علامہ کا صرف نام ہی سنا تھا اور ان کے شاعرانہ کمالات سے مطلق واقف نہ تھے۔ مجمع نے علامہ موصوف سے درخواست کی، کہ وہ بذریعہ تقریر اپنے ارشادات سے حاضرین کو مستفید فرمائیں اور کوئی پیغام بھی عطا کریں۔ جواب میں علامہ نے انگریزی میں ایک مختصر سی تقریر کی، اور فرمایا کہ بطور انعام کے میں صرف ایک شعر پیش کردینا کافی سمجھتا ہوں۔ وہ شعر یہ ہے:

بجاں بزی کہ اگر مرگِ تست، مرگِ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

... جب علامہ تقریر کرچکے تو دوست احباب نے انھیں گھیر لیا کہ اس شعر کا

انگریزی ترجمہ بھی کر دیا جائے۔ چناں چہ علامہ نے ان کی درخواست کو شرف پذیرائی بخشا، اور ذیل کا ترجمہ لکھوایا۔ فرماتے ہیں :

LIVE SO BEAUTIFULLY
THAT IF DEATH IS THE END OF ALL
GOD HIMSELF MAY BE PUT TO SHAME
FOR HAVING ENDED THY CAREER

اس کے بعد چائے نوشی ہوئی، اور اقبال حاضرین سے خوش گپیاں فرماتے رہے۔ جب چائے نوشی کا سلسلہ ختم ہوگیا تو **ایوانِ رفعت** کے ہال میں رقص و سرود کا انتظام کیا گیا۔ رقص و سرود کے دوران میں علامہ اقبال نے فی البدیہہ تین اشعار قلم بند کر کے عطیہ بیگم صاحبہ کی خدمت میں پیش کیے۔ وہ شعر یہ ہیں۔

ترسم کہ تو می رانی زورق بسراب اندر
زادی بہ حجاب اندر، میری بہ حجاب اندر
برکشت و خیاباں پیچ، برکوہ و بیاباں پیچ
برقے کہ بخود پیچد میرد بسحاب اندر
ایں صوتِ دلاویزے از زخمۂ مطرب نیست
مہجور جہاں حورے نالد برباب اندر

محمد اقبال در دولت کدہ عطیہ بیگم
بمبئی ۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ء

ضیاء الدین احمد برنی کے مضمون کے اس اقتباس سے لمعہ/اکبر رحمانی کے دروغ ترکیبی کی پرتیں اور کھلتی ہیں، سبزہ زار پر چائے نوشی ہوئی تھی۔ پھر لوگ اٹھ کر ہال میں گئے تھے، جہاں رقص و سرود کی محفل آراستہ کی گئی تھی۔

اور اس رقص و سرود کی محفل میں اقبال کی موجودگی سے لمعہ کے دل کو بڑی تکلیف پہنچی تھی اور اسی کے دوران میں اقبال نے پرچے پر تین شعر لکھ کر بدستِ عطیہ فیضی لمعہ

کو بھجواتے تھے، اور جب لمعہ نے "جواب آں اشعار" بھجوایا تو اقبال نے میزبان خاتون سے پوچھا کہ لمعہ کہاں ہے؟"

آٹھواں خط

لاہور

۱راگست ۱۹۳۴ء

محترم بندہ ڈاکٹر عباس علی خاں صاحب

تسلیم آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا۔ آپ کی طویل علالت کی خبر سُن کر مجھے افسوس ہوا۔ نارو کا مرض واقعی بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ صفائی کا خیال رکھیے یہ اپنی مقررہ مدت میں اچھا ہوتا ہے۔ خدا سے امید ہے، وہ جلد آپ کو شفایاب فرمائے گا۔

اتنی سخت علالت میں آپ کے مشاغل نہایت قابلِ مبارکباد ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ عقل و حواس پر قابو پا رہے ہیں۔ تکلیف اور خوف کا احساس آپ سے دور ہو رہا ہے۔ ماشاءاللہ۔ اس کا آپریشن نہ کرائیں، ورنہ پیر کا معاملہ ہے۔ میں نے لاہور کے ایک حکیم صاحب سے دریافت کیا تھا۔ آپ یہ علاج ضرور کیجیے۔ ۳ ماشہ ہنگ کو پیاز میں رکھ کر گرم کر لیجیے۔ اس کے بعد روزانہ کھا لیجیے۔ صرف تین دن استعمال کریں۔ تیل اور ترشی وغیرہ کا پرہیز ہے۔

جس جگہ نارو ہے اس پر چنبیلی کے پھول روزانہ شب میں باندھ لیں۔ انشاءاللہ جلد صحت یابی ہو جائے گی۔

آپ کی نارو والی نظم بہت دلچسپ ہے۔ باقی خیریت ہے۔ خدا حافظ۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

نارو سے متعلق نظم درج ذیل ہے۔ لمعہ

نارو کے درد کا بھی عطیہ ہمیں ملا ۔۔۔ یہ درد کیا ہے، تارِ محبت کا سلسلہ

ہے سوز اس میں آتشِ نمرود کا نہاں ۔۔۔ سوزش بھی اس کی سودِ محبت کی ہے زباں

ناردو کا تار عشق کی زندہ مثال ہے ۔ پیچیدگی میں اس کی قیامت کی چال ہے
بچپن سے جو کہ آتشِ نمرود میں پلا ۔ خائف وہ درد سے کہیں نار و کے بھی ہوا

ڈاکٹر لمعہ

اقبال کے قلم سے اس نظم کے بارے میں دلچسپ کا لفظ لکھوایا گیا ہے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ بو اسیر وہ چاہے خونی ہو یا بادی) یا ناردو یا سوزش اور جلن والے اور امراض کو اگر عطیہ کہا جائے تو سوال پیدا ہوگا کہ کس کا عطیہ ؟ محبت کا لفظ خالص جسمانی اور مبتذل معنوں کا حامل ہو جاتا ہے ۔تارِ نظر تو ہوتا ہے ۔ دامن اور گریباں کا تار ہوتا ہے ۔ قوام کا اور نہاری کا تار ہوتا ہے ۔ یہ محبت کا تار کیا ہے ۔ اور پھر تار نہیں ، بلکہ تار کا سلسلہ ۔ زیادہ معنی تلاش کیے جائیں تو ذم کے پہلو نکلنے لگیں گے ۔ اقبال سے اس نظم کو دلچسپ قرار دلوایا گیا ہے ۔ اور سوءِ محبت کی زیاں سوزش بھی ہے ۔ پرہیز کو اقبال نے بے شک ایک جگہ تانیث کے صیغے میں نظم کیا ہے ۔ لیکن زیاں کو تانیث کے صیغے میں اگر وہ دیکھتے تو یقیناً دلچسپ کہتے ۔ لیکن یہ خط چوں کہ اقبال کے قلم سے نہیں ہے ۔ اس لیے آگے گفتگو فضول ہوگی ۔ پہلے محبت کا تار تھا ۔ اب ناروکا تار آگیا ۔ نارو کی بیماری میں بدن پر جہاں پھنسی ہوتی ہے ۔ اس میں سے تار نکلتا ہے ۔ جو کیڑہ ہوتا ہے ۔ تکلیف دہ بیماری ہے ۔ اس کا ذکر ذوقِ سلیم پر بار ہے ۔

آتشِ نمرود اقبال کے یہاں استعارہ ہے کہ اس سے گلزارِ خلیل کھلتا ہے ۔ آتشِ نمرود عشق کی آزمائش کا بھی استعارہ ہے ۔ لیکن یہاں کچھ اور ہی بات ہے ۔ تیسرے مصرع میں آتشِ نمرود کی توصیف کا پہلو ہے ۔ اور ساتویں مصرع میں نہایت مبہم اور اپنے والدین کو گالی نظم کی گئی ہے اس لیے بچپن سے آتشِ نمرود میں پلنے کا ذکر ہے ۔

نہایت غیر معیاری ، زبان اور بیان کی خامیوں سے چھلکتی ہوئی نظم ہے ۔ اس سے لمعہ کی شاعرانہ صلاحیت یا عدمِ صلاحیت واضح ہوتی ہے ۔ زیادہ سے زیادہ اسے پست معیار کی اسلوبِ اقبال کی پیروڈی کہہ سکتے ہیں ۔

نظم کے آخر میں مصنف نے خود کو ڈاکٹر کے خطاب سے سرفراز فرمایا ہے ۔

اقبال کی طبیعت میں شوخی تھی ، اور جب ان کی رگِ ظرافت پھڑکتی تھی ، تو اکبر الہ آبادی کے

رنگ میں شعر بھی کہہ لیتے تھے۔ اُن کی نثر عام طور سے سنجیدہ پیرائے میں ہے۔ ۲۳ سالہ نوخیز عباس کو "محترم بندہ ڈاکٹر عباس علی خاں" لکھ کر مخاطب کرنا قرین قیاس نہیں۔ علامہ اردو زبان پر، نظم اور نثر دونوں میں قادر تھے۔ "آپ کی طویل علالت کی خبر سن کر مجھے افسوس ہوا" ایسا جملہ ہے، جس سے اس خط کا اقبال سے منسوب کیا جانا قطعاً نادرست ہو جاتا ہے۔ خبر پڑھ کر نہیں خبر سن کر۔ کس سے سُن کر؟ لمعہ کے کسی خط کا یہ جواب علامہ کی طرف سے لکھا گیا ہے۔ اگر نارو والی نظم کا ذکر اس میں نہ ہوتا تو کھینچ تان کر اکبر رحمانی کے لیے اس پر اصرار کرنے کی گنجائش ہوتی کہ علامہ نے اپنے حلقے کے کسی ادب نواز سے شاعر نارو کی علالت کی خبر سنی ہوگی۔ لیکن ایسی گنجائش قطعی نہیں ہے۔

"تکلیف اور خوف کا احساس آپ سے دور ہو رہا ہے"۔ یہ جملہ بھی اقبال سے منسوب نہیں کیا جا سکتا خوف کا احساس تو کم یا دور ہو سکتا ہے، لیکن جب تک تکلیف ہے۔ تکلیف کا احساس کیسے دور ہو سکتا ہے؟ آخر عمر میں اقبال ذہنی طور سے فعال تھے۔ وہ ایسا جملہ نہیں لکھ سکتے تھے۔ لمعہ ایسے لوگ ایسا لکھ سکتے تھے، اور اکبر رحمانی جیسے لوگ ہی اسے اقبال سے منسوب کرنے کی نازیبا جرأت کر سکتے ہیں۔

لاہور کے کسی حکیم؟ بمبئی میں رہنے والے کسی مریض کے علاج کے سلسلہ میں مشورہ اقبال کرتے؟ اس وقت جب وہ خود بھی بہت صحت مند نہ تھے! اور پھر علاج ملاحظہ فرمائیے:

"تین ماشہ ہینگ کو پیاز میں رکھ کر گرم کر لیجیے"۔ (کتنا ___ اور کتنی دیر، اور کس طرح؟ کرچھے میں؟ دو سکوروں میں، براہِ راست آنچ میں دستے سے پکڑ کر، یا انگاروں پر رکھ کر، ڈھاک کے انگاروں پر یا اپلوں پر؟ دہکتی ہوئی آگ میں، یا نرم آنچ پر، بجھے ہوئے چولھے کی گرم راکھ پر؟) کچھ نہیں۔ بس گرم کر لیجیے۔ "اس کے بعد روزانہ کھا لیجیے"۔ یہاں لیجیے اقبال کی زبان نہیں ہے۔ یہ لمعہ کے گاؤں کی زبان ہے۔ اکبر رحمانی کو یہ نہیں کھٹکی اس لیے ان کی بھی یہی بولی ہوگی۔

"اور اب زبان کا دھماکہ خیز استعمال، جو شاعر مشرق سے کرایا گیا ہے:

"اس کے بعد روزانہ کھا لیجیے۔ صرف تین دن استعمال کریں" صرف تین دن استعمال کرنا ہے تو روزانہ کھا لیجیے کیا معنیٰ!

کیا ۱۹۳۴ء میں یہ اقبال کی زبان ہے!

نواں خط

عزیزم عباس علی خاں صاحب سلمہ

السلام علیکم۔ رجسٹر اور خط موصول ہوا۔ نظمیں ایک جگہ سب کی سب محفوظ ہیں۔ انتخاب آپ کی مرضی پر موقوف ہے۔ نظم ہو یا غزل، مختلف مضامین کی حامل ہوتی ہے، اور ناظرین یا سامعین کی طبائع مختلف۔ اس لیے میرے خیال میں اشعار کا انتخاب مشکل کام ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مدارج کے لحاظ سے منتخب کیا جائے آپ کا ایک خاص رنگ ہے۔ اور آپ کے اکثر اشعار ایک وجدانی کیفیت رکھتے ہیں اپنے مجموعۂ کلام کے لیے آپ نے جو نام تجویز فرمائے۔ ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ اور سب نام ایک سے ایک بہتر۔ نظر انتخاب کہیں جمتی نہیں۔ میری رائے میں آپ اپنے جملہ کلام کو، ایک ہی نام سے معنون کریں "تقدیر امم" موزوں نام ہے۔

میری صحت بحمداللہ اچھی ہے۔ اور موسم ناگوار نہیں ہے۔ خصوص صبح میں اچھی سردی رہتی ہے۔ آپ کا خیال درست ہے۔ چہل قدمی ضرور مفید ہوگی انشاءاللہ آپ کی ہدایت پر ضرور عمل کروں گا۔ یہاں سب خیریت سے ہیں۔ امید ہے کہ آپ بھی بعافیت ہوں گے۔

مکرر: یاد آوری کا شکریہ

آپ کا مخلص

محمد اقبال لاہور

۲ر فروری ۱۹۳۳ء

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر خط میں اقبال سے لمعہ کی دلداری کرائی جاتی ہے۔ ہر بات میں توصیف، ہر بات میں تائید۔ نارو والی نظم صرف اس لیے نقل کی گئی ہے کہ ایسے کلام بلاغت نظام کا اقبال کو شیدا ثابت کیا گیا ہے، اور ایسے کلام کے لیے ان سے تقدیر امم جیسا ٹائٹل اقبال سے تجویز کرایا گیا ہے۔ شاید تقدیر امم کو موزوں اور مناسب ثابت کرنے کے لیے ہی بعد میں نظم

نارو لکھی گئی۔ شاید علامتی طور پر یہ کہنا مقصود ہو کہ امت مرحومہ نارو میں مبتلا ہے، لیکن لمعہ نہ اتنے پڑھے لکھے تھے، اور نہ اُن کا ذہن یہاں تک پہنچ سکتا تھا۔ اُن کے سامنے تو بالِ جبریل کا یہ شعر رہا ہوگا۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

اور اسی سے انھوں نے اپنے بے وجود سے مجموعۂ کلام کے لیے تقدیرِ اُمم کو چن لیا۔ اور اقبالؔ سے یہ نام تجویز کرا دیا۔ اکبر رحمانی کو اس بات پر اصرار ہے کہ یہ خط کھرا ہے، اور اقبالؔ نے لاہور سے ۲ فروری ۱۹۳۳ء کو لکھا تھا۔

ماسٹر اختر نے ص ۵۲ پر زندہ رود سے جاوید اقبال کا یہ اقتباس پیش کیا ہے:
"۱۰ فروری ۱۹۳۳ء کو وینس سے بحری جہاز کونٹے وردی پر (اقبالؔ) سوار ہوئے، اور ۲۲ فروری ۱۹۳۳ء کو بمبئی پہنچے۔"

ماسٹر اختر نے واضح کیا ہے کہ جس تاریخ کو لمعہ کے نام اقبال کا یہ خط لکھا جانا ——— اور لاہور سے لکھا جانا ظاہر کیا جاتا ہے، اقبال تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد پیرس میں تھے۔ اقبال ۷، اکتوبر ۱۹۳۲ء سے ۲۵ فروری ۱۹۳۳ء تک لاہور میں تھے ہی نہیں۔

شاید اکبر رحمانی کوئی جواز، کوئی استدلال، کوئی توجیہہ پیش کرنا چاہیں۔ حیرت تو علامہ اقبالؔ کے برادرِ اکبر شیخ عطا محمد پر ہے، کہ انھوں نے اقبال نامہ میں جعلی خطوں کی بھرمار کر دی۔ انھوں نے معمولی احتیاطیں بھی نہیں برتیں!

دسواں خط

مجی لمعہ صاحب

تسلیم۔ آپ کا عنایت نامہ ملا۔ یاد فرمائی کا شکریہ

خدا کا شکر ہے کہ آپ خیریت سے ہیں۔ یہاں گرمی شروع ہو چکی ہے۔ لیکن رات نسبتاً تکلیف دہ نہیں ہے۔ اپریل اور مئی کے یہ دو مہینے یہاں سخت تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ دیہات میں تو عموماً موسم اچھا ہوتا ہے یہاں

مرض چیچک کی وجہ سے لوگ بہت پریشان ہیں۔ اب کے کسی سرد مقام پر جانے کی فکر میں ہوں۔ مگر اب تک مقام تجویز نہیں ہوا۔ اگر جانا ہوا تو آپ کو اطلاع دوں گا۔ آپ کے خطوط اور خیالات کو پڑھ کر مجھے بے حد مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اس اخلاق کا شکر گزار ہوں۔ ہاں۔ آج کل کیا مشاغل ہیں۔ آپ بھی جوان اور آپ کی شاعری بھی جوان۔ مجھے تو آپ کی نظموں میں ایک خاص جذبہ نظر آتا ہے۔ اور زبان کی سلاست سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ جو کچھ کہہ جاتے ہیں، بلا قصد کہہ جاتے ہیں۔ اسی کا نام آمد ہے۔ یہ کیفیت منجانب اللہ ہے۔ کوشش سے حاصل نہیں ہوتی۔ رند کہتا ہے شعر؛

مشق کر مشق کہ تا لطفِ سخن پیدا ہو۔
خود بخود شعر میں بیساختہ پن پیدا ہو

عید الفطر کی پیشگی مبارکباد بھیجتا ہوں۔ یا شاید وقت پر ہی پہنچ جائے۔ خدا حافظ

آپ کا مخلص

محمد اقبال

۱۹؍ مارچ ۱۹۳۳ء

عید الفطر کی پیشگی مبارکباد اقبال سے ۱۹؍ مارچ ۱۹۳۳ء کو دلوا کر، لمعہ نے اپنے جعل کے لیے ایک بہت واضح سراغ اس خط میں چھوڑ دیا۔ تقویم کی رو سے اس سال شوال کی پہلی تاریخ ۲۸ جنوری کو تھی۔ اور اس روز شنبہ تھا۔ ملاحظہ فرمائیں تقویم ہجری و عیسوی، مرتبہ ابو النصر محمد خالدی، بنظر ثانی محمود احمد خاں (انجمن ترقی اردو ہند، دہلی) ص ۶۸۔

۱۔ یاد فرمائی نادرست نہیں ہے۔ لیکن رائج نہیں ہے۔ یاد فرمانے کے لیے شکریہ یا یاد آوری کے لیے شکریہ معیاری فقرے ہیں۔

۲۔ رات نسبتاً تکلیف دہ نہیں ہے، اس طرح منفی معنوں میں اس طرح کا بیان اقبال کے قلم سے منسوب کرنے میں تردد ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہ اسلوب علامہ کا نہیں۔ رات نسبتاً کم تکلیف دہ ہے یا رات نسبتاً ٹھنڈی / آرام دہ ہے ـــــ یہ زبان اقبال کی ہو سکتی تھی۔

۳۔ چیچک فارسی لغت ہے۔ اور مرضِ چیچک، اضافت کے ساتھ قواعد کی رو سے درست ہے، لیکن اقبال چیچک کا مرض لکھتے۔ یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اقبال پنجابی تھے، لیکن داغ کے شاگرد بھی تھے، اور چاہتے تو خالص زبان کی شاعری کرنے پر بھی قادر تھے۔

۴۔ چیچک کی وبا ایسا موضوع نہیں تھا کہ اقبال خط و کتابت میں حشو کے طور پر استعمال کرتے۔

۵۔ اب کے بھی زبردستی رکھا گیا نظر آتا ہے۔

۶۔ "کسی سرد مقام پر جانے کی فکر میں ہوں، مگر اب تک مقام تجویز نہیں ہوا ہے۔" اقبال بے تکلفی سے موثر خط لکھتے تھے۔ عبارت آرائی نہیں کرتے تھے۔ لیکن ایک ہی جملے میں دو جگہ مقام ہرگز نہ لکھتے۔ تجویز بھی اس جملے میں نہیں لکھتے طے لکھتے۔ یہ انشار درست کرنے کی کوشش نہیں، بلکہ اُن کے اسلوب کے پیشِ نظر محلِ نظر مقامات کی نشاندہی کی جارہی ہے۔

۷۔ پھر وہی آپ بھی جوان اور آپ کی شاعری بھی جوان، اقبال ایسی بچکانہ اور بے تکی شاعری کو ہرگز یہ سند نہ دیتے۔ لمعہ نے اپنی شاعری کی تعریف اور توصیف میں جو جملے اقبال کے اس جعلی خط میں لکھے ہیں، ان کا انطباق اُن گھڑ، کہیں کہیں وزن سے ساقط اور غیر مربوط شعروں اور مصرعوں پر نہیں ہوتا۔ جو شخص میرے اور مرے کا فرق نہ جانے —— اور اس میں اکبر رحمانی بھی ان کے شریک ہیں —— وہ تو شاعروں کی سطح سے بھی کچھ نیچے ہے۔

۸۔ اقبال کے کلام، اور ان کے خطوط سے، خاص طور سے جو اصلاح چاہنے والوں کو لکھے ہیں، یہ ثابت ہے کہ وہ شعر میں حشو کو بہت قبیح سمجھتے تھے۔ "آپ کے خطوط اور خیالات کو پڑھ کر مجھے بے حد مسرت حاصل ہوتی ہے۔" اقبال کے قلم سے جملہ نہیں ہو سکتا۔ خیالات کو پڑھ کر، ایسا فقرہ ہے، جس کے مفہوم سے لمعہ اور رحمانی بے شک آشنا نہ ہوں، لیکن اقبال بخوبی واقف تھے خیالات پڑھنا، قیافہ شناسی تو نہیں، لیکن اسی کی قسم سے ہے۔ بے حد مسرت حاصل ہوتی ہے، بھی اقبال کا اسلوب نہیں ہے۔ مسرت ہوتی ہے۔ یا خوشی ہوتی ہے۔ کے بجائے بے حد تصنع آمیز جملہ اقبال سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ خواہ مخواہ جملے کو طوالت بخشنے کے لیے حاصل کا حشو بھی ٹھونک دیا!

۹۔ ہاں، آج کل کیا مشاغل ہیں، بھی خطوں میں اقبال کا اسٹائل نہیں لمعہ ثابت کیا کرنا

چاہتے تھے ؟ اقبالؔ ان کے لنگوٹیا یار تھے ؟

ان شہادتوں اور تجزیے کی بنا پر یہ خط جعلی قرار پاتا ہے ۔ ماسٹر اخترؔ نے ص ۵۴ پر ایک ایسا ثبوت بھی فراہم کیا ہے ، جو مطلق ہے ۔ لاہور سے ۹ ؍ مارچ ۱۹۳۳ء کو اقبال یہ خط لکھ ہی نہیں سکتے تھے ۔ زندہ رود میں جاوید اقبال نے ص ۵۰۶ پر لکھا ہے ۔

”۸ ؍ مارچ ۱۹۳۳ء کو اقبال ، ڈاکٹر انصاری کی دعوت پر جامعہ ملیہ میں رؤف بے کے دو خطبوں کی صدارت کے لیے دہلی پہنچے ۔ ۔ ۔ “

اکبر رحمانی اس خط کو کھرا مانیں تو یہ غیر متوقع نہیں ۔ کیوں کہ وہ لمعہ کے ہمزاد یا قائم مقام ہمزاد ہیں ۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اقبال کے برادر اکبر نے یہ جعلی خط اقبال نامہ میں شامل کیا ۔

پندرہواں خط

مکرم بندہ ، ڈاکٹر لمعہ

تسلیم ۔ نوازش نامہ کا شکریہ

خدا کا شکر ہے کہ میری صحتِ عامہ اب اچھی ہے ۔ مگر حلق کی تکلیف ہنوز باقی ہے آپ کے افسانے اور کلام بعد مطالعہ واپس کر رہا ہوں ۔ ماشاءاللہ خوب ہیں ۔

رموزِ فطرت کا اک مبصر ترے خیالوں میں گا رہا ہے
تو خود شناسی سے اپنی دنیا کو رازِ انساں بتا رہا ہے

امید ہے کہ جناب کا مزاج بخیر ہوگا ۔ خدا حافظ ۔

مخلص محمد اقبال لاہور

۱۲ ؍ اپریل ۱۹۳۴ء

یہ خط صرف اس بنیاد پر جعلی قرار پاتا ہے کہ صحتِ عامہ اردو میں ایک اصطلاح ہے ۔ اگرچہ اقبالؔ نے عربی میں ایم ۔ اے کیا تھا ، لیکن عربی کے دخیل الفاظ وہ عربی قواعد کے مطابق نہیں ، اردو قواعد اور رواج کے مطابق استعمال کرتے تھے ۔

مکرم بندہ ، لمعہ جیسے نوخیز ، سبز رنگ والے کے لیے اٹ پٹا طرزِ تخاطب ہے ۔ ہنوز باقی ہے ، میں ہنوز بھی حشو ہے ۔ یہ اقبالؔ کا کیا شاگرد ہے ، جسے وہ صرف کلام کی داد دیتے رہیں ،

اس پر اصلاح نہیں دیتے۔ کسی خط میں زبان و بیان اور خیال کے بارے میں کوئی نکتہ نہیں!
اس بیت کا لمعہ کی شاعری سے کیا تعلق ؟۔ یہ بیت بھی تحقیق طلب ہے کہ کیا اقبال اسے اس خط میں نقل کرتے ؟
امید کہ مزاج بخیر ہوگا اقبال کا اسلوب ہو سکتا ہے۔ یہ جناب کیوں ؟

سولہواں خط

لاہور
ار دسمبر ۱۹۳۴ء

مکرم بندہ

آپ کا گرامی نامہ مل گیا میری طبیعت بحمداللہ اب اچھی ہے۔
حکیم نابینا صاحب دہلی والے علاج کر رہے ہیں۔ فرق ضرور ہے، مگر عام طور پر گفتگو کرنے میں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ جناب کی گراں قدر رائے کا شکریہ ـــــ
انشاء اللہ ضرور بھوپال جاؤں گا، اور بجلی کے علاج سے بھی استفادہ حاصل کروں گا
میں نے صحت کی مجبوریوں کے باعث ولایت جانے کا قصد ترک کر دیا ہے۔
میں نے آپ کا تازہ کلام دیکھا ہے اور تازہ ترنظمیں بھی۔ مجھے شعریت سے زیادہ معنویت نظر آئی، اور میں بے حد متاثر ہوا، میری یہ خواہش ہے کہ اس قدرتی عطیہ کو آپ بہترین طریقے سے استعمال کریں۔ آپ کے اشعار وجدان کے حامل ہیں۔
آپ کے وقتاً فوقتاً ہدایات کے لیے میں جناب کا شکر گزار ہوں۔

مخلص

محمد اقبال لاہور

خط بنانے والے سے، چالاکی کے باوجود بھلی چوک یہ ہوئی کہ جب ابتدا میں مقام (لاہور) دائیں کونے میں، اوپر لکھا ہے، تو دستخط کے بعد لاہور کیوں ہے۔ اقبال ہرگز ایسا نہ کرتے۔ یہ خط یقیناً پیڈ پر لکھا ہوا پلان نہیں کیا گیا تھا۔ سرنامے کی عبارت اس میں نہیں ہے۔

ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے بہت صحیح محاکمہ کیا ہے کہ اقبال استفادہ حاصل کروں گا نہیں لکھ سکتے تھے، اس لیے یہ خط جعلی ہے۔

خود لمعہ کم استعداد انسان تھے۔ اقبال نے عربی میں ایم، اے کیا تھا۔ استفادہ عربی لغت ہے اور اس کے معنی ہیں فائدہ حاصل کرنا۔ حاصل کا مفہوم اس لفظ میں شامل ہے۔ استفادہ کیا جاتا ہے۔ حاصل نہیں کیا جاتا۔ اشک کا شعر ہے۔

پوچھتے ہی پوچھتے پہنچے مکاں یار تک
استشارہ کرتے کرتے استفادہ ہو گیا

لمعہ نے کئی خود نوشتہ خطوں میں، جو اقبال کی طرف سے لکھے ہیں اقبال سے استفادہ حاصل کرایا ہے یا لمعہ کے استفادہ حاصل کرنے کی بات ہے۔ ظاہر ہے یہ سب خط جعلی ہیں، کیوں کہ اپنی کسی اور تحریر میں علامہ نے استفادہ حاصل نہیں کیا ہے۔

ماسٹر اختر نے ص ۶۸ پر لکھا ہے:

"کچھ حضرات حیاتِ اقبال اور مکاتیب اقبال کے مطالعے، اور ان کے سیاق و سباق میں جائے بغیر یہ مانتے ہیں کہ محض ایک غلطی کی بنا پر لمعہ کے نام کے تمام خطوط کو جعلی قرار دے دینا، ان کے ساتھ ناانصافی ہے۔ مثلاً اکبر رحمانی صاحب فرماتے ہیں۔

خطوں کے متن میں اس قسم کی غلطیاں ناقل یا کاتب سے سرزد ہوئی ہیں اور خطوطِ اقبال کا کوئی بھی مجموعہ غلطیوں سے پاک نہیں ہے۔

اختر نے اس عبارت کے لیے شاعر اقبال نمبر ۱۹۸۸ء، ص ۱۵۷ کا حوالہ دیا ہے۔

یہ عبارت اکبر رحمانی سے منسوب کر کے ان سے جلدی میں افسوسناک تسامح ہوا ہے۔ یہ اقتباس شاعر کے ادارتی نوٹ سے جو لیا گیا ہے، جس کا عنوان ہے۔ اقبال بنام لمعہ حیدرآبادی۔ اوپر کے نصف صفحہ پر ادارتی نوٹ ہے۔ اور نیچے کے نصف صفحہ پر ۱۳ جون ۱۹۳۳ء کے خط کا عکس ہے۔ (جو اقبال کی تحریر ہے) اور جس سے اس مقالے کا آغاز ہوا ہے۔ مثلاً ادارتی نوٹ کی اہمیت کے پیش نظر، اسے نقل کیا جاتا ہے۔

اقبال کے خط کا یہ عکس اقبال نامہ (حصہ اول مطبوعہ ۱۹۴۴ء، صفحہ نمبر ۱۲۷، مرتبہ

شیخ عطا محمد سے لیا گیا ہے۔ اقبال کے لمعہ کے نام خطوط کو جعلی اور وضعی کہا گیا ہے۔ ڈ ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے اقبال نامہ (حصہ اول) پر اظہار رائے کرتے ہوئے، ان خطوں کو جعلی قرار دیا ہے۔ (اقبال کا فکر و فن، مرتبہ افضل حق قریشی، مطبوعہ ۱۹۷۷ء، لاہور) ۲۳ فروری ۱۹۳۵ء کا (کذا!) ئے، خط بنام لمعہ میں اقبال نے ایک جگہ تحریر کیا ہے۔

میں یہ سن کر بہت خوش ہوا کہ آپ مثنوی مولانائے روم سے استفادہ حاصل کر رہے ہیں

خط میں ایک ٹکڑا (کذا! ٹکڑے) استفادہ حاصل کرنا کو بنیاد بنا کر تمام خطوط کو جن کی تعداد ۲۹ ہے جعلی اور وضعی قرار دینے کو عبدالواحد معینی نے بھی درست تسلیم کیا ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ؛

”ڈاکٹر تاثیر نے قطعی طور پر ثابت کر چکے ہیں کہ اکثر وہ خطوط، جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اقبال نے ڈاکٹر لوما کو لکھے تھے۔ جعلی ہیں۔

نقش اقبال از عبدالواحد معینی مطبوعہ ۱۹۶۹ء (لاہور)

محض ایک ٹکڑے کو بنیاد بنا کر بہت سے خطوط و شواہد کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ بعض ثقہ ماہر اقبالیات عبدالواحد معینی کو درست مانتے ہیں۔ معینی صاحب نے لمعہ کا نام کہیں جگہ غلط، یعنی لوما تحریر کیا ہے۔ خطوں میں اس نوع کی غلطیاں ناقل یا کاتب سے سرزد ہوئی ہیں، اور خطوطِ اقبال کا کوئی بھی مجموعہ غلطیوں سے پاک نہیں ہے۔“

اس ادارتی نوٹ کو، جو بہ ظن غالب، افتخار امام صدیقی کا لکھا ہوا، ماسٹر اختر نے اکبر رحمانی کی تحریر سمجھا۔ یہ تسامح شاید اس وجہ سے ہوا کہ ص ۸ پر ترتیب کے تحت اقبال بنام لمعہ حیدرآبادی کا مصنف اکبر رحمانی کو بتایا گیا ہے۔ اس عنوان سے جو مضمون ہے وہ ص ۱۶۳ سے شروع ہوتا ہے۔ اسی عنوان کے تحت اقبال کے قلم سے خط کا عکس بھی ص ۱۵۷ پر ہے۔

ہم پھر ار دسمبر ۱۹۳۴ء کے خط کی طرف واپس آتے ہیں۔ استفادہ حاصل کرنا نادرست

ہے، اسے قلم کی لغزش بھی تصور نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ یہ فقرہ اور خطوں میں بھی ہے۔ یہ اقبال کی نہیں لمعہ کی زبان ہے۔

"حکیم نابینا صاحب دہلی والے" بھی بمبئی اور اطراف کی زبان ہے۔ اقبال لکھتے تو دہلی کے حکیم نابینا لکھتے۔ اور دہلی کے بھی کیوں لکھتے؟ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے بھائی، حکیم نابینا اپنے زمانے کے مشہور حکیم تھے، اور صرف حکیم نابینا کے عرف سے مشہور تھے۔

یہ بار بار سبز قرینین اپنے لیے اقبال کی طرف سے گراں قدر رائے، جیسے فقرے لکھتے ہیں اور بجلی کے علاج کی بات بھی محلِ نظر ہے۔ لاہور اور دلّی میں بجلی سے علاج کرنے والے معالج موجود تھے۔

"میں نے آپ کا تازہ کلام دیکھا اور تازہ تر نظمیں بھی" نہایت جاہلانہ بیان ہے، اور اقبال سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ تازہ کلام میں تازہ تر نظمیں شامل نہیں تھیں تو کیا مخصوص بیماریوں کے نسخے تھے؟

شعریت سے زیادہ معنویت بھی بے ہودہ فقرہ ہے۔ اشعار میں وجدان کی بات ہے، جو سراسر جعلی ہے۔

آخر میں بھر وہی "آپ کے وقتاً فوقتاً ہدایات کے لیے میں جناب کا شکر گزار ہوں۔" جناب قطعاً حشو ہے۔ اقبال نے اس طرح گڑگڑا کر کسی کی نہ تو تعریف کی ہے اور نہ اس طرح بچھ بچھ گئے ہیں۔

یہ خط سراسر جعلی ہے۔

خط نمبر ۱۷

لاہور

۱۱ر دسمبر ۱۹۳۴ء

جنابِ من۔ آپ کا خط مل گیا ہے۔ الحمدللہ میری صحت عامہ اچھی ہے۔ مگر گلے کی شکایت ابھی رفع نہیں ہوئی۔ گو کسی قدر بہ نسبت سابقہ فرق ضرور ہے حکیم نابینا صاحب دہلی والے علاج کر رہے ہیں، اور صحت کا یقین دلاتے ہیں۔ میں

ولایت اب کے سال نہ جا سکوں ۔

محمد اقبال

۱۔ صحت عامہ اصطلاح ہے۔ اسی کو انگریزی میں پبلک ہیلتھ کہتے ہیں ہو سکتا ہے جنرل ہیلتھ کو حیدرآباد میں صحتِ عامہ کہتے ہوں۔ لمعہ نے علامہ اقبال کی جانب سے اپنے نام یہ خط خود ہی لکھا ہو گا۔

۲۔ "کسی قدر بہ نسبت سابقہ فرق ضرور ہے" یہ جملہ بھی اقبالؔ سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ حکیم نابینا صاحب دہلی والے، پچھلے خط میں بھی یہ فقرہ تھا۔ اقبال یہ نہیں لکھ سکتے تھے اگر پچھلے خط میں دہلی کے حکیم نابینا لکھا ہوتا تو دوسرے خط میں دہلی کے بھی نہ لکھتے۔

۴۔ "علاّمہ اقبال کے مکاتیب" کے عنوان سے شاعر میں ص ۲۰۲ سے ص ۲۴۲ تک علاّمہ کے بھتیجے اعجاز احمد نے اپنی یادداشتیں لکھی ہیں، اور علامہ کے خط بھی دیے ہیں۔ اقبالؔ حکیم نابینا صاحب دہلی والے نہیں کہتے تھے، اور نہ لکھتے تھے۔ ص ۲۳۹ سے یہ یادداشت:

"۱۹۳۷ء میں، میں دہلی میں بطور سب جج تعینات تھا۔ میری اہلیہ کے بدن پر گاہے گاہے . . . سبھی قسم کے علاج کرائے، لیکن کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ ایک دفعہ چچا جان سے اس کا ذکر آیا تو فرمایا۔ تم دہلی میں تعینات ہو۔ حکیم عبدالوہاب صاحب کو کیوں نہیں دکھاتے . . . اپریل میں دو تین دن کے لیے دہلی آئے۔ افغانستان کے قونصل جنرل ان کے دوست تھے۔ ان کے ہاں قیام فرمایا۔ وہاں سے بذریعہ ڈاک مجھے یہ خط میرے دہلی کے پتے پر لکھا:

. . . آج حکیم صاحب نابینا سے ملاقات کی ہے، اور تمہاری بیوی کے متعلق ان سے مفصل کہہ دیا ہے . . . اس خط میں حکیم صاحب کے نام بھی ایک خط ملفوف ہے . . . "

اس خط کا متن ان کا قلمی نہیں، کسی اور سے لکھوایا گیا۔ لیکن دستخط ان کے ہیں۔ قونصل خانہ کا پتہ، اور تاریخ تحریر خط بھی ان کی قلمی ہیں . . . "

حکیم عبدالوہاب صاحب یا حکیم صاحب نابینا کے علاوہ کچھ اور اقبالؔ کے قلم سے منسوب نہیں کیا

جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ دہلی کے حکیم سے پہلے قابل قبول ہو سکتا ہے۔ وہ بھی پہلے خط میں، بعد کے خط میں نہیں۔ واضح طور سے یہ اس اقبال کا خط نہیں ہے۔ جسے علاّمہ اقبال/ڈاکٹر سر محمد اقبال کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اٹھارہواں خط

مخدومی

تسلیم۔ میں یہ خط آپ کو بھوپال سے لکھ رہا ہوں۔ اس سے قبل بھی آپ کو ایک خط لکھ چکا ہوں۔ ملا ہوگا۔ آپ کی تازہ نظم میں پڑھ کر بہت خوش ہوا کہ آپ مثنوی مولانائے روم سے استفادہ حاصل کر رہے ہیں۔ دنیا کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے، وہ آپ کی عمر کی لحاظ سے بالکل درست ہے۔ مگر آپ کو خیال رکھنا چاہیے کہ دنیا ایک بہت اہم مقام ہے۔ اور اس سے صحیح استفادہ حاصل کرنے کے لیے ہمیں انسانِ کامل بننے کی کوشش کرنا چاہیے۔ مولانا رومیؒ کو بغور پڑھیے اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھیے کہ جو کچھ آپ کا ضمیر اس خصوص میں آپ کو مشورہ دے، اس سے انکار نہ ہو۔ میرے گلے کی حالت اب رو بصحت ہے۔ آپ کے گراں قدر مشوروں کا شکریہ۔

نگہدار آں چہ در آب و گلِ تست　　سرورِ سوز و مستی حاصلِ تست

تہی دیدم سبوئے ایں و آں را　　مئے باقی بہ مینائے دلِ تست

آپ نے میرا حال دریافت فرمایا ہے۔ شکریہ۔

زندہ ہوں۔ دل مضمحل، مسرت فنا، اللہ اللہ خیر صلاّ۔ خدا حافظ

مخلص محمد اقبال لاہور

۲۰ فروری سنہ ۱۹۳۵ء

جعل سازی لمعہ نے کی تھی، اس لیے اس طرف ان کا دھیان نہیں گیا کہ خط کا بھوپال سے لکھنا دکھایا گیا ہے۔ پہلی سطر میں۔ اور مکتوب نگار "مخلص محمد اقبال لاہور" ہے۔ یعنی مکتوب نگار خط لکھتے وقت تو بھوپال میں تھا، اور خط کے اختتام کے وقت لاہور میں۔

یہ نہایت واضح پہلو ہے اس جعلی خط کا، جو اکبر رحمانی کے علاوہ سب کو پہلی نظر میں دکھائی دیتا ہے۔ ماسٹر اختر نے ص ۴۳، پر اس کی نشاندہی کی ہے۔

اس شہادت کے بعد، جعلی کردار کی وضاحت کے لیے اور اندرونی شہادتیں پیش کرنا لازمی نہیں ہیں۔ مخطوطہ/نسخہ شناسی کے طلبہ کے لیے ان کی نشاندہی کرنا مفید ہوگا۔

۱۔ "میں یہ سن کر بہت خوش ہوا"۔ اقبال نہیں لکھ سکتے تھے۔ بھوپال میں اقبال کو لمعہ کے بارے میں کوئی بات کون سناتا؟ سر راس مسعود؟ نواب حمید اللہ خاں؟ یا مفتی محمد انوار الحق؟ سبز قرین لمعہ کو پڑھ کر اور سُن کر کا بھی فرق نہیں معلوم تھا! اور اکبر رحمانی بھی شاید اس فرق کی اہمیت سے آگاہ نہیں۔

۲۔ اس خط میں بھی لمعہ پر استفادہ حاصل کرنے کی دھن سمائی ہوئی ہے۔

۳۔ یہ جملہ بے ہودہ ہے "جو کچھ آپ کا ضمیر اس خصوص میں آپ کو مشورہ دے، اس سے انکار نہ ہو" اس جملے کو اقبال سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ جو خطوں میں براہ راست، ترسیل کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ گنجلک جملے، چبا چبا کر کاغذ پر نہیں اگلتے۔ خصوص کا یہ استعمال اقبال کے یہاں نہیں ملتا، اور اقبال کے اسلوب سے بعید ہے۔

۴۔ "گلے کی حالت اب روبصحت ہے" اقبال کیا، کوئی ادیب نہیں لکھے گا۔ "گلا بہتر ہے اب میں روبصحت ہوں"۔ روبصحت مریض ہوتا ہے، کوئی عضو نہیں ہوتا۔

۵۔ خیر سلاّ سین سے ہے۔ ص سے نہیں۔ املے کی یہ غلطی لمعہ اور اکبر رحمانی جیسے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ اقبال زبان اور محاورے کے بارے میں بہت محتاط تھے۔

جو حضرات اللہ اللہ خیر سلاّ میں ص سے صلاّ لکھتے ہوں، وہ درست املا کی تصدیق کے لیے نور اللغات اور فرہنگِ آصفیہ سے رجوع کریں۔ فرہنگِ آصفیہ میں خ کے تحت خیر سلاّ دیکھیں۔ فیروز اللغات میں بھی خیر سلاّ اسی املے سے ملے گا۔

۶۔ آخری سطر اقبال کے اسلوب میں ہے ہی نہیں۔

۷۔ خط اگر بھوپال سے لکھا گیا ہوتا، تو اس پر بھوپال کا پتہ ضرور ہوتا، اور یہ اطلاع بھی ہوتی کہ بھوپال میں کب تک قیام رہے گا۔ بھوپال پہنچنے کی تاریخ کے علاوہ بھوپال کے حالات

خاص طور سے علاج کے سلسلہ میں کوئی فقرہ یا جملہ ہوتا۔

۸۔ اور سب سے آخر میں (نظم کے اصلاح سے مستغنی ہونے کی بات حقارت سے نظر انداز کرتے ہوئے) القاب و آداب کی بات۔ اس سبز قرنین کو شاید مخدومی کے معنی بھی نہیں معلوم تھے اور مولانائے روم سے استفادہ حاصل کرنے کا عزم!

انیسواں خط

مکرمی لمعہ صاحب

السلام علیکم

آپ کا عنایت نامہ ابھی ابھی ملا۔ آپ کی بار بار یاد فرمائی کا بے حد ممنون ہوں یہاں اب گرمی شروع ہو چکی ہے۔ نو دس بجے صبح خاص گرمی رہتی ہے۔ ایسے موسم میں علی العموم میرا معدہ اور بھی خراب ہو جاتا ہے۔ آپ کا خیال درست ہے، اور میرا بھی یہی تجربہ ہے۔ دوا سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ مجھ کو تقلیل غذا مفید ہوتی ہے۔ اسی پر عمل پیرا ہوں۔ کسی دوا کا سر دست استعمال نہیں ہے۔ گوشت تو میں نے ترک کر دیا ہے۔ البتہ مرغ اور مچھلی استعمال میں ہے۔ اور میں صرف ایک دفعہ دوپہر میں جو کچھ کھا لیتا ہوں، کھا لیتا ہوں۔ اور شب میں فاقہ۔ اس طریقِ عمل سے مزاج صاف رہتا ہے۔ مگر تولیدِ ریاح اور قبض بدستور۔ خیر خدا کو جو منظور ہے، ہو رہے گا۔

آپ کے حسب الحکم . . . . (پڑھا نہیں جا سکا) . . . کی گولیوں کا استعمال جاری ہے۔ اور لسی بھی استعمال کرتا ہوں، جس سے اختلاج میں ضرور افاقہ ہے۔ اس کے ساتھ، آپ کی حسبِ خواہش، آنولے کا مربہ بھی استعمال کر رہا ہوں۔

آپ کا کلام میرے حدِ مذاق تک، بہت پُر لطف ہے۔ اس کی اشاعت میں تامل کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ آپ کے شوق کی بات ہے۔ میں نے حتی الامکان جہاں جہاں ضرورت معلوم ہوئی، ترمیم کی ہے۔ لیکن آپ کے تخیل کو مجروح ہونے سے بچایا ہے۔ طبع کے وقت مکرر غور بھی ممکن ہے، اور انتخاب بھی۔

یہ سب چیزیں بالمشافہ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص محمد اقبال لاہور

۲۳، مارچ ۱۹۳۵ء

خط ہی میں اس کے جعلی ہونے کے سراغ موجود ہیں، ماسٹر اختر نے اپنی کتاب میں ص ۴، اور ص ۵، پر اندرونی شہادتیں پیش کی ہیں۔ سب سے اہم شہادت یہ ہے کہ تاثر یہ دیا گیا ہے کہ اقبال وہ گولیاں استعمال کر رہے ہیں جو لمعہ نے تجویز کی ہیں، لیکن خود ہی ان گولیوں کا نام نہ پڑھ سکے۔ احتیاط کے طور پر انھوں نے اس جعلی خط میں دوا کا نام نہیں لکھا، حالاں کہ کسی بھی کمپونڈر سے پوچھ کر لکھ سکتے تھے، تاکہ گرفت نہ ہو۔ لیکن اس کے لیے انھوں نے جو ڈرامائی ترکیب کی، وہ ان کی ناتجربہ کاری کی دلیل ہے۔

خط زبان اور بیان کی خامیوں سے بھرا پڑا ہے۔ اقبال کے کرم فرما ہیں ان خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان باتوں کا اور اضافہ کیا جا سکتا ہے:

۱۔ "تقلیل غذا مفید ہوتی ہے" مفید کا یہ استعمال اٹ پٹا ہے۔ تقلیل غذا، مثبت نہیں، منفی حالت ہے۔ اس کے لیے مفید کا استعمال محاورے کے خلاف ہے۔ پھر تقلیل غذا بول چال کی ترکیب نہیں ہے۔ اقبال کے خطوں میں روزمرہ کا استعمال ہوا ہے۔ غذا کم کرنے سے مجھے آرام ملا، یا ایک وقت، اور وہ بھی ہلکی غذا سے مجھے فائدہ ہوا، کچھ اس طرح اقبال لکھتے۔

۲۔ مرغ اور مچھلی استعمال میں ہے، یہ بھی زبان و بیان کے اعتبار سے، اقبال کا اسلوب نہیں جو چیز استعمال میں ہوتی ہے، وہ استعمال سے ختم نہیں ہوتی۔

۳۔ اس طریق عمل سے مزاج صاف رہتا ہے، — یہ جملہ بھی اقبال سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ مزاج صاف رہنا، کوئی روزمرہ نہیں ہے۔ طریق عمل بھی اقبال نہیں لکھتے۔ اقبال لکھتے تو لکھتے ایسا کرنے سے سکون ملتا ہے۔

۴۔ "خیر خدا کو جو منظور ہے، ہو رہے گا" — یہ بھی اقبال کا اسلوب نہیں ہے۔

۵۔ حتی الامکان کے ساتھ جہاں جہاں ضرورت معلوم ہوئی، بھرتی کا فقرہ ہے۔ اقبال

بے ضرورت الفاظ کا انبار نہیں لگاتے تھے۔

۶۔ "آپ کا کلام میرے حدِ مذاق تک بہت پر لطف ہے"۔ جملے کی ایسی ساخت کہیں اور اقبالؔ کی تحریر میں نہیں ہے۔

۷۔ بالمشافہ کون سی سب چیزیں ٹھیک ہو جائیں گی، جب جہاں جہاں ضرورت تھی، اور حتی الامکان ترمیم کر دی گئی تھی۔ پاس ادب کی وجہ سے اقبالؔ سے اصلاح یا درستی کے الفاظ نہیں لکھوائے گئے۔ صرف ترمیم کرائی گئی!

اس بالمشافہ پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کسی خط سے یہ نہیں کھلتا کہ سبز قرین لمعہ ۱۹۳۵ء میں قیام پذیر کہاں تھے؟ بمبئی میں موصوف کے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اگر یہ مان بھی لیں کہ انھوں نے ڈپلومہ کورس کیا، تو ۱۹۳۴ء میں اُنھیں بمبئی سے فارغ ہو کر اپنی جاگیر پر واپس جانا چاہیے تھا۔ "اقبال بنام لمعہ حیدر آبادی" میں اکبر رحمانی نے اقبال نامہ کے دیباچے سے شیخ عطا محمد کا جو اقتباس دیا ہے، اس میں یہ جملہ دیکھیے:

"شیخ عبدالقادر نے مجھ پر سب سے بڑا کرم یہ کیا کہ ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ حیدر آبادی، جاگیر دار تونڈاپور، مشرقی خاندیش سے میرا تعارف کرایا۔"

مکڑی دوسرے کیڑے مکوڑوں کو پکڑنے کے لیے جال بنتی ہے۔ ۸ر جولائی ۱۹۹۱ء کے ہماری زبان میں ان کا مضمون ایسا جال ہے۔ جس میں وہ خود پھنس گئے ہیں، اور انھیں احساس تک نہیں۔ ۱۳ر جون ۳۲ء کے اقبال کے مکتوب کے لفافے کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے ـــــ اور یہ عبارت فوری حوالے کے لیے دوبارہ نقل کی جاتی ہے:

اس لفافے پر انگریزی میں لمعہ کا درجِ ذیل پتا تحریر ہے، اور یہ انگریزی تحریر بھی علامہ اقبالؔ ہی کی ہے:

M. ABBAS ALI KHAN ESQ
TONDPUR P.O.
DISTRICT EAST KHANDESH
VIA PACHORA JUNC.

گویا سنہ ۳۲ء ہی میں سبز قرنین بمبئی سے مشرقی خاندیش، اپنی جاگیر میں آکر رہنے لگے تھے۔
ایک کج بحثی یہ کی جاسکتی ہے کہ نہیں صاحب۔ اُن کا قیام بمبئی ہی میں تھا۔ گرمیوں کی تعطیلات
میں اپنی جاگیر کے انصرام پر نظر ڈالنے کے لیے مشرقی خاندیش آجاتے تھے۔ چلیے مان لیا۔ اگرچہ
میڈیکل اسکول کے طالب علم نہیں رہے تھے، پھر بھی گرمیوں کی تعطیلات میں جاگیر پر جاگیرداری
کرنے آجاتے تھے۔ لیکن سنہ ۳۵ء میں تو انھیں اس زمانے کے خاندیش، اور آج کے جلگاؤں
میں ہونا چاہیے تھا۔ ان کی جاگیر (اگر کوئی تھی)، بمبئی اور بھوپال کے تقریباً وسط میں تھی۔ جتنا فاصلہ
جھانسی اور بھوپال کے درمیان ہے۔ تقریباً اتنا ہی فاصلہ جلگاؤں/کھنڈوا اور بھوپال کے
درمیان میں ہے۔ یہ سبز قرنین کیا کٹھور دل تھا کہ وہ اقبال، جس کو اپنے کلام بلاغت نظام،
کو ارفع و اعلیٰ بتانے کے لیے اس نے بے دریغ استعمال کیا۔ وہ بھوپال آیا تو اس کو اپنا
چہرۂ زیبا دکھانے کے لیے خاندیش سے بھوپال تک نہ جاسکا۔ اور اس خط میں بالمشافہ ٹھیک
ہو جائیں گی، کا ذکر ہے۔ ہے نا نہایت سنجیدہ مذاق؟ ہوسکتا ہے تولید ریاح اور قبض سے
لمعے کے کلام کا حدِ مذاق تک پُر لطف ہونے کا کوئی رشتہ ہو کہ دونوں ہم آہنگ ہوں، اور
بالمشافہ بے آہنگ اور درست ہونے کا امکان ہو!

بیسواں خط

لاہور

۱۱ر مئی ۱۹۳۵ء

محترمی بندہ

تسلیم۔ آپ کا نوازش نامہ مل گیا۔ بحمد اللہ۔ میری صحت اب بہتر ہے۔ آپ کے
مشورے کا شکریہ۔ انشاء اللہ آپ کے حسبِ خواہش ضرور بھوپال جا کر بجلی کا
علاج کراؤں گا۔

آپ کے افسانوں اور مثنوی سے میں نے استفادہ حاصل کیا ہے۔ افسانے
نہایت دلکش اور مؤثر ہیں۔ زبان شستہ ہے۔ مثنوی کا آغاز بہت اچھا ہے
خدا کرے اس کا اختتام بھی اچھا ہو۔ آپ کے خطوط کے ورود سے مجھے بے حد

خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور میں آپ کے خیالات کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔

لندن کا سفر ملتوی کرنے کا ارادہ ہے۔ آپ کے ایما پر ٹیگور میری مزاج پرسی کے لیے لاہور آئے تھے۔ مگر میں لاہور میں موجود نہ تھا۔ اس لیے ملاقات نہ ہوسکی۔ آپ انھیں مطلع کردیں۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

نیازمند

محمد اقبال لاہور

اقبال، سماجی روابط کے آداب کا بڑا لحاظ رکھتے تھے۔ اگرچہ لمعہ کے نام ان کے خطوط، جو اقبال نامہ میں ہیں، یا تو جعلی، یا وضعی ___ یا کسی اور کے نام ہیں، جو ترمیم کے ساتھ یا ترمیم کے بغیر لمعہ نے اپنے کھاتے میں ڈال لیے ہیں۔ لمعہ کے کچھ خطوں کا جواب اقبال نے دیا ہوگا۔ اگر اقبال کو خط لکھے گئے ہوں، کیوں کہ علامہ خطوں کا جواب ضرور دیتے تھے۔ اگر ولایت جانے سے پہلے یہ بات ان کی عادت میں تھی، تو دورانِ قیام یورپ میں یہ ان کی سرشت میں داخل ہوگئی۔ اگر ٹیگور اقبال سے ملنے لاہور گئے ہوتے تو وہ خود ٹیگور کو خط لکھتے۔ سبز قرنین کے توسط سے، اور سبز قرنین کے قلم سے مطلع نہ کراتے۔ یک روکھا فقرہ ہے۔ یہ تک نہیں کہ "میرا اسلام پہنچا دیں" اور شکریہ ادا کریں۔ میں بھی ان کے نیاز حاصل کرنے کا خواہش مند تھا" اقبال کو انتہائی بدلحاظ اور بداخلاق ظاہر کیا گیا ہے۔

لمعہ اپنے خطوط کے ورود کے بجائے خطوط کے ورود مسعود کا فقرہ بھی لکھوا سکتے تھے۔

جو الفاظ / فقرے اقبال کے اسلوب سے باہر ہیں، یا لغوی اعتبار سے نادرست ہیں ان پر خط کھینچ دیا گیا ہے۔ شائع میں اقبال کے خط اپنے والد، اپنے برادر بزرگ اور بھتیجے کے نام شامل ہیں۔ ان میں انھوں نے کہیں بحمداللہ نہیں لکھا ہے۔ الحمدللہ۔

اقبال کی ایک عادت اور ہے۔ مکتوب الیہ کے لیے ایک ہی القاب و آداب قائم رکھتے ہیں۔ مثلاً حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو مخدوم مکرم خاں صاحب / جناب قبلہ خاں صاحب۔ اور لمعہ جیسے سبز قرنین نے خود کو مخدومی سے مخاطب کروایا۔ اور ہر خط میں القاب و آداب بدلوائے ہیں

یہاں تک کہ محترمی بندہ اور مکرم بندہ جیسے القاب کا غبن بھی کیا۔

۱۱ مئی کے اس خط میں یہ لحاظ بھی نہ رکھا کہ سبز قرنین بھوپال سے ۲۰ فروری کو ایک خط علامہ سے اپنے نام لکھوا چکے تھے!

اس خط میں ٹیگور کا ذکر ہے۔ اور ٹیگور کے خطوط بھی سبز قرنین کے نام ہیں، اس لیے اس مقام پر اگر ٹیگور بنام لمعہ کی مراسلت کو پرکھ لیں تو مفید ہو گا۔

عطا محمد کو لمعہ نے خوب خوب چڑایا۔ اپنے نام ٹیگور کا خط یا اس کا عکس دینے کے بجائے اس کا ترجمہ دے دیا۔ اور وہ انھوں نے آنکھوں سے لگا کر اقبال نامہ کے دیباچہ میں شامل کر دیا۔ سرنامے القاب و آداب اور آخر خط کے بغیر BODY OF THE LETTER دیباچہ میں ہے۔ ماہنامہ نیرنگ خیال (لاہور) کے سالنامے میں پورا خط ہے۔ عبارت میں جزوی اختلاف ہے، لیکن اسے یہ کہہ کر اس سے صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے، کہ دو مختلف ترجمے ہیں۔ نیرنگ خیال میں چوں کہ پورا خط ہے، اس لیے اقبال کے کرم فرما کے صفحات ۱۰۳ اور ۱۰۴ سے نقل کیا جاتا ہے:

وشوا بھارتی

شانتی نکیتن۔ بنگال ۷ فروری ۱۹۳۳ء

محبی ڈاکٹر خاں

آپ کے خط اور نظم نے میرے دل پر خاص اثر کیا۔ مجھے یہ سُن کر بڑی مسرت ہوئی کہ آپ میری اور اپنے شاعرِ اعظم سر محمد اقبال کی نظموں کے درمیان ایک خاص اندرونی تعلق پاتے ہیں۔

چوں کہ میں اس زبان سے نابلد ہوں، جس میں وہ اپنا کلام فرماتے ہیں۔ اس لیے میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں اُن کی اپج کی گہرائی یا ان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کر سکوں۔ لیکن ان کی عالمگیر شہرت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں جاودانی علم و ادب کی عظمت ہے۔

بارہا اس چیز نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے کہ نقادوں کی ایک جماعت میری اور سر محمد اقبال کی ادبی کوششوں کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر غلط فہمیان

بھیلانے کی کوشش کرتی ہے، اور یہ رویہ اس ادب کے متعلق بالکل غلط ہے، جو انسانی دل و دماغ کے عالمگیر پہلو سے بحث کرتا ہے۔ اور اس طرح تمام ملکوں اور زبانوں کے شعراء، اور اہلِ فن کو، ایک برادری میں منسلک کرنے کا سامان پیدا کرتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ سر محمد اقبالؔ اور میں ادب میں صداقت اور حسن کی خاطر کام کرنے والے دو دوست ہیں، اور اس جگہ یکجا ہو جاتے ہیں، جہاں انسانی دماغ اپنا بہترین ہدیہ جاودانی انسان کے حضور میں پیش کرتا ہے۔

خیر اندیش

رابندر ناتھ ٹیگور

رابندر ناتھ ٹیگور کے اصل انگریزی خط کو اخفا میں لکھا گیا۔ کئی غلط بیان دینے کے بعد، اکبر رحمانی نے بڑی پچھاڑیں کھائیں، اور آخر زچ ہو کر ٹیگور کا یہ خط پیش کیا:

VISVA BHARATI
SHANTINIKETAN
BENGAL

February 7, 1933

My dear Dr. Khan,

Your letter and poem have touched my heart. It has given me deep pleasure to know that you have found an inner affinity between my poems and those of your great poet Sir Mohammad Iqbal.

Not knowing the language in which he writes his original poems, I am not in a position to reach the depths of his creative productions or properly evaluate them but I am assured through wide fame they have won that they carry the majesty of eternal literature.

It has pained me after to find certain class of critics trying to create mis-understanding by ranging my literary works against those of Sir Mohammad Iqbal on a competitive basis. This is an entir_ly arronesus attitude towards literature which deals with the universal aspects of human mind and heart and therefore provides a plat-form where poets and artists of all lands and times can fraternise.

I am sure, bothe my self and Sir Mohammed Iqbal are comrades working for the cause of truth and beauty in literature and meet in a realise shere the human mind after its best gifts to the shrine of the eternal man.

With kind regards,

Sincerely yours,

Sd. Rabindernath Tagore

To
Dr. M. Abbas Ali Khan Lamma Esqr.

قومی زبان کراچی، جنوری ۱۹۸۷ء میں ص ۳۲ پر[1] اکبر رحمانی نے یہ اظہار کیا ہے کہ ڈاکٹر لمعہ مرحوم نے مرنے سے چند ماہ قبل اصل خط راقم الحروف کے حوالے کیا تھا۔"

چوں کہ یہ خط متنازعہ فیہ مسئلہ بن گیا ہے۔ اس لیے اس دستاویز کے مالک اور لمعہ کے ادبی وکیل ہونے کی حیثیت سے ان پر واجب تھا کہ اس خط کا عکس پیش کرتے۔ میں نے اکبر رحمانی کو تین خط لکھے ہیں، اور ان سے گزارش کی ہے کہ اس معاملہ پر واضح بیان دیں، اور اطلاع دیں کہ اقبال کے کرم فرما میں ص ۱۱۱ پر ٹیگور کے خط کا جو متن انگریزی میں ہے، وہ اصل کے مطابق ہے یا اس میں اور اس نقل میں علاماتِ اوقاف سمیت کوئی فرق ہے۔ اگر ٹیگور کے اس خط کا وجود ہے تو رحمانی اس کا عکس بھیج دیں گے۔

سرسری نظر ہی سے یہ خط جعلی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کم استعداد طالب علم یا مدرس نے اردو عبارت کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

ٹیگور انگریزی زبان کے مزاج سے آشنا، اور اس کے اداشناس تھے۔ یہاں تک کہ ٹھاکر کو انگریزیا کر ٹیگور کر لیا گیا تھا۔ غالب نے کچھ لوگوں کو متصدیوں والی فارسی لکھنے کا طعنہ دیا تھا۔ ٹیگور سے منسوب یہ خط متصدیوں والی انگریزی کی اچھی مثال ہے۔ فقروں اور جملوں کی ساخت سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا عرض کر دیا جائے کہ MYSELF ایک لفظ ہے، مرکب لفظ، ضمیر متکلم۔ اس خط میں دو مفرد لفظ لکھے ہیں۔ اسی طرح Plat - form ہائفن کے ساتھ ٹیگور نہیں لکھ سکتے تھے۔ اس طرح لمعہ یا اکبر رحمانی کی استعداد ہی کے لوگ لکھ سکتے تھے۔

آخر میں with kind regards نیم سرکاری خطوں میں لکھا جاتا ہے۔ ذاتی خطوں میں kind regards کی جگہ good wishes یا Warmest good wishes وغیرہ لکھتے ہیں۔

یہ اہم نکتے ہیں، لیکن خط کے مکتوب نگار سے انتساب، اور اس کے استناد کے سلسلے میں

---

[1] اقبال کے کرم فرما؛ ص ۱۰۷

ان کو پس پشت ڈالا جا سکتا ہے۔
آخری پیراگراف یوں شروع ہوتا ہے :

I am sure, bothe my self and Sir Mohammed Iqbal are comrades ----

ٹیگور ہی نہیں، کوئی بھی شخص جو انگریزی کلچر اور زبان کے مزاج سے واقف ہے آداب کی ایسی خلاف ورزی کر کے خود کو غیر مہذّب اور کندۂ ناتراش نہیں ثابت کرے گا۔ ایسے موقعوں پر، مہذب گفتگو میں اور تحریر میں بھی، اپنا نام، یا ضمیرِ متکلم بعد میں رکھتے ہیں MYSELF (یہاں بھی متصدیوں والی انگریزی ہے (MY SELF۔ قواعد کی رو سے I اور بول چال کی رو سے ME درست ہے۔ ٹیگور یہی جملہ لکھتے تو کچھ یوں لکھتے :

I trust, Sir Mohammed Iqbal and I, bothe are comrades

اس میں تو کسی حد تک مفروضے کو دخل ہے کہ ٹیگور اگر یہی مفہوم ادا کرتے تو کیا عبارت لکھتے لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ گنوارو انگریزی میں اقبال کا نام ضمیرِ متکلم کے بعد نہ لکھتے
اگر زبان و بیان اور آدابِ نگارش کی یہ بھسنڈ غلطیاں نہ بھی ہوتیں تو آخر میں :

Dr. M. Abbas Ali Khan Lamma Esqr.

سے بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔
ESQR مخفف ہے ESQUIRE کا۔ اور یہ لاحقۂ تعظیمی ہے۔ یہ لاحقۂ تعظیمی صرف اس صورت میں لگتا ہے، جب کوئی سابقۂ تعظیمی نام سے پہلے نہ لگا ہو۔ لمعہ نے تعظیم کو کس کر اپنے نام کے ساتھ بندھا رکھنے کے لیے نام سے پہلے، سابقہ ڈاکٹر بھی لکھوا دیا، اور بعد میں لاحقہ لکھوا کر بھی لکھوا دیا۔ ٹیگور کو لمعہ اپنی سطح پر اتار لائے۔ اور لمعہ کی سطح پر اکبر رحمانی خود اتر آئے۔ اس نقلی خط کو نوشتۂ ٹیگور ثابت کرنے کے لیے۔ یا ہو سکتا ہو رحمانی کو نیچے اترنے کی زحمت نہ کرنا پڑی ہو!

لاحقہ کے سلسلے میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے، اس سے انگریزی خواں طبقہ یقیناً واقف ہوگا۔ اکبر رحمانی اور اسی قماش کے دوسرے محققوں کو فوری استفادے کے لیے مشورہ ہے کہ شاعر ص ص ۵۴، ۵۵ اقبال کی اسناد کے عکس ملاحظہ فرمائیں۔ جن حضرات کے ناموں سے پہلے سر/ دی رائٹ آنریبل سر کا سابقہ لگا ہے۔ ان کے ناموں کے بعد اسکوائر کا لاحقہ نہیں ہے۔

پھر سب سے بڑی بات ہے کہ آنند نرائن ملاؔ نے شاعری کی ابتدا، اس صدی کی دوسری دہائی میں شکوہ کے انگریزی ترجمے سے کی تھی۔ نکلسن اسرار خودی کا انگریزی میں ترجمہ کر چکے تھے۔ لمعہ اقبال کو تو کتابیں بھیجا کرتے تھے۔ انھوں نے ٹیگور کو کلام اقبال کے ترجمے بھیجے؟ THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHTS IN ISLAM کی جلد ٹیگور کو نہ بھیجی۔ اگر ٹیگور سے ان کی خط و کتابت ہوتی تو یہ کتابیں انھوں نے ضرور بھیجی ہوتیں!

اکیسواں خط

محبی لمعہ صاحب سلمہٗ

تسلیم۔ ابھی محبت نامہ صبح صبح ملا، حالاں کہ میرے لب تبسم آشنا نہیں ہیں۔ تاہم آپ کے خط سے متبسم ہو جاتے ہیں۔ آپ کی نثر بھی نظم سے کم نہیں ہوتی۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

آپ کی نظم و نثر کی بیاض محفوظ ہے۔ کہیں کہیں درست کرنے کی ضرورت پڑی واپس کرنے میں خوف ہو رہا ہے۔ کیا واپس ہی کر دوں؟ لیکن پہنچنے نہ پہنچنے کا میں ذمہ دار نہیں۔ یا رہنے دیجیے۔ یا جب آپ سے ملاقات ہوگی دست بدست لے لیجیے۔ بہر حال جو مناسب ہو مطلع فرمائیے۔

آپ کے مشاغل کیا ہیں۔ کیا شاعری جاری ہے؟ کبھی کبھی، جب طبیعت لگے، ضرور شعر کہیے۔ آپ کی طبیعت شاعری کے مناسب ہے، اور آپ کی نظموں میں مجھ کو لطف آتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی نثر میں لکھیے۔ آپ کی نظم بھی دلچسپ ہوتی ہے۔

خدا نے آپ کو ادب کی خدمت، مخلوق کی خدمت (ڈاکٹری) کے ساتھ ساتھ کرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور جوانوں کو کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے۔ خدا حافظ

مخلص محمد اقبال لاہور

۲۱ر جون ۱۹۰۴ء

عباس علی خاں کا سنہ پیدائش ۱۹۱۱ء ہے۔ سنہ یا تو لمعہ ہی نے غلط لکھا، یا مرتب / کاتب (اقبال نامہ) سے غلطی ہوئی۔

۱۱ر مئی ۱۹۳۵ء کے خط میں تو لمعہ نے اپنے افسانوں اور مثنوی سے استفادہ حاصل کرایا تھا۔ افسانے نہایت دلکش اور موثر ہونے کی داد بھی اقبال سے حاصل کی تھی۔ ۲۳ر مارچ کے خط میں کلام بلاغت نظام پر حتی الامکان جہاں جہاں ضرورت تھی ترمیم بھی کرالی تھی۔ ایسا تاثر یہ خط دیتے ہیں کہ اقبال کو اس سبز قرنین کی نثر و نظم کی تعریف کرنے کا مالیخولیا تھا۔ اگر اقبال مالیخولیا کے مریض اور مراقی تھے، تو یہ خط اقبال کا ہے۔ اگر اقبال ان امراض کا شکار نہیں تھے تو مکتوب الیہ کو یہ امراض لاحق تھے۔ اور در مدحِ خود، یہ خط شاید اُن ہی کی تصنیف ہیں۔

"ڈاک سے واپس کروں تو تلف ہو جانے کا اندیشہ ہے" کیا یہ مضمون اقبال ادا نہیں کر سکتے تھے؟ کیا اقبال جیسا قادر الکلام شاعر، جس نے فلسفے اور اقتصادیات پر انگریزی میں سہی، تحقیقی مقالے لکھے۔ اور اردو میں جس کی تحریریں اتنی ہیں کہ ایک کتاب میں نہیں سماتیں، خوف اور اندیشے کے فرق سے واقف نہیں تھا؟ پھر ایک چیز رجسٹری بھی ہوتی تھی، اور بیرنگ خط بھی اس لیے لکھے جاتے تھے کہ ڈاک میں گم یا ضائع نہ ہوں۔

بائیسواں خط

عزیزم ڈاکٹر عباس علی خاں صاحب لمعہ سلمہ،

نوازش نامہ مل گیا۔ بحمد اللہ سب خیریت ہے۔ آپ کے انگریزی نظموں کا مجموعہ میں نے بغور دیکھا ہے۔ اور ٹیگور کے خطوط بھی۔ ٹیگور آپ سے بے حد خوش ہیں اور کیوں نہ ہوں۔ انگریزی زبان پر آپ کو بھی اچھا خاصا عبور ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔

مشق کیے جائیے۔ اور جو کچھ آپ کا ضمیر آپ کو لکھائے، فوراً قلم بند کر لیا کریں۔ مگر ایک بات یاد رکھیے۔

آپ چند روز کے لیے آرام کر لیں۔ ورنہ آپ کی صحت پر بہت بار پڑے گا۔ میری صحت ٹھیک ہے، مگر روز بروز انحطاط محسوس کر رہا ہوں ادویات استعمال کر رہا ہوں۔ میں تجدید حیات اور شباب کا قائل نہیں ہوں۔ فطرت کا قانون اٹل ہے۔

نواب عزیز یار جنگ کے کلام کا مجموعہ ارمغانِ عزیز جسے آپ نے تحفتہً مجھے بھجوایا ہے، ملا۔ شکریہ۔ ان کی ہستی حیدرآباد کے لیے مایۂ ناز ہے۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ خدا حافظ

مخلص محمد اقبال لاہور

۷ر جولائی ۱۹۳۵ء

ٹیگور کے خطوں کی جو نقلیں اقبال کو بھیجی گئی تھیں، لیکن ان کے مفہوم لمعہ نہیں سمجھتے تھے؟ ٹیگور آپ سے بے حد خوش ہیں، ایسا جملہ ہے، جو ریکارڈ کے لیے اقبال کے قلم سے لکھوایا گیا ہے، تاکہ سند رہے؛ انگریزی پر عبور کی جو سند حاصل کی گئی ہے، اس کی حقیقت تو ٹیگور کے اُس خط سے آشکارا ہو گئی، جس پر گفتگو ہو چکی ہے۔ لمعہ کو ایسا عبور حاصل تھا کہ انھوں نے اپنے نام سے پہلے ڈاکٹر کا سابقہ لگوا لیا، اور نام کے بعد اسکوائر کا لاحقہ بھی! جعل سازی کے لیے صرف عقل سے کام نہیں چلتا۔ علم کی بھی تھوڑی بہت ضرورت ہوتی ہے۔

"جو کچھ آپ کا ضمیر آپ کو لکھائے" اقبال کے قلم سے نہیں ہو سکتا۔ دل لکھائے، یا جذبہ لکھائے ہونا چاہیے تھا۔ ضمیر کی تو دہائی دی جاتی ہے، سچ بولنے، حقیقت کا اظہار کرنے کے لیے۔

یہ عجیب بات ہے۔ لمعہ صحت کے سلسلے میں علامہ کو مشورہ دیتے تھے۔ اور یہاں علامہ چند روز آرام لینے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ چند روز کیوں؟ آرام لیں، اقبال کی زبان نہیں ہے۔

پچھلے ایک خط میں ر۱۹واں خط، اقبال سے لکھوایا گیا" آپ کا خیال درست ہے اور میرا بھی یہی خیال ہے کہ دوا سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا" پھر اسی خط میں اپنی تجویز کی ہوئی وہ گولیاں بھی کھلوا دیں، جن کا نام پڑھا نہ جا سکا۔ اور معالج کو یاد بھی نہ رہا کہ اٹکل سے پڑھ لیتا۔ زیرِ نظر

خط میں ہے۔ "ادویات استعمال کررہا ہوں۔"

یہ جملہ حیرت میں ڈالنے والا ہے "میں تجدید حیات اور شباب کا قائل نہیں ہوں۔" مافیہ پر گفتگو سے پہلے، جملے کی ساخت کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔ جس سال کا یہ خط اقبال کا بتایا جاتا ہے۔ اس سال میں امیرالدولہ اسلامیہ ہائی اسکول میں ثانوی سطح کا طالب علم تھا۔ اور قواعد میں عطف و اضافت کے بارے میں سبق پڑھ چکا تھا۔ اگر یہ جملہ غلطی درست کرنے کے لیے امتحان میں دیا جاتا تو بیشتر طلبہ کی طرح میں بھی تجدید حیات اور شباب سے اور ہٹا کر تجدید حیات و شباب کر دیتا۔

ظاہر ہے قواعد کی رو سے ایسا ناقص جملہ اقبال نہیں لکھ سکتے تھے۔ اس طرح کی ایک خامی بھی ان کے ذخیرۂ نظم و نثر میں نہیں ہے۔ ممکن ہے کبھی خط میں واقعی علامہ نے لمعہ کو مشورہ دیا ہو کہ مشق کریں۔ یہ جملہ انھوں نے ایک جگہ سے زیادہ جعلی اور وضعی خطوں میں اقبال کی طرف سے لکھوایا ہے۔ افسوس انھوں نے اس پر عمل نہیں کیا۔ واؤ عطف کی جگہ عطف اور لکھنے کی ایسی فاش اور فاحش غلطی، صرف اسی سے سرزد ہو سکتی تھی، جس کے مبلغ علم کی اعلیٰ ترین سطح وہ ہو، جو ڈاکٹر عباس علی لمعہ سلمہٗ کی تھی۔ یا جو اکبر رحمانی کی ہے، کہ وہ ان خطوط کا مکتوب نگار ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال ایم اے (عربی)، ایم اے (فلسفہ)، پی ایچ ڈی کو سمجھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ، دونوں سبز قرنین عباس علی خاں لمعہ ہیں! "روز بروز انحطاط محسوس کررہا ہوں۔ ادویات استعمال کررہا ہوں۔ میں تجدید حیات و شباب کا قائل نہیں ہوں۔ فطرت کا قانون اٹل ہے۔"

تجدید حیات شاید کایا کلپ کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ صحت مند قویٰ سے اقبال کو چڑ نہیں تھی۔ اور اسے وہ فطرت کے قانون کی خلاف ورزی نہیں سمجھتے تھے، اگر کبرسنی میں بھی کوئی صحت مند رہنے کی کوشش کرے۔ قدرت کا قانون اگر اٹل ہے تو ادویات استعمال کرنے کی کوئی منطقی وجہ نہیں۔ جن لوگوں نے اقبال کو پڑھا ہے وہ اقبال کے خیالات سے واقف ہیں۔ صرف ایک مثال: اپنے ۲۰ جون ۱۹۰۸ء کے خط میں انھوں نے اپنے والد کو لکھا،

قبلہ و کعبہ السلام علیکم

آپ کا والا نامہ ملا۔ الحمد اللہ کہ آپ کی صحت اچھی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ دیر تک آپ کا سایہ ہمارے سر پر رکھے گا۔ بھائی صاحب نے اس سے پہلے کسی خط میں آپ کے انتظامِ خوراک وغیرہ کے بارے میں لکھا تھا۔ یہ طریق بہت اچھا ہے، اور اسی کو دستور العمل بنانا چاہیے۔ میں نے یورپ کے ایک مشہور حکیم کی کتاب میں دیکھا ہے کہ جو شخص ہر روز دہی کی لسّی پیا کرے اس کی عمر بڑھتی ہے وہ کہتا ہے کہ انسان میں ایسے جراثیم ہیں، جو قاطعِ حیات ہیں، اور دہی کی لسّی ان جراثیم کے لیے بمنزلہ زہر کے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاؤں کے رہنے والے لوگ شہریوں کی نسبتاً عموماً طویل العمر اور تندرست ہیں۔ علی بخش نے کل مجھے بتایا کہ اس کی بچی کی لمبی عمر ہوئی۔ اور آخر میں اس کا گزران زیادہ تر لسّی پر تھی، (کذا) ترش لسّی تو شاید آپ کے لیے مفید نہ ہو کہ آپ کا گلا خراب ہے۔ البتہ میٹھے دہی کی لسّی اگر صبح پی جائے، تو شاید مفید ہو۔ اس کا تجربہ بھی کرنا چاہیے۔ . . میری خواہش تھی کہ سال کا زیادہ حصہ آپ میرے پاس بسر کیا کرتے۔ ذرا ریل کا انتظام ٹھیک ہو جائے، تو انشاء اللہ آپ کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوں گا۔ . . روحانی کیفیات کا سب سے بڑا ممد و معاون یہی کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط ہے۔ نبی کریم کی ساری زندگی اس بات کا ثبوت ہے۔ میں خود اپنی زندگی، کم از کم کھانے پینے کے متعلق اسی طریق پر ڈھال رہا ہوں . . . "

ایک تو زیرِ غور جملے میں واؤ عطف کی جگہ آ رہے ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ جملہ اقبال کے قلم سے نہیں ہے۔ پھر مندرجہ صدر اقتباس سے واضح ہو جاتا ہے کہ زندگی ـــــ انفرادی زندگی کی بقا کے لیے ان کا جو نظریہ تھا، لمعہ کے نام خط میں یہ جملہ اس کی نفی کرتا ہے۔ اس میں تقدیر پر قانع رہنے کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ جو اقبال کے فلسفۂ خودی کے سراسر خلاف ہے۔ اعلیٰ مقاصد سے خودی کی نمود ہوتی ہے، اور اعلیٰ مقاصد کے لیے انفرادی زندگی کی بڑی اہمیت ہے۔ کارِ جہاں دراز ہے۔ تو اسے سرانجام دینے کے لیے ابدی نہیں تو عمرِ دراز ضرور چاہیے۔

اقبال کے ذخیرے میں عباس علی خاں لمعہ کی نذر "ارمغانِ عزیز" تھی ضرور، جو انھوں نے اپنے

بھتیجے اعجاز کو دے دی تھی[1]۔ اس پر لمعہ نے تحفہ پیش کرنے کی تاریخ ۱۰ اگست ۱۹۳۴ء لکھی ہے اقبال نے شکریہ کا خط اگست ۳۴ء میں لکھا ہوگا۔ ظاہر ہے یہ رسمی خط ہوگا۔ اس کو دبا کر اس کی جگہ لمعہ نے اگر اگست ۳۴ء کی کسی تاریخ کو اقبال کا خط بنایا ہوتا، تو شاید انھیں شک کا فائدہ بھی کچھ لوگ دے دیتے۔ یہ اگست ۳۴ء کا نہیں، جولائی ۳۵ء کا خط ہے!

مزید چھان بین یا تبصرے کی ضرورت نہیں۔

تیسواں خط

میرے عنایت فرما سلمہ اللہ تعالیٰ

رجسٹرڈ خط ابھی ابھی ملا، جس میں چند نظمیں ملفوف ہیں۔ اس سے قبل بھی ایک رجسٹرڈ اور دو خط مع اشعار موصول ہوئے ہیں۔ آپ کے جواہر پارے گنجِ سخن میں محفوظ ہیں، اور میں دیکھ کر محظوظ ہو رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص محمد اقبال

۱۰ نومبر ۱۹۳۵ء

القاب و آداب کے بارے میں تو سارے خطوں کی ابتدائی خواندگی کے بعد بات ہوگی۔ یہاں اس بات کی طرف توجہ دلانا ہے کہ خط کا دوسرا جملہ گواہی دے رہا ہے کہ یہ خط اقبال نے نہیں لکھا تھا۔ علامہ بڑی پابندی سے خطوں کا جواب دیتے تھے۔ کوئی اہم بات، تفصیل سے نہ لکھنا ہو، تو پوسٹ کارڈ لکھ دیتے تھے۔ لمعہ نے تو ہوا باندھ رکھی ہے کہ اقبال ان کے خطوں سے تسکین حاصل کرتے تھے۔ یہاں ایک رجسٹرڈ اور ایک نہیں دو دو خط آئے اور انھوں نے جواب نہیں دیا۔ رجسٹرڈ میں اتنی نظمیں اور غزلیں، اور انھوں نے رطب اللسانی نہیں کی! یہ پاک طینت عاشقِ کلام لمعہ پر کیا افتاد پڑی ــــ یہ وہ رات دن رجسٹرڈ میں درج کلامِ بلاغت نظام کا ورد کرتے رہے۔ اور زندگی کے سارے قابلِ ذکر اور ناقابلِ ذکر معمولات بھول گئے، جن میں رجسٹرڈ کی رسید اور دو خطوں کے جواب بھی تھے!

'گنج سخن میں محفوظ ہیں'، اقبال کا اسلوب نہیں۔

---

[1] اقبال کے کرم فرما: ص ۸۴

ایک اور اہم نکتہ۔ جس طرح غالب پہلی تاریخ کے لیے اوّل نہیں لکھتے تھے۔ (جعلی دیوانِ غالب بخطِ غالب میں ایک یادداشت کی تاریخ اوّل صفر ہے، جسے مالک رام اور عرشی نے بخطِ غالب تسلیم کیا ہے۔ ان کا موقف نادرست ثابت ہوا) اقبالؔ بھی پہلی تاریخ آر نہیں لکھتے تھے۔ یہ عادت کی بات ہے ضربِ کلیم کی ایک جلد انھوں نے محمود آباد کے راجہ محمد امیر احمد خاں کو پیش کی تو پہلی تاریخ تھی۔ انھوں نے یکم لکھا ہے۔ "لمعہ کے نام" چوتھے خط میں تاریخ یکم فروری ۱۹۳۱ء لکھوائی گئی ہے۔ لیکن آٹھویں خط میں ار اگست ۱۹۳۴ء لکھوائی گئی۔ سولہویں خط میں پھر ار دسمبر ۱۹۳۴ء ہے۔ لمعہ کو ار لکھنے کی عادت رہی ہوگی۔ اقبالؔ یکم لکھتے تھے۔

چھبیسواں خط

لاہور سے ۱۸ر نومبر ۱۹۳۵ء کو انگریزی میں یہ خط لمعہ نے اپنے نام اقبال سے لکھوایا ہے اقبال نامہ میں اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔ اگرچہ اس میں CAT معنی بلّی اور RAT معنی چوہا درج نہیں ہیں۔ لیکن بکری اور بھیڑ کا ذکر ضرور ہے۔ علامہ سے لکھوایا گیا ہے۔ جس کا ترجمہ ہے۔

"آپ نے میرے لیے بکری کا دودھ تجویز فرمایا ہے۔ A یا بھیڑ کا؟ بہرنوع بالکل سیاہ بھیڑ کا میسّر آنا تو نہایت مشکل نظر آتا ہے۔ آپ کا جواب آنے پر اس باب میں آپ کو اطلاع دوں گا۔"

یہاں کئی سوال پیدا ہوتے ہیں:

لمعہ نے میڈیسن میں داخلہ لیا تھا، یا WITCH DOCTOR بننے کی تربیت لی تھی؟ انگریزی اور اردو میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے۔ جس کے تحت بھیڑ، بکری، دونوں آئیں۔ جس کی وجہ سے اقبالؔ کو لمعہ کے خط کا مفہوم سمجھ میں نہ آیا ہو۔ استعارہ کے طور پر BLACK SHEEP سے مراد خود لمعہ کی اپنی ذات تو نہیں تھی؟ کیا ہم یہ فرض کریں کہ اقبالؔ اتنے سادہ لوح تھے کہ ۲۴ر برس کے سبز قرینین کے مشورے پر سنجیدگی سے غور کریں۔ اس سبز قرینین کے، جس نے اگر میڈیسن میں ڈپلومہ کورس کر بھی لیا تھا، تو ناتجربہ کار تھا۔ جب کہ اقبالؔ کو بہترین معالجوں کی خدمات مہیا تھیں۔

اقبال نامہ (حصہ اوّل) کے مرتب یقیناً اس بات کے لیے مبارکباد کے مستحق نہیں ہیں کہ انھوں نے اقبالؔ کا انگریزی خط، ان کی اپنی تحریر میں شامل کرنے کے بجائے اس انتہائی مشتبہ اردو خط کو

شامل کیا۔ جو ترجمہ بتایا جاتا ہے۔ اردو میں بھیڑ اور بکری کے لیے کوئی مشترک لفظ نہ ہونے کی وجہ سے اس کا جعلی ہونا ثابت ہے۔

پچیسواں خط

یہ بھی انگریزی خط کا ترجمہ بتایا جاتا ہے۔ حالاں کہ اردو کی عبارت ایسی ہے کہ اس کا انگریزی ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ چوں کہ یہ ترجمہ ہے۔ اس لیے ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں۔

چھبیسواں خط

لاہور

۲ر اگست ۱۹۳۶ء

مجی

تسلیم۔ آپ کی نظم آج ہی ملی۔ دیکھ کر آج ہی واپس کر رہا ہوں۔ بار بار پڑھا۔ لطف آیا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ میری صحت اب بہتر ہے۔ مگر آواز میں ترقی نہیں ہوئی۔ آپ کے مشورہ کا شکریہ۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

مخلص محمد اقبال

اکبر رحمانی نے "اللہ کرے زور قلم اور زیادہ . . . . کے بعد نقطے دیے ہیں (شاعر ص ۱۶۸) اور اگلی سطریں لکھا ہے۔

اب ذرا وہ نظم اور علامہ کی اصلاح ملاحظہ فرمائیے:

انتخاب کلام لمعہ (شاعر ص ۱۵۶) کا پہلا جملہ اکبر رحمانی کے ذوقِ شعری کی کلید ہے:

"ڈاکٹر عباس علی خاں حیدر آبادی ایک بلند پایہ شاعر، نثر نگار اور انشا پرداز تھے۔"

اب شاعر ص ۱۶۹ پر کلامِ بلاغت نظام، اور علامہ سے منسوب اصلاح پر ایک نظر:

اصلاحِ اقبال

لمعہ	اصلاحِ اقبال
لمعہ ہے نیپئین ہے اور آرزوئے وصال ہے	
مشقِ خرام نیپئین، موسم برشگال ہے	موجیں ہیں زور زور کی، موسم برشگال ہے
ساحلِ نیپئین پر آج عشق کا اور حال ہے	

لب پہ سرورِ سرمدی، حُسن سے قیل و قال ہے
موجیں ہیں نغمہ زن اِدھر، ابر اُدھر ہے اشکبار
دونوں کی کشمکش میں آج، حسن بھی پائمال ہے

دونوں کی کشمکش میں آج ذوق بھی پائمال ہے

بربطِ دل میں لمعہ کے نغمے ہیں وہ نئے نئے
جس کا خدا ہے کارساز، جس میں خودی کا حال ہے
سوزشِ عشق نے مری شمع کو بھی بجھا دیا
میرے صدائے درد میں، ہے تو یہی کمال ہے
علم کی جان و جسم میں میرا قیام ہے مدام
آنکھ میں شمس[1] ہے اگر، دل میں مرے جمال ہے
مجھ سے گناہگار پر اُف رے تری نوازشیں
دل بھی دیا دماغ بھی، جاہ بھی ہے منال ہے
اس کے سوا نہیں کوئی اور تو میری آرزو
وصل ہو دید کا مجھے، دید مرا وصال ہے
جان کے دل کا راز وہ مجھ سے یہ پوچھتے ہیں پھر

جان کے بھی وہ رازِ دل مجھ سے پوچھتے ہیں پھر

آپ چھپا رہے ہیں کیوں، آپ کا کیا سوال ہے
دل بھی دیا دماغ بھی جاہ بھی اور منال بھی
میری اگر ہے کوئی شے، آرزوئے وصال ہے
عشقِ مجاز نے مجھے ذوقِ طلب عطا کیا
دل میں جگر میں آنکھ میں ایک ترا خیال ہے
عرشِ خیالِ شعر پر لمعہ ہے آج جلوہ گر
نوکِ قلم سے زر فشاں رازِ خودی کا حال ہے

---

[1] شمس (تبریزی) جمال سے مراد جلال الدین رومی۔

ہم اس وقت اس بات سے بھی بحث نہیں کریں گے ان اشعار ہیں، جنھیں لمعہ اور اکبر رحمانی، دونوں نظم کہتے ہیں۔ مصنف نے اپنا تخلص ہائے مختفی سے نظم کیا۔ تین مصرعوں ہیں، حالاں کہ ایک مقطع میں ہائے ہوز سے ایک اور جگہ نظم کیا ہے۔ (شاعر: ص ۱۶۱):

اقبال ہوں، رومی ہوں کہ غالب ہوں کہ لمعہ

ہے سب کی فغاں ایک تو اندازِ بیاں اور

یہ اسم عام نہیں، اسم خاص ہے۔ اور اس میں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ خضر کے دو تلفظ کی بحث سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اور نہ نظیر میں خاقانی کے دوسرے تخلص خاقنی کا حوالہ برمحل ہوگا۔ لمعہ بنیادی طور پر شاعر نہیں تھے۔ انھیں شاید احساس بھی نہ ہو، اور اس بات کا علم بھی نہ ہو کہ ان کے تخلص کا وزن کیا ہے۔ جب انھیں اطلاع نہیں تھی، تو ان کے گواہ رحمانی کو۔

پہلا مصرع ہی مضحکہ خیز ہے۔ لمعہ ہے، نیلپیئن ہے اور آرزوئے وصال ہے۔ وصال کس سے؟ وصال کے دو معنی ہیں۔ ایک، محبوب سے خلوتِ صحیحہ۔ وہ معنی یہاں بڑے عجیب سے ہوں گے کیوں کہ بحیرۂ نیلپیئن کے کنارے خلوتِ صحیحہ! وصال کے دوسرے معنی اللہ کے عشق میں جاں بحق ہوجانا۔ یہ معنی کچھ کچھ نکالے جاسکتے ہیں۔ کیوں کہ آنکھ میں (آنکھوں میں نہیں۔ کس آنکھ میں دائیں میں کہ بائیں میں ـــــ یہ لمعہ نے راز رکھا ہے) شمس (تبریز) ہے اور دل میں جمال ہے (اور جمال سے ان کی مراد جلال الدین رومی ہیں)۔ جب چشم و دل میں شمس تبریز اور جلال الدین رومی ہوں، تو کوئی بھکوا معشوق، جو انسان کے روپ میں ان کا ہمعصر ہو، کیسے آرزوئے وصال کا موضوع بن سکتا ہے لیکن پھر عشقِ مجاز نے انھیں ذوقِ سفر دیا۔ وہی مضمون ہوگیا۔ چھوٹی گھوڑی بھوسیلے کھڑی۔ شمس تبریزی اور رومی کو چھوڑ چھاڑ، اگاڑی پچھاڑی تڑا۔ واپس آگئے عشقِ مجاز (ی) کے تھان پر۔ اور محبوب کا خیال دل ہی میں نہیں جگر میں بھی اور آنکھ (صیغۂ واحد) میں بھی پیوست ہوگیا۔ خیال دل و دماغ میں (شاعری کی روایت کے مطابق) ہوتا ہے۔ لیکن لمعہ نے میڈیسن میں داخلہ لیا تھا ANATOMY اور PHYSIOLOGY کی کتابیں دیکھی ہوں گی۔ جگر اور آنکھ میں بھی ایک تیرا خیال ٹرانس پلانٹ کرنے کا گر سیکھ لیا ہوگا۔ اگرچہ اعضا کا ٹرانس پلانٹ ان کے زمانے میں نہیں ہوتا تھا۔

اقبال سے اصلاح بھی دلوائی گئی ہے۔ مشقِ خرام نیلپیئن، موسم برشگال ہے کہ اقبال سے

موجیں ہیں زور زور کی، موسم برشگال، کروادیا ہے۔

اکبر رحمانی صاحب خاص طور سے نوٹ کر لیں۔ موسم برشگال، کاف فارسی سے اقبال رہنے نہ دیتے۔ ورشاکال، سنسکرت کا مرکب لفظ ہے۔ اس کا مفرس برشکال ہے۔ پڑھے لکھے شاعر برشکال، کاف عربی سے لکھتے ہیں۔ لمعہ کا مبلغ علم فارسی سے ظاہر ہے کہ انھوں نے برشگال لکھا۔ اقبال نے اگر واقعی اصلاح دی ہوتی، تو ان مصرعوں کو یک قلم ناقابلِ اصلاح قرار دیتے۔

اور یہ اصلاحی مصرع ملاحظہ فرمائیں۔ موجیں ہیں زور زور کی، موسم برشگال ہے!

سر بفلک ہر ایک موج، موسم برشگال ہے یا سر بفلک ہے موج موج، موسم برشکال ہے، یا کوئی مصرع لکھا جا سکتا تھا۔ اگر ایسا کیا جاتا تو باقی مصرعے بھی معنوی اعتبار سے درست کرنا پڑتے۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ مصرعے اگرچہ بے تکے ہیں، لیکن ہیں وزن میں۔ حیرت اس لیے ہے کہ رحمانی نے لمعہ کی شاعرانہ عظمت کی گواہی میں جو کلام نقل کیا ہے، اس میں ناموزوں مصرعے بھی ہیں۔ چند مثالیں اس کلام بلاغت نظام سے جو اکبر رحمانی نے فخریہ نمونے کے طور پر پیش کیا ہے:

رسولِ خدا بھی ہے قرآں بھی میرا

دو عالم بھی میرے خدا بھی ہے میرا

ردیف تو میرا ہے قافیہ کیا ہے؟ اگر غیر مردف ہے تو دونوں مصرعوں میں ایک ہی قافیہ!

نہ گھر دار اپنا نہ اموال اپنا

یہ دنیا ہے والٹدرین بسیرا

گھر دار یا گھر وار، دونوں یہاں نادرست ہیں۔ اموال جمع ہے مال کی۔ اور اپنا صیغۂ واحد میں ہے۔ دوسرا مصرع بحر سے ساقط ہے۔

متقارب کا سب سے آسان آہنگ ہے۔ اس میں لمعہ کا یہ حال ہے۔

ہیں جو ہوا تو کیا ہوا، اور نہ ہوا تو کیا ہوا   ہونے سے میرے مجھ پہ ہی باب خودی کا وا ہوا

ہو کے شریک سب میں ہیں، سب سے سدا جدا ہوا   پا کے خودی کے باب کو، عشق کا باب وا ہوا

میرا خدا خودی میری، میری خودی میرا خدا   خود میں عیاں ہوا ہوں میں رہ کے جہان سے جدا

قطع نظر اس کے اقبال کے مضامین، کچھ غالب کے خیال آمیز کر کے، اقبال کی پیروڈی کی گئی ہے۔ لیکن یہاں

ان نکتوں پر توجہ دلانا ہے۔

۱۔ لمعہ مسدس کے فارم سے بھی واقف نہیں، دوسرے اور چوتھے مصرعوں میں ایک ہی قافیہ وا ہے، جو لمعہ کے کلام کے اقبال کی نظر سے نہ گزرنے کا ثبوت ہے۔ اقبال سے جتنی تعریف و توصیف لمعہ کے کلام کی کرائی گئی ہے، وہ اقبال کے جعلی خطوط میں ہے۔

اکبر رحمانی نے بھی ان نظموں کو شاہکار قرار دے کر صرف یہ بات ثابت کی ہے کہ موصوف بھی فن شاعری سے نابلد ہیں۔

۲۔ ٹیپ کے شعر میں، پہلا مصرع یوں موزوں ہے:

میرا خدا، خودی مری، میری خودی، مرا خدا

ایک اور بند ہے۔

درس فروش ماسٹر، علم فروش جامعات — روح کی موت بالیقیں علم کی گم ہے کائنات
کھو کے خودی کو اپنے سب بن گئے لات و منات — شیکسپیر کا درس ہے بٹتی ہے حسن کی زکات
مرد کی ہمتیں ہیں پست، مرد کی روح سرد ہے — مغربیت کے رنگ میں زن بہ صفاتِ مرد ہے

آخری مصرع بڑی معنویت کا حامل ہے۔ موصوف کو شیکسپیر کے درس پر بھی اعتراض ہے! بالیقیں کا املا نہ لمعہ کو معلوم تھا اور نہ اکبر رحمانی کو۔ حاصل نہ کیجیے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو! اگر جامعات علم فروش ہیں، تو جب تک علم طلبہ کو قیمتاً بھی فراہم ہے تو منہ بسورنے کی کیا بات ہے۔ خیر ان باتوں کو جانے دیجیے۔ بہ یک وقت اکبر الہ آبادی اور اقبال کی پیروڈی ہے۔ اور ہمیں باور کرانے کی کوشش کی گئی یہ اس کلام پر یا تو اقبال نے اصلاح کی، یا اسے اصلاح سے مستغنی سمجھا! اور یہ بھی کہ وہ اس سے محظوظ ہوئے، اور اس سے استفادہ بھی حاصل کیا۔

تیسرے مصرع کا عروضی پہلو توجہ چاہتا ہے۔

کھو کے خودی (مفتعلن)، کُ اپ نِ سب (مفاعلن)، بن گئے لا (مفتعلن)، ت و منات (مفاعلان)

وعطف کو یک حرفی کے بجائے لمعہ نے وا دو حرفی نظم کیا ہے۔ یہ غلطی تو اوسط درجے کے متشاعر سے بھی نہیں ہوتی۔ دعویٰ ہے کہ یہ کلام اقبال کا اصلاح کردہ ہے۔ اور اسے سراہتے ان کا قلم نہیں تھکتا تھا۔ جتنی نامعتبر لمعہ کی سخن گوئی ہے۔ اگر اس سے زیادہ نہیں تو اتنی ہی نامعتبر اکبر رحمانی

کی سخن سنجی ہے۔

لمعہ نے طرزِ غالب کی بھی ریڑھ ماری ہے، اور اکبر رحمانی نے اسے بھی شاہکاروں میں شمار کیا ہے۔ ایک شعر ہے:

پندارِ مماتقد، عقدہ کشا ہائے نفس ہے کھونا ہے یہاں اور تو پانا ہے وہاں اور

پہلا مصرع وزن سے ساقط ہے، کیوں کہ عقدہ کے عین کو الف موصول کی طرح رکھا گیا ہے۔ عین موصول نہیں ہوتا۔

پندار (مفعول)، مماتقد (مفاعیلُ)، کشا ہائے (مفاعیلُ)، نفس ہے (فعولن)

حشو کے پہلے مفاعیلُ میں مماتقد پڑھا جاتا ہے۔ عین غائب ہے۔ اس کی اجازت نہیں ہے۔ اس لیے یہ مصرع وزن سے ساقط ہے۔

لمعہ نے اپنا کلام اپنے دستِ مبارک سے لکھ کر اکبر رحمانی کو سند اور یادگار کے طور پر دیا تھا جو ہر لال نہرو پر، اقبال کی ایک مشہور زمین میں طبع آزمائی فرمائی گئی ہے۔ ۱۵ر جولائی کو جو شاہکار رقم کیا گیا، اس کا آخری شعر ہے۔

دیر و حرم کے بیر کو صاحبِ دل سمجھ گیا دیر کو رام رام ہے کعبہ کو سلام ابھی

لمعہ کی طرف سے اکبر رحمانی یہ دلیل نہیں دے سکتے کہ ابھی یہاں کوئی معنی نہیں دیتی، نہ سہی لیکن ردیف ہے، اس لیے آئے گی تو!

پانچ شعروں کی اس نظم میں ردیف کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا گیا ہے۔ تیسرا شعر ہے:

حُبِّ خدا سے (ہے) فزوں حبِّ وطن کا احترام پینے دو مومنوں کو بھی شوشلزم کا جام ابھی

پہلے مصرع میں ہے چھوٹ گیا تھا۔ رحمانی نے فٹ نوٹ میں درست نہیں کیا۔ وہ ہے کے بغیر ہی اس شاہکار مصرع کا ورد فرماتے ہوں گے۔ دوسرا مصرع پیٹ بھر کر ناموزوں ہے:

اکبر رحمانی نے یہ بڑا احسان کیا کہ لمعہ کا کلام، انھیں کے خط میں شائع کر دیا۔ جو ۱۹۷۲ء میں ایسا ناموزوں طبع ہو، وہ چالیس برس پہلے کس قیامت کا ناموزوں طبع ہوگا۔ کیا اقبال ایسے شاعر کی تک بندی پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسا سکتے تھے؟

اپنی زبان میں جو اس پائے کی شاعری کرے۔ سوشلزم کو شوشلزم لکھے، اس نے انگریزی

میں جوتیں مارے ہوں گے، ان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ماسٹر اختر نے ص ۹۱ پر اعتراض کیا ہے۔ بمبئی میں نیپئین نام کا کوئی دریا نہیں ہے طہارہل کی پشت پر سمندر کا کنارہ ہے۔ اس کنارے کو آج بھی نیپئین سی کہا جاتا ہے۔ یہ اعتراض درست نہیں ہے۔ دریا فارسی لغت ہے۔ اور بحیرہ کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ زیادہ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے، صرف "عبور دریائے شور" کی طرف توجہ دلاؤں گا۔

ستائیسواں خط انگریزی کا بتایا گیا ہے۔ جس کا ترجمہ اقبال نامہ میں درج ہے۔ بالواسطہ انداز میں اس کلامِ بلاغت نظام کی تعریف کی گئی ہے، جس کے کچھ نمونوں پر ابھی گفتگو ہوئی ہے۔ لطف لینے کے لیے یہ جملہ ملاحظہ فرمائیں:

"مجھے امید ہے کہ آپ کی نظمیں بارگاہِ خسروی میں مقبول ہوتی ہیں، اور اعلیٰ حضرت آپ کو بیرونِ ملک جانے کے لیے وظیفہ مرحمت فرمائیں گے۔"

لعہ نے تکلف سے کام لیا۔ خط میں لکھوا سکتے تھے کہ حضور نظام اگر فصاحت جنگ جلیل کے بجائے آپ کو استاد مقرر کر لیں تو دولت آصفیہ کو چار چاند لگ جائیں گے۔

اٹھائیسواں

مکرم بندہ۔ تسلیم۔ نوازش نامہ ابھی ملا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب جناب کی والدہ صاحبہ قبلہ کی صحت اچھی ہے۔ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد ایک روز تک ہمارے عزلت کدہ میں وہ کیفیت تھی، جس کو غالب نے شاید ہماری محبت کے بارے میں موزوں کیا ہوگا۔

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل

سے آغاز کیا، اور

اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا عجیب قسم کی فرض کامیڈی کا ٹریجڈی پر مبنی انجام ہے۔ جس ڈراما کی ایکٹنگ ہم آپ جیسے انسان انجام دے رہے ہیں۔ اس کے ڈائرکٹر کی انسان نوازی پر فخر کرنا چاہیے کہ اس نے اپنے ڈراما کی شوٹنگ کے لیے

انسان کو مختص فرمایا۔ دنیا میں انسان کی کامیابی یا ناکامی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہ دونوں بے معنی لفظ ہیں، اور اس دھن میں دنیا کی اکثریت لگی ہوئی ہے

انسان صرف جویائے محبت، اور اپنے یارِ حقیقی کی دھن میں لگا رہے۔ باقی تمام عبث، اور خیالی دنیا کا بے ہودہ فلسفہ ہے۔ ہم اس کو ڈھونڈتے رہیں، جو ہم کو ڈھونڈنا چاہتا ہے۔ اس کو ڈھونڈنے میں خوب ڈھونڈیں اور اتنا ڈھونڈیں کہ اپنے آپ کو پالیں۔ آپ کی چند ساعت صحبت میں میرے دل کو سرور حاصل ہوا۔ آپ درحقیقت مسرت فروش ہیں۔ خدا آپ کو ہر طرح بامراد اور کامیاب رکھے۔ میری صحت خراب ہو رہی ہے بینائی میں فرق آگیا ہے۔ اختلاج بہت بڑھ گیا ہے۔ پرہیز کا میں قائل نہیں۔ معلوم ہو رہا ہے کہ امتحان کا وقت قریب آگیا۔ تقرب نصیب ہو رہا ہے۔ ہم آغوشی بھی مل جائے گی۔

آپ کی والدہ صاحبہ قبلہ کی خدمت میں میری جانب سے قدم بوسی عرض کیجیے۔

مخلص محمد اقبال

۳۰ مئی ۱۹۳۷ء

القاب و آداب کے سلسلے میں ہر مکتوب نگار کی کچھ عادتیں ہوتی ہیں۔ آیئے دیکھیں اقبال کا کیا طریق تھا۔

۱۴ جون ۱۴ء کے خط میں اعجاز احمد کو :

”تمہارا نام کامیاب طلبا میں دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی . . . . الحمد اللہ۔ تم نے پہلی منزل طے کرلی . . . . اپنے ابا سے میرا اسلام کہنا، اور ان کو میری طرف سے بہت بہت مبارکباد دینا۔ والدِ مکرم اور والدہ کی خدمت میں مبارک باد کہنا۔“

۲ اگست ۱۸ء کے خط میں اعجاز احمد کو :

”والدِ مکرم کی خدمت میں عرض کرنا کہ میں ۵ اگست کی شام کو یہاں سے روانہ ہو کر ان کی خدمت میں پہنچوں گا۔ تم اسٹیشن پر آجانا۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔“

۵ اپریل ۱۹ء کے خط میں شیخ عطا محمد کو :

برادر مکرم السلام علیکم۔ الحمد اللہ آپ مع الخیر سیالکوٹ پہنچ گئے . . . والد مکرم کی خدمت

میں سلام عرض کریں

۵ مئی ۱۹ء کو والد شیخ نور محمد کو :

قبلہ و کعبہ ام ۔ السلام علیکم

پوسٹ کارڈ مل گیا ہے ۔ بھائی صاحب کا خط بھی آج ہی ملا ہے ۔ وہاں بھی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے ۔ یہاں سب لوگ بفضلہٖ خیریت سے ہیں، اور سب کی طرف سے آپ کو آداب عرض ہے ۔

۱۴ مئی ۱۹ء

قبلہ و کعبہ ام ۔ السلام علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا تھا خدا کے فضل و کرم سے سب خیریت ہے . . . .

۱۰ مئی ۱۹ء

قبلہ و کعبہ ام ۔ السلام علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا ہے ۔ الحمدللہ کہ سب خیریت ہے . . . .

۸ جولائی ۱۹ء کے خط میں اعجاز احمد کو :

برخوردار اعجاز کو بعد دعائے عمر درازی کے واضح ہو کہ تمہارا خط مل گیا تھا . . . میں انشاءاللہ ۲۹ جولائی کو یہاں سے سیالکوٹ آنے کا قصد رکھتا ہوں . . . باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے . والد مکرم کی خدمت میں میری طرف سے آداب کہیں . . .

۲۰ جولائی ۱۹ء کے خط میں والد کو :

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

آپ کا کارڈ مل گیا ہے ۔ الحمدللہ کہ خیریت ہے ۔ یہاں پر بھی خدا کے فضل سے ہر طرح خیریت ہے . . .

۲۶ جولائی ۱۹ء

قبلہ و کعبہ ام السلام علیکم

. . . ۲۸ جولائی کو لاہور میں ایک مقدمہ ہے ۔ اس سے فارغ ہو کر انشاءاللہ ۳۰ جولائی

کو حاضرِ خدمت ہونے کا قصد ہے۔

<u>۳؍اگست سنہ ۱۹ء کے خط میں اعجاز احمد کو:</u>

برخوردار اعجاز احمد طال عمرہٗ

کل میں نے تمھیں تار دیا تھا۔ ۔ ۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض کرنا۔ ۔ ۔

۷؍اگست سنہ ۱۹ء کے خط میں:

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمھارا خط ابھی ملا ہے۔ الحمد اللہ خیریت ہے۔ ۔ ۔ ۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب۔۔۔ والدہ مکرمہ کی خدمت میں عرض کریں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی۔ دوسرے روز ایک مقدمہ مل گیا۔ ۔ ۔

۱۱؍اگست سنہ ۱۹ء کے خط میں:

برخوردار اعجاز طال عمرہٗ

تمھارا خط ابھی ملا ہے۔ الحمد اللہ کہ خیریت ہے۔ والد مکرم کا خط بھی ساتھ ملا۔ ۔ ۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض۔

ان اقتباسات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اقبال کا اسلوب سادہ عبارت لکھنے کا ہے۔ پچھے دار عبارت کا نہیں۔ ایک تو لمعہ کا لاہور جانا مشتبہ۔ پھر اقبال ان کے رُخصت ہونے کے بعد غزل کے مضامین والا خط لکھتے ـــــ اور اپنے دل کی ویرانی اور مایوسی کے لیے غالب کے قطع کا سہارا لیتے؛ فرض نہیں فرضی ہونا چاہیے۔ کامیڈی کا ٹریجڈی بے معنی اصطلاح ہے COMICO-TRAGEDY کومیکو ٹریجڈی لمعہ نے کہیں پڑھا ہوگا۔ اس خط میں نقل کرتے وقت غلطی ہو گئی۔ ایک تو یہ عبارت اقبال کے مزاج اور ان کے اسلوب کی نہیں ہے۔ بالفرض وہ لکھتے بھی تو جملہ کچھ اور ہوتا اور کامیڈی کا ٹریجڈی نہیں کومیکو ٹریجڈی لکھتے۔ پتہ نہیں جویائے محبت، یار حقیقی کی دھن اور باقی تمام عبث اور خیالی دنیا کا فلسفہ کس عبارت کا الٹا سیدھا ترجمہ ہے۔ کیا جملہ ہے۔ آپ کی چند ساعت صحبت میں دل کو سرور حاصل ہوا!

آپ کی والدہ صاحبہ قبلہ کی خدمت میں میری جانب سے قدمبوسی عرض کیجیے۔ اپنی والدہ صاحبہ . . . . کہ جگہ آپ کی، انگریزی کا براہِ راست ترجمہ ہے۔ اور قدمبوسی عرض نہیں کی جاتی! یہ اقبال کے جملے نہیں ہو سکتے۔ اور اقبال نے قدمبوسی کبھی عطیہ فیضی کی نہیں کی۔ صرف اپنے والد کے لیے لکھا ہے کہ قدمبوسی کے لیے حاضر ہوں گا۔ اپنے بھتیجے اور بھائی کے خطوں میں والدہ کو آداب عرض لکھا ہے۔

ان چند وجوہ کی بنا پر، یہ اقبال کا لکھا ہوا خط نہیں ہے۔

انتیسواں اور آخری خط

میو روڈ۔ لاہور

۳۱ اگست ۱۹۳۷ء

جناب من۔ ضعفِ بصارت کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے سے منع کر دیا ہے۔ اس واسطے وہ اپنے دستخط آپ کو خط نہیں لکھ سکے۔ دیوان غالب کی ترسیل کے لیے آپ کے شکر گزار ہیں، اور آپ کے ملاقات کی آرزو رکھتے ہیں۔

والسلام

محمد شفیع ایم۔ اے

رسمی جواب ہے۔ چوں کہ اقبال نے خود نہیں لکھا ہے۔ اس لیے اس پر گفتگو کی ضرورت بھی نہیں۔ البتہ "آپ سے ملاقات کی آرزو" سے یہ بات بڑی حد تک ثابت ہو جاتی ہے کہ پچھلے خط میں جس ملاقات کا ذکر ہے، وہ لمعہ کی خیالی دنیا کی بات ہے۔

اکبر رحمانی چوں کہ ابھی تک اس بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ ان کے سبز قرینین مؤکّل کے نام علامہ اقبال کے سارے خطوط کھرے ہیں، اور ان کا مؤکّل، جس کی شاعری کی اتنی تعریف و توصیف شاعرِ مشرق نے کی ہے۔ عظیم المرتبت شاعر تھا، اس لیے یہ معروضات پیش کی گئیں۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی

مول چند منشی کی ایک نادر تصنیف

شاہنامہ فردوسی، حماسہ نگاری میں ایک عہد آفریں تصنیف ہے۔ رزمیہ شاعری میں شاہنامے کی عظمت کے شعری نمونے بہت کم دستیاب ہیں۔ یہ بے مثال تصنیف اگرچہ فارسی زبان کے حصے میں آئی لیکن اس نے حماسی اور رزمیہ ادب کی جس عظیم الشان روایت کو جنم دیا اور پوری دنیا کے ادب کو جس طرح متاثر کیا، اس کی مثال دنیا کے کسی دوسرے ادب میں نہیں ملتی۔

برصغیر میں شاہنامہ فردوسی کا رواج اور قبولِ عام ایک خاص تاریخی پس منظر رکھتا ہے اس خطے میں شاہنامے کا تعارف غالباً اس کے زمانہ تصنیف سے ہی ہو چکا تھا۔ سلطان محمود غزنوی کے دربار میں جہاں ایران و توران کے اہلِ علم، ادبا اور شعرا کی بڑی تعداد موجود تھی۔ وہاں برصغیر کے بلند پایہ صاحبان علم و فضل بھی موجود تھے۔ جن کی برصغیر کے مختلف علوم و فنون اور زبانوں پر ماہرانہ دسترس غزنوی دربار کے لیے طرۂ افتخار تھی۔ غزنوی دربار میں جہاں فارسی کے بلند پایہ ادیب اور شاعر اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتے تھے وہاں سنسکرت اور برصغیر کی دیگر مقامی زبانوں کے شعرا کو بھی سلطان اور اہل دربار سے داد و تحسین حاصل ہوتی تھی۔ چناں چہ دورہ غزنوی کے مستند ماخذ "تاریخ بیہقی" میں ایسے واقعات موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے سلطان محمود اور اس کے جانشین نہ صرف برصغیر کی زبانوں میں لکھی گئی تخلیقی کاوشوں کے قدردان تھے۔ بلکہ خود بھی کافی حد تک سنسکرت اور اس ملک کی دیگر

مقامی زبانیں جانتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی دربار غزنی سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں میں بھی باہمی استفادے اور فیض رسانی کا سلسلہ جاری تھا۔ پنجاب کے دربار غزنی کے ساتھ الحاق کے بعد یہ عمل اور زیادہ تیز اور وسیع ہو گیا تھا۔ غزنوی عہد کے اکابر شعراء کے کلام میں برصغیر کے مقامی الفاظ کی موجودگی اس بات کا بیّن ثبوت ہے۔ فرخی، عسجدی، انوری، مسعود سعد سلمان، فردوسی کوئی شاعر ایسا نہیں جس کے کلام میں برصغیر کی زبانوں کے الفاظ موجود نہ ہوں۔ یہ الفاظ آج بھی اردو زبان کا حصہ ہیں۔ بطور مثال مسعود سعد سلمان اور فردوسی کا ایک ایک شعر پیش خدمت ہے۔

مسعود سعد سلمان :

چوں رعد زابر بغرّید کوس محمودی
برآمد از پسِ دیوارِ حصن "مارا مار"

فردوسی :

ز سر" شارۂ ہندوی" برگرفت
پیادہ شد و دست بر سر گرفت

فردوسی کے ہاں برصغیر کی تہذیب کے اثرات اور برصغیر کی تاریخ سے متعلق بعض اطلاعات اس امر کا ثبوت ہیں کہ شاہنامے کے مصنف کو اس علاقے کی تاریخ، ثقافت اور زبان سے خاص دلچسپی تھی۔ غزنوی دربار میں قصیدہ نگاری کے بعد جس ادبی فن پارے کو سب سے اہم اور بلند مقام حاصل تھا وہ شاہنامہ فردوسی تھا بلکہ دربار کی ادبی سیاست اور شعراء کی باہمی رقابت نے اسے ہر دوست دشمن کی توجہ کا محور بنا دیا تھا۔ شاہنامہ فردوسی اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے یقیناً اس دور کے ادب کا سرمایہ افتخار تھا اور اس دور کا کوئی اہلِ علم اور اہل ادب اس کی عظمت کے سحر سے اپنے آپ کو باہر نہیں نکال سکتا تھا چنانچہ جب پنجاب نے علمی، ادبی اور تہذیبی سرمایہ کاری کے اعتبار سے غزنی ثانی کا درجہ حاصل کیا تو فارسی ادب کی درخشاں روایت کے طور پر شاہنامہ فردوسی نے بھی اپنی ادبی اور لسانی فتوحات کا دائرہ پنجاب اور اس کے بعد غزنوی خاندان کی دیگر سیاسی سرحدوں

تک پھیلا دیا۔ برصغیر کے سنسکرت زبان میں لکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کے آثار میں شاہنامہ فردوسی کا اثر و نفوذ اس بات کا بیّن ثبوت ہے۔ چناں چہ سنسکرت اور ہندی زبان کی قدیم کتابوں: راجاولی، راج ترنگنی، راجاولی پتاکا اور پرتھی راج راسا پر شاہنامۂ فردوسی کے اثرات نمایاں ہیں۔ یہ تصانیف گیارھویں صدی عیسوی سے چودھویں صدی عیسوی تک پھیلی ہوئی رہیں۔

برصغیر کے قدیم فارسی گو شعرا بھی شاہنامہ فردوسی کی عظمت کے معترف تھے۔ ڈاکٹر شہریار نقوی مرحوم نے مسعود سعد سلمان، ابوالفرج رونی، تاج الدین ریزہ، بدر چاچ اور امیر خسرو دہلوی کے کلام میں شاہنامہ فردوسی کے کرداروں، داستانوں اور تاریخی واقعات کی نشاندہی کی ہے[۱۹]۔ علاءالدین خلجی کے دور میں فخرالدین قواس نے "فرہنگ نامہ قواس" ترتیب دیا جو شاہنامہ فردوسی کے مطالب اور اس میں شامل پہلوی الفاظ کی تشریح ہے۔ قواس کا بیان ہے:۔

"نخست شاہنامہ را کہ شاہ نامہ ہا است پیش آوردم واز سرتا پا بخانہ فرو خواندم۔ آں چہ از سخن پہلوی بود، ہمہ راجداگانہ بر کاغذ نوشتم۔ فرہنگ نامہ ہاے دیگر کہ آں را فرہنگ نامہ نبشتہ اند در زبان تازی و پارسی ترجمان کردہ ہمہ را فرد فرد یکان یکان درخانہ کاغذ نگار آوردم وآں را بخش بخش وگونہ گونہ و بہرہ بہرہ کردم[۲۰]"

"فرہنگ نامہ قواس" کی طرح ایک اور لغات "گنج نامہ" بھی شاہنامۂ فردوسی کی فرہنگ ہے جس کے مصنف سلطان عبداللہ قطب شاہ والی گولکنڈہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ مصنف کا نام علی بن طیفور بسطامی ہے[۲۱]۔

برصغیر میں مغلیہ عہد شاہنامہ شناسی کے ایک نئے دور سے وابستہ ہے۔ ہمایوں کی ایران سے واپسی اور مغلیہ خاندان کے برصغیر میں اقتدار کی بحالی کے بعد یہاں اگر ایک طرف ایران کے تہذیبی، فکری اور علمی اثرات نے رواج پایا تو دوسری طرف فارسی زبان و ادب کو بطور خاص فروغ حاصل ہوا۔ شاہنامہ فردوسی ان اہم تصانیف میں سے ایک تھا جسے ادب

اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے خواص و عوام نے اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ برصغیر کے فارسی ادب پر شاہنامے کے اثرات سے متعلق ڈاکٹر احمد شمیم داری کا مقالہ قابلِ قدر معلومات رکھتا ہے یہ مقالہ بہت جلد کتابی صورت میں شائع ہو جائے گا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس دور میں جہاں شاہنامے کی ادبی، لسانی اور فنی خوبیوں کو سراہا گیا وہاں اس کا طول کلام مغلیہ دور کے نفاست پسند معاشرے کو گراں گزرا چناں چہ ہمایوں کے بیٹے اکبر بادشاہ کے دور میں ہی محسوس کیا گیا کہ اس عظیم لیکن ضخیم تصنیف کا اختصار اور خلاصہ تیار ہونا چاہیے۔ اس ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے تقی شوشتری نے شاہنامے کا فارسی نثر میں خلاصہ تیار کیا۔[۲۴] یہ شاہنامے کا اولین خلاصہ تھا۔

شاہنامہ فردوسی کا دوسرا اہم خلاصہ اکبر کے پوتے شاہجہاں بادشاہ کے عہد میں ہوا۔ اس کتاب کا نام "تاریخ دلکشائے شمشیر خاں" یا تاریخ شمشیر خانی ہے اسے بطور اختصار محض "شمشیر خانی" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مصنف توکل بیگ بن تولک بیگ حسینی ہیں۔ شمشیر خانی کے اثرات چوں کہ اپنے بعد پیدا ہونے والے ادب پر براہ راست ہوئے، اس لیے اس کا ذکر قدرے تفصیل کے ساتھ بے موقع نہ ہوگا۔

شمشیر خانی ۲۶۔ جلوس شاہجہانی ۱۰۶۳ھ میں تصنیف ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب شہزادہ دارا شکوہ کو قندھار کی مہم سر کرنے کے لیے صوبہ دار کابل بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اس زمانے میں غزنی کا حکمراں جسے شاہجہاں نامہ کے مصنف نے "تھانہ دار غزنیں" لکھا ہے شمشیر خاں ترین تھا۔ اسے مغل دربار سے سہ ہزاری کا منصب حاصل تھا۔ محمد صالح کنبو کے مطابق ۲۴ رجمادی الثانی ۱۰۶۲ھ مطابق ۲۔ جون ۱۶۵۳ء کو شاہجہاں کے دربار سے شمشیر خاں ترین کو خلعت اور نقارہ عطا ہوا۔ اور اسے غزنی پہنچنے کا حکم دیا گیا[۲۵] شمشیر خاں نے اپنے امین اور واقعہ نویس توکل بیگ سے فرمائش کی کہ وہ شاہنامہ فردوسی کا خلاصہ نثر میں تیار کریں چناں چہ سبب تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:۔

"پوشیدہ نماند کہ ایں رسالہ مختصر در ہنگام سنہ ہزار شصت و سہ ہجری مطابق سنہ بیست و شش جلوس ہمایوں صاحب قران ثانی شاہجہاں پادشاہ غازی در وقتیکہ

صوبہ دار الملک کابل شہزادہ والا گہر جہاں پناہ کشورستان درۃ التاج زینت الملت والدین آن کہ عالم جہاں صاحبقران ایں چنیں جہاں باں در ہیچ مکانی ندیدہ و در ہیچ قرنی نشنیدہ، یعنی شہزادہ دارہ شکوہ سلمہ اللہ والبقا۔ بادشاہ پدر بزرگوار آں گوہر والا نژاد تفویض فرمود، اقل العباد یعنی توکل دار شہزادہ بلند اقبال بہت خدمت امینی واقع نویسی بلدہ غزنین تعین نمودہ بودن، باتمام و انصرام رسید۔ باعث ایں تحریر و مقصد ایں تقریر بداں بود کہ امارت و ایالت پناہ حشمت و اجلال دستگاہ، شوکت اشتباہ خان، عالی شان سمو المکان شمشیر خاں حاکم غزنین کہ متحلی بحلیہ عدالت و فتوت و مزین بزینت سخاوت و شجاعت است و در خلق و حلم نظیر و ہمتا نداشت۔ با اینہمہ صفت ہائے حمیدہ کہ ایزد متعال طبع بلند و ادراک عالی بخان مشار الیہ نیز عطا فرمودہ لہٰذا دایم الاوقات ذہن مستقیمش بدریافت مطالب اعلیٰ و مقاصد عظمیٰ توجہ داشت۔ روزی خاں رفیع المقدر بر سبیل اتفاق بیاران سخندان کہ در مجلس جنت آسائش حاضر بودند، اشاعت نمودند کہ اگر کتاب تاریخی بہ ہم رسد کہ از احوال پادشاہان ایران و توران بطریق اجمال و بلغت اختصار توان بر کیف آں وقوف یافت بسیار خوب است۔ احضار مجلس جواب دارند بر حصول ایں مطلب بہ از شاہنامہ حکیم فردوسی ہیچ مکانی ندارد۔ و امارت پناہ مشار اللہ گفت کہ شاہنامہ را حکیم فردوسی بسیار طولانی گفتہ است۔ عرض مصنف فصاحت و بلاغت شعر است بنابران بعضی مطالب اندک از برائے شاعری و قدرت ہمیں نمودن در لغت بسیار آوردہ است حاصل کلام بعد از دیر و انتظار بسیار مفہوم میشود و از خواندن و شنیدن ایں پارسی سامع را ملال دست میدہد خصوصاً اہل حکومت را کہ ہمیشہ در تدبیر مملکت داری اشتغال دارند و فرصت مطالعہ کتب کمتر روی دہد اگر کسی ترجمہ نظم شاہنامہ را لباس نثر پوشانیدہ بہ عبارت موخر و مختصر ربط دارد بیان نماید بس نیکو باشد۔ یاران خاموش ماندند۔ ایں خاکسار محض

برائے رضامندی آں والا جاہ دریں معنی قبول نمودہ محرر ایں نسخہ گردید تا ہر کرا شوق و ارادہ اطلاع بر احوال تاریخ پادشاہانِ ماضی شود۔ ازیں مختصر باسانی وخوبی تمام مقصد کلام معلوم خود حاصل سازد و ایں رسالہ را "تاریخ دل کشای شمشیر خاں" نام نہاد و امید از قاریان مختصر آں است کہ ہر جاہ کہ سہوی و خطای بینند باصلاح کوشند" ۔ ۵؎

اس تفصیل کے مطابق شمشیر خانی کی تالیف کا سبب ایک تو شاہنامے کی طوالت سے بچ کر اس کے مطالب تک براہ راست رسائی ہے اور دوسرا اس طول کلام سے پیدا ہونے والی اکتاہٹ سے اپنے ممدوح کو بچانا ہے۔

۴۔صفر ۱۰۶۳ھ مطابق ۸۔بہمن ۱۰۳۲ شمسی (۱۶۔جنوری ۱۶۵۲ء) کو جشن وزن شمسی سے فراغت کے بعد شاہجہاں بادشاہ نے فیصلہ کیا کہ شہزادہ دارا شکوہ کو تسخیر قندھار کی مہم پر روانہ کیا جائے۔ چناں چہ اس مقصد کے لیے شہزادہ دارا شکوہ نے ۳۔ربیع الاول ۱۰۶۳ھ مطابق یکم فروری ۱۶۵۳ء کو لاہور سے کوچ کیا اور ۵ رجمادی الثانی ۱۰۶۳ھ مطابق ۳۔مئی ۱۶۵۳ء کو قلعہ قندھار کی حدود میں داخل ہوئے ۶؎ توکل بیگ نے لکھا ہے کہ شمشیر خانی کا خلاصہ ۲۶ رجلوس شاہجہانی ۱۰۶۳ھ کو اس وقت تیار کیا گیا جب شہزادہ دارا شکوہ کو کابل کا صوبہ دار مقرر کیا گیا تھا۔ اس جگہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ یکم جمادی الثانی ۱۰۶۳ھ کو ستائیسواں جلوس شاہجہانی شروع ہو گیا تھا۷؎ اس اعتبار سے ۳۔ربیع الاول ۱۰۶۳ھ سے یکم جمادی الثانی تک تقریباً دو ماہ ستائیس دن بنتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں تاریخ شمشیر خانی تصنیف ہوئی۔ دارا شکوہ بھی اورنگ زیب کی طرح قندھار کی مہم میں ناکام ہوئے۔ اور محمد صالح کنبو کے مطابق بتاریخ پانزدہم شہر محرم الحرام سنہ یک ہزار و شصت و چہار داخل دولت خانہ دار السلطنت لاہور شدند۹؎ تمام قرائن پر غور کرنے کے بعد یہ کہیں واضح نہیں ہوتا کہ تاریخ شمشیر خانی شہزادہ دارا شکوہ کی فرمائش پر لکھی گئی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ شمشیر خان ترین نے کتاب کا نسخہ اپنے طور پر قندھار میں شہزادے کی خدمت میں پیش کر دیا ہو۔ کیوں کہ برصغیر میں اس کتاب کے قلمی نسخوں کی بکثرت تعداد اس امر کو واضح کرتی ہے کہ کتاب نے اپنے قارئین کا ایک وسیع حلقہ پیدا کیا۔ آقائے احمد منزوی

کی فراہم کی ہوئی تفصیل کے مطابق صرف پاکستان کے مختلف کتب خانوں میں اس کتاب کے پچاس سے زائد قلمی نسخے موجود ہیں۔[۵۱] ۱۹۷۲ء میں قیام مشہد کے دوران میری نظر سے اس کتاب کا ایک مصور نسخہ گزرا تھا جو بے تاریخ ہونے کے باوجود معاصر معلوم ہوتا تھا۔ یہ مشہد کے مشہور عتیقہ فروش آقائے حیدر سمار کی ملکیت تھا۔ تاریخ شمشیر خانی اپنے اختصار اور اسلوب کے اعتبار سے مقبول ہوئی چناں چہ برصغیر میں اردو زبان وادب کے فروغ کے ساتھ ہی اس کتاب کو اردو میں منتقل کرنے پر توجہ دی گئی۔ ان تراجم میں تین تصانیف خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک زیر نظر کتاب، دوسری مرزا مہدی مقبول کا اردو شاہنامہ اور تیسری رجب علی بیگ سرور کی تصنیف "سرور سلطانی"۔ اس سے پہلے کہ ان تینوں تصانیف کا ذکر کیا جائے اور زیر نظر کتاب پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے اردو ادب کی تاریخ میں شاہنامہ فردوسی کے تراجم کے رواج پر مختصر گفتگو نامناسب نہیں ہوگی۔

اردو ادب میں شاہنامہ فردوسی، تراجم، مطالب اور اسلوب تینوں صورتوں میں داخل ہوا۔ سترھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں برصغیر میں دکن اردو ادب کے فروغ کا سب سے بڑا مرکز تھا جہاں فارسی ادب کی روایت نے اردو کی نشوونما میں اہم کردار ادا کیا۔ چناں چہ جب سلطان محمد عادل شاہ کی فرمائش پر ملک خشنود نے امیر خسرو کی یوسف زلیخا اور ہشت بہشت کو دکنی اردو میں منتقل کیا تو گویا یہ اردو ادب کو فارسی زبان کے اسلوب میں ڈھالنے کے منشور کا اعلان تھا اردو زبان کے تخلیقی دائرہ عمل کو وسیع کرنے کے لیے یہ امر یوں بھی ناگزیر تھا۔ ہندوی زبان جس سے اردو زبان کو تہذیبی اور سیاسی قربت تھی، اس کے تخلیقی سوتوں میں سنسکرت خون خشک ہو رہا تھا۔ لہٰذا اردو زبان کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی بقائے حیات کے لیے فارسی زبان کے گرم جوش اور حیات بخش خون سے استفادہ کرے۔ اردو کے مصنفین اور شعراء نے اپنے ادب کو فارسی کے مقام پر لانے کے لیے سب سے پہلے تراجم کے عمل کو اپنایا۔ دکن میں سلطان محمد عادل شاہ کا دور فارسی ادب سے اردو تراجم کے لیے امتیازی اہمیت رکھتا ہے۔ کمال خان رستمی کا خاور نامہ اس دور کی اہم یادگار ہے جو ابن حسام کی تصنیف خاور نامہ (۱۴۲۶ء) کا اردو روپ ہے۔ ابن حسام نے اپنی کتاب کی بنیاد شاہنامہ فردوسی پر رکھی تھی۔ لہٰذا یہ بات قابل توجہ ہے کہ خاور نامہ رستمی، اردو ادب میں شاہنامہ فردوسی کا قدیم ترین نقش ہے۔ اس ترجمے میں شاہنامے کی روح اس قدر

سرایت کیے ہوئے ہے کہ اس سے شاہنامے کے اس دور کی تہذیبی زندگی میں ایک اہم تخلیقی قوت ہونے کا سراغ ملتا ہے۔ بطور مثال خاورنامہ ابن حسام اور خاورنامہ رستمی کے چند اشعار آمنے سامنے رکھ کر ملاحظہ فرمائیے۔ یہ اشعار اردو کے ممتاز محقق ڈاکٹر جمیل جالبی نے انتخاب کیے ہیں۔[۱۱]

خاورنامہ رستمی	خاورنامہ ابن حسام
رکھے کوہ زریں کمر کے اوپر	نہد بر سر کوہ زریں کمر
کدھیں تاج مشکیں کدھیں تاج زر	گہی چتر مشکیں گہی تاج زر
کہوں راز کیا چرخ کا کھول کر	چہ می گویم از راز چرخ بلند
زمین سات طبقاں رکھیا تول کر	نگہ کن بریں تیرہ خاک نژند
عروس بہار آکر ے انجمن	برآید عروس بہار از چمن
زمین پر اٹھے لالہ و نسترن	بروید گل و لالہ و نسترن

ان اشعار میں ابن حسام کے وسیلے سے رستمی شاہنامے کی بحر، اسلوب اور تخلیقی جوہر تینوں کو اپنے کلام میں سمو رہے ہیں۔ گویا یہ تنہا شاہنامے کی زبان کی ہی اردو میں آمیزش نہیں بلکہ اس تہذیبی عمل کی شرکت بھی ہے۔ جس نے آگے چل کر اردو شاعری کو اسالیب کی رنگا رنگی اور قوت اظہار کی فراوانی سے مالا مال کیا۔ چناں چہ اسی دور میں نصرتی نے مثنوی "علی نامہ" لکھی جو علی عادل شاہ کی حکومت کے ابتدائی دس برسوں کی منظوم داستان ہے۔ اس مثنوی میں بھی شاہنامہ فردوسی سے استفادہ کیا گیا ہے۔ نصرتی نے شاہنامے کے معیار کو سامنے رکھ کر نہ صرف اس کے لب و لہجے کو اپنایا بلکہ اس کی مثال رزمیہ روایت اور حماسی اسلوب سے بھی استفادہ کیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے بقول "میدان جنگ کے نقشے فوجوں کی معرکہ آرائی، قلعوں کے محاصرے، تلواروں کی بڑش، تیروں کی یورش، گھوڑوں کی چستی، فوجوں کا دبدبہ اور ساری کیفیات و مناظر کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔"[۱۲]

دکنی ادب کے بغور مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد میں جتنے بھی فارسی ادب سے منظوم اردو تراجم ہوئے ان میں سے بیشتر کی بحر شاہنامہ فردوسی کے مطابق رکھی گئی اور ان میں شاہنامے کے اسلوب سے بطور خاص استفادہ کیا گیا۔ ان تصانیف میں سے چند ایک کے

نام درج ذیل ہیں۔

سیف الملوک بدیع الجمال :	غواصی	تصنیف	۱۰۲۵ھ
تحفتہ العاشقین :	قطب رازی	〃	۱۰۳۵ھ
طوطی نامہ :	غواصی	〃	۱۰۴۹ھ
گلشن عشق :	محمد نصرت نصرتی	〃	
پدماوت :	غلام علی دکنی	〃	۱۰۹۱ھ
ظفر نامہ :	غلام	〃	۱۰۹۵ھ
قصہ ملکۂ مصر :	سید محمد عاجز	〃	۱۱۰۰ھ
اشارت الغافلین :	عشق اللہ عشق	〃	۱۱۴۳ھ
مثنوی چہار درویش :	محمد علی خاں شوق	〃	۱۳۱۳ھ

دکن سے اردو شاعری کی بھرپور روایت جب شمالی ہند میں پہنچی تو شاہنامۂ فردوسی کی ترویج بھی اس کے ساتھ موجود تھی۔ ۱۱۹۹ھ مطابق ۸۵۔۱۷۸۴ء میں جب میر حسن نے اردو کی معرکہ آرا مثنوی سحرالبیان تصنیف کی تو شاہنامہ فردوسی کو نہ صرف بطور لسانی اور ادبی ماخذ استعمال کیا بلکہ اس کے اسلوب خاص اور روح مطالب سے بھی استفادہ کیا گیا۔ اس سلسلے میں پر لطف بات یہ ہے کہ سحرالبیان کی بحر بھی شاہنامہ فردوسی ہی کی ہے۔ فردوسی کا شعر ہے:

زنقارہ آواز آید بروں

کہ دون است دون است گردونِ دوں

اس شعر کو ذہن میں رکھتے ہوئے مثنوی سحرالبیان کا مندرجہ ذیل بیت ملاحظہ فرمائیے۔

کہا زیر نے بم سے بہر شگوں

کہ دوں دوں خوشی کی خبر کیوں نہ دوں

دونوں اشعار کے مفہوم جدا ہیں لیکن آہنگ اور صوتی تاثر کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ہمدست نظر آتے ہیں۔

برصغیر میں شاہنامے کے مطالب کا باقاعدہ اور رسمی ترجمہ تاریخ شمشیر خانی کے توسط سے ہوا۔ شاہنامے کا قدیم ترین اردو ترجمہ اگرچہ لالہ بھیم چند کا تھا جس کی اطلاع دکن میں اردو کے مصنف نصیر الدین ہاشمی اور فارسی ادب کے منظوم اردو تراجم (تحقیقی مقالہ) کے مصنف ڈاکٹر بشیر حسین نے دی ہے۔ لالہ بھیم چند دیوگڑھ کے قلعدار برہان شاہ کا متوسل تھا۔ یہ ترجمہ ۱۲۰۷ھ میں مکمل ہوا، لیکن اس کا کوئی مخطوطہ اس وقت برصغیر کے متعارف کتب خانوں میں موجود نہیں[۱۱]۔ اس کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مکمل شاہنامے کا ترجمہ تھا یا منتخب حصوں کا۔ ساتھ ہی یہ کہ لالہ بھیم چند نے اصل شاہنامے کو مدنظر رکھا یا تاریخ شمشیر خانی کو۔ ان سب نکات کے جواب مثنوی کا متن حاصل ہونے کے بعد ہی دیئے جا سکتے ہیں۔

تاریخ شمشیر خانی سے براہ راست جن تین اردو تراجم کا اوپر ذکر کیا گیا تھا۔ ان میں قدیم ترین منشی مولچند کا زیر نظر ترجمہ ہے۔ دوسرا ترجمہ منظوم ترجمہ مرزا مہدی خاں مقبول کا ہے جو ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں مکمل ہوا۔ مقبول، محمد مرزا لکھنوی کے فرزند اور اردو کے معروف شاعر امام بخش ناسخ (متوفی ۱۸۳۸ء) کے شاگرد تھے۔ کتاب کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہے[۱۲]۔ تیسرا ترجمہ "سرور سلطانی" اردو کے نامور انشا پرداز رجب علی بیگ سرور نے سلطان واجد علی شاہ اختر تاجدار اودھ کی فرمائش پر کیا۔ تینوں تراجم کا مقصد اپنے ماخذ شمشیر خانی کے تتبع میں شاہنامے کو بطور اختصار قارئین تک پہنچانا ہے سرور سلطانی کے مصنف نے سبب تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"بعد چندے کہ سنہ ہجری بارہ سو چونسٹھ (۱۲۶۴ھ) تھے حکم قضا شیم صادر ہوا کہ "شمشیر خانی" زبان اردو میں لکھ لیکن طول نہ ہو، تا قاری و سامع ملول نہ ہو۔ اگرچہ فقیر کو یہ لیاقت نہ تھی۔ مگر فیض ارشاد ہدایت بنیاد سلطان عالم حامی و مددگار ہوا، یہ نسخہ تیار ہوا، رنگینی اور نثاری سے یہ نثر اور فقیر عاری ہے، خلاصہ مضمون اور مطلب نگاری ہے۔ جو کچھ فردوسی سخن داں نے نظم کیا ہے، وہی مضمون "شمشیر خانی" ہے۔ لیکن اس تحریر حال میں مقدمہ ثانی ہے۔ کہ حسب ونسب شاہان نام دار میں تحقیق کی طرف طبیعت متوجہ نہیں ہوئی۔ فقط شاعری کی طاقت سے موقع بنایا ہے۔ ہر مصرع تصویر تحریر کر کے دکھایا ہے۔ لہذا کتب تواریخ معتبر سے کہ ان کا نام موقع اور محل پر آجائے گا۔

دیکھ کے لکھا کہ ناظرین کے نزدیک اس کا عز و وقار ہو، شک باقی نہ رہے۔ نسخہ ذی اعتبار ہو۔ امید خالق لیل و نہار سے یہ ہے کہ سلطان عالم کو پسند ہو تو خاص و عام کو مقبول ہو۔ جاں نثار کی محنت و مشقت بےکار نہ جائے، ناموری حصول ہو۔ جس دم تمام یہ ترجمہ "شمشیر خانی" ہوا، نام اس کا "سرور سلطانی" ہوا۔[۱۵]

سرور سلطانی اور اس کے مصنف کے بارے میں تفصیلات ڈاکٹر آغا سہیل کے فاضلانہ مقدمہ میں موجود ہیں جو انھوں نے کتاب کا تازہ ایڈیشن مرتب کرتے ہوئے لکھا ہے[۱۶] سرور سلطانی، تاریخ شمشیر خانی کا لفظی ترجمہ نہیں بلکہ مطالب کو مزید اختصار کے ساتھ اس طرح پیش کیا گیا ہے اور ساتھ ہی مزید معلومات اس انداز سے درج کی گئی ہیں کہ اصل متن ان توضیحات کا محض تمہید نما شذرہ معلوم ہوتا ہے۔ اس پر مزید گفتگو ذرا آگے چل کر ہوگی۔

(۳)

زیر نظر کتاب کے مصنف لالہ مولچند منشی کائستھ، دہلی کے رہنے والے تھے۔ شاہ نصیر دہلوی (۱۷۶۱ء۔۱۸۳۸ء) کے شاگرد اور شاہ عالم آفتاب کے متوسلین میں سے تھے۔ تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ بادشاہ کی شان میں قصیدے کہتے تھے اور بادشاہ ہی کے عہد میں شاہنامہ فردوسی کے مطالب اردو میں نظم کیے۔ قلعۂ شاہی میں آمد و رفت بے تکلف تھی۔ ۱۸۳۲ء میں انتقال کیا۔ چوں کہ اس کے علاوہ منشی کی سوانحی تفصیلات دستیاب نہیں لہٰذا تذکرہ نگاروں کی اصل عبارتیں درج ذیل ہیں:

گلشن بے خار : نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ :

"منشی تخلص مولچند از شاگردان نصیر، کائستی است، در دہلی قصص شاہنامہ را بریختہ نظم کردہ است"[۱۷]

گلستان بے خزاں : قطب الدین باطن

"منشی تخلص لالہ مولچند نام، فیض یافتہ صحبت شاہ نصیر مرحوم قوم کائستھ دہلوی جن کے سخن کی یہ تاثیر، منشی انشا پرداز کا شاعر طبع ناظم ہے۔ اس کی نظم بھی تحریر کرنی لازم ہے"[۱۸]

گلستان سخن : قادر بخش صابر :

"منشی، تخلص منشی مولچند قوم کائستھ شاگرد ازلی شاہ نصیر مرحوم اور ملازم ابدی سرکار فیض آثار سلطانی حضرت شاہ عالم بادشاہ کے حضور ہیں قصائد مدحیہ پڑھتا رہا۔ شمشیر خانی کو اردو میں نظم کیا ہے۔ عرصہ بعید ہوا کہ عالم باقی کی طرف رحلت کی۔"[19]

ارمغان گوکل پرشاد : گوکل پرشاد رسا

منشی، مول چند شاگرد نصیر کائستی کے ہیں، دہلی کے رہنے والے ہیں شاہنامہ فردوسی کا ترجمہ اردو میں نظم فرمایا جو مشہور و عام پسند ہے۔"[20]

خوش معرکہ زیبا : سعادت خاں ناصر

"منشی، مول چند، سخن اس کا عام پسند، لالہ مول چند، تخلص، منشی، شاگرد نصیر دہلوی"[21]۔

یادگار شعراء : سپرنگر

منشی، مول چند کائستھ، شاگرد نصیر۔ بادشاہ کے حکم سے ایک قصہ نظم کیا (قاسم، دلی میں شاہنامے کو ریختہ میں نظم کیا (گلشن بے خار)، ریختہ میں ایک دیوان کہا (ذکا)، ۱۸۳۳ء کے قریب انتقال کیا۔"[22]

طبقات الشعرائے ہند : کریم الدین

"منشی تخلص، مول چند کا ہے۔ جو نصیر کے شاگردوں میں ہے۔ وہ کایستھ تھا اس نے شاہ نامہ اردو زبان میں نظم لکھا ہے۔ دلی کا رہنے والا ہے۔"[23]

جامع الاشعار : ایڈورڈ سیل

منشی، تخلص ہے، منشی مول چند قوم کالیتھ ساکن دہلی شاگرد شاہ نصیر دہلوی مرحوم اور ملازم سلطانی حضرت شاہ عالم بادشاہ کے اکثر ظل سبحانی کے حضور میں قصائد مدحیہ پڑھتے رہے۔ بہت ممتاز تھے۔ بہت سے شاہی فرمانوں پر ان کے دستخط موجود ہیں۔ انھیں نے شمشیر خانی کو اردو نظم میں کیا ہے۔ ۱۸۳۲ء (اٹھارہ سو بتیس) عیسوی میں انتقال کیا۔"[24]

مجموعہ نغز : قدرت اللہ قاسم

منشی، لالہ مول چند، وے کایستھ زادہ الیت (باحلم و حیا) آراستہ و ببہرہ (و) وفا پیراستہ۔ نہایت یکسرو و بغایت خوشخو۔ بسیار یار و خوش تقریر۔ شاگرد رشید محمد نصیر الدین الدین نصیر۔ در قلعہ مبارک آمد و رفت دارد و حسب الحکم ارفع اقدس قصہ منظوم سازد۔"[۲۵]

شمشیر خانی کا زیر نظر ترجمہ مول چند منشی نے ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں کیا۔ تاریخی نام "قصہ خسروانِ عجم" ہے۔ شاہ عالم ثانی آفتاب ۲۴ جون ۱۷۲۸ء میں پیدا ہوئے۔ ۲۴ دسمبر ۱۷۵۹ء میں تخت نشین ہوئے۔ ۱۰ اگست ۱۷۸۸ء کو انھیں غلام قادر روہیلہ نے معزول کر کے اندھا کر دیا ۳ دسمبر ۱۷۸۸ء کو دوبارہ تخت پر بیٹھے اور ۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء کو دنیا سے رخصت ہوگئے۔

اس اعتبار سے مول چند منشی کا یہ منظومہ جو مثنوی کی ہیئت میں ہے، شاہ عالم کے دور حکومت کے آخری برسوں کی یادگار ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بادشاہ کور چشمی کے باعث قصہ کہانیاں سننے میں دلچسپی لیتے تھے اور خود بھی گزر اوقات کے لیے تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے نابینا ہونے کے بعد انھوں نے ۱۷۹۰ء میں اپنے ہندی کلام کا مجموعہ "نادرات شاہی" مرتب کروایا۔ دیوان فارسی کا ایک نسخہ بھی ۱۷۹۵ء میں کتابت ہوا۔ علاوہ ازیں عجائب القصص کا مسودہ ۱۲۰۷ھ مطابق ۱۷۹۲ء کو املا کرایا۔ جس میں شہزادہ شجاع الشمس اور ملکہ نگار کی داستان محبت بیان کی گئی ہے[۲۶]۔ شاہ عالم ثانی ادیبوں اور شاعروں کے قدرداں تھے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے ایسے بعض واقعات نادرات شاہی کے دیباچے میں لکھے ہیں[۲۷]۔ مول چند منشی سبب تالیف میں لکھتے ہیں:

بہم محفل آرا تھے ہنگام شب — مہیا تھا اسباب جشن و طرب
وہ مجلس تھی رشک بہار سخن — ہر ایک لحظہ تھا ذکر شعر و سخن
تواریخ کا بھی جو مذکور تھا — تو پھر ہر کسی نے بیاں یوں کیا
کہ ہے شاہ نامہ تماشا کتاب — عجب نظم دلکش ہے با آب و تاب
وے ہر کسی کو میسر نہیں — یہ تاریخ فرخ نہیں ہر کہیں
توکل کہ مرد سخن سنج تھا — کیا ترجمہ اس نے شہ نامہ کا
لکھا نثر میں نسخہ مختصر — کہ احوال معلوم ہو سر بسر

یہ شمشیر خانی وہ موسوم ہے — تمام اس میں احوال مرقوم ہے
یہ سن کر برادر مرے مہرباں — سخن فہم و دانشور و نکتہ داں
کہ زور آور ان کا جہاں میں ہے نام — بخلق پسندیدہ مشہور عام
یہ بولے کہ اے منشی اس نامہ کو — تم اب ریختہ کی زباں میں لکھو
کرو نظم ترتیب با آب و تاب — بنام شہنشاہ گردوں جناب
وہ سلطاں کہ ہے تاج شاہنشہاں — وہ خاقاں کہ ہے خسروِ خسرواں
چراغِ شبستان سلطاں تمر — جہاں دار بخشندۂ لعل و در
خدا نے جسے شاہ اکبر کیا — خداوند اورنگ و افسر کیا
سنا یہ سخن جب تو با صد طرب — وہیں کر کے شمشیر خانی طلب
ہوا میں دل و جاں سے مصروف کار — لکھی نظم یہ دلکش و آبدار
بجز فکر اشعار شام و سحر — نہ تھی مجھ کو زنہار فکرِ دگر
معانی شناسانِ فرخ نہاد — سخن آشنایانِ با دین و داد
ہوئے سن کے اس نظم کو شادکام — رہِ منصفی سے یہ بولے تمام
کہ واللہ یہ نامہ دل پذیر — بہت خوب ہے بلکہ ہے بے نظیر
بجا ہے جو ہو اسپہ گوہر نثار — کہ ہے یہ بنام شہ نامدار
مرتب یہ جب شاہنامہ ہوا — کیا فکر تب سال و تاریخ کا
تو پھر ہاتفِ غیب نے صبح دم — کہا: "قصہ خسروان عجم"
۱۲۳۵ھ

سبب تالیف سے واضح ہوتا ہے کہ "قصہ خسروان عجم" یعنی شاہنامہ اردو کی تصنیف کے محرک منشی کے بے تکلف دوست تھے جن میں ایک دوست "زور آور" نام کے اصرار پر یہ تصنیف معرضِ وجود میں آئی ۔

قصۂ خسروان عجم جیسا کہ کتاب کے سبب تالیف سے بھی ظاہر ہے توکل بیگ کی تاریخ شمشیر خانی کا ترجمہ ہے ۔ منشی توکل بیگ اور شاہ نامے کے اسلوب سے اس قدر متاثر ہے کہ

پوری مثنوی پر ان دونوں کتابوں کی عمومی فضا محیط ہے۔ منشی نے سرور سلطانی کے برعکس شمشیر خانی کے زیادہ سے زیادہ مطالب کو نظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاہ نامہ فردوسی کی فضا کو اس قدر قائم رکھا ہے کہ بے شمار اشعار اور مصرعے اردو کی بجائے فارسی زبان کے ہو گئے ہیں برصغیر کے داستان نگاروں کی ایک روش یہ بھی ہے کہ وہ عموماً داستانوں کے عنادین فارسی میں لکھتے ہیں۔ آج بھی پنجابی زبان کی جو داستانیں اور قصے شائع ہوئے ہیں۔ ان کے عنادین فارسی میں ہی ہوتے ہیں یہ ایک روایت ہے جس کا سبب شاید تصنیف کو علمی اور ادبی ثقاہت دینا ہے۔ اسی روایت کے تحت مول چند منشی نے بھی" قصہ خسروان عجم" کے سارے عنوان فارسی میں ہی تحریر کیے ہیں۔ مثلاً:

"آمدن سلطنت ایران ضحاک و آوارہ شدن جمشید و رسیدن تنہا در شہر زابل بلباس دیگر و شناختن او را دختر شاہ زابلستان و عقد بستن باا و"

"خواب دیدن ضحاک و ترسیدن از آں خواب ہولناک"

نشستن فریدون بر تخت کیان و گرفتار ساختن ضحاک را و تسخیر کردن ملک بتائید یزداں" وغیرہ۔

جہاندار جمشید عالی وقار	خردمند دانشور و ہوشیار
خداوند اورنگ و شاہنشہی	سپہ دار اقلیم فرمان دہی
سپہ دار مر تاشس تازی بنام	شہ کامران خسرو ذو الکرام
زرہ پوش مردان شمشیر زن	جوانان جنگ آور و صف شکن
سوئے گرگساران مازندراں	بفرمان فرماں روای جہاں

فارسی مصرعے، بطور مثال:

سیامک تھا اس شاہ کا اک پسر	خردمند مثل پدر نامور
دلیر و ہنرمند و اہل تمیز	کہ جو موت کا جان دل سے عزیز
پئے رزم شاہنشہ نامدار	وہ لایا بہت لشکر دیو سار
ہوا جب کہ ہوشنگ فیروز بخت	بصد فرہی مالک تاج و تخت

ان اشعار میں اگر ایک آدھ لفظ تبدیل کر دیا جائے تو پورے کے پورے فارسی زبان کے ہو جاتے ہیں۔

منشی نے ترجمے کو شمشیر خانی کے متن سے قریب رکھا ہے۔ شاہ نامہ فردوسی کے مطابق نہیں کیوں کہ ایسا کرنے سے شمشیر خانی کے مقاصد کو نقصان پہنچتا تھا۔ منشی بعض جگہ اصل سے مختصر تر ضرور ہوئے ہیں لیکن یہ اختصار ایسا نہیں کہ قاری کو سرورِ سلطانی کی یاد دلائے۔ ڈاکٹر بشیر حسین مرحوم نے منشی کے متن کا فردوسی سے مقابلہ کر کے محاکمے کا صحیح طور پر حق ادا نہیں کیا اس لیے کہ "قصۂ خسروانِ عجم" تو شاہ نامہ فردوسی کے ان مطالب کا ترجمہ ہے جو تاریخ شمشیر خانی میں درج ہوتے ہیں نہ کہ خود شاہ نامے کا۔ بہر حال اس جگہ بے وقوع نہ ہوگا اگر فردوسی، توکل بیگ مول چند منشی اور رجب علی بیگ سرور کا ایک ایک اقتباس سامنے رکھا جائے تا کہ زیرِ نظر متن کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کیا جا سکے :۔

شاہ نامہ فردوسی :

۱۔ خروشید جوشید جامہ درید ہزاری بآں کودک نارسید

برآورد بانگ و غریو و خروش زماں تا زماں زو می رفت ہوش

فرو بردہ ناخن دو دیدہ بہ کند برآورد بالا در آتش فگند

ہر آں زلف چوں تاب دادہ کمند بہ انگشت پیچیدہ واز بن بکند

بہ سر بر فگند آتش و بر فروخت ہمہ موی مشکیں بہ آتش بسوخت

ہمیں گفت کای جانِ مادر کنوں کجائی سرشتہ بخاک و بخوں

ہمیں گفت و می خست و می کند موی ہمی زد کفِ دست بر خوب روی

۲۔ تاریخ شمشیر خانی :

"بعد چند گاہ چوں ایں خبر بمادر سہراب رسید، ہماندم آتش زد۔ مردم اورا فی الحال از آتش کشیدند اما موی او تمام سوخت و بدن او داغ داغ شد۔

بہ سر خاک زد آتشی بر فروخت ہمی جور موی سیاہش بسوخت

دو زلفش کہ بد نابدادہ کمند بر انگشت پیچیدہ از بن بکند

۳۔ قصہ خسروانِ عجم :

گئی جب یہ سوئے سمنگاں خبر — تو تہمینہ کو غم ہوا اس قدر
کہ آتش وہیں کر کے افروختہ — گری آگ میں بادل سوختہ
لیا کھینچ مردم نے پھر دوڑ کر — ولیکن جلے سر بسر موی سر
تن نازنین بھی ہوا داغ داغ — جہاں اس کی نظروں میں تھا بے چراغ

۴۔ سرورِ سلطانی :

"اس (سہراب) کی ماں کا یہ سن کے عجب حال ہوا۔ ایک دم جینا محال ہوا، سہر سمنگاں کو آگ لگا دی۔ اس آتش سوزاں میں وہ دل جلی کود پڑی۔ لوگوں نے گو جلدی نکالا تھا مگر سر سے پاؤں تک بدن میں ہزار چھالا تھا۔"

ان اقتباسات پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ توکل بیگ نے محض امر واقعہ کو لیا ہے اس میں مصنوعی رنگ آمیزی نہیں کی اور اسی کا ترجمہ منشی نے اور سرور نے کیا ہے۔ در اصل نفس مضمون کا ابلاغ ہی ان تینوں کا بنیادی مقصد ہے۔

"قصہ خسروان عجم" کے بارے میں ایک نکتہ یہ عرض بھی کرنا چاہتا ہوں کہ مول چند منشی ہر چند کہ غیر مسلم ہے لیکن اس کے فکر و فن پر اسلامی تہذیب و ثقافت کی گہری چھاپ موجود ہے۔ ممکن ہے یہ شاہ نصیر کا فیضان ہو یا اس کی اپنی افتادِ طبع یا فکری اور روحانی وابستگی۔ کتاب کے آغاز میں حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم میں منشی کے بیان میں اس قدر عقیدت اور گداز موجود ہے کہ اس پر "قلب او مومن دماغش کافر است" کی مثال صادق آتی ہے حالاں کہ شمشیر خانی میں حمد و نعت الگ الگ عنوانات کے تحت موجود ہی نہیں ہیں اور سرور سلطانی میں حمد و نعت عالمانہ تحریریں معلوم ہوتی ہیں۔

حواشی

۱۔ نفوذ و تاثیر شاہنامہ فردوسی در ہند و پاکستان : سخندانی ہای سومین دورہ سخنوانی و بحث دربارہ شاہ نامہ فردوسی،

وزارت فرہنگ و ہنر تہران ۔

۲۔ فرہنگ نامہ قوس : دکتر نذیر احمد ؛ مجلہ فکر و نظر (اردو) جولائی ۱۹۶۵ء

۳۔ فرہنگ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ؛ مطبوعہ وزارت فرہنگ و ہنر تہران ۔

۴۔ بحوالہ فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان ؛ احمد منزوی

مرکز تحقیقات فارسی ایران پاکستان ، اسلام آباد ۔

۵۔ شاہجہاں نامہ (عمل صالح) ، محمد صالح کنبو ، ؛ جلد سوم ص ۱۱۱ ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۲ء

۶۔ تاریخ دل کشائے شمشیر خاں (شمشیر خانی) ، ؛ ص ۱ تا ص ۳ ، مخطوطہ مکتوبہ جمادی الثانی ۱۱۳۴ھ جنوری ۱۷۲۳ء ، مخزونہ کتاب خانہ گنج بخش ، اسلام آباد ۔

۷۔ شاہجہاں نامہ ص ۱۲۲ و ص ۱۲۳

۸۔ ایضاً ص ۱۲۱

۹۔ ایضاً ص ۱۳۲

۱۰۔ فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان : احمد منزوی ؛ جلد ۱۱ ، مرکز تحقیقات فارسی ایران پاکستان ، اسلام آباد ۔

۱۱۔ تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۲۶۶

۱۲۔ ایضاً ص ۳۴۲

۱۳۔ دکن میں اردو ؛ نصیر الدین ہاشمی ص ۷۳ ،

فارسی ادب کے منظوم اردو تراجم : ڈاکٹر بشیر حسین ؛ مخزونہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور ۔

۱۴۔ فہرست بلوم ہارٹ ص ۸۹ ۔ بحوالہ مذکورہ ماقبل

۱۵۔ سرو سلطانی : ص ۵۴ تا ص ۵۵ ، مرتبہ آغا سہیل ، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۵ء ۔

۱۶۔ ایضاً : مقدمہ

۱۷۔ گلشن بے خار : ص ۱۹۲ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۴ء

۱۸۔ گلشن بے خزاں : ص ۲۳۳ " " ۱۲۹۱ ۔

۱۹۔ گلستان سخن : ص ۲۳۵ ، مطبوعہ

۲۰ے ارمغان گوکل پرشاد : ص ۸۲، مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۷۵ء

۲۱ے خوش معرکہ زیبا : ص ۱۴۹، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۲ء

۲۲ے یادگار شعراء : ص ۱۹۶، مطبوعہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۹۲۳ء

۲۳ے طبقات الشعرائے ہند : ص ۳۸۹، مطبوعہ

۲۴ے جامع الاشعار : ص ۴۲، مطبوعہ نظام المطابع مدراس ۱۸۸۳ء

۲۵ے مجموعہ نغز : ص ۲۲۲، مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۳۳ء

۲۶ے عجائب القصص : مقدمہ ڈاکٹر سید عبداللہ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۵ء

۲۷ے نادرات شاہی : مطبوعہ ہندوستانی پریس رام پور ۱۹۴۴ء

ڈاکٹر سید شاہد اقبال

بہار کی دانش گاہوں میں اردو تحقیق

(آغاز سے ۱۹۹۰ء تک)

ریاست بہار کی دانش گاہوں میں مختلف نوعیت کی زبان اردو میں ادبی تحقیقات کو ایک مستحکم اور جاندار ادبی روایت کی حیثیت حاصل ہے، پچھلے ۳۵ برسوں میں تین سو سے زائد مقالات تحقیقی عالم وجود میں آچکے ہیں۔ فی زمانہ یہ تحقیقی کام تیزی سے جاری ہے۔

اس اہم ادبی کام میں ایک یونی ورسٹی کے شعبہ کا دوسری یونی ورسٹی کے شعبے سے عدم تعلق اور عدم رابطہ کی وجہ سے نہ صرف معیار تحقیق میں گراوٹ آگئی ہے بلکہ ایک ہی موضوع پر کاموں کی تکرار بھی کم نہیں ــــــ اس پس منظر میں اس بات کی ضرورت ہے کہ تحقیقی کاموں کا جائزہ لیا جائے اور ان منظور شدہ تحقیقات ادبیہ کی توضیحی فرہنگ ترتیب دی جائے۔

راقم کی تیار کردہ اس نوع کی پہلی فہرست جو مگدھ یونی ورسٹی سے متعلق ہے، ہماری زبان (ہفتہ وار۔ نئی دہلی)، بابت ۸ راگست ۱۹۸۸ء میں شایع ہوئی۔ مذکورہ فہرست کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر "بہار کی دانش گاہوں میں اردو تحقیق" کی مکمل فہرست (مطبوعہ/غیر مطبوعہ) ایک ساتھ پیش خدمت ہے۔

پٹنہ یونی ورسٹی، پٹنہ (قائم شدہ ۱۹۱۷ء)

نمبر شمار	موضوع	مقالہ نگار	نگراں	سال
۱	بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء (مطبوعہ) آغاز سے ۱۸۵۷ء تک (ڈی لٹ)	ڈاکٹر اختر اورینوی		۱۹۵۷ء
۲	جدید اردو افسانہ نگاری	″ فردوس فاطمہ نصیر	ڈاکٹر اختر اورینوی	۱۹۵۷ء
۳	راسخ عظیم آبادی بحیثیت مثنوی نگار (مطبوعہ)	″ ممتاز احمد	پروفیسر کلیم الدین احمد	۱۹۵۸ء
۴	متحدہ تہذیب اردو ادب کی روشنی میں	″ محمد یوسف خورشیدی	″ ″	۱۹۶۱ء
۵	شاہ آیت اللہ جوہری، حیات اور شاعری (ڈی لٹ)	″ سید صدر الدین فضا	″ ″	۱۹۶۱ء
۶	پریم چند کی افسانہ نگاری	″ محمد شکیل الرحمٰن	″ ″	۱۹۶۲ء
۷	راسخ کے دو شاگرد محسن اور فرحت	″ محمد مطیع الرحمٰن	″ ″	۱۹۶۴ء
۸	شاہ رکن الدین عشق، حیات اور شاعری (مطبوعہ)	″ تریشہ خاتون	″ ″	۱۹۶۴ء
۹	شیر علی افسوس، عصر، حیات اور شاعری (مطبوعہ)	″ سید ظہیر الحسن		۱۹۶۶ء
۱۰	فضل حق آزاد، حیات اور شاعری (مطبوعہ)	″ روحی حسن مجید	″ اختر اورینوی	۱۹۶۶ء
۱۱	بہار میں اردو شاعری کا ارتقاء ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک	″ کلیم احمد عاجز	″ ″	۱۹۶۶ء
۱۲	صوفی منیری حیات اور شاعری (مطبوعہ)	″ خالد رشید صبا	″ ″	۱۹۶۶ء
۱۳	صوفی منیری کے نثری کارنامے (مطبوعہ)	″ محمد طیب ابدالی	″ اختر اورینوی	۱۹۶۸ء
۱۴	صغیر بلگرامی بحیثیت شاعر و ادیب (مطبوعہ)	″ ظفر اوگانوی	″ جمیل مظہری	۱۹۶۸ء
۱۵	اردو نثر میں طنز و مزاح اور رشید احمد صدیقی کا حصہ (مطبوعہ)	″ اقبال اختر	″ سید صدر الدین فضا	۱۹۶۸ء
۱۶	راجندر سنگھ بیدی، حیات اور خدمات (مطبوعہ)	″ سید نثار مصطفیٰ	″ اختر اورینوی	″
۱۷	جرات بحیثیت مثنوی نگار	″ محمد یونس	ممتاز احمد	۱۹۶۹ء
۱۸	شاہ اکبر داناپوری حیات اور شاعری (مطبوعہ)	″ محمد طلحہ رضوی برق	″ جمیل مظہری	۱۹۷۰ء
۱۹	اردو شعرا کا تنقیدی شعور (ڈی لٹ)	″ ممتاز احمد	″ کلیم الدین احمد	″

۲۰ بہار میں اردو نثر کا ارتقاء ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک ، پروفیسر سید مظفر اقبال پروفیسر کلیم الدین احمد ۱۹۷۰ء
(ڈی لٹ) مطبوعہ

۲۱ قلی قطب شاہ کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب	〃 شاہ شکیل احمد	〃 سید صدر الدین فضا	۱۹۷۱ء
۲۲ اردو ڈراما آغا حشر کے بعد (مطبوعہ)	〃 قمر اعظم ہاشمی	〃 اختر اورینوی	〃 〃
۲۳ اردو میں واسوخت نگاری 〃	〃 محمد زین العابدین	〃 سید صدر الدین فضا	۱۹۷۲ء
۲۴ آتش لکھنوی، حیات اور شاعری	〃 محمد شعیب راہی	〃 اختر اورینوی	۱۹۷۳ء
۲۵ ظہور الحق پھلواروی حیات اور خدمات	〃 قاسم احسن وارثی	〃 مطیع الرحمٰن	〃 〃
۲۶ اردو ناول ۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۷ء	〃 اسلم آزاد	〃 اختر اورینوی	۱۹۷۴ء
۲۷ اردو نثر کا اسلوب محمد حسین آزاد سے ابوالکلام آزاد تک	〃 عبدالخالق	〃 جمیل مظہری	〃 〃
۲۸ بہار میں انیس کے بعد مرثیہ نگاری	〃 سید افضل حسن	〃 مطیع الرحمٰن	۱۹۷۵ء
۲۹ اردو میں قصیدہ نگاری، آغاز سے ۱۹۶۵ء تک	〃 محمد کمال الدین	〃 اختر اورینوی	〃 〃
۳۰ محمد جعفر خاں راغب اور اردو میں ان کی ادبی خدمات	〃 محمد کاظم حسین	〃 کلیم الدین احمد	〃 〃
۳۱ تدوین دیوان مہدی بخش تسلیم (مطبوعہ)	〃 حمیرا خاتون	〃 〃	〃 〃
۳۲ امیر اللہ تسلیم حیات اور شاعری	〃 سید فضل امام رضوی	〃	۱۹۷۶ء
۳۳ سرشار کے نسوانی کردار	〃 ثریا جمال مظہری	〃 یوسف خورشیدی	〃 〃
۳۴ ناسخ کے شاگرد، بحر لکھنوی	〃 حمیدہ خاتون	〃 سید صدر الدین فضا	〃 〃
۳۵ اردو افسانہ ۱۹۴۷ء کے بعد	〃 قدوس جاوید	〃 〃	〃 〃
۳۶ اردو تنقید حالی کے بعد (ڈی لٹ)	〃 سید نواب کریم		۱۹۷۷ء
۳۷ اردو غزل میں فکری عناصر (ڈی لٹ)	〃 یوسف خورشیدی	—	〃 〃
۳۸ اردو مرثیہ اور خاندان دبیر	〃 سیدہ بیگم	یوسف خورشیدی	〃 〃
۳۹ شاہ محمد ہاشم بہاری بحیثیت شاعر	〃 ذیشان فاطمی	〃 〃	〃 〃
۴۰ میر حسن کی غزلیات مع تعارف (ڈی لٹ)	〃 محمد ذکی الحق	—	〃 〃
۴۱ رنجور عظیم آبادی حیات اور فن (مطبوعہ)	ثریا جبیں	〃 ممتاز احمد	〃 〃

۴۲ عبدالماجد دریابادی حیات اور خدمات	ڈاکٹر عتیق الرحمٰن خاں	-	۱۹۷۷
۴۳ نذیر احمد کی کردار نگاری	" اشرف جہاں	-	۱۹۷۸
۴۴ شوق نیموی حیات اور خدمات	" ریاض احمد سہیل	-	" "
۴۵ آسی غازی پوری بحیثیت صوفی شاعر	" سید محمد کاظم ہاشمی	پروفیسر جمیل مظہری	" "
۴۶ اکبر الہ آبادی کے سیاسی افکار و خیالات	" محمد عزیز الرحمٰن	" ممتاز احمد	۱۹۷۹
۴۷ غالب کی شاعری اور فن	" محمد مظہر عالم	" "	۱۹۸۰
۴۸ حفیظ عظیم آبادی حیات اور شاعری (مطبوعہ)	" سید سمیع احمد	" کلیم عاجز	۱۹۸۱
۴۹ اردو میں خود نوشت سوانح نگاری	" شیریں جمال	" ذکی الحق	" "
۵۰ راسخ کی غزل گوئی	" لطف الرحمٰن	" مطیع الرحمٰن	۱۹۸۲
۵۱ قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں نسوانی کردار	" شمیم صادقہ	" قریشہ خاتون	" "
۵۲ حسرت موہانی اور اردوئے معلیٰ	" ریحان غنی	" ممتاز احمد	" "
۵۳ نذیر احمد بحیثیت ناول نگار (مطبوعہ)	" اعجاز علی ارشد	" سید نواب کریم	۱۹۸۳
۵۴ انیس کے مرثیوں میں شاعرانہ آرٹ	" زاہدہ قدوس	-	" "
۵۵ عبدالمنان بیدل حیات اور خدمات	" شمشاد بیگم	" اعجاز علی ارشد	" "
۵۶ عصمت چغتائی بحیثیت ناول نگار	" فرزانہ اسلم	" ممتاز احمد	" "
۵۷ اردو کے سفرنامے	" برکت علی	" "	" "
۵۸ عبدالحق بحیثیت نقاد	" محمد مشتاق احمد	" "	" "
۵۹ مبارک عظیم آبادی حیات اور شاعری	" نشاط احمد	" "	" "
۶۰ اردو کے علاقائی ناول	" عشرت بانو	" "	" "
۶۱ کلیم عاجز، عہد اور فن	" رئیس الحق	" اعجاز علی ارشد	" "
۶۲ آسی غازی پوری حیات اور خدمات اور تدوین کلام (ڈی لٹ)	" محمد طیب ابدالی	-	۱۹۸۴
۶۳ بہار میں اردو ناول نگاری	" آصفہ واسع		۱۹۸۴

نمبر	عنوان	مقالہ نگار	نگراں	سال
۶۴	ماہنامہ ندیم (گیا) کی ادبی خدمات (مطبوعہ)	ڈاکٹر عظیم الحق داؤدی	پروفیسر ممتاز احمد	۱۹۸۴ء
۶۵	نصیر الدین حسین نصیر حیات اور شاعری	" ناصر رضا جلالی	" کلیم الدین احمد	" "
۶۶	عبدالغفور شہباز حیات اور خدمات	" اعظم الحق داؤدی	" کلیم عاجز	" "
۶۷	عبدالحق بحیثیت محقق	" رومانہ زرّین	" قریشہ خاتون	" "
۶۸	ابلیغ کی ادبی خدمات	" محمد عمر ابدالی	" ممتاز احمد	" "
۶۹	عظیم آباد میں اردو	" محمد معز الدین	" ذکی الحق	۱۹۸۵ء
۷۰	بہار میں اردو مثنوی نگاری کا ارتقاء	" محمد قمر الزماں	" سیدہ بیگم	" "
۷۱	شوق نیموی حیات اور شاعری	" ابراہیم آہ	" جمیل مظہری	" "
۷۲	سہیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری	" محمد حبیب الحق	" اعجاز علی ارشد	" "
۷۳	خلیل الرحمٰن اعظمی حیات اور شاعری (مطبوعہ)	" اسلام عشرت	" اسلم آزاد	" "
۷۴	واقف دہلوی، احوال تدوین دیوان و تنقید کلام	" شکیب ایاز	" کلیم الدین احمد	" "
۷۵	پروفیسر محمد مجیب حیات و خدمات	" صادقہ ذکی	" ممتاز احمد	" "
۷۶	ترتیب و تدوین دیوان رضیہ خاتون جمیلہ خدابخش	" محمد اسرائیل رضا	" "	۱۹۸۶ء
۷۷	احادیث نبوی کے تراجم و تشریحات	" محمد عاصم اعظمی	" "	" "
۷۸	بہار میں اردو صحافت	" جاوید حیات	" "	" "
۷۹	بہار کا اردو ادب ۱۹۴۷ کے بعد	" نسیم اختر	" یوسف خورشیدی	۱۹۸۷ء
۸۰	پریم چند کے نمائندہ کردار۔ ناول کی روشنی میں	" عبدالستار	" اسلم آزاد	۱۹۸۸ء
۸۱	یاسؔ بہاری حیات اور شاعری	" انیس صدوی	" ممتاز احمد	" "
۸۲	اردو میں مرصع نثر کی روایت	" ممتاز احمد خاں	" "	" "
۸۳	اکبر بحیثیت شاعر	" محمد انوار عالم	" "	۱۹۸۹ء
۸۴	سریر کابری حیات اور شاعری	" نشاط عابدین	" یوسف خورشیدی	" "

مندرجہ ذیل مقالات برائے پی. ایچ. ڈی داخل کیے جا چکے ہیں

۱	کرشن چندر کی ناول نگاری	اشفاق احمد خاں	پروفیسر ممتاز احمد
۲	غالب کے خطوط میں عصری حیثیت	بیگم حسنین	〃 〃
۳	"آج کل" کی ادبی خدمات	شمویل احمد	〃 کلیم عاجز
۴	بہار میں اردو مرثیہ آزادی کے بعد	شہناز بیگم	〃 یوسف خورشیدی
۵	اردو مرثیہ میں بہاویہ اور ساقی نامہ	شہناز بانو	〃 〃
۶	اردو افسانے پر تقسیم ہند کے اثرات	ظفر سعید	〃 قریشہ خاتون
۷	بہار میں اردو تحقیق	زاہدہ بانو	〃 حمیرا خاتون
۸	احمد جمال پاشا حیات و خدمات	ظفر کمالی	〃 اعجاز علی ارشد
۹	دبستان عظیم آباد کے ادبی گلدستے	عفت وہاب	〃 ثریا جبیں

بہار یونی ورسٹی مظفر پور، قائم شدہ ۱۹۵۲ء

۱	مرزا محمد علی فدوی عصر حیات اور شاعری	ڈاکٹر سید محمد حسنین	پروفیسر کلیم اللہ احمد	۵۶ء
۲	متصوفانہ شاعری میں تصور عشق	〃 سید احمد احسن		۱۹۶۱
۳	بہار میں اردو ناول نگاری	〃 آصفہ ذکریا		۱۹۶۶
۴	مرزا مسیح فطرت سوانح حیات اور کارنامے	〃 مطیع احمد		۱۹۶۷
۵	دیوان عبدالوہاب بکھروکی تدوین (ڈی لٹ، مطبوعہ)	شمیم احمد	〃 قاضی عبدالودود	〃 〃
۶	اردو نثر کی ترقی میں شاد عظیم آبادی کا حصہ (مطبوعہ)	〃 وہاب اشرفی	〃 اختر قادری	〃 〃
۷	عبدالغفور شہباز حیات اور کارنامے (مطبوعہ)	〃 محمد اختر الحسن	〃	〃 〃
۸	نظیر کی شاعری میں فطرت اور تہذیب کے عناصر (ڈی لٹ)	〃 محمد سلیمان	〃 شمس الدین احمد	〃 〃

نمبر	موضوع	نام	نگران	سال
۹	پریم چند کے بعد اردو افسانہ	ڈاکٹر محمد حامد	پروفیسر اختر قادری	۱۹۶۹
۱۰	بہار میں اردو سوانح نگاری کا آغاز و ارتقا (مطبوعہ)	" عبدالواسع	" "	۱۹۷۱
۱۱	اردو شاعری میں جدید رجحانات (مطبوعہ)	" انوار حسین	" محمد سلیمان	۱۹۷۲
۱۲	اردو مثنویوں میں کردار نگاری	" نجم الہدیٰ	" اختر قادری	۱۹۷۳
۱۳	جدید اردو ادب پر وجودیت کے اثرات	" خورشید عالم	" "	۱۹۷۴
۱۴	منشی دیا شنکر نسیم حیات اور کارنامے	" الیس احمد	" "	۱۹۷۵
۱۵	سید سلیمان ندوی، حیات اور خدمات	" علی وردی خاں	" "	" "
۱۶	فوق البشر کا تصور اور اقبال کا مرد مومن	" حاتم رامپوری	" "	۱۹۷۶
۱۷	فیض احمد فیض کی شاعری میں تشبیہ استعارہ	" نئی جہاں	" "	" "
۱۸	دیوان ریاض حسن خاں خیال ترتیب و تدوین	" فاروق احمد صدیقی	" شمیم احمد	۱۹۷۸
۱۹	نظیر اکبر آبادی کی خدمات بحیثیت نظم گو	" جمیلہ محمد جان	" محمد سلیمان	" "
۲۰	اختر اورینوی حیات و خدمات	" سید ظاہر حسین شمشاد	" قمر اعظم ہاشمی	" "
۲۱	بہار میں اردو مثنوی نگاری کا ارتقا (مطبوعہ)	" احمد حسین دانش	" شمیم احمد	" "
۲۲	اقبال بحیثیت غزل گو	" منظور عالم نعمانی	" نجم الہدیٰ	" "
۲۳	جمیل مظہری، حیات اور شاعری	" محمد سلیم اشرف	" عبدالواسع	۱۹۷۹
۲۴	سید احتشام حسین۔ حیات اور کارنامے	" اقبال احمد ریاض	" نجم الہدیٰ	۱۹۷۹ء
۲۵	اردو ناول میں خاتون کا حصہ	" محی الدین انصاری	" شمیم احمد	" "
۲۶	اردو ناولٹ فن اور ارتقا	" سید مہدی احمد	" قمر اعظم ہاشمی	
۲۷	ن۔م۔راشد فن اور شاعری	محمد اسرار حیدری	" "	۱۹۸۱ء
۲۸	انیس سے جوش تک اردو مرثیے کا ارتقا	" ثریا جمال مظہری	" محمد سلیمان	۱۹۸۱ء

(۱۸۵۷ء سے ۱۹۵۷ء تک) ڈی لٹ

نمبر	موضوع	نام	نگران	سال
۲۹	اردو میں دیوتا ثر نگاری فن اور ارتقا	" محمد زبیر گوہر	" قمر اعظم ہاشمی	۱۹۸۱ء
۳۰	احسان حسن خاں اور ان کی شعری خدمات	" عبدالقادر اختر	" زبیر احمد قمر	۱۹۸۱ء

۳۱ مخدوم محی الدین حیات اور کارنامے (مطبوعہ)	ڈاکٹر عطاء الرحمٰن	پروفیسر عبدالواسع	۱۹۸۲ء
۳۲ مرزا عظیم بیگ چغتائی حیات اور کارنامے	〃 ریحانہ یاسمین	〃 محمد سلیمان	〃 〃
۳۳ اردو ناولوں میں ہندوستانی زندگی کا عکس	〃 محمد غیاث الدین	〃 قمر اعظم ہاشمی	〃 〃
۳۴ اردو خطوط نگاری میں عبدالغفور شہباز کا حصہ	〃 ایس صابر حسن	〃 〃	〃 〃
۳۵ ترقی پسند تحریک اور اردو کی افسانوی روایت	〃 سید علی عباس	〃 عبدالواسع	۱۹۸۳ء
۳۶ آزادی کے بعد اردو ناول کی ترقی میں خواتین ناول نگار کا حصہ	〃 محمد شمیم احمد	〃 〃 〃	〃 〃
۳۷ اردو افسانے میں انسانی نفسیات کے عناصر	〃 فرحت جہاں آرا بیگم	〃 محمد سلیمان	〃 〃
۳۸ مرزا دبیر اور ان کی مرثیہ نگاری (مطبوعہ)	〃 نفیس فاطمہ	〃 〃	〃 〃
۳۹ جدوجہد آزادی میں اردو شعراء کا حصہ	〃 مقصود احمد انصاری	〃 〃 〃	۱۹۸۴ء
۴۰ آزادی کے بعد اردو ناول میں رجحانات	〃 محمد تہذیب ہاشمی	〃 〃	〃 〃
۴۱ امداد امام اثر حیات اور کارنامے ڈی لٹ (مطبوعہ)	〃 اختر قادری	-	〃 〃
۴۲ جمیل مظہری کا فن	〃 سلیم اشرف	〃 عبدالواسع	〃 〃
۴۳ اختر اورینوی کی تنقید نگاری	〃 عامر صدیقی	〃 〃	〃 〃
۴۴ اردو میں اشتراکی تنقید	〃 ایم اے صدیقی	〃 〃	〃 〃
۴۵ اردو ظرافت اور رشید احمد صدیقی	〃 قطب الدین اشرف	〃 〃 〃	〃 〃
۴۶ سید سلیمان ندوی کی سوانح نگاری	〃 ظفیر الدین انصاری	〃 〃 〃	〃 〃
۴۷ پریم چند کے بعد ناول میں کردار نگاری کا فن	〃 محمد سلیم اللہ	〃 قمر اعظم ہاشمی	〃 〃
۴۸ اردو کی انقلابی شاعری	〃 انور علی	〃 〃	〃 〃
۴۹ سید شاہ شاہد علی فانی گورکھپوری حیات اور خدمات	〃 منظور حسن	〃 〃	〃 〃
۵۰ بہار میں اردو صحافت ارتقا	〃 ولی اللہ صدیقی	〃 شمیم احمد	〃 〃
۵۱ اردو کے تاریخی ناول کا ایک جائزہ	〃 محمد شاکر	〃 〃 〃	〃 〃
۵۲ جگن ناتھ آزاد۔ شخصیت اور شاعری	〃 سید محمد رضوان اللہ	〃 محمد سلیمان	۱۹۸۵ء

۵۳ رتن ناتھ سرشار کے ناولوں میں کردار نگاری	ڈاکٹر محمد ابو شاہد	پروفیسر محمد سلیمان	۱۹۸۵ء
۵۴ ارشد تلامذہ شاد عظیم آبادی	" ابو منور گیلانی	" عطاء الرحمٰن	" "
۵۵ سہیل عظیم آبادی کی افسانہ نگاری	" قیصر جمال	" عبدالواسع	۱۹۸۶ء
۵۶ اردو شاعری میں احتجاجی شعور	" محمد مظاہر الحق	" قمر اعظم ہاشمی	" "
۵۷ اردو نظم میں وجودیت	" محمد شفیع حسن	" "	" "
۵۸ جوش ملیح آبادی کی نثر نگاری	" اسرائیل حسن	" شمیم احمد	" "
۵۹ شفق عماد پوری حیات اور ادبی خدمات	" محمد ثوبان فاروقی	" عبدالواسع	" "
۶۰ شبلی نعمانی کی نثر نگاری	" محمد نصیر	" "	" "
۶۱ مثنوی نل دمن از بھگوت رائے راحت کا تنقیدی مطالعہ	" محمد رئیس	" قمر اعظم ہاشمی	" "
۶۲ قاضی عبدالودود کے تحقیقی کارناموں کا تنقیدی جائزہ	" شمیمہ کمال	" زبیر احمد قمر	۱۹۸۷ء
۶۳ امداد علی بحر لکھنوی۔ حیات اور شاعری	" نور الحسن	" شمیم احمد	" "
۶۴ ڈاکٹر عبدالحق بحیثیت تنقید نگار	" محمد وجیب الحق	" قمر اعظم ہاشمی	" "
۶۵ شبلی نعمانی بحیثیت مورخ اسلام	" غلام غازی خاں	" عطاء الرحمٰن	۱۹۸۸ء
۶۶ اردو افسانہ روایت اور امکانات	" محمد سلمان	" متین احمد صبا	" "
۶۷ بہار میں اردو مرثیہ نگاری	" سید حسن عباس	" عبدالواسع	" "
۶۸ اردو افسانے میں کردار نگاری کا فن	" ہمزا میمہ	" "	" "
۶۹ بہار میں جدید نظم کا ارتقاء (۱۹۴۷ء - ۱۹۷۷ء)	" ولی احمد ولی	" قمر اعظم ہاشمی	" "
۷۰ عبدالماجد اختر حیات اور خدمات	" سید مظہر الحق انور	" "	" "
۷۱ محمد علی جوہر حیات اور کارنامے	" نسیم بانو	" "	" "
۷۲ بہار کی اردو شاعری پر ترقی پسند تحریک کا اثر	" شمس الضحیٰ شمس جالوی	" "	" "
۷۳ پریم چند کے ناولوں میں عورت	" اختر کمال بانو	" عبدالواسع	" "
۷۴ اجتبیٰ رضوی۔ حیات اور شاعری	" اظہار احمد	" "	" "
۷۵ اقبال کی شاعری میں ڈرامائی عناصر	" نبی احمد	" محمد سلیمان	" "

٧٦	اردو ظرافت پر ترقی پسند تحریک کے اثرات	ڈاکٹر ابوالبرکات	پروفیسر ناز قادری	١٩٨٨ء
٧٧	سید محمد حسن شفا گوالیاروی حیات اور شاعری	〃 محمد امان اللہ قادری	〃 〃	١٩٨٩ء
٧٨	سجاد ظہیر کی ادبی خدمات	〃 محمد تنویر نور	〃 〃	〃 〃
٧٩	برج نرائن چکبست کی قومی شاعری	〃 خورشید انور	〃 قمر اعظم ہاشمی	〃 〃
٨٠	حیات اللہ انصاری حیات اور خدمات	〃 جلال اصغر فریدی	〃 〃	〃 〃
٨١	اردو نثر میں طنز و مزاح	〃 اقبال حسن آزاد	〃 عبدالواسع	〃 〃
٨٢	احتشام حسین کی تنقید نگاری	〃 حامد الرحمٰن	〃 〃	〃 〃
٨٣	سید شاہ عطا حسین عطا کاکوی حیات اور کارنامے	〃 محمد لئیق الرحمٰن	〃 〃	〃 〃
٨٤	مولانا مناظر احسن گیلانی کی سوانح نگاری	〃 انور جہاں	〃 〃	〃 〃
٨٥	پریم چند کے ناولوں کا نمایندہ کردار۔ ایک تجزیاتی مطالعہ	〃 عبدالسمیع صدیقی	〃 〃	〃 〃

مگدھ یونی ورسٹی، بودھ گیا (قائم شدہ ١٩٦٢ء)

١	اکبر الٰہ آبادی سماجی اور سیاسی مطالعہ (مطبوعہ)	〃 افصح ظفر	〃 سید محمد حسنین	١٩٧٢ء
٢	بہار میں افسانہ نگاری	〃 عبدالحفیظ انصاری	〃 〃	١٩٧٤
٣	اردو غزل اور شاد عظیم آبادی کا فن	〃 سید آل احمد	〃 〃	〃 〃
٤	بہار میں مزاح نگاری اور انجم مان پوری	〃 انیس الرحمٰن	〃 افصح ظفر	١٩٧٥
٥	عظیمؔ عظیم آبادی عصر، حیات اور شاعری (مطبوعہ)	〃 محمد محفوظ الحسن	〃 سید محمد حسنین	〃 〃
٦	بہار میں تذکرہ نگاری (مطبوعہ)	〃 محمد منصور عالم	〃 〃	〃 〃
٧	سعادت یار خاں رنگین، حیات اور شاعری (ڈی لٹ مطبوعہ)	〃 حسن آرزو	〃 〃	١٩٧٧
٨	اردو شاعری کے رجحانات (١٨٨٠ء سے ١٩٤٧ء تک)	علیم اللہ حالی	〃 〃	١٩٧٧

۹	غالب کی اردو شاعری میں پیکر تراشی	ڈاکٹر حسن امام	ڈاکٹر افصح ظفر	۱۹۷۷
۱۰	امیر الدین وجد، حیات اور شاعری	〃 ملک غلام مصطفےٰ	〃 شاہ شکیل احمد	〃 〃
۱۱	عرفان اسلام پوری حیات اور شاعری	〃 سید محمد اختر احمد رضوی	〃 محمد طیب ابدالی	۱۹۷۸
۱۲	اردو قصیدہ نگاری پر فارسی قصیدہ نگاری کے اثرات	〃 سید شاہ مطیع الرحمٰن	〃 سید محمد حسنین	〃 〃
۱۳	رومان اور اردو کے چند معروف رومانی شعرا	〃 سید منصور عالم	〃 〃	۱۹۸۰
۱۴	ریختی کی ابتدا ارتقا اور زوال	〃 آفتاب احمد	〃 افصح ظفر	〃 〃
۱۵	ڈرامے کا فن، تکنیک اور اردو کے چند اہم ڈرامے	〃 شکیل احمد خاں	〃 وہاب اشرفی	〃 〃
۱۶	مولانا مناظر احسن گیلانی، حیات اور ادبی خدمات	〃 محمد نور الہدیٰ	〃 محمد قاسم احسن وارثی	۱۹۸۱ء
۱۷	مشرقی منیری حیات اور شاعری (مطبوعہ)	〃 ابو عبیدہ ابدالی	〃 سید محمد حسنین	〃 〃
۱۸	مسدس حالی اور اردو کی قومی و ملی شاعری	〃 ضیاء الدین محمد صابر	〃 محمد طیب ابدالی	۱۹۸۴
۱۹	اردو تنقید میں بہار کا حصہ	〃 سید غلام مرتضیٰ	〃 محمد طلحہ رضوی برق	۱۹۸۳
۲۰	علامت نگاری کا تصور نئے اردو افسانے کے خصوصی مطالعے کے ساتھ	〃 حسین الحق	〃 افصح ظفر	۱۹۸۴
۲۱	اقبال کی شاعری میں خودی کا تصور	〃 اشتیاق احمد	〃 〃	۱۹۸۴
۲۲	بہار میں اردو فکشن - ایک تنقیدی جائزہ	〃 احمد حسین آزاد	〃 〃	〃 〃
۲۳	آل احمد سرور کی تنقید نگاری	〃 سید غنی حیدر زکریا	〃 وہاب اشرفی	〃 〃
۲۴	شکیلہ اختر۔ حیات اور خدمات	〃 فریدہ محسن	〃 سید ظہیر احسن	〃 〃
۲۵	حکیم عبد الحمید شہد اسہسرامی، حیات و خدمات	〃 محمد فصیح الزماں	〃 سید محمد حسنین	〃 〃
۲۶	حضرت سید شاہ ایوب ابدالی نیز اسلام پوری شخصیت اور شاعری	〃 محمد احسان اللہ	〃 محمد طیب ابدالی	〃 〃
۲۷	حضرت بدرالدین اوگھٹ شاہ وارثی حیات اور کارنامے	〃 کبیر الدین خاں	〃 محمد طلحہ رضوی برق	〃 〃

۲۸ نذیر احمد ایک مترجم قرآن	ڈاکٹر منور حسین خاں	ڈاکٹر محمد طلحہ رضوی برق	۱۹۸۴
۲۹ اردو تنقید کے ارتقا میں خلیل الرحمٰن اعظمی کا حصہ	〃 عفت آرا ہاشمی	〃 وہاب اشرفی	〃 〃
۳۰ جمیل مظہری۔ حیات اور شاعری	〃 فضیل احمد	〃 سید محمد حسنین	〃 〃
۳۱ جوش ملیح آبادی کی شاعری سماجی اور سیاسی پس منظر میں	〃 محمد مظہر حسین	〃 افصح ظفر	〃 〃
۳۲ فرقت کاکوروی، عصر، حیات اور ادبی خدمات	〃 سید اقبال واجد	〃 علیم اللہ حالی	〃 〃
۳۳ عطا بہاری، حیات اور شاعری	〃 سید اعلیٰ ابدالی	〃 محمد طیب ابدالی	〃 〃
۳۴ اردو مثنوی میں استحصال جنس	〃 محبوب اعلیٰ قریشی	〃 سید محمد حسنین	۱۹۸۵
۳۵ غالب کی شاعری میں فکری آہنگ	〃 سید اقبال احمد	〃 سید آل احمد	〃 〃
۳۶ شاد عظیم آبادی، بحیثیت مرثیہ نگار	〃 محمد رضوان احمد خاں	〃 سید محمد حسنین	〃 〃
۳۷ محسن داناپوری، حیات اور شاعری	〃 سید شمیم گوہر	〃 محمد طیب ابدالی	〃 〃
۳۸ عبدالباری ساقی حیات اور خدمات	〃 توفیق احمد خاں	〃 سید محمد حسنین	〃 〃
۳۹ شاد عظیم آبادی کے تین شاگرد (سید جان بیتاب، عطا کاکوی، محمود علی خاں صبا)	〃 محمد عین الہدیٰ	〃 علیم اللہ حالی	〃 〃
۴۰ اختر اورینوی بحیثیت کہانی کار	〃 محمد سراج الدین	〃 افصح ظفر	۱۹۸۶
۴۱ ڈاکٹر اختر قادری حیات اور ادبی خدمات	〃 محمد اسد اللہ	〃 〃	〃 〃
۴۲ پریم چند کے ناولوں میں زندہ جاوید کردار	〃 ہمایوں رشید	〃 〃	〃 〃
۴۳ اردو تنقید کی نشو و نما میں سید احتشام حسین کا حصہ	〃 نسیم اختر	〃 〃	〃 〃
۴۴ سید شاہ شاہد علی خانی گورکھپوری حیات اور کارنامے	〃 سید محمد کلیم الدین ثمر	〃 محمد طیب ابدالی	〃 〃
۴۵ بہار کے اردو افسانوں کا اسلوبی مطالعہ	〃 معشوق زبانی	〃 علیم اللہ حالی	〃 〃
۴۶ سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری	〃 محمد اشرف الدین	〃 سید آل احمد	〃 〃
۴۷ قوس حمزہ پوری حیات اور کارنامے	〃 محمد اشرف علی	〃 〃	〃 〃
۴۸ آرہ۔ ایک قدیم مرکز ادب اردو	〃 سید محمد نظام الدین	〃 طلحہ رضوی برق	〃 〃

۴۹ ماہنامہ نگار کے ۷۵ سال — ڈاکٹر طارق قاطمی — ڈاکٹر محمد طیب ابدالی — ۱۹۸۷

۵۰ اردو شاعری پر تصوف کے اثرات (ولی تا اقبال) — ″ حافظ محمد شمیم — ″ فصیح الزماں — ۱۹۸۸

۵۱ عشرت گیاوی کی حیات اور شاعری کا تنقیدی مطالعہ — ″ سید شاہد اقبال — ″ محمد محفوظ الحسن — ″ ″

۵۲ شفق عماد پوری بحیثیت غزل گو — ″ سید سلیمان بلخی — ″ حسین الحق — ″ ″

۵۳ الیاس اسلام پوری حیات اور کارنامے — ″ محمد اشتیاق — ″ محمد طیب ابدالی — ″ ″

۵۴ بہاؤ الدین کلیم حیات اور شاعری — ″ ظہراللہ پالوی — ″ ″ — ″ ″

۵۵ اردو داستانوں میں وطن کا تصور — ″ سید شفیق احمد — ″ فصیح ظفر — ″ ″

۵۶ ناوک حمزہ پوری شخصیت اور ادبی خدمات — ″ محمد حفیظ الرحمٰن — ″ محمد فصیح الزماں — ″ ″

۵۷ فن خطاطی (اردو میں اس کی ابتدا اور ارتقاء) — ″ عبدالرشید انصاری — ″ فصیح ظفر — ۱۹۸۹

۵۸ شبلی نعمانی کی سوانح نگاری — ″ اشرف النبی — ″ عبدالواسع — ″ ″

۵۹ انور علی یاس آروی حیات اور کارنامے — ″ خواجہ صغیر الدین — ″ محمد محفوظ الحسن — ″ ″

۶۰ مخدوم محی الدین کی جدید شاعری میں خدمات — ″ محمد مناظر الحسن — ″ شکیل احمد خاں — ″ ″

۶۱ شفیع تمنائی حیات اور کارنامے — ″ محمد ریحان — ″ طلحہ رضوی برق — ″ ″

۶۲ ثاقب عظیم آبادی حیات اور خدمات — ″ شاہین حیدر — ″ ″

پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ کے لیے مقالے جو داخل کیے گئے

۱ بہار میں اردو کے ہندو شعرا اور ان کی خدمات (ڈی لٹ) — ″ محمد محفوظ الحسن — ″ سید محمد حسنین

۲ حکیم بدیع الزماں قمر نعمانی حیات اور خدمات — ″ محمد مظفر حسن — فصیح الزماں

۳ بہار کی اردو صحافت میں گیا کا حصہ — ″ نعیم شاہد — ″ فصیح ظفر

۴ خدیجہ مستور بحیثیت ناول نگار — ″ محمد بشیر الدین — ″ غنی حیدر

۵ ہوش عظیم آبادی حیات اور خدمات — ″ سید ارشد علی جعفری — ″ اقبال اختر

۶ قتیل دانا پوری حیات اور شاعری — ″ محمد صلاح الدین حیدر — ″ طلحہ رضوی برق

رانچی یونی ورسٹی، رانچی (قائم شدہ ۱۹۶۲ء)

نمبر	موضوع	اسکالر	نگراں	سال
۱	اردو میں خواتین افسانہ نگاروں کا تقابلی اور تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر سید صابر حسین ،، (شین۔ اختر)	-	۱۹۶۸ء
۲	فیض کی شاعری میں پیکر تراشی	،، طلعت جہاں	-	۱۹۷۵
۳	حکیم عبدالحیٔ ہاتف حیات اور شاعری	،، رفعت سجاد	ڈاکٹر احمد سجاد	۱۹۷۶
۴	سید فخرالدین سخن دہلوی حیات اور خدمات	،، سید سمیع الحق	-	۱۹۷۷
۵	مولوی کریم الدین حیات اور کارنامے (مطبوعہ)	،، شان احمد صدیقی	-	۱۹۷۸
۶	جیلانی بانو کی افسانہ نگاری	،، عذرا پروین	-	،، ،،
۷	فراق کی رباعیوں کا تنقیدی جائزہ	،، سید حسن امام	-	،، ،،
۸	مائل خیرآبادی کی نثری خدمات	،، محمد توحید	-	۱۹۷۹
۹	چھوٹا ناگ پور میں اردو افسانے کا آغاز و ارتقاء	،، محمد شمیم الدین	،، شین اختر	۱۹۸۲
۱۰	آغا حشر کے ڈراموں میں نسوانی کردار	،، مسعودہ صفدر امام	،، وہاب اشرفی	،، ،،
۱۱	چھوٹا ناگ پور میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء	،، محمد صدیق مجیبی	،، شین اختر	،، ،،
۱۲	حضرت شاہ کمال علی دیوروی حیات اور شاعری	،، شاہ حسن عثمانی	،، وہاب اشرفی	،، ،،
۱۳	خلیل الرحمٰن اعظمی فن اور شخصیت	،، سید سراج الدین	،، ،،	۱۹۸۳
۱۴	شکیلہ اختر حیات اور کارنامے	،، محمد مجاہد	،، ،،	،، ،،
۱۵	اردو ناول میں شعور کی رو	،، فرزانہ جعفری	،، ،،	،، ،،
۱۶	اردو نثر کے ارتقاء میں غالب کا حصہ	،، محمد مرتضیٰ ہاشمی	،، ،،	۱۹۸۴
۱۷	پریم چند اور شرف چند ایک تقابلی مطالعہ	،، عبداللہ	،، ،،	،، ،،
۱۸	اردو افسانوں میں آدی باسی زندگی	،، پرویز اختر	،، ،،	،، ،،
۱۹	رضا نقوی واہی شخصیت اور شاعری	،، عقیل اشرف	،، سمیع الحق	،، ،،
۲۰	شین مظفر پوری بحیثیت افسانہ نگار	،، حسن رضا	،، احمد سجاد	،، ،،

۲۱ سید فصیح الدین بلخی حیات اور ادبی خدمات	ڈاکٹر سید مظفر بلخی	/ ڈاکٹر احمد سجاد	۱۹۸۴
۲۲ سجاد ظہیر حیات اور خدمات (مطبوعہ)	" عبدالقیوم ابدالی	" ابوذر عثمانی	" "
۲۳ مانوس سہسرامی، شخص اور شاعری (مطبوعہ)	" خالد سجاد	" " "	۱۹۸۶
۲۴ بہار میں اردو کی نعتیہ شاعری	" شاہ وشاد عثمانی	" وہاب اشرفی	" "
۲۵ جدید اردو ادب پر وجودیت کے اثرات	" جمیل اختر	" "	" "
۲۶ اردو میں بچوں کا ادب	" سعدیہ مشہدی	" "	" "
۲۷ اختر شیرانی کی رومانی شاعری (مطبوعہ)	" قمر جہاں	" وہاب اشرفی	" "
۲۸ اردو پہیلیوں میں سماجی اور ثقافتی اثرات (مطبوعہ)	" انور عمادی	" "	" "
۲۹ ذکی انور۔ اور ان کی ناول نگاری	" شبیر احمد	" نادم بلخی	" "
۳۰ وفا حسین آبادی حیات اور شاعری	" الیاس انصاری	" "	" "
۳۱ اردو شاعری میں معشوق کا تصور	" روشن آرا	" "	" "
۳۲ اردو میں تحریکی شاعری ایک تنقیدی مطالعہ	" مظفر مہدی	" احمد سجاد	۱۹۸۷
۳۳ منٹو کے افسانوں کے نسوانی کردار کے روایتوں کا نفسیاتی مطالعہ	" مسرت رحمٰن	" وہاب اشرفی	"
۳۴ نسیم انھونی فن اور شخصیت	" عبدالجبار	" ابوذر عثمانی	" "
۳۵ اردو کے نفسیاتی ناولوں کے فروغ میں ممتاز مفتی کا حصہ	" محمد حسیب	" وہاب اشرفی	" "
۳۶ بہار کی نفسیاتی افسانہ نگار	" انوری بیگم	" "	" "
۳۷ جدید اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات (مطبوعہ)	" خورشید جہاں	" "	۱۹۸۸
۳۸ مہجور شمشی، حیات اور شاعری	" محمد اقبال وارث	" "	" "
۳۹ کرامت علی کرامت، فن اور شخصیت	" محمد عزیز الرحمٰن	" "	" "
۴۰ خواجہ احمد عباس کی ناول نگاری	" ممتاز انصاری	" "	" "
۴۱ مومن سہیل کے مضامین کا تنقیدی جائزہ	" اے رحیم انصاری	" "	" "

۴۲ اختر انصاری، حیات اور ادبی خدمات — ڈاکٹر محمد منصور عمر " ابوذر عثمانی ۱۹۸۸

۴۳ حیات اللہ انصاری حیات اور ادبی خدمات " رحمٰن حمیدی " " " "

۴۴ اردو غزل کے فروغ میں جگر مراد آبادی کا حصہ " محمد مہتاب انصاری " وہاب اشرفی " "

۴۵ کلیم الدین احمد بحیثیت تنقید نگار " عامر مصطفٰے صدیقی " " " "

۴۶ اسالیب غزل " منظر کاظمی " " " " " "

۴۷ روپ کی رباعیات " شہناز رعنا " " " " "

۴۸ اردو ادب میں سوانح نگاری " قاضی عبدالہادی " شین اختر ۱۹۸۹

۴۹ پرویز شاہدی بحیثیت شاعر " نشاط بانو " وہاب اشرفی " "

۵۰ نذیر احمد کے نسوانی کردار " شاہدہ بیگم " " " " "

۵۱ اردو میں مارکسی تنقید کا ارتقا " اسلم پرویز " ابوذر عثمانی ۱۹۹۰

۵۲ اردو غزل کے ارتقا میں کلیم عاجز کا حصہ محمد نعیم الدین " وہاب اشرفی " "

۵۳ اقبال کی شاعری کا استعاراتی نظام " قاضی محمد شعیب " " " " "

بھاگلپور یونی ورسٹی، بھاگلپور (قائم شدہ ۱۹۶۲ء)

۱ ڈاکٹر محمد اقبال کا سماجی فلسفہ ایک تنقیدی جائزہ " عبدالعلیم بلال ۱۹۷۴

۲ عبدالحلیم شرر بحیثیت شاعر (مطبوعہ) " مناظر عاشق ہرگانوی " شمیم فرزا قمر ۱۹۸۱

۳ احوال و افکار و آثار شاہ عبدالحکیم حاکم لاہوری " محمد اسد اللہ ۱۹۸۶

۴ معین احسن جذبی، حیات اور کارنامے " محمد عارف حسین " شمیم احمد ۱۹۸۷

۵ اردو ناول کی روایت اور قرۃ العین حیدر " محمد زاہد خاں " لطف الرحمٰن ۱۹۸۸

۶ سہیل عظیم آبادی کی فنکارانہ اور تخلیقی تہذیب " شبیر احمد " " " " ۱۹۸۴

۷ ترتیب و تدوین کلیات پرویز شاہدی " محمد عباس " رئیس انور ۱۹۸۷

۸ نذیر احمد بحیثیت اخلاقی ناول نگار " محمد علی امام " " " ۱۹۸۸

۹ اردو نظم میں علامت نگاری ۱۹۶۵ء تک " غلام مصطفٰے صدیقی " " ۱۹۸۸

۱۰	اردو تنقید میں جدید رجحانات بہار کے حوالہ سے (ڈی لٹ)	ڈاکٹر شاداب رضی	ڈاکٹر لطف الرحمٰن	۱۹۸۸
۱۱	عصمت چغتائی کی ناول نگاری	" محمد نوشاد عالم آزاد	" "	۱۹۸۹
۱۲	اقبال اور تصوف	" محمد محسن اختر	" "	"
۱۳	فراق گورکھپوری بحیثیت اردو تنقید نگار	" محمد پرویز احمد	" شمیم احمد	"
۱۴	بہار میں اردو افسانہ ۶۰ء کے بعد	" جی جی مہر نگار	" مناظر عاشق ہرگانوی	"

ایل۔ این میتھلا یونی ورسٹی، دربھنگا (قائم شدہ ۱۹۷۲ء)

۱	تفہیم اقبال۔ ایک جائزہ اور تنقید	" غلام قدوس	" نجم الہدیٰ	۱۹۸۰
۲	مراثی شاد میں فکری عناصر	" اظہار احمد	" محمد مطیع الرحمٰن	۱۹۸۳
۳	مطالعہ اقبال۔ تاریخ اسلام کی روشنی میں	" محمد رضوان صدیقی	" محمد طیب صدیقی	۱۹۸۴
۴	محسن دربھنگوی حیات اور شاعری	" عبد القیوم	" "	۱۹۸۵
۵	نواب سعادت علی خاں حیات اور خدمات	" عبد المنان طرزی	" محمد مطیع الرحمٰن	۱۹۸۶
۶	سلام سندیلوی حیات اور خدمات	" سید حسین احمد	" "	"
۷	سلطان جان حیات اور شاعری (ڈی لٹ)	" محمد طیب صدیقی	" "	"
۸	ریاست علی ندوی حیات اور کارنامے	" محمد علقمہ شبلی	" محمد طیب صدیقی	"
۹	بہار کے طنز و مزاح نگار	" نذیر احمد انجم	شاکر خلیق	۱۹۸۷
۱۰	دربھنگا میں اردو کا ارتقاء (۱۹۰۱ء سے ۱۹۷۵ء تک)	" عبد الظہیر ناشاد	" "	"
۱۱	بہار میں اردو مثنوی نگاری کا ارتقاء	" محمد سہیل اختر	" "	۱۹۸۸
۱۲	بہار میں اردو نعت گوئی	" محمد نسیم	" عبد المنان طرزی	"
۱۳	عبد المجید مضطر مظفرپوری حیات اور خدمات	" محمد ظفر العلام ظفر	" محمد طیب ابدالی	"
۱۴	راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں عورت کا تصور	" محمد معین الدین	" محمد مطیع الرحمٰن	"
۱۵	بہار میں اردو نثر کا ارتقاء (۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۷ء تک)	" محمد عبد الرحمٰن	" محمد طیب صدیقی	"

۱۶	ساحر لدھیانوی حیات اور شاعری	ڈاکٹر سید ضیاء الرحمٰن	ڈاکٹر محمد مطیع الرحمٰن	۱۹۸۹
۱۷	اردو کی ادبی تنقید اور جدید ذہن	” محمد عمیر احمد	” محمد طیب صدیقی	” ”
۱۸	مظہر امام کی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ	” سید اعجاز حسن امام اعظم	” ” ”	” ”
۱۹	جدید شاعری کی ہیئت اور ترقی	” رفیع اللہ	” محمد مطیع الرحمٰن	” ”
۲۰	منظری شاعری بہ تخصیص اقبال	” محمد فیاض ظفر	” محمد طیب صدیقی	۱۹۹۰
۲۱	شبلی نعمانی سوانح نگار اور مورخ کی حیثیت سے	” محمد جمیل اختر	” ” ”	” ”

URDUADAB
QUARTERLY

EDITOR

Khaliq Anjum

ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)
NEW DELHI

سہ ماہی

اردو ادب

انجمن ترقی اردو ہند

اردو ادب

١٩٩١ء شمارہ (۴)	١٩٩٢ء شمارہ (١)

اردو ادب

(بابائے اردو مولوی عبدالحق نمبر)

اڈیٹر

خلیق انجم

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دلّی

۱۹۹۱ء شمارہ (۴)　　۱۹۹۴ء شمارہ (۱)

سالانہ قیمت ـــــــــــ ۴۵ روپے

فی شمارہ ـــــــــــ پندرہ روپے

موجودہ شمارے کی قیمت ـــــــــــ ۵۰ روپے

پرنٹر پبلشر ایم۔ حبیب خاں نے ثمر آفسیٹ پرنٹرس دلّی میں چھپوا کر انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر راؤز ایونیو نئی دلّی سے شائع کیا۔

فہرست

حرف آغاز	خلیق انجم	۷
مولوی عبدالحق	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	۱۲
عبدالحق کی تنقید نگاری	پروفیسر عبدالمغنی	۳۰
مولوی عبدالحق کا اسلوب	پروفیسر نثار احمد فاروقی	۳۸
مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری	ڈاکٹر خلیق انجم	۵۶
مولوی عبدالحق کی تنقید نگاری	پروفیسر عنوان چشتی	۶۴
مولوی عبدالحق اور انجمن ترقی اردو ہند کا دلی میں ورود	ایم۔ حبیب خاں	۷۳
ڈاکٹر عبدالحق کے تحقیقی کارنامے	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ	۸۵
مولوی عبدالحق اور ترقی پسند تحریک	ڈاکٹر علی احمد فاطمی	۹۰
بابائے اردو کے رسالے	ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری	۱۰۰
اردو کی ادبی تاریخیں اور مولوی عبدالحق	مرزا سلیم بیگ	۱۲۶
مولوی عبدالحق کی خدمات	مسرت فردوس	۱۳۲
مولوی عبدالحق اور اردو کالج کراچی	شجاع احمد زیبا	۱۴۳
دبستانِ شبلی اور مولوی عبدالحق	عتیق احمد جیلانی	۱۸۵
مولوی عبدالحق کی قواعد نویسی	ڈاکٹر محمد صدیق شبلی	۲۰۸
بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم	صوفی عبدالرشید	۲۱۵

حرفِ آغاز

مولوی صاحب اردو کے صفِ اول کے ادیب، نقاد، ماہرِ دکنیات، محقق، لغت نویس، مترجم، ماہرِ صرف ونحو، تبصرہ نگار، خاکہ نگار اور ادبی صحافی کے ساتھ ساتھ اردو تحریک کے زبردست علم بردار تھے۔ ان کی ساری زندگی اردو اور انجمن ترقی اردو کی خدمت میں گزری۔

انجمن ترقی اردو، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ادبی شعبے کی حیثیت سے قایم ہوئی تھی۔ اس کے پہلے صدر ٹامس آرنلڈ اور سکریٹری علّامہ شبلی نعمانی منتخب ہوئے اور نائب صدور کے عہدوں کے لیے منشی ذکاءاللہ، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا الطاف حسین حالی کو منتخب کیا گیا۔ دو سال بعد یعنی ۱۹۰۵ء میں مصروفیات کی وجہ سے علّامہ شبلی نعمانی مستعفی ہوگئے اور اس عہدے کے لیے حبیب الرحمن خاں شیروانی منتخب ہوئے۔ ۱۹۱۰ء میں شیروانی صاحب نے بھی استعفا دے دیا اور عزیز مرزا صاحب کو یہ ذمہ داری سونپ دی گئی۔ بدقسمتی سے دو سال بعد ہی عزیز صاحب کا انتقال ہوگیا اور اس بار قرعۂ فال مولوی عبدالحق کے نام پڑا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا ہے کہ جب انھوں نے انجمن کا چارج لیا تو انھیں ایک ٹین کا ٹوٹا ہوا صندوق ملا تھا جسے رسی سے باندھ رکھا تھا۔ صندوق کے اندر دو ایک رجسٹر چند پرانے بغیر مرتب کیے مسودات، ایک قلم اور باقی بس اللہ کا نام۔ یہ تھی کل کائنات جو انجمن کے نئے سکریٹری یعنی مولوی صاحب کو ملی تھی۔ مولوی صاحب انجمن کو اپنے ساتھ اورنگ آباد لے گئے۔ انھوں نے انجمن کے جنرل سکریٹری کے عہدے کا چارج نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ لیا تھا۔ مولوی صاحب نے چند ہی روز میں انجمن کو ایک فعال اور سرگرم ادارہ بنا دیا۔ وہ انجمن جس کی کل کائنات ایک ٹوٹا ہوا صندوق تھا، باقاعدہ ایک جدید انداز کے دفتر میں بدل گیا۔ مولوی صاحب نے عزیزوں، دوستوں اور صاحب اقتدار لوگوں سے چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ حیدرآباد ریاست سے درخواست کی اور تین ہزار روپے سالانہ کی امداد انجمن کو ملنی شروع ہوگئی۔ مولوی صاحب کی سب سے بڑی تمنا اور کوشش یہ تھی کہ اردو ایک جدید علمی زبان بن جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ انجمن سے ایسی کتابیں شایع ہوں جن کا معیار یورپ کی اعلا مطبوعات کی سطح پر ہو۔ اس لیے انجمن کا چارج لیتے ہی

مولوی صاحب نے پہلا کام یہ کیا کہ انگریزی کی اہم کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ اردو میں اصطلاحات کی کمی تھی۔ اگرچہ یہ مشکل اس سے پہلے دہلی کالج کی ورنا کیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی اور سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی اور بعض دوسرے اداروں کو درپیش آئی تھی۔ لیکن کسی نے اصطلاحات سازی کا کام منظم طور پر نہیں کیا تھا۔ مولوی صاحب نے اصطلاحات علمیہ کی ایک لغت مرتب کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور اس سلسلے میں خاصا کام ہوا۔ مختلف علوم پر کئی چھوٹی چھوٹی کتابیں شایع ہوئیں۔ مولوی صاحب نے اصطلاحات سازی کے فن پر مولانا وحید الدین سلیم سے ایک کتاب بھی لکھوا کر شایع کی۔ اپنی نوعیت کا اردو میں یہ پہلا اور آخری کام ہے۔ اصطلاحات علمیہ کی لغت تیار کرنے کا خیال اردو میں پہلی بار مولوی صاحب کو آیا تھا بہر حال انجمن نے کام کرنا شروع کیا۔ مولوی صاحب نے خود بھی "اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جو ۱۹۴۹ء میں شایع ہوئی پہلی بار ۱۹۱۴ء میں مولوی صاحب کو یہ خیال آیا کہ انجمن کا صرف ایک مرکزی دفتر ہی کافی نہیں ہے۔ مختلف شہروں میں اس کی شاخیں بھی قایم کی جاتی چاہیں۔

ضلع پربھنی (مہاراشٹر) میں ۱۹۱۴ء میں انجمن کی پہلی شاخ قایم کی گئی، پھر بھوپال، کانپور، جالندھر اور لکھنؤ میں شاخیں قایم ہوئیں۔ ۱۹۲۰ء میں ان شاخوں کی تعداد چالیس کے قریب پہنچ گئی خدا کا شکر ہے کہ مولوی صاحب کا لگایا ہوا یہ پودا اب تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس وقت ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، انگلینڈ اور کینیڈا میں انجمن کی شاخیں قایم ہیں۔ صرف ہندوستان میں ہی ہر صوبے اور تقریباً ہر شہر میں انجمن کی شاخیں موجود ہیں اور ان شاخوں کی تعداد چھ سو بیس سے زیادہ ہے۔

مولوی صاحب نے انجمن میں اردو ادب کی ترقی کے لیے کام شروع کیا تھا لیکن بہت جلد انھیں اردو زبان کے لیے بھی کام کرنا پڑا کیوں کہ ہندوستان کے بعض حلقوں سے اردو کی مخالفت زور پکڑ رہی تھی۔ مولوی صاحب اردو کے پہلے شخص ہیں جنھوں نے منظم طور پر اردو تحریک کا آغاز کر کے انتہائی باقاعدگی کے ساتھ اردو مخالف طاقتوں کا مقابلہ کیا۔ مولوی صاحب کو اس سلسلے میں اولیت حاصل ہے کہ انھوں نے اردو زبان کی ترقی اور فروغ کے لیے ہندوستان کے شہر شہر اور قصبے قصبے کا دورہ کیا۔ اس سے پہلے کبھی کسی نے اردو کے فروغ کے لیے ہندوستان کے مختلف شہروں کے دورے نہیں کیے تھے۔

اب میں چند ایسے امور کا ذکر کروں گا جن میں مولوی صاحب کو اولیت یا غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

اگرچہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں کئی انگریزی اور ہندوستانی لغتیں شایع ہوئیں، ان کی تفصیل مولوی عبدالحق نے انگلش اردو ڈکشنری کے دیباچے میں دی۔ مولوی صاحب نے مستشرقین اور ہندوستانیوں کی تیار کردہ سولہ لغتوں کے نام دیے ہیں۔ ان میں آخری لغت رینکنگ کی انگریزی ہندوستانی لغت ہے جو ۱۹۰۵ء میں شایع ہوئی تھی ان میں سب سے اہم لغت ڈاکٹر فیلن کی نیو انگلش ہندوستانی ڈکشنری ہے جو ۱۸۸۳ء میں بنارس سے شایع ہوئی۔

۱۹۳۰ء میں مولوی صاحب کو خیال آیا کہ انگریزی اردو کی پرانی لغتیں وقت کا ساتھ نہیں دے رہیں۔ اس لیے ایک نئی لغت کی ضرورت ہے۔ چناں چہ انھوں نے بہت بڑے پیمانے پر انگریزی اردو ڈکشنری کا ڈول ڈالا۔ ۱۹۳۷ء میں یہ لغت تیار ہوئی اور انجمن ترقی اردو سے شایع ہوئی۔ یہ اردو کی پہلی جامع انگریزی اردو لغت ہے۔ تقریباً پچپن سال گزرنے کے باوجود اس کی اہمیت برقرار ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ضرورت پڑتی ہے وہاں یہی لغت استعمال کی جاتی ہے۔

مولوی صاحب نے "لغت کبیرہ" کے نام سے کئی جلدوں میں ایک اردو لغت کا کام بھی شروع کیا تھا لیکن یہ کام دو جلدوں سے آگے نہیں بڑھا۔

جون ۱۹۵۸ء میں پاکستان میں ترقی اردو بورڈ کے نام سے ایک خود مختار ادارہ قایم کیا گیا۔ اس ادارے کا مقصد آکسفورڈ ڈکشنری کے انداز پر اردو کی ایک لغت کی تدوین بھی تھا۔ اس لغت کے مدیر اعلا مولوی عبدالحق اور مشیر ادبی جوش ملیح آبادی مقرر ہوئے۔ مولوی صاحب کی زندگی میں بڑے پیمانے پر کام شروع ہو گیا تھا لیکن اس کی پہلی جلد ۱۹۷۷ء میں شایع ہوئی۔ اب تک اس لغت کی تیرہ جلدیں شایع ہو چکی ہیں۔ اس لغت کی تدوین کی تکمیل کے لیے اردو ڈکشنری بورڈ کے نام سے ایک علاحدہ ادارہ قایم کر دیا گیا ہے۔ آج کل اس ادارے کے سربراہ اردو کے ممتاز محقق اور نقاد ڈاکٹر فرمان فتحپوری ہیں۔

مولوی صاحب کی ایک کتاب "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" بہت مختصر ہے لیکن موضوع کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اردو میں پہلی بار صوفیائے کرام کے ملفوظات اور سوانح سے اردو کے وہ فقرے نکالے گئے ہیں جو صوفیا کی زبان سے ادا ہوتے تھے۔ اس کتاب میں مولوی صاحب نے پہلی بار ہماری توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے کہ اردو کے چلن کو عام کرنے میں صوفیائے کرام کا بہت اہم رول رہا ہے۔ بعض صوفیا حضرات اپنے گھر کے لوگوں اور اپنے مریدوں سے اردو ہی میں بات کرتے۔

میرامن نے "باغ و بہار" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ امیر خسرو کے مرشد حضرت نظام الدین اولیا کی طبیعت ناساز ہوئی تو ان کا دل بہلانے کے لیے امیر خسرو فارسی میں ایک داستان سناتے رہے جو "قصہ چار درویش" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس واقعہ کو بہت شہرت حاصل تھی۔ مولوی عبدالحق نے بعض اہم دلائل پیش کر کے پہلی بار ہماری توجہ اس طرف متوجہ کرائی کہ یہ امر تحقیق طلب ہے کہ اس داستان کے مصنف امیر خسرو ہیں۔ بعد کے محققین نے مولوی صاحب کے اس شبہے کو درست ثابت کر دیا۔ اس طرح یہ بات عام طور سے مشہور تھی کہ "باغ و بہار"، فارسی کی "چار درویش" کا اردو ترجمہ ہے خود میرامن نے "باغ و بہار" میں لکھا ہے کہ انھوں نے جان گلکرسٹ کی فرمائش پر فارسی قصّے کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے "باغ و بہار" کے مقدمے میں پہلی بار ثابت کیا ہے کہ میرامن کا یہ بیان درست نہیں ہے۔ کیوں کہ "باغ و بہار" فارسی قصے کا ترجمہ یا اس سے ماخوذ نہیں بلکہ اس کی بنیاد میر محمد حسین عطا خاں تحسین کی اردو داستان "نو طرز مرصع" پر ہے۔ میر تقی میر کا ذکر تذکروں میں تو ملتا تھا، ان کے دیوان کا پہلا نسخہ فورٹ ولیم کالج سے ۱۸۱۱ء میں اور پھر ۱۸۶۷ء میں مکتبہ نول کشور سے شایع ہوا لیکن میر تقی میر کی شخصیت اور فن پر بھرپور تحریریں مولوی عبدالحق ہی کی ہیں۔ انھوں نے میر کی دو کتابیں نکات الشعرا اور ذکر میر مرتب کر کے شایع کیں۔ اور میر کی شاعری کا ایک بھرپور انتخاب، انتخاب کلام میر کے نام سے مرتب کیا اور اس پر تفصیلی مقدمہ لکھا۔ میر کو اہل اردو سے پہلی بار اس انداز میں مولوی صاحب ہی نے متعارف کرایا تھا۔

مولوی صاحب کا یہ عظیم ادبی کارنامہ ہے کہ انھوں نے دکنی ادب کی تصنیفات دریافت کیں۔ دکنی اردو کے بیش بہا مخطوطات ذاتی اور خانقاہوں کی لائبریریوں کی الماریوں میں دیمک کی نذر ہو رہے تھے۔ مولوی صاحب نے اردو میں پہلی بار دکنی ادب کے مخطوطات حاصل کر کے انجمن کی لائبریری میں داخل کیے۔ انھوں نے دکنی ادب کے ایسے بہت سے نثر نگاروں اور شاعروں کا اردو والوں سے تعارف کرایا جن کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں تھا اور جن کی تصنیفات اردو کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ مولوی صاحب نے انجمن کے سہ ماہی رسالے اردو میں دکنی تصانیف اور مضامین پر خاصی تعداد میں مقالے تحریر کیے۔ انھوں نے اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان قطب قلی شاہ کے دیوان پر تبصرہ لکھ کر اردو ادب میں اہم ترین اضافہ کیا۔ مولوی صاحب نے ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۸ء کے سہ ماہی اردو کے مختلف شماروں میں دکنیات پر کئی اہم مضامین لکھے۔ مولوی صاحب اردو کے پہلے محقق ہیں، جنھوں نے دکنی ادب کا اہل اردو سے تعارف کرایا۔ انھوں نے نصرتی پر ایک مستقل کتاب

لکھی اس کے علاوہ ملا وجہی کی سب رس اور قطب مشتری، نصرتی کی گلشن عشق اور علی کارنامہ وغیرہ مرتب کر کے شایع کیں۔

مولانا کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے بہت سے تذکروں کے مخطوطات کا ترجمہ کیا اور انھیں مرتب کر کے شایع کیا۔ مرزا علی لطف کا تذکرہ "گلشن ہند"، مصحفی کا تذکرہ ہندی، تذکرہ ریاض الفصحاً اور عقدِ ثریا، میر تقی میر کا نکات الشعراً اور لکشمی نراین شفیق اورنگ آبادی کا چمنستان شعراً، نورالدین حسین خاں خایق رضوی کا مخزن شعراً، اسد علی تمنا اورنگ آبادی کا گل عجایب مرتب کر کے شایع کیے۔ دکنیات میں ان تمام کتابوں اور اردو تذکروں کے تعارف سے مولوی صاحب نے تاریخ ادب اردو میں دو سو، ڈھائی سو سال کا اضافہ کیا۔

اردو میں سرسید پہلے ادیب ہیں، جنھوں نے اپنے ادیبوں کا ایک حلقہ بنایا اور انھیں اہم ادبی کاموں کی ترغیب دی۔ سرسید کے ان رفقا میں مولانا الطاف حسین حالی کا نام سرفہرست ہے۔ سرسید کے بعد اس سلسلے میں دوسرا نام عبدالحق کا ہے۔ سرسید کے مقابلے میں مولوی عبدالحق کے رفقائے کار کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ مولوی صاحب صرف ادبی کام کرنے کی ترغیب ہی نہیں دیتے تھے بلکہ انجمن ترقی اردو سے اس کام کو بہت اچھی طباعت کے ساتھ شایع بھی کرتے تھے۔ مولوی عبدالحق کے رفقا میں مولوی وحیدالدین سلیم، سید وہاج الدین، مولوی محمد حسین، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، مولوی غلام یزدانی، مولوی سید ہاشمی، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر سید عابد حسین، شیخ چاند، سید سراج الدین، ڈاکٹر عبدالستار، حافظ محمود شیرانی، مرزا فرحت اللہ بیگ، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، ڈاکٹر لطافت حسین خاں، مرزا محمد مہدی کوکب اور محمد الیاس برنی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ مولوی صاحب نے اپنے بعض رفقا سے مستقل موضوعات پر کتابیں لکھوا کر شایع کیں۔ بعض رفقا سے انگریزی اردو ڈکشنری کی تیاری میں مدد لی اور بعض حضرات سے سہ ماہی "اردو" اور "ہماری زبان" کے لیے مضامین لکھوائے۔

مولوی عبدالحق پہلے اور آخری اردو ادیب تھے جنھوں نے اپنے ہم عصروں سے اتنے بڑے پیمانے پر ادبی کام کرا کے شایع کیا۔

آخر میں شاید یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ مولوی عبدالحق اردو زبان و ادب کی وہ میراث ہیں جو ہندوستان اور پاکستان میں مساوی تقسیم ہوئی ہے۔ جس طرح ہندوستان کی قدیم تہذیب کی یادگاریں ہڑپا اور

موہنجوداڑو پاکستان کی سرزمین پر ہمیشہ محفوظ رہیں گی اس زبان اور ادب کی تاریخ میں ہندوستان میں بھی مولوی عبدالحق کا نام زندہ اور تابندہ رہے گا اس لیے کہ خود انجمن ترقی اردو (ہند) دراصل مولوی عبدالحق ہی کا دوسرا نام ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنے ادبی کارناموں سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ترقی اردو کے معنی زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان جملہ اصناف ادب کی ترقی بھی ہیں جن کی ترویج میں مولوی عبدالحق نے نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں اور جن کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں تفصیل کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

مولوی عبدالحق

(یادوں کے آئینے میں)

۱۹۳۷ء میں گارڈن کالج راولپنڈی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایم۔ اے میں داخل ہونے کے لیے لاہور آیا تو یہاں کی فضا نے کالج کی طرف رہنمائی کرنے کی بجائے آوارہ گردی کے راستے پر ڈال دیا۔ چنانچہ کچھ مدّت لاہور میں بے مقصد رہنے کے بعد میں پھر واپس راولپنڈی جا پہنچا۔ آل انڈیا ریڈیو کی ابتدا اسی زمانے میں ہوئی تھی۔ پہلے یہ سلسلہ ایک پرائیویٹ کارپوریشن کے طور پر وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے ہال میں شروع ہوا تھا۔ اس کے بعد سرکاری ادارہ بن گیا۔ سیّد احمد شاہ بخاری اس کے کنٹرولر تھے جو بعد میں ڈائرکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ میں نے ملازمت کے لیے ان کے نام اپنی درخواست بھیج دی۔ بخاری صاحب نے مجھے انٹرویو کے لیے بلایا۔ والد نے مجھے مولوی عبدالحق کے نام ایک خط دیا کیوں کہ اس وقت دہلی میرے لیے ایک نیا شہر تھا، اور دہلی آنے کا میرا پہلا اتفاق تھا۔

اس زمانے میں انجمن ترقیِ اردو (ہند) اپنے پورے شباب پر تھی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی (دریا گنج) میں اس کا دفتر تھا۔ اس میں مولوی صاحب کا قیام تھا۔ علامہ برج موہن کیفی مرحوم بھی وہیں فروکش تھے۔ میں خط لے کر حاضر ہوا تو مولوی صاحب بڑی محبت سے ملے اور فرمانے لگے تمہارا قیام یہیں میرے یہاں ہوگا چائے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد مجھے اپنے ساتھ ایک کمرے میں لے جا کر کہنے لگے۔ یہ بڑا تاریخی کمرہ ہے اس میں کانگریس کمیٹی کے دنوں میں جواہر لال نہرو ٹھہرے تھے۔ تم اسی میں جب تک چاہو قیام کرو۔ پھر اس کوٹھی کے دوسرے کمروں کا ذکر کر کے بتانے لگے کہ فلاں کمرے میں مولانا محمد علی مرحوم، فلاں میں پنڈت موتی لال نہرو اور فلاں میں مہاتما گاندھی فروکش تھے۔ مجھے اس سے پہلے اتنے بڑے مکان اور بالخصوص اتنی تاریخی حیثیت کے مکان میں

قیام کرنے کا کہاں موقع ملا تھا۔ دیر تک ایک حیرت آمیز مسرت کی کیفیت رہی۔ سب سے زیادہ مسرت کا سبب، تو مولوی صاحب کی وہ شفقت تھی جس کا مجھے پہلے سے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

باتوں کے دوران میں آپ نے مجھ سے پوچھا کہ تمہارا انٹرویو کب ہے۔ میرے یہ بتانے پر کہ جناب انٹرویو کی تاریخ تو گذر چکی ہے، بہت ہنسے اور بولے پھر تم آئے ہی کیوں ہو۔ میں نے کہا "بخاری صاحب سے جاکر کہوں گا دفتر کی چٹھی راولپنڈی میں ملی۔ میں لاہور میں تھا، دوبارہ راولپنڈی جانا پڑا اور اب وہاں سے دہلی آرہا ہوں"، کہنے لگے تم ابھی کالج کے ماحول سے باہر آئے ہو، تمہیں دنیا کا تجربہ نہیں۔ ان باتوں کو کوئی نہیں سنتا۔ تمہیں تو دفتر کے لوگ بخاری صاحب تک پہنچنے ہی نہ دیں گے۔ وہ یہی کہہ کے کہ انٹرویو کی تاریخ گذر چکی ہے، تمہیں واپس روانہ کر دیں گے لیکن چلو اس بہانے دہلی کی سیر تو ہو جائے گی۔ انجمن کا کتب خانہ بھی اطمینان سے دیکھتے رہو۔ اس کمرے میں تاریخی کتابیں ہیں، اس میں تنقیدی کتابیں، فلاں کمرے میں نادر کتابوں کا ذخیرہ ہے اور فلاں میں قلمی مسودے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

رات کو کھانے پر پانچ سات حضرات موجود تھے۔ علامہ کیفی اور رحم علی الہاشمی صاحب کے علاوہ اور جو حضرات تھے ان کے نام مجھے یاد نہیں۔ میں کھانے کی میز پر اور ویسے بھی اس ماحول میں دبکا دبکا سا رہتا تھا۔ اٹھارہ انیس برس میری عمر تھی۔ ان علمی شخصیتوں سے بات کرنے کا حوصلہ کہاں سے لاتا۔ اس وقت اگرچہ "ادبی دنیا" لاہور اور "زمانہ" کانپور میں میری دو چار غزلیں چھپ چکی تھیں لیکن ان دو چار غزلوں کے سہارے مولوی عبدالحق اور علامہ کیفی مرحوم ایسے علما کے سامنے لب کشائی کی جرأت تھوڑا ہی ہو سکتی تھی۔ اور اس وقت کا کیا سوال، آج بھی میرے لیے یہ کہاں ممکن ہے کہ ڈاکٹر عبدالحق کے روبرو حوصلے سے بات کر سکوں۔

تو خیر دوسرے دن میں انٹرویو کے لیے براڈ کاسٹنگ ہاؤس جا پہنچا۔ اس زمانہ میں ریڈیو کے تمام دفاتر ایک ہی جگہ نہ تھے بلکہ شہر کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ کنٹرولر آف براڈ کاسٹنگ کا دفتر اسکندرا روڈ پر تھا۔ اور دہلی ریڈیو اسٹیشن انڈر ہل روڈ پر۔ مجھے چونکہ کنٹرولر کے دفتر سے بلاوا تھا اس لیے اسکندرا روڈ پہنچا مولوی صاحب کی بات حرف بہ حرف صحیح نکلی۔ وہاں صورت حال یہ تھی کہ ؎

سگ و درباں چو یافتند غریب
ایں گریباں گرفت واں دامن

جس کمرے میں گیا یہی جواب ملا کہ بخاری صاحب سے ملاقات ممکن نہیں۔ انٹرویو تو پرسوں تھا۔ آپ آج آرہے ہیں

جن امیدواروں کا انٹرویو ہونا تھا ہو چکا۔ بورڈ کے اراکین اپنے اپنے شہر کو واپس جا چکے۔ اب انٹرویو کا کیا سوال۔ ن۔ م راشد اور کرشن چندر انڈر ہل روڈ والی بلڈنگ میں تھے، ورنہ ان سے کچھ مدد حاصل کرتا۔ آخر بخاری صاحب کے سکریٹری سے میں نے کہا کہ میرا کارڈ اندر بھیج دیں۔ بخاری صاحب نہ ملنا چاہیں گے تو نہ ملیں گے۔ کارڈ اندر بھیجنے میں آپ کو کیا اعتراض ہے۔ میں نے کارڈ پر اپنے نام کے ساتھ والد کا نام بھی لکھ دیا تھا اور یقین تھا کہ "انٹرویو" ہو نہ ہو "ملاقات" تو ہو ہی جائے گی۔

کارڈ اندر گیا تو دو چار منٹ ہی میں بخاری صاحب نے بلا لیا۔ کمرے میں داخل ہوا تو اخلاق اور تہذیب کے ایک دل نشین پیکر کو اپنے سامنے دیکھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ میں نے بخاری صاحب کو پہلی بار نیکر پہنے دیکھا۔ اردو ادب کا یہ عدیم المثال مزاح نگار، پطرس کے مضامین کا مصنف، مجھے اس وقت متانت اور سنجیدگی کی ایک تصویر نظر آ رہا تھا۔ انھوں نے بات تو وہی کہی کہ انٹرویو کی تاریخ گذر چکی ہے لیکن ایک لمحے کے لیے بھی مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں نے براڈ کاسٹنگ ہاؤس کی حدود میں داخل ہو کر کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ غالباً دل نوازی کا سلیقہ ان کے لہو میں کار فرما تھا۔

خیر واپس آ کر مولوی عبدالحق صاحب کو ساری داستان کہہ سنائی۔ بہت محظوظ ہوئے، کہنے لگے مجھے اس بات کا یقین تھا کہ تاریخ مقررہ کے بعد انٹرویو ممکن نہیں لیکن میں نے تمھیں اس لیے نہیں روکا کہ اس قسم کا تجربہ زندگی میں ضروری ہے۔ پھر خود ہی کہنے لگے کہ تمھاری ملازمت کے بارے میں اب میں کچھ سوچوں گا۔ چنانچہ دوسرے دن انھوں نے خود مجھ سے اس موضوع پر بات کی۔ کہنے لگے کہ ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر کا دفتر یونی ورسٹی انکلیو میں ہے۔ تم ان سے جا کر ملو۔ میں تمھیں خط دے دیتا لیکن تم اپنے والد کا نام بتا دینا۔ میرے خط کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس ہدایت کے مطابق میں اگلی صبح ڈاکٹر بھٹناگر کے وہاں جا پہنچا۔ ڈاکٹر بھٹناگر میرے والد کے مداحوں میں سے تھے۔ لاہور میں ایک دو بار ان سے ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ یہ اپنے دفتر میں بجلی کی سرعت سے کام کر رہے تھے۔ چند لمحوں میں انھوں نے نہ جانے کتنی فائلیں نکال ڈالیں۔ کتنے ہی لوگوں کے ٹیلی فون سنے اور کتنے ہی لوگوں کو ٹیلی فون کر ڈالا۔ میری جانب متوجہ ہوئے تو میں نے کہا کہ مولوی عبدالحق صاحب کی ہدایت کے مطابق حاضر ہوا ہوں۔ انھوں نے میری مختصر سی بات بڑی توجہ سے سنی۔ اور کہنے لگے ڈاکٹر عبدالحق کی بات تو میں کسی طرح نہیں ٹال سکتا۔ تم اس مضمون کی ایک درخواست مجھے دے دو۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا اور سکریٹریٹ میں ملازمت آسانی سے مل جاتی تھی۔ میں اگلے دن درخواست لے کر حاضر ہوا۔ انھوں نے درخواست پر کچھ لکھا اور اپنے کسی ماتحت کو بلا کر

اس کے سپرد کردی۔

مجھے یقین تھا کہ ملازمت مل جائے گی۔ مولوی صاحب کو بھی امید تھی کہ ڈاکٹر بھٹناگر ان کی بات کا یقیناً خیال کریں گے۔ لیکن تیسرے دن ہی یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر بھٹناگر بہ کار سرکار یورپ تشریف لے گئے ہیں۔ مولوی صاحب کہنے لگے بھئی اب تمہارا کام کچھ مشکل ہوگیا ہے۔ یہ دفتری نظام ہی ایسا ہے۔ ڈاکٹر بھٹناگر کے جانے کے بعد تمہاری درخواست کو کوئی اٹھا کے بھی نہیں دیکھے گا۔ اور وہ جس فائل میں ہے اسی میں دفن ہو جائے گی۔

اس کے بعد میں کوئی دو چار روز دلی میں رہا اور روزانہ میں نے یہ دیکھا کہ ہر مکتب فکر کے لوگ مولوی صاحب سے ملنے آتے تھے۔ ان میں سیاسی جماعتوں کے لوگ بھی ہوتے تھے۔ مولوی صاحب ہر ایک کے ساتھ ایک ہی موضوع پر بات کرتے تھے۔ اور وہ تھا ہندوستان میں اردو کی ترقی کا مسئلہ۔ میں نے انھیں کبھی کسی سیاسی جماعت کی حمایت یا مخالفت کرتے نہیں دیکھا۔ ان سے ملنے والوں میں کانگریسی، مسلم لیگی، کمیونسٹ اور مہاسبھائی ہر انداز فکر کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ لیکن مولوی صاحب کبھی سیاسی بحث میں نہیں الجھتے تھے۔ ویسے بھی انھیں کسی سیاسی جماعت سے کوئی سروکار نہ تھا بلکہ حتی الامکان سیاست سے دور ہی رہتے تھے۔ انھی دنوں کا ذکر ہے مرحوم جناح صاحب دلی آرہے تھے۔ انجمن کے بعض لوگ کسی اور مہمان کو پہنچانے اسٹیشن جانا چاہتے تھے۔ مولوی صاحب نے انھیں یہ مشورہ دیا کہ تم لوگ اسٹیشن پر نہ جاؤ تو اچھا ہے، بعض لوگوں کو یہ گمان گذرے گا کہ انجمن ترقیِ اردو کے اراکین جناح صاحب کا استقبال کرنے آئے ہیں۔

اِس قیام دہلی کے بعد مجھے مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع لاہور میں ملا۔ یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ مولوی عبدالقادر قصوری کے دولت کدے پر ان کا قیام تھا۔ میں ایک دوست کے ہمراہ ان کے وہاں حاضر ہوا آپ انجمن ترقیِ اردو کی صوبائی شاخ قائم کرنے کے لیے آئے تھے۔ میں پہنچا تو بہت مصروف تھے۔ اندر بلا تو لیا لیکن زیادہ وقت نہ دے سکے۔ فرمانے لگے شام کو میاں بشیر احمد کی کوٹھی پر آجانا، وہاں ایک بہت اہم جلسہ منعقد ہو گا اِسی جلسے میں انجمن کی صوبائی شاخ کے قیام کا باضابطہ اعلان کیا گیا تھا۔

تین برس بعد آپ پھر لاہور تشریف لائے۔ غالباً قیام ان کا ایک ہی دن رہا۔ مجھے ان کی آمد کا علم نہ تھا۔ شام کو استاذ محترم مولانا تاجور نجیب آبادی کی صدارت میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ ہم لاہور کے شعرا اس میں شریک تھے۔ تھوڑی دیر میں منتظمین مشاعرہ کے ہمراہ مولوی عبدالحق صاحب تشریف لے آئے۔ انھوں نے مشاعرے کے اختتام پر اردو کے متعلق ایک ایسی پُر مغز تقریر کی کہ اہلِ لاہور نے شاید ہی ایسی تقریر کبھی سنی ہو۔

پھر ملک تقسیم ہو گیا۔ اب میں ہندوستانی تھا اور قبلہ ڈاکٹر صاحب پاکستانی۔ ایک ہی خاندان کے افراد دو قوموں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں انجمن ترقی اردو (پاکستان) کی گولڈن جوبلی کی تقریب تھی۔ ہندوستان سے ڈاکٹر اعجاز حسین، حضرت جگر مراد آبادی، جناب جوش ملسیانی، جناب روش صدیقی اور راقم التحریر کو شرکت کی دعوت ملی۔ میرا پاکستان کا یہ سفر ایک عجیب کیف و نشاط سے لبریز تھا۔ کراچی میں انجمن کی جوبلی کے بعد گارڈن کالج راولپنڈی میں مشاعرہ تھا۔ اور پھر واپسی پر پنجاب یونی ورسٹی لاہور میں ایک مشاعرہ تھا۔ گارڈن کالج راولپنڈی اور پنجاب یونی ورسٹی لاہور تو وہی درس گاہیں ہیں، جہاں میں نے بات کرنے کا طریقہ سیکھا۔ چنانچہ مولوی صاحب سے ملاقات کی مسرت اور گارڈن کالج اور پنجاب یونی ورسٹی کی زیارت کا شوق پر پرواز بن گیا اور میں براہِ راست کراچی جا پہنچا۔

اب کے میرا قیام پھر انجمن ترقی اردو کے دفتر میں تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ عمارت بھی جس میں انجمن کا دفتر ہے ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ مولوی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے باتوں باتوں میں یہ راز افشا کیا کہ انجمن کی یہ عمارت بھی ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے کہا دہلی میں تو آپ نے مجھے جواہر لال نہرو کے کمرے میں ٹھہرایا تھا۔ اب میرا قیام کس کمرے میں ہے۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ میں کس کمرے میں ٹھہرایا گیا ہوں۔ میں نے انھیں بتایا کہ پہلی منزل پر بائیں ہاتھ کا کمرہ ہے۔ فرمانے لگے اس عمارت کا اصل نام گاندھی آشرم ہے اور جس کمرے میں تم فروکش ہو اسی میں بیٹھ کر مہاتما گاندھی پرارتھنا کیا کرتے تھے۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ اس پرارتھنا میں شریک ہوتے تھے۔ مختلف کمروں میں لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سے ان کی آواز پہنچتی تھی اور وہ قرآن کی آیت اور وید کے منتر اسی کمرے میں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔

کراچی میں اب کے میرا قیام کئی روز کا تھا۔ راولپنڈی کے مشاعرے میں ابھی کوئی دس گیارہ روز باقی تھے اور دہلی واپس آکر راولپنڈی جانا آسان نہ تھا۔ راولپنڈی کے بعد لاہور میں بھی مجھے رکنا تھا۔ اس لیے ایسے پروگرام کا ارادہ ترک کر دیا جو بھاگم بھاگ پر مشتمل ہو۔ چنانچہ ڈاکٹر اعجاز حسین، حضرت جوش ملسیانی اور روش صاحب کی واپسی کے بعد میں ہندوستان والوں میں تنہا کراچی میں رہ گیا۔

اب کے مولوی صاحب کو اور زیادہ مدت کے لیے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کی پابندیٔ اوقات، ان کی مسلسل محنت، ان کا علی الصباح بیدار ہو کر سمندر کی سیر کو جانا، ان کی کم خوری یہ تمام باتیں میرے لیے بڑی حیرت کا باعث تھیں۔ کھانا تو وہ ایک زمانے سے ایک ہی وقت کھاتے ہیں۔ رات کو، دن کو وہ کھانا نہیں

کھاتے۔ ان کا کہنا ہے کہ دن کا کھانا طبیعت میں گرانی پیدا کرتا ہے اور یہ گرانی روزانہ کے کام میں حارج ہوتی ہے رات کا کھانا بھی اتنا کم کھاتے ہیں کہ خوردن برائے زیستن کا اس پر پوری طرح اطلاق ہوتا ہے۔ میرے لیے تو اتنی کم خوری حیرت کا باعث تھی۔ ایک دو بار میں نے ارادہ کیا کہ صبح ان کے ساتھ ہوا خوری کے لیے جاؤں لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ وہ صبح ۴ بجے حوائج ضروری سے فارغ ہو کر سیر کے لیے گھر سے چل دیتے ہیں تو مجھے اپنا ارادہ فسخ کرنے کے سوا اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ جو کام ہلکہ سیر و تفریح اسی برس کی عمر میں وہ بہ آسانی کر لیتے تھے وہ میرے لیے چونتیس برس کی عمر میں ممکن نہ تھی۔ میری روانگی کے روز جب انھیں معلوم ہوا کہ میں بر بنائے کاہلی اپنا ارادہ پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے قاصر رہا ہوں تو انھوں نے صبح کی سیر اور مناظر سے لطف اندوزی کی لذت کو کچھ اس سحر آفریں انداز سے بیان کیا کہ دہلی واپس آکر میں نے سچ مچ صبح کی سیر شروع کر دی اور کئی ماہ تک اسے جاری رکھا۔

اسی سفر کا ذکر ہے ایک دن شام کو میں مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ ہندوستان میں اردو کے مستقبل کا ذکر چل نکلا۔ اردو کی بقا اور ترقی کے متعلق ہندوستان میں جو کام ہو رہا ہے اس کی روشن صاحب نے بڑی واضح اور عمدہ تصویر پیش کی۔ آپ ساری روداد بہ غور سنتے رہے۔ کہیں کہیں اپنی رائے کا اظہار کرتے رہے۔ بعد میں کہنے لگے ہاں لیکن یہاں (یعنی پاکستان میں) جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میں بالکل غیر مطمئن ہوں۔ چنانچہ غالباً یہی وجہ تھی کہ انھیں اپنے خلاف مزاج اردو کے سلسلے میں ایک ایجی ٹیشن چلانا پڑی اور سیکریٹریٹ تک ایک جلوس کی رہنمائی کرنا پڑی۔

اس مختصر سے قیام میں مجھے اس کمرے میں بھی حاضری کے مواقع ملے جس میں مولوی صاحب دن بھر گرمی، سردی، برسات سے بے نیاز ہو کر کام کرتے ہیں۔ یہ کمرہ سادگی اور نفاست پسندی کی ایک دل کش تصویر تھا۔ خطوط، کتابیں، فائلیں، مسودے ہر چیز اپنی اپنی جگہ قرینے سے موجود اور مولوی صاحب اس انہماک سے لکھنے یا پڑھنے میں مشغول ہیں کہ انھیں کسی کی آمد کا احساس تک نہیں ہے دو ایک بار تو ایسا ہوا کہ میں کمرے میں ایک آدھ منٹ توقف کے بعد انہی قدموں واپس لوٹ آیا کیوں کہ کام میں ان کی یک سوئی نے مجھ میں اتنی ہمت ہی نہ پیدا ہونے دی کہ میں ان کے انہماک میں مخل ہو سکوں۔

یہ میں آج سے سات برس پہلے کی بات بتا رہا ہوں۔ پھر اس کے بعد کئی بار ڈھاکہ، چٹاگانگ اور لاہور جانے کا اتفاق ہوا لیکن میں کراچی نہ جا سکا۔ ایک بار گیا تو یوں کہ مشاعرے میں شرکت کے بعد علی الصباح وہاں سے روانہ ہوا۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے دفتر میں اس دس دن کے قیام کے بعد مجھے مولوی صاحب کی خدمت

میں حاضری کا موقع نہ مل سکا۔ اور اب موجودہ حالات کے پیشِ نظر کیا کہا جاسکتا ہے کہ کب یہ سعادت نصیب ہو۔

ع کشتی شکستگانیم اے بادِ شرط برخیز

نئی دہلی

۲۴ر دسمبر ۱۹۶۰ء

حواشی

۱۔ ڈاکٹر سر شانتی سروپ بھٹناگر مرزا ہرگوپال تفتہ کے خاندان سے تھے۔ شاعر بھی تھے۔ اور شاعروں کے ہمدرد بھی۔ ایک مدت تک آپ لاہور میں رہے۔ پھر دہلی آگئے۔ یہاں وہ بورڈ آف سائنٹی فک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ بعد میں منسٹری آف ایجوکیشن کے سکریٹری بنے۔ ریٹائر ہونے سے قبل ہی آپ کا انتقال ہوگیا۔ "لاجونتی" آپ کی نظموں کا مجموعہ ہے جس میں زیادہ تر نظمیں ان کی رفیقۂ حیات لاجونتی کے انتقال پر ہیں۔

۲۔ پہلی منزل سے میری مراد گراؤنڈ فلور ہے۔ ہم اردو والے گراؤنڈ فلور ہی کو بالعموم پہلی منزل کہتے ہیں حالاں کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ (ج۔ ن۔ ا۔)

پروفیسر عبدالمغنی

عبدالحق کی تنقید نگاری

شبلی اور حالی کے بعد اردو ادب کے جس تنقید نگار پر نگاہ ٹھہرتی ہے وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق ہیں۔ وہ ادب میں حالی کی اخلاقیات اور شبلی کی جمالیات کے جامع ہیں۔ وہ حالی سے بہت زیادہ اور براہِ راست مغربی تصورات سے واقف ہیں۔ لیکن ان کا اسلوبِ بیان اپنی مشرقی نفاست میں شبلی سے قریب تر ہے، اگرچہ اس میں رنگینی کم اور سادگی زیادہ ہے۔ بہر حال، شبلی ہی کی طرح وہ بھی ایک محقق ہیں اور ان کی تنقید کو تحقیق سے بالکل الگ کر کے دیکھنا مشکل ہے۔ درحقیقت عبدالحق کی تنقید نگاری میں ایک تحقیقی وزن ہے اور ان کی تحقیق میں ایک تنقیدی نظر ہے۔ وہ صرف ادیب نہیں، عالم بھی ہیں۔ علم و ادب کا یہ امتزاج ہی انھیں بیک وقت شبلی اور حالی دونوں کا جانشین بناتا اور اردو تنقید کی تاریخ میں ایک منفرد و ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ اس مقام کی ایک نمایاں خصوصیت مشرق و مغرب کی ہم آہنگی بھی ہے۔ عبدالحق شبلی و حالی کی بہترین تنقیدی روایات کے نہ صرف وارث بلکہ ان میں کچھ توسیع کرنے والے بھی ہیں۔ یہی چیز انھیں جدید اردو تنقید کے بانیوں اور ان کے بعد آنے والے جدید تر اردو ناقدین کے درمیان ارتقا کی ایک اہم کڑی بنا دیتی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے کم عمر ہم عصروں میں کوئی ان کا جانشین نہیں نظر آتا ہے۔

عبدالحق نے کوئی تنقیدی کتاب نہیں لکھی، نہ ان کا کوئی مستقل تنقیدی مقالہ دست یاب ہے۔ بالعموم اور بہ کثرت انھوں نے یا تو مقدمے لکھے ہیں یا تبصرے۔ ان مقدموں اور تبصروں میں وہ سب باتیں ہیں جو مقالات و مضامین میں پائی جاتی ہیں۔ یہ علمی و ادبی کاوشیں اپنے موضوعات کے تحقیقی و تنقیدی مطالعات ہیں۔ ان میں معتد بہ تحریریں موضوع کے تمام اہم پہلوؤں پر بھرپور روشنی ڈالتی ہیں۔ عبدالحق نے جس کتاب پر قلم اٹھایا ہے عام طور پہ اس کے مصنف کی سیرت کا تعارف کراتے ہوئے اس کے مواد کی اس طرح تشریح کی ہے کہ فکر و فن،

اخلاقیات و جمالیات اور اقدار و مسائل کے زاویے واضح ہو گئے ہیں، روایات پر بھی بحث کی گئی ہے اور تجربات پر بھی، قدیم کی بھی قدر شناسی ہے اور جدید کی بھی، نظریاتی و معاشرتی امور کے ساتھ ساتھ لسانیات اور محاورات سے بھی اعتنا کیا گیا ہے۔ یہ مطالعات وافر ادبی و تہذیبی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ان میں تجزیہ، موازنہ اور فیصلہ سبھی کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ ایک مرکب، متوازن اور مکمل تنقید کے نمونے ہیں۔ یہ حقیقی قدر شناسی کی مثالیں ہیں، جن میں نہ کسی کی رعایت و مروت ہے نہ کسی پر سبّ و شتم۔ عبدالحق کا اندازِ تنقید معروضی ہے اگرچہ ان کی اپنی ترجیحات عیاں ہیں، ان کے کچھ مفروضے ہیں، ان کی پسند و ناپسند بھی ہے۔ مگر بالکل شخصی تعصبات کم سے کم ہیں اور افراط و تفریط تقریباً مفقود۔ عبدالحق کی رایوں سے اختلاف ضرور کیا جاسکتا ہے مگر ان پر الزام نہیں رکھا جاسکتا، ان کو نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا، ان کی طرف التفات مفید ہوگا۔

ناقدانہ صلاحیت کے متعلق عبدالحق کا یہ خیال حقیقت افروز ہے۔:

"تنقید پر صرف وہی لکھ سکتا اور دوسروں کو ہدایت کر سکتا ہے جس کا تجربہ وسیع، مطالعہ گہرا اور نظر دور بیں ہو، جو صرف ذوق ہی صحیح نہ رکھتا ہو بلکہ دریائے ادبیات کا شناور بھی ہو، جس نے ایک مدت مطالعہ اور غور و فکر کے بعد اِن امور کے متعلق خاص رائے قایم کی ہے اور وہ اس رائے کے بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور دوسروں کے دل نشیں کر سکتا ہے۔"

(روحِ تنقید" — تنقیداتِ عبدالحق

مرتبہ محمد تراب علی خاں باز، ص ۹۹)

اس مختصر سے بیان کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تنقید نگاری کے لیے حسب ذیل اوصاف مطلوب ہیں:

۱۔ ادبیات سے شغف۔
۲۔ کثرتِ مطالعہ۔
۳۔ غور و فکر۔
۴۔ کافی تجربہ۔
۵۔ ذوقِ سلیم۔
۶۔ وسعتِ نظر

۷۔ قوتِ فیصلہ۔

۸۔ قدرتِ بیان۔

اس سلسلے میں عبدالحق ایک پتے کی بات یہ بھی بتاتے ہیں کہ:

"تنقید پر کتابیں پڑھنے سے تنقید نہیں آتی، بلکہ اعلادرجے کا کلام اور اعلا پائے کی تنقیدیں پڑھنے سے اس کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔"

(ص ۱۰۱، ایضاً)

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ براہِ راست تخلیقی اور تنقیدی دونوں قسم کی اصل متون کا مطالعہ کرنے سے تنقیدی حس بیدار ہوتی ہے اور تنقیدی شعور پیدا ہوتا ہے، ورنہ ادب کی تاریخوں وغیرہ میں بالواسطہ دوسروں کی رائیں پڑھ لینے سے تنقیدی استعداد حاصل نہیں ہوتی۔ اس معاملے میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ "اعلادرجے کا کلام" کے ساتھ ساتھ "اعلادرجے کی تنقیدیں" کو بھی ذوقِ تنقید کے نشوونما کا ایک وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عبدالحق تخلیق کے علاوہ تنقید کی اصلیت و اہمیت کے بھی قایل ہیں۔ یہ ادب و تنقید کا جدید ترین اور صحیح ترین نقطۂ نظر ہے جس کا علم و احساس بہت عام نہیں ہے۔ اس سے ادب میں تنقید کے کردار پر روشنی پڑتی ہے اور واضح ہوتا ہے کہ ناقد کی حیثیت فن کار سے کم تر نہیں ہے، بلکہ وہ ادب و تہذیب کی تزئین و ترویج میں فن کار کے ساتھ شریک ہے اور اس کا معاون ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ادب اور زندگی دونوں کے لیے تنقید کی ضرورت و افادیت کا اقرار عبدالحق ان لفظوں میں کرتے ہیں:

"تنقید کئی خدمتیں انجام دیتی ہے۔ خود نقاد اور ادیب کے حق میں بھی یہ اصلاح کا باعث ہے۔ اسے ذاتی اظہار کی قدر کرنے کا موقع دیتی ہے اور ضبط سکھاتی ہے۔ ایک طرف وہ سنتِ قدیم پر غیر ضروری شیفتگی سے بچاتی اور دوسری طرف جدت یا جذبات کے زور میں تمام حدود کو توڑ کر نکل جانے سے روکتی ہے، یعنی بریک کا کام دیتی ہے۔ پڑھنے والوں کے لیے تفریح اور تعلیم کا سامان مہیا کرتی ہے اور تہذیب کا ذوق پیدا کرنے میں مدد دیتی اور تحریک بن کر ان کی رہنمائی کرتی ہے۔ غرض ادب کے فروغ و ترقی کے لیے

تنقید لازم ہے۔"

("اردو تنقید کا ارتقا"۔ مقدمات عبدالحق

مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص)

تنقید کو "تعلیم" کے ساتھ ساتھ "تفریح" کا ایک ذریعہ قرار دے کر ایک بار پھر عبدالحق نے تنقید کی تخلیقی نوعیت پر تاکیدی نشان لگایا ہے۔ یہ ان کے نظریۂ ادب کی وسعت کا ایک ثبوت اور ان کی تنقیدی باریک بینی نیز روشن خیالی کی دلیل ہے۔

مشرقی و مغربی تنقید کی بحث عبدالحق کے زمانے میں شروع ہوئی تھی اور جدید تعلیم یافتہ ناقدین اپنی کوتاہ نظری سے مشرقی تنقید کی تحقیر کر رہے تھے۔ ایک اچھے، سچے اور بڑے ناقد کی طرح عبدالحق نے اپنے ہم عصروں کو اس مسئلے پر اس طرح خبردار کیا:

"مشرقی کلام کی تنقید میں کیوں نہ مشرقی اصطلاحات اور معانی و بیان کے الفاظ سے کام لیں جو ہمارے ادب میں شروع سے مستعمل ہیں اور ان کا مفہوم معین ہے۔ پڑھنے والے ان الفاظ و اصطلاحات کا مفہوم بلا تامل سمجھ جاتے ہیں۔ کیا تمام مشرقی الفاظ و اصطلاحات کا استعمال ترک کرنے اور سرتاسر مغربی الفاظ و اصطلاحات کے اختیار کرنے ہی سے تنقید قابلِ قبول ہو سکتی ہے؟"

(ص ۲۷۴ ایضاً)

یہ ایک چبھتا ہوا سوال ہے جس نے جدت پرست نقادوں کو شرمندہ کیا ہو یا نہیں، مگر باذوق قارئینِ ادب کو ضرور ایک حقیقت سے آگاہ کر دیا اور انھیں معلوم ہو گیا کہ اردو تنقید میں مغرب پرستی کا رواج عقل و دانش سے خالی ہے۔ اس موضوع پر عبدالحق کے یہ نکات بصیرت افروز ہیں کہ مشرقی کلام کی تنقید میں مشرقی اصطلاحات کا استعمال بالکل مناسب و موزوں ہے اور فی الواقع یہی الفاظ و اصطلاحات ہیں جن کا مفہوم واضح ہونے کے سبب وہ بہ آسانی قارئین کی سمجھ میں آجاتے اور انھیں متاثر کرتے ہیں۔ اس بیان میں یہ اشارہ بھی مضمر ہے کہ نامانوس اور اجنبی قسم کے مغربی الفاظ و اصطلاحات نہ تو ٹھیک ٹھیک قارئین کی سمجھ میں آتے ہیں نہ انھیں متاثر کرتے ہیں اور نتیجتاً ان کی افادیت محدود ہو جاتی ہے، جب کہ یہ بھی ممکن ہے کہ مغربی انداز کی پیچیدگیِ بیان دراصل پراگندگیِ خیال کے سبب ہو، یعنی اس انداز

کے تنقید نگاروں کی فکر واضح نہیں ہے، لہٰذا اس کے اظہار میں ابہام ہے۔

تنقید میں طرزِ بیان کی وضاحت پر عبدالحق بہت زیادہ زور دیتے ہیں اور خیال کی اوّلیت کا اعتراف کرتے ہوئے بھی اس کے اظہار کی اہمیت کو نمایاں کرتے ہیں :

"اس میں شبہ نہیں کہ اصل غایت خیال ہے اور حسنِ بیان ذریعہ۔ لیکن طرزِ بیان کے محاسن اور اسقام اس سے جدا نہیں ہو سکتے۔ یہ دو چیزیں الگ الگ نہیں ہیں۔ ان کا تعلق جسم و روح کا سا ہے۔ جسم کو روح سے اور روح کو جسم سے الگ نہیں کر سکتے۔ اس لیے تنقید میں نقاد اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔"

(ص ۴۷۰، ایضاً)

ادب و تنقید کا یہ ترکیبی نقطۂ نظر تازہ ترین بھی ہے اور بہترین بھی۔ موضوع و اسلوب کے درمیان جسم و روح کا رشتہ بتا کر دونوں کی ہم آہنگی کا جو تصور عبدالحق نے پیش کیا ہے وہ حقیقت پسندانہ اور بصیرت مندانہ ہے۔

عبدالحق کے دور میں اخلاقی، معاشی اور نفسیاتی تنقیدوں کے مکاتبِ فکر کے درمیان جو معرکہ آرائی شروع ہوئی اس میں غلو، مبالغہ اور افراط و تفریط سے اس درجہ کام لیا گیا کہ تفرقے اور فتنے کی صورت پیدا ہو گئی جس سے علمی وقار غارت اور ادبی توازن برہم ہونے لگا۔ یہ گویا قدیم و جدید کی کش مکش تھی جس کی تہہ میں مشرق و مغرب کی آویزش پنہاں تھی۔ عبدالحق اس عبوری دور میں ایک ایسی شخصیت رکھتے تھے جو قدیم و جدید اور مشرقی و مغربی عناصر و اقدار کی جامع تھی۔ لہٰذا انھوں نے انتہا پسندیوں کے درمیان ایک نقطۂ اعتدال پیش کیا اور چاہا کہ حریف مکاتب کے مابین مفاہمت و مصالحت ہو جائے، تاکہ ناقدین ایک شغلِ مشترک میں باہمی تعاون کی راہ اختیار کریں اور اس طرح ادب و تنقید کی ترقی صحیح رخ پر ہو۔ انھوں نے اپنے وقت کی ادبی نزاع کو ایک آفاقی تناظر میں دیکھا اور اس کا ایک عمومی جائزہ لے کر اصلاحِ احوال کی کوشش کی :

"افلاطون کے وقت سے لے کر اب تک تنقید کے بیسیوں مسلک وجود میں آچکے ہیں، مثلاً جمالیاتی، وجدانی، تاریخی، ماحولی، تاثراتی، نفسیاتی وغیرہ وغیرہ اور اس زمانے میں فرایڈ اور مارکس کے نظریوں نے بھی تنقید کو متاثر کیا ہے اور جیسے جیسے حالات بدلتے رہیں گے ادب اور تنقید پر نئے نظریوں اور سائنس کے انکشافات کا بھی اثر پڑتا رہے گا۔ افتادِ طبع، ماحول، تعلیم و تربیت

وصحبت کی بنا پر انسان کا رجحان ایک خاص جانب ہو جاتا ہے اور جب
اس میں غلو ہوتا ہے تو وہی مسلک یا مذہب بن جاتا ہے۔ اس لیے تنقید
کا کوئی مسلک جامع نہیں۔ ایسے نقاد اپنے رجحان یا ذوق کے زیر اثر ایک
طرف جھک جاتے ہیں اور دوسرے رُخ پر یا تو سرسری نظر ڈالتے ہیں یا اُسے
بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ صحیح تنقید اسی وقت ہو گی جب ادب کے ہر
رخ کو دیکھا اور جانچا جائے گا۔ اگر ایک گروہ دوسرے کو الہامی، ماورائی
روحانی، جذباتی کہتا اور اسے ماضی پرستی یا روایت پرستی کا ملزم قرار دیتا
اور اس کی تنقید کو تنقید نہیں سمجھتا تو دوسرا گروہ جو فرایڈ اور مارکس پرستی
میں مادیت پر اتنا زور دیتا ہے کہ دوسری انتہا پر پہنچ جاتا ہے تو اس کی تنقید
بھی ادبی تنقید نہیں رہتی، کچھ اور ہی ہو جاتی ہے۔ بے شک ادب کا کام
صرف ذوق اور وجدان کی تسکین کا سامان پیش کرنا نہیں لیکن اس کا کام
محض مادیت کا پرچار بھی نہیں۔ یہ دونوں کا خادم ہے۔ کیا تنقید کے لیے
لازم ہے کہ نقاد کسی خاص مسلک کا مقلد ہو؟"

(ص ۷۰-۴۶۹، ایضاً)

یہ حالات اور حقائق کا ایک متوازن، عالمانہ اور مفکرانہ تجزیہ ہے۔ چند لفظوں میں مابہ النزاع مسئلے کی ایک معروضی تشریح بھی ہے اور اس کے ایک معقول حل کی طرف اشارہ بھی۔ یہ ایک منصفانہ رویہ ہے، جس میں نہ جانب داری ہے نہ تعصب، گرچہ حقیقت پسندی کے پیشِ نظر معاشی و نفسیاتی نظریہ بازوں اور حربہ اندازوں کی جارحیت کے مقابلے میں اخلاقی نقطۂ نظر کا دفاع کیا گیا ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ بے اعتدالی اور زیادتی مارکس اور فرائڈ کے ماننے والوں سے سرزد ہوئی ہے اور ان کی بے جا شدت نے تنقیدی توازن کو برہم کیا ہے۔ اس سلسلے میں روایت و جدت اور روحانیت و مادیت کی کش مکش کا نقشہ جس طرح کھینچا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالحق کی ہمدردی، ممکن ہے ان کے مظلوم ہونے کے سبب، روایت و روحانیت کے ساتھ ہے۔ گرچہ جدت و مادیت کی حقیقت سے انھیں انکار نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ادب میں معاشی تجزیے اور تحلیلِ نفسی کا عمل دخل الہامی و اخلاقی ذوق و وجدان کے تحت ہو، تاکہ حد سے بڑھی ہوئی جمالیات و اقتصادیات کی بے راہ روی ادب و تہذیب کی تباہی کا

سامان نہیں کرے اور روحانیات و اخلاقیات کے اصول و اقدار انسانیت کو تعمیر کے راستے پر گامزن رکھیں۔ اس بحث میں عبدالحق نے بہت ہی موزوں الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ادب و تہذیب اور علوم و فنون کی ترقیات سے اچھی طرح واقف ہیں اور اپنا نقطۂ نظر موثر طریقے پر پیش کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے انتہاپسندانہ اشتراکی و نفسیاتی تنقید کے محض تنقید ہونے سے نہیں، "ادبی تنقید" ہونے سے انکار کیا ہے، یعنی مارکس اور فرائڈ کے نظریات ادب کی اصلیت کی تشریح میں بہت زیادہ مفید نہیں، اس لیے کہ وہ ادب کے سرچشمۂ ابہام و وجدان سے آگاہ نہیں یا اس کا مطالعہ نہیں کرتے۔ اسی طرح وہ اشارہ کرتے ہیں کہ نقاد کے لیے کسی خاص مسلک کا "مقلد" ہونا "لازم" نہیں، گرچہ وہ ذاتی غور و فکر سے کام لے کر زندگی اور ادب کا کوئی معین موقف اختیار کر سکتا ہے، بلکہ اسے کرنا چاہیے۔

عبدالحق کے ان تنقیدی تصورات پر مبنی تنقیدی مطالعات کا جایزہ لے کر دیکھنا چاہیے کہ وہ اپنے نظریات کا اطلاق کرنے میں کس حد تک کامیاب ہیں اور ان کی فکر کس پیمانے پر بروئے عمل آتی ہے۔ اس مقصد کے لیے اقبال کے پہلے مجموعۂ کلام "بانگِ درا" اور "انتخاب کلامِ میر" پر ان کے تبصرے اور مقدمے کا تجزیہ کافی ہوگا۔

اس سلسلے میں عبدالحق کے یہ جملے بہت فکر انگیز ہیں اور ان کی پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی کہ:

> "جس شاعری کی ابتدا کوہ ہمالہ ہو اس کی انتہا کیا ہوگی؟ میں اقبال کے لیے اس میں نیک شگون پاتا ہوں، وہ محاسن جو ہم نے بعد میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اقبال کے کلام میں نکالے ان سب کے بیج اس نظم میں نظر آتے ہیں۔ تخیل، تشبیہات، بندش اور خیالات سب آئندہ کی غمازی کر رہے ہیں۔"
>
> ("بانگِ درا" تنقیدات عبدالحق، ص ۵۷)

بعض ناقد "ہمالہ" کو پہلی نظم اور بانگ درا کو پہلا مجموعہ سمجھ کر ان کی اہمیت کم کر دیتے ہیں۔ یہ ایک غلط اندازِ تنقید ہے۔ اس کے برخلاف عبدالحق حقیقت پسندی سے کام لیتے ہیں اور صحیح طور پر نظم اور مجموعے دونوں کو ان کے بنیادی محاسن کا سراغ لگاتے ہیں جو بعد میں بلاشبہ زیادہ وسیع پیمانے پر برگ و بار لائے۔ یہ واقعہ ہے کہ اقبال کی جو خصوصیات ابتدا ہی میں ظاہر ہوئیں انہی کا ارتقا انتہا تک ہوتا رہا، فکر و فن دونوں کے اعتبار سے بانگِ درا کی تخلیقات اردو میں بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز کی منظومات کی پیش رو ہیں، جبکہ فارسی میں "پیامِ مشرق" جیسا اہم مجموعہ اعلا پایے کی نظموں اور غزلوں کے ساتھ پہلے ہی شائع ہو چکا تھا۔ آگے چل کر عبدالحق اقبال کے سوانح پر روشنی ڈالتے

ہوئے ان عمرانی احوال کا نقشہ پیش کرتے ہیں جن میں اقبال کی شاعری رونما ہوئی اور اس کے ذہنی ارتقا میں شاعر کے ہم سفر بن کر اس کے اشعار کی ٹھیک ٹھیک تشریح کرتے ہیں، چنانچہ قوم پروری کی طرف اقبال کے میلان کی توجیہ وہ اس طرح کرتے ہیں:

"وہ یورپ کی وطنیت اور قومیت سے جس کا اثر تمام یورپ پر چھایا ہوا ہے اور دنیا کے دوسرے ممالک پر بھی پھیلتا جاتا ہے، سخت بیزار ہیں۔ وہ اس تنگ نظری اور خود غرضی کو دنیا کے لیے باعث ہلاکت اور موجب آفت خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ یورپ کی جنگ عظیم سے جو بربادی یورپ اور عام طور پر دنیا پر نازل ہوئی اس کا بدیہی ثبوت ہے۔ اس بیزاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسلامی اخوت و مساوات کی طرف مائل ہوتے ہیں اور یورپ کی معاشرتی اور معاشی اور سیاسی زندگی جو بے روح اور صداقت سے خالی ہے انھیں اس عقیدے پر اور مستحکم کر دیتی ہے۔ اس طوفانِ سرمایہ داری و استبداد میں انھیں ایک ہی روشنی نظر آتی ہے جو دنیا کو نجات دے سکتی ہے اور جو جغرافی حدود اور نسل و رنگ کے قیود سے بالا ہے۔"

(ص ایضاً)

پیامِ اقبال کی اس ہمدردانہ ترجمانی کے باوجود، عبدالحق اندیشہ ظاہر کرتے ہیں کہ کہیں اقبال اپنے وطن ہندستان اور اس کی آزادی سے بالکل صرفِ نظر نہیں کرلیں۔ اس معاملہ میں وہ ترانۂ ہندی اور ترانۂ ملّی کے فرق پر زور دیتے ہیں۔ انھیں یہ اندیشہ بھی ہے کہ فارسی کے ساتھ وابستگی کے سبب اقبال اردو کو نظر انداز نہ کر دیں۔ یہ دونوں اندیشے ایک غلط فہمی پر مبنی تھے اور غلط ثابت ہوئے۔ ملک کی آزادی میں اقبال کا حصہ فکر و عمل دونوں میں ہندوستان کے کسی بڑے سے بڑے مفکر یا رہنما سے ذرا بھی کم نہیں بلکہ بعض جہتوں سے بہت زیادہ ہے۔ غلام ہندوستان کو انقلاب کا نعرہ اور آزادی کا ترانہ اقبال ہی نے دیا، جس کے بغیر دلوں میں وہ حرارت و جرأت پیدا نہیں ہوسکتی تھی جس نے بالآخر تحریک آزادی کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچا دیا۔ شاعر کے علاوہ، بحیثیت ایک سیاست داں کے بھی اقبال کا تدبر بہ یک وقت وطن دوستی اور ملت دوستی سے مرکب ہے اور اگر سیاسی پارٹیوں کے بعض بڑے رہنما، خواہ وہ کانگریس کے ہوں یا لیگ کے، انگریزوں بالخصوص برطانوی سامراج کے آخری وائسرائے کے شر پسندانہ

قریب ہی نہیں آجاتے تو اقبال کی وفات کے نو سال بعد برصغیر کی خوں ریز تقسیم نہیں ہوتی۔ اسی طرح بانگِ درا کے بعد اردو شاعری نے کلامِ اقبال کے بہترین نمونے پیش کیے۔

بہر حال اقبال کے نقطۂ نظر پر قدامت پرستی کے الزام کو عبدالحق اس طرح رد کرتے ہیں:

"ان کی قدامت پرستی مردہ نہیں ہے جو دلوں میں یاس اور اداسی پیدا کرتی ہے، بلکہ وہ ان اصولوں کی پیروی ہے جن کی صداقت پر شاعر کو کامل یقین ہے۔ وہ اپنے پیام میں عہدِ ماضی کی روشن مثال دکھا کر بار بار انھیں عمل اور جدّ و جہد اور ثبات پر آمادہ کرتا ہے۔"

(ص ۷۶، ایضاً)

یہ اقبال کی روایت پسندی کی بہت معقول توجیہ ہے، لیکن "قدامت پرستی" کا لفظ، انگریزی لفظ "کنزرویٹیزم" کا ترجمہ ہو تو ہو، اسی طرح ناموزوں ہے جس طرح "پیٹریٹزم" کا ترجمہ "وطن پرستی"، اس لیے کہ کم از کم اقبال کے معاملے میں خدا پرستی کے ساتھ کوئی دوسری "پرستی"، حتّٰی کہ خودی کی "خود پرستی" بھی جمع نہیں ہو سکتی اس کا ترجمہ "قدامت کا جنون" ہونا چاہیے۔

عبدالحق نے اقبال اور ٹیگور کا جو موازنہ کیا ہے اس سے ان کی انصاف پسندی کی کوشش کے باوجود ان کے تعقل کی حدود بھی آشکار ہوتی ہیں:

"ٹیگور کے کلام میں نسائیت کا شائبہ پایا جاتا ہے اور اقبال میں مردانہ پن۔ ٹیگور کا جذبۂ محبت گو بہت گہرا اور بے تھاہ ہے، لیکن وہ اپنے حدود کو توڑ کر کبھی آگے نہیں نکل جاتا اور باوجود کیف و وجد کے آپے سے باہر نہیں ہونے پاتا۔ اقبال کا مطمحِ نظر اگرچہ مقابلتہً محدود ہے، مگر زیادہ قوی، زیادہ پرزور اور زیادہ شور انگیز ہے۔ ٹیگور کے یہاں نازک سے نازک موقع پر بھی عقل کی پرچھائیں آس پاس ضرور نظر آتی ہے، مگر اقبال کے یہاں جذبات کے تلاطم کے سامنے بعض اوقات بے چاری عقل اپنی آبرو بچانے کے لیے اچک کر الگ جا کھڑی ہوتی ہے۔ وہاں جذب و کیف کے ساتھ خود داری ہے اور یہاں وارفتگی و شیفتگی۔"

(ص ۷۹، ایضاً)

اس تجزیے میں ٹیگور کے یہاں نسائیت اور اقبال کے یہاں مردانگی کی بات ممکن ہے کہ صحیح ہو۔ لیکن دونوں کے کلام میں عقل و عشق کی حدود، جنون و خرد کے فرق اور محدود و لامحدود کی جو تمیز کی گئی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اس میں تضاد بھی ہے اور پراگندہ خیالی بھی۔ اگر اقبال کا مطمحِ نظر نسبتہً محدود ہے تو ان کا کیف و وجد ہر حد سے آگے کیسے چلا جاتا ہے، جب کہ ٹیگور کا جذبہ ایک حد کے اندر رہتا ہے؟ اقبال کے نظریۂ خودی کی انتہا یہ ہے کہ انسان خدا کے قریب پہنچ جائے اور زندگی بھر اس کا شریکِ کار اس معنی میں رہے کہ اس کی مشیت کی تعمیل و تکمیل کے لیے اس کے احکام بجا لاتا رہے، جب کہ ٹیگور انسان کی خودی کو خدا کی ہستی میں ضم کر دیتا ہے۔ یہ دراصل اسلام اور ویدانت کا فرق ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹیگور کا مطمحِ نظر بہت محدود اور معمولی بلکہ رسمی طور پر صوفیانہ ہے، جس کے اندر ہندو بھگتی کا فنا سے شخصیت کا تصور کام کر رہا ہے۔ اس کے برخلاف اقبال انسان کی خودی کو اس درجہ مستحکم دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ کائنات کے ارتقا میں خدا کے ساتھ مستقل بالذات طور پر تعاون کرے اور اس طرح اپنی خودی کے آفاقی امکانات کو روبہ عمل لائے، جس کے آگے اور پیچھے کوئی حد نہیں ہے، وہ ازلی اور ابدی ہے۔ ٹیگور عشرتِ قطرہ دریا میں فنا ہو جانا سمجھتا ہے، لیکن اقبال کا قطرہ ایک دریا سے ناپیدا کنار بننا چاہتا ہے۔ یہ تشریح واضح کرتی ہے کہ عبدالحق کی رائے کے برعکس "خودداری" اقبال کے یہاں ہے، جب کہ "وارفتگی" ٹیگور کے یہاں۔ یہی وجہ ہے کہ عبدالحق کے بیان کے برخلاف اقبال کے اندازِ نظر میں عقل و عشق یا جنون و خرد کا جو توازن ہے وہ ٹیگور کے اندازِ نظر میں مفقود ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عبدالحق کو اقبال اور ٹیگور کا کوئی گہرا اور وسیع تقابلی مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا اور انھوں نے اپنے دور کے بعض سطح بیں ادیبوں کی خیال آرائیوں سے متاثر ہو کر، کافی غور و فکر کے بغیر ایک غلط رائے قائم کر لی۔

ایسی ہی غلط رائے کا اظہار عبدالحق نے اقبال کے فنِ شاعری کے بعض پہلوؤں کے متعلق بھی کیا ہے:

> "تخیل کی بلندی، تشبیہات و استعارات، لفظی ترکیبیں صاف بتاتی ہیں کہ کلام پر مرزا غالب کا کس قدر اثر ہے۔ وہ گویا مرزا کے معنوی شاگرد ہیں اور پڑھنے والا جسے ذوقِ سخن ہے بہ آسانی اسے سمجھ سکتا ہے۔ لیکن بندش میں وہ چستی نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ مرزا کے طرزِ ادا میں جو خاص نزاکت ہے وہ نہیں پائی جاتی اور نہ وہ سوز و گداز اور درد ہے جو ہم حالی کے کلام میں پاتے ہیں، اگرچہ کہیں کہیں تکلف کی جھلک نظر آتی ہے اور فارسی ترکیبیں اعتدال سے آگے نکل جاتی ہیں، مگر شان و شکوہ، زور اور شور امنڈتے ہیں۔

جذبات کی ادائی، حکیمانہ نظر اور شاعرانہ اندازِ بیان میں اقبال کے کلام کا جواب نہیں۔ (ص ۷۷-۸ ، ایضاً)

اقتباس کا آخری جملہ قبل کے جملوں کی تردید کرتا ہے۔ یہ تضادِ بیان ایک الجھن کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ عبدالحق اقبال کے فنی تجربات کی داد دینا چاہتے ہیں، مگر اردو تنقید نیز شاعری کی روایات انھیں روکتی ہیں۔ بندش کی چستی، نزاکت اور سوز و گداز کا ایک خاص مفہوم اور ماضی کے بعض شاعروں پر اس کا اطلاق متعین ہو چکا ہے، جو ایک معیار بن گیا ہے، لہٰذا عبدالحق اسی معیار پر اقبال کے تجربے کو جانچنے لگتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اقبال کے اشعار میں ابتدا سے الفاظ و تراکیب کی جو چستی اور روانی ہے وہ غالب کے یہاں بھی ان کے کلام کے دورِ متوسط سے قبل پیدا نہیں ہوئی۔ مثال کے طور پر اقبال کی نظم "ہمالہ" کی تراکیب کا موازنہ غالب کے ابتدائی کلام سے کیا جائے تو حقیقت واضح ہو جائے گی۔ بات یہ ہے کہ فنِ شاعری کو جہاں پر غالب نے ترقی دے کر چھوڑا تھا وہاں سے اقبال نے شروع کیا اور بہت دور تک آگے گئے۔ اردو شاعری کی روایت میں اقبال کی انفرادیت کا کمال یہی ہے۔ جہاں تک نزاکت کا معاملہ ہے، اس کے لیے روایتی تصورات میں بھی غالب نہیں، میر مشہور ہیں۔ ممکن ہے عبدالحق کا مفہوم لطافت ہو، مگر اس کے لیے انھوں نے صحیح لفظ کا استعمال نہیں کیا۔ اس کے علاوہ نزاکت کا لفظ بجائے خود محض اس ملائمت کے لیے وقف نہیں جس کا اثبات کلامِ میر میں خاص طور پر کیا جاتا ہے۔ یہ ایک زیادہ وسیع لفظ ہے اور اس میں نفاست کا مفہوم بھی شامل ہے۔ اس معنی میں اقبال کے یہاں نزاکت کسی اردو یا فارسی شاعر سے کم نہیں ہے۔ یہی حال لطافت کا ہے۔ اقبال کے یہاں ہرگز وہ تکلف اور بے اعتدالی نہیں ہے جس کا احساس عبدالحق کو ہوا ہے۔ اسی طرح سوز و گداز اور دردمندی میں اقبال کا "شکوہ" اسی کیف کا حامل ہے جو مسدسِ حالی میں محسوس کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ "تصویرِ درد" سے "ذوق و شوق" تک سوز و گداز اور درد کی جو روانی ہے اس کا تھوڑا ہی سا حصہ حالی کے کلام میں، اس کا پیمانہ محدود ہونے کے سبب، پایا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے تنقیدی مطالعات میں عبدالحق روایاتِ تنقید میں کوئی اجتہاد نہیں کر سکے۔ شاید اس کے لیے وہ اصلاً ایک محقق اور عالم تھے، لہٰذا روایت میں کچھ توسیع کے باوجود اس کی تجدید اور بہت زیادہ ترقی کے لیے درکار صفات اپنے اندر نہیں پیدا کر سکے۔

عبدالحق کا مطالعہ میر زیادہ متوازن، واضح اور بھرپور ہے، اس لیے کہ یہ ایک نسبتہً قدیم شاعر کا مطالعہ ہے، جس کی کچھ روایات بن چکی ہیں۔ اس میں سب سے پہلے میر کے سوانح اور احوال کی تفتیش کی گئی ہے، اس کے بعد اردو شاعری کی تاریخ میں ان کے امتیاز پر بحث کی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ کس طرح میر کا کلام درحقیقت ان

کی سیرت کا آئینہ ہے یا ان کے کردار کی زیبائی ان کے کلام کی رعنائی کا باعث ہے۔ اسے ایک تاریخی یا شخصی مطالعہ بھی کہا جا سکتا ہے، مگر یہ حقیقی بن جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ناقد نے شاعر کی زندگی سے اعتنا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے فن کا بھی معروضی تجزیہ کیا ہے، اگرچہ ممکن ہے کہ تجزیے کے ہر پہلو سے پورا اتفاق نہیں کیا جائے، خاص کر جہاں درد اور انیس کے ساتھ میر کا موازنہ کیا گیا ہے۔ بہرحال، جس تفصیل اور شرح و بسط کے ساتھ عبدالحق نے میر کے اسالیب شاعری کا جایزہ لیا ہے وہ عمومی طور پر قاری کو مطمئن کر دیتا ہے کہ ایک بڑے فن کار کی قدر شناسی کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مطالعہ میر میں عبدالحق نے جو تنقیدی نکات پیش کیے ہیں ان پر اب تک بسوط کتابیں بھی کوئی اضافہ نہیں کر سکی ہیں۔ یہ ایک ایسا عالمانہ و محققانہ مطالعہ ہے جس میں تنقیدی بصیرت بہت نمایاں ہے۔ یہ مقدماتِ عبدالحق کا ایک اہم ترین نمونہ اور ایک بہترین ادبی کارنامہ ہے:

"یوں تو میر صاحب کے تمام نامور ہم عصروں کے کلام میں سادگی، صفائی اور روزمرے کی پابندی پائی جاتی ہے، لیکن محض سلاست اور زبان کی فصاحت کام نہیں آسکتی، جب تک کہ زبان میں تازگی، ادائے مطلب میں شگفتگی اور خیال میں بلندی و جدت نہ ہو۔ میر صاحب کے کلام میں یہ سب خوبیاں یکجا جمع ہیں اور پھر اس پر درد اور تاثیر خداداد معلوم ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے تمام ہم عصروں میں ممتاز اور اردو شاعروں میں خاص درجہ رکھتے ہیں اور ان کی اس ممتاز خصوصیت کو اب تک کوئی نہیں پہنچا ہے۔ البتہ خواجہ میر درد ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے سلاست و فصاحتِ زبان کے ساتھ اخلاقی مضامین اور صوفیانہ خیالات کی چاشنی دی ہے اور کلام میں درد پیدا کیا ہے۔ بیان میں جدت اور تازگی بھی پائی جاتی ہے جس سے وہ میر صاحب کے لگ بھگ پہنچ جاتے ہیں، لیکن بیان میں وہ کھلاوٹ نہیں جو میر صاحب کے یہاں ہے اور نہ غایت درجہ سلاست و سادگی کے ساتھ وہ سوز و گداز ہے اور نہ تخیل کی وہ شان ہے جو شاعری کی جان ہے خصوصاً بیان کا وہ انوکھا انداز جس میں خاص نزاکت ہوتی ہے نظر نہیں آتا۔ میر صاحب کا بڑا کمال اسی میں ہے۔ میر انیس بھی جن کا فصاحت میں

بہت بلند درجہ ہے اور جو سوز و غم کے بیان میں اپنی نظیر نہیں رکھتے میر صاحب کو نہیں پہنچتے۔ میر انیس میں پھر بھی تصنع اور تکلف آجاتا ہے۔ میر اس سے بالکل بری ہے۔ وہ خود سوز و غم کا پتلا ہے اور اس کا شعر سوز و غم کی صحیح اور سچی تصویر ہے جس میں تکلف کا نام نہیں۔ میر انیس کے یہاں خیال کے مقابلے میں الفاظ کی بہتات ہے اور خیال سے پہلے لفظ پر نظر پڑتی ہے، لیکن میر کے اشعار میں الفاظ و خیال کے ساتھ اس طرح لپٹے ہوتے ہیں کہ پڑھنے والا محو ہو جاتا ہے اور اسے لفظ خیال سے الگ نظر نہیں آتا میر انیس کے یہاں دھوم دھام اور بلند آہنگی ہے۔ میر کے یہاں سکون اور خاموشی ہے اور اس کے شعر چپکے چپکے خود بخود دل میں اثر کرتے چلے جاتے ہیں، جس کی مثال اس نشتر کی سی ہے جس کی دھار نہایت باریک اور تیز ہے اور اس کا اثر اسی وقت معلوم ہوتا ہے جب وہ دل پر جا کر کھٹکتا ہے میر انیس رلاتے ہیں۔ میر خود روتا ہے۔ یہ آپ بیتی ہے اور وہ جگ بیتی۔"

("انتخاب کلام میر" ۔ مقدمات عبدالحق، ص ۹۵-۹۴)

اس بیان میں میر کی جتنی خوبیاں بیان کی گئی ہیں سب صحیح ہیں اور ان سے کلامِ میر کی خصوصیات واضح ہوتی ہیں۔ سادگی، بے ساختگی، درد و غم، سوز و گداز، تازگی و شگفتگی یقیناً اشعارِ میر کے امتیازی نشانات اپنے مجموعی کیف و کم کے لحاظ سے ہیں۔ لیکن میر کے ساتھ موازنہ کے لیے درد اور انیس کا انتخاب بہت موزوں نہیں۔ درد کا تصوف اور انیس کی رزمیہ نگاری میر کے تغزل سے مختلف چیزیں ہیں۔ چنانچہ درد کو میر کے لگ بھگ قرار دینا تنقیدی شعور کی دلیل نہیں۔ اسی طرح میر انیس کے یہاں تکلف اور تصنع کا سراغ لگانا تنقیدی ذوق کا ثبوت نہیں۔ میر غزل گو ہیں اور انیس نظم نگار، لہٰذا انیس کی شاعری لازماً جگ بیتی ہوگی اور میر کی آپ بیتی، مگر کمالِ فن کے لیے یہ فرق فیصلہ کن نہیں، نہ انیس میر کی دروں بینی میں دخل دے سکتے ہیں، نہ میر انیس کی جہاں بینی میں، دونوں اپنی اپنی سلطنت کے سلطان ہیں اور ان کے ممالک کی سرحدیں ایک دوسری سے نہیں ملتیں۔ جہاں تک الفاظ و خیالات کے باہم دگر پیوستہ ہونے کا تعلق ہے وہ جس حد تک میر کے یہاں ہے اسی حد تک انیس کے یہاں بھی یہی وجہ ہے کہ اپنے موضوع کے موثر اظہار کے لیے انیس کا اسلوب اتنا ہی فطری ہے جتنا میر کا اپنے موضوع کے لیے۔ شاید عبدالحق

نے شبلی کے معرکہ آرا تنقیدی کارنامے "موازنۂ انیس و دبیر" کا مطالعہ بہ غور نہیں کیا، ورنہ انھیں معلوم ہوتا کہ اردو مرثیہ نگاری بجائے خود ایک عظیم صنفِ سخن ہے اور اس کی عظمت کے معمار انیس ہی ہیں جنھوں نے المیہ نگاری کے ساتھ رزمیہ نگاری اور فطرت نگاری کو ملا کر اعلا پائے کی نظم نگاری کا ثبوت دیا ہے، جس کا کمال غزل نگاری کا ہرگز محتاج نہیں اور نہ کوئی غزل گو، یہاں تک کہ میر بھی، اس نظم نگاری کا مقابلہ اس کے اپنے دائرۂ کار میں کر سکتا ہے۔

میر کی مثنویوں پر تبصرہ کرتے ہوئے عبدالحق کہتے ہیں:

"مثنوی اصنافِ سخن میں بہت مشکل ہے۔ میر صاحب نے خوب نبھایا ہے۔ اردو زبان میں میر صاحب کی مثنویاں سب سے پہلا اور عمدہ نمونہ ہیں۔ مثنوی کی انہی کی بدولت ترقی ہوئی۔ میر حسن اور شوق وغیرہ سب انہی کے مقلد ہیں۔ البتہ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی میر اثر کی مثنوی "خواب و خیال" ایک ایسی نظم ہے جو روزمرہ کی صفائی اور زبان کی خوبی کے لحاظ سے کہیں بڑھی ہوئی ہے۔ لیکن وہ ہجر و وصل، راز و نیاز، تغافلِ معشوقانہ اور سراپا کی داستان ہے، جس میں قصے کا سا کوئی تسلسل نہیں اور اسی لیے میر صاحب کی مثنوی "شعلۂ عشق" کو کسی طرح نہیں پہنچتی بلکہ اس سے مقابلہ کرنا ہی فضول ہے۔" (ص ۲۰۲، ایضاً)

مثنوی نگاری میں اثر کے ساتھ میر کا جو موازنہ عبدالحق نے کیا ہے اور اس سلسلہ میں میر کی فضیلت کا جو نتیجہ جس جہت سے انھوں نے نکالا ہے وہ صحیح اور اعلا تنقیدی بصیرت پر مبنی ہے، اس لیے کہ تخلیقاتِ نظم کے اجزا کے بجائے کُل کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا گیا ہے۔ لیکن اس معاملے میں میر حسن پر میر تقی میر کی ترجیح محلِ نظر ہے اور میر حسن کی سطح پر شوق کو رکھنا موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ میر غزل کے بادشاہ اپنی خاص حدود کے اندر ہیں، مگر مثنوی کی بادشاہت کا تاج بھی ان کے سر پر رکھنا مناسب نہیں۔

بہر حال، مثنویوں کی قدر شناسی کے باوجود عبدالحق نے مسدس حالی پر مقدمہ لکھتے ہوئے زبان کی سادگی کے معاملے ان کی خدمات کو نظر انداز کرتے ہوئے حالی کی سلاستِ بیان کے سلسلے میں یہ مبالغہ کیا کہ "حالی نے زبان کو وسعت نہیں دی، ایک نئی زبان پیدا کی ہے" (مقدمات ص ۲۵۵)۔ لیکن "خطوطِ سرسید" کے اسلوب پر تنقید کرتے ہوئے عبدالحق نے انصاف سے کام لیا ہے:

"جس طرح ان کی طبیعت میں تصنّع اور تکلّف کو دخل نہ تھا اسی طرح ان کی عبارت ہنر نما عیب سے خالی نہیں۔ وہ بلا تکلّف لکھتے چلے جاتے ہیں اور لکھتے وقت جو خیال جس طرح ادا ہو گیا اسی طرح ادا کر دیتے ہیں۔ لیکن اس بے تکلّفی اور بے ساختہ پن میں بعض وقت عجیب عجیب فقرے ان کے قلم سے نکل جاتے ہیں۔"

(ص ۵۴، تنقیدات)

خواجہ حسن نظامی کی نثر پر بھی عبدالحق نے جچی تلی رائے دی ہے اور قبل کے دو نثر نگاروں کے اسالیب کے ساتھ اس کا موازنہ انھوں نے بصیرمندی کے ساتھ کیا ہے:

"بعض کہتے ہیں کہ آزاد کا رنگ اڑایا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آزاد کی جھلک پائی جاتی ہے ورنہ اصل میں اس سے بالکل الگ ہے۔ آزاد میں تصنّع زیادہ ہے۔ خواجہ صاحب کے جملے اور فقرے بھی اگرچہ فکر و تراش سے خالی نہیں ہوتے لیکن اسے خوبی سے چھپایا ہے کہ بے تکلّفی اور بے ساختہ پن قربان ہو جاتا ہے، بلکہ دیکھا جائے تو خواجہ صاحب کا رنگ مرزا غالب سے بہت ملتا جلتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ ظرافت کی چاشنی نہیں مگر اس کے بجائے سوز و گداز ہے۔"

(ص ۲۷۳ "مقدمہ سی پارۂ دل" ــ مقدمات)

"اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" عبدالحق کا ایک تحقیقی کارنامہ ہے مگر اس علمی مطالعے میں انھوں نے تنقیدی نظر کا ثبوت دیا ہے۔ وہ بالکل صحیح کہتے ہیں:

"یہ بزرگ اس زبان کے بڑے ادیب اور شاعر نہ تھے یا کم سے کم ان کا مقصد اس زبان کی ترقی نہ تھی، نہ انھیں اس کا کچھ خیال تھا۔ ان کی غایت ہدایت تھی۔ لیکن اس ضمن میں خود بخود اس زبان کو فروغ ہوتا گیا اور عہد بہ عہد نئے نئے اضافے اور اصلاحیں ہوتی گئیں اور ان کی مثال نے دوسروں کی ہمت بڑھائی، جس سے اس کے ادب میں نئی شان پیدا ہو گئی، گو اب یہ ایک بھولی بسری داستان ہے لیکن اردو زبان کا مورخ ان کے احسان کو کبھی بھول نہیں سکتا۔"

یہ ایک لسانی تجزیہ ہے جو تاریخی زاویۂ نگاہ سے کیا گیا ہے۔ اس کا ناقدانہ انداز واضح ہے، جس کے مطابق قدر شناسی میں قدر افزائی کا مبالغہ نہیں کیا گیا ہے اور تحقیق کو حقیقت پسندی کی حدود میں رکھا گیا ہے۔ اس سے ایک عالمانہ تفکر کے ضبط و احتیاط کا پتہ چلتا ہے، جو عام طور پر عبد الحق کے کثیر التعداد اور متنوع مقدمات کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ ان معدودے چند محققوں میں ایک ہیں جو اپنی محنت کے نتائج شخصی جوش و خروش کے، بجائے بالعموم حکیمانہ تحمل کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ مقدمہ نگاری میں تحقیق و تنقید کا یہ توازن بہت ہی نادر ہے۔ یہ ایک نہایت باذوق اور باشعور شخصیت کا اشاریہ ہے۔ اس میں ذہانت و متانت کا وہ امتزاج ہے جو ادب کے بااصول معروضی مطالعے کے لیے ضروری ہے۔

ان مباحث کے پیش نظر ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ تاریخی طور پر شبلی و حالی کے بعد عبد الحق اردو کے سب سے بڑے نقاد ہیں اور انھوں نے اپنے دونوں بزرگوں کے مشرقی و مغربی رجحانات کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرکے ایک جامع تنقیدی نصب العین کا ایک نمونہ پیش کیا ہے۔ بعد کے ناقدین نے اس نمونے پر پورے طور سے عمل نہیں کیا، رشید احمد صدیقی اور نیاز فتح پوری کا انداز مشرقی رہا، جب کہ کلیم الدین احمد اور احتشام حسین نے مغربی رویہ اختیار کیا اور آل احمد سرور صاحب مشرق و مغرب کے درمیان تذبذب میں پڑ گئے۔ اس طرح عبد الحق تک اردو تنقید کی جو سیدھی لکیر آئی وہ اپنے رُخ پر آگے نہیں بڑھ سکی اور پیچ و خم کا شکار ہو گئی، خواہ اس کے حجم میں بہت کچھ اضافہ ہوا ہو۔ اس صورتِ حال کی ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عبد الحق کے بعد تحقیق و تنقید کا باہمی ربط ٹوٹ گیا، ناقد اور عالم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ ممکن ہے، کسی حد تک تہذیبی قدروں کے ساتھ وابستگی کا مسئلہ بھی اس سلسلے میں درپیش رہا ہو۔ اس معاملے میں ایک بہت بڑا سوال شخصیت کا بھی ہے۔ عبد الحق اپنے پیش رووں کی طرح پورے معاشرے کی تعمیر و ترقی کے لیے ایک تحریک اپنی خاص لسانی و ادبی جہت سے چلا رہے تھے۔ لہٰذا ان کے سامنے زندگی اور ادب کا ایک مجموعی تصور تھا جو ان کی حقیقت پسندی اور استقامت کا باعث تھا۔ ان کے بعد آنے والے ناقدین اس تصور سے بہرہ ور نظر نہیں آتے۔

اب ایک سوال یہ ہے کہ کیا ہم عبد الحق کو ناقدِ کامل کہہ سکتے ہیں؟ کلیم الدین احمد نے کہا ہے:

"جس نقاد کی اردو دنیا منتظر ہے وہ عبد الحق نہیں۔"

(ص ۱۳۹، اردو تنقید پر ایک نظر، اشاعت ۱۹۸۳ء)

یہ بیان اس نکتے پر مبنی ہے کہ عبد الحق نے پرانی قدروں میں انقلاب برپا کرکے نئی قدریں نہیں پیش کیں۔ ظاہر ہے کہ کلیم الدین احمد قدروں کی آفاقی اہمیت سے واقف نہیں، نہ قدیم و جدید کا کوئی اصولی معیار ان کے سامنے ہے۔

ان کا مفہوم یہ ہے کہ عبدالحق کا نقش حالی کی دکھائی ہوئی پیرویِ مغربی کی راہ پر بہت آگے نہیں بڑھتا ہے۔ بجائے خود نقص کے یہ دلیل ناقص ہے اور اس کا منبع ایک خام قسم کی مغرب پرستی ہے، جو توازن سے خالی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو جس چیز کو کلیم الدین احمد عبدالحق کا عیب سمجھتے ہیں وہ دراصل ان کا ہنر ہے۔ عبدالحق اگر ناقدِ کامل نہیں ہیں تو اس کی وجہیں دوسری ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کا کوئی نظامِ تنقید نہیں ہے، جس میں اصولی اور نظریاتی مباحث کے ساتھ علمی اور تجزیاتی مطالعات مستقل و منظم طور پر یکجا ہوں، دوسرے یہ کہ ان کی کوئی باضابطہ، ہموار اور استوار فکر نہیں ہے جس سے حیات و کائنات کے متعلق ان کے معین تصورات کی وضاحت ہو۔ چنانچہ ان کے سرمایۂ تنقید میں جو کچھ ہے وہ صرف باذوق تبصروں اور چند اخلاقی بیانات پر مشتمل ہے، اگرچہ یہ تبصرے اور بیانات اپنی جگہ بہت اہم اور باعثِ امتیاز ہیں۔

بہرحال، تذکروں سے شبلی و حالی تک کی اوّلیں تنقیدی کوششوں کے فوراً بعد کسی ناقدِ کامل کا ظہور متوقع نہیں تھا۔ کلیم الدین احمد نے وقت سے پہلے اس کا انتظار کیا اور مایوس ہوئے۔ ممکن ہے کہ وہ اپنی تنقیدوں کو حقیقتِ منتظر سمجھتے ہوں اور ناقدِ کامل کی حیثیت سے نمایاں ہونے کی آرزو رکھتے ہوں۔ ان کی حقیقت ہمیں معلوم ہو چکی ہے اور ان کی آرزو پوری نہیں ہوئی۔ جس مقام تک بعض تاریخی وجوہ سے عبدالحق کی رسائی نہیں ہو سکی اس مقام تک ان کے بعد آنے والے ناقدین بھی نہیں پہنچ سکے ہیں۔ لہٰذا عبدالحق کی اہمیت یہ ہے کہ اپنے وقت میں انھوں نے اردو ادب کی تنقیدی روایات کو فروغ دیا، ان میں کچھ توسیع کی اور مستقبل کے ارتقا کے لیے صحیح رُخ کی طرف اشارے کیے۔ یہ رُخ مشرقی تصور کی بنیاد پر مغربی تجربات کر کے ایک جامع نقطۂ نظر اور آفاقی معیار کا حصول تھا، تاکہ اخلاقیات اور جمالیات کے امتزاج سے مطالعۂ ادب کے بہترین اور مفید ترین طریقے کا سراغ لگ سکے اور تہذیبی قدریں نہ صرف پورے طور پر واضح ہوں بلکہ ان کے ساتھ وابستگی اتنی عام ہو کہ فرد اور معاشرہ دونوں کی ترقی استقامت کے ساتھ ایک نقطۂ عروج کی طرف ہوتی رہے۔ اس جہت سے عبدالحق کے تمام علمی و ادبی کارناموں کے مکمل مطالعے کی اشد ضرورت ہے۔

اس مطالعے میں عبدالحق کا اسلوبِ نگارش ہماری کافی مدد کر سکتا ہے۔ عام طور پر ان کی نثر میں وہ نفاست پائی جاتی ہے جو شبلی سے منسوب ہے، اس میں وہ ناہمواری نہیں جو سرسید اور حالی کی تحریروں میں بہ کثرت نظر آتی ہے، گرچہ شبلی کی شوخی اور شگفتگی کے بجائے عبدالحق کے اسلوب میں مقابلۃً سادگی اور قدرے خشکی نمایاں ہے۔ نفاست کے ساتھ متانت کی خصوصیت عبدالحق کے طرزِ اظہار کو ان متنوع مطالعات کے لیے سازگار بناتی ہے جو ان کے کثیر التعداد مقدموں اور دیباچوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ ایک کاروباری نثر ہے جو ہر قسم کے تبصروں میں کام آ سکتی ہے۔ اس سے ایک ایسی شخصیت نے کام لیا جس کی دلچسپیاں وسیع تھیں اور وہ اپنے وقت کے اکثر علوم و فنون کی تصنیفات کے

تعارف پختگی اور عمدگی کے ساتھ، بالعموم باذوق اور باشعور طریقے سے کراتی تھی۔ لسانیات اور قواعد کے مقابل کے مذہب و سائنس کے معرکے تک کوئی چیز اس کے دائرۂ عمل سے باہر نہیں تھی۔ ادب میں شاعری، تذکرہ، تنقید، تحقیق، تاریخ، افسانہ سب پر اس کی توجہ تھی۔ عبدالحق کا اسلوب فی الواقع ایک تحریک کا ترجمان تھا۔

تنقید نگاری میں ایک تحریکی حرارت شبلی و حالی کی طرح عبدالحق کی وہ خصوصیت ہے جو انھیں اپنے پیش رووں کا وارث، اہم عصروں کا قاید اور بعد میں آنے والوں کے لیے ایک نمونہ بنا کر پیش کرتی ہے۔ وہ روایات کے امین، حالات کے مبصر اور ترقیات کے علم بردار تھے۔ اردو تنقید میں ان کا مقام مستحکم، منفرد اور ممتاز ہے۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی

مولوی عبدالحق کا اسلوب

اسلوب یا "طرزِ نگارش" کا مسئلہ ایسا نہیں جس پر کوئی فیصلہ کن اور دو ٹوک بات کہی جا سکے۔ آسان لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ افکار و خیالات کے اظہار و ابلاغ کا ایسا پیرایہ ہے جو دل نشین بھی ہو اور منفرد بھی۔ اسی کو انگریزی میں (Style) کہتے ہیں۔ اردو میں اس کے لیے "طرز" یا "اسلوب" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ عربی اور جدید فارسی میں "سبک" کہتے ہیں۔ ان الفاظ پر غور کرنے سے ہی یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلوب میں "صناعی" (Ornamentation) کا مفہوم شامل رہا ہے۔

سب سے پہلے انگریزی لفظ (Style) کو لیجیے۔ یہ یونانی لفظ (Stilus) سے نکلا ہے، "جو ہاتھی کے دانت، لکڑی یا کسی دھات کا بنا ہوا ایک نوکیلا اوزار ہوتا تھا جس کے ذریعہ موم کی تختیوں پر حروف و الفاظ یا نقوش کندہ کیے جاتے تھے۔ کچھ لوگ اس کی اصل (Stylus) بتاتے ہیں مگر یہ غلط ہے۔

. . . امتدادِ زمانہ سے وہ آلہ جس سے نقش بٹھا دیا جاتا تھا، خود ان نقوش، جملوں یا عبارت کا مفہوم ادا کرنے کو استعمال ہونے لگا اور ایک عمل جو ابتداً میکانکی تھا، رفتہ رفتہ ذہنی یا تصوراتی بن گیا۔ یہ نقوش یا تو اجاگر ہوتے تھے یا دھندلے اور ناہموار، جنھیں بعد کو (Stilus) کے دوسرے کند حصے سے سدھارا جاتا تھا۔ ادب میں یہی کاٹ چھانٹ، دماغ سوزی اور باریک بینی خود ادیب کی اپنی ذات کی پرکھ بن جاتی ہے۔"[1]

اس تعریف سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسٹائل میں ہمیشہ کاوش، صناعی اور مرصع کاری کا عنصر ضروری سمجھا گیا ہے۔ خیال تو خیر بنیادی چیز ہے، مگر اس کے ساتھ، قوتِ اظہار اور پیرایۂ بیان کی ندرت و انفرادیت بھی جب تک شامل نہ ہو، اچھا ادب وجود میں نہیں آسکتا۔

---

[1] اثر لکھنوی؛ چھان بین۔ ۳۶

جدید فارسی اور عربی زبان میں اسٹائل کے لیے "سبک" استعمال ہوتا ہے۔ اصل میں یہ عربی لفظ ہے۔ سبک، یسبک (ضرب یضرب) کے لغوی معنی ہیں دھات کو پگھلانا اور سانچے میں ڈھالنا۔ چناں چہ ایسا سونا جسے کٹھالی میں ڈال کر میل سے پاک کر لیا جاتا ہے سبیک یا مسبوک کہلاتا ہے۔ اور دھات کی چیزیں ڈھالنے والی (Foundry) فونڈری کو مسبکۃ کہتے ہیں۔ اس لفظ کا استعمال بھی صنعت گری کا مفہوم ادا کرتا ہے اور اب اس کا مطلب کلام کو حشو و زوائد سے پاک کرنا، لیا جاتا ہے۔

اب دوسرا لفظ "طرز" لیجیے۔ طرز یطرز (سمع یسمع) لباس فاخرہ استعمال کرنے کو کہتے ہیں۔ طرز اور تطرز (تفعل) کپڑے پر بیل بوٹے بنانے یا زردوزی کرنے کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ الطرازۃ زردوزی کے لیے اور المطرز بیل بوٹے بنانے والے یا زردوز کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسے طور طریقہ، ہیئت یا ترتیب کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً عربی میں کہیں گے "ھذا علی طراز ذالک" یعنی "یہ اس کے طریقے پر ہے" طراز عربی جدید میں فیشن کے معنی بھی دیتا ہے۔

یہاں ضمناً یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ یہی طرز ترکی زبان میں پہنچا اور زردوز کے علاوہ خیاط کے معنوں میں بھی مستعمل ہوا۔ ط اور د کی آوازیں قریب المخرج اور متبادل ہیں۔ ترکی سے اردو میں آیا وہاں طرزی تھا، یہاں درزی ہو گیا۔

اب اسلوب کا لفظ دیکھیے۔ یہ طریقہ، راستہ، روش اور ڈھنگ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسالیب اس کی جمع ہے۔ یہ فی الاصل متعین و متیقن روش کے لیے ہے۔ اسی لیے جب عربی میں کہتے ہیں "انفہ فی اسلوب" یعنی "اس کی ناک ایک ہی ڈھنگ سے رہتی ہے" (یا وہ مغرور و متکبر ہے) تو اس میں انفرادیت کا تصور شامل ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ ادب میں بھی کسی کے مخصوص انداز نگارش کے واسطے بولا جاتا ہے۔ جس میں لکھنے والے کی شخصیت کے منفرد خط و خال نظر آئیں۔

کیا ہرج ہے اگر لگے ہاتھوں یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ ہندی میں اس کے لیے کون سے الفاظ استعمال

ے اس لفظ کے لغوی معنوں کی خصوصیات پر غور کیجیے تو دھات کو تپانا، اسے حشو و زوائد سے پاک کرنا، نکھارنا پھر ڈھالنا اور ایک خوش نما شکل دے دینا، ایسا عمل ہے جو اچھے اسٹائل میں اسی طرح لفظوں کے ساتھ بھی دہرایا جاتا ہے۔ اسی میں اسلوب کی نفاست، پختگی اور پائداری کا راز مضمر ہے۔

ہوتے ہیں۔ پہلے تو لفظ "ریتی" استعمال کیا جاتا تھا اور سنسکرت ادب میں اب بھی زیادہ تر، یہی لفظ اسلوب کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے لیکن مغربی اصول نقد و نظر کی اشاعت کے بعد ہندی میں "سبک" یا "طرز" کے لیے شیلی بولا جاتا ہے۔ یہ لفظ ہندی میں (اپنے موجودہ مفہوم کے لیے) زیادہ پرانا نہیں، اگرچہ اس کی اصل لفظ شیل ہے جو اصول، برتاؤ، ڈھنگ اور ڈھب کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ جیسے "پنچ شیل" میں ہے۔ شیلی کا مفہوم عین مین وہی ہے جو عربی میں اسلوب کا ہے۔

ان الفاظ کی تشریح و تعبیر میں اتنی لمبی تمہید سے مدعا یہ تھا کہ (Style) کے لیے ہندی، سنسکرت، عربی، فارسی، انگریزی وغیرہ میں جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں، وہ فی اصلہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کوئی اسلوب بغیر "تصنع" یا آورد کے نہیں بنتا۔

یہاں یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ اردو میں اس کے لیے ایک لفظ "انداز" بھی مستعمل ہے۔ میر تقی میر اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے یہ لفظ ان مخصوص معنوں میں استعمال کیا:

"۔۔۔ ششم انداز است کہ ما اختیار کردہ ایم و آں محیط ہمہ صنعتہاست تجنیس، ترصیع تشبیہ، صفائے گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادا بندی، خیال وغیرہ ایں ہا ہمہ در ضمن ہمیں است و فقیر ہم ازیں وتیرہ محظوظم ۔۔۔۔"[۱]

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کے شاعروں میں سب سے پہلے میر نے طرز کو اہمیت دی اور اور سختی سے کاربند رہا۔ بعد ازاں دوسروں نے تتبع کیا"[۲]

میر شاعر تھا اور اس نے طرز پر کاربندی غزل ہی میں کی لیکن (Style) کے لیے انداز کا لفظ میر نے بہت مناسب اور موزوں تجویز کیا۔ یہ لفظ اسلوب (شیلی)، یا طرز سے زیادہ انفرادیت کا غماز ہے۔

اب مختصراً یہ دیکھنا چاہیے کہ مختلف زبانوں اور زمانوں میں (Style) کی کیا تعریف کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ مشہور قول ڈاکٹر بوفان (Buffon) کا ہے جو اس نے ۱۷۵۳ء میں فرانچ اکادمی کے افتتاحی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

(Le style Est L'homme meme) یعنی "اسلوب خود انسان ہے"![۳] بوفان کا مطلب یہ تھا کہ مصنف

۱۔ میر: نکات الشعرا۔ ۱۸۰۔ طبع ثانی۔ ۲۔ اثر لکھنوی: چھان بین۔ ۳۷۔

۳۔ See: Encyclopaedia Britannica Volume. 21 Page. 488.

کی شخصیت اپنے تمام نشیب و فراز اور رنگ و آہنگ کے ساتھ الفاظ میں منتقل ہو جاتی ہے۔ ایمرسن نے یہی بات ذرا سی تبدیلی کے ساتھ کہی تھی اور ہمارا خیال ہے کہ وہ صحیح تشریح کرتا ہے[۱]
A man's style is his mind's voice. اسلوب کو "ذہنی آواز" کہنا یوں بھی زیادہ قرین حقیقت ہے کہ اس میں انفرادیت اور افتادِ ذہنی کا پرتو اسی کی سفارش کرتے ہیں۔ ایک خیال مشترک ہو سکتا ہے۔ اس کے اظہار کے الفاظ بھی وہی ہو سکتے ہیں، اگر فلابیر کا قول تسلیم کر لیا جائے کہ ایک فعل، ایک اسم اور ایک حرف ایک ہی مفہوم کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ لیکن یہ ذہنی اختلاف ہے جو طرزِ ادا میں علیحدگی پیدا کرتا ہے اور مصنف کی انفرادیت کو منعکس کر دیتا ہے۔ ملک الشعرا محمد تقی بہار نے یہی بات ان الفاظ میں کہی ہے:

"سبک در اصطلاح ادبیات عبارتست از روش خاص ادراک و بیان افکار بوسیلۂ ترکیب کلمات و انتخاب الفاظ و طرزِ تعبیر۔ سبک بیک اثر ادبی وجہ خاص خود را از لحاظ صورت و معنی القاء می کند و آں نیز بنوبۂ خویش وابستہ بطرزِ تفکر گوینده یا نویسنده دربارهٔ "حقیقت" می باشد"[۲]

لیکن یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ تھامس جیفرسن کا خیال تھا کہ بچپن میں جب انسان کا ذہن اثر پذیری کی زیادہ صلاحیتیں رکھتا ہے، ہر چیز کا نقش جلد قبول کر لیتا ہے، اور طبیعت میں بھی جولانی ہوتی ہے، اسی وقت سے اس کے طرز یا اسلوب کی نشو و نما شروع ہو جاتی ہے۔

ایمرسن کے مذکورہ بالا قول، اور جیفرسن کی رائے کو ذہن میں رکھیے، پھر غور کیجیے تو یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ اچھے اسلوب کے واسطے الفاظ پر حاکمانہ اقتدار، لکھنے پر پوری قدرت، اظہار میں کامل سہولت، در و بست کی صلاحیت اور انتخابی ملکہ ناگزیر ہے۔ تھامس گرے کی مشہور (Elegy) کا ایک مصرع:

The ploughman homeward plod's his weary way.

ایک جگہ اس طرح لکھا گیا تھا کہ یہی الفاظ، قواعد کی صحیح ترتیب کے ساتھ (۶) صورتوں میں آ سکتے ہیں لیکن

---

[۱] Journals V. X Page. 457. [۲] محمد تقی بہار ، سبک شناسی جلد اول مقدمہ د (طبع تہران)

صرف موجودہ صورت ایسی ہے جو نہ صرف مفہوم کو پورا پورا ادا کرتی ہے بلکہ جس ترتیب سے الفاظ رکھے گئے ہیں۔ شاعر کا مقصود بھی اسی ترتیب اور درجہ میں کلام کا زور پیدا کرنا ہے۔ مثلاً:

His weary way the ploughman homeward plods.

مگر اس میں زور (Weary way) پر آتا ہے، جو شاعر کا مقصود نہیں۔ وقس علیٰ ہذا۔

الفاظ کی ترتیب اور انتخاب کا سلیقہ یقیناً بنیادی اہمیت رکھتا ہے (Homer) نے کہا تھا کہ:

"Nor can one word be chang'd but for a worse." [1]

الفاظ کے انتخاب اور در و بست کا یہ کمال حافظ، سعدی، فردوسی، میر، اور انیس کے ہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ نثر میں غالب، آزاد (محمد حسین)، عبدالحق اور ابوالکلام کی تحریروں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ اعتراف کر لینا چاہیے کہ اردو کا کوئی نثر نگار، اردو کے شاعروں کی طرح الفاظ کے انتخاب کا اعلا معیار پیش نہیں کرتا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ نثر کی نسبت نظم میں فکر و تامل کے لیے زیادہ مہلت ملتی ہے۔

انتخابیت کے لیے علم اور تجربے کی ضرورت ہے۔ اسی لیے میں نے شروع میں اس بات پر زور دیا کہ کوئی اچھا اسٹائل بغیر صنعت یا آورد اور محنت کے نہیں بن سکتا۔ گویا وہ مصنف کے ذہن کی گونج بعد میں ہے۔ محنت اور مرصع کاری کا طالب پہلے۔ میرے اس خیال کی تائید ایڈورڈ گبن کی تشریح سے بھی ہوتی ہے [2]

اور سوئفٹ (Swift) کے نزدیک تو (Style) عبارت ہی انتخاب سے ہے۔ وہ اسلوب کی تعریف "Proper words in proper places" کرتا ہے [3]

الفاظ کے انتخاب میں سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ خیال کو مصور کر دیں۔ اگر ان کی صوتی کیفیت کا پورا خیال رکھا جائے تو عبارت میں زور، دل نشینی، اور اثر انگیزی پیدا کی جا سکتی ہے۔ مثلاً ظفر علی خاں کا یہ شعر، جس میں جنگل کے سنسان ہونے کا نقشہ ایسے مناسب لفظوں میں کھینچا گیا ہے کہ شاید اس سے بہتر پیرایہ ممکن نہ ہو۔

---

[1] Homer: Odyssey, Bk. VIII, l. 192.

[2] Gibbon: Miscellaneous Works, V.I P.145

[3] Swift: Definition of a Good Style.

ہُو کا عالم تھا وہاں، کرتا تھا جنگل بھائیں بھائیں!
سنسنی اٹھتی تھی، سن سن کر ہوا کی سائیں سائیں!!

اس میں "ہُو"، "بھائیں بھائیں"، "سنسنی"، "سن سن کر"، "سائیں سائیں" یہ سب الفاظ بھرپور صوتی کیفیت رکھتے ہیں۔ یا مثنوی سحرالبیان کا یہ شعر۔

چلی واں سے دامن اٹھاتی ہوئی
کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی

اور گلزارِ نسیم کا یہ مرقع؛

وہ ناچنے کیا کھڑی ہوئی تھی
خود راگنی آ کھڑی ہوئی تھی

اسی طرح فارسی کا یہ شعر۔

زنقارہ آواز آمد بروں
کہ دون است دون است گردونِ دوں

اسی طرح میر کے وہ اشعار جو "تصویریت" لیے ہوئے ہیں۔ یہ سب اچھے نمونے ہیں۔ الفاظ کی یہ اہمیت اتنی بات سمجھانے کے لیے ظاہر کی گئی کہ اچھے خیال کا حسن پوری طرح دوسرے کے ذہن میں منتقل کرنے کے واسطے اچھے الفاظ بہت ضروری ہیں۔ الگزنڈر پوپ کا یہ مشہور قول ایک بار لارڈ چیسٹر فیلڈ نے بھی اپنے خط میں (۲۴ نومبر ۱۷۴۹ء) لکھا تھا کہ؛

Expression is the dress of thought, and still Appears more decent as more suitable.۲

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر فلا بیر نے کہا کہ طرز و اسلوب، خیال کا لباس ہی نہیں۔ اس کی کھال ہے۔ یعنی اگر وہ نہیں تو نرا خیال "جذامی" معلوم ہوگا۔ اسٹائل کی اہمیت پر زور دینے

۱ء مزید تفصیل کے لیے: اثر لکھنوی، مقدمہ مراثی میر جلد اول اور شبلی نعمانی، شعرالعجم اور موازنہ انیس و دبیر۔

۲ء Pope: Essay on criticism pt. ii. 1. 118 (1712)

والوں میں الگزنڈر اسمتھ یہ کہنے سے بھی نہیں چوکتا کہ خیال سے زیادہ پائدار اور لازوال شے ادب میں اسلوب ہے۔"

لیکن اس تمام بحث کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ اسٹائل محض صنعت گری، ترصیع، محنت، انتخاب الفاظ یا بازی الفاظ کا ہے۔ JOUBERT کی یہ بات توجہ کی مستحق ہے کہ الفاظ کا صحیح استعمال، مناسب خیال کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے وہ کہتا ہے کہ "کوئی اچھا لفظ استعمال کرنے سے پہلے اس کی اچھی جگہ تلاش کرو۔"

بعض مخصوص الفاظ کسی مصنف کے ذہن کا آئینہ ہوتے ہیں۔[۱۵] یہ بھی دو طرح کے ہیں۔ یا تو وہ عام استعمال کے الفاظ ہوں گے، مگر ایک مصنف کی تحریر میں اتنے استعمال ہوں گے کہ اس کی مخصوص افتادِ ذہنی، طبعی رجحان اور زاویۂ فکر کا نشان بن جائیں گے یا بعض مصنفوں کے فن پاروں میں نئے اور غیر مانوس الفاظ ایسی خوبی اور خوب صورتی سے استعمال ہوں گے کہ نہ صرف اس کے اسٹائل کو دل پسند اور دل نشیں بنا دیں گے بلکہ اس کی انفرادیت کو زیادہ نمایاں کر دیتے ہیں۔ اردو میں اس کی مثال مہدی افادی، سجاد انصاری، عبدالحق اور ابوالکلام کی تحریروں سے دی جاسکتی ہے۔ مہدی اور سجاد الفاظ وضع کرنے کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔ ابوالکلام اکثر پرانے سکوں کو نیا صیقل دے کر چلاتے ہیں مگر عبدالحق سکۂ رائج الوقت کی قیمت کے شناسا ہیں۔ وہ نامانوس الفاظ سے اپنی تحریر میں وزن پیدا نہیں کرتے۔ اس لحاظ سے مہدی افادی کا اختراعی کارنامہ لائق تحسین ہے مگر نئے الفاظ کی وضع و تراش بہت نازک معاملہ ہے Ben Jonson نے کہا تھا کہ "نئے الفاظ وضع کرنا اور انھیں رواج دینا، بہت محنت اور کم فائدے کا کھیل ہے کیوں کہ اگر وہ نئے الفاظ قبول عام کی عزت پا گئے تو واضع کو اس کا کریڈٹ شاذونادر ہی ملتا ہے، لیکن اگر نامقبول ہوئے تو نفرت و حقارت بھی یقینی ہے۔"

مولوی عبدالحق کا تعلق، سرسید تحریک سے ہے اور وہ حالی کے سچے وارث و جانشین ہیں۔ اس لیے ان کے اسلوب نگارش کے محاسن اور عناصر ترکیبی سے بحث کرتے ہوئے ان کے پیشرو حضرات پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہوجاتا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں نشاۃ ثانیہ کا جو زبردست کام ہوا، اس کے

کرتا دھرتا سرسید احمد خاں مرحوم تھے۔ سرسید کے مقابلے میں، کوئی دوسری ہستی اتنی جامع حیثیات پیش نہیں کی جاسکتی۔ سرسید ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی اصلاحی کوششوں کا آغاز ۱۸۵۷ء سے، ہوتا ہے۔ جب انھوں نے "رسالہ اسباب بغاوت ہند" لکھا۔ یہ مسلمانوں کی وکالت میں پہلا قدم تھا جو مثبت انداز میں نہایت دوراندیشی اور عاقبت بینی کے ساتھ اٹھایا گیا۔ اس کے بعد ہی سرسید کا رابطہ عوام سے قائم ہوا اور انھیں سادہ، عام فہم اور سلیس عبارت لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسلوب وانداز میں سرسید کی نثر آرٹ کا نمونہ نہیں ہے لیکن وہ کلاسکی حیثیت رکھتی ہے اس نے قوم کا ذہن بنایا۔ اس میں وسعت اور گہرائی پیدا کی اور اس کے اثر سے بہت سے اعلا درجے کے نثرنگار اردو کو نصیب ہوئے۔ تعلیم اور سیاست کے میدان میں سرسید کی جتنی خدمات ہیں، ادب میں اس سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ ان کے اثرات بہت دیرپا ہیں۔[۱]

اس دور میں ہندوستان کے مسلمان کسی ایک فرد کے افکار سے اتنے متاثر نہیں ہوئے جتنا سرسید نے ان کے ذہنوں کو جھنجھوڑا۔ ان کی تحریک نے اردو کو حالی، شبلی، وقارالملک، محسن الملک، وحیدالدین سلیم نذیر احمد، ذکاءاللہ، چراغ علی، ظفر علی خاں، خوشی محمد ناظر، سید علی بلگرامی جیسے فاضل خطیب، ادیب، مقرر اور انشا پرداز، شاعر اور مفکر دیے۔ مولوی عبدالحق اس سلسلۂ طلائے ناب کی آخری کڑی ہیں۔

"... سرسید اپنے دور کے منفرد شخص ہیں ... ان کی زندگی کے (۵۴) برس میں بلکہ پوری انیسویں صدی میں کوئی دوسرا مصنف ایسا نہیں ہے جس نے تعداد میں اتنی زیادہ، مضامین میں اتنی مختلف، ضخامت میں اتنی گراں، خوبیوں میں اتنی اعلیٰ، فوائد میں اتنی کثیر، اثر میں اتنی وسیع تصنیف کی ہوں۔ یہ تمام محاسن وفضائل کسی ایک مصنف میں جمع نہیں ہیں۔"[۲]

سرسید اسکول نے جن لوگوں کو پیدا کیا ان میں اسلوب نگارش کی انفرادیت کے لحاظ سے اول نمبر پر شبلی نعمانی کا نام آتا ہے۔ دوسرے نذیر احمد ہیں، پھر الطاف حسین حالی۔ بقول حامد حسن قادری علامہ شبلی اپنے زمانے کے پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلوب تحریر کی اہمیت کو سمجھا[۳]

---

[۱] تفصیلی مطالعے کے لیے Syed Abdullah: Spirit and Substance of Urdu prose under the Influence of Sir Syed Ahmad Khan. (1940)

[۲] حامد حسن قادری: داستان تاریخ اردو (۳۱۳)

[۳] ایضا (۶۳۰)

شبلی کا اسلوب کیا ہے ، نثر میں شاعری ہے ۔ کہیں مبالغے سے کام لیتے ہیں ۔ کبھی نازک تشبیہیں اور لطیف استعارے لاتے ہیں ، کہیں خطابت کا جوش اور بیان کا سحر دکھاتے ہیں ۔ الفاظ کے در و بست اور ان کی نشست سے جتنا شبلی واقف ہیں ان کے عہد میں کوئی نہیں ۔ پھر یہ کہ انھوں نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں ۔ الکلام ، المامون ، الفاروق ، شعر العجم ، موازنہ ، مقالات ، سیرت النبی ۔ ان سب کے موضوعات مختلف ہیں تو اسلوب بیان بھی جدا ہے[1] ۔ کہیں نرے جذباتی ہیں کہیں پورے منطقی ۔ کبھی دل میں چٹکی لیتے ہیں ، کبھی ذہن کو جھنجھوڑ دیتے رہیں ۔ حالی کے اثر نے مولوی عبدالحق کو پیدا کیا اور شبلی کے اسلوب میں ہمیں ابو الکلام کے طرز کا نقش اولیں ملتا ہے ۔

حالی اپنی زندگی میں جتنے متین ، مہذب ، سنجیدہ اور متعلیق تھے ، اتنی ہی ان کی تحریریں سادہ ، صاف ، شائستہ و دلآویز ہیں ۔ ان کا نمایاں وصف ، سادگی ، متانت اور اثر انگیزی ہے ۔ حامد حسن قادری نے لکھا ہے :

انھوں نے غور و فکر کے ساتھ اردو زبان و ادب کا جائزہ لے کر اس کی خامیوں کو دیکھ کر ، ضرورتوں کو سمجھ کر ، دوسری زبانوں سے مقابلہ کر کے ، جدید موضوعات کی کتابیں لکھ دیں لیکن اپنی تحریر و اسلوب کے لیے کوئی روش خاص پیدا نہ کر سکے ۔ صاحب طرز بننے کے معنی ہیں تقلید چھوڑ کر موجد بننا ۔ موجودہ روش سے بغاوت کرنا اور اپنی راہ الگ نکالنا ۔ یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کسی ادیب و مصنف کے اندر فطری اُپج ہو . . . . اور اسی صفت کے نہ ہونے سے مولوی ذکاء اللہ اور مولانا حالی "صاحب طرز" نہیں ہیں[2] ۔"

نثر کی حد تک نہ سہی لیکن ادبی روایات کا طلسمی حصار توڑنے میں حالی نے فکری جہاد بھی کیا اور اپنا الگ راستہ بھی نکالا ۔ سرسید کی طرح ان کے پیش نظر بھی یہ نہیں تھا کہ کس طرح کہا جائے بلکہ "وہ کیا کہا جائے" پر نظر رکھتے تھے ۔ شاعری کے بارے میں ان کے خیالات نے نئی نسلوں کو بہت متاثر کیا اور آج ادب جدید کا نقشہ حالی کی فکر ہی سے استوار ہوا ہے ۔ اسی طرح نثر میں انھوں نے سادہ و سہل نثر کو رواج دیا ۔ حالی نے جس عہد میں آنکھ کھولی تھی ، وہ تصنع ، تکلف ، بناوٹ اور سجاوٹ کا زمانہ تھا ۔ اس لیے حالی کی نثر کے

---

[1] شبلی کے اسلوب پر تفصیلی مطالعے کے لیے ، سید عبداللہ بحث و نظر (۱۲۳) و بعد نیز خورشید الاسلام : تنقیدیں (۳۴) و بعد ۔ [2] داستان تاریخ اردو (۵۵۰)

دیرپا اور دوررس اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مولوی عبدالحق، حالی کے سچے جانشیں ہیں۔ وہ بے شبہ ایک "صاحب طرز" انشا پرداز ہیں۔ ان کی تحریر میں حالی کی حلاوت اور سادگی متانت اور وقار، شبلی کی رنگینی اور دانشی، مہدی کی لطافت و نظافت، نذیر احمد کی محاورہ بندی، رشید احمد صدیقی کی رعایت لفظی اور صوتی توافق کا لحاظ، عبدالماجد دریا بادی کے طنز اور فرحت اللہ بیگ کے مزاج کا نہایت دل نشین اور خوش گوار مرکب ملتا ہے۔ وہ اس طرح لکھتے ہیں کہ اسٹائل کے سامنے موضوع کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ صحیح، صاف، سادہ، دل نشین اور سنجیدہ نثر لکھنے کی جو روش عبدالحق نے ایجاد کی ہے۔ اسے اردو کی معیاری نثر کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اردو کو ایسا لب و لہجہ دیا ہے جو ذاتی خطوط، تقریر، خطبات، علمی مضامین، تنقید و تحقیق اور تاریخ و سیرت نگاری سب اصناف نثر کے مزاج سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ عبدالحق کی شگفتگی، ان کے خطوں میں اپنے شباب پر ہوتی ہے اگر ان کے بے تکلف خطوط کا ایک عمدہ انتخاب شایع کیا جائے تو وہ غالب، مہدی افادی اور محمد علی ردولوی کے خطوط کا نہایت نفیس مرکب ہوگا۔ ان کا اسٹائل اظہار و ابلاغ کے لیے بہت موثر ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، بھرپور لفظوں میں بے تکلف کہہ دیتے ہیں اور یہی اسٹائل کا مقصد و منتہی ہے۔

میں نے اس مضمون کے آغاز میں اسلوب کے لغوی معنوی سے بحث کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ اس میں مرصع سازی، محنت اور صناعی کا مفہوم شامل رہا ہے لیکن یہ بات کم سے کم اردو کی حد تک صرف کلاسکی سرمائے کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ دور حاضر میں انگریزی ادبیات کے مفکروں نے اسٹائل کے تصور اور عناصر ترکیبی پر جو کچھ لکھا ہے، وہ قدیم تصورات سے قدرے مختلف ہے۔ جدید نقادوں میں (F. L. Lucas) نے اسٹائل کے موضوع پر بہت اچھی کتاب لکھی ہے۔ اس میں وہ تمام عناصر کا تجزیہ و تحلیل کرنے کے بعد بتاتا ہے کہ اچھے اسلوب کی بنیادی خصوصیات یہ ہیں۔ سلاست (Clarity) بلاغت (Brevity) متانت (Urbanity) اور سادگی (Simplicity)

مگر اس کے ساتھ ہی لوکس (Lucas) نے لب و لہجے کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا۔ شخصیت یا انانیت کا پرتو دراصل لہجے ہی میں محسوس بھی ہوتا ہے۔ سادہ نثر میں اتنا واضح لہجہ پیدا ہونا بہت مشکل ہے جتنا ہمیں ابوالکلام کی تحریروں میں ملتا ہے۔ لیکن مولوی عبدالحق کے اسلوب کی یہی خوبی ہے کہ

اس کا منفرد لب و لہجہ ہے۔ ان کے خطبات، مقدمات، مضامین اور خاکوں میں یہ لہجہ، موج تہہ نشین کی طرح سرایت کرتا رہتا ہے۔ اس میں خطیبانہ جوش یا واعظانہ "سرپرستی" نہیں بلکہ ایسا پرسوز انداز ہے جیسے کوئی صاحب دل "نجد و یاران نجد" کی حکایت کہہ کر درود یوار کو وجد میں لا رہا ہے۔

ان کے علاوہ بھی عبدالحق کی نثر کے کچھ بنیادی اوصاف ہیں جو ان کی تحریر میں اس طرح رچے ہوئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے متاثر کرنا بہت مشکل ہے:

مشکل حکایتے است کہ ہر ذرہ عین اوست

امانمی تواں کہ اشارت با و کنند

وہ ابوالکلام یا شبلی کی طرح "انتخاب الفاظ" پر زیادہ زور نہیں دیتے، جس سے تحریر میں حسن تو پیدا ہو جاتا ہے۔ گفتگو میں جاذبیت بھی آسکتی ہے مگر بسا اوقات اثر انگیزی میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور سامع پر براہ راست اثر نہیں ہوتا لیکن انتخاب الفاظ کی بات بھی ایک درجے میں آکر اضافی و اعتباری ہی ہو جاتی ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ کسی زبان میں کوئی دو لفظ مترادف نہیں ہوتے، تو اس کا مقصد یہی ہے کہ ان میں کوئی نہ کوئی لطیف فرق ضرور ہوتا ہے۔ انس، محبت، عشق، جنوں، الفت، شیفتگی، وارفتگی، یہ سب ایک ہی جذبے کے مختلف مدارج کو ظاہر کرتے ہیں اور ان سب میں بہت ہی نازک فرق ہے جسے محل استعمال میں صرف وجدان ہی محسوس کر سکتا ہے۔

دراصل خیال ایک مجرد (Abstract) شے ہے۔ الفاظ کے قالب میں ڈھل کر ہی وہ دوسروں تک پہنچ سکتا ہے۔ فنون لطیفہ کی ایجاد، اس بات کی شاہد ہے کہ انسان کبھی اپنے خیالات اور محسوسات و مدرکات کی تبلیغ کماحقہ نہیں کر سکا۔ رقص و سرود، موسیقی، نقاشی، مصوری تمثیلیں اور شاعری یہ سب اظہار و تبلیغ احساس ہی کے ذرائع ہیں۔ رقص میں حرکات و سکنات کے ذریعے جذبے کا اظہار ہوتا ہے۔ موسیقی میں ہوا کی لہروں کو چھیڑ کر وجدان کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ نقاشی میں بھی کام بے جان نقوش سے لیا جاتا ہے۔ مصوری میں موقلم اور رنگ مل کر جذبے کی تصویر بناتے ہیں۔ شاعری، ان سب کا لطیف مرکب ہے۔ اس میں موسیقی، حرکت رقص، مصوری اور نقاشی سب فنون کا امتزاج ہوتا ہے۔ اچھا شعر بھی وہی ہے جس میں یہ سارے اوصاف موجود ہوں اور جذبہ پوری طرح الفاظ میں ڈھل گیا ہو۔ بعض شعر ایسے ہوتے ہیں جن کا خیال نہ رقص میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ نہ موسیقی سے ادا ہو سکتا ہے۔ نہ مصور کا موقلم اس میں رنگ بھر سکتا ہے۔

مثلاً میر کا یہ شعر دیکھیے :

پتا پتا، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

سوائے شعر کے، فنون لطیفہ کی اور کون سی صنف اس خیال کی متحمل ہو سکتی تھی ؟ جوش ملیح آبادی کی ایک نظم کا تھیم (Theme) یہ ہے کہ شاعر کے ذہن میں افکار کی جو اصلی (Original) شکل اور لطیف نوعیت ہوتی ہے وہ شعر کی صورت میں ڈھلتے ڈھلتے اور لفظ و عبارت کے قالب میں آتے آتے بالکل ہی مسخ ہو جاتی ہے۔ وجدانی لطافت اور نزہت لفظوں کے کھردرے پیکر میں سما ہی نہیں سکتی۔ جوش نے اظہار واقعہ میں تھوڑا سا شاعرانہ مبالغہ بھی کیا ہو تو بھی اس میں شک نہیں کہ ہزاروں لکھنے والوں میں سے کسی ایک ہی کو یہ منصب ملتا ہے کہ وہ اپنے احساس کو دوسروں تک پہنچا سکے اور اپنے افکار کو الفاظ کے قالب میں جوں کا توں منتقل کر دے ورنہ عموماً یہی احساس باقی رہ جاتا ہے کہ :

زباں ز نطق فرو ماند و راز من باقیست
بضاعت سخن آخر شد و سخن باقیست

اسی لیے الفاظ کے انتخاب کا معاملہ کسی ضابطے یا اصول کا پابند نہیں۔ اگر لکھنے والے کا خیال پختگی کی منزل تک آگیا ہے تو وہ جزءً ظاہر ہو کر بھی گہرا تاثر چھوڑ سکتا ہے۔ لیکن اگر ذہن ناپختہ تھا، خیال خود ہی مبہم و موہوم تھا یا اس کی لطافت میں کثافت کی ناپختگی باقی رہ گئی تھی تو وہ بار بار اور طرح طرح سے ظاہر کرنے پر بھی تاثر کی گرمی اور تاثیر کے گداز سے محروم رہتا ہے۔

شاعری میں فن اور قواعد کی قیود کے ساتھ کچھ سہولتیں بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ شاعر اپنے خیال کو بلاواسطہ (Direct) ظاہر کرنے کا پابند نہیں۔ اگر وہ رمز و ایما کے پردے ہی میں کہے یا بالواسطہ (Indirect) اظہار کا طریقہ اختیار کرے تو یہ اکثر پسندیدہ ہوتا ہے۔ لیکن نثر نگار جتنی وضاحت سے اور بلاواسطہ اپنی بات دوسروں تک پہنچا سکے اتنا ہی وہ قابلِ ستایش ہے۔ مولوی عبدالحق کی تحریریں پڑھ کر ہمیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تحسین کلام کے لیے، یا عبارت کو دلچسپ بنانے کے لیے کبھی اِدھر اُدھر نہیں دیکھتے۔ نہ وہ اپنی نثر میں غیر ضروری تشبیہات استعمال کریں گے نہ استعارے سے کام لیں گے۔ نہ عربی فارسی کی بھاری بھرکم ترکیبوں سے اسے سجائیں گے۔ ابوالکلام کی طرح وہ الفاظ کے جوڑے بھی نہیں لاتے، نہ محمد حسین آزاد کی طرح مجرد (Abstract) تصورات کو

متحرک کرتے ہیں۔ فرحت اللہ بیگ جیسا مبالغہ بھی نہیں کرتے۔ نہ استفہام انکاری و اقراری سے نثر میں خطیبانہ آہنگ پیدا کرتے ہیں۔ انھیں اپنے قلم پر اعتماد ہے، اپنے خیال پر اعتماد ہے، اور جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اسے بے تکلف ادا کر دیتے ہیں۔ ان کی نثر کا یہ حال بھی نہیں کہ مبتدا کہیں ہے خبر کہیں۔ اس میں عموماً تعقید، ابہام یا لف و نشر بھی نہیں ہوتا۔ اس کی مثال میں ابوالکلام کی یہ عبارت دیکھیے :

"وہ ذلت کا زخم نہ تھا، بلکہ نامرادی کا زخم لگانے والا ہاتھ تھا۔ وہ مظلومی کی تڑپ نہ تھی بلکہ ظلم کو تڑپانے والی شمشیر تھی۔ وہ مسکینی کی بے قراری نہ تھی بلکہ دنیا کو بے قرار کرنے والوں نے اس سے بے قراری پائی۔ وہ درد و کرب کی کروٹ نہ تھی بلکہ درد و کرب میں مبتلا کرنے والوں کو اس سے بے چینی کا بستر ملا۔ وہ جو کچھ لایا، اس میں غم گیتی کی چیخ نہ تھی، ناتوانی کی بے بسی نہ تھی، اور حسرت و مایوسی کا آنسو نہ تھا، بلکہ یکسر شادمانی کا غلغلہ تھا جشن و مراد کی بشارت تھی، کامیابی و عیش فرمائی کی بہار تھی، طاقت اور فرماں روائی کا اقبال تھا۔ امید اور یقین کا خندۂ عیش تھا، زندگی اور فیروزمندی کا پیکر و تمثال تھا۔ فتح مندی کی ہمیشگی تھی، اور نصرت و کامرانی کی دائمی"[ل]

اتنی طویل عبارت میں جو تقریباً (۱۲۵) لفظوں پر مشتمل ہے، ایک ہی بات بار بار کہی گئی ہے اور اسے اتنی بار دہرایا گیا ہے کہ ذہن میں اچھی طرح مرتسم ہو جائے۔ اس کے برعکس مولوی عبدالحق کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیے :

"وہ حساب کے کھرے، بات کے کھرے اور دل کے کھرے تھے۔ وہ مہر و وفا کے پتلے اور زندہ دلی کی تصویر تھے۔ ایسے نیک نفس، ہمدرد، مرنج و مرنجان اور وضع دار لوگ کہاں ہوتے ہیں۔ ان کے بڑھاپے پر جوانوں کو رشک آتا تھا اور ان کی مستعدی کو دیکھ کر دل میں امنگ پیدا ہوتی تھی۔ ان کی زندگی بے لوث تھی اور ان کی زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا۔ مجھے وہ اکثر یاد آتے ہیں اور یہی حال ان کے دوسرے جاننے والوں اور دوستوں کا ہے اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ کیسا اچھا آدمی تھا۔ قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے نور خاں ہوتے۔"[کہ]

ان دونوں عبارتوں میں "اسٹائل" موجود ہے مگر فرق یہ ہے کہ پہلی عبارت میں الفاظ زیادہ ہیں، مضمون کم ہے اور دوسری میں مفہوم زیادہ، الفاظ کم ہیں۔ پہلی عبارت خوب صورت ہے مگر دوسری سائنٹفک

لہ ہفتہ وار پیغام کلکتہ جلد (۱) شمارہ (۸) ۱۹۲۱ء   کہ چند ہم عصر (۱۱۵)

ہے۔ عبدالحق کی نثر میں یہی حسن ہے کہ وہ سائنٹیفک ہوتی ہے۔ وہ کبھی دور از کار، پادر ہوا اور مغلق بات نہیں کہتے، نہ حشو و زوائد سے "پچی کاری" کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم نے محمد حسین آزاد کے طرز نگارش کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا:

"توصیفی اور تشبیہی ترکیبوں سے جو حشو کے طور پر جملوں میں اضافہ کردی جاتی ہیں، ادنیٰ سا فقرہ، حسن و لطافت کی تصویر بن جاتا ہے۔ اس کتاب کے دیباچے کا ابتدائی فقرہ ہے: "آزاد ہندی نہاد کے بزرگ، فارسی کو اپنی تیغ زبان کا جوہر جانتے تھے۔" اس فقرے کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی نہاد ترکیب صفتی ہے۔ زبان کو تیغ کے ساتھ تشبیہ دے کر اس کا لازمہ جوہر لایا گیا۔ ان زواید کو نکال دینے سے اصل جملہ یہ رہ جاتا ہے "آزاد کے بزرگ فارسی کو اپنی زبان جانتے تھے۔" اس حالت میں یہ جملہ بالکل روکھا پھیکا معلوم ہوتا ہے مگر صرف چند زوائد کے لانے سے جنھیں نفس مضمون سے کوئی تعلق نہیں، سارا جملہ چمک اٹھتا ہے۔"[1]

جملہ چاہے چمک اٹھے اور یہ اسلوب لاکھ محاسن رکھتا ہو لیکن اسے Oliver Wendell Holmes کے الفاظ میں "دلیل سوز" کہنا چاہیے۔ اس نے صحیح کہا ہے کہ Eloquence may setfire to reason. اس لیے یہ انداز نگارش تحقیقی و تاریخی کتابوں کے لیے موزوں نہیں ہے اور قدم قدم پر گمراہ کرتا ہے۔ شبلی کی رنگینی بیاں کا منکر کون ہو سکتا ہے مگر یہی محمود شیرانی جو محمد حسین آزاد کے اسلوب کو "اپنے انداز کے آپ ہی موجد اور آپ ہی خاتم" بتاتے ہیں، شبلی کی شعرالعجم میں ہزاروں تاریخی غلطیاں شمار کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ان میں بیشتر غلطیاں وہ ہیں جو زور بیان اور فصاحت نے کرائی ہیں۔ پھر محمد حسین آزاد بھی ایک خیالی دنیا کے باشندے ہیں۔ ان کا اسٹائل اردو میں بے عدیل و نظیر سہی مگر تاریخ و تحقیق کا دشمن ہے۔ چناں چہ "دربار اکبری"، "سخن دان پارس"، "نگارستان سخن"، اور "آب حیات" میں ان سے ہر قدم پر عبرت ناک غلطیاں ہوتی ہیں۔ کچھ انھوں نے زیب داستاں کے لیے اضافے بھی کر دیے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی نثر چوں کہ سائنٹفک ہے اور حشو و زوائد سے معرّیٰ ہے۔ اس لیے وہ تنقید و تحقیق اور تاریخ یا علمی مضامین کے لیے نہایت مناسب واقع ہوئی ہے۔ تحقیق میں غلطی عبدالحق سے بھی ہو سکتی ہے

---

[1] اورینٹل کالج میگزین لاہور جلد ۱۷، شمارہ (۴)، اگست ۱۹۴۱ء، صفحہ (۴۹۔ ۵۰)

اور ہوئی ہے، لیکن اس کی ذمہ داری، ان کی سحر طرازی یا طلاقت لسانی پر عائد نہیں ہوتی۔

الفاظ بھی من جملہ اسرار کائنات ہیں۔ لفظ اپنی جگہ کوئی چیز نہیں۔ ایک مہمل آواز او بے معنی صوتی حرکت یا ارتعاش اور بے جان و غیر مرئی سی شے ہے۔ ایک لفظ کا وہی مطلب ہے جو ہم نے ٹھہرالیا ہے یعنی وہی ہیوم (Hume) والا فلسفہ اشیا ہے کہ سلسلہ کائنات ہمارے خیال پر قائم ہے ہمارا خیال کائنات سے نہیں۔ الفاظ تابع ہیں خیال کے، اور خیال آزاد ہے۔ وہ کسی قید میں نہیں سما سکتا۔ فن تحریر کی ایجاد نے یہ سہولت پیدا کی تھی کہ ہم دور بیٹھ کر بھی اپنی بات دوسروں تک پہنچا سکیں یا اپنے خیال کو محفوظ کر سکیں۔ ابتدا میں یہ کام نقوش و تصاویر سے لیا گیا اور رفتہ رفتہ حروف تہجی وجود پذیر ہوئے۔ پھر ان سے الفاظ بنتے گئے۔ اس طرح ہم نے اپنے خیالات کو اشاروں میں ظاہر کرنے اور دوسروں تک پہنچا دینے کا ایک وسیلہ ایجاد کر لیا۔ اسی لیے الفاظ صرف خیال کا "آلہ" ہیں، خیال ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چند انسان ایک ہی خیال کو مختلف لفظوں میں ادا کرتے ہیں۔ مثلاً ایک جملہ لیجیے کہ "آسمان پر تارے چمک رہے ہیں"۔ یہ ایک خیال ہے جو الفاظ میں ظاہر کیا گیا۔ ہندی، سنسکرت انگریزی، لاطینی، فرانسیسی، اطالوی، ایرانی، سریانی، عربی، فارسی، ہر زبان میں مختلف الفاظ یہ خیال ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوں گے۔ ان کے لب و لہجے میں، آواز کے زیر و بم میں، قواعد کی ترتیب میں بھی فرق ہوگا۔ لیکن "خیال" جو اصل شے ہے۔ ہر جگہ مشترک ملے گا۔ الفاظ بدل جائیں گے یہ نہیں کہ ہمارا یہ اردو کا جملہ ہر ملک اور ہر زبان والے کی سمجھ میں آجائے۔ وہ جب اس خیال کو ادا کرے گا تو اپنے الفاظ استعمال کرے گا۔ اسی معمولی سی مثال سے واضح ہو گیا کہ خیال، الفاظ کا تابع نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ایک خیال، ایک مخصوص لفظ کا تابع ہوتا اور زبانوں کا اختلاف اس میں حائل نہ ہو جاتا۔

پھر دوسری دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ الفاظ انسان کی شخصیت اور سیرت، ذہن اور مزاج کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ کسی خیال کی گہرائی میں اتر جائیے اور کہنے والے نے جن لفظوں میں اس بات کو ادا کیا ہے، اس کا تجزیہ و تحلیل، جزئیات کی حد تک کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس شخص کی افتاد ذہنی کیا ہے اور کیسی "شخصیت" کا انسان ہے[1]۔ اس مطالعے کے بعد ہی اندازہ ہوگا کہ بوفان نے کتنی سچی بات کہی تھی

---

[1] تفصیل کے لیے: Lucas: Style, London 1936.

جب یہ کہا تھا کہ "اسلوب خود انسان ہے۔"

دو باتیں اور ہمارے سامنے آتی ہیں۔ جب ہم کسی بات یا کسی خیال کو دوسروں تک منتقل کرنا چاہتے ہیں اور زور ہمیں خیال پہ دینا ہوتا ہے تو نئے نئے اسالیب تراشتے ہیں۔ کہیں ابہام، کہیں تشریح، کبھی تکرار، کبھی اطناب، کہیں ایجاز، کہیں تشبیہہ و استعارہ۔ مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ ہمیں کہنا ہے، وہ سننے والے یا پڑھنے والے تک پہنچ جائے۔ کبھی "خیال" پر زور نہیں دیتے اور صرف لفظی پینترے (Play of words) مدنظر ہوتے ہیں تو نئی نئی صنعتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ پُرتکلف عبارتیں اسی لیے وجود میں آئی ہیں کہ لکھنے والا خیال سے زیادہ الفاظ کی اہمیت سمجھتا تھا۔

قرآن نے اپنے احکام کی تبلیغ کے لیے طرح طرح کے پیرائے اختیار کیے ہیں۔ کہیں تمثیل ہے، کہیں تشبیہ، کہیں حکایت، کہیں تفصیل و تشریح، کبھی تاکید، کبھی اختصار و ایجاز۔ ان سب کا مقصد یہی ہے کہ اصل مدعا واضح ہو جائے۔ چناں چہ کہا گیا کہ: "ان اللہ لا یستحی ان یضرب علیکم المثل ما بعوضۃ من عند اللہ وما فوقھا"۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس سے بھی نہیں شرماتا کہ تم پر مچھر کی مثال دے یا اس سے بھی حقیر و کمتر کسی چیز کو تمثیل میں پیش کرے۔

اگرچہ اچھے اسلوب کی تشکیل میں بہت سے عناصر کار فرما ہوتے ہیں اور ان میں سے کسی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن عہد جدید کے نظریات، اساتذۂ قدیم سے بنیادی طور پر مختلف واقع ہوئے ہیں۔ آج کے نقاد الفاظ پر خیال کو ترجیح دیتے ہیں اور اسی اسٹائل کو سائنٹفک تسلیم کرتے ہیں جو اظہار خیالات کے لیے آسان، سبک، سادہ اور مختصر ہو۔ ذیل میں ہم اسلوب کا ایک خاکہ پیش کرتے ہیں جس سے اس کے مختلف عناصر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

اسلوب

خیال (۱)
اختصار — سلاست (قوت ابلاغ) — صفائی — سادگی

الفاظ (۲)
خطابت — زور بیان — موسیقیت

کنایہ — استعارہ — تشبیہ و تمثیل — مبالغہ

ترصیع — ترکیب — الفاظ کے جوڑے — استفہام انکاری — استفہام اقراری — لف و نشر

پختگی — پرکاری — عکاسی — خوش آہنگی — آہنگ و صوت — ہم مخرج حروف
سنجیدگی — اعتماد — لطیف مزاح — انتخابیت — شعریت
انانیت — شگفتگی

مولوی عبدالحق کا اسٹائل جدید نظریہ اسالیب سے زیادہ قریب واقع ہوا ہے۔

وہ اپنی نثر میں نذیر احمد کی طرح جا و بے جا محاورہ نہیں ٹھونستے لیکن آسان اور سادہ ہندی الفاظ بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ ان کی کتاب "چند ہم عصر" سے بعض عبارتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں ان میں خط کشیدہ الفاظ خصوصیت سے قابل توجہ ہیں جنھوں نے ان کی نثر کو موثر اور شگفتہ بنانے میں حصہ لیا ہے۔

(۱) "منشی صاحب، سلطان عالم حضرت واجد علی شاہ کے دربار میں بھی باریاب ہوئے۔ اس باریابی کی وجہ غالباً ان کی دو کتابیں ارشاد السلطان اور ہدیۃ السلطان ہوئیں۔ یہ دو کتابیں آج کل کہیں نہیں ملتیں اور نہ یہ پتا ملتا ہے کہ ان میں لکھا گیا ہے۔ غالباً یہ بادشاہ کی کتابوں کی شرحیں ہیں۔ واجد علی شاہ کی یہ عجیب عادت تھی کہ وہ اپنے کتب خانے میں گئے اور ادھر ادھر سے چند کتابیں اٹھالیں اور کتاب کہیں سے بھی کھول کر چند ورق نقل کر لیے۔ اسی طرح جو کتاب سامنے آئی۔ اس میں سے کچھ حصہ نقل کر لیا۔ وہ اس بات کا مطلق لحاظ نہیں کرتے تھے کہ یہ کتابیں کس مضمون کی ہیں یا میں نے مختلف مضامین اور علوم کی کتابوں کے اقتباس بے ٹھکانے جمع کر دیے ہیں۔ غرض بادشاہ کی کتابیں اسی طرح تصنیف ہوتی تھیں اور وہ خود نیز ان کے درباری ان کتابوں کو اعلا تصانیف میں سے خیال کرتے تھے۔ ایسی انمل بے جوڑ کتابوں کی شرح لکھنا اور ان میں ربط و سلسلہ قائم کرنا، منشی صاحب مرحوم ہی کا کام تھا۔"[۱]

(۲) "اس کا علم اس قدر وسیع تھا کہ گویا وہ زندہ انسائی کلو پیڈیا تھا اور اس لیے اس کی باتیں اور گپ شپ نہایت دل چسپ اور کسی فن کی بحث اس کے سامنے پیش کیجیے، وہ کوئی نہ کوئی نئی بات ضرور سجھا دیتا تھا، اور اس کی ظرافت بھی عجیب شان کی ظرافت تھی۔ اس کے ایک ٹھٹول میں وہ وہ مضمون و نکات ہوتے تھے جو عمر بھر کے مطالعے اور کتابوں کے کھنگالنے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔"

اس کے علاوہ ان کی تحریروں میں اکثر روزمرہ کے الفاظ بڑا حسن پیدا کر دیتے ہیں مثلاً، "اس کے ڈھے جانے کا اتنا رنج نہ ہوگا جتنا ایک کھنڈر کے گر جانے کا۔ وہ اپنے بھاویں رعایا کے حق میں اسے عین انصاف اور نیکی سمجھتے تھے۔" رائے قائم کرنے کے بعد پھر اس سے نہ ٹلتے تھے گویا وہ رائے، پتھر کی لکیر ہوتی تھی۔"

---

[۱] چند ہم عصر، صفحہ ۲

"مولوی صاحب مرحوم پھر چپ سادھ گئے"۔ "مگر مولوی صاحب مرحوم ٹس سے مس نہ ہوئے"۔ "جب دیکھا کہ یہاں دال گلتی نظر نہیں آتی"۔ "اس کے نیچے ایک تہ خانہ بنا ہوا ہے جس میں کاٹھ کباڑ اور ڈیرے خیمے پڑے رہتے تھے"۔ "تحقیق و تفتیش کی چیٹک تھی۔ وہ جس مضمون کا خیال کرتے، اس کی تہ تک پہنچتے اور مالہ وماعلیہ کے سراغ میں پتے پتے اور ڈالی ڈالی پھرتے اور پتال تک کی خبر لاتے"۔

میں سمجھتا ہوں، یہ چند مثالیں اور اتنی وضاحت، مولوی عبدالحق کے اسلوب نگارش کی بنیادی خوبیوں کو سمجھنے کے لیے کافی ہوگی۔ میں نے مثالوں کا انبار لگانے کے مقابلے میں یہ ضروری سمجھا کہ اسٹائل کے محاسن اور عناصر ترکیبی سے بحث کروں اور چند ایسی بنیادی باتیں کہ سکوں جن کی روشنی میں بابائے اردو کے اسلوب کا واضح خاکہ ان کی تحریریں پڑھنے والے کے ذہن میں بن جائے۔

خلیق انجم

مولوی عبدالحق بحیثیت خاکہ نگار

اردو میں خاکہ نگاری کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے۔ سب سے پہلی تحریر جسے ہم "خاکہ"، "اسکیچ" (Sketch) یا "پین پورٹریٹ" (Pen portrait) کہہ سکتے ہیں مرزا فرحت اللہ بیگ کا مضمون "نذیر احمد کی کہانی" ہے۔ فرحت اللہ بیگ سے پہلے بعض تحریریں ایسی ضرور مل جاتی ہیں جن پر "خاکہ" کا گمان ہوتا ہے مثلاً اردو شعرا کے تذکرہ نگاروں نے بعض شاعروں کے متعلق کچھ ایسی معلومات فراہم کی ہیں کہ اگر ان تحریروں میں "خاکہ" کی تمام شرائط پوری کی جائیں تو یقیناً یہ بڑے کامیاب خاکے ہوتے۔ ان تذکروں میں قدرت اللہ قاسم کا "مجموعہ نغز" سعادت خاں ناصر کا "تذکرۂ خوش معرکہ زیبا" اور آزاد کی "آب حیات" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ قاسم اور ناصر نے شاعروں سے متعلق وہ تمام معلومات دی ہیں جن کا انھیں علم ہے۔ لیکن وہ اتنی تشنہ ہیں کہ شاعر کی پوری شخصیت ہمارے سامنے نہیں آتی۔ محمد حسین آزاد پہلے تذکرہ نگار ہیں، جنھوں نے شاعر کا حلیہ، عادات واطوار، عقائد ونظریات اور اس کی خوبیوں اور خرابیوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ہمارے سامنے اس کی پوری شخصیت آجاتی ہے۔ لیکن عام طور پر بعض شخصیتوں کو دلچسپ بنانے کے لیے اپنی انشا پردازی کے زور میں انھوں نے واقعات اور لطیفوں کا اختراع کیا ہے۔ بعض لوگوں پر طنز وتعریض بھی کی ہے۔ اور بعض قابل عزت شخصیتوں پر فنکارانہ طریقے سے ستم ظریفیاں بھی کی ہیں۔ چوں کہ مصنف کی "غیر جانبداری" اور "صداقت وحق گوئی" خاکے کی بنیادی شرط ہے۔ اس لیے اردو کا پہلا خاکہ نگار ہونے کا شرف، آزاد کو حاصل نہ ہو سکا۔ "خاکہ" کیمرے کی ایک تصویر کی طرح غیر جانب دار ہوتا ہے۔ اگر مصنف کسی کی بے وجہ تعریف کرتا ہے اور قابل ذکر خامیوں کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے تو یہ "مدح سرائی" ہے جسے انگریزی میں (Prose-panegyric) کہتے ہیں اور اگر خاکہ نگار، دانستہ طور پر اس کی خرابیوں کو مبالغے کے ساتھ نمایاں کر کے پیش کرتا ہے تو یہ "نثری ہجو" یا (Caricature) ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "خاکہ نگار" اور "مورخ" میں کیا فرق ہوتا ہے۔ دونوں کے لیے غیر جانب داری اور حق گوئی لازمی ہے۔ لیکن خاکہ نگار میں انسان کی شخصیت کا ادراک بہت زیادہ ہوتا ہے

اور یہ ادراک ہمدردانہ ہوتا ہے جسے ہم (Sympathetic Understanding) کہہ سکتے ہیں۔ مورخ کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ اس کا پڑھنے والا خوش ہوا یا نہیں یا پڑھنے والے میں اس مخصوص انسان کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے یا نہیں۔ لیکن خاکہ نگار صرف اس وقت کامیاب ہو سکتا ہے، جب وہ پڑھنے والے میں بھی وہی ہمدردی کے جذبات پیدا کر دے جو خود اس میں ہیں۔ ہمدردانہ رویہ اور غیر جانب داری میں بہت نازک فرق ہے۔ ایک ہمدردانہ رویہ رکھنے والا خاکہ نگار کسی شخصیت کے تمام برے اور بھلے پہلوؤں پر اس طرح روشنی ڈالے گا کہ پڑھنے والے کو اس سے نفرت نہیں ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ مورخ کا اصل مقصد واقعات کو پیش کرنا ہے۔ ان واقعات سے متعلق جتنی شخصیتیں ہیں وہ دوسرے درجہ کی اہمیت رکھتی ہیں، لیکن خاکہ نگار کا اصل فوکس کوئی شخصیت ہوتی ہے اور وہ صرف ان واقعات کو پیش کرتا ہے جس سے اس شخصیت کے بعض اہم پہلو اجاگر ہو سکیں۔

خاکہ نگاری کسی شخصیت کا معروضی مطالعہ ہوتا ہے جس میں ایک خاکہ نگار کے لیے قوت مشاہدہ، ادراک و فہم غیر جانبداری، ہمدردانہ رویہ اور انداز بیان میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ فراہم کیے ہوئے مواد میں ضبط و نظم کا پیدا کرنا ضروری خصوصیات ہیں۔ خاکہ نگار بعض ایسے اہم پہلوؤں کا انتخاب کرتا ہے، جن سے کسی انسان کی پوری شخصیت، ذہنی افتاد، افکار و نظریات ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ ایک کامیاب خاکہ، مولانا عبدالحق کے حکیم امتیاز الدین کے خاکے کی طرح ڈیڑھ صفحہ پر بھی مشتمل ہو سکتا ہے اور فرحت اللہ بیگ کے "نذیر احمد کی کہانی" کی طرح پوری ایک کتاب پر بھی پھیلایا جا سکتا ہے۔

اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں فرحت اللہ بیگ کے بعد اگر کسی پر نظر ٹھہرتی ہے تو وہ مولانا عبدالحق ہیں۔ مولانا کی پوری زندگی تحقیق اور تنقید کے میدان میں گزری ہے اور بقول مہدی الافادی وہ ہمیشہ "مقدمہ بازی" کرتے رہے ہیں۔ لیکن ان کی اس مقدمے بازی کے طفیل کلاسیکی ادب کے وہ گوہر ہائے نایاب ہمارے ادب کی رونق ہیں جو ان سے پہلے بعض کتب خانوں کی زینت اور بعض اشخاص کی ذاتی ملکیت تھے۔ اگر انھیں مرتب کر کے شایع کیا جاتا تو باقی تمام ذخیرہ کی طرح یہ بھی دست برد زمانہ کی نذر ہو جاتا۔ یہ مولانا کی انتھک کوشش، لگن، خلوص اور ایمانداری کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے پاس اردو شاعروں کے لکھے ہوئے بیشتر تذکرے موجود ہیں۔ دکن اور شمالی ہند میں لکھی جانے والی نثر اور نظم کے جواہر، مولانا ہی کے توسط سے ہم تک پہنچے ہیں اور اردو پر ان کا وہ احسان ہے جس سے اہل اردو کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

لیکن میں سوچتا ہوں کہ اگر مولانا "چند ہم عصر" کے علاوہ اور کچھ نہ لکھتے تب بھی اردو میں ان کا نام ہمیشہ عزت اور احترام سے صاحب طرز انشا پردازوں کے ساتھ لیا جاتا۔

"چند ہم عصر" میں اٹھارہ خاکے ہیں، جو ۱۹۰۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا شمار اردو کے کامیاب ترین خاکوں میں کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب خاکے ایسی شخصیتوں کے ہیں جنھیں مولانا خوب اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں اور مولانا کو جن سے قریب رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ان خاکوں میں مولانا محبت و نفرت، بغض و عناد، ذاتی تعصبات سے بلند اور غیر جانب دار ہیں۔ انھوں نے ان تمام شخصیتوں کی خوبیوں اور خرابیوں کو بے کم و کاست بیان کر دیا ہے۔

بعض اوقات مصنف خاکے کو اپنی ذات اور شخصیت کی اہمیت دکھلانے کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔ وہ خود اس طرح چھا جاتا ہے کہ خاکہ مصنف اور اس شخصیت کے تعلقات اور مصنف کی اپنی شخصیت کا مطالعہ معلوم ہونے لگتا ہے اور اکثر کامیاب ترین خاکے محض اس وجہ سے ناکام تحریریں بن جاتی ہیں۔ لیکن مولانا اس معاملے میں بہت محتاط رہتے ہیں۔ خاکے کے کینوس پر وہ خود بہت کم نظر آتے ہیں اور اگر کبھی ان کا عکس نظر بھی آتا ہے تو تصویر کو اور زیادہ رنگین اور دلچسپ بنانے کے لیے۔ یا اس تصویر کے بعض اہم پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لیے۔

مولانا کے حساس دل، وسیع قلب اور انسان دوست ذہن میں ایک سپاہی، ایک مالی سے لے کر حالی اور سرسید جیسی عظیم ہستیوں تک، سب کی گنجائش ہے۔ حیدرآباد کے فوجی ملازموں میں بہت سے کرنیل، میجر، کپتان اور بڑے بڑے عہدے دار موجود تھے۔ لیکن ان کی ملمع کی ہوئی چمکدار شخصیتیں اور کھوکھلا وقار، مولانا کو متاثر نہیں کر سکا۔ ان کے معیار انسانیت پر صرف ایک معمولی سپاہی نور خاں اترتا ہے۔ جو کیچڑ میں گرا ہوا ہیرا، گدڑی میں چھپا ہوا لال ہے۔ جو بظاہر کچھ بھی نہیں لیکن اہل نظر کے لیے بہت کچھ ہے۔ نور خاں کی نیک نفسی، حق گوئی، خودداری شرافت، ایمانداری اور مزاج کے تیکھے پن نے زندگی بھر انھیں مصائب و آلام میں گرفتار رکھا۔ ان کی گردن کئی بار کٹی مگر جھکی ایک دفعہ بھی نہیں۔ بقول مولانا:

"وہ حساب کے کھرے، بات کے کھرے اور دل کے کھرے تھے۔"

ان کی یہی ادا اور یہی خوبی مولانا کو عزیز ہے اور اسی نے مولانا سے یہ خاکہ بھی لکھوایا۔

مولانا کی قوت مشاہدہ جس قدر تیز ہے، اتنی ہی اس کے بیان پر بھی انھیں قدرت ہے۔ بعض خاکوں کی ابتدا ہی میں چند الفاظ میں پوری شخصیت کا جائزہ اس طرح لے لیتے ہیں کہ اگر صرف وہی چند الفاظ رہنے دیے

جائیں تب بھی اس شخصیت کا مکمل خاکہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم کے بارے میں لکھتے ہیں؛

"مرحوم لڑکپن سے ذہین وذکی مشہور تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ اپنے ہم سروں میں ممتاز رہے۔ ان کی کارروائی اور کارگزاری، ریاست حیدرآباد دکن میں ضرب المثل ہے۔ وہ کام کرنے میں بجلی اور محنت کرنے میں آندھی اور طوفان تھے۔ معاملات کی تہ کو اس قدر جلد پہنچتے تھے کہ جن لوگوں نے انھی معاملات کا ہفتوں اور مہینوں مطالعہ کیا تھا، وہ بھی دیکھتے رہ جاتے۔"

مولانا نے ایک اور خاکے" نواب محسن الملک" کی ابتدا اس طرح کی ہے:

"قدرت نے نواب محسن الملک مرحوم کو بہت سی خوبیاں عطا کی تھیں۔ وجاہت، ذہانت، خوش بیانی اور فیاضی ان کی ایسی عام اور نمایاں صفات تھیں کہ ایک راہ چلتا بھی چند منٹ کی بات چیت میں معلوم کر لیتا تھا۔"

جو لوگ شیخ غلام قادر گرامی مرحوم کی شخصیت اور عادات واطوار سے واقف ہیں، وہ ہی سمجھ سکتے ہیں کہ مولانا نے کس طرح چند الفاظ میں ان کی شخصیت کا مکمل اور جامع عکس اتار دیا ہے۔ انھوں نے گرامی کے خاکے کی ابتدا اس طرح کی ہے:۔

"گرامی سچا شاعر تھا۔ ہمارے ہاں شاعر کے لیے جو جو لوازم سمجھے جاتے ہیں وہ سب اس مرحوم میں موجود تھے۔ بے نیاز، بے پروا، دنیا کے معاملات سے بالکل بے خبر، لاابالی، اگرچہ دنیا کی نظروں میں دیوانہ تھا، مگر شعر کہنے میں فرزانہ تھا۔"

جیسا کہ میں نے ابتدا میں کہا تھا کہ خاکہ نگاری مدح سرائی یا ہجو نگاری نہیں ہوتی۔ ایسا بھی نہیں کہ خواہ مخواہ توازن قائم کرنے کے لیے دو چار خوبیوں کے ساتھ، دو چار خامیاں بھی بیان کی جائیں۔

مولانا ہر شخصیت کا مطالعہ، ایمانداری سے کرتے ہیں۔ ہم مولانا کی رائے سے تو اختلاف کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کی نیت پر کبھی شبہ نہیں کر سکتے۔ مولانا کو ان لوگوں کے ساتھ خلوت اور جلوت دونوں میں رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ انھوں نے ان شخصیتوں کو جیسا دیکھا اور سمجھا ہے، بے کم وکاست بیان کر دیا ہے۔ اسی لیے مولانا انسانی خوبیاں ہی نہیں، خرابیاں بھی بیان کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں حکیم امتیاز الدین اور مولانا محمد علی کے خاکے کامیاب ترین ہیں۔ یہ دو شخصیتیں ایسی تھیں کہ جہاں خاکہ نگار کی ایمانداری، صداقت اور غیر جانبداری

کا امتحان تھا۔ مولانا اس امتحان میں پورے اترے، وہ حکیم امتیاز الدین کے بارے میں لکھتے ہیں :

اگرچہ طبیعت کا کمزور اور لاابالی تھا مگر دوستی کا سچا اور دھن کا پکا۔ یہ سچ ہے کہ وہ دنیا کے کام کا نہ تھا، مگر خیال میں اس نے ایک ایسا عالم بنا رکھا تھا کہ عالم مثال بھی اس کے سامنے ہیچ تھا۔ اس میں ہر بات انتہائی تھی، محبت تھی تو انتہا درجے کی، عداوت تھی تو انتہا درجے کی، میانہ روی سے وہ بالکل آشنا نہ تھا۔"

مولانا محمد علی کے خاکے میں ابتدائی چند سطروں میں مولانا نے ان کی پوری شخصیت کا احاطہ کر لیا ہے۔ جن لوگوں نے مولانا محمد علی کو قریب سے دیکھا ہے اور جو ان کی سیرت اور شخصیت سے واقف ہیں، وہی عبدالحق صاحب کے ادراک اور ژرف نگاہی کی داد دے سکتے ہیں۔ وہ محمد علی مرحوم کے بارے میں لکھتے ہیں :

"وہ مختلف، متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے۔ اگر انھیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان دونوں میں عظمت و شان ہے۔ لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی بھی موجود ہے . . . . وہ آزادی کا دلدادہ اور جبر و استبداد کا پکا دشمن تھا۔ لیکن اگر کبھی اس کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو بہت بڑا جابر اور مستبد ہوتا۔"

مولانا نے بعض شخصیتوں کا ذکر بہت خلوص اور محبت سے کیا ہے۔ ان کے قابل ستائش اوصاف کو ہر ممکن طریقے سے سراہا ہے۔ لیکن ان شخصیتوں میں بھی جہاں مولانا کو کچھ خامی یا کمی نظر آتی ہے۔ مولانا نے سید علی بلگرامی کی قابلیت اور علمیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے :

"بلگرامی مرحوم ہندوستان کے عہد جدید کے ان نامور علماء میں سے ہیں جنھوں نے علم والسنہ مشرقیہ و مغربیہ میں کمال پیدا کر کے ہند کے تمدن، علمی ترقی اور روشن خیالی میں ایک نئی شان پیدا کی ہے۔"

لیکن اسی خاکے میں مولانا لکھتے ہیں :

"لیکن جب ان کے کلام پر نظر ڈالی جاتی ہے تو افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کے علم کے مقابلے میں ان کا عمل بہت ہی کم تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ طبعاً جفاکش اور علمی کام کی طرف کم راغب تھے۔ دوسرے دکن کی آب و ہوا . . . . مرحوم میں ایک

بڑا نقص یہ تھا کہ وہ متلون مزاج تھے۔ اور بعض اوقات خود غرض لوگوں کے بہکانے سے بھٹک جاتے تھے۔ یا حب جاہ میں ایسی باتیں کر گزرتے تھے، جو ان کی شان کے شایاں نہ ہوتی تھیں۔"

اسی طرح مولانا نے خواجہ غلام الثقلین کے بارے میں لکھا ہے:

خواجہ صاحب طبعاً ذکی الحس واقع ہوئے تھے۔ ان پر بعض اوقات ناکامیابی کا بہت بڑا اثر پڑتا تھا۔ اور ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی صحت خراب رہتی تھی۔ وہ زیادہ دیر ناکامیابی کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔"

سوانح عمری اور خاکہ میں فرق یہ ہوتا ہے کہ سوانح نگار کسی شخصیت کی ولادت، جائے ولادت، ابتدائی تعلیم و تربیت اور اس کی زندگی کے تمام اہم اور غیر اہم واقعات کا احاطہ کرتا ہے۔ لیکن خاکہ نگار کو ان تمام حقائق سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ کسی نے ایک سنگ تراش سے پوچھا کہ تم ایک پتھر سے اتنی خوب صورت مورتی کس طرح تراش لیتے ہو۔ اس نے جواب دیا، مورتی تو خود اس پتھر میں موجود تھی۔ میں نے تو صرف زائد حصہ کو علاحدہ کر دیا ہے۔ بالکل یہی کام خاکہ نگار کا ہوتا ہے۔ وہ سوانح عمری میں سے زائد حصہ کو اس طرح الگ کر دیتا ہے کہ وہ شخصیت اپنے اصلی روپ میں ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مولانا [illegible] سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کے خاکے واقعات کی کھتونی نہیں ہیں۔ لیکن واقعات، سوانح کے بعض اہم پہلوؤں سے مبرا بھی نہیں۔ بعض خاکوں میں کسی شخصیت کے مختصر سوانح بھی دیے جانے ضروری ہوتے ہیں۔ کیوں کہ عام طور پر عوام اس شخصیت سے واقف نہیں ہوتے اور اگر وہ اس کی سوانح عمری پڑھنا چاہیں تو ممکن نہیں ہوتا۔ اس کی بہترین مثال مولانا کا خاکہ "پروفیسر حیرت مرزا" ہے۔ ان کی ولادت، ابتدائی سوانح اور بعض واقعات کا دینا ضروری تھا کیوں کہ عام طور پر بمبئی سے باہر لوگ ان سے متعارف نہیں تھے اور پھر ان تمام چیزوں نے پروفیسر حیرت کی شخصیت کی تعمیر میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

اور بھی کچھ خاکے ہیں جن میں مولانا نے بعض واقعات بیان کیے ہیں۔ ان کے انتخاب میں مولانا بہت محتاط ہیں اور صرف ایسے واقعات بیان کیے ہیں جن سے کسی شخصیت کے اہم پہلو اجاگر ہو سکیں۔ حالی، سر سید اور محسن الملک کے خاکوں میں انھوں نے ایسے ہی واقعات بیان کیے ہیں۔

ادب کی کوئی صنف اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک مصنف کو اپنے موضوع اور قوت

بیان دونوں پر پورا عبور نہ ہو۔ خاص طور پر خاکہ کا فن بہت مشکل اور کٹھن فن ہے۔ اسے اگر نثر میں 'غزل کا فن' کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جس طرح غزل میں محدود الفاظ میں طویل مطالب بیان کرنے پڑتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح خاکے میں بھی مختصر الفاظ میں پوری شخصیت پر روشنی ڈالنی پڑتی ہے۔ اس لیے خاکہ لکھنا بہت آسان ہے لیکن اول درجہ کا خاکہ لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ مولانا کو موضوع کی طرح بیان پر بھی پوری قدرت ہے۔ اردو کے صاحب طرز انشا پردازوں میں ان کا شمار صرف "چند ہم عصر" کی وجہ سے ہوگا۔ کیوں کہ تذکروں اور دوسری علمی اور ادبی کتابوں پر ان کے مقدمے تحقیقی نوعیت کے ہیں، جہاں انشا پردازی کا دخل نہیں، اور جہاں اسلوب کی شگفتگی، خوبی نہیں، خرابی شمار کی جاتی ہے۔ جہاں مصنف، انشا پردازی کے زور میں تیاس کے طوطے مینا اڑانے لگتا ہے اور جہاں وہ واقعات اور حقائق کو اپنے اسلوب بیان کے سانچوں میں ڈھالنے پر مجبور ہوتا ہے۔

مولانا کے خاکوں میں جو بیان کی شگفتگی اور شیرینی ہے، کہیں کہیں سنجیدہ بذلہ سنجی اور شوخی گفتار ہے، تشبیہات واستعارات کا برجستہ استعمال، لب ولہجہ کی بے ساختگی اور محاوروں کی چاشنی ہے، وہ ان کی اور تحریروں میں نہیں ہے۔ انھیں خوبیوں نے خاکوں کو انشا پردازی کی بہترین مثال بنا دیا ہے۔

ان خاکوں کی ایک اور بڑی خوبی ہے۔ جس کی طرف ڈاکٹر عابد حسین نے "جوہر" کے عبدالحق نمبر میں توجہ دلائی ہے اور وہ یہ کہ ان خاکوں میں خود مولانا کی شخصیت بھی جھلکتی ہے۔ ان کا تصور نیک وبد، انسان کی صفات، زندگی کے بارے میں ان کے نظریات، ایک نیک اور صالح آدمی کے اوصاف وغیرہ کا تصور بھی معلوم ہوتا ہے۔ میں یہاں صرف دو تین اقتباسات پیش کروں گا۔ تاکہ مولانا کے افکار وعقائد پر کچھ روشنی پڑ سکے۔

جس لگن اور خلوص کے ساتھ مولانا کو اردو ادب کی خدمت کرتے ہوئے آدھی صدی سے زیادہ بیت گئی ہے۔ اس خلوص کی جھلک ان الفاظ میں دیکھیے۔ پروفیسر حیرت مرزا کے خاکے میں مولانا، ملٹن کا ایک قول پیش کرتے ہیں کہ :

"شہرت، شریف النفس انسان کا آخری ضعف ہے۔"

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کسی میدان میں شہرت پانے کے بعد، انسان کو اپنے مقصد اور اپنے فن سے پہلا سا لگاؤ نہیں رہتا۔ مولانا، ان خوش قسمت لوگوں میں ہیں، جنھیں بحیثیت ادیب، نقاد اور محقق بہت کم عمری میں شہرت اور مقبولیت حاصل ہو گئی تھی، لیکن یہ شہرت ان کے مقصد، خلوص، انتھک محنت پر قطعی اثر انداز نہ ہو سکی، اور کبھی ان کی کمزوری نہ بن سکی۔ انھوں نے کام اس لیے کیا ہے کہ یہ انسان کی زندگی کا مقصد ہے

اس لیے نہیں کہ انھیں شہرت اور دولت حاصل کرنی تھی۔ وہ سید محمود کے خاکے میں لکھتے ہیں :

"شہرت، دولت اور حکومت جن سے ایک عالم میں ہیجان اور انقلاب برپا ہے اور جن کی آگ تقریباً ہر سینے میں مشتعل ہے، وہ ان کی آنچ سے بالکل محفوظ تھے۔"

مولانا کے یہ الفاظ سید محمود کے لیے نہیں، خود اپنی ذات کے لیے بھی ہیں۔ ان کی پوری زندگی اس کی آئینہ دار ہے۔ مولانا کو نور خاں اس لیے پسند ہے کہ وہ "دل کا کھرا اور بات کا کھرا ہے"۔ اس میں صداقت اور ایمانداری کے ساتھ ساتھ خودداری بھی ہے۔ نام دیو مالی ان کو اس لیے عزیز ہے کہ وہ کام کو، کام کی خاطر کرتا ہے، دولت حاصل کرنے کے لیے نہیں۔ جب نام دیو مالی اپنی پوری محویت کے ساتھ باغ میں کام کر رہا تھا، تو شہد کی مکھیوں کا ایک جھلڑ اس سے چمٹ گیا اور اسے اتنا کاٹا کہ وہ مر گیا۔ اس کی وفات پر مولانا نے بڑی معنی خیز بات کہی ہے، جو خود ان کے کردار پر روشنی ڈالتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مکھیوں کا غضب ناک جھلڑ، اس غریب پر ٹوٹ پڑا۔ اتنا کاٹا، اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا۔ آخر اسی میں جان دے دی۔ میں کہتا ہوں اسے شہادت نصیب ہوئی۔"

آخر میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ "چند ہم عصر" کا شمار اردو کے بہترین خاکوں اور انشا پردازی کے بہترین نمونوں میں ہے۔

پروفیسر عنوان چشتی

مولوی عبدالحق کی تنقید نگاری

مولوی عبدالحق کے تنقیدی افکار میں فنکار کی شخصیت، اس کے ماحول اور عہد نیز ذریعۂ اظہار کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ شخصیت کے وسیلے سے ان کا ذہنی رشتہ نفسیاتی تنقید ہے، ماحول اور عہد کے واسطے سے ان کا فکری تعلق سماجی اور تاریخی تنقید سے نیز ذریعۂ اظہار کی نسبت سے ان کا تنقیدی رشتہ اردو کی کلاسیکی تنقید سے قائم ہوجاتا ہے۔ لیکن ان کی تنقیدی تحریروں میں نفسیاتی اور سماجی تنقید کا شعور کم ہے۔ پھر بھی انھوں نے شخصیت اور عہد کی اہمیت پر خاصا زور دیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے۔

"جب ہم شعر یا شاعری کی تاریخ لکھنے بیٹھیں تو ہمارا فرض ہے کہ شاعر کی زندگی کے حالات، اس کی طبیعت، اس کے خصائص اور عادات پر نظر ڈالیں ـــــ اور اس کے بعد ـــــ اس کے عہد کے واقعات و حالات و تغیرات و انقلابات کا ذکر کم سے کم اس حد تک ضرور کریں، جہاں تک ان کا تعلق اس کی شاعری سے ہے۔ کیوں کہ یہ ممکن نہیں کہ کوئی شاعر اور اس کی شاعری اپنے عہد کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکے۔"

(تنقیداتِ عبدالحق ص ۱۵۲)

اس میں شک نہیں کہ فنکار کی تخلیق پر اس کی شخصیت یعنی شعور و لاشعور اور عہد یعنی سیاسی، سماجی تہذیبی اور اقتصادی میلانات کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے "انتخابِ میر" کے مقدمہ میں میر کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی "شخصیت اور عہد" کے میلانات کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا ہے۔ اور میر کی شاعری پر شخصیت و عہد کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ انھوں نے میر تقی میر کے بارے میں لکھا ہے۔

۱۔ "میر صاحب کی زندگی مصائب و آلام کا سلسلہ تھی۔ جس کا تار بچپن سے لے کر لکھنؤ جانے تک کبھی نہ ٹوٹا" (انتخابِ کلامِ میر ص ۱۲)

۲۔ "اس وقت دلی تاریخ میں خاص حیثیت رکھتی تھی۔ وہ ہندوستان کی جان اور سلطنتِ مغلیہ

کی راجدھانی تھی۔ مگر ہر طرف سے آفات کا نشانہ تھی۔ اس کی حالت اس عورت کی سی تھی جو بیوہ تو نہیں، پر، بیواؤں سے کہیں زیادہ دکھیاری ہے۔" (انتخاب کلامِ میر۔ ص ۱۲)

اس ضمن میں مولوی عبدالحق نے میر کی زندگی کے مدو جزر اور ان کے عہد کے اتار چڑھاؤ کے تناظر میں اس کی شاعری میں درد و داغ، خستگی و برستگی اور غم زدگی و بے چارگی کا سراغ لگانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اگر میر کی شاعری کو اس کی زندگی اور عہد کے مرقع میں سجا کر دیکھیں تو آسانی سے یہ راز سمجھ میں آسکتا ہے کہ میر کی شاعری میں دل اور دلّی کے نوحے کیوں ملتے ہیں؟ مولوی عبدالحق نے بار بار شخصیت و عہد کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔

۱۔"ان (میر تقی میر) کا کلام میں ایسا درد بھرا ہوا ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر چوٹ سی لگتی ہے۔ جو لطف سے خالی نہیں" (انتخابِ کلامِ میر۔ ص ۱۸)

۲۔ شگفتگی اور زندہ دلی میر صاحب کی تقدیر میں نہ تھی۔ وہ سراپا یاس و حرماں تھے۔ اور یہی حال ان کے کلام کا ہے۔ گویا ان کا کلام ان کی طبیعت و سیرت کی ہو بہو تصویر ہے۔" (انتخاب کلامِ میر۔ ص ۱۹)

۳۔"ان کے اشعار سوز و گداز اور درد کی تصویر ہیں۔ زبان سے نکلتے ہی دل میں بیٹھ جاتے ہیں۔" (انتخابِ کلامِ میر۔ ص ۲۱)

مولوی عبدالحق نے میر کی شاعری پر ان کی شخصیت اور عہد کے اثرات کی نشاندہی تو ضرور کی ہے۔ لیکن ان کی تنقیدوں میں نفسیاتی تنقید اور سماجی تنقید کا واضح اثر نہیں ملتا۔ نفسیاتی تنقید میں فنکار کی شخصیت کے تشکیلی محرکات، اس کے ذہن و فکر کے نفسیاتی عوامل اور تخلیقی عمل کا تجزیہ شامل ہے۔ عبدالحق کی تنقیدوں میں نفسیاتی تنقید کے یہ اصول کارفرما نہیں ہیں۔ اسی طرح سماجی تنقید کے نقطہ نظر سے عبدالحق نے مادیت زندگی کی کشمکش اور مقصدیت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اور سادہ انداز سے شخصیت اور عہد کے اثرات کی چھان بین کی ہے۔

مولوی عبدالحق کی تنقید نگاری کا تیسرا اصول ذریعۂ اظہار کی حرمت ہے۔ انھوں نے بار بار اپنی تنقیدی تحریروں میں زبان کی صحت اور بیان کی لطافت پر اصرار کیا ہے۔ جس کا رشتہ اردو کی کلاسیکی تنقید سے مل جاتا ہے۔ عبدالحق کی تنقید نگاری کا غالب رجحان یہی ہے۔ اردو تنقید کا کلاسیکی دبستان لسانی،

فنی اور عروضی پہلو پر مشتمل ہے۔ لسانی پہلو میں روزمرہ اور محاورہ کی صحت، زبان کے درست استعمال اور قواعد کے اصولوں کی خاص اہمیت ہے۔ فنی پہلو میں جمالیات اور شعریات نیز بدیع، بیان اور معانی کے اصولوں پر نظر رکھی جاتی ہے۔ عروضی پہلو میں حروفِ علت کے سقوط، شکست ناروا اور اوزان و بحور کے مسائل شامل ہیں۔ بنیادی طور پر اردو تنقید کا کلاسیکی دبستان شاعری کی ہیئت کے حسن پر اصرار کرتا ہے۔ اس کو زیادہ دل نشیں اور کیف آفریں بنانے پر زور دیتا ہے۔ اساتذہ کی اصلاحوں، ادبی معرکوں اور تذکروں نے اس کو پروان چڑھایا ہے۔ مولانا حالیؔ اور شبلیؔ کی تنقیدی تحریروں پر ان اصولوں کا خاصا اثر ہے۔ حسرت موہانی نے "نکاتِ سخن" کی شکل میں اس دبستان کی بوطیقا پیش کی ہے۔ مولوی عبدالحق اگرچہ اردو تنقید کے کلاسیکی دبستان کے روایتی علم بردار نہیں۔ لیکن ان کے تنقیدی افکار پر اس دبستانِ نقد کا گہرا اثر ہے۔ مولوی عبدالحق کے تبصروں، دیباچوں، مقدموں اور تنقیدی مضامین کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے قدیم اردو تنقید کے دو پہلوؤں یعنی لسانی اور فنی پہلو پر خاص توجہ مبذول کی ہے۔ لیکن عروضی پہلو کو قدرے نظر انداز کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنی تنقیدوں میں بار بار زبان کے لغوی اور تخلیقی استعمال کی بحث اٹھائی ہے۔ انھوں نے منشی احمد علی شوق قدوائی کے دیوان "فیضانِ شوق" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

مرے منہ پر کسی سے لے کے تجھ کو پان کھاناتھا | ترے ہونٹوں کو میرے خون کا بیڑا اٹھانا تھا
یہ آہیں چند، میں نے کھینچ دیں مرف اوپر دل سے | اثر کی کب تمنا تھی، فقط اس کو ڈرانا تھا

ان اشعار میں زبان کے محلِ استعمال پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

"آہیں کھینچ دینا یا کھینچ لینا، دونوں ٹھیک نہیں۔ "آہیں کھینچی" ہی فصیح معلوم ہوتا ہے۔ پہلے شعر میں "مرے منہ پر" بھی اچھا نہیں ہے۔"

(تنقیداتِ عبدالحق۔ ص ۵۳)

اسی مضمون میں مولوی عبدالحق نے ایک دوسری جگہ لکھا ہے۔

گل ہو کے میں کیا ہنستا، ایسا نہ تھا غم میرا
شبنم کی طرح گزرا، روتے ہی جنم میرا

انھوں نے شوق قدوائی کے مندرجہ بالا شعر کی زبان پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اس (شعر) میں جسم گزرا" باندھا گیا ہے۔ خدا جانے یہ کہاں تک بہ لحاظ زبان ٹھیک ہے۔" (تنقیداتِ عبدالحق۔ ص ۵۶)

مولوی عبدالحق نے جوش ملیح آبادی کی کتاب "روحِ ادب" پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی زبان اور اس کے استعمال پر اس طرح اعتراض کیا ہے۔

بعض مقامات پر عبارت میں خامی معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ زیادہ قابلِ لحاظ نہیں تاہم نہ ہوتی تو بہتر تھا۔ "عجیب شیرینی" کا پہلا جملہ "ایک رنگین عارضوں والی دوشیزہ"۔۔

یا ــــ اس شعر میں "اشک" کا لفظ

تمہارے سامنے کیوں "اشک" میرا بہ نہیں سکتا
اسے محسوس کر سکتا ہوں لیکن کہہ نہیں سکتا"

(تنقیداتِ عبدالحق، ص ۱۲)

مولوی عبدالحق محض نکتہ چیں ہی نہ تھے۔ بلکہ نکتہ رس تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں جگہ جگہ زبان کے تخلیقی استعمال کی داد دی ہے۔ اور زبان کی مجازی شکلوں کو سراہا ہے۔ انھوں نے "بانگ درا" پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال کی تین نظموں (شمع و شاعر، خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام) کو پسند کیا ہے۔ انھوں نے ان نظموں پر جو رائے دی ہے، وہ مشرقی شعریات کے اصولوں پر مبنی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے

"جن تین نظموں کا میں نے نام لیا ہے، وہ ایسی ہیں کہ ان میں اقبال کی شاعری کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ تخیل کی بلندی، تشبیہات و استعارات لفظی ترکیبیں صاف بتاتی ہیں کہ مرزا غالب کا کس قدر اثر ہے۔" (تنقیداتِ عبدالحق۔ ص ۱۲۵)

واضح رہے کہ تخیل پر حالی اور شبلی نے بالترتیب مقدمۂ شعر و شاعری اور شعرالعجم میں اچھی خاصی بحث کی ہے۔ لیکن جہاں تک تشبیہات و استعارات نیز لفظی ترکیبوں کا تعلق ہے۔ یہ مباحث تو خالص مشرقی شعریات کے ہیں۔ جن میں زبان کے تخلیقی استعمال کا حسن ہے۔ مولوی عبد ن۔ م۔ راشد کے شعری مجموعے "ماورا" پر تبصرہ کرتے ہوئے نکتہ رسی کی لے کو اور تیز کیا ہے۔ اور اس تبصرے میں انھوں نے خیالات کے ساتھ "طرزِ بیان" کی جدت اور زبان کے نئے پن کا خیر مقدم کیا ہے۔ انھوں نے "ماورا" پر لکھا ہے۔

انھوں (ن۔م۔ راشد) نے طرزِ بیان اور خیالات میں بھی جدّت دکھائی ہے۔ بعض نظمیں عاری (یعنی بلینک ورس) میں لکھی ہیں۔

اُڑ کے پہنچوں میں وہاں روح کے طیارے میں
سرعتِ نور سے یا آنکھ کے پلکارے میں

"پلکارے" کا لفظ نیا ہے۔ اور خوب بنایا ہے۔" (تنقیداتِ عبدالحق۔ ص ۱۳۶)

مولوی عبدالحق نے جہاں نئے خیالات کا خیر مقدم کیا ہے، وہیں انھوں نے نئے اسالیب کا استقبال بھی کیا ہے۔ "ماورا" پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے عاری نظموں (بلینک ورس) کی پذیرائی کی ہے۔ واضح رہے کہ یہ وہی مولوی عبدالحق ہیں، جنھوں نے نظم معرا کی تحریک پر عبدالحلیم شرر کی حمایت کی تھی۔ اور جن کے مشورے سے شررؔ نے بلینک ورس کا نام "نظم معرا" تجویز کیا تھا۔ اِن مباحث کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ مولوی عبدالحق نے نکتہ چینی کے ساتھ نکتہ رسی کا حق بھی ادا کیا ہے۔ اور ہیئت کے جمال آفریں عناصر اور اسالیب کو سراہا ہے۔

اردو تنقید کا تیسرا رکن "عروضی" ہے۔ مولوی عبدالحق نے روایتی انداز میں عروضی مباحث پر اظہار خیال نہیں کیا۔ لیکن ان کی تنقیدی تحریروں میں گہرا شعورِ آہنگ کارفرما ہے۔ میر تقی میر کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے لکھا ہے۔

"الفاظ کا صحیح استعمال اور ان کی خاص ترتیب و ترکیب زبان میں موسیقی پیدا کردیتی ہے۔"

(انتخابِ کلامِ میر۔ ص ۱۸)

اس میں شک نہیں کہ موسیقی اور شاعری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ میں نے "میر تقی میر: داخلی موسیقی کا شاعر" عنوان سے اپنے ایک مقالے میں اس اندازِ فکر کی تھوڑی سی وضاحت کی تھی۔

"موسیقی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک مجرد آوازوں کی باقاعدہ ترتیب سے پیدا ہونے والی موسیقی۔ اور دوسری بامعنی آوازوں یعنی لفظوں کی باقاعدہ ترتیب سے ابھرنے والی "لسانیاتی موسیقی"۔ شاعری میں دونوں طرح کی "موسیقیت" کا سنگم ہوتا ہے۔ حروف کی موسیقی مجرد آوازوں کی موسیقی ہے۔ نیز الفاظ، تراکیب اور مصرعوں کی موسیقی بامعنی موسیقی کے دائرے میں آتی ہے۔ اس بامعنی موسیقی میں مجرد آواز یعنی حروف کی موسیقی لازمی طور پر شامل ہوتی ہے

اسی طرح شاعری میں "لسانیاتی موسیقی" اور اس کی تمام قسمیں جوہر کی طرح پیوست ہوتی ہیں۔ ایک کامیاب اور باشعور شاعر، اپنی شاعری میں آواز اور اس کی اشاریت کے جملہ امکانات سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ جس کو شعری آہنگ بھی کہا جاتا ہے۔ میر ہمارے اُن بڑے شاعروں میں ہے، جن کو نہ صرف آہنگ کا بھرپور شعور ہے۔ بلکہ وہ اس کو برتنے کا فن بھی جانتا ہے۔ شعری آہنگ بھی دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک داخلی آہنگ، جس میں جذبے کا آہنگ بھی شامل ہے۔ اور دوسرا خارجی آہنگ، جس میں حروف، الفاظ، تراکیب کے آہنگ کے ساتھ بحر و قوافی کا آہنگ، جس میں ہے۔ شعری آہنگ اِن دونوں کے ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر ایک اکائی بن جانے سے وجود میں آتا ہے۔"

(معنویت کی تلاش، ص ۱۰)

اگر مولوی عبدالحق کے اصول (الفاظ کا صحیح استعمال اور خاص ترتیب سے پیدا ہونے والی موسیقی) کو عموماً میر کی کل شاعری اور خصوصاً "بحرِ میر" پر وارد کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ مولوی عبدالحق کے شعورِ آہنگ کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ بلکہ اس سے میر کی شاعری کے بارے میں دلکش نتائج بھی حاصل ہوتے ہیں۔ اس بحر میں میر تقی میر کی تقریباً ۱۸۳ غزلیں ہیں۔ بظاہر یہ بحرِ متقارب ہے۔ لیکن میر نے ارکان کی غیر رسمی و غیر روایتی ترتیب سے عروضی آہنگ کے جو پیٹرن ابھارے ہیں۔ وہ انھیں کا حصّہ ہے۔ یہ بھی مولوی عبدالحق کی تنقیدی بصیرت ہے کہ انھوں نے میر کے شعری آہنگ کی انفرادیت کو محسوس کیا اور اس شعورِ آہنگ کو اپنی تنقیدی بصیرت کا حصّہ بنایا۔ مولوی عبدالحق نے راشد کے "ماورا" پر تبصرہ کرتے ہوئے "شعورِ آہنگ" پر چند خیال انگیز اشارے کیے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے:

"راشد صاحب کا یہ کہنا ایک حد تک صحیح ہے کہ بد قسمتی سے ہمارے ملک کی شاعری خصوصاً اردو شاعری اپنی خارجی اصل کے سبب ہمارے "قومی شعرِ نغمہ" کے ساتھ کوئی ربط نہیں رکھتی بلکہ ایک میکانکی علمِ عروض پر مبنی ہے ـــــ لیکن ساتھ ہی اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ عروض اور نحو سب میکانکی ہوتے ہیں۔ پہلے شعر ہے اور اس کے بعد عروض اسی طرح پہلے زبان ہے اور اس کے بعد صرف و نحو، منطق ہو یا صرف و نحو۔ عروض ہو یا موسیقی، یہ سب ہماری بنائی ہوئی چیزیں ہیں۔ اٹل نہیں، تغیر پذیر ہیں۔ جب زندہ زبان

اور ادب ایک حال پر نہیں رہ سکتے اور ان میں تغیر لازم ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ موسیقی کے اصول ایک حال پر قائم رہیں۔" (تنقیدات عبدالحق۔ ص ۱۳۸)

مولوی عبدالحق نے یہاں بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ ایک تو انھوں نے یہ سوال اٹھایا کہ "قومی شعورِ نغمہ یا ہندوستانی مزاج موسیقی" کیا ہے؟ اس پر آج تک گفتگو نہیں ہوئی دوسرے انھوں نے "عروضی آہنگ" کی تائید کرتے ہوئے واضح طور پر کہا ہے کہ زبان اور شاعری زمانے کے ساتھ چلتی ہیں۔ اور بدلتی رہتی ہیں۔ انھوں نے یہ بات زور دے کر کہی کہ جب زمانے کے ساتھ زبان اور شاعری کا رنگ و آہنگ بدلتا ہے تو قواعد اور عروض کو بھی بدلنا ہوگا۔ لیکن یہ تبدیلی ضروری اور فطری ہوگی۔ تبدیلی برائے تبدیلی نہیں۔ چوں کہ شاعری کی ہیئت نامیاتی ہوتی ہے۔ آہنگ جو ہیئت کا حصّہ ہوتا ہے، وہ بھی نامیاتی ہوتا ہے۔ زندگی کے ساتھ زبان اور شاعری، زبان اور شاعری کے ساتھ صرف و نحو نیز آہنگِ شاعری نامیاتی انداز سے بدلتا رہتا ہے مولوی عبدالحق کے اس اندازِ نظر سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا تصور آہنگ معتدل تھا۔ روایتی یا انقلابی نہیں تھا۔ مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ مولوی عبدالحق نے اردو تنقید کے دو اصول یعنی لسانی اور فنی توجوں کے تو قبول کر لیے تھے۔ لیکن عروضی اصول کو من وعن تسلیم نہیں کیا تھا۔ بلکہ ان کے شعورِ آہنگ پر روایتی اور انقلابی تصورِ آہنگ کا اثر ہے۔ وہ بھی عروض کے زندہ عناصر کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ مگر نئے تصورِ آہنگ کا استقبال بھی کرتے ہیں۔

فنونِ لطیفہ میں وسیلۂ اظہار کی جو اہمیت ہے، اس سے ہر فنکار واقف ہے۔ موسیقی میں آواز کے زیر و بم، سُر اور تال کی، رقص میں حرکاتِ بدن میں توازن اور ہم آہنگی کی، مصوّری میں رنگ، خطوط اور الوان کی ترتیب و توازن کی، بت گری میں سنگ تراشی کے ضابطوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح شاعری میں زبان کی صحت، آہنگ و بحور کے اصولوں اور فن کے دیگر لوازمات سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایک موسیقار اپنے ذریعۂ اظہار یعنی آواز کے اتار چڑھاؤ اور سُر تال سے چشم پوشی کرتا ہے، وہ اپنے فن کے ساتھ کیا خاک انصاف کر سکتا ہے؟ اگر ایک رقاصہ اپنے بدن کی حرکات و سکنات میں کسی ترتیب متناسب اور ہم آہنگی کی قائل نہیں تو وہ کیا دادِ رقص دے سکتی ہے۔
اگر ایک مصوّر اپنے ذریعۂ اظہار یعنی رنگ و الوان کے استعمال میں اگر کسی اصول اور ضابطے کا پابند نہیں تو وہ اپنے فن کے ساتھ کیا انصاف کر سکتا ہے؟ یہی حال نقاشی اور صنم سازی کا ہے۔ آج کل شاعری

کے میدان میں ایک حشر برپا ہے۔ اکثر شعراء ذریعۂ اظہار کی حرمت کے قائل نہیں۔ زبان اور بیان کے اصولوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔ فن کی تاریخ شاہد ہے کہ جو فنکار اپنے فن کے ذریعۂ اظہار کا احترام نہیں کرتا، فن بھی اس کا احترام نہیں کرتا۔

مولوی عبدالحق کے نظریۂ تنقید پر یوں تو نفسیاتی اور سماجی تنقید کے اصولوں کا معمولی سا اثر ہے۔ یعنی انھوں نے فنکار کی شخصیت اور عہد کے وسیلے سے فن تک رسائی پر زور دیا ہے۔ لیکن ان کے تنقیدی افکار پر اردو کی کلاسیکی تنقید کا اثر ہے۔ انھوں نے زبان و بیان نیز ہیئت و اسلوب کی صحت اور جمال آفرینی پر زور دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ زبان اور شاعری کو اگرچہ بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن یہ زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ اور قواعد اور عروض بھی ان تبدیلیوں کو انگیز کرتا ہے۔ اس لیے انھوں نے روایتی شعورِ آہنگ کے زندہ عناصر کے ساتھ نئے آہنگ کا خیر مقدم بھی کیا ہے۔ اردو کے نئے شعراء اور نقادوں فن مولوی صاحب کے تجزیے سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ایم۔ حبیب خاں

مولوی عبدالحق
اور
انجمن ترقی اردو ہند کا دلّی میں ورود

مولوی عبدالحق، سرسید اور حالی کے زبردست حامیوں میں تھے، طالب علمی کے زمانے میں سرسید سے علمی اور ادبی زندگی کے جو آداب انھوں نے سیکھے تھے ان کو بعد میں اپنی زندگی کا نصب العین بنایا۔ سرسید کو قریب سے دیکھنے کی وجہ سے مولوی صاحب نے بہت سی عادتیں سرسید کی اپنالیں، اس لیے عبدالحق کی شخصیت کی تعمیر میں سرسید اور حالی کا زبردست ہاتھ ہے۔ کالج کی جب چھٹیاں ہوجاتیں تو سرسید، عبدالحق کو گھر جانے سے روک دیتے اور اپنے علمی کاموں میں مشغول رکھتے۔ اس سے ان میں علمی و ادبی کام کرنے کی لگن پیدا ہو گئی۔ شیخ چاند، نے عبدالحق کی علمی زندگی اور سرسید سے قربت کا ذکر اس طرح کیا ہے:

> "آپ کا زیادہ تر وقت سرسید کے ساتھ گزرتا تھا۔ تعطیل میں عموماً سید صاحب آپ کو گھر جانے سے روک دیتے تھے اور مختلف علمی کاموں میں مشغول رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ پر سرسید کی آزاد خیالی اور روشن دماغی کا خاص اثر پڑا۔"[1]

یہی وجہ ہے کہ مولوی عبدالحق کو اردو سے رغبت پیدا ہوئی اور انجمن ترقی اردو کا سکریٹری ہونے کے بعد اردو کی خدمت کے جذبے کو جلا ملی جس کا ثبوت ہمیں ان کی علمی اور لسانی خدمات سے ملتا ہے۔

---

[1] مولوی عبدالحق کا مقصد زندگی ص ۴۲

اورنگ آباد سے دلّی منتقلی

مولوی عبدالحق اپنی ملازمت کے دوران اردو کی خدمت شروع سے کرتے رہے لیکن اردو کے فروغ اور اس کی ترقی کا جذبہ اس وقت پیدا ہوا جب وہ ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو کے اعزازی سکریٹری مقرر ہوئے۔ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں اس وقت آل انڈیا اردو کانفرنس کے سکریٹری تھے، ان کی وساطت سے مولوی عبدالحق نے سکریٹری شپ کا عہدہ سنبھالا۔ اور مولوی صاحب انجمن ترقی اردو ہند کے دفتر کو علی گڑھ سے اورنگ آباد دکن لے گئے۔ جہاں رابعہ درانی کے مقبرے کے ایک گوشے میں انجمن کا دفتر قائم کیا۔ یہاں انھوں نے از سرِ نو انجمن کی تشکیل کی اور شب و روز کی محنت اور اپنے اثرات سے اس میں نئی جان ڈالی اور یہ ادارہ پورے ہندوستان کی نمائندگی کرنے لگا۔ غرض مولوی صاحب کی لگاتار محنت اور توجہ نے اردو کو انجمن کے پلیٹ فارم سے دور دور تک پہنچا دیا اور انھوں نے اپنے علمی و ادبی کارناموں سے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا۔ اورنگ آباد جیسے دور دراز مقام سے اردو کی ترقی و ترویج کو پھیلانا آسان کام نہ تھا، یہ کام وہی شخص انجام دے سکتا تھا جسے اردو سے محبت اور لگاؤ ہو۔ مولوی صاحب نے ۲۴ سال تک اورنگ آباد میں رہ کر اردو کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کا سکہ لوگوں کے دلوں میں بٹھا دیا۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۶ء تک اورنگ آباد میں ملازمت کا سلسلہ جاری رکھا اور اردو کا پرچار بھی کرتے رہے اور عوام کے دلوں میں اس کی اہمیت اور اس کے علمی خزانے کی قدر و قیمت کو واضح کرتے رہے۔ اب انھیں یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ جنوبی ہند میں رہ کر اردو کے فروغ میں پیدا شدہ اڑچنوں کو دور نہیں کیا جا سکتا اس لیے انھوں نے ملازمت سے سبک دوش ہونے کا تہیہ کر لیا اور انجمن ترقی اردو ہند اور اس کی شاخوں کو قائم کر کے اردو کی ترقی اور فروغ کا بیڑا اٹھانے کا ارادہ کر لیا۔

اکتوبر ۱۹۳۶ء میں مولوی صاحب نے آل انڈیا اردو کانفرنس علی گڑھ میں منعقد کی جہاں دور دراز مقامات سے ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ اردو اور ہندی سے محبت کرنے والے جمع ہوئے۔ اس کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ انجمن ترقی اردو کا صدر مقام اورنگ آباد کے بجائے دلّی میں ہونا چاہیے اور حالات کے پیش نظر شمالی ہند میں اردو کی طرف توجہ کرنا بہت ضروری ہے۔ اس لیے مولوی صاحب نے ملازمت سے استعفا دے دیا۔

انجمن کے چوتھے صدر سر راس مسعود ۱۹۳۷ء میں انتقال فرما گئے۔ یہ اردو کے سچے پرستار اور عاشق تھے اردو سے ایک رشتہ ان کا یہ بھی تھا کہ وہ سر سید کے پوتے اور سید محمود کے فرزند تھے۔ ان کے انتقال سے انجمن اپنے ایک محسن اور مربّی سے محروم ہو گئی۔ ان کے انتقال کے بعد سر اکبر حیدری کی تجویز پر انجمن کی مجلس نظما نے سر تیج بہادر سپرو

کو انجمن کا صدر منتخب کیا۔ یہ انجمن کے پانچویں صدر تھے۔ اس وقت سے یہ روایت قائم ہو گئی کہ ایک ہندو صدر انجمن کا منتخب ہونے لگا۔ گو دستور میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ نومبر ۱۹۳۸ء میں انجمن ترقی اردو ہند کے مرکزی دفاتر دہلی منتقل کردیے گئے۔ جب ۱۹۱۲ء میں انجمن کا دفتر مولوی عبدالحق علی گڑھ سے اورنگ آباد لے گئے تھے تو اس کا کل اثاثہ ایک پرانا اور بوسیدہ صندوق تھا اور چند قلم دوات۔ جب انجمن دلّی لائی گئی تو اس کی شائع شدہ کتابیں اور دوسرے سامان مال گاڑی کے کئی ڈبوں میں لاد کر دلّی لائے گئے۔ دلّی میں دریا گنج میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی کرایے پر لی گئی۔ چند مہینے بعد جنوری ۱۹۳۹ء میں "ہماری زبان" کے نام سے پندرہ روزہ اخبار مولوی صاحب نے جاری کیا۔ مولوی صاحب کا دلّی آنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس زمانے میں اردو اور ہندی کا تنازعہ بہت بڑھ گیا تھا اور اردو کو سیاست کا شکار بنا کر ہر ممکن نقصان پہنچانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ اب انجمن کے دو مقاصد ہو گئے ایک علم و فن کی خدمت دوسرے اردو زبان کا تحفظ۔ ان کے علاوہ مولوی صاحب اردو کے مخالفوں سے اور اس کے راستے میں اڑچن پیدا کرنے والوں سے مقابلہ کرتے رہے۔ اس طرح مولوی صاحب چومکھی لڑائی بڑی کامیابی اور مستعدی کے ساتھ لڑتے رہے۔ اردو کا مخالف ان کا سب سے بڑا دشمن تھا۔

اُردو ہندی کا تنازعہ

مولوی عبدالحق نے اردو ہندی کے تنازعہ کو روکنے کے لیے گاندھی جی سے اس بات پر اتفاق کر لیا تھا کہ تقسیم ہند کے بعد ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ مولوی عبدالحق گاندھی جی کے آدرشوں کا کھلے دل سے احترام کرتے تھے اور ان کے خلوص اور احترام کا یہاں تک عملی ثبوت ملتا ہے کہ ساہتیہ پریشد کے جلسے ۱۹۳۶ء سے پہلے ان کے کمرے میں چرخا اور ایک لٹیا رکھی رہتی۔ یہ دونوں چیزیں وہ تھیں جو لوک مانیہ تلک سیاسی روپوشی کے زمانے میں چھوڑ گئے تھے[1] اور مولوی صاحب نے ان کو حاصل کر کے اپنے کمرے کی زینت بنا لیا تھا۔ کھادی کا لباس بھی مولوی صاحب اسی پابندی اور احترام سے پہنتے جس طرح گاندھی جی کا آدرش تھا۔ ہندوستانی کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے ریڈیو سے جو تقریر کی اس کے جستہ جستہ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں تاکہ اردو اور ہندی کا فرق واضح ہو سکے:

---

[1] گرد راہ۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری/ص ۱۰۴۔

"زبان کے معنوں میں ہندوستانی کا لفظ ہمارے کسی مستند شاعر یا ادیب یا اہلِ زبان نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ یہ یورپ والوں کی اختراع ہے۔ یورپ کے سیاحوں نے جو سترھویں صدی سے اس ملک میں آنے شروع ہوئے۔ اس زبان کو جو شمالی ہند میں عام طور سے بولی جاتی تھی۔ اندوستان، اندستانی اور بعد ازاں ہندوستانی کے نام سے موسوم کیا۔ لیکن اس لفظ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں اس وقت فروغ ہوا جب ۱۸۰۰ء میں کلکتے میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ عجیب بات یہ ہے کہ کالج کے انگریز استاد تو اس زبان کو جس میں میرامن کی "باغ و بہار" شیر علی افسوس کی "آرایش محفل"، حیدری کا "طوطی نامہ"، عیش کی "بہار دانش" وغیرہ لکھی گئیں ہندوستانی کہتے ہیں لیکن ان کتابوں کے لکھنے والے اپنی کتاب کی زبان کو اردوئے معلیٰ، ریختہ یا ہندی کہتے ہیں"۔۔۔۔۔۔

"غرض وہ تمام کتابیں جن کے نام میں نے لیے ہیں اُسی زبان میں ہیں جسے ہم آج کل اردو کہتے ہیں۔ انگریز اسے ہندوستانی کہتے تھے۔ ہندوستانی سے ان کی مراد وہ صاف اور فصیح زبان تھی جو بول چال میں آتی تھی یعنی ایسی زبان جو مقفیٰ، مسجع اور پر تکلف نہ ہو جس کا رواج اس زمانے کی بعض کتابوں میں پایا جاتا تھا۔ اردو، ریختہ، ہندی اس زمانے میں ہم معنی لفظ تھے۔ چنانچہ مرزا جان طپش نے اپنی کتاب "شمس البیان" میں ہندی کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ "ہندی عبارت از زبان موزوں دہلی است" یعنی ہندی سے مراد دلّی کی فصیح زبان ہے۔ جدید ہندی جس کی اشاعت کی آج کل کوشش کی جا رہی ہے نئے زمانے کی پیداوار ہے"۔[1]

مولوی عبدالحق ہندوستانی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اب سوچ بچار کے بعد ہندوستانی کے یہ معنی قرار پائے ہیں کہ وہ زبان جو جو شمالی ہند میں عام طور پر بولی جاتی ہے اور جو ثقیل اور نامانوس سنسکرت اور عربی فارسی الفاظ سے پاک ہے۔ اصل میں ہندوستانی کی یہ تعریف ڈاکٹر گریرسن کے بیان سے لی گئی ہے

---

[1] ہندوستانی (ریڈیائی تقریریں) مکتبہ جامعہ دہلی، ص ۲۳ تا ۲۴۔

اور اس تعریف کو اکثر ان لوگوں نے قبول کر لیا ہے جو ہندوستانی کے حامی ہیں۔۔۔۔۔۔نتیجہ یہ کہ آسان اردو کا نام ہندوستانی ہوا۔۔۔۔۔۔ اس کے بعد اگر کوئی مجھ سے پوچھے گا کہ ہندوستانی زبان کسے کہتے ہیں تو میں اس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ جس زبان میں، میں نے آج تقریر کی ہے یہی ہندوستانی ہے۔[1]''

مولوی عبدالحق ناگپور کے ساہتیہ پریشد اجلاس سے پہلے ۱۹۳۶ء تک ہندوستانی زبان بنائے جانے کی اصول پر قایم رہے۔ انھوں نے کبھی ہندی یا کسی دوسری زبان کی مخالفت نہ کی، یہ ان کے اصول اور شعار کے خلاف تھا البتہ جب اس کی مخالفت کی گئی اور اس کے رستے میں روڑے اٹکائے گئے تو انھیں مجبوراً اس کی مدافعت کرنی پڑی۔ حفاظت اور سلامتی کے لیے مدافعت لازم ہے۔[2] ۱۹۳۵ء میں گاندھی جی کے مشورے سے منشی کنہیا لال جو اس وقت غذائی وزیر تھے مولوی عبدالحق صاحب سے حیدرآباد ملنے گئے اور انھوں نے ایک ایسی انجمن بنانے کے بارے میں گفتگو کی جس میں ہر زبان کے ادیب شریک ہوں تاکہ ایک دوسرے کی زبان اور اس کے ادب سے واقفیت حاصل ہو سکے۔ چوں کہ یہ ایک نیک کام تھا اور ادبی معاملہ تھا مولوی صاحب نے اسے منظور کر لیا۔ مولوی صاحب ناگپور کی رپورٹ میں اس واقعہ کے بارے میں لکھتے ہیں :

''۱۹۳۵ء میں مسٹر کنہیا لال منشی (غذائی وزیر) مجھ سے حیدرآباد آکر ملے۔ اور بیان کیا کہ ہم ایک ایسی انجمن بنانا چاہتے ہیں جس میں ہر زبان کے ادیب شریک ہوں تاکہ ایک دوسرے کے ادب کے حالات اور معلومات سے واقفیت حاصل ہو سکے۔ آپ اس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہو جائیے۔ چوں کہ ادبی معاملہ تھا، میں نے منظور کر لیا۔[3]''

گاندھی جی مشہور و ممتاز سیاست داں تھے لیکن ان کے ادبی مشیروں میں کے۔ ایم۔ منشی اور کاکا کالیکر کے نام نمایاں تھے۔ ان میں سے ایک گجراتی اور دوسرا مرہٹی کا مشہور مصنف تھا۔ ان حضرات نے ہندوستانی کے خلاف گاندھی جی کو بھڑکایا۔ یہ دونوں ہندی ساہتیہ سمیلن کے روح رواں تھے انھوں نے گاندھی جی کو اس بات پر آمادہ

---

[1] ہندوستانی (ریڈیائی تقریریں) مکتبہ جامعہ۔ دہلی، ص ۲۶، ۲۷، ۳۰۔

[2] مکتوباتِ عبدالحق: جلیل قدوائی، ص ۲۴۸۔

[3] رپورٹ تیسری کل ہند کانفرنس۔ ناگپور، ص ۱۱۲۔

کر لیا کہ ساہتیہ پریشد کے اجلاس کے ساتھ ہندی ساہتیہ سمیلن کا اجلاس بھی رکھ لیا جائے۔ غرض ساہتیہ پریشد کا اجلاس اپریل ۱۹۳۶ء کو ناگپور میں ہوا جس میں گاندھی جی اور ہندی ساہتیہ سمیلن کے ممبروں کے علاوہ پنڈت جواہر لال نہرو، منشی پریم چند، آچاریہ نریندر دیو، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور مولوی عبدالحق وغیرہ شامل تھے۔ جلسے میں ہندی کے طرف داروں کی تعداد کافی تھی اس لیے بحث و مباحثے کے بعد ہندی کو منظور کر لیا گیا۔ اس پر مولوی عبدالحق نے ساہتیہ پریشد کی ورکنگ کمیٹی سے استعفا دے دیا۔ مولوی صاحب نے اس کی پوری روداد لکھی ہے۔ یہاں اس اجلاس میں گاندھی جی اور مولوی عبدالحق کی بحث کے چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔

"۱۹۳۶ء میں اس کا سالانہ جلسہ ناگپور میں گاندھی جی کی صدارت میں ہوا۔ اس انجمن کا نام اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد تھا۔ اس میں ایک مسئلہ یہ پیش ہوا کہ پریشد کی زبان کیا ہونی چاہیے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا "ہندوستانی" گاندھی جی نے دریافت کیا کہ میں ہندوستانی کیوں تجویز کرتا ہوں۔ میں نے کہا اس لیے کہ انڈین نیشنل کانگرس کا یہ رزولیوشن ہے کہ کانگرس کی اور ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی نیز کانگریس کے آئین کی دفعہ ۲۱ میں صاف طور سے یہ درج ہے۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ اس کا یہ مطلب نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ہر دس سال کے بعد مطلب بدلتا گیا تو کام کیسے چلے گا گاندھی جی ہندی کے حق میں تھے جب بحث زیادہ بڑھی تو گاندھی جی نے پینترا بدلا اور ایک نئی زبان اور نیا نام تجویز کیا یعنی ہندی ہندوستانی۔ میں نے پوچھا، ہندوستانی سے آپ کا کیا مطلب ہے فرمایا وہ زبان جو کتابوں میں ہے، بول چال میں نہیں، پھر میں نے پوچھا ہندوستانی سے آپ کا کیا مطلب ہے تو فرمایا وہ زبان جو بول چال میں ہے کتابوں میں نہیں۔ اس پر میں نے کہا تو پھر ہندی، ہندوستانی زبان کیا ہوئی۔ فرمایا وہ زبان جو آگے چل کر ہندوستانی ہو جائے گی۔ میں نے عرض کیا کہ جب ہندوستانی پہلے سے موجود ہے تو پچاس سال اور انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس پر انھوں نے جھنجھلا کر کہا، میں ہندی نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نے عرض کیا، جب آپ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم اردو کیوں چھوڑ دیں۔ اس پر انھوں نے ایسا عجیب وغریب جواب دیا جس کی ان سے توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ فرمایا کہ مسلمان چاہیں تو اردو رکھ سکتے ہیں۔ یہ ان کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔

مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی۔ اس کے بعد بحث کی گنجائش باقی نہ رہی اور میں نے اکھل
بھارتیہ ساہتیہ پریشد کی کمیٹی سے استعفا دے دیا۔ اب ہماری آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا
کہ زمانے کا رنگ کچھ اور ہے۔[1]

ساہتیہ پریشد کا اجلاس صبح سے شام تک جاری رہا اور طویل بحث کا سلسلہ ختم ہونے کا نام نہ لیتا۔ دوسرا اجلاس سہ پہر کے بعد شروع ہوا۔ پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس اجلاس میں موجود تھے۔ مولوی عبدالحق گاندھی جی کے بعد پنڈت نہرو کا احترام اسی طرح کرتے تھے جس طرح گاندھی جی کا کرتے تھے اس لیے انھیں یہ امید تھی کہ بہ حیثیت صدر کانگرس وہ عبدالحق صاحب کی تائید کریں گے۔ لیکن جب پنڈت نہرو کی طرف سے خاموشی دکھائی دی تو انھیں بڑا دکھ ہوا۔ جب کہ اس موقع پر تین تین صدر کانگرس موجود تھے۔ اور ان میں سے کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ حق اور سچائی کی موافقت میں اظہار خیال کرے۔ اس لیے ہندی کثرت رائے سے منظور کرلی گئی۔

اس اجلاس کے بعد مولوی صاحب بد دل ہو گئے۔ جن پتوں پر تکیہ کیا تھا وہی ہوا دے گئے۔ اس کا علاج کسی کے پاس نہ تھا۔ اب مولوی صاحب کی توجہ شمالی ہند کی طرف زیادہ ہو گئی۔ انھوں نے اکتوبر ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا اردو کانفرنس علی گڑھ میں اسی غرض سے بلائی کہ اس میں صورت حال کا جائزہ لیا جائے۔ چنانچہ کانفرنس کے اجلاس میں یہ رزولیوشن پاس ہوا کہ انجمن کا صدر دفتر اورنگ آباد کے بجائے دہلی منتقل کر دیا جائے تاکہ مولوی صاحب یہاں رہ کر اردو کے فروغ کے لیے کام کر سکیں۔ مولوی صاحب کا بیان ہے کہ ناگپور کے جلسہ ساہتیہ پریشد نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ اور جگہ جگہ اپنی تقریروں میں ناگپور کو جاگپور کا نام دیا۔

مولوی عبدالحق کو اردو سے محبت جنون کی حد تک تھی اس لیے انھوں نے انجمن کے سکریٹری کی حیثیت سے ملک کے مختلف مقامات کے دورے کیے۔ بنگال، بہار، اتر پردیش، سندھ، کشمیر، گوالیار صوبوں کے علاوہ جنوبی ہند میں مدراس، آندھرا پردیش، شمالی ارکاٹ، جنوبی ارکاٹ، تامل ناڈ اور ٹراونکور کے دورے کیے اور اردو میں تقریریں کیں اور لوگوں کو اردو کی امداد کے لیے آمادہ کیا۔ جہاں انجمن کی شاخیں نہیں تھیں وہاں شاخیں قائم کیں۔ اس طرح مولوی صاحب نے ہندوستان میں انجمن کی شاخوں کا جال بچھا دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت چاروں طرف ان کے ہم خیال موجود تھے اور ہندوستان کے کونے کونے سے اردو کے حق میں آوازیں بلند ہونے لگیں

---

[1] رپورٹ تیسری کل ہند کانفرنس ناگپور، ص ۱۱۳۔

چنانچہ نومبر ۱۹۳۸ء میں مولوی صاحب نے انجمن کا صدر دفتر دلی منتقل کر دیا۔ یہاں حالات کا جائزہ لینے کے بعد انھوں نے ۲۰ر جنوری ۱۹۴۰ء میں ناگپور میں اردو کانفرنس منعقد کی جہاں طے کیا گیا کہ ہندوستان میں کسی موزوں مقام پر اردو یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اس تاریخی تجویز کا ملک کے طول و عرض میں بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ مولوی صاحب کی عمر بھی خاصی ہو چکی تھی اور کام اب پہلے کے مقابلے میں کافی بڑھ گیا تھا۔ مگر انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ اس سلسلے میں اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"روز بروز کام اس قدر بڑھتا جاتا تھا کہ بعض وقت گھبرا جاتا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیوں کر سمیٹوں۔ میں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں، کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ انجمن کے کام اور اس کی مشکلات اس قدر بڑھتی جاتی تھیں کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے یا نو بجے سے جو بیٹھتا تو کام کرتے کرتے شام ہو جاتی۔ بیچ میں چائے پینے اور اخبار پڑھنے کے لیے ایک گھنٹہ مل جاتا پھر بھی کام پورا نہیں ہوتا تھا۔"[1]

ساہتیہ پریشد کے اجلاس کے بعد مولوی صاحب اردو کے تحفظ کے لیے کمر بستہ ہو گئے اور انھوں نے ناگپور ہی میں پے در پے کئی اردو کانفرنسیں کر کے اردو عوام طبقے کو بیدار کر دیا۔ انھوں نے ناگپور میں ۳۸ء اور ۴۰ء کی کانفرنسوں کے بعد جنوری ۱۹۴۴ء میں کل ہند پیمانے پر بڑا بھاری اجتماع کیا۔ جس میں تین سو سے زیادہ مندوبین نے شرکت کی بحالاں کہ عالم گیر جنگ کے خاتمے پر جو بربادی ہوئی اس کے اثرات زندگی کے مختلف شعبوں پر پڑے۔ اس کے باوجود مہمانوں کے قیام و طعام کا انتظام بڑی فراخ دلی سے کیا گیا۔ برقی روشنی کی کثرت سے چاروں طرف پنڈال کے وسیع شامیانے میں دن کا سماں نظر آتا تھا۔ کانفرنس کا افتتاح نواب مرزا یار جنگ، حیدر آباد نے کیا اور ۱۹ر جنوری کے جلسے کی صدارت نواب حیدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی رئیس حبیب گنج علی گڑھ نے کی۔ مولوی عبدالحق نے سکریٹری کی حیثیت سے پوری روداد ساہتیہ پریشد جس میں گاندھی جی نے اردو کی مخالفت اور ہندی کے حامی کی حیثیت سے رول ادا کیا تھا، پڑھ کر سنائی۔ انھوں نے عوام کو مخاطب کر کے کہا۔

"وہ (گاندھی جی) ہندی کو ہندوستان کی عام زبان بنا کر رہیں گے۔ ہمیں خواب خرگوش سے بیدار کیا۔ اس وقت ہماری آنکھیں کھلیں اور ہم سمجھے کہ کمروں میں بیٹھ کر کاغذ

---

[1] مکتوبات عبدالحق : جلیل قدوائی، ص ۲۶۴، ۲۶۸۔

سیاہ کرنے اور قلم گھسنے سے کیا حاصل اور یہ سب کچھ کس دن کے لیے اور کس کے لیے۔
تب انجمن کے مقاصد میں اشاعت وحفاظتِ زبان کا مقصد بڑھانا پڑا اور انجمن میدان میں آئی۔ پہلی مہم کا آغاز اسی شہر سے ہوا جسے میں نے اس کے بعد سے "جاگ پور" کا نام دیا۔ کیوں کہ اس نے ہمیں اور آپ کو جگا دیا۔[1]

اس تقریر کا اثر اردو طبقے پر خاص طور پر پڑا۔ اب انجمن ترقی اردو کے حامیوں کی تعداد خاصی بڑھ گئی تھی اخباروں اور رسالوں میں اردو کی افادیت پر زور دیا جانے لگا یہاں تک کہ اردو تحریک اس زوروں پر چلی کہ گاندھی جی کے خیالات میں زبان کے مسئلے پر تبدیلی پیدا ہوئی۔ بالآخر ۱۹۴۴ء کے آخر میں گاندھی جی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور فروری ۱۹۴۵ء کو انھوں نے ہندوستانی لٹریچر بورڈ قائم کیا جس کے دس ممبروں میں ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر ذاکر حسین، پنڈت سندرلال، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری وغیرہ تھے۔ گویا دس برس کے بعد اس بات کا احساس ہوا کہ ہندوستان کی ہندی کے بجائے ہندوستانی زبان ہونی چاہیے۔ گاندھی جی نے اس سبھا کا اجلاس ۲۶ فروری کو واردھا میں بلایا تھا اور اس میں جو تقریر انھوں نے کی اور جو بات ناگپور میں رد کر دی تھی یہاں کھلے دل سے اس کا اعلان کیا کہ "مولوی صاحب کو دوست کر کے بلایا تھا وہ دشمن ہو کر گئے، غلطی میری تھی۔ میں ان کی بات کو نہیں سمجھا۔" اس اجلاس میں ڈاکٹر تاراچند کے اصرار پر مولوی عبدالحق صاحب نے شرکت کی تھی۔ غرض ہندو مسلم مفاہمت کے لیے گاندھی جی نے یہ قدم اٹھایا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم طبقہ خاصی بڑی تعداد میں کانگرس کے خیالات کا حامی ہو گیا لیکن اردو سے محبت اس کا پرچار اس کا نصب العین قرار پایا۔ مولوی عبدالحق کے ساتھ پنڈت برج موہن دتاتریا کیفی اور مولوی ہاشمی فرید آبادی ان کے ہم نوا تھے۔ اردو کی لسانی خدمات میں ان کا بڑا اہم رول رہا ہے کبھی کبھی ان حضرات کو دھمکیاں بھی دی جاتیں کہ وہ اردو کے پرچار اور اس کو عوامی طاقت بنانے سے گریز کریں۔ مگر ان حضرات نے ان دھمکیوں کی کبھی پرواہ نہیں اور وہ برابر مولوی صاحب کے شانہ بہ شانہ اردو کی خدمت کرتے رہے۔

۱۴ر جولائی ۱۹۴۷ء کو مولوی عبدالحق کے دوست کے بیٹے نے ہوائی جہاز سے حیدرآباد جانے کے دو ٹکٹ منگوا لیے۔ دوسرے دن ہوائی جہاز سے روانہ ہونا تھا۔ وہ ان کے ساتھ جانا نہیں چاہتے تھے مولوی صاحب کا بیان ہے کہ "میں اس لیے بھی ان کے ساتھ نہیں جانا چاہتا تھا کہ وہ میرا ٹکٹ خرید لیتے ہیں اور رقم نہیں لیتے۔ میں ان کے

---

[1] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، مولوی ہاشمی فرید آبادی، ص ۱۳۱

والد کا دوست ہوں۔ یہ میرے سامنے کے بچے ہیں۔ لیکن انھوں نے میری اور انجمن کی ایسی محبت اور خلوص سے خدمت کی ہے کہ میں بعض اوقات ان کی بات ماننے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔"[۱]

مسئلہ یہ تھا نواب سر مرزا اسماعیل نے انجمن کی سالانہ مالی امداد بند کر دی تھی اس کے اجرا کا بھی موقع تھا اس لیے مولوی صاحب کو حیدر آباد جانا پڑا۔ اس کے علاوہ اردو کی ترقی و اشاعت کے لیے ایک لمیٹڈ کمپنی بنانے کا ارادہ تھا۔ ان تمام کاموں سے اگست ۴۷ء تک نجات مل پائی۔ اسی دوران انگریز حکومت نے ہندوستان کی تقسیم کا اعلان کر دیا۔ ۳ ستمبر ۴۷ء کو ٹرین کے ذریعہ حیدر آباد سے بھوپال روانہ ہوئے۔ سفر میں سید علی شبّر حاتمی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ تقسیم کے اعلان کے بعد ہی ہندو مسلم فساد پھوٹ پڑا۔ مسلمان ہجرت کر کے پاکستان جانے لگے۔ دونوں طرف سے قتل و غارت گری ہونے لگی۔ بارہ دن تک بھوپال میں شعیب قریشی صاحب کے اصرار پر رکے رہے۔ پھر وہیں مولوی صاحب کو ملیریا ہو گیا اچھا ہوتے ہی وہ ۲۵ ستمبر کو پھر حیدر آباد کے لیے روانہ ہو گئے کہ وہاں کچھ کام باقی رہ گئے تھے ان کو مکمل کر دیا جائے، ممکن ہے کچھ دنوں کے بعد دلّی کی حالت بہتر ہو جائے۔ چاروں طرف قتل و غارت اور خون ریزی کا بازار گرم تھا۔ بالآخر ۹ نومبر ۴۷ء کو مولوی صاحب حیدر آباد سے دلّی کے لیے روانہ ہوئے۔ دلّی میں ان کا قیام مولانا ابوالکلام آزاد کے یہاں ایک ہفتے رہا۔ مولوی شبّر حاتمی ایک روز پہلے دلّی پہنچ چکے تھے۔ اسی دن ۱۰ نومبر کو انجمن کا دفتر دیکھنے گئے تو وہاں پر بھارت انشورنس کمپنی لاہور نے پوری کوٹھی پر قبضہ کر رکھا تھا۔ انجمن کے ضروری کاغذات منتشر حالت میں پڑے ہوئے دیکھ کر مولوی صاحب کو سخت افسوس ہوا۔ کتابیں اور قلمی مسودات البتہ الماریوں میں بند تھے۔ لیکن آہنی تین الماریوں کے سوا باقی لکڑی کی الماریاں تھیں جن کی حفاظت کی کوئی گارنٹی نہیں تھی۔ مولوی عبدالحق انجمن کے دفتروں کے کمروں کی حالت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "میرا جی دھکڑ پکڑ کر رہا تھا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ میری ان کتابوں کا کیا حشر ہوا جو میرے کمرے میں تھیں، جس کمرے میں، میں کام کرتا تھا وہ بہت بڑا اور وسیع تھا۔ کوٹھی بھر میں اس سے بڑا کوئی ہال نہ تھا اس میں کتابوں کی متعدد الماریاں تھیں، کھلی الماریوں کے سوا دو بڑی فولادی[۲]

۱۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص ۱۷۱۔

۲۔ بڑی فولادی (آہنی) الماریاں دو نہیں تین تھیں جن میں قلمی کتابیں تھیں۔ بلوائیوں نے ان کو باہر دوسرے سامان کے ساتھ کھلی جگہ پر ڈال دیا تھا جہاں بارش کی وجہ سے اندر کے قلمی نسخے بہت خراب ہو گئے۔ بڑی مشکل سے ان کو علی گڑھ منتقل ہونے کے بعد علاحدہ کرایا گیا اور ان کی جلد بندی کرائی گئی۔

الماریاں جن میں خاص خاص نادر قلمی نسخے اور قدیم فرامین اور کاغذات اور بعض نامور اشخاص مثلاً ناسخ، غالب، سر سید، حالی، محسن الملک، اقبال، سر تیج بہادر سپرو وغیرہ کے خطوط اور اسی قسم کی بہت سی عزیز اور بیش قیمت اشیا تھیں، ان کے علاوہ کئی بڑے بڑے صندوق تھے۔"[1]

گویا مفسدوں نے انجمن کا بیشتر حصہ برباد کر دیا تھا۔ مولوی صاحب اپنا ذاتی کتب خانہ دو تین مرتبہ میں کراچی لے گئے باقی ساز و سامان علی گڑھ میں مولانا آزاد کے توسط سے منتقل کرا دیا گیا۔ اور اس کے سکریٹری قاضی عبدالغفار مقرر ہوئے۔ صدر ڈاکٹر ذاکر حسین کو بنایا گیا، خطوط اور فرامین مولوی صاحب سب ساتھ لے گئے یہاں اس قسم کا سامان علی گڑھ میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ انجمن کے کتب خانے کی شیرازہ بندی میں کئی سال کی محنت اور جدوجہد کے بعد کر پایا۔ نادر اور قلمی نسخے جو بلوائیوں کی زد سے باقی بچ گئے تھے ان کو علی گڑھ منتقل کر دیا گیا۔ دلّی میں کتب خانے کی کتابوں اور دوسرے سامان کی جو بربادی ہوئی اس کی تفصیل انجمن ترقی اردو کے ذیل میں کر دی گئی ہے۔ مولوی عبدالحق اس سلسلے میں لکھتے ہیں :

"جب حیدر آباد پر بھارت نے قبضہ کر لیا تو میں (عبدالحق) ۲ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کو دلّی روانہ ہوگیا۔ سب معاملات کا تصفیہ کرنے کے بعد ۶ر جنوری ۱۹۴۹ء کو دہلی سے رخصت ہوا۔ بھوپال اور بمبئی میں کچھ دن قیام کر کے ۲۸ر جنوری ۱۹۴۹ء کو کراچی پہنچا۔ میں اپنے ساتھ اپنا کتب خانہ بھی لیتا آیا جو نادر و نایاب مخطوطات اور مطبوعات پر مشتمل ہے۔"[2]

غرض ہندوستان میں جب اردو کی خدمت اور اس کے فروغ کی سب کوششیں بے کار ہوگئیں تو کافی غور و خوض کے بعد مولوی صاحب نے طے کیا کہ اب پاکستان میں رہ کر ہی اردو کے فروغ کا کام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ۲۸ر جنوری ۱۹۴۹ء کو وہ ہوائی جہاز سے کراچی چلے گئے، ہوائی اڈے پر شعیب قریشی، پیر حسام الدین راشدی، سید ہاشمی فریدآبادی اور عبداللطیف خاں ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ کراچی کو اپنا صدر مقام بنایا۔ کراچی میں ایک پرانی عمارت ۱۰ر مارچ ۱۹۴۸ء سے پہلے مولوی عبدالحق کے قبضے میں سید علی شبر حاتمی کی کوشش اور مصلحت شناسی کی

---

[1] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص ۱۹۰۔

[2] اردو کا المیہ۔ مولوی عبدالحق، ص ۷۔

وجہ سے قبضے میں آچکی تھی۔ اور یہاں انھوں نے انجمن ترقی اردو پاکستان قائم کرکے کام شروع کردیا۔ اس طرح مولوی صاحب نے یہاں نئی مہم کا آغاز کیا۔ یہ پُرانی عمارت بڑی کشادہ اور کئی منزلہ ہے کمرے بھی کافی ہیں۔ اسی جگہ میں ایک طرف مولوی صاحب نے انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام اردو کالج قائم کیا۔ اور پڑھائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شروع کے یہ دن بڑے صبر آزما اور مصیبت کے تھے، مولوی صاحب اس سلسلے میں لکھتے ہیں :

"مصیبت بعض اوقات رحمت ثابت ہوتی ہے ۔۔۔۔۔۔ یہ تازیانے کا کام دیتی ہے جس سے سوئی ہوئی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں اور اٹی ہوئی سوتیں کھل جاتی ہیں ۔۔۔ ۔۔۔ جو کام پہلے اَن ہونے معلوم ہوتے تھے وہ آسان نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ وقت ہم پر بھی ایسا ہی آیا تھا۔ یہ درحقیقت ہمارے امتحان کا وقت تھا۔ میں سدا کا پردیسی ہوں۔ نہ کبھی گھر بنایا اور نہ کبھی گھر میں رہنا نصیب ہوا۔ ایک جھونپڑا تھا سو خدا کا شکر ہے وہ بھی نہیں (رہا) انجمن کے ایک لٹے پٹے قافلے کی طرح پاکستان پہنچی اور کراچی آکر اطمینان کا سانس لیا۔ باوجود بے سروسامانی اور ناداری اور باوجود طرح طرح کی مشکلات کے ہم ہمت نہیں ہارے اور کچھ دنوں کے بعد انجمن نے پھر اپنا کام شروع کردیا ۔۔۔" [۱]

مولوی عبدالحق زندگی بھر اردو کی خدمت اور اردو تحریک کو فعال بنانے میں مصروف رہے اور اردو کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ لیکن اپنی کبھی پروا نہیں کی۔ اپنے لیے نہ گھر بنوایا اور نہ سر چھپانے کے لیے کوئی ایسا آسرا تلاش کیا جہاں آرام و سکون سے زندگی بسر کرسکتے۔ انجمن کا دفتر، ان کی زندگی اور یہی ان کا گھر تھا۔ کراچی میں انجمن ہی کے زیر سائے اردو کالج قائم کیا، کالج کیا قائم کیا بیٹھے بٹھائے مصیبت مول لے لی۔ ان کی عجلت ہی ان کے لیے مصیبت بنی۔ کسی یونیورسٹی نے اردو کالج سے الحاق کرنا منظور نہیں کیا۔ اس سے ان کی ہمت اور پست ہوتی چلی گئی۔ کالج کے سلسلے میں لکھتے ہیں :

"پہلے ہی پریشانیاں کیا کم تھیں۔ یہ کالج قائم کرکے میں نے بیٹھے بٹھائے ایک پریشانی اور مول لے لی۔ کوئی یونیورسٹی اس کے الحاق کے لیے آمادہ نہیں تھی، سندھ یونیورسٹی نے انکار کردیا۔ پنجاب یونیورسٹی کی حدود سے باہر تھا۔ ۔۔۔۔ ہم ہندوستان سے لٹ پٹ

---

[۱] بابائے اردو احوال و افکار، ص ۱۹۹۔

کے برباد ہو کے آئے تھے، توقع تھی پاکستان ہمارے آنسو پونچھے گا اور ہمت افزائی کرے گا لیکن اب جو دیکھا تو یہاں کا رنگ، ہی کچھ اور تھا۔۔۔۔ کہاں تک لکھوں بڑی طولانی داستان ہے۔"[1]

کالج کے الحاق کے لیے مولوی صاحب ایک سال سے زاید عرصے تک لڑتے رہے اور اس عرصے میں اور اس عمر میں شب و روز محنت اور کوشش کرتے رہے۔ کالج کے طلبہ بھی ان کی اس ہمت اور حوصلے کی قدر کرتے اور ان کو دیکھتے تو خوش ہو جاتے مگر مولوی صاحب بھی ان کو الحاق کا برابر یقین دلاتے رہے۔ کالج کے تمام مضامین کی تعلیم اردو زبان کے ذریعہ دی جاتی۔ انجمن کا یہ بڑا کارنامہ تھا۔ کالج کے پرنسپل میجر آفتاب تھے۔ مولوی عبدالحق انجمن کے صدر اور کالج کے نگراں تھے۔ مولوی صاحب کو کالج کے حسابات کے بارے میں گڑبڑ کا علم ہوا تو انھوں نے ایک تحقیقاتی کمیٹی کی سفارش کی جو کالج کے حسابات اور حالات کی تنقیح کر کے مجلس نظما میں اس کی رپورٹ پیش کرے۔ مولوی صاحب کا اس کمیٹی کے مقرر کرانے کا یہ منشا تھا کہ کالج کے حسابات درست ہو جائیں اور آیندہ کوئی گڑبڑ نہ ہو لیکن اس کا اثر الٹا ہوا۔ میجر آفتاب اور ان کے رفیقوں نے مولوی صاحب اور انجمن کے خلاف غلط پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ غلط پروپیگنڈے اور سازش سے مجلس عاملہ میں اپنی اکثریت بڑھالی اور تخریبی کارروائیوں کا جال بچھا دیا۔ سید محمود صاحب کو معتمد بنایا۔ محمود صاحب مولوی صاحب کے خلاف تھے غرض کالج اور انجمن دونوں کے خلاف مولوی صاحب کو آلۂ کار بنایا۔ انجمن اور کالج کا سارا روپیہ ان تخریبی کاموں میں صرف کر دیا اور انجمن کے پاس اب اتنی رقم باقی نہیں رہی کہ کتابیں چھاپ سکے۔ پریس کی حالت بھی ابتر تھی اس کا درست کرنا بھی آسان کام نہ تھا۔ مولوی صاحب کو اذیت پہنچانے اور ان کو پریشان کرنے میں تخریب کاروں کو لطف محسوس ہوتا۔

---

[1] بابائے اردو احوال و افکار، ص ۱۹۹، ۲۰۰۔

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ

ڈاکٹر عبدالحق کے تحقیقی کارنامے

حکایت از قدآں یار دل نواز کنیم
باایں فسانہ مگر عمر خود دراز کنیم

"بابائے اردو" کو لوگ اردو کے خدمت گزار اور عاشق زار کی حیثیت سے جتنا جانتے ہیں، اتنا "محقق" کی حیثیت سے نہیں۔ سچ پوچھیے تو بابائے اردو کا بڑا کارنامہ اردو ادب کے ان شعراء اور محققین کو زندگی عطا کرنا ہے جو معنوی طور پر مر چکے تھے۔ اس طرح وہ اردو کے "بابا" ہی نہیں "مسیحا" بھی ہیں، جنھوں نے اپنی تحقیقات سے کئی مُردوں کو زندہ کیا، کئی جاں بہ لب مریضوں کو چنگا کیا۔ ان کی بے گور و کفن لاشوں کو منزل مقصود پر پہنچایا اور اردو کے جسد بے جان میں زندگی کی روح پھونکی۔ اردو کا قدیم دور، ان ہی کی تحقیقات کی بدولت زندہ ہے۔ مولوی صاحب کی ذات ہزار شیوہ اور ہزار رنگ ہے۔ انھوں نے انشائیے بھی لکھے۔ سیرت نگاری بھی کی، تنقیدیں بھی کیں، لسانیاتی بحثیں بھی چھیڑیں، تراجم بھی کیے، وہ لغت اور قواعد نگاری کے بھی رمز آشنا ہیں لیکن تحقیق کا پلہ سب پر بھاری ہے۔ ان کی تحقیق کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایسی "لچک" ہے کہ وہ ہر زمانے میں زندہ رہ سکتی ہے۔ حالاں کہ تحقیق میں "حرف آخر" نہیں ہوتا، کیوں کہ "سب کچھ" کہنے کے بعد بھی "بہت کچھ" کہنے کی گنجائش باقی رہتی ہے اور پچھلے نظریے باطل ہو سکتے ہیں۔ مولوی صاحب آنے والوں کے لیے بہت کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رکھتے۔ وہ اپنے موضوع کا پوری طرح مطالعہ کر کے آگے بڑھتے ہیں۔ ان کی تحقیق اتنی جامع ہوتی ہے کہ پھر مزید تحقیق کی گنجائش نہیں رہتی۔

ان کی تحقیقات، اردو زبان کے متعلق بھی ہیں اور ادب کے تعلق سے بھی۔ دونوں میں ان کا طریقہ استخراجی (Inductive) بھی ہے اور اشتقاقی (Derivative) بھی یعنی وہ اندرونی اور بیرونی، دونوں شواہد (Evidences) سے کام لیتے ہیں۔ پھر لطف یہ کہ تحقیق میں یبوست یعنی "خشکی" نہیں پیدا ہونے پاتی بلکہ شگفتگی برقرار رہتی ہے۔ یہ ایسا کارنامہ ہے جس کی وجہ سے ان کی تحقیقات "محقق" اور "متعلم" سے قطع نظر، عام آدمی

(Lay man) کے لیے بھی دلچسپی کا باعث ہوتی ہے۔ ان کے پیش رو اور مابعد کے محققین میں بھی، بجز چند کے، بہت کم ہیں، یہ خصوصیت نظر آتی ہے۔ حالی اور آزاد کے پاس شگفتگی ہے لیکن دقت نظر نہیں شبلی کے پاس دقت نظر ہے۔ لیکن شگفتگی کا فقدان ہے۔ مولوی عبدالحق کی تحقیق، حالی اور شبلی دونوں کا سنگم ہے۔ وہ اپنے اسکول کے آپ بانی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ "عبدالحق اسکول" کا اثر زیادہ تر جامعہ عثمانیہ ہی کے اساتذہ پر پڑا۔ جنھوں نے مسیحائے اردو سے فیض حاصل کیا۔ یوں تو مولوی صاحب کے تحقیقاتی کارناموں کی فہرست طویل ہے۔ لیکن مضامین سے قطع نظر، یہاں صرف مستقل تصانیف میں ذیل کے نوادر قابل قدر ہیں :

(۱) اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام (۲) مرحوم دہلی کالج (۳) نصرتی (۴) مقدمہ قطب مشتری۔ (۵) سب رس (۶) مقدمہ باغ و بہار (۷) مقدمہ معراج العاشقین (۸) قواعد اردو (۹) مقدمہ گلشن ہند (۱۰) مقدمہ خطبات گارساں دتاسی (۱۱) مرہٹی کا اثر فارسی زبان پر۔

اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام

مولوی صاحب کی یہ تصنیف بیک وقت سیرت بھی ہے، تذکرہ بھی اور ٹھوس تحقیق بھی نہ صرف یہ اردو کے آغاز پر روشنی ڈالتی ہے بلکہ لسانیاتی پہلو سے بھی یہ بہت اہم کارنامہ ہے۔ کیوں کہ اس میں نہ صرف اردو کے ابتدائی "روپ" نظر آتے ہیں بلکہ مسلمانوں کی آمد کے بعد کے ہندوستان کی سماجی و معاشی حالات سے بھی آگہی ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ان میں ان بزرگوں کی حیات کی تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ جنھوں نے اہل بھارت کے ذہنوں کو روشنی بخشی اور ایک نئے سماج کی تعمیر کی۔ تاریخی اعتبار سے یہ کافی اہم ہے۔ کیوں کہ اس نے اردو کی قدامت کو مستحکم کر دیا۔ مواد جمع کرنے کے لیے مولوی صاحب نے کس قدر محنت کی۔ اس کے ہر ورق سے ظاہر ہے۔ نہ صرف انھیں تواریخ کا مطالعہ کرنا پڑا بلکہ بزرگان دین کے ملفوظات اور تصانیف کو بھی کھنگالنا پڑا جن کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ اس تصنیف نے اردو کے آغاز کے پرانے نظریوں کو بھی باطل کر دیا۔ کیوں کہ مولوی صاحب نے نویں اور دسویں صدی عیسوی کے نمونے فراہم کیے اور اردو کی اشاعت کے ایک اہم ادارہ (Institution) (یعنی صوفیا کی مساعی) کو بیان کیا ہے۔

سب رس : دوسرا اہم کارنامہ دکنی شاعر وجہی کی تصنیف "سب رس" ہے۔ مولوی صاحب نے ہی دکنی دور کو کھوج کر نکالا اور ثابت کیا کہ دکنی دراصل اردو ہے۔ ورنہ بہت سے عالموں کو، دکھنی کو

اردو ماننے میں تامل تھا جن میں علامہ نیاز فتح پوری بھی شامل تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ دکھنی سے اردو کا ڈانڈا ملانا ایسا ہی ہے جیسا کہ انسان کو بندر کی ارتقا یافتہ شکل بتانا۔ یہ مولوی صاحب ہی کی تحقیق اور تجسس تھا جس سے دکھنی دور کا پورا ادبی سرمایہ فراہم ہوسکا۔ ان کے جلائے ہوئے دیوں کو ان کے جانشینوں ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری اور پروفیسر سید محمد صاحب نے فروزاں و تاباں کیا۔

"سب رس" مولوی صاحب کی تحقیق کا بڑا اچھا نمونہ ہے۔ سب سے پہلے مولوی صاحب نے کتاب کا ماخذ ڈھونڈا ہے اور بتایا ہے کہ یہ وجہی کا اپجی کارنامہ نہیں بلکہ فارسی قصہ "حسن و دل" کا ترجمہ ہے۔ پھر انھوں نے قصہ "حسن و دل" کے مختلف نسخوں سے جن میں نظم و نثر دونوں اصناف شامل ہیں، بحث کی ہے بعد میں وہ وجہی کے زمانے اور اس کے حالات کی تحقیق، اسی تصنیف کے اندرونی شواہد (Internal Evidences) سے کرتے ہیں۔ آخر میں نفس قصہ سے بحث کی ہے، جو فلسفیانہ نقطۂ نگاہ کی حامل ہے۔ یہ بحث بہت دلچسپ ہے۔ ساتھ ہی مولوی صاحب کا انداز بیان اتنا شگفتہ اور سلیس ہے کہ تحقیق کی خشکی محسوس نہیں ہونے پاتی۔

مقدمہ قطب مشتری :

اس کے بعد مولوی صاحب نے اسی مصنف کی دوسری تصنیف "قطب مشتری" کا سراغ لگایا ہے اور اس میں شک نہیں کہ قطب مشتری بیک وقت تحقیق بھی ہے اور تنقید بھی۔ کیوں کہ فرہنگ میں انھوں نے متروک دکھنی الفاظ کی شرح کی ہے۔ بلکہ نظم کے محاسن شعری کی وجہی کے نقطۂ نظر سے وضاحت بھی کی ہے۔ یہ اتنی جامع ہے کہ بعد کے آنے والے علماء اور متعلم، شاید اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔

نصرتی :

دکھنی دور ہی کے متعلق ان کا معرکۃ الآرا تحقیقی کارنامہ "نصرتی" ہے جس میں نصرتی کی شاعری کے جملہ اصناف، قصائد، مثنوی، غزل، رباعی، مرثیوں وغیرہ کا جائزہ لیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس عہد کے بہت سے واقعات کی تفصیل بھی اسی کی تصانیف کے حوالے سے دی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کتاب کے لیے انھیں پورے عادل شاہی دور کی تواریخ دیکھنی پڑی ہوں گی اور معاصر شعرا کے کارنامے دیکھنے پڑے ہوں گے۔ غرض مولوی صاحب کی ایک ادبی تصنیف بھی کئی سو کتابوں کے مطالعے، تفحص و تحقیق کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس محنت و کدوکاوش کی قیمت کو پُرلطف انداز بیان اور بڑھا دیتا ہے۔ مثلاً "سب رس"

کے دیباچے میں وجہی کے متعلق لکھتے ہیں :

ملا صاحب نے بظاہر تو اسے ایسے پیش کیا ہے کہ جیسے ان کی تصنیف ہو۔ لیکن دراصل یہ

. . . . فارسی مصنف کا ترجمہ ہے۔"

مرحوم دہلی کالج :

بھی اسی نوعیت کی تحقیق ہے ۔ اس میں مولوی صاحب نے انگریزوں کی آمد کے فوری بعد کے نثری اور علمی کارناموں کا اور ان مصنفین کا حال بیان کیا ہے جنھوں نے اردو میں ٹھوس کارنامے پیش کیے۔ مثلاً ماسٹر رام چندر جنھوں نے پہلی مرتبہ اردو میں ریاضی جیسے مشکل فن کو روشناس کروایا۔

تذکرہ گلشن ہند :

مرزا علی لطف کا تحریر کردہ ہے جو فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں شامل تھے۔ اس پر مولوی صاحب نے بڑی دقت اور محنت سے پیش لفظ لکھا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ مصنف کی کوتاہیاں اور لغزشیں بھی واضح کی ہیں۔ مصنف نے جہاں کسی شاعر یا ادیب کے حالات میں غلطی کی، وہاں مولوی صاحب نے دوسرے تذکروں سے مقابلہ و موازنہ کر کے اصلاح کی ہے۔ اسے اردو میں تحقیق در تحقیق کہہ سکتے ہیں یعنی انھوں نے صرف مواد کی پیش کش پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مواد کو بھی کھوجا اور جانچا ہے۔

مقدمہ معراج العاشقین :

ان سب سے اہم، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے قلمی رسالے معراج العاشقین کی دریافت اور اس کی اشاعت ہے۔ خواجہ صاحب کے اردو رسائل کے متعلق بڑے شبہات کا اظہار کیا جاتا تھا۔ خود مولوی صاحب نے بھی ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ڈرتے ڈرتے اس گتھی کو سلجھایا ہے۔ مگر ان کا قیاس ہی آنے والے علمار کے لیے "یقین" بن گیا۔ اور اردو کے تسلسل کی ابتدائی کڑیاں جو گم گشتہ تھیں، پھر سے جڑ گئیں۔ ورنہ بعض انگریز اور بنگالی علمار کی تحقیقات نے اردو کی ابتدا کو بہت پیچھے لا ڈالا تھا اور وہ کھڑی بولی کے روپ، ہندی کا مابعد روپ سمجھی جاتی تھی۔ کم از کم اس سے یہ مسلم ہو گیا کہ کھڑی بولی کے وہ علاحدہ علاحدہ ارتقا پائے ہوئے روپ، اردو اور ہندی ہیں۔ کیوں کہ ان کا آغاز ساتھ ساتھ ہوا۔ یہ نہیں کہ ہندی کے بعد اردو کا ارتقا ہوا۔ یہ دریافت بجائے خود ایک عظیم تحقیق تھی جس نے دوسروں پر تحقیق کے راستے کھول دیے۔

مقدمہ باغ و بہار

قصہ چہار درویش کا ایک ترجمہ عطا حسین خاں تحسین نے "نو طرز مرصع" کے نام سے کیا تھا لیکن یہ اپنے مرصع اسلوب کی وجہ سے مقبول نہیں ہو سکا۔ میر امن نے سلیس اور بامحاورہ اسلوب میں لکھ کر جدید نثر کی گویا داغ بیل ڈالی۔ اس طرح مولوی صاحب نے اس کتاب کو شایع کر کے نثر کے سادہ اسلوب کو رواج دیا۔ ساتھ ہی وہ اردو، ہندی کے تعلق سے بڑی پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔

نکات الشعراء

میر کے تذکرہ پر مولوی صاحب کی تحقیق اپنی نوعیت کی آپ ہے۔ اس میں بھی تحقیق پر تنقید کا رنگ غالب ہے۔ میر نے جن شعرا کا تذکرہ اپنی تصنیف میں کیا ہے۔ مولوی صاحب نے مقدمے میں ان لکھنے والوں کے متعلق بھی اشارے کیے۔ ساتھ ہی میر کے زمانے اور ان کے حالات زندگی کو بڑی محنت سے یکجا کیا اس تذکرے کے علاوہ مولوی صاحب نے قدیم شعراء کے اور بھی کئی تذکرے چھاپے۔ ادب کے علاوہ اردو زبان کی قواعد کی تدوین مولوی صاحب کا شاندار تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس میں اردو حروف تہجی، اردو افعال اور اردو صرف و نحو کا جس طرح مولوی صاحب نے مطالعہ کیا ہے، وہ اردو لسانیات کے متعلم کے لیے مشعل راہ ہے۔ یہ اردو کی بڑی جامع اور مانع قواعد ہے۔ اس کے بعد، یوں تو بہت سی قواعدیں لکھی گئیں لیکن سب قواعد نویسوں نے اس کی خوشہ چینی کی اور ان ہی کے فراہم کردہ مسالہ سے عمارت تعمیر کی۔ اسی نوعیت کی تصنیف "مرہٹی کا اثر فارسی زبان پر" ہے، جو بڑا اچھا لسانیاتی مطالعہ ہے۔

"خطبات عبدالحق" میں اکثر جگہ مولوی صاحب نے محققانہ رنگ اختیار کیا ہے۔ وہ بھی اردو کے تحقیقاتی ادب کے سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ مولوی صاحب کی خوبی یہ ہے کہ نہ صرف وہ خود تحقیق کے رسیا ہیں بلکہ اپنے طالب علموں میں بھی تحقیق کی لگن، لگا دیتے ہیں۔ اس کی مثال مرحوم شیخ چاند، پروفیسر عزیز احمد، ہاشمی فرید آبادی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں ہیں۔ متذکرہ بالا اصحاب بھی میدان تحقیق میں یکتا ہیں۔

مختصراً اردو زبان جب تک زندہ رہے گی اس کے متعلم، اس محقق اعظم کو فراموش نہیں کر پائیں گے جس نے اردو کو نہ صرف آن بخشی بلکہ "جان" بھی دی اور صحیح معنوں میں وہ مسیحا ہے۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی

مولوی عبدالحق اور ترقی پسند تحریک

ترقی پسند تحریک کے ابتدائی مراحل ومنازل پر اردو کے جن بزرگ وشہرت یافتہ ادیبوں اور شاعروں نے اس تحریک کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے اپنی علمی وعملی سرپرستی سے نوازا ان میں پریم چند۔ حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی کے ساتھ ساتھ مولوی عبدالحق کا نام بہت اہم ہے۔ پریم چند، حسرت اور جوش تو تقریباً پہلے ہی سے سماجی، باغی اور انقلابی تھے اور ان کے افکار وتخلیقات کے سلسلے میں تقریباً ایک رائے اور شناخت قائم ہو چکی تھی چناں چہ ان بزرگوں کی شرکت اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے منشور پر دستخط کر دینا زیادہ تحیر آمیز نہ تھا لیکن مولوی عبدالحق ایسے بزرگ ضرور تھے جن کی سرپرستی اور وابستگی کو اکثر مسرت اور کہیں کہیں حیرت کی نظر سے دیکھا گیا۔ خود سجاد ظہیر نے اپنی کتاب روشنائی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے تئیں جہاں ان کی شفقت۔ سرپرستی اور اصول پسندی کو سنہرے حرفوں میں لکھا ہے اور ان کی اردو دوستی۔ ادب دوستی کی خوب خوب تعریف کی ہے تو ساتھ ہی اردو اور انجمن ترقی اردو کے تئیں ان کے مخصوص نقطہ نظر اور غیر جمہوری اندازِ فکر پر بھی روشنائی خرچ کی ہے جس کی روشنی میں مولانا کی متضاد شخصیت ابھرتی ہے اور شاید یہ تضاد مولانا میں تھا اور تضادات سے تو صرف مولانا ہی کیا اس عہد کے تقریباً تمام اکابرین مبرا نہ تھے خواہ وہ اقبال ہوں یا ٹیگور ـــــ حسرت پر یہ الزام تو اور بھی آسانی سے لگا دیا جاتا ہے، عظیم فن کاروں میں یہ تضادات اکثر مل جاتے ہیں۔ اس مضمون میں مولانا کے تضاد سے تھوڑی دیر نظر بچاتے ہوئے انجمن ترقی پسند مصنفین سے ان کی حقیقی معنوں میں دلچسپی اور وابستگی کا اظہار مقصود ہے اور اس اظہار کے حوالے سے مولانا کی بارریش اور شیروانی میں بند شخصیت کو اردو کے قدامت پرست اور روایتی ادیب کے کھانچے سے نکال کر ان کی صاف اور بے باک شخصیت کا ایک اور زاویہ پیش کرنا ہے۔ جو کہیں بابائے اردو کے خطاب، انجمن ترقی اردو کی لازوال خدمات اور کہیں اردو کی مشرقی روایت اور سیاست کے تلے دب گیا اور ترقی پسند تحریک کی بے پناہ مقبولیت کے باوجود خود مولانا اور تحریک دونوں کا اٹوٹ حصہ نہ بن سکا جب کہ وہ اس انجمن کی

ابتدائی تعمیر و تشکیل کے ہر مشکل قدم پر ساتھ رہے اور حقیقی معنوں میں اپنے اور یجنل فکر و خیال سے آراستہ کرتے رہے اور راہیں ہموار کرتے رہے۔

ترقی پسند تحریک کو جنم دینے والے ان چند جوشیلے اور باغی قسم کے نوجوانوں کی حمایت کا پہلا اعلان تو مولانا نے ایک طرح سے اسی وقت کر دیا جب ۱۹۳۲ء میں انگارے شایع ہوا اور اس کے خلاف ہنگامے شروع ہو گئے اور بات اتنی بڑھی کہ رجعت پرستوں نے مسجدوں کے خلاف رزولیشن پاس کیے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی تو باقاعدہ خم ٹھونک کر ترقی پسندوں کے خلاف سامنے آ گئے۔ قتل کی دھمکی دی جانے لگی اور بات اتنی بڑھی کہ بالآخر صوبۂ متحدہ کی حکومت نے انگارے ضبط کر دی گئی۔ اس ہنگامہ خیزی اور خوف و ہراس کے لمحوں میں جب خود کہانیاں لکھنے والوں میں سے بعض سہم گئے اور گوشہ نشین ہو گئے۔ کچھ اور ترقی پسند ادیب اپنی سرکاری ملازمتوں اور کچھ دوسری مصلحتوں کی وجہ سے خاموش ہو گئے ایسے میں مولوی عبدالحق نے اپنے رسالے اردو اور دیا نرائن نگم نے زمانہ میں باقاعدہ انگارے پر ستائشی تبصرے شایع کیے۔ افسوس کہ تنگیٔ وقت کی وجہ سے مجھے وہ تبصرہ دستیاب نہ ہو سکا ورنہ وہ مولانا کی حق پرستی اور خورد نوازی کے اچھے ثبوت فراہم کرتا۔ پروفیسر قمر رئیس ضرور ایک جگہ لکھتے ہیں :

> "نو کہانیوں کا یہ مجموعہ صرف ۱۳۴ صفحات پر مشتمل تھا اور ایک ہزار کی تعداد میں نظامی پریس لکھنؤ سے شایع ہوا تھا۔ مولوی عبدالحق کے رسالے اردو اور دیا نرائن نگم کے زمانہ میں اس پر جو ستائشی تبصرے ہوئے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف نوجوانوں نے اس باغیانہ تصنیف کو لبیک کہا بلکہ محتاط اور اعتدال پسند ادیبوں نے بھی کھلے دل سے اس کی حوصلہ افزائی کی۔"
>
> (اردو افسانے میں انگارے کی روایت)

۱۹۳۵ء میں لندن سے باقاعدہ واپس آنے کے بعد جب سجاد ظہیر انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل کے لیے باضابطہ عمل پیرا ہوئے تو الٰہ آباد میں اپنے گھر پر باقاعدہ ایک میٹنگ کی۔ ہندوستانی اکادمی الٰہ آباد کی ایک کانفرنس میں شرکت کی غرض سے آئے ہوئے پریم چند۔ جوش اور مولوی عبدالحق، ان دنوں الٰہ آباد میں تھے اور یہ تینوں حضرات بقول سجاد ظہیر ___ اپنے ادبی وقار اور بزرگی کے لحاظ سے اردو زبان میں اس وقت ان سے بڑھ کر اور کون ترقی پسند تھا ___؟"

سجاد ظہیر اور رشید جہاں کی دعوت پر ان تینوں حضرات نے اس میٹنگ میں شرکت کی ظاہر ہے

ان سب کی شرکت سے وہ ایک بے حد دلچسپ ۔یادگار اور تاریخی میٹنگ ثابت ہوئی ۔اس میٹنگ کی مختصر رودادسجاد ظہیر کے لفظوں میں ملاحظہ کیجیے ۔

"ہم نے کافی ڈر، انکسار اور جھجک کے ساتھ گفتگو شروع کی ۔کچھ چھوٹا منہ اور بڑی بات معلوم ہوتی تھی کہ ہم ان بزرگوں سے ترقی پسند ادب کی تحریک کے مجوزہ مقاصد اور تنظیم کی گفتگو کریں ۔ایسی صورت میں مینی فیسٹو کا مسودہ ہمارے بڑے کام آیا ۔ہم نے اس کی ایک ایک کاپی سب کو پڑھنے کے لیے دے دی ۔مولوی صاحب اپنی صاف گوئی کے لیے مشہور ہیں ۔انھوں نے اسے پڑھ کر فوراً کہا ۔"یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن آپ چاہتے کیا ہیں؟" میں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ اگر آپ سب اس سے متفق ہیں تو اس پر دستخط کر دیں ہم ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادیبوں سے اس پر دستخط کرا کے شایع کریں گے"۔ مولوی صاحب نے فوراً قلم اٹھا کر اپنے دستخط کر دیئے ۔اس کے بعد اور صاحبوں نے بھی دستخط کر دیے ۔مولوی صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ جب کوئی نوجوان کسی بڑی اور اچھی ادبی اسکیم کو لے کر ان کے پاس جاتا ہے تو ہمیشہ اس سے کہتے ہیں کہ بڑا اچھا خیال ہے اس پر ضرور عمل کرو لیکن تجربے نے بتایا ہے کہ زیادہ تر ایسے لوگ ٹھوس کام سے گھبراتے ہیں علم و ادب بڑے جان لیوا آقا ہیں ۔ان کی سچی خدمت کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے ۔چناں چہ انھوں نے ہمیں یہ نصیحت کی کہ اعلان شایع کرنے، انجمن بنانے اور جلسے کرنے سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہم اس ادب کی تخلیق کے لیے محنت کریں جو ہمارے نزدیک صحیح اور ضروری ہے"

(روشنائی سے ماخوذ)

اس اقتباس کے آخری جملے میں مولوی عبدالحق کی گراں قدر نصیحت پوشیدہ ہے اور جو مولوی صاحب کی ترقی پسند اور پریکٹیکل اسپرٹ کی غمازی کرتا ہے اور جہاں اس مینی فیسٹو پر اس عہد کے سربرآوردہ ادیبوں نے دستخط کرنے میں ہچکچاہٹ برتی یا مین میخ نکالا وہاں مولوی صاحب کا فوراً دستخط کر دینا اور پریم چند و جوش جیسے ادیب و شاعر کی موجودگی میں زبان و ادب اور سماج اور معاشرے کے لیے کچھ کر دکھانے کے لیے ٹھوس کام کی نصیحت کرنا مولانا کی جرات، فعالیت اور روشن خیالی بین ثبوت فراہم کرتا ہے ۔یہ بھی خیال رہے کہ پریم چند اور جوش نے کوئی نصیحت نہیں کی یا مولانا کی نصیحت کے بعد مزید کسی نصیحت کی ضرورت نہیں محسوس کی ۔سجاد ظہیر کے یہ تاثرات

معمولی نہیں ہیں۔ ان میں مولانا کی ترقی پسندی کا برملا اعلان تو ہے ہی ساتھ ہی ان کی عظمت اور بزرگی کا بھی جس نے انھیں پریم چند اور جوش کے منصب پر پہنچا دیا تھا۔

اس میٹنگ اور اس انجمن سے مولانا کی وابستگی، مولانا کی فراخدلی اور روشن خیالی کا ثبوت تو پیش کرتی ہی ہے ساتھ ہی انجمن کی آزاد خیالی اور جمہوریت پسندی کا بھی ثبوت پیش کرتی ہے اور یہی وجہ تھی کہ ابتدا سے ہی اس میں ہر طرح کے عقائد کے لوگ تھے۔ مولانا کی شرکت اور حمایت۔ ادب اور ادبی تحریک کے درمیان ایسے ہی سلجھے ہوئے صحت مند تصور کی خوب صورت مثال تھی۔

ان بزرگوں کی سرپرستی نے نوجوانوں کے حوصلے بلند کر دیے اور انھوں نے اس میٹنگ کے فوراً بعد ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی شاندار اور یادگار کانفرنس منعقد کی ـــــ کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ مولوی عبدالحق جنھوں نے انجمن کی پہلی نشست میں پورے زور شور سے دلچسپی لی اور اپنی خوشی و رضامندی کا اظہار کیا وہ فوراً بعد ہونے والی اس پہلی اور تاریخی کانفرنس میں شرکت کیوں نہ کر سکے۔ سجاد ظہیر نے اس کانفرنس کی روداد انتہائی تفصیل سے لکھی ہے لیکن اس تفصیل میں وہ ان تین بزرگوں میں سے مولوی عبدالحق اور جوش کی عدم شرکت کی وجہ نہ لکھ سکے۔ بعد میں ان کی وابستگی کو دیکھتے ہوئے اس عدم شرکت کو محض اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

لکھنؤ میں انجمن کی پہلی کانفرنس ہوئی اور بے حد شاندار ہوئی جس نے پورے ملک کے ادیبوں و شاعروں اور دانشوروں کو سوچنے پر مجبور کر دیا اور اس سے زیادہ سوچنے پر مجبور ہوئی اس وقت کی انگریز حکومت ـــــ جس کے سامنے تمام دانشوروں کا ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا اور غلامی کی مخالفت و آزادی کی حمایت میں متحد ہونا ان کے لیے سب سے بڑا خطرہ تھا ـــــ چناں چہ ان کو جو کرنا تھا انھوں نے کیا۔ مرکزی خفیہ پولس نے اپنا کام دکھایا۔ انجمن اور ترقی پسند ادیبوں کے خلاف اس وقت کے معروف اخبار اسٹیٹمین STATESMAN میں دو مضامین ایسے چھپے جس میں ترقی پسند نقطۂ نظر کی سخت مخالفت کی گئی اور اس انجمن کو غیر مذہبی، غیر تہذیبی سماج دشمن۔ ملک دشمن وغیرہ وغیرہ قرار دیا گیا اور ہوشمند ادیبوں کو ان سے خبردار رہنے کو کہا گیا۔ ان مضامین کی تلخی بلکہ دھمکی سے بڑے بڑے ہل گئے اور خاص طور پر وہ جو سرکاری ملازم تھے۔ ترقی پسندوں پر سخت آزمائش کا وقت پڑا خاص طور پر اس وقت جب خود ان کی صفوں میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ اس نازک مرحلے پر بھی ان نوجوانوں نے صبر اور حوصلے سے کام لیا۔ مضامین کے جواب دیے گئے نظریات کو واضح کیا گیا۔ مقاصد

مزید روشن ہوئے اور پھر تھوڑے سے تزلزل کے بعد وہ یہ محسوس کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ

"یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انگریز سامراجیوں کے اس حملے سے ہماری تحریک کو نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہی ہوا۔ ملک کے وہ مقتدر ادیب جنھوں نے ہماری تحریک کی سرپرستی کی تھی، (پریم چند۔ جوش۔ عبدالحق۔ قاضی عبدالغفار وغیرہ) اس قسم کے الزامات سے جیسے کہ ان مضامین میں کیے گئے تھے، اگر متاثر بھی ہوئے تو تحریک کے حق میں ہی۔ وہ جانتے تھے کہ یہ حملہ محض نوجوان ترقی پسندوں پر نہیں بلکہ بالواسطہ ان پر اور تمام محب وطن لکھنے والوں پر تھا"

(روشنائی)

اس لمبی گفتگو سے کام کی بات یہ نکلتی ہے کہ ایسے نازک وقت پر ان ادیبوں کا ساتھ دینا جو غیر سرکاری ملازم تھے اتنی جرأت کی بات نہ تھی —— لیکن سرسید اسکول کے پروردہ، انگریزوں اور نوابوں وغیرہ کی حمایت وعنایت سے اردو کی خدمت کرنے والے اور پوری زندگی کو ایک خاص مشن سے چلانے والے مولوی عبدالحق نے اس وقت بھی ترقی پسندوں کے مشن اور انگریز دشمنی میں برابر سے شریک رہے یہ ضرور مقام حیرت ہے اور مقام مسرت بھی اور یہیں سے اصل عبدالحق کو یا عبدالحق کے اصل مشن کو سمجھنے اور پرکھنے کا ایک نیا سرا ہاتھ آتا ہے جسے ہم نے مدتوں سے چھوڑ رکھا ہے۔

مولانا کی اسی جرأت اور حمایت کا نتیجہ تھا جب ۱۹۳۷ء میں الہ آباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں بجائے ایک صدر کے تین افراد پر مشتمل صدارتی ٹیم کا اعلان کیا گیا۔ سنسکرت کے عالم اور سوشلسٹ لیڈر آچاریہ نریندر دیو اور ہندی کے نامور شاعر اور گیت کار رام نریش ترپاٹھی اور اردو کے مولوی عبدالحق۔ ظاہر ہے کہ یہ انتخاب، یہ اعزاز انھیں حسرت۔ جوش۔ قاضی عبدالغفار جیسے مقتدر ادیبوں کی موجودگی میں ملا اور محض ان کے سچے اور کھرے۔ بے خوف اور بے باک ہونے کی وجہ سے ملا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ ان کی اور انجمن دونوں کی بدقسمتی تھی کہ وہ عین کانفرنس کے دنوں بیمار ہو گئے اور اس میں شرکت نہ کر سکے لیکن انھوں نے اپنا صدارتی خطبہ بھیجا جو پڑھا گیا اور جو یقیناً ایک یادگار خطبہ ہے۔ اس میں وہ بہت صاف طور پر کہتے ہیں :

"ہمارے اصول اور عقائد، ہمارے خیالات کیسے ہی اعلا اور پاکیزہ کیوں نہ ہوں اور خواہ ہمیں وہ کیسے ہی عزیز کیوں نہ ہوں اگر زمانے کے اقتضا کے مطابق ان میں جدت اور تازگی پیدا نہیں

کی جائے گی تو ایک روز بند پانی کی طرح ان میں سڑاند پیدا ہونے لگے گی اور ان میں ایسے زہریلے جراثیم پیدا ہو جائیں گے۔ جو ان کی ہلاکت کا باعث ہوں گے۔"

آگے لکھتے ہیں :-

ہر ترقی پسند ادیب کا فرض ہے کہ وہ گزشتہ ادب کا مطالعہ کرے اور دیکھے کہ ہمارے ادب میں کہاں تک آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے۔ کن چیزوں کا ترک کرنا مناسب ہے اور کن ذرائع سے اسے بلند مقام پر پہنچانے کی ضرورت ہے کیوں کہ جو چیز آپ کو وراثتاً ملی ہے اگر آپ اس کے حسن و قبح سے واقف نہیں تو اصلاح کس کی اور انقلاب کیسا —— ہم صرف حال ہی کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں آیندہ کے بھی جواب دہ ہیں۔ اس لیے زندگی کے جس شعبے میں ہاتھ ڈالیں ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم دیکھیں کہ ہمارے اعمال و افعال کا اثر آیندہ نسلوں پر کیا ہوگا۔ کیوں کہ آیندہ زمانے میں ہمارے کاموں کی تنقیح و تنقید اسی اصول پر ہوگی۔"

ایک جگہ اور لکھتے ہیں :-

ترقی پسند جماعت کو اپنے مقاصد کے عمل میں لانے کے لیے اخلاقی آزادی اور اخلاقی جرأت سے کام لینا پڑے گا۔ اگر آپ نے مقبولیت یا ہر دل عزیزی یا کسی قسم کی امداد حاصل کرنے کے لیے یا اپنی تعداد بڑھا کر دکھانے کی خاطر ذرا بھی رجعت پسندی کی طرف میلان ظاہر کیا تو یاد رکھیے کہ معقول پسند اور حقیقی ترقی پسند لوگ آپ سے بدگمان ہو جائیں گے . . . . رجعت پسندی کے بل پر کھڑے ہونے سے بہتر ہے کہ آپ کھڑے نہ ہوں۔"

ان تحریروں میں مولانا کی علم و ادب کے تئیں ان کا سچا ایمان و عرفان۔ احساس و آگہی جھلکی پڑتی ہے۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی بزرگی یا شفقت کی نیت سے محض نوجوانوں کو خوش کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ پوری ادبی دیانت داری سے وہ اپنی بات کہتے نظر آتے ہیں۔ جس سے ان کی اپنی اوریجنل فکر کا عکس صاف دکھائی پڑتا ہے۔ اور اصلاً مولوی صاحب کا سچا اور کھرا روپ سامنے آتا ہے۔ مولوی صاحب کی اسی ہمت افزائی اور رہنمائی کے تحت ہی سجاد ظہیر نے پوری ایمانداری اور سچائی کے ساتھ مولوی صاحب کی عظمت اور قدر و قیمت کے بارے میں چند صفحات رقم کیے جس کی چند سطریں پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا :-

مولوی عبدالحق کی ذات ہماری ادبی دنیا میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اردو زبان کی ارتقا کی

تاریخ میں ان کی ایک مستقل جگہ ہے۔ مولوی صاحب کی شخصیت میں دل چسپی اور دلکشی ان کی مختلف اور متضاد خصوصیتوں کے سبب سے ہے۔

وہ علی گڑھ یونیورسٹی اور علی گڑھ تحریک کی سر سید احمد خاں اور مولانا حالی کے زمانے کی ان روشن خیال روایت سے وابستہ ہیں جن کے سرے انیسویں صدی کی انگریزی فلسفیانہ آزاد خیالی سے ملتے تھے، چناں چہ وہ مذہبی احیائیت کی اس تحریک کو ناپسند کرتے ہیں جو مولانا شبلی کے زیر اثر علی گڑھ اور شمالی ہند کے مسلمانوں میں جاری ہوئی . . . وہ چاہتے ہیں کہ جدید آزاد فکر اور جدید سائنس کے خیالات اردو کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ ملک میں پھیلیں۔ ملّائیت اور مذہبی عصبیت اور تنگ نظری کے وہ سخت مخالف ہیں اور اس لحاظ سے ان کا مولوی کا لقب بالکل ناموزوں ہے . . . وہ جدید اشتراکیت کے علمی فلسفہ کو بھی پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہیں چناں چہ ۱۹۳۲ء میں انھوں نے ڈاکٹر محمد اشرف کو انجمن ترقی اردو کی طرف سے معاوضہ دے کر اس کام پر متعین کیا کہ سوشلزم کی ایک علمی اور مبسوط تاریخ لکھیں . . . . پاکستان آنے کے بعد اور اس ضعیفی کے عالم میں بھی مولوی صاحب نے اپنی اس آزاد خیالی کے مسلک کو ترک نہیں کیا تھا چناں چہ کراچی کی رجعت پرست فضا میں بھی جب روسی ادب کا نام لینا ہی خطرناک سمجھا جاتا ہے انھوں نے تین سال ہوئے "یوم میکسم گورکی" کے جلسے کی صدارت کی . . . . انھوں نے ادیبوں کو گورکی کی ادبی عظمت اور حقیقت نگاری کی پیروی کرنے کی تلقین کی۔ جب پنجاب گورنمنٹ نے لاہور کے ترقی پسند سالوں ادب لطیف۔ سویرا اور نقوش کو ایک جنبش قلم سے بند کر دیا تو اس کے حکم کے خلاف پاکستانی ادیبوں کے ساتھ احتجاج نامہ پر انھوں نے بھی دستخط کیے اور جب ۱۹۵۲ء کے پر آشوب حالات میں پاکستان ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل پاکستان کانفرنس کراچی میں ہوئی تو پھر مولوی عبدالحق نے عبدالمجید سالک کے ساتھ اس کی صدارت کر کے اس بات کا ثبوت دیا کہ ترقی پسند ادب کی تحریک سے ان کی دلچسپی اور ہمدردی اس کے آغاز سے لے کر آج تک بدستور قائم ہے۔"

(روشنائی)

اور یہ سچ ہے کہ پاکستان میں عرصۂ دراز سے معطّل رہنے کے بعد ۱۹۵۲ء میں جب انجمن کی دوسری کانفرنس ہوئی تو

مولوی صاحب نے باقاعدہ اس کی صدارت کی اور خطبۂ صدارت پیش کیا۔ اس خطبہ میں پندرہ سال کی مدت۔ تجربہ مشاہدہ اور بزرگی کا لہجہ بولتا دکھائی دیتا ہے۔ اس خطبے میں وہ کہتے ہیں کہ

"ترقی پسند مصنفین کی انجمن، اس کی پیدائش میرے سامنے ہوئی اگرچہ اس کے بنانے میں میں نے کوئی کام نہیں کیا۔ شروع شروع میں اس کا بڑا زور و شور تھا اور ترقی پسند خود پسند ہو گئے تھے اور بہت خود سر تھے۔ ان خود سر لاان جھگڑوں نے رجعت پسندوں کی بہت خبر لی وہ بھی جلے اور انھوں نے بھی ان کی خبر لی اس زمانہ میں سب کو بڑی حیرت تھی کہ یہ کیا طوفان پیدا ہو گیا ہے۔ خیر یہ ہوتا رہا۔ جب انھوں نے ان پر حملہ کیا تو ان کے مویدین نے ان پر حملہ کیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ رجعت پسندوں کی آنکھیں کھلیں اور انھوں نے کہا کہ ہم اپنی اصلاح کرتے ہیں اور انھوں نے بھی ادب کی خدمت کی۔ اس میں شک نہیں کہ شروع میں ترقی پسند ادیبوں میں بعض نقائص تھے جو ناگوار گزرتے تھے اور اس کی وجہ سے یہ بہت نامقبول ہو چکے تھے لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی اصلاح کی ان چیزوں پر متنبہ ہوئے اور انھوں نے رفتہ رفتہ ترک کیا۔ . . . انجمن ترقی پسند مصنفین نے ہمارے ادب کی خدمت کی ہے اور اس کا درجہ بلند کیا۔ وقار کو بڑھایا اور ادب میں وسعت پیدا کی اور خاص کر تنقید میں ان کا کام نہایت قابل قدر ہے۔"

قدیم تہذیب و ادب کے علمبردار مولوی عبدالحق پورے پندرہ سال بعد اپنی عمر کی انتہا پر بھی ترقی پسندی اور ترقی پسندوں کی حمایت کی یہ الگ بات ہے کہ اس خطبے میں بزرگی اور نصیحت زیادہ بولتی نظر آتی ہے، ایسا فطری بھی شاید انھیں اس بات کا احساس تھا کہ ترقی پسندوں کے درمیان انھیں آیندہ بولنے کا موقع ملے یا نہ ملے جس کا انھوں نے اظہار بھی کیا۔ چوں کہ مولانا بذات خود زبان و ادب کے مردِ مجاہد تھے۔ جنون کی حد تک کام کرتے تھے اس لیے وہ ترقی پسندوں کی بھی اس جنونی کیفیت کو پسند کرتے تھے تبھی تو انھوں نے اپنے خطبے کے آخیر میں کہا تھا کہ

"ان ترقی پسندوں میں بھی شیطان ہے۔ یہ کام کرنے میں آندھی ہیں، بھوت ہیں، شیطان ہیں اور کبھی کبھی شیطنت بھی کرتے ہیں۔ جو ادب و فن کے لیے ضروری ہے۔"

مولانا کے ارشادات و ہدایات اور ان کی نصیحتیں ترقی پسندوں کے لیے گراں قدر سرمایہ تھیں کم از کم مولوی صاحب

کی زندگی تک تو ترقی پسندوں نے ان نصیحتوں پر عمل بھی کیا تبھی تو سجاد ظہیر لکھتے ہیں ۔

"میرے خیال میں ترقی پسند مصنفین کی پندرہ سال کی تاریخ اس کی شہادت دے گی انھوں نے حتی المقدور اس نصیحت پر عمل کرنے کی کوشش کی۔"

لیکن سجاد ظہیر نے ساتھ ہی ایک سوال بھی اٹھایا ۔

کاش کہ مولوی صاحب انجمن ترقی اردو میں بھی کسی حد تک سہی وہی جذبہ پیدا کر سکتے جس کی وہ ہماری انجمن سے بجا طور پر توقع رکھتے تھے ۔"

سجاد ظہیر کے اس اعتراض کی وضاحت تو انجمن ترقی اردو کی تاریخ میں تلاش کی جا سکتی ہے لیکن مولانا ایسا کیوں نہ کر سکے اس کی وضاحت اگر اس چار روزہ سیمینار میں ہو جائے تو دونوں مرحومین کی روح کو کسی حد تک سکون مل سکتا ہے۔

ایک مسئلہ مجھ جیسے نوجوان طالب علموں اور ترقی پسندوں کا ہے جس کی طرف ابتدا میں اشارہ کیا جا چکا ہے ۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مولانا نے اپنی زندگی کا پورا حصہ جتنا ادب کے لیے وقف کیا اتنا ہی زبان کے مسائل کے لیے بھی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ زبان کی ترویج و ترقی اس کی بقا اور ارتقا کے لیے انھوں نے زیادہ ہی ایثار و قربانیاں دیں تو غلط نہ ہوگا ۔ ادب و سماج ۔ ترقی پسندی اور رجعت پسندی وغیرہ کے سلسلے میں اتنا واضح تصور ۔ اتنا صاف نظریہ رکھنے اور ابتدا سے انتہا تک ترقی پسند تحریک کی حمایت کرنے والے مولوی عبدالحق زبان کی ترقی ۔ تبدیلی کے لیے وہ عوامی ۔ جمہوری اور پھیلا ہوا تصور کیوں نہ رکھ سکے جیسا کہ اُن سے کل کے اور آج کے بھی ترقی پسند توقع رکھتے تھے ــــــ مثلاً وہ اس بات پر تو خوش ہوتے تھے کہ انگریزوں نے ۔ جان گل کرسٹ نے اردو کی بڑی خدمت کی ہے وہ اس بات پر بھی ناز کرتے تھے کہ اعلاحضرت آصف جاہ عثمان علی خاں نے ریاست حیدرآباد سے انجمن ترقی اردو کو عطیہ دیا اور اردو نوازی کا ثبوت پیش کیا ــــــ لیکن وہ اس عوام کی طرف متوجہ اور مخاطب نہیں ہوئے ۔ جس کے کیف و کم اور پیچ و خم کے درمیان زبان پھلتی پھولتی ہے اور جن کے جذبات و احساسات کا اظہار اردو ادب میں اور بالخصوص ترقی پسند ادب میں ہوتا ہے ۔ وہ اس تخلیقی ادب کو پسند کرتے تھے ، لیکن اپنے قلم میں اور اپنی نگاہ میں وہ وزن نہ پیدا کر سکے خاص طور پر زبان کے سلسلے میں عام طور پر ان کا رویہ غیر جمہوری اور غیر ترقی پسندانہ رہا اور شاید یہی وجہ ہے کہ کم از کم ان کے عہد تک انجمن ترقی اردو بقول سجاد ظہیر اردو سامراج اور اس کی

سیاست سے الگ نہ تھی "۔ اسی بنا پر انجمن ترقی اردو اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے درمیان فاصلے رہے اور ترقی پسند ادیبوں کا اس سے کوئی تعلق نہ پیدا ہو سکا۔

مولانا کی عملی زندگی کا یہ تضاد ایک غور طلب امر ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو بھی باعمل ہوتا ہے اس کی کچھ مشکلات بھی ہوا کرتی ہیں۔ مولانا ایک باعمل اور فعال انسان تھے اور ایک ہی وقت میں بہت سارے کام کرنا چاہتے تھے۔ اردو کے لیے وہ اپنی زندگی میں بہت کچھ کر لینا چاہتے تھے اس لیے انھیں یقیناً بہت سارے سمجھوتے بھی کرنے پڑے ہوں گے اور بہت ساری سیاست بھی کرنی پڑی ہوگی ان سے بھی غلطیاں ہوئیں تبھی تو وہ اپنے آخری خطبے میں کہتے ہیں ۔

"ایک بات میں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ غلطی کو کبھی اہمیت نہیں دینا چاہیے۔ یہ بہت معمولی چیز ہے۔ سب غلطیاں کرتے ہیں بڑے بڑوں نے غلطیاں کی ہیں۔ اولیاؤں اور پیغمبروں نے غلطیاں کی ہیں، غلطیاں بھی ترقی میں ممد ہوتی ہیں۔ غلطی وہ کرتا ہے جو کچھ کرنا چاہتا ہے اور جو کچھ نہیں کرتا وہ غلطی نہیں کرتا ــــ"

زبان و ادب کے تئیں ان کے بے پناہ خلوص ولگن اور عمل اور جتن سے لبالب بھری ان کی زندگی کے پیش نظر ان کے بعض عملی تضادات ان کے علمی نظریات پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوئے دکھائی دیتے جو گزرتے ہوئے وقت کی دھول میں مٹتے ہی چلے جائیں گے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی نشو ونما اور اس کے لالن پالن میں جو انھوں نے شفقت و معاونت برتی اور پوری ترقی پسند تحریک کی جس طرح انھوں نے سرپرستی کی وہ ہمیشہ یاد کی جاتی رہے گی اور ان کے ارشادات و ہدایات کی کل بھی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے اور آج بھی اس کی قدر وقیمت میں کمی نہیں دکھائی پڑتی۔

محمد ضیاء الدین انصاری

بابائے اردو کے رسالے

بابائے اردو مولوی عبدالحق ایک متنوع اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اردو کے مردِ مجاہد تھے اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے سلسلہ میں آپ کی خدمات اتنی وسیع اور اتنی مختلف النوع ہیں کہ ان سب کا احاطہ کرنا آسان کام نہیں۔ آپ نے اپنی مادری زبان کی اتنی زیادہ اور اتنے طویل عرصہ تک خدمت کی کہ خادم سے مخدوم بن گئے اور بابائے اردو کے لقب سے مشہور ہوئے۔

مولوی صاحب کی خدمات کا اعتراف مختلف نوع سے کیا گیا ہے اور ان کے ہر پہلو سے سیر حاصل بحث کی جا چکی ہے۔ اس کے باوجود اب بھی کتنے ہی گوشے ایسے ہیں جن میں ہمارے ناقدین اور محققین کی توجہ کم ہوئی ہے۔ ایسا ہی ایک گوشہ ان کی صحافت اور وہ رسائل ہیں جن کو انھوں نے جاری کیا یا کسی نہ کسی طرح ان سے وابستہ رہے۔ مولوی صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ہی صحافت سے کیا۔ اور زندگی کے آخری مرحلے تک مختلف رسایل سے متعلق رہے۔ اس طرح چھ دہائیوں سے زیادہ عرصہ تک اپنے خونِ جگر سے صحافت کے وسیلے سے اردو زبان و ادب کی آبیاری کرتے رہے۔ اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں مولوی صاحب کا جن رسالوں سے تعلق رہا۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں :

۱۔ افسر ۲۔ اردو ۳۔ سائنس ۴۔ معاشیات

۵۔ ہماری زبان ۶۔ قومی زبان ۷۔ تاریخ و سیاست

ذیل میں ان سب پر تفصیل سے گفتگو کی جاتی ہے۔

افسر

یہ وہ رسالہ ہے جس سے مولوی صاحب سب سے پہلے وابستہ ہوئے اور جس سے انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز کیا۔ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ اسے مولوی صاحب نے جاری کیا تھا۔ لیکن یہ خیال

صحیح نہیں ہے۔ اسے افواج آصفیہ کے سپہ سالار نواب افسر الملک نے جاری کیا اور ان ہی کی فرمایش پر مولوی صاحب نے اس کی ادارت قبول کی تھی۔

عبدالحق نے ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ کالج سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا اور تلاش معاش میں بمبئی پہنچے، جہاں نواب محسن الملک، جو اس زمانے میں ریاست حیدرآباد میں معتمد مال تھے، تبدیل آب و ہوا کی غرض سے مقیم تھے۔ انھوں نے عبدالحق کی دستگیری کی اور وقتی طور پر اپنا پرایویٹ سکریٹری بنا لیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد نواب صاحب کا سفارشی خط لے کر وہ حیدرآباد پہنچے۔ اس زمانے میں ریاست حیدرآباد کے ہوم سکریٹری مولوی عزیز مرزا تھے۔ مرزا صاحب ایک اچھے منتظم ہونے کے ساتھ ادب کا بھی نہایت ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ خود صاحب طرز نثر نگار تھے اہل علم کی قدر کرتے تھے اور ادبی لوگوں کی سرپرستی فرماتے تھے۔ ہمارے بہت سے ادیب اور شاعر آپ کے دامن فیض سے وابستہ رہے اور آپ کی علم نوازی سے مستفیض ہوتے۔ عبدالحق کی بھی آپ نے پذیرائی کی اور اپنے دفتر میں انتظامی امور سے وابستہ کر لیا۔ اسی دوران ان کی ملاقات ریاست حیدرآباد کے کمانڈران چیف نواب افسر جنگ سے ہوئی جو اپنی فوجی ذمہ داریوں کے ساتھ 'افسر' کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ بھی نکال رہے تھے۔ یہ خالص فوجی رسالہ تھا۔ اس میں فوجیوں کے لیے مضامین اور پریڈ وغیرہ سے متعلق معلومات دی جاتی تھیں۔ افسر جنگ ایک ہی ملاقات میں مولوی عبدالحق کی علمیت اور کام کرنے کی صلاحیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھیں رسالہ افسر کی ادارت پیش کر دی۔ یہ کام چونکہ مولوی صاحب کے مزاج سے مطابقت رکھتا تھا اس لیے انھوں نے فوراً اسے قبول کر لیا۔ اسی کے ساتھ افسر الملک نے اپنے قایم کردہ مدرسۂ آصفیہ کا انھیں صدر مدرس بھی بنا دیا۔

رسالہ 'افسر' ۱۸۹۷ء میں جاری ہوا۔ ابتدا میں افسر الملک کے معتمد خاص مولوی محب حسین نے اس کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ اکتوبر ۱۸۹۹ء میں مولوی عبدالحق اس سے متعلق ہوئے لیکن رسالہ پر ان کا نام بحیثیت اڈیٹر جنوری ۱۹۰۰ء کے شمارے سے درج ہونا شروع ہوا۔ اس سلسلہ میں مولانا امداد صابری نے تاریخ صحافت اردو (جلد سوم) میں حسب ذیل معلومات فراہم کیے ہیں۔

> حیدرآباد سول ملٹری کلب ملک پیٹ سے یہ ماہانہ رسالہ ۱۸۹۷ء کو نمودار ہوا۔ اس کے پہلے اڈیٹر محب حسین تھے۔ دو سال بعد بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب مرحوم مقرر ہوئے یہ رسالہ انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو شایع ہوتا تھا۔ اس رسالہ میں علمی، اخلاقی، تاریخی،

فلسفی، تمدنی اور فوجی مضامین درج ہوتے تھے۔ کتابوں پر ریویو بھی کیا جاتا تھا۔ ہر ماہ سب سے بہتر مضمون کے لیے ایک اشرفی مقرر تھی۔ یہ رسالہ نواب میجر افسرالدولہ سی۔ آئی اے کمانڈر انچیف نظام حیدرآباد کی سرپرستی میں نکلتا تھا۔"

مولانا نے اس کا سالِ اجرا تو بتا دیا لیکن ماہ کا تعین نہ کر سکے۔ اسی طرح ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے تخمینہ لگایا ہے کہ یہ جنوری ۱۸۹۷ء میں جاری ہوا ہوگا۔ لکھتے ہیں:

"مجھے پانچویں جلد کے دو پرچے ملے ہیں۔ نمبر ۵ اور ۶۔ یعنی مئی اور جون ۱۹۰۱ء کے شمارے۔ ان ہی پرچوں سے میں نے یہ بات متعین کی ہے کہ افسر کی پہلی جلد ۱۸۹۷ء کی جنوری میں شروع ہوئی ہوگی۔"[۱]

بیدار صاحب کا نشانہ یہاں صحیح نہیں بیٹھا۔ دیگر شواہد سے پتا چلتا ہے کہ رسالہ افسر جنوری میں نہیں بلکہ اپریل ۱۸۹۷ء میں جاری ہوا۔ اور جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ مولوی صاحب اکتوبر ۱۸۹۹ء میں اس سے متعلق ہوئے۔ اسی ماہ کے شمارے میں منیجر دفتر رسالہ 'افسر' محمد عطا صاحب کی جانب سے ایک بہت ہی اہم نوٹ شایع ہوا جس میں کہا گیا تھا۔

"۔ ۔ ۔ اس کے متعلق تمام خط و کتابت جناب مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے (لینڈ ون مڈلسٹ) ہیڈ ماسٹر مدرسہ آصفیہ ملک پیٹ سے کرنا چاہیے۔"

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مولوی صاحب اکتوبر ۱۸۹۹ء میں اس سے وابستہ ہوئے لیکن بحیثیت ایڈیٹر ان کا نام جنوری ۱۹۰۰ء کے شمارے سے شایع ہونا شروع ہوا۔ مولوی صاحب کے کلی طور پر قبضہ میں آجانے کے بعد رسالہ کی ہیئت یکسر بدل گئی۔ اب اس میں علمی اور ادبی مضامین پر زیادہ توجہ دی جانے لگی اور صفحات کی تعداد ۳۲ سے بڑھا کر ۴۸ کر دی گئی اور صرف آٹھ صفحے فوج سے متعلق مضامین کے لیے مختص کیے جانے لگے۔ جنوری ۱۹۰۰ء کے شمارے کے سرورق پر "عبدالحق بی۔ اے اڈیٹر رسالہ افسر" کی جانب سے ایک اطلاع ضروری، شایع ہوئی جس میں رسالہ کی تبدیلی ہیئت کے بارے میں اہم معلومات دیے گئے تھے۔ اس میں کہا گیا تھا کہ:

رسالہ افسر تین سال سے بہ سرپرستی جناب افسرالدولہ بہادر سی۔ آئی۔ ای کمانڈر انچیف افواج باقاعدہ سرکار عالی و بہ اہتمام کپتان نواب ممتاز جنگ بہادر جاری ہے۔ اب تک صرف فوجی

مضامین کے لیے مخصوص تھا لیکن اب جناب ممدوح نے بالکلیتہً ہمارے حوالے کر دیا ہے اور ہمیں اجازت دی ہے کہ چند صفحے فوجی مضامین کے علاوہ باقی حصّہ کو جیسے چاہیں استعمال کریں۔ چوں کہ حیدرآباد میں اس وقت ایک علمی میگزین کی بہت ضرورت ہے۔ اس لیے ہم نے ارادہ کیا ہے کہ اسے جہاں تک ممکن ہو ایک اعلا درجہ کا میگزین بنانے کی کوشش کی جائے۔ چناں چہ یکم جنوری ۱۹۰۰ء سے اس کی ہیئت بالکل بدل دی جائے گی۔ اور اس کے قالب میں علمی روح نظر آئے گی۔ اس میں ہر قسم کے عمدہ عمدہ علمی، تاریخی، اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین لکھے جائیں گے جن کی اردو زبان کو بے انتہا ضرورت ہے اور جو خاص کر ہمارے ہم وطنوں کے لیے زیادہ مفید ہوں۔ اس غرض سے اس کا حجم بھی بڑھا دیا جائے گا۔ یعنی بجائے ۳۲ صفحے کے ۴۸ صفحے کر دیے جائیں گے جن میں صرف ۸ صفحے میں فوجی مضامین ہوا کریں گے لیکن یہ فوجی مضامین بھی اس قسم کے ہوں گے جو عام طور پر دلچسپ اور مفید ہوں، بلکہ یہ بھی ایک قسم کے علمی مضامین ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہم نے یہ بھی انتظام کیا ہے کہ ہر ماہ اعلا درجہ کے مضامین کے لیے ایک اشرفی نذر کی جائے۔"

جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا مولوی صاحب سے قبل مولوی محب حسین اس کی ادارت کے فرایض انجام دے رہے تھے۔ یہ 'تعلیمِ نسواں' اور 'شفیق' نام کے دو رسالے خود بھی نکالتے تھے۔ اس کے علاوہ نواب افسرالملک کے دفتر میں بحیثیت مترجم بھی کام کرتے تھے۔ اس لیے رسالہ افسر کے ادارت کی ذمہ داری پوری توجہ اور دلجمعی سے ادا نہیں کر پاتے تھے لیکن چوں کہ ان کو تصنیف و تالیف اور طباعت وغیرہ کا تجربہ کافی تھا۔ اس لیے مولوی عبدالحق کے مدیر مقرر ہو جانے کے بعد بھی اس نوع کی ذمہ داری ان ہی کے سپرد رہی۔ اور سرورق پر "مرتبہ خادم الملک محب حسین مترجم اسٹاف کمانڈر انچیف سرکار نظام" بدستور شایع ہوتا رہا۔

جنوری ۱۹۰۰ء کے شمارے میں اطلاع ضروری کے تحت اعلان کیا گیا تھا کہ ہر ماہ سب سے اچھے مضمون پر ایک اشرفی بطور انعام دی جایا کرے گی۔ چناں چہ اس کے تحت سب سے پہلا انعام سید بے نظیر شاہ وارثی کو ان کی نظم 'حکمتِ ظاہری و باطنی' پر دیا گیا۔ یہ نظم جنوری ۱۹۰۰ء کے شمارہ میں شایع ہوئی تھی۔

مولوی صاحب کی مساعی سے رسالہ 'افسر' کے قلمی معاونین کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوا۔ اس کے لکھنے والوں میں نواب افسرالملک اور مولوی محب حسین کے علاوہ مولوی محمد اختر، مولوی علی خبیر، نواب عمادالملک

مولانا ظفر علی خاں، مولوی عزیز مرزا، نظیر حسین فاروقی، مولوی چراغ علی، نظام الدین حسن، عبدالغنی خاں رافت جیسے بلند پایہ نثر نگار اور صاحب طرز ادیب شامل ہیں۔ ان کے علاوہ شعرا میں حضرت بے نظیر شاہ وارثی، غلام قادر گرامی اور عبدالغفور شہباز کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مولوی صاحب کے زمانۂ ادارت میں جو مضامین افسر میں شایع ہوئے ان میں سے اہم مضامین کی فہرست حسب ذیل ہے:

۱۔	دار العلوم اسلامی	از نواب عماد الملک	جنوری ۱۹۰۰ء
۲۔	سگنلنگ کا استعمال	از محب حسین	" "
۳۔	اشرف المخلوقات	از ظفر علی خاں	فروری "
۴۔	فلسفہ قیافہ	از نظیر حسین فاروقی	اپریل "
۵۔	مدرسۃ العلوم علی گڑھ اور جدید انتظام	از عبدالحق	" "
۶۔	جنگی تاریخ	از محب حسین	جون "
۷۔	حروف مقطعات وعلامات معدنی وآلات تحریر وطبع	از نظام الدین حسین	" "
۸۔	گورنمنٹ	از مولوی ذکاء اللہ	جولائی "
۹۔	قوموں کی پندرہ مشہور علامتیں اور زوال کی نشانیاں اور اسباب	از خواجہ غلام الثقلین۔	" "
۱۰۔	اردو ناول پر ایک نظر	از مولوی عزیز مرزا	اگست "
۱۱۔	اخلاقی قوت غیر فانی ہے۔	از منور خاں	" "
۱۲۔	پروفیسر میرزا حیرت کے مختصر حالات	" مولوی عبدالحق	اکتوبر "
۱۳۔	پیرانہ سالی	" قطب الدین علی تسلی	دسمبر "
۱۴۔	مسئلہ ازدواج پر ایک نظر	" محمد اختر	مئی ۱۹۰۱ء
۱۵۔	عورتوں کی نسبت سرسید احمد خاں کے خیالات	" محب حسین	اپریل "
۱۶۔	ایک ستارہ پرست قوم	" علی شبیر	مئی "
۱۷۔	مصنفین کی نسبت غائبانہ خیال	" عبدالحق	جون "

رسالہ افسر میں کتابوں پر تبصرے بھی شایع ہوتے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم تبصرہ مولانا حالی کی یادگار تالیف "حیاتِ جاوید" پر اردو لٹریچر کی سب سے اعلا کتاب، کے عنوان سے مولوی عبدالحق کا ہے۔ یہ تبصرہ کافی

طویل ہے اور اس کی نوعیت ایک روایتی تبصرہ سے بڑھ کر مستقل مضمون کی سی ہے۔ مولوی صاحب نے بڑی تفصیل سے اس میں 'حیاتِ جاوید' کا جائزہ لیا ہے اور اس کے محاسن پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلہ میں مولوی صاحب کی یہ رائے بڑی وقیع ہے کہ:

مولانا حالی کے طرزِ بیان میں ایک خاص بات ہے جس پر عام طور پر نظر نہیں پڑتی، اسے میں 'استادانہ ضبط' سے تعبیر کرتا ہوں جس سے میرا مطلب یہ ہے کہ نہ تو اس قدر بات کو پھیلاتے ہیں کہ مضمون پھُس پھسا اور پھیکا ہو جائے اور طول ناگوار گزرے، اور نہ اس قدر مختصر کہ ادھورا اور ناقص معلوم ہو، بلکہ نہایت اعتدال کے ساتھ اپنے مضمون کو اس خوبی اور ترتیب سے بیان کرتے ہیں کہ کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہوتا۔ مگر پھر ضبط اس قدر ہے کہ اس کا پھیلاؤ اعتدال سے بڑھنے نہیں پاتا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو سرسید کی لائف باوجود اس قدر مواد کے اس خوبی کے ساتھ اتنی ضخامت میں نہ آسکتی تھی۔ اور باوجود اس کے تحقیق و تنقید کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ہمارے موجودہ مصنفین میں صرف مولانا حالی ہی ایک ایسے شخص ہیں جن میں کرٹی سزم (تنقید) کی قوت پائی جاتی ہے۔ اگرچہ اس میں کچھ شک نہیں کہ مولانا حالی سرسید کے سچے قدرداں اور بہت بڑے مداح ہیں مگر ان کی لائف میں انھوں نے انصاف کو مدنظر رکھا ہے۔ نہ بےجا طرف داری کی ہے اور نہ بےجا بدگمانی ہے۔ جہاں انھوں نے غلطی کی ہے اسے صاف ظاہر کر دیا ہے۔ لیکن جہاں خوبیاں اس کثرت سے ہوں کہ عیب اس کے مقابلے میں ایسے ہوں۔ جیسے پہاڑ کے سامنے رائی کا دانہ، تو وہاں سوائے اس کے کہ خوبیوں کی تعریف اور اس کی مدح سرائی کی جائے اور کیا ہو سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ سرسید کے احسانات ہماری قوم پر اس قدر ہیں کہ اس کا حق کبھی ادا نہیں ہو سکتا۔"

مولانا حالی کو یہ تبصرہ بہت پسند آیا۔ انھوں نے مولوی عبدالحق کو اس سلسلہ میں ایک خط بھیجا جس میں اپنے مخصوص انداز میں انکسار سے کام لیتے ہوئے اس تبصرہ کی تعریف کی اور اس پر اظہار تشکر فرمایا۔ لکھتے ہیں:

"مئی۔ جون ۱۹۰۱ء کا 'افسر' پہنچا۔ اس میں حیاتِ جاوید پر آپ کا ریویو دیکھا۔ جو کلمات بہ تقاضائے محبت تصنیف و مصنف کے حق میں بےاختیار قلم سے ٹپک پڑے ہیں، اگرچہ

میں اپنے تئیں اس کا مستحق نہیں سمجھتا، لیکن بہر حال آپ کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض جانتا ہوں یہ وہی خصلت ہے جس کو اہل ایران یار فروشی کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور ہماری زبان میں چھڑ کر پچنا کہتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ حیات جاوید پر آپ کے ریویو کی تعریف مجھ کو زیبا نہیں ہے ورنہ مثل وہی ہو گی "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو۔" ؎۱

حیاتِ جاوید کے علاوہ جن کتابوں پر افسر میں تبصرے شایع ہوئے ان میں حسب ذیل خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

۱۔ سیرتِ رسول	مصنفہ	نظیر حسین فاروقی	جون	۱۹۰۱ء
۲۔ اخبار الریاض		حاجی ریاض الدین (مدیر)	اپریل	۱۹۰۰ء
۳۔ سفر نامہ باندہ	مصنفہ	حسام الدین	مئی	۱۹۰۰ء
۴۔ الہارون	مترجمہ	مصباح الدین	جون	۱۹۰۰ء
۵۔ سیرِ ظلمات	از	مولانا ظفر علی خاں	ستمبر	۱۹۰۰ء
۶۔ دیوانِ مجروح	از	میر مہدی مجروح	اکتوبر	۱۹۰۰ء

رسالہ افسر کا حصہ نظم بھی خاص اہمیت رکھتا تھا۔ اس میں غزلیات کے مقابلے میں منظومات پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ اس میں سب سے زیادہ کلام بے نظیر شاہ وارثی کا شایع ہوا۔ ان کے علاوہ غلام قادر گرامی کے کلام کو بھی مولوی صاحب نے درخود اعتنا اور لایق اشاعت تصور فرمایا۔

اوایل ۱۹۰۲ میں رسالہ افسر ابدی نیند سو گیا۔ مولانا حالی نے اس سانحہ کا ماتم ان الفاظ میں کیا:

ہندوستان میں کوئی عمدہ رسالہ نہیں چل سکتا۔ معارف، ادیب، حسن اور دیگر عمدہ عمدہ میگزین چند روز کی ہوا کھا کے نوبت بہ نوبت راہی ملک عدم ہو گئے۔ پھر افسر کے چلنے کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ جس چیز کی خریداری کا مدار زیادہ تر مسلمانوں پر ہو گا، اس کا رونق اور فروغ پانا معلوم۔" ؎۲

؎۱ مکاتیب حالی از عبدالحق (مشمولہ: فروغ اردو۔ حالی نمبر حصہ ۲) ص ۳۴۷ ۔ ۳۴۸

؎۲ بحوالہ: اردو کے اہم ادبی رسالے اور اخبار۔ از ڈاکٹر عابد رضا بیدار۔ ص ۱۳۲

اردو

مولوی عبدالحق ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو کے معتمد عمومی مقرر ہوئے۔ اس کے بعد انجمن میں از سرِ نو جان آئی مولوی صاحب نے انتہائی لگن، جانفشانی، اور شب و روز کی محنت سے اس میں نئی روح پھونکی، اسے فعّال بنایا اور اس کے دائرہ کار کو وسعت دے کر اسے ملک گیر تحریک بنایا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے اعلا اور معیاری کتابوں کی اشاعت کی جانب بھی خصوصی توجہ مبذول کی جس کے نتیجہ میں انجمن کے زیرِ اہتمام بڑی تعداد میں کتابیں شایع ہونے لگیں۔ اسی کے ساتھ آپ نے انجمن کی طرف سے ایک علمی اور ادبی رسالے کے اجرا کی تجویز بھی پیش کی، جس کو مجلس منتظمہ نے منظوری عطا کی اور حالات سازگار ہوتے ہی اسے جاری کرنے کی اجازت دی، لیکن کافی عرصہ تک حالات نے مساعدت نہ کی جس کے سبب رسالہ جاری نہ کیا جا سکا۔ ۱۹۱۱ء کی انجمن کی سالانہ رپورٹ میں اس بات کی وضاحت کی گئی تھی کہ:

> "اگر ارکانِ اعانت کی کافی تعداد بہم پہنچ جائے تو ارادہ ہے کہ انجمن کی طرف سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا جائے جس میں اعلا درجے کے ادبی مضامین لکھے جائیں جن سے اہل ملک کے ذوق میں اصلاح ہو، نیز وہ دوسرے ممالک کی ادبی اور علمی ترقی سے آگاہ ہوں، اپنے ادب پر نظر ڈالیں اور اس میں جان ڈالنے کی کوشش کریں۔ بہت سی علمی اور ادبی بحثیں ایسی ہیں جو کتابوں میں نہیں آسکتیں، وہ اس رسالے کے ذریعہ سے اہل ملک کی خدمت میں پیش کی جائیں علاوہ اس کے انجمن کے مقاصد و اغراض اور اردو زبان کی اشاعت بھی اس سے مقصود ہوگی۔"

اس کے بعد یہ طے کیا گیا کہ اکتوبر ۱۹۲۰ء سے "اردو" نام کا دو سو صفحات پر مشتمل ایک رسالہ جاری کر دیا جائے جو سردست سہ ماہی ہو، لیکن بعد میں ماہانہ کر دیا جائے۔ مگر اس کے سرورق کا جو بلاک تیار کرایا جا رہا تھا وہ وقت پر نہ مل سکا، لہٰذا بحالتِ مجبوری اس کی اشاعت کو تین ماہ کے لیے موخر کر دینا پڑا اور بجائے اکتوبر ۱۹۲۰ء کے جنوری ۱۹۲۱ء میں شایع ہوا۔

"اردو" کا بنیادی مقصد اردو زبان و ادب کی خدمت کرنا، اس کو فروغ دینا اور انجمن ترقی اردو کے اغراض و مقاصد کی ترویج و اشاعت قرار پایا۔ اسی کے ساتھ عوام و خواص میں ادب کا صالح ذوق پیدا کرنا اور ان میں صحیح تنقیدی شعور بیدار کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل کیا گیا۔ اور یہ بات حیرت انگیز بھی ہے اور

مسرت افزا بھی کہ تقسیم ملک سے قبل، ۲ سال تک اور اس کے بعد سے اب تک یہ بڑی خوش اسلوبی سے اپنے مقصد کے حصول میں مصروف ہے۔ اس کے مقاصد کی تشریح اور اس کے مشمولات کی نوعیت کی وضاحت کرتے ہوئے پہلے ہی شمارے میں مولوی عبدالحق نے لکھا تھا:

"سب سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ رسالہ خالص ادبی ہوگا۔ یہ مثل کشکول کے نہ ہوگا جس میں ہر قسم کے رطب و یابس اور انمل بے جوڑ مضامین بھر دیے جاتے ہیں اور کوئی خاص مقصد پیش نظر نہیں ہوتا۔ صرف پیشانی پر اس قدر لکھ دینا کافی ہے 'ادبی' اخلاقی، تاریخی، معاشی، سیاسی رسالہ، میں نے یہ تعریضاً نہیں کیا۔ ملک کو ایسے رسالوں کی بھی ضرورت ہے۔ مگر انجمن کا رسالہ ادب اور اس کے متعلقات کی حد سے آگے بڑھنا نہیں چاہتا اس پر اکثر صاحبوں نے اعتراض کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ کاغذ کی یہ ناؤ کب تک چلے گی اور یہ مضمون کب تک مساعدت کرے گا۔"

مولوی صاحب نے اس اعتراض کا مدلل جواب دیا اور فرمایا کہ یہ صحیح ہے کہ اردو زبان وادب سے متعلق بہت کام ہو چکا ہے تاہم اب بھی ایسے متعدد گوشے باقی رہ گئے ہیں جن پر مزید روشنی ڈالنے اور تفصیل سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ملاحظہ ہو، مولوی صاحب فرماتے ہیں:

میں اس کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ان صاحبوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا اور روش عام اس رائے کا باعث ہوئی ہے . . . . نظر کوئی نہ کرے تو بہت سے ایسے خزانے ہیں جو ابھی تک پردۂ خفا میں ہیں اور جنھیں ہوا تک نہیں لگی . . . . کون انکار کر سکتا ہے کہ بہت سے الفاظ اور محاورے ابھی تحقیق طلب ہیں۔ بہت سے ایسے مصنف اور شاعر ہیں جن کا کلام ابھی تک بساط قدر دانی تک نہیں پہنچا۔

بہت سی کتابیں جو لکھنے کے بعد ہی گوشۂ گمنامی میں رہ گئیں یا شایع ہوتے ہی ناپید ہوگئیں۔ زبان کا رسم الخط، املا، اور انشا میں بہت سی باتیں اصلاح طلب اور مشورہ اور بحث کی محتاج ہیں۔ اردو کی تاریخ اور اس کی نشو و نما میں بہت سی منزلیں ابھی طے کرنی باقی ہیں۔

شاہراہ زبان سے مختلف شاخیں ایسی پھوٹتی ہیں جن کا سراغ لگانا ضروری ہے مثلاً خود اردو اور اس کی بہنیں کس خاندان کی ہیں، ان میں باہم کیا تفاوت اور تعلق ہے اور ملک میں اس کا

کیا درجہ ہے . . .

تنقید جو ادب کی جان اور ذوقِ سلیم کی روح و رواں ہے۔ ابھی ہمارے یہاں ابتدائی مراحل میں ہے۔ اسے صحیح رنگ میں دکھانا بہت بڑا فرض ہے۔ اس کے بغیر ادب کی خدمت ادا ہونی ممکن نہیں۔

اردو کے بہت سے ایسے محسن ہیں جن کے حالات اور کارنامے ملک کے سامنے پیش ہونے چاہئیں اور خاص کر جو خدمت انھوں نے اردو کی کی ہے اسے وضاحت کے ساتھ دکھانے اور ان کے کلام پر ہمدردانہ تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت باقی ہے۔

اس کے علاوہ غیر زبانوں کے ادب میں ایسے انمول جواہر ہیں جو صاحب نظر ادیب اور شائقین ادب کے لیے سب سے بڑا تحفہ ہیں۔ ضرورت ہے کہ انھیں اردو کے لباس میں پیش کیا جائے تاکہ ہمارے اہل ملک ان کے اسلوب بیان، طرز تخیل و ادائے مطلب سے حظ حاصل کریں اور متمتع ہوں۔

پھر ایک بات اور ہے کہ بعض انشا پرداز ایسے بلند نظر اور پاکیزہ مذاق ہیں جو اپنے جگر پارے معمولی اخباروں اور عام رسالوں کے حوالے کرنا نہیں چاہتے۔ ان کے لیے بھی آخر کوئی سامان ہونا چاہیے۔

مختصر یہ کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ رسالہ اردو زبان اور ادب کی ایسی مفید اور محققانہ بحثوں سے مالا مال ہو کہ شائقین ادب اسے غور اور شوق سے پڑھیں اور فائدہ اٹھائیں اور اہل ملک کے ذوق پر اس کا اچھا اثر ہو اور وہ دن آئے کہ لوگ اس کو ڈھونڈتے پھریں۔"

مولوی صاحب اپنے مذکورہ بالا مقاصد میں پوری طرح کامیاب رہے۔ رسالہ اردو نے اردو میں تحقیق و تنقید کا جو معیار قایم کیا وہ بلاشبہ فقید المثال ہے۔ اس نے ہمارے کاروانِ ادب کے لیے مقدمۃ الجیش کا کام کیا۔ مولوی صاحب کی یہ خواہش بھی پوری ہوئی کہ وہ دن آئے کہ لوگ اس کو ڈھونڈتے پھریں۔ یہ حقیقت بھی اب کسی سے پوشیدہ نہیں کہ تحقیقی و تنقیدی مضامین کے سلسلہ میں سب سے زیادہ حوالے اردو میں شایع شدہ مضامین کے ہی دیے جاتے ہیں۔

رسالہ 'اردو' کا پہلا شمارہ علی گڑھ میں مولوی محمد مقتدی خاں شیروانی کے زیر اہتمام انسٹی ٹیوٹ پریس سے

چھپ کر شایع ہوا۔ اس کے بعد اورنگ آباد میں ہی طبع ہونے لگا۔ ۱۹۳۸ء تک یہ وہیں شایع ہوتا رہا۔ ۱۹۳۹ء میں انجمن کا دفتر اورنگ آباد سے دہلی منتقل ہوگیا۔ اسی کے ساتھ رسالہ "اردو" بھی دہلی آگیا اور دسمبر ۱۹۴۴ء تک یہیں سے طبع ہو کر شایع ہوتا رہا۔ اس طرح جلد ۱ سے جلد ۱۸ تک اورنگ آباد سے اور جلد ۱۹ سے جلد ۲۷ تک دہلی سے شایع ہوا۔

رسالہ اردو نے اپنے مشمولات کا معیار ہمیشہ بلند رکھا۔ مولوی صاحب کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ کم تر درجے کی کوئی چیز کسی بھی قیمت پر قبول نہیں کرتے تھے۔ رسالے کے مضامین کے لیے بھی ان کا معیار بے حد بلند رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اتنی طویل مدت میں اردو میں ہزاروں مضامین شایع ہوئے لیکن ان میں سے کوئی بھی مضمون ایسا نہیں ہے جسے ہم دوسرے درجہ کا کہہ سکیں۔

۱۹۴۷ء تک 'اردو' میں تازہ مطبوعات پر تبصرے بڑی پابندی سے شایع ہوتے تھے۔ رسالہ کا یہ حصہ بڑا دلچسپ اور خصوصی اہمیت کا حامل ہوتا تھا۔ یہ تبصرے بڑے جاندار اور غیر جانبدار ہوتے تھے۔ دراصل جس طرح مولوی صاحب نے کتابوں پر مقدمے لکھ کر مقدمہ نگاری کو ایک مستقل فن اور ادبی صنف کی حیثیت عطا کی۔ اسی طرح انھوں نے اردو میں تبصرہ نگاری کو بھی نئی جہت عطا کی اور اسے وزن و وقار بخشا۔ ان تبصروں کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ان مطبوعات کا محض تعارف کرانے پر اکتفا نہیں کیا جاتا تھا، نہ ہی ان میں صرف تعریف و توصیف ہوتی تھی بلکہ ان میں تصویر کے دونوں رخ پیش کیے جاتے تھے۔ اور بڑی تفصیل سے ان کے حسن و قبح پر روشنی ڈالی جاتی تھی اور اس طرح غیر جانبدارانہ اور منصفانہ تبصرہ نگاری کا حق ادا کیا جاتا تھا۔

رسالہ 'اردو' اپریل ۱۹۴۷ء تک ہندوستان سے پابندی کے ساتھ نکلتا رہا۔ اس کے بعد تقسیم ملک کا حادثہ پیش آگیا۔ اس ہنگامے کے دوران انجمن کا کام معطل رہا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مولوی صاحب پاکستان چلے گئے اور وہاں انھوں نے از سر نو انجمن کی داغ بیل ڈالی۔ وہاں قدم جمانے کے بعد مولوی صاحب نے رسالہ اردو کو کراچی سے جاری کیا۔ اس نئے دور کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۴۹ء میں جاری ہوا اور جلد اور شمارہ کے تسلسل کو ۱۹۴۷ء کے شماروں سے مربوط رکھا۔ اپریل ۱۹۴۷ء کے شمارے کی جلد کا نمبر ۲۷ تھا۔ چناں چہ کراچی سے شایع ہونے والے جولائی ۱۹۴۹ء کے پرچے کو جلد ۲۸ کا پہلا شمارہ قرار دیا گیا۔ اسی طرح ہندوستان میں جب انجمن کا احیا ہوا تو رسالہ اردو کو بھی جاری کیا گیا لیکن کراچی والے اردو سے ممتاز کرنے کی غرض سے اس کا نام 'اردو ادب' تجویز کیا گیا۔ اس کے اڈیٹر پروفیسر آل احمد سرور مقرر ہوئے۔ اس کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۵۰ء میں

شایع ہوا۔ اس نے جلد اور شمارے کا سلسلہ از سر نو شروع کیا چنانچہ جولائی ۱۹۵۰ء کا شمارہ جلد اول کا پہلا شمارہ قرار دیا گیا۔ اپنے 'حروف آغاز' میں اس کے اجراء سے متعلق سرور صاحب فرماتے ہیں :

جب یہ طے ہوا کہ موجودہ حالت میں انجمن ترقی اردو کا کام ہندوستان اور پاکستان میں بالکل علاحدہ اور خود مختار حیثیت سے ہوگا۔ تو علی گڑھ میں اس کا صدر دفتر قایم کیا گیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اس کے صدر اور قاضی عبدالغفار اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ مجلس نظما کی نئے سرے سے تشکیل ہوئی۔ انجمن کا نیا دستور وضع ہوا اور یکم مئی ۱۹۵۰ء کے جلسہ میں متفقہ طور پر منظور ہوا۔ انجمن کا پندرہ روزہ اخبار 'ہماری زبان' جنوری ۱۹۵۰ء سے نکل رہا ہے۔ اور اب جولائی ۱۹۵۰ء سے اس کا سہ ماہی رسالہ 'اردو ادب' شایع کیا جا رہا ہے۔"

اس کے بعد 'اردو ادب' کے دائرہ کار' اس کے مقاصد اور معیار کی وضاحت کرتے ہوئے سرور صاحب فرماتے ہیں،

ہماری کوشش ہوگی کہ 'اردو ادب' رسالہ 'اردو' کے اعلا علمی و تحقیقی معیار کو برقرار رکھے اور اسے جدید ادبی ضروریات و میلانات سے ہم آہنگ کرے۔ ہم ہندوستان کے تمام اربابِ فکر و نظر کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اردو ادب کی شمع روشن کرنے میں ہماری مدد کریں ...

'اردو ادب' اربابِ فکر و نظر کو دعوت دیتا ہے کہ وہ خاص طور پر اصلاح زبان، اصلاح رسم الخط قدیم اردو ادب کے شہ پاروں، اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی ذہنی اور ادبی زندگی بیسوی صدی کے اہم میلانات، ہندوستان کی جدید زبانوں کی موجودہ خصوصیات، مغربی اور مشرقی ادبیات کے رجحانات پر مضامین لکھیں۔"

اردو ادب کے اس 'حرف آغاز' سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں مقاصد کم و بیش وہی رہے جو اس پیشرو 'اردو' کے تھے اور اس نے خود کو بنیادی طور پر 'اردو' کا ہی ایک تسلسل جانا۔ رسالہ اردو نے تحقیق و تنقید کا جو اعلا معیار قایم کیا تھا، اردو ادب نے اسے نہ صرف برقرار رکھا، بلکہ اس میں صحت مند اضافے بھی کیے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۷۴ء میں علی گڑھ سے نئی دہلی منتقل ہو گئی۔ اسی کے ساتھ اس کی انتظامیہ میں بھی تبدیلی عمل میں آئی۔ اب سرور صاحب کی جگہ ڈاکٹر خلیق انجم اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اسی کے ساتھ اردو ادب کا ادارت بھی ان کے سپرد ہوئی۔ اور اب تک وہ ان فرایض کو بحسن و خوبی نباہ رہے ہیں۔

مولوی صاحب نے کراچی سے جب 'اردو' کا احیا کیا تو انھوں نے کسی کو اس کا ایڈیٹر مقرر نہیں کیا بلکہ ایک مجلسِ ادارت تشکیل دی جس کے صدر وہ خود تھے اور قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی معتمد۔ ان کے علاوہ دیگر اراکینِ مجلس کی تعداد چھ تھی۔ جولائی ۱۹۴۹ء کے سرورق پر جو مجلسِ ادارت درج کی گئی تھی، وہ اس طرح تھی:

ڈاکٹر عبدالحق	معتمد اعزازی۔ انجمن ترقی اردو پاکستان	صدر
شیخ محمد اکرام	شریک معتمد۔ اطلاعات و نشریات حکومت پاکستان	رکن
ممتاز حسین	شریک معتمد۔ فینانس حکومت پاکستان	〃
ڈاکٹر فضل احمد کریم فضلی	معتمد تعلیمات حکومت مشرقی پاکستان۔ ڈھاکہ	〃
مولوی سید ہاشمی فریدآبادی۔		
ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب شادانی	صدر شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی	〃
ڈاکٹر سید عبداللہ	ریڈر پنجاب یونیورسٹی	〃
قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی		معتمد

خصوصی شمارے

رسالہ اردو نے خصوصی شمارے بھی شایع کیے۔ ۱۹۴۷ء تک اس کے صرف دو خصوصی شمارے نکلے۔ ایک سر سید احمد خاں کے پوتے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سر راس مسعود کی یاد میں اور دوسرا شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے انتقال پر۔ تقسیم ملک کے بعد کراچی سے 'اردو' نے اور 'اردو ادب' نے علی گڑھ اور نئی دہلی سے متعدد خصوصی شمارے طبع کیے۔ یہ تمام شمارے بہت اہم ہیں اور اپنے اپنے موضوع پر دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ذیل میں ان کی فہرست پیش کی جاتی ہے:

اردو: اورنگ آباد

۱۔ مسعود نمبر	جلد ۱۷	شمارہ ۴	(اکتوبر)	۱۹۳۷ء
۲۔ اقبال نمبر	〃 ۱۸	〃 〃	(〃)	۱۹۳۸ء

اردو: کراچی

۱۔ حالی نمبر	جلد ۳۱	شمارہ ۲	(اپریل)	۱۹۵۲ء
۲۔ جوبلی نمبر	〃 ۳۲	〃 ۳-۴	(جولائی۔ اکتوبر)	۱۹۵۳ء

٣۔ بابائے اردو نمبر				١٩٦٣ء
٤۔ غالب نمبر (حصہ اول)	جلد ٤٥	شمارہ ١	(جنوری)	١٩٦٩ء
٥۔ غالب نمبر (حصہ دوم)	" "	" ٢	(اپریل)	" "
٦۔ شمارۂ خاص بیاد خسرو	" ٥١	" ٤	(اکتوبر)	١٩٧٥ء
٧۔ اشاعت خاص (دانائے راز)	" ٥٣	" "	(نومبر)	١٩٧٧ء
٨۔ شیرانی نمبر	" ٥٦	" "	(اکتوبر)	١٩٨٠ء
٩۔ نعت نمبر حصہ اول	" ٦٣	" ٣	(جولائی)	١٩٨٦ء
١٠۔ نعت نمبر حصہ دوم	" "	" ٤	(اکتوبر)	١٩٨٧ء

اردو ادب

١۔ حسرت نمبر	جلد ٢	شمارہ ١-٢	(جولائی تا دسمبر)	١٩٥٣ء
٢۔ مولانا آزاد نمبر	" ٨	"		١٩٥٩ء
٣۔ تخلیق نمبر		" ٤		١٩٦٣ء
٤۔ نہرو نمبر		" ٣-٤		١٩٦٤ء
٥۔ تخلیق نمبر		" ٤		١٩٦٥ء
٦۔ تخلیق نمبر		" ٤		١٩٦٦ء
٧۔ غالب نمبر		" ١-٤		١٩٦٩ء
٨۔ ذاکر نمبر		" ٣		" "
٩۔ سیدین نمبر		" ٤		١٩٧٢ء
١٠۔ دہلی کے اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست		" ١-٢		١٩٧٤ء
١١۔ اقبال نمبر		" ١-٤		١٩٧٩ء
١٢۔ حسرت نمبر		" ١-٤		١٩٨١ء
١٣۔ خاص نمبر		" ١-٢		١٩٨٢ء
١٤۔ فراق نمبر		" ٣-٤ (١٩٨٣ء) و شمارہ ١-٢		١٩٨٤ء
١٥۔ فیض نمبر				

سائنس

مولوی عبدالحق علی گڑھ کالج کے ساختہ پرداختہ تھے۔ علی گڑھ تحریک کے مثبت اور صحت مند عناصر ان کے رگ و ریشہ میں پیوست تھے۔ سرسید کی طرح وہ بھی سائنس کی تعلیم کو بنیادی اہمیت دیتے تھے۔ سرسید کی طرح ان کا بھی یہی خیال تھا کہ موجودہ سائنسی ترقیات کے دور میں اگر ہم اس جانب متوجہ نہ ہوں گے اور اس طرف سے بے رخی و بے اعتنائی برتیں گے تو ہم دیگر اقوام سے صدیوں سے پیچھے جا پڑیں گے۔ لہٰذا وقت کی اہم ضرورت یہ ہے کہ ہم سائنس کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دیں اور اس میدان میں ترقی یافتہ اقوام سے بھی آگے نکل جانے کی کوشش کریں۔ مولوی صاحب چاہتے تھے کہ سائنس کی تعلیم بھی مادری زبان میں ہو اسی لیے وہ زیادہ سے زیادہ سائنسی علوم کو اردو زبان میں منتقل کرنا چاہتے تھے۔ یہ وہی کام ہے جسے سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعہ انجام دینے کی کوشش کی تھی۔ مولوی صاحب نے بھی ان ہی سطور پر کام کیا۔ اس سلسلے سے متعلق مختلف موضوعات پر معیاری اور معلوماتی مضامین شایع ہوتے۔ یہ طبعزاد بھی ہوتے اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ بھی۔

رسالہ سائنس کی اشاعت کے پس منظر اور اس کے اجرا کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے اڈیٹر ڈاکٹر مظفر الدین قریشی جنوری ۱۹۲۸ کے شمارے میں 'عرض واجب' کے عنوان کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

> ہم اپنی نسبت کچھ ہی کہیں لیکن اس میں مطلق شبہ نہیں کہ ہم 'سائنس' کے علم و عمل میں اس قدر پیچھے ہیں کہ گویا ترقی کرنے والی قوموں کے سامنے طفل مکتب ہیں۔ ہماری گزشتہ تعلیم کا بہت بڑا حصہ منطق، فلسفہ، ادب و شاعری وغیرہ کی نذر ہوتا تھا۔ اور اب بھی ان مضامین کو ہمارے نظامِ تعلیم میں بہت کچھ دخل ہے اس لیے تخیل نے عمل کی جگہ بھی گھیر لی ہے۔
> ایشیائی اور خاص کر ہندی دماغوں کا علاج سائنس ہے۔ اس سے نہ صرف سائنس کی معلومات کا حاصل ہونا مقصود ہے بلکہ اس طریقۂ تحقیق کی تعلیم بھی مدنظر ہے جو سائنس ہمیں سکھاتا ہے اور جو علم کی شاخ اور معاشرت کے ہر شعبے کے لیے ضروری ہے۔ ہندوستان کے کالجوں میں سائنس کی جو تعلیم ہوتی ہے، اگرچہ وہ بھی ناقص ہے تاہم جو کچھ ہے غنیمت

ہے لیکن ان درسگاہوں کے باہر اندھیر اگھپ ہے۔ چشم بددور اردو میں رسالوں کی تعداد کافی ہے اور ہر مہینے کوئی نہ کوئی نیا رسالہ جاری ہوتا رہتا ہے مگر وہ زیادہ تر ادب اور تاریخ وغیرہ سے بحث کرتے ہیں۔ سائنس کے لیے کوئی مخصوص نہیں ہے۔ مشکل یہ پیش کی جاتی ہے، اور صحیح بھی ہے کہ سائنس کے مضامین کو اپنی زبان میں کیوں کر ادا کریں۔ اس مشکل کو عثمانیہ یونیورسٹی نے رفع کر دیا ہے لیکن اس کا دائرہ بھی کالج کے احاطے تک محدود ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس فیض کو عام کریں۔"

اس کے بعد رسالہ 'سائنس' کے اجرا کے مقاصد بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر قریشی لکھتے ہیں:

"اس خیال سے انجمن ترقی اردو نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس کی مساعی کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ ہم اس رسالے کو ڈرتے ڈرتے اہل ملک کے سامنے پیش کرتے ہیں اس لیے ابھی نہیں کہہ سکتے کہ ہم کہاں تک اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے ہیں ایک مقصد تو یہ ہے کہ عام پڑھے لکھے لوگوں کو سائنس کے معلومات سے نیز ان ایجادات واختراعات سے آگاہ کرتے رہیں جو دنیا میں سائنس کے متعلق روز بروز ہوتی رہتی ہیں۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ خود ہمارے لوگ اپنی تحقیقات کو ملک کے سامنے پیش کریں یا سائنس کے مختلف شعبوں پر محققانہ مضامین لکھیں۔ کوششیں یہ کی گئی ہے کہ مضامین عام فہم ہوں۔ لیکن یہ کام آسان نہیں۔ تجربہ ہوتے ہوتے معلوم ہوگا کہ ہمیں اس کا کیا ڈھنگ رکھنا چاہیے۔ جامعہ عثمانیہ نے جہاں اصطلاحات وغیرہ کی وضع میں آسانی پیدا کی ہے، وہاں یہ مشکل بھی آپڑی ہے کہ ہم ان الفاظ اور اصطلاحات کو استعمال کرتے کرتے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ باہر والوں کے لیے یہ کہاں تک عام فہم ہیں۔"

ان مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے اور اہل ملک کے ذہنوں میں سائنسی شعور بیدار کرنے کے عزم مصمم کے ساتھ جنوری ۱۹۲۸ء کو اورنگ آباد کی سرزمین سے سہ ماہی رسالہ 'سائنس' نمودار ہوا۔ اس نے ابتدا سے ہی اپنے مقرر کردہ مقاصد کی تکمیل کو پیش نظر رکھا اور ہر ممکن طریقہ سے ملک میں سائنسی علوم کو عام کرنے کی کوشش کی۔ اس نے علوم جدیدہ کے سلسلہ میں ایک تحریک کو جنم دیا اور ملک

و بیرون ملک کے سائنسدانوں سے مضامین لکھا کر علم کو سائنسی تجربات اور جدید ایجادات سے آگاہ کیا۔ ان تمام امور کی وضاحت خود اڈیٹر نے بھی رسالہ کے پہلے شمارہ کے 'شذرات' میں کر دی ہے۔ فرماتے ہیں :

"رسالہ 'سائنس' کے پہلے نمبر کو قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے یہ کہنا غالباً کچھ مبالغہ تصور نہ کیا جائے گا کہ اس رسالے کے اجرا سے ایک نئی تحریک وجود میں آئی ہے جس کی ضرورت ایک عرصہ سے محسوس ہو رہی تھی۔ اردو کے ذریعہ ملک میں جدید علوم بالخصوص تجربی علوم کی اشاعت کا کام جس قدر اہم ہے۔ اسی قدر مشکل بھی ہے۔ ابھی تک ان مشکلات سے مقابلہ کرنے کی پوری طرح کوشش نہیں کی گئی تھی۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام اس قسم کی پہلی کوشش ہے۔ اس کوشش سے بہت سی ابتدائی مشکلات حل ہو گئی ہیں۔ لیکن درس و تدریس کے علاوہ اشاعت علوم کا ایک بہت بڑا ذریعہ اخبارات اور رسالے ہوتے ہیں جو علمی معلومات کو درس گاہوں کے محدود حلقے سے نکال کر عامۃ الناس کے وسیع حلقوں تک پہنچاتے اور اہل ملک میں علمی ذوق و شوق کی تحریک پیدا کرتے رہیں۔ جہاں تک جدید علوم اور خاص کر سائنس کی اشاعت کا تعلق ہے، اردو میں ابھی تک کوئی اخبار یا رسالہ ایسا نہ تھا جس سے یہ غرض پوری ہوتی تھی۔ بالآخر انجمن ترقی اردو نے 'سائنس' کے اجرا سے اس کمی کے پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔"

اپنی تحریک کو درجہ استناد عطا کرنے اور رسالہ 'سائنس' کے مقولات کو مزید وزن و وقار بخشنے کی خاطر نہ صرف ہندوستان کے صف اوّل کے سائنسدانوں، بلکہ دوسرے ممالک کے بھی ماہرین علوم جدیدہ سے ربط قایم کیا گیا اور ان سے مضامین حاصل کر کے ان کے ترجمے شایع کیے گئے۔ اس کی اطلاع بھی 'شذرات' میں دے دی گئی تھی :

اس سلسلہ میں یورپ کے چند ممتاز سائنسداں حضرات کو بھی خطوط لکھے گئے تھے جن میں رسالے کے اغراض و مقاصد کا ذکر کیا گیا تھا۔ ہم ان حضرات کے بے حد ممنون ہیں کہ انھوں نے باوجود گوناگوں مصروفیتوں کے ہماری درخواست کی طرف توجہ کی اور اس تحریک سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ انگلستان کے ممتاز کیمیاداں پروفیسر ای۔ ایم۔ آرم

سٹرونگ نے ہماری درخواست کو نہایت خوشی سے قبول فرمایا ہے اور ایک خاص مضمون لکھنے کا وعدہ کیا ہے جو غالباً آئندہ نمبر میں شایع ہوگا۔"

رسالہ 'سائنس' کے منتظمین کی یہ کوششیں بارآور ہوئیں اور یورپ، بالخصوص انگلستان کے ماہرین علوم جدیدہ کا تعاون اسے حاصل ہوا اور کافی تعداد میں ان کے مضامین اس میں شایع ہوے۔ ان میں سے اہم مضامین کی فہرست ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

۱۔ دوربینائی	از پروفیسر ای۔ این۔ ڈی سی انڈریڈ	جلد ۱ شمارہ ۱ جنوری ۱۹۲۸ء
۲۔ مصر قدیم کا علم طب اور فنِ جراحی	از ڈبلیو۔ آر۔ ڈاؤسن	جلد ۱ شمارہ ۲ اپریل ۱۹۲۸ء
۳۔ مادے اور ایتھر کا باہمی تعلق	از سر آلیور لاج	〃 〃 ۳ جولائی 〃 〃
۴۔ فنِ جراحی پر سب سے پہلی کتاب	از جیمز ہنری بریسٹڈ	〃 ۲ 〃 ۴ اپریل ۱۹۲۹ء
۵۔ طبیعات کا نیا نقطۂ نظر	از سر آلیور لاج	〃 〃 ۱ جنوری 〃 〃
۶۔ حشرات میں عقل و شعور	از آر۔ سی۔ کیڈ والڈر	〃 ۱۰ 〃 ۲ اپریل ۱۹۳۸ء
۷۔ انسانی جسم میں پیوندکاری	از ڈاکٹر ورونا ف	〃 ۱۴ 〃 ۳ مارچ ۱۹۴۱ء
۸۔ آرتھوڈیپن	از کلیمنٹ پارک	〃 〃 ۶ جون 〃
۹۔ سیاروں کے طبیعی حالات	از سر جیمز جینز	〃 ۱۵ 〃 ۳ مارچ ۱۹۴۲ء
۱۰۔ رایل ایروناٹیکل سوسائٹی	از لارڈ بیز بون	〃 ۱۹ 〃 ۸ اگست ۱۹۴۶ء
۱۱۔ برطانیہ میں صنعتی ترقی	از ڈاکٹر ایچ۔ بکلے	〃 ۱۹ 〃 ۹ ستمبر ۱۹۴۶ء

ان کے علاوہ ہندوستان کے ممتاز ماہرین علوم جدیدہ جن کا قلمی تعاون حاصل رہا ان میں سے حسب ذیل کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

۱۔ پروفیسر مظفر الدین قریشی	۲۔ پروفیسر محمد طاہر رضوی	۳۔ میجر فرحت علی
۴۔ جناب حبیب خاں قریشی	۵۔ جناب سلیم الزماں صدیقی	۶۔ جناب محمد عثمان خاں
۷۔ جناب محمد نصیر احمد	۸۔ سردار بلدیو سنگھ	۹۔ پروفیسر غلام دستگیر رشید
۱۰۔ پروفیسر منہاج الدین	۱۱۔ جناب محمد فاروقی	۱۲۔ جناب مرتنجے راؤ
۱۳۔ جناب جگ موہن لال چترویدی	۱۴۔ پروفیسر محمد بابر مرزا	۱۵۔ جناب رفعت حسین صدیقی

ان حضرات کا قلمی تعاون رسالے کا اعلا معیار برقرار رکھنے کا ضامن ہے۔

رسالہ 'سائنس' میں چند مستقل عنوانات ہوا کرتے تھے جن کے ذریعہ سائنس سے متعلق مختلف نوع کے دلچسپ اور اہم معلومات فراہم کیے جاتے تھے۔ ان میں 'سائنس کی دنیا' اور 'دلچسپ معلومات' وغیرہ عنوانات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ 'سوال وجواب' کے باب میں سائنس سے متعلق قارئین کے سوالوں کے جوابات دیے جاتے تھے۔ علاوہ ازیں علوم جدیدہ سے متعلق تازہ ترین اور اہم مطبوعات پر تبصرے بھی شایع کیے جاتے تھے۔ ان تمام عنوانات کے تحت فراہم کردہ اطلاعات اور معلومات کا مطالعہ قارئین کی معلومات عامہ میں بے انتہا اضافہ کا باعث ہوتا تھا اسی کے ساتھ غیر ملکوں میں تخلیق کیے جانے والے سائنسی لٹریچر سے بھی انھیں آگاہی ہوتی رہتی تھی۔

ابتدا میں رسالہ 'سائنس' کا وقفۂ اشاعت سہ ماہی تھا۔ دسمبر ۱۹۴۰ء تک یہ سہ ماہی ہی رہا۔ جنوری ۱۹۴۱ء سے یہ ماہانہ ہوگیا۔ یہ رسالہ بیس سال کے طویل عرصہ تک مسلسل پابندی سے شایع ہوتا رہا۔ تقسیم ملک کے بعد نامساعد حالات کے سبب اس کی اشاعت بند ہوگئی۔ جولائی ۱۹۴۸ء کو اس کا آخری شمارہ شایع ہوا۔ اس کے بعد یہ ابدی نیند سوگیا۔ اس کے سرورق پر ہمیشہ یہ عبارت درج ہوتی تھی:

"سب سے خوش نصیب وہ انسان ہے جو نئے حقایق کا انکشاف کرتا ہے اور دوسرے درجے پر وہ ہے جو پرانے تعصبات کو ترک کرتا ہے۔"

ہماری زبان

مولوی عبدالحق کی نگرانی میں انجمن ترقی اردو سے شایع ہونے والے دونوں رسالے 'اردو اور سائنس' خالص ادبی پرچے تھے۔ ان کا دائرہ کار اردو ادب کو فروغ دینے اور سائنسی لٹریچر کو عام کرنے تک محدود تھا۔ ان میں اردو تحریک سے متعلق عام خبریں شایع نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن جب مولوی صاحب کی قیادت میں محبانِ اردو کی مساعی اور جدوجہد سے اردو تحریک کو فروغ حاصل ہوا اور اس نے ملک گیر حیثیت حاصل کرلی، تو اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اس قسم کی تمام سرگرمیوں سے عوام وخواص کو باخبر رکھا جائے۔ چناں چہ مولوی صاحب کی تحریک پر انجمن ترقی اردو نے ایک پندرہ روزہ ترجمان جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور چوں کہ اس کا کام خالص اردو سے متعلق خبریں شایع کرنا تھا اس لیے اس کا نام 'ہماری زبان' تجویز کیا گیا۔ یہ یکم اپریل ۱۹۳۹ء کو جاری ہوا۔

اس کا وقفۂ اشاعت پندرہ روزہ تھا اور یہ کل بیس صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کا سالانہ چندہ صرف ایک روپیہ تھا اور قیمت فی پرچہ تین پیسے مقرر ہوئی۔ اور چوں کہ اس زمانہ میں انجمن ترقی اردو دکن سے منتقل ہو کر دہلی آگئی تھی، اس لیے 'ہماری زبان' بھی دہلی سے ہی نکلنا شروع ہوا۔ اس کی پیشانی پر سر تیج بہادر سپرو کا یہ مقولہ بالالتزام درج ہوتا تھا۔

"اردو زبان ہندو مسلمان دونوں کی اپنے آبا و اجداد سے ایک مشترکہ اور مقدس ترکہ کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابل تقسیم ہے۔"

'ہماری زبان' نے جلد ہی عوام و خواص میں مقبولیت حاصل کرلی۔ اس کے اثر سے اس کی تعداد اشاعت میں تیزی سے اضافہ ہوا اور صرف ایک سال کی قلیل مدت میں اس کی تعداد ساڑھے تین ہزار سے متجاوز ہوگئی اور رفتہ رفتہ یہ تعداد ساڑھے پانچ ہزار تک پہنچ گئی۔ اس کی مقبولیت کا بنیادی سبب یہ تھا کہ اس کے اعلا معیار کو ہمیشہ برقرار رکھا۔ اس نے انجمن ترقی اردو کے اغراض و مقاصد کی تبلیغ و اشاعت کو اپنا نصب العین بنایا۔ اس میں ادبی لسانی اور ثقافتی مضامین بھی شایع ہوتے تھے لیکن اس کا بنیادی کام اردو دنیا کی خبریں شایع کرنا تھا۔ اس کی خوبی یہ تھی کہ اس نے خبروں اور مضامین دونوں کو حسب ضرورت اہمیت دے کر دونوں حصوں میں توازن برقرار رکھا۔

'ہماری زبان' کے پہلے مدیر ریاض الحسن صاحب مقرر ہوے۔ ان کے بعد رفیق الدین صاحب، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، سید ہاشمی فرید آبادی اور طفیل احمد صاحب نے علی الترتیب اس کی ادارت کے فرایض انجام دیے۔

فروری ۱۹۴۴ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی تیسری کُل ہند کانفرنس ناگپور میں منعقد ہوئی۔ اس موقع پر 'ہماری زبان' کا خصوصی شمارہ کانفرنس نمبر شایع ہوا۔ جس کو عام طور پر پسند کیا گیا۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں یہ بند ہوگیا۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں حالات معمول پر آنے پر انجمن ترقی کا از سر نو احیا ہوا۔ اس کا صدر دفتر علی گڑھ منتقل ہوگیا اور دیگر سرگرمیوں کو شروع کرنے کے ساتھ ہی 'ہماری زبان' کو بھی از سر نو جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چناں چہ جنوری ۱۹۵۰ء کو علی گڑھ سے انجمن ترقی اردو (ہند) کا ترجمان 'ہماری زبان' جاری ہوا۔ اس وقت انجمن کے سکریٹری قاضی عبدالغفار تھے لہٰذا وہی 'ہماری زبان' کے اڈیٹر مقرر ہوے۔ ۱۹۵۵ء میں

قاضی صاحب کے بعد پروفیسر آل احمد سرور انجمن کے سکریٹری مقرر ہوے۔ اس حیثیت سے آپ نے ہماری زبان کے اڈیٹر کے فرائض بھی انجام دیے۔ آپ کی ہندوستان سے غیر موجودگی کے زمانے میں کچھ عرصہ تک پروفیسر مسعود حسین خاں نے اس کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ ۱۹۷۴ء میں انجمن کی انتظامیہ میں تبدیلی ہوئی جس میں پروفیسر آل احمد سرور کی جگہ ڈاکٹر خلیق انجم اس کے جنرل سکریٹری بنائے گئے۔ اسی کے ساتھ اردو ادب اور ہماری زبان کی ادارت بھی آپ کے ذمہ آگئی۔ ۱۹۷۴ء سے آج تک یہ آپ ہی کی ادارت میں انتہائی پابندی اور کامیابی سے نکل رہا ہے۔ آج کل اس میں مضامین کے مقابلہ میں اردو دنیا کی خبروں پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔

'ہماری زبان' ابتدا میں ہفت روزہ تھا لیکن دسمبر ۱۹۵۵ء سے اسے پندرہ روزہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد پندرہ روزہ اور بعد میں ہفت روزہ کر دیا گیا جو ابھی تک شایع ہو رہا ہے۔ اس عرصہ میں اہم موضوعات پر 'ہماری زبان' کے متعدد خصوصی شمارے بھی شایع ہوئے ہیں جو ہر لحاظ سے معیاری ہیں اور اپنے اپنے موضوع پر دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔

قومی زبان

۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد مولوی صاحب پاکستان چلے گئے۔ وہاں انھوں نے انجمن ترقی اردو کی از سر نو شیرازہ بندی کی۔ اور کراچی میں باقاعدہ انجمن قایم ہو جانے کے بعد آزادی سے قبل انجمن سے شایع ہونے والے رسالوں کو دوبارہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ۱۹۴۹ء میں سہ ماہی 'اردو' کا احیا کیا نیز ۱۹۵۰ء میں پندرہ روزہ 'قومی زبان' جاری کیا۔ یہ دراصل ہماری زبان کا ہی تسلسل تھا۔ چوں کہ علی گڑھ سے 'ہماری زبان' دوبارہ شایع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس لیے مولوی صاحب نے اپنے رسالے کا نام بدل کر 'قومی زبان' کر دیا۔ اس کی نوعیت محض ایک خبر نامے سے بڑھ کر ادبی رسالہ کی کر دی گئی۔ ۱۹۶۳ء میں اس کا وقفۂ اشاعت بجاے پندرہ روزہ کے ماہانہ کر دیا گیا۔ اب اس کی حیثیت خالص ادبی، تحقیقی اور تنقیدی رسالہ کی ہو گئی۔

یوں تو 'قومی زبان' میں سیکڑوں اعلا اور معیاری مضامین شایع ہوے، لیکن اس میں دو سلسلے مفید اور معلومات افزا شروع ہوے جن کی نظیر دوسرے رسائل پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ ایک سلسلہ 'گنجہاے گرانمایہ' کے عنوان سے تھا جس میں انجمن ترقی اردو (پاکستان) کے کتاب خانے میں محفوظ مخطوطات

کی وضاحتی فہرست شایع ہوتی تھی۔ بعد میں بالاقساط شایع ہونے والی یہ فہرست کتابی شکل میں شایع ہوئی۔ دوسرا سلسلہ 'نئے خزانے' کے عنوان سے تھا جس میں اخبارات اور رسائل میں شایع ہونے والے مضامین کا فن وار اشاریہ دیا جاتا تھا۔ اس نوع کے اشاریے دانشوروں اور تحقیقی کام کرنے والے حضرات کے لیے بے انتہا اہم ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ 'قومی زبان' میں سائنسی علوم سے متعلق انگریزی۔ اردو مصطلحات بھی بالالتزام شایع ہوتی تھیں۔

'قومی زبان' کے کثیر تعداد میں خصوصی نمبر بھی شایع ہوئے۔ ان کی تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

۱۔ بابائے اردو نمبر	جلد ۲۱	شمارہ ۳ - ۶	(اگست - ستمبر)	۱۹۶۲ء
۲۔ " "	" ۲۵	" ۹ - ۱۰	(ستمبر - اکتوبر)	۱۹۶۴ء
۳۔ ہاشمی فریدآبادی نمبر	" ۲۵	" ۱۱ - ۱۲	(نومبر - دسمبر)	" "
۴۔ آزادی نمبر	" ۳۱	" ۲	(اگست)	۱۹۶۷ء
۵۔ بابائے اردو نمبر	" "	" ۳	(ستمبر)	" "
۶۔ " "	" ۳۳	" "	(")	۱۹۶۸ء
۷۔ بیاد غالب	" ۳۴	" ۲	(فروری)	۱۹۶۹ء
۸۔ " "	" "	" ۳	(مارچ)	" "
۹۔ بابائے اردو	" ۳۷	" ۲	(اگست)	۱۹۷۰ء
۱۰۔ " "	" ۴۲	" ۹	(ستمبر)	۱۹۷۳ء
۱۱۔ " "	" ۴۴	" ۸	(اگست)	۱۹۷۴ء
۱۲۔ بیاد ممتاز حسین	" ۴۵	" ۱	(جنوری)	۱۹۷۵
۱۳۔ اشاعت خاص	" "	" ۸	(اگست)	" "
۱۴۔ بیاد امیر خسرو	" "	" ۱۲	(دسمبر)	" "
۱۵۔ خصوصی شمارہ (صد سالہ جشن پیدائش قائد اعظم)	۴۶	" ۱۲	(")	۱۹۷۶ء
۱۶۔ اقبال نمبر	" ۴۷	" ۱۱	(نومبر)	۱۹۷۷ء
۱۷۔ اشاعت خاص (مولانا محمد علی جوہر)	" ۴۸	" ۱۲	(دسمبر)	۱۹۷۸ء

۱۸۔ اقبال نمبر	شمارہ ۴۹	جلد ۴		اپریل	۱۹۷۹ء
۱۹۔ بیاد بابائے اردو مولوی عبدالحق	″	″	۸	اگست	″
۲۰۔ اشاعت خاص (علامہ اقبال)	″	″	۱۱	نومبر	″
۲۱۔ شیرانی نمبر	۵۰	″	۱۰	اکتوبر	۱۹۸۰ء

معاشیات

بابائے اردو بڑے وسیع القلب اور وسیع النظر انسان تھے۔ آپ کی فکر میں ہمہ گیری اور نظریات میں بلندی کے ساتھ ہمہ جہتی بھی ملتی ہے۔ وہ دور اندیش بھی تھے اور دور بین بھی۔ اپنے اہل وطن کی ترقی کا وہ ایک واضح نقشہ رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تعلیم کے ذریعہ ہی اپنی قوم کی ترقی ممکن ہے اور ترقی یافتہ ممالک سے ہمدوش ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ان میں سائنس کی تعلیم عام ہو۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ سماجی علوم کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کائنات علم کی یہ دونوں شاخیں اپنی اپنی اہمیت اور افادیت رکھتی ہیں۔ اور ان میں کسی ایک کو بھی نظر انداز کر کے ہم صحیح معنی میں ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتے لہٰذا ہمہ جہت ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ہم دونوں میں توازن قایم رکھیں اور سائنسی علوم کے ساتھ سماجی علوم میں بھی درک حاصل کریں۔ اور چوں کہ سب سے زیادہ اہم اور بنیادی مسئلہ معاشیات کا ہوتا ہے۔ اس لیے سماجی علوم میں آپ نے سب سے زیادہ زور معاشیات پر دیا۔ چناں چہ اپنے اہل وطن کو جدید معاشی نظریات اور موجودہ معاشی نظام کے گوناگوں مسائل سے لوگوں کو آسان زبان میں واقف کرانے کے لیے آپ نے انجمن ترقی اردو کی جانب سے ایک ماہانہ رسالہ 'معاشیات' کے عنوان سے جاری کیا۔

رسالہ 'معاشیات'، جنوری ۱۹۴۶ء کو جاری ہوا۔ رسالہ 'سائنس' کی مانند یہ رسالہ بھی اردو میں اپنی نوعیت کا واحد رسالہ تھا۔ اس میں معاشیات اور معاشی مسائل سے متعلق بڑے مفید اور معلومات افزا مضامین شایع ہوتے تھے۔ اس کے اڈیٹر طفیل احمد خاں صاحب مقرر ہوئے جو صحافت کا وسیع تجربہ اور معاشی مسائل پر گہری نظر بھی رکھتے تھے۔ الٰہ آباد سے شایع ہونے والے ہفت روزہ 'آبزرور' کے مدیر کی حیثیت سے آپ کو ملک گیر شہرت اور مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ مولوی صاحب اور طفیل احمد خاں صاحب کی مساعی سے 'معاشیات' کو قبول عام نصیب ہوا۔ اسے ملک اور بیرون ملک کے ماہرین معاشیات کو

قلمی تعاون حاصل ہوا۔ ان لکھنے والوں میں؛

۱۔ پروفیسر عطار اللہ ۲۔ مارگٹ ہمن من ۳۔ پنڈرل مون ۴۔ موریس ڈوب

۵۔ پروفیسر برج نرائن ۶۔ ڈاکٹر ابوسالم ۷۔ رمیش نرائن ماتھر ۸۔ شفیق الرحمن

جیسے ہندوستان گیر اور بین الاقوامی شہرت کے حامل ماہرینِ فن کے اسمار گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں مولوی صاحب بھی اکثر اپنی تحریروں سے اسے نوازا کرتے تھے۔ اس میں جن موضوعات پر مضامین شایع ہوتے تھے ان میں عالمی معاشی مسایل، عالمی معاشی نظریات، معاشی منصوبہ بندی، صنعت و حرفت کی صورت حال، تجارت کے امکانات وغیرہ شامل تھے۔ اسی کے ساتھ مستقل عنوان کے تحت ملک کی معاشی صورت حال کا جائزہ بھی پیش کیا جاتا۔ ان کے علاوہ ان موضوعات سے متعلق تازہ مطبوعات پر تبصرے بھی کیے جاتے۔

'معاشیات' کے مجموعی طور پر تقسیم ملک سے قبل، ۱۱ پرچے شایع ہوے۔ یہ مئی ۱۹۴۷ء تک پابندی سے شایع ہوتا رہا۔ اس کے بعد بند ہوگیا۔ پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد اگست ۱۹۴۹ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان کی جانب سے مولوی صاحب نے اسے دوبارہ جاری کیا۔

تاریخ و سیاست

مولوی صاحب سماجی علوم کو کتنی اہمیت دیتے تھے اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ کراچی میں اردو کالج قایم کرنے کے بعد آپ نے وہاں ایک 'مجلس تاریخ' قایم کی اور اس کی جانب سے ایک سہ ماہی رسالہ 'تاریخ و سیاست' جاری کیا۔ اس مجلس کا افتتاح اس وقت پاکستان کے وزیر خارجہ سر محمد ظفراللہ خاں نے کیا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے 'تاریخ' کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

> صاحبان! جس طرح مسلمانوں نے دنیا میں عملی سائنس کی بنیاد قایم کی اور یورپ کو جس پر کئی صدی سے تاریکی چھائی ہوئی تھی، علم و حکمت کی روشنی سے مستفیض کیا۔ اسی طرح مسلمانوں نے فلسفۂ تاریخ کی بنیاد رکھی اور بتایا کہ زندہ قوموں کے لیے تاریخ کا مطالعہ کس قدر ضروری ہے۔ ابن خلدون کا مقدمۂ تاریخ آج بھی مورخین کے لیے مشعل راہ کا کام دے رہا ہے مسلمانوں میں جب سیاسی و اجتماعی زوال اور جمود آیا تو انھوں نے اپنی تاریخ سے

غفلت برتنا شروع کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دورِ حاضر میں اسلام اور مسلمانوں کی مستند تاریخیں غیر مسلم مورخین نے ترتیب دیں یا لکھیں اور اپنے حواشی کے ساتھ انھیں شایع کیا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ آج دنیا میں مسلمان اور اسلام ان ہی تاریخوں کے ذریعہ مطعون ہیں۔"

آگے چل کر آپ نے فرمایا:

"ہماری قومی تاریخ سے ہماری تہذیب اور تمدن وابستہ ہیں۔ گزشتہ تاریخ اور ہمارے قدیم کارنامے حال اور آئندہ کی مساعی میں ہماری رہنمائی اور امداد کر سکتے ہیں۔"

سر ظفر اللہ خاں کے اس افتتاحی خطبے کو ہم رسالہ 'تاریخ و سیاست' کے اجرا کی ضرورت، اس کے پس منظر اور اغراض و مقاصد کی تشریح و توضیح قرار دے سکتے ہیں خصوصیت اس لیے بھی کہ خود رسالہ میں نہ اس کی اشاعت کے اغراض و مقاصد بیان کیے گئے ہیں، نہ اس کی ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۵۱ء کو شایع ہوا۔ اس کا کوئی علاحدہ سے اڈیٹر مقرر نہیں ہوا بلکہ ایک مجلس ادارت تشکیل دی گئی جس کے صدر مولوی عبدالحق تھے اور اسی حیثیت سے وہ رسالہ کی ادارت کے فرایض بھی انجام دیتے تھے۔ مجلس کے ارکان حسب ذیل تھے:

۱۔	مولوی عبدالحق	صدر
۲۔	ڈاکٹر محمود حسین خاں	رکن
۳۔	ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی	"
۴۔	مسٹر ایم۔ بی۔ احمد	"
۵۔	ڈاکٹر معین الحق	"
۶۔	ڈاکٹر ریاض الحسن	"
۷۔	سید حسام الدین راشدی	"
۸۔	قاضی احمد میاں اختر	"
۹۔	سید ہاشمی فرید آبادی	معتمد

رسالہ 'تاریخ و سیاست'، نے شروع سے ہی اعلا معیار کو برقرار رکھا۔ اس کو ابتدا سے ہی اپنے عہد کے ممتاز دانشوروں اور نامور ادیبوں کا قلمی تعاون حاصل رہا۔ جس رسالے میں ایسی نابغۂ روزگار شخصیات

کے مضامین شایع ہوتے رہے ہوں۔ جیسے علامہ سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر محمد اشرف، مالک رام، سید معین الحق، ڈاکٹر وحید قریشی، نصیر الدین ہاشمی، مولوی عبد الحق، ایڈورڈ زاخاؤ، تمکین کاظمی، محمد علی قصوری، مفتی انتظام اللہ شہابی، باقر علی ترمذی، حسام الدین راشدی اور عبد الرحمن صدیقی وغیرہ تو اس کے معیار کے بارے میں گفتگو کرنا میسر حاصل ہوگا۔ ان حضرات کا قلمی تعاون کسی بھی رسالے کے معیار کو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر کردے گا۔

'تاریخ و سیاست' میں جن موضوعات پر مضامین شایع ہوتے تھے، وہ بھی بہت اہم تھے ان میں قدیم تاریخ اور عالمی تہذیب کی بازیافت بھی ہوتی تھی اور عہد وسطیٰ کے مسلمانوں کے تمدنی جلووں کی جھلک اور ان کے مختلف النوع کارناموں کی تلاش و تحقیق بھی۔ اس میں طبع زاد مضامین پر زیادہ زور دیا جاتا تھا لیکن دوسری زبانوں، بالخصوص انگریزی، سے ترجمہ شدہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ جن موضوعات پر زیادہ مضامین شایع ہوتے تھے ان میں بین الاقوامی سیاست، بین الاقوامی قوانین، اسلامی تاریخ، اسلامی تہذیب و تمدن، ہندوستان کی تاریخ، ہندوستان کی ثقافت و معاشرت، وسط ایشیا کی تاریخ اور وہاں کی سیاسی صورت حال، خلافت عباسیہ، مسلمانوں کا نظام تعلیم اور تاریخی شخصیات کے سوانح اور ان کے تاریخی کارنامے جیسے اہم عنوانات شامل ہیں۔ رسالہ میں تازہ مطبوعات پر تبصرے بھی شایع ہوتے تھے لیکن ہر شمارے میں ان کا التزام نہیں کیا جاتا تھا۔

مرزا سلیم بیگ

اردو کی ادبی تاریخیں اور مولوی عبدالحق

بابائے اردو مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء - ۱۹۶۱ء) ایک ہمہ جہت شخصیت تھے، ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر متعدد ماہرین و مشاہیر روشنی ڈال چکے ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ ذیل میں ہم بابائے اردو کی تحریروں کی حد سے اردو ادب کی تاریخ نویسی اور ادبی مورخ کے دائرہ کار سے متعلق ان کے نظریات کا تعین کریں گے۔

ہر چند کہ اس موضوع پر ان کی کوئی مستقل تصنیف یا باقاعدہ مضمون دستیاب نہیں ہے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ ان کے بیشتر مضامین سے متعدد ایسے علمی اور ادبی مباحث کا آغاز ہوا جن کے نتائج زبان اور ادب کی تاریخ پر اثر انداز ہوئے۔

مثلاً اردو زبان و ادب سے متعلق ان کے مضامین جو خاصی تعداد میں ہیں اور اردو کی لسانی و ادبی تحقیق میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں، نیز سرمایۂ دکنیات اور قدیم شعراء کے تذکروں پر مقدمے اور ادبی تاریخوں پر ان کے تبصرے وغیرہ جن کی روشنی میں تاریخ ادب کے کئی تاریک گوشے منور ہوئے، کئی ادبی مغالطوں کا خاتمہ ہوا اور کئی ادبی گتھیاں سلجھ گئیں۔ اس تمام تحریری سرمایے کو اگر یک جا کر کے جائزہ لیا جائے تو بآسانی زبان و ادب کی تاریخ اور ادبی مورخ کے دائرہ کار کے بارے میں ان کے نظریات متعین کیے جا سکتے ہیں۔

بابائے اردو کی نظر میں تاریخ ادب کی ترتیب و تدوین کا جو معیار تھا اس پر پورا اترنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ رام بابو سکسینہ کی تالیف A HISTORY OF URDU LITERATURE مطبوعہ ۱۹۲۷ء سے لے کر ان کی وفات ۱۹۶۱ء تک شایع ہونے والی کوئی ادبی تاریخ بجز چند ایک تاریخوں کے مثلاً حکیم شمس اللہ فاروقی کی تصنیف "اردوئے قدیم" (۱۹۲۵ء)، ان کے معیار پر پوری نہیں اتر سکی۔ اس کے ثبوت کے طور پر رسالہ اردو میں ان تاریخوں پر شایع شدہ تبصرے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ جن

میں نہ صرف ان تاریخوں کی خامیوں کی طرف واضح اشارے کیے گئے ہیں بلکہ بعض مقامات پر اغلاط کی تصیحات بھی کی گئی ہیں جنھیں دیکھ کر اس موضوع سے ان کی گہری دلچسپی اور اس پر ان کی دسترس کا اندازہ ہوتا ہے، اس کی تفصیل اس مضمون میں مناسب موقع پر آگے آئے گی۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ مولوی عبدالحق نے کبھی بھی ادبی تاریخ کو اپنا موضوع نہیں بنایا، لیکن پھر بھی وہ اس میدان میں ہونے والی ترقی سے بے خبر نہیں تھے، چناں چہ جب نواب نصیر حسین خاں خیال نے اپنے ایک خطبے کو جو انھوں نے ۱۹۱۶ء میں انجمن ترقی اردو کے سالانہ جلسے میں "داستان اردو" کے نام سے پڑھنے کے بعد "مغل اور اردو" کے نام سے شایع کیا تو مولوی عبدالحق نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا،

"یہ خطبہ دراصل اردو زبان کی تاریخ کا سرسری خاکہ تھا اردو داں طبقے میں اس کا ذرا کچھ چرچا ہوا وہ محض اس وجہ سے کہ اس وقت تک تاریخ ادبیات اردو کا مواد زیادہ روشنی میں نہیں آیا تھا۔ لیکن اب اس موضوع پر کئی مشہور ادیبوں نے تحقیقات شروع کر دی ہے اور اس قدر عجیب و غریب نتائج بر آمد ہو رہے ہیں کہ کبھی سان گمان بھی نہ تھا کہ تاریخ زبان اردو کے میدان میں اس قدر وسعت ہوگی"۔[۱]

یہی وجہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ادبی تاریخ نویسی اور ادبی مورخ کے بارے میں ان کا معیار جتنا بلند ہوتا گیا اتنا ہی ہمارے ادبی مورخوں کے لیے اس پر پورا اترنا مشکل ہو گیا، حتیٰ کہ جب سید اعجاز حسین کی کتاب "مختصر تاریخ ادب اردو" انڈین پریس الٰہ آباد سے شایع ہو کر منظر عام پر آئی تو بابائے اردو نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی مایوسی کا اظہار ان الفاظ میں کیا،

"تاریخ ادب اردو پر حال میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ افسوس یہ ہے کہ یہ موضوع جس قدر مشکل ہے اسی قدر آسان سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے"۔[۲]

---

[۱] سہ ماہی "اردو"، اورنگ آباد (دکن)، جلد ۱۴، نمبر ۵۳، بابت جنوری ۱۹۳۴ء، ص ۲۰۷

[۲] ایضاً جلد نمبر ۱۶، نمبر ۶۱، بابت اپریل ۱۹۳۶ء، ص ۲۹۰

غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ایک ادبی تاریخ کو پرکھنے کے لیے بابائے اردو کے معیارات پر پورا اترنا کوئی ناممکن بات نہ تھی، کیوں کہ ایک ادبی تاریخ سے ان کے مطالبات صرف یہ تھے کہ "کتاب پڑھنے کے بعد صاف طور پر معلوم ہو کہ اس کا موضوع کیا ہے اور اس کے لکھنے سے مؤلف کا منشا کیا ہے۔" (اردو، ۱۹۲۶ء، ص ۱۸۴) اسلوب ادا سنجیدہ اور پختہ ہو" (اردو، جنوری ۱۹۳۴، ص ۲۱۷) "ماخذات کے حوالے دیے گئے ہوں" (ایضاً ص ۳۴) ادبی تحقیق ماخذات کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اسی اہمیت کے پیش نظر بابائے اردو نے متعدد جگہ ماخذات کی نشان دہی پر زور دیا ہے چناں چہ ایک جگہ رقم طراز ہیں کہ:

> "ایسے مصنف و مؤلف جو حقیقی علم کا ذوق رکھتے ہیں وہ اپنے ماخذوں کے حوالے دینے میں کبھی بخل نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ عالی ظرفی سے کام لیتے ہیں۔"[1]

ضروری معلوم ہوتا ہے گفتگو کو مزید آگے بڑھانے سے تاریخ ادب کے نظریے کی وضاحت کر دی جائے اس سلسلے میں علی جواد زیدی اپنے ایک مضمون "تاریخ ادب کی تدوین" میں رقم طراز ہیں کہ:

> تاریخ کا ایک مفہوم تو وہ ہے جس کا تعلق تقدم و تاخر زمانی سے ہے لیکن تاریخ صرف زمانے کی ترتیب کے ساتھ واقعات کے یکجا کرنے کا نام نہیں ہے، ہر واقعہ زمان و مکان کی قیدوں میں گھرا ہوا ہے یہ واقعات تاریخ اسی وقت بنتے ہیں، جب ان کے باہمی تعلقات کو سمجھ کر انھیں ایک رشتے میں اس طرح پرو دیا جائے کہ یہ ارتقار کے مسلسل عمل کی نشان دہی کرنے لگیں . . . گرد و پیش کے ماحول سے لے کر عالمی اثرات تک تاریخ کی تشکیل و تعمیر میں اسی طرح حصہ لیتے ہیں جیسے انسانی حیات کی تعمیر و ریخت میں۔"[2]

تاریخ کا مذکورہ نظریہ جو آج رائج ہے مولوی عبدالحق بہت پہلے ایک ضمنی ذکر میں بیان کر چکے ہیں لیکن چوں کہ اب تک ان کی شخصیت کے اس پہلو کی طرف توجہ نہیں کی گئی تھی اس لیے اس پر مزید کام نہ

---

[1] مولوی عبدالحق: "چند تنقیدات عبدالحق" طبع اوّل، دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۳۹ء، ص ۳۱۔

[2] علی جواد زیدی: "تاریخ ادب اردو کی تدوین"، سہ ماہی تحریر، دہلی، علمی مجلس، جلد ۳، شمارہ نمبر ۱، بابت اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص ۱۰۹۔

ہو سکا۔ ذیل میں تاریخ کے اس نظریے سے متعلق جو دراصل مغرب سے ماخوذ ہے۔ اور اب ہمارے ہاں پورے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ بابائے اردو کے الفاظ نقل کیے جا رہے ہیں تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ تاریخ کے بارے میں ان کا نظریہ کتنا جدید اور واضح تھا:

شاعری کے انقلابات اور تغیرات زمانے کے انقلابات اور تغیرات سے وابستہ ہوتے ہیں۔ شعر کو شاعر اور اس کے زمانے سے جدا کر کے دیکھنا ایسا ہے جیسے کسی شخص کو اس کے احباب اور عزیزوں اور اس کے وطن سے جدا کر دیا . . . جب ہم شاعری کی تاریخ لکھنے بیٹھیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم شاعر کی زندگی کے حالات، اس کی طبیعت، اس کے خصائل اور عادات پر غور کی نظر ڈالیں اور اس کے بعد اس کے عہد واقعات و حالات اور تغیرات و انقلابات کا ذکر کم سے کم اس حد تک ضرور کریں جہاں تک ان کا تعلق شاعر اور اس کی شاعری سے ہے، کیوں کہ یہ ممکن نہیں کہ کوئی شاعر اور اس کی شاعری اپنے عہد کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکے۔"[1]

ان کے علاوہ بعض باتیں ایسی بھی ہیں جن کا براہِ راست ذکر مولوی عبدالحق صاحب نے کہیں نہیں کیا لیکن جہاں کہیں نظر آئیں ان کا نوٹس لیا اور اس پر اپنی رائے دی مثلاً ادبی تاریخ کے ادوار کی تقسیم کو لیجیے، جتنی ادبی تاریخوں پر انھوں نے اپنی رائے دی اس پہلو کو ضرور مدنظر رکھا حتیٰ کہ بعض تاریخوں کے سلسلے میں تو ان کے ماخذ کی نشان دہی بھی کر دی مثال کے طور پر گراہم بیلی کی تالیف "اردو لٹریچر" پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں جہاں تک ابتدائی اردو کا تعلق ہے، ادوار کی تقسیم میں "اردوئے قدیم" کا اتباع کیا ہے۔"[2]

ادوار کے ساتھ ساتھ ابواب کی تقسیم میں بھی ان کی ذاتی موجود تھی، اس سلسلے میں وہ اس بات کے خواہشمند تھے ابتدا میں ایک باب زبان کی تاریخ سے بھی متعلق ہو جس زبان سے متعلق بحث ہو جیسے "تغیر و تبدل کے اسباب" وغیرہ۔

---

[1] سہ ماہی "اردو" اورنگ آباد (دکن)، انجمن ترقی اردو (ہند)، بابت ۱۹۲۶ء، ص ۱۸۴

[2] مولانا عبدالحق: "چند تنقیدات عبدالحق" طبع اول، دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۳۹ء، ص ۵۶۔

ادبی تاریخ کے ساتھ ساتھ بابائے اردو کی تحریروں میں ایسے اشارے بھی دستیاب ہیں جنھیں یک جا کر کے ہم ایک ادبی مورخ کی نمایاں خصوصیات بھی متعین کر سکتے ہیں مثلاً:

"مولف اپنی ذاتی معلومات کو کافی نہ سمجھے"، جدید تحقیقات سے جو وقتاً فوقتاً رسالوں میں شایع ہوتی رہتی ہیں پورا استفادہ کرے" (اردو، اپریل ۳۶ء، ص ۲۹۲) مولف کو اپنے قلم پر قابو چاہیے" (اردو، جنوری ۱۹۳۶ء، ص ۲۱۰) مولف ایک وسیع المطالعہ شخص، زبان کے فطری ارتقا کی باریکیوں سے واقف ہو۔۔۔ اس کی نظر میں اردو زبان کی ترقی کے مدارج اور اس کے ارتقائی رجحانات بھی ہوں" (اردو، جنوری ۴۴ء، ص ۲۱۴، ۲۱۶) "مولف میں ضبط و متانت اور تمکین و تحمل ہو، ورنہ کتاب میں خطیبانہ جوش اور داعظانہ بلند آہنگی درآتی ہے۔ جو کتاب کے لیے اچھی علامت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بابائے اردو ادبی مورخ سے اس بات کے بھی متقاضی تھے کہ اگر اسے پچھلے مورخین کے کاموں میں کوئی فروگذاشت نظر آئے تو اس کی اصلاح کرے نہ کہ اس پر طنز کرے، چناں چہ لکھتے ہیں:

> خطا تحقیق کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ اگلوں کی تحقیق پچھلوں کی رہ نمائی کا کام دیتی ہے، اگر اس میں کوئی فروگذاشت رہ گئی ہے تو آنے والے اس کی اصلاح کر دیتے ہیں اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے۔ تحقیق اگلوں کی ہو یا پچھلوں کی، قابل قدر ہے، اگر اس میں کوئی خطا ہے تو قابلِ اصلاح ہے نہ کہ لائق سب و شتم۔" [1]

اوپر کے صفحات میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تحریروں کی مدد سے ایک ادبی تاریخ اور ادبی مورخ کے بارے میں ان کے خیالات کو یک جا کیا گیا اور ضمناً یہ جائزہ بھی لیا گیا کہ ان کی زندگی میں جتنی ادبی تواریخ شائع ہوئیں ان کے بارے میں مولوی صاحب کی رائے کیا تھی۔ یہاں مولوی صاحب کا ایک بیان نقل کیا جاتا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں جامع ادبی تاریخ کی کمی کا احساس کتنی شدت سے تھا:

> "افسوس ہے آج تک اردو زبان میں کوئی ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی جو اردو شاعری کے ان تمام انقلابات و تغیرات کو نمایاں کرتی اور اس سے یہ معلوم ہوتا کہ انواع شاعری کی ترقی کے لحاظ سے موجودہ زبانوں میں اردو کا کیا درجہ ہے"۔ [2]

---

[1] مولوی عبدالحق: ارباب نثر اردو" سہ ماہی اردو اورنگ آباد (دکن)، بابت اکتوبر ۱۹۴۲ء، ص ۶۸۳۔

[2] ایضاً، بابت ۱۹۲۶ء، ص ۱۸۴۔

ہر چند یہ بیان ۶۵ برس پرانا ہے، لیکن کیا اس کے بعد اس معیار کی کوئی تاریخ لکھی گئی۔ اور وہ پایۂ تکمیل کو پہنچی؟ اگر نہیں تو اسے ایک ایسا قرض سمجھنا چاہیے جس کا اتارنا ابھی باقی ہے۔

کتابیات

۱۔ عبدالحق، مولوی: "چند تنقیداتِ عبدالحق"، طبع اول، دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۳۹ء

رسائل

۱۔ سہ ماہی اردو، اورنگ آباد دکن، انجمن ترقی اردو، جلد ۶۔ بابت ۱۹۲۶ء

۲۔ —— ایضاً —— جلد نمبر ۶۔ نمبر ۲۳، بابت جولائی ۱۹۲۶ء

۳۔ —— ایضاً —— اکتوبر ۱۹۲۸ء

۴۔ —— ایضاً —— جلد ۱۳۔ نمبر ۵۱، بابت جولائی ۱۹۳۳ء

۵۔ —— ایضاً —— جلد ۱۴، نمبر ۵۳، بابت جنوری ۱۹۳۴ء

۶۔ —— ایضاً —— جلد ۱۶، نمبر ۶۱، بابت اپریل ۱۹۳۶ء

۷۔ سہ ماہی تحریر، دہلی، علمی مجلس، جلد ۳، شمارہ نمبر ۱ بابت اکتوبر دسمبر ۱۹۶۹ء

مسرت فردوس

مولوی عبدالحق کی خدمات
قیامِ اورنگ آباد کے دوران

مولوی صاحب کی زندگی کے مختلف ادوار مختلف مقامات پر گزرے ہیں۔ زمانہ طالب علمی کی ابتدار پنجاب سے کی لیکن علی گڑھ سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ تلاشِ معاش کے لیے بمبئی گئے اور حیدرآباد میں ملازمت کی۔ تعلیمی میدان کی دلچسپی اور ملازمت نے انھیں اورنگ آباد پہنچا دیا پھر کیا تھا اورنگ آباد کی سرزمین نے ان کے پاؤں پکڑ لیے۔ اردو کو اس کا حق دلانے کے لیے اورنگ آباد سے دلّی منتقل ہوگئے۔ جب تک دلی میں رہے اردو کی ترقی کے لیے متفکر اور مصروف رہے لیکن تقسیم ملک کے حالات نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ پاکستان چلے جائیں۔ وہاں جاکر نئے سرے سے کام کا آغاز کیا۔

یوں تو تمام عمر اپنے مقاصد کے حصول کے لیے تگ و دو، کوشش اور جدوجہد کرتے رہے لیکن خاص طور سے اورنگ آباد کا زمانہ ان کی کامیابیوں اور کامرانیوں کا زمانہ رہا۔ اس زمانے میں انھوں نے تین اہم عہدوں پر خدمات انجام دیں۔ ایک بحیثیت صدر مہتمم تعلیمات (۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۳ء تک) دوسرے معتمد انجمن ترقی اردو (۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۸ء تک) اور تیسرے پرنسپل عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج (۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۹ء تک) دارالترجمہ عثمانیہ کی خدمات، عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کی پروفیسری اور اردو لغت یہ ایسے کام ہیں جو حیدرآباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن مولوی صاحب کی کام کی لگن اور ذمہ داری کے احساس نے حیدرآباد اور اورنگ آباد کے درمیان کے فاصلے کو کم کر دیا تھا ان کے خطوط سے پتا چلتا ہے کہ اورنگ آباد سے حیدرآباد کئی چکر کرتے تھے لہٰذا ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۸ء تک کا زمانہ اورنگ آباد کا ہی دور کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد بھی ۱۹۴۷ء تک ہر سال اورنگ آباد آتے رہے۔ محمد علی کے نام ایک خط تحریر کرتے ہیں کہ:

"میں نے بے شک تم سب کو ہدایت کی تھی کہ اورنگ آباد نہ چھوڑنا لیکن زمانہ کا انقلاب ہے کہ پہلے مجھے ہی چھوڑنا پڑا۔ مگر اس کی محبت اب تک میرے دل میں ہے سید ہاشمی

کہا کرتے تھے اورنگ آباد کے قدردان اورنگ زیب عالمگیر تھے یا عبدالحق آگے لکھتے ہیں کہ ۔

یہ بھی تم جانتے ہو کہ برا بھلا کام جو کچھ بھی مجھ سے بن پڑا اس کا زیادہ تر حصہ اورنگ آباد میں بیٹھ کر کیا پھر میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں[۱]

مولوی صاحب علی گڑھ سے بی۔اے کی ڈگری لے کر بمبئی روانہ ہوئے۔ پھر حیدرآباد دکن آئے حیدرآباد میں مدرسہ آصفیہ کے صدر مدرس رہے یہاں رسالۂ افسر کی ادارت کی۔ ہوم آفس کی مترجمی پر مامور ہوئے اس وقت مسٹر حیدری ہوم ڈپارٹمنٹ کے وزیر تھے کسی بات سے ناراض ہو کر مولوی صاحب نے حیدرآباد چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا انھی دنوں میں میر سعادت علی نے ڈاکٹر سراج الحسن ناظم تعلیمات سے سفارش کی کہ مولوی صاحب کو محکمۂ تعلیم میں لیا جائے[۲]۔ مولوی صاحب کا حیدرآباد سے اورنگ آباد آنے کا واقعہ بھی دلچسپ ہے ریاست حیدرآباد کا ایک صوبہ میدک تھا۔ گوبند رام صاحب کالے اس صوبہ کے مہتمم تعلیمات تھے۔ گوبند رام کالے صاحب نے تین ماہ کی رخصت لی تو مولوی صاحب منصرم بنا کر بھیجے گئے۔ ۸ر فروری ۱۹۱۱ء کو مولوی صاحب نے مہتمم تعلیمات صوبۂ میدک کا جائزہ لیا[۳]۔ خطوطِ عبدالحق مرتبہ اکبرالدین صدیقی میں درج ہے کہ محمد علی تعلیمات میدک میں اہل کار تھے کالے صاحب نے اپنی رخصت میں توسیع کرنی چاہی تو محمد علی کو خط لکھا کہ اطلاع دو کہ کتنی رخصت اور طلب کی جا سکتی ہے لہٰذا کالے صاحب کی چھ ماہ کی رخصت منظور ہوئی اور چند دن بعد کالے صاحب کا تبادلہ اورنگ آباد ہو گیا اس لیے کارگزار مہتمم مولوی عبدالحق کو اورنگ آباد جانا پڑا لہٰذا ۱۹۱۱ء میں مولوی صاحب اورنگ آباد آگئے۔

اورنگ آباد میں کام کی نوعیت، یہاں کی فضا اور یہاں کا ماحول مولوی صاحب کے مزاج اور افتادِ طبع کے عین مطابق تھا چنانچہ اورنگ آباد کا قیام صحیح معنوں میں ان کی زندگی کا عہد زریں ثابت ہوا۔ یہاں تعلیم سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو ایک تحریک میں بدل دیا۔ مولوی صاحب ابتدا ہی سے فطرت کے حسین اور دلکش ماحول کو بہت پسند کرتے تھے اورنگ آباد شہر پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے باغوں کی کثرت ہے جگہ جگہ حوض،

---

[۱] خط بنام محمد علی کراچی، ۱ر دسمبر ۱۹۵۸ء خطوطِ عبدالحق مرتبہ اکبرالدین صدیقی ص ۲۱۰

[۲] بیادِ عبدالحق از محمد حبیب اللہ رشدی ماہنامہ قومی زبان ستمبر ۱۹۶۷ء

[۳] ہندوستانی ادب کے معمار عبدالحق از مختارالدین احمد ساہتیہ اکاڈمی ص ۲۵

فوارے، جھرنے خوب صورتی میں اضافہ کرتے ہیں زمین دوز نہروں کا انتظام ملک عنبر کا ہے ڈاکٹر سراج الحسن کے مشورے پر مقبرہ رابعہ دورانی کو جسے اورنگ زیب نے تاج محل کے نمونے پر تعمیر کیا تھا رہنے کے لیے منتخب کیا یہ بڑا ہی خوب صورت اور پُر فضا مقام ہے مکان مقبرے کے شمال مشرقی سرے پر احاطہ کی چار دیواری سے متصل تھا اس کے نصف حصہ میں مولوی صاحب کی سکونت تھی اور نصف حصہ میں انجمن کا دفتر تھا۔ مقبرے کی حسین عمارت کے پیچھے پہاڑیاں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس زمانے میں یہ علاقہ اتنا غیر آباد تھا کہ مسعود حسن ہاشمی لکھتے ہیں کہ ایک وقت شیر باغیچہ کے حوض سے پانی پینے آیا تھا[۱] مولوی صاحب کو یہ مقام بہت پسند تھا۔ یکم نومبر ۱۹۵۸ء میں کراچی سے ساجد علی کے نام خط لکھتے ہیں کہ

اورنگ آباد کا وہ مقام جہاں میرا قیام تھا یعنی مقبرہ رابعہ دورانی اسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس کی صاف ستھری ہوا، عنبری نہر کے لطیف پانی، اس کے دل رُبا ماحول میں ایسی کشش تھی کہ حیدرآباد چھوڑنے کے بعد بھی میں ہر سال کچھ دن وہاں بسر کرتا اُسے اپنی صحت توانائی اور مسرت کا ضامن سمجھتا اب بھی کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ اورنگ آباد جاؤں اور چند روز مقبرے میں جا کر رہوں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حسرت میرے ساتھ قبر میں جائے گی[۲]

باغبانی سے آپ کو خاص دل چسپی تھی یہ شوق بھی یہاں پورا ہوا آپ حکومت کی طرف سے اس باغ کے اعزازی نگراں کار تھے۔ نام دیوا اسی باغ کا مالی تھا[۳]

مولوی صاحب صوبہ اورنگ آباد کی مہتمم تعلیمات پر فائز ہوئے تو اس زمانہ میں صوبہ کے چار ضلعوں کے لیے صرف ایک مہتمم تعلیمات مقرر تھا۔ مولوی صاحب چاروں اضلاع کا دورہ کرتے تھے زیادہ تر تحتانی مدارس تھے، جن میں چوتھی تک تعلیم ہوتی تھی۔ گنتی کے وسطانیہ مدارس بھی تھے سر اکبر حیدری وزیر فینانس نے محکمہ تعلیمات کے لیے خزانہ کا منہ کھول دیا۔ ہر سال مدرسوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا تھا کام بڑھ جانے کی وجہ سے صوبے بھر کے لیے چار انسپکٹر آف اسکولس مقرر ہوئے اس کے سال دو سال بعد ہر صوبے

---

[۱] کچھ عرصہ بابائے اردو کے ساتھ از مسعود حسن ہاشمی، قومی زبان اگست ۱۹۸۷ء ص ۱۱۹

[۲] خط بنام ساجد علی خطوطِ عبدالحق مرتبہ اکبر الدین صدیقی ص ۱۷۵

[۳] عظیم انسان از غلام ربانی سہ ماہی بابائے اردو نمبر ۱۹۷۲ء ص ۴۲

کے لیے ایک صدر مہتمم تعلیمات مقرر ہوا۔ مولوی صاحب نے اورنگ آباد کے اضلاع کے علاوہ تعلقوں کے چھوٹے چھوٹے تحتانی مدرسوں تک کا دورہ کیا۔ مولوی صاحب کا طریقہ تھا کہ پربھنی اور ناندیڑ کے دورے پر ٹرین سے جاتے تھے مگر اورنگ آباد اور بیڑ کے تعلقوں کا بڑا دلچسپ دورہ کرتے ایک خوب صورت تانگا اپنے لیے رکھ لیا تھا۔ نوکر پیشہ لوگ بیل گاڑیوں میں ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ بعض مقامات پر آپ کو پیدل بھی جانا پڑتا تھا۔ مولوی صاحب ہمیشہ اپنے کیمپ کے لیے دریا کا کنارہ، پہاڑیوں کی وادی یا پُر فضا مقام تلاش کرتے اور آبادی سے باہر ڈیرے لگواتے تھے۔ آپ کے دوروں سے متعلق دلچسپ معلومات واقعات آپ کے ماتحتین نے درج کیے ہیں۔ شیخ چاند مرحوم نے ہٹن ضلع اورنگ آباد کے دورہ کا ذکر ایک جگہ اس طرح کیا ہے۔

> "مولوی صاحب تعلیمات صوبۂ اورنگ آباد کے صدر مہتمم تھے۔ دورہ کی تقریب میں وہ ہٹن سال میں کم از کم ایک بار ضرور تشریف لاتے۔ ان کی آمد آمد سن کر مدرسین کی سرگرمیاں بڑھ جاتی تھیں۔ ہر شخص اپنی کارگزاری کے اظہار میں بے چین رہتا تھا۔ شہر کے باخبر لوگوں میں چرچے ہوتے تھے ہم پر ان چیزوں کا بڑا اثر ہوتا تھا وہ آتے تو معلوم ہوتا کہ علم و فضل کا دیوتا آرہا ہے۔"[۱]

مدرسے کی کتاب الرائے میں ہدایتیں لکھنے کے بجائے مولوی صاحب اساتذہ کو زبانی سمجھاتے تھے۔ اس طرح سے اساتذہ کو بھی کھلے دل سے اپنے مسائل پیش کرنے کا موقع ملتا تھا۔ تعلیم کے اصول بہت کارآمد تو ہوتے ہیں لیکن بعض اوقات مقامی حالات کے پیش نظر ان پر عمل کرنا دشوار ہوتا ہے مولوی صاحب ان دشواریوں کو خوب سمجھتے تھے اپنی ہدایات میں آزادیٔ عمل کی گنجائش رکھتے تھے۔

ڈاکٹر رحیم الدین کمال نے لکھا ہے کہ "اگر مولوی صاحب کی کتاب الرائے میں لکھی ہوئی تحریریں ایک جگہ جمع کر دی جائیں تو فنِ تعلیم اور علم و ادب کے لیے ایک بہت ہی مفید ذخیرہ ثابت ہوں گے۔"[۲] لیکن افسوس کہ اب یہ ریکارڈ دستیاب نہیں ہے۔

ناندیڑ ضلع میں کیلینا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے وہاں ایک مدرسہ وسطانیہ تھا مولوی صاحب نے وہاں

---

[۱] بابائے اردو مولوی عبدالحق کی زندگی کے چند حقیقت افروز پہلو از ڈاکٹر رحیم الدین کمال سہ ماہی اردو، بابائے اردو نمبر ۱۹۶۲ء ص ۳۰۸

کے مدرسے کے طریقۂ تعلیم کو بہت پسند کیا اور کتاب الرائے میں لکھا کہ "مجھے فخر ہوتا اگر میں ان کی ماتحتی کرتا"[1]

موثر طریقہ تدریس اور اصول فن تعلیم سے واقف کروانے کے لیے مولوی صاحب نے اورنگ آباد میں اساتذہ کی ایک انجمن قائم کی تھی۔ اس انجمن میں ایک مدرس عملی سبق دیتا دوسرے مدرسین اسے دیکھتے اور آخر تنقید کرتے مولوی صاحب اپنی صدارتی تقریر میں اس سبق پر نکتہ چینی اور غلطیوں کی اصلاح کرتے۔ نیچ اقوام کو آگے بڑھانے اور ترقی دینے کا خیال بھی مولوی صاحب کو تھا وہ مہتمان اضلاع کو زبانی اور تحریری ہدایت کرتے کہ تعلیمی رپورٹوں میں ان طلبار کی تعلیمی حالت کا خاص تذکرہ کیا جائے۔ سید ساجد علی لکھتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ رپورٹ میں ان کی تعلیم کا ذکر علاحدہ سرخی قائم کر کے نہیں کیا بلکہ ضمناً کر دیا تو مجھے لکھا کہ

"میں نے آپ کو بارہا تاکید کی ان بے بس اور بے کس نیچ ذاتوں کی تعلیم کا ذکر رپورٹ میں خصوصیت سے کیا جائے مگر آپ نے میری ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ کیا سید بھی برہمن ہو گئے ہیں"۔[2]

مولوی صاحب اساتذہ کی خوب عزت کرتے تھے اس سلسلے میں ساجد علی صاحب اور ڈاکٹر رحیم الدین کمال نے یہ واقعہ تحریر کیا ہے کہ ایک انگریز ماہر تعلیم مسٹر میہیو تھے مولوی صاحب کے ساتھ دورے پر تھے اور کسی گاؤں پر پہنچے۔ مسٹر میہیو کو کوئی بات بری لگی اور وہ بھری جماعت میں استاد پر برس پڑے مولوی صاحب یہ دیکھ کر بے تاب ہو گئے اور اپنے خیمہ میں واپس ہو کر مسٹر میہیو کو لکھ بھیجا کہ وہ اسی وقت واپس ہو رہے ہیں۔ جب مسٹر میہیو نے سبب پوچھا تو مولوی صاحب نے کہا کہ آپ استاد کو اس کے طالب علموں کے سامنے ڈانٹتے ہیں اس طرح میں آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔[3]

مولوی صاحب تعلیم بالغان کی اہمیت سے بھی واقف تھے۔ تعلیم بالغان کے ذریعہ اردو کی اشاعت کرنا بھی مقصود تھا۔ محلہ بیگم پورہ کے بالغوں کو جمع کر کے مولوی صاحب انھیں خود پڑھاتے تھے۔ مولوی صاحب نے اردو کا قاعدہ جدید طریقے پر بڑی محنت، توجہ اور مشوروں سے تیار کیا تھا اور اس کے ساتھ کلید قاعدہ بھی

---

[1] عظیم انسان از غلام ربانی سہ ماہی اردو بابائے اردو نمبر ۱۹۶۲ء ص ۴۳

[2] مولوی صاحب اور تعلیمات از سید ساجد علی سہ ماہی اردو ۱۹۶۲ء ص ۲۰۲ ۔ [3]

[3] بابائے اردو کی با مقصد زندگی کے چند حقیقت افروز پہلو از رحیم الدین کمال سہ ماہی اردو بابائے اردو نمبر اگست ۱۹۶۲ء ص ۳۰۹

چھپوایا تھا اس قاعدے کا ذکر انجمن کی رپورٹوں اور خطوط میں ملتا ہے۔

صدر مہتمم تعلیمات کے عہدہ کے ساتھ ساتھ مولوی صاحب ۱۹۱۲ء سے معتمد انجمن ترقی اردو کی اہم ذمہ داری بھی سنبھال رہے تھے۔ حیدر آباد کی عظیم شخصیتوں سر راس مسعود اور سر اکبر حیدری سے مولوی صاحب کے قریبی تعلقات تھے۔ مولوی صاحب نے اپنی کوششوں سے مدرسہ فوقانیہ اورنگ آباد کو انٹرمیڈیٹ کالج بنا دیا۔ اس کالج کی صدارت یا پرنسپلی کے لیے ان سے زیادہ موزوں شخص کوئی نہیں تھا پھر در دقولنج کی مجبوری کو بھی مدِ نظر رکھتے ہوئے مولوی صاحب صدر مہتمم تعلیمات سے صدر عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج بن گئے۔ تعلیمی یا علمی میدان سے متعلق یہ ان کی دوسری اہم ذمہ داری تھی۔

جامعہ عثمانیہ سرکار عالی کے سال نامہ ۱۳۳۴ف جلد اول میں درج ہے کہ حسبِ تحریک ناظم صاحب تعلیمات و بمنظوری مجلس اعلا جامعہ عثمانیہ میں تین انٹرمیڈیٹ کالج قائم کیے گئے۔

۱۔ سٹی انٹرمیڈیٹ کالج

۲۔ اورنگ آباد انٹرمیڈیٹ کالج

۳۔ مدرسہ نسواں نام ہیں۔

اورنگ آباد میں امتحاناً دو سال کے لیے انٹرمیڈیٹ کالج قائم کیا گیا ہے مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے جو صوبہ اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات تھے کالج کے صدر مقرر ہوئے ہیں[1] ۲۴ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو انٹرمیڈیٹ کالج کی ابتدا ہوئی[2] پروفیسر عبدالقوی دسنوی، محمد حبیب اللہ رشدی، اور اورنگ آباد میں مولوی صاحب کے شاگردوں مثلاً غلام جیلانی ہاشمی، عزیز الدین مغربی، شیخ احمد اورنگ آبادی سے ملاقات کرنے پر انھوں نے بتایا کہ اس وقت اورنگ آباد میں دو اسکول تھے۔ ایک مدرسہ فوقانیہ اور دوسرا انگلش ہائی اسکول۔ مدرسہ فوقانیہ کے صدر مدرس ملا شیخ داؤد تھے اور ہائی اسکول صدر ایس۔ آر۔ پیٹرک تھے ہائی اسکول کا تعلق مدراس یونیورسٹی سے تھا اور فوقانیہ کا تعلق سلطنت آصفیہ کے ڈائرکٹر تعلیمات سے۔ حیدر آباد میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہو جانے کے باوجود اسکولوں اور کالجوں کا تعلق مدراس یونیورسٹی سے رہا۔

---

[1] جامعہ عثمانیہ سرکار عالی سال نامہ ۱۳۳۴ف جلد اوّل ص ۱۰۹

[2] ،،

وہاں کی دونوں اسکولوں کو ملا کر ایک مڈل اسکول ایک انٹر کالج بنا دیا گیا۔[1] انٹرمیڈیٹ کالج موجودہ ملٹی پرپز اسکول اورنگ آباد کی عمارت کے دوسرے منزلے پر کھولا گیا جب کالج کی پہلی جماعت قائم ہوئی تو مولوی صاحب نے اپنے خرچ سے ان تمام طالب علموں کو جو اسی سال فوقانیہ کی تعلیم ختم کر کے جا چکے تھے واپس اورنگ آباد بلایا۔ غلام جیلانی ہاشمی نے دوران ملاقات بتایا کہ مولوی صاحب کو اختیار دیا گیا کہ اساتذہ ان دونوں اسکولوں میں متناسب ہوں اور لیے جائیں اس کے باوجود اگر اساتذہ کی ضرورت ہو تو باہر سے بلائیں مولوی صاحب لائق اساتذہ کو شمالی ہندوستان سے بلایا جامعہ عثمانیہ کے سال نامہ میں اساتذہ کے نام درج ہیں۔ ڈاکٹر ظفر اقبال نے بالکل صحیح کہا ہے کہ

"مولوی صاحب چوں کہ ایک طویل مدت تک محکمہ تعلیم سے وابستہ رہے تھے لہٰذا وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ اداروں سے اشخاص نہیں بلکہ اشخاص سے ادارے تشکیل پاتے ہیں۔ تعلیمی اداروں کا طرۂ امتیاز و سرمایۂ افتخار اس کے ذی علم اساتذہ ہوتے ہیں۔ کالج کی بدولت اورنگ آباد میں علمی و تہذیبی فضا پیدا ہو گئی۔"

عزیز الدین مغربی نے لکھا ہے کہ مولوی صاحب کو طلبا سے اتنی محبت تھی کہ ان کے خلاف کسی قسم کی کوئی شکایت برداشت نہیں کرتے تھے۔ اور تو اور اس معاملہ میں اساتذہ کو بھی نہیں بخشتے۔ اُلٹے انھیں کو خطا وار ٹھہراتے اور کہتے کہ طالب علم کی غلطی تمہاری نا اہلیت کا ثبوت ہے۔ طلبا تو ایسا معلوم ہوتا کہ ان کی جان ہے وہ کبھی کسی سے نہیں کھلتے تھے مگر طلبا سے گھل مل جاتے تھے۔[2]

محمد شرف الحق صاحب لکھتے ہیں کہ

اورنگ آباد کالج کا وہ کیا دور تھا کالج نہیں بلکہ ایک بڑا مشترکہ خاندان تھا۔ اسٹاف ہو کہ طلبہ یہ ناممکن تھا کہ مولوی صاحب قبلہ کے اشارے کے خلاف چلنے کا خیال بھی دل میں لائیں۔ مولوی صاحب کو کالج والوں سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہ تھی کوئی مہینہ ایسا نہ ہو گا جس میں طلبا مولوی صاحب کے روپے ہڑپ نہ کر جاتے ہوں۔ مقیم طلبہ تو اس

---

[1] علامہ محوی صدیقی از پروفیسر عبدالقوی دسنوی اور بیادِ عبدالحق از حبیب اللہ رشدی قومی زبان ۱۹۶۷ء ص ۹۳

[2] کالج کی ڈائمنڈ جوبلی کے وقت پرانے طلبہ کی جماعت بنائی گئی اس میں موصوف نے یہ مضمون پڑھا۔

معاملے میں بہت آگے تھے جہاں روپیوں کی ضرورت ہوئی مولوی صاحب کی خدمت میں دستِ سوال دراز کر دیا۔[1]

غلام جیلانی ہاشمی کا کہنا ہے کہ مولوی صاحب کو طلبا اور پروفیسر صاحبان کو کھانا کھلانے کا بڑا شوق تھا۔ جب بھی بورڈنگ کے لڑکوں کا دل چاہتا مولوی صاحب کے بنگلے پر چلے جاتے تھے۔ کئی مرتبہ مولوی صاحب طلبا کے طعام کے لیے بہترین اور عمدہ انتظامات کرتے تھے اور اس کام میں انھیں دلی خوشی ہوتی تھی۔ جس بھی طالب علم کو ضرورت مند دیکھتے فوراً روپیوں سے اس کی مدد کرتے تھے۔ پارٹیوں اور دعوتوں کے کئی دلچسپ قصے ان کے شاگردوں نے سنائے اور تحریر کیے ہیں۔ مسعود حسن ہاشمی لکھتے ہیں کہ "طلبہ کو مولوی صاحب کی طرف سے ماہانہ وظیفہ دیا جاتا تھا اور انجمن کے ذریعہ بھی طلبا کی امداد کی جاتی تھی۔ کہیں کتابوں کی، کہیں نقد رقم سے اور کہیں کتابوں سے۔[2] مولوی صاحب کی نگرانی میں کالج ڈے بڑے اہتمام سے منایا جاتا تھا اس کی تیاریوں میں مولوی صاحب، طلبا، اساتذہ اور دوست احباب پوری دلچسپی اور توجہ سے مصروف رہتے تھے۔ ۲۴، ۲۵/ اکتوبر، ۱۹۲۷ء کو مرزا فرحت اللہ بیگ کا لکھا ہوا۔ ۱۲۶۱ھ کا دلی کا آخری یادگار مشاعرہ" پیش کیا گیا یہ مشاعرہ اورنگ آباد کالج کے سالانہ جلسے میں شب کے وقت اسی شان سے کیا گیا جو اس زمانے کی تہذیب اور وضعداری کے شایان تھا۔ اس میں خاص طور پر یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ ہر چیز اسی زمانے کی ہو اور ہر شاعر اسی حلیے اور وضع قطع میں آئے جو اصل میں تھی۔ رحیم الدین کمال کا کہنا ہے کہ اس کے انعقاد میں ذوق اور حوصلہ کا ثبوت دیا گیا۔[3]

اس موقع پر کئی مہمان حیدر آباد، علی گڑھ اور دلی سے تشریف لائے گنیش راو تھتے کا کہنا ہے وہ دن یوم کالج سے زیادہ یوم اردو تھا اردو کے بڑے بڑے ادیب اور شاعر اس تقریب میں شریک تھے۔[4] طلبا کی علمی و ادبی پرورش کے لیے مولوی صاحب کالج سے ایک دو ماہی رسالہ "نورس"

---

[1] مولوی صاحب قبلہ از محمد شرف الحق سہ ماہی اردو بابائے اردو نمبر ص ۶۸ ۱۹۶۲ء

[2] کچھ عرصہ بابائے اردو کے ساتھ از مسعود حسن ہاشمی قومی زبان ۱۹۸۰ء ص ۱۲۰

[3] بابائے اردو کی زندگی کے حقیقت افروز پہلو از رحیم الدین کمال سہ ماہی اردو ۱۹۶۲ء

[4] علمی آدمی از گنیش راو تھتے قومی زبان اگست ۱۹۶۳ء ص ۳،

شایع کرواتے تھے۔ "نورس" کا نام انھوں نے بیجاپور کے شاہی فرماں روا ابراہیم عادل شاہ ثانی کی تصنیف 'نورس' سے مستعار لیا تھا۔[1] ۱۹۲۵ء سے یہ رسالہ شروع ہوا اور انجمن کے مطبع میں چھپتا تھا۔ رسالہ معارف میں اس کے متعلق درج ہے کہ

"اورنگ آباد کالج سے میوہ نورس بہم پہنچا ہے، اور اس لحاظ سے اورنگ آباد کالج اپنے اصل یعنی جامعہ عثمانیہ سے آگے بڑھ گیا ہے۔"[2]

خطوطِ عبدالحق میں مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ

"اس کا نام میں نے بہت ہی مناسب رکھا ہے آپ سن کر بہت خوش ہوں گے 'نورس' ہر لحاظ سے مناسب ہے۔"[3]

ایک مرتبہ ۱۳ جون ۱۹۲۸ء مہاراجہ سرکشن پرشاد کی آمد پر ایک شاندار مشاعرہ کا انعقاد مقبرے میں کیا گیا اس کی منتخب غزلوں کا مجموعہ اور مشاعرے کے حالات محوی صدیقی نے تحریر کیے ہیں لکھتے ہیں کہ سرکشن پرشاد کی آمد پر مولوی صاحب نے شاندار مشاعرے کا انعقاد مقبرے میں کیا۔ گرمی کی ٹھنڈی اور پرکیف رات تھی۔ مشاعرہ ایک گول حوض پر کیا گیا تھا یہ حوض بہت خوب صورت اور تقریباً دو فٹ گہرا ہے چاروں طرف خوش نما کنگرے بنے ہوئے ہیں۔ تمام حوض صاف و شفاف پانی سے لبریز تھا۔ تہ آب بالکل سفید مرمریں نظر آتی تھی۔ کنگروں کے درمیان میں جو خلا تھا ہر ایک میں پانی کے اندر مختلف رنگ کی برقی روشنی کے قمقمے آویزاں تھے۔ ہر ایک کا رنگ جداگانہ تھا۔ ہوا کے جھونکے جب سطح آب کو خفیف جنبش دیتے تھے تو رنگین روشنیاں موجوں اور لہروں میں مل کر اپنی بوقلمونیوں کی عجیب بہار دکھاتی تھی۔ چوں کہ آسمان چاندنی سے محروم تھا۔ اس وجہ سے صاحبِ مشاعرہ کی جدت پسند دماغ اور ذوق سلیم لطافت مذاق نے عجیب لطف سے اس کی تلافی کر دی مقبرے کے سربفلک وکوہ پیکر گنبد پر سرچ لائٹ اس حسن سے ڈالی گئی تھی کہ گنبد قلعہ نور نظر آتا تھا۔

---

[1] عملی آدمی از گنیش راؤ تھتے قومی زبان اگست ۱۹۶۳ء ص ۳۰

[2] خطوط عبدالحق مرتبہ اکبرالدین صدیقی ص ۱۲۵

[3] ایضاً

غرض بڑا ہی حسین اور پر لطف منظر مجوی صدیقی نے پیش کیا ہے مشاعرہ کا مصرعہ طرح

اپنے رقیب آپ رہے ہم جہاں رہے۔[۱]

تھا صدر مشاعرہ نے شعرا حضرات کو ہمرو کا تھان عطا کیا۔ مقبرہ کا مشاعرہ ۱۲ تیر کو ہوا اور ۵ تیر ۱۳۴۷ ف کو کالج میں کالج کے اساتذہ نے مشہور و مقبول ڈرامہ "نکاح بالجبر" دکھایا سر کشن پرشاد کے خیر مقدم کے لیے کالج کو دلہن کی طرح آراستہ کیا گیا۔[۲]

محمد احمد سبزواری کہتے ہیں مولوی صاحب کا خطاب "بابائے اردو" ابھی انھیں اورنگ آباد کالج کے ہوسٹل سے ہی ملا تھا۔ ایک مرتبہ طلبا نے مولوی صاحب کو ہوسٹل میں کھانے پر مدعو کیا کھانے کے بعد مولوی صاحب نے دریا مندر اسکیم ہندی ہندوستانی کے متعلق اظہار خیال کیا طلبا جوش میں آگئے، ایک نوجوان محمد یوسف نے نعرہ لگایا "اردو زندہ باد، بابائے اردو زندہ باد"، بس پھر کیا تھا ساری محفل بابائے اردو زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگی جب اس واقعہ کی خبر اورنگ آباد کے ایک ہفتہ وار مقامی اخبار میں شایع ہوئی تو سرخی تھی "بابائے اردو کا کالج کے طلبا سے خطاب" پھر یہ خطاب حیدرآباد پہنچا اور وہاں سے اردو کے ساتھ ساتھ سارے برصغیر میں پھیل گیا۔[۳]

اکتوبر ۱۹۲۹ء میں مولوی صاحب وظیفہ حسن خدمت پر سبک دوش ہوئے۔ رسالہ نورس کا عبدالحق نمبر شایع ہوا جس میں الوداعی جلسہ کی تفصیل اور تقریریں چھپی ہیں۔

مولوی صاحب نے اپنی الوداعی تقریر میں کہا۔

"میری حالت اس مالی کی سی ہے جسے ایک بنجر زمین کے ٹکڑے پر باغ لگانے کے لیے مامور کیا گیا اس نے اپنی پوری صلاحیتیں صرف کر دیں اور چند برسوں میں ایک نہایت خوب صورت باغ لہلہانے لگا عین ایسے وقت اس مالی کو زبردستی ہٹا دیا گیا۔[۴]

۱۔ بزم مشاعرہ یعنی مشاعرے کی منتخب غزلوں کا مجموعہ بمقام مقبرہ اورنگ آباد ۱۲ تیر ۱۳۳۷ فصلی منعقد ہوا۔

۲۔ ایضاً

۳۔ چند تاثرات از محمد احمد سبزواری قومی زبان اگست ۱۹۶۴ ص ۳۳

۴۔ مولوی صاحب قبلہ از شرف الحق سہ ماہی اردو بابائے اردو نمبر ۱۹۶۲ء ص ۶۹

یوں تو انجمن ترقی اردو ۱۹۰۳ء میں قائم ہوگئی تھی مولوی صاحب ۱۹۱۲ء میں اس کے چوتھے سکریٹری منتخب ہوئے۔ ملازمت اور انجمن کی ذمہ داری ساتھ ساتھ سنبھالنے کے لیے مولوی صاحب نے انجمن کو اورنگ آباد منتقل کرلیا یا یوں کہیے کہ بوسیدہ رسی سے کسا ہوا صندوق اور ذمہ داری کے احساس کو لے کر اورنگ آباد آگئے۔ انجمن کے آتے ہی اورنگ آباد علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ ساجد علی کے نام خط میں لکھتے ہیں۔

"یہ ایک بیج تھا جو اڑتا اڑتا اورنگ آباد کی زرخیز زمین میں آپڑا تھا۔ چند ہی روز میں یہاں کی خوش آب و ہوا کی بدولت اس میں کونپلیں نکلیں اور ہوتے ہوتے یہ ایک تناور درخت بن گیا اور اس نے وہ نشاط انگیز بہاریں دیکھیں جو کم اداروں کو نصیب ہوتی ہیں"[1]

انجمن کا قیام، انجمن کے لیے عطیوں اور چندوں کا وصول کرنا۔ انجمن کے لیے ارکان کی تلاش۔ دورے کرنا۔ مختلف مقامات پر کتب خانے اور شاخیں قائم کرنا۔ نایاب اور دیگر زبانوں کی کتابوں کے ترجمے کروانا۔ انجمن میں چھاپا خانہ لگوانا۔ انگلش اردو ڈکشنری کی تالیف، اردو قواعد اور اردو لغت جیسی اہم کتابوں کی ترتیب و تدوین دکنی شعرا اور نثر نگاروں کے متعلق کتابیں تحریر کرنا، دور دراز مقامات سے مخطوطوں کی تلاش اور انھیں بصیرت افروز مقدموں کے ساتھ شایع کرنا۔ جامعہ عثمانیہ کے لیے نصاب تیار کرنا۔ اردو اور سائنس جیسے معیاری رسالوں کی ادارت اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے لیے کانفرنسیں۔ تقریریں۔ کانگریسی لیڈروں سے بحث و تکرار اور انجمن کی دلی منتقلی یہ تمام اتنے واقعات ہیں کہ اس مختصر وقت میں ان تمام وسیع موضوعات کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا اس کی تفصیل کے لیے علاحدہ مقالہ درکار ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کی کوششیں بھی مولوی صاحب کا اورنگ آباد میں رہ کر ایک اہم کارنامہ ہے۔ اور دارالترجمہ عثمانیہ کی نظامت بھی ایک مکمل باب ہے۔ طوالت کے پیش نظر انداز کیا جاتا ہے۔

---

[1] خطوط عبدالحق مرتبہ اکبرالدین صدیقی

شجاع احمد زیبا
سابق پرنسپل اسلامیہ کالج، کراچی

مولوی عبدالحق اور اردو کالج کراچی

مولوی عبدالحق صاحب انجمن ترقی اردو ہند کی مجلس نظما کے فیصلے کے مطابق انجمن کا صدر دفتر حیدر آباد دکن سے دہلی لے آئے تھے اور دریا گنج (   ) ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی دارالسلام میں کرایہ دار کی حیثیت سے مع انجمن مقیم ہو گئے تھے۔ حسن اتفاق سے تقسیم ہند کے موقع پر مولوی صاحب ۱۵ر جولائی ۱۹۴۷ء کو بذریعہ طیارہ حیدر آباد کی گرانٹ کے سلسلے میں حیدر آباد گئے ہوئے تھے کہ ان کی عدم موجودگی میں دلّی میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ وہ ۱۴ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو دہلی واپسی کے لیے حیدر آباد سے بذریعہ ریل روانہ ہوئے۔ ابھی بھوپال کے اسٹیشن پر پہنچے تھے کہ وہاں کے احباب نے دلّی کے فسادات کی خبر سنائی اور انھیں بھوپال سے آگے جانے کی اجازت نہ دی۔ مجبوراً بارہ دن انھیں بھوپال میں ٹھہرنا پڑا۔ وہ دہلی آنے کے لیے بے چین تھے۔ باہمی مشورے سے طے ہوا کہ کسی کو دہلی بھیج کر امن وامان کی حالت کی صحیح کیفیت معلوم کی جائے۔ علی شبیر حاتمی معلوماتی مشن پر ۱۹ر ستمبر کو دہلی گئے اور حالات کا مشاہدہ کر کے ۲۳ر ستمبر کو بھوپال واپس پہنچے اور دہلی کے احوال سے اطلاع دی اور بتایا کہ انجمن کے دفتر پر پنجاب سے آنے والے مہاجروں نے حملہ کر کے تباہی پھیلا دی ہے چنانچہ فی الحال مولوی صاحب کا دہلی جانا مناسب نہیں۔ مجبوراً مولوی صاحب حیدر آباد واپس چلے گئے۔ انجمن کے دفتر اور کتب خانے کی تباہی نے مولوی صاحب کو سخت رنجیدہ کر دیا تھا۔ وہ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو پھر بھوپال واپس آئے اور وہاں سے مولانا آزاد کے سکریٹری اجمل خاں کو خط لکھا کہ میں دہلی آنا چاہتا ہوں۔ اگر مولانا آزاد کو اعتراض نہ ہو تو سردست ان کے ساتھ ٹھہر جاؤں۔ اجمل خاں صاحب نے جواب دیا کہ مولانا کو کوئی اعتراض نہیں تو مولوی صاحب ۹ر نومبر ۱۹۴۷ء کو علی شبیر حاتمی کے ساتھ دہلی آکر مولانا آزاد کی کوٹھی پر قیام پذیر ہوئے۔ اس زمانے میں مولانا آزاد کی مصروفیات کا یہ عالم تھا کہ ساتھ رہتے ہوئے بھی مولوی عبدالحق صاحب سے بمشکل چند منٹ کی ملاقات میسر آتی تھی مولوی صاحب مولانا آزاد کے ساتھ قیام کو بے سود اور نامناسب سمجھتے ہوئے ایک ہفتے بعد

نظام پیلس گیسٹ ہاؤس میں اُٹھ آئے۔ حیدر آباد پیلس کے گیسٹ ہاؤس میں آنے کے صرف چار روز بعد ہی انھیں معلوم ہوا کہ حیدر آباد کا ایک اعلا اختیاراتی وفد حکومتِ ہند سے گفت و شنید کے لیے دہلی آرہا ہے اور ان کا گیسٹ ہاؤس میں قیام ممکن نہ رہے گا۔ دہلی میں تلاش کے باوجود کوئی جگہ رہنے کے لیے نہ مل سکی۔

ابھی وہ حیدر آباد میں تھے کہ حکومت پاکستان کی وزارتِ تعلیمات کی جانب سے ایک اہم تعلیمی کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ مل چکا تھا۔ اس کانفرنس کی شرکت کے لیے وہ ۱۵ روز دہلی میں رہ کر ۲۶ نومبر کو کراچی پہنچے۔ ۲۷ نومبر سے یکم دسمبر ۱۹۴۷ء تک کانفرنس کے اجلاسوں میں شریک ہوئے جس میں برِّصغیر کے سربرآوردہ علما اور ماہرینِ تعلیم کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس کے بعد کراچی میں انھوں نے پرانے دوستوں اور شناساؤں سے ملاقاتیں کیں۔ غلام محمد صاحب سے ان کی پُرانی یاد تھی۔ اب وہ پاکستان کے وزیر خزانہ بھی مقرر ہو چکے تھے۔ ان سے مولوی صاحب کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے دہلی میں انجمن کے صدر دفتر کی تباہی پر اظہار افسوس کیا اور مولوی صاحب سے دریافت کیا کہ اب ان کا کیا ارادہ ہے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ حالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں میں اپنا کام نہیں چھوڑ سکتا اور جس طرح بھی ہوگا اس دفتر کو دوبارہ جماؤں گا۔ جناب غلام محمد صاحب نے مولوی صاحب سے کہا کہ کانگریس ہندوستان کا ریزولیوشن پاس کر چکی ہے اور پاکستان میں اردو کو قومی زبان بنانے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ گو ملک کی تقسیم عمل میں آچکی ہے مگر جہاں تک زبان اور تہذیب کا تعلق ہے اس کی تقسیم ممکن نہیں۔ آپ کی تحریک خالصتاً تہذیبی اور لسانی ہے اور آپ کا دائرہ کار دونوں ممالک تک وسیع ہے اور آپ پر دونوں ملکوں کی لسانی و تمدنی تحریک کے فروغ کے لیے جدّوجہد کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ آپ ہندوستان میں بھی اپنا کام جاری رکھیں اور پاکستان میں بھی اپنی تحریک کو منظم کریں۔ یہ بات اس لیے بھی مولوی صاحب کو پسند آئی کہ وہ اس وقت تک اردو کو ہندو مسلم اتحاد کی ایک روشن علامت تصوّر کرتے تھے اور ان کے عقیدے کے مطابق لسانیات کا سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا۔ انھوں نے کراچی میں اپنے احباب سے مشورہ کیا اور صلاح یہ ٹھہری کہ کراچی میں پاکستان کے لیے ایک مرکز قائم کیا جائے جو پاکستان کی شاخ ہائے انجمن کو کنٹرول کرے۔ اسی غرض سے قاضی فضل اللہ صاحب نے اپنی طرف سے ملیر میں دس ایکڑ زمین دینے کا وعدہ کیا مگر پیر الٰہی بخش صاحب نے سردست کراچی کی کسی متروکہ عمارت کے الاٹ کرانے کا مشورہ دیا تاکہ کام فوراً شروع ہو سکے۔ مولوی صاحب کو انجمن کے لیے ہسپتال روڈ پر سارد امندر کے متروکہ اسکول کی بلڈنگ مل گئی مگر اس کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس میں ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجرین کی بڑی تعداد آباد ہو گئی۔ اس عمارت کا خالی کرانا خود حکومت کے بھی بس سے باہر تھا۔ مگر علی شیر حاتمی نے حکمت عملی سے کام لے کر ایک

ڈیڑھ ماہ کے اندر عمارت خالی کرالی اور اس طرح انجمن کا کراچی دفتر قائم ہوگیا جو صرف پاکستان کے لیے تھا۔

مولوی صاحب ۱۳ جنوری ۱۹۴۸ء کو زاہد حسین صاحب کے ساتھ دہلی واپس آگئے ان کا خیال تھا کہ کراچی کے دفتر میں پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی اور مولوی سید ہاشمی فرید آبادی کو انچارج بنا کر خود ہندوستان کی انجمن میں رہیں اور ضرورت پڑنے پر کراچی آتے جاتے رہیں۔ دہلی میں وہ چند روز زاہد حسین صاحب کے ساتھ ٹھہرے۔ پھر چند روز کے لیے علی گڑھ گئے وہاں ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو ہمدردان اردو کا جلسہ ہوا۔ مولوی صاحب یہ جاننا چاہتے تھے کہ دہلی کی کشیدہ فضا کے ہوتے ہوئے کیا انجمن کو علی گڑھ منتقل کیا جاسکتا ہے۔ اُس وقت یونیورسٹی کے وقار کا تقاضہ یہ تھا کہ انجمن کو علی گڑھ نہ لایا جائے۔ لیکن شرکائے جلسہ نے اس امر سے اتفاق کیا کہ مولوی صاحب بدستور تہذیبی و لسانی محاذ پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ۲۸ جنوری کو وہ سر تیج بہادر سپرو صدر انجمن سے صلاح مشورہ کے لیے الٰہ آباد گئے اور اٹاوہ ہوتے ہوئے ۳ فروری ۱۹۴۸ء کو دہلی واپس ہوئے۔ ۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو وہ سید ہاشمی فرید آبادی کے ساتھ لاہور گئے اور وہاں سے ۹ مارچ کو کراچی گئے تاکہ کراچی کے نئے دفتر میں ہاشمی صاحب کو بٹھا دیں۔ وہاں سے ۲۳ مارچ کی صبح لاہور واپس آئے تاکہ پنجاب یونیورسٹی اردو کانفرنس کی صدارت کریں۔ ۳۰ مارچ کو کراچی آئے اور یکم اپریل کو احمد آباد (گجرات) کے لیے روانہ ہوگئے۔ ۳ اپریل کو گجرات اردو کانفرنس کی صدارت کی۔ اس موقع پر سید ہاشمی فرید آبادی اور پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی صاحب بھی شریک تھے۔ ۷ اپریل کو وہ مع پنڈت کیفی کے کراچی گئے اور طے پایا کہ کیفی صاحب کراچی ہی میں قیام کریں۔ اسی زمانے میں کراچی کے جہانگیر پارک میں کیفی صاحب کی صدارت میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں کیفی صاحب نے صدارتی تقریر اس مصرعہ پر ختم کی۔

ع پروانہ چراغِ حرم و دیر نہ داند

اس زمانے میں مولوی صاحب کی طبیعت ناساز ہوگئی ڈاکٹروں نے بحالیٔ صحت کے لیے کوئٹہ جانے کا مشورہ دیا۔ اگست میں کراچی واپس آئے۔ دہلی واپسی کے لیے طے ہوا کہ پہلے کیفی صاحب وہاں جاکر حالات کا جائزہ لیں اور رپورٹ بھیجیں۔ ۱۲ ستمبر کو حیدر آباد کے خلاف پولیس ایکشن ہوا۔ کئی ماہ سے فضا میں کشیدگی کے آثار نمایاں تھے۔ کیفی صاحب نے لکھا کہ ہرگز ادھر کا رُخ نہ کرنا۔ جو لوگ حیدر آباد سے تعلق والے ہیں دہلی میں ان پر سختی ہو رہی ہے۔ مولوی صاحب دہلی آنے کے لیے بے چین تھے بالآخر ۳ اکتوبر کو دہلی واپس ہوئے اور اس دفعہ سوئی والان کے ایک مکان خلیق منزل میں مقیم ہوئے۔ ان کا ارادہ دہلی میں انجمن کے لیے کوئی مکان حاصل کرکے از سرِ نو دفتر اور کتب خانے کا انتظام کرنا تھا۔ لیکن دہلی میں انجمن کے لیے کوئی مکان دینے کو تیار نہ تھا۔ عام افواہ یہ تھی کہ حکومت

انجمن کے خلاف ہے۔ ایسی صورت میں مولوی صاحب کو اربابِ حکومت سے مل کر معاملات کو صاف کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ انجمن کے کارکنوں کو پولیس نے تنگ کرنا شروع کر دیا تھا اور مولوی صاحب کی داڑھی اور شیروانی دیکھ کر دہلی کی ہندو آبادی کی طرف سے تعجب کا اظہار ہوتا تھا۔ بہر حال وہ ۵ مارچ کو مولانا آزاد سے ملے۔ مولانا نے مولوی صاحب کی سرگذشت سننے کے بعد بقول مولوی صاحب یہ کہا کہ آپ کی ایک ٹانگ پاکستان میں ہے اور ایک ہندوستان میں۔ آپ کی نسبت بدگمانیاں بڑھ رہی ہیں۔ مولانا کو معلوم ہو چکا تھا کہ انجمن کے لیے کراچی میں مکان الاٹ ہو چکا ہے اور وہاں بھی مولوی صاحب مرکز قائم کر چکے ہیں۔ انھیں اس کا بھی شبہ تھا کہ مولوی صاحب نے پاکستانی قومیت اختیار کر لی ہے۔ حالاں کہ واقعہ یہ تھا کہ مولوی صاحب کے پرمٹ پر، جو پاکستان میں مقیم ہندوستانی ہائی کمشنر شری پرکاما صاحب کے دستخطوں سے جاری ہوا تھا مولوی صاحب کو ہندوستانی باشندہ تسلیم کر لیا گیا تھا۔ لیکن مولانا آزاد نے مولوی صاحب کے پرمٹ کا اندراج دیکھنے کی زحمت گوارا نہ فرمائی۔ جہاں تک کراچی کے مرکز کا تعلق ہے وہ پاکستانی شاخوں کے علاحدہ کنٹرول کے لیے تھا اور مولوی صاحب اب تک اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ اردو کو ایک غیر سیاسی مسئلہ اور انجمن کو ایک غیر متنازعہ ادارہ سمجھتے ہوئے ان کے اس ارادے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا کہ وہ دونوں مملکتوں میں کام کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ ملک کی تقسیم واضح طور پر عمل میں آ چکی تھی اب تو دونوں ملکوں کی اپنی اپنی علاحدہ لسانی پالیسیاں اور مصلحتیں تھیں۔ جہاں تک ایک مشترکہ قومی زبان کا تعلق ہے ہندوستان نے اب بجائے ہندوستانی کے ہندی کا تفوق قائم کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ مولوی صاحب قسم کے پرانے خیال کے لوگ جو اب تک ہندوستان اور پاکستان کے لسانی اتحاد اور تمدنی اکائی کے خبط میں مبتلا تھے، بدلتے ہوئے حالات کو سمجھنے میں دیر لگا رہے تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اب سمجھنے کو کیا رہ گیا تھا۔ تبدیلی کو دیکھتے ہوئے بھی پرانی روایت کو سینے سے لگائے وہی ضد کیے جا رہے تھے جو تقسیم سے پہلے ان کا شعار تھا۔ مولانا آزاد سے ملاقات کے بعد مولوی صاحب کو احساس ہوا کہ وہ جو کچھ سمجھ رہے ہیں اور کرنا چاہتے ہیں وہ ان حالات میں ممکن العمل نہیں یعنی :

۱۔ سب سے پہلے انھیں یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ وہ ہندوستان اور پاکستان میں سے کسی ایک مملکت کا انتخاب کریں۔ اور اسے اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنائیں۔

۲۔ ذہنی اور عملی طور پر یہ خیال فوراً دل سے نکال کر پھینکنا پڑے گا کہ وہ بیک وقت دونوں ملکوں میں یکساں قابلِ قبول ہوں گے۔

۳۔ کیوں کہ دونوں ممالک اب اپنی اپنی حکمت عملی اور مقاصد میں قطعاً آزاد اور خود مختار ہو چکے ہیں اس لیے انھیں بھی اپنی آزادی اور دائرۂ اختیار کا تعین کیے بغیر ان ملکوں میں کوئی موثر اور قابلِ عمل عوامی تحریک شروع کرنے اور چلانے کا حق باقی رہ گیا یا نہیں۔

۴۔ مولانا آزاد کا یہ کہنا کہ "آپ کی ایک ٹانگ یہاں ہے اور ایک وہاں" اور یہ کہ "بدگمانیاں بہت ہیں" آزاد ہندوستان کے نئے رہنماؤں کے طرزِ فکر کا عکاس ہے۔ اور مولوی صاحب کو اندریں حالات یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا کہ کیا وہ ہندوستان میں رہ کر اپنی پُرانی روش کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔

۵۔ انجمن کا صدر دفتر دہلی میں تھا جسے فسادات میں نقصان پہنچ چکا تھا۔ چونکہ مولوی صاحب ۱۹۴۷ء سے پہلے اسی دفتر میں کام کرتے تھے ان کی اپنی کتابیں بھی وہیں رہ گئی تھیں۔ مولوی سید ہاشمی اور پنڈت دتاتریہ کیفی کی ذاتی کتابیں بھی وہیں پڑی تھیں۔ لہٰذا اب ناگزیر طور پر وہ پاکستان جاتے۔ یں تو انجمن کے اثاثوں اور کتب خانے وغیرہ کا کیا ہوگا۔

مولوی صاحب نے اپنے ارادوں اور مجبوریوں کو مولانا آزاد سے بیان کیا۔ مولانا آزاد اپنی تمام تر ہمدردیوں کے باوجود اس پر قدرت نہ رکھتے تھے کہ مولوی صاحب کے ماضی کو اپنے اور ہندوستان والوں کے ذہن سے یک سر محو کر سکیں۔ یہ واقعہ تھا کہ مولوی صاحب نے زندگی بھر ہندی کی جارحانہ پیش دستی کی مزاحمت کی تھی اس لیے انھوں نے براہِ راست گاندھی جی سے مجادلہ کیا تھا۔ خالص ہندی پرستوں کو وہ ہندو مسلم اتحاد کا دشمن سمجھتے اور کہتے رہے۔ انھوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اردو کو پھیلانے اور منوانے پر صرف کی تھیں۔ کیا نیا ہندوستان انجمن ترقی اردو اور اس کے رہنما کے اس طرزِ عمل کو برداشت کر سکتا تھا۔ تقسیم کے بعد اردو والوں کو تو یہ کہنا تھا کہ وہ ہندی کے حریف نہیں حلیف ہیں۔ اور اگر ہندی کے بجائے اردو کو بھی صرف جینے کا حق دے دیا جائے تو وہ اسی پر قانع اور مطمئن ہیں۔ کیا مولوی عبدالحق اس نئے اندازِ نظر کو قبول و اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے وہی فیصلہ کیا جو وہ کر سکتے تھے۔ کیوں کہ فیصلہ تو حکومتی سطح پر ہو چکا تھا اور اردو کو ہندی کے مقابلے پر حریفانہ کھڑا کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ مولانا آزاد نے مولوی صاحب کو یقین دلایا تھا کہ اگر وہ پاکستان جانا چاہیں گے تو انجمن کی منصفانہ تقسیم میں بھی کوئی دشواری نہ ہوگی۔ لیکن دہلی پولیس نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو انجمن کا کتب خانہ سربہ مہر کر دیا اور پہرے پر دو سپاہی مقرر کر دیے گئے کہ اب مولوی صاحب اس کے کتب خانے میں داخل نہ ہو سکیں۔ انجمن کے دفتر املاک اور کتب خانے کی تقسیم کبھی عمل میں نہ آسکی۔ سر تیج بہادر سپرو صدر انجمن نے ڈاکٹر تاراچند

معتمد تعلیمات اور چیف کمشنر دہلی کو خطوط لکھے مگر کوئی مداوا نہ ہوا۔

مولوی صاحب نے پاکستان جانے کا فیصلہ کر کے ۱۲ر اکتوبر کو مولانا آزاد کو مطلع کر دیا کہ میں یہ مسئلہ انجمن کی مجلس نظما میں پیش کر کے قطعی تجویز منظور کراؤں گا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی بھی یہی رائے تھی مگر یہ حضرات مولوی صاحب کے پاکستان کے فیصلے کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور انھوں نے واضح طور پر مولوی صاحب کو لکھ دیا کہ اس فیصلے کو میری رائے کا نتیجہ نہ کہا جائے۔ بہر حال ۲۶ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کو علی گڑھ میں مجلس نظما کا اجلاس ہوا اور مولوی صاحب کو ہندوستان کی انجمن کی ذمہ داری سے سبک دوش کر کے کتب خانے وغیرہ کی تقسیم اور اپنی ذاتی کتابیں انجمن سے نکال لینے کی اجازت دے دی گئی جس پر عمل کی کبھی نوبت نہ آئی۔ بالآخر ۲۸ر جنوری ۱۹۴۹ء کو مولوی صاحب آخری مرتبہ ہندوستان سے کلیجے پر پتھر رکھ کر پاکستان آگئے۔ اس سلسلے میں خود مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ:

> "دلّی میں رہ کر ہم نے سب جتن کر کے دیکھ لیا کہ یہاں دال گلتی نظر نہیں آتی آخر تنگ آکر اسی میں خیریت دیکھی کہ دلّی کو خیرباد کہیں چنانچہ ۶ جنوری ۱۹۴۹ء کو میں گرانڈ ٹرنک سے بھوپال روانہ ہو گیا۔۔۔۔۔
>
> ۲۴ جنوری کو بھوپال سے روانہ ہو کر ۲۵ کی صبح کو بمبئی پہنچا، دو تین روز قیام کر کے بعض احباب سے ملا اور دو ایک کام تھے وہ کیے آخر ۲۸ جنوری ۱۹۴۹ء کو بمبئی سے یہ شعر پڑھتا ہوا جہاز میں سوار ہوا۔
>
> رخصت اے ہندوستاں اے بوستان بے خزاں
> رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی میہماں"

مولوی عبدالحق صاحب کی زندگی کا بیشتر حصہ ہندوستان میں بسر ہوا تھا اور وہ بھی دکن میں۔ ان کی ساری تگ و تاز اور مہم جوئی اردو اور صرف اردو کے لیے وقف رہی۔ تقسیم کے بعد انھیں ہندوستان میں اردو کے لیے گنجائش نظر نہ آئی اور اب انھیں بادل نخواستہ ترک وطن پر مجبور ہونا پڑا۔ وہ اپنی پرانی روش کے مطابق اردو کے لیے جدوجہد کر سکتے تھے لیکن نئی حکومت آزادی کے بعد اپنے اختیارات کو اردو کے خلاف استعمال کرنے میں غیر معمولی سرعت اور تیز رفتاری پر آمادہ نظر آئی اور انجمن ترقی اردو کی مخالف ہندی سرگرمیوں کو برداشت کرنے اور ایک فراخ دلانہ رویہ اختیار کرنے پر بالکل تیار نہ تھی۔ وہ ۲۸ جنوری ۴۸ء کو خستہ و درماندہ کراچی پہنچے۔ زندگی کا ایک

اہم اور تاریخ ساز باب ملک کے سیاسی انقلاب کی زد میں آ کر بند ہی نہیں ہوا مٹ گیا۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو کی تشکیل و تنظیم جس انداز میں کی تھی اور جس طرح اسے ایک ملک گیر ادارہ بنایا وہ ایک ہی جھٹکے میں مسمار ہو گیا تھا۔ اس کی بربادی اور تباہی مولوی صاحب کے درخشاں ماضی کی مکمل نفی تھی۔ ایک تو یہ غم تھا کہ اب وہ گھوم پھر کر اسی مقام پر آ گئے تھے جہاں سے یہ سفر شروع کیا تھا۔ انجمن کی بربادی سے بڑا سانحہ عثمانیہ یونیورسٹی کے انقلاب کا تھا اس طوفان میں جو ریاست حیدر آباد کے خلاف ہندوستان کی "پولیس کارروائی" کے جلو میں آیا پہلا کاری وار جامعہ عثمانیہ پر ہوا۔ حیدر آباد کے ملٹری گورنر نے ریاست پر قبضہ ہوتے ہی حکم جاری کر دیا کہ اردو ذریعہ تعلیم کے اس کامیاب تجربے کو جو ملک بھر میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے مثال تھا اور ملک کی کسی دوسری زبان نے اس قسم کا قدم اٹھانے کی ابھی تک ہمت ہی نہ کی تھی بہ یک جنبش قلم خارج از آہنگ سمجھ کر مٹا نے کا حکم جاری کر دیا۔ جامعہ عثمانیہ مولوی عبدالحق صاحب کی عمر بھر کی جد و جہد اور سرگرمیوں کا ماحصل تھی۔ کسی زبان کی زندگی اور موت کے لیے اس سے محبت کرنے والوں اور اسے بولنے والوں کی کثیر تعداد کے علاوہ اسے ذریعہ تعلیم کے بطور اختیار کرنے والوں کی خاص ضرورت ہوتی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام انجمن ترقی اردو اور مولوی عبدالحق کی جہد و کاوش کا نتیجہ تھا۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کی پہلی درخواست جو حضور نظام کی منظوری کے لیے پیش کی گئی تھی وہ مولوی عبدالحق ہی کے تراوش قلم کا شاہکار تھی۔ پھر جامعہ کے قیام کے ہر مرحلے میں مولوی صاحب نے ارباب جامعہ کے ساتھ تعاون کیا ہر دشواری کے حل میں مدد دی اور مکمل تعاون کیا۔ اس جامعہ کی کامیابی اردو تالیفات و تراجم کے بغیر ممکن نہ تھی۔ چنانچہ ایک دارالترجمہ اور مطبع کا قیام عمل میں آیا جہاں ہر علم و فن کی کتابیں تیار کر کے شائع کی گئیں۔ اس میں مولوی صاحب اور ان کے رفقا کا مکمل تعاون نمودار و نمایاں تھا۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ مولوی صاحب کی امیدوں اور آرزوؤں کا ایک ایسا حسین مرقع تھی جس پر اگر مولوی صاحب یہ سمجھتے کہ ؎ تا دم از زندگی خویش کے کارے کردم، تو بے جا نہ تھا۔ اس جامعہ کو اب سیاسی مصلحتوں کی بھینٹ چڑھایا جا رہا تھا۔ اعلان ہو گیا تھا کہ اگلے تعلیمی سال یعنی ۴۹ - ۵۰ سے اردو کے ذریعہ تعلیم دینے کا سلسلہ قطعاً بند کر دیا جائے گا۔ دارالترجمہ کو حکم ہوا کہ اپنا کام فی الفور بند کر دے۔ کیونکہ اگلے سال سے ذریعہ تعلیم انگریزی ہو گی اور اس کے لیے کتابوں کی تیاری کے لیے کسی الگ شعبے کے قیام ہی کی ضرورت نہیں۔ مولوی صاحب نے آخر جنوری ۱۹۴۹ء تک ہندوستان میں رہ کر یہ تماشا دیکھا۔ ہر چند کہ وہ اس پر پختہ ایمان رکھتے تھے کہ زبانیں حکومت کے احکام کی پابند نہیں ہوتیں۔ ان کا بننا یا بگاڑنا سرکاری فرامین پر منحصر نہیں ہوتا۔ دنیا میں ایسا نہیں ہوتا کہ ایک بٹن دبا کر قوموں کے منہ سے ان کی زبان چھین لی جائے اور اگلے لمحے دوسری زبان رواج پا جائے۔ لیکن تاریخ کے مطالعے نے ان کو

یہ بھی بتایا کہ یورپ کی قومی ریاستوں میں (دنیا کی تاریخ میں پہلی بار) زبان کی بنیاد پر بھی جنگیں لڑی گئی ہیں اور مفتوحہ قوم کی زبان کو مٹانے اور پامال کرنے میں ریاستی جبر کا استعمال ہوا۔ اساس، دلوزین، چیکوسلواکیہ، ٹیرول اور پولینڈ میں صرف زبان کی خاطر بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں۔ پولینڈ میں اس سلسلے میں سب سے زیادہ تشدّد ہوا لیکن پول ایک زندہ قوم تھے انھوں نے یہ دیکھ کر کہ ان کی زبان کا سرعام بولنا قانوناً ممنوع ہے تو گھروں کے اندر اور تہہ خانوں میں بیٹھ کر اپنی زبان کے شعرا کا کلام پڑھا اور بچوں کی تربیت خاموشی کے ساتھ اپنی زبان میں کرتے رہے تاکہ ان کی زبان مٹ نہ سکے۔ البتہ اب دنیا کے حالات بدل گئے تھے۔ نئے دور میں حکومتوں کے پاس کچھ ایسے آلات اور ذرائع ہیں کہ وہ بہت جلد ایک زبان کے رواج کو ختم کر کے ایک نئی اور اجنبی زبان کو رائج کر سکتے ہیں۔ اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی وژن کے علاوہ اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ اور نصاب کو کنٹرول کر کے خاطر خواہ نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اور اب یہ کہنا کہ ایسا نہیں ہو سکتا حقائق سے آنکھیں چُرانے کے مرادف ہوگا۔ مولوی صاحب نے جو قیاس کیا تھا اس کے بارے میں ہندوستان کے گزشتہ ساڑھے تینتالیس سال کا لسانی نقشہ ہمارے سامنے ہے۔ دوسری زندہ مثال اسرائیل کی ہے جہاں ایک ہزاروں سال پرانی مردہ زبان کو اس کی قبر سے اکھاڑ کر اس میں از سرِ نو زندگی کی روح پھونکی گئی ہے اور آج ریاست کے اندر جملہ کاروبار اسی زبان میں انجام دیا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں گو ہندی کی ترویج کی رفتار اسرائیل کی نسبت سست تر ہے اور گو اب چالیس سال پہلا سا جوش وخروش قدرے ماند پڑ گیا ہے لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جدید ہندی کی بنیادیں مضبوط کی جا چکی ہیں اور اس کا سفر متعینہ راستے پر آہستہ روی مگر کمالِ احتیاط کے ساتھ جاری ہے۔ یوپی کے علاقوں کے وہ بچے جو آزادی کے بعد پیدا ہوئے ہیں اردو لکھنے پڑھنے سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔ اب نئے بچے پاکستان خط بھیجتے ہیں تو ہندی رسم الخط استعمال کرتے ہیں جسے وہاں پڑھنے والے میسر نہیں آتے۔ چند سال بعد واقعی یہ دونوں ملک صحیح معنوں میں ایسے ملک ہو جائیں گے جہاں تہذیب و تمدن، افکار و خیالات وغیرہ میں یکسانی کی کوئی رمق بھی باقی نہ رہے گی۔ مولوی عبدالحق صاحب اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک مشترک تہذیب کے فروغ کی ضرورت محسوس کرتے رہے کہ اس کا ذریعہ ان کے نزدیک مشترکہ زبان تھی۔ انھیں نظر آ رہا تھا کہ ہندوستان آہستہ آہستہ ایک نئی زبان مروّج کر رہا ہے۔ اور اس زبان میں مشترکہ تہذیب کی چھاپ نہیں۔ وہ جانتے تھے کہ جامعہ عثمانیہ کا سب کیا دھرا اس طرح مردہ اور بے کار ہو جائے گا اس سرمائے کو بچانے کے لیے انجمن ترقی اردو پاکستان کے پہلے ہی اجلاس میں جو کراچی میں ۱۳ر جنوری ۱۹۴۹ء کو ملک غلام محمد کی زیرِ صدارت ہوا، یہ فیصلہ کیا گیا کہ انجمن کی طرف سے ایک اردو کالج قائم کیا جائے نیز صدرِ جلسہ نے اس بات پر بھی زور دیا کہ تاامکان ہندوستان سے لسانی روابط قائم رکھنے

کی کوشش کی جائے جو نہ صرف زبان اردو کی حفظ و بقا بلکہ عام تہذیبی اور مجلسی تعلقات کے لیے بھی مفید ہوگی۔

انجمن ترقی اردو پاکستان کے پہلے اجلاس میں جو حضرات شریک ہوئے اس میں انجمن کے سکریٹری مولوی عبدالحق صاحب کے علاوہ جناب ملک غلام محمد صاحب وزیر خزانہ پاکستان، جناب شعیب قریشی صاحب، جناب چودھری خلیق الزماں صاحب، جناب حکیم محمد احسن صاحب، جناب صدیق علی خاں صاحب، جناب پیر الہی بخش صاحب، اور جناب مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی شامل تھے۔ اس اجلاس کے پہلے فیصلوں میں اردو کالج کا قیام یہ ظاہر کرتا ہے کہ مولوی صاحب اسے کتنا اہم اور ضروری سمجھتے تھے پھر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ تجویز کے صرف چھ ماہ کے اندر اندر اس تجویز کو عملی صورت بخش دی گئی اور یوں کہا جا سکتا ہے کہ کراچی آکر انجمن کا اہم ترین کارنامہ اردو کالج کی بنا اور اہتمام تھا۔

میں ۱۹۴۸ء میں اردو ڈان میں بحیثیت سب ایڈیٹر ملازم ہوا اور ۳۱ مارچ ۱۹۴۹ء کو تخفیف میں آگیا۔ اس وقت حکیم اسرار احمد صاحب کریوی مجھے مولوی صاحب کی خدمت میں لے گئے، مولوی صاحب کراچی میں انجمن کی بنیادیں رکھ رہے تھے۔ انھیں اپنے ذاتی کتب خانے کی کتابوں کی ترتیب کے لیے ایک آدمی کی ضرورت تھی بہت کم مشاہرے پر میرا تقرر کیا اور اپریل کے شروع میں مجھے مولوی صاحب کے ساتھ ان کی رہنمائی میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اسی زمانے میں اردو کالج کے انتظامات شروع ہوئے۔ مولوی سید تقی الدین صاحب جو اس وقت انجمن کے شریک معتمد انتظامی تھے کالج کے انتظام و انصرام میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ ۲۹ مارچ ۱۹۴۹ء کالج کے ہال میں بہت سے افراد کو مدعو کیا گیا جس میں مولوی صاحب کے ایما پر میں بھی شریک ہوا اور طے پایا کہ مولوی محی الدین صاحب جو کراچی آگئے تھے، کالج کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیں۔ اس جلسے میں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے جناب نجم الہدی صاحب مرحوم، مولوی عبدالرشید صاحب فاضل مرحوم، جناب مولوی فصیح الزماں خاں، مولوی محمد عارف صاحب مرحوم، مولوی عبدالسلام صاحب، اور مولوی مظہر علی صاحب کامل اور مولوی منتخب الحق قادری وغیرہ شریک ہوئے۔ جلسے کے شرکا نے نئے کالج کی تشکیل کا خیر مقدم کیا اور اس کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ طے پایا کہ کالج کے داخلے شروع کر دیئے جائیں اور جب معقول تعداد فراہم ہو جائے تو تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ مولوی صاحب کراچی آکر پہلے ہی کالج کے نصاب تعلیمی و مصارف نیز عمارت کی اسکیم تیار کر چکے تھے اس میں انھوں نے سندھ مسلم کالج کے ڈاکٹر ہاشمی سے مدد لی تھی۔ ۲۱ مارچ کو انھوں نے سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ابوبکر احمد عبدالحلیم صاحب سے ملاقات کی اور ان سے کالج کے قیام کی تجویز پر تبادلہ خیال کیا وائس چانسلر نے جامعہ سندھ کی شرائط الحاق کے

کاغذات اور الحاق کے فارم دے دیے۔ مولوی صاحب نے شرائط الحاق کا بغور مطالعہ کر کے اس کی جملہ شرائط کی تکمیل کی اور الحاق کا فارم ۲ رمئی کو پُر کر کے حلیم صاحب کو پیش کیا انھوں نے مشورہ دیا کہ فارم میں بطور خاص اردو ذریعہ تعلیم کی صراحت کی جائے تاکہ کالج کی خصوصیتِ خاصہ کا پورے طور پر اظہار ہو جائے چنانچہ یہی کیا گیا۔ اس کے بعد ۲۳ رجون کو کالج کی مجلس انتظامی کا اجلاس بلایا گیا جس میں حسب ذیل حضرات نے شرکت فرمائی۔

۱۔ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی ۲۔ جناب شعیب قریشی صاحب ۳۔ جناب عبدالواحد صاحب ناظم جنگلات

۴۔ جناب سید تقی الدین صاحب ۵۔ جناب سید محی الدین صاحب ۶۔ جناب قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی

۷۔ جناب سیٹھ عبداللطیف ردائی ۸۔ جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ۹۔ جناب حاتم علوی صاحب

۱۰۔ جناب ڈاکٹر محمود حسن خاں صاحب

مجلس انتظامی نے طے کیا کہ چوں کہ یونیورسٹی کا تعلیمی سال شروع ہونے والا ہے اس لیے کالج جلد از جلد قائم کر کے یونیورسٹی کو مطلع کر دیا جائے سال اول اور سال سوم کے لیے طلبہ کا داخلہ شروع کر دیا جائے چنانچہ جب خاصی تعداد میں طالب علم داخل ہو گئے تو تدریس کے آغاز کے لیے مولوی صاحب سے افتتاحی کلمات ادا کرنے کی درخواست کی گئی چنانچہ ۲۵ رجون ۱۹۴۹ء کو صبح کے گیارہ بجے طلبہ اور اساتذہ کالج کے ایک کمرے میں جمع ہوئے۔ سید تقی الدین صاحب شریک معتمد انتظامی اور ان کے برادر بزرگ مولوی محی الدین صاحب جنھیں عارضی طور پر کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا تھا شریک جلسہ تھے، مولوی صاحب کی تشریف آوری کے بعد تلاوت کلام پاک سے جلسہ کا آغاز ہوا پہلے مولوی سید محی الدین صاحب پرنسپل نے کالج کے اغراض و مقاصد پر مختصراً گفتگو کی اس کے بعد جناب مولوی صاحب نے فرمایا :

"ہم آج ایسی تحریک کا آغاز کر رہے ہیں جو پاکستان کے لیے بالکل نئی ہے ہم نے اس کو نہایت سادگی سے شروع کیا ہے۔ اگر ہم چاہتے تو بہت بڑا ہنگامہ، دعوتیں ضیافتیں کر سکتے تھے لیکن ہم نے ان ہنگاموں اور طرح طرح کے شور و غل کے مقابلے میں سادگی کو پسند کیا اس لیے کہ ہم لٹ کر اور پٹ کر یہاں آئے ہیں ہم نے مصائب، اور آلام برداشت کیے ہیں ہم نے اپنی آنکھوں سے قتل و غارت کے مناظر دیکھے ہیں۔ ہم خون کی ندی تیر کر یہاں پہنچے ہیں ہمارے لیے ہنگامے اور دعوتیں زیبا نہیں۔

دوسرے یہ کہ ہم دعوے سے پہلے عمل سے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جو کام جو

تحریک ہم نے شروع کی ہے وہ کس قدر قابل عمل ہے اور ہماری قومی زبان اور پاکستان کے لیے یہ کس قدر ضروری اور مفید ہے اس کو ثابت کرنے کے بعد ہم کو حق حاصل ہوگا۔ لیکن عمل سے پہلے بڑے بڑے دعوے کرنے کا حق ہمیں حاصل نہیں۔ ہم کو چاہیے کہ جو لوگ شک و شبہ میں ہیں ان کو اپنے عمل سے یہ بتادیں کہ ان کے شبہات غلط اور بے بنیاد ہیں۔"

مولوی صاحب نے مزید فرمایا کہ :

"اس کالج کے قائم کرنے سے ہمارا مقصد ایک تو قومی زبان کی برتری ثابت کرنا ہے اور دوسرے اس زبان کے ذریعہ علم کی اشاعت ہے۔ ہم کو ایک غیر زبان میں تعلیم دی جاتی ہے اور پاکستان بننے کے بعد بھی دی جاتی ہے یہاں تک کہ عربی فارسی اردو زبان وادب کی تعلیم بھی انگریزی زبان کے ذریعہ دی جاتی ہے۔ انگریز نے ہماری حکومت اور تہذیب وتمدن کو مختلف طریقوں سے ختم کیا۔ اس میں خود ہماری غداری کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ مادی فتح اور دولت وقوت ہمیشہ قایم رہنے والی نہ تھی۔ انگریز دوسرے فاتحوں سے زیادہ ہوشیار تھے۔ اس لیے انھوں نے انگریزی زبان کے ذریعہ روحانی اور ذہنی فتح حاصل کی۔ یہ سب سے زیادہ خطرناک تھی اور اس کے اثرات اب تک برقرار ہیں اور ہمارے ذہن اور دماغ پر مسلط ہیں۔"

انھوں نے کہا کہ :

"غیر زبان سیکھنا عیب نہیں ہم نے بہت سی غیر زبانیں سیکھیں اور سیکھتے ہیں لیکن کسی غیر زبان کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے سے نہ ہم اس زبان پر عبور حاصل کرسکے اور نہ علوم پر۔ بس طوطے کی طرح کچھ چیزیں رٹ لیں اور انگریزی تہذیب، رسم ورواج اور زبان کو اختیار کرلیا اور ہم میں سب سے بڑا شخص وہ سمجھا جانے لگا جو زیادہ سے زیادہ انگریزی کی تقلید کرے اور دل میں اپنے آپ کو انگریز سمجھے۔ اس طرح ہم میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا جس کی زبان، عادتیں رفتار کردار سب انگریز کے تھے۔ انگریز نے جب ہماری تعلیم کو اپنے ہاتھوں میں لیا تو اس نے یہ صاف صاف اعلان کیا کہ ہم انگریزی زبان

کے ذریعہ اہل ہند کو تمام علوم سکھانا چاہتے تھے تاکہ وہ ہمارے جیسے ہو جائیں یعنی کہ خود اپنے تہذیب و تمدن کو بھول جائیں اس ضمن میں سب سے زیادہ کوششیں عیسائی مشنریوں نے کیں کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ اس طرح ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے میں آسانی ہوگی۔ اگرچہ ہم عیسائی نہیں ہوئے لیکن ہماری تہذیب اور فکر و خیال انگریز یا عیسائی..... ہو گئے۔ یہ انگریز کی بہت بڑی فتح ہے۔"

انھوں نے کہا کہ:

"اس کالج کے قیام سے ہمارا مقصد اس ذہنیت اور رجحان کو مٹانا اور اپنے اخلاق و عادات اور تہذیب کی تجدید کرنا ہے۔ قومی زبان کی اہمیت اور قوت سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ یہ صرف بات چیت کرنے یا کتابیں پڑھنے تک ہی محدود نہیں۔ قومی زبان میں تو قوم کے سارے کردار ہوتے ہیں اور اس کا بولنے والا اس کی نمائندگی کرتا ہے۔"

مولوی صاحب نے اس کے بعد یاد دلایا کہ مسلمانوں کے دور حکمرانی میں کسی زبان پر جبر نہیں کیا گیا تاریخ کے مطالعے سے ثابت ہو جائے گا کہ سنسکرت اور ہندی کے اعلا درجے کے ادیب اور شاعر اسلامی عہد حکومت میں ہوئے ہیں۔ بنگالی زبان کو پنڈتوں اور برہمنوں نے بالکل مٹا دیا تھا۔ وہ بنگال میں سنسکرت پھیلانا چاہتے تھے مسلمان حکمرانوں نے بنگالی کو دوبارہ زندگی بخشی بڑے بڑے ادیب بلائے سنسکرت کی اہم کتابوں کے ترجمے کرائے اور اس زبان کے ادیبوں کو انعامات اور منصب عطا کیے۔ اس طرح بنگالی زبان کو عروج ہوا۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے بتایا کہ ملک گیری کے لیے تو جنگ و جدال ہوتی تھی مگر زبان کے لیے جنگ یورپ سے آئی ہے۔ السا س، لوزی، چیکوسلواکیہ، ٹیرول اور پولینڈ وغیرہ میں صرف زبان کی خاطر بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں۔ زندہ قوموں نے اس کے لیے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں جرمنوں نے پولینڈ میں قانوناً یہ حکم نافذ کر دیا تھا کہ کوئی شخص نہ پولستانی زبان بولے نہ لکھے اس حکم کے منوانے کے لیے سزائیں دی گئیں، لوگوں کو جیل میں ڈالا گیا، کوڑے مارے گئے مگر پولینڈ والوں نے اپنی زبان نہ چھوڑی انھوں نے اپنے شعرا کا کلام تہہ خانوں میں بیٹھ بیٹھ کر نقل کیا۔ پولیس رات کو بھی گشت کرتی تھی اور پولستانی زبان بولنے یا لکھنے پڑھنے والوں کو پکڑتی تھی یہ لوگ پولیس سے محفوظ رہنے کا انتظام کرتے تھے اور اپنی زبان کی حفاظت کے لیے بڑی کوشش کرتے رہے انتہائی سختیاں برداشت کیں مگر پولش زبان کو زندہ رکھا۔ یہ قومی زبان کا روحانی پہلو ہے۔ لسانیات و سیاسیات کے ماہرین یہ نہیں جانتے کہ زبان کا ایک روحانی پہلو بھی ہوتا ہے اگر یہ نہ ہوتا تو لوگ زبان کے لیے اتنی مصیبتیں کیوں

برداشت کرتے۔ ماہرین لسانیات الفاظ کے اشتقاق، اصل مادّے اور ساخت کی الجھنوں میں پڑے رہتے ہیں اس کے روحانی پہلو پر اس کی نظر نہیں جاتی۔ مولوی صاحب نے زور دے کر کہا کہ جو لوگ آقاؤں کی زبا خوشامد یا ذاتی اغراض کے لیے سیکھتے اور اپنی زبان سے شرماتے ہیں وہ بے غیرت اور بے آبرو ہیں اور بے آبرو لوگ مردہ ہوتے ہیں ان میں زندگی نہیں ہوتی ہے جو قومیں مردہ ہوجاتی ہیں ان میں قومی زبان کی روحانی قوت نہیں رہتی۔ ہندوستان میں ہماری زبان کو جس طرح فنا کیا جارہا ہے اس سے آپ سب بخوبی واقف ہیں اگر ہم میں قومی زبان کی روحانی قوت باقی ہے تو عدالتوں دفتروں سے اردو کو ختم کرنے سے اردو فنا نہ ہوجائے گی۔ جس طرح پولینڈ میں مائیں دروازے بند کر کے بچّوں کو اپنی زبان سکھاتی تھیں اسی طرح یہاں بھی ہر دشواری کے باوجود اپنی زبان سکھانی ہوگی۔

انھوں نے مزید کہا کہ:

"اب ہم پاکستان میں ہیں ہماری ذمہ داری اور فرض ہے کہ اپنی قومی زبان کی ترقی اور فروغ کے لیے کوشش کریں بلکہ تمام ملک میں پھیلائیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ اس زبان کو پاکستان میں لائے ہیں یہ یہاں کے کسی علاقے کی زبان نہیں۔ مگر ہندوستان میں بھی یہ کسی علاقے کی زبان نہ تھی۔ بلکہ تمام ملک کی زبان تھی اسی طرح یہاں (پاکستان) تمام ملک کی مشترکہ قومی زبان ہے۔ زبان کی ترقی ایک تو اس کے بولنے والوں سے ہوتی ہے جو اس پر پورا ایمان رکھتے ہیں دوسرے زبان کی صلاحیت سے۔ زبان کبھی کوتاہی نہیں کرتی۔ کوتاہی اہل زبان کی طرف سے ہوئی۔ ہماری زبان نے کبھی کوتاہی نہیں کی جب صنائع بدائع کا زمانہ تھا تو اس کا ساتھ دیا پھر سادگی کا دور آیا تو اس کے سانچے میں ڈھل گئی اب جب علم وفن کا زمانہ آیا تو اس میں بھی کامیاب اتری جامعہ عثمانیہ میں اس کا مکمل تجربہ کیا اور ثابت کردیا کہ یہ علوم وفنون کی تعلیم کے لیے ہر طرح موزوں ہے۔ اب جامعہ عثمانیہ ہمارے ہاتھ سے نکل گئی لیکن ہم پاکستان میں اس کے کام کو باقی رکھیں گے ہم یہاں ایک نئی جامعہ بنائیں گے۔ کھوئی ہوئی چیز حاصل کرنا آسان نہیں اس مقصد میں کامیابی کے لیے صبر واستقلال اور محنت وخلوص لازمی ہیں۔

جب ہم نے یہ کالج قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو مجھ سے کہا گیا کہ سرمایہ کہاں ہے،

کتابیں کہاں ہیں، اساتذہ کہاں ہیں ہمارا سب سے مقدم سرمایہ ہمارا ایمان ہے ہمارا
دوسرا سرمایہ یہ طالب علم اور اساتذہ ہیں یہ اس کی کامیابی کے ضامن ہیں۔ ہمارا مقصد صرف
چند کتابیں پڑھا دینا نہیں نصاب کی پانچ چھ کتابیں پڑھ کر کوئی عالم نہیں بن جاتا ایک
اوسط درجے کی لیاقت کا شخص اپنے مطالعے، کتب خانوں اور اخباروں کی مدد سے اس
قدر قابلیت حاصل کر سکتا ہے جو کالج کے طالب علم میں ہوتی ہے مگر یہ قابلیت اور ذہانت
انسانیت کے لیے کافی نہیں اس کے لیے اخلاقی قوت اور اخلاقی جرأت سچے عزم و استقلال
کی ضرورت ہے۔ اخلاقی جرأت یا نیکی بدی کی تمیز کتابیں پڑھنے یا کالج کے لیکچروں سے
حاصل نہیں ہوتی یہ صاحب علم اور صاحب اخلاق اصحاب کی صحبت سے حاصل ہو سکتی
ہے۔ اس کا سامان ہم نے خاص طور پر آپ کے لیے مہیا کیا ہے۔

آپ کی یہ خوش نصیبی ہے کہ آپ کے اساتذہ ایسے ہیں جو صاحب علم ہونے کے
علاوہ صاحب کردار بھی ہیں انھوں نے اس کالج کے لیے ایثار کیا ہے بعض نے بلا معاوضہ
اور بعض نے جو حالات سے مجبور تھے بہت ہی کم معاوضہ لے کر کام کرنا منظور کیا ہے۔
یہ بڑا ایثار ہے اور ایثار کردار کی سب سے اعلا صفت ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ پاکستان
کے تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لیے بہترین نمونہ پیش کریں۔ آپ جب باہر نکلیں تو
آپ کے ایثار و کردار و اخلاق سے یہ ثابت ہو کہ اس کالج کے طالب علم ایسے ہوتے
ہیں اساتذہ اور طلبہ سب میں یہ بات ہونی چاہیے کہ ہر دیکھنے والا یہ سمجھے کہ یہ اپنی قومی
زبان اور تہذیب و اخلاق کا نمونہ ہے آپ پر نہ صرف اپنے کالج بلکہ تمام پاکستان کی
عزت کا لحاظ لازم ہے۔

یاد رکھیے کہ قومی زبان ہی ایک وہ چیز ہے کہ پاکستان کے تمام فرقوں اور حصوں
میں اتحاد کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ آپ کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ آپ اس رشتے کو انتہائی
مستحکم بنائیں اگر آپ صبر و استقلال اور عزم و ہمت سے کام کریں گے تو انشاء اللہ ضرور کامیاب
ہوں گے اور اس کالج اور پاکستان کا نام روشن کریں گے۔"

مولوی صاحب کی افتتاحی تقریر کچھ اتنی موثر اور دل میں اتر جانے والی تھی کہ حاضرین جلسہ پر اس کا بہت اثر ہوا۔

اساتذہ اور طلبہ کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ ہم صرف ایک تعلیمی ادارے نہیں بلکہ ایک قومی تحریک کے کارکن ہیں اور ہمارے فرائض شہر اور ملک کے دیگر کالجوں سے بہت حد تک مختلف ہیں کالج کی مجلس انتظامی کے لیے جو نام یونیورسٹی کو تجویز کیے گئے وہ حسب ذیل تھے۔

۱۔ مولوی عبدالحق صاحب صدر ۲۔ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی ۳۔ چودھری خلیق الزماں صاحب ۴۔ جناب شعیب قریشی صاحب ۵۔ جناب قاضی فضل اللہ صاحب، وزیر تعلیم سندھ ۶۔ پیر الٰہی بخش صاحب ۷۔ جناب حاتم علوی صاحب ۸۔ محترمہ مسز حاتم علوی ۹۔ حکیم محمد احسن صاحب ۱۰۔ جناب ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب نائب وزیر خارجہ ۱۱۔ جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی نائب وزیر داخلہ ۱۲۔ جناب ہاشم رضا صاحب ناظم کراچی ۱۳۔ جناب ہاشم صاحب رکن مجلس دستور ساز ۱۴۔ جناب عبداللطیف باوانی صاحب ۱۵۔ مولوی سید محی الدین صاحب سابق معتمد وزارت تعلیمات حیدر آباد دکن ۱۶۔ قاسم علی نور محمد چٹھا گوکل بھائی صاحب ۱۷۔ جناب ملا عبدالحسین ذکی الدین صاحب ۱۸۔ عبدالواحد صاحب صدر ناظم محکمہ جنگلات۔ طے پایا کہ صدر کالج اور پرنسپل کالج بحیثیت عہدہ مجلس انتظامی کے صدر و معتمد ہوں گے۔

کالج میں تدریس زور شور سے جاری تھی اور وائس چانسلر حلیم صاحب کا ہمت افزا رویہ اس یقین دہانی کے لیے کافی سمجھا جا رہا تھا کہ یونیورسٹی کالج کا الحاق ضرور منظور کر لے گی۔ یونیورسٹی کی جملہ شرائط پر عمل ہو رہا تھا لیکچروں کی حاضریوں اور فی کلاس طلبہ کی تعداد وغیرہ کا باقاعدہ حساب رکھا جا رہا تھا کہ یونیورسٹی کے افسرانِ معائنہ اگر بے اطلاع تشریف لائیں تو ہر کام قاعدے کے مطابق ہوتا نظر آئے لیکن مئی ۴۹ء میں جامعہ سندھ کی سنڈیکیٹ میں انجمن کی درخواست پیش ہوئی تو اس جلسے میں طے پایا کہ چوں کہ ذریعہ تعلیم کے متعلق ایک قرارداد حال ہی میں سینٹ میں پیش ہو کر منظور ہو چکی ہے لہٰذا جب تک اس کو تین ماہ کا عرصہ نہ گزر جائے کسی درخواست پر جو اس موضوع سے متعلق ہو، غور نہیں کیا جا سکتا البتہ اگر سنڈیکیٹ کے پانچ ارکان اس کی تحریک کریں تو غور ممکن ہے۔ چنانچہ سنڈیکیٹ کے پانچ معزز ارکان کے دستخط سے اردو کالج کے الحاق سے متعلق تحریک پیش کر دی گئی جو سنڈیکیٹ کے جلسہ منعقدہ ۱۱ر جولائی میں زیر بحث آئی اس جلسے میں جو قرارداد منظور ہوئی وہ درج ذیل ہے:۔

> "قرار پایا کہ وائس چانسلر ان کے نمائندوں سے ملاقات کریں اور ان کو یہ اطلاع دیں کہ ان کی درخواست سینٹ کی قرارداد کے متناقض ہے اس لیے اس پر غور نہیں کیا جا سکتا تاوقتیکہ اس کو منظورہ قرارداد کے مطابق نہ بنا دیا جائے۔"

اس قرارداد میں گھما پھرا کر یہ واضح کیا گیا تھا کہ اردو کالج کو اس لیے الحاق نہیں دیا جاسکتا کہ اس کا ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ اگر اردو کو ترک کر کے ذریعہ تعلیم انگریزی مقرر کر دیا جائے تو سنڈیکیٹ کو الحاق پر کوئی اعتراض نہ رہتا۔ ظاہر ہے کہ ایک یونیورسٹی کی مجلس انتظامی جیسی ذمہ دار جماعت کا یہ فیصلہ از حد حیرت انگیز اور افسوس ناک تھا۔ علاوہ ازیں یہ کہنا کہ اردو کالج کی درخواست سینٹ کی قرارداد سے متناقض ہے صریحاً خلاف حقیقت تھا۔ سینٹ کی قرارداد کا منشا یہ تھا کہ فی الحال پانچ سال تک انگریزی کو ذریعہ تعلیم رکھا جائے اس کے بعد اردو ذریعہ تعلیم بنائی جائے اور انجمن اپنے کالج میں ابھی سے اردو کو رائج کر رہی تھی۔ فرق صرف تعیین مدت کا تھا غایت دراصل دونوں کی ایک تھی۔ سینٹ منزل مقصود کی طرف پانچ سال بعد جانا چاہتی تھی جبکہ انجمن ابھی سے اس طرف گامزن تھی۔ اردو کالج تو اصل میں عملی مثال قائم کر کے آئندہ کے لیے سہولت پیدا کرنا چاہتا تھا اور اس کا یہ عمل سینٹ کے منشا کے خلاف ہونے کے بجائے اس کے عین مطابق تھا چنانچہ سنڈیکیٹ کا اعتراض مولوی صاحب کو ہرگز قابل قبول نہ تھا۔ سندھ یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ اور اس کے امتحانات کو پہلے ہی تسلیم کر چکی تھی اور یہ کالج جو جامعہ عثمانیہ کے اصول پر قائم ہوا تھا، کس دلیل کی رو سے ناقابل قبول ٹھہر سکتا تھا۔ علاوہ ازیں حکومت پاکستان نے اردو کو قومی زبان تسلیم کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا تھا کہ پاکستان کی یونیورسٹیوں کا ذریعہ تعلیم اردو زبان ہی ہو گی۔ مولوی صاحب یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ جامعہ سندھ کے ارباب اختیار ان حقائق سے لاعلم تھے۔ پھر یہ امر تعجب کا باعث تھا کہ انجمن کے قابل تحسین اقدام کی تائید اور حوصلہ افزائی کے بجائے اس میں رکاوٹ پیدا کرنے کا آخر کیا مقصد تھا۔ مولوی صاحب نے اسے سراسر علم دشمنی کا مکروہ مظاہرہ قرار دیا۔

پاکستان کے اخبارات و جرائد نے جامعہ سندھ کے اس فیصلے کی پرزور مذمت کی اور اسے حد درجہ نامناسب اور رجعت پسندانہ قرار دیا۔ حتیٰ کہ ملک کے مقتدر اخبار ڈان کراچی جو حکومت پاکستان سمجھا جاتا تھا جامعہ سندھ کے فیصلے کو ہضم نہ کر سکا۔ اس کے نامور مدیر جناب الطاف حسین نے مولوی صاحب کے موقف کو درست قرار دیا انھوں نے اپنے اداریے میں دلائل کے ساتھ ثابت کیا کہ ارباب یونیورسٹی کا یہ فیصلہ ہرگز فہم و بصیرت پر مبنی نہ تھا۔ انھوں نے لکھا کہ "ہر یونیورسٹی کا ایک بنیادی مقصد اور اہم ترین فریضہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ بلند خیالی اور وسعت نظر پیدا کرے۔ یونیورسٹی کو مقامی تعصبات کی پیدا کردہ خرابیوں کو دور کرنے کا ایک موثر ترین ذریعہ ثابت ہونا چاہیے"۔

مولوی صاحب اور کارکنان کالج مرکزی حکومت کے ارباب اختیار سے ملے۔ جناب لیاقت علی خاں وزیراعظم پاکستان نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ "مولوی صاحب آپ نے پہلے مجھ سے اس کا ذکر کیوں نہ کیا۔ اگر مجھے

معلوم ہوتا کہ آپ کے کالج کے الحاق کا مسئلہ سندھ یونیورسٹی کے سامنے ہے تو میں پہلے سے کچھ نہ کچھ ضرور کرتا۔ آپ اپنے کالج کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے کرالیں اور اس میں آپ کی پوری مدد کی جائے گی۔" مولوی صاحب وزارت تعلیمات کے افسروں سے ملے اور اس باب میں صلاح مشورہ کیا۔ وزیر تعلیم فضل الرحمٰن صاحب نے کہا کہ کراچی کو وفاقی علاقہ قرار دیا جاچکا ہے اور حکومت سندھ کے دفاتر حیدر آباد (سندھ) منتقل ہو رہے ہیں۔ میں نے اپنی وزارت کو ہدایت کی ہے کہ وہ کراچی کے لیے فیڈرل یونیورسٹی کے قیام کا مسودہ قانون پارلیمنٹ میں منظوری کے لیے تیار کرے۔ میری مجوزہ فیڈرل یونیورسٹی آپ کے کالج کا فوراً الحاق منظور کرے گی۔ مولوی صاحب اس وضاحت کے بعد قدرے مطمئن ہوئے مگر انھوں نے تجویز پیش کی کہ یہ بل بعجلت محکمہ پارلیمنٹ میں لایا جائے، اس کے قیام کی تاریخ کا ابھی سے اعلان کر دیا جائے۔ بل میں یہ وضاحت بھی کر دی جائے کہ اس جامعہ کا ذریعہ تعلیم اردو ہوگی اور اس کے لیے درسی کتب کی فراہمی کے لیے ایک محکمہ تالیف و ترجمہ کی گنجائش بھی رکھی جائے اور یہ محکمہ قائم کرنے کے لیے یونیورسٹی کے بل کی منظوری کے انتظار میں وقت ضائع نہ کیا جائے بلکہ فی الفور اس کے لیے علاحدہ رقم منظور کرائی جائے۔ ان امور کے علاوہ انھوں نے تجویز پیش کی کہ مجوزہ جامعہ کا خاکہ مرتب کرتے وقت جس چیز کو ملحوظ رکھنا از حد ضروری ہے وہ مقصد تعلیم کا تعین اور طرز تعلیم کی اصلاح ہے۔ ہم کو اب ایسے نظام تعلیم کی ضرورت ہے جو پاکستان کی ضروریات کے مطابق ہو چنانچہ نئے نظام میں مقصد تعلیم کا تعین انھی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہونا چاہیے جن کے حصول کی خاطر پاکستان قائم ہوا ہے۔

۱۶ اگست ۱۹۴۹ء تک کالج میں داخلہ لینے والے طلبہ کی مجموعی تعداد دو سو سے متجاوز ہو چکی تھی۔ سال اول میں ڈیڑھ سو طالب علم تھے۔ کالج میں مخلوط تعلیم رائج کی گئی تھی چنانچہ اس تعداد میں آٹھ طالبات بھی تھیں۔ ابتداً کالج میں انگریزی اردو دینیات کے لازمی مضامین کے علاوہ تاریخ عام، تاریخ اسلام، سیاسیات و شہریت، معاشیات، منطق و فلسفہ، نفسیات، فارسی عربی کے مضامین کی تدریس شروع کی گئی اور نصاب جامعہ سندھ کے دیگر کالجوں کے مطابق تھا۔ اخبارات میں اردو تدریس کا حال شائع ہوا تو مختلف سیاست داں، ماہرین تعلیم اور اہل علم اسے دیکھنے کے لیے کالج کے اوقات میں آنے لگے۔ چنانچہ سب سے پہلے ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب نائب وزیر دفاع حکومت پاکستان، جناب ہاشم صاحب رکن سندھ، وغیرہ کالج تشریف لائے اور مختلف جماعتوں کی تعلیم اور کتب خانے کا معائنہ کیا۔ کالج کے معیارِ تعلیم کی نسبت اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ ۲۷ اگست ۱۹۴۹ء کو وزیر اعلا سندھ جناب یوسف ہارون صاحب، جناب عباس خلیلی معتمد محکمہ صنعت، جناب نذیر احمد کمشنر آباد کاری اور جناب شعیب قریشی

مرکزی اور صوبائی حکومت کے دیگر عمّال کے ہمراہ کالج میں تشریف لائے۔ کالج کا معائنہ کیا اور طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے جناب یوسف ہارون صاحب نے کہا کہ جہاں تک مرکزی حکومت اور اس کے تحت صوبائی حکومتوں کا تعلّق ہے سب کا یہ عقیدہ اور ایمان ہے کہ اردو پاکستان کی قومی زبان ہے۔ ۳۱ر اگست کو صوبہ سرحد کے وزیر اعلا خان عبدالقیوم خان نے بھی کالج کا دورہ کیا۔ ۱۹ر ستمبر ۴۹ء کو وزیر اعظم پاکستان جناب لیاقت علی خاں معہ بیگم لیاقت علی خاں و سردار عبدالرب نشتر گورنر مغربی پنجاب و خواجہ شہاب الدین وزیر داخلہ پاکستان کالج میں تشریف لائے اور کالج کے کتب خانے کا افتتاح کیا۔ اور مولوی صاحب کے کام کی بہت تعریف کی۔ فیڈرل یونیورسٹی کا بل ابھی پارلیمنٹ میں پیش ہونے میں دیر ہو رہی تھی۔ طلبہ میں یہ اضطراب بڑھ رہا تھا کہ الحاق نہ ہوا تو طالب علم امتحان میں کیونکر شریک ہوں گے۔ مولوی صاحب ۲ر نومبر ۴۹ء کو وزیر تعلیم جناب فضل الرحمان سے پھر ملے اور کالج کے بڑھتے ہوئے مسائل کا ذکر کیا اور اطمینان دلایا۔

۲۸ر مئی ۴۹ء کو مولوی صاحب نے سید ہاشمی فرید آبادی کو خط میں لکھا تھا کہ "کالج کا معائنہ ابھی تک معلق ہے وائس چانسلر بہت نکما ہے۔" (مطبوعہ اردوئے مصفی) ۲۲ر جولائی ۱۹۴۹ء کو پھر انھی کو لکھتے ہیں "ہمارے کالج میں ڈیڑھ سو طالب علم شریک ہو گئے۔ سندھ یونیورسٹی نے الحاق منظور نہیں کیا۔ ہم نے فیڈرل یونیورسٹی کو مقابل میں کھڑا کر دیا ہے اس کا بل کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی میں پیش ہوگا۔ اس سے ہمارے کالج کا الحاق ہو کر رہے گا۔"
(اردوئے مصفی ص ۱۷۲)

۱۳ر نومبر کو ہاشمی صاحب کو اطلاع دیتے ہیں "میں چند روز ہوئے مرکز کے وزیر تعلیم مسٹر فضل الرحمٰن سے ملا تھا انھوں نے کہا کہ ہم ہرگز آپ کے کالج کو ٹوٹنے نہ دیں گے اور کہا کہ میں اگر چاہتا تو سندھ یونیورسٹی پر دباؤ ڈال کر الحاق منظور کرا دیتا لیکن چوں کہ ہم خود فیڈرل یونیورسٹی کا بل پیش کر رہے ہیں اس لیے ضرورت نہ سمجھی۔ ہم آپ کے کالج کو تسلیم کریں گے اور مدد بھی دیں گے اس کے بعد میں نے مناسب خیال نہ کیا کہ جھگڑے کو طول دوں۔" (ص ۱۷۶)

غرض امید و بیم کی یہ کیفیت یوں ہی جاری رہی۔ مولوی صاحب اور طلبہ پر اضطرابی کیفیت طاری رہی۔ کالج کے مستقبل سے مایوس ہو کر طالب علموں کی حاضری گھٹنی شروع ہو گئی۔ اساتذہ بھی سوچتے تھے کہ یہی کیفیت رہی تو کالج کا مستقبل کیا ہوگا۔ آخر کار وزیر تعلیم حکومت پاکستان جناب فضل الرحمان نے وہ اقدام کیا جس سے وہ اب تک گریز کر رہے تھے یعنی ان کے ایما پر جامعہ سندھ کی سنڈیکیٹ نے ۲۹ر جون ۱۹۵۰ء کو کالج کے از سر نو معائنے اور تنقیح کے لیے ایک سہ رکنی کمیٹی بھیجی جس کے ارکان میں جناب غلام محمد وزیر خزانہ پاکستان، پیرزادہ عبدالستار

وزیر خوراک پاکستان اور ڈی جے کالج کے پرنسپل مسٹر شیخ شامل تھے۔ اس کمیٹی نے کالج کا تفصیلی معائنہ کیا جماعتوں کی تعلیمی کیفیت کا مشاہدہ کیا رجسٹروں کے اندراجات کالج فنڈ اور کتب خانہ وغیرہ کو اچھی طرح دیکھا اور کوئی نقلی نہ پایا تو سنڈیکیٹ سے الحاق کی سفارش کر دی۔

۲۵ جون ۱۹۵۰ء میں اردو کالج کا قیام بڑی بے سرو سامانی کے عالم میں ہوا تھا۔ ایک سال تک کالج کے الحاق کا مسئلہ معلق رہا۔ کالج کے طلبہ اور ہمدرد مولوی صاحب سے زیادہ پریشانی میں مبتلا تھے۔ سندھ کی صوبائی حکومت کے افسران، جامعہ سندھ کے ارباب نسبت وکشاد اور مرکزی حکومت کی وزارت تعلیم کے عمّال کو بار بار یاد دہانیاں کی جاتی رہیں۔ ساری کوشش اس امر پر مرکوز ہو گئی تھی کہ داخل ہو جانے والے طلبہ کا قیمتی سال ضائع نہ ہو۔ مولوی صاحب ایک لمحے کے لیے بھی اس شک وشبہ میں مبتلا نہ ہوئے کہ کالج کا الحاق نہ ہو گا۔ وزیر تعلیم فضل الرحمان صاحب اور وزیر خزانہ ملک غلام محمد صاحب مسلسل یقین دہانیاں کراتے رہے کہ کالج کو ناکام نہ ہونے دیا جائے گا مگر اصل مسئلہ وقت کا تھا۔ مرکزی حکومت فیڈرل یونیورسٹی کے قیام کا ارادہ ظاہر کر چکی تھی اور یہ امر بالکل واضح ہو چکا تھا کہ فیڈرل یونیورسٹی قائم ہو گی تو کالج کے الحاق میں ہرگز کوئی لاینحل مسئلہ نہ رہے گا مگر اس بل کا تیار ہونا، مختلف وزارتوں کے آرا کی چھان بین، ان کی تطبیق پر وزارت قانون کی قطعی تجاویز اور بالائے برآں حکومت کی اسمبلی پارٹی اور وزارتی کمیٹیوں کا غور وفکر اس کے بعد مسودۂ قانون کا پارلیمنٹ میں پیش ہونا، ہفتوں اس پر بحث وتمحیص، ترامیم کے بارے میں فیصلے اور سب سے آخر میں بل کا قطعی شکل اختیار کر کے منظور کیا جانا پھر صدر اسمبلی کے دستخط اور بالآخر گورنر جنرل کی توثیق کے بعد اس کا نفاذ اور پھر عملی طور پر یونیورسٹی کا قیام وانصرام یہ سب ایک دو دن کی بات نہ تھی۔ یہ سب امور معمولاً اپنا وقت لیتے ہیں یہاں بچوں کے امتحان کا مسئلہ سر پر کھڑا تھا۔ چنانچہ وزیر تعلیم پاکستان کو بادلِ ناخواستہ جامعہ سندھ کے ارباب حل وعقد کو مجبور کرنا پڑا کہ وہ نئی کمیٹی بنائیں اور الحاق کی کارروائی پر از سر نو غور کر کے مناسب فیصلہ کریں جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کمیٹی کے ایک اہم رکن خود وزیر خزانہ غلام محمد صاحب تھے جو انجمن ترقی اردو کے بہی خواہ اور ہمدرد تھے اردو کالج کے قیام کا فیصلہ انہی کے زیر صدارت اجلاس نظمائے انجمن منعقدہ ۱۳ فروری ۱۹۴۹ء (جو پاکستانی انجمن کا تاسیسی اجلاس تھا) میں کیا گیا تھا۔ دوسرے اہم رکن پیرزادہ عبدالستار صاحب تھے جو سندھ کے قدیم باشندے اور قائد اعظم کی پہلی کابینہ کے اہم رکن تھے اردو سے متعلق ان کا موقف بھی اردو کے مخالفین سے بہر احال مختلف تھا۔ تیسرے رکن ڈی جے کالج کے پرنسپل شیخ صاحب تھے۔ اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کمیٹی میں ان کی شمولیت تکنیکی امور کے طے کرنے کے لیے تھی۔ وہ سندھ کے پُرانے ماہر تعلیم اور بہت قابل شخص تھے۔ عام مسموم فضا سے قطعاً غیر متاثر اور معاملات کا فیصلہ اصولوں کی بنیاد پر

کرنے کے عادی تھے۔ اس کمیٹی نے حسب توقع اردو کالج کے الحاق کی منظوری کی سفارش کر دی چنانچہ ایک سال کی مدت اس قضیے کا فیصلہ ہونے میں لگ گئی اور جو توانائیاں ادارے کی تقویت اور استحکام میں صرف ہونی چاہیے تھیں وہ اس بے کار مد میں صرف ہوئیں۔ مولوی صاحب کو اس تفریق کا صدمہ ضرور تھا مگر وہ ہار ماننے والے انسان نہ تھے انھوں نے بار بار کہا تھا کہ اردو کے لیے میں نے زندگی بھر غیروں سے لڑتے گذاری یہاں مجھے اپنوں سے جنگ کرنی پڑ رہی ہے مگر میں نے نہ جب ناکامی قبول کی نہ اب ہار مانوں گا۔ مولوی صاحب کا کہا پورا ہوا اور انھوں نے کالج کا الحاق حاصل کر کے دم لیا۔

۱۹۴۹ء میں جب کالج کا آغاز ہوا تو آرٹس (فنون) کے چند مضامین کی کلاسیں شروع ہوئی تھیں لیکن الحاق کی منظوری کا اعلان ہوتے ہی کالج میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ اب تک جو اساتذہ کالج میں تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے وہ یا تو وہ لوگ تھے جنھوں نے از خود اپنی خدمات پیش کی تھیں اور بعض وہ تھے جنھیں مولوی صاحب اور ان کے رفقا نے اس کام پر مامور کیا تھا۔ الحاق کے بعد اب ہر کام یونیورسٹی کے قواعد و ضوابط کے مطابق کرنا شروع ہوا۔ سب سے پہلے اساتذہ کی بھرتی کے لیے اخبارات میں اشتہار شایع کیا گیا اور یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ماہرین تعلیم کے مشورے سے ایک انتخابی بورڈ تشکیل دیا گیا جس نے دفتر انجمن میں پورے دن انتخابی مجلس کا جلسہ جاری رہا۔ انتخابی مجلس کے صدر مولوی عبدالحق صاحب تھے جامعہ سندھ کی نمائندگی اس کے شیخ الجامعہ جناب پروفیسر ابو بکر احمد عبدالحلیم صاحب نے کی دیگر علما اور ماہرین تعلیم میں حسب ذیل اصحاب شامل تھے۔

جناب مولانا سید سلیمان ندوی صاحب، جناب ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب نائب وزیر دفاع پاکستان، جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی نائب وزیر داخلہ پاکستان، جناب سید عبدالواحد صاحب ناظم جنگلات، جناب مولوی سید تقی الدین صاحب سابق معتمد ریاست حیدر آباد دکن اور کالج کے پرنسپل جناب ملا محی الدین صاحب سابق معتمد تعلیمات حیدر آباد دکن۔ انتخابی بورڈ کے سامنے ایک صد سے زیادہ امیدواران ملازمت پیش ہوئے۔ پچھلے سال جو اساتذہ کالج میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے ان میں سے بعض نے انتخابی بورڈ کے روبرو پیش ہونا مناسب نہ سمجھا مثلاً جناب نجم الہدیٰ صاحب پروفیسر تاریخ وار دو جو کالج کے وائس پرنسپل کے فرائض بھی انجام دیتے رہے تھے بقیہ سابق اساتذہ میں جو لوگ انتخابی بورڈ کے سامنے پیش ہوئے بورڈ نے ایک اضافی ترقی کے ساتھ ان کا تسلسل جاری رکھنا منظور کیا کیوں کہ یہ حضرات مطلوبہ قابلیت پر پورے اترتے تھے دوسرے کٹھن حالات میں کالج کی رفاقت کرتے رہے تھے نئی اسامیوں پر غیر معمولی قابلیت کے اصحاب علم کا تقرر کیا گیا مثلاً ڈاکٹر سید معین الحق صاحب شعبہ تاریخ،

جناب قادری صاحب شعبۂ سیاسیات، ڈاکٹر محمود الحسن صاحب تاریخ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب اردو، پروفیسر حبیب اللہ صاحب غضنفر اردو، ڈاکٹر غلام سردار صاحب فارسی، مولوی عبدالرشید صاحب فاضل فارسی، جناب عبدالعزیز صاحب فارسی، جناب آیت اللہ بیگ صاحب عارف معاشیات، جناب پروفیسر حسن عادل صاحب معاشیات، جناب فصیح الزماں صاحب معاشیات، جناب محمد عارف صاحب سیاسیات، جناب ڈاکٹر عبدالسلام صاحب اردو، جناب عبدالقیوم صاحب اردو، جناب شرافت علی صاحب ہاشمی تجارت، جناب شمیم احمد صاحب تجارت اور راقم الحروف، محترم محمد حسن عسکری صاحب جو حال ہی میں سرکاری جریدے ماہ نو کی ادارت سے مستعفی ہوئے تھے۔ شعبۂ انگریزی میں ملازمت کے امیدوار تھے۔ چوں کہ انتخابی بورڈ میں ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی وزیر داخلہ موجود تھے انھوں نے عسکری صاحب سے سوال کیا کہ انھوں نے ماہ نو کی ادارت سے کن اسباب کی بنا پر استعفا دیا عسکری صاحب کی طبع نازک پر یہ سوال سخت گراں گزرا اور انھوں نے فرمایا کہ میں نے اردو کالج کی ملازمت کے لیے درخواست دی ہے۔ گورنمنٹ کی ملازمت میں رہنے نہ رہنے کا اس سے کیا تعلق لہٰذا یہ سوال غیر ضروری ہے۔ ڈاکٹر قریشی نے یہ سوچ کر کہ امیدواران ملازمت سے ان کی سابقہ کارکردگی کے زمرے میں پچھلی ملازمتوں پر کام کرنے کی مدت اور علاحدگی کی وجوہ کا جاننا انتخابی کمیٹی کے لیے ایک معمول کی کارروائی ہے۔ اپنے سوال پر اصرار کیا تو عسکری صاحب اپنی کتابیں یا کاغذات سمیٹ کر انٹرویو سے باہر نکل آئے اور اردو کالج میں ملازمت کے خیال کو یکسر ترک کر دیا۔ اس جگہ مولوی عبدالعلیم صاحب اور مولانا جلیل الدین صاحب کا تقرر ہو گیا ان حضرات کے علاوہ جناب عبدالرحمٰن صاحب حنفی کو شعبہ ریاضی، عین الدین کو شعبہ فلسفہ اور جناب صاحب کو شعبہ تاریخ اسلام میں لے لیا گیا۔ ان میں سید منتخب الحق صاحب اور جناب قادری شعبہ اسلامیات و عربی اور ان کے ساتھ مولوی مظہر علی کامل اور مولانا قمر الدین صاحب کو عربی و اسلامیات میں لے لیا گیا۔ اردو کالج کے معتمد جناب مولوی تقی الدین صاحب اور کالج کے پرنسپل جناب سید محی الدین صاحب کٹر قسم کی مذہبیت کے حامل حضرات تھے اس لیے کسی ایسے استاد کو قبول کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا جو اپنی علمی صلاحیتوں کے باوجود آزاد خیالی کے لیے شہرت رکھتے تھے اسی لیے حسن عسکری صاحب کی انتخابی کمیٹی سے چلا جانا انھوں نے اپنے حق میں مفید سمجھا۔ اسی طرح اس انتخابی بورڈ نے علی گڑھ کے پروفیسر ڈاکٹر خورشید الاسلام صاحب کو جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیر ملازمت اور گوناگوں ادبی صلاحیتوں کے ابھرتے ہوئے نوجوان تھے، منتخب کر لیا تھا لیکن سکریٹری کالج سید تقی الدین صاحب نے ان کو قلیل مشاہرے کی پیش کش کی جو ان کی موجودہ تنخواہ سے بہت کم تھی۔ انھوں نے بجا طور پر اسے ایک توہین آمیز

پیش کش قرار دیا اور حکم نامہ تقرری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ یوں بھی پاکستان میں ملازمت کے خواہش مند نہ تھے اور ایک دوست نے کراچی آنے پر مجبور کرنے کے لیے اردو کالج کے لیے ان کی درخواست داخل کر دی تھی۔ وہ سخت برہم ہوئے اور مولوی عبدالحق صاحب سے ملاقات کرنے اور اس حقیر پیش کش کا سبب دریافت کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی اور ہندوستان واپس چلے گئے۔ سید تقی الدین کالج میں ان کی شمولیت پر ہرگز خوش نہ تھے۔ ان کو بے حد خوشی ہوئی کہ خورشید صاحب نے اردو کالج میں آنے سے صاف انکار کر دیا۔ خود میرے ساتھ یہ واقعہ ہوا کہ انتخابی بورڈ کے اجلاس کے بعد شام کو مولوی صاحب نے خود مجھے مطلع فرمایا کہ تم کو منتخب کر لیا گیا ہے۔ میں مطمئن ہو کر گھر چلا آیا۔ کئی دن تک تقرر کے پروانے کا منتظر رہا۔ اس درمیان میں یہ دیکھتا رہا کہ جن لوگوں کو لیا جانا تھا ان کو پروانہ ہائے تقرر مولوی صاحب کے دستخطوں سے جاری ہو رہے ہیں۔ سید علی شیر حاتمی صاحب نے ایک دن مجھ سے پوچھا کہ آپ کو تقرر نامہ ملا یا نہیں میں نے جو صورت حال تھی بتا دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ تقی الدین صاحب نے غالباً میرے پروانہ تقرر کے سلسلے میں کوئی گڑبڑ کی ہے وہ مجھے رکھنا نہیں چاہتے۔ شاید علی شیر حاتمی صاحب نے مولوی صاحب سے اس کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں زیبا کے تقرر کے کاغذات کئی دن ہوئے دفتر کو بھیج چکا ہوں اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بورڈ نے اس کا انتخاب منظور کر لیا تھا۔ شیر حاتمی صاحب نے دفتر میں جا کر سارے کاغذات کھنگال ڈالے مگر میرے پروانہ تقرر کا پتہ نہ چلا۔ انھوں نے تقی الدین صاحب سے دریافت کیا تو انھوں نے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں نے یہ حالات دیکھے تو سوچا کہ اب اگر مرا تقرر ہو بھی گیا تو تقی الدین صاحب جو کالج کے سکریٹری ہیں مجھے قبول نہیں کریں گے اور میں ناحق مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ اُس زمانے میں مجھے روزنامہ امروز کے عملہ ادارت میں جگہ مل گئی تھی اور ایک سال سے مجھے اخباری کام کی مشق و مزاولت حاصل ہو چکی تھی۔ میں شیر حاتمی صاحب کو اپنے تذبذب سے مطلع کر کے صاف کہہ دیا کہ میں اب کالج میں آنا نہیں چاہتا۔ شیر صاحب نے غالباً مولوی صاحب کو میرے خیال سے آگاہ کر دیا۔ انھوں نے اگلی صبح مجھے گھر سے طلب فرمایا۔ میں حاضر ہوا تو ان کے سامنے تقرر ناموں کے خالی کاغذات کا پلندہ رکھا تھا مجھ پر سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میں تم کو بتا چکا ہوں کہ تمہارا انتخاب کر لیا گیا ہے۔ اگر تمہیں پروانہ تقرر نہیں ملا تھا تو میرے پاس کیوں نہ آئے۔ میں نے یہ عرض کرنے کی جسارت کی کہ کالج کے حالات بظاہر میرے لیے ناسازگار ہیں مجھے ان حالات میں اپنی موجودہ ملازمت کو چھوڑنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ انھوں نے سخت نظروں سے میری طرف دیکھا اور ڈانٹا (ہائے اس شفقت آمیز ڈانٹ میں جو لطف تھا وہ آج تک میرے دل و دماغ میں محفوظ ہے) فرمایا یہ کاغذ تھامو اور کل کالج جا کر حاضری کی رپورٹ

کرو یہ کہہ کر پروانہ تقرر کے فارم پر جو ان کے سامنے رکھا تھا اپنے دستخط کر کے مجھے تھما دیا اور کہا اب جاؤ۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے اخبار کے دفتر میں گیا اور کراچی امروز کے ایڈیٹر جناب ایوب احمد کرمانی کو یہ حال سنایا اور اپنے عزیز دوست اور کرم فرما ابرار حسن صدیقی کو جو اس وقت نیوز ایڈیٹر تھے ان سے مشورہ طلب کیا۔ دونوں نے مولوی صاحب کے حکم کو بے چون و چرا ماننے کی تلقین کی اور وعدہ کیا کہ جس تاریخ سے مناسب سمجھو گے اخبار سے فارغ کر دیا جائے گا۔ ان احباب کی محبت اور دل سوزی کو یاد کرتا ہوں اور پھر آج کے زمانے کا حال دیکھتا ہوں تو دل خوں کے آنسو روتا ہے اور سوچتا ہوں کہ وہ لوگ اور وہ زمانے اب کہاں لد گئے

غالب بہ تصرف ؏ دل ڈھونڈھتا ہے پھر وہی الفت کے رات دن

اسی سلسلے میں ایک واقعہ اور یاد آتا ہے اس کا بھی ذکر کرتا چلوں۔ مولوی صاحب کی خدمت میں بلاناغہ حاضر ہوتا رہتا تھا کیوں کہ چند ماہ سے قومی زبان کی ادارت میرے سپرد تھی۔ ایک صبح کو میں پہنچا تو مولوی صاحب ناشتے کی میز پر بیٹھے تھے میں ان کے ساتھ چائے میں شریک ہو گیا۔ فرمانے لگے تم حسن عسکری سے واقف ہو۔ میں نے عرض کیا چند بار ملاقات ہوئی ہے تھوڑی بہت جان پہچان ہے۔ کہنے لگے تمھیں معلوم ہے کہ ہم عسکری کو لینا چاہتے تھے مگر انتخابی کمیٹی میں ایسی صورت حال پیدا ہو گئی کہ وہ انٹرویو کی تکمیل سے پہلے اٹھ کر چلے گئے تمھیں شاید معلوم نہ ہو کہ وہ میرے ہم وطن ہوتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ان کے کالج میں نہ آنے کا مجھے بھی قلق ہے۔ فرمایا کہ اس وقت کوئی اور کام نہ ہو تو عسکری کے پاس چلے جاؤ اور میری طرف سے ان سے کہو کہ وہ کالج میں آجائیں تنخواہ ان کی لیاقت کے مطابق دی جائے گی۔ میں چائے پی کر اٹھا نیچے دفتر میں آیا اور سوچتا رہا کہ عسکری صاحب کا مکان مجھے معلوم نہیں اب کیا کروں۔ پھر یاد آیا کہ میرے دوست سلیم احمد صاحب ان سے ملتے رہتے ہیں وہ ان کے مکان سے واقف ہیں۔ وہ بندر روڈ پر ریڈیو پاکستان کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ انجمن کے دفتر سے نکل کر میں پیدل چلتا ہوا ریڈیو پاکستان گیا اور سلیم احمد صاحب سے ملا۔ انھیں سب ماجرا سنایا اور پوچھا کہ اب کیا ہونا چاہیے وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے میں ابھی تمھیں لے کر عسکری صاحب کے پاس چلتا ہوں۔ چلو ان سے بات کرتے ہیں۔ میں رکشا میں بیٹھ کر سلیم احمد صاحب کے ساتھ عسکری صاحب کے مکان واقع پیر الٰہی بخش کالونی میں پہنچا اس وقت دن کے کوئی تین بج چکے تھے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ عسکری صاحب پروفیسر کرار حسین صاحب کے ساتھ میٹنی شو دیکھنے کے لیے نشاط سنیما گئے ہوئے ہیں۔ میں نے سلیم احمد صاحب سے کہا کہ چلو نشاط سنیما چلتے ہیں۔ وہاں گئے تو شو شروع ہو چکا تھا۔ ہم دونوں انٹرول کے انتظار میں سنیما کے برآمدے میں ٹہلتے رہے گھنٹہ آدھ گھنٹہ میں انٹرول

کی گھنٹی بجی اور کرار حسین صاحب عسکری صاحب کے ساتھ ہال سے باہر نکلے ان کے باہر آتے ہی سلیم احمد نے کہا کہ زیبا صاحب مجھے ساتھ لے کر آپ کے مکان پر حاضر ہوئے تھے وہاں سے پتہ چلا کہ آپ کوئی انگریزی فلم دیکھنے نشاط سنیما آئے ہوئے ہیں۔ ہم آپ کی تلاش میں یہاں آ گئے۔ اب جو کام ہے وہ زیبا صاحب آپ کو بتائیں گے میں نے وہاں کھڑے کھڑے مختصر الفاظ میں مولوی صاحب کا پیغام دیا اور عرض کیا کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مولوی صاحب سے کسی وقت ملاقات کریں اور کالج میں ملازمت قبول فرمالیں۔ عسکری صاحب نے پوری بات سننے کے بعد دوسری طرف کو رخ بدلا اور فرمایا کہ مجھے کیا کام ہے کہ میں مولوی عبدالحق کے پاس جاؤں۔ میں نے کہا کہ حضرت آپ کو کام نہ ہوگا۔ لیکن مولوی صاحب کالج کے لیے آپ کی خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کہنے لگے، چاہتے ہوں گے مگر میں تو نہیں چاہتا۔ اب سلیم احمد نے مداخلت کی اور عسکری صاحب سے کہا کہ جناب آپ ماہ نو چھوڑ چکے ہیں کراچی میں بہت زیادہ کالج نہیں ہیں۔ یہ ملازمت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ آپ دہلی میں سینٹ اسٹیفنز کالج میں کافی عرصے اس کام کا تجربہ کر چکے ہیں اس لیے اس پیش کش پر غور کیے بغیر کوئی بات کہنی مناسب نہ ہوگی فرمایا کیوں مناسب نہ ہوگی کہہ جو دیا کہ میں مولوی عبدالحق کے پاس جانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ جہاں تک ماہ نو کی ملازمت ترک کرنے کا تعلق ہے تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے اسلامیہ کالج میں ملازمت مل چکی ہے بلکہ چند طالب علموں نے میری وجہ سے ایم اے کلاس میں داخلہ لے لیا ہے اب میں انھیں کسی حال میں چھوڑ کر مایوس نہیں کر سکتا۔ کرار حسین صاحب جو اب تک خاموش کھڑے تھے عسکری صاحب کی تائید میں بولے کہ بھئی یہ اسلامیہ کالج نہیں چھوڑ سکتے ہیں انھیں اسلامیہ کالج میں لایا ہوں اور اب یہ وہاں جم چکے ہیں۔ بغیر کسی وجہ کے ترکِ ملازمت نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہم لوگ مایوس و نامراد ہو کر واپس آئے۔ سلیم احمد کو ان کے دفتر میں چھوڑتا ہوا انجمن گیا اور مولوی صاحب کو نرم لفظوں میں یہ گفتگو سنا دی۔ مولوی صاحب نے سخت افسوس کیا مگر یہ حال تھا تو وہ کیا کر سکتے تھے۔ ہاں میں نے از راہ احتیاط مولوی صاحب کو یہ نہیں بتایا کہ انٹرویو والے دن ڈاکٹر قریشی کے سوالات کا ردعمل عسکری صاحب نے کچھ اس حد تک قبول کر رکھا ہے کہ وہ آپ کے پاس آنے اور ملاقات کرنے کے بھی روادار نہیں ہیں۔ عسکری صاحب کے لہجے کی تلخی اور بے لحاظی کا ذکر مولوی صاحب کی عمر اور بزرگی کو دیکھتے ہوئے، کرنا مجھے مناسب نہ ہوگا۔ البتہ عسکری صاحب کے اخلاق اور معقولیت کے بارے میں جو رائے میں نے قائم کی اس کا نہ لکھنا ہی بہتر ہے۔

بہرحال کالج شروع ہو گیا اس سال یعنی ۱۹۵۰ء میں آرٹس (فنون) کے مضامین کے علاوہ شام کے

وقت تجارت کے مضامین کی شفٹ بھی شروع ہوگئی۔ شام کی تدریس کا تجربہ کراچی میں سب سے پہلے اردو کالج میں شروع ہوا اور بہت کامیاب رہا اس کے بعد آنے والے زمانے میں کراچی کے بیشتر غیر سرکاری کالجوں میں شام کی تدریس کا سلسلہ عام ہوگیا۔ اس وقت سید معین الحق صاحب جنھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تاریخ میں پی ایچ ڈی کی تھی اور پندرہ بیس سال وہاں کے شعبہ تاریخ میں استاد رہے تھے (اور مجھے بھی چار سال وہاں پڑھایا تھا) کالج میں وائس پرنسپل بلکہ عملاً پرنسپل کے فرائض انجام دیتے رہے۔ مولوی صاحب علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ایک اور صاحب آفتاب حسن صاحب کو کالج کا پرنسپل بنانے کا وعدہ کر چکے تھے مگر اس میں دقت یہ تھی کہ موصوف قیام پاکستان کے بعد حیدر آباد سے ہجرت کر کے آئے اور ملٹری اکادمی کاکل میں بحیثیت میجر خدمات انجام دے رہے تھے فوج والے ان کی درخواست کے باوجود انھیں چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے بعض حالات کی وجہ سے وہ خود بھی فوجی ملازمت ترک کرنا چاہتے تھے اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ علی گڑھ کے مشہور پروفیسر اسحاق صاحب جو وہاں طبیعات کے شعبے کے چیرمین تھے اور نیوکلائی طبیعات کے سلسلے میں انگلستان کے علمائے سائنس کے ساتھ کام کر چکے تھے پاکستان آکر ملٹری اکادمی کاکل میں آفتاب صاحب سے بلند تر منصب پر فائز ہو چکے تھے ان کے آنے سے ملٹری اکادمی میں آفتاب صاحب کی حیثیت متاثر ہونے لگی تھی اور وہ بار بار مولوی صاحب کو لکھتے تھے کہ اپنے اثرات کو کام میں لاکر انھیں کاکل سے نجات دلائیں۔ مولوی صاحب ان کے سلسلے میں فوجی حکام کو خطوط لکھتے رہے مگر جب اس سے بھی کام نہ چلا تو خود راولپنڈی تشریف لاکر خاص طور پر جنرل محمد ایوب خاں صاحب کمانڈر انچیف افواج پاکستان سے ملاقات کی اور انھیں میجر آفتاب حسن صاحب کی گلو خلاصی پر رضامند کیا گو اس کام کی تکمیل میں کچھ دیر لگی لیکن جنرل صاحب نے مولوی صاحب کو رد کرنے کی جرأت نہ کی اور ۱۹۵۱ء کے اواخر میں آفتاب حسن صاحب کاکل سے فارغ ہو کر کراچی آگئے۔ یکم جنوری کو ۱۹۵۲ء کو اپنے خسر مولوی سید محی الدین صاحب سے کالج کا جائزہ لے کر پرنسپلی پر فائز ہوگئے۔ اس درمیان میں سید تقی الدین صاحب سکریٹری کالج نے طلبہ کی ہڑتال کے نتیجے میں اپنے عہدے سے استعفا دے دیا تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی استعفے کی دھمکیاں دے چکے تھے اور ایک مرتبہ تحریراً استعفا دے چکے تھے لیکن مولوی سید ہاشمی فرید آبادی صاحب نے باوجود اس کے کہ سید تقی الدین صاحب ان کو سخت ناپسند فرماتے تھے مولوی صاحب کو سمجھا بجھا کر اس پر راضی کر لیا کہ استعفا گورننگ باڈی میں پیش نہ کیا جائے بلکہ اسے منسوخ سمجھا جائے لیکن سید تقی الدین صاحب جو انجمن اور کالج میں من مانی کارروائیوں کے عادی ہو چکے تھے مولوی صاحب سے کسی کام میں صلاح مشورے کو ضروری

نہ سمجھتے تھے اور اگر ان کو کوئی نیک صلاح دی جاتی تھی تو ان کی خودسری اور خود پسندی اس پر عمل کرنے کو غیر ضروری سمجھتی تھی۔ وہ مولوی صاحب کو جو صدر و بانی کالج تھے اپنے اختیارات کے مقابلے میں ایک گوشے میں بٹھا دینا چاہتے تھے۔ ان کی خود پسندی اور آمریت نے مولوی صاحب کے صبر و ضبط کے باوجود یہ دن دکھایا کہ کالج کے طلبہ ان کے سخت مخالف ہو گئے اور ان کے خلاف ہڑتال کر دی اور زبردست مظاہرہ کیا جس میں ان سے استعفے اور کالج سے بے تعلقی کا مطالبہ کیا۔ سید تقی الدین صاحب جذباتی قسم کے مغرور المزاج انسان تھے طالب علموں کی نعرہ بازی ان کو اس درجہ ناگوار ہوئی کہ طیش میں آ کر لوٹا رکھ کر (مغرب کے وقت نماز کے لیے وضو کے واسطے غسل خانے جا رہے تھے) ایک طالب علم کے ہاتھ سے قلم اور کاپی چھین لی اور کھڑے کھڑے مولوی صاحب کے نام چند سطری استعفا لکھ کر طلبہ کے حوالے کر دیا۔ طلبہ نے وہ کاغذ اسی وقت اوپر کی منزل پر جہاں مولوی صاحب مقیم تھے جا کر مولوی صاحب کو پیش کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ مولوی صاحب نے جبراً استعفا لکھوا کر لانے والے طلبہ کو سخت تنبیہ کی اور یہ کہا کہ اس کالج کے طلبہ کو اس قسم کی ناشائستہ حرکتیں ہرگز زیب نہیں دیتیں۔ بزرگوں کی بے ادبی اور بے حرمتی ہمارے اخلاق اور روایات کے خلاف ہے یہ سن کر جو طلبہ انھیں استعفا دینے گئے تھے سخت شرمندہ ہوئے اور یہ کہہ کر کہ آپ اس پر غور فرمالیں اور ہم آپ کے بچے ہیں اگر ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو آپ درگذر فرمائیں اور آپ جو فیصلہ کریں گے ہم میں اس کی سرتابی کی جرأت نہ ہو گی۔ مولوی صاحب اس گفتگو کے بعد مطمئن ہو گئے۔ اگرچہ وہ سید تقی الدین صاحب کے طریق کار کو پسند نہ کرتے تھے لیکن ان کا اس طرح علاحدہ کیا جانا ان کو ہرگز پسند نہ تھا۔ انھوں نے طالب علموں کو جو تعداد میں چار پانچ سے زیادہ نہ تھے زجر و توبیخ کر کے اپنے پاس سے بھگا دیا۔ اُدھر کالج کے اساتذہ یہ ہلڑ اور طوفانی بدتمیزی دیکھ کر نیچے اتر آئے تھے اور انھوں نے طلبہ کو ڈانٹنا اور سمجھانا شروع کر دیا تھا اس طرح جوش و خروش میں معتدبہ کمی آ گئی اور طالب علم خاموشی کے ساتھ اپنے جماعتوں میں واپس چلے گئے۔ اب اسے استادوں کا اثر رسوخ تصور کر دیا یہ سمجھو کہ سید تقی الدین صاحب نے طیش میں آ کر استعفا طلبہ کے حوالے کر دیا تھا یہ وجہ طلبہ کے سکون و اطمینان کی ہو گئی تھی اور وہ اپنا مقصد پورا ہوتا دیکھ کر پُرسکون ہو گئے تھے مگر تقی الدین صاحب پر اس واقعہ کا ردِ عمل شدید تھا اور وہ اگلی صبح اپنا بستر اور اسباب رکشہ پر رکھ کر انجمن کی عمارت کی نچلی منزل سے جو کالج کے سامنے اسی احاطے میں واقع تھی، کچھ کہے سنے بغیر اپنے مکان (بہار کالونی) چلے گئے اور انجمن یا کالج سے بے تعلقی اختیار کر لی۔ انھوں نے تشریف لے جانے سے پہلے مولوی صاحب اور سید ہاشمی فرید آبادی صاحب سے رخصتی ملاقات بھی نہ کی اور

نہ اپنا موقف بتانا ضروری سمجھا۔ وہ چلتے ہوئے چوکیداروں سے یہ کہہ گئے کہ ان کا استعفا قطعی ہے اور اب وہ کبھی انجمن یا کالج میں قدم نہ رکھیں گے کیوں کہ ان کی بڑی بے عزتی ہوئی ہے جب وہ بالکل ہی چلے گئے اور واپسی کا کوئی امکان نہ نظر آیا تو مولوی صاحب نے کالج گورننگ باڈی اور نظمائے انجمن کے اجلاس طلب کیے اور تقی الدین صاحب کی تحریر اور پیش آوردہ واقعات سے اراکین کو مطلع کیا۔ یہ ۱۵ر نومبر ۱۹۵۱ء کا واقعہ ہے۔ اسی شام کو چار بجے اردو کالج کی گورننگ باڈی نے مجبوراً تقی الدین صاحب کا استعفا منظور کیا اور مولوی صاحب کی تجویز پر جناب عبدالرحمٰن صاحب صدیقی (سندھی) سے یہ عہدہ قبول کرنے کی درخواست کی جو انھوں نے منظور کر کے معتمدی کے فرائض انجام دینا شروع کر دیے۔ ان حالات میں بعض صاحبوں نے مولوی صاحب کو مشورہ دیا کہ آفتاب حسن صاحب کو جو تقی الدین صاحب کے برادر بزرگ مولوی سید محی الدین صاحب پرنسپل کے داماد ہیں کالج میں نہ بلایا جائے مگر مولوی صاحب اس سلسلے میں اتنی پیش رفت کر چکے تھے اور عمال حکومت سے لے کر کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خاں تک رسائی حاصل کر چکے تھے کہ انھوں نے ممکنہ خطرات سے صرف نظر کیا اور اپنے فیصلے میں کسی تبدیلی کے روادار نہ ہوئے۔ ڈاکٹر سید معین الحق صاحب نے اپنی پرنسپلی کے لیے بہت کوششیں کیں اور عبدالرحمٰن صدیقی معتمد کالج اس پر رضامند بھی ہو گئے تھے مگر مولوی صاحب کسی طرح راضی نہ ہوئے اور یکم جنوری ۱۹۵۴ء کو آفتاب حسن صاحب نے کالج سنبھال لیا۔ آفتاب حسن صاحب جب کالج تشریف لائے تو مولوی صاحب کے ساتھ برخوردانہ اور مودبانہ طرز عمل رکھا مگر کالج کے ان اساتذہ اور طلبہ کو جو سید تقی الدین صاحب کے آوردے اور خیر خواہ تھے بطور خاص نوازا اور اپنے ساتھ ملانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ مولوی صاحب کے احکام کی تعمیل کی بجا آوری وہ خندہ پیشانی سے کرتے رہے مگر کالج میں وہ کسی اور پالیسی پر چلتے رہے اور کراچی یونیورسٹی کے (جو اب قائم ہو چکی تھی) نئے وائس چانسلر پروفیسر ابوبکر احمد عبدالحلیم صاحب سے پڑھایا اور کالج کو ان کی پالیسیوں کا گڑھ بنا دیا۔ میں نے چند مرتبہ مولوی صاحب سے اجمالاً یہ کہنا چاہا کہ آفتاب صاحب انجمن کے بجائے یونیورسٹی کی طرف زیادہ مائل نظر آتے ہیں مگر مولوی صاحب نے سنی ان سنی کر دی اور کوئی توجہ نہ فرمائی۔

آفتاب حسن صاحب نے آ کر دیکھا کہ کالج فنون و تجارت (آرٹس کامرس) کے مضامین کی تعلیم دے رہا ہے انھیں اس نظام میں اپنی افادیت نظر نہ آئی لہٰذا مولوی صاحب سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جب تک سائنس کی تدریس کا اجرا نہ کیا جائے گا یہ تحریک نامکمل رہے گی۔ اس کی تکمیل کے لیے سائنس کی تدریس کا انصرام ضروری ہے۔

یہ بات مولوی صاحب کی خواہش اور آرزو کے عین مطابق تھی مگر مولوی صاحب اب تک اس سے اس لیے ہچکچا رہے تھے کہ سائنس کی تعلیم کے لیے کثیر سرمائے کی ضرورت تھی جو اس وقت نہ انجمن کو میسّر تھا نہ کالج اس کا متحمل ہو سکتا تھا۔ الحاق کے بعد کالج کی مقبولیت میں یک بیک بہت اضافہ ہو گیا تھا اور طلبہ کی تعداد اتنی ہو گئی تھی کہ کالج کی عمارت ان کے لیے ناکافی اور تنگ معلوم ہوتی تھی بلکہ بعض چھوٹے کلاس مثلاً ریاضی وغیرہ کی تدریس باہر صحن میں بنچوں پر بیٹھ کر درختوں کے سایے میں ہوتی تھی۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کی سالانہ روئداد بابت یکم اپریل ۱۹۵۳ء تا ۳۱ مارچ ۱۹۵۴ء میں صفحہ ۱۷ پر مولوی صاحب نے یہ لکھا ہے:

"انجمن نے محسوس کیا کہ نئی نسل میں صحیح قومی جذبے کی نشوونما اس وقت تک ممکن نہیں جب تک قومی زبان کے ذریعے اپنے تہذیبی ورثے کی اہمیت کو اچھی طرح طلبہ کے ذہن نشین نہ کرایا جائے اور جو اصحاب اب تک مذبذب ہیں ان پر اردو کی اعلا علمی صلاحیتیں آشکار کی جائیں اس مقصد کے پیشِ نظر جون ۱۹۴۴ء میں (سنہ غلط طبع ہو گیا ہے اصل سال ۱۹۴۹ء ہونا چاہیے) اردو کالج قائم کیا گیا جو انتہائی نامساعد حالات کے باوجود روز بروز ترقی کی منازل طے کر رہا ہے سال گذشتہ اس کالج کے طلبہ کی تعداد ۱۴۲۹ تھی اور اساتذہ کی تعداد ۴۷ تھی۔ سال زیرِ نظر میں طلبہ کی تعداد بڑھ کر ۱۵۰۲ اور اساتذہ کی تعداد ۴۹ ہو گئی ہے۔"

چنانچہ ۱۹۵۳ء میں کالج میں شعبۂ سائنس کا اجرا عمل میں آیا اور اسی میں صرف طبیعات، ریاضی، کیمیا اور جغرافیہ کے مضامین شروع کیے گیے۔ کالج میں تجربہ خانوں اور نئے کلاسوں کی گنجائش نہ تھی مگر پہلے سال جوں توں کر کے کام چلایا گیا۔ آفتاب حسن صاحب نے مولوی صاحب کو آمادہ کیا کہ وہ اس کے لیے صرف دس ہزار روپے کی منظوری دیں تو وہ کام شروع کر دیں گے۔ چنانچہ یہ رقم ان کو دے دی گئی اور چند ایسے طلبہ جو ایم ایس سی میں زیرِ تعلیم تھے کالج میں جز وقتی طور پر مقرر کر کے کام چلایا گیا۔ ان استادوں نے جن میں   بھی شامل تھے جوں توں کر کے ایک سال کام کیا۔ اگلے سال چند نئے کمرے تعمیر کیے گئے اور قانون کی کلاسوں کا بھی اجرا کر دیا گیا۔ سائنس میں ایک نیا شعبہ حیاتیات کا اضافہ کیا گیا۔ شعبہ قانون کے اجرا کا ذکر مندرجہ بالا روئداد انجمن متعلقہ یکم اپریل ۱۹۵۳ء تا ۳۱ مارچ ۱۹۵۴ء میں صفحہ ۱۷ پر اس طرح ملتا ہے۔

"اردو کی قومی حیثیت کے مدِّنظر ضروری تھا کہ ملک کے عدالتی نظام میں اسے اس

کے جائز منصب پر فائز کرایا جائے۔ مگر اس کے لیے شرط اولیں یہ ہے کہ ملک میں ایسے وکلا اور قانون داں اصحاب موجود ہوں جو جملہ عدالتی کام بآسانی اردو کے ذریعے کرسکیں چنانچہ اردو کالج کی انتظامی کمیٹی نے نئے تعلیمی سال سے کلیہ قانون کھولنے کا فیصلہ کیا ہے توقع ہے کہ قانون کے شعبے کے لیے ہمیں اعلا درجے کے ماہرین قانون اور وکلا کی خدمات بحیثیت اساتذہ حاصل ہو جائیں گی اور یہ شعبہ ایک مثالی شعبہ بن جائے گا۔"

چنانچہ ۱۹۵۴ء میں قانون کی جماعتیں شروع کر دی گئیں اس شعبے کی صدارت ملک کے مشہور ماہر قانون اور وکیل جناب محمود رضا صاحب کی خدمات حاصل کر لی گئیں جو برسوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ قانون کے استاد کی حیثیت سے وابستہ رہے تھے اور کراچی میں ان کا شمار کامیاب وکلا میں ہوتا تھا۔ وہ ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتے تھے اور ان کے علی گڑھ کے زمانے کے شاگردوں کی بہت بڑی تعداد کراچی میں وکالت کے پیشے سے وابستہ تھی۔ حسن اتفاق سے مجھے بھی مسلم یونیورسٹی میں جہاں سے میں نے اول درجے میں قانون کی ڈگری حاصل کی تھی ان کی شاگردی کا فخر حاصل تھا اور میرے چچازاد بھائی وہاج احمد خاں صاحب جو اب تک مراد آباد میں وکالت کر رہے تھے ان کے چہیتے شاگردوں میں شامل تھے۔ ایک مرتبہ ایک مقدمے کے سلسلے میں امروہہ میرے مکان پر بھی تشریف لا چکے تھے۔ میں ان تعلقات دیرینہ کے پیش نظر ان کے تقرر سے بہت خوش تھا۔ اُن کے علاوہ جناب عبداللہ صاحب جو حیدرآباد کے ممتاز وکیل اور انجمن اتحاد المسلمین کے نظریاتی رہنماؤں میں رہ چکے تھے، منتخب کیے گئے تھے۔ ایک اور معروف وکیل جناب سہروردی صاحب بھی تھے جو ریلوے بورڈ کے مشہور چیرمین جناب سہروردی کے چھوٹے بھائی تھے اور قانون کے اساتذہ میں انھیں بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ غرض ۱۹۵۴ء میں اردو کالج کے شعبہ قانون کا اجرا ہو گیا اور ان کلاسوں کو طلبہ میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی یعنی تعداد کے لحاظ سے شہر کے دوسرے کالج ایس ایم لا کالج کی قدامت اور طویل درسی تسلسل کے لحاظ سے اس نوزائیدہ کالج کو جو کامیابی حاصل ہوئی وہ ایک غیر معمولی بات نظر آتی تھی۔ اب اردو کالج میں چار فیکلٹیاں زور شور کے ساتھ کام کر رہی تھیں یعنی فنون (آرٹس) تجارت (کامرس) علوم (سائنس) لا (قانون) کالج ایک اسکول کی پرانی عمارت میں قائم کیا گیا تھا جس کے دو بلاک کالج کے قبضے میں تھے اور ایک بلاک جو قدرے فاصلے پر تھا اس میں انجمن کے دفاتر اور کتب خانے وغیرہ قائم تھے۔ درمیان میں ایک وسیع صحن تھا جس میں حسب ضرورت انجمن یا کالج کے جلسوں کا انعقاد ہوتا رہتا تھا۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کی سالانہ

روئداد بابت یکم اپریل ۱۹۵۳ء تا ۳۱ مارچ ۱۹۵۴ء میں حسب ذیل تحریر ملتی ہے :

کسی درس گاہ کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت اس کے فرزندوں کے ان امتیازات سے ملتا ہے جو دوسرے اداروں کے مقابلے میں حاصل کرتے ہیں اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اردو کالج نے پانچ سال کے مختصر عرصے میں ایسی نمایاں کامیابی حاصل کی ہے جو ہمدردان اردو کے لیے قابل فخر ہے ہمارے طلبہ نے یونیورسٹی کے امتحانوں میں اعزازات حاصل کرکے جو ریکارڈ قائم کیا ہے اسے کوئی دوسرا کالج مشکل ہی سے توڑ سکتا ہے اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ شیر محمد قیصر ایم اے سال دوم اردو، اول ڈویژن، یونیورسٹی میں اول آئے۔ ۲۔ نصرت اشرف ایم اے سال دوم فارسی، دوم ڈویژن، یونیورسٹی میں اول آئے۔ ۳۔ نصیر امام ایم اے سال دوم، اردو، دوم ڈویژن یونیورسٹی میں دوم۔ ۴۔ محمد احمد سعید بی اے پاس، اول ڈویژن یونیورسٹی میں اول۔ ۵۔ اقبال احمد خان بی اے پاس دوم ڈویژن یونیورسٹی میں دوم۔ ۶۔ محمد بدیع الزماں بی اے آنرز اردو، دوم ڈویژن یونیورسٹی میں اول۔ ۷۔ حافظ محمد یوسف علی صدیقی بی اے آنرز اردو دوم ڈویژن، یونیورسٹی میں دوم۔ ۸۔ مفتی محمد معظم بی اے آنرز فارسی دوم ڈویژن یونیورسٹی میں دوم۔ ۹۔ تقی حسن بی اے آنرز تاریخ اسلام، دوم ڈویژن یونیورسٹی میں دوم۔ ۱۰۔ رحیم بخش خاں بی اے آنرز تاریخ اسلام دوم ڈویژن، یونیورسٹی میں دوم ۱۱۔ سید افتخار فہمی بی اے آنرز معاشیات دوم ڈویژن یونیورسٹی میں اول ۱۲۔ محمد ریاض اللہ خان سال اول فنون، اول ڈویژن یونیورسٹی میں اول ۱۳۔ محمد جلیل احمد سال اول سائنس، یونیورسٹی میں اول ۱۴۔ سید اعجاز علی سال اول تجارت اول ڈویژن یونیورسٹی میں اول۔ اس طرح یونیورسٹی کے تقریباً اٹھارہ امتیازات میں سے ہمارے طلبہ نے چودہ (سال زیر رپورٹ میں) حاصل کیے۔ یہ اردو کالج کے اسٹاف کی فرض شناسی اور تن دہی نیز اردو کی صلاحیت کا واضح ثبوت ہے۔" انجمن ترقی اردو پاکستان کی سالانہ روئداد یکم اپریل ۱۹۵۵ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۵۶ء تک۔ (صفحات: ۱۷، ۱۸، ۱۹)

"برگ گل" بھی انجمن اتحاد طلبہ کا سالانہ مجلہ ۱۹ء سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر کالج کے طالب علم شیر محمد قیصر (ابن انشا) اور نائب ایڈیٹر افضل الرحمٰن ممتاز مقرر ہوئے اس کی پہلی مجلس ادارت کے نگرانوں میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب، جناب (ڈاکٹر) عبدالقیوم صاحب اور شجاع احمد زیبا وغیرہ مقرر کیے گئے تھے۔

۳۱ اگست ۵۴ء ۱۹ میں بعض اختلافات کے باعث راقم الحروف انجمن کے پندرہ روزہ رسالے قومی زبان کی ادارت سے علاحدہ ہوگیا اور ایک سال بعد (اگست ۱۹۵۵ء) میں اردو کالج کی ملازمت سے بھی مستعفی ہو کر جناح کالج کراچی میں جو ایک سال پہلے ناظم آباد کے علاقے میں تعمیر ہوا تھا، چلا گیا اور ۱۶ جولائی ۱۹۵۶ء میں اسلامیہ کالج سے وابستہ ہوگیا۔ ۳۱ اگست ۵۴ء سے اگست ۵۵ء سے قریب ایک سال تک انجمن ترقی اردو کی سرگرمیوں سے علاحدہ رہا۔ لیکن جب اگست ۵۵ء میں مولوی صاحب نے بطور صدر اردو کالج میرا استعفا قبول کیا اور میرے واجبات کی قطعی ادائیگی کے چیک پر دستخط کر دیے تو شاید انھیں میری مکمل علاحدگی پر کچھ خیال پیدا ہوا۔ اور میں اپنے واجبات کا چیک وصول کر کے جب اردو کالج کے دفتر سے نیچے اتر رہا تھا تو مولوی صاحب کے نمائندے کو پھاٹک کے قریب منتظر پایا۔ انھوں نے میری علاحدگی اور استعفے پر اظہار افسوس کرتے ہوئے مولوی صاحب کا یہ پیغام پہنچایا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں اور اپنی رہائش گاہ میرے منتظر ہیں۔ میں اس وقت انجمن اور کالج کی دیرینہ رفاقت سے انقطاع تعلق پر افسردہ اور رنجیدہ تھا میں نے مولوی صاحب کے فرستادے سے اس وقت ان کی خدمت میں حاضری سے معذوری ظاہر کی اور پھر کسی وقت حاضر ہونے کا خیال ظاہر کیا اور اپنے گھر واپس چلا آیا۔ اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ مولوی صاحب اور آفتاب حسن صاحب پرنسپل کالج میں انتظامی معاملات میں کچھ اختلافات شروع ہو چکے ہیں۔ مولوی صاحب غالباً اس مرحلے پر کالج سے میری علاحدگی نہ چاہتے تھے، اسی لیے شاید مجھے طلب کر کے کچھ سمجھانا چاہتے تھے انجمن اور کالج میں ۱۹۴۹ء سے میں سرگرم کارکن کی حیثیت سے جو خدمات انجام دے چکا تھا وہ ان کے علم میں تھیں بہر حال میں چند روز ان کے پاس نہ جا سکا اور نئے کالج میں اپنا کام سمجھنے اور سنبھالنے میں مصروف رہا۔ فرصت ہی نہ مل سکی کہ ایک دن جبکہ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی مولوی صاحب کی گاڑی میرے گھر کے سامنے آکر رکی اور مولوی صاحب مینھہ میں بھیگتے ہوئے میرے گھر میں داخل ہوئے۔ اس وقت ان کے معتمد خصوصی عبن الدین رضوی ان کی گاڑی چلاتے ہوئے انھیں ساتھ لے کر آئے تھے۔ مولوی صاحب کچھ دیر میرے مکان پر ٹھہرے اور میری علاحدگی پر اظہار افسوس کیا۔ اردو کالج کا ذکر ہوا تو آفتاب حسن صاحب سے ان کے اختلافات اور خفیف سی بے اطمینانی کا ذکر ہوا تب مجھے پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ کالج کی موجودہ صورت حال ان کے لیے باعث تشویش بن چکی ہے۔ بہر نوع انھوں نے مجھ سے اپنے پاس آتے اور ملتے رہنے کا وعدہ لیا اور میں اس کے بعد سے ہر دوسرے تیسرے دن ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگا۔ مولوی صاحب کو سب سے زیادہ فکر کالج کی

مالی حالت کی تھی اور اس کی اصلاح اور درستگی میں آفتاب صاحب ان سے تعاون نہیں کر رہے تھے ۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں :

"کالج کے حسابات کی حالت سید تقی الدین صاحب کے زمانے سے ناقابل اطمینان چلی آرہی تھی۔ لیکن ۱۹۵۵ء میں جو اطلاعات مجھے ملیں اور ان کے متعلق میں نے اپنے طور پر تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ حسابات کی حالت ابتر ہے اور بہت سی رقم کا بیجا صرف کیا گیا ہے اور جن کے ہاتھ میں رقم کا لین دین ہے ان کی دیانت بہت مشتبہ ہے اس بنا پر میں نے کالج کے حالات و حسابات کی تنقیح کے لیے ایک تحقیقاتی کمیٹی کی تجویز کی اور اس مضمون کی قرارداد مجلس نظما میں ۴ نومبر ۱۹۵۵ء کو عبدالخالق صاحب نے پیش کی اور بالاتفاق منظور ہوئی اس کمیٹی کے تین ارکان تجویز کیے گئے۔ حاتم علوی صاحب داعی (کنوینر) عبدالخالق عبدالرزاق صاحب، حسام الدین راشدی...... اس سے میرا منشا علاوہ دیگر امور کے خاص طور پر حسابات کالج کی اصلاح تھا میری قطعی یہ رائے تھی کہ اگر اس وقت خبر نہ لی گئی تو آئندہ یہ خرابی بڑھتی چلی جائے گی۔ جن کی اصلاح اور بھلائی کے لیے یہ تجویز کی گئی تھی وہی اس کے زبردست مخالف نکلے اور اس وقت سے آفتاب حسن صاحب پرنسپل اور ان کے رفقا نے میرے اور انجمن کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔" (اردو کا المیہ، صفحات ۱۶، ۱۷)

گفتگو کے تسلسل میں یہ بتانا بھول گیا کہ تقی الدین صاحب کے استعفے کے بعد جو عبدالرحمٰن صدیقی صاحب کالج کے معتمد مقرر ہوئے تھے وہ چند ماہ بعد ہی مشرقی پاکستان کے گورنر مقرر ہو کر کراچی سے باہر چلے گئے تھے اور ان کی جگہ حکیم محمد احسن صاحب نے خود اپنی درخواست پر کالج کی معتمدی کی تجویز مولوی صاحب سے منظور کرائی تھی انجمن اور کالج کی کمیٹیوں میں وہ پابندی کے ساتھ شرکت کرتے تھے اور مولوی صاحب کے کاموں میں ہمہ تن مصروف و معاون رہتے تھے مولوی صاحب ان کی بہت قدر کرتے تھے اور ہمیشہ انھیں اپنا مددگار اور رفیق سمجھتے تھے۔ جب میں نے کالج سے استعفا دیا تو انھوں نے صدر کی خدمت میں استعفا قبول کرنے کی سفارش بھیجنے سے پہلے مجھے بہ نفس نفیس طلب کیا تھا اور مجھے کالج میں روکنے کی کوشش کی تھی۔ یہ تفصیلات کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔ بہر حال کالج میں رفتہ رفتہ سکریٹری حکیم محمد احسن صاحب اور پرنسپل آفتاب حسن صاحب کے درمیان خوب گاڑھی

چھننے لگی تھی۔ اب معلوم ہوا کہ دونوں مولوی صاحب کی مخالفت میں متحد المقصد ہو گئے ہیں اور کالج کے ضوابط اور قوانین کی پروا نہیں کرتے۔ مولوی صاحب کی ہدایات کو بھی نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ آفتاب حسن صاحب اردو کالج سے میرے جانے کے بعد مطمئن ہو گئے تھے اور سمجھتے تھے کہ کالج سے معلومات کا واحد ذریعہ جو مولوی صاحب کو حالات سے آگاہ کر سکتا تھا، چلا گیا۔ اول تو میرے اور مولوی صاحب کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرائیں اور اب مجھ سے چھٹکارا پانے کے بعد بالکل مطمئن ہو گئے اور خوب کھیل کھیلے۔ انھیں معتمد کالج کی بھرپور حمایت اور سرپرستی حاصل تھی اس لیے مولوی صاحب کے پاس آنا جانا، ملنا جلنا بھی ترک کر دیا تھا۔ اُدھر خود انجمن میں بھی نئے سکریٹری ڈاکٹر سید معین الحق صاحب کے آنے کے بعد کش مکش شروع ہو گئی اور چوں کہ بعض ارکان کالج اور انجمن کے نظما میں مشترک تھے اس لیے ایک کے حالات کا دوسرے ادارے پر بھی اثر پڑنے لگا۔ ڈاکٹر معین الحق صاحب ۳ جولائی ۱۹۵۶ء کو انجمن کے معتمد مقرر ہوئے اور کوئی ایک ماہ کے اندر ہی انھیں مولوی صاحب سے شکایات پیدا ہوئیں۔ جنوری ۱۹۵۷ء تک یہ سب مدت لڑائی جھگڑے میں گزری۔ کالج اور انجمن کے نظما میں پارٹیاں بن گئیں اور دونوں اداروں کو سخت نقصان پہنچا۔ نظما کے اکثر لوگ عبدالرحمن رضوی صاحب سے جو معین الحق صاحب کے ساتھ انجمن کے شریک معتمد ہو گئے تھے، نالاں تھے اور ان کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ اور انجمن اور کالج میں مداخلت کو پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر معین الحق کے استعفے کے ساتھ ہی عین الدین کی شرکت معتمدی بھی ختم ہو گئی۔ ڈاکٹر معین الحق کے استعفے کے بعد ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب جو اس وقت کراچی یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ و سیاسیات میں پروفیسر ہو گئے تھے بعض احباب کے مشورے سے مولوی صاحب نے انجمن ترقی اردو کا معتمد اعزازی اور ان کے ایما پر حکیم محمد احسن صاحب کو شریک معتمد مقرر کیا گیا دونوں حضرات کے انجمن کے اہم عہدوں پر فائز ہونے کے ساتھ انجمن میں عین الدین رضوی کے اقتدار کا سورج غروب ہو گیا اور مولوی صاحب تن تنہا رہ گئے اس زمانے میں مولوی صاحب پوری طرح مخالفین کے نرغے میں گھر کر رہ گئے تھے انجمن کی بالائی منزل میں ان کی رہائش گاہ تھی۔ انجمن کے دفتر پر حکیم محمد احسن صاحب ڈاکٹر محمود حسین خاں کے نائب کی حیثیت سے قابض ہو گئے۔ ۲۵ مئی ۱۹۵۶ء کو کالج کی گورننگ باڈی میں مولوی صاحب کی مقرر کردہ تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ پیش ہونا تھی۔ اس کی کوئی نقل مولوی صاحب کو نہیں دی گئی۔ اور حکیم محمد احسن صاحب نے مولوی صاحب کی مخالفت کے باوجود اس اجلاس میں پڑھ کر سنائی مولوی صاحب کو اعتراض تھا کہ اس کی نقول اراکین مجلس کو مہیا نہیں کی گئیں لہٰذا اس وقت اس پر بحث ملتوی کر دی جائے مگر ان کی ایک نہ سنی گئی

وہ اجلاس برخواست کر کے جلسے سے باہر آگئے مگر ان کی موجودگی میں ایک رکن عبدالخالق صاحب کی صدارت میں کارروائی جاری رکھی گئی اس طرح اس رپورٹ اور اس کے ساتھ حسام الدین راشدی کی ذیلی رپورٹ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا کمیٹی کے کنوینر حاتم علوی نے مولوی صاحب کے طلب کرنے کے باوجود انھیں یہ کہہ کر اس کی نقل نہ دی کہ ایک ہی کاپی تھی جو حکیم محمد احسن صاحب لے گئے ان کے پاس کوئی نقل اب موجود نہیں۔ حکیم احسن صاحب نے رپورٹ دبالی اور کبھی منظر عام پر نہ آئی۔ میر حسام الدین راشدی صاحب نے اپنا تحریر کردہ نوٹ مولوی صاحب کو دے دیا تھا۔ وہ جولائی ۱۹۵۸ء کے "نیا راہی" کراچی میں شائع ہو گیا مگر اس پر بھی کسی نے توجہ نہ کی۔ پیر صاحب نے اپنی رپورٹ کے آخر میں لکھا تھا کہ:

> "دوسری ضروری چیز جس پر مجلس نظما انجمن ترقی اردو اور گورننگ باڈی اردو کالج کے ارکان کو فوری توجہ دینی چاہیے یہ ہے کہ پچھلے آٹھ دس ماہ سے انجمن اور کالج کے اراکین میں جو اختلافات پیدا ہو چکے ہیں وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے انتہائی شرم ناک ہیں اور دونوں اداروں کی عزت و ناموس کو ناقابل تلافی حد تک نقصان پہنچ چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دونوں اداروں کے اراکین انتظامی نے اگر یہ حرکات بند نہ کیں تو یہ ادارے تباہ ہو جائیں گے اس لیے دونوں اداروں کی مجالس کی خدمت میں میری مخلصانہ گزارش ہے کہ اس طرف فوری توجہ دیں اور کوئی ایسی صورت نکالیں جس سے پیدا شدہ اختلافات ختم ہو جائیں اور جو دماغ اس وقت منصوبے سازی اور سازشی کارروائیوں میں مصروف ہیں وہ آئندہ اداروں کی فلاح و ترقی میں مصروف ہو جائیں نیز اگر یہ معلوم ہو کہ بعض افراد کے وجود سے یہ اختلافات پیدا ہوئے ہیں تو ان افراد کو اداروں کی فلاح و بہبود کے پیش نظر فوراً علاحدہ کر کے اس فضا اور مکدر شدہ ماحول کو صحیح اور صحت مند بنایا جائے۔"

میر صاحب کی اس "مخلصانہ گزارش" اور دردمند تجویز بھی پارٹی بازی کا شکار ہو گئی اس پر کسی نے ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے کی زحمت نہ فرمائی۔ میجر آفتاب حسن صاحب کی طرف سے ذیلی رپورٹ میں مندرج الزامات کی تردید کی کبھی زحمت نہ فرمائی چنانچہ انجمن اور اردو کالج کی بدنامی میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا۔

مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ:

"ڈسپلن تو پہلے ہی ناقص تھی تعلیمی حالت بھی خراب ہو گئی امتحانات کے نتائج بھی اچھے نہ رہے یہی وجہ ہے کہ اس سال طالب علم بہت کم داخل ہوئے ہیں اب یہ تعلیمی ادارہ نہیں رہا بلکہ سازشوں اور فسادات کا گھر ہو گیا ہے بہت سے طالب علموں اور بعض استادوں سے پروپیگنڈے کا کام لیا جاتا ہے تعلیمی مقاصد پس پشت ڈال دیے گئے ہیں۔"
(اردو کا المیہ ص ۲۶ از مولوی عبدالحق)

انجمن کے معتمد اعزازی ڈاکٹر معین الحق صاحب کے دور میں اردو خواتین کالج جو دو سال پہلے انجمن نے اردو کالج کے اصول پر قائم کیا تھا انجمن میں فنڈ نہ ہونے کے عذر پر بند کر دیا گیا تھا۔ مولوی صاحب کو اس کا بھی بہت صدمہ تھا۔ اِدھر تو یہ حالات تھے اُدھر انجمن کی بالائی منزل میں جہاں مولوی صاحب کی رہائش تھی حالات ناگفتہ بہ تھے مولوی صاحب کو بے دست و پا بنا کر رکھ دیا گیا اور وہ ایک طرح قید شہابی کی زندگی گزار رہے تھے ان کے پاس آنے جانے والوں کو روکا جاتا تھا ان کے ملازمین کو خدمت کرنے سے منع کر دیا گیا تھا خود حکیم صاحب اور میجر آفتاب حسن صاحب نے مولوی صاحب کے ہمدردوں اور ملنے والوں کو دھمکیاں دے کر ان کا آنا جانا بند کر دیا جس میں ابن انشا صاحب، حشمت حسین صاحب نجمی اردو کالج کے بعض اساتذہ اور خود راقم الحروف کو بھی انجمن میں داخل ہونے اور مولوی صاحب کا حال احوال پوچھنے کی ممانعت کر دی تھی اور کچھ دن کے لیے باہر کی دنیا سے مولوی صاحب کا رابطہ کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ اس کے باوجود چند لوگ جان پر کھیل کر مولوی صاحب کے پاس جاتے رہے جن میں ابن انشا صاحب اور میں خود بھی شامل تھا۔ ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب کو یہ شکایات پہنچائی گئیں لیکن انھوں نے اس طرف کوئی توجہ نہ فرمائی۔ مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ:

"میرے ساتھ کام کرنے والے یا میرے خاص ہمدرد میرے پاس نہیں آنے پاتے انھیں زدوکوب کرنے کی دھمکی دی جاتی ہے اور وہ ڈر کر انجمن میں قدم نہیں رکھتے ظاہر ہے کہ ایک شریف آدمی غنڈوں سے مقابلہ نہیں کر سکتا انجمن کے کارکنوں کو مجھ سے ملنے کی ممانعت ہے وہ حکیم صاحب کے عتاب سے ڈرتے ہیں۔"
(اردو کا المیہ ص ۳۴)

۲۰ نومبر ۱۹۵۷ء کو کتب خانہ خاص جو مولوی صاحب کی ملک تھا اور جسے بعض احباب نے مولوی

صاحب کی خدمت میں پیش کیا اور جہاں بیٹھ کر مولوی صاحب کام کرتے تھے مقفل کر کے مہر بند کر دیا گیا۔ مولوی صاحب کا کام ان کے مسودات، کتابیں اور مخطوطات وغیرہ اندر بند ہو گئے اور مولوی صاحب کو اس طرح بے بس کر دیا گیا کہ وہ اپنی تحقیقی کام بھی نہ کر سکیں اور اوپر بیٹھے مکھیاں مارتے رہیں۔ اس زمانے میں انجمن کے رسالے بند ہو چکے تھے اور کتابوں کی چھپائی اور اشاعت پر بھی ناخوشگوار اثر پڑا تھا۔ اس کے ساتھ یہ سازش تیار کی گئی کہ مولوی صاحب کو اردو کالج کی صدارت کے منصب سے خارج کر دیا تھا ان کی جگہ سندھ ہائی کورٹ کے سابق جج جناب ظہیر الحسنین لاری صاحب کو صدارت پر فائز کرنے کے لیے بھاگ دوڑ شروع ہوئی۔ اس کے علاوہ یہ تجویز کیا گیا کہ مولوی صاحب کو انجمن کی صدارت سے بھی علاحدہ کر دیا جائے اس کے لیے یہ تجویز سوچی گئی کہ مجلس نظما میں ایک سرپرست کا اضافہ کر کے مولوی صاحب کو محض ایک سرپرست کا درجہ دے دیا جائے اس طرح انجمن سے ان کو عملاً بے دخل کر کے ان کی رہائشی منزل بھی خالی کرالی جائے۔

ایک دن صبح کے گیارہ بجے مولوی صاحب میرے پاس اسلامیہ کالج تشریف لائے میں کالج سے چھٹی لے کر ان سے بات چیت کرنے کے لیے ایک قریبی ہوٹل (گرین ہوٹل) میں چلا گیا۔ وہاں بالائی ہال میں مولوی صاحب کو بٹھا کر گفتگو کرنے لگا انھوں نے ہوٹل کا پرسکون ماحول دیکھ کر یکایک مجھ سے کہا کہ مجھے اسی ہوٹل میں ایک رہائشی کمرہ دلوادو تاکہ سکون اور دل جمعی کے ساتھ زندگی کے باقی دن گزار سکوں۔ یہ کہتے ہوئے مولوی صاحب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے مجھے سخت صدمہ ہوا اور میں نے عرض کیا کہ آپ کے حکم کی تعمیل میں قطعی کوئی دقت نہیں لیکن ان حالات میں آپ کا انجمن کا قیام چھوڑ کر کسی دوسری جگہ منتقل ہونا حریفوں کی عین مسرت کا موجب ہوگا اور آپ کا کانٹا نکل جانے کے بعد وہ بے خوف و خطر جو چاہیں گے کریں گے اور کالج تو تمام و کمال ان کے ہاتھوں میں آچکا ہے اب وہ انجمن پر بھی تصرف بے جا کریں گے اور آپ کا سب کیا کرایا غارت ہو جائے گا۔ مولوی صاحب کی سمجھ میں میری بات آگئی اور انھوں نے تسلیم کیا کہ اپنے مقام سے ہٹنا صریحاً خلاف مصلحت ہے۔ میں نے مولوی صاحب کو یقین دلایا کہ میں ہر دوسرے تیسرے دن باوجود مصروفیت کے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہوں گا اور ان کی تکالیف کو حتی الامکان دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ مولوی صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے اور کچھ دیر بعد انجمن واپس چلے گئے۔

کالج کی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی تھی۔ انجمن میں مولوی صاحب عضو معطل بن چکے تھے کہ یکایک ۱۹۵۸ء میں جنرل ایوب خاں صاحب نے ملک میں مارشل لا نافذ کر کے سول حکومت کو برطرف کر دیا۔ ایوب خاں کی فوجی

حکومت پاکستان کے لیے ایک نیا تجربہ تھی اور ملک میں غنڈوں اور قانون شکن عناصر کی سرگرمیاں یکایک بند ہوگئیں۔ احتساب اور سزا کے خوف سے ہر شعبہ زندگی میں اعتدال سا آگیا۔ اردو کالج کے ارباب اقتدار کو معلوم تھا کہ مولوی صاحب کے جنرل ایوب خاں سے خاص مراسم ہیں اور مولوی صاحب نے انجمن کے مسائل اور پریشانیوں کے سلسلہ میں ان سے خط و کتابت شروع کر رکھی ہے۔ ۲۸ جون ۱۹۵۸ء کو ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب نے معتمدی سے استعفا دے دیا تھا اور شریک معتمد حکیم محمد احسن صاحب کو چارج دے کر رخصت ہوگئے تھے اب حکیم صاحب عملاً انجمن اور کالج دونوں کے مالک و مختار بن گئے تھے۔ ۹ جولائی ۵۸ء کو مولوی صاحب نے محمود حسین خاں صاحب کے استعفے کا تفصیلی جواب تحریر کیا مگر ملک میں مارشل لا لگ جانے کے باعث یہ بحث آگے نہ بڑھی۔ مرکزی وزارت تعلیم نے ایوب خاں صاحب کی ہدایت پر کالج اور انجمن کے حالات کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا اس کی خبر مولوی صاحب کے مخالفین کو بھی ہوگئی اور انھوں نے بھی حکومت کے با اثر افراد تک رسائی حاصل کرنا شروع کر دی۔ اسی کش مکش میں ایک سال گذر گیا۔ مولوی صاحب کے خط کے جواب میں جنرل ایوب خان نے کہا کہ موجودہ ملکی قوانین کے لحاظ سے میں انجمن اور کالج میں مداخلت کا اختیار نہیں رکھتا اس پر مولوی صاحب نے ساری حالت زار بیان کر کے انجمن اور کالج کو ایوب خاں صاحب کی تحویل میں دے دیا۔ اس پر ستمبر ۱۹۵۹ء کو ایوب خاں صاحب نے ایک مارشل لا ضابطہ جاری کیا اور انجمن اور کالج کو دوبارہ مولوی صاحب کے ہاتھ میں دے دیا اور ان کی مدد کے لیے کچھ سرکاری افسروں کی ایک با اختیار کمیٹی مقرر کر دی۔ اس کام میں صدر ایوب خاں کے سکریٹری جناب قدرت اللہ شہاب صاحب نے مولوی صاحب کی خاص مدد کی اور صدر صاحب کو مولوی صاحب کے موقف کی تائید پر آمادہ کیا اس کام میں متوسط اور رابطہ کا کام ابن انشا صاحب نے انجام دیا جو شہاب صاحب کے مخلص اور بے ریا دوست تھے۔ آخری وقت تک مخالفین نے ان اقدامات کو روکنے کی سخت کوشش کی۔ مولوی صاحب کا اس زمانے میں جو حال تھا اسے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "یہ حالت بہت نازک اور خطرناک ہے اسے دیکھ کر مجھے سخت رنج اور صدمہ ہے اس تھوڑے عرصے میں انجمن کا انحطاط اس درجے کو پہنچ گیا ہے کہ اگر چندے یہی حالت رہی تو شاید وہ روز پھر دیکھنا پڑے جس کا اندیشہ ہے میں نے تقریباً پچاس سال تک اس انجمن کے بنانے ترقی دینے، انجمن کے مقاصد پورا کرنے اور اردو کے وقار کو بڑھانے کے لیے ہر قسم کی محنت و مشقت اور جد و جہد کی اور اپنا دل و دماغ اور سرمایہ اس

کی نذر کر دیا میں اپنی زندگی میں اسے برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا اگر میں خاموشی سے
ایک تماشائی کی طرح یہ سب کچھ دیکھتا رہا تو مجھ سے زیادہ قابل ملامت کوئی شخص نہیں
ہو سکتا اسے ہلاکت سے بچانا دردمندان اردو کا فرض ہے میں اس زندگی پر
موت کو ترجیح دوں گا ۔

معرفت نیست دریں قوم خدایا مددے کہ برم گوہر خود را نہ خریدار گر"

(اردو کا المیہ صفحات ۳۸ ، ۳۹)

مارشل لا کے نفاذ کے ساتھ ہی حکیم احسن اور آفتاب حسن صاحب اپنے گھر بیٹھ رہے نئی انتظامی کمیٹی نے
جس کے سکریٹری جناب صوفی تھے پہلے ہی اجلاس میں آفتاب حسن صاحب کے اخراج کا فیصلہ کیا اور اگلے اجلاس
کرنل عطاء الرحیم صاحب کو ان کی جگہ پرنسپل مقرر کر دیا کہ وہ ناپسندیدہ عناصر کی تطہیر کر کے ضروری اصلاحات
عمل میں لائیں ۔

۱۹۵۹ء میں جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے مارشل لا آرڈر کے نفاذ کے بعد انجمن اور کالج دوبارہ مولوی صاحب
کے زیر انتظام آگئے ۔ آفتاب حسن صاحب پرنسپل اور حکیم محمد احسن صاحب معتمد کالج سے علاحدہ ہو گئے ۔ اور حکیم اسرار
احمد صاحب کرپوی کے مشورے سے کرنل عطاء الرحیم صاحب کو اردو کالج کا نیا پرنسپل مقرر کر دیا گیا ۔ کرنل صاحب
نے جب کالج کا چارج سنبھالا تو خیال کیا جاتا تھا کہ وہ آفتاب حسن اور ان کی ذرّیات کو کالج سے نکال دیں گے مگر
اس قسم کی کوئی کارروائی عمل میں نہیں آئی اور کالج کا کام خوش اسلوبی سے چلنا شروع ہو گیا ۔ یہاں یہ کہنا ضروری
ہے کہ کالج کے مناقشات کے زمانے میں مولوی صاحب نے اپنی تحریک کو ایک نیا رنگ دینا شروع کر دیا
تھا اور اب وہ پوری توانائی کے ساتھ "اردو یونیورسٹی" کی مہم چلا رہے تھے ۔ کالج چونکہ کراچی یونیورسٹی کے
قوانین کا پابند تھا اور اس یونیورسٹی کے مقاصد میں اردو کی ترویج اور اس کے فروغ کی کوئی صراحت نہیں کی
گئی تھی اور یہ اپنے دستور العمل سے ہٹ کر کوئی ایسا کرنے کی مکلّف نہ تھی جو جامعہ عثمانیہ کے آغاز قیام ہی سے
اس کا حصہ تھے ۔ مولوی صاحب کو گزشتہ آٹھ دس سال کے تجربے سے یہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ جو مقاصد ان کے
پیش نظر ہیں وہ صرف اردو کالج کے ذریعے پورے نہیں کیے جا سکتے وہ سمجھ چکے تھے کہ جامعہ کراچی صرف تدریس کا
کام کرنے اور امتحان لے کر اسناد تقسیم کرنے کے علاوہ کوئی بنیادی فریضہ ادا نہیں کر سکتی ۔ ان کے نزدیک
ایک تو انگریزی ذریعہ تعلیم بجائے خود طالب علم کی تخلیقی صلاحیت کو نقصان پہنچاتا ہے دوسرے اس کے ذریعے

جن کتابوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے ان سے پڑھنے والوں کے فکر و خیال پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ ان میں نقالی اور تقلید کی عادت راسخ ہو جاتی ہے۔ وہ بے لاگ غور و فکر سے قاصر رہتے ہیں۔ اپنے ماحول سے منافرت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ باتیں قومی ترقی اور نشو و نما کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ اس باطنی کیفیت کا اثر ظاہر پر بھی پڑتا ہے زبان کے ہر لفظ اور جملے اور پیرایۂ بیان میں قومی روایات تہذیب و تمدن کے شعار اور ذہنی اور روحانی تجربے پیوست ہوتے ہیں۔ انگریزی کے ذریعہ ایک صدی میں جو تعلیم ہم نے حاصل کی ہے اس علم و فن کو ہم ڈھنگ سے اپنی زبان میں منتقل نہیں کر سکتے۔ یونیورسٹیوں سے علم کی روشنی ملک میں نہیں پھیل سکی اور اہلِ وطن ان کے علم سے نہال نہ ہو سکے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ ہماری قوم کے عالی دماغ مصلح سر سید احمد خاں کو سب سے پہلے اردو یونیورسٹی کا خیال پیدا ہوا انھوں نے ۱۸۶۷ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے حکومت ہند کو ایک یادداشت پیش کی تھی جس میں اس تجویز کی ضرورت اور اہمیت کو صاف اور سادہ زبان میں مدلل طور پر بیان کیا۔ انھوں نے خاص طور پر زور دیا کہ جب تک جدید علوم ہمیں ہماری زبان میں نہ پڑھائے جائیں گے ہماری تعلیم ناکافی اور غیر موثر رہے گی۔ لیکن اس وقت کے حالات کے باعث یہ تجویز عمل میں نہ آ سکی پر یہ تجربہ دہلی کالج میں کیا گیا۔ اس کالج کے مشرقی شعبے میں جدید علوم و فنون کی تعلیم اردو کے ذریعہ دی جاتی۔ اس کامیاب تجربے کی توصیف میں پرنسپل کارگل اور بنگال تعلیم عامہ کے سرکاری تبصرہ سے شاندار الفاظ میں تحسین کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں مسٹر فریڈرک مواٹ مٹ فزیشین میڈیکل کالج کلکتہ نے بھی اس کی تعریف کی ہے۔ ۱۸۵۷ء میں یہ کالج توڑ دیا گیا۔ اس کے کوئی اسی سال بعد عثمانیہ یونیورسٹی قایم ہوئی اس کے شعبۂ تالیف و ترجمہ نے علوم و فنون کی صدہا کتابیں تالیف یا ترجمہ کیں ہزاروں علمی اصطلاحات وضع کیں۔ انجینیری، ڈاکٹری جملہ نظری اور طبعی علوم کے سارے شعبے قایم کیے۔ سر آر دیشہ دلال، سر پرشوتم داس ٹھاکر داس سر رادھا کرشنن ہی راج گوپال آچاریہ اور ہندوستان ٹائمز نے عثمانیہ یونیورسٹی کے تجربے کی توصیف و تعریف کی ہے۔ انگلستان کے سب سے بڑے طبی ادارے نے جامعہ عثمانیہ کی ڈاکٹری کی ڈگری کو تسلیم کیا۔ ۱۹۳۸ء کی دہلی اردو کانفرنس میں اور ۲۰ جنوری ۱۹۴۰ء کو ناگپور کانفرنس میں اردو یونیورسٹی کے قیام کی قراردادیں منظور کی گئیں۔ یہ یونیورسٹی کہاں قائم ہو اس پر اخبارات میں بہت سی تجاویز پیش کی گئیں۔ ۱۹۳۹ء کو ایک سماجی کارکن اور ماہر تعلیم مسٹر واسوانی نے اسے کراچی میں قائم کرنے کا مشورہ دیا اسی سلسلے میں مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ "میں نے اللہ کا نام لے کر اسی کراچی میں انجمن ترقی اردو پاکستان کے زیر اہتمام اردو کالج قایم کیا جو خدا کے فضل و کرم سے اب بھی

کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے اور جس میں بی اے، بی ایس سی، بی کام اور ایل ایل بی تک اردو کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے اب سے چند سال پہلے ایم اے کی تعلیم بھی اس میں اردو کے ذریعہ سے دی جاتی تھی۔"

(اردو یونیورسٹی وقت کا اہم تقاضہ ص۲۴۔ از مولوی عبدالحق)

مولوی صاحب نے فرمایا کہ حکومت پاکستان کے مقرر کردہ تعلیمی کمیشن نے اردو کالج کی افادیت کا اعتراف کیا ہے کمیشن نے اردو کی ترویج کے لیے پندرہ سال کی مدت تجویز کی تھی جس پر مولوی صاحب نے فرمایا کہ "لیکن میں انتظار نہیں کر سکتا اور ایک مسلمہ حقیقت کو عمل میں لانے کے لیے پندرہ سال اور غیر یقینی اور تذبذب کے عالم میں نہیں رہنا چاہتا۔ اور اللہ کے نام سے از سرِ نو اردو یونیورسٹی کی زندگی بخش اور روح پرور مہم کو نئے جوش اور ولولوں سے شروع کرتا ہوں۔"

(ص۲۷، مضمون، اردو یونیورسٹی وقت کا اہم تقاضہ، از مولوی عبدالحق)

مولوی صاحب نے یہ مہم ۱۱ر مارچ ۱۹۶۰ء کو شروع کی۔ ۶ر اکتوبر ۱۹۶۰ء کو شام پانچ بجے نیپئر ہوٹل کراچی میں انجمن کی طرف سے ایک جلسہ ہوا جس کی صدارت کریم آغا نے کی۔ مولوی صاحب نے ان کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا اور ان کے دست مبارک سے اردو یونیورسٹی کی مہم کا افتتاح کرایا۔ مولوی صاحب نے یاد دلایا کہ سر کریم آغا خان کے دادا نے مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لیے سارے ہندوستان سے چندہ کیا اور اس کے مساوی رقم خود بھی عطا کر کے مسلم یونیورسٹی کے خواب کو حقیقت کا جامہ پہنایا۔ اب ان کے پوتے کے ہاتھوں اردو یونیورسٹی کے قیام کا عظیم کام شروع ہو رہا۔ مولوی صاحب نے اردو یونیورسٹی کی تشکیل کے لیے ایک تاسیسی کمیٹی قائم کی جس کے سکریٹری گجراتی کے مشہور ادیب، شاعر اور اخبار نویس جناب صاحب ایڈیٹر ملت گجراتی کو مقرر کیا۔ اُس زمانے میں مولوی صاحب آنکھوں کے عارضے میں مبتلا تھے اور ان کی آنکھوں میں موتیا بند اترنے کی وجہ سے آپریشن ہوا تھا وہ اپنے خطوط بھی دوسروں سے پڑھوا کر سنتے تھے اور جوابات بھی لکھوا کر بھیجتے تھے۔ اس کے بعد سے مولوی صاحب کی علالت کا سلسلہ دراز ہو گیا وہ ۱۹۶۱ء دوبارہ جناح اسپتال کراچی میں داخل کر دیے گئے تھے جہاں سے مشترکہ فوجی اسپتال میں اور پھر راولپنڈی میں صدر پاکستان کے ذاتی مہمان کی حیثیت سے زیر علاج رہے۔ عالم سکرات میں کراچی واپس لائے گئے اور کراچی میں بحریہ کے اسپتال میں ۱۶ر اگست ۱۹۶۱ء کو جان جاں آفریں کے سپرد کی اور اپنی وصیت کے مطابق اردو کالج میں دفن ہوئے۔

مولوی صاحب کے انتقال کے بعد انجمن اور اردو کالج نئی انتظامیہ کے تحت ترقی کی نئی منزلوں کی طرف رواں ہوئے۔ جناب اختر حسین صدر انجمن و کالج کی سربراہی میں اردو سائنس کالج کی نئی عمارت کے لیے زمین حاصل کی گئی اور تعمیر کے لیے عطیات فراہم کیے گئے اور تعمیر عمارت کے بعد سائنس کا شعبہ نئی عمارت میں منتقل کر دیا گیا جہاں اب وہ ایک علاحدہ اور مکمل کالج کے طور پر کام کر رہا ہے۔ اس کالج کے پہلے پرنسپل جناب اکرام الرحمن صاحب ہوئے اور اب ایم ایس سی کے مضامین کی تدریس بذریعہ اردو انجام دے رہا ہے۔ یکم ستمبر ۱۹۷۲ء کو دونوں کالج ملک کے دوسرے کالجوں کے ساتھ قومی تحویل میں لے لیے گئے اور یکم مئی ۱۹۷۵ء کو ان اردو کالج کے دونوں حصوں کا انتظام وفاقی حکومت نے سنبھال لیا۔ اب آرٹس کالج یعنی پرانی عمارت میں فنون تجارت اور قانون کی تعلیم جاری ہے۔ آرٹس کالج کے پرنسپل خلیل اللہ صدیقی کے دور میں کالج نے بڑی ترقی کی۔ پرانے کالج کی عمارت میں توسیع ہوئی اور کالج و انجمن کے درمیان جو صحن افتادہ تھا اس پر بھی عمارتوں کا ایک سلسلہ تعمیر ہو گیا ہے۔ کالج کے قریب علمی کراچی کا میدان موجود تھا اس کا ایک حصہ جو کالج سے ملحق تھا کالج کو مل گیا اس حصے میں بابائے اردو ہال اور پرنسپل کے دفاتر واقع ہیں۔ کالج میں ایم اے کی تدریس دوبارہ شروع ہو گئی ہے ایک۔ نئے مضمون ایم اے ایجوکیشن کا اضافہ کیا گیا ہے قانون میں ایل ایل ایم کی جماعتوں کے لیے نیا نصاب مرتب کیا گیا ہے اور یہ کلاسیں پورے ملک میں اپنے ذریعہ تعلیم کی بنا پر مقبول عوام ہیں۔

کالج کے اساتذہ کی علمی کارگزاری ایک الگ موضوع ہے جس پر علاحدہ مضمون درکار ہے۔ مجملاً کہا جا سکتا ہے کہ پرنسپل آفتاب حسن نے دو انگریزی کتابوں کا ترجمہ شائع کیا، مولانا مظہر علی کامل صاحب نے "حکومت کا اسلامی نظام" کے نام سے ایک عربی کتاب "نظام الحکم فی الاسلام" کا ترجمہ کیا، عبدالرشید نے "اقبال اور عشق رسالت مآب" لکھی، محمد علی علوی صاحب نے جغرافیے پر تین کتابیں مرتب کیں۔ سید عین الحق صاحب نے قدیم مشرق کے نام سے پرانی تہذیبوں کا مطالعہ پیش کیا۔ عظمت اللہ خاں نے نظری معاشیات پر ایک کتاب لکھی۔ اردو کالج کے وابستگان اساتذہ اور طلبہ نے جو علمی و ادبی کام کیا ہے اس کی مکمل فہرست آج تک شائع نہیں ہوئی لیکن مولوی عبدالحق نے اردو کالج کی صورت میں جو چراغ علم و ادب روشن کیا تھا اس کی لو سے بہت سے چراغ ضوفشاں ہوئے اور آج تک ان کی روایت پر اس طرح کام ہو رہا ہے جیسا کہ ان کی زندگی میں ہوتا تھا۔ جن اساتذہ اور طلبہ نے علمی کاموں میں زندگی گزاری ان میں ڈاکٹر معین الحق

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، پروفیسر حبیب اللہ خاں غضنفر، ڈاکٹر عبد السلام، ڈاکٹر عبد القیوم، عبد اللہ المدوسی، مولانا مظہر علی کامل، مولوی عبدالرشید فاضل، مولوی قمرالدین خان، پروفیسر خلیل اللہ، ڈاکٹر نعیم نقوی، اکرام الرحمٰن، محمد علی علوی، ڈاکٹر غلام سرور، ڈاکٹر محمد ایوب قادری اور دیگر متعدد اصحاب کا نام گنایا جا سکتا ہے۔ مولوی صاحب کی وضع اصطلاحات کی مجالس میں دیگر ماہرین کے علاوہ کالج کے آفتاب حسن، مولا منتخب الحق قادری، سید عبد العلیم، فصیح الزماں صاحب، خواجہ آشکار حسین اور دیگر حضرات شریک ہوتے رہے اور اس کام کو بڑھانے میں ان کی مدد کی۔ اردو کالج اب ایک سرکاری ادارہ ہے اس کی مالی مشکلات کا بڑی حد تک ازالہ ہو چکا ہے۔ افسوس کہ مولوی صاحب اس کی تعمیر و ترقی کا یہ دور دیکھنے کو زندہ نہ رہے لیکن اس کالج کے احاطے میں ان کا مزار اب بھی کالج آنے والے ہزاروں افراد کو اپنے بانی کے عزم و ہمت کی یاد دلاتا رہتا ہے۔

عتیق احمد جیلانی

استاد، شعبۂ اردو، جامعہ سندھ،

جام شورو، پاکستان۔

دبستانِ شبلی اور مولوی عبدالحق

مولوی عبدالحق کو عام طور پر دبستانِ شبلی کے مخالفین میں شمار کیا جاتا ہے لیکن اخیر عمر کے ایک خط میں انھوں نے اس خیال کی تردید کی ہے جس کا حوالہ آئندہ سطور میں آئے گا۔ تمہید کے طور پر یہاں قومی زبان، کراچی؛ بابائے اردو نمبر ۱۹۶۶ء سے دو اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:[۱]

"میں تربیت کے لحاظ سے شبلی کے گروہ کا آدمی تھا۔ یہاں تک کہ ۳۹ء یا ۴۰ء تک میں مولوی عبدالحق صاحب سے صرف اسی وجہ سے بے تعلق رہا کہ وہ میرے ہیرو کے متعلق اچھے خیالات نہ رکھتے تھے۔"

اس کے ساتھ ہی ابوسلمان شاہجہان پوری کے مقالے سے یہ اقتباس بھی توجہ طلب ہے:[۲]

"مولانا غلام رسول مہر نے اسی سلسلے میں میرے ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا: یہ ٹھیک ہے کہ مولوی عبدالحق کے گرد ایسے لوگوں کا ایک حلقہ بن گیا تھا جو لیگی ذہن رکھتے تھے اور مولانا آزاد کے مخالف تھے۔ مولوی صاحب ان لوگوں سے متاثر تھے۔ لیکن ان کے اختلاف کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ شبلی کو سخت ناپسند کرتے تھے اور شبلی اسکول کو بھی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مولانا آزاد کو اگر کسی اسکول سے وابستہ کیا جا سکتا ہے تو وہ شبلی اسکول ہے۔ اس لیے وہ مولانا آزاد کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ شبلی کے مقابلے میں

---

[۱] ڈاکٹر سید عبداللہ، مضمون "کچھ یادیں"، مشمولہ قومی زبان، کراچی، بابائے اردو نمبر، جلد ۲۹، شمارہ ۲، ۱۹۶۶ء، ص ۱۰۔

[۲] ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری: مضمون "عبدالحق اور ابوالکلام آزاد"، مشمولہ قومی زبان، محولہ بالا، ص ۲۵۱۔

وہ حالی کے بہت مداح تھے بلکہ یہ کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ وہ شبلی کے دشمن اور حالی کے عقیدت مند تھے ، مولانا مہر نے مزید فرمایا تھا : ' واقعہ یہ ہے کہ شبلی کی مخالفت ان کی ایک کمزوری تھی اور اکثر لوگ ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے تھے ۔"

اب آئیے مولوی عبدالحق کے مذکورہ مکتوب کی طرف "ادیب" علی گڑھ ، شبلی نمبر کے لیے عبداللطیف اعظمی نے بذریعہ خط ان کے تاثرات طلب کیے ۔ جوابی خط میں مولوی صاحب لکھتے ہیں :[۱]

"رہی یہ بات کہ میں مولانا شبلی کا مخالف ہوں تو یہ بالکل غلط ہے ۔ میں مولانا کے علم و فضل کا تہہ دل سے قائل ہوں اور انھیں اردو زبان کے بڑے ادیبوں اور محسنوں میں شمار کرتا ہوں ۔۔۔۔۔۔

لوگوں کا یہ کہنا کہ میں مولانا شبلی کا مخالف ہوں ، اس کا سبب میری سمجھ میں نہیں آتا ۔ ہو سکتا ہے کہ میں نے اپنی بعض تحریروں میں مولانا شبلی کے بعض بیانات پر جو تنقید کی ہے اس سے لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہو ۔"

اسی خط میں ماہ نامہ انشا' کراچی ، اکتوبر ۱۹۵۹ء میں شائع شدہ اپنے ایک مضمون کا اقتباس بھی نقل کیا ہے ۔ زمانۂ طالب علمی کے بارے میں لکھتے ہیں :[۲]

"یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے فارسی لی ، اس کی بدولت مجھے شبلی جیسے استاد ملے ۔"

حالی و شبلی کی چشمک کے ضمن میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے مولوی صاحب اس کی تردید کرتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ مولانا شبلی کی طبیعت میں ضبط نہ تھا جب کہ حالی انتہا درجے کے ضابط واقع ہوئے تھے ۔ انھوں نے

---

[۱] مولوی عبدالحق : مکتوب بنام عبداللطیف اعظمی مرقومہ ۹ جولائی ۱۹۶۰ء ، مشمولہ ماہ نامہ ادیب ، علی گڑھ ، شبلی نمبر جلد ۶ ، شمارہ ۹ ، ستمبر ۱۹۶۰ء ، ص ۱۴ ، ۱۵ ۔ (یہ خط "شبلی نقادوں کی نظر میں" از و احمد عثمانی ، کراچی ، صفیہ اکیڈمی ، مطبوعہ ۱۹۶۷ء میں بھی شامل ہے ۔)

[۲] ایضاً ص ۱۵ ۔ (مولوی صاحب ایک اور جگہ لکھتے ہیں : "مولانا شبلی شاعر ، ادیب اور مورخ تھے ، ان کی جماعت میں بیٹھ کر جی خوش ہوتا تھا ۔ وہ موقعے موقعے سے ادبی نکات اور اساتذہ کے اشعار اور لطائف یا تاریخی واقعات اس طرح بیان کرتے تھے کہ درس کا حق ادا ہو جاتا تھا ۔" بحوالہ "بابائے اردو : احوال و افکار" ، از ڈاکٹر سید معین الرحمن لاہور ، سنگ میل پبلی کیشنز ، طبع اول ۱۹۷۶ء ، ص ۱۴۳ ۔)

شبلی کا ذکر ہمیشہ اچھے لفظوں میں کیا۔ مولانا شبلی نے "حیاتِ جاوید" دیکھتے ہی اسے کذب و افترا کا آئینہ قرار دیا تھا، مگر انھیں حالی سے کوئی بغض نہ تھا وہ بھی ان کی علمیت کے قائل تھے۔ جب مولانا (حالی) کو شمس العلما کا خطاب ملا تو مولانا شبلی نے مجھ سے فرمایا: اب اس خطاب کی عزت بڑھ گئی ہے۔"[۱]

مولوی صاحب کی اس وضاحت کے باوصف یہ حقیقت ہے کہ ان کے اور شاگردان و حامیانِ شبلی کے درمیان تعلقات میں کبھی گرم جوشی کی کیفیت نہیں رہی۔ دونوں طرف کی متعلقہ تحریروں میں اختلافات کا رنگ بھی جھلکتا ہے اور ایک دوسرے کی ادبی و علمی خدمات کا اعتراف بھی ملتا ہے۔ ان تحریروں کے جائزے سے مقصود صرف اسی قدر ہے کہ بکھرے ہوئے حقائق یکجا کر دیے جائیں۔ دونوں طرف کے بزرگوں میں سے کسی کو برحق ثابت کرنا ہمارا منشا ہرگز نہیں۔ ہماری نگاہ میں سرسید احمد خاں، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبلی نعمانی، مولوی عبدالحق، مولانا ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مہدی الافادی اور دیگر اہلِ علم اپنی اپنی جگہ لائق تکریم ہیں۔

اس جملۂ معترضہ کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں فریقوں کے تعلقات میں خرابی کا آغاز کہاں سے ہوا۔ اس ضمن میں "حالی و شبلی کی چشمک" کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ مگر ایک خیال یہ بھی ہے کہ شبلی کی مخالفت حالی سے نہیں سرسید سے تھی۔ سرسید سے اختلافات کے آغاز اور ان کی نوعیت پر "حیاتِ شبلی" میں سید سلیمان ندوی نے تفصیلاً لکھا ہے اور اس کے ساتھ ہی حالی و شبلی کے مخلصانہ تعلقات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔[۲] آل احمد سرور، عبداللطیف اعظمی کی تصنیف "شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں" کے مقدمے میں لکھتے ہیں[۳]: "دراصل یہ چشمک ان دونوں بزرگوں میں اتنی نہ تھی، جتنی ان کے جانشینوں میں ہے۔"

۱۔ ایضاً، ص ۱۴۔

۲۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: "شبلی نامہ" اور "یادگارِ شبلی" از ڈاکٹر شیخ محمد اکرام، "سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ" از ڈاکٹر سید عبداللہ، "شبلی ایک دبستان" از ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی ردولوی، "ذکرِ شبلی" از محمد امین زبیری، اور "شبلی ادیبوں کی نظر میں" از محمد واصل عثمانی۔

۳۔ آل احمد سرور: مقدمہ مشمولہ "شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں"، طبع دوم، کراچی، صفیہ اکیڈمی، اکتوبر ۱۹۶۷ء، ص ۳۔

اس موضوع پر جب مہدی الافادی نے قلم اٹھانے کا ارادہ کیا تو اس کی اطلاع مولانا عبدالماجد دریابادی کے توسط سے سید سلیمان ندوی تک پہنچی، مگر صاحبِ مضمون کا نام صیغۂ راز میں رہا۔ سید صاحب کا ذہن قاضی تلمذ حسین اور سید ہاشمی فرید آبادی کی طرف منتقل ہوا اور یہ گمان گزرا کہ شاید یہ سب کچھ مولوی عبدالحق کے اشارے پر ہوا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام لکھتے ہیں:[۱]

"متاخرین کی معاصرانہ چشمک آخر کس کی آنکھ کا اشارہ ہے ..... میرا خیال ہے کہ قاضی صاحب ہوں گے یا ہاشمی صاحب! نوواردوں میں کوئی تیسرا نہیں ہو سکتا"

(ص ۹۱، مکتوب مرقومہ ۱۵ر جون ۱۸ء)

"ہاں! مولوی عبدالحق یا سلیم تو 'چشمک باز' نہیں؟ ابھی یونہی شبہ سا ہوا"

(ص ۹۲، مکتوب مرقومہ ۱۵ر جون ۱۸ء۔)

"آپ کے چشمک باز صاحب پر ایک شعر یاد آیا، داد دیجیے گا:

اللہ رے تابِ حسن کہ تیرا دُرِ بلاق | چشمک زنی کرے ہے عقیقِ یمن کے ساتھ"

(ص ۹۳، مکتوب مرقومہ ۲۷ر رمضان ۳۶ھ۔)

"حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک" کے اصل خالق مہدی الافادی، مولانا شبلی کے مدّاحوں میں سے تھے۔ اسی حوالے سے سید سلیمان ندوی اور ندوہ و دارالمصنفین سے بھی تعلقِ خاطر رکھتے تھے۔ سید صاحب نے ان کے انتقال پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے بھی اس مضمون کا حوالہ دینا ضروری خیال کیا۔ لکھتے ہیں:[۲]

"ناظرین کے دلوں میں شبلی سوسائٹی اور معاصرانہ چشمک کے لکھنے والے کی یاد ابھی بالکل تازہ ہو گی۔ مرحوم کو مولانا شبلی کی ذات، ان کی تصانیف، ان کے تلامذہ اور ان کی یادگار کی چیزوں، سب سے گہرا تعلق تھا۔"

ان اقتباسات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شبلی و حالی کے تعلقات کو اس انداز میں موضوع بحث بنانا سید صاحب کو منظور نہ تھا۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سر سید احمد خان اور مولانا الطاف حسین حالی کے بارے میں

۱۔ سید سلیمان ندوی: "مکتوباتِ سلیمانی"، جلد اول، لکھنؤ، صدق جدید بک ایجنسی، ۱۹۶۳ء

۲۔ سید سلیمان ندوی: "یادِ رفتگاں"، کراچی، مکتبۃ الشرق، جنوری ۱۹۵۵ء، ص ۴۳۔

دارالمصنفین اور سید سلیمان ندوی کے تاثرات کی ایک جھلک پیش کردی جائے۔ شذراتِ معارف کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے[1]:

"جو لوگ اب تک ہر چیز کے جواب میں 'آیاتِ محکمات' کی طرح سر سید کی پالیسی، سر سید کی پالیسی چلاتے رہتے ہیں وہ یا تو سر سید کو غلط سمجھتے ہیں یا خود اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں یا قوم و ملک کو۔"

مولانا حالی سے متعلق دو اقتباسات دیکھیے:۔

"مولانا حالی مغفور کی قدر دانی خود ان کی قوم میں تو یہ ہوئی تھی کہ خالی، خیالی، ڈفالی جیسے سنجیدہ حریف ان کے زیر کرنے کو اکھاڑے میں اتارے گئے اور علی گڑھ، لکھنؤ و گورکھپور سے مہینوں بلکہ برسوں ان کے نام پر آوازے کسے جاتے رہے۔ لیکن دوسری قومیں اس قدر تنگ نظر نہ تھیں۔ ان کی رباعیات کا ترجمہ مدت ہوئی انگریزی میں ہو چکا ہے۔ ان کی تصانیفِ نثر پر انگریز محققوں نے تبصرے لکھے ہیں۔۔۔۔" [2]

"ہمارے پچھلے نامور مصنفین میں مولانا حالی کا جو درجہ ہے وہ مخفی نہیں۔ وہ "حیاتِ جاوید" کے مصنف ہو کر خود حیاتِ جاوید پا چکے ہیں۔ ان کی سخن وری، سخن فہمی، نکتہ رسی اور متانتِ تحریر اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ایسی ہستی اگر کسی دوسری قوم کو حاصل ہوتی تو اس کی مستقل سوانح عمریوں اور اس کے کارناموں کے تبصروں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہوتا مگر ہماری غفلت کی انتہا ہے کہ چند صفحوں کے سوا ان کے سوانح حیات کا کوئی ورق بھی نہیں ملتا۔" [3]

۱۹۱۵ء کے دوران شبلی اکیڈمی اور دارالمصنفین کی تجاویز زیرِ غور تھیں۔ سید سلیمان ندوی مقاصد کے اشتراک کی بنیاد پر انجمن ترقیِ اردو سے رابطے اور تعاون کی صورت چاہتے تھے۔ اس ضمن میں مولانا

---

[1] معارف، جلد ۹، شمارہ ۵، مئی ۱۹۲۲ء، ص ۳۲۴۔

[2] معارف، جلد ۱۰، شمارہ ۵، نومبر ۱۹۲۲ء، ص ۳۲۸۔

[3] "مولانا حالی کی خود نوشت سوانح عمری"، ادارتی نوٹ، مشمولہ معارف، جلد ۱۹، شمارہ ۵، مئی ۱۹۲۷ء، ص ۳۴۴۔

عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں[۱]:

● — "رات اکاڈیمی کے قواعد و مقاصد ترتیب دے رہا تھا، دیکھتا ہوں تو انجمن ترقیِ اُردو سے کہیں کہیں ٹکرا جاتی ہے۔ کاش اہلِ انجمن، ترقیِ اردو کو اکاڈیمی میں ضم کر دیں۔ مولوی عبدالحق مشغول آدمی ہیں اور پھر مرکز سے ۷۰۰ کوس دور۔ مولوی عبدالحق کا پتا معلوم نہیں، مطلع فرمائیے۔" (ص ۳۸، مکتوب مرقومہ ۲ فروری ۱۵ء۔)

● — "دارالمصنفین کی نسبت ڈاکٹر اقبال، سید اکبر حسین، عمادالملک اور مولوی حبیب الرحمٰن خاں اور مولوی ابوالکلام سے گفتگو کر رہا ہوں، مولوی عبدالحق کو بھی خط لکھتا ہوں۔"

(ص ۳۸، مکتوب مرقومہ ۹ فروری ۱۵ء۔)

● — "حُسنِ نیت سے معاملہ خود بخود فیصل ہو گیا۔ اتفاق سے چند روز کے لیے مجھے خود حیدرآباد جانا پڑا، مولوی عبدالحق وہاں آ گئے تھے، مولوی حمیدالدین صاحب اور میرے مقابلے میں اُن سے باتیں ہو گئیں۔"

(ص ۳۹، مکتوب مرقومہ ۴ مارچ ۱۵ء۔)

"دارالمصنفین" کے قیام اور "معارف" اعظم گڑھ کی اشاعت کے اولین سالوں میں بھی سید صاحب اور مولوی عبدالحق کے درمیان تعلقات میں سرد مہری قائم رہی۔ اس کا اظہار مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام سید صاحب کے خطوط میں ہوتا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے[۲]:

● — "سنا ہے کہ آپ نے ترقیِ اردو کی شاخ لکھنؤ میں قائم کی ہے۔ میں تو اس دربار کے لائق ہی نہیں ہوں، ورنہ میں بھی شہدا میں داخل ہوتا۔"

(ص ۴۷، مکتوب مرقومہ ۳ دسمبر ۱۵ء۔)

● — نقاد میں اپنی تنقید تو آپ نے پڑھی ہو گی، ترقیِ اردو کو تو کہیں کا نہ رکھا۔"

(ص ۶۹، مکتوب مرقومہ ۱۸ مئی ۱۷ء۔)

---

۱ سید سلیمان ندوی: مکتوباتِ سلیمانی، محولہ بالا۔

۲ ایضاً۔

● ۔ "مولوی عبدالحق صاحب کی مجلسِ شوریٰ میں مجھے بار کیوں ملنے لگا! آپ کو یہ منطقی طرزِ استدلال معلوم ہے، دشمن کا دوست دشمن ہوتا ہے۔"

(ص ۴۷، مکتوب مرقومہ ۲۲ اگست ۱۷ء۔)

مولانا عبدالماجد دریابادی، انجمن ترقیِ اردو اور دارالمصنفین، دونوں سے قریبی روابط رکھتے تھے۔ وہ مولوی عبدالحق اور سید سلیمان ندوی، دونوں کے مخلص احباب میں شامل تھے۔ اس لیے دونوں بزرگوں کے باہمی تعلقات کے بہت سے نشیب و فراز اُن کی نگاہ میں تھے۔ چنانچہ اسی واقفیت کی بنیاد پر مذکورہ بالا خط (مرقومہ ۲۲ اگست ۱۷ء) کے حاشیے میں لکھتے ہیں[۱]: "مولوی عبدالحق صاحب کی مخالفت مولانا شبلی اور ان کے جانشین سے اب بہت زیادہ بڑھ چکی تھی۔" (ص ۴۷)

ان خطوط میں انجمن ترقیِ اردو کی مطبوعات پر تنقیدی آرا بھی موجود ہیں[۲]:

● ۔ "معاف کیجیے، آپ کے سوا انجمن ترقیِ اردو کے دوسرے دور کی کوئی کتاب زبان کی لفظی و معنوی غلطیوں سے پاک نہیں۔" (ص ۸۴، مکتوب مرقومہ ۸ جنوری ۱۸ء۔)

● ۔ "مولوی عبدالحق صاحب نے اصطلاحات کی کاپی بھیجی تھی۔ میں کیا بتاتا، یوں ہی کچھ سٹ پٹ جا بجا رائے لکھ کر بھیج دی۔ جامع نے انھیں کتابوں کے اخیر سے اصطلاحات بعینہٖ نقل کر لی ہیں۔" (ص ۸۷، مکتوب مرقومہ ۱۴ فروری ۱۸ء۔)

۱۹۲۱ء کے آغاز میں سہ ماہی اردو، انجمن کے علمی مجلّے کی حیثیت میں سامنے آیا تو معارف نے اس کا خیر مقدم کیا۔ باب التقریظ والانتقاد کے تحت پہلے شمارے پر تبصرہ شاملِ اشاعت کیا گیا۔ اس تبصرے میں شکوہ و شکایت کا ایک پہلو بھی موجود تھا۔ چنانچہ اردو کی تیسری اشاعت میں مولوی عبدالحق نے "معارف کی تنقید" کے عنوان سے اس کا جواب تحریر کیا[۳]۔ اس طرح غیر ضروری طور پر فضا ناخوش گوار ہو گئی اور پھر جلد ہی شعر العجم کی تنقید سے متعلق سلسلۂ مضامین نے اسے محاذ آرائی کی شکل دے دی۔ سہ ماہی اردو، شمارہ ۱، پر معارف کے تبصرے سے اقتباس درج ذیل

۱۔ ایضاً۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ مولوی صاحب کی یہ تحریر قومی زبان کراچی، جلد ۵۳، شمارہ ۸، اگست ۱۹۸۳ء میں بھی شائع ہو چکی ہے۔

ہے [۱]:

"اردو کا آغاز ہی پڑھنے سے خیال ہوتا ہے کہ اس کے دربار میں نہ حالی و آزاد (مولوی محمد حسین) کی صف میں شبلی کی جگہ ہے اور نہ 'حسن' و 'دکن ریویو' کے ساتھ 'الندوہ' کے نام سے یہ اپنی زبانِ قلم کو آلودہ کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے یقیناً معارف کی تعریف و تنقیص دونوں سے اس کا مرتبہ ارفع ہوگا۔۔۔۔ اردو میں اس سے پہلے غالباً کوئی سہ ماہی رسالہ کبھی نہیں نکلا۔ اس بدعتِ حسنہ کا ہم دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔"

مولوی صاحب نے اس شکایت کا جواب ان الفاظ میں تحریر کیا [۲]:

"معارف نے اردو کا خیر مقدم کیا ہے جس کا ہم شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ معارف کی طرح اردو کا شیوہ نوک جھونک نہیں ہے لیکن فاضل مرتب معارف نے ابتدائے تنقید ہی میں چند جملے ایسے لکھ دیے ہیں جن سے مغالطہ پیدا ہوتا ہے اور اس کا رفع کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔۔۔۔ بہرحال ہمیں ان کی طبیعت کا رنگ معلوم ہوگیا اور جو ان کے دل میں تھا وہ ان کے قلم سے بے اختیار ٹپک پڑا۔"

علامہ شبلی نعمانی کی مشہور تصنیف شعر العجم پر حافظ محمود خاں شیرانی کے تحقیقی مقالات کی اشاعت رسالۂ اردو میں شروع ہوئیں تو اسے بھی دار المصنفین میں شک کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ معارف کے شذرات اور مقالات میں مذکورہ "تنقید شعر العجم" متعدد بار موضوعِ تحریر بنی۔ یوں دونوں اداروں کے درمیان شکوک و شبہات کی خلیج کچھ اور وسیع ہوگئی۔ سید سلیمان ندوی اس سلسلۂ مضامین کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کا اندازہ ڈاکٹر سید عبداللہ کی اس تحریر سے کیا جا سکتا ہے [۳]:

"جس زمانے میں استاد مرحوم پروفیسر شیرانی، شعر العجم کے بعض حصوں پر تنقیدی مضامین لکھ رہے تھے سید صاحب مرحوم نے مجھے لکھا کہ اپنے استاد سے کہہ دو

۱۔ معارف، جلد ۷، شمارہ ۴، اپریل ۱۹۲۱ء، ص ۳۱۵۔

۲۔ رسالہ اردو، جلد اول، حصہ سوم، جولائی ۱۹۲۱ء، ص ۴۸۱۔

۳۔ ڈاکٹر سید عبداللہ: مضمون "کچھ یادیں"، مشمولہ قومی زبان، محولہ بالا، ص ۹

کہ تنقید ضرور کریں مگر مولوی عبدالحق کی پارٹی بازی میں شرکت نہ کریں۔ پیغام میں نے پہنچادیا اور مدتوں تک استاد مرحوم کی نظروں میں مشکوک بلکہ معتوب آدمی رہا۔"

رسالہ اردو، اکتوبر ۱۹۲۴ء، جلد ۳، حصہ ۱۲ میں تنقید شعر العجم کے سلسلے میں مشہور محقق ڈاکٹر محمد اقبال کو غلطی سے ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال لکھ دیا گیا۔ شذرات معارف میں سید سلیمان ندوی نے اس کی تصحیح میں ذرا سخت لہجہ اختیار کیا ہے۔ لکھتے ہیں[۱]:

"مرحوم مصنف نے تو سینکڑوں برس کے مردہ اشخاص کے ناموں میں غلطیاں کی ہیں مگر ہمارے زندہ تنقید نگار کی صحیح البیانی یہ ہے کہ وہ زندہ اور معاصر اشخاص کے ناموں میں بھی التباس اور تشابہ سے محفوظ نہیں، پھر مردوں کی داد فریاد کون سنتا ہے ...... حضرت مسیح نے سچ کہا ہے: تم کو دوسروں کی آنکھوں کا تنکا نظر آتا ہے مگر اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا،

یک زندہ دل نہ رفت سلامت زعیب جو   کایں ماجرا بہ خضر علیہ السّلام رفت۔"

رسالہ اردو کے اگلے شمارے میں اس سے زیادہ سخت لہجہ اختیار کیا گیا اور فہرست مضامین سے قبل تین صفحات میں دو عنوانات کے تحت نمایاں طور پر جواب شائع کیا گیا۔ پہلی تحریر منیجر مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (مولوی محمد مقتدیٰ خاں) کی طرف سے "مطبع کی معذرت" کے عنوان سے ہے۔ صاحب تحریر قارئین سے معذرت کے بعد لکھتے ہیں[۲]:

"شعر العجم کی جو تنقید رسالہ اردو میں مسلسل شائع ہو رہی ہے وہ بلاشبہ ایک اہم ادبی و تاریخی خدمت ہے اور اس سے کسی طرح مرحوم مؤلف کی خدانخواستہ منقصت یا ان کے حقیقی کمال کا استخفاف مدنظر نہیں ہے۔ مگر شبلی منزل کے عرش نشین جو خود کو جائز سے جائز اعتراضوں سے ماورا سمجھتے ہیں اس سے سخت نعل در آتش ہیں اور بجائے اس کے کہ اعتراضوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرتے اور متانت کے ساتھ ان کا جواب دیتا (اگر کچھ

۱؎ معارف، جلد ۱۲، شمارہ ۶، دسمبر ۱۹۲۳ء، ص ۴۰۸۔

۲؎ رسالہ اردو، جلد ۴، حصہ ۱۳، جنوری ۱۹۲۴ء صفحہ نمبر ندارد۔

ہو سکتا ہو) اب معارف کے دسمبر نمبر میں انھوں نے اس ناموں کی الٹ پھیر کی آڑ پکڑ کر رسالہ اور اس کے فاضل تنقید نگار پر بوچھاڑ کی ہے۔"

اس کے بعد دوسرے صفحے پر نیا عنوان ہے "کھسیانی بلّی کھمبا نوچے"۔ یہ تحریر اڈیٹر کی طرف سے ہے۔ اس کا عنوان اور نفسِ مضمون غیر ضروری حد تک جا رہا ہے۔ اقتباس درج ذیل ہے [۱]:

"معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ معارف ایسی ایسی بھول چوک کی تاک ہی میں تھے رسالے کے فاضل اڈیٹر نے اپنے شذرات میں رسالہ اردو اور صاحبِ تنقید شعر العجم پر رکیک اور عامیانہ زبان میں حملہ کیا ہے جو ایک علمی پرچے کی شان سے بعید ہے اور بڑے فخر و نمود سے اس غلطی کا اظہار فرمایا ہے گویا تنقید شعر العجم کا جواب ہو گیا۔ ۔ ۔ مگر اس کا کیا علاج کہ یہ حضرات شیش محل میں رہ کر دوسروں پر پتھر پھینکتے ہیں۔ معارف کے پرچے (بابت ماہ دسمبر) میں تلخیص و تبصرہ کے تحت میں بوسٹن کے عجائب خانے کا حال درج ہے اور ہر جگہ بوسٹن کو انگلستان کا شہر بتایا ہے۔ حالاں کہ مدرسے کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ یہ شہر صوبہ جات متحدہ امریکہ میں واقع ہے۔ ۔ ۔ کیا ہم حضرت مسیح کے اس قول کی نقل کر سکتے ہیں جو معارف کے فاضل اڈیٹر نے اردو پر تعریض کرتے ہوئے نقل فرمایا ہے۔"

اس کے فوراً بعد شذراتِ معارف میں سید سلیمان ندوی جواب الجواب کے طور پر لکھتے ہیں [۲]:

"دسمبر کے معارف میں تنقید شعر العجم کے سلسلے میں ڈاکٹر اقبال اور پروفیسر اقبال کے تشابہہ پر رسالہ اردو کو جو ہم نے ٹوکا تھا اس نے اورنگ آباد سے لے کر علی گڑھ تک ایک آگ سی لگا دی، ایڈیٹر صاحب کی خفگی تو بجا تھی مگر مہتمم صاحب مطبع مسلم یونیورسٹی کی بوالفضولی سمجھ میں نہیں آئی، بہر حال معارف اور اردو کے شذرات ملک کے اربابِ علم و فہم کے سامنے ہیں اور وہ ان کو دیکھ کر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں میں کس کا معیارِ اخلاق بلند ہے؟ ۔ ۔ ۔ معارف کے ایک معمولی لیکن ذرا سے شذرے پر

---

[۱] ایضاً۔

[۲] معارف، جلد ۱۳، شمارہ ۲، فروری ۱۹۲۴ء، ص ۸۱۔

جس سے ملک کے متعدد اہل قلم کو باہمی الجھاؤ سے نجات مل گئی اردو کی اس برافروختگی کو دیکھ کر ہم کو بے اختیار ہنسی آتی ہے کہ وہ ایک معمولی گرفت سے اس قدر برہم ہے اور ان لوگوں کو صبر و رضا و تسلیم کی دعوت کرتا ہے جن کے ایک بزرگ کو طعن و طنز، لہجے کی درشتی اور تجہیل کے ساتھ وہ مہینوں سے یاد کر رہا ہے۔"

معارف کے اسی شمارے میں "شعر العجم اور عمر خیام" کے عنوان سے سید سلیمان ندوی کا ایک مقالہ بھی موجود ہے جس میں پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی کے ساتھ اس بحث میں پروفیسر محمد اقبال کی شرکت پر تنقید کی گئی ہے اور پھر یہ نکتہ بہ نکتہ پروفیسر اقبال کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے [1]۔ تمہیدی عبارت کے چند فقرے یہاں درج کیے جاتے ہیں [2]:

"کچھ دنوں سے رسالہ اردو (اورنگ آباد، دکن) میں شعر العجم پر ایک مسلسل تنقید نکل رہی ہے جس کی طرف پہلے اس لیے ہم نے توجہ نہ کی کہ یہ نقاد کی شعر العجم پر تنقید نہیں بلکہ مغربی مستشرقین کی مشرقی تذکرہ نویسوں پر تنقید ہے اور شعر العجم کا پردہ مضمون نگار نے صرف اس لیے رکھا ہے تاکہ 'طعنۂ نیکاں' کے وسیلے سے وہ اپنے 'اخلاق حسنہ' کی پردہ دری کر سکیں۔"

اس بحث کے بعد بھی رسالہ اردو اور معارف میں شعر العجم کا تذکرہ ہوتا رہا۔ مسٹر پسٹن جی بھاجی والا کی کتاب "مولانا شبلی اینڈ عمر خیام" (انگریزی) شائع ہوئی تو رسالہ اردو میں غالباً ہاشمی فرید آبادی نے اس پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا: [3]

---

[1] اس سے اگلے شمارے کے شذرات میں سید صاحب لکھتے ہیں: "پروفیسر اقبال میرے نیاز نامے کے جواب میں ارقام فرماتے ہیں کہ میں نے رسالہ اردو والا مضمون اشاعت کے ارادے سے نہیں لکھا تھا ورنہ اس کی عبارت اور ترتیب مختلف ہوتی۔ آپ نے اپنے مضمون سے اُردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے اور بدین وجہ اہلِ زبان کو میری نکتہ چینی کا مشکور ہونا چاہیے۔" (بحوالہ معارف جلد ۱۳، شمارہ ۳، مارچ ۱۹۲۴ء، ص ۱۶۲۔)

[2] سید سلیمان ندوی: "شعر العجم اور عمر خیام" مشمولہ معارف، جلد ۱۳، شمارہ ۲، ص ۸۲۔

[3] رسالہ اُردو، اپریل ۱۹۲۳ء، ص ۴۳۰۔

"انھوں نے مرحوم کے حالات لکھنے میں کافی محبت اور دردسری اٹھائی ہے اور انگریزی دانوں کو اسلامی ہند کے اس مشہور اہلِ قلم سے روشناس کیا ہے جس کی اردو میں بھی ابھی تک کوئی معقول سیرت نہیں لکھی گئی۔ مسٹر بھاجی والا کی یہ کوشش قابلِ شکرگزاری ہے لیکن ذوقِ تحقیق کا تقاضا تھا کہ وہ مصنفِ مرحوم کے مضمون کو جس کا ترجمہ کیا ہے اچھی طرح جانچ لیتے کیوں کہ مرحوم کی یہ کتاب تحقیق کے معیار پر قابلِ اصلاح پائی گئی ہے۔"

اِس کے برخلاف معارف کے صفحات میں شعر العجم کا ذکر اس انداز میں ملتا ہے:

"مولانا شبلی مرحوم کو اپنی زندگی میں شاید اپنی کتاب شعر العجم کی اس مقبولیت کا خیال بھی نہ آیا ہوگا کہ ایک طرف وہ پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران کا آخری ماخذ بنے گی اور دوسری طرف خود وہ ملک جس کی ادبی تاریخ اس میں لکھی گئی ہے اس کی اتنی قدر کرے گا کہ اس کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کا اہتمام کرے گا۔"[۱]

"مولانا شبلی مرحوم جب شعر العجم لکھ رہے تھے تو ان کو خیال بھی نہ تھا کہ وہ اتنی مقبول ہوگی کہ ایک طرف انگلستان کا سب سے بڑا مستشرق اس سے فائدہ اٹھائے گا اور دوسری طرف ایران وعجم کے مشاق اس سے بہرہ مند ہوں گے۔"[۲]

اس سلسلے میں قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ معارف اور دار المصنفین کو بہت جلد اندازہ ہوگیا کہ "تنقید شعر العجم" کسی فرمائش یا سازش کا نتیجہ نہیں بلکہ حافظ محمود خاں شیرانی کی سنجیدہ علمی کاوش ہے۔ "پنجاب میں اردو" منظر عام پر آئی تو معارف میں سید نجیب اشرف ندوی نے اس پر مقالہ تحریر کیا۔ اس مقالے میں شیرانی صاحب کے بعض نتائجِ تحقیق سے اظہار اختلاف کے پہلو بہ پہلو ان کے علم وفضل کا اعتراف بھی کیا گیا ہے۔ تنقید شعر العجم کے پس منظر میں دبستانِ شبلی کے ایک رکن کی طرف سے یہ الفاظ قابلِ توجہ ہیں:[۳]

"جناب پروفیسر محمود شیرانی صاحب آج سے چند سال قبل تک ادبی دنیا میں

۱۔ معارف، جلد ۴۶، شمارہ ۳، ستمبر ۱۹۴۱ء، ص ۱۶۴۔

۲۔ معارف، جلد ۳۹، شمارہ ۱، جنوری ۱۹۳۸ء، ص ۲۔

۳۔ سید نجیب اشرف ندوی: مقالہ "پنجاب میں اردو"، مشمولہ معارف، جلد ۲۲، شمارہ ۲، اگست ۱۹۲۸ء، ص ۹۱۔

بہت کم معروف تھے اور ان کی تنقید شعر العجم سے پہلے شاید پنجاب سے باہر ہندوستان کے بہت ہی کم لوگ ان کی وسعتِ تحقیق، فراوانیٔ معلومات اور خداداد علمیت و ذہانت سے واقف تھے۔ ۔ ۔ ۔ ان کا ایک ایک حرف نہایت افادی شوق اور طالب علمانہ ذوق سے پڑھا جاتا ہے۔ وہ جس چیز پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اس میں تحقیق و معلومات اور فلسفیانہ تنقید و نتائج کے دریا بہا دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر تحریر بہ خاص توجہ کے ساتھ دیکھی جاتی ہے۔"

اسی طرح حافظ محمود خاں شیرانی کے انتقال پر معارف میں "وفیات" کے زیرِ عنوان سید سلیمان ندوی کی ایک تحریر بھی توجہ طلب ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیس بائیس سال پہلے کی تنقید شعر العجم کو سید صاحب زیادہ بہتر پس منظر میں دیکھ رہے ہیں اور انھیں شیرانی مرحوم کی غیر جانب دارانہ علمی تنقید و تحقیق کا اعتراف ہے۔ سید صاحب کے الفاظ ہیں[1]:

"ہم کو ابھی تک اپنے ملک کے علما اور محققین کی پوری قدر نہیں ہوئی۔ کیسے افسوس کی بات ہے کہ ہماری قوم اور ملک کے ایک نامور محقق پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی کا انتقال ۱۶ر فروری ۱۹۴۶ء کو ٹونک میں ہو گیا اور ہم میں سے بہتوں کو اس کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ ۔ ۔ ۔ اس زمانے میں یورپ کے علمائے مشرقیات نے بعض شعرا پر جو مستقل مضامین لکھے ہیں یا کتب خانوں کی فہرستوں میں ان شعرا کے دواوین کے ضمن میں جو کچھ لکھا گیا ہے یا پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب میں ان منتشر معلومات کو جو یکجا کر دیا ہے پروفیسر شیرانی نے ان سب کو سامنے رکھ کر اپنی ذاتی تحقیقات کے بہت سے اضافوں کے ساتھ اس سلسلے کو لکھ کر فارسی ادب کی تاریخ کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔"

"ادیب" علی گڑھ، شبلی نمبر ۱۹۶۰ء میں شامل خط میں مولوی عبد الحق نے تنقیدِ شبلی سے متعلق اپنی جن تحریروں کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں چند مقدمے بھی شامل ہیں۔ مقدمہ "مثنوی خواب و خیال" میں مولوی صاحب نے حالی کے اس قیاس کی تصدیق کی ہے کہ مذکورہ مثنوی نواب مرزا شوق کا ماخذ تھی۔ اس سے قبل شبلی نعمانی تذکرہ گلشنِ ہند کے دیباچے میں اس خیال کی تردید کر چکے تھے۔

---

[1] معارف، جلد ۵۷، شمارہ ۴، اپریل ۱۹۴۶ء، ص ۳۱۲۔

ان مقدمات میں سے مقدمہ "حیات النذیر" بھی قابلِ توجہ ہے کیوں کہ اس میں مولوی صاحب نے شبلی نعمانی، ندوہ اور اس سے متعلق علمائے کے بارے میں نہایت تند و تیز زبان استعمال کی ہے۔ دو طرفہ اختلافی تحریروں میں یہ مقدمہ اسی سبب سے نمایاں ہے۔ مولوی نذیر احمد دہلوی کی کتاب "امہات الامہ" کی اشاعت پر علما اور عام مسلمانوں کی طرف سے جو ردِ عمل ہوا تھا اور جس طرح ۱۹۱۰ء میں ندوہ کے اجلاس منعقدہ دہلی میں اس کتاب کی کاپیاں نذرِ آتش کی گئیں، اس کا ذکر اس مقدمے میں نہایت جذباتی اور افسانوی انداز میں کیا گیا ہے۔ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے مقدمہ "مقدماتِ عبدالحق" میں اس کی پُرزور تردید کی ہے۔ لکھتے ہیں:[1]

"ندوۃ العلما کے ارکان و شرکا اس کے جلانے پر آخر تک آمادہ نہ تھے خود مولوی (نذیر احمد) صاحب مرحوم کی تحریک تھی۔ ۔ ۔ ۔ چنانچہ رسالے جلائے گئے، مٹی کا تیل لاکر دو بجے رات کو جس نے رسالوں پر ڈالا تھا، وہ میں ہی تھا۔"

مولوی عبدالحق کے اس مقدمے اور مولانا شروانی کی وضاحت کو سید سلیمان ندوی نے "معارف" جلد ۳۶، شمارہ ۴ اور حیاتِ شبلی میں موضوعِ بحث بنایا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اور تحریر "مقدمہ بر خطوطِ عطیہ بیگم صاحبہ" ہے۔ ظاہر ہے کہ ان خطوط کی اشاعت وابستگانِ ندوہ و دارالمصنفین کے لیے رنج کا باعث ہوئی ہوگی۔[2] مولوی صاحب اس مقدمے میں سید سلیمان ندوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:[3]

"مولانا کے ایک ارشد تلمیذ نے حال میں شعر العجم کے متعلق یہ تحریر فرمایا ہے کہ 'وہ واقعات کی کھتونی نہیں، حسن و عشق کی داستان ہے۔'[4] گویا واقعات (شاعر کی زندگی اور اس

---

[1] مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی؛ مقدمہ "مقدماتِ عبدالحق"، مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، پہلا پاکستانی اڈیشن، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۴ء۔

[2] محمد واصل عثمانی لکھتے ہیں: "حالی کی شاگردی اور علی گڑھ سے وابستگی نے عبدالحق کو شبلی کے خلاف ضرور اکسایا اور اس طرح وہ اپنی دلی آرزو کی تکمیل کے لیے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرتے رہے کہ شبلی کی حیاتِ معاشقہ اور رنگین زندگی کو اجاگر کیا جائے۔ (بحوالہ "شبلی ادیبوں کی نظر میں"، طبع اوّل، کراچی، صفیہ اکیڈمی، ۱۹۶۸ء، ص ۸۱۔)

[3] مولوی عبدالحق؛ مقدماتِ عبدالحق، (حصہ دوم)، مرتبہ مولوی مرزا محمد بیگ، حیدرآباد، مکتبہ ابراہیمیہ، ۱۹۳۱ء، ص ۱۰۰۔

[4] یہاں سید سلیمان ندوی کی تحریر "شعر العجم اور عمر خیام"، شمولہ معارف فروری ۱۹۲۴ء کی طرف اشارہ ہے۔

کی) شاعری پر کچھ اثر ہی نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ شعر العجم واقعات کی کھتونی بھی ہے اور حسن و عشق کی داستان بھی، لیکن وہ اگر ان خطوط کو دیکھتے (اور اگر دیکھا ہے تو غور نہیں فرمایا) کہ جس داستان کا تصور اُن کے ذہن میں تھا وہ شعر العجم میں نہیں ان خطوط میں ہے۔"

مقدمے کے اختتام پر لکھتے ہیں[۱]:

"آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ مولانا شبلی کی تصانیف کو ابھی سے لونی لگنی شروع ہو گئی ہے۔ زمانے کے ہاتھوں کوئی نہیں بچ سکتا، وہ بہت سخت مزاج ہے۔ مگر آخری انصاف اسی کے ہاتھ ہے۔ ان کی بعض کتابیں ابھی سے لوگ بھولتے جاتے ہیں اور کچھ مدت بعد صرف کتاب خانوں میں نظر آئیں گی لیکن بعض تصانیف ان کی ایسی ہیں جو مدتوں شوق سے پڑھی جائیں گی اور انھیں میں یہ خطوط بھی ہیں۔"

مولوی صاحب، مقدمات کے مرتب مرزا محمد بیگ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں[۲]:

"آپ عطیہ بیگم کے خطوط سے متردد نہ ہوں اس سے مولانا شبلی کی منقصت نہیں ہوتی۔ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ نرے خشک ملّا یا مولوی نہ تھے بلکہ لطیف انسانی جذبات بھی رکھتے تھے۔"

یہاں ایم مہدی حسن افادی الاقتصادی کے مشہور مضمون "حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک" سے ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے جس میں مولوی صاحب کی مقدمہ نگاری کے ایک خاص پہلو پر تبصرہ ہے۔ لکھتے ہیں[۳]:

"مولوی عبدالحق کے ذمہ دار قلم سے ٹپکی ہوئی سیاہی جس طرح پھیلی ہے ایک نظر دیکھنے کے لائق ہے۔ جس طرح ناممکن ہے کہ کسی ٹکسالی (اسٹینڈرڈ) کتاب پر اُن کا مقدمہ نہ ہو، یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی نہ کسی حیثیت سے حالی کی پاس داری میں یہ شبلی پر چوٹ نہ کرتے ہوں یعنی چشمک کے جراثیم اُن کے مقدمات میں اس کثرت سے ملیں گے کہ یہ امر ان کے

۱۔ مولوی عبدالحق: "مقدمات عبدالحق"، مرتبہ مولوی مرزا محمد بیگ، محولہ بالا، ص ۱۳۲۔

۲۔ ایضاً، مکتوب بنام مولوی مرزا محمد بیگ، پیش لفظ از مرتب، مشمولہ مقدماتِ عبدالحق، مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، محولہ بالا۔

۳۔ ایم مہدی حسن افادی الاقتصادی: افاداتِ مہدی، مرتبہ مہدی بیگم، طبع چہارم، لاہور، شیخ مبارک علی، ۱۹۴۹ء، ص ۳۱۱۔

لٹریچر کے خصائص کا ایک جزو ہو گیا ہے۔ پس یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ موقعے کی تاک میں رہتے ہیں اور اظہارِ خیال سے کبھی نہیں چوکتے۔ لیکن میں اگر غلطی نہیں کرتا تو یہ جو کچھ لکھتے ہیں نکتہ سنجانہ لکھتے ہیں یعنی شبلی کی تنقیص مقصود بالذات نہیں ہوتی۔"

رسالہ "الناظر" کی طرف سے، اردو کے سب سے بڑے انشا پرداز کا تعین کرنے کے لیے انعامی مقابلہ منعقد کیا گیا۔ بعد ازاں انعامی مضمون تبصرے کے لیے مولوی صاحب کو بھیجا گیا۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں[۱]:

"مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ آزاد کی اردو شاعرانہ، نذیر احمد کی عاصیانہ اور سوقیانہ اور حالی کی روکھی پھیکی ہے۔ اردو میں اگر کوئی اعلا ادیب اور انشا پرداز ہوا ہے تو وہ شبلی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا فیصلہ بائع نظر ادیبوں کی نظر میں کیا وقعت رکھ سکتا ہے۔"

مولوی صاحب کی اخیر عمر کا ایک خط بنام مولوی حاجی محمد مقتدیٰ خاں شروانی پیش نظر ہے۔ مکتوب الیہ کو ان کے ایک مضمون کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں[۲]:

"آپ کا مضمون 'علی گڑھ میں شبلی کا قیام' پڑھا۔ سبحان اللہ کیا خوب لکھا ہے۔ جزاک اللہ! کیا چھپی چوریاں پکڑی ہیں۔ یہ اس قابل ہے کہ 'حیاتِ شبلی' کے اخیر میں بطور ضمیمہ شائع کیا جائے۔ اگر مولوی سلیمان زندہ ہوتے اور اس مضمون کو پڑھتے تو ان کے قلب کی حرکت بند ہو جاتی۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ کوئی بات خلافِ واقعہ نہیں ہے۔ آپ نے حق گوئی کا حق ادا کر دیا اور ان باتوں کو صاف صاف بیان کر دیا جن پر عمداً پردہ پڑا ہوا تھا۔

مولانا شبلی نے سرسید کو بدنام کرنے کے جو طریقے اختیار کیے تھے وہ بہت گھٹیا تھے اور افسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ایسے عامیانہ طریقے کیوں اختیار کیے ہیں۔ اصل بات ظرف کی ہے۔"

۱۔ مولوی عبدالحق: "ادبی تبصرے"، طبع اول، لکھنؤ، دانش محل، ۱۹۴۷ء، ص ۶۸۔

۲۔ خط مولوی عبدالحق بنام مولوی محمد مقتدیٰ خاں شروانی، مرقومہ ۱۷ فروری ۱۹۵۸ء، مشمولہ اردو، بابائے اردو نمبر، ۱۹۶۲ء، ص ۳۶۵۔ (مولوی مقتدیٰ خاں کا مذکورہ مضمون "البصیر" کے شبلی نمبر میں شائع ہوا ہے۔)

"قومی زبان" کراچی کے ابتدائی شماروں میں ادارے کی طرف سے "مشاہیرِ اردو" کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا۔ مولانا شبلی نعمانی پر تحریر کیے گئے مضمون میں ایک ذیلی عنوان ملتا ہے۔ "معاصرانہ چشمک" اس کے تحت یہ عبارت آتی ہے[۱]:

"سرسید اور آزاد جس بزم ادب کے رُکن تھے اُسی کے شبلی بھی ہیں۔ گو یہ سب کے بعد پہنچے لیکن پیچھے نہیں بیٹھے۔ اور اگرچہ ابتدا میں اپنے معاصرین کے ادبی کارناموں کو سراہتے رہے لیکن بتدریج معاصرانہ چشمک کا جذبہ بڑھتا رہا۔ اور آخر میں تو قلم میں زیادہ گرمی پیدا ہو گئی۔"

دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ترجمان "معارف" اور انجمن ترقیِ اردو کے ترجمان "اردو" اور "قومی زبان" میں چھپنے والے کتابوں اور رسالوں کے تبصرے بھی ہمارے مطالعے کا حصہ ہیں۔ رسالہ اردو میں سید سلیمان ندوی کی کتابوں پر تبصرے ملتے ہیں۔ "عربوں کی جہاز رانی" پر تبصرہ رسالہ اُردو جولائی ۱۹۳۸ء میں موجود ہے۔ اس میں مذکورہ کتاب کے اس دعوے کی تردید کی گئی ہے کہ عرب میں جہاز رانی کا آغاز عہد جاہلیت میں ہوا۔ مبصر نے ایک آیت کی تشریح میں سہو کی نشان دہی بھی کی ہے۔ "قومی زبان" کراچی کے ایک شمارے میں "معارف" کی نزدیکی اشاعت میں شائع شدہ ایک "شکوے" کا جواب ان الفاظ میں دیا گیا ہے[۲]:

"نئی مطبوعات کے ضمن میں قومی زبان کا بھی ذکر آگیا ہے۔ لائق مدیر تحریر فرماتے ہیں کہ 'اردو زبان کو یہ شکایت کرنے کا حق ہے کہ اُسے ہندوستان میں بے یار و مددگار چھوڑ کر (انجمن ترقیِ اردو کا) پاکستان کی راہ لینا آئینِ وفا سے بعید ہے، بے چارے غالب کو تو یہ شکایت تھی کہ جن کی خاطر گھر بار لٹا یا تھا وہی بے خانماں ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہندی دوست شاعر کے خیالی معشوق سے آگے بڑھ گئے کہ گھر لوٹ کر دیس نکالا دیا اور اب خود ہی بے وفائی کا الزام دے رہے ہیں۔ کیا یہ بھی ستم کا کوئی نیا پیرایہ ہے۔"

۱۔ "قومی زبان"، جلد ۲، شمارہ ۶، اگست ۱۹۴۹ء، ص ۵۔

۲۔ "قومی زبان"، جلد ۱ شمارہ ۳/۷، مارچ ۱۹۴۹ء، ص ۲۔

"معارف" میں بابائے اُردو اور انجمن ترقی اردو کی بیشتر تصانیف پر تبصرے موجود ہیں۔ ان تحریروں میں تعریفی و توصیفی انداز بھی ہے اور اختلافی و تنقیدی نکات بھی۔ مثنوی "خواب وخیال" مرتبہ مولوی عبدالحق پر تبصرے میں یہ انداز اختیار کیا گیا ہے[۱]: "شروع میں جناب مرتب کا ایک مقدمہ ہے جو ہر حیثیت سے تشنۂ بیان ہے۔۔۔ قدر شناسانِ اُردو کو انجمن ترقی اردو کا شکر گذار ہونا چاہیے کہ اُس نے اس گراں قیمت متاع کو وقفِ عام کر دیا۔" قواعدِ اردو از مولوی عبدالحق (طبع دوم) پر تبصرے کے الفاظ ہیں[۲]: "شاید جناب مؤلف نے ان تنقیدوں پر زیادہ توجہ نہیں کی جو طبع اول پر شائع ہوئی تھیں۔ بہر حال وہ اس وقت اردو کی معیاری کتابوں میں ہے۔" پندرہ روزہ "ہماری زبان" پر تبصرہ کرتے ہوئے مبصر اردو زبان کے خلاف ہونے والی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں[۳]:

"مسلمانوں کے پاس اس کے مقابلے کے لیے زبانی شور و غل کے سوا کچھ نہیں ہے۔ لے دے کے ایک انجمن ترقی اردو اپنی بساط کے مطابق عملاً مقابلہ کر رہی ہے۔ اسی غرض سے اس نے یہ پندرہ روزہ اخبار نکالا ہے۔۔۔۔ اس سے مخالفین اردو کی تخریبی سرگرمیوں اور انجمن ترقی اردو کی مدافعانہ اور تعمیری کارگذاریوں کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔"

رسالہ "جوہر" دہلی کے عبدالحق نمبر پر تبصرے سے اقتباس یہ ہے[۴]:

"انجمن اتحاد جامعہ کے رسالے "جوہر" نے مولوی عبدالحق صاحب انجمن ترقی اردو کی سترویں سال گرہ کی تقریب میں یہ خاص نمبر نکالا ہے۔ جس کی ممدوح کی ذات بجا طور پر مستحق ہے۔ "جوہر" نے یہ نمبر نکال کر اردو کے خدمت گذاروں کی جانب سے محسن شناسی کا ثبوت دیا ہے۔"

"سرسید احمد خاں" از مولوی عبدالحق پر معارف کا تبصرہ بھی قابل توجہ ہے[۵]:

۱۔ "معارف"، جلد ۱۹، شمارہ ۴، اپریل ۱۹۲۷ء، ص ۳۱۸۔

۲۔ "معارف"، جلد ۱۹، شمارہ ۶، جون ۱۹۲۷ء، ص ۴۸۰۔

۳۔ "معارف"، جلد ۴۴، شمارہ ۲، اگست ۱۹۳۹ء، ص ۱۵۳۔

۴۔ "معارف"، جلد ۴۶، شمارہ ۲، اگست ۱۹۴۰ء، ص ۱۴۷۔

۵۔ "معارف"، جلد ۸۶، شمارہ ۳، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۲۳۶۔

"سرسید مرحوم کے بعض مذہبی افکار و عقائد سے اختلاف کے باوجود ان کے قومی، علمی، تعلیمی اور اصلاحی کارناموں سے انکار نہیں کیا جاسکتا...... مصنف سرسید کی مجلسوں اور صحبتوں میں شریک رہ چکے ہیں، اس لیے بڑی خوبی سے ان کے سیرت و کردار کی مصوری کی ہے مگر چوں کہ تمام تر عقیدت و محبت کے جذبات میں ڈوبے ہوئے ہیں، اس لیے ان کا ایک ہی پہلو دکھایا ہے۔"

تبصروں کے علاوہ معارف کے شذرات میں بھی بابائے اُردو اور انجمن ترقی اردو کا تذکرہ ملتا ہے۔ چند شذرات کا حوالہ پہلے آچکا ہے۔ یہاں موضوع کی ضرورت کے لحاظ سے چند اقتباسات مزید پیش کیے جاتے ہیں۔ "معارف" کے ایک شمارے میں اردو انسائیکلو پیڈیا کی تجویز کے ضمن میں سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں[1]:

"امید ہے کہ اہلِ نظر اور اس کام سے دل چسپی رکھنے والے ہندو مسلمان اصحاب اپنے خیالات سے مستفید فرمائیں گے۔ اس ذیل میں مولوی عبدالحق صاحب بی اے (اورنگ آباد) ڈاکٹر سر محمد اقبال، الشیخ عبدالقادر صاحب بی اے (لاہور)...... سے خصوصیت کے ساتھ التفات و توجہ کی درخواست ہے۔"

ہندوستانی اکیڈمی صوبہ متحدہ کی چوتھی ادبی کانفرنس کا اجلاس الٰہ آباد میں منعقد ہوا۔ مولوی عبدالحق نے اجلاس کے شعبۂ اردو کی صدارت کی اور خطبہ دیا۔ اس خطبے کے ضمن میں "معارف" نے مولوی صاحب سے اس طرح اپنی شکایت کا اظہار کیا[2]: "اگر اردو کی پچھلی اور موجودہ ترقیوں کے ضمن میں ذکر نہیں آیا تو اس شخصیت کا جس نے اس قابلِ مثال انجمن ترقی اردو کی بنیاد ڈالی۔" مگر اس کے ساتھ ہی ایک شذرے میں یہ انداز بھی موجود ہے[3]: "ہمارے مخدوم مولوی عبدالحق صاحب اردو کی جو جواں مردانہ خدمت کر رہے ہیں وہ اردو کے ہر حامی کے شکریہ کی مستحق ہے۔"

اس دوطرفہ مطالعے کے اختتام سے قبل تین اہم تحریروں کا تذکرہ ضروری ہے۔ ۱۔ رسالہ "جوہر" عبدالحق نمبر کے لیے سید سلیمان ندوی کا پیغام۔ ۲۔ سید صاحب کے انتقال پر "قومی زبان" کا تعزیتی نوٹ۔ ۳۔ مولوی صاحب کی وفات

---

[1] "معارف"، جلد ۱۹، شمارہ ۲، فروری ۱۹۲۷ء، ص ۸۷۔
[2] "معارف"، جلد ۳۷، شمارہ ۲، فروری ۱۹۳۶ء، ص ۸۳۔
[3] "معارف"، جلد ۴۴، شمارہ ۶، دسمبر ۱۹۳۹ء، ص ۴۰۴۔

پر "معارف" کا تعزیتی شذرہ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے رسالے "جوہر" میں سید سلیمان ندوی کی یہ تحریر موجود ہے:[1]

"ملک کے پورے طول و عرض میں، جس میں اردو زبان کے بولنے والوں کی تعداد کروڑوں سے بڑھی ہوئی ہے، اس کی خدمت کرنے والوں کی تعداد اگر مولوی عبدالحق نہ ہوتے تو صفر ہوتی۔ وہ پیری میں بھی ہمت سے کام کر رہے ہیں اور اپنے قلم قدم اور درم سے اس کی ترقی کی یادگار کوششیں کر رہے ہیں۔ انھوں نے سادہ نگاری کو ترقی دی، نقد و تبصرے کی نئی راہ نکالی، اردو کی تاریخ کئی سو سال آگے بڑھادی، ادب اور تاریخ ادب پر تحقیقی مضمون لکھے، اردو کے قواعد کو نئے سرے سے مرتب کیا، اردو لغت، اردو تذکرے، اردو کے پرانے دیوان اور اردو میں نئے علوم کی عمدہ کتابیں چھپوائیں اور لکھوائیں اور انجمن ترقی اردو کو ہر حیثیت سے وہ ترقی دی کہ آج وہ ملک کا زندہ ادارہ ہے۔"

سید سلیمان ندوی کے انتقال (۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء) پر "قومی زبان" نے "آہ! مولانا سید سلیمان ندوی" کے عنوان سے ایک تعزیتی تحریر شاملِ اشاعت کی۔ اس میں سید صاحب کی دینی و علمی خدمات کا اعتراف بھی ہے اور ان کے زہد و تقویٰ کا تذکرہ بھی۔ اقتباس درج ذیل ہے[2]:

"موصوف کا انتقال علمی و ادبی دنیا کا ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اپنے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے اعتبار سے سید صاحب کی ذات پاکستان و ہند ہی نہیں پوری دنیائے اسلام کے لیے شمعِ ہدایت کی حیثیت رکھتی تھی۔ سید صاحب کے علمی کارنامے اور ان کی ادبی خدمات اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔۔۔۔۔ علمی دنیا ان کے احسانات سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔۔۔۔

آں را کہ جاہ و مسندِ شاہی نہ داشتہ ایں فضل بس کہ نقشِ سلیمان گذاشتہ"

---

[1] سید سلیمان ندوی: "جوہر" عبدالحق نمبر، دہلی مکتبہ جامعہ، مارچ ۱۹۴۰ء، ص ۱۴۔ (یہی پیغام بعد ازاں ماہ نامہ "الشجاع" کراچی، عبدالحق نمبر، ۱۹۵۹ء اور "بابائے اردو، احوال و افکار" از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، میں بھی شائع ہوا۔)

[2] قومی زبان، کراچی، جلد ۴، نمبر ۲۳، یکم دسمبر ۱۹۵۳ء، ص ۳۔

اسی طرح بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی وفات پر "معارف" نے شذرات میں ان کی علمی و ادبی خدمات کا تذکرہ کیا اور ان کے انتقال کو دنیائے اردو کا سب سے بڑا حادثہ قرار دیا۔ مذکورہ تحریر سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے[1]:

"بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کی وفات دنیائے اردو کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ علمی اور ادبی حیثیت سے اُردو کے خدمت گذاروں کی کمی نہیں ہے لیکن جس نے ہر پہلو سے اس کی خدمت کی اور اس کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی اور اس کی راہ میں اپنا تن من دھن سب نثار کر دیا وہ تنہا مولوی عبدالحق کی ذات تھی، مولوی صاحب مرحوم سے پہلے اردو کی خدمت کا دائرہ محض اردو کی انفرادی علمی و ادبی تصانیف تک محدود تھا، اجتماعی کوشش اور تاریخی، لسانی اور سیاسی حیثیت سے اس کی خدمت کی صرف بنیاد پڑی تھی، مولوی صاحب نے اس کا عظیم قصر تعمیر کر دیا اور اُردو کی خدمت کی ایک عام لگن پیدا کر دی، ان کی خدمات اردو کی تاریخ میں ناقابلِ فراموش ہیں اور جب تک اردو زبان باقی ہے اُن کا نام بھی زندہ و پائندہ رہے گا۔۔۔۔ اگر انجمن ترقی اردو نہ ہوتی تو اردو کو علمی زبان بننے میں بڑی دیر لگتی۔۔۔۔ مولوی صاحب کو اردو سے والہانہ عشق تھا۔ انھوں نے اس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا، ان کو سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے اسی کی دھن رہتی تھی۔۔۔۔ پاکستان میں بھی ان کو اردو کے لیے جنگ کرنا پڑی اور آخر تک لڑتے رہے۔ اُردو کے مسئلے میں پاکستان میں جو کامیابی بھی ہوئی اس میں دوسرے حامیانِ اردو کی تائید و حمایت کے ساتھ مولوی صاحب کی کوششوں کو بھی بڑا دخل ہے۔۔۔۔ خالص علمی اور ادبی حیثیت سے بھی ان کی خدمات گراں قدر ہیں۔۔۔۔ وہ صاحبِ طرز ادیب تھے۔ ان کی تحریر سادگی و سلاست میں سہل ممتنع کی حیثیت رکھتی ہے اور سادگی کے باوجود خوش گوار ادبی چاشنی سے خالی نہیں ہوتی۔۔۔۔ اب اُردو کے ایسے باعمل فدائی نہ پیدا ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے۔"

دبستانِ شبلی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کے مابین تعلقات و مراسم کی یہ روداد ہماری ادبی تاریخ کا

---

[1] شاہ معین الدین احمد ندوی: شذرات مشمولہ "معارف"، جلد ۸۸، شمارہ ۳، ستمبر ۱۹۶۱ء، ص ۱۶۲۔

ایک حصہ ہے۔ اس سلسلے کی دوطرفہ تحریروں میں طنز بھی ہے اور تنقید بھی، شکوہ وشکایت بھی ہے اور باہمی رنجش کا اظہار بھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ تحریریں بھی موجود ہیں جن میں ایک دوسرے کے علمی، ادبی اور شخصی کمالات کا اعتراف بھی کیا گیا ہے۔ اس جائزے میں دونوں رُخ پیش کیے گئے ہیں، جنھیں دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ اکثر اوقات اختلافات کی خلیج محض معمولی غلط فہمیوں کے سبب وسیع ہوئی۔ اگر چھوٹی چھوٹی باتوں سے صرفِ نظر کیا جاتا یا ردِ عمل کے اظہار میں احتیاط و توازن کا دامن تھاما جاتا تو یقیناً یہ صورت پیش نہ آتی۔ اس جائزے کا مثبت پہلو یہ ہے کہ تمام تر ذاتی و شخصی اختلافات کے باوجود ملّت کی خیر خواہی اور اردو کی ترقی کے لیے سب کے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے۔ علی گڑھ، جامعہ عثمانیہ اور انجمن ترقی اردو ہو یا ندوۃ العلماء، شبلی اکیڈمی اور دار المصنفین، اردو زبان کی ترقی و ترویج کے معاملے میں سب کا خلوص ہر قسم کے شک و شبہے سے بالاتر ہے۔

کتابیات:

۱۔ آفتاب احمد صدیقی ردولوی، ڈاکٹر: شبلی ایک دبستان، ڈھاکہ، مکتبہ عارفین، مئی ۱۹۷۰ء۔

۲۔ سلیمان ندوی، السید: حیاتِ شبلی، طبع سوم، اعظم گڑھ، دار المصنفین، ۱۹۷۹ء۔

۳۔ سلیمان ندوی، السید: مکتوباتِ سلیمانی حصہ اوّل، مرتبہ مولانا عبدالماجد دریابادی، لکھنؤ، صدقِ جدید بک ایجنسی، ۱۹۶۳ء۔

۴۔ سلیمان ندوی، سید: یادِ رفتگاں، کراچی، مکتبۃ الشرق، جنوری ۱۹۵۵ء۔

۵۔ عبدالحق، مولوی، ڈاکٹر: ادبی تبصرے، طبع اول، لکھنؤ، دانش محل، ۱۹۴۷ء۔

۶۔ عبدالحق، مولوی، ڈاکٹر: مقدماتِ عبدالحق حصہ دوم، مرتبہ مولوی مرزا محمد بیگ، حیدرآباد، مکتبہ ابراہیمیہ، ۱۹۳۱ء

۷۔ عبدالحق، مولوی، ڈاکٹر: مقدماتِ عبدالحق، مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۴ء۔

۸۔ عبداللطیف اعظمی: شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، کراچی، صفیہ اکیڈمی، اکتوبر ۱۹۶۷ء۔

۹۔ محمد اکرام، شیخ، ڈاکٹر: یادگارِ شبلی، طبع اوّل، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۱ء۔

۱۰۔ معین الرحمٰن، سید، ڈاکٹر: بابائے اردو احوال و افکار، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء۔

۱۱۔ مہدی الافادی (مہدی حسن افادی الاقتصادی) : افاداتِ مہدی، مرتبہ مہدی بیگم، طبع چہارم، لاہور، شیخ مبارک علی، ۱۹۴۹ء۔
۱۲۔ واصل عثمانی، محمد: شبلی ادیبوں کی نظر میں، طبع اوّل، کراچی، صفیہ اکیڈمی، نومبر ۱۹۶۸ء۔
۱۳۔ واصل عثمانی، محمد: شبلی نقادوں کی نظر میں، طبع اول، کراچی، صفیہ اکیڈمی، اکتوبر ۱۹۶۷ء۔

رسائل:

۱۔ اردو اورنگ آباد/ دہلی/ کراچی، متفرق شمارے۔
۲۔ ادیب، علی گڑھ، شبلی نمبر ستمبر ۱۹۶۰ء۔
۳۔ الشجاع، کراچی، عبدالحق نمبر، ۱۹۵۹ء۔
۴۔ جوہر، دہلی، عبدالحق نمبر، مارچ ۱۹۴۰ء۔
۵۔ قومی زبان، کراچی، متفرق شمارے۔
۶۔ معارف، اعظم گڑھ، متفرق شمارے۔

ڈاکٹر محمد صدیق شبلی (پاکستان)

مولوی عبدالحق کی قواعد نویسی

اردو قواعد نویسی کی دو واضح روایتیں ملتی ہیں۔ ایک یورپی اور دوسری عربی۔ یورپ میں بارہویں تیرہویں صدی میں برصغیر کی زبانوں کے علمی مطالعہ کا آغاز ہوا۔ اردو بھی زیر مطالعہ زبانوں میں شامل تھی۔ جرمن، فرانسیسی، ولندیزی اور انگریز علمائے لسانیات نے اردو قواعد کی کتابیں تحریر کیں۔ ان کتابوں کا بڑا مقصد تبلیغ یا تجارت کے لیے ہندوستان جانے والوں کو قواعد کے ذریعہ اردو سکھانا تھا۔ یہ تمام کوششیں اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں لیکن ہر یورپی قواعد نویس نے اپنی زبان کے حوالے سے قواعد لکھے اور اس طرح اپنی زبان کے بہت سے غیر متعلق مباحث کو قواعد میں داخل کرلیا جس کی وجہ سے یہ کتب اردو قواعد کا اچھا نمونہ نہیں بن سکیں۔ عربی قواعد نویسی کے ارتقا میں ایرانیوں کا حصہ بڑا وقیع ہے۔ عربی قواعد کا جو سانچا بنا اس کا اطلاق فارسی پر بھی کیا گیا اور اردو بھی ایک مدت تک عربی قواعد کے شکنجوں میں کسی جاتی رہی اور عربی فارسی علما اس پر ستم ڈھاتے رہے۔ اس طرح ان کے ہاتھوں اردو قواعد متعلق و غیر متعلق بحثوں کا مجموعہ بن کر رہ گئی۔ اردو قواعد کے سرمایے میں انشا کی دریائے لطافت غنیمت معلوم ہوتی ہے۔ انشا نے اردو کو ایک مستقل زبان قرار دے کر اس کے اپنے قواعد پر زور دیا ہے اور اسے فارسی اور عربی کا تتمہ نہیں سمجھا۔ انشا کے اس موقف کی بدولت دریائے لطافت بہت سی غیر ضروری بحثوں سے محفوظ رہی لیکن اس کتاب سے بطور قواعد اردو زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ اس کی بڑی وجہ شاید یہ ہے کہ اس میں کتب قواعد کی جامعیت اور متانت نہیں ملتی۔ پھر یہ کتاب فارسی میں لکھی گئی۔ اس میں کچھ ایسے موضوعات بھی زیر بحث آئے ہیں جو اس سے پہلے یا بعد قواعد کی کتابوں کا موضوع نہیں بن سکے۔ ان سب کتابوں میں مولوی عبدالحق کی قواعد اردو ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے انھوں نے اس کتاب میں عربی کا تتبع کیا نہ سنسکرت کا اور انگریزی قواعد کی پیروی میں بھی حد سے آگے نہیں بڑھے۔ انھوں نے ان تینوں سرچشموں سے استفادہ ضرور کیا ہے۔

قواعد کا تعلق بنیادی طور پر زبان ہی سے ہوتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ قواعد کا موضوع کون سی زبان ہے بول چال کی یا تحریری، قواعد نویسوں کی ایک غالب اکثریت نے تحریری زبان ہی کو اپنا موضوع بنایا ہے اور انھوں نے مثالیں نظم و نثر ہی سے پیش کی ہیں۔ مولوی صاحب اس سلسلہ میں بول چال کی زبان کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے۔ "اس لیے زندہ زبان کے قواعد نویس کو سب سے اوّل بول چال کا خیال رکھنا چاہیے اور اسی سے قاعدے بنانے چاہئیں۔ قواعد میں اول درجہ آواز کا ہے اس کے بعد حروف کا پہلے بول چال ہے اور بعد میں تحریر۔" [۱]

اردو کے جدید ترین قواعد نویس بھی اسی موقف پر قائم ہیں [۲] وہ بھی بول چال کی زبان کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے مولوی صاحب جدید ترین قواعد نویسوں میں جگہ پاتے ہیں۔

کلاسیکی قواعد نویسی کی غرض و غایت یہ رہی ہے کہ زبان کے معیاری نمونوں کے حوالے سے زبان کے قواعد مرتب کیے جائیں اور ان قواعد کے ذریعہ معیاری زبان کو محفوظ کرنے کی کوشش کی جائے اس طرح قواعد کا شمار (NORMATIVE SCIENCES) معیاری علوم میں ہوتا رہا ہے۔ بعض قواعد یہ بتاتے رہے کہ زبان "کیسی ہونی چاہیے"۔ لیکن اب قواعد کا یہ تصور بدل چکا ہے۔ اور اس کے ذریعہ زبان کے اصولوں کی سائنسی تشریح کی جاتی ہے اس تصور کے مطابق زبان "کیسی ہونی چاہیے" کے بجائے زبان کی تشریح "جیسی کہ وہ ہے" کے مطابق کی جاتی ہے اور بولی جانے والی زبان کے اختلافات زیر بحث لائے جاتے ہیں جدید قواعد نویس معیاری زبان کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک زبان کی تبدیلیاں زیادہ اہم ہیں اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مولوی صاحب کی قواعد اردو بھی کتب قواعد کے کلاسیکل زمرہ ہی میں آتی ہے کیوں کہ اس کتاب کے لکھنے سے ان کا مقصد لوگوں میں معیاری اردو زبان کے قواعد کا شعور پیدا کرنا تھا چناں چہ فرماتے ہیں "اردو زبان اب ملک کی عام اور مقبول زبان ہو گئی ہے اور ملک میں اکثر جگہ بولی جاتی ہے اور ہر جگہ سمجھی جاتی ہے۔ ملک کی دوسری زبانیں خاص خاص خطوں میں محدود اور مخصوص ہیں نیز اس زبان کو کچھ ایسے مقامات کے لوگ بھی پڑھتے اور سیکھتے ہیں جن کی یہ مادری زبان نہیں۔ اس لیے ضرورت واقع ہوئی کہ اس زبان کے قواعد منضبط کیے جائیں [۳] اور مستند کتابیں لغت پر لکھی جائیں تاکہ زبان بگڑنے سے محفوظ رہے۔ قواعد اردو کا آغاز ہجا سے ہوتا ہے اس فصل میں اردو حروف کی تعداد، ان کی اصل وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ مولوی صاحب نے اردو کی ہائیہ آوازوں کے بارے میں بہت اہم بات

کہی ہے وہ انھیں دو سادہ آوازیں قرار دیتے ہیں جو مل کر ایک ہو گئی ہیں جدید قواعد نویس بھی اردو کی ہائیہ آوازوں کو مفرد آوازیں سمجھتے ہیں حالاں کہ ایک مدت تک انھیں مرکب آوازیں سمجھا جاتا رہا ہے مولوی صاحب نے اردو حروف کی کل تعداد پچاس لکھی ہے ان میں ہائیہ آوازیں بھی شامل ہیں۔ مولوی صاحب عربی حروف تہجی کو اردو میں رکھنے کے حق میں تو ہیں لیکن بول چال کی زبان میں ان حروف کے صحیح تلفظ پر انھیں اصرار نہیں ہے۔ اعراب (حرکات وسکنات) کے بارے میں بھی انھوں نے بہت کام کی باتیں لکھی ہیں۔ ہمارے قواعد نویس اس موضوع پر عربی فارسی اصطلاحوں کی توضیح کو کافی سمجھتے آئے ہیں۔ لیکن مولوی صاحب نے اردو کے خاص مسائل کے حوالے سے ان پر بحث کی ہے۔ ہمزہ کی بحث عربی فارسی میں بڑی پیچیدہ بحث ہے اس کے حرف یا حرکت ہونے پر اختلاف پایا جاتا ہے اور مولوی صاحب بھی اسے حروف میں شامل کرنے میں متامل ہیں۔ ان کے خیال میں ہمزہ ی اور واو کے ساتھ وہی کام دیتا ہے جو مد الف کے ساتھ۔ بعض جگہ یہ، ی کا قائم ہوتا ہے اور کبھی عربی الفاظ میں خفیف الف کی آواز دیتا ہے۔ یائے معدولہ کی دریافت مولوی صاحب کا لسانی اجتہاد ہے اس بحث میں بابائے اردو نے اردو صوتیات کی اصطلاحات برتے بغیر بہت سے سوالوں کا جواب دے دیا ہے اگرچہ یہ موضوع دریائے لطافت یا بعض جدید قواعد کی کتابوں کی طرح مفصل نہیں ہے پھر بھی مولوی صاحب اردو قواعد کے سلسلہ میں اپنے معاصرین کے مقابلہ میں زیادہ جدید ہیں۔

قواعد اردو میں صرف کا آغاز مستقل اور غیر مستقل الفاظ سے کیا گیا ہے اسم، صفت، ضمیر، فعل، تمیز کو مستقل الفاظ کے تحت اور حروف کو غیر مستقل کے تحت رکھا گیا ہے۔ اردو قواعد نویس عربی کی پیروی میں کلمہ کو اسم، فعل اور حرف میں تقسیم کرتے چلے آئے ہیں۔ اور کلمہ کی تمام اقسام کو ان تینوں کے تحت زیر بحث لاتے رہے ہیں مولوی صاحب نے اردو کے مزاج کا خیال کرتے ہوئے اس تقسیم کو رواج دینے کی کوشش کی۔ ان کے بعد لکھی جانے والی قواعد کی بیشتر علمی کتابوں میں تقسیم کے اسی اصول کو اپنایا گیا ہے قواعد کی درسی کتابیں البتہ اب تک اسم، فعل اور حرف کی تقسیم پر کاربند رہیں جدید فارسی قواعد نویسوں نے کلمہ کی تقسیم کو زیادہ سہل بنانے کی کوشش کی تھی، ان کے نزدیک کلمہ کی اقسام مندرجہ ذیل ہیں۔

اسم، فعل، صفت، عدد، کنایہ، قید، حرف، اور صوت، کنایہ میں ضمیر، اشارہ اور استفہام وغیرہ کو شامل کیا جاتا ہے۔ قید میں ADVERB یا متعلق فعل کی مختلف صورتیں زیر بحث آتی ہیں۔ مولوی

صاحب نے اسم کی بحث میں جنس، تعداد اور حالت کو لوازم اسم قرار دے کر روایتی طریقہ سے انحراف کیا ہے۔ جنس میں تذکیر و تانیث، تعداد میں واحد جمع اور حالت میں فاعلی، مفعولی، ندائی خبری، اضافی اور طوری حالتوں کا ذکر کیا ہے۔ اسم کی حالت دراصل نحو کا موضوع ہے اس لیے یہاں اسے اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مولوی صاحب نے فعل پر جو لکھا ہے۔ وہ قدیم قواعد سے کافی مختلف ہے اور ان کی قواعد اردو کا یہ حصہ بہت جاندار ہے وہ اسم کی طرح فعل کے بعض لوازم کے بھی قائل ہیں ان کے خیال میں لوازم فعل مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) جنس (۲) تعداد (۳) طور (۴) صورت (۵) زمانہ

جنس میں فعل کی تذکیر و تانیث، تعداد میں واحد جمع، طور میں معروف و مجہول آجاتے ہیں۔ خبری، شرطی، احتمالی، امری اور مصدری فعل کی پانچ صورتیں بتائی گئی ہیں۔ پہلے قواعد نویس شرطی اور احتمالی کا ذکر صرف ماضی کے حوالے سے کرتے تھے۔ امر ان کے نزدیک ایک باقاعدہ فعل تھا خبر اور مصدر کا ذکر وہ فعل کے حوالے سے نہیں کرتے تھے۔ فعل کی مصدری صورت مولوی صاحب کے ہاں بھی قدرے مبہم ہے۔ زمانے کے حوالے سے فعل کو ماضی حال اور مستقبل میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مولوی صاحب نے فعل کی بحث میں حالیہ پر بھی روشنی ڈالی ہے اور حالیہ ناتمام، حالیہ تمام اور حالیہ معطوفہ اس کی تین اقسام بتائی ہیں۔ حالیہ، غالباً PARTICIPLE کا ترجمہ ہے اردو میں حالیہ کی وہ حیثیت نہیں جو انگریزی میں ہے حالیہ تمام ماضی مطلق، واحد غائب کے سوا کچھ نہیں۔ حالیہ ناتمام کو پرانے قواعد کی رو سے ماضی تمنائی کہہ سکتے ہیں۔ اور یہی کیفیت حالیہ معطوفہ کی ہے جسے فعل معطوف بھی کہا گیا ہے۔ مولوی صاحب نے بعض افعال کے نام بھی نئے رکھے ہیں۔ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ماضی تمام (ماضی بعید) ماضی ناتمام (ماضی استمراری) حال قدیم (مضارع) حال مطلق (حال)، حال ناتمام (جاری)، حال تمام (ماضی قریب) حال احتمالی۔ علمی اعتبار سے یہ سارے نام بالکل درست ہیں لیکن درسی کتابوں میں ابھی تک پرانے نام ہی چل رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے اردو افعال کے صیغوں پر بڑی محنت اور تفصیل سے روشنی ڈالی ہے لیکن چو نیکو دانے اپنی کتاب اردو کے صیغے میں ان کی جو تفصیل دی ہے۔ وہ مولوی صاحب کے ہاں نہیں ملتی قواعد کی قدیم کتابوں میں افعال مصدر سے بنتے تھے لیکن مولوی صاحب نے اس سلسلے میں مادہ فعل پر زیادہ زور دیا ہے جدید قواعد نویس بھی مصدر کے مقابلہ میں مادہ فعل کو زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔

متعلق فعل کے لیے مولوی صاحب نے تمیز کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یہ اصطلاح اپنے اندر متعلق فعل جیسی وسعت نہیں رکھتی اور متعلق فعل انگریزی ADVERB کا ترجمہ ہے۔ تمیز چوں کہ فعل کے ساتھ ساتھ صفت کی کیفیت بھی بیان کرتی ہے۔ اس لیے متعلق فعل کہنا زیادہ درست ہے۔ جدید فارسی قواعد نویس اسے قید کہتے ہیں۔ تمیز یا متعلق فعل کی جگہ اس آسان اصطلاح کو رواج دیا جاسکتا ہے۔ غیر مستقل الفاظ میں حروف کو رکھا گیا ہے۔ اور حروف ربط، عطف، حروف تخصیص اور حروف فجائیہ ان کی چار قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ اور انہی قسموں کے تحت حرف کی بحث کو سمیٹ لیا گیا ہے۔

قواعد اردو کی تیسری فصل کا تعلق مشتق اور مرکب الفاظ سے ہے مولوی صاحب نے مشتق کی تعریف میں وسعت پیدا کی ہے اسے مصدر سے بننے والے الفاظ تک محدود نہیں رکھا ان کے نزدیک جو لفظ کسی دوسرے لفظ سے کسی قدر تغیر سے نکلا یا بنا ہو وہ مشتق ہے انھوں نے اردو میں مستعمل اشتقاق کی مختلف صورتوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اسی طرح مرکب الفاظ اور ان کی ساخت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ لفظ سازی کے یہ طریقے اردو زبان کے مزاج کا خاص حصہ ہیں لیکن قواعد کی قدیم کتابیں ان کے ذکر سے عام طور پر خالی نظر آتی ہیں لفظ سازی میں سابقے اور لاحقے خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ لیکن مولوی صاحب نے ان کی مثالیں تو دی ہیں مگر سابقے اور لاحقے کی اصطلاح نہیں برتی۔ مرکب الفاظ کی بحث میں عبدالحق صاحب نے مندرجہ ذیل مرکبات کا بھی ذکر کیا ہے۔

مرکبات تابع، مرکبات ربطی، مرکبات اعدادی، مرکبات تمیزی، یہ سب مرکبات اور ان کی مختلف اقسام مرکب الفاظ ہی ہیں۔ ان کی یہ تقسیم اس معنوی تعلق کی بنیاد پر کی گئی ہے جو اس مرکب کے دونوں اجزا میں موجود ہوں اس سے ان مرکبات کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور نئے لفظ بنانے میں اردو کی وسعت کا اندازہ بھی ہوتا ہے عام قواعد نویس مرکب اضافی، توصیفی وغیرہ کا ذکر نحو میں کرتے ہیں۔ مولوی صاحب نے جن مرکب لفظوں پر یہاں روشنی ڈالی ہے ان کا تعلق صرف ہی سے بنتا ہے۔

فصل چہارم کا موضوع نحو ہے اور کتاب کا یہ حصہ روایتی کتب سے کافی مختلف ہے نحو میں پہلے مرکبات اور ان کی اقسام کا ذکر کیا جاتا تھا پھر جملے کی قسمیں آتی تھیں اور آخر میں جملے کی مختلف اقسام کی ترکیب نحوی ہوتی تھی۔ مولوی صاحب نے اس فصل میں ایک تو اجزائے کلام اور ان کے مختلف تغیرات کے عمل سے جو ان میں بلحاظ تعداد، حالت و زمانہ وغیرہ پیدا ہوئے ہیں بحث کی ہے۔ اگرچہ ان اجزائے کلام کا ذکر حصہ

صرف میں بھی آیا ہے لیکن حصہ نحو میں یہ بحث معنی اور مفہوم کے لحاظ سے کی گئی ہے اس فصل کا دوسرا بڑا موضوع جملوں کی ساخت اور ان کی اقسام سے تعلق رکھتا ہے۔ مولوی صاحب نے مرکب جملے کی ترکیب نحوی میں ہم رتبہ، تابع، اسمی، وصفی اور تمیزی جملوں کے ذکر سے اردو ترکیب نحوی کو انگریزی ANALYSIS کی حدود میں داخلہ کر دیا ہے۔ بیشتر آریائی زبانوں میں ANALYSIS ترکیب نحوی کے مقابلہ میں زیادہ عام ہے ہر چند کہ مولوی صاحب نے حصہ نحو میں اجزائے کلام پر نحوی تبدیلیوں کے حوالے سے نظر ڈالی ہے لیکن اکثر مقامات پر صرف و نحو گلے ملتی نظر آتی ہیں اور نحو کا امتیاز واضح نہیں ہو پاتا۔ جدید فارسی قواعد نویس تجزیہ اور ترکیب پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ تجزیہ میں جملہ میں آنے والے تمام الفاظ کے بارے میں صرفی بحث کی جاتی ہے اور اجزائے جملہ کے باہمی روابط پر ترکیب جملہ میں روشنی ڈالی جاتی ہے۔

مولوی عبدالحق کی قواعد اردو کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اردو کے بعض ہندی الاصل کلمات کے ماخذ پر بھی روشنی ڈالی ہے عربی اور فارسی الفاظ کی اصل پر زیادہ توجہ نہیں دی اس کے مقابلہ میں ان کلمات پر زیادہ توجہ دی ہے جن کا تعلق سنسکرت سے ہے اس کی وجہ ظاہر ہے کہ عام اردو جاننے والے سنسکرت کی نسبت فارسی، عربی سے زیادہ قربت رکھتے ہیں اور اردو کے اس عنصر کو جاننے کی ضرورت ہے جو سنسکرت سے اردو میں آیا ہے مولوی صاحب نے اردو اعداد و ضمائر کے ماخذوں پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس طرح انھوں نے بعض افعال اور حروف کی اصل کی نشاندہی کی ہے۔ اردو میں موجود بعض ہندی الاصل کلمات کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مولوی صاحب نے قواعد اردو میں اردو زبان کی بعض خصوصیات کا خیال رکھا ہے، مثلاً الفاظ کی تکرار اردو کی ایک خصوصیت ہے اور اس تکرار سے جملے میں خاص معنی پیدا ہوتے ہیں اور ان سے اختلاف زور، تاکید یا مبالغہ کا اظہار ہوتا ہے۔ مولوی صاحب نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اسی طرح افعال مرکب، مرکب و مشتق الفاظ بھی اردو کی بعض خصوصیتوں کو ظاہر کرتے ہیں اور انھیں بھی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔

ہمارے ہاں قواعد کو زیادہ تر فطری حیثیت سے پڑھا، پڑھایا گیا ہے اور کتب قواعد میں نظری مباحث زیادہ ملتے ہیں لیکن مولوی صاحب کی کتاب میں قواعد کے عملی استعمال پر زور دیا گیا ہے ہر فطری مسئلہ کی وضاحت لاتعداد مثالوں سے کی گئی ہے اس سے ایک تو کتاب اتنی خشک نہیں رہی دوسری یہ نظری سے زیادہ عملی قواعد کی کتاب بن گئی ہے اسماء کی تذکیر و تانیث وحدت و جمع، صفات و ضمائر کا

استعمال، فعل سازی، افعال کا تعدیہ، مرکب افعال و الفاظ اور تمیز وغیرہ پر اتنی تفصیلات اس کتاب میں کر دی گئی ہیں کہ اس سے پہلے ان موضوعات پر اتنی معلومات کہیں اور نظر نہیں آتیں۔

مولوی صاحب کی قواعد اردو کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۴ء میں شایع ہوا۔ اس کے بعد ایک عرصہ تک اردو قواعد کے موضوع پر کوئی بلند پایہ عملی کتاب نہیں ملتی۔ چوں کہ قواعد اردو کے نصاب میں بھی شامل رہے ہیں اس لیے درسی ضرورتوں کے تحت قواعد کی بہت سی کتابیں لکھی گئیں ان میں کوئی واضح نقطۂ نظر نہیں ملتا۔ بیشتر کتب میں عربی قواعد کی تقلید کی گئی ہے کہیں کہیں مولوی صاحب کے اثرات بھی نظر آجاتے ہیں۔۷۰ء کی دہائی سے اردو قواعد نویسی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور بعض ماہرین لسانیات نے قواعد اردو کی طرف توجہ کی۔ ۱۹۷۱ء میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی جامع القواعد کا حصہ صرف شایع ہوا۔ اس کتاب کا ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کا لکھا ہوا حصہ نحو... منظر عام پر آیا۔ ۱۹۸۱ء میں دلی سے عصمت جاوید صاحب کی نئی اردو قواعد ۱۹۸۲ء میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کی اردو قواعد اور ۱۹۸۵ء میں ڈاکٹر اقتدار حسین خاں کی "اردو میں صرف و نحو" جیسی کتابیں شایع ہوئیں۔ مغربی زبانوں میں لسانیات اور ساختیات کے زیر اثر قواعد کے ایک نئے تصور نے جنم لیا ہے نئی اردو قواعد اور اردو صرف و نحو اسی تصور کے متابع ہیں ان کتابوں کی بدولت جیپرسن، بام فیلڈ، نوم چامسکی اور دوسرے اکابرین فن کے افکار کی جھلک اردو قواعد میں نظر آتی ہے۔ ان کتابوں کا انداز سائنسی ہے اور علمی پایہ بلند ہے موجودہ دور کو اردو قواعد کی تاریخ میں نئی سوچ کا دور قرار دیا جا سکتا ہے نئے قواعد نویس بابائے اردو کی قواعد سے بہت آگے دیکھنے کے دعوے دار ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ درست بھی ہو سکتا ہے لیکن مولوی صاحب کے قواعد اردو کا اعتبار اب بھی قائم ہے اور جس مقصد کے تحت انھوں نے یہ کتاب لکھی قواعد کی کوئی دوسری کتاب اس مقصد کو اس خوبی سے پورا نہیں کرتی۔

---

[1] عبدالحق، ڈاکٹر مولوی، قواعد اردو، لاہور اکیڈمی لاہور ۱۹۵۸ء ص ۳۵
[2] عصمت جاوید نئی اردو قواعد، ترقی اردو بیورو نیو دہلی، ۱۹۸۵ء ص ۱۴ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو قواعد، مکتبہ اسلوب کراچی ۱۹۸۲ء ص ۷۰، اقتدار حسین خاں، ڈاکٹر، اردو صرف و نحو ترقی اردو بیورو نیو دہلی ص ۹۸

[3] عبدالحق ص ۲۸ [4] ایضاً ص ۳۴ [5] ایضاً ص ۴۷، [6] بخاری، دکتر طلعت، دستور مختصر زبان فارسی، کتاب خانہ طہوری، تہران، ۱۳۴۶ھ ص ۱۱ [7] چرنیکووا، سونیا، اردو کے صیغے، دارالاشاعت ترقی ماسکو ت۔ن، ص ۱۴-۱۶، [8] بخاری، ص ۲۲۳

صوفی عبدالرشید

بابائے اردو مولوی عبدالحق (مرحوم) کا خادمِ خاص

مشاہدہ و حقیقت

میں نے آنکھ کھولنے کے بعد بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب (مرحوم) کے گھر ہی میں پرورش پائی۔ اس قرب نے مجھے مولوی صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع دیا۔ مولوی صاحب کا وضع، قطع، علم و فضل، جہاں دنیائے ادب پر مسلّم ہے وہاں ان کی نجی زندگی بھی ایک کھلی کتاب کی طرح تابندہ و درخشندہ تھی۔ محنت، خلوص، شفقت اور دل جوئی مولوی صاحب کے شعارِ لازمہ کے عناصرِ جلیلہ تھے۔ وہ جہاں اہلِ علم کی پذیرائی اور طالبانِ علم کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے وہاں ناخواندوں سے بھی اسی پُروقار عظمت کے ساتھ محبت کا مظاہرہ کرتے تھے۔

یوں تو مولوی صاحب کے اَن گنت واقعات میری نظر سے گزرے، مگر میں اپنی چند یادداشتوں سے دو واقعے نذرِ قارئین کرنا چاہتا ہوں اس سے اندازہ ہوگا کہ بابائے اردو کی ادبی زندگی کے ساتھ ساتھ نجی زندگی کس محور پر تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک غریب مفلوک الحال خاتون جو کہ ذہنی مریضہ تھی جس کا نام کنڑوں باؤلی تھا یہ سقن تھی۔ اس کی ذہنی کیفیت ایک ایسے حادثے سے دوچار ہوئی۔ جس نے اس کی خوش و خرم زندگی کو باؤلا کر دیا، ہوا یوں کہ ایک کے جواں سال بیٹے کی بارات، دریائے گنگا کی نذر ہو گئی یہی صدمہ وہ تھا جس نے اِسے پاگل بنا دیا۔ اس طرح یہ بےچاری گلیوں میں ماری ماری پھرنے لگی۔

اس کا مولوی صاحب کے خاندان سے ربط تھا۔ اس غریب خاتون کو مولوی صاحب وہی عزت دیتے تھے جو کسی صاحب حیثیت کے لیے ہوتا ہے مولوی صاحب کو جب کہیں بےچاری نظر آتی اس کے لیے دعائے صحت فرماتے اور جو کچھ اس وقت جیب میں ہوتا، اس کو دے دیا کرتے تھے اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ "ادبا" کے جھرمٹ میں رہنے والی شخصیت غربا کو کسی بھی وقت اپنے سے

جدا نہیں کرتی تھی۔ مولوی صاحب دردمند تھے کسی کی تکلیف کو گوارا نہیں کرتے تھے۔

دوسرا واقعہ بھی ملاحظہ فرمایئے، ہاپوڑ میں ایک شخص کرم الٰہی نامی تھا جو تانگہ چلایا کرتا تھا یہ تانگہ اس کا اپنا تھا مگر مولوی صاحب کے خاندان کا بندۂ بے دام ہونے پر فخر کیا کرتا تھا۔ اپنی تمام خدمات مولوی صاحب کے گھر کے لیے وقف کردی تھیں، مولوی صاحب کے والد صاحب کی سواری کے لیے ہمہ وقت خاطر رکھتا، ان کے بعد مولوی صاحب کے بڑے بھائی شیخ ضیاء الحق صاحب کی خدمت بجا لاتا۔ اور مولوی صاحب کی موجودگی میں اس بات کا منتظر رہتا تھا کہ مولوی صاحب کا کب اشارہ ہو اور وہ ان کی خدمت بجا لائے۔ آپ اندازہ لگایئے کہ وہ مولوی صاحب کے ارشاد پر مزدوری کے لیے نکلتا تو کوشش یہی کرتا تھا کہ پھیرا جلد مکمل کر کے پھر تانگے کو مولوی صاحب کے گھر کی ڈیوڑھی پر لے آئے، اکثر یہ ہوتا کہ ہاپوڑ کے اسٹیشن پر جب کوئی سواری اس کو ملتی اور اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ آنے والی شخصیت بابائے اردو کی مہمان ہے تو وہ بڑے تپاک سے تانگے میں سوار کرتا اور بلا معاوضہ کے ان کو بابائے اردو کے گھر تک پہنچا کر ایک روحانی مسرت حاصل کرتا۔

یہ واقعات اور ان سے ملتے جلتے نہ جانے کتنے واقعات بابائے اردو کے خاندان سے منسوب ہیں جو اس بات کے متقاضی ہیں کہ ادیبوں میں سے کوئی ادیب ایسا بھی ہو کہ وہ بابائے اردو کی خالصتاً نجی زندگی کے انمول روزمرہ کو زینت قرطاس بنائے، یوں تو بابائے اردو پر بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر ابھی مجھ جیسے لوگ باقی ہیں جو بابائے اردو کی سحر و شام سے 'کماحقہٗ' واقفیت رکھتے ہیں میں اس سلسلے میں اپنی خدمات پیش کرنے کو سعادت سمجھوں گا۔

ایک اہم چیز یہ ہے کہ میں نہ صرف مولوی صاحب کے گھر کا ریزہ خوار تھا بلکہ بابائے اردو کے خادم ہونے کے باعث انجمن ترقی اردو سے بھی منسلک رہتے ہوئے اپنی خدمت بجا لاتا رہا۔ میں انجمن ترقی اردو کی ابتدائی منزل سے تاحال خدمت انجام دے رہا ہوں۔ میں نے انجمن ترقی اردو کے شب و روز دیکھے ہیں بابائے اردو کے ساتھ، نواب سید ہاشمی فرید آبادی اور قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی، ان شخصیات سے پہلے بابائے اردو کی موجودگی میں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی۔ جنھوں نے انجمن کی بہت خدمت کی ان کا واقعہ یاد آیا، جو قارئین کی نظر ہے میں نے ایک فائل الٹے ہاتھ سے دی تو انھوں نے مجھے ڈانٹا اور کہا یہ عمل درست نہیں، فائل یا اور کوئی چیز ہو تو سیدھے ہاتھ سے

دیا کریں۔ ایک اور چھوٹا سا واقعہ کہ لطیفی پریس سے ایک صاحب آئے جو انجمن کے کاغذات کے بل لائے تھے اس پر دستخط انگریزی میں کیے ہوئے تھے تو پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی صاحب نے ان سے کہا کہ یہ بل واپس لے جائیں اور اس پر اردو میں دستخط کروا کے پھر لائیں یہ سب کام اردو اور انجمن کی محبت میں کرتے تھے۔

ان کے بعد جناب اختر حسین صاحب، جناب قدرت اللہ شہاب صاحب اور اب انجمن کے موجودہ صدر جناب نورالحسن جعفری صاحب کی سرپرستی میں میں اپنی خدمات وقف کیے ہوئے ہوں۔ یہ امر انتہائی حوصلہ افزا ہے کہ موجودہ صدر نورالحسن جعفری صاحب جب سے صدر انجمن ترقی اردو ہوئے ہیں۔ انجمن حقیقتاً بابائے اردو کے خواب کی تعبیر بنتی جا رہی ہے میں دعا کرتا ہوں کہ صدر انجمن جناب نورالحسن جعفری صاحب اور متولیانِ انجمن جناب جمیل الدین عالی صاحب، ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب، جناب مشفق خواجہ صاحب اور دیگر کرم فرماؤں کو اللہ تعالٰے شاد و آباد رکھے! جناب مشفق خواجہ صاحب اب تک انجمن کے ملازمین کا، اور جو کام انجمن کی بہتری کے لیے ہو اس کام کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے قیمتی وقت نکال کر، شب و روز خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اللہ ان کو زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کی سعادت مرحمت فرمائے۔ جس درخت کو بابائے اردو نے لگایا تھا وہ سدا بہار رہتے ہوئے ثمر ہائے ادب سے بارآور ہو۔ آمین۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کی جہاں گراں مایہ بیشتر تصانیف ہیں ان میں کی یادگار، ماہنامہ "قومی زبان" اور "سہ ماہی اردو" اپنی روایات کو دنیائے ادب میں قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اخیر میں میں ڈاکٹر محمد اسلم فرخی صاحب مشیر علمی و ادبی کا ذکر بھی کروں گا کہ جب سے ڈاکٹر اسلم صاحب انجمن کے مشیر علمی و ادبی مقرر ہوئے ہیں۔ انجمن کی کارکردگی نمایاں طور پر پیش قدمی سے ہمکنار ہے اور یہ سفر انشاء اللہ جاری و ساری رہے گا۔

مولوی صاحب کی تمام توجہات کا مرکز انجمن ترقی اردو تھی۔ وہ کسی قیمت پر یہ برداشت ہی نہ کر سکتے تھے کہ کوئی شخص انجمن کو نقصان پہنچائے۔ خواہ وہ شخص ان کا عزیز ترین دوست ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے لیے وہ اپنی ذاتی عزت اور ذلت کا کبھی کوئی خیال نہیں کرتے تھے۔ انجمن کی عزت ہی ان کی اپنی عزت تھی۔ ان کی اسی کمزوری سے کچھ لوگوں نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا ہے۔ ہر ایسا شخص مولوی صاحب کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتا تھا کہ دوسرا انجمن ترقی اردو کو نقصان پہنچا رہا ہے اور کسی کے بارے میں

اس قدر کہہ دینا مولوی صاحب کو اس کے خلاف کر دینے کے لیے کافی تھا۔

مولوی صاحب ہمیشہ ہم لوگوں سے یہ کہا کرتے تھے کہ اگر تم لوگ مجھ سے محبت کرتے ہو تو تم کو انجمن سے محبت کرنا چاہیے اور اگر تم انجمن کی خدمت کرو گے تو گویا میری خدمت کرو گے۔ انھوں نے انتقال سے ذرا پہلے کہا تھا۔ جب تک زندہ ہوں انجمن باقی ہے اور تم اس وقت تک یہیں رہو گے۔ لیکن اب وہ نہیں ہیں۔ مگر میں جب تک زندہ ہوں انجمن کی خدمت کرتا رہوں گا۔ کیوں کہ انجمن کی خدمت میرے محسن اور آقا مولوی عبدالحق کی خدمت ہے۔ اس میں بہت زیادہ مسرت محسوس کرتا ہوں۔

میرا خاندان مولوی صاحب کے خاندان کے احسانات کے بوجھ سے ہمیشہ دبا رہا ہے۔ میں تو ساری عمر ان کے احسانات سے سر نہ اٹھا سکوں گا۔ جیسا زندگی بھر ان کا غلام رہا آج بھی ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔ میرا اور مولوی صاحب کا تعلق میرے دادا کے وقت کا تھا۔ میرے دادا ان کے پرانے ملازم تھے اور اس طرح میری تین پشتیں مولوی صاحب کے خاندان کی خدمت میں گزر گئیں ہیں۔ میری پیدائش بھی مولوی صاحب کے بڑے بھائی شیخ ضیاء الحق صاحب کے گھر میں ہوئی تھی۔ اور میرے والد صاحب بھی اسی طرح اس خاندان کے دعا گو اور احسان مند رہے ہیں۔ مولوی صاحب کا خاندان بڑا غریب پرور خاندان تھا۔ اور اچھا خاصا کھاتا پیتا خاندان سمجھا جاتا تھا۔ اس خاندان میں ایک خصوصیت ہمیشہ رہی تھی کہ وہ خدا ترسی اور حق گوئی کے معاملہ میں بہت مشہور تھا۔ ضیاء الحق صاحب سیاسی آدمی تھے۔ مولوی صاحب سمیت تین بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ بھائیوں میں بڑے بھائی ضیاء الحق صاحب ہاپوڑ میں رہتے تھے۔ منجھلے بھائی مولوی عبدالحق صاحب تھے اور چھوٹے بھائی احمد حسن صاحب جو بھوپال میں انجینئر تھے مولوی صاحب کی بڑی بہن منشی اخلاق حسین محرر اور زمیندار کو بیاہی گئی تھیں جو ہاپوڑ میں ہی رہتے تھے۔ اور باقی دو بہنیں بھی ہاپوڑ کے ہی زمیندار گھرانوں میں بیاہی گئی تھیں۔"

مولوی عبدالحق صاحب کی پیدائش ہاپوڑ میں نہیں بلکہ سراداہ میں ہوئی تھی جو ہاپوڑ سے چار میل دور ایک جگہ تھی۔ بچپن سے ہی مولوی عبدالحق صاحب کو پڑھنے کا بے حد شوق تھا اور اکثر چراغوں کی روشنی میں رات گئے تک پڑھا کرتے تھے۔ یہ بات مشہور تھی کہ مولوی صاحب کی فطرت میں عام بچوں کی طرح کھیل کود اور شرارت کا عنصر نہیں تھا۔ بلکہ وہ شروع ہی سے سنجیدہ تھے اور پڑھائی کی طرف مائل تھے۔ اسی وجہ سے ان کا تعلیمی شوق روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ علی گڑھ چلے

گئے جہاں انھوں نے سرسید کے زیرِ نگرانی تعلیم حاصل کرنی شروع کی اور اسی فیضِ صحبت کا نتیجہ تھا کہ وہ سرسید احمد خاں اور مولانا حالی کے رنگ میں ہمیشہ کے لیے رنگ گئے۔ یہ وہی رنگ تھا جو ساری عمر اُن پر سے نہ اترا۔ علمی، تعلیمی اور قومی کاموں میں ہر وقت مصروف رہنا اور زندگی کی کسی بھی بڑی سے بڑی رنگینی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا، ان کا خاص جوہر تھا۔ اسی لیے وہ اپنے خاندان اور گھرانے کے افراد سے بہت بیگانہ رہتے تھے اور کبھی ان کو خاندان کے معاملہ میں دلچسپی لیتے نہیں دیکھا گیا حتیٰ کہ مولوی صاحب نے اپنی شادی بھی اسی نحوے بیگانگی کی نذر کر دی۔ جب ان کی چھوٹی بہن کی شادی "چھوٹے محل" میں ہونے لگی جو ہاپوڑ کا ایک زمیندار گھرانا تھا تو مولوی صاحب کی شادی بھی اسی گھر کی ایک لڑکی سے طے کر دی گئی۔ مولوی صاحب کی بیوی کا نام زکریا بیگم تھا۔ یہ شادی مولوی صاحب نے زبردستی بڑے بھائی شیخ ضیاء الحق صاحب کے اصرار پر کی تھی۔ اور ان کے حکم کی عدولی نہیں کرتے تھے۔ مگر ان سے یہ زبردستی زیادہ برداشت نہیں ہوئی اور بیوی سے بالکل تعلق ہی نہیں رکھا اور علی گڑھ چلے گئے۔ تھوڑے عرصہ بعد مولوی صاحب نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی اور زکریا بیگم کی دوسری شادی مولوی ممتاز صاحب سے ہوئی۔ مولوی ممتاز صاحب کے دو بیٹے جو زکریا بیگم سے ہوئے، ایک ہارون اور دوسرے ریحان جو بقیدِ حیات ہیں اور ہاپوڑ میں رہائش پذیر ہیں۔ مگر مولوی صاحب نے پھر ساری عمر شادی نہیں کی۔

شیخ ضیاء الحق صاحب کا انتقال ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد میں ہاپوڑ میں ان کے مکان پر رہا۔ جب انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے دہلی منتقل ہوئی تو میں پابندی کے ساتھ دہلی میں انجمن کی خدمت پر مامور رہا۔

میرے ساتھ مولوی صاحب کا رویہ ایسا ہی رہا ہے جیسے ان کے بڑے بھائی مرحوم شیخ ضیاء الحق صاحب کا تھا۔ وہ مجھے اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ اور مولوی صاحب نے بھی اولاد کی طرح میرے ساتھ سلوک کیا اور ہر وقت اپنے ساتھ رکھا۔ کبھی کبھی خفا ہو جاتے تو اس کی تلافی فوراً کر دیتے تھے۔ خفا اس بات پر ہوتے تھے کہ فالتو چیز نہ آئے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ چینی (شکر) ختم ہو گئی جو اس دور میں راشن ڈپو سے ملا کرتی تھی۔ مہمان زیادہ آگئے تو چینی زیادہ خرچ ہو گئی۔ میں چینی بازار سے لے کر آگیا اس چینی کی قیمت میں کچھ اضافہ ہوا تو مجھ سے پوچھا کہ چار روپے زیادہ کیوں خرچ ہوئے۔ گڑ کی قیمت کا بھاؤ پوچھا چینی کی قیمت میں اور گڑ کی قیمت میں تقریباً چار روپے کا فرق نکلا تھا۔ چینی واپس کروائی گئی اور گڑ کی شکر منگوائی

گئی اور یہ شکر اتنی مقدار میں آئی کہ گیارہ روپے کی بچت ہوئی۔ جو ان کی اپنی ذاتی جیب خرچ میں سے تھی گیارہ روپے مولوی صاحب کے کہنے پر انجمن کے دفتر میں جمع کروا دیے گئے۔ اس دن سے مولوی صاحب کے حکم کے مطابق جو بھی چیز آتی وہ مہنگی ہوتی تو اسی قیمت کے حساب سے جو پیسے بچتے وہ انجمن کے دفتر میں جمع کروا دیتے جو ان کی اپنی جیب خرچ کا ایک حصہ ہوتی تھی۔ اور یہ رقم انجمن کے دفتر میں بطور امداد جمع کروائی جاتی۔ وہ چیزیں جو اپنے مصرف میں آتیں وہ کم قیمت کی ہوتی اور اس سے جو بچتا وہ انجمن کے دفتر میں جمع کرادیا جاتا اس طرح کے سیکڑوں واقعات تھے۔

میں ان کی ذاتی خدمت پر مامور تھا، چیزوں کا لانا، لے جانا ان کے احکامات کی پابندی کرنا میرے فرائض میں شامل تھا۔ گویا میرا وہ کام تھا جو اوپر کے ملازمین کرتے ہیں۔ مولوی صاحب کو شروع میں میری تعلیم سے بہت دلچسپی تھی مگر میں بیمار اس قدر رہتا تھا کہ مولوی صاحب کی یہ خواہش کبھی نہ پوری ہو سکی۔ اور میں علم کی روشنی سے محروم رہا۔ میں دراصل اپنی ذہنی کمزوری کی بنا پر نہیں پڑھ سکا۔ مولوی صاحب کے بڑے بھائی ضیاء الحق صاحب کا انتقال ۱۹۳۶ء میں ہوا تھا۔ اور یہ وہ واحد واقعہ تھا جس پر میں نے مولوی صاحب کو بہت متاثر دیکھا۔ ان کو اپنے بڑے بھائی سے بے پناہ محبت تھی۔ اسی لیے ان کے بعد ان کی اولاد کو خوب پڑھایا اور گھر کے تمام اخراجات اور تعلیم کا خرچ بھی خود دیتے تھے۔ ان کی صاحبزادی کی شادی بھی مولوی صاحب نے خود کی۔ ضیاء الحق صاحب کے علاوہ خاندان کے دیگر افراد سے مولوی صاحب کو کبھی زیادہ شغف نہیں رہا۔ جب تک ضیاء الحق صاحب زندہ رہے مولوی صاحب ہاپوڑ پابندی سے آتے رہے۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد صرف بھتیجے کی شادی پر ہاپوڑ آئے تھے اور اس کے بعد پھر کبھی نہیں آئے۔

۱۹۳۸ء میں جب مولوی صاحب دہلی آئے تو میں ان کے ساتھ تھا۔ دہلی میں مولوی صاحب دریا گنج میں رہتے تھے۔ یہاں مولوی صاحب کی ذاتی خدمت کے علاوہ میرے سپرد دفتری کام بھی تھے۔ ۱۹۴۷ء میں جب حالات مخدوش ہو گئے اور فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا تو مولوی صاحب نے مجھ سے کہہ دیا کہ تم بھوپال چلے جاؤ چناں چہ مولوی صاحب خود حیدر آباد چلے گئے اور مجھے احمد حسن صاحب کے پاس روانہ کر دیا۔ دہلی سے بھوپال جاتے ہوئے فرید آباد کے مقام پر ٹرین پر حملہ ہوا۔ جس میں میں شدید زخمی ہوا۔ وہ زمانہ جس سنگین صورت حال سے دوچار تھا اس کا اندازہ آج اچھی طرح نہیں کیا جا سکتا۔ بھوپال پہنچتے پہنچتے دو چار روز لگ گئے۔ احمد حسن صاحب کو ٹرین پر حملہ کی خبر پہلے ہی مل چکی تھی۔ وہ اسٹیشن پر منتظر تھے۔ مجھے لے گئے اور میرا علاج کروایا۔ جب مولوی

صاحب حیدرآباد سے بھوپال آئے تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ تم فوراً کراچی چلے جاؤ۔ میں کراچی ہی آ رہا ہوں۔ مولوی صاحب بھوپال سے دہلی آگئے اور وہاں ابوالکلام آزاد سے مل کر انجمن کے مستقبل کے بارے میں گفتگو کی اور آگئے۔ میں بمبئی کے راستے بحری جہاز سے کراچی پہنچا۔ مولوی صاحب نے میری والدہ کو اپنے بھتیجے کے ساتھ ہوائی جہاز سے یہاں پہلے ہی بلوا لیا تھا۔ اور وہ انھیں کے پاس رہ رہی تھیں۔ میں جب یہاں پر آیا تو کلیٹن روڈ پر ان کے بھتیجے ممتاز حسین صاحب کے پاس رہا۔ اور مولوی صاحب کی خدمت بدستور شروع کر دی۔

مولوی صاحب کی رحلت سے تقریباً چھ سات سال قبل انجمن میں ایسے حالات پیدا ہوئے کہ مجھے مولوی صاحب کی خدمت سے الگ کر کے دفتری کام میں لگا دیا گیا تھا۔ مگر میری تنخواہ مولوی صاحب ہی دیتے رہے اور اکثر میرے مانگنے پر الگ سے روپیہ بھی مجھے دیتے تھے۔ میری شادی بھی انھوں نے ۱۹۵۳ء میں کرائی اور سارے اخراجات خود برداشت کیے۔

مولوی صاحب میں اتنی خوبیاں تھیں جن کے گنوانے کے لیے ایک عمر چاہیے۔ لیکن خاندانی روایت کے تحت جو شخص جو کچھ بھی کہتا اس پر عمل کرتے۔ کوئی شخص کسی کے خلاف کچھ کہہ دیتا اس کو صفائی کا موقع دیے بغیر الگ کر دیتے اور بدگمان ہو جاتے۔ اس بات کی وجہ سے بعض بڑے مخلص افراد کو بڑا نقصان پہنچا۔ لیکن میرا پھر بھی یہ اصرار ہے کہ اس میں محض انجمن ترقی اردو کی محبت کام کر رہی تھی۔

"میں ۱۹۳۶ء سے تا حال انجمن کا ملازم ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ میں مولوی صاحب کا ہی ملازم ہوں۔ مرحوم نے ساری زندگی انجمن کی نذر کر دی اور اسی خلوص کی روشنی آج تک ہم سب کے لیے مشعل راہ ہے۔"

بڑے آدمی

دنیا میں بڑے آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کا ہم ادب و احترام کرتے ہیں، دوسرے وہ جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ ادب ہم اولوالعزم اور عالی حوصلہ مدبروں اور وطن پرستوں اور باکمال حکیموں اور ادیبوں کا کرتے ہیں جن کی حیرت انگیز جدوجہد قربانیوں اور عظیم الشان کاموں اور تدبیروں نے اور جن کے علم و کلام نے عالم کو فیض پہنچایا اور روشن سورج کی طرح تاریکی مٹایا۔ محبت ہم ان سے کرتے ہیں جن کی سیرت، خوش اطواری اور

خوش اخلاقی دل کے موہنے میں وہی کام کرتی ہے جو چودھویں رات کی چاندنی۔ ان کے پاس سے جو اُٹھا کچھ لے کر اُٹھا، اور ان کے پاس جو گیا کچھ بن کر آیا۔

بڑے آدمیوں کے وعدے

بڑے آدمیوں کے وعدے ایسے ہوتے ہیں۔ جو جتنا بڑا ہوتا ہے اُس کے وعدے کے ایفا کو بھی اتنی ہی دیر لگتی ہے۔ (چند ہمعصر۔ ص ۲۱۲)

بڑے لوگوں کی صحبت

بڑے لوگوں کی صحبت بھی اکسیر کی خاصیت رکھتی ہے جو اُن سے چھُوا کندن بن گیا۔

(چند ہمعصر۔ ص ۲۰۷)

URDU ADAB

QUARTERLY

EDITOR

Khaliq Anjum

ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)
NEW DELHI

سید ہاشمی

اردو ادب

انجمن ترقی اردو ہند

اردو ادب (سہ ماہی)

۱۹۹۲ء

شمارہ (۲)

اردو ادب

(خاص نمبر)

اڈیٹر

خلیق انجم

انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلّی

فہرست

حرف آغاز	ڈاکٹر خلیق انجم	۷
تعارف	پروفیسر مختار الدین احمد	۹
مقدمہ	ڈاکٹر ظفر اقبال	۱۶
دیوان نین سکھ	نین سکھ	۲۷
غالب کی حیات معاشقہ	پروفیسر مسعود حسین	۷۳

حرفِ آغاز

اردو میں قدیم متون کی طباعت اسی وقت سے شروع ہو گئی تھی جب ہندوستان میں پریس کا رواج ہوا اگرچہ سر سید نے ابوالفضل کی 'آئینہ اکبری' مرتب کر کے متنی تنقید کی روایت کا باقاعدہ آغاز کر دیا تھا لیکن اس فن کو مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی۔ آئینہ اکبری کی طباعت کے ۶۰، ۷۰ سال بعد مولوی عبدالحق نے اردو میں متنی تنقید کا آغاز کیا۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو ہند کے زیر اہتمام بڑی تعداد میں اردو تذکروں، دکن اور شمالی ہند کے شاعروں کے دواوین اور دکن کی بعض نثری تصنیفات کے تنقیدی اڈیشن شایع کیے۔ ہمارے متنی نقادوں میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، حافظ محمود شیرانی، مالک رام صاحب، پروفیسر نذیر احمد اور رشید حسن خاں صاحب وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ یہ فن ہمیشہ ہی سے ہماری دانش گاہوں کی حدود سے باہر رہا۔ اردو میں جتنے بھی اعلا درجے کے متنی نقاد پیدا ہوئے ہیں ان کا درس و تدریس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ یہ بات میں نے اس لیے کہی کہ کچھ دنوں سے یونیورسٹی کے اساتذہ اب اس طرف توجہ کر رہے ہیں اور یہ متنی تنقید کے حق میں بہت اچھا ہے۔ کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر ظفر اقبال نے ایک غیر معروف کلاسیکی شاعر نین سکھ کا دیوان مرتب کیا ہے۔ اس شاعر کے نام سے شاید ہی کوئی اسکالر واقف ہو۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے تذکرہ مخطوطات اردو میں نین سکھ نامی ایک شاعر کا ذکر کیا ہے لیکن غالباً وہ کوئی اور شاعر ہے وہ نہیں جس دیوان کا ظفر اقبال صاحب نے تنقیدی اڈیشن تیار کیا ہے۔ نین سکھ کے دیوان کا ابھی صرف ایک ہی نسخہ دریافت ہوا ہے۔ متنی تنقیدوں کے اصولوں کے پیش نظر متنی نقاد کے پاس اگر صرف ایک ہی متن ہو تو کام مشکل بھی ہو جاتا ہے اور آسان بھی۔ مشکل یہ ہوتی ہے کہ اگر ہمارے پیشِ نظر دو یا دو سے زیادہ متن ہوتے ہیں۔ تو عبارت پڑھنا آسان ہو جاتا ہے۔

کیوں کہ اگر ایک متن میں عبارت غیر واضح ہو تو دوسرے متن سے مدد لی جا سکتی ہے اور اگر صرف ایک ہی متن ہو تو متنی نقاد کو قیاسی تصحیح کا بہت زیادہ سہارا لینا پڑتا ہے۔

اقبال صاحب نے نین سکھ کے دیوان کا زیر نظر تنقیدی اڈیشن بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے تیار کیا ہے۔ مقدمے میں انھوں نے متن اور شاعر سے متعلق تمام اہم مباحث کا احاطہ کر لیا ہے۔ یہ دیوان قدیم اردو کی ادبی اور لسانی خصوصیات کے سلسلے میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔

ظفر اقبال صاحب اٹھارہویں صدی کے بعض اہم شاعروں کے دیوانوں کا تنقیدی اڈیشن تیار کر رہے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ اردو میں یہ کام بہت کم ہوا ہے۔ ہم نے غالب، اقبال اور انیس کا کافی حد تک حق ادا کر دیا لیکن میر، سودا، خواجہ میر درد اور مومن وغیرہ ابھی تک ہمارے متنی نقادوں کی توجہ کے طالب ہیں۔ خدا کرے ظفر اقبال صاحب اپنے مقصد میں کامیاب ہوں۔

۳۰ جون ۱۹۹۲ء

خلیق انجم

تعارف

ڈاکٹر ظفر اقبال، کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر ہیں، آج کل مہمان استاد کی حیثیت سے ٹوکیو یونیورسٹی، جاپان کے شعبۂ اردو میں طلبا کو درس دے رہے ہیں۔ اپنی کم عمری کے باوجود درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تحقیق کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ وہ آج کل بعض قدیم متون، دیوانِ احسن اللہ بیانؔ، دیوانِ آبرو، دیوانِ قدرت اللہ قدرتؔ اور مبتلا کا تذکرہ طبقاتِ سخن مرتب کرنے میں مصروف ہیں۔ طبقاتِ سخن کے نسخۂ شاہجہاں پور کی نقل اور نسخۂ برلین کا عکس انھوں نے فراہم کر لیا ہے۔ ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان اہم اور قدیم مخطوطات پر پوری توجہ دیں گے اور تصحیح و تحشیے کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں گے۔

دیوانِ نین سکھ کی ترتیب ان کی تازہ کوشش ہے یہ کام انھوں نے اردو کے علاقے سے بہت دور جاپان میں بیٹھ کر کیا ہے۔ جہاں اردو کے مصادر بہت کم ہوں گے، اگر یہ کام وہ کراچی، لاہور میں کرتے تو ان متعدد مراجع سے انھیں مستفید ہونے کے مواقع ملتے جو فی الحال، میرا خیال ہے، ان کی دسترس میں نہیں۔

نین سکھ کی شخصیت فی الحال مجہول ہے، اس کا اصل نام یہی تھا یا کچھ اور، کہا نہیں جا سکتا، اس کے سنینِ ولادت و وفات بھی معلوم نہیں، کہاں کا رہنے والا تھا، شاعری میں کس سے شرفِ تلمذ حاصل تھا، کچھ پتا نہیں۔ اس کی زندگی کے حالات پردۂ تاریکی میں ہیں۔ اردو شعرا کے تذکرے جو اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہیں، اس کے ذکر سے خالی ہیں۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم کے تذکرۂ مخطوطاتِ اردو میں، جس نین سکھ کا ذکر ہے، جس نے صف شکن خاں مجاہد جنگ ارمان حیدر آبادی کے صوبہ دار مقرر ہونے پر ایک قطعۂ تاریخ فارسی

زبان میں ۱۱۶۷ھ میں لکھا تھا، مرتب کے خیال میں وہ، نین سکھ صاحبِ دیوان سے مختلف ہے۔ میں فی الحال اس سلسلے میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں، لیکن انھوں نے اس کے جو دلائل پیش کیے ہیں وہ قطعی نہیں اور ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے:

۱۔ وہ لکھتے ہیں کہ صف شکن خاں کے سلسلے کا قطعۂ تاریخ، دیوان نین سکھ میں موجود نہیں، اس لیے وہ قطعہ، صاحب دیوان کا نہیں کسی اور کا لکھا ہوا ہے۔ ممکن ہو ایسا ہی ہو، لیکن یہ بالکل ضروری نہیں کہ کسی شاعر کی ہر غزل، ہر قصیدہ، ہر قطعہ دیوان میں شامل ہو۔ خاص طور پر ایسی شکل میں کہ ان کے بقول دیوان کا موجودہ نسخہ غالباً نین سکھ کی بیاض ہے جس میں اس نے اپنا کلام بغیر کسی ترتیب کے نقل کرایا ہے۔ پھر ولیؔ سے غالبؔ تک کے دواوین دیکھ جائیے۔ بعض شعرا کا کچھ اور بعض کا خاصا کلام دیوان مروجہ میں سے غیر حاضر لیکن دوسرے مصادر میں موجود ملتا ہے۔ پھر یہ نین سکھ کا اردو دیوان ہے فارسی کلام کا شمول اس میں ضروری نہیں۔ دیوان شیخ غلام یحییٰ حضورؔ عظیم آبادی (متوفی ۱۲۰۶ھ) میں اس کے اردو اشعار ہیں فارسی کا ایک مصرع بھی نہیں ملتا، جب کہ ان کا لکھا ہوا فارسی کا ایک قطعہ جو حضرت شاہ رکن الدین عشقؔ عظیم آبادی کی وفات پر انھوں نے ۱۲۰۳ھ میں نظم کیا، حضرت عشقؔ کے لوح مزار پر کندہ ملتا ہے۔ فدویؔ عظیم آبادی کا فارسی قطعۂ تاریخ وفات عشقؔ بھی ان کے دیوان اردو سے غیر حاضر ہے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ نین سکھ کے دیوان کا موجودہ نسخہ مکمل نہیں، جیسا کہ مرتب نے اپنے مقدمے میں صراحت کی ہے۔ اس کے کچھ اوراق غائب ہیں۔

۲۔ مرتب نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ نین سکھ نے کیا ساری زندگی میں ایک ہی فارسی قطعہ لکھا؟ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی زندگی کا سارا سرمایہ ہمارے پیش نظر ہے کہاں! حضورؔ اور فدویؔ کا ذکر اوپر گزرا، جن کا لکھا ہوا صرف ایک ہی فارسی قطعہ اب تک دستیاب ہوا ہے۔ ایسے اور شعرا بھی ہوں گے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ نین سکھ نے فارسی میں شعر کہے ہوں لیکن وہ ہم تک نہ پہنچ سکے ہوں یا ضائع ہو گئے ہوں۔

میرا یہ ادعا ہرگز نہیں کہ محی الدین قادری زورؔ نے جس نین سکھ کا ذکر کیا ہے۔ وہ یہی نین سکھ صاحبِ دیوان اردو ہیں۔ میری مراد یہ ہے کہ فاضل مرتب نے جو دلائل دیے ہیں وہ مستحکم اور قطعی نہیں۔

نین سکھ نام کے ایک صاحب اور گزرے ہیں۔

سید مقبول احمد صمدنی: علامہ میر عبد الجلیل بلگرامی (متوفی ۱۱۳۸ھ) کی سوانح زندگی حیات جلیل میں میر صاحب کے بارہ[۱۲] معتمدان خدمت و ملازمین خاص کا ذکر کرنے کے بعد نین سکھ کا مختصر حال لکھتے ہیں۔

نین سکھ، ان کا منشی اور مقرب خاص تھا۔ جس زمانے میں دربار کی حاضری دونوں وقت دینی پڑتی تھی اور میر صاحب عدیم الفرصت تھے تو افسوس کرتے تھے:

نین سکھ بیمارست لہٰذا جواب خطوط مردم آں جا کہ میرسد نمی شود کہ بنویسم بہر کدام عذر خواہند گفت"

دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

نین سکھ بتاریخ ششم جمادی الآخر ۱۱۲۴ھ بقضائے الٰہی فوت شد۔ متاسف بسیار نمودیم۔ بجز صبر چارہ نیست" (حیات جلیل) : (طبع الٰہ آباد ۱۹۴۱ء)

مؤلف مرحوم نے میر عبد الجلیل کے دو خطوں کی جو مختصر عبارتیں نقل کی ہیں اس سے نین سکھ کے بارے میں یہ کچھ وضاحت نہیں ہوتی۔ اس کی فارسی انشا پردازی کا ذکر تو ہے لیکن اس کی اردو شاعری کے متعلق کسی قسم کا اشارہ نہیں ملتا۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی (۱۲۰۲ھ) مآثر الکرام میں میر عبد الجلیل کے حال میں لکھتے ہیں۔ میر سید محمد سلمہ اللہ تعالیٰ خلف الصدق ایشاں پارہ از منشآت والا جمع کردند"۔ یہ مجموعہ بائیس خطوط پر مشتمل تھا جو میر صاحب نے اپنے صاحبزادے میر سید محمد بلگرامی کو سفر سے بھیجے تھے۔ (حیات جلیل ۲: ۱۷) افسوس ہے کہ اس مجموعۂ خطوط کا کوئی قلمی نسخہ بلگرام یا کسی جگہ دستیاب نہیں۔ ہاں فرامین (ORIENTAL MISCELLANY میں ہے جسے ایک انگریز مستشرق نے مرتب کیا ہے اور جس میں فرامین اور دوسری تحریرات کے ساتھ میر عبد الجلیل کے فارسی مکتوبات کا متن انگریزی ترجمے کے ساتھ کلکتہ سے ۱۷۹۸ء میں شائع ہوا ہے۔ قابل قدر تحریرات کا مجموعہ ہے۔ انگریز مؤلف نے اس کا نام مختلف معاملات پر باپ کے اصلی خطوط بیٹے کے نام رکھا ہے اس کی اشاعت کو اب کوئی دو سو سال ہونے کو آئے یہ کمیاب نہیں گویا نایاب ہے۔ میں نے کلکتہ، لاہور خطوط لکھ کر اس کے حصول کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی میں نے لندن خط لکھا ہے اگر برٹش لائبریری میں یہ مجموعہ حاصل ہو گیا تو اس کا امکان ہے کہ نین سکھ کے بارے میں کچھ مزید اطلاع ملے۔

لیکن یہ نین سکھ، صاحب دیوان سے متقدم معلوم ہوتے ہیں اور اس کا بہت کم امکان ہے کہ ہم جس

نین سکھ کی تلاش میں ہیں وہ یہی نین سکھ ہوں جن کا ذکر حیات جلیل میں آیا ہے۔

نین سکھ نے ایک شعر میں بارھویں صدی کا ذکر کیا ہے:

بارہ صدی کا دور جو سنتے تھے (ہم) نین

بے شک شبہہ تحقیق وہ ہنگام یہی ہے

منشی نین سکھ جن کا سال وفات ۱۱۴۰ھ میر صاحب نے بتایا ہے، یہ صاحب دیوان نین سکھ اسی وقت قرار دیے جا سکتے ہیں جب یہ معلوم ہو جائے کہ نین سکھ نے یہ غزل یا کم از کم یہ شعر اپنی زندگی کے بالکل آخری دور میں ۱۱۴۰ھ سے کچھ پہلے لکھا ہے، لیکن اس شکل میں بھی یہ اشکال رہ جاتا ہے کہ نین سکھ کی زبان اتنی قدیم نہیں معلوم ہوتی۔ خلاصۂ کلام یہ کہ بصورت موجودہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ شاعر نین سکھ جس کا دیوان اردو محفوظ ہے۔ اور جس نین سکھ کا فارسی قطعہ حیدرآباد میں ملتا ہے اور نین سکھ جو میر عبدالجلیل بلگرامی کے متوسلین میں تھا۔ ایک ہیں یا یہ تینوں علٰحدہ علٰحدہ شخصیتیں ہیں۔

نین سکھ کے ایک شعر میں تیرھویں صدی کا ذکر بھی آیا ہے:

وہ تیرہ صدی جو سنے تھے سبھی

یہی ہے، یہی ہے یہی ہے، یہی

اس سے تو یہ خیال بالکل باطل ہو جاتا ہے کہ نین سکھ (متوفی ۱۱۴۰ھ) کا کسی قسم کا تعلق نین سکھ صاحب دیوان سے ہے۔

مرتب نین سکھ صاحبِ دیوان کو پیشے کے لحاظ سے زرگر بتاتے ہیں اور ثبوت میں ان کی تین ابیات پیش کرتے ہیں۔ جن میں تولہ، ماشہ، رتی، چھٹنکی، صراف اور کھوٹا کے الفاظ آئے ہیں۔ شعرائے فارسی و اردو کے کتنوں کے یہاں نجوم، طب اور دوسرے علوم اور مختلف پیشہ وروں کی اصطلاحیں آئی ہیں۔ ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ شعرا نجومی یا طبیب تھے یا زرگر، خیاط، معمار۔

نین سکھ کو مرتب یقینؔ دہلوی کا شاگرد بتاتے ہیں۔ اور سند میں حسب ذیل شعر درج کرتے ہیں جس میں اس نے یقینؔ کے ایک مصرع کی تضمین کی ہے۔ اس میں استناد کی بنیاد اس بات پر ہے کہ نین سکھ نے انھیں "حضرت یقینؔ" لکھا ہے۔ تعظیمی لفظ "حضرت" استعمال کرنے سے یقینؔ کا ان کا استاد ہونا کس طرح ثابت ہو سکتا ہے، ناصر مولف تذکرہ خوش معرکۂ زیبا کا دستور ہے کہ وہ کسی اہم شاعر کے ذکر کے بعد ان کے

تلامذہ کا ذکر کرتا ہے۔ یقین کی فہرستِ تلامذہ میں نین سکھ کا ذکر نہیں۔ اگر وہ یقین دہلوی جیسے شاعر کا واقعی شاگرد ہوتا تو کسی نہ کسی تذکرے میں اس کا ذکر ضرور ملتا۔ شاگردیِ یقین کے لیے کسی مضبوط دلیل کی ضرورت ہے۔

نین سکھ کے مذہب کے بارے میں مرتب کا خیال ہے کہ وہ ہندو مذہب کے پیرو کار ہیں۔ ثبوت میں تین شعر انھوں نے پیش کیے ہیں۔ ان اشعار سے استناد درست نہیں۔ کتنے ہی مسلم شعرا کے دواوین میں اس مضمون کے شعر مل جائیں گے۔ انھوں نے اپنے خیال کے استحکام کے لیے نین سکھ کے حسب ذیل شعر نقل کیے ہیں، ان سے تو معاملہ برعکس نظر آتا ہے۔

تسبیح نماز روزے سے مجھ کو نہیں ہے کام	میں بت پرست ہوں مرا پہچان یہ سخن
کیا ازل سے ہے صانع نے بت پرست مجھے	کبھو بتوں سے پھروں میں، یہ تو خدا نہ کرے
یہ مانگتا ہوں دعا روز حق تعالیٰ سے	بتوں سوائے کہیں دل کو مبتلا نہ کرے

وہ لکھتے ہیں نین سکھ نے اہلِ دل، اہلِ حق، مردم آگاہ، حق آگاہ، جیسی تراکیب بکثرت استعمال کی ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی صوفی کے صحبت یافتہ یا اسی طرح کے ماحول کے پرورش یافتہ تھے۔ وہ عقیدۂ جبر کے قائل تھے، ان کے خیال میں انسان مجبورِ محض ہے۔

اپنی نظر تو نینؔ خدا پر ہے، ہو سو ہو
جو آن بازکھائے وہ لاچار دیکھنا

وہ آگے چل کر لکھتے ہیں: نین سکھ پختہ مذہبی عقائد رکھتے تھے اور خدا کی رزاقیت پر مکمل بھروسا کرنے کے قائل تھے، انھوں نے دو شعر بھی نقل کیے ہیں جو قابلِ توجہ ہیں:

تو ہی رازقِ حقیقی ہے جو دیوے سارے عالم کو	ترے ثانی کوئی یارب کہاں داتا رہو پیدا
جز نام خدا صرف نہ کرنا کبھو انفاس	از بسکہ عبادت کا سرانجام یہی ہے

نین سکھ، اگر شاعر کا نام ہے تو ان کے مذہب کا معاملہ واضح ہے، اور اگر نین سکھ اصلی نام نہیں، بلکہ بعض مسلم شعرا کی طرح کہ جب وہ ہندی میں شعر کہتے ہیں تو اسی مناسبت سے نام بدل دیتے ہیں اور کچھ اور رکھ لیتے ہیں، یہ ان کا قلمی نام ہے۔ تو صورتِ حال مختلف ہو جاتی ہے۔

ہندی شاعری کی تاریخ میں ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ میر غلام نبی بلگرامی اٹھارویں صدی عیسوی کے شاعر ہیں۔ فارسی میں نبی تخلص کرتے تھے، یہ ہندی میں رس لین (محبت میں محو) کے نام سے معروف ہیں۔

ان کی منظوم تصانیف میں انگ درپن اور رس بودھ مشہور ہیں۔ سید ابراہیم، جو "رس کھان" کے نام سے شہرت رکھتے ہیں، ہندی کے ممتاز شاعر گزرے ہیں۔ طالب علی بلگرامی (رس نائک) بھی ہندی کے شاعر ہیں۔ "یتیم" اور "پریمی" بھی مسلمان شاعر ہیں، نام کچھ اور ہیں لیکن ہندی دنیا میں یہ دونوں "یتیم" اور "پریمی" کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ نین سکھ کے مذہب کے بارے میں قطعیت کے ساتھ اسی وقت کچھ کہا جا سکتا ہے جب اس عہد کی تاریخ یا شعرا کے تذکرے سے کوئی معتبر شہادت مل جائے۔

دیوان نین سکھ کا نسخہ منحصر بفرد ہے۔ قیاس ہے کہ یہ مکمل ہو کر کبھی مرتب نہیں ہوا، کلام بھی عام اور مقبول نہ ہوا اس لیے اس کی نقلیں تیار نہ ہو سکیں، اگر نقل نویسوں نے اس کی نقلیں تیار کیں تو وہ ضائع ہو گئیں، اور صرف وہی نسخہ محفوظ رہ گیا جو مصنف کا ذاتی نسخہ تھا۔ یہ نین سکھ کے قلم کا لکھا ہوا ہے اور اسے مرتب نے بیاض کہا ہے۔ حسن اتفاق سے مولوی عبدالحق مرحوم کو یہ نسخہ ہاتھ لگ گیا (اگر انھیں حیدرآباد یا اس کے مضافات میں ملا تو اس سے کچھ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے، اگرچہ قطعی نہیں) اور ان کے ذاتی کتاب خانے میں رہا۔ یہ اورنگ آباد سے دہلی منتقل ہوا، تقسیم ہند کے فسادات میں ضائع ہونے سے بچ گیا اور کراچی پہنچ کر مولوی صاحب کے کتاب خانہ خاص میں محفوظ رہا۔ مولوی صاحب کی زندگی میں کراچی میں ان کے ذاتی کتاب خانے پر بھی افتاد پڑی، بہرحال ان کی وفات کے بعد ان کی مملوکہ ساری کتابیں کتب خانہ انجمن ترقی اردو پاکستان میں محفوظ کر دی گئیں۔ آج کل اردو۔ سندھی جھگڑوں اور لسانی فسادات کی وجہ سے انجمن کے سارے مخطوطات و نوادر حکومت کی نگرانی میں نیشنل میوزیم کراچی میں بھیج دیئے گئے ہیں۔ اور دیوان نین سکھ کا یہ وحید نسخہ اب وہیں محفوظ ہے۔

کسی قدیم شاعر کا دیوان صرف ایک نسخے سے مرتب کرنا، اور الفاظ کی صحیح قرارت متعین کرنا ایک مشکل کام ہے۔ شاید اسی لیے کہ شاعر غیر معروف بلکہ مجہول ہے جس کا صحیح زمانہ حیات بھی معلوم نہیں، اور جس کے اکثر اشعار بھی بے مزہ ہیں، مولوی عبدالحق مرحوم نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ دیوان کی اشاعت تو دور کی بات ہے، اس پر ایک مختصر سا تعارفی مضمون بھی لکھ کر یا کسی سے لکھوا کر شائع نہیں کیا۔ دیوان کی قدامت کی وجہ سے اس کی لسانی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر ظفر اقبال کا ہمیں ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے اس کی ترتیب و اشاعت کی طرف توجہ کی، ان کی یہ کوشش

لائق تحسین ہے۔

جناب ڈاکٹر خلیق انجم، سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) سے اس دیوان کا ذکر آیا، اس کی قدامت و لسانی اہمیت کی وجہ سے وہ اس کی اشاعت پر بخوشی آمادہ ہوگئے، اگر وہ اسے صحیح چھپوا سکے تو ہمارے دہرے شکریے کے مستحق ہوں گے۔ کیا عجب مستقبل قریب میں اس کا کوئی دوسرا نسخہ مل جائے، اس وقت اس کا زیادہ مکمل اور صحیح و مستند متن پیش کیا جا سکتا ہے۔

مختارالدین احمد

۲۰/مئی ۱۹۹۱ء

ناظمہ منزل

۴/۲۸۶ امیر نشان روڈ

علی گڑھ

مقدمہ

نین سکھ کے حالات واشعار کسی تذکرے یا ذیلی مآخذ میں نہیں ملتے ہیں۔ اور نہ انھوں نے دیوان میں ایسے اشارے دیے ہیں کہ جن کی مدد سے ان کی زندگی کا خاکہ مرتب کیا جا سکتا۔ وہ کہاں اور کب پیدا ہوئے، زندگی کہاں اور کیسے گزاری، وفات کہاں اور کب پائی؟ ان سب کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ ان کے دیوان میں دو شعر ایسے مل سکے کہ جن سے نین سکھ کے عہد کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے:

بارہ صدی کا دور جو سنتے تھے نین　　بے شک شبہ، تحقیق وہ ہنگام یہی ہے

وہ تیرہ صدی جو سنے تھے سبھی　　یہی ہے، یہی ہے، یہی ہے، یہی

پہلے شعر میں بارہویں صدی اور دوسرے میں تیرہویں صدی کے ذکر سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ نین سکھ کا زمانہ بارہویں صدی کے وسط سے تیرہویں صدی کی ابتدائی چند دہائیوں تک کے عہد پر محیط ہے۔ اس سلسلے میں "مسدس شہر آشوب" کے دو بند ہماری مزید رہنمائی کرتے ہیں:

ہے عجب کچھ یہ جاٹ کی سرکار　　خلق ناخوش، سپاہ سب بیزار

دیر طلبی سے سخت ہو لاچار　　اکثر اس بیت کو پڑھیں ہیں پکار

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی و بحالی ہے

پاجی عالم ہے بادشاہی میں　　مرد آدم پھریں تباہی میں

کیا کہوں میں جناب الٰہی میں　　اب کے پھر گٹھلی ہے چھماہی میں

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے

جس پہ برطرفی و بحالی ہے

جاٹ گردی، شاہ عالم کے عہد کے اہم واقعات میں سے ہے۔ شاہ عالم کی تاریخ مسند نشینی ۱۱۷۳ھ اور

تاریخ وفات ۱۲۲۱ھ سے نہ صرف مذکورہ شہر آشوب کے سن کی توقیت ہوتی ہے بلکہ نین سکھ کے عرصہ حیات کو بھی ایک دائرے میں محدود کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے قرائن سے نین سکھ کی حیات کو بارہویں صدی کے نصف آخر اور تیرہویں صدی کی ابتدائی چند دہائیوں کے مابین متعین کر چکے ہیں، مذکورہ شہر آشوب میں بیان کردہ حالات سے اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے "تذکرۂ مخطوطات" میں درج ذیل قطعۂ تاریخ کو نین سکھ نام کے ایک شاعر سے منسوب کیا ہے:

نگہدار مولا علی در امن　　　مبارک کناں نظم جان و دکھن
زہاتف ندا آمد، آمین بگو　　　کہ ملک علی صوبہ شد صف شکن

ڈاکٹر زور نے لکھا ہے کہ نین سکھ نے یہ قطعہ صف شکن خاں، مجاہد جنگ، ارمان حیدرآبادی کے حیدرآباد کا صوبہ دار مقرر ہونے کے موقع پر پیش کیا تھا۔ یہ واقعہ ۱۱۶۷ھ کا ہے۔ (ڈاکٹر محی الدین قادری زور "تذکرہ مخطوطات" جلد چہارم، ص: ۲۶۲۔ طبع ثانی: ترقی اردو بیورو، دہلی ۱۹۸۴ء) یہی اطلاع افسر صدیقی نے بھی دی ہے (افسر صدیقی، فہرست مخطوطات، انجمن ترقی اردو، جلد چہارم، ص: ۲۰۲) مذکورہ بالا قطعہ کا اس نین سکھ سے جس کا دیوان ہم پیش کر رہے ہیں انتساب ہماری رائے میں درست نہ ہوگا۔ اس کے متعدد دلائل موجود ہیں۔

ا۔ اگر یہ قطعہ ہمارے نین سکھ کا ہے تو اسے ان کے دیوان میں بھی شامل ہونا چاہیے تھا لیکن دیوان میں مذکورہ قطعۂ تاریخ درج نہیں۔ اس کے علاوہ ایک بات اور: کیا نین سکھ نے ساری زندگی میں صرف ایک ہی قطعۂ تاریخ لکھا؟ اگر زیادہ لکھے تو انھیں کلاً یا جزواً دیوان میں شامل ہونا چاہیے تھا۔

۲۔ نین سکھ کا حیدرآباد جانا ثابت نہیں۔ اگر وہ حیدرآباد جاتے تو وہاں کی "سرکاروں" یا دربار میں باریابی اور حصولِ مقصد کے لیے قصائد ضرور لکھتے؛ موجودہ صورت میں ان کے دیوان میں قصیدہ تو کجا، کسی کی شان میں چند مدحیہ اشعار تک نہیں ہیں۔

۳۔ مذکورہ بالا قطعہ تاریخ فارسی میں ہے۔ نین سکھ کے پورے دیوان میں فارسی کا ایک بھی شعر نہیں۔ اگر وہ فارسی میں کچھ بھی لکھتے تو زیر نظر دیوان میں کچھ نہ کچھ تو درج ہوتا۔

دلائل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ قطعۂ تاریخ کا زیر بحث نین سکھ سے انتساب درست نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ اس نام کی کوئی اور شخصیت حیدرآباد میں گزری ہو۔

نین سکھ کے دیوان میں ۱۹۰ اشعار کی ایک مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں بھوپال کے حالات بیان کیے

گئے ہیں اور ایک واقعے کی تفصیلات رقم کی گئی ہیں۔ اس مثنوی میں بیان کردہ تفصیلات سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بیان ذاتی مشاہدہ پر مبنی ہے۔ نیز اس مثنوی سے نین سکھ کی بھوپال سے کچھ نہ کچھ نسبت بھی واضح ہوتی ہے۔

نین سکھ کی علمی صلاحیت اوسط درجہ کی تھی۔ انھوں نے متعدد مقامات پر 'عنداللہ'، 'حق تعالیٰ'، 'جزاک اللہ' جیسے عربی الفاظ برمحل استعمال کیے ہیں۔ علاوہ ازیں "مخمس شہر آشوب" میں ایک قرآنی آیت "وقنا عذاب النار" بھی بطور مصرع استعمال کی ہے۔ جہاں تک فن شاعری کا تعلق ہے، اس سے نین سکھ کو بس معمولی واقفیت تھی۔ بالخصوص عروض سے ان کی ناواقفیت کا ثبوت دیوان میں متعدد مقامات پر فراہم ہوتا ہے۔

نین سکھ پیشے کے لحاظ سے زرگر تھے۔ انھوں نے متعدد اشعار میں اپنے پیشے کی اصطلاحات نظم کر کے اس کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

وہ جو اک تولہ کئی ماشہ تھی تم سے یاری	رتی بھر بھی نہ رہا اس میں کچھ آثار کہیں
کھوٹا ہو اگر دام ہی اپنا یارو	صراف کو پھر عیب عبث لیتے کیوں
ذرا سے دیکھتے ہی یہ بدلی نظر تری	من میں چھٹنکی سیر پیچھے گھٹ گیا ہے دل

نین سکھ کو غالباً انعام اللہ خان یقین سے تلمذ حاصل تھا، کیوں کہ انھوں نے ایک شعر میں اس طرف اشارہ کیا ہے:

قول ہے حضرت یقین کا تب تو یوں کہتا ہے نین	"بھر کے دل رو لیجیے یہ چشم گریاں پھر کہاں"

اس شعر میں یقین کے لیے "حضرت یقین" کے تعظیمی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو یقین سے ان کے تلمذ کے گمان کو تیقن کی سرحدوں تک پہنچاتے ہیں۔ انھوں نے یقین کے علاوہ سودا اور میر تقی میر کے مصرعوں کی بھی تضمین کی ہے لیکن ان کے لیے ایسے تعظیمی الفاظ نہیں استعمال کیے ہیں:

راست ہے دنیا کا احوال، بقول سودا	"ایک زنداں ہے کہ جس میں ہیں گرفتار کئی"
اب کیا کہوں نصیبوں کو سچ ہے، بقول میر	"ایدھر تو ہم سے تم پھرے اودھر خدا پھرے"

اس غیر حتمی داخلی شہادت کے علاوہ یقین سے ان کے تلمذ کا ثبوت کہیں سے نہ مل سکا۔ نین سکھ نے اپنے استاد کی مہربانیوں کا بھی برملا اعتراف کیا ہے:

مہر استاد کی سے دیکھو تو اس نین کے تئیں
شعر کہنے کا کبھی ڈھب نہ ہوا تھا سو ہوا

اس دیوان کی ترتیب کے وقت تک نین سکھ معمر ہو چکے تھے جس کا اشارہ متعدد اشعار میں ملتا ہے:

غنیمت ہے مجھ کو بزرگی یہ اتنی   میں طالب ہوں تیرا اور تو جان من ہے
ہو سکے سب ہوس دے لیکن   بوڑھے کو کس طرح جواں کیجیے

نین سکھ نے اپنی شاعری کی وجہ جواز یوں بیان کی ہے:

دنیا میں یادگاری کو کرتا ہے فکر نینؔ
اس کا بھی کوئی دنوں میں دیوان دیکھنا

ان کے نزدیک فکر سخن، نام کی بقا کا بہترین طریقہ ہے۔ اس شعر کی تخلیق کے وقت تک ان کا دیوان مکمل نہیں ہوا تھا۔ "کوئی دنوں" سے مترشح ہوتا ہے کہ اس وقت تک وہ خاصی تعداد میں شعر کہہ چکے تھے اور دیوان کی تکمیل کچھ ہی عرصہ کی بات تھی۔ نین سکھ شاعری کو فن شریف، قابلیت کی نشانی اور باعثِ افتخار جانتے تھے۔ انھوں نے صاحب سخن کو افلاطون کے ہم مرتبہ قرار دیا ہے:

جسے شعر کا شوق ہے رات دن   وہ تو قابل ہے اس کی کیا بات ہے
جو کوئی عصر میں ہے صاحبِ سخن   اسے کہیے بے شک فلاطون زمن

نین سکھ ہندو مذہب کے پیرو کار تھے۔ انھوں نے متعدد مقامات پر فخریہ لہجے میں اس کا اظہار کیا ہے:

تسبیح، نماز، روزے سے مجھ کو نہیں ہے کام   میں بت پرست ہوں، مرا پہچان یہ سخن
کیا ازل سے ہے صانع نے بت پرست مجھے   کبھو بتوں سے پھروں میں، یہ تو خدا نہ کرے
یہ مانگتا ہوں دعا روز حق تعالیٰ سے   بتوں سوائے کہیں دل کو مبتلا نہ کرے

نین سکھ نے اہل دل، اہل حق، مردم آگاہ، حق آگاہ، دل آگاہ جیسی اصطلاحات بکثرت نظم کی ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی صوفی کے صحبت یافتہ یا اس طرح کے ماحول کے پروردش یافتہ تھے۔ وہ عقیدہ جبر کے پیرو کار تھے۔ ان کے خیال میں انسان مجبور محض ہے:

جو حق کی رضا ہے، سو ہی سچ ہے   جھوٹا ہے سب اختیار اپنا
اپنی نظر تو نین خدا پر ہے، ہو سو ہو   جو آن باز کھائے سو لاچار دیکھنا

نین سکھ پختہ مذہبی عقائد رکھتے تھے اور خدا کی رزاقیت پر مکمل بھروسہ کرنے کے قائل تھے:

تو ہی رازقِ حقیقی ہے جو دیوے سارے عالم کو — ترے ثانی کوئی یارب کہاں داتار ہو پیدا
صانع مرادہ ہے کہ ہو کیسی رہی چوب خشک — سو سو دفعہ وہ چاہے تو اس کو ہری کرے

وہ خدا سے لو لگانے اور دنیاوی ہوا و ہوس سے دور رہنے کو پسند کرتے تھے:

یہ نین سکھ تری یاد میں مسرور رہے دائم — یا بار خدا اس کا یہ اطوار نہ چھوٹے
جز نام خدا صرف نہ کرنا کبھو انفاس — از بکہ عبادت کا سرانجام یہی ہے

نین سکھ نے زمانے کی بدلتی ہوئی قدریں، مفاد پرستی، ناپرسی، بے توقیری، ملمع سازی، سپاہیوں، علماء اور ہنر مندوں کی بے قدری، جاہلوں کی لاف وگزاف، پست لوگوں کا بلند ہو جانا، ہوس مال رکھنے والوں کا صاحب عزت و رتبہ ہونا اور عوام کو پریشان کرنے والے منصب داروں اور اہلکاروں کی جا بجا مذمت کی ہے:

یاروں میں جو یاری ہے سو سب باتیں ہیں سن لو — دنیا میں کہاں ہے کہیں کوئی یار کسی کا
نجیبوں سے کیوں کر خوشی ہو تمہاری — کمینوں کا ہے دور حضرت سلامت
پوچھے کوئی کسی کو یہ امکان ہی نہیں — ناپرسی کا یہ دور انوکھا کھلا پھرا
بے ہنر ہو گئے ہیں اب ممتاز — قابلوں کا شمار کوئی نہیں ہے

نین سکھ کے کلام میں مکمل طور پر ہندوستانی فضا جھلکتی ہے۔ وہ دور از کار تشبیہات اور بعید از فہم استعارات سے کام نہیں لیتے، وہ سامنے کی چیزوں کو بطور تشبیہ استعمال کرتے ہیں۔ انسانی عزم و ہمت کو برانگیختہ کرنے کے لیے اردو شاعری میں دریائے گنگا کو بطور مثال پیش کرنے کی اولین طرح غالباً ان ہی نے ڈالی ہے:

بڑھی جس کی ہمت بڑھا اس کا ٹھاٹ
نہ مانو تو جا دیکھو گنگا کا پاٹ

ان کی شاعری میں محاوروں کا استعمال بہت کم ہوا ہے۔ انھوں نے جہاں محاورہ باندھا ہے تو پست و بلند کے تصور کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ شاعری میں سوقیانہ محاورہ یا پست و فحش لفظ استعمال کرنے سے قطعاً نہیں ہچکچاتے:

گو کہ ہے آہ اپنی بے تاثیر — پر رقیبوں کو ہینگ ہگاتی ہے

اپنی کرتے ہیں آپ ہی تعریف　　ان کے تئیں کو تو چوتیا کہیے

انھوں نے اپنے کلام میں بہت سے غیر مانوس اور متروک الفاظ استعمال کیے ہیں جن کی فہرست درج ذیل ہے:

آب اوزاں، آسیا، اچرج، ادھوتر، اگری، اپاو۔

بھونچیا، بھوتیا، بھاگن، بھنڈی، باٹ، بچلنا، بھتیک، بھائیں، باچھڑی، بے بند، بھیتر، بھیدبھاؤ۔

پل، پاسیدھیا، پھلیل، پرات، پیچ ہار، پسیری۔

جٹا، جھمکڑا، پچیرہ، بجیرا بند، چھیا، چھٹہ، چٹ لگن، چٹنی، چبلنا، چھیکا، چھیبنا، چھٹ، چکرت، پچا۔

خنجری، خندوں، خوگیر۔

دہاشہ، دھمیا، دھندھوکال، دھتورا۔

ڈنڈیل، ڈاہ۔

زری باب۔

روب، رُپ، رنجک۔

سرس، سرمور، سارنگ، سمر شہتوت، سہج، سیتی، سوگند، سر بری۔

شباشب، شیے، شفقی۔

غربال۔

فروعی۔

قلبتاں، قابوچیں۔

کھور، کٹی بھیر بھاڑ، کھاج، کھنڈی، کانا، کپوت، کھان پان، کنگ، کنے، کھل، کپور، کام دار، گنگور، گیھان، گھور، گھڑیال، گوہد، گیپائی، گونیدے۔

مدھجھڑا، ماٹ، مشر، من ہرن، مشک، مردنگ، مواشی، مستتر، موگیا، مرنڈا۔

نت نپٹ، نانکار۔

وار پار۔

ہاٹ۔

پرات۔

مخطوطہ کی کیفیت

دیوان نین سکھ کا مخطوطہ ۲/۱×۶ ۲/۱×۹ سائز کے ۶۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ نسخہ اوسط درجہ کے خط نستعلیق میں بظاہر مصنف کے ہاتھ کا تحریر کردہ ہے۔ نسخہ معمولی طور پر کرم خوردہ ہے۔ کاغذ، مٹیالا دبیز ہے اور کتابت سیاہ روشنائی سے کی گئی ہے۔ قومی عجائب گھر کراچی میں محفوظ کردی گئی ہیں۔ اس کا نمبر فا ۵۴/۱ ہے۔ نسخہ کا آغاز غزلیات سے ہے۔ صفحہ ۳۰ تک الف، ت، ن، ی، ع، ف، و، ل، ط، اور ک کی ردیفوں میں غزلیں ہیں۔ اس ضمن میں کسی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ صفحہ ۳۱ سے ۳۹ تک، ۱۴۷ اشعار کی ایک مثنوی ہے۔ اس کے بعدہ، ی، الف، ظ، اور ز کی ردیفوں میں غزلیں ہیں جن کا سلسلہ صفحہ ۴۳ تک ہے۔ صفحہ ۴۴ سے ۴۹ تک ۱۲ بند کا ایک مخمس شہر آشوب ہے۔ اسی صفحہ سے ایک مسدس شہر آشوب صفحہ ۵۵ تک ہے۔ اسی صفحہ پر ۱۳ اشعار پر مشتمل ایک غزل شہر آشوب ہے۔ صفحہ ۵۶ سے ۵۹ تک د، س، ی، الف، ن کی ردیفوں میں ۶ غزلیں ہیں۔ اسی صفحے پر دو رباعیاں اور دو متفرق شعر ہیں۔ صفحہ ۶۰ اور ۶۱ پر ۱۲ فردیات اور چند مطلعے درج ہیں۔ صفحہ ۶۱ کے آخر میں بطور ترقیمہ صرف یہ عبارت درج ہے؛ "خاتمہ بقلم نین"

دیوان نین سکھ کا یہ نسخہ ناقص الاوسط ہے۔ صفحہ ۱۵ کا آخری شعر یہ ہے؛

ساۓ کو میرے لیے جہاں میں
داماں اگرچہ ہو، تیرا ہی ہو

مذکورہ صفحہ کے آخر میں بطور ترک "نکلا خورشید" کے الفاظ درج ہیں۔ جس کے مطابق اگلی غزل کا آغاز "نکلا خورشید" سے ہونا چاہیے، لیکن صفحہ ۱۶ پر نہ صرف مذکورہ ترک کے مطابق شعر نہیں ہے بلکہ اس صفحہ کا آغاز کسی دوسری نامکمل غزل کے اس شعر سے ہوتا ہے؛

آیا کبھو نہ بر میں مرے پیار کر کے تو
اس آرزو میں عمر ہی ساری بسر کردی

اس غزل کا مطلع اور بقیہ اشعار جس صفحہ پر درج تھے وہ ضائع ہو چکا ہے۔

یہ دیوان مصنف کے قلم کا تحریر کردہ معلوم ہوتا ہے۔ اور غالباً یہ اس کی بیاض ہے جس میں اس نے بغیر کسی ترتیب کے اپنا کلام تحریر کیا ہے۔ اس نے متعدد مقامات پر نظرِ ثانی، ترمیمات اور اضافوں کا عمل کیا ہے ترمیم و تنسیخ کا عمل مصنف کے علاوہ اور کوئی نہیں کرسکتا ہے۔ ترمیمات، تنسیخات اور اضافوں کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

۱۔ پہلے اس طرح لکھا گیا تھا: بجیبوں سے ہرگز خوشی نئیں تمہاری
ترمیم شدہ: بجیبوں سے کیونکر خوشی ہو تمہاری

۲۔ پہلی روایت: ہر روز مجھ کو عشق سے کیوں مانع ہوئے ہیں
ترمیم شدہ: . . . . . روکتا ہے تو

۳۔ پہلی روایت: آسماں پھٹ کے گر پڑا سارا
ترمیم شدہ: آسماں سارا ہو گیا غربال

۴۔ پہلی روایت: بہتر ہے سب سے دوستی اللہ میاں کی نین
ترمیم شدہ: بہتر ہے سب سے دوستی اپنی خدا کی نین

۵۔ پہلی روایت: باغ میں کیا مزا ہے جانے کا — جب تلک ساتھ گلعذار نہ ہو
ترمیم شدہ: کیا مزا ہے شراب پینے کا — جب تلک پاس گلعذار نہ ہو

۶۔ دیکھتے ہی اس بت خوش خراماں کی طرف — پھر کبھو ہرگز نہ آیا میں گلستاں کی طرف

شاعر نے اس مطلع کے پہلے مصرع پر نظرِ ثانی کر کے لکھا "دیکھ کر ایسا جھکا" لیکن بعد میں اس ترمیم شدہ ٹکڑے کے آغاز و اختتام پر 'لا' لکھ کر سابقہ قرأت ہی کو بحال رکھا ہے۔

۷۔ صفحہ ۲۱ پر ایک غزل درج ہے: کس سیتی دل کا مدعا کہیے . . . الخ

یہ غزل دس اشعار پر مشتمل تھی۔ شاعر نے بغلی حاشیوں میں چار اشعار کا اضافہ کیا اور بقیہ دس اشعار میں بھی جزوی تبدیلیاں کیں لیکن بعد کو اسی غزل کے سات اشعار منتخب کر کے انھیں صفحہ ۲۲ پر درج کیا گیا ہے اور صفحہ ۲۱ پر خط تنسیخ پھیر دیا گیا ہے۔

املائی خصوصیات: نین سکھ بے حد غلط نویس تھا۔ وہ اکثر الفاظ کو بے موقع توڑ کر یا جوڑ کر لکھتا ہے۔

ؔ اس عہد کے بلکہ بعد کے عہد کے بعض شاعروں اور نقل نویسوں کے یہاں بھی یہ املائی خصوصیات ملتی ہیں۔ اور 'بیجان' اور 'دلمیں' تو ہمارے عہد کے بعض لوگ اب بھی لکھتے ہیں۔ خلیق انجم۔

جوڑنے کی مثالیں :

ایدل (اے دل) متکر (مت کر) بیجان (بے جان) دلمیں (دل میں)

سارےعالمکو (سارے عالم کو) بیشعوریکا (بے شعوری کا) بیطرح (بے طرح) جسگھڑی (جس گھڑی)

لوڈیونسے (لونڈیوں سے) اسمصرعپر (اس مصرع پر) سچکہ (سچ کہ)

توڑنے کی مثالیں :

چو بھا (چبھا) اٹھ کھیلی (اٹھکھیلی) لیجہ یے (لیجیے) ، خوش آمد (خوشامد) کبھی وہ الفاظ کا املا یکسر تبدیل کر دیتا ہے مثلاً : حالم (حاتم)

ڈ، ڑ اور ٹ پر چار نقطے لگاتا ہے : بڈھا (بڈھا) ، اڑ (اڑ) پھوٹ (پھوٹ) چھوتے (چھوٹے) طراقہ (طراقہ)

یاں کو یہاں اور واں کو وہاں لکھتا ہے۔

وہ کو وو بھی لکھتا ہے۔

پیش کی حرکت ظاہر کرنے کے لیے اکثر واو کا استعمال کرتا ہے، مثلاً : اوس (اُس) ، اون (اُن) ہائے مخلوط کو بعض جگہ حذف کر دیتا ہے، مثلاً سات (ساتھ) ہات (ہاتھ)

بعض الفاظ میں 'ہ' کا اضافہ کر دیتا ہے ، مثلاً ؛ جھوٹھ (جھوٹ) ، تڑپھ (تڑپ)

ہائے مخلوط کو ہائے ہوز سے لکھتا ہے : پہر (پھر) ، پہل (پھل)

غیر منقوط نون کی جگہ بھی منقوط لکھتا ہے ، مثلاً : مین (میں) ، نہین (نہیں) ، یون (یوں)

گاف پر ایک مرکز لگاتا ہے ، مثلاً ؛ کر (گر) ، کریباں (گریباں) ، کریاں (گریاں)

یائے مجہول کی جگہ بھی یائے معروف استعمال کرتا ہے ، مثلاً : کی (کے) ، بری (برے)

کبھی یائے معروف کی جگہ یائے مجہول استعمال کرتا ہے، مثلاً : دلدارے (دلداری) ، نیکے (نیکی) ، دل آزارے (دل آزاری)

زبان :

تذکیر و تانیث : دیوان کی زبان میں آج کل کے قاعدے سے اختلاف ملتا ہے مثلاً گلے فغاں اور جاں کو مذکر باندھا ہے :

شمع کی آشنائی ہیں دیا آخر کو جاں اپنا
سناؤں کس طرح اس کو میں فریاد و فغاں اپنا

کہیں کہیں واو عطف کا استعمال عجیب نامانوس طور پر ملتا ہے :

چاہو سو ہو و پر مجھے ایک بار دیکھنا

افعال :

دیوان میں افعال (۵) کی متعدد مثالیں ملتی ہیں :

قابو میں آوتا تو نہیں ہے مرے رقیب
ہر نفس کو حیران کرے سووتے جگتے
تہے آونے کی خبر سن کے پیارے
آقا ہو کے بجاوتے مردنگ

ہندی کے مخصوص افعال یا مصادر سے بنے ہوئے افعال بھی ملتے ہیں : چبلنا ، چھیونا ، بھاگنا ، چھیکنا نون غنہ کے حذف یا اضافے سے واحد اور جمع کے صیغے بعض مقامات پر خلط ملط کر دیے ہیں ، مثلاً :

اتنا ہیں سخن مان تو اک بار کسی کا
وہ تیرہ صدی جو سنے کتے سبھی

دیوان میں جدید عہد کی زبان کے برعکس متعدد مقامات پر نون کا استعمال ملتا ہے ۔ یہ عمل اسم ، فعل ، حرف ہر جگہ پایا جاتا ہے :

یں نیں تو اس کو خوب ہی زیر و زبر کیا
جنے جدھر کو چاہا دل اپناں ادھر کیا

متعدد مقامات پر ہائے ہوز کے اضافے سے بعض الفاظ تلفظ کیے گئے ہیں :

اس قدر دل یہہ بے قرار نہ ہو
بولتے ہو نہہ کہیں مردم آگاہ غلط

ہائے مخلوط کے اضافے سے بھی بعض الفاظ تلفظ کیے گئے ہیں : جھوٹھ ، ترڑپھ ، ہونٹھ

متعدد ساکن حروف کو متحرک استعمال کرتا ہے ، مثلاً :

مت مل بتوں سے مجھ سے یہ آکر ذِکر کیا

خنک ہو گئے جیوں برف کی ڈلی

عذل کے لیے وہ پھرے کو بہ کو

یہ کہہ کر کے جلدی بٹھایا امن

متعدد مقامات پر مخفف الفاظ کو مشدد تلفظ کرتا ہے:

تجھے ہجّوم میں ہم دیکھ کر یوں تاڑ جاتے ہیں

رحم ذرّا بھی نہ لانا وہ دل آزار کہیں

ہر فنّ میں عیار ہو بس تم کو بھی دیکھا

حروف علت (و، الف، ی) کے استعمال میں فراخدلانہ آزادی کا ثبوت دیوان میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ نین سکھ اکثر مقامات پر ان حروف کو دبا کر تلفظ کرتا ہے، لہٰذا دیوان کی قرارت کے دوران اس امر کو بطور خاص ملحوظ رکھا جائے ورنہ متعدد اشعار خارج از بحر معلوم ہوں گے۔

ظفر اقبال

شعبۂ اردو

ٹوکیو یونیورسٹی، جاپان

غزلیات

کب دخل تری بزم میں ہو یار کسی کا
مشکل ہے پہنچنا نہیں وہاں یار کسی کا

شکوہ نہ کرائے دل کبھو زنہار کسی کا
ہو جائے مبادا تو گنہ گار کسی کا

جو بات سپتے کی ہو اسے سنتے ہی پی جا
کہیں فاش نہ ہو راز خبردار کسی کا

یاروں میں جو یاری ہے سو سب باتیں ہیں سن لو
دنیا میں کہاں ہے کہیں کوئی یار کسی کا

کھٹکے ہے جگر بیچ مرے، تیر کی مانند
بے طرح چبھا چشم میں یہ خار کسی کا

مختار ہے اب نیکی بدی، چاہے سو کرے
اس دور میں نہیں کوئی روادار کسی کا

اس بھانت ملے غیر سے پی پی کے قدح بھنگ
جس طرح کر لڑکا ہو کوئی خوار کسی کا

گلیوں میں پھرے سیف نکالے ہے شب و روز
یہ شوخ تو ہے درپے آزار کسی کا

دلداری تو ڈوبی ہے، دلآزاری بھی مت کر
اتنا ہی سخن مان تو اک بار کسی کا

خوش کیجے کسو کو تو سبھی آفریں بولیں
کیا فائدہ دل لیجیے بیزار کسی کا

کہیے جو بھلے کی تو بری لگتی ہے تجھ کو
خاطر میں نہیں تیرے مگر پیار کسی کا

تب حسن(و) قبح عشق کا ہووے تجھے معلوم
جب ہووے کہیں تو بھی گرفتار کسی کا

پھر نین تجھے دیکھے کوئی ایک نظر بھی
پھر کچھ نہ رہے اس کو سروکار کسی کا

تماشا ہے اگر خلقت سبھی زردار ہو پیدا
نہ پوچھے کوئی کسی کو پھر عجب آزار ہو پیدا

نہیں ہو تو بلا سے مت کوئی دلدار ہو پیدا
پر اتنا تو کہیں ہو، موجب درکار ہو پیدا

توئی رازق حقیقی ہے جو دیوے سارے عالم کو
ترے ثانی کوئی یارب کہاں داتار ہو پیدا

یہی ہے آرزو دل میں کہ کردے دیدۂ روشن
تو ہر اک ذرّہ سے تجھ کو ترا دیدار ہو پیدا

ہیں خوبصورت بہت اب بھی اور آئندہ بہت ہوں گے
یہ ممکن ہے کوئی تجھ سا پری رخسار ہو پیدا

نہ فرما غیر کو کچھ اب، سو تو اپنے طالب کے
غنیمت ہے اسے تیری اگر بیگار ہو پیدا

ترے خوش قد کی رفتاری کو دیکھے سرو گلشن میں
تو پھر بے شک قیامت کا وہاں آثار ہو پیدا

یہ جتنا سبزہ ہے جگ میں، نہ پاوے خط کے سبزے کو
زمیں کو پھوڑ کر قصداً اگر صد بار ہو پیدا

جدھر تو ناز سے دیکھے، اٹھا کر چشم مخمور میں
بجائے خس اُدھر فوراً گل و گلزار ہو پیدا

پڑھے کوئی شعر ناموزوں اگر قابل کی محفل میں
تو ہر اک حرف سے اس کے عجب تکرار ہو پیدا

بغیر از وصل کے، اس کی دوا نہیں ہے طبابت میں
ازل سے جو کوئی تجھ عشق کا بیمار ہو پیدا

اگر تو گاہ باشد پیارے ہم سے ہنسے بولے
تو آنکھوں میں رقیبوں کے بڑا ہی خار ہو پیدا

اگر کوئی نین پاوے تجھ سخن کے طرز رنگین کو
تو ہر مصرع سے تیرے مطلع انوار ہو پیدا

بہتوں نے جسے عرش پہ بے جان میں دیکھا
ہم نے تو اسے جیتے جی اس جان میں دیکھا

مجنوں تھا ہم آغوش لیے لیلیٰ کو اپنی
یارو یہ تماشا میں بیابان میں دیکھا

جاوے کبھی پھر آوے کبھی کئی شکل سے ہر بار
چکر سیں کہاں، پر یہ مزا تان میں دیکھا

فاقہ ہی رہے روز، نہ کچھ کھانا نہ پینا
یہ دور میں نے حضرت رمضان میں دیکھا

سب رات لڑیں ٹوٹنے چھچھوندر کی لڑائی
بھونچکا میں نے چھوٹتے شعبان میں دیکھا

گو میوے ہزاروں ہیں اور ہیں نعمتیں لاکھوں
پر سب سے سرس ہم نے مزا نان میں دیکھا

ہر شعر ترڑاقے کا، ہر اک بات تماشا
ایسا تو میں نے سودا کے دیوان میں دیکھا

ہر نفس کو حیران کرے سوتے جگتے
اس فن کو میں حضرتِ شیطان میں دیکھا

کچھ بات کہے ہنس کے تو جھڑتے ہیں ترے پھول
لحظہ یہ ترے اس لب خندان میں دیکھا

ہنستے ہی کرے دیر نہ لڑتے ہی کرے دیر
یہ طور ترا طفلکِ نادان میں دیکھا

گو سرو ترے قد کا ساموزوں تو نہیں ہے — پر کہنے کو لاچار میں بستان میں دیکھا
جو چاہ زنخ نہ بچ گرا، پھیر نہ نکلا — ایسا تو کئی بار میں ہر آن میں دیکھا
کوچے کا گیا تیرے، کوئی پھرتا نہیں ہے — میں خوب ہی کر غور گریبان میں دیکھا

تجھ چشم کی تشبیہ کو نرگس کا ذکر کیا
سو بار اسے میں نے گلستان میں دیکھا

جس دم چمن میں سہج ہی تو نے گزر کیا — گل نے نثار تجھ پہ تمام اپنا زر کیا
بلبل کی، گل کی، وصل میں کیا خوب بن گئی — گویا بہم کسی نے یہ شیر و شکر کیا
جب دور دور ظلم کا دیکھا ترا جہاں — تب ہار کر کے یار میں آہن جگر کیا
کیا تاب ہے رقیب کی ہو سامنے ترے — میں نے تو اس کو خوب ہی زیر و زبر کیا
واعظ کی بے شعوری کا میں کیا بیاں کروں — ق — مت مل بتوں سے، مجھ سے یہ آکر ذکر کیا
سنتے ہی سوختہ ہو کے کہا میں نے اے — جا خیریت سے، دیکھ خدا کا میں ڈر کیا
ملتا ہوں گل رخوں سے تو میں اب، آپ کو — اس میں تری گرہ کا بتا کیا ضرر کیا
عاشق تو سب نڈر ہیں کسو کے ہی بس کے نئیں — جن نے جدھر کو چاہا دل اپنا اُدھر کیا
بارے وہاں چشم ؟ ، سے یہ جھکے ہی اٹھ گیا — میں بھی کلام طول کو پھر مختصر کیا
ہر چند ہم نے غم میں ترے چشم تر کیا — تجھ سنگ دل میں لیک نہ کچھ اثر کیا
جی دے چکا ہوں ہجر میں فریاد کیا کروں — آہ و فغاں و نالہ ترے سب نذر کیا
نے خط، نے پیام، نہ کچھ بھیجنا سلام — نے آپ ہی اب تلک کبھو ایدھر گزر کیا
آنے کی کہہ گئے تھے سو آئے بھلے شتاب — تارے ہی گنتے شام سے یاں تو سحر کیا
میرا کیا تو سارا وہ برباد ہی گیا — تو نے جو کچھ کیا سو میاں خوب تر کیا
فرہاد سے غریب کو شیریں کے عشق نے — رسوا کیا، خراب کیا، در بدر کیا

منزل کو اپنی ، زود ہی پہنچا ہے یقیں
جن نے کہ اس جہان سے عزم سفر کیا

کیا بے طرح سے جاتی ہے اک جان دیکھنا / یارو خدا کے واسطے یہ آن دیکھنا
کیا حسن کیا غرور سے آتا ہے بے نظیر / اس شوخ دلربا کی ٹک اک شان دیکھنا
اندازا اس کی خوبی کا کہتے نہ بن سکے / مکھڑے پہ اس کے زلف پریشان دیکھنا
غنچہ دہن کا سیر کرو شوق سے لیکن / چاہ زنخ ہے آ کے مہربان دیکھنا
منظور اپنی طبع کو ہرگز نہیں ہے یہ / مجنوں کو دشت بیچ میں حیران دیکھنا
کر کے خضاب ڈاڑھی کو نکلا ہے آج شیخ / اس بے حیا کی صورتِ شیطان دیکھنا

دنیا میں یادگاری کو کرتا ہے فکر یقیںؔ
اس کا بھی کوئی دنوں میں یہ دیوان دیکھنا

کیا اس کو لکھوں پیام اپنا / لیتا ہی نہیں سلام اپنا
اس دل نے کیا ہے کام اپنا / اس بت کو کیا ہے رام اپنا
چاہوں نہ ترے سوا کسی کو / شیوا ہے یہی مدام اپنا
دیتا ہے گلوں کے تئیں طراوت / یاں تک ہے یہ تر، مشام اپنا
افسوس تری گلی میں ہم نے / قصہ ہی کیا تمام اپنا
دل لیلیٰ کو دے کے دشت میں جا / مجنوں نے کیا ہے نام اپنا
پھندے میں لیا مجھے لبھا کر / یہ زلف سیہ ہے دام اپنا
لے مفت میں مجھ سے نقد دل کا / مفسد نے کیا طعام اپنا

تس پہ غضب کہ یقیںؔ وہ شوخ
سنتا ہی نہیں کلام اپنا

یار کا وصل شبا شب نہ ہوا تھا، سو ہوا / ساغر عشق لبالب نہ ہوا تھا، سو ہوا
لے چکا دل کو وہ جب ہاتھ سے تب میں نے کہا / اس قدر تیرا مطالب نہ ہوا تھا، سو ہوا
جور اور ظلم سے دنیا میں یہ خوباں کا اسم / بے وفائی کا ملقب نہ ہوا تھا، سو ہوا

کرنا تسخیر ہر اک دل کو دو اک باتوں میں — اس طرح کا بھی عجائب نہ ہوا تھا، سو ہوا

روز لگتا ہے ترے کان سے جا جا کے رقیب — کسو کا اتنا مراتب نہ ہوا تھا، سو ہوا

غیروں کی، بریں ترے اب تو یہ کچھ کثرت ہے — یعنی ہر کوئی مصاحب نہ ہوا تھا، سو ہوا

جہاں استاد کی سے دیکھو تو اس نین کے تئیں
شعر کہنے کا کبھی ڈھب نہ ہوا تھا، سو ہوا

مل جائے کہیں وہ یار اپنا — کر رکھوں گلے کا ہار اپنا

جب بات کہے ادا سے ہنس کر — کر ڈالوں یہ دل نثار اپنا

یا رب ہو کہیں شتاب ایسا — دیکھوں میں وہ نوبہار اپنا

مدت سے پڑا ہوں بس میں اس کے — جادو ہے وہ گلعذار اپنا

آتی ہی نہیں زباں سے اب بات — یاں تک ہوں میں شرمسار اپنا

جو حق کی رضا ہے، سو ہی سچ ہے — چھوٹا ہے سب اختیار اپنا

کیا جا کے کروں گلی میں تیری — کچھ بھی تو نہیں شمار اپنا

تس پر یہ رقیب کی شرارت — دکھلاتا ہے مجھ کو پیار اپنا

اس دوستی پہ نہ بھولیو نینؔ
دشمن ہے یہ در کنار اپنا

ناگن ہے زلف یار نہ زنہار دیکھنا — اڑ اڑ کے کاٹتی ہے خبردار دیکھنا

کہتے ہیں لوگ مجھ سے یہ کہا کھا کے اب قسم — خونخوار ہے یہ شوخ ستمگار دیکھنا

شیریں دہن نہ بوجھیو، ہیں شہد کی چھری — ہنس ہنس کے جان لیں ہیں یہ اطوار دیکھنا

کہتا ہوں در جواب انھوں کے میں روبرو — چاہو سو ہو پر مجھے اک بار دیکھنا دو؟

قابو میں آوتا تو نہیں ہے مرے رقیب — کہیں داؤ بن گیا تو میرے یار دیکھنا

شانہ، سمجھ کے کیچو زلفوں کو اپنا یار — الجھا ہے اس میں دل یہ گرفتار دیکھنا
دل خوش ہوا کہیں تو پھر اپنا یہ ہے شعار — جا کر کے باغ میں گل و گلزار دیکھنا

اپنی نظر تو نین خدا پر ہے، ہو سو ہو
جو آن بازکھائیے سو لاچار دیکھنا

نہیں ہے تجھ سوا کوئی دوسرا اب دلستاں اپنا — کہ جس کو دردِ دل جا کر سنا دیں اے میاں اپنا
جہاں میں جستجو کی سب عمر پر اب تلک ہم نے — نہ دیکھا قدرداں اپنا نہ کوئی مہرباں اپنا
مجھے پروانہ پر یارو بڑا افسوس آتا ہے — شمع کی آشنائی میں دیا آخر کو جاں اپنا
خبر لے آ کے جلدی اپنے عاشق دیدہ گریاں کو — وگرنہ سوختہ ہوتا ہے ابھی دل شمع ساں اپنا
گئی آخر خفا ہو کر کے ایسی گل کے ہاتھوں سے — چمن میں پھر بلبل نے نہ دیکھا آشیاں اپنا
مجھے اس فصل گل میں ہر گھڑی حسرت یہ آتی ہے — کسو کو بھی کیا ممنوں نہ تو نے باغباں اپنا
ترا اندوہ، درد اور فکر، حسرت اس میں رہتے ہیں — عجب ترکیب سے آباد ہے یہ خانماں اپنا
تجھے ہجوم میں ہم دیکھ کر یوں تاڑ جاتے ہیں — کہ جیوں لشکر میں بولیں دور سے وہ ہے نشاں اپنا

وہ دل دیتا نہیں ہے نین ہرگز اپنی باتوں پر
سناؤں کس طرح اس کو میں فریاد و فغاں اپنا

وہ یار ہم سے خفا ہے تو ہو، ہوا سو ہوا — پھر اس کا قصہ ہی کیا، جانے دو ہوا سو ہوا
اگر رقیب شرارت سے باز نہیں آتا — بلا سے اپنی کنویں میں پڑو، ہوا سو ہوا
ہر اک بات میں تم کیوں الجھتے ہو یارو — دیکھو یہ مفت گدھے مت چڑھو، ہوا سو ہوا
یہ سارا قضیہ تو ہم سے ہے، اس سے تم کو کیا — تم اپنے ایک طرف ہو رہو، ہوا سو ہوا
ہم اپنا آپ ہی کر لیں گے انفصال اس سے — ہمارے بیچ کوئی مت پڑو، ہوا سو ہوا
یہ سب لڑانے کی باتیں ہیں تم جو کہتے ہو — ذرا تو خیر کا کلمہ کہو، ہوا سو ہوا
ہمیں تو یار سوا اپنے تئیں کسو سے کام — برا کسی کو لگے تو لگو، ہوا سو ہوا
رنگا ہے اب تو زمانے نے خوب کالا رنگ — یہ لال، زرد دکھائی کرو، ہوا سو ہوا

گر ان بتوں سے تری نین پیش نہیں جاتی
تو پھر بیہودہ کیوں بکتے ہو، ہوا سو ہوا

جفا کا اس کی گِلہ مت کرو ہوا سو ہوا — خدا کے واسطے چپکے رہو، ہوا سو ہوا
سنے گا وہ تو خفا ہوگا پھر نئے سر سے — کسو کے کان میں کچھ مت کہو، ہوا سو ہوا
یہ گفتگو جو کرو ہو سو کچھ بھلی نہیں ہے — کسی سے فعل عبث مت لڑو، ہوا سو ہوا
مجھے تو پاک محبت ہے، مت کرو بدنام — کہیں خدا کے غضب سے ڈرو، ہوا سو ہوا
پھرے ہے وہ تو سپر، سیف لے، ارے یارو — کسی سے قضیہ نہ ہو دیکھیو ہوا سو ہوا
یہ مرضِ عشق ہے اس کی دوا کرو موقوف — طبیب مفت میں رسوا نہ ہو، ہوا سو ہوا
گرا جو چاہ زنخ میں کوئی، تو یوں بولا — سزا ہے، غوطہ ذرا کھانے دو، ہوا سو ہوا
سنا جب ان نے فلانا تو آج، مر ہی گیا — کہا بلا سے مری، کوئی مرو، ہوا سو ہوا

اگر نصیب میں ایسا ہی کچھ لکھا ہے یقین
تو پھیر بس نہیں لاچار، جو ہوا سو ہوا

تری گلی میں جو کوئی دھوکے سے جا پھرا — بے واسطہ کو زخم وہ سینے پہ کھا پھرا
کیا جانے کیا بلا ہے ترے کوچے میں صنم — جو کوئی پھرا، سو واں سے نہایت خفا پھرا
ہے نام آشنا کا لیکن آشنا کہاں — اپنا سا میں کروڑ جگہ آزما پھرا
پوچھے کوئی کسی کو سوا امکان ہی نہیں — ناپرسی کا یہ دور انوکھا بھلا پھرا
اب کیا کہوں نصیبوں کو سچ ہے بقول میر — "ایدھر تو ہم سے تم پھرے اودھر خدا پھرا"
میرا تو دل پھرا تھا برہمن کی شکل سے — پربت کو دیکھتا ہوں تو وہ بھی بھلا پھرا

پیغامبر کے آنے کا مت ذہن کر خیال
دیوار قہقہہ کا نہ کوئی گیا پھرا

جس کے گھر ناز سیتی چل کے وہ جانا آیا — گویا بنگالہ کا، گھر اس کے خزانہ آیا
لطف سے جس کو شہ حسن کا نامہ آیا — قبضہ میں اس کے تمام حاصل کا مادہ آیا
چٹپٹی دل کی بجھی یار کے دیکھے سے یوں — بھوکے کو جیسے کہیں سے گویا کھانا آیا
چاہا جب میں نے، کہوں تجھ سیتی مطلب اپنا — کچھ نہ کچھ یاد تجھے وو نہیں بہانہ آیا
خوں بہائے گا یہ پروانے کے جی کا جب تو — لازم ہر ایک کے تئیں شمع جلانا آیا

لاکھ سر مارو اگر تو بھی نہ پوچھے کوئی — آنکھوں کے دیکھتے یہ زور ہی زمانہ آیا

گھر بہ گھر پھرنے کی عادت ہے تری جیوں خورشید
مہر سے نینَن کے گھر لیک نہ آنا آیا

ذرا کیجے غور حضرت سلامت — یہ کیا سیکھا ہے طور حضرت سلامت

مناسب نہیں ہم غریبوں کے اوپر — کرو اس قدر جور، حضرت سلامت

تمھیں چھوڑ کر اب کہیں در دکس سے — ہے کوئی دوسرا اور حضرت سلامت

نہیں جانتے تم سوا ہم کسی کو — ہمارے ہو سرمور، حضرت سلامت

ہر اک دانے میں دل پڑے دیکھتا ہوں — زہے پہنچے بلّور، حضرت سلامت

اسی آستانے بغیر ہم کو جگ میں — نہیں ہے کہیں ٹھور حضرت سلامت

لگائی ہے صندل کی تم نے جبیں پر — قیامت ہے یہ گھور، حضرت سلامت

نہیں بولتے ہم سے، سو کیا سبب ہے — یہ کہہ دیجے فی الفور حضرت سلامت

نجیبوں سے کیوں کر خوشی ہو تمہاری — کمینوں کا ہے دور حضرت سلامت

بس اب کیجے معاف دیکھیں تماشا
نکلتی ہے گنگور، حضرت سلامت

کسو کی عقل میں آیا نہیں یہ راز ہنوز — مرغ دل کس لیے کرتا ہے یہ پرواز ہنوز

اور سب مانی نے تیری تو بنائی تصویر — پر درست ہو نہ سکی چہرے کی پرداز ہنوز

شمع رو دیکھ ترا، ہوئے شمع شرمندہ — کہیں دیکھا نہ سنا کوئی ترے دم ساز ہنوز

ہو گیا آہ سے میری تو تُنک سب عرش — لیک پہنچی نہ ترے کان تک آواز ہنوز

حشر تک دید میسّر ہو ترا، سو معلوم — پر کیے جاتا ہوں، اپنی سی تگ و تاز ہنوز

چرخ ظالم کی خوشامد تو بہت کی لیکن — ظلم اپنے سے نہ آیا کبھو وہ باز ہنوز

کر دیے اُن میں سو لخت، جگر کے میرے — تیغ ابرو کا عجب کاٹ ہے طنّاز ہنوز

غیر کے بر میں دیکھوں ہوں نپٹ نوش تجھ کو — ہم سے ہر بات میں قضیے کا ہے آغاز، ہنوز

جفا و جور ہی سمجھیں ہیں دلستاں افسوس
وفا کے نام سے بھاگیں ہیں یہ بتاں افسوس

شمع کو جلتے، نہیں دیکھ سکتا پروانہ
تصدق ہو کے وہ دیتا ہے اپنی جاں افسوس

سنی نہ تم نے کبھو دل کی داستاں میری
یہ کہتے کہتے گئی ساری گھس زباں، افسوس

کرم رقیبوں کے اوپر، ستم غریبوں پر
یہ دیکھتے ہی گیا مجھ کو جاوداں، افسوس

ترا یہ بوس و کنار ہم کو کیوں کہ ہو حاصل
زمین سخت ہے اور دور آسماں، افسوس

جو مدعا ہے مرے دل کا مستتر یارو
کرے ہے آہ اسے فاش ہر زباں افسوس

سب اپنی غرض کے ہیں نینؔ یار دنیا میں
نہیں کسو کا کوئی دوست، مہرباں افسوس

ہیں تو تحقیق سبھی یہ بت گمراہ غلط
لبھی پوششیں انھوں کی ہے مع وجاہ غلط

راز اس عقدہ لاحل کا کوئی پاتا نہیں
کیوں کرے ہے یہ مرے حق میں مری آہ غلط

نہ سنا آج تلک ہم نے کسو کے منہ سے
بولتے ہوں کہیں مردمِ آگاہ غلط

جو کہیں بات زباں سے سو ہے پتھر کی لکیر
کب کہیں حق میں کسو کے جو دل آگاہ غلط

آنا تیرا تو مرے یار بعلم عند اللہ
لوگوں کے منہ کی ہے سب طرح یا افواہ غلط

دیکھنے سے تو کبھو بھی نہ ہٹے دل ہرگز
گر زنخ زیچ نہ ہووے ترے یہ چاہ غلط

نینؔ ہرگز تو دل اپنے میں گرانی مت لا
حرف بے جا کہے کوئی تجھ کو گر از راہ غلط

دلدار ہوا ناخوش، اب دل کا خدا حافظ
نظروں میں لگا لڑنے بسمل کا خدا حافظ

خنجر سے مژہ کے یہ سب سینہ کیا زخمی
کچھ بس ہی نہیں چلتا گھایل کا خدا حافظ

کس طرح کوئی جیتے، ناداں سے پڑا پالا
بے طرح کی خواری ہے، عاقل کا خدا حافظ

غیروں سے چپلتا ہے، یاروں سے بچلتا ہے
چھوتے ہی مچلتا ہے چنچل کا خدا حافظ

اپنی ہی وہ کہتا ہے پر اور کی نہیں سنتا
ہر اک سے الجھتا ہے، جاہل کا خدا حافظ

شہ گل کی خبر آئی، آتا ہے لیے لشکر گلشن میں پڑی کھل بل، بلبل کا خدا حافظ

میں تجھ کو نہ کہتا تھا، مت نین بتوں سے مل

دل دے کے ہوا رسوا، اب دل کا خدا حافظ

اتنا سکے ہے آپ کو گرچہ جلائے شمع پروانے کے مذاق کو تو بھی نہ پائے شمع

سرتا قدم ہے یار جسے سوز اور گداز پہلے ہی سب سے بزم میں یہ کیوں نہ آئے شمع

لگ جائے ماہ رو کا اگر ہاتھ ناز سے کب پیرہن میں اپنے خوشی سے سمائے شمع

شعلے کو تیرے نور کے کہیں دیکھے اگر خاطر میں پھر کسی کو ذرا بھی نہ لائے شمع

پردے میں مارے شرم کے لاچار ہے وے پروانہ پاس پہنچے ابھی پر رگائے شمع

کہہ کیا خیال تھا کہ یہ پروانے کی طرح یوں مفت جی جلاتے دیا تو نے ہائے شمع

کیا تاب اک قدم بھی تجھ آگے وہ چل سکے خدمت میں تیری رہوے کھڑی ایک پائے شمع

جی لیتے ہی ڈرے ہے نہ جی دیتے ہی ڈرے کیا جانے کچھ یہ کیسی ہے یارو بلائے شمع

مت پوچھ راز شوخ کا تو نین اور سے

کس واسطے کہ کون ہے محرم سوائے شمع

دیکھتے ہی اس بت خوش قد خراماں کی طرف پھر کبھو ہرگز نہ آیا میں گلستاں کی طرف

جو کہ غفلت میں پڑے ہیں سو تو ہیں سب بے نصیب اب تلک ڈالے پڑے ہیں سر گریباں کی طرف

زندگی جن کے تئیں گو تھی نپٹ کر کے عزیز وے تو دوڑے ہیں پینے کو آب حیواں کی طرف

بعضوں نے چاہا کہ ہم بھی دیکھ لیں تو کچھ بنے ق اٹھ چلے ہے دیکھنے کو تیرے بستاں کی طرف

جب نظر آئی ترے کوچے میں کتنی بھیڑ بھاڑ بزدلے جی لے کے بھاگے تب بیاباں کی طرف

رپ گئے عاشق ترے دل کے جو کوئی مرد تھے پل گئے چالاکی سے زلف پریشاں کی طرف

عاشقی کچھ خانۂ خالہ نہیں سو پیش جائے سر کے بدلے دیکھنا ہے ماہ رویاں کی طرف

یاد میں اس کی فنا ہو اور خودی کو چھوڑ دے تب میسر ہو تجھے کہیں ماہ تاباں کی طرف

اس حقیقت کو تو جانیں نین جو ہیں اہل دل

شیر خواروں کی ہے حرکت آب اوزاں کی طرف

دوری سے تیری یار بڑھا ضعف یہاں تلک
طاقت نہیں سخن کی جو پہنچے زباں تلک

تجھ ہجر کا تو ہے ہی نہیں انتہا کہیں
ہر چند جی میں غور کیا میں جہاں تلک

اس ماجرا کو جا کے کہوں کس کے روبرو
میری تو دوڑ ہے گی ترے آستاں تلک

میں ہوں زمیں پہ اور فلک ہشتمیں پہ تو
پر ہو ویں تو بھی اڑ کے نہ پہنچوں وہاں تلک

کیا منہ ہے تیرے کوچے میں جاوے کوئی صنم
دشوار ہے پہنچنا ترے خانماں تلک

اب تو پہنچ رہے گی ترے کان میں کبھو
آہ و فغاں گئی ہے مری آسماں تلک

گل کے ستم کی ماری چمن سیتی عندلیب
ایسی گئی کہ پھر نہ پھری آشیاں تلک

آوے بہار جلدی سے ایسا خدا کرے
کس کس خوشی سے جایئے پھر بوستاں تلک

کہنا کسی کا یار ترے بھاویں ہی نہیں
اس داستاں کو نین کہے اب کہاں تلک

تجھ تیغ کی نگہ سے مرا کٹ گیا ہے دل
بھیتر سینے کے ٹکڑے ہو کر پھٹ گیا ہے دل

جب سے جمال تیرا میں دیکھا ہے اے صنم
تب سے سبھی طرف سے مرا ہٹ گیا ہے دل

انداز ناز قہر ہے اس کے نہ میں کہوں
پر خال و خط میں جا کے ترے بٹ گیا ہے دل

آگے کو بڑھ سکے ہے نہ پیچھے کو ہٹ سکے
یاں تک ترے خیال میں اب ڈٹ گیا ہے دل

ذرا سے دیکھتے ہی یہ بدلی نظر تری
من میں چھٹنکی سیر پیچھے گھٹ گیا ہے دل

ہوتا ہے شب کو جا کے ہم آغوش غیر سے
یہ بات سن کے یار نپٹ چھٹ گیا ہے دل

جیسا ہے سبز خط تیرا اور شوخ چشم
ان دونوں بیچ آ کے میرا لٹ گیا ہے دل

چاہتا ہوں کہ ملے یار وفادار کہیں
کیا کہوں ہے ہی نہیں جگ میں وہ زنہار کہیں

ہر گھڑی زخم کریں سینے پہ تیغے کی مثال
نچلے رہتے ہی نہیں ابروئے خم دار کہیں

سیم و زر لے کے دوڑیں ہیں خبر سن کر
کب ہٹیں دیکھ کے یوسف کو خریدار کہیں

جیتے جی منزلِ مقصود کو پہنچو سو بخیر
بعد مرنے کے کہیں ہیں ملے دیدار کہیں

جو ملے سو ہی جفا پیشہ، ستم گر، بیدرد
یعنی دیکھے ہی نہیں ایسے طرح دار کہیں

کم نصیبی سے کسو طرح نہیں ہے چارہ
ورنہ بے مہری کریں کیوں مرے دلدار کہیں

آمد و رفت ہے دنیا کی کبوتر خانہ
گل سے خالی نہ رہے جگ کا یہ گلزار کہیں

دائم المرض شفا پاوے یہ تو ممکن ہے
چنگا ہوتا نہیں تجھ چشم کا بیمار کہیں

کم نگاہی سے یہ ظالم نے کیا غارتِ دل
رحم ذرّا بھی نہ لایا وہ دل آزار کہیں

وہ جو اک تو لہ کئی ماشہ تھی یاری تم سے
رتّی بھر بھی نہ رہا اس میں کچھ آثار کہیں

وہ واہ چاہیے ایسا ہی تمہیں رحمت ہے
بار دیگر نہ کرے پھر کوئی تکرار کہیں

یہ جو کچھ جور و جفا تم نے کیا نینؔ اوپر
ایسا کوئی کرتا ہے بتلا تو بھلا یار کہیں

ناصح نہ بک زیادہ مرا مان یہ سخن
مجھ سیتی چھوٹے عشق، ہے امکان یہ سخن

تسبیح، نماز، روزہ سے مجھ کو نہیں ہے کام
میں بت پرست ہوں مرا پہچان یہ سخن

ہر روز مجھ کو عشق سے کیوں روکتا ہے تو
آخر کو کھو رہا ہے تری جان یہ سخن

دلدار، دلربا ہیں مرے دل کے مشتری
میں ان کا دکڑا، ہوں مری جان یہ سخن

اتنے میں میرا یار مرے پاس آگیا
کہنے لگا کہ کیا ہے مہربان یہ سخن

اس بے حیا سے کاہے کو خالی کرو ہو مغز
یہ بے وقوف ہے جو کہے آن، یہ سخن

طالب کو معرفت کے، سبھی چیز ہیں معاف
اکثر کے کہہ گئے ہیں قدردان یہ سخن

القصّہ ہو خموش، کیا میں نے یہ یقیں
جب منہ سے یار کے پڑا مجھ کان یہ سخن

بہتر ہے سب سے، دوستی اپنی خدا کی نینؔ
فعل عبث ہے یاری، گیہان یہ سخن

فصلِ گل میں ہر گھڑی یہ ابر و باراں پھر کہاں
دیکھ لو خوش ہو کے یاراں یہ بہاراں پھر کہاں

ہے سعادت قمریو اس کے تصدق ہو چلو	ورنہ کوئی دن کو یہ سرو خراماں پھر کہاں
آج آئی ہے نظر مجھ دل کے شیشے میں پری	دیکھ لو لحظہ میں یہ صورت نمایاں پھر کہاں
میں چمن میں پی کے مے کو اس لیے کہتا ہوں لیبر	کون جانے ساقیا یہ گلعذاراں پھر کہاں

قول ہے حضرت یقیں کا تب تو یوں کہتا ہے نیَن
بھر کے دل رو لیجیے یہ چشم گریاں پھر کہاں

جن نے مجھ دل کو لیا کل تھا چُرا آنکھوں میں	آج پھر بھی وہی آتا ہے چلا آنکھوں میں
یارو اس شوخ کی حرفت کا بیاں کیا کیجیے	مجھ کو ممنون کیا رہ کے ذرا آنکھوں میں
رحمت ہے آفریں، شاباش تری دانش کو	(؟) غرض ملنے کی مرے تاڑ گیا آنکھوں میں
رفت اور روب میں مژگاں سے کیا ہے گھر کو	(؟) کیا بنائی ہے ترے واسطے جا آنکھوں میں
تجھ سوا کون ہے ایسا کہ جسے میں چاہوں	تو ہی بستا ہے میرے یار سدا آنکھوں میں
کیوں نہ ہر ایک کے ملنے میں کرے یار حجاب	وہ تو دکھتا ہے نپٹ شرم و حیا آنکھوں میں

روئے وہ مردمک دیدہ اگر تجھ کنے نیَن
ہو کے بیتاب یہی کہیو کہ آ آنکھوں میں

دیکھ کر حسن یار آنکھوں میں	ہو گیا بے قرار آنکھوں میں
چشم تیری کو دیکھ کہتا ہوں	خوب پھولی بہار آنکھوں میں
اک نظر تجھ کو دیکھتے ہی میاں	بڑھ گیا انتظار آنکھوں میں
گرچہ تقصیر دل کی ثابت نہیں	پھر یہ کیوں ہے غبار آنکھوں میں
کب زباں سے کہوں مرے اس کے	ہو گیا جو شمار آنکھوں میں
بعد مدت کے میں ملا اس سے	وہی پایا دہے پیار آنکھوں میں

نیَن اپنے کو کیوں ستاتے ہو
آ کے بے اختیار آنکھوں میں

جو بات منع کی ہے اسے کہیے کیوں | جو شے کہ حرام ہے گی اسے کھیئے کیوں
کھوٹا ہو اگر دام ہی اپنا، یارو | صراف کو پھر عیب عبث لیئے کیوں
خطرہ ہے صریح جی کا سمجھ دیکھ تو جی میں | جو راہ کہ مرتے ہوں اُدھر جیئے کیوں
جس بستی میں انصاف کا کہیں نام نہ ہووے | اس بستی میں پھر فعل عبث رہیے کیوں

بات اپنی پیش نہ جاتی ہووے
بے فائدہ پھر بولنا وہاں چہیے کیوں

دیجے نہیں کسو کو تو پھر لیجے بھی نہیں | نیکی نہ بن سکے تو بدی کیجے بھی نہیں
توقیر حسن شرط ہے دل دینے کے لیے | گر حسن ہی نہ ہو تو کبھو ریجھیے بھی نہیں
ہووے اگرچہ اپنی شرافت اوپر نگاہ | ہر گز بدی کے کام پہ دل دیجیے بھی نہیں
ایدھر سے سیتے جاؤ اور اودھر سے پھٹتا جائے | ایسے طرح کے کپڑے کو پھر سیجیے بھی نہیں
دینا دلانا سارا ہے اک نام کے لیے | گر نام بھی نہ ہو تو عبث چھیجیے بھی نہیں
کوئی سا معاملہ ہو پہلے چھان لیجے | یکبارگی بھڑک کے کبھو کیجیے بھی نہیں

مے کا مزا تبھی ہے کہ جب ماہ رو ہو پاس
گر ماہ رو نہ ہووے تو مے پیجیے بھی نہیں

یار کے دل میں گر پیار نہ ہو | اس قدر دل یہ بے قرار نہ ہو
اس صنم سیتی پھر ملیں کیا خوب | دل میں اپنے اگر غبار نہ ہو
سچ کہہ بلبل تو کیا کرے گل کو | باغباں گر خود اختیار نہ ہو
جو کہ دل کینہ دار ہے اس کا | عاشقوں میں کبھی شمار نہ ہو
کیا مزا ہے شراب پینے کا | جب تلک پاس گلعذار نہ ہو
دیکھے اٹھ کھیلی سے تجھے چلتے | کیوں نہ پھر سرو شرمسار نہ ہو

فعل عبث بوجھ زندگی کو نہیں
بس میں اپنے اگر چہ یار نہ ہو

کہی نہیں جائے آہ، مت پوچھو | لگی ہے چوٹ، چاہ مت پوچھو
اس شکر لب کے کچھ نہیں بھائیں | ہنسے ہے قاہ قاہ مت پوچھو
مفت مرنا ہے اس کے کوچے میں | کوئی اودھر کو راہ مت پوچھو
ہنس کے بولیں نہیں ہیں غنچہ دہن | یا چھڑے واہ واہ مت پوچھو
کسی نے بحرِ عشق کی اب تک | نہیں پائی ہے تھاہ مت پوچھو
شوق میں تیرے پھرتے ہیں گھر گھر | روز و شب مہر و ماہ، مت پوچھو

نینؔ کو آرزو ہے ملنے کی
خواہ کوئی پوچھو، خواہ مت پوچھو

بڑی ہی یار ہے گی خند تم کو | کہے کیوں کر نہ خلقت رند تم کو
نہ ملنا اس قدر کا کس سے سیکھا | کہو سچ، حق کی ہے سوگند تم کو
کیا تم نے اگر قتل عاشقوں کو | کہے گا کون پھر دلبند تم کو
نہیں رکھتے ہو تم خاطر کسو کی | کہا میں سو دفعہ ہرچند تم کو
یہ باندھا جب سے تم نے سرخ چیرا | کہیں ہیں لوگ چیرا بند تم کو
یہ باعث ہے تمہارے سبز رنگ کا | کرے ہے پیار سارا ہند تم کو

کہا اب نینؔ کا کاہے کو مانو
چڑھی ہے بھنگ یہ بے بند تم کو

دل کو سمجھاتا ہوں میں ہر بار، ہونا ہو سو ہو | خوبرویوں سے نہ مل زنہار، ہونا ہو سو ہو
بات کہنے سیتی پرائی ہوئے یہ تو جان لے | رازِ دل کا مت کرے اظہار، ہونا ہو سو ہو
خود پسندی چھوڑ دے اور تلخ گوئی ترک کر | اس میں ہرگز مت کرے تکرار، ہونا ہو سو ہو
مجھ کو تیرے دیکھنے کی غرض ہے اور کچھ نہیں | کوئی اگر رسوا کرے بیکار، ہونا ہو سو ہو
طوق اور زنجیر کس خاطر میں یاں لاتا ہے کیوں | میں تو دیوانہ ہوں تیرا یار، ہونا ہو سو ہو

زلف کے زنداں میں یارو کیا پڑا اندھیر ہے ‏ ‏ چھوٹنے سے کچھ نہیں سروکار، ہونا ہو سو ہو

واسطے میرے نہ کیجیو کوئی معالج کا تلاش

نرگسی چشموں کا ہوں بیمار، ہونا ہو سو ہو

یہ جان اگرچہ ہو تو تیرا ہی ہو ‏ ‏ قربان اگرچہ ہو تو تیرا ہی ہو

تا زیست کسی کا بار احسان نہ لوں ‏ ‏ احسان اگرچہ ہو تو تیرا ہی ہو

دونوں ناچیز، کیا گدا اور کیا شاہ ‏ ‏ فرمان اگرچہ ہو تو تیرا ہی ہو

بیمار عشق کا نہیں کوئی طبیب ‏ ‏ درمان اگرچہ ہو تو تیرا ہی ہو

سائے کو میرے لیے جہاں میں

دامان اگرچہ ہو، تیرا ہی ہو

عاشقوں کا تو یہ احوال ہے دلدار کے ساتھ ‏ ‏ کبھی پوشیش چلے جس طرح سردار کے ساتھ

سلطنت ہند کی سب بخش دوں اس دم یارو ‏ ‏ باتیں جس وقت کرے ہنس کے صنم پیار کے ساتھ

میرے اور اس کے کوئی بیچ میں ہرگز نہ پڑو ‏ ‏ سر لگایا ہے میں نے طرہ خمدار کے ساتھ

خوبیاں گو کہ ہزاروں ہیں جہاں میں لیکن ‏ ‏ زندگانی کا مزا سارا ہے روزگار کے ساتھ

چشم خونخوار، بھنویں تیغ کی، یوں ہے تعریف

بانکے ہوتے ہیں سپاہی سب ہی ہتھیار کے ساتھ

اب تو اس دل کو تازہ جاں کیجیے ‏ ‏ یعنی گلشن میں آشیاں کیجیے

یہ بھی اک سیر ہے گلوں کے لیے ‏ ‏ عندلیبوں کو باغباں کیجیے

زندگانی تو ہے مثالِ حباب ‏ ‏ کب تلک چاہ گل رخاں کیجیے

راز دل کا کبھو بھی فاش نہ ہو ‏ ‏ زردیٔ رخ کو گر نہاں کیجیے

یہ زمانہ ہے اک طرح کا یار ‏ ‏ دل کا احوال کیا بیاں کیجیے

آسماں پھٹ کے گر پڑے سارا ‏ ‏ حسبِ حال اپنے گر فغاں کیجیے

جب تلک زندگی خدا دیوے ‏ ‏ تب تلک فکرِ آب و ناں کیجیے

دولت وصل گر میسّر ہو ‏ ‏ عیش ہی عیش جاوداں کیجیے

ہو سکے سب ہوس ولے لیکن | بوڑھے کو کس طرح جواں کیجیے
ہونا جو کچھ تھا سو تو ہو گزرا | معاف تقصیر خوردگاں کیجیے

کمتریں ہے تمہارا عاجز نیؔن
اتنا غصہ نہ مہرباں کیجیے

کبھو کسی کا گلہ اپنی تو بلا نہ کرے | یہ بے وفا سے کہیں دل لگے خدا نہ کرے
کیا ازل سے ہے صانع نے بت پرست مجھے | کبھو بتوں سے پھروں میں، یہ تو خدا نہ کرے
یہ مانگتا ہوں دعا روز حق تعالےٰ سے | بتوں سوائے کہیں دل کو مبتلا نہ کرے
اگرچہ یار ہے ظالم تو کیا ہوا یارو | مگر ہے خوف یہ، کوئی بددعا نہ کرے
وفا کی تجھ سے توقع تو کچھ نہیں مجھ کو | یہ ممکن ہے کہ ستم گار کہیں جفا نہ کرے
اگر مریض بغیر از علاج چنگا ہو | طبیب جگ میں کسو کے تو پھر دوا نہ کرے

شمار عاشقوں میں اس کا کچھ نہیں ہے نیؔن
شمع نمط جو کوئی عشق میں گلہ نہ کرے

جی میں آتا ہے کہ اس مشکل کو آساں کیجیے | اپنے فیضِ اشک سے صحرا گلستاں کیجیے
گر یہی ٹھہری کہ اب مجنوں کو مہماں کیجیے | اس خیاباں کی جگے یاروں بیاباں کیجیے
نوح کا طوفاں بھی چھپے آن کر مانگے پناہ | حسب حال اپنے اگر یہ دیدہ گریاں کیجیے
عمر سب آخر ہوئی اور ہجر جیوں کا تیوں رہا | کب تلک اس سوختگی میں جان بریاں کیجیے
چشم میرے آج تک بھی گرد افشانی کریں | یار سے ملنے کا پھر کیا خوب ساماں کیجیے
سرو بھی حیراں ہو اور غافتہ بے تاب ہو | تجھ سے خوش قد کو جو گلشن میں خراماں کیجیے

عشق کی سختی تبھی معلوم ہووے دل کو نیؔن
قیس کے ہمراہ جب سیر بیاباں کیجیے

مجھ سے شکوہ سنا کبھی نہ کبھی | یعنی بوسہ دیا کبھی نہ کبھی
دست کوتاہ کر، تعدّی سے | مان کہنا ذرا کبھی نہ کبھی
ہر طرح شوخ کو ملوں گا میں | اس بلا سے بچا کبھی نہ کبھی

قصہ کیجیو تمام، دل اپنا گر سُنے دلبرا، کبھی نہ کبھی
صندلی یا شفقی یا اگری شیخ ڈاڑھی رنگا کبھی نہ کبھی
آسماں سارا ہو گیا غربال ہم نے نعرہ کیا کبھی نہ کبھی

نیّن تجھ کو دکھاؤں گا وہ دن
گر میں جیتا رہا کبھی نہ کبھی

مجھ سے تو ترا عشق یہ زنہار نہ چھوٹے اپنا تو یہ خواہاں ہے اے یار نہ چھوٹے
تجھ چاہ زنخ کا تو گرفتار نہ چھوٹے جیوں یوسف مصر سے خریدار نہ چھوٹے
یہ شیخ و برہمن ہیں نرے قصہ دلال ان سے تو کبھو تسبیح و زنار نہ چھوٹے
فریاد کروں کس سے ترے ظلم کی اے شوخ تجھ سے تو جفاکاری کا اطوار نہ چھوٹے
تجھ قد کی صفت کیا کہوں سبحان اللہ ہر لحظہ کی اٹھکیلی کی رفتار نہ چھوٹے
ٹک چلتے تجھے دیکھے تو ایسا ہی خجل ہو تا حشر کبھو کبک سے کہسار نہ چھوٹے
ہر روز اگر لاکھ دوا دیویں طبیباں تجھ عشق کے بیمار سے آزار نہ چھوٹے
جب تک کہ نہ ہو ہجر کی آفت سے خلاصی چشموں سے مری اشک تو یکبار نہ چھوٹے
ہر چند ہووے باغباں مانع و مزاحم بلبل سے تعشق گل و گلزار نہ چھوٹے
مجنوں کو ملا دشت اور فرہاد کو تیشہ قسمت کا لکھا یوں ہی تھا لاچار نہ چھوٹے

یہ نیّن تری یاد میں مسرور ہے دائم
یا بارِ خدا اس کا یہ اطوار نہ چھوٹے

غصہ کو ترے کیا کہوں ایسا ہی غضب ہے قاصر ہے زباں، ہوش فرشتے کا سلب ہے
کہاں تک میں کروں آپ کے اوصاف کا شکوہ جھڑکی تو ہر اک بات ہے، دشنام لقب ہے
ہم سے تو گئی چشم بدل طوطے کی مانند غیروں سے مل جائیے یہ تو زور ہی ڈھب ہے
از روز ازل خواہش ملنے کی ہے واللہ کیا جانیں ترے ملنے کا وہ روز بھی کب ہے
رفتار زمانے کی اگر بگڑی تو بگڑے ہم کو تو نفع اس سے نہ آگے تھا نہ اب ہے
ہر چند کہو، کوئی نہ سنے بات کسی کی اس گردشِ افلاک کا یہ طور عجب ہے

وحدت تھی میسر سو تو وہ دن گیے افسوس
کثرت میں پڑی آکے یہ قسمت کا سبب ہے

ہنفتاد و دو ملّت ہے یہ سب مظہر اسی کا
بت خانے میں، کعبے میں وہی ایک ہی رب ہے

تھے عاشق و معشوق اگر وامق و عذرا
ان پر تو صریح مجنوں کا احوال چرب ہے

دانا تو سبھی کم سخن ہوتے ہی ہیں از بس
اس کو نہ سمجھ عیب، یہ تو پاسِ ادب ہے

ٹک اپنی جھلک نورِ تجلّی کی دکھا دے
مدت سے ترا نیتن یہ دیدار طلب ہے

اے شوخ دل آزار ترا کام یہی ہے
عاشق کو کرے خستہ و بدنام یہی ہے

دامن کو پکڑ تیرے، یہ محشر میں کہوں گا
دیتا ہے مجھے مفت میں دشنام یہی ہے

جز یادِ خدا صرف، نہ کرنا کبھو انفاس
از بسکہ عبادت کا سرانجام یہی ہے

رکھتی ہے سدا دل کو مرے دام میں اپنے
مکھڑے پہ تری زلفِ سیہ فام یہی ہے

ہر روز تری جستجو میں پھرتے ہی رہنا
لے صبح سے تا شام، مجھے کام یہی ہے

صہبا کا تو ساقی ہو تو پھر اللہ ہی اللہ
دل خواہ شکلِ عشرت و آرام یہی ہے

آسودہ کو کچھ دیجیے تو اس کی نہیں تعریف
مفلس کو اگر دیجیے تو نام یہی ہے

بارہ صدی کا دور جو سنتے تھے (رہم) نیتن
بے شک شبہ، تحقیق وہ ہنگام یہی ہے

مر گیے کھینچتے ہی ہجر کے آزار کئی
تیر مژگاں سے ترے تھے جو دل افگار کئی

جنس یوسف کی تجھے دیکھ کے اے مایۂ حسن
ہر طرف سے چلے آتے ہیں خریدار کئی

کیا بلا دام ہے تجھ زلف کا دل کے حق میں
ہوتے ہیں دیکھتے ہی جس کے گرفتار کئی

ایسے بے قدر ہیں دل، یار ترے کوچے میں
جیوں پڑے رہتے ہیں صحرا میں خس و خار کئی

راست ہے دنیا کا احوال بقولِ سودا
"ایک زنداں ہے کہ جس میں ہیں گرفتار کئی"

کچھ نہ فرہاد کی گنتی ہے نہ کچھ مجنوں کی
کر دیے چرخِ ستم گار نے لاچار کئی

کس سے جا کر کے کہوں حال زمانے کا نیتن
جان اپنی سے تو بیزار ہیں اب یار کئی

رقیباں اس طرح پھرتے ہیں نت اٹھ یار کے پیچھے
کہ جیسے ٹھگ پھریں زور آوری، زر دار کے پیچھے

دوا کوئی کیا کرے اب مفسدوں کی ایسی بن آئی
طبیبوں کی بنے جس طرح سے بیمار کے پیچھے

نہ سوجھا وقت پر کچھ، پھیر کچھ کا کچھ لگے بکنے
کہ جیوں دشنام یا دا آوے کسی کو مار کے پیچھے

پڑا ہے کام یوں فریاد سے تجھ عشق میں ظالم
کہ جیسے داد خواہ ہووے کوئی خونخوار کے پیچھے

ہجوم آہ، بن لیلیٰ کے یوں ہے قیس کے ہمرہ
کہ جیوں لڑکے تماشے کو پھریں سے خوار کے پیچھے

نظر کی مہر سے تم نے، تو یہ رتبہ ہوا مجھ کو
کہ جیوں ادنیٰ سے اعلیٰ ہو کوئی سردار کے پیچھے

لکھا تقدیر کا مٹتا نہیں، کہتے ہیں سب لیکن
جو کچھ بے قدری ہے جگ میں سو ہے روزگار کے پیچھے

ہوا جو کچھ سو دیکھا اور جو ہوگا سو دیکھیں گے
لیکن معلوم نہیں کیا ہوئے دن دو چار کے پیچھے

نہیں ہے نیک و بد پہ منحصر اب نیںؔ دنیا میں
جو کچھ جس کی معیشت ہے سو ہے سردار کے پیچھے

دلبر سے یہ سودا ہے مرا، یا کہ یہ دم ہے
ایک دم کی جدائی تیری مجھ پر تو ستم ہے

ملنا ترا اغیار سے تشریح کروں کیا
یہ قہر ہے آفت ہے، غضب، رنج والم ہے

آئینے سے مجھ دل کے تحیّر کو ملا دیکھ
یہ دو لوں برابر ہیں کوئی بیش نہ کم ہے

گو عرش پہ خورشید ہے روشن تو بلا سے
مکھڑے کی چمک تیری یہ کب ماہ سے کم ہے

کوئی ہاتھ لگاتا ہی نہیں خوف کے مارے
ناگن کی لہر ہے کہ تری زلف کا خم ہے

جتنا کہ ہے افراط تری کم نگہی کا
اتنا ہی ادھر دیکھو تو یہ دیدۂ نم ہے

چونکے ہے مجھے دیکھ کے وحشی سی سرس تو
آہو سے بھی صد چند تجھے مجھ سیتی رم ہے

کیا کیا کہوں تجھ عاشقی میں گزرا سو گزرا
مت پوچھ یہ مجھ سے تجھے تیری ہی قسم ہے

یا آتے تھے ہر روز یا اب ملتے ہی نہیں ہو
اس نیںؔ پہ کچھ کیسا تمہارا یہ کرم ہے

کیا منہ ہے کسی کا جو ترے کوچے میں جاوے
جاوے بھی تو پھر کا ہے کو دنیا میں وہ آوے

کیا غرض ہے اس کو جو ملے پھیر کسو سے
جب پہنچا ترے پاس جو کچھ چاہے سو پاوے

مارے بھی جلاوے بھی اور آمرزش بھی کر دے
عہدے سے ترے کون ہے ایسا سو بر آوے

دیکھا ہے کہیں گل نے تجھے جس کی خوشی سے
پھولا ہے وہ اتنا کہ قبا میں نہ سماوے

ہر چند کہ عشق میں سر چیر کے مر جائے
فرہاد سے خسرو کبھو شیریں نہ ملاوے

تجھ چشم کے غمزہ کو اگر دیکھے نرگس
ہرگز نہ مشابہ میں کبھی آپ کو لاوے

میں مردگنوں نین جہاں میں تو اسی کو
تیغے کا تیرے ابرو کے جو وار بچاوے

وا جبی بات کہیں ذرا کہیے
بری لگتی ہے سب کو کیا کہیے

مجھ کو اک یہ بڑی سی حیرت ہے
برے کو کس طرح بھلا کہیے

نیکی کا پھل بدی لگا ہونے
اس زمانے کا کیا گلہ کہیے

چرخ ظالم نے سب کو ڈالا بیس
اس کو تحقیق آسیا کہیے

اور ہی احوال دیکھتا ہوں میں
کس کے آگے یہ ماجرا کہیے

جا بجا چھوٹیں جھوٹ کے شپّے
یہ بھی یاروں کا اشغلا کہیے

اُمّی کہتے ہیں ہم تو ہیں فاضل
بے وقوفوں کا در کھلا کہیے

اپنی کرتے ہیں آپ ہی تعریف
ان کے تئیں کو توچوتیا، کہیے

بے شعوری پہ بسکہ ہیں نازاں
کیوں نہ اب ان کو ناسزا کہیے

شیخ جی نے کیا ہے آج خضاب
اس کو بوڑھے کا چوچلا کہیے

لوگوں کے پھوڑتا پھرے شیشے
محتسب کو تو مسخرا کہیے

پوچ، پادر ہوا، بکے ہے سخن
ناصح کو خواہ مخواہ سڑا کہیے

اپنا سر پھوڑتا ہے آپ رقیب
شوق سے اس کو مُد جھڑا کہیے

مارے خندوں کے مرد آدم کو
کوئی پوچھے نہیں ہے کیا کہیے

ڈاڑھی ملّا کی گو کہ ہے خوگیر
پر مہا دیو کی جٹا کہیے

جن کی حرمت پہ کچھ نہیں ہے نگاہ
ان کو پاپوش کا تلا کہیے

چھپتے پھرتے ہیں وقت جنگ وجدل
بزدلا ان کو برملا کہیے

خود پسندی میں غرق ہے عالم
نین کس کس کو اب بُرا کہیے

کس سیتی دل کا مدعا کہیے — کوئی سنتا نہیں ہے کیا کہیے
یار ہم سے کمال ناخوش ہے — کس کے آگے یہ دکھ سنا کہیے
شکوہ کیا تاب، کوئی کرے اس کا — جو کرے وہ سو سب بجا کہیے
سیف ہے یہ تاب سرمئی چشم — قتل عاشق کو تو تیا کہیے
بے طرح ہے یہ مرض عشق طبیب — کوئی مجرب سی اب دوا کہیے
وقت پر جو کہ اپنے کام آوے — اسی کو اپنا آشنا کہیے

جس گھڑی یار ہنس کے بولے نین
اس گھڑی کو تو مرحبا کہیے

ہر چند گرم ہو کے اگر برتری کرے — کب آفتاب منہ کی ترے ہمسری کرے
جلوہ ترا وہ ہے کہ پری کو پری کرے — کس کی مجال ہے جو تری ہمسری کرے
وہ جادو تری چشم ہیں اے نرگسی نین — دیکھے جو سامری تو تری چاکری کرے
میرے تو دل کی ہووے تبھی آرزو تمام — جب تو سخن کی اپنے، سخن پروری کرے
خوش قد ترے کی جگ میں تو تمثیل ہی نہیں — کہنے کو سرو ہے یہ کہاں سربری کرے
صانع مرا وہ ہے کہ ہو کیسی ہی چوب خشک — سو سو دفعہ وہ چاہے تو اس کو ہری کرے

ہو باغ باغ نینؔ، وہ غنچہ دہن اگر
دو ایک بات ہنس کے کبھو سرسری کرے

جی کو جب تیری یاد آتی ہے — آگ رنجک کے تئیں لگاتی ہے
بیٹھتے کل پڑے نہ اٹھتے کل — مثل بھونچال ہلہلاتی ہے
گو کہ ہے آہ اپنی بے تاثیر — پر رقیبوں کو ہینگ ہگاتی ہے
قد ترا جب سے دیکھا قمری نے — سرو کو چٹکی میں اڑاتی ہے
تیرے دانتوں کی یار براتی — مثل بجلی کے چھپاتی ہے
اس قدر خوش ہے گل سیتی بلبل — تن میں پھولی نہیں سماتی ہے
جب کہ فریاد کرتی ہے گھڑیال — کھڑے پانی میں ڈوب جاتی ہے

پر یہ اچرج ہے غیر کی صحبت　　کس طرح تیرے تئیں خوش آتی ہے
روز جلتی ہی رہوے ساری رات　　شمع کی زور ہی یہ چھاتی ہے
لیلیٰ کے دیکھنے کو آج تلک　　روح مجنوں کی تڑپھڑاتی ہے

نین کے دل میں لہر ملنے کی
ایک آتی ہے ایک جاتی ہے

چپ رہ دنیا میں یار کوئی نہیں ہے　　کسو کا زینہار کوئی نہیں ہے
اپنی اپنی غرض کے ہیں سب یار　　اس میں اب پھیر پھار کوئی نہیں ہے
اس زمانے کا کیا کہوں احوال　　باپ بیٹوں میں پیار کوئی نہیں ہے
جا بجا ہو گئی خزاں جگ میں　　کہیں ذرا بھی بہار کوئی نہیں ہے
چاہو کوئی کسو کے کام آوے　　ایسا تو روزگار کوئی نہیں ہے
جھوٹوں کے پیر ہو گئے سردار　　سچ کا سروکار کوئی نہیں ہے
سب ڈنڈیل ہو گئے صغیر و کبیر　　اب تو ایماندار کوئی نہیں ہے
جن کی آگو بڑی سی دولت تھی　　ان کنے ایک تار کوئی نہیں ہے
بے ہنر بیشتر ہیں اب ممتاز　　قابلوں کا شمار کوئی نہیں ہے
نوکری میں کریں ہیں فاقہ لوگ　　اس خرابی کا پار کوئی نہیں ہے
یہاں تلک مفلسی نے گھر گھیرا　　پگڑی ہے تو ازار کوئی نہیں ہے
اس غضب دکھ کے تئیں کہوں کس سے　　مونس و غمگسار کوئی نہیں ہے
جو کہ آقائے وقت ہیں ان میں　　دانشی اور بچار کوئی نہیں ہے
فضلِ حق کے سے آبرو رہ جائے　　اس برابر وقار کوئی نہیں ہے

چاہے سو ہو، وہ نین دنیا میں
اپنا کچھ اختیار کوئی نہیں ہے

سنے ہی نہیں ہیں کسو طرح دِلستاں اپنی　　الٰہی کس سے کہوں جا کے داستاں اپنی
منع ہی کرتے ہیں تو تھک گیا اے یارو　　خموش رہتی نہیں ہے کہیں زباں اپنی

ملے نہ تجھ سے کبھو ہم تو، ہو کے ہم آغوش — یہ آرزو ہی رہی جی میں جاوداں اپنی
ذرا سی بات میں ہوتے ہو تم تو رو گرداں — اسی میں ہو چکی بس خیراب نشاں اپنی
ہم عاشقی میں تری یار، بہت تیچ ہارے — کسو ہی طرح نہیں گلتی دال یاں اپنی
تماش دیکھ ترے دل کا، جو فرد شوں نے — کری ہے گرم بڑے ٹھاٹھ سے دوکاں اپنی
پواج عالم یکلخت ہو گئے بہلول — انھوں کے آگے کہو اب چلے کہاں اپنی
نہ ہے یہ شکل، زمانے کے ہاتھ سیتی نجیب — سنبھالے پھرتے ہیں دستار ہر زماں اپنی

خدا ہی شرم رکھے نینؔ اب تو دنیا میں
پڑی ہے آ کے ہر اک کو جہاں تہاں اپنی

بے شبہ ہے کہ عرش اُپر تو ہے — پر جدھر دیکھوں ہوں تدھر تو ہے
کون ہے ایسا کہ جس کی دوں تشبیہ — تیرے ثانی ہے تو اگر تو ہے
کسو پہ تیرا بھید نہیں کھلتا — تیری حکمت سے باخبر تو ہے
نازکی کے سبب چل ہی نہ سکے — زور ہی یار مو کمر تو ہے
تیری الفت کو کس طرح چھوڑوں — میری تو جان اور جگر تو ہے
بعضے طالب ترے یہ کہتے ہیں — شمس بھی تو ہے اور قمر تو ہے

نینؔ کہتا ہے کلّ وہم، شئے میں (؟)
جانِ من، قصہ مختصر تو ہے

جہاں میں جو کوئی گلبدن، خوش نین ہے — بہت جی کو پیارا ہے اور من ہرن ہے
یہ سب خوبیاں تجھ میں ہیں گی پری رو — تو ہی من ہرن ہے، تو ہی چت لگن ہے
دیوانہ ہوں اس دم کہ جس دم کہیں ہیں — شکر لب بھی کیا خوب شیریں بچن ہے
(ذرا)[1] پیار سے جس سے تو ہنس کے بولے — تو بے شک اسے بادشاہی ختن ہے
تجلاّ ترا جن نے ٹک دیکھ پایا — ولی ہے وہ پھر اور فلاطون زمن ہے

---

[1] ایک لفظ کیڑے نے کھا لیا ہے "ذرا" قیاسی تصحیح۔

ترے آونے کی خبر سن کے پیارے
کھڑا منتظر سارا نرگس چمن ہے
بھلا تجھ کو دنیا میں کوئی کیوں کر پاوے
نہ گھر کہیں تیرا، کہیں نہ وطن ہے
ہے سب میں ملا اور سب سے نرالا
عجب تیری قدرت عجب تیرا فن ہے
تو اب خواہ نزدیک یا دور ہی رہ
تری یاد جی میں مرے رات دن ہے
غنیمت ہے مجھ کو بزرگی یہ اتنی
میں طالب ہوں تیرا اور تو جان من ہے

کرم کی نظر سے ذرا دیکھ ادھر
ترا نینؔ عاجز ہے رنگین سخن ہے

جو کوئی آبرو سے کہ جگ میں جیا ہے
ہر ایک شخص نے وصف اس کا کیا ہے
جو کوئی جیا آبرو کھو کے جگ میں
سراسر وہ احمق ہے اور بے حیا ہے
ارے یارو سنتے ہو کوئی تو بولو
یہ دل ہے کہ دشمن ہے، قاتل ہے کیا ہے
مجھے ان نے سب طرح سے پیس ڈالا
یہ دل نہیں ہے پہلو میں سنگ آیا ہے
میں حرمت کو چاہوں، یہ چاہے بتوں کو
انوکھا خدائی سے شیوا لیا ہے
یہ ڈھونڈے سیہ زلف اور چشم مے گوں
بھلا اب یہ سودا نہیں ہے تو کیا ہے
یہ نت اٹھ کے چاہِ زنخ ہی کو دوڑے
نہ سمجھے اُدھر جو گیا، سو گیا ہے
پری رُو کے پیچھے قلعہ کوٹ کھودے
یہ گو ہر کے حق میں گو پا سیدھیا ہے
(کرم خوردہ) کو پیر الٰہی
کہاں کا یہ منہ زور گھوڑا دیا ہے
الجھتا ہے ہر دم، نہ روکا رکے ہے
مجھے دل نے اب سخت عاجز کیا ہے
کہوں ہوں میں کچھ، یہ کرے اور ہی کچھ
نہ جانا پڑے کن نے جادو کیا ہے
کبھو گاوے، روو ے، کبھو مسکراوے
دیوانہ ہے یارو یہ کچھ اولیا ہے

... پہنچے تہاں اڑ کے پہنچے
گلا داب نے کو یہ تو مو گیا ہے

؎ یہاں ایک لفظ کرم خوردہ ہے۔

نصیحت سے میری یہ سو کوس بھاگے — تلنگوں کے حق میں جیسے بھوتیا ہے

میں بیٹھوں زمیں پر، یہ بیٹھے سماں پر — کجا تخت شاہی، کجا بوریا ہے

کریں جا بجا لوگ پر کا کبوتر — ہر اک بات کا بچ رہا توتیا ہے

زمانے کا یہ حال اور دل کا یہ حال — کہو کس طرح رہتی شرم اور حیا ہے

بھنور بیچ غم کے میں ڈوبوں اور اچھلوں — یہ کہتا ہے مجھ سے کہ تو مرجیا ہے

میں سو سو دفعہ تیرا پھاڑا گریباں — بتا تو نے کس واسطے پھر سیا ہے

تو ہے موت کا ڈھیر، مت بول مجھ سے — امر ہوں، میں نے آبِ حیواں پیا ہے

میرے ثانی نہیں ہے کوئی اب جہاں میں — فلک کے کنگوروں کو میں نے چھپا ہے

فدا ہوں سدا عاشقی پر میں اس کی — وہ جو قیس صحرا میں ایک ہو گیا ہے

خدا کی طرف جن نے دل کو لگایا — ہوا افضل اس کے سے وہ انبیا ہے

مرے جی میں آوے گی سو ہی کروں گا — میں مختار ہوں میرا دکرم خوردہ) ہے

سنیں دل کے منہ سے، میں جب ایسی باتیں — خدا شاہد ہے میں نے رو رو دیا ہے

پھر آخر ہو لاچار میں ہار بیٹھا — یہ لڑنے کے تئیں میرخاں ٹھوکیا ہے

کہوں کیا کیا یارو، میں دل کے تماشے — یہ تو سوانگ لانے کو بہروپیا ہے

نہ بک آگے اب نینؔ خاموش ہو رہ
یہ دل ہے ترا، یار لنگوٹیا ہے

آیا کبھو نہ بر میں مرے پیار کر کے تو — اس آرزو میں عمر ہی ساری بسر کری[1]

ماریں ہیں پہلو عرش پہ اب تو بھی رقیب — ایسی ہی تو نے مہر انھوں کے اوپر کری

بے رحم میرے حق میں مقرر ہے تو صنم — اب تک کبھو نہ تو نے کرم کی نظر کری

ٹک دیکھ چشمِ خلق سے نینؔ اپنے کی طرف
تیرے ہی اعتماد پہ میں تو گزر کری

---

[1] اس غزل کے ابتدائی اشعار دیوان میں موجود نہیں۔

رباعیاں

واجبی بات میں کچھ پھیر نہیں ہوتا ہے
چھپے پیسری کا بھلا میر کہیں ہوتا ہے
کہتے ہیں شیخ جی کے خائے ہیں سارے بھاری
اتنا گاڑی بھرا اندھیرا کہیں ہوتا ہے

یہ زلفیں نہیں ہیں مکھڑے پر بلا ہے، جو تجھے سوجھے
بھنویں ترچھی بڑی قاتل ادا ہے، جو تجھے سوجھے
جو کچھ فرہاد پر گزرا سو سب عالم پہ روشن ہے
مقامِ عشق میں بے شک وغلہے، جو تجھے سوجھے

فردیات

کیا کارگر ہوگئی ہے دیکھو ڈاہ کسی کی
ظالم کو تو لگتی ہی نہیں آہ کسی کی
کھو جا کے زلیخا سے نہ کر چاہ کسی کی
بس چھوڑ دے یوسف کو نہ لے آہ کسی کی

دیکھے ہیں تیری چشم میں جادو بھرے ہوئے
وحشی پھرے ہیں دشت میں آہو ڈرے ہوئے

تجھ سامنے ہو شمع تو حسرت سے پگھل جائے
اور گل کا تو کیا منہ کہ چمن سے نہ نکل جائے

متصل چشم کے یوں فکر اڑی رہتی ہے
جیوں لب آب سدا فوج پڑی رہتی ہے
چشم سے اشک کی وہ ندی چڑھی رہتی ہے
جس طرح مینہ کی ساون میں جھڑی رہتی ہے

شیریں تجھ لباں کی نہ کہہ انتہا سکوں
مصری، مثال ہے گی پہ لیکس نہ لا سکوں

نہ دینا بسکہ سیکھا شوخ نے کوئی کہاں تک مانگے
میں اپنا مانگتا ہوں دل، وہ کہتا ہے کہ پھر مانگو

منہ سے جتنی گزرے زندگی اتنی نزاکت ہے   کدورت اس میں کچھ بھی ہو تو پھر پوری ملامت ہے

دل اور جان سے جو کوئی دیوانہ تیرا ہے   کہیں ہیں لوگ کہ اس پر پری کا پھیرا ہے

جہاں میں جہاں تک کہ خوبصورتے ہیں   جگر داکفیں خواہ مخواہ گھورتے ہیں

مزے کا دیکھنا ہم کو تو یار تیرا ہے   ہوا تو آنکھوں کے اوجھل تو پھر اندھیرا ہے

مخمس

از بسکہ ستم گار ہو، بس تم کو بھی دیکھا   عاشق کے دل آزار ہو، بس تم کو بھی دیکھا
ہر فن میں عیار ہو، بس تم کو بھی دیکھا   ایذا کے روادار ہو، بس تم کو بھی دیکھا
کیا خوب وفادار ہو، بس تم کو بھی دیکھا

کھب گئی ہے زبس دل میں مرے، تیری نزاکت   اس واسطے کھینچے ہے یہ دل اتنی ملامت
یا ویسی محبت تھی اور یا ایسی قیامت   اب زیادہ کہوں کیا، تمھیں حق رکھے سلامت
کوئی تم بھی عجب یار ہو بس تم کو بھی دیکھا

کہہ تیرے سوا خوبی میں استاد کہاں ہے   تجھ حسن کی زیبائی کا تعداد کہاں ہے
گلشن میں ترے قد سا وہ شمشاد کہاں ہے   دنیا میں کوئی تجھ سا پریزاد کہاں ہے
ایسے ہی طرحدار ہو بس تم کو بھی دیکھا

رہتی ہے شب و روز مرے دل میں یہ حسرت   غیروں سے یہ الفت رکھو اور ہم سے یہ نفرت
کیا جانیں تجھے کیوں کہ خوش آئی ہے وہ صحبت   افسوس ترے دل سے کہاں گئی وہ مروت
کوئی سخت دغادار ہو بس تم کو بھی دیکھا

کہاں تک میں کروں آپ کے اوصاف کا شکوہ   ہر بار اکڑ جاتے ہو غصہ سیتی بل کھا
نے آپ ہی بوجھو، نہ کہو مجھ سیتی، سمجھا   اس طور تمہارے کی حقیقت کو کہوں کیا

ذرا ہی میں بیزار ہو بس تم کو بھی دیکھا

کیا کہیے میاں تم سے عبث، دل ہے دیوانہ — کہنے کو مرے تم نے کبھو بھی تو نہ مانا

ایک دم جو ملے ہم سے، کیا تم نے بہانہ — اس وضع تمہاری کو میں اب خوب پہچانا

خندوں کے خریدار ہو بس تم کو بھی دیکھا

ہے گرم بہت اب تو ترے حسن کی دوکان — بہتیک تجھے دیکھ کے ہوتے ہیں گے قربان

شاباش میاں خوب نکالی ہے یہی شان — دانا نہ کہیں اس کو، کہے تم کو جو نادان

ہر بات میں ہوشیار ہو، بس تم کو بھی دیکھا

تب تم کو کہے تھے کہ میں ہوں صادق دلدار — اور مجھ سا نہ کوئی دوسرا دنیا میں وفادار

اک دم جو جدا ہو، نہ تو ہوا ان میں گنہ گار — اس بات کو یک بارگی اب بھول گئے یار

عیار، ہو مکار، ہو، بس تم کو بھی دیکھا

مثنوی

الٰہی میرے تئیں ہدایت تو دے — ذرا اپنی مجھ کو حمایت تو دے

تری یاد مجھ کو تو ہر آن ہے — تیرے نام پر جان قربان ہے

اگر تیرا ثانی میں ڈھونڈوں کہیں — نہیں ہے، نہیں ہے، نہیں ہے نہیں

زباں پر کیا ورد میں نے یہی — توئی ہے، توئی ہے، توئی ہے، توئی

ہر اک شئے یہی بولتی ہے صدا — خدا ہے، خدا ہے، خدا ہے، خدا

پچ ہارے بہت اپنا ساکر اپاور (؟) — کسی نے نہ پایا تیرا بھید بھاؤ

تیرے بھید سے ہے تجھی کو خبر — جہاں میں نہیں ہے کسی کو خبر

ترا کُن کا کہنا کرامات تھا — لیکن بے طرح کا ظلمات تھا

تیرے کُن کے کہتے ہوا یہ وہ سب — پڑے تھے عدم میں نہ تھا کچھ بھی تب

عجائب ہیں یہ چار صفتیں تری — کہ جس سے ہے خرم طبیعت مری

یعنی ہے تو بے چون اور بے چگوں — کہیں ہیں دگر بے شبہ بے نموں

نہ دیکھا کسی نے نہ پایا کہیں
پڑی عقل چکرت میں آکر یہیں

ہے سب سے جدا اور سب میں ملا
اسی بات سے غنچۂ دل کھلا

ہزاروں گدا کر دیے بادشاہ
ترے حکم سے روشن ہیں مہر و ماہ

نظر آگیا جس کو ٹک تیرا نور
اُسی دم ہوا اُس کا سب درد دور

لیکن ایک تیری عجب شکل ہے
کسی کا نہ تیرے کنے دخل ہے

جو چاہوں کہ تیرا کروں کچھ بیاں
تو منہ میں ہوئی جائے ساکت زباں

تو نے دل کے تئیں جس کے روشن کیا
اسے انبیاء، اولیاء کر دیا

تصدق کیا تجھ پہ سب جان و تن
قدم بوس ہونے لگے مرد و زن

ترا عشق تخت سے جن نے کیا
گویا اُن نے سچ مچ دھتورا پیا

لگا باتیں کرنے وہ اسمان سے
ہوا بے خبر جسم اور جان سے

پھرے بھونکتا سگ نمن، اوڑھ ٹاٹ
جیسے بے دہاشہ بکیں ڈوم، بھاٹ

پھر آخر کے تئیں اس کو سودا ہوا
گلی در گلی خوب رسوا ہوا

اسی طرح سب عمر بھٹکا کیا
ہر ایک سنگ پر سر کو پٹکا کیا

تری آشنائی میں یہ حال ہے
کہوں کیا بڑا جی کو جنجال ہے

تری اب عبادت ہی کرنا ہے خوب
غضب سے ترے سخت ڈرنا ہے خوب

لکھوں ہوں میں آگے زمانے کا حال
سنو اہل فرہنگ اور اہلِ قال

نپٹ کر کے اب وقت باریک ہے
زمین آسماں سارا تاریک ہے

وہ تیرہ صدی جو سنیں تھے سبھی
یہی ہے، یہی ہے، یہی ہے، یہی

مچائیں زمانے کے نیرنگیاں
کریں رنگ میں سب کی بے رنگیاں

لگے جا بجا چوٹ پر اور چوٹ
مقدمہ ہے ہر ایک کا لوٹ پوٹ

اک عالم کے تئیں کر دیا خاک سیاہ
ہزاروں سپاہی پھریں ہیں تباہ

ٹھکانہ کسو بھی نہ سرکار میں
نہ دربار میں کچھ، نہ گھر بار میں

مچی ہے نہایت ہی اب بھوک بھوک
چھوہارا ہوئی خلق سب سوکھ سوکھ

کوئی چھٹ بٹنے کی باتیں کرے — تو انبوہ پھر اس طرف چل پڑے
گریں ایک پر چھ چھ وہاں اس طرح — شہد پر مگس گرتے ہیں جس طرح
کہیں ہیں اسے رجعت القہقری — گیا موجِ زن آب اور پھر، پھرا
تھے جتنے زمانے میں بانکے بلی — خنک ہو گئے جیوں برف کی ڈلی
اسافل خوشی ہے تو کم بیش ہے — نجیب ہے سو وہ سخت دلریش ہے
گیا بھول یک لخت جوش اور خروش — کیا اس طرف سے میں نے دل خموش
کہوں اس حکایت میں ایک اور طرز — سنو اہل علم و عمل، اہل رمز
عجب وقت ہے اور عجب ڈول ہے — کہیں جھگڑے ہے اور کہیں ڈھول ہے
کسو کے تئیں کوئی پوچھے نہیں — برا اور بھلا کچھ بھی سوجھے نہیں
حمق پر ہوئی ساری تر کی تمام — ندارد ہوئی عین، قاف اور لام
تزک دیکھ ناخواندوں کا اس زماں — ہوا وِرد ہم کو، الٰہی اماں
کریں بے شعوری کے سب کام وے — دھریں ہیں خدائی کے تئیں نام وے
تکیں پگڑی ایک ایک کی، لے کے ناؤں — جنھوں کی طبیعت کا سر ہے نہ پاؤں
ڈرے خلق یوں ان کی تدبیر سے — کہ جس طرح کلوا ڈرے تیر سے
غرض سب طرح ان کی نیت بری — ہر ایک بات جن کی شہد کی چھری
بھانویں پٹلے[1] کر کے دلداریاں (؟) — کریں پیچھے سے خوں خواریاں
پھکے ہے کوئی دن میں جلدی سے صور — ہوا ایک ہی بھاو پر کھل، کپور
اور آقا ہمارے تو اب واہ واہ — ہنسے ہے جنھیں خلق سب قاہ قاہ
قبول ہے یہ قسمت کا اپنی قصور — پہ گو پندوں سے یہاں کے حق رکھے دور
جہاں فاقہ ہے اور برا حال ہے — تہاں کہتے ہیں خواہ مخواہ مال ہے
نہ وہاں مال، نہ چرخا، نہ خاک دھول — یہ کیا بنے پھرتے ہیں پھول پھول

---

[1] پہل ؟

جو کچھ چاہتے ہیں سو بکتے پھریں
گلی کوچے میں سب کو تکتے پھریں

کٹیں اجلے کپڑوں کو دیکھ اس طرح
چھری سے کٹے خرپزہ جس طرح

مرو یا جیو کوئی بیزار سے
انھیں کام ہے مردم آزار سے

پھریں پیچھے ہر ایک کی گھات میں
کریں خالی وہ، گھر ذرا بات میں

تھے آگے ہی سے ایک تو لاعلاج
ہوئے تس پہ اب کوڑھ ہیں اور کھاج

کہیں کو چلو راہ چلتی نہیں
کسو کی یہاں دال گلتی نہیں

فروئی کا اب کیا کہوں میں رواج
کوئی کل غارت ہوا، کوئی آج

(کرم خوردہ) تو بستی میں کوئی نہیں بجا
بچا کر کے چھوڑا ہر ایک کو بچا

فروئی جو پوچھو تو ہے یہ کہاں
بچا چیل کا سا چھپٹا یہاں

نکل گھر سے جو کوئی کہیں کو چلا
وہ نہیں لوگوں نے اس کا پکڑا گلا

اسے چوڑے میں پھر کھڑا کر دیا
جو کچھ پایا سو سب ہڑپ کر لیا

روہیلہ ہے ایک میر خاں اس کا نام
اسے کرتی ہے خلق اٹھ اٹھ سلام

اگرچہ کامداری سے ظاہر ہے وہ
لیکن مال کھانے کو ماہر ہے وہ

بڑا دھاک اس کا بڑا اس کا ٹھوک
سب آمد شہر کی وہ لے خم کو ٹھوک

نہ چھوڑے بھلا اور نہ چھوڑے برا
مُرنڈا کرے وہ پکڑ کر چھُرا

یہاں تک کشش کی کہ پھر تھک گیا
رعیت کے تئیں لوٹ کر چھک گیا

پڑا صبر رعیت کا اس پر شتاب
ہوا آپ ہی اس کا سب زہرہ آب

دیکھا اس نے اٹھنے ہی میں ہے مزا
والا کر یہاں پہنچتی ہے سزا

نہ مانا پھر ان نے کسی کا کہا
جمعیت کو اپنی لے جاتا رہا

سنو کارپردازوں کا اب بیاں
جنھیں تھوکتا ہے گا سارا جہاں

مچایا ہے کھنڈی کا دور اس قدر
کہ بھاگن پڑی شہر میں گھر بگھر

لگے ہے یہ تو سال میں ایک بار
نہ کہ ہر مہینے میں پھر، چھ چھ بار

یہ کھنڈی نہیں ہے گی بھنڈی ہے یہ
ستم کاروں کی گرم منڈی ہے یہ

گریں بنیوں پہ رات دن لوٹ لوٹ
مچائی ہے بے طرح کی لوٹ لوٹ

کسو کی نہ مانیں کوئی داب، ڈانٹ
الٰہی یہ کچھ کیا بگڑا ہے ماٹ

کسو کے تئیں کوئی کھینچے پھرے
کسو کے تئیں کوئی اینچے پھرے

کسو کے تئیں کوئی ڈالے پچھاڑ
کسو کے کوئی توڑتا ہے کواڑ

کسو کو کوئی روٹی کھانے نہ دے
کسو کو کوئی ہاٹ جانے نہ دے

کسو کا گویا کوئی والی نہیں
جو دم ہے سو آفت سے خالی نہیں

کسو کی ذرا کوئی سنے نئیں پکار
کریں ہیں رعیت کے تئیں مار مار

محلّے محلّے میں ہلّا مچا
یہ ہلّا نہیں بل دھڑلّا مچا

کہوں کیا پڑی ہلڑی مہربان
ہوئے کان سن سن کے اب پکدان

گئے بھاگ لے لے کے سب اپنی جان
لگے چھوڑ کر قفل، گھر اور دوکان

ہوا آخرش سارا بازار بند
کیا یہ تردد تو لایق پسند

لگے کہنے سب مل کے واہ واہ رے میں
لیا پیسہ بنیوں سے کیا خوب، ایں!

کئی ماہ تک یہ بکھیڑا رہا
رعیّت نے یارو بڑا دکھ سہا

ہزاروں روپوں کا پڑا آکے بیچ
ہوئے مفت میں بنیے سب ہیچ، ہیچ

گئے بیچنا بھول دے مونگ، ماش
ہوئے گھر کے گھر صاف اور پاش پاش

اب ان باتوں کا کوئی کیا دے جواب
مجھے آگے کہنے کی طاقت نہ تاب

دکنا، تھا ملک آگو حیدر علی
وہ مرزا، وہ منصف، عصر کا ولی

یہاں تک ہے وہ اپنے باطن کا صاف
ہزاروں خطا لوگوں کی کردے معاف

ہے سب طرح سے اس کی نیت بخیر
ہمیشہ خدا کی اس اوپر ہے مہر

رکھے سب کو خوش اور خوش رہوے آپ
بھلائی کی اس کے تو پھیلی ہے چھاپ

ملک ہے جہاں ظلم معدوم ہے
کرے زیادتی کوئی، معلوم ہے

کسی کا برا کرکے جانے نہیں
چپٹر خندوں کی بات مانے نہیں

چکوروں کو وہ کان لگنے نہ دے
وہ تا حشر فتنے کو جگنے نہ دے

عمر اس کے میں، چوری کا نام کیا
دغا باز، نٹ کھٹ کا دھاں کام کیا

خدا نے کیے خوش ایسے کتوال کو
پرکھتا رہے سب کے احوال کو

عذاں کے لیے وہ پھرے کو بکو
تردد کا ہے لیک دادا، گرو

خفا ہو گیا تھا وہ بھوپال سے
کئی طرح کے یاں کے احوال سے

سنا ان نے جس وقت یہ ماجرا
نہایت وہ دل بیچ اپنے کڑھا

بارے آن پہنچا وہ چل کر شتاب
ہوا شہر کو دیکھ جل بھن کباب

بہت اہلکاروں کو دی لعن طعن
کیے صاف گویندوں کے ناک کان

وہ پہلے سبھوں کے تو گھر گھر پھرا
ہر ایک سے بغل گیر ہو کر ملا

بلا پھر تو سب کو، دیئے ان نے پان
کہا کھولو دوکان تم میری جان

اگر تم کو دیکھے کوئی بد نظر
کیا بو جو اس کو شہر کے بدر

ذرا چھیڑے تم کو کوئی بات میں
تو دے دوں ابھی دم اسے کاٹھ میں

یہ کہہ کر کے جلدی بٹھایا امن
کیا شہر کو پھر گلوں کا چمن

لگیں جا بجا کو یلیں بولنے
پھلیل اور عطر پھر لگیں تولنے

ہوئی گل فروشوں کی وہ ہی بہار
لگے بکنے انگور، سیب اور انار

جھمکڑا وہی پھر چمکنے لگا
وہی مشر و میٹھا پھڑکنے لگا

پری زاد گھر سے نکلنے لگے
بہت سنگ دل پھر پگھلنے لگے

عجائب کیے نازنیں خوش خرام
کریں کوئی نظروں میں قصہ تمام

کیا بنیوں کے سینے سے دور، داغ
ہوا دل ہر ایک کا نپٹ باغ باغ

ملک کے تئیں کو کہے آفریں
جزاک اللہ صد آفریں، آفریں

کرے اس کی تعریف خلقت نہ کیوں
کیا ان نے بازار کو جیوں کا تیوں

کیا مختصر میں نے یہ رنگ رس
کہ مغز حقیقت ہمین است و بس

سنو یارو اب تم بزرگوں کے قول
کہے ہیں سخن میزاں میں تول تول

جو کوئی کہ ہیں گے نپٹ دل حزیں
وہ اَلّذین ہیں نہ اَللّذین

جو کوئی مفت لیتے پھریں ٹکڑیں
پڑیں غیب سے ان کے سر چھکڑیں

جو کوئی زباں کا کر گندہ ہے وہ
بھلا آدمی نہیں ہے خندہ ہے وہ

جو کوئی کسو کا کرے ہے بُرا
نہ ہووے کبھو ہرگز اس کا بھلا

جو کوئی فضیلت سے بھاگیں ہیں دور
مقرر انھیں جانیے دل کے کوُر

جسے شعر کا شوق دن رات ہے
وہ تو قابل ہے اس کی کیا بات ہے

جو کوئی عصر میں ہے صاحب سخن
اسے کہیے بے شک فلاطوں زمن

جو کوئی کہ مفلس پئیں ہیں شراب
انھوں کی تو مٹی ہے گھٹ گھٹ خراب

جنھوں کی کہ نیت میں ہے کچھ خلل
ہے آفت انھوں پر محل بے محل

جو کوئی سخاوت کے ہیں پائے مرد
انھوں نے کیا ہمت حاتم کو گرد

لیکن یارو ہمت خدا داد ہے
سدا اہل ہمت کا دل شاد ہے

نہ ہمت برابر کوئی چیز ہے
نہیں جس میں ہمت وہ تو حیز ہے

بڑھی جس کی ہمت بڑھا اس کا ٹھاٹ
نہ مانو تو جا دیکھو گنگا کا پاٹ

جو کوئی کہ سب طرح ہیں بے تمیز
انھوں کے تئیں کو ہے دولت عزیز

کیا ان کی دولت نے جس دم فرار
لگے خوار پھرنے شتر بے مہار

خوشامد کریں جا بجا جوڑ ہاتھ
تو بھی ان کی کوئی نہیں پوچھے بات

جو کوئی کہ عاشق ہیں تیرے اُپر
وے ماریں ہیں دولت کو پاپوش پر

بڑی دولت ہے گی ترے نام کی
بڑے نام کی اور بڑے کام کی

فدا ہوں میں نون ترے نام پر
کمر باندھی ہے کس کے اس کام پر

ہزار آفتوں سے بچایا مجھے
نئے سر سے کئی دم جِلایا مجھے

ترا شکر ہر دم کیا چاہیے
یہی چاہیے اور کیا چاہیے

الٰہی ترا فضل درکار ہے
یہ بندہ تو سب طرح لاچار ہے

شرابِ طہورا پلا دے مجھے
جمال اپنا جلدی دکھا دے مجھے

یہی نتّن کو آرزو ہے مدام
تری یاد میں خوش رہے صبح و شام

مسدس شہر آشوب

جس کسی کا گھرانہ عالی ہے
اس کا منہ چکنا، پیٹ خالی ہے
زور ہی تحفہ طرح نکالی ہے
دیں بنارس کہیں کہ حالی ہے (؟)

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

روز داروغہ پاس جاتے ہیں
شور و ہو ہا بہت مچاتے ہیں
صبح سے شام تک بکاتے ہیں
وے مواشی انھیں بتاتے ہیں

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

بعضے جب آکے دھوم ڈالیں ہیں
آنہ دو آنہ، دے کے ٹالیں ہیں
بعضوں سے حجتیں نکالیں ہیں
بعضوں کو صاف ٹالیں بالیں ہیں

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

لکھ کے دیتے ہیں دو روپے کی برات
تس کے دو آنے پھر لگیں ہیں ہاتھ
اس کو بھی گئی لگا رہے ہیں گھات
اس خرابے کی کیا کہوں میں بات

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

کیا ہوا بگڑی ہے زمانے کی
کچھ بھی صورت نہیں ہے پلنے کی
آشنا کی نہ کچھ یگانے کی
وائے بر جان ہے بیگانے کی

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

کوئی روپوں کی تلاش میں ہیں گے　　　کوئی فکر معاش میں ہیں گے
کوئی سینہ خراش میں ہیں گے　　　اس طرح کے قماش میں ہیں گے

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

مارے بھوکوں کے اس قدر ہیں چور　　　کسو کے منہ پہ نئیں ذرا بھی نور
بے نصیبی میں کچھ نہیں ہے قصور　　　یہ حقیقت کہوں میں کس کے حضور

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

بے طرح کے یہ لوگ ہیں بے پیر　　　دینے کی کچھ بھی نئیں کرین تدبیر
بھوک از بس ہوئی ہے عالمگیر　　　ساری دنیا کے تئیں کیا ہے فقیر

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

ہے عجب کچھ یہ جاٹ کی سرکار　　　خلق ناخوش، سپاہ سب بیزار
دیر طلبی سے سخت ہو لاچار　　　اکثر اس بیت کو پڑھیں ہیں پکار

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

پاجی عالم ہے بادشاہی میں　　　مرد آدم پھریں تباہی میں
کیا کہوں میں جناب الٰہی میں　　　اب کے پھر گھٹلی ہیں چھاہی ہیں

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

حال اپنا سنا کے جیتا کہا　　　سال گزرے پہ تو بھی کچھ نہ ملا
اٹھ گئے آخرش کو ہو کے خفا　　　بے جا نئیں ہے، کہا ہے بہت بجا

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

کیا کہوں میں انھوں کی نادانی
نوکری کہیں ذرا نہ پہچانی
بے وقوفوں پہ ہے مہربانی
بہت سا پیار اور قدردانی

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

اس سوا اور یہ تماشا ہے
کیا کھلا اتوؤں کا ڈربہ ہے
حق شناسی کا حرف عنقا ہے
بسکہ عالم خراب و رسوا ہے

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

یہاں تلک ہے جہاں کی بات ابتر
پیسے دینے پہ نئیں کسو کی نظر
جھوٹ ہی جھوٹ پہ بندھی ہے کمر
شاہ کے آنے کی ہے تس پہ خبر

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

دیکھ کر جھوٹ اور دغا بازی
اٹھ گئے جو کہ مرد تھے غازی
چاپلوسی سے کر سخن سازی
اب تو نامرد لے گئے بازی

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

نہ کوئی منصف ہے نہ کوئی عادل
حظ نفسی میں ہیں سبھی کامل
بسکہ حیرت میں ہیں گے سب عاقل
کہتے ہیں روز ہاتھوں کو مل مل

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

جا بجا بھوک اور پریشاں ہیں
کردۂ خویش سے پشیماں ہیں

دیدہ گریاں و سینہ بریاں ہیں — دیکھ یہ حال ہم بھی حیراں ہیں

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

کیا یہ امرار و بخشی و عظّام — روز و شب کرتے ہیں گے اپنا کام
دیکھ کر کے یہ ان کی شکل مدام — اک ہنسی آتی ہے گی جن پہ تمام

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

اس طرح کا مچا ہے دھندھو کال — سب کے چہرے پہ ہے نمودِ ملال
خواجہ حافظ میں دیکھتے ہیں فال — تینسرے فاقے، ہے حرام، حلال!

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

ہو گئے نادھند اہلِ ہمم — اب کسی کا کسی کو درد نہ غم
غور کیجے تو ہے صریح ستم — بات اس مصرع پہ ہوئی ہے ختم

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

کیا کروں یارو جاٹ کا میں بیان — اونچی دوکان اور سڑا پکوان
وے کہاوت ہے آخرش کو ندان — اڑ گئی چڑیا رہ گئے دو کان

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

دیکھو یارو یہ کیا عجائب ہے — طرح آقا کے کیا غرائب ہے
جو کہ بھڑوا ہے سو مصاحب ہے — مسخرا ہے سو پیارا نائب ہے

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

کوئی کچھ لینے کو جو یہاں آوے — پیسے دے، مار کھا، چلا آوے
لاکھ کوئی اگرچہ چلاوے — آقا سُن کر کہیں نہ شرماوے

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

ہے مزا اب تو بات جھوٹی میں — کچھ نزاکت نہیں ہے موٹی میں
دیکھتا ہوں یہ طرز کھوٹی میں — جی رہے ہیں ہمیشہ روٹی میں

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

اب تو رتبہ ہے زندگی کے تئیں — اور مراتب ہے خندگی کے تئیں
کوئی نئیں پوچھے بندگی کے تئیں — پھٹے منہ ایسی زندگی کے تئیں

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

دھول ہے اب کے اس زمانے میں — خاک اڑتی ہے کارخانے میں
کچھ برکت نہیں کمانے میں — گوہا، پچی بچی ہے خانے خانے میں

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

کہیں ذرا شرم دل پہ نئیں لاتے — روز پھرتے ہیں خایہ سہلاتے
تس پہ بھی حق اپنا نہیں پاتے — اس حماقت سے باز نہیں آتے

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

بہتوں کی اب یہ آرہی گزر — ٹھیکرا لے کے پھرتے ہیں گھر گھر
بعضے کہتے ہیں دیکھ انھیں اکثر — لعنت ہے ایسی نوکری اوپر

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

کیا کہوں بعضوں کی بھی شامت کو　　کچھ میسّر نہیں حجامت کو
دیکھتے ہیں صریح قیامت کو　　تس پہ بھی مرتے ہیں قدامت کو

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

بعضوں کی گانٹھ ہیں، نہ کچھ گھر ہیں　　وے اکڑتے پھریں نہ کہیں شر ہیں
دیکھو عالم انھیں بہت بھر ہیں　　مجھ کو کچھ غرض نہیں، کہوں پر ہیں

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

جو کہ صاحب طبع ہیں اہلِ ذکا　　وے تو مرنے کی مانگتے ہیں دعا
ہاتھ میں تسبیح کے دل کو لگا　　یہ وظیفہ پڑھیں ہیں سب کو سُنا

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

ہو رہے ہیں فضیحتے گھنگھور　　اور خرابی مچی ہے چاروں اُور
جس کو دیکھو سو زندہ ہے درگور　　رات کو تس پہ آوتے ہیں چور

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

غرض ہے اب جہاں میں آپا آپ　　کوئی نہ بیٹا کسو کا، کوئی نہ باپ
اپنا مطلب کریں ہیں سب چپ چاپ　　پھر اسی مصرع پہ لگی ہے تھاپ

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ برطرفی اور بحالی ہے

ساری خلقت کو دیکھ کر غمناک　　بسکہ حیرت کا ہوئے سینہ چاک

آنکھیں سب کی ہیں پر نہیں ہے ناک　　اس سوا اور کیا کہوں میں خاک

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ بر طرفی اور بحالی ہے

شہر آشوب بس کیا چہیے　　آگو خاموش ہی رہا چہیے
گزرے جو کچھ، سو سب سہا چہیے　　کوئی پوچھے تو یہ کہا چہیے

کیا مصیبت خدا نے ڈالی ہے
جس پہ بر طرفی اور بحالی ہے

مخمس شہر آشوب

جگ میں کوئی کسو کا یار نہیں　　یار بھی ہیں تو ان میں پیار نہیں
پیار وہ جس کا اعتبار نہیں　　اعتبار ہے سو بر قرار نہیں

کونسا دل ہے جو کہ زار نہیں

سوچ ہی میں کٹے ہے ساری رات　　جی نہ چاہے وہ کیسے منہ سے بات
ماریے ایسی زیست اوپر لات　　اس زمانے کے ہاتھ سے ہیہات

عیش کا کچھ بھی سروکار نہیں

کیا کہوں میں تباہی دنیا کی　　بھوک کی، دکھ کی، وائے ویلا کی
اور مصیبت کے صور برپا کی　　یہاں تلک مفلسی نے اب جا کی

پگڑی سر پر ہے تو ازار نہیں

اس سوا اور بھی یہ ندرت ہے　　دانا شخصوں سے سب کو نفرت ہے
زور ہی یہ خدا کی قدرت ہے　　نہ کہیں عیش ہے نہ عشرت ہے

جز خزاں کے کہیں بہار نہیں

فاضل آگے ہی کہہ گئے ہیں پکار　　بعد اقبال کے ہے پھر ادبار
زندگی کا مزا ہے دن دو چار　　اس کو کس واسطے کروں اظہار
یہ سخن کس پہ آشکار نہیں

کوئی نہ پوچھے اگر مرے کوئی　　درد میں عمر سب بھرے کوئی
سر کو کاٹ ہاتھ پر دھرے کوئی　　لاکھ حکمت اگر کرے کوئی
تو بھی مطلب کا رو بکار نہیں

یاں تو جو کچھ کہ طرح ہے سو یہ ہے　　مقصد ہونے کو میں کہا سو وہ ہے
جی میں آوے لہر سو جی میں رہے　　چاہے کہنے کو بھی تو کس سے کہے
ایسا کوئی یار غمگسار نہیں

تیل بن، گھر دیا جلے کیوں کر　　آنچ بن چیز کوئی گلے کیوں کر
پیسے بن کام بھی چلے کیوں کر　　مفت چاہو سو کچھ ملے کیوں کر
باوا جی کی تو نانکار نہیں

ایک نے جا نجومی سے پوچھا　　کچھ ترقی کب ہوگی یہ بتلا
تب وہ بولا کہ ہے نرا دھوکا　　کون جانے کہ کل کیا ہوگا
آج ہے اس میں پھیر پھار نہیں

جو کہ بالفعل ہیں گے اب سردار　　وہ تو غفلت کی مدھ میں ہیں سرشار
ساری بستی انھوں سے ہے بیزار　　وقنا ربنا عذاب النار
دینے کا کچھ بھی کاروبار نہیں

اُنؔ ہیں سو مشیر صاحب ہیں　　فیلیاں ہیں سو عمدہ نائب ہیں
مسخرے ہیں سو وہ مصاحب ہیں　　اہلِ دانش انھوں سے تائب ہیں
اس حماقت کا وار پار نہیں

سیر کو جب کہیں وہ جاتے ہیں　　لال، پیلے کی سج دکھاتے ہیں
طرّہ رکھ کر کے سر ہلاتے ہیں　　چلتے میں بھاؤ سا بتاتے ہیں
اس سوا ان کو اور کار نہیں

دیکھ کر یہ طرح، ہوا جی دنگ — آقا ہو کے بجاوتے مردنگ
خنجری لے کے گاوتے سارنگ — اور غضب یہ کہ ایسے ہیں دل تنگ
جن کے ابخل پنے کا پار نہیں

صحبت ان کی عجب دھمیا ہے — کوئی پتنگا کوئی تتیا ہے
ہے گویا کوئی، پچیا ہے — تانا رے رے ہے، تانا تھیا ہے
مرد آدم کو ان میں بار نہیں

شکل ایسی کہ جیوں ثمر شہتوت — بولے ایسے کہ جیسے بولے بھوت
کیوں نہ خلقت کہے الٹوں کو کپوت — لونڈیوں سے کتا کے بیچیں سوت
کہیں ذرا دل میں جن کے عار نہیں

مرد ایسے کہ چوہے سیتی ڈریں — جنگ کا نام سن کے موت بھریں
چلو بھر پانی میں نہ ڈوب مریں — یار سب مل کے ان کا ٹھٹھا کریں
تو بھی ذرا وہ شرمسار نہیں

ہیجڑوں کی سی جن کی چولی ہے — جو ملے اس سے پھر ٹھٹھولی ہے
بارہ مانسے جنھوں کی ہولی ہے — روز شب جن کا درس گولی ہے
قابلیت کا کچھ شعار نہیں

نوکر حق ملنگنے کو جب آویں — ایک روپیہ انھیں نہ دلواویں
وقت پر وے بھی خایہ بتلاویں — ایسے برتے پہ آقا کہلاویں
بے شعوری کا کچھ شمار نہیں

دوسرے اور یہ بڑا جنجال — ایک عالم پھرے ہے بیت المال
جھوٹ، چغلی، دغا کا مالا مال — کارکن ہے سو وہ بھی خر، دجال
رحم کا دل میں جس کے بار نہیں

چوری اوپر ہے عاملوں کی نگاہ — (کذا)، رشوتی ہے مارِ سیاہ
بخشی کہ جن پہ ہے سپاہ کی آہ — دیوان سیتی پناہ دے اللہ
معتبر کوئی اہلکار نہیں

شخصیت ہی نہیں کہوں کس میں ہے عناد اور نفاق آپس میں
جائے محبّت کے کچھ نہیں اس میں کون سا گھر ہے یہ کہو جس میں
خانہ جنگی وکار زار نہیں

خوب ہی میں نے غور کر دیکھا یہاں بزرگی کو سب نے مل چھیکا
چاہیں جس کو کریں ہیں چو مینھا نہ حساب ہے نہ جس کا کچھ لیکھا
ان کے گرنے کو کوئی غار نہیں

ایسا اندھیر بھی سنا ہے کہیں جس کو دیکھو سو ہے وہ قابو چیں
غیر کے کام میں نپٹ ، بد بیں کیوں نہ رسوا کروں میں ان کے تئیں
ان کو کچھ اور روزگار نہیں

یا الٰہی زیادہ اب نہ جلاؤ ہونا ہو کل سو آج ہی ہو جاؤ
چار سُو کا ہے بے طرح کچھ بھاؤ خندوں کو راگ، ناچ، قلیہ، پلاؤ
مستحقوں کو مُو نہار نہیں

کام کے لوگوں کو تو موت آئی اب نکمّوں نے دھوم پھیلائی
راست گفتہ کسے زدا نائی سگ نشیند بجائے گیپائی
اس برابر تباہ کار نہیں

ناک، کان، آنکھیں، خوردن و آشام ادیہاں سب ہے اے ذوی الاکرام
پر ندارد ہے عین، قاف اور لام ڈھب ہے دیکھیو صبح یا شام
اس میں کچھ دیر زینہار نہیں

جو کہ آگو بڑے تھے دولت مند نجبا، اشراف کو رکھے تھے پسند
ان کی حالت کہوں میں اب تا چند اس قدر ہوئی انھوں کی آمد بند
پالکی کو جنھیں کہار نہیں

جو خوشی بیچ دن کو بھرتے تھے نیک نیت پہ دل کو دھرتے تھے
اور بدی سے بہت سا ڈرتے تھے سب طرح کا وہ حظ کرتے تھے
ان میں اب کوئی مالدار نہیں

جن کا خوبی میں نام تھا مشہور　　اور زری، باب سے تھا گھر معمور
جانتے ہی نہ تھے وہ حرف غرور　　کام آتے تھے سب کے وقت ضرور
ان کنے اب تو ایک تار نہیں

لشکری سارے، ہاتھ دھو ہی چکے　　جو طلب تھی اسے ڈبو ہی چکے
بڑے کے جی کو خوب رو ہی چکے　　یہاں برائی کا بیج بو ہی چکے
کچھ سمجھ کا جنھیں بچار نہیں

دل ہوا ہے کباب، اب جل کر　　جی میں ہے اس طرف سیتی ٹل کر
کسو کے ساتھ ہر طرح مل کر　　اپنا دن کاٹیے کہیں چل کر
ایسے کوئی دوست تین چار نہیں

چاہیے یوں کہ دور ہو آلام　　مے ہو، مطرب ہو، ساقی ہو اور جام
وہ میسر ہو نازنین گلفام　　جس کے دیکھے سے جی کو ہو آرام
لیکن اپنا کچھ اختیار نہیں

ایزد اپنی امان میں رکھے　　جب تلک اس جہان میں رکھے
شادی وکھان پان میں رکھے　　جاہ و حشمت کی شان میں رکھے
اس سے بہتر کوئی وقار نہیں

پروفیسر مسعود حسین

غالبؔ کی حیاتِ معاشقہ

گر مصیبت تھی تو غربت میں اُٹھا لیتا اسدؔ
میری دلّی میں ہی ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے! (قبل ۱۸۲۱ء)

غزل ایک داخلی صنفِ سخن ہے جو ملبوس ہوتی ہے کنایات و ملائم کی تہ داری میں۔ اسی لیے اِس کی داخلیت سے کسی قسم کی خارجیت کا استخراج ایک نازک مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے میں خواجہ منظور حسین جیسے ادبیات کے دیدہ ور نے ایک عمر صرف کر دی[۱]، اور چند غزل گو شعرا مثلاً میرؔ، ظفرؔ، ذوقؔ، حالیؔ اور داغؔ کے کلام سے بعض "تاریخی حالات و معاملات" کا استخراج بھی کیا، لیکن غالب کے سلسلے میں اُنھیں بھی زیادہ کامیابی نہ ہو سکی[۲]۔ وہ غالب کے تعلق سے اس "دورِ انحطاط" کے صرف چند نقوش عمومی بیانات کے طور پر فراہم کر سکے ہیں۔ اُن کے اِن بیانات میں بہر حال ایک تاریخی استحکام اور استدلال کی صورت ملتی ہے، یہ دیگر شارحین و ناقدین کے اُس رویّے کے بالکل مختلف ہے، جو غالب کے کلام کے تاریخی ارتقا اور ادوار سے ناواقفیت کی بنا پر ایک دَور کا شعر دوسرے دور کے تاریخی حالات پر چسپاں کر دیتے ہیں؛ خاص طور پر جب ڈاکٹر سیّد محمود کی طرح غالبؔ کو ایک وطن پرست شاعر ثابت کرنا

---

[۱] اردو غزل کا خارجی روپ بہروپ، لاہور، ۱۹۸۱ء
(اس تصنیف کے تانے بانے خواجہ منظور حسین نے تقسیمِ ملک سے قبل اپنے علی گڑھ کے قیام میں تیار کر لیے تھے)

[۲] ۴۰۴ صفحات کی اس تصنیف میں وہ بہ مشکل چار صفحوں کا مواد فراہم کر سکے جو مشتمل ہے غالبؔ کے چند اشعار اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے متعلق ایک قطعے پر۔ یہ تمام چیزیں بھی شعری نقطۂ نظر سے دوم درجے کی ہیں۔

[۳] مقدمۂ دیوانِ غالب

پیشِ نظر ہو۔

مولانا امتیاز علی عرشی[1] اور کالی داس گپتا رضا[2] کی کاوشوں سے اب غالب کا اردو کلام بڑی حد تک تاریخی ترتیب پا چکا ہے۔ خاص طور پر غالب صدی کے موقع پر (۱۹۶۹ء) گنجِ باد آورد کے طور پر ان کے ابتدائی کلام کے مجموعے " دیوان بخطِ غالب" کے انکشاف کے بعد ان کے کلام کی تاریخی ترتیب میں بہت سہولت ہو گئی ہے جس سے اس "گنجینۂ معنی کے طلسم" شاعر کی شخصیت کے بہت سے پرت کھلنے لگے ہیں[3]۔

چھبیس پچیس برس کی عمر تک غالب نے ایک "رندِ شاہد باز" کی حیثیت سے زندگی گزاری۔ تذکرہ سرور[4] کے مصنف نے "جو غالب کے دوست تھے۔ انھیں ایک "دردمند" (عاشق) اور "پردۂ عشقِ مجاز" شخصیت کا مالک بتایا ہے۔ خود غالب اس دور میں اپنے " فسق و فجور اور عیش و عشرت میں انہماک" اور "شورِ سودائے پری چہرگاں" کا ذکر کرتے ہیں[5]۔ دیوان بخطِ غالب (۱۸۱۶ء) کے ایک شعر میں ایک "جفا مشرب" شیعہ محبوبہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے ؎

اُس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسد

مالِ سُنّی کو مُباح اور خونِ صوفی کو حلال

نسخۂ بھوپال (حمیدیہ)، جس کی تکمیل کے وقت (۱۸۲۱ء) غالب کی عمر ۲۴ سال کے قریب تھی، وہ بری طرح "عشرتِ صحبتِ خوباں" میں "اپنی عمرِ طبیعی" کی پروا نہ کرتے ہوئے منہمک تھے ؎

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو

نہ ہوئی غالب اگر عمرِ طبیعی نہ سہی (قبل ۱۸۲۱ء)

---

[1] دیوانِ غالب ؛ انجمن ترقی اردو (ہند)، طبع دوم

[2] دیوانِ غالب (کامل) ؛ بمبئی، ۱۹۸۸ء

[3] مذکورہ بالا 'بیشۂ شعر' کی سیاحت دشوار ثابت ہو تو دیکھیے، انتخاب کلامِ غالب (مکمل)، مرتبہ مسعود حسین سرسید بک ڈپو، جامعہ اردو، علی گڑھ، ۱۹۹۱ء

[4] یہ تذکرہ "عمدۂ منتخبہ" ۱۸۰۰ء تا ۱۸۰۶ء مرتب ہوتا رہا جس میں مسلسل اضافے ہوتے رہے ہیں۔

[5] ذکرِ غالب، مالک رام ص ۴۹ (طبع چہارم)

'شاہد بازی' میں یہ غالب کا عروج کا زمانہ تھا کہ وہ واقعۂ ہائلہ پیش آیا جس کی یاد انھیں عمر بھر ستاتی رہی۔ ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں اپنے عزیز دوست مرزا حاتم علی بیگ مہر اکبر آبادی کو ان کی محبوبہ کے انتقال پر تعزیت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"جناب مرزا صاحب، آپ کا غم افزا نامہ پہنچا، میں نے پڑھا، یوسف علی خاں کو پڑھوایا۔ انھوں نے جو میرے سامنے، اُس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا، یعنی اس کی اطاعت اور تمہاری اس سے محبت، سخت ملال ہوا اور رنج کمال ہوا۔ سنو صاحب! شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں، یہ تین آدمی، تین فن میں سردفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جاوے، فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھاوے، عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہوئے۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی، تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری، بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری۔ بھئی! مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں، اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں، عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخمِ مرگِ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ باآنکہ یہ کوچہ چھُٹ گیا۔ اس فن میں بیگانۂ محض ہو گیا، لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اُس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ جانتا ہوں کہ تمہارے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ صبر کرو اور اب ہنگامہ سازیٔ عشقِ مجازی چھوڑو . . . ."[1]

مرزا حاتم علی بیگ مہر کو یہ خط غالب نے ۱۸۶۰ء میں لکھا تھا[2]۔ اس وقت غالب کی عمر ۶۳ برس کے قریب تھی۔ واقعہ کو غالب کی یادداشت کے مطابق چالیس بیالیس سال گزر

---

[1] عودِ ہندی، ص ۱۶۵، نولکشور

[2] دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی) ص ۲۵۸ (فٹ نوٹ)

چکے تھے۔ میرے خیال میں یہ "چالیس بیالیس" سال سنہ ھجری کے ہوں گے، اس لیے کہ غالب سنہ عیسوی سے واقف ہونے کے باوجود اپنی عمر کا شمار ہمیشہ سنہ ھجری میں کرتے تھے۔ سنہ ھجری اور عیسوی میں ۳۶ سال کے اندر سال بھر کا تفاوت پڑ جاتا ہے۔ یعنی سنہ ھجری، سنہ عیسوی سے سال بھر چھوٹا ہو جاتا ہے۔ اس حساب سے یہ واقعہ سنہ عیسوی میں ۱۸۱۸ء تا ۱۸۲۱ء کے درمیان کا ہو گا۔ یہی زمانہ نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) کی تصنیف کا ہے جس کی تکمیل ۱۸۲۱ء میں ہوئی تھی اور جس کے متن میں غالب کی ہائے ہائے! ردیف والی غزل کا اندراج ملتا ہے[1] اس طرح یہ یقینی ہو جاتا ہے کہ اُسی "بڑی ستم پیشہ ڈومنی" کی المناک موت سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے، جسے غالب ۱۸۶۰ء تک نہیں بھولے تھے۔ اور جہر کی محبوبہ کے انتقال پر ان کی اپنی محبوبہ کی یاد کے زخم ایک بار پھر ہرے ہو گئے تھے!

اب اس غزل کا متن ملاحظہ کیجیے جیسی کہ نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) میں درج ہے[2]۔

۱۔ درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے!
کیا ہوئی، ظالم، تری غفلت شعاری؟ ہائے ہائے!

۲۔ تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری؟ ہائے ہائے!

---

[1] اس میں شبہ نہیں کہ مرثیہ نما اِس غزل کا اندراج دیوان بخطِ غالب (۱۸۱۶ء) میں بھی ملتا ہے، لیکن وہاں یہ حاشیہ پر ہے اور کسی دوسرے کے قلم سے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ غزل ۱۸۱۶ء کے بعد کہی گئی ہے اور اس نسخے میں جہاں اور چودہ غزلوں کا اندراج حواشی پر ملتا ہے، ان میں یہ بھی شامل ہے۔ (دیکھیے نسخۂ عرشی زادہ)

[2] کالی داس گپتا رضا نے دیوانِ غالب (کامل) میں اس غزل کو بعد از ۱۸۲۱ء کا بتایا ہے۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی جب کہ یہ نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) کے متن میں درج ہے اور بجز شعر نمبر ۱۳ (دوسرا مقطع) جس پر 'مطبوعہ' لکھا ہوا ہے غزل کے باقی اشعار پر 'قلمی' کا اندراج ہے، جس سے نسخۂ بھوپال کا متن مقصود ہے۔

۳۔ کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال ؟
دشمنی اپنی تھی، میری دوستداری ہائے ہائے!

۴۔ عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا ؟
عمر کو بھی تو نہیں ہے پایداری، ہائے ہائے!

۵۔ زہر لگتی ہے، مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی، تجھ سے تھی اِسے ناسازگاری ہائے ہائے!

۶۔ گُل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا؟
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری، ہائے ہائے!

۷۔ شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی، تجھ پر، پردہ داری ہائے ہائے!

۸۔ خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے!

۹۔ ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک، لگنے نہ پایا زخمِ کاری، ہائے ہائے!

۱۰۔ کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشکال؟
ہے نظر، خو کردۂ اختر شماری، ہائے ہائے!

۱۱۔ گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل، تِس پر، یہ نا اُمیدواری، ہائے ہائے!

۱۲۔ گر مصیبت تھی، تو غربت میں اُٹھا لیتا اسدؔ
میری دلّی ہی میں ہونی تھی یہ خواری، ہائے ہائے!

۱۳۔ عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری، ہائے ہائے!

یہ غزل متداول دیوان میں بغیر کسی حک و اصلاح کے جوں کی توں برقرار رکھی گئی ہے، البتہ

نمبر ۱۲ (مقطعِ اوّل)، حذف کر کے نمبر ۱۳ (مقطعِ دوم)، کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ یہ عمل غالباً ۱۸۳۳ء میں متداول دیوان کا مُبیّضہ تیار کرنے سے پہلے کر دیا گیا ہوگا۔ دوسرا مقطع (نمبر ۱۳) پہلے مقطع سے (نمبر ۱۲) کہیں زیادہ پختہ اور عمومی صداقت کا حامل ہے۔ اس میں جذبے یا اظہار کی وہ ناپختگی نہیں ملتی جو مقطع اول (شعر ۱۲) سے ظاہر ہے۔ تخلص بھی اسد کے بجائے غالب کر دیا گیا ہے۔ دوسرے مقطع (نمبر ۱۳) میں اس 'رسوائی' اور خواری کی واردات پر پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ جس کی جائے وقوع دہلی کے کوچہ و بازار تھے۔ دوسرا مقطع پہلی بار نسخۂ رام پور قدیم میں درج ملتا ہے، جو بقول عرشی متداول دیوان کا پہلا نقش ہے۔

قبل اس کے کہ ہم غالب کی عشقیہ واردات کا تجزیہ کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے فلسفۂ عشق کے بارے میں چند نکتے بیان کر دیں۔ اپنے دوست مرزا حاتم علی بیگ مہر کو ایک دوسرے خط میں (ان کا محبوبہ کی موت پر مسلسل جزع و فزع کرنے پر)، یوں رقم طراز ہیں:

"مرزا صاحب! ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے، پچاس برس عالمِ رنگ و بو کی سیر کی ہے۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے یہ نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانعِ فسق و فجور نہیں، پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو، سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک افشانی۔ کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ، اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چُنّا جان[1] نہ سہی مُنّا جان سہی . . ."

حسن و عشق میں انفرادیت پسند غالب کے اس آزادانہ مسلک کے باوجود جس "بڑی ستم پیشہ ڈومنی" کو انھوں نے "مار رکھا" تھا اس کی یاد ساری عمر ان کی دامن گیر رہی، لہٰذا مذکورہ بالا غزل باریک بینی کے ساتھ تجزیہ چاہتی ہے۔ یہ ہی نہیں نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) کے دور کی اُن تمام غزلوں پر بھی نظر رکھنی ہوگی جن میں غالب نے "دل کے داغ نمایاں" کیے ہیں۔

---

[1] چُنّا جان عَلَم ہے مہر کی محبوبہ کا نام تھا۔ اس کا انتقال ۳۱ مئی ۱۸۶۰ء کو ہوا تھا۔ (ذکرِ غالب ص ۵۰)

محولہ بالا غزل کے بارے میں سب سے پہلے نظم طباطبائی نے اپنی شرح دیوانِ غالب (۱۹۰۰ء) میں یہ اشارہ کیا تھا کہ "یہ ساری غزل معشوق کا مرثیہ ہے۔"[۱] اس کے بعد آغا محمد باقر نے اس کے اشعار کو 'بکائیہ' لکھا ہے[۲]۔ مالک رام نے ذکرِ غالب میں مزید تشریح کرتے ہوئے اس کے بارے میں یہ اظہارِ خیال کیا ہے۔

"چوں کہ یہ نظم 'نسخۂ حمیدیہ' کے متن میں شامل ہے، اس لیے یقیناً ۱۸۲۱ء کے پیشتر کا کلام ہے، جو اس نسخے کی تاریخِ کتابت ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ اسی ستم پیشہ ڈومنی کا مرثیہ ہو۔"[۳]

دوسرا اہم نکتہ جس کی جانب انھوں نے اشارہ کیا ہے، یہ ہے:

"میرا خیال یہ ہے کہ غالباً یہ 'ڈومنی'، کوئی 'رنڈی' نہیں تھی۔ اس غزل میں ایک شعر (نمبر ۷) یہ ہے:

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری، ہائے ہائے!

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بازاری عورت نہیں تھی، ورنہ کہاں کی "شرمِ رسوائی" اور کہاں کی "پردہ داریٔ الفت"۔ اس شعر سے یہ بھی گمان گزرتا ہے کہ شاید اس نے خودکشی کر لی تھی۔"[۳]

مرزا حاتم علی مہر کو غالب کا ۱۸۶۰ء کا مکتوب، اس میں چالیس بیالیس سال پہلے کی ایک وارداتِ عشق کی جانب اشارہ، "بڑی ستم پیشہ ڈومنی" کی ترکیب سے محبوبہ کی شناخت، دلّی میں 'رسوائی' اور 'خواری' کا خوف اور بالآخر محبوبہ کا "شرمِ رسوائی" سے نقابِ خاک میں جا چھپنا' ایسی کڑیاں ہیں جس سے غالب کے عشقیہ ڈرامے کے سارے باب مرتب ہو جاتے ہیں۔

لیکن اس سلسلے میں سب سے پہلے "ڈومنی" کے بارے میں صراحت کر دینا ضروری ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ 'ڈومنی' اس عہد کے سماج میں (اور بعد تک بھی) ایک (socialite)

۱۔ بیانِ غالب: لاہور ۱۹۴۹ء (طبع چہارم)

۲۔ مالک رام: ذکرِ غالب ص ۵۰

۳۔ " " ص ۵۱

کی حیثیت رکھتی تھی، کبھی نہیں ہوتی تھی۔ میرے قصبے، قائم گنج (ضلع فرخ آباد) میں، میرے بچپن تک ڈومنیوں کا گھریلو تقریبات میں آکر گانا بجانا عام تھا۔ یہ لوگ 'ڈوم' کے بجائے خود کو 'سرودی' کہلائے جانے پر اصرار کرتے تھے۔ ان کے بیان کے مطابق وہ بھی پٹھان ہیں۔ جن کے آبا و اجداد قائم گنج کے دیگر آفریدی پٹھانوں کی طرح صوبہ سرحد سے ہجرت کر کے قائم گنج آگئے تھے۔ دوسرے الفاظ میں ان کی ذات میں کوئی کھوٹ نہیں تھا، البتہ پیشے کے اعتبار سے وہ گاتے بجاتے تھے، اور یہی ان کی معاش کا وسیلہ تھا۔ بیگماتِ اودھ کی مصاحبت میں جو ڈومنیاں رہتی تھیں وہ عام ڈومنیوں سے خود کو اعلیٰ و برتر سمجھتی تھیں۔ بہرحال ان کا کسبی نہ ہونا مسلّم ہے۔ اس کا امکان ضرور تھا کہ بڑے گھرانوں میں جہاں وہ گانے بجانے جاتی تھیں وہاں کا کوئی من چلا رئیس زادہ کسی طرحدار ڈومنی سے تعلقات پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ یہ امکان اس وقت بڑھ جاتا تھا جب رئیس زادہ (غالب کی طرح) شاعر ہو اور ڈومنی خواندہ و سخن فہم ہو۔ دونوں کے درمیان یہ کاروبارِ عشق نہایت خفیہ اور بڑوں کی نظر سے بچا کر ہوتا تھا۔ اس لیے کہ 'رسوائی' کا خوف دونوں طرف ہوتا۔ لیکن عشق اور مشک دونوں کب چھپتے ہیں، بھانپنے والے بھانپ جاتے۔ بالکل یہی صورت غالب کے اس معاشقے کی ہوئی۔

یہاں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ غالب، امراؤ بیگم کے رشتے سے خاندانِ لوہارو کے داماد بن چکے تھے۔ ان کے خسر الٰہی بخش معروف جو نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی تھے، ایک عرصے تک عیش و نشاط کی زندگی گزارنے کے بعد تائب ہو کر صوفیہ کے حلقے میں داخل ہو چکے تھے۔ غالب کی شادی کو تقریباً ۶، سال ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں وہ کئی بچوں کے باپ بھی بن چکے تھے، ایسے میں اچانک اس تازہ واردات کا پیش آنا ان کے اور ان کی محبوبہ دونوں کے لیے باعثِ خواری و رسوائی تھا۔ اس لیے ان کی دلی خواہش تھی کہ یہ واقعہ غربت میں دلّی سے پرے کہیں ہوا ہوتا ؎

گر مصیبت تھی، تو غربت میں اُٹھا لیتا اسدؔ
میری دلّی ہی میں ہونی تھی یہ خواری، ہائے ہائے!

غالب ہزار 'بادہ خوار' سہی لیکن ثقاہتِ لوہارو کی لاج رکھنا ان کے لیے بھی ضروری

تھا۔ جمیل الدین عالی نے اپنے خاندان کے کاغذات کا مطالعہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ غالب اپنی مذموم حرکتوں کی وجہ سے لوہارو خاندان میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ خود غالب بھی "ستم ہائے عزیزاں" کے شاکی تھے۔ دہلی سے بے زاری کا ذکر انھوں نے اس دور کے ایک اور شعر میں بھی کیا ہے:

دہلی کے رہنے والو اسد کو ستاؤ مت

بے چارہ چند روز کا یھاں مہمان ہے (قبل ۱۸۲۱ء)

غالب اپنی تعقل پسندی کے سبب جان کو عزیز جانتے ہوئے اس واقعۂ سخت کی تاب لے آئے۔ لیکن وہ "ستم پیشہ" خود اپنا شکار ہوگئی۔ غزل کا آغاز اس کی جاں کنی کے عالم سے ہوتا ہے، اس عالم میں بھی وہ شکوہ کناں ہے ؎

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری، ہائے ہائے!

کیا ہوئی ظالم، تری غفلت شعاری؟ ہائے ہائے!

شکوے کی یہ لے بلند ہوتی جاتی ہے جب وہ تیسرے اور چوتھے شعر میں اپنے محبوب سے کہتی ہے کہ اگر تیرے دل میں "آشوبِ غم" کا حوصلہ نہ تھا تو پھر تو نے میری "غم گساری" کا دم کیوں بھرا تھا۔ تیرے عمر بھر کے "پیمانِ وفا" باندھنے سے کیا فائدہ؟ تو میری حالتِ زار کو دیکھ کہ عمر کو بھی پائیداری نہیں ہے۔

چوتھے شعر تک عالمِ نزع میں محبوبہ کی زبان سے شکوہ کیا گیا ہے۔ بعد کے شعروں میں اُس کی المناک موت پر شاعر نے اپنے تاثرات پیش کیے ہیں۔ پوری غزل ایک ڈرامائی انداز میں لکھی گئی ہے جس کی وجہ سے بعض اوقات یہ معلوم کرنا دشوار ہوتا ہے کہ محبوبہ کی آواز کون سی اور شاعر نے اپنی آواز کہاں سے شامل کر دی ہے۔ جیسا کہ ۶، ۷، اور ۸ ویں شعر سے ظاہر ہے محبوبہ نے 'شرم رسوائی' کے خوف سے 'نقابِ خاک' میں جا چھپنا پسند کیا۔ یعنی خودکشی کر لی۔ شاعر کو اب زندگی زہر لگنے لگی۔ اس لیے کہ وہ وفا کی کسوٹی پر پورا نہیں اترا۔ وہ گل اندام جو اپنے نازِ جلوہ سے گل افشانی کرتی تھی، آج خاک پر اپنی لالہ کاری دکھا رہی ہے اور یہ سب اس نے "شرمِ رسوائی" اور بدنامی کے خوف کی بنا پر کیا ہے۔ محبوبہ کی موت شاعر کے لیے سارے جہاں

کی موت ہے اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ دنیا سے 'راہ و رسمِ یاری' جیسے اٹھ گئی ہو۔

غالب کی عشقیہ واردات کا یہ دور زیادہ طویل نہیں تھا۔ (میرے خیال میں بس دو برس، اسی لیے انھوں نے ۱۸۶۰ء میں اسے چالیس بیالیس برس کا واقعہ بتایا ہے) یوں ہے کہ غالب کہتے ہیں کہ ابھی عشق کا 'زخمِ کاری' دل پر لگنے بھی نہیں پایا تھا کہ یہ ڈراما محبوبہ کی خودکشی پر اچانک ختم ہو جاتا ہے۔ اب رونق برسات کی تاریک رات ہے اور وہ ہیں۔ ہجر میں جو وقت وہ "اختر شماری" کے سہارے کاٹتے تھے، اس کا بھی موقع نہیں۔ نہ تو گوش تک محبوبہ کی "گلبانگِ تسلّی" پہنچتی ہے اور نہ چشم اس کے "جلوۂ ناز" کی گل افشانی دیکھ پاتی ہیں۔ شہر دہلی اب انھیں کاٹنے لگا ہے۔ اور وہ 'غربت' کے متلاشی ہیں۔ نئے مقطع میں بھی انھیں احساس ہے کہ عشق نے ابھی جنون کی کیفیت اختیار نہیں کی تھی کہ بساطِ محبت اُلٹ گئی ؎

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ

دل میں جو کچھ رہ گیا تھا ذوقِ خواری ہائے ہائے!

ہرچند غالب نے اپنے عشق کی نوعیت "مصری کی مکھی" کی بتائی ہے اور غالباً اُن کے دیگر معرکہ ہائے عشق اسی نوعیت کے ہوں گے، لیکن "ستم پیشہ ڈومنی" سے جسے انھوں نے "مار رکھا" تھا دل کی لگی کو ہم صرف دل لگی کہہ کر نہیں ٹال سکتے۔ اس لیے اس دور کی ان تمام غزلوں پر بھی نظر ڈالنی ہوگی جہاں جہاں اس کا عکس ملتا ہے۔ محولہ بالا غزل میں واردات کے اثبات کے بعد باقی کام قیاس کے لیے رہ جاتا ہے۔

اس دور کی ایک اور غزل جس میں یادِ ماضی کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے، المیہ کے ایک سال بعد کی تخلیق معلوم ہوتی ہے۔ یہ غزل نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) کے حاشیے پر درج ملتی ہے[۱]

وہ فراق اور وہ وصال کہاں؟

وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں؟

---

[۱] یہ غزل دیوان بخطِ غالب (۱۸۱۶ء) کے حاشیہ پر بھی درج ہے، لیکن بدلے ہوئے خط میں۔

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے ؟

ذوقِ نظارۂ جمال، کہاں ؟

دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا

شورِ سودائے خط و خال، کہاں ؟

تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے

اب وہ رعنائیٔ خیال، کہاں ؟ (بعد ۱۸۲۱ء)

"اک شخص" اب غالبؔ کی شاعری کا استعارہ سا بن گیا ہے۔ واردات سے زمانی قرب کے پیشِ نظر یہ "اک شخص" وہی "ستم پیشہ" تو نہیں جس کو چالیس ہیا لیس سال بعد بھی یاد کر کے چیخ اٹھتے ہیں، "اُس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔"

غالبؔ دو سال کے معاملاتِ عشق و محبت میں سبھی نشیب و فراز سے گزر گئے؛ شوقِ وصل، غمِ ہجراں، چھیڑ چھاڑ، حتیٰ کہ دھول دھپا تک۔

دل دیا جان کے، کیوں اس کو وفادار اسدؔ

غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا (قبل ۱۸۲۱ء)

فلک کو دیکھ کے، کرتا ہوں اُس کو یاد اسدؔ

جفا میں اس کی ہے، انداز کارفرما کا (قبل ۱۸۲۱ء)

معاملاتِ حسن و عشق میں غالبؔ عام طور پر مغلوب نظر آتے ہیں۔ ان کا محبوب ہر زمانے میں 'ستم پیشہ' اور 'جفا مشرب' رہا اس لیے اللہ کا یہ شیر (اسداللہ) کوچۂ عشق میں جا کر سگِ لیلیٰ بن جاتا ہے ؎

دہنِ شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل!

نہ کھڑے ہو جیے خوبانِ دل آزار کے پاس (قبل ۱۸۲۱ء)

اپنی بے بسی پر کبھی کبھی جھنجلاہٹ آتی ہے تو یہ ردِّ عمل ہوتا ہے ؎

ہے ہے، خدا نخواستہ! وہ اور دشمنی

اے شوقِ منفعل! یہ تجھے کیا خیال ہے ؟ (قبل ۱۸۲۱ء)

لیکن غالب کے لیے ترکِ محبت ناممکن ہے۔ یہ ان کی زندگی ہے۔ بالآخر پھر محبوبہ کے قدموں پر آجاتے ہیں ؎

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت، تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی؟ — اے وہ مجلس نہیں، خلوت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں — نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خُو، ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے، اسدؔ — گر نہیں وصل، تو حسرت ہی سہی

(بعد ۱۸۲۱ء)[1]

معاملاتِ حسن و عشق میں کامرانی اور ناکامی کے نشیب و فراز آتے ہیں خاص طور پر جب محبوبہ 'ستم پیشہ' اور 'جفا مشرب' ہو۔ کاروبارِ محبت کی یہ دھوپ چھاؤں ان اشعار میں ملاحظہ ہو ؎

چاہیے اچھوں کو، جتنا چاہیے — یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل؟ — بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے
اپنی، رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی — یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے
غافل اِن مہ طلعتوں کے واسطے — چاہنے والا بھی اچھا چاہیے
چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ — آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے[2]

لیکن غالب کی 'صورت' ایسی تو نہ تھی کہ 'خوب رویوں' کو ناخوب معلوم ہو۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر کو اپنے جوانی کے حلیے کے بارے میں لکھتے ہیں:

---

[1] نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) کے حاشیہ پر۔ (نوٹ: نسخۂ بھوپال کے ناپید ہو جانے کی صورت میں یہ بتانا کہ حواشی میں درج غزلوں کی نوعیت کیا تھی، ذرا مشکل ہے۔ اس لیے ایسی تمام غزلوں کو "بعد از ۱۸۲۱ء" تصور کرنے کا تحقیقی جواز نہیں ملتا۔ مزید یہ کہ کچھ غزلیں حاشیے پر نہیں بلکہ آخر میں چپاں زائد اوراق میں درج تھیں)

[2] یہ غزل نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) کے آخر میں اضافہ شدہ اوراق میں درج تھی۔

"بہر حال تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا، کس واسطے میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا، کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا۔ اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے ۔ ۔ ۔"[1]

غالب کی عشقیہ واردات میں رشک ورقابت ایک خاص جذبہ ہے، جو محبوبہ سے منسوب ہر دور میں پایا جاتا ہے۔ اس "ستم پیشہ" کو وہ کیوں کر بخش سکتے تھے:

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا؟ (قبل ۱۸۲۱ء)

گو تم کو رضا جوئی اغیار ہے لیکن
جاتی ہے ملاقات کب ایسے سببوں سے (قبل ۱۸۲۱ء)

'ستم گر' 'ستم پیشہ' محبوبہ سے غالب کی عشقیہ واردات اور معاملات کا مجموعی تاثر حزنیہ مرتب ہوتا ہے۔ یہ تاثر حسب ذیل دو مشہور غزلوں کے منتخب اشعار سے کیا جا سکتا ہے جو اسی دور (۱۸۱۷ء تا ۱۸۲۱ء) سے یادگار ہیں:

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہوتے تک
کون جیتا ہے، تری زلف کے سر ہوتے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں، خونِ جگر ہوتے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہوتے تک

---

[1] غالب کے خطوط (جلد دوم ص ۱۹۷)، مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم

نہ گُلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تو اور آرایشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

لافِ تمکین، فریبِ سادہ دلی
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیّاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

وہ بھی دن ہو! کہ اس ستم گر سے
ناز کھینچوں، بجائے حسرتِ ناز

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز

اے ترا غمزہ! یک قلم انگیز!
اے ترا ظلم! سربسر انداز

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تو غریب نواز

اسدؔ اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا! وہ رندِ شاہد باز

غالبؔ نے یہ اشعار ۲۴ سال کی عمر سے قبل سپردِ قلم کیے تھے۔ اس وقت تک ان کی 'رندی' اور 'شاہد بازی' کے چرچے دلّی کے گلی کوچوں میں عام ہو چکے تھے۔ لوہارو خاندان کے اکابرین (بہ شمول ان کے خسر الٰہی بخش معروفؔ) ان کی نوجوانی کی رنگ رلیوں سے بخوبی واقف تھے۔ الٰہی بخش معروفؔ نے تو غالبؔ کی اس دور کی ایک عاشقانہ غزل کی تضمین تک لکھی تھی۔ کاش وہ اس غزل کے بین السطور معنی سے آشنا ہوتے، اور اُس "آفت" کو جان سکتے جس میں غالبؔ اپنے 'دِل کے ہاتھوں سے' "گرفتار" تھے ؎

اپنا احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں؟
ہے حیا مانعِ اظہار، کہوں یا نہ کہوں؟

نہیں کرنے کا میں تقریر ادب سے باہر
میں بھی ہوں محرمِ اسرار، کہوں یا نہ کہوں؟

اپنے ہی دل سے، میں احوالِ گرفتاریِ دل
جب نہ پاؤں کوئی غم خوار، کہوں یا نہ کہوں؟

دل کے ہاتھوں سے، کہ ہے دشمنِ جانی میرا
ہوں اک آفت میں گرفتار، کہوں یا نہ کہوں؟

میں تو دیوانہ ہوں، اور ایک جہاں ہے غمّاز

گوش ہیں در پسِ دیوار، کہوں یا نہ کہوں ؟

آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے تو اسدؔ

حسبِ حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں ؟[1]

ان کی اس دور کی ایک اور مشہور غزل کے بعض اشعار میں غالبؔ کی اس عشقیہ واردات کا دردناک عکس ملتا ہے۔ غالب کا یہ شہکار بھی اسی 'ستم پیشہ' کا مرہونِ منت معلوم ہوتا ہے ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا

درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا

غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل

خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

حال دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر یعنی

ہم نے بارہا ڈھونڈھا، تم نے بارہا پایا (قبل ۱۸۲۱ء)

اس دور کے چند اور اشعار بھی پیش کیے جاتے ہیں جن سے بھی "اک شخص کے تصوّر" کی کرنیں پھوٹتی ہیں ؎

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی کیوں ترا راہ گزر یاد آیا (قبل ۱۸۲۱ء)

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں

وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا (قبل ۱۸۲۱ء)

---

[1] یہ غزل دیوان الٰہی بخش معروف (متوفی ۱۸۲۶ء) کے ایک مخمس میں ملتی ہے۔ اس لیے متداول دیوان غالب میں شامل ہونے سے رہ گئی۔ کالی داس گپتا رضا نے اس لیے اس پر بھی 'بعد از ۱۸۲۱ء' لکھا ہے (دیوانِ غالب (کامل) ص ۲۰۳) حالاں کہ یہ ۱۸۲۱ء سے قبل کی بھی ہو سکتی ہے۔

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں، سو وہ بھی نہ ہوا　　(قبل ۱۸۲۱ء)

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا　　(قبل ۱۸۲۱ء)

مرے دل میں ہے غالب، شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے، جو اس سے میں یہ بھی کہوں، وہ بھی　　(قبل ۱۸۲۱ء)

غالب کی عشقیہ واردات میں صرف فراقی پہلو نہیں تھے معاملہ بندی کی وہ تمام سطحات بھی موجود ہیں جو اس قسم کی آزاد محبت میں پیش آتی ہیں اسی لیے تو کہا ہے ؎

جب کرم رخصتِ بے باکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر، بجز خجلتِ تقصیر نہیں　　(قبل ۱۸۲۱ء)

اور جب "کرم رخصتِ بے باکی و گستاخی" نہیں دیتا ہے تو یہ "عذرِ مستی" درمیان میں لاکر دھمکی دیتے ہیں:

ہم سے کھل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن　　(قبل ۱۸۲۱ء)

اور اپنی "پیش دستی" کا ان الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں ؎

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن　　(قبل ۱۸۲۱ء)

اور کبھی کبھی معاملاتِ عشق میں یوں بھی ہوتا ہے ؎

اسد خوشی میں مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جب اس نے، ذرا میرے پانو داب تو دے　　(بعد ۱۸۲۱ء)

ابھی غالب دھول دھپا اور پانو دابنے کی "رخصتِ بے باکی و گستاخی" کی داد دینے بھی نہ

پا ئے تھے کہ محبوبہ کی موت نے بساطِ عشق الٹ دی۔ غالب کی ناکام اور مختصر محبت کی کلید، اس شعر میں ملتی ہے ؎

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد

تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا (بعد ۱۸۲۱ء)

غالب کی رنگ رلیوں کا یہ دور ۲۴، ۲۵ برس کی عمر کے قریب ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی وہ 'رندِ بادہ خوار' رہے لیکن 'شاہد بازی' اور 'غمِ عشق' سے منہ موڑتے گئے۔ ۱۸۲۶ء میں اپنے خسر الہٰی بخش معروف کے انتقال کے بعد وہ 'غمِ روزگار' میں مبتلا ہو گئے اور اسی سال اپنی پنشن کی بازیافت کے لیے کلکتے کے سفر پر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ امر مسلّم ہے کہ غالب اپنی متاہلانہ زندگی سے مطمئن نہیں تھے۔ اپنے خطوط میں انھوں نے بار بار لکھا ہے کہ وہ متاہل کے آدمی نہیں تھے اور نہ ایک عورت کے ساتھ ساری زندگی گزارنا (چاہے وہ حور کیوں نہ ہو) ان کا مشرب تھا۔ جو حالات و واقعات پہنچے ہیں ان سے علم ہوتا ہے کہ امراؤ بیگم سے انھوں نے ساری عمر نبھایا ہے۔ ان کے اور غالب کے درمیان کوئی شے قدرے مشترک نہیں تھی؛ مسکن الگ، کھانے کے برتن الگ، وہ پنج وقتہ صلوٰۃ کی پابند، ان کی "طبیعت ادھر نہیں جاتی"، وہ روزہ دار، غالب روزہ خوار، غالب کی شراب نوشی ان کے لیے باعثِ آزار رہی۔ ان کی صوم و صلوٰۃ کی پابندی کا ٹھٹول وہ یہ کہہ کر اڑاتے، تم نے تو گھر کو فتح پوری کی مسجد بنا رکھا ہے!

ایسے حالات میں غالب کا کسی طرحدار سے، جو غالباً مذاقِ سخن بھی رکھتی تھی، ربط و ضبط بڑھا لینا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ غالب نے اسے اپنی شاعری میں کبھی شوخ، کبھی جفا مشرب، کبھی کافر صنم، کبھی ستم گر اور ستم پیشہ اور کبھی 'ایک شخص' کے نام سے یاد کیا ہے۔ رسوائی کا خوف دونوں طرف تھا۔ غالب کو منہ چھپانے کے لیے 'غربت' کی تلاش تھی لیکن وہ 'ستم پیشہ' اپنی ہی آگ میں جل کر مر گئی۔ یہ اس کی دردناک موت تھی جس نے غالب سے "ہائے ہائے" والی غزل لکھوائی اور مرنے کے بعد بھی وہ ایک 'داغِ کہنہ' کی شکل میں غالب کے دل میں جاگزیں رہی۔

URDUADAB

QUARTERLY

EDITOR

Khaliq Anjum

ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)
NEW DELHI

سہ ماہی

اردو ادب

انجمن
ترقی
اردو
ہند

اردو ادب (سہ ماہی)

۱۹۹۲ء شمارہ (۳،۴) ۱۹۹۳ء شمارہ (۱)

اردو ادب

(بابائے اردو مولوی عبدالحق نمبر)

اڈیٹر

خلیق انجم

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دلّی

فہرست

حرفِ آغاز	خلیق انجم	۷
مولوی عبدالحق اور ہندوستانی	حیات اللہ انصاری	۹
مولانا عبدالحق صاحب، اردو اور مہاتما گاندھی جی	بیگم سلطانہ حیات	۱۹
مہاتما گاندھی ۔ اردو ۔ مولوی عبدالحق	ڈاکٹر کمال احمد صدیقی	۵۱
مولوی عبدالحق اور اردو تحریک	سید شہاب الدین دسنوی	۱۰۰
مولوی عبدالحق مرحوم کی بعض تحریریں	رشید حسن خاں	۱۱۹
مولوی عبدالحق اردو کا استعارہ	ڈاکٹر منظر اعظمی	۱۲۳
مقدمات عبدالحق اور ان کی تنقیدی اہمیت	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	۱۳۳
مولوی عبدالحق کی تبصرہ نگاری	سید جاوید اقبال	۱۴۲
مولانا عبدالحق اور تحقیقی تدوین	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	۱۵۶
علی گڑھ بابائے اردو کے سفرِ حیات کی ایک اہم منزل	ڈاکٹر کاظم علی خاں	۱۶۱
مولوی عبدالحق اور دیوانِ غالب	ڈاکٹر سید حامد حسین	۱۸۰
مولوی عبدالحق اور بنگال میں اردو تحریک	ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ	۱۹۵
بابائے اردو مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری	کشمیری لال ذاکر	۲۰۱
مولوی عبدالحق کی تبصرہ نگاری	ڈاکٹر ہارون ایوب	۲۱۰
مولوی عبدالحق خطوط کے آئینے میں	یوسف ناظم	۲۱۶
مولوی عبدالحق کے ادبی اور علمی رسائل	طاہر مسعود	۲۲۶
مکاتیب عبدالحق	ڈاکٹر رحیم بخش	۲۵۲
مولوی عبدالحق کی تحقیق	ڈاکٹر مظہر احمد	۲۶۵
مولوی عبدالحق بحیثیت شاعر	محبوب احمد نقوی	۲۷۸

حرف آغاز

دسمبر ۱۹۹۱ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) نے اردو کے محسن اعظم مولوی عبدالحق پر (۲۸ر دسمبر سے ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۱ء تک) چار روزہ بین الاقوامی سیمنار منعقد کیا تھا۔ اس کے افتتاحی جلسے کی صدارت جناب سید حامد نے کی اور افتتاح اس وقت کی نائب وزیر اطلاعات و نشریات ڈاکٹر گرجا ویاس نے کیا تھا۔ اس وقت کے سفیر پاکستان عزت مآب عبدالستار صاحب نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ سیمنار میں ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، ناروے، انگلینڈ اور کینیڈا وغیرہ سے تقریباً بہتّر مقالہ نگار حضرات نے شرکت کی۔ انجمن کے دعوت نامے پر ہزاروں روپے خرچ کر کے دہلی پہنچنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اہل اردو مولوی عبدالحق کی لسانی اور ادبی خدمات کے دل سے معترف ہیں۔

مولوی عبدالحق صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد باقی تمام زندگی کو اردو ادب کی ترقی و فروغ اور اردو زبان کی بقا کے لیے وقف کر دیا۔ مولوی صاحب نے پہلی بار دکنی ادب کے شہ پارے تلاش کر کے اردو والوں کو ان سے روشناس کرایا اور ان کی ادبی و لسانی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اردو کے ادبی مورخین ہماری ادبی تاریخ کا آغاز شمالی ہند کے میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، اور خواجہ میر درد وغیرہ سے کرتے تھے۔ مولوی صاحب نے ہماری ادبی تاریخ میں تقریباً تین صدیوں کا اضافہ کیا۔ انھوں نے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے لے کر ولی تک بڑی تعداد میں دکنی شاعروں اور نثر نگاروں کو دریافت کر کے اردو والوں سے متعارف کرایا۔

اٹھارویں صدی میں بڑی تعداد میں اردو شاعروں کے تذکرے لکھے گئے۔ یہ تذکرے ذاتی اور سرکاری لائبریریوں اور الماریوں میں بند تھے۔ مولوی صاحب نے انھیں تلاش کر کے مرتب کیا یا دوسروں سے کروایا اور پھر انجمن سے انھیں شایع کیا۔ ہمارے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے نصف اول تک کی تاریخ ادب اردو انھیں تذکروں کی مرہون منت ہے۔ اگر مولوی

صاحب ان تذکروں کو دریافت کرکے شایع نہیں کرتے تو آج ہم بے شمار شاعروں کے ناموں سے بھی واقف نہ ہوتے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) پر مولوی عبدالحق کے ناقابل فراموش احسانات ہیں۔ وہ ۱۹۱۲ء میں جب انجمن کے سکریٹری منتخب ہوئے تھے تو انھیں ٹین کے ایک صندوق میں چند بوسیدہ رجسٹر اور کچھ مسودات کی شکل میں انجمن کا پورا ریکارڈ ملا تھا۔ مولوی صاحب کے زمانے میں اردو زبان کے معاملات خاصے ہنگامہ خیز تھے۔ اردو مخالفین نے اردو کو تباہ کرنے بلکہ اس کا نام و نشان مٹا دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انجمن کے سکریٹری کی حیثیت سے مولوی صاحب کے دو رول ہو گئے۔ ایک تو وہ انجمن کے ایک پلیٹ فارم سے اردو ادب کی خدمت کرتے رہے اور دوسرے پلیٹ فارم سے اردو زبان کی بقا اور ترقی کے لیے جد و جہد میں مصروف رہے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) نے کوشش کی تھی کہ ایک اعلا درجے کا بین الاقوامی سیمنار منعقد کر کے مولوی صاحب کی خدمات کا خاطر خواہ اعتراف کیا جائے۔ ہمیں خوشی ہے کہ انجمن اپنے اس ارادے میں کامیاب ہوئی۔ جن حضرات کو مولوی صاحب کی شخصیت یا فن پر مقالہ لکھنے کی دعوت دی گئی تھی، ان سب حضرات نے بھرپور تعاون کیا۔ بلکہ مولوی عبدالحق کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ بعض ایسے حضرات بھی تھے، جنھیں مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن مولوی صاحب کی محبت اور عقیدت میں ہزاروں روپیے خرچ کر کے وہ بھی سیمنار میں شریک ہوئے۔ ہم ان تمام مقالہ نگار حضرات کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

سیمنار کے مقالوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے لیے ان تمام مقالوں کو شایع کرنا ممکن نہیں ہے۔ ۱۹۹۲ء میں ہم نے اردو ادب کا "مولوی عبدالحق نمبر" شایع کیا تھا۔ جس میں پندرہ مضامین شامل تھے۔ ہمیں خوشی ہے کہ یہ نمبر چند مہینوں میں ختم ہو گیا۔ ہمیں پھر اسے کتابی صورت میں شایع کرنا پڑا۔ اب ہم "اردو ادب" کے تحت باقی مضامین کا "مولوی عبدالحق نمبر" شایع کر رہے ہیں۔ اس میں انیس مضامین شامل ہیں۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم اس نمبر کو بھی کتابی صورت میں شایع کریں گے۔

میں آخر میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے اس وقت کے صدر جناب سید حامد کا شکر گزار ہوں جنھوں نے ہماری نہ صرف رہنمائی کی بلکہ قدم قدم پر ہمیں مالی تعاون بھی دیا۔ اگر انجمن کے تمام اراکین اور انجمن کے کارکنان بھرپور تعاون نہیں دیتے تو یہ سیمنار اتنا کامیاب نہیں ہوتا۔ ان سب کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ سب حضرات آیندہ بھی اسی طرح تعاون کرتے رہیں گے۔

خلیق انجم

حیات اللہ انصاری

مولوی عبدالحق اور ہندوستانی

ہندوستان کی ریاستوں میں قومی حکومتوں کے بننے سے پہلے لگ بھگ ۱۹۳۷ء کے شروع میں صدر کانگریس ڈاکٹر راجندر پرشاد اور مولوی عبدالحق کا ہندوستان کی مشترکہ زبان کے بارے میں ایک بیان نکلا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ قومی زبان ہندوستانی ہوگی جو کہ شمالی ہند میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ وہ دونوں رسم الخط میں لکھی جائے گی یہ بیان پڑھ کر میرے ایسے نوجوان جوش میں سوچنے لگے کہ ہم لوگ ابھی سے ایسی زبان لکھنا کیوں نہ شروع کر دیں۔

اتر پردیش میں قومی حکومت بنتے ہی کئی قوم پرور اردو اور ہندی ہفتہ وار نکل آئے تھے اردو میں تھا "ہندوستان" جس کا میں اڈیٹر تھا اور ایک ہندی "سنگھرش" تھا۔ اِن دونوں کے اسٹاف والوں نے فیصلہ کیا کہ ہم ہندوستانی لکھنے کی کوشش کریں گے۔ اس فیصلے کے بعد جو پرچے نکلے اُن کا جب موازنہ کیا گیا تو زبان میں بڑی دوریاں نکلیں۔ مثلاً ہندوستان میں تھا بین الاقوامی اور سنگھرش میں انترراشٹریہ اور پھر عبارت میں اُن کے مشتقات تھے مثلاً بین اقوام اور اقوامی ایک طرف اور انترراشٹر اور راشٹریہ دوسری طرف۔ اب بحث اٹھی کہ یہ دوریاں کیوں کر کم کی جائیں۔ تاکہ ہندوستانی پیدا ہو سکے۔ اردو والے کہتے تھے کہ بین الاقوامی کو سب ہی سمجھتے ہیں۔ اس لیے ہندی والے اس کو اور اسی قبیلے کے الفاظ کیوں نہیں لکھتے ہیں۔ ہندی والے کہتے تھے کہ انترراشٹر کو سب ہی لوگ سمجھتے ہیں۔ اس لیے اسی قبیلے کے الفاظ کو قبول کر لینا چاہیے۔ میں نے غور کیا کہ وہ سب ہی لوگ کون ہیں۔ جن کا حوالہ ہندی والے اور اردو والے دونوں ہی دیتے ہیں۔ پتا چلا کہ یہ تھے کہنے والوں کے اپنے حلقے کے لوگ۔ تقریروں میں لوگ انٹرنیشنل کہتے تھے اور قوم اور راشٹر۔ ایسے میں اس سوال کا اٹھنا ضروری تھا کہ ہندوستانی زبان کیوں کر بنے گی؟۔

رامائن اور میلاد شریف کی محفلوں میں مَیں دیکھتا تھا کہ مسلمان اپنے بزرگوں کے لیے عربی اور

فارسی کے القاب استعمال کرتے ہیں۔ اور ہندو اپنے بزرگوں کے لیے سنسکرت کے القاب۔ یہ بھی دیکھنا تھا شادی اور غمی کے موقعوں پر جس شخص کو مبارک باد دی جائے یا اظہار غم کیا جائے وہ چاہتا ہے کہ ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جو اُس کے مذہب یا دھرم کی رو سے متبرک ہیں۔

میری نظر اس طرف بھی گئی کہ سنسکرت کے القاب و آداب اور شادی و غمی میں استعمال ہونے والے سنسکرت کے جملے اگر اردو میں آئیں گے تو اُن کے مشتقات بھی آئیں گے اور محاورے بھی۔ اُن چیزوں کی آمد سے زبان میں تو ایسا اُلٹ پلٹ ہو جائے گا کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد اردو کی شکل و صورت پہچانی ہی نہیں جا سکے گی۔ دوسری طرف اگر ہندی پر عربی اور فارسی الفاظ کی یلغار ہوئی تو اس کی بھی حالت ویسی ہی ہو جائے گی۔ پھر ایک سوال یہ بھی تھا کہ اگر اسی طرح الفاظ کی آمیزش نہ ہوئی تو ایسی ہندوستانی بن سکے گی جو سب کے کام آسکے۔؟ وہ ہندوستانی کس مصرف کی ہوگی کہ جب میں اپنے دوستوں کے رنج و غم میں شریک ہونے جاؤں تو وہ گونگی ثابت ہو۔

یہ مسئلہ ابھی تک میرے خیالات کی دنیا میں گھوم ہی رہا تھا کہ ایک واقعہ ایسا ہوا۔ کہ مسئلہ مزید روشن ہو گیا۔ ہوا یہ کہ مولوی عبدالحق صاحب کا خط ملا "دیکھیے آپ کے وزیر تعلیم کیا کہتے ہیں۔"

سمپورنانند جی نے کسی مضمون میں لکھا تھا کہ ہندوستانی میں ہندی کے روزمرّہ کے کام چلاؤ الفاظ شامل ہوں گے۔ میں اُن سے ملا تو انھوں نے کہا کہ میرے اسی مضمون پر بحث اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اس لیے میں نے اس کے بارے میں گاندھی جی سے اُن کی رائے پوچھی ہے۔ گاندھی جی نے جو جواب دیا اُس سے مسئلہ کی نوعیت بالکل بدل گئی۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی میں اردو اور ہندی کے سب ضروری الفاظ ہوں گے۔ اس کا فارمولا یہ ہوگا۔

ہندی مثبت اردو = ہندوستانی

ہندوستانی منفی اردو = ہندی

ہندوستانی منفی ہندی = اردو

اس پر مولوی صاحب نے مجھے لکھا کہ گاندھی جی ہٹ گئے اپنے موقف سے اس طرح میرے سامنے آیا ہندی اردو اور ہندوستانی کا مسئلہ پوری طرح کھل کر۔ اس واقعہ سے کافی پہلے کی بات ہے کہ ایک قصہ گو صاحب زندہ تھے۔ جو ضعیفی کی وجہ سے کہیں جاتے نہیں تھے۔ قصہ سننے لوگ اُن کے گھر

پہنچ جاتے تھے۔ ایک بار میں بھی ان کے گھر پہنچ گیا تھا۔ قصہ کہتے کہتے اُنھوں نے ایک جگہ سوال کیا چوتشی جی نے کیا کہا بادشاہ سے ؟ یہ کہہ کر وہ جوتشی کے الفاظ دہرانے لگے جو کہ سنسکرت آمیز ہندی میں تھے۔ اور ان کا وہ ترجمہ بھی کرتے جاتے تھے۔ اس طرح اُنھوں نے اکبر کے دربار کا نمونہ پیش کر دیا۔ جہاں ہندو، مسلمان، راجپوت اور مغل سب ہی ہوتے تھے۔ یہ تصویر کشی میرے دماغ کو جو افسانہ نگار بننے والا تھا بہت اچھی لگی تھی۔ اب میں سوچنے لگا تھا۔ کہ اس تصویر کشی کے لیے سنسکرت آمیز ہندی بھی ضروری ہے۔ اور اس کا ترجمہ بھی۔

اس دور میں ہندو ازم اور اسلام دونوں کے ایک بڑے واقف کار تھے۔ ڈاکٹر بھگوان داس میں نے اُن سے سوال کیا کہ مہاتما گوتم بدھ خدا کے وجود کے بارے میں مذبذب تھے یا منکر لیکن انھوں نے ہندو فلسفہ کے مطابق روح کی حیثیت ابدی تسلیم کرلی تھی۔ اس طرح لاتعداد چھوٹے چھوٹے خداؤں کو مان لیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب اردو تو خوب جانتے تھے۔ لیکن فارسی اور کچھ عربی بھی جانتے تھے لیکن اس سوال کے جواب میں اُن کو بڑے بڑے سنسکرت کے الفاظ استعمال کرنا پڑے جن کو وہ یا تو طویل اردو جملوں میں سمجھاتے تھے یا انگریزی میں۔

مسلم بزرگوں کے ملفوظات اور مخطوطات میں بڑے فلسفیانہ مباحث آئے ہیں۔ اُن بحثوں میں بزرگوں کو ایسے فارسی اور عربی الفاظ کا سہارا لینا پڑا ہے جو ہندی لغت میں نہیں پائے جاتے ہیں۔

ان باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر مجھے گاندھی جی کا ہندوستانی کا فارمولا قابلِ قبول نظر آیا کہ ہندی اور اردو دونوں کے ضروری الفاظ اس میں شامل ہوں گے۔

اور مجھے موقع مل گیا۔ مولوی عبدالحق صاحب سے گفتگو کرنے کا اُن کا خیال یہ تھا کہ جس کو میں ہندی کہہ رہا ہوں وہ ایک مصنوعی زبان ہے جس کو فورٹ ولیم کالج کے جادوگروں نے بنا دیا ہے۔ بول چال سے وہ بہت دور ہے رہا نئے الفاظ کا ہندوستانی کے لیے۔ سو اردو ہمیشہ نئے الفاظ قبول کرتی چلی آئی ہے۔ ضرورت ہوگی تو سنسکرت کے اور الفاظ بھی قبول کر لیے جائیں گے۔ میں نے مولوی عبدالحق صاحب کی توجہ اُن مسائل کی طرف دلائی جو میرے ذہن میں تھے۔ مگر مولوی صاحب نے اس طرف دھیان نہیں دیا اور گفتگو ختم کر دی۔

لیکن اس گفتگو سے میں نے ایک نتیجہ نکالا وہ یہ کہ مولوی صاحب ہندوستانی کی اصطلاح سے کچھ اور سمجھتے ہیں اور گاندھی جی کچھ اور اس کا تعلق ان دونوں کے ماضی سے ہے۔

جس زمانہ میں مولوی عبدالحق صاحب حیدرآباد گئے ہیں یا اُس زمانے میں وہ ریاست تعلیم اور کلچر میں اُبھرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہاں کے دانشوروں کو یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ علم اور کلچر تک صرف دو راستوں سے جایا جاسکتا ہے۔ انگریزی کے ذریعہ یا اردو کے ذریعہ۔ جن میں انگریزی تک رسائی کم لوگوں کو ہوسکتی ہے۔ اور اس لیے اس حالت میں اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس تک حیدرآباد والوں کی رسائی ہے اور جو ان کو علم اور کلچر تک لے جاسکتی ہے۔ ایسے میں مولوی صاحب کا وجود ریاست کے لیے ایک نعمت تھا۔ اس سے پورا فائدہ اُٹھایا گیا۔ پھر مولوی صاحب نے بھی ریاست کو بہت کچھ دیا۔ انھوں نے دکنی مخطوطات کو مرتب کرکے اردو کی جڑ بنادی۔ اردو کی علمی اصطلاحات مرتب کرنے میں بڑا کام کیا۔ رفتہ رفتہ مولوی صاحب حیدرآباد کے علمی اور ادبی طبقے کے لیڈر بن گئے۔ اس طبقے میں ہندوؤں کی تعداد بہت کافی تھی لیکن جس طرح انگریزی دور کی ابتدا میں بڑے لوگ تقریبوں اور شادی اور غم کے موقعوں پر انگریزی ہی استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح حیدرآباد میں ہندو بھی جن کی زبان تامل تلگو اور کنٹر تھی اہم موقعوں پر اور شادی اور غمی میں اردو ہی کا استعمال کرتے تھے۔

نچلی سطح پر ریاست کی خاص زبانیں یعنی تلگو، کنٹر اور تامل زور پکڑ رہی تھیں اور ان کا لٹریچر ابھر کر کچھ دور تک آگیا تھا۔ اوسط سطح میں بھی اور اس کے نیچے بھی یہ زبانیں تقریبوں اور شادی بیاہ میں آنے لگی تھیں۔ لیکن مولوی صاحب کی زندگی جن حلقوں میں کٹ رہی تھی وہ ان نچلے حلقوں سے بہت دور تھے ان اسباب کی وجہ سے مولوی صاحب اس لسانی کشمکش سے بالکل ناواقف رہے۔ جو ہندوستان میں مختلف شکلوں میں اندر اندر چل رہی تھیں۔ شمالی ہند میں اسی کی ایک شکل تھی ہندی کا فروغ۔

گاندھی جی کا لسانی تصور ایک بالکل ہی دوسری فضا سے آیا تھا۔ وہ گجراتی اور انگریزی لے کر جنوبی افریقہ گئے تھے لیکن وہاں طرح طرح کے ہندوستانیوں سے باتیں اور بحثیں کرکے وہ ہندوستان آئے تو ایک ایسی کھچڑی زبان لے کر آئے۔ جو شمالی ہند اور بمبئی اور گجرات میں سمجھی جانے لگی۔ گاندھی جی نے اپنی وہی زبان لے کر ہندوستان بھر کا دورہ کیا۔ چمپارن بہار میں تحریک چلائی۔ پھر اسی زبان میں نان کوآپریشن اور نمک کی تحریکیں چلائیں۔ کانگریس کے بڑے بڑے اجلاسوں کو خطاب کیا۔ اخباروں میں ان کی تقریروں کی رپورٹیں شائع ہوئیں۔ اور کسی کو ایسا نہیں لگا کہ گاندھی

جی کی کھچڑی زبان سمجھی نہیں جاتی ہے۔

کانگریس کے اجلاسوں میں ہندوستان بھر کے نمائندے آتے تھے۔ لیکن چوں کہ شمالی ہند کے نمائندے بہت بڑی تعداد میں ہوتے تھے اس لیے سب کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ایسی زبان میں تقریر کریں جس کو زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھیں۔ اس لیے لوگ طرح طرح کی اردو مائل یا ہندی مائل کھچڑی زبان میں تقریریں کرتے تھے۔ ان میں پرشوتم داس ٹنڈن جی کے ایسے ہندی بولنے والے بھی ہوتے تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ایسے بلیغ اردو بولنے والے بھی۔ ایسی ہی بھانت بھانت کی زبانوں کے ال۔ سی۔ ام اور جی۔ سی۔ ام سے گاندھی جی نے اپنا ہندوستانی زبان کا فارمولا حاصل کیا تھا۔

ہندوستانی زبان کی ایک تیسری سمت بھی تھی۔ عیسائی مشنریوں کو اپنے کاموں کے لیے اردو بہت مفید نظر آئی کیوں کہ وہ شمالی ہند میں اور کسی حد تک جنوبی ہند میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ وہ اس کو استعمال کرنے لگے۔ لیکن جلد ہی ایک دشواری اس راہ میں آن پڑی وہ یہ کہ انگریز حکومت نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑانے کی جو راہیں نکالی تھیں اُن میں ایک تھی اردو اور ہندی کا ٹکراؤ۔ اس حالت میں مشنری نہ اردو کی طرف جا سکتے تھے اور نہ ہندی کی طرف۔ یہ دیکھ کر مشنریوں نے اردو میں اپنی چند اصطلاحیں ملا کر اُس کا نام ہندوستانی رکھ دیا۔ اور پھر یہ نام بھی چل نکلا۔

جب گاندھی جی نے کہا کہ آزاد ہندوستان کی زبان ہندوستانی ہوگی تو مولوی صاحب نے ہندوستانی کو اسی معنی میں لیا۔ جس میں مشنری لیتے تھے۔ حالاں کہ گاندھی جی نے یہ نام دیا تھا اس زبان کو جو ایک پودے کی طرح گاندھی جی کے ذہن میں تھی۔ اس پودے نے ابھی زمین سے سر نکالا تو تھا۔ لیکن کوئی شناخت نہیں ہو سکی تھی۔

یہ اختلاف ان دونوں لیڈروں کی خط و کتابت اور تحریروں میں کافی نمایاں ہے مولوی صاحب نے ۲۳ ستمبر ۱۹۴۷ء کو گاندھی جی کو لکھا:

"اگر آپ میری اس درخواست کو منظور فرما لیتے جو میں نے اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے سالانہ اجلاس ناگپور ۱۹۳۶ء میں کی تھی کہ اس ملک اور پریشد کی زبان ہندستانی ہونی چاہیئے۔ تو بہت سے جھگڑوں کا خاتمہ ہو جاتا۔ پریشد کے اس اجلاس میں جب آپ سے پوچھا گیا۔ کہ ہندی سے آپ کی کیا مراد ہے۔ تو آپ نے فرمایا۔ وہ زبان جو کتابوں

میں ہے بول چال میں نہیں"

ایک ایسی زبان کو جو بول چال میں نہیں راشٹر بھاشا قرار دینا اور اُس زبان کو جو صدیوں سے بول چال میں ہے نظر انداز کر دینا کتنی بڑی ناانصافی تھی اور یہی بات فساد کی جڑ بن گئی ۔

"یہ سچ ہے کہ کبھی آپ نے اردو دشمنی کا اظہار نہیں کیا لیکن دانستہ یا نادانستہ ایسی تدبیریں اختیار کیں جن کی وجہ سے زبان کا مسئلہ دن بدن پیچیدہ اور خراب ہوتا چلا گیا - اور دلوں میں بدگمانی اور بیر بڑھتا گیا"

اس خط میں مولوی صاحب کا اصرار ہے کہ گاندھی جی خالص ہندی کو راشٹر یہ بھاشا بنانا چاہتے ہیں ۔ اور وہ اردو کے خلاف ہیں ۔ جواب میں گاندھی جی لکھتے ہیں کہ وہ اردو کے خلاف نہیں ہیں ۔ اور وہ اردو ہندی کو ملا کر ایک بھاشا بنانا چاہتے ہیں ۔ گاندھی جی کے خط کا ایک ٹکڑا یہ ہے ۔

"خیال میں بھی میں نے اردو زبان کی دشمنی نہیں کی ۔ میں نے جنوبی افریقہ میں اور یہاں بھی ہندی اور اردو کو ملانے کی کوشش کی ہے ۔ اور کر رہا ہوں یہ میری غلطی مانی جائے سو الگ بات ہے لیکن میں دشمن کسی کا نہیں"

"ہندی ساہتیہ سمّیلن میں اردو کی بات نکالنے والا پہلے میں تھا"

گاندھی جی کا اصرار یہ رہا کہ ہندوستانی کو راشٹر یہ بھاشا بننا ہے اور اس کے بنانے کے لیے اردو اور ہندی کو ملانا ضروری ہے ۔ لیکن مولوی صاحب نے اس پر کھل کر کبھی بحث نہیں کی ۔ دونوں کی خط و کتابت میں مسئلہ کا یہ رُخ بار بار سامنے آتا رہا ہے ۔ مولوی صاحب کے اعتراضات کا خلاصہ یہ ہو رہا ہے ۔

(۱) "گاندھی جی نئی ہندی کو راشٹر یہ بھاشا بنانا چاہتے ہیں ۔

(۲) ہندی کے فروغ کی ساری ذمہ داری گاندھی جی پر آتی ہے ۔

(۳) ہندو مسلم اختلافات میں زبان کا بڑا دخل رہا ہے ۔ اور اس کی ذمہ داری بھی گاندھی جی پر آتی ہے ۔

اب لیجیے نئی ہندی کا مسئلہ ہندی نظم کی شکل میں تو صدیوں سے موجود تھی لیکن نثر کی شکل میں وہ موجود نہیں تھی ۔ نثر کی شکل اس کو دی فورٹ ولیم کالج والوں نے اسی کو مولوی صاحب

نئی ہندی کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی کوئی عوامی جڑ نہیں ہے۔ اس لیے وہ مصنوعی زبان ہے ۔ اور اس کو فورٹ ولیم کالج کے جادوگر عدم سے وجود میں لے آئے۔ یہ بات ایک حد تک صحیح ہے لیکن بس ایک حد تک ۔ ہوا یہ کہ جب انگریزوں نے محسوس کیا کہ ہندوستانی قومیت اُن کی حکومت سے ٹکّر لے رہی ہے۔ تو انھوں نے لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی اختیار کی۔ اس مسئلہ پر ایک بار وزیر ہند اور گورنر جنرل میں خط و کتابت بھی ہوئی تھی۔ جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ لڑاؤ کے لیے ہندو مسلم مسئلہ بہت اچھا رہے گا ۔ اور اس کو مختلف رخوں سے اٹھانا چاہیئے۔ جو چل جائے وہ لے لیا جائے۔ ہوشیار انگریزوں نے دیکھ لیا کہ اردو وسیع ہونے کے باوجود ہندوؤں کے بعض بے حد گہرے جذباتی مواقع کے ادا کرنے میں ناکام رہی ہے مثلاً پیدائش اور شادی کے مواقع پر اظہار مسرت میں غمی کے موقع پر اظہار غم میں اور مذہبی تقریبوں کے موقع پر ہندو بزرگوں کو اچھے القاب سے یاد کرنے میں ۔ اِن موقعوں پر سنسکرت آمیز ہندی کام دیتی ہے ایسے میں اگر ہندی کو اُبھار دیا جائے تو مذہب کا بھرپور سہارا پاکر وہ کلچر کو دو حصّوں میں تقسیم کرنے کا کام دے سکتی ہے۔ ہندی نظم کافی جاندار اور عوامی ہے اس صورت میں ہندی کو صرف نثر کی ضرورت ہے فورٹ ولیم کالج کے ہوشیار لوگوں نے ہندی والوں کو مشورہ دیا کہ تم اردو نثر لے لو اور اس میں جہاں جہاں عربی اور فارسی کے الفاظ ہوں وہاں سنسکرت کے الفاظ رکھ دو۔ اس طرح ہندی نثر تیار کر لو۔ یہ جادو چل گیا اور نثر کی تیاری کا کام جو زبانوں میں صدیاں لیتا رہا ہے وہ ہندی میں برسوں میں انجام پاگیا۔ اس طرح اردو کے ٹکر پر ایک طریقۂ اظہار ایسا مل گیا جو دونوں فرقوں کے درمیانی خلیج کو مسلسل چوڑا کرتا رہا ۔

ہندی نثر بن تو گئی لیکن وہ بول چال میں آ نہیں سکی اور اس میدان میں اردو ہی کا قبضہ رہا۔ لیکن ہندی کو بالکل مصنوعی زبان نہیں کہا جاسکتا ہے۔ بالکل ہی مصنوعی زبان ہوتی تو نہ تو اس طرح تیزی سے پھیلتی جس طرح پھیلی ہے اور نہ اس میں اس طرح کے شاہکار تصنیف ہو سکتے۔ جیسے ہندی میں موجود ہیں۔

میں نے اپنا یہ نظریہ واضح کرنے کے لیے انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالے کے لیے ایک مضمون ٹھیٹھ اردو کے عنوان سے لکھا جس میں ذرا گھما پھرا کر یہ بات کہی کہ اردو ہے تو بے حد مکمل زبان جو شمالی ہند سے لے کر جنوبی ہند کے بہت سے مقاموں تک پھیلی ہوئی ہے ۔ اور تحریر اور تقریر دونوں کاموں میں آتی ہے ۔ لیکن اس کے باوجود ہندوؤں کے ایک بہت بڑے طبقے کی بے حد

اہم ضروریات کو پورا نہیں کر پاتی ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اس میں ایسے الفاظ شامل کیے جائیں کہ وہ اپنے جغرافیائی حلقے کے سب لوگوں کی اہم ضرورتوں کو پورا کر سکے یہ مضمون دو حصوں میں تھا۔ پہلے میں دکھایا گیا تھا کہ اردو کا عوام کے ہر طبقے سے اب تک پکا رشتہ رہا ہے اور دوسرے میں یہ کہ اس رشتے کو موجودہ ضروریات کے مطابق ڈھالنے کے لیے کیا کیا کرنا چاہیے۔ اس دوسرے حصے میں میں نے اُن پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا تھا جہاں اردو ابھی گونگی ثابت ہو جاتی ہے مولوی صاحب نے پہلا حصہ تو شائع کر دیا اور دوسرے کے مسودے پر لکھ دیا "یہ شائع نہیں کیا جائے گا"۔

جب ہندوستان تقسیم ہو گیا اور ہندوستان کی الگ انجمن ترقی اردو بن گئی۔ تب میرے مضمون کا دوسرا حصہ شایع ہوا۔ لیکن وہ اب نشتے بعد از جنگ تھا۔

آج عملی طور پر انگریزی اور ہندی سرکاری زبانیں ہیں۔ لیکن کیا ان دونوں میں سے کوئی بھی ایسی ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی ضروریات کو براہ راست ادا کر سکے؟ کیا ان میں سے کسی میں میلاد شریف اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کو ویسی ہی تشفی ہو جیسی اردو میں بیان کیے ہوئے میلاد شریف سے ہوتی ہے۔ ہندی کی کسی لغت میں کیا صلی اللہ علیہ وسلم اور رضی اللہ تعالیٰ عنہ ملے گا؟

ہندی کی ایک بات سے مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ اس میں بڑے پائے کے افسانے اور ناولیں لکھی جارہی ہیں۔ لیکن ان میں آپ کو مسلم کردار اکا دکا کہیں تو ملیں۔ اور اگر مسلمان کبھی آجاتا ہے تو ٹائپ کی شکل میں آتا ہے۔ آپ اس بات کو ہندو مسلم عینک سے نہیں دیکھ سکتے۔ کیوں کہ اردو میں ہندو مصنفوں کے یہاں ایک سے ایک اعلیٰ نقاشی کے مسلم کردار ملتے ہیں۔ میرے خیال میں ہندی ادب میں مسلم کرداروں کے فقدان کی وجہ یہ ہے کہ ہندی میں ایسے الفاظ ہی نہیں ہیں جو تخیل کو مسلم زندگی کی طرف لے جاسکیں۔ سرسری قسم کے جو الفاظ ہیں وہ ٹائپ ہی تک لیے جاسکتے ہیں۔ الفاظ بھی قطب نما کا کام کرتے ہیں۔

گاندھی جی نے برسوں زبردست کوشش کی لیکن وہ اپنی ہندوستانی کے قریب نہیں پہنچ سکے۔ اس وقت ہندی والوں نے ان سے کہا کہ ساہتیہ سمیلن اردو اور ہندی کو ملانے کے کام میں آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہے۔ آپ اس کی ممبری قبول کر کے سرپرستی کیجیے۔ گاندھی جی نے جیسا کہ انھوں نے اپنے خط میں لکھا ہے ساہتیہ سمیلن والوں سے کہا کہ وہ اردو کی بھی سرپرستی کریں گے۔ ہندوستانی بنانے کا پروگرام یہ پیش کیا گیا کہ اس کا پہلا مرحلہ ہوگا۔ ہندی اتھوا ہندوستانی۔ گاندھی جی کی بات معقول نظر آتی ہے۔

شفیق الرحمٰن صاحب نے مجھے بتایا کہ اس موقع پر ڈاکٹر ذاکر حسین نے ان سے کہا تھا کہ اگر اردو والے ہندوستانی یا اردو کی تحریک چلائیں تو آپ اس میں شریک ہوں گے؟ گاندھی جی نے جواب دیا "یقیناً"

پنڈت سندرلال نے گاندھی جی سے اس وقت کہا تھا کہ ساہتیہ سمّیلن والے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں وہ ہندستانی کے لیے کچھ بھی نہیں کریں گے۔ آپ کے نام سے ہندی کو فروغ دیں گے لیکن افسوس گاندھی جی ساہتیہ سمّیلن والوں کے کہنے میں آگئے اور اس کی ممبری قبول کرلی۔

کئی برسوں کے بعد گاندھی جی نے اپنی غلطی مانی اور سمّیلن سے استعفادے دیا۔ لیکن اتنے عرصے میں ہندی آندھی کی طرح بڑھنے لگی تھی اور ہندوستانی کا جو کچھ بھی کام ہورہا تھا وہ بھی ٹھیٹھ ہندی بن چکی تھی۔ اس جگہ یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ اگر مولوی صاحب نے گاندھی جی کی بات سمجھ لی ہوتی کہ اردو کو ہندوستان بھر کے لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بھاری تعداد میں ہندی الفاظ کی ضرورت ہے تو گاندھی جی سمّیلن کی طرف ہرگز نہ جاتے۔

گاندھی جی نے جو سوال اٹھایا تھا وہ آج بھی موجود ہے۔ آج انگریزی اور ہندی کل ہند قومی سرکاری زبانیں ہیں۔ لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی مسلمانوں کی شادی وغم میں اور ان کے میلاد شریف میں کیا کام دے سکتی ہیں؟ کیا کسی کی لغت میں صلی اللہ علیہ وسلم اور رضی اللہ عنہ پایا جاتا ہے۔ یعنی جو کمزوریاں مجھے اس وقت اردو میں نظر آتی تھیں اس وقت ہندی میں نظر آرہی ہیں گاندھی کل سچائی پر تھے اور آج بھی ہیں۔

میں نے مولوی صاحب سے دو بار ہندوستانی کے بارے میں بحث کی تھی اور دونوں بار یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ گاندھی جی کے ذہن میں ہندوستانی کا تصوّر کیا ہے۔ آخری بار گفتگو اس وقت ہوئی جب گاندھی جی سمّیلن کو چھوڑ چکے تھے۔ گفتگو ذرا تفصیل سے ہوئی۔ اس کے پس منظر میں میرا مضمون ٹھیٹھ اردو تھا جو نصف شائع ہوچکا تھا۔ مولوی صاحب میری بات سنتے رہے۔ لیکن جواب سرسری سے دیتے۔ اور گفتگو اس طرح ختم کی کہ انھوں نے آرام کرسی سے ٹیک لگالی اور حقّہ کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اس گفتگو کے بعد میں لوگوں سے کہتا رہا کہ مولوی صاحب مجھے اپنے مخالفوں میں تو نہیں گنتے ہیں۔ لیکن دوستوں میں بھی نہیں گنتے ہیں۔ مجھے صرف برداشت کر لیتے ہیں۔

لیکن حال میں ایک زبردست انکشاف ہوا جس سے مولوی صاحب کی شخصیت میری نظروں میں

کچھ اور ہو گئی۔ قومی آواز دہلی ایڈیشن کے میگزین ۲۲ر دسمبر ۱۹۹۱ء میں "مولوی عبدالحق مرحوم" کے عنوان سے مصنفہ چودھری شرف الدین شائع ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کی میرے بارے میں کیا رائے تھی۔ پس منظر یہ ہے کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے اردو طلبا کی دعوت پر مولوی صاحب لکھنؤ تشریف لائے تھے اور سنٹرل ہوٹل میں مقیم تھے۔ مضمون میں لکھا گیا ہے:

"جو بات بہت ہی اہم ہے وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں کانگریس اور مسلم لیگ کا زبردست زور تھا۔ پڑھے لکھے نوجوان پر لیگ کا جادو چل گیا تھا اور کوئی الیکشن ہونے والا تھا۔"

جب مولوی صاحب سنٹرل ہوٹل میں قیام پذیر تھے۔ تو ان کے کمرے میں زیادہ تر لڑکے مسلم لیگ کے جوشیلے کارکن تھے۔ انھوں نے حیات اللہ انصاری کا ذکر نکال دیا تا کہ کچھ صلواتیں ہی سننے کو مل جائیں۔ مگر مولوی صاحب نے آرام کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے فرمایا:

"حیات اللہ بڑا ہی پُرخلوص کارکن ہے۔ مجھے ایسے ہی پر خلوص اور محنتی آدمی کی ضرورت ہے۔ اس کی لگن دیکھیے۔ ایسی لگن اور محنت سے، کام عبادت بن جاتا ہے۔"

یہ بات ہے ۱۹۴۵ء کی اس وقت تک میں نے سوائے عام قسم کی جدوجہد کے اردو کا کوئی کام ایسا نہیں کیا تھا جس کی مولوی صاحب کی نظروں میں خاص وقعت ہوتی۔ نہ دستخطی مہم چلائی تھی، نہ "دس دن میں اردو" مکمل کر سکا تھا۔ نہ قومی آواز کے ذریعہ صحافت کی خدمت کر سکا تھا اور نہ ایک ناول "لہو کے پھول" لکھ سکا تھا۔ بلکہ میں تو ایک حد تک ہندوستان کے معاملے میں مولوی صاحب کے اپوزیشن کیمپ میں تھا۔ اس حالت میں میری ایسی تعریف کرنا! کتنا بڑا دل تھا مولوی صاحب کا اور کتنا قدردان!

رہے گا نام ان کا، نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

بیگم سلطانہ حیات

مولانا عبدالحق صاحب، اُردو اور مہاتما گاندھی جی

ہندوستان مہاتما گاندھی کی قیادت میں آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھا اس کے ساتھ ساتھ اردو اور ہندی بھی الگ الگ اپنی اپنی بقاء، تحفظ اور ترقی و ترویج میں لگی ہوئی تھیں۔ اس وقت سوال یہ تھا کہ آزاد ہندوستان کی زبان کیا ہوگی۔ یا یہ کہ کیا ہونی چاہیئے۔ اسی جذبہ کے تحت (ہندی) ساہتیہ سمیلن اور ہندی ساہتیہ پریشد کی طرف سے ایک مشاورتی جلسہ ناگپور میں طلب کیا گیا تھا جس میں ملک کے سر برآوردہ لیڈروں مثلاً مہاتما گاندھی۔ پنڈت جواہر لعل نہرو۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ ڈاکٹر عابد حسین۔ کاکا کالیکر صاحب اور منشور والا صاحب وغیرہ نے شرکت کی تھی۔ اردو کی نمائندگی مولانا عبدالحق صاحب مرحوم مع اپنے ساتھیوں کے کر رہے تھے۔ اس زمانہ میں مہاتما گاندھی کے جو مضامین اور بیانات نکلے اس میں انھوں نے آزاد ہندوستان کی زبان کو "ہندی الفوا ہندوستانی" کا نام دیا تھا۔ یہ میٹنگ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئی یعنی کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا کہ آزاد ہندوستان کی زبان کیا ہونی چاہیے۔

اس میٹنگ کی رپورٹ مولانا عبدالحق صاحب کے قلم سے اردو اخبارات میں شائع ہوئی تھی جس میں منجملہ اور باتوں کے ایک جملہ مولانا صاحب نے مہاتما گاندھی کی طرف منسوب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مہاتما نے اس میٹنگ کے دوران کہا کہ:۔

"اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ قرآن شریف کے الفاظ رسم الخط میں لکھی جاتی ہے مسلمان چاہیں تو اس کو رکھیں چاہیں نکالیں"

اس جملہ نے پوری اردو دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ شاید ہی کوئی اردو کا اخبار ہو جس نے اس جملے کو بار بار کسی نہ کسی عنوان سے نہ لکھا ہو۔ اس جملہ نے اردو والوں کے دلوں میں تعصب اور نفرت کی وہ آگ لگائی جس

نے اردو ہندی زبانوں کو دو پہلوانوں کی طرح سیاست کے اکھاڑے میں اتار دیا تھا۔ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے یہ جملہ تقریباً ہر تقریر اور تحریر میں دہرایا جانے لگا۔ یوں تو سینکڑوں جملے اور باتیں کہی اور لکھی جاتی ہیں اور بھلا دی جاتی ہیں مگر یہ جملہ برابر تقریروں اور مضامین کا موضوع بنا رہا۔ اور مسلم لیگ نے اس جملہ سے تقویت پائی۔ ورنہ اس سے پہلے عموماً پڑھا لکھا طبقہ اپنے آپ کو مسلم لیگی کہلوانے سے ذرا کتراتا تھا۔ غرضیکہ دن، مہینوں اور برسوں کے پردے بھی اس جملہ کو بھلا نہ سکے۔

مجھے بھی یہ جملہ کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مہاتما نے یہ جملہ کیسے کہدیا۔ مجھے اگست ۱۹۴۱ء میں باپو سے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا۔ وہ پیر کا دن تھا۔ یعنی باپو اس روز چپ کا روزہ یا مون رکھتے تھے میں نے باپو سے کہا:

"آپ پوری ہندوستانی قوم کے لیڈر ہیں ــــــ پھر آپ نے یہ کیسے کہا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے جو قرآن شریف کے رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان اس کو چاہے رکھیں چاہے ختم کر دیں"

باپو کا چہرہ حیرت اور جذبات کی شدت سے سرخ پڑ چکا تھا۔ وہ بول نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے لکھ کر دیا:

"تم نے میری بحث دیکھی تھی۔ سچ بات یہ ہے کہ میں نے کبھی ایسا نہیں کہا۔ میں نے جو کہا تھا وہ چھپا ہے۔ میں نکال کر بھیج سکتا ہوں"

میں نے بہت ادب سے عرض کیا کہ مولانا صاحب کہتے ہیں کہ وہ جملہ آپ نے دوران گفتگو کہا تھا، لکھا نہیں تھا۔ یہ جملہ تو مولانا عبدالحق صاحب برابر دہرا رہے ہیں۔ اُردو دنیا میں تو آپ کے اس جملہ نے آگ لگا دی ہے۔ مسلم لیگ اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اور دنوں، مہینوں اور برسوں کی دوری بھی اس جملہ کو نہیں بھلا سکی تھی۔ اردو اخبارات برابر اس جملہ کو چھاپتے ہیں۔ اور اس کا حوالہ دیتے ہیں۔

باپو نے پھر لکھ کر دیا:

"کیا کیا جائے؟ اخباروں میں میرے بارے میں بہت ہی غلط باتیں لکھی جاتی ہیں۔ اگر کل تک رہنا ہے تو آجاؤ۔ کچھ بات کریں گے اور کچھ بتاؤں گا"

"یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ نے یہ کہا نہ ہو اور مولانا عبدالحق صاحب آپ کا نام لے لے کر اس کو آج

بھی دہرا رہے ہیں ؟

میرا یہ اصرار آس پاس کے کھڑے لوگوں کو ناگوار ہوا۔ مگر میرے دل میں اس جملہ نے آگ لگائی ہوئی تھی۔ اس لیے میں نے اصرار کیا کیوں کہ اردو میری مادری زبان ہے۔

ہمارا صبح ہی کو ناگپور جانے کا پروگرام تھا۔ میں نے پھوپھی جان[۱] بیگم حمیدہ۔ سید عزیزالدین احمد صاحب سے دریافت کیا کہ کل ہم آ سکیں گے ؟ پھوپھی جان نے خوشی سے پروگرام میں تبدیلی کی اور یہ طے پایا کہ ہم کل مہاتما جی سے ملنے آئیں گے۔

باپو نے ہاتھ کی انگلیوں سے اشارہ کیا کہ شام کے ۴ بجے آنا۔ اگلے روز ہم سب وقت پر پہونچے۔ باپو لیٹ رہے تھے اور ان کے پیٹ پر مٹی کی پٹی رکھی جا رہی تھی۔ کمرے میں آچاریہ کرپلانی بیٹھے تھے۔ ہندی ساہتیہ سمیلن اور پریشد کی مشترک مٹینگ کی کچھ کاروائی نیز زبان کے متعلق کچھ باپو کے مضامین جو اخبارات میں شائع ہوئے تھے وہ رکھے تھے۔ وہ سب باپو نے مجھے پڑھنے کے لیے دئے۔

گفتگو کا آغاز تو اس سے ہوا کہ آزاد ہندوستان کی رابطہ کی زبان کیا ہونی چاہیئے۔ اور پھر جلد ہی اس شعلہ بار جملہ کا ذکر آگیا جس کا تذکرہ کر چکی ہوں۔ اور جس کا تقسیم ہند میں بڑا حصہ تھا۔ مہاتما گاندھی جی جوش میں نہیں آتے تھے مگر میری اس تکرار سے اُن کو تکلیف ہوئی اور پھر انھوں نے ہندی ساہتیہ پریشد اور ہندی ساہتیہ سمیلن کی ناگپور میں منعقدشدہ کانفرنس کا ذکر کیا۔ اپنے رجحان طبیعت کا تذکرہ کیا کہ وہ اس قسم کی فضول بات نہ سوچ سکتے ہیں نہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ اردو کی بناوٹ پر روشنی ڈالی کہ یہ کس طرح ترکی۔ پشتو۔ فارسی۔ عربی اور ہندوستان کی دیگر زبانوں سے مل کر بنی ہے۔ وغیرہ۔ اس گفتگو میں ایک گھنٹہ پورا گزر گیا ہے۔ جب بہن امتہ السلام نے اُن کے پیٹ پر سے مٹی اٹھاتے ہوئے بتایا تو وہ چونک پڑے۔ بولے کہ اتنا وقت تو میں آج کل کسی کو نہیں دیتا ہوں۔

مہاتما جی جیسی ذہین ہستی! انھوں نے میرے ذہن میں جو کشمکش جاری تھی اس کو پڑھ لیا۔ بولے کہ جب ضرورت ہو تو راجیند بابو (ڈاکٹر راجیندر پرشاد جی سابق صدر جمہوریہ ہند) اور کاکا صاحب (کاکا کالیکر صاحب) سے بھی مل لینا۔ وہ دونوں بھی اس مٹینگ میں تھے۔ اس طرح سے یہ گفتگو ختم ہوئی میری کشمکش سے۔ میں نے محسوس کیا کہ باپو بھی بےچین ہیں۔

---

[۱] بیگم حمیدہ احمد صاحبہ اور پھوپھا سید عزیزالدین احمد صاحب مرحوم کے ساتھ میں واردھا گئی تھی اور ڈاکٹر سید منہاج الحسن صاحب مرحوم جو ضلع واردھا کے کانگریس صدر تھے، اکی وساطت سے مہاتما جی سے ملنا ہوا تھا۔

کچھ دن بعد میں پھر اکیلی سیواگرام آشرم پہونچ گئی۔ باپو سے جب موقع ہوتا تھا، آزاد ہندوستان کے رابطہ کی زبان کیا ہونی چاہیئے، پر گفتگو ہوتی تھی۔ اکثر مہاتما جی خود اس کا آغاز کرتے تھے۔ کبھی کبھی میں بھی یہ جسارت کرتی تھی۔ اس وقت باپو کا خیال تھا کہ رابطے کی زبان وہ ہونی چاہیئے جو کہ شمالی ہند کے بازاروں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور یہ کہ یہ زبان ہندی۔ اردو دونوں رسم الخط میں لکھی جائے مگر باپو اس کو ہندی اتھوا ہندوستانی کا نام دیتے تھے۔ میں کہتی تھی کہ لفظ ہندی اتھوا لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ سیدھی بات صرف ہندوستانی کہیئے۔

اسی دوران اور لوگوں کے علاوہ بابو راجیندر پرشاد جی سے تفصیل سے گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ انھوں نے بھی مجھے ناگپور کی میٹنگ کی تفصیل بتائی۔ پھر وقت مقرر کرکے وہ مجھے کاکا صاحب کے پاس لے گئے جو سیواگرام آشرم اور واردھا کے درمیان رہتے تھے۔ وہاں پر ریحانہ طیب جی اور بہن سروجنی مہتا سے بھی پہلی بار ملاقات ہوئی۔ ان ہی کی بیٹھک میں بیٹھ کر ہم سب نے اس میٹنگ کی رپورٹیں پڑھیں۔ اس طرح کی میٹنگیں کئی بار ہوئیں۔ آخری بار کی میٹنگ آج بھی دماغ پر نقش ہے۔ کاکا کالیکر صاحب راجیندر باپو۔ نشوروالا جی سب بیٹھے تھے اور بڑی دردمندی سے مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ باپو ایسا جملہ کبھی کہہ نہیں سکتے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ وہ تو ہر اقلیت کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے ہیں۔

ان سب اور خصوصاً مہاتما گاندھی کی باتوں میں کتنی سچائی اور خلوص تھا۔ میں کافی پریشان ہو گئی ایک طرف مہاتما گاندھی جیسی شخصیت دوسرے مجھے ان کے ساتھ ان کی کٹیا میں رہتے ہوئے کافی دن گزر چکے تھے۔ جس قدر مجھے ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع مل رہا تھا اتنی ہی میری عقیدت بڑھ رہی تھی۔ جی میں آتا تھا سب کی طرح میں بھی اُن کو پیار اور احترام کے ساتھ باپو کہنے لگوں مگر پھر وہ زہریلا جملہ یاد آجاتا تھا۔ اور یہ کہ مولانا عبدالحق صاحب نے اردو کا بہت کام کیا ہے۔ بچپن سے اُن کا نام سُن رہی ہوں۔ پھر مولانا ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اردو کا ہر اخبار مہاتما جی کا یہ جملہ دہرا رہا ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور قرآن پاک کے رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ وغیرہ۔ اردو کے سب اخبارات اور مولانا عبدالحق صاحب انجمن ترقی اردو ہند کے پلیٹ فارم سے یہ جملہ بار بار دہرا رہے ہیں۔ یہ سب غلط ہوں اور یہ کہ سچ کس طرف ہے؟ کس کی طرف ہے؟ میں فیصلہ نہیں کر پائی ــــ میری اس خلش کو باپو محسوس کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ:

"توجواہر لعل ۔ ذاکر حسین صاحب ۔ عابد حسین صاحب اور جو جو اس روز ناگپور والی میٹنگ میں شریک تھے اُن سے مل لے اور ہر ایک سے پوچھ لے کہ کیا میں نے ایسی بات کہی تھی کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے ؟"

میں نے بھی اپنے دل میں کہا کہ یہ ٹھیک ہے ۔ میں بھی ایک ایک سے مل کر اس کی تصدیق کروں گی کہ سچ کس طرف ہے ۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ آزاد ہندوستان کی زبان کیا ہونی چاہیئے ۔ اِس مسئلہ پر ہفتوں گفتگو ہوئی ۔ جس میں مختلف موقعوں پر مختلف لیڈر بھی شامل ہوجاتے تھے ۔ مثلاً سردار پٹیل ۔ بی ۔ جی ۔ کھیر صاحب جو بعد میں مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ بنے تھے ۔ مرارجی ڈیسائی ایک دفعہ پنجاب کے میاں افتخار الدین صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ نے بھی شرکت کی تھی ۔ آچاریہ کرپلانی جی سنتے سب کچھ تھے مگر بولتے کوئی خاص نہیں تھے ۔

آخر یہی طے پایا کہ وہی فارمولا تسلیم کرلیا جائے جس کو باپو اور مولانا عبدالحق صاحب منظور کرلیں ۔ چناں چہ باپو کے مشورہ سے میں نے ایک خط مولانا صاحب کو لکھا جس کو نقل کر رہی ہوں

قبلہ مولوی صاحب السلام علیکم

مجھے اردو ہندی کے بڑھتے ہوئے جھگڑے سے بڑی تکلیف ہوتی ہے ۔ میں نے مہاتما گاندھی جی سے کچھ سوالات کیئے ۔ انھوں نے بڑی مہربانی سے مجھے بتایا اور میرے شکوک رفع کرنے کی کوشش کی ۔

اب بجائے اس کے کہ اخبارات میں زبان کا جھگڑا طے ہو ۔ زبانی اس کا فیصلہ ہوجائے تو اچھا ہے ۔ کیوں کہ میں اب تک اس نتیجہ پر پہونچی ہوں کہ فساد کی اصلی جڑ ایک بڑی حد تک غلط فہمی ہے ۔

کیا آپ مجھے وقت دیں گے کہ میں آپ سے مل کر اس الجھی ہوئی بحث کو سلجھانے کی کوشش کروں ؟

آپ کے جواب کی منتظر ہوں ۔

راقمہ

(سلطانہ قاضیہ)

مہاتما جی کا بھی یہی خیال ہے کہ اب یہ جھگڑا زبانی طے ہو جائے اور یہ خط میں آپ کو اُن کے مشورہ سے لکھ رہی ہوں۔ یہ بعد کا جملہ مہاتما جی نے لکھوایا تھا۔

ستمبر ۱۹۴۱ء کے تیسرے ہفتہ میں مولانا صاحب کا جواب آیا جو یہ ہے۔

انجمن ترقی اردو (ہند)

نواب منظور جنگ بہادر، حبشی گوڑہ حیدرآباد دکن

مورخہ ۱۹ ستمبر ۱۹۴۱ء

مکرمہ سلطانہ قاضیہ صاحبہ۔ سلمہا

آپ کا خط مجھے یہاں پہنچا جس کا بہت شکر گزار ہوں۔
میں دہلی واپس جانے کے بعد آپ کو اطلاع دوں گا۔ آپ
وہاں تشریف لائیں۔ میں نہایت خوشی کے ساتھ اردو ہندی
تنازع کے متعلق آپ سے گفتگو کروں گا۔

میں خود اس کا متمنی ہوں کہ یہ معاملہ معقول طور پر طے ہو جائے۔

خیر طلب
عبدالحق

مجھے ناگپور میں مولانا صاحب کا ۲۶ ستمبر ۱۹۴۱ء کا تحریر کردہ خط ملا۔ یہ خط لے کر میں پھر واردھا گئی اور یہ خط مہاتما جی کو سنا دیا۔ وہ یہ خط سن کر خوش ہوئے۔ اور پھر ایک تاکیدی خط لکھنے کی ہدایت دی کہ میں اُن سے ملنے حیدرآباد بھی جا سکتی ہوں یا پھر وہ دہلی واپس جاتے ہوئے غریب خانہ پر قیام کریں۔ میرے اس خط کا انھوں نے فوراً جواب دیا جو یہ ہے۔

انجمن ترقی اردو (ہند)

بوساطت نواب منظور جنگ، حبشی گوڑہ، مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۹۴۱ء

مکرمہ سلطانہ قاضیہ سلمہا۔

آپ کا خط پہنچا۔ شکریہ

میں یہاں سے جلد جانے والا ہوں۔ اگر میرا قیام یہاں کچھ دنوں اور رہتا تو میں آپ کو یہیں بلا لیتا۔ یہاں سے میں سیدھا بھوپال جاؤں گا وہاں دو تین روز قیام ہو گا۔ انجمن کے

متعلق بعض معاملات طے کرنے ہیں اور وہاں سے دہلی چلا جاؤں گا۔ ناگپور میں نہیں ٹھہر سکتا۔ دہلی جا کر آپ کو اطلاع دوں گا ۔ آپ کو اب دہلی آنے کی زحمت اٹھانی پڑے گی۔ اگر بعض ضروری کام نہ ہوتے تو میں ناگپور ایک دو روز کے لیے ٹھہر جاتا لیکن فوری ضرورت کی وجہ سے یہ ممکن نہیں۔

خیر طلب
عبدالحق

مولانا صاحب سے تو خط و کتابت جاری تھی۔ دوسری طرف باپو سے آزاد ہندوستان کی رابطہ کی زبان پر بحث ہوتی رہتی تھی۔ باپو ہندی اتھوا ہندوستانی نام دینا چاہتے تھے۔ باپو کو اگر کوئی چیز اُن کی رائے کو تبدیل کرنے پر مجبور کر سکتی تھی تو وہ تھی صرف دلیل کی طاقت۔ اور میں چاہتی تھی کہ رابطہ کی زبان کا نام صرف ہندوستانی رہے۔

ایک رات کھانے کے بعد رابطہ کی زبان کا ذکر آیا۔ یہ بحث تقریباً ایک ہفتہ سے زیادہ چل چکی تھی۔ جہاں تک یاد ہے۔ اس وقت راجیندر پرشاد جی جو وہاں راجیندر بابو کہلاتے تھے۔ کھیر صاحب، سردار پٹیل وغیرہ موجود تھے۔ میں نے کہا کہ مہاتما جی، جب شمالی ہند کے بازاروں میں جو بولی بولی جاتی ہے۔ اس کو آپ ہندی اتھوا ہندوستانی کہتے ہیں۔ مولانا صاحب اس کو اردو کہتے ہیں۔ راجیندر بابو اس کو ہندی کہیں گے۔ تو پھر اس کا نام صرف ہندوستانی ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے۔ اس پر سب ہنس پڑے اس کے بعد محفل برخاست ہو گئی۔ باپو کی سونے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

اگلے دن جب ہم سب شام کو ٹہلنے کے لیے نکلے۔ سردار پٹیل تو ساتھ ہوتے ہی تھے۔ اس کے علاوہ راجیندر بابو اور بمبئی کے کچھ مہمان بھی تھے۔ راستہ میں باپو بولے ___ " تو ٹھیک کہتی ہے۔ ہندی اتھوا ہندوستانی کے بجائے صرف ہندوستانی ہی نام رہے تو اچھا ہے۔ باپو کے منھ سے یہ الفاظ سُن کر میں ازحد خوش ہوئی۔ باپو کا ہاتھ میرے کندھے پر تھا۔ یہ بھی بھول گئی۔ اور خوشی سے تالیاں بجانے لگی ___ فوراً ہی ہوش آیا تو! اور تو سب حیرت میں تھے۔ مگر سردار پٹیل مسکرا رہے تھے۔ وہ شرمندگی اب تک یاد ہے۔ باپو کا چہرہ دیکھنے کی ہمت نہیں پڑی۔ میرے چہرے سے آنچ سی نکلنے لگی۔ اور آتے ہی مولانا صاحب کو خط لکھا۔ خوشی کے مارے میرا بُرا حال تھا۔

کیوں کہ میں سمجھ رہی تھی کہ ایک بہت اہم منزل طے ہو گئی ہے۔

۱۶/ اکتوبر ۱۹۴۱ء

جناب مولوی صاحب تسلیم!

گرامی نامہ موصول ہوا۔ شکور فرمایا۔ کچھ ایسی صورتیں پیدا ہو گئی ہیں کہ میں اب آپ سے جلد نیاز حاصل کرنے کی متمنی ہوں۔

(سلطانہ قاضیہ)

اس خط کا جواب مجھے فوراً ہی ملا جو یہ ہے:-

انجمن ترقی اردو (ہند)

۱۔ دریا گنج، دہلی

مورخہ ۳/ اکتوبر ۱۹۴۱ء

مکرمہ سلطانہ قاضیہ صاحبہ السلام علیکم

میں پرسوں اپنے دورے سے یہاں واپس آگیا ہوں۔ آپ نے دہلی تشریف لانے اور اردو ہندی کے متعلق گفتگو کرنے کے متعلق لکھا تھا۔ اگر آپ ۱۲/ اکتوبر کو یہاں تشریف لے آئیں تو اطمینان سے گفتگو ہو سکے گی۔ براہ کرم اطلاع دیجیے کہ آپ اس تاریخ کو یہاں آسکیں گی یا نہیں۔ اگر قیام کا کہیں اور انتظام نہ کیا ہو تو انجمن کا مکان حاضر ہے۔ جواب کا منتظر رہوں گا۔

دوسری عرض یہ ہے کہ انجمن کی اردو ریڈریں بغرض منظوری محکمۂ تعلیمات میں داخل کی گئی ہیں۔ کمیٹی کی روح رواں بیگم عزیز الدین صاحبہ ہیں۔ میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ بیگم صاحبہ موصوفہ سے اس بارے میں تائید کی سفارش کر دیں گے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ اردو زبان و ادب کی بڑی حامی ہیں اور ذوق علم و ادب رکھتی ہیں۔ انھوں نے تائید کا وعدہ بھی کیا تھا۔ آپ براہ کرم انھیں یاد دلا دیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی تائید منظوری کے لیے کافی ہو گی بلکہ وہ صاحب علم بھی ہیں اور ذی اثر بھی۔

خیر طلب
عبدالحق

اس خط کا جواب میں نے ۶/ نومبر ۱۹۴۱ء کو دیا۔ جو یہ ہے۔

معرفت۔ سید عزیز الدین احمد صاحب، کامٹی روڈ۔ ناگپور

۶/ نومبر ۱۹۴۱ء

جناب مولوی صاحب

بصد ادب تسلیم!

گرامی نامہ بارے ۵ نومبر کو موصول ہو کر باعث عزت ہوا!۔۔۔ خط پر ۲۳/ اکتوبر درج ہے۔ اکتوبر کب کا رخصت ہوا۔ ماہ رواں نومبر ہے ممکن ہے کہ یہ خط اکتوبر ہی میں لکھا گیا ہو اور کسی وجہ سے پڑا رہ گیا۔ اب معلوم نہیں آپ اس ماہ کی ۱۲/ تاریخ کو بھی تحریر کے مطابق وقت دے سکیں گے یا نہیں۔ جواب کی منتظر ہوں۔

اگر آپ کا مطلب نومبر سے ہے تو کیا میں ماہ حال کی ۱۵ یا ۱۶ تاریخ کو حاضر ہو سکتی ہوں؟

انجمن کے مکان پر آپ نے جو مجھے قیام کی دعوت دی ہے۔ اس کا بہت شکریہ!

آپ کا خط آنے پر مطلع کروں گی کہ میں دہلی میں کہاں ٹھہر رہی ہوں۔

باقی صاحب سے معلوم ہوا تھا کہ دہلی سے کتابیں ناگپور میں کسی صاحب کو بھیجی جا چکی ہیں۔ غالباً وہ انھوں نے اب تک بورڈ کو نہیں بھیجی ہیں۔

کل ہی کچھ کتابیں برائے تنقید پھوپی جان کے پاس آئیں تھیں۔ مگر اس میں انجمن کی کوئی کتاب نہیں تھی۔ کتابیں دراصل مندرجہ ذیل پتے پر پہنچنی چاہئیں۔

To.

Mr. U. A. Apte,

Secretary High School Education Board,

Central Provinces, Berar Nagpur

پھوپی جان کو خود بہت خیال ہے۔ اب دیر کی مطلق گنجائش نہیں۔ جلد از جلد کتابیں بھیج دیجیے۔ غالباً جنوری میں میٹنگ ہو گی۔ اور اس سے ایک مہینہ قبل سب ممبروں کی رائے وہاں پہنچنی چاہیئے۔ اور خود ممبران بھی تنقید لکھنے میں ایک مہینہ تو لگا ہی دیں گے۔

زیادہ سلام

سلطانہ قاضیہ

اس خط کے جواب میں مجھے اطلاع ملی کہ ۱۲ر نومبر ۱۹۴۷ء کو مولانا صاحب دن کے ۱۱ر بجے میرا انتظار کریں گے۔ اور پھر میں ۱۲ر نومبر کو ان سے ملنے دہلی پہنچ گئی۔

مولانا عبدالحق صاحب سے ملاقات

انجمن ترقی اردو ہند کا دفتر ا۔ دریا گنج میں تھا۔ میں جب وہاں پہنچی تو ایک بڑے سے کمرہ میں بٹھایا گیا۔ تھوڑی دیر میں مولانا عبدالحق صاحب مع ایک اور صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے۔ برتاؤ عجیب تھا۔ قبل اس کے کہ کوئی بات شروع ہو، مولانا صاحب کو کسی ضروری کام سے باہر جانا پڑا۔ اس دوران میں جو صاحب آئے تھے۔ انھوں نے میرے والد صاحب کا نام دریافت کیا۔ جب میں نے بتایا کہ میرے والد صاحب کا نام قاضی بشیر الدین احمد صاحب ہے۔ تو ان کا رویّہ ایک دم سے بدل گیا اور بہت محبت سے انھوں نے گھر کا سب حال دریافت کیا۔ وہ بھوپال کے شعیب صاحب تھے جنگ بلقان کے سلسلہ میں ۱۹۱۲ء میں ایک وفد ڈاکٹر مختار احمد انصاری صاحب کی قیادت میں قسطنطنیہ گیا تھا۔ میرے والد صاحب اس میں شریک تھے۔ شعیب صاحب سے اس وقت سے یا علی گڑھ سے ان کی دوستی تھی۔

اب مولانا صاحب واپس آئے۔ میں ان کی آمد پر حسب عادت کھڑی ہوئی اور اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ (جو کہ ان کو پہلے سے تو معلوم تھا ہی) مولانا صاحب بہت برافروختہ ہوگئے۔ خفگی کی وجہ یہ تھی کہ میرے سوا کوئی اور معقول آدمی اردو ہندی کے مسئلہ کو طے کرنے کے لیے نہیں ملا؟ میں نے وضاحت کی کہ میں نے خود ہی باپو سے جاکر آپ کے تحریر کردہ قیامت خیز جملے کا تذکرہ کیا تھا۔ اور اب یہ کہ آزاد ہندوستان کی رابطہ کی زبان کیا ہو۔ اس پر اگر آپ دونوں میں سمجھوتہ ہو جائے تو اچھا ہے۔ بس اب مولانا صاحب کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ وہ میرے بجائے کسی اور معقول آدمی سے گفتگو کر سکتے ہیں۔

"تو پھر آپ نے مجھے یہ کیوں لکھا کہ آپ یہ مسئلہ مجھ سے مل کر طے کرنا چاہتے ہیں؟"

اب نہ پوچھیے مولانا کے غصّہ کا عالم! وہ تو شعیب صاحب موجود تھے۔ وہ برابر مولانا صاحب کو

تھام رہے تھے۔

مولانا صاحب بگڑ کر بولے۔" نہیں میں نے نہیں لکھا"

آپ نے لکھا تھا۔ میرے پاس آپ کی تحریر موجود ہے۔ ورنہ میں آپ کے پاس آتی کیوں؟

مجھے اُس وقت ا۔ دریا گنج میں بیٹھ کر سیوا گرام آشرم کا برتاؤ یاد آرہا تھا۔

" جھوٹ بالکل غلط"! میں نے نہیں لکھا۔

شعیب صاحب نے معاملہ کو آسان کر دیا۔ مولانا صاحب کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

مولانا صاحب کہتے ہیں کہ انھوں نے نہیں لکھا اور تم کہتی ہو کہ تمہارے پاس تحریر موجود ہے۔ تو وہ تحریر موجود ہے تو بس دکھا دو۔ مولانا صاحب نے اگر لکھا ہے تو وہ ضرور اردو، ہندی کے مسئلہ پر گفتگو کریں گے۔ (یہ سب ایک جملہ میں طے نہیں ہوا تھا۔ تقریباً ۵۔ ۱۰ امنٹ میں ہم تینوں بولے تھے تب یہ نتیجہ نکلا تھا۔ میں نے بتایا کہ وہ خطوط گھر پر ہیں جہاں میں مقیم ہوں۔ طے پایا کہ میں جا کر وہ خطوط لے آؤں۔

میں کمرے سے برآمدے میں آگئی۔ شعیب صاحب بھی آگئے۔ دریافت کیا کہ کہاں ٹھہری ہوئی ہو۔ دریا گنج میں پرانے تھانہ کی پشت پر اپنے نانا ابا ڈپٹی قاضی محتشم الدین احمد صاحب مرحوم کے مکان پر — وہ تو قریب ہے — انھوں نے اپنے ڈرائیور کو بلایا۔ میرے منہ سے تو بات بھی نہیں نکل رہی تھی۔ میں ان کی کار میں بیٹھ کر قیام گاہ روانہ ہو گئی۔

واپسی پر دیکھا کہ برآمدے میں شعیب صاحب ٹہل رہے تھے۔ وہ سب خطوط جو اوپر تحریر کر چکی ہوں، اُن کے ہاتھ میں دیدئے۔ انھوں نے ہماری خط وکتابت کو پورا پڑھا۔

" لو لکھا تو ہے"! شعیب صاحب کے جملہ میں جو اطمینان تھا وہ آج بھی محسوس کر رہی ہوں۔ مولانا صاحب نے اپنے خطوط پر نظر ڈالی مگر کچھ بولے نہیں۔ اور گفتگو کا آغاز ہوا۔ مولانا صاحب، باپو کے اس خیال سے تو متفق تھے کہ وہ زبان جو شمالی ہند کے بازاروں میں بولی جاتی ہے وہ اردو اور ہندی رسم الخط میں لکھی جائے۔ مگر ان کے خیال سے بازاروں میں وہ زبان بولی جاتی تھی جو وہ لکھتے تھے جس میں ہندی الفاظ کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ نیز یہ کہ مستند الفاظ کو چُن لیا جائے اِس پر وہ راضی تھے۔

پھر یہ طے پایا کہ اب کی بار جو مہاتما جی دہلی آئیں گے تو مولانا صاحب اُن سے مِل کر یہ مسائل طے کریں گے۔ نیز یہ بھی طے پایا کہ پنڈت سندر لال جی کو بھی اس گفتگو میں شامل کیا جائے اور مہاتما جی سے رابطہ کی زبان کے متعلق گفتگو کی جائے۔ وغیرہ۔

یہ تو حاصل تھا اس گفتگو کا جو نہ معلوم بعد میں کتنے دن چلی تھی۔ مولانا صاحب کو اس سمجھوتے پر لانے میں مجھے اتنی ہی دقت پڑی تھی جس قدر آج اتر پردیش سرکار سے اردو کے سلسلہ میں کوئی مراعات حاصل کرنے میں ہوتی ہے۔

یہ تحریر کرنا ضروری ہے کہ پہلی میٹنگ میں ہی میں نے بڑی ہمت کر کے مولانا صاحب سے دریافت کر لیا تھا۔ کہ آپ نے جو اخبارات میں تحریر فرمایا ہے کہ "مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ قرآن پاک کے رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان چاہے اس کو رکھیں چاہے نکالیں"_____ میں نے مہاتما جی سے دریافت کیا تھا کہ وہ پوری قوم کے لیڈر ہیں۔ انھوں نے ایسا جملہ کیسے کہہ دیا؟ تو انھوں نے انکار کیا کہ انھوں نے کبھی ایسا جملہ نہیں کہا۔

"کیسے نہیں کہا تھا؟" مولانا صاحب پھر طیش میں آ گئے۔

میں نے روانہ ہوتے ہوئے یہ بھی بتا دیا کہ مہاتما جی نے مجھ سے کہا ہے کہ میں ان حضرات سے جو جو اس میٹنگ میں شامل تھے، ان سے بھی تصدیق کر لوں کہ انھوں نے یہ جملہ کہا تھا یا نہیں۔

مولانا صاحب غصہ میں نہ معلوم کیا کیا کہہ رہے تھے۔ صرف محترم شعیب صاحب کی وجہ سے گفتگو آگے بڑھی تھی۔ وہی مجھے رخصت کرنے برآمدے تک آئے۔ پیچھے مولانا صاحب بھی آ گئے تھے۔

مجھے مولانا صاحب کے برتاؤ سے تکلیف تو بہت ہوئی تھی اور جی چاہا کہ اب دوبارہ ان سے نہ ملوں مگر پھر خیال آیا کہ اردو میری مادری زبان ہے۔ صرف مولانا صاحب کی تو نہیں ہے۔ اور اگر اب سمجھوتہ ہو جاتا ہے تو ہندوستان میں اردو کے لیے جگہ رہے گی۔ دوسری طرف اردو کو بچانے کے لیے پاکستان بنایا جا رہا تھا۔ تاکہ اردو کو ایک وطن مل جائے۔ یہی میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سندھ میں سندھی، بنگال میں بنگالی۔ اسی طرح پنجابی اور پشتو وغیرہ ہیں۔ وہ لوگ اپنی زبان چھوڑ کر اردو کو کیوں قبول کریں گے؟ اردو کو اس کے وطن میں ہی جگہ ملنی چاہیئے۔ یہی وقت ہے جب کہ اردو کے لیے جگہ بنائی جا سکتی ہے۔ اسی جذبہ کے تحت میں نے پھر سلسلہ جنبانی کی۔ جس کے نتیجہ میں باپو نے مولانا

صاحب کو خطوط لکھے۔ پنڈت سندرلال جی تو بالکل گھر کے بزرگوں کی طرح ساتھ دے رہے تھے۔
یہاں تک کہ میں مولانا صاحب کی شکایت بھی انھیں سے کرتی تھی۔ وہ ہنس ہنس کر مجھے تسلی دیتے تھے۔
صرف اُن سے ہی اردو کے معاملہ میں ہر بات کھُل کر کہی اور سوچی جا سکتی تھی۔

مولانا صاحب کا برتاؤ برسوں میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ایک دفعہ ایک صاحب جو مولانا عبدالحق صاحب کو کافی قریب سے جانتے تھے۔ اُن سے ذکر آگیا۔ انھوں نے مولانا صاحب اور میرے خطوط پڑھے۔ پھر سوال کیا ـــــ "انجمن کی ریڈروں کا کیا ہوا؟"

میں نے جواب دیا کہ ریڈریں محکمہ تعلیم میں داخل ہی نہیں ہو سکیں۔ اس کی اطلاع میں نے مولانا صاحب کو اپنے خط میں دیدی تھی۔ اور یہ بھی لکھ دیا تھا کہ باقی صاحب نے بتایا تھا کہ آپ نے کسی کے ہاتھ ریڈریں ناگپور بھیج دی ہیں۔ مگر وہ اب تک محکمہ میں داخل نہیں ہوئی ہیں۔ جلدی ریڈریں محکمہ کو بھیج دیں۔ مگر وہ آخری وقت تک محکمہ میں داخل نہیں ہو سکیں۔

اُن صاحب نے پھر دریافت کیا ـــــ "مولانا صاحب نے کس کے ہاتھ کتابیں بھیجی تھیں؟" میں نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم ـــــ اُن صاحب کا نام نہ باقی صاحب نے بتایا اور نہ مولانا صاحب سے میں نے دریافت کیا۔

وہ ہنسنے لگے۔ بولے بس یہاں سے ہی غلط فہمی کا آغاز ہوا ہوگا۔ اللہ جانے؟

غالباً مہاتما جی کی فرمائش پر میں سیوا گرام آشرم سے پنڈت سندرلال جی کو الہ آباد خط لکھ چکی تھی۔ یا دہلی سے لکھا۔ بہر حال وہ دہلی آئے۔ میں میرٹھ سے آئی اور مولانا عبدالحق صاحب کی موجودگی میں جو کچھ طے ہوا تھا وہ میں نے باپو کو ۲۱ر نومبر ۱۹۴۱ء کو لکھ دیا تھا۔

مجھے خیال بھی نہیں تھا کہ کبھی یہ خطوط شائع بھی کیے جائیں گے۔ یہ نقش اول ہے۔ جو خط باپو کو بھیجا تھا وہ ظاہر ہے کہ اس سے بہتر ہوگا۔

Sunder Kot
Meerut.
21. 11. 1941.

My dear Mahatmaji,

I reached safely Nagpur,

Delhi and now Meerut.
At Delhi I met Molana Abdul Haq Sahib. I am glad to say that he agreed to all those points, about the national language of India, which I have discussed with you before-hand.

I think there should not be any controversy about the first four points, which are as follows:

1. Indias' national language will be called only Hindustani.
2. And it is that language, which is commonly spoken by northern India Hindus and Muslims; and it is written in Hindi and urdu script.
3. All those Persian and Arabic words which are used by good (standard) Hindi writers and all those Hindi words which are used by good urdu writers, must be taken in the national language. (Babu Rajendra Prasad is of the same opinion).

4. A committee will be formed of Hindi and urdu knowing scholars of admitted ability. This committee will decide about each word, expression and idiam of the national language and this committee will be entrusted with the task of compiling a dictionary of the national language.

The fifth point, which molana sahib has added is as follows. I put it in the exact words.

کوئی کانگرس کا ممبر کسی ایسی انجمن یا جماعت کا ممبر نہیں ہو سکے گا۔ جو قومی زبان کے بارے میں اوپر لکھی ہوئی پالیسی کو پوری طرح پر نہ مانتی ہو۔ یا جس کا اصول یا عمل اسکے خلاف ہو۔

I shall be deeply grateful to you, Mahatamaji, if you honour me with your view-point on the above.

Slams to all.

With respect,
Yours affectionatly
Sultana Kazia.

۲۵ نومبر کو باپو کا خط سیواگرام سے آگیا جو درج ذیل ہے۔

اس ورق کے علاوہ ایک ورق اور بھی تھا جس پر دونوں طرف لکھا ہوا تھا اور باپو کے دستخط بھی تھے۔ مجھے سخت رنج ہے کہ وہ ورق کھو گیا۔ لیکن مولانا صاحب، پنڈت سندر لال جی اور میرے خطوط سے معلوم ہو سکتا ہے کہ باپو نے کیا لکھا تھا۔

સેવાગ્રામ 25-11-41 سیواگرام سیواگرام
વર્ધા સી.પી. وردھا- سی- پی وردھا- سی- پی
10859

My dear Sultana,
I was delighted to have your letter.
The four propositions you have laid down with the approval of the Maulvi Sahib are sound. But how to secure unanimous acceptance of them is the question

10859
[illegible]

My [illegible]
for [illegible]
If you [illegible]

[illegible] to [illegible]
by [illegible]
the next step for us
is to meet & discuss
the ways & means
of he can take
the [illegible] to [illegible]
[illegible], this is a [illegible]
[illegible] on Rajaram
[illegible]

باپو کا ۲۵ر نومبر ۱۹۴۱ء کا خط آنے کے بعد میں نے اس کی اطلاع پنڈت سندر لال جی اور مولانا صاحب کو لکھ دی تھی۔ ان خطوط کی نقلیں رکھنے کا تو خیال بھی نہ تھا بلکہ خط صاف لکھا جائے اس لیے اصلی خط کا یہ نقش اوّل ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اصلی خطوط جو ان صاحبان کو تحریر کیے ہیں۔ ان میں عبارت کچھ مختلف ہو مگر مطلب یہی تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے لیے نقل کرنا بڑا مشکل ہے۔ ہر دفعہ کچھ نہ کچھ تبدیلی ہو جاتی ہے۔

یکم دسمبر ۱۹۴۱ء

اندر کوٹ۔ میرٹھ

جناب پنڈت جی آداب عرض ہے۔

پتا نہیں آج کل آپ کا قیام کہاں پر ہے۔بہر حال انجمن ترقی اردو کی معرفت آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ خدا کرے کہ آپ تک پہنچ جائے۔

میں نے اردو اور ہندی کے جھگڑے کے سلسلہ میں جو پانچ بنیادی شرائط مولانا صاحب اور آپ کی موجودگی میں آپ سب کے مشورے سے لکھی تھیں۔ مہاتما جی کو میرٹھ پہنچنے کے بعد بھیج دی تھیں۔ مہاتما جی کا خود اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا خط آیا ہے۔ جس میں کہ انھوں نے پہلی چار باتوں کو تسلیم کر لیا ہے۔آپ کی یاد دھانی کے لیے اُن کو لکھتی ہوں۔

(۱) ہندوستان کی قومی زبان صرف ہندوستانی کہلائے گی۔

(۲) اور یہ وہ زبان ہے جسے شمالی ہندوستان کے ہندو مسلمان مشترکہ طور پر بولتے ہیں۔اور یہ اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔

(۳) ہندی اور اردو کے چند مستند عالموں کو ملا کر ایک کمیٹی بنائی جائے گی۔یہ کمیٹی ہندوستانی زبان کے ہر لفظ اور جملہ کے متعلق تحقیق کر کے طے کرے گی۔اور قومی زبان کی ڈکشنری بنانا اسی کمیٹی کے سپرد ہوگا۔

(۴) فارسی اور عربی کے تمام وہ الفاظ جن کو اچھے اور مسلم الثبوت ہندو مصنفوں نے استعمال کیا ہے اور تمام وہ ہندی الفاظ جو کہ بڑے مسلمان مصنفوں نے اپنی کتابوں میں لکھے ہیں۔ قومی زبان میں شامل کیے جائیں گے۔

مہاتما جی کا خیال ہے کہ جب وہ اور مولانا صاحب ان اصولوں کو قومی زبان کی بنیاد سمجھتے ہیں۔تو اب یہ دونوں مل کر باہمی سمجھوتے سے ایسی باتیں سوچیں۔جن سے کہ ان بنیادی اصولوں کو عوام کے اندر بھی مقبولیت حاصل ہو جائے۔اس لیے مہاتما جی چاہتے ہیں کہ مولانا صاحب سیواگرام تشریف لائیں وہاں پر پانچویں شرط بھی طے ہو جائے گی۔کیوں کہ اس میں کئی باتیں تشریح طلب ہیں۔وہ یہ ہے:۔

(۵) کوئی کانگریس کا ممبر کسی ایسی انجمن یا جماعت کا ممبر نہیں ہو سکے گا۔ جو قومی زبان کے بارے میں اوپر لکھی ہوئی پالیسی کو پوری طرح پر نہیں مانتی ہو۔ یا جس (ممبر) کا اصول یا عمل اس کے خلاف ہو۔

غالباً آپ کو یاد ہو گا۔ یہ پانچویں شرط آپ نے بولی اور میں نے لکھی تھی۔ میں نے تقریباً اس ہی مضمون کا خط مولانا صاحب کو دہلی لکھا ہے۔ کیوں کہ مہاتما جی نے مجھے تحریر فرمایا ہے کہ میں مولانا صاحب سے سیوا گرام جانے کے متعلق دریافت کر کے ان کو مولانا صاحب کے جواب سے مطلع کروں۔

میں آپ کو یہ خط اس امید کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ آپ ایسا موقع ہرگز نہیں آنے دیں گے۔ جس سے کسی کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ اردو والے ہی صلح کرنا نہیں چاہتے۔ دوسرے میری آپ سے ایک درخواست ہے۔ وہ یہ کہ مولانا صاحب کے ساتھ آپ کا جانا بہت ضروری ہے۔ آپ ضرور جائیں میں آپ کے جواب کی منتظر رہوں گی کہ آپ نے اس سلسلہ میں کیا فیصلہ کیا۔

سلطانہ قاضیہ

یکم دسمبر کو میں نے مولانا صاحب کو بھی خط تحریر کیا تھا۔ بہر حال یہ نقش اول ہی سہی۔ مگر اس اہم خط و کتابت کی کڑی سے کڑی ملاتا ہے۔

اندر کوٹ میرٹھ

یکم دسمبر ۱۹۴۱ء

جناب مولوی صاحب تسلیم

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

میں نے آپ کے دولت خانہ پر اردو اور ہندی تنازعہ کے سلسلہ میں صلح کے لیے جو پانچ شرائط پنڈت سندر لال جی اور آپ کے مشورے سے لکھی تھیں۔ میرٹھ آ کر میں نے ان کو مہاتما جی کے پاس بھیج دیا تھا۔ پرسوں مہاتما جی کا خط آیا۔ جس میں کہ انھوں نے پہلی چار شرائط کو تسلیم کر لیا ہے۔ اور وہ شرائط مندرجہ ذیل ہیں۔

چوں کہ آپ اور مہاتما جی قومی زبان کے ان چار بنیادی اصولوں پر متفق ہیں۔ اس لیے مناسب

معلوم ہوتا ہے کہ اسی سلسلہ میں دوسری عملی باتیں بھی طے ہو جائیں۔ اس کے لیے مہاتما جی چاہتے ہیں کہ آپ سیوا گرام جانے کی تکلیف فرمائیں تاکہ ان بنیادی اصولوں کو عوام میں بھی مقبولیت حاصل ہو جائے۔ مہاتما جی نے تحریر فرمایا ہے کہ میں آپ سے اس تجویز کے متعلق دریافت کر کے ان کو آپ کے جواب سے مطلع کروں مجھے امید ہے کہ آپ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں دیں گے کہ صلح کرنے میں اردو والوں نے کوتاہی کی۔ اب رہی پانچویں شرط تو مہاتما جی کا خیال ہے کہ اس کو مل کر طے کر لیا جائے۔ کیوں کہ اس میں کئی چیزیں تشریح طلب ہیں۔

جواب کی منتظر رہوں گی۔ سلطانہ قاضیہ

مجھے مولانا صاحب کا تحریر کردہ خط بتاریخ ۸ر دسمبر ۱۹۴۱ء ملا۔ جس میں انھوں نے صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ مجھے دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۔ دریا گنج، دہلی

مورخہ ۸ر دسمبر ۱۹۴۱ء

مکرمہ قاضیہ سلطانہ صاحبہ

آپ کا خط مورخہ یکم دسمبر وصول ہوا۔ میں اس قدر مصروف تھا کہ اس کا جواب نہ لکھ سکا۔ اس تاخیر کی معافی چاہتا ہوں۔

وہ چار اصول جن کے متعلق گاندھی جی نے اتفاق ظاہر کیا ہے کوئی نئے نہیں ہیں۔ میں نے سب سے اوّل یہ تجویز آل انڈیا اورئنٹیل کانفرنس منعقدہ بڑودہ (دسمبر ۱۹۳۳ء) میں اپنے خطبۂ صدارت میں پیش کی تھی۔ نیز اس بیان میں جو بابو راجیندر پرشاد صاحب اور میں نے مشترکہ طور پر شائع کیا تھا تقریباً یہی اصول درج تھے۔ لیکن اس کا کیا نتیجہ ہوا؟ کچھ بھی نہیں بابو راجیندر پرشاد صاحب نے جو حال میں تقریریں فرمائی ہیں اُن سے ظاہر ہے کہ وہ ہندی ہی کو ملک کی عام زبان سمجھتے یا بنانا چاہتے ہیں۔ پانچویں شرط ہم نے اس لیے لگائی تھی کہ جب تک وہ منظور نہ کی جائے گی کوئی عملی نتیجہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ پنڈت سندر لال صاحب مختلف اوقات میں ہفتوں اور مہینوں سیگاؤں میں رہ کر آئے اور برابر کوشش

کرتے رہے۔ ڈاکٹر تاراچند گاندھی جی کے فرمانے پر ایک ہفتہ وہاں رہے اور اس بارے میں گفتگو کرتے رہے دونوں ناکام واپس آئے۔ اب میں جاؤں گا تو کیا کرلوں گا۔ گاندھی جی اگر یہ سمجھتے ہیں کہ اردو ہندی تنازعہ کا رفع کرنا ملک کے حق میں مفید ہوگا اور وہ سچے دل سے اس کے لیے آمادہ ہیں تو انھیں براہ راست اس کے متعلق کارروائی اور مجھ سے مراسلت کرنی چاہیے۔ بیچ میں کسی واسطہ کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ اس سے بہت کچھ غلط فہمی کا اندیشہ ہے اور تاویل اور توجیہہ کی بہت بڑی گنجائش نکل آتی ہے۔ اور تاویل کرنے میں گاندھی جی بڑے ماہر ہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ فساد گاندھی جی کا بڑھایا اور پھیلایا ہوا ہے۔ اس سے پہلے یہ صرف ایک دو علاقوں میں محدود تھا۔ لیکن جب گاندھی جی نے ہندی کو ملک کی عام اور مشترکہ زبان بنانے کا اعلان کیا تو سارے ملک میں آگ سی لگ گئی۔ اب یہ زہر اس قدر پھیل چکا ہے کہ گاندھی جی کے مٹائے بھی نہیں مٹ سکتا۔ اور یہ اُن کے بس کی بات نہیں رہی۔ ایک وقت تھا کہ وہ اس جھگڑے کو آسانی سے مٹا سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے اس کی قدر نہ کی اور وقت ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ غلط راستے پر چلے اور نتیجہ یہ ہوا کہ آج اگر وہ چاہیں بھی تو کچھ نہیں کر سکتے۔ بہر حال کوشش کرنے میں کوئی ہرج نہیں کوشش کرنا ہمارا فرض ہے۔

جب گاندھی جی کی کوئی تحریر آئے گی تو اس پر میں اور میرے رفیق بڑی خوشی سے غور کریں گے۔

عبدالحق

مولانا صاحب کا یہ خط پڑھ کر مجھے تکلیف تو ہوئی لیکن میں نے اردو کے کام کو مقدم سمجھتے ہوئے باپو کو ایک خط لکھا جس کا عکس درج ذیل ہے۔

I acknowledged
II Bihar

~~My dear Bapu~~

~~I was so glad to receive your very kind letter, which I have already acknowledge through Bihar Amtul Slam~~

~~I hope, Bapu, that you and others~~

in the ashram are well and happy.
I pray for your long life, health and happiness (Success)

I am ~~my self feeling~~ well and my stay with you at Sevagram which you so kindly permited has done me a lot of good.

I received today a letter from Molana Abdul Huq Sahib from Delhi. He desires that the correspondence on the subject of the National language should be direct between you and him. He says in his letter that correspondence through others ~~(in this case myself)~~ leads to misapprehentions. He therefore desires that you should very kindly correspond on this subject direct with ~~him~~.

He seems quite agreed on the main points of the matter.

Do kindly be good enough to let me know about the future develop-ments in this matter, if any.

with Salams to all and high regard to you and Bapu I beg to remain your

affectionate

Sultana

پنڈت سندرلال جی کا خط الہ آباد سے موصول ہوا۔ جیسا کہ اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ میں اس سلسلہ میں کام کرتی رہوں۔

مورخہ ۱۶ر دسمبر ۱۹۴۱ء

عزیز بہن سلطانہ قاضیہ

سلام

آپ کا یکم دسمبر کا خط مجھے آج اسی وقت یہاں الہ آباد میں ملا۔ ۱۱ اور ۱۲ تاریخ کو میں دہلی تھا۔ اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو میں وہاں آپ سے اور مولانا عبدالحق صاحب سے دونوں سے گفتگو کر لیتا۔ خیر ابھی اتنی جلدی نہ میں مولانا سے صلاح کر کے جواب دے سکتا ہوں اور نہ کوئی خاص رائے قائم کر سکتا ہوں۔ لیکن فی الحال جو میری رائے ہوتی ہے وہ یہ ہے۔ اگر مہاتما جی ان چار باتوں کو بنیادی طور پر تسلیم کرتے ہیں تو میری رائے میں وہ فوراً اس مضمون کا ایک خط مولانا عبدالحق کو خود تحریر کریں۔ اُس میں اِن چاروں چیزوں کو صاف کر دیں اور مولانا کو لکھیں کہ اگر وہ ان بنیادی چیزوں کو مزید گفتگو کے لیے کافی اور درست سمجھتے ہوں تو سیواگاؤں آنے کی تکلیف گوارہ کریں۔ آپ کو یاد ہوگا جب دہلی میں مولانا صاحب سے گفتگو ہو رہی تھی تب بھی اُن کی اس سے تسلی نہ تھی کہ مہاتما جی آپ کی یا کسی دوسرے کی وساطت سے گفتگو کریں۔ وہ براہِ راست گفتگو کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ میرا ابھی خیال ہے کہ

چوں کہ مہاتماجی بزرگ ہیں ان کی اپنی تحریر کا اثر بالکل دوسرا ہوگا۔ اور اس طریقہ سے آئندہ کی راہ نکل آویگی۔ رہا میرا سیواگاؤں جانا وہ بھی اگر مہاتماجی مجھے طلب کریں گے تو فوراً پہنچ جاؤں گا۔ انھیں یہ معلوم بھی ہے اور اگر مولانا مجھے اپنے ہمراہ لے جانا ضروری خیال کریں گے تو ان کی خدمت کے لیے بھی حاضر رہوں گا۔ مجھے جواب سے اطلاع دیں گی مولانا نے آپ کو کیا جواب دیا اور آپ نے آئندہ کیا قدم اٹھایا۔

فقیر سندرلال ۱۶ر دسمبر ۱۹۴۱ء

اسی اثنا میں مجھے باپو کا کارڈ ملا۔ جس کا عکس درج ہے۔ مہاتماجی چاہتے تھے کہ میں پھر سیواگرام جاؤں۔

10860

Bardoli 17 12-41

My dear Sultana,

I have your letter. I will write to Maulana Sahib. You have to come again.

Love

Bapu

۲۱ر دسمبر ۱۹۴۱ء کو میں نے ایک خط پنڈت سندرلال جی کو لکھا جو ذیل میں درج ہے۔ اس عرصہ میں پنڈت جی دہلی آئے تھے اور مجھے مطلع بھی کیا تھا۔ ڈاکٹر داور صاحب جن کے گھر پر پنڈت جی دہلی میں قیام کرتے تھے۔ انھوں نے یاد پڑتا ہے کہ مجھے پنڈت جی کے دہلی آنے کی اطلاع بھی دی تھی۔ کیوں کہ اس خط میں میں نے معذرت کی ہے۔

اندرکوٹ۔ میرٹھ۔

۲۱ دسمبر ۱۹۴۱ء

محترم مکرم۔۔۔ تسلیم

آپ کا خط الہ آباد سے آیا۔ بہت شکریہ آپ نے دریافت فرمایا ہے کہ اردو ہندی کے تنازعہ کے سلسلہ میں کیا ہو رہا ہے۔ جواباً عرض کرتی ہوں کہ میں نے مولانا

صاحب کو مطلع کر دیا تھا کہ مہاتما جی ان چار بنیادی باتوں کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ مولانا صاحب نے جواب دیا کہ وہ چاہتے ہیں کہ وہ خود ان کو لکھیں۔ میں نے مولانا صاحب کا یہ پیغام ان تک پہنچا دیا تھا۔

پرسوں مہاتما جی نے مجھے لکھا کہ وہ اس سلسلہ میں ایک خط مولانا صاحب کو دہلی بھیج رہے ہیں۔

دیکھئے مولانا صاحب کیا جواب دیتے ہیں۔

اگر آپ مجھے اپنے تبدیل مقام سے مطلع کرتے رہیں تو بہت عنایت ہوگی۔ کیوں کہ پھر میں آپ کو بوقت ضرورت خط لکھ سکوں گی۔ امید ہے کہ آپ بخریت ہوں گے۔

زیادہ آداب

خاکسار

سلطانہ قاضیہ

مورخہ یکم جنوری ۱۹۴۱ء

محترم پنڈت جی .... تسلیم!

امید ہے کہ آپ بخریت ہوں گے۔

مجھے آپ کا خط ملا تھا۔ بہت شکریہ۔ اس عرصہ میں کوئی خاص بات سوائے اس کے نہیں ہوئی کہ مولانا عبدالحق صاحب نے باپو سے سیوا گرام جانے کا وعدہ فرما لیا ہے۔ اور تاریخ کا ابھی طے نہیں ہوا۔

البتہ میں آپ سے ایک خاص بات کہنا چاہتی تھی۔ وہ یہ کہ میرا خیال ہے۔ ممکن ہے کہ غلط ہو۔ بہ ہر حال میں یہ سمجھتی ہوں کہ اردو ہندی کے جھگڑے کو ختم کرنے کی یہ بہت دنوں کے لیے آخری کوشش ہے۔ مولانا صاحب خصوصاً اور دوسری طرف مہاتما جی وغیرہ سب اس سے گھبرا اٹھے ہیں۔ اگر خدا نہ خواستہ یہ ابھی طے نہ ہو تو اس قصّہ کا سلجھنا مشکل ہو جائے گا ـــــ دوسری طرف میں سمجھتی ہوں کہ مولانا صاحب سے اس معاملہ میں گفتگو کرنے میں آپ کی موجودگی انتہائی ضروری ہے۔ اس لیے آپ مجھے مطلع کیجیے کہ اب تک سیوا گرام سے یا مولانا صاحب کے پاس سے آپ کے پاس کوئی خط آیا ہے یا نہیں۔

مجھے مطلع کریں کہ کیا آپ بھی سیوا گرام جا رہے ہیں؟ میرے خیال میں تو آپ کی شرکت اردو ہندی کے متعلق سمجھوتا کرانے میں انتہائی ضروری ہے۔ میں آپ کے جواب کی منتظر ہوں۔ عنایت

مابعد :- یادفرمائی کا شکریہ!

میں ضرور حاضر ہوتی۔ مگر اس دوران میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ جس کے لیے میں آپ کا وقت لیتی۔

سلطانہ قاضیہ

مجھے میرٹھ میں مولانا صاحب کا ۱۰؍جنوری ۱۹۴۲ء کا تحریر کردہ خط موصول ہوا۔ اس کا عکس درج ہے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۔ دریا گنج دہلی۔

مورخہ ۱۰؍جنوری ۱۹۴۲ء

مکرمہ سلطانہ قاضیہ صاحبہ۔

گاندھی جی کا خط بردولی سے میرے پاس آیا۔ انھوں نے بات چیت کرنے کے لیے سیوا گرام بلایا ہے۔ میں جاؤں گا لیکن ابھی کسی تاریخ کا تعین نہیں کیا۔

عبدالحق

جناب مولوی صاحب آداب عرض ہے۔

آپ کا خط ملا۔ بہت شکریہ!

مجھے یہ معلوم ہوکر بہت خوشی ہوئی کہ آپ سیوا گرام جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ خدا کرے کہ اب مہاتما جی اور آپ کے درمیان کوئی سمجھوتا ہوجائے۔ کیا آپ کے ساتھ پنڈت سندر لال جی بھی وردھا تشریف لے جائیں گے۔

سلطانہ قاضیہ

اس کے بعد پنڈت جی کا خط آیا جس کا عکس درج ہے۔ میں پنڈت جی سے ملنے دہلی گئی تھی۔ پنڈت جی مسلسل میری ہمت افزائی کرتے رہتے تھے۔

معرفت ڈاکٹر ایم سی داور

کوناٹ پلیس، نئی دہلی۔

مورخہ ۱۷؍جنوری ۱۹۴۲ء

مجی۔ تسلیم سلطانہ قاضیہ

میں چند روز سے دہلی ہوں۔ مولانا عبدالحق صاحب سے ملاقات کی امید نہیں۔ یہاں آکر معلوم ہوا وہ حیدر آباد گئے ہیں۔ ایک خط اسی سلسلے میں گاندھی جی کا بھی ملا تھا۔ میں ابھی کم از کم دو تین روز یہاں اور ضرور رہوں۔ اگر آسانی سے ممکن ہو تو چند گھنٹے کو تشریف لے آئیے۔ حالات معلوم ہو جائیں گے۔ ورنہ معاملات نے اس وقت تک جو کچھ ترقی کی ہے اُس سے اوپر کے پتا پر مطلع کریں۔ زیادہ دُعا۔

خیر اندیش

فقیر سُندر لال

۲۰ر جنوری ۴۲ء کا مولانا عبدالحق صاحب کا تحریر کردہ خط ملا۔ جس کا عکس درج ذیل ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے اس کے بعد اردو ہندی کے سلسلہ میں کوئی سلسلہ جنبانی نہیں ہوئی۔

مورخہ ۲۰ر جنوری ۱۹۴۲ء

مکرمہ۔ ۔ ۔ تسلیم

پنڈت سندر لال صاحب سے اس بارے میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی اس لیے میں نہیں کہہ سکا کہ وہ میرے ساتھ جائیں گے یا نہیں۔

خیر طلب

عبدالحق

ادھر تو مہاتما جی، مولانا صاحب اور پنڈت سندر لال جی وغیرہ سے خط و کتابت چل رہی تھی۔ دوسری طرف میں نے ان لوگوں سے ملنا شروع کر دیا جو کہ ناگپور میں ہندی ساہتیہ کے سمیلن کے جلسہ منعقدہ ۳۶-۱۹۳۵ء میں موجود تھے۔ جن سے ملنے کے لیے مہاتما جی نے کہا تھا۔ مجھے اس قیامت خیز جملہ کے متعلق سخت فکر تھی۔ کہ سچ کس طرف ہے۔ اس خیال نے مجھے کافی پریشان کر دیا تھا۔

ایک طرف مہاتما گاندھی جیسی شخصیت، دوسرے مجھے اُن کے ساتھ رہتے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ اور جس قدر میں اُن کو قریب سے دیکھ رہی تھی۔ میری عقیدت بڑھ رہی تھی۔ جی میں آیا کہ میں بھی اُن کو سب کی طرح باپو کہنے لگوں۔ مگر پھر دل نے کہا کہ عبدالحق صاحب نے اردو کے لیے بہت کام کیا ہے۔ بچپن سے اُن کا نام سُن رہی ہوں یہ جملہ دہرایا جا رہا ہے کہ اردو مسلمانوں

کی زبان ہے اور قرآن پاک کے رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ اردو کے سب اخبارات، مولانا صاحب، انجمن ترقی اردو ہند جس کے پلیٹ فارم سے یہ جملہ ہر گھڑی دہرایا جارہا ہے۔ سب غلط ہوں۔ سچ کس کی طرف ہے۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی جب میں سیوا گرام میں تھی تو مجھے باپو کے آزاد ہندوستان کی زبان کے متعلق لکھے ہوئے کئی مضامین ملے تھے۔ جو ان کے موقف کو واضح کرتے تھے۔ پھر میں جب میرٹھ میں تھی تو جواہر لال جی میرٹھ آئے۔ اس وقت مجھے ان سے اس موضوع پر گفتگو کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ اس وقت کانگریس کے ورکرس کی لگائی ہوئی ایک نمائش کا غالباً افتتاح کرنے یا دیکھنے جا رہے تھے۔ کارکن اعلیٰ مسز کیلاش وتی سود صاحبہ اور دیگر بہنوں نے بڑی محنت سے یہ نمائش لگائی تھی۔ میں نے یہ بات جیسے کہی۔ وہ رُک گئے۔ مجھے لے کر مجمع سے ہٹ کر کھڑے ہوگئے۔

یہ تحریر کرنا ضروری ہے کہ میرے دادا ابا قبلہ قاضی نجم الدین صاحب مرحوم میرٹھ شہر کانگریس کمیٹی کے صدر بہت لمبے عرصہ تک رہے۔ جب جواہر لال جی میرٹھ آتے تھے تو ابا جی ہم سب بہنوں کو ان سے ملانے کے لیے لے جاتے تھے۔ اس لیے مجھے ان سے باتیں کرنے میں آسانی ہوئی۔

میں نے جواہر لال جی کو پورا قصہ سنایا کہ کس طرح باپو کے متعلق یہ جملہ مشہور کیا جا رہا ہے کہ انھوں نے ناگپور کی میٹنگ میں کہا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔" جواہر لال جی نے بے چین ہو کر جواب دیا:۔

نہیں نہیں باپو ایسی بات کیسے کہہ سکتے ہیں؟ کبھی نہیں۔ انھوں نے ایسا نہیں کہا میں تو موجود تھا"۔۔۔ باپو ایسی نکمی بات کیسے کہہ سکتے ہیں؟" انھوں نے بہت ہی شفقت سے میرا شک دور کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد میں دہلی جا کر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور عابد حسین صاحب سے الگ الگ ملی۔ اور ناگپور کی میٹنگ کے متعلق دریافت کیا۔ سب نے بڑی وضاحت سے بتایا کہ اس میٹنگ میں باپو نے کبھی ایسا جملہ نہیں کہا۔ دوسرے یہ کہ اگر ایسا جملہ کہا ہوتا تو ان لوگوں کی طرف سے فوراً اعتراض ہوتا۔ وغیرہ

میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم اور عابد حسین صاحب مرحوم سے فرداً فرداً شکایت کی تھی۔ کہ جب آپ کو یہ یقین ہے کہ باپو نے یہ جملہ نہیں کہا تو پھر اخباروں میں آپ نے اس کی تردید کیوں

نہیں کی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب میرے ایسا کہنے پر تڑپ اٹھے اور بولے۔ کیا کوئی لکھے؟ پھر انھوں نے مجھے واردھا اسکیم کا واقعہ سنایا کہ جب انھوں نے باپو کی ہدایت پر واردھا تعلیمی اسکیم مرتب کر کے ملک کے سامنے پیش کی تو مسلم لیگ اور خصوصاً مسٹر جناح اور ان کے ساتھیوں نے جس میں لیاقت علی خاں صاحب بھی شامل تھے، اس اسکیم کی شدید مخالفت کی۔ ذاکر صاحب نے ان حضرات کو خطوط بھیجے کہ واردھا اسکیم میں جو قابلِ اعتراض حصے ہوں وہ بتائے جائیں تاکہ اسلام کی تعلیم کے خلاف جو بات ہو وہ اسکیم سے نکال دی جائے۔ نیز یہ کہ ڈاکٹر صاحب ان کو ہر طرح سے مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔ ان خطوط کا کوئی جواب نہیں آیا۔ ذاکر صاحب نے ہنس کر بتایا کہ کسی پارٹی میں ان کی ملاقات مسٹر جناح سے ہو گئی۔ انھوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور مسٹر جناح سے کہا کہ بتائیے آپ کو واردھا تعلیمی اسکیم میں کیا کیا خرابیاں نظر آئیں جو اسلام کے خلاف ہیں تاکہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مسٹر جناح نے جواب دیا کہ "ڈاکٹر صاحب میں نے واردھا اسکیم پڑھی نہیں ہے"۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کے کسی ممبر نے بھی جنھوں نے اس کی شدید مخالفت کی تھی، واردھا اسکیم کو پڑھا تک نہیں تھا۔

یہ تھے مسلم لیگ کے لیڈر! یہ قصہ سُنا کر ذاکر صاحب نے پھر صفائی پیش کی کہ باپو نے یہ جملہ اردو کے متعلق کبھی نہیں کہا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اب مجھے یقین آگیا کہ ذاکر صاحب، عابد حسین صاحب، کاکا صاحب، منشور والا جی، جواہر لال جی اور میرے باپو سچے ہیں اور انھوں نے یہ جملہ نہیں کہا تھا۔ اس کے بعد میں نے مہاتما جی کو باپو کہنا شروع کر دیا تھا۔

ہٹلر کی مین کاف اور مشہور کتاب Hitler puts the clock book پڑھنے کے بعد مجھے ہٹلر کے نسخہ پر یقین آگیا کہ جھوٹ اتنی بار دہراؤ کہو اور لکھو یہاں تک وہ سچ بن کر جی اٹھے۔

برلا ہاؤس میں ملاقات

ملک کے سیاسی حالات بہت تیزی سے بدل رہے تھے۔ سر اسٹوفر کرپس حکومتِ برطانیہ کی طرف

سے ہندوستانی لیڈروں سے سمجھوتہ کرنے کے لیے دہلی آئے۔ تو صدر کانگریس نے اپنی ورکنگ کمیٹی کے ممبران کو دہلی طلب کر لیا۔ باپو برلا ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں میرٹھ سے اُن سے ملنے کے لیے دہلی آئی۔ باپو بہت خوش ہوئے اور انھوں نے مجھے برلا ہاؤس میں دادا بھائی نوروجی کی سب سے چھوٹی صاحبزادی خورشید بہن کے ساتھ قیام کے لیے کہا۔ اُن کے ساتھ چند دنوں رہ کر میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ بڑی حسین خاتون تھیں۔

برلا ہاؤس میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کی برابر میٹنگیں ہو رہی تھیں۔ اور بھی کچھ اہم لوگ آئے ہوئے تھے۔ باپو سے ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اس کے باوجود جب بھی موقع ملتا تھا، باپو مجھ سے رابطہ کی زبان کے متعلق بات کر لیتے تھے۔ اور اُن کے مشورہ سے میں نے مولانا عبدالحق صاحب کو مدعو کر لیا۔ اور اس کی اطلاع ڈاکٹر عابد حسین صاحب کو بھی دی کہ وہ وقت مقررہ پر تشریف لائیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور پنڈت سندر لال جی دہلی میں نہیں تھے۔

حسب وعدہ مولانا عبدالحق صاحب مع ڈاکٹر عابد حسین صاحب اور شاید ایک دو حضرات اور تھے، ان سب کے ساتھ برلا ہاؤس پہنچ گئے۔ جب میں باپو کے کمرہ میں داخل ہوئی تو میں نے دیکھا کہ ایک گاؤ تکیہ کا سہارا لگائے باپو بیٹھے ہیں۔ ان کے داہنی طرف مولانا عبدالحق صاحب غصہ میں زور زور سے باتیں کر رہے ہیں۔ سر کی زوردار گردش کے ساتھ ترکی ٹوپی کا کالا پھندنا ہوا میں لہرا رہا ہے۔ ادب سے ڈاکٹر عابد حسین صاحب بیٹھے کبھی مولانا صاحب کو کبھی باپو کے پریشان چہرے کو دیکھ رہے ہیں۔ اور میں؟ میں سہم گئی۔ اپنے باپو کو اُن کے سوکھتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ رہی تھی۔ اُدھر مولانا کا چہرہ شہابی رنگت اختیار کر رہا تھا۔ اِدھر شاید ہم لوگوں کے چہروں کا رنگ اُڑا جا رہا تھا۔

مولانا صاحب کا غصہ دو باتوں پر تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ باپو نے اُردو کے ایک اہم مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ایک مجھ جیسی معمولی اور گم نام لڑکی کو کیوں چُنا۔ کیا اور کوئی پورے ہندوستان میں نہیں رہ گیا تھا؟ اس کا جواب باپو نے یہ دیا کہ اُس نے ہی یہ مسئلہ اُٹھایا اور پھر اس کی مسلسل کوشش دیکھ کر میں نے اُس کو ہی آپ کے پاس بھیج دیا تاکہ اردو اور ہندی کے مسئلہ کا کوئی حل نکل آئے۔

دوسری بات یہ تھی کہ مولانا صاحب باپو پر الزام لگا رہے تھے کہ اردو ہندی کا سارا جھگڑا انھیں کا ڈالا ہوا ہے۔ اس پہ بڑی سختی سے پھٹکار رہے تھے۔ عابد حسین صاحب کہنا چاہتے تھے کہ جو ہوا

سو ہوا۔ اب نئے سرے سے اس پر گفتگو کر لی جائے۔ مگر مولانا صاحب بار بار اسی کی تکرار کر رہے تھے۔ غالباً ۱۰۔ ۱۵ منٹ یا اس سے زیادہ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر بڑی کوشش کے بعد اصل مسئلہ کہ ہندوستان کی آئندہ قومی زبان کیا ہوگی، زیر بحث آیا۔ مولانا صاحب اسی پر اصرار کرتے رہے کہ ہندوستانی زبان کی وہی شکل ہوگی جو کہ وہ بولتے اور لکھتے ہیں۔ اور سمجھوتہ کی کوئی بات نہیں کی۔

جب میں نے محسوس کیا کہ اب گفتگو ختم ہو رہی ہے اور مولانا صاحب اٹھنے والے ہیں تو میں نے مولانا صاحب کی خفگی برداشت کرنے کو تیار ہو کر کہا کہ آپ نے جو جملہ اردو کے متعلق باپو سے منسوب کر کے کہا تھا کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مولانا صاحب میرا مطلب سمجھ گئے۔ اس کے بعد مولانا صاحب نہ معلوم کتنی دیر اپنے غصّہ کا اظہار کرتے رہے۔ جب ذرا دھیمے پڑے تو باپو بولے کہ میں نے یہ جملہ کبھی نہیں کہا۔ مولانا صاحب نے جواب دیا "کہا کیسے نہیں تھا؟ مولانا صاحب کو پھر غصّہ آگیا۔

مولانا صاحب جب ذرا خاموش ہوئے تو میں نے پھر کہا کہ میں نے اس جملہ کے متعلق ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، جواہر لال جی، ڈاکٹر راجیندر پرشاد جی، کاکا صاحب اور منشور والا جی سے فرداً فرداً دریافت کیا تھا اور سب نے وثوق کے ساتھ مجھے یقین دلایا کہ مہاتما جی نے ایسا کوئی جملہ نہیں کہا تھا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ عابد حسین صاحب موجود ہیں اُن سے بھی دریافت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"سب جھوٹے ہیں" مولانا صاحب نے بے دھڑک کہہ دیا۔

محفل پر سناٹا چھا گیا۔

مولانا صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ چوں کہ میں نے ہی مولانا صاحب کو مدعو کیا تھا اس لیے میں ان سب کو کار تک چھوڑنے کے لیے گئی۔ راستہ جو کافی لمبا تھا اس کو طے کرتے ہوئے ڈاکٹر عابد حسین صاحب نے دو ایک جملے میری ہمت افزائی کے لیے بھی کہے اور یہ قافلہ قومی زبان کا مسئلہ طے کیے بغیر چلا گیا۔ اس کے بعد کسی نے بھی اردو ہندی کے درمیان باعزت سمجھوتہ کی کوشش نہیں کی۔

اتنا اور یاد دلا دوں کہ آزادی وطن کے بعد جب قومی زبان کا مسئلہ ایوان حکومت میں آیا

کہ آزاد ہندوستان کی قومی زبان کیا ہونی چاہیئے۔ تو خود کانگریس کے ممبران جن کی اس وقت ایوان میں بھاری اکثریت تھی، دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک کی وکالت جواہر لال جی کر رہے تھے دوسرے کی وکالت ڈاکٹر راجیندر پرشاد جی کر رہے تھے۔ جواہر لال جی چاہتے تھے کہ ملک کی قومی زبان ہندوستانی تسلیم کی جائے جو کہ ہندی اور اردو دونوں رسم الخط میں لکھی جائے گی۔ اور ڈاکٹر راجیندر پرشاد جی ہندی کی وکالت کر رہے تھے جو کہ صرف ہندی رسم الخط میں لکھی جائے گی۔

اگر مولانا صاحب سمجھوتہ کر لیتے اور "ہندوستانی" پر فیصلہ ہو جاتا کہ آزاد ہندوستان کی زبان ہندوستانی ہوگی تو پھر جواہر لال جی ایوانِ حکومت سے ہندی کے بجائے 'ہندوستانی' کو ملک کی قومی زبان منوانے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ یاد رہے کہ پارلیمنٹ میں جب قومی زبان کے مسئلہ پر ووٹ پڑے تھے تو جواہر لال جی صرف ایک ووٹ سے ہار گئے تھے۔ اگر باپو اور مولانا صاحب کا سمجھوتہ ہو چکا ہوتا تو اس وقت ایسا ماحول تھا کہ کانگریس کے ممبران کی ایک بڑی اکثریت باپو کے سمجھوتہ کا احترام کرتی جس کے معنی یہ ہوتے کہ ہندوستانی، ہندی اور اردو دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی۔ اور اردو تعصب کا ایسا نشانہ نہیں بن سکتی تھی جیسا کہ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک اس کو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

۱۹۴۲ء اور اس کے بعد ماحول میں پاکستان بننے کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اردو بیلٹ پاکستان میں شامل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے اُردو کی محبت کا تقاضہ تھا کہ مولانا صاحب کسی اپنی پسند کے با اثر فرد کو باپو سے اردو ہندی مسئلہ پر سمجھوتہ کرنے کے لیے بھیج دیتے مگر ایسا نہیں کیا گیا اور باپو نے سچ کہتے کہتے سینہ پر گولی کھائی اور مولانا عبدالحق صاحب اردو کی محبت میں اُردو کی سرزمین چھوڑ کر وہاں چلے گئے جہاں کی زمین پر اردو کا تناور درخت اب تک جڑ نہیں پکڑ سکا ہے۔

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

مہاتما گاندھی — اردو — مولوی عبدالحق

مولوی عبدالحق اس صدی کے بابائے اردو ہیں۔ یہ لقب انھوں نے خود اختیار نہیں کیا تھا، بلکہ اردو زبان بولنے والوں نے، اردو کے تئیں عبدالحق کی خدمات کے اعتراف میں ان کو یہ خطاب دیا تھا۔ میرا موضوع ہے: "مہاتما گاندھی، عبدالحق اور اردو"۔ شروع ہی میں یہ عرض کردوں کہ مولوی عبدالحق نے جس اردو کے جمہوری حقوق کے لیے جدوجہد کی، وہ نہ اب ہمارے ادیب اپنی تخلیقات کے لیے استعمال کرتے ہیں، اور نہ اس زبان میں اخبارات نکلتے ہیں، اور نہ یہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ادبی پروگراموں کی زبان ہے۔ اردو رسالوں اور اخباروں میں یہ رسم خط دیکھنے کو ملتا ہے، لیکن یہ زندہ اردو زبان اخباروں اور رسالوں کے مضامین میں نہیں ہوتی۔ اردو اگر زندہ ہے، تو صرف اس وجہ سے کہ کروڑوں لوگ، جن میں سے زیادہ اَن پڑھ ہیں، یا اردو رسم خط سے واقف نہیں، یہ زبان گھروں اور بازاروں میں بولتے ہیں، اور اسی زبان میں ہندی کی اکثر فلمیں بنتی ہیں۔ اور ان فلموں کی زبان ہی ٹیلی ویژن کے اکثر اشتہاروں اور ان ناٹکوں کی زبان ہے، جو SOAP OPERAS کہلاتے ہیں، اور جو ہندی لپی ہی میں لکھے جاتے ہیں۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اردو کا ادبی محاورہ، روزمرے سے دور جا پڑا ہے۔ مولوی عبدالحق ادبی زبان اور بول چال کی زبان کے درمیان دوئی کی دیواریں گرا دینے کے حق میں تھے۔ منشی پریم چند اور مولوی عبدالحق کی تحریروں کی زبان اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

لسانیات کے مسلمات میں سے یہ بات ہے کہ زبان کا تعلق نہ تو نسل سے ہوتا ہے، اور نہ مذہب سے۔ ادبی تخلیقات کا تو طبقاتی کردار ہو سکتا ہے جس کی وجہ ادیب کا طبقہ نہیں، بلکہ اس کا نظریہ ہوتا ہے۔ زبان کا کوئی طبقاتی کردار نہیں ہوتا۔ ایسا ہوتا، تو زبان ترسیل اور ابلاغ کا ذریعہ نہیں بن سکتی تھی — اور یہی اس کا مقصد بھی ہے اور اس کے وجود کی وجہ بھی۔

گاندھی جی لسانیات کے ماہر نہ تھے۔ لسانی قضیے یا مسئلے کے سلسلہ میں ان کے خیالات سرسری اور

نامعتبر معلومات پر اور بڑی حد تک لسانی عصبیت کے شکار مشیروں کے غلط مشوروں کا نتیجہ تھے۔ گاندھی جی نے زبان کو ایک سیاسی حربے کے طور پر استعمال کرنا چاہا، لیکن وہ خود اپنے مشیروں کا آلۂ کار بن گئے۔ اُن کے مشیروں میں پرشوتم داس ٹنڈن اور کنہیالال منشی شامل تھے۔

ہند سوراج[1] ۱۹۰۹ء، ص ۱۲۴، قومی زبان کے تصوّر کے بارے میں گاندھی جی کا یہ بیان ہے:

"ہر ایک پڑھے لکھے ہندستانی کو اپنی زبان کا، ہندو کو سنسکرت، مسلمان کو عربی، پارسی کو فارسی کا، اور سب کو ہندی کا گیان ہونا چاہیئے۔ کچھ ہندوؤں کو عربی، اور کچھ مسلمانوں اور پارسیوں کو سنسکرت سیکھنی چاہیے۔ اُتر اور پچھم میں رہنے والے ہندستانیوں کو تامل سیکھنی چاہیئے۔ سارے ہندستان کے لیے تو ہندی ہی ہونی چاہیئے اردو یا ناگری لکھاوٹ میں لکھنے کی چھوٹ دینی چاہیئے۔ ہندو مسلمانوں کے وچاروں کو ٹھیک رکھنے کے لیے بہتیرے ہندستانیوں کو انگریزی لکھاوٹیں جاننا ضروری ہے۔ ایسا ہونے پر ہم اپنے آپس کے بیوہار میں سے انگریزی کو باہر نکال سکیں گے۔"

۱۹۱۸ء میں ہندی ساہتیہ سمّیلن کا آٹھواں اجلاس ہوا۔ خطبۂ صدارت گاندھی جی نے پڑھا، انھوں نے جن نکتوں پر زور دیا، ان میں یہ بھی ہے[2]:

"ساہتیہ کا دائرہ، بھاشا کی بھومی جاننے پر ہی طے ہو سکتا ہے۔ اگر ہندی بھاشا کی بھومی صرف اُتری صوبہ ہوگی، تو ساہتیہ کا دائرہ تنگ رہے گا۔ اگر ہندی بھاشا راشٹر بھاشا ہوگی، تو ساہتیہ کی پھیلاوٹ بھی راشٹری ہوگی۔۔۔ ہندی بھاشا، وہ بھاشا ہے، جس کو اُتر میں ہندو اور مسلمان بولتے ہیں، اور جو ناگری یا فارسی لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہے، یہ ہندی ایک دم سنسکرت لدی نہیں ہے، نہ وہ ایک دم فارسی شبدوں سے لدی ہوئی ہے۔۔۔ ہندوؤں کی بولی سے فارسی شبدوں کو بالکل الگ کرنا، اور مسلمانوں کی بولی سے سنسکرت کو بالکل الگ

---

[1] بحوالہ گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ، مترجمہ عشرت علی صدیقی (اترپردیش اردو اکاڈمی: ۱۹۸۰ء، ص ۱۳۱

[2] مشترکہ زبان (مہاتما جی نے کیا سوچا تھا)، قاضی عبدالغفار: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۵۰ء) ص ص: ۶۹-۱۰

کر دینا غیر ضروری ہے۔ ۔ ۔ مسلمان بھائی عربی لکھاوٹ میں ہی لکھیں گے۔ ہندو دیوناگری میں لکھیں گے۔ ۔ ۔ ہندوؤں کو فارسی شبد تھوڑے بہت جاننے پڑیں گے۔ مسلمان بھائیوں کو سنسکرت شبدوں کا گیان حاصل کرنا پڑے گا۔ ۔ ۔ ہم جانتے ہیں کہ مسلمان بھائیوں کی تو اردو ہی راشٹر بھاشا ہے۔ اس بات سے یہ بھی آسانی کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ ہندی یا اردو مغلوں کے زمانے سے راشٹر بھاشا بنتی جاتی تھی۔"

اس خطبے میں گاندھی جی نے نہ صرف یہ کہا کہ "ہم جانتے ہیں کہ مسلمان بھائیوں کی تو اردو ہی راشٹر بھاشا ہے" بلکہ یہ مشورہ دینے کے بعد کہ مسلمان سنسکرت کا گیان حاصل کریں، یہ بھی کہا کہ "ایسے لین دین سے **اسلامی بھاشا** کا بل بڑھ جائے گا۔"

دوسری گجرات تعلیمی کانفرنس ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو بھڑوچ میں ہوئی تھی۔ ہندی اور اردو کے تعلق سے بھی گاندھی جی نے کچھ باتیں اپنے خطبہ صدارت میں کہیں:[1]

"۔ ۔ ۔ میں ہندی اُس زبان کو کہتا ہوں، جو اُتر کے ہندو اور مسلمان بولتے ہیں، اور جسے یا تو دیوناگری میں، اور یا اردو لکھاوٹ میں لکھا جاتا ہے۔ اس تشریح پر کچھ اعتراض بھی کیے گئے ہیں۔ ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ہندی اور اردو، دو الگ الگ زبانیں ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اُتری ہندستان میں ہندو اور مسلمان، دونوں ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ ان زبانوں میں فرق پڑھے لکھے لوگوں نے پیدا کیا ہے۔ پڑھے لکھے ہندو، اپنی ہندی میں سنسکرت ملا دیتے ہیں، جس کی وجہ سے مسلمان اسے سمجھ نہیں پاتے۔ اسی طرح لکھنؤ کے مسلمان اپنی اردو میں فارسی ملا دیتے ہیں، اور اسے ہندوؤں کے سمجھنے کے لائق نہیں رکھتے۔ عام لوگوں کے لیے یہ دونوں زبانیں اجنبی ہیں، اور اُن کے کسی کام کی نہیں ہیں۔ ۔ ۔ اُتری ہندستان کے لوگ جو زبان بولتے ہیں، وہ ایک ہے آپ اسے چاہے ہندی کہہ لیں چاہے اردو۔ اسے اردو لکھاوٹ میں لکھ کر آپ اردو کہہ سکتے ہیں، اور اِسی کو ناگری لکھاوٹ میں لکھیں تو یہ ہندی بن جاتی ہے۔ اب رہا لکھاوٹ کا سوال۔ فی الحال مسلمان یقینی طور سے اردو لکھاوٹ

---

[1] گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ: ص ۱۵ - ص ۱۷؛

استعمال کریں گے، اور ہندو زیادہ تر دیو ناگری میں لکھیں گے۔ میں زیادہ تر کی بات اس لیے کہتا ہوں کہ آج بھی ہزاروں ہندو اردو لکھاوٹ میں لکھتے ہیں، اور ان میں سے کچھ تو ناگری لکھاوٹ جانتے بھی نہیں ہیں۔ آخر میں جب ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ کوئی شک وشبہ نہیں رہ جائے گا، اور جب ان کے درمیان بے اعتباری کی تمام وجہیں دور ہو جائیں گی، تو جس لکھاوٹ میں زیادہ طاقت ہے، وہ زیادہ بڑے پیمانے پر استعمال ہوگی۔ اور اس طرح قومی لکھاوٹ بن جائے گی۔ بیچ کے زمانے میں جو ہندو اور مسلمان اپنی درخواستیں وغیرہ اردو میں لکھنا چاہتے ہیں، انھیں ایسا کرنے کی آزادی ملنی چاہیے۔۔۔ ہندی نے اپنے آپ کو قومی زبان کی حیثیت سے پہلے ہی جما لیا ہے۔ ہم اسے اس حیثیت میں بہت مدت سے استعمال کر رہے ہیں۔ خود اردو کا جنم بھی اسی صورت حال کا نتیجہ ہے۔ مسلمان بادشاہ فارسی اور عربی کو قومی زبان نہیں بنا سکے۔ انھوں نے ہندی قواعد (گرامر ویاکرن) کو اپنا لیا، اور صرف بول چال میں فارسی کے زیادہ لفظ استعمال کیے، اور لکھنے میں اردو لکھاوٹ سے کام لیا۔ لیکن وہ عام لوگوں سے بات چیت ایک بدیسی زبان میں نہیں کر سکتے تھے۔ یہی معاملہ انگریزی حاکموں کا ہے۔ جن لوگوں کو معلوم ہے کہ فوج میں سپاہیوں سے کیسے کام لیتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اس کے لیے انھوں نے ہندی یا اردو کے لفظ گھڑ لیے ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ صرف ہندی قومی زبان بن سکتی ہے۔۔۔"

۳/ جنوری ۱۹۲۶ء کے نوجیون میں گاندھی جی نے کانپور کانگریس کے ہندستانی کے بارے میں رزولیوشن کے ضمن میں لکھا:[1]

"اس رزولیوشن کو بڑی اہمیت حاصل ہے کہ کانگرس کی کارروائی، جہاں تک ہو سکے، ہندوستانی میں چلائی جائے گی۔ اگر کانگریس کے ممبر اس کو قبول کر لیں، اور اس پر عمل کریں، تو کانگرس کے کام میں غریب جنتا کی دلچسپی بڑھ جائے گی۔"

کانپور کانگرس کا رزولیوشن نمبر ۸ (انڈین نیشنل کانگرس، کانپور، ۱۹۲۵ء) یہ تھا:[2]

---

[1] گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ: ص ۳۷

[2] ایضاً۔ ص ۳۷

"کانگرس کی کارروائی، جہاں تک ممکن ہو گا، ہندستانی میں چلائی جائے گی۔ انگریزی زبان، یا کوئی صوبائی زبان بھی استعمال کی جا سکتی ہے، اگر تقریر کرنے والا ہندوستانی نہیں بول سکتا یا جب کبھی ضروری ہو جائے، صوبہ کانگرس کمیٹی کی کارروائی، متعلقہ صوبے کی زبان میں ہو گی — ہندستانی بھی استعمال کی جا سکتی ہے"

۱۴ جولائی ۱۹۲۷ء کے ینگ انڈیا میں رسم خط کے سلسلہ میں گاندھی جی نے ان خیالات کا اظہار کیا:[لہ]

"... سارے ہندستان کے لیے ایک ایسی عام لکھاوٹ ہونی چاہیئے، جسے آسانی سے اپنایا جا سکے۔ اور کسی لکھاوٹ کو اپنانے میں اتنی آسانی نہیں ہے، جتنی دیوناگری لکھاوٹ کو اپنانے میں۔ اور نہ کوئی لکھاوٹ اتنی مکمل ہے، جتنی کہ دیوناگری لکھاوٹ۔ اس کام کے لیے ایک کل ہند ادارہ قائم ہے، یا کسی زمانے میں قایم تھا[لہ] میں نہیں جانتا کہ اس وقت یہ سنستھا کیا کام کر رہی ہے۔ لیکن اگر اس کام کو انجام دینا ہے، تو یا تو اصل انجمن کو جاندار بنانا ہو گا، یا اس کے لیے ایک الگ ادارہ قایم کرنا ہو گا۔ اس تحریک کو ہندی یا ہندستانی کا ایک مشترکہ زبان کی حیثیت سے، پرچار کرنے کی تحریک کے ساتھ کسی طرح خلط ملط نہ کرنا چاہیئے۔ یہ دوسرا کام آہستہ آہستہ، لیکن مستقل طور سے جاری ہے۔ ایک ہی لکھاوٹ کے استعمال سے، ایک ہی زبان کو چلانے میں مدد ملے گی۔ لیکن یہ دونوں تحریکیں اپنے مقصد کے اعتبار سے، صرف ایک نقطہ تک ساتھ ساتھ جاتی ہیں۔ ہندی یا ہندستانی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے صوبائی زبانوں کے بجائے رائج کیا جائے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اُن زبانوں کی امداد کی جائے، اور مشترکہ زبان کو صوبوں کے آپسی کام کاج میں استعمال کیا جائے۔ جب تک ہندو مسلم تنازع باقی ہے، اُس وقت تک اس کی شکل یا تو اس اردو کی ہو گی جو فارسی لکھاوٹ میں لکھی جائے گی، اور جس میں فارسی اور عربی لفظوں کی کثرت ہو گی، اور یا اُس ہندی کی ہو گی، جو دیوناگری لکھاوٹ میں لکھی جائے گی، اور جس میں سنسکرت لفظوں کی

لہ گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ: ص ص ۴۱ - ۴۲

لہ ناگری پرچارنی سبھا (کمال)

بھرمار ہوگی۔ جب دونوں فرقوں کے دل مل جائیں گے، تو ایک ہی زبان کی دونوں شکلیں ایک دوسرے میں سماجائیں گی، اور ہمیں ایک ایسی زبان مل جائے گی، جو دونوں کے میل سے پیدا ہوگی، اور جس میں سنسکرت، فارسی، عربی، یا دوسری زبانوں کے وہ لفظ شامل ہوں گے، جو زبان کی پوری ترقی اور وچاروں کو پوری طرح سے ظاہر کرنے کے لیے ضروری ہوں گے۔"

راشٹریہ شکشن پریشد (قومی تعلیمی کونسل) گروکل کانگڑی میں گاندھی جی نے ایک تقریر کی تھی، جو ۳۱ مارچ ۱۹۲۷ء کے ہندی نوجیون میں چھپی تھی۔ ایک اقتباس:[1]

"سنسکرت سیکھنا ہر ایک ہندستانی طالب علم کا فرض ہے۔ ہندوؤں کا تو ہے ہی۔ مسلمانوں کا بھی ہے، کیوں کہ آخر اُن کے باپ دادا بھی تو رام اور کرشن ہی تھے، جنھیں پہچاننے کے لیے اُنھیں سنسکرت سیکھنی چاہیے۔ لیکن مسلمانوں کے ساتھ سمبندھ رکھنے کے لیے اُن کی زبان سیکھنا ہندوؤں کا بھی فرض ہے۔ آج ہم ایک دوسرے کی بھاشا سے بھاگے پھرتے ہیں، کیوں کہ ہم پاگل بن گئے ہیں۔۔۔"

ہندی، اردو، ہندستانی کے سلسلہ میں ایک بڑا عجیب اور بھیانک تضاد گاندھی جی کے ان خیالات میں ہے، جو پیش کیے گئے اقتباسات میں اتنا نمایاں ہے، کہ صرف اشارہ کرنا کافی ہوگا۔ وہ ہندی، اردو، ہندستانی کو ایک ہی زبان مانتے ہیں۔ اُن کی یہ رائے کسی گہری فکر یا مطالعے کی وجہ سے نہیں، بلکہ سیاسی وجدان کا کرشمہ ہے۔ خلافت کی تحریک کو جنھوں نے کانگرس کی حمایت اس لیے پیش کی کہ مسلمان جذباتی طور سے کانگرس کی طرف راغب ہوں۔ اردو کو مسلمانوں کی زبان بار بار کہہ کر، اور ہندی کو ہندوؤں کی زبان قرار دے کر، دونوں کو قریب لانا چاہا۔ ساخت اور قواعد کے اعتبار سے بول چال کی ہندی اور اردو ایک ہیں۔ سر جارج گریرسن[2] نے بھی یہی بات کہی ہے، لیکن مذہب یا فرقے کا عنصر اُس نے بھی داخل کیا۔ اور یہی تضاد اُس کے یہاں بھی ہے:

As a dialect of Western Hindi, Hindustani presents itself

---

[1] گاندھی جی اور قومی زبان: ص ۴۲۔

[2] LINGUISTIC SURVEY OF INDIA; VOL. IX Indo-Aryan Family: Central Group : Part I.
(First Edition : 1916, Reprint (Motilal Banarsi Das, Delhi:1968)

under several forms. These may first of all be considered under two heads, viz. vernacular Hindustani, and the Literary Hindostani founded there on. Vernacular Hindostani is the language of the Upper Gangetic Doab and of Western Rohilkhand. Literary Hindostani is the polite speech of India generally, and may be taken as the Vernacular of educated Musalmans through out northern India, and of all Musalmans south of Narbada...Literary Hindostani is so widely knwon and of such importance, that it must necessarily be taken as the standard dialect of Western Hindi (p.42)

"مغربی ہندی کی ایک بولی کی حیثیت سے ہندستانی کے کئی روپ ہیں۔ سب سے پہلے ان کے بارے میں، دو خانوں میں بانٹ کر، غور کیا سکتا ہے۔ ایک: ورناکیولر، یعنی دیسی بول چال کی ہندستانی دو: بول چال کی ہندستانی پر مبنی ادبی ہندستانی۔ بول چال کی ہندستانی۔ ورناکیولر ہندستانی بالائی دوآبے (گنگا) اور مغربی روہیل کھنڈ کی زبان ہے۔ ادبی ہندستانی عام طور سے ہندستان کی شائستہ زبان ہے، اور اسے شمالی ہندستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں اور نربدا کے جنوب کے سارے مسلمانوں کی زبان سمجھنا چاہیئے۔ ادبی ہندستانی اتنی عام ہے، اور اتنی اہمیت کی حامل ہے کہ لازمی طور پر اسے مغربی ہندستانی کی معیاری بولی ماننا چاہیئے۔"

(ص ۴۲)

گریرسن کے اس بیان میں ایک واضح تضاد ہے۔ ایک طرف وہ کہتا ہے کہ ادبی ہندستانی عام طور سے ہندوستان کی شائستہ زبان ہے۔ دوسری طرف وہ اسے شمالی ہندستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی زبان بتاتا ہے۔ اور دوہرا تضاد یہ ہے کہ نربدا کے جنوب میں رہنے والے مسلمانوں کی زبان بھی یہی ہے، چاہے وہ تعلیم یافتہ ہوں یا ناخواندہ

کیوں کہ نربدا کے جنوب کے لیے اُس نے تعلیم یافتہ ہونے کی بھی قید نہیں رکھی۔ کیا یہ بات قابل قبول ہوسکتی ہے کہ ایک گھر میں دو بھائی صرف اس وجہ سے زبان کے دو مختلف روپ بولیں گے کہ ایک تعلیم یافتہ ہے، اور ایک ناخواندہ۔ اردو کے سلسلہ میں تو دتی میں بھی، اور لکھنؤ میں بھی، بعض گھرانوں کی خواتین کی زبان کو سند مانا جاتا تھا۔ حالاں کہ اس زمانے میں تعلیم نسواں کا رواج نہیں تھا۔ اگلے صفحے پر ہی گریرسن نے یہ لکھا ہے:[1]

Literary Hindostani, as distinct from Vernacular Hindostani, is current, in various forms, as the language of polite society, and as a <u>lingua franca</u> over the whole of, India proper. It is also a language of Literature, both poetical and prose (p.44)

ورناکیولر ہندستانی سے نمایاں طور پر مختلف، ادبی ہندستانی، مختلف ہیئتوں میں شائستہ سوسائٹی کی زبان کی حیثیت سے اور سارے ہندستان کی لنگوا فرانکا کی حیثیت سے رائج ہے یہ نثر اور نظم کی ادبی تخلیقات کی بھی زبان ہے۔" (ص ۴۴)

گریرسن کے بیان کے پچھلے اقتباس کے تضادات، اس اقتباس کے بعد اور زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔ وہ زبان، جو ملک کی لنگوا فرانکا ہو کسی طبقے یا فرقے تک محدود نہیں ہوسکتی۔ ہاں، کسی علاقے میں رہنے والوں کی مادری زبان ہوسکتی ہے۔ دوسرے علاقوں کے باشندوں کی اکتسابی زبان ہوسکتی ہے۔ یہ باقاعدہ زبان ہوتی ہے، جو بولی کی سطح سے ترقی کر کے زبان کی سطح پر پہنچتی ہے۔ اور یہ زبان اکتسابی زبان کی حیثیت سے جہاں پڑھی اور استعمال کی جاتی ہے، وہاں کی زبانوں کو متاثر کرتی ہے ــــ اور اگر کسی دوسرے علاقے میں رائج ہونے لگے، تو جیسے اپنے علاقے میں اس کی بولیاں ہوتی ہیں، دوسرے علاقوں میں بھی اس کی بولیوں کے اکھوے پھوٹتے ہیں ما اور اس کی نشوونما اپنے ماحول میں ایک مختلف نہج سے ہوتی ہے۔ گریرسن جیسے مغربی ہندی، ادبی ہندستانی کو جس کی بولی بتاتا ہے، دراصل اس کی عمر ادبی ہندستانی سے کم ہے۔ اور اس لیے مغربی ہندی، ادبی ہندستانی بولی تو ہوسکتی ہے، ادبی ہندستانی، مغربی ہندی کی بولی نہیں ہوسکتی۔

---

[1] ایضاً

(یہ ذکر ضمنی طور پر آگیا ہے، کیوں کہ موضوعِ حاضر سے متعلق تھا۔ موضوع ایک تحقیقی مقالے کا تقاضہ کرتا ہے۔ حوصلہ کانٹے کی طرح ذہن میں چبھ رہا ہے، کیوں کہ وقت متاعِ کمیاب ہے۔)

وہ گریرسن، جس نے ادبی ہندستانی کو شمالی ہند کے تعلیم یافتہ اور نربدا سے نیچے کے سارے مسلمانوں کی زبان بتایا تھا، صفحات ۴۴ اور ۴۵ پر لکھتا ہے[1]:

Urdu is that form of Hindostani, which is written in the Persian character, and which makes a free use of Persian (including Arabic) words in its vocabulary. The name is said to be derived from the Urdu-e-Mu'alla or royal military bazar outside the Delhi palace. It is spoken chiefly in the towns of Western Hindostani, by Musalmans and by Hindus who have fallen under the influence of Persian culture. Persian vocabless are, it is true, employed in every form of Hindostani. Such have been admitted to full citizenship even in the rustic dialects, or in the elegant Hindi of modern writers like Harishchandra of Benaras. To object to their use would be affected purism, just as would be the avoidance of the use of all words of Latin derivation in English. But in what is known as High Urdu, the use of Perssian words is carried to almost incredible extremes. In writing of this class we find whole sentences in which the only Indian thing is the grammer, and with nothing but Persian words from beginning to end. It is curious, however, that the extreme Persianisation of Hindostani is not, as Sir Charles Lyall rightly points out, the work of conquerors ignorant of the language of the people. On the contrary, the Urdu language took its rise in the effortss of the ever pliable Hindu to assimilate the language of his rulers. Its authors were Kayasthas and Khatris employed in the administration and acquainted with Persian, not Persians or Persianised Turks, who for many centuries used only their

---

[1] ایضاً

own language for literary purposes. To these is due the idea of employing the Persian character for their vernacular speech and the consequent preference for woods to which that character is native. "Perssian is now no foreign idiom in India, and through its excessive use is repongnant to good taste, it would be foolish purism and a political mistake to attempt (as some have attempted) to eliminate it from the Hindu (HINDI) literature of the day' .... Once a word has become domisticated in Hindostani no one has any right to object to its use, whatever its origin may be, and opinions will only differ as to what words have received the right of citizenship and what have not. This, after all, is a question of style, and in Hindostani, as in English, there are styles and styles . For myself, I far prefer the Hidostani from which words whose citizenship in any way is doubtful are excluded, but that I freely admit, is a matter of taste.

"اردو، ہندستانی کا وہ روپ ہے، جو فارسی حروف میں لکھا جاتا ہے، اور جو اپنی فرہنگ میں (عربی سمیت) فارسی الفاظ کا آزادانہ استعمال کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ نام اردو معلّٰی یعنی دلّی کے شاہی محل[۲] کے باہر کے فوجی بازار[۳] سے مستخرج ہے۔ یہ (یعنی اردو) خاص طور سے مغربی ہندستان میں، مسلمان، ۔ اور وہ ہندو، جو ایرانی کلچر کے اثر میں آگئے ہیں۔ بولتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ فارسی الفاظ ہندستانی کے ہر روپ میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ دیہاتی بولیوں میں بھی انھیں پوری طرح قبول کر لیا گیا ہے۔ بنارس کے ہرشی چندر جیسے جدید اور شستہ ہندی ادیبوں کی تحریروں کی اقلیم میں بھی انھیں پوری شہریت کا حق مل گیا ہے۔ اُن کے

1.: Quotation from Sir Charles Lyall.

[۲] لال قلعہ [۳] اردو بازار

استعمال پر اعتراض کرنا محض دکھاوے کی تطہیر پسندی ہوگی، بالکل اسی طرح جیسے انگریزی میں لاطینی سے مستخرج الفاظ کے استعمال سے احتراز کریں۔ لیکن وہ، جسے اردوئے معلیٰ کہتے ہیں، فارسی الفاظ کا استعمال ناقابلِ یقین انتہائی حدوں تک پہنچ گیا ہے۔ اس قسم کی تحریروں میں ہمیں پورے پورے جملے ایسے ملتے ہیں، جن میں ہندستانی جزو صرف قواعد (صرف و نحو) ہوتا ہے۔ شروع سے آخر تک فارسی الفاظ کے علاوہ کچھ اور نہیں ہوتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہندستانی کی انتہائی فارسی زدگی، جیسی کہ سر چارلس لیال نے درست نشاندہی کی ہے، عوام کی زبان سے ناواقف فاتحوں کا نہیں تھا۔ برخلاف اس کے، اردو زبان ابھری ہی ہمیشہ اطاعت پزیری پر مائل ہندوؤں کی اپنے حکمرانوں کی زبان کو جذب کر لینے کی سعی اور سرگرمی کی وجہ سے[1] کائستھ اور کھتری، جو انتظامیہ میں ملازم تھے، اور فارسی سے واقفیت رکھتے تھے، اس کے موجد تھے، نہ کہ ایرانی یا ایرانی کلچر میں رنگ جانے والے ترک، جنھوں نے ادبی مقاصد کے لیے صرف اپنی زبان استعمال کی[2] اپنی ورناکیولر بولی کے لیے فارسی حروف کا تحریر میں استعمال کرنے کا منصوبہ بھی انہی کا رہینِ منّت ہے، اور اس کی وجہ سے اس زبان کے الفاظ کو ترجیح دینے کا خیال بھی جس کا رسم خط انھوں نے اپنی زبان کی تحریر کے لیے اپنایا۔

---

[1] : یہ نظریہ کہ صرف کائستھوں اور کھتریوں نے فارسی زبان اور حروف کو اپنایا، مزید چھان بین چاہتا ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں کے ایک سنسکرت مخطوطے میں، بعض الفاظ کے صحیح تلفظ کے لیے بین السطور میں الفاظ، فارسی رسم خط میں لکھے ہیں۔ اور یہ مذہبی کتاب ہے۔ کشمیر میں ماسٹر زندہ کول اور ماسٹر شنکر پنڈت کو مثنوی مولانائے روم نہ صرف ازبر تھی، بلکہ عبادت کے طور پر اس کا جاپ کرتے تھے۔ دلّی میں فارسی زبان پوجا کی تقریبات کا حصہ بن گئی تھی۔ مہیشور دیال نے اپنے بچپن میں، جیٹھ کے مہینے میں ہونے والی نرجلا اکادشی کی پوجا میں یہ اشلوک سنا: "یک فلوس، دو بادکش و یک صراحی بہ شری کرشن ارپن می دہم"۔ فارسی پوجا کے شلوکوں کے روپ میں رائج ہوگئی تھی۔ اور گھروں اور مندروں میں پہنچ گئی تھی۔ (کمال)

[2] اس بیان کی صداقت اس حقیقت سے واضح ہے کہ بابر نے اپنی توزک ترکی میں لکھی۔ جہانگیر کی توزک فارسی میں ہے۔ اورنگ زیب کے رقعاتِ عالمگیری بھی فارسی میں ہیں۔ محمد شاہ آخری بادشاہ تھا، جو ترکی جانتا تھا۔ اردو، ہندی (فارسی رسم خط میں) شاہ عالم اور آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر نے ادبی اظہار کی زبان کے طور پر استعمال کی۔ اکبر کے نورتنوں میں سے ایک راجہ ٹوڈرمل نے محکمۂ مال کے ریکارڈ فارسی میں رکھنے کے احکامات صادر کیے۔ (کمال)

اب فارسی (کے الفاظ) ہندوستان میں غیر ملکی روزمرّہ یا محاورہ نہیں، اور اگرچہ اس کا کثرت سے استعمال ذوق پر گراں گزرتا ہے، پھر بھی آج کے ہندی ادب سے فارسی کے الفاظ یک قلم نکال پھینکنے کی کوشش کرنا (جیسا کہ کچھ نے کرنا چاہا) احمقانہ تطہیر پسندی اور سیاسی حماقت ہوگی۔[۱] ایک بار کوئی لفظ ہندستانی میں سدھ جائے (اور رائج ہوجائے) تو کسی کو اُس کے استعمال پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں، چاہے اس کا ماخذ کوئی بھی (زبان) ہو۔ اختلافِ رائے صرف اس بات پر ہوسکتا ہے کہ کون سے الفاظ کو (اقلیمِ زبان میں) شہریت کا حق مل گیا ہے، اور کن کو نہیں۔ یہ بہرحال، اسلوب کا سوال ہے، اور ہندستانی میں، جیسا کہ انگریزی میں ہے، اسالیب کی رنگارنگی ہے۔ جہاں تک میرا تعلّق ہے، میں اس ہندستانی کو کہیں زیادہ ترجیح دیتا ہوں، جو ایسے الفاظ سے پاک ہو، جن کا مروّج ہونا کسی بھی طرح مشکوک ہو، لیکن یہ بات میں کھلے دل سے مانتا ہوں کہ یہ اپنی پسند اور ذوق کا معاملہ ہے۔"

ص ۴۷ پر گریرسن نے لکھا ہے:

We may now define the three main varieties of Hindostani as a follows: Hinđostani is primarily the language of the Upper Gangetic Doab, and is also the Linga franca of India, capable of being written in both Persian and Devnagri characters, and without purism, avoiding alike the exercise use of either Persian or Sanskrit words when employed for literature. The name 'Urdu' can then be confined to that special variety of Hindostani in which Persian words are of frequent concurrence, and which hence can only be written in the Persian character and similarity, 'Hindi' can be confined to the form of Hindostani, in which Sanskrit words abound, and which hence can only be written in the Devanagri character -

---

[۱] سر چارلس لیال کی تحریر سے اقتباس

"اب ہم ہندوستانی کی تین سب سے اہم قسموں کا تعین کریں گے۔ ہندستانی بنیادی طور سے گنگا کے اوپری دوآبے کی زبان ہے، اور ہندستان کی لنگوا فرانکا بھی ہے، اور جس میں صلاحیت ہے فارسی اور دیوناگری، دونوں لپیوں میں لکھے جانے کی، اور تطہیر کی شعوری کوشش کے بغیر فارسی اور سنسکرت کے (ثقیل) الفاظ کے بے تحاشا استعمال سے بچنے کی، جب ادبی تخلیق کے لیے کام میں لائی جائے۔ اردو کا نام ہندستانی کے اس روپ کے لیے مخصوص کیا جاسکتا ہے جس میں فارسی (دخیل) الفاظ زیادہ ہوں، اور اس لیے صرف فارسی رسم خط میں لکھی جاسکے۔ ہندی، ہندستانی کے اس روپ کے لیے مخصوص کی جاسکتی ہے جس پر سنسکرت (تت سم) شبد چھائے ہوئے ہوں اور اس لیے صرف دیوناگری ہی میں لکھی جاسکتی ہے۔"

رسم خط، زبان کا ناقابلِ تنسیخ جزو نہیں ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے زبان کی تحریری شکل بعد کا مرحلہ ہے، اور اس کا بھی ایک ارتقا ہے۔ تصویری رسم خط سے حروف کی موجودہ شکل تک۔ اس کے باوجود ہندی اور اردو قضیے نے کچھ ایسی صورت اختیار کرلی ہے کہ فارسی حروف پر مبنی رسم خط اردو کی بقا کے لیے ضروری ہوگیا ہے یہ تفصیل کا موقع نہیں ہے، لیکن یہ گزارش کرنا ضروری ہے کہ بہت سے (اور یہ تعداد کروڑوں میں ہے) اُن لوگوں کی مادری زبان اردو ہے، جو لکھنا نہیں جانتے، یا صرف ناگری رسم خط سے واقف ہیں۔ ان کی زبان بنیادی ہندستانی ہے (بنیادی پر چونکنے کی ضرورت نہیں، اسی میں غیر ضروری آمیزش سے نام نہاد اونچ کوٹی کی شدھ ہندی اور اعلا معیار کی اردو ایجاد ہوئیں، جو فطری زبانیں نہیں بلکہ (خشکہ پر گندہ بیروزہ کی طرح) ایجاد بندہ ہیں۔

ولی، آبرو، میر، اور بڑی حد تک سودا کی زبان بھی فارسی زدہ نہیں ہے (حالاں کہ سودا فارسی کے بھی شاعر تھے۔ ولی کو گلشن کے مشورے کی روایت، اردو شاعری کی زبان میں ایرانی پیکر تراشی، اور فارسی الفاظ کی روز افزوں فراوانی کا نقطۂ عروج غالب کی وہ شاعری، جسے بیدل کی رنگ کہا جاتا ہے (حالاں کہ اس حقیر کے نزدیک یہ رنگ بیدل نہیں ہے) ایسی ہی افراط و تفریط کی نثر میں ایک مثال رجب علی بیگ سرور کا "فسانۂ عجائب" ہے۔ یہ بھی اردو ادب کا ایک لطیفہ ہے کہ رنگ بیدل میں ریختہ کہنے والے مرزا اسداللہ خان غالب نے رجب علی بیگ سرور کی فارسی زدہ نثر کی عبارت کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ سچ ہے دوسرے کی آنکھ کا تنکا نظر آجاتا ہے، اپنی آنکھ کا شہتیر دکھائی نہیں دیتا۔

سرور کے نزدیک میرامن کی باغ و بہار کے زبان سوقیانہ تھی، اسی لیے انھوں نے فسانۂ عجائب۔ شرفا

کی پُرتکلّف اور شستہ زبان لکھی۔ لیکن غالب نے میرامن کی زبان کو ترجیح دی، کیوں کہ یہ دلّی کی بول چال اور روز مرّے کے مطابق تھی۔ فسانۂ عجائب چوں کہ باغ و بہار کے بعد لکھا گیا، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو نثر، جو تسہیل کی طرف جا رہی تھی، اُس سفر میں یہ ایک قدم مراجعت کا تھا۔

اردو نثر کا ارتقا ایک ضخیم تحقیقی مقالے کا مطالبہ کرتا ہے، اور یہاں اس کا موقعہ نہیں ہے۔ لیکن مختصر طور سے اس کا ذکر ضروری ہے، چاہے وہ ادھورا ہی ہو، ناقص الاوّل اور ناقص الآخر ہونے کے علاوہ درمیان کی بھی بہت سی کڑیاں چھوٹی ہوئی ہوں۔

عجائب القصص، شاہ عالم کی تصنیف ہے، اور اُس عہد کی، جب غلام قادر روہیلہ انھیں نابینا کر چکا تھا۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے اس پر تحقیق کی ہے، اور اُن کا خیال ہے کہ شاہ عالم نے یہ قصّہ (بہت ممکن ہے) میرامن ہی کو املا کرایا تھا۔ عجائب القصص کی زبان کا اندازہ اس اقتباس سے ہو سکتا ہے:

"سائبان کھنچے ہوئے ہیں، اور ٹٹیاں ابرک کی لگ رہی ہیں اور جوہری بچہ اور صرّاف، حلوائی وغیرہ اقسام اقسام کی پوشاکیں پہنے ہوئے، دوکانوں میں بیٹھے ہیں، اور ایک طرف دوکانوں میں نان و حلوہ فروش، طرح طرح کے طعام تیار کیے ہوئے، چوڑیاں، سونے، روپے کی ہاتھ میں لیے ہوئے، مگس رانی کر رہے ہیں، اور ایک طرف دوکانوں میں فالودے والے چاندی کی قابو (ں) میں، آبخوریاں ہیں، چینی کی تشتریوں میں فالودہ دمشقی و رومی و ہندی و چینی جمائے ہوئے بیٹھے ہیں، چمچی اور قاشق نقرہ و چوبی منقش چین کے اور روم کے خطائی پیالوں پر دھری ہوئی ہیں۔"

باغ و بہار[1] میں میرامّن، سیر پہلے درویش کی اس طرح شروع کرتے ہیں:

---

[1] خاتمۂ کتاب کی عبارت یہ ہے: جب یہ کتاب فضلِ الٰہی سے اختتام کو پہنچی، جی میں آیا کہ اس کا نام بھی ایسا رکھوں کہ اسی میں تاریخ نکلے، جب حساب کیا تو بارہ سو پندرہ ہجری میں کہنا (لکھنا) شروع کیا تھا۔ باعث عدم فرصت کے بارہ سو سترہ سن کی ابتدا میں انجام ہوئی۔ اس فکر میں تھا کہ دل نے کہا باغ و بہار اچھا نام ہے کہ ہم نام و ہم تاریخ اس میں نکلتی ہے۔"

انڈیا آفس لائبریری (لندن)، میں مجھے سلیم قریشی کی عنایت سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ نایاب مخطوطے، قدیمی نسخے اور مخطوطات اور نسخوں کی فہرستیں دیکھنے کا موقعہ ملا۔ جو یادداشتیں تیار کی تھیں، اُن میں سے ایک میرامّن کی اس کتاب کے بارے میں بھی ہے، مخطوطات کی فہرست کے مطابق ۱۸۰۱ء میں چار درویش کی تالیف ہو چکی تھی۔ اندراج کے مطابق۔

۱۲۱۵ ہجری مطابق ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوئی، اور اصل کتاب کے نام پر اس کا نام بھی چار درویش رکھا گیا۔ لیکن باغ و بہار کے نام سے مشہور ہوئی، جو اس کا تاریخی نام ہے۔ پہلے پہل ۱۸۰۳ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی، لیکن اس سے پہلے ایک سال قبل اس کا کچھ حصّہ گلکرسٹ کے ہندی مینول میں شائع ہو چکا تھا۔

اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ جنوری ۱۸۰۲ء میں جب کتابوں کی اشاعت ملتوی ہو گئی، اور اس میں میرامّن کی کتاب بھی شامل تھی، تو میرامّن نے مسودّے پر نظرِ ثانی کر کے، نام باغ و بہار رکھا ہو، اور اس کا سنِ تالیف و تصنیف، ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء قرار دیا ہو۔ (۱۸۰۱ء شعبان ۱۲۱۶ھ میں ختم ہوا تھا۔

"پہلا درویش دو زانو ہو بیٹھا، اور اپنی سیر کا قصہ اس طرح سے کہنے لگا۔ یا معبود! اللہ!
ذرا اِدھر متوجہ ہو، اور ماجرا اس بے سر و پا کا سنو:

یہ سرگذشت میری ذرا کان دھر سنو | مجھ کو فلک نے کر دیا زیر و زبر، سنو
جو کچھ کے پیش آئی ہے شدت مرے تئیں | اُس کا بیان کرتا ہوں، تم سر بسر سنو

اے یاراں! میری پیدائش اور وطن بزرگوں کا ملک یمن ہے۔ والدِ ماجد اس عاجز کا ملک التجار، خواجہ احمد نام، بڑا سوداگر تھا۔ اُس وقت میں کوئی مہاجن یا بیپاری اُن کے برابر نہ تھا۔ اکثر شہروں میں کوٹھیاں اور گماشتے، خرید و فروخت کے واسطے مقرر تھے، اور لاکھوں روپے نقد اور جنس مُلک مُلک کی، گھر میں موجود تھی۔ اُن کے یہاں دو بچے پیدا ہوئے۔ ایک تو یہی فقیر، جو کفنی سیلی پہنے ہوئے، مرشدوں کی حضوری میں حاضر، اور بولتا ہے۔۔۔"

باغ و بہار سے پہلے دریائے لطافت سے عبارت کا نقل کیا جانا چاہیئے تھا، لیکن ایسا بعد میں، بہ وجوہ، کیا جا رہا ہے۔ میرزا مظہر جانِ جاں سے اپنی ملاقات کا ذکر انشا نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"۔۔۔ میں نے دیکھا کہ میرزا موصوف پیراہن اور کلاہ سفید پہنے، اور ناشپاتی رنگ کے دوپٹے کا سموسہ کندھے پر ڈالے بیٹھے تھے۔ میں نے نہایت ادب سے سلام کیا۔ نہایت عنایت اور اخلاق سے، جو بزرگوں کا شیوہ ہے، سلام کا جواب دیا، اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر، مجھ بے لیاقت کے سر کو اپنے کنار میں کھینچ لیا، اور پہلو میں جگہ دی۔ میں نے عرض کیا:

ابتدائے سنِ صبا سے، تا اوایلِ رسیا اور اوایلِ رسیا سے الی الان اشتیاق مالا یطاق تقبّل عتبۂ عالیہ نہ بجدے تھا کہ سلکِ تحریر و تقریر میں منظم ہو سکے۔ لہٰذا، بے واسطہ و وسیلہ حاضر ہوا ہوں۔ انھوں نے ارشاد کیا: اپنے تکوں بھی بدو طفلی سے تمھیں اپنے اشخاص کے ساتھ موانست و مجالست رہا کی ہے۔"

گفتگو، اس جناتی زبان میں (جو میرزا غالب کے بیدلی رنگ کا نثری جواب ہے) لکھنے والے انھی انشا نے رانی کیتکی کی کہانی اس مثالی زبانِ اردو میں لکھی، جس میں ایک لفظ بھی عربی، فارسی، ترکی کا نہیں۔ پہلے اس نثر کا نمونہ (راج کمار اودے بھان):

"ایک دن ہریالی دیکھنے کو، اپنے گھوڑے پہ چڑھ کے، اٹکھیل پنے، اور بڑکپن کے ساتھ دیکھتا بھالتا چلا جاتا تھا۔ اتنے میں جو ایک ہرنی اس کے سامنے آئی، تو اُس کا جی لوٹ پوٹ ہوا۔ اس نے ہرنی کے پیچھے، سب کو چھوڑ چھاڑ کر گھوڑا پھینکا۔ بھلا کوئی گھوڑا اس کو پا سکتا تھا۔ جب سورج چھپ گیا، اور ہرنی آنکھوں سے اوجھل ہوئی، تب تو یہ کنور اودے بھان بھوکا، پیاسا، اُنیندا، جمہاتا، انگڑائیاں لیتا، ہکا بکا ہو کے، لگا آسرا ڈھونڈھنے۔ اتنے میں کچھ ایک امریاں دھیان چڑھیں۔ اُدھر چل نکلا، تو کیا دیکھتا ہے کہ چالیس پچاس رنڈیاں[1]، ایک سے ایک جوبن میں اگلی، جھولا ڈالے ہوئے، پڑی جھول رہی ہیں، اور ساون گا[2] تیاں ہیں۔ جوں ہی انھوں نے اس کو دیکھا، تو کون؟ تو کون؟ کر چنگھاڑ سی پڑ گئی۔ اُن سبھوں میں ایک کے ساتھ، اُس کی آنکھ لڑ گئی۔ دوہا اپنی بولی کا:

کوئی کہتی تھی، یہ اُچکا ہے کوئی کہتی تھی۔ ایک پکا ہے۔

یہ چند صفحوں کی کہانی نہیں، کتاب ہے۔ لسانی اعتبار سے اس کی بڑی اہمیت ہے، اور وہ یہ کہ صفحہ، دس صفحے نہیں، پوری کتاب اردو میں لکھی گئی ۔۔۔ اور اُس میں کوئی لفظ فارسی عربی اور ترکی کا نہیں۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ۔۔۔ اور اس سے بڑا اور ثبوت کیا ہوگا کہ اردو کا اس ملک میں مسلمانوں کی آمد سے کوئی تعلق نہیں۔ فارسی، عربی اور ترکی الفاظ مسلمانوں کے ساتھ ہی تو آئے تھے۔ اگر اردو کی ایک کتاب میں صرف دیسی لفظ ہیں، تو یقیناً اُس زبان کا ارتقاء، دوسری جدید ہندوستانی زبانوں کی طرح اسی ملک میں ہوا۔ اب اگر فارسی، عربی ترکی، وغیرہ کے لفظوں کو حق شہریت مل گیا ہے، تو ایسا کس زبان میں نہیں ہے؟ بنگالی، مراٹھی، گجراتی، کشمیری، پنجابی، ہریانوی، ڈوگری، کونکنی کے علاوہ نربدا کے جنوب میں بولی جانے والی دراوڑی زبانوں تک میں یہ بیرونی الفاظ ہیں۔ اور تو اور ہندی میں ان زبانوں کے دخیل الفاظ ہیں۔ خود ہندی کا نام تت سم یا تدبھو نہیں، فارسی ہے۔ انشا کی کتاب "رانی کیتکی کی کہانی"، کی زبان اگرچہ وہ نہیں ہے، جو بے تکلف لکھی یا بولی جاتی تھی / ہے۔ ایک طرح سے اس میں بڑی آورد ہے، اس کے باوجود اس سے اردو کا خالص ہندستانی زبان ہونا تو ثابت ہوا ہی۔ انشا چوں کہ اردو، عربی

---

[1] اُس زمانے میں عورت کو رنڈی کہتے تھے۔ باغ و بہار میں بھی رنڈی انہی معنوں میں ہے۔ (کمال)

[2] یہ لفظ شاید زائد ہے اور سہوِ کتابت ہے۔

فارسی، ترکی پنجابی اور کشمیری زبانوں پر دسترس رکھتے تھے، اس لیے انھوں نے عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کی آمیزش نہیں ہونے دی۔ انھوں نے یہ کتاب ۱۸۰۳ء میں لکھی تھی۔

چند معروضات اعلا اور ارفع اردو کے مقابلے میں اونچ کوٹی کی ہندی کے بارے میں۔ یہ ہائی ہندی، کوئی فطری یا ارتقاء پذیر زبان نہیں، بلکہ ایجاد کی ہوئی زبان ہے، اور اس کے موجد ہیں للّو لال کب (کوی) یہ بھی میر امّن کی طرح فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کے عملے میں تھے۔ ان کی کتاب پریم ساگر، ۱۸۱۰ء میں چھپی۔ کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد تھا کہ اردو اور دیوناگری لپیوں میں ایسی کتابیں لکھوائی اور چھاپی جائیں جن سے کمپنی بہادر کے افسر، جو ولایت سے آئیں، وہ ہندستانی نہ صرف سمجھ سکیں، بلکہ لکھ بھی سکیں۔ دفتروں اور عدالتوں میں دستاویزیں پڑھ سکیں اور گواہیاں سن سکیں، اور ہندوستانی عملے کو ہدایات دے سکیں اور اُن کے جواب سمجھ سکیں۔ ہندوستانی شعبے کے صدر گلکرسٹ تھے۔ آواخرِ فروری ۱۸۰۴ء میں گلکرسٹ نے فورٹ ولیم کالج سے استعفےٰ دے دیا تھا۔ ۹ اگست ۱۸۰۲ء کو انھوں نے ہندوستانی مصنفین (عملے) کی جن کتابوں پر انعام دینے کی سفارش کی تھی، اس میں ۲۵۰ صفحوں کی کتاب پریم ساگر بھی شامل تھی۔ گویا کتاب ۱۸۰۲ء میں لکھی جا چکی تھی لیکن چھپی گلکرسٹ کے جانے کے چھ برس بعد۔ گلکرسٹ کے زمانے میں جتنی کتابیں لکھی گئیں، اُن میں اس بات پر زور تھا کہ بول چال کی زبان استعمال ہو۔ لیکن پریم ساگر کی زبان سنگھاسن بتیسی، بیتال پچیسی اور باغ و بہار سے بالکل مختلف ہے۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے لیے جو تحقیقی مقالہ (ترسیلی اردو بحوالہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن) میں نے لکھا تھا، اُس میں شاید پہلی بار یہ سوال اُٹھایا گیا کہ پریم ساگر کی زبان، کالج کی دوسری مطبوعات کی زبان سے مختلف کیوں ہے؟ میری حقیر رائے یہ ہے کہ گلکرسٹ نے جس مسوّدے کو انعام کا مستحق ۱۸۰۲ء میں سمجھا تھا، وہ اور تھا، اور ۱۸۱۰ء میں جو کتاب چھپی وہ کچھ اور تھی۔[1] اور ان معنوں میں للّو لال جی نے اس چھ برس کے عرصے میں یہ کام کیا کہ جن

---

[1] شکنتلا اور بیتال پچیسی کا ترجمہ للّو لال اور کاظم علی جواں نے مل کر کیا تھا۔ کاظم علی سنسکرت نہیں جانتے تھے، اور شکنتلا کا ترجمہ شاید سنسکرت متن کا کیا گیا تھا۔ اسی طرح سنگھاسن بتیسی اور قصّہ مادھونل وکام کندلا کا ترجمہ للّو لال اور مظہر علی ولا نے مل کر کیا تھا۔ سنگھاسن بتیسی اور بیتال پچیسی اردو اور ہندی رسم خط، دونوں میں چھپی تھیں۔ واضح رہے کہ یہ ترجمے ہندوستان کے لوگوں کے پڑھنے کے لیے نہیں، ولایت سے تازہ وارد صاحبوں کی تعلیم کے لیے ہوتا تھا۔ اس لیے زور دو باتوں پر تھا۔ کمپنی بہادر کے یہ نئے انگریز افسر ناگری اور اردو لپیاں سیکھیں، اور وہ زبان بھی جس میں انھیں مقدمے سننا ہوں گے، اور درخواستیں پڑھنا ہوں گی۔ تت سم لدی ہندی یا فارسی زدہ اردو کو ایجاد کرنا یا فروغ دینا فورٹ ولیم کالج کا مقصد نہیں تھا (کمال)

لفظوں کو انھوں نے عربی اور فارسی اور ترکی کا سمجھا، اُن کی جگہ سنسکرت کے شبد رکھ دیئے۔ اور جہاں جہاں ممکن ہوا تدبھو الفاظ کاٹ کر، ان کی جگہ تت سم لکھ دیئے۔ اب للّو لال کب جی ہفت زبان تو تھے نہیں، انشا کی طرح۔ آگرے کے معمولی پڑھے لکھے آدمی تھے۔ فورٹ ولیم کالج کو ضرورت بھی ایسے لوگوں کی تھی، جو بول چال کی زبان لکھ سکیں۔

چناں چہ بھرشٹ فارسی (بشمولِ عربی و ترکی) الفاظ پریم ساگر میں موجود ہیں، ایک بات موصوف نے اور بھی کی۔ وہ یہ کہ مرکّب افعال کا جو اسلوب ساز طریقہ چونکھر اتھا، للّو لال جی نے اسے بھی ترک کیا۔

پریم ساگر میں ایک جملہ ہے:

"جس کال اوشا بارہ ورش کی ہوئی، تو اُس کے مکھ چندر کی جیوتی دیکھ پورن ماسی کا چندر رما چھب ہین ہوا"

اُس زمانے میں نہ یہ زبان بولی جاتی تھی، اور نہ اس سے پہلے بولی جاتی تھی۔ چناں چہ نثر و نظم سے ایسی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ اسی لیے وہ اس شیلی کے بانی قرار پائے۔ کال، وقت اور زمانے کے معنوں میں بے شک ہے، لیکن یہاں جیسے استعمال ہوا ہے، شاید ہی پہلے یا بعد میں ہوا ہو۔ دور درشن اور آکاش وانی نے شبد کوش کی مدد سے نہایت مضحکہ خیز زبان ایجاد کی ہے، لیکن کال کا ایسا استعمال کرنے کی جرأت ان اداروں کو بھی نہیں ہوئی۔[1] زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ گلکرسٹ نے پریم ساگر کے مسوّدے کو دیکھ کر انعام کی سفارش کی ہوگی، تو اس میں عبارت یہ رہی ہوگی:

"جس سمے اوشا بارہ برس کی ہوئی، تو اُس کے چاند سے مکھڑے کی دمک دیکھ کر چودھویں/پورن ماشی کا چاند ماند پڑ گیا"

---

[1] للّو لال اور سدل مسر کی کتابوں کے علاوہ یہ زبان اور کہیں نہیں ملتی۔ یہ اولین نمونے ہیں۔ ہندی ساہتیہ کا اتہاس میں رام چندر شکل صرف پریم ساگر کی زبان کو ہندی مانتے ہیں نیکستلا اور مادھونل و کام کندلا کے ساتھ دیوناگری میں چھپے بیتال پچیسی اور سنگھاسن بتیسی کی زبان کو اردو قرار دیتے ہیں۔ ہندی نہیں تسلیم کرتے۔ گویا للّو لال ہندی کے پہلے مصنف ہیں۔ اس طرح تت سم لدی ہندی انیسویں صدی کی دوسری نہیں تو پہلی دہائی میں وجود میں آئی۔ اردو میں قطع و برید کے بعد۔ اس طرح اعلیٰ ہندی، اردو کی شیلی بن جاتی ہے (کمال)

گریرسن نے ہندستانی کے جو تین روپ بیان کیے ہیں، اُن تینوں کی مثالیں بھی پیش کی گئیں، اور کچھ اُن کے ارتقا کے بارے میں بھی گزارش کی گئی۔

اب ہم ماضی بعید سے نسبتاً ماضی قریب کی طرف آتے ہیں، حالاں کہ اُس پر بھی ۵۵ برس گزر چکے ہیں۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اس وقت مولوی عبدالحق کے ساتھ انجمن ترقی اردو میں کام کر رہے تھے۔ اپنی خود نوشت سوانح حیات گرد راہ میں انھوں نے ساہتیہ پرشد، ناگپور کے جلسے کے بارے میں ص ۱۰۲-۱۰۴ پر جو کچھ لکھا ہے، اُس کے کچھ اقتباسات:

"اپریل ۱۹۳۶ء کے آخری ہفتہ کی مقررہ تاریخ کو میں ڈاکٹر (مختار احمد) انصاری کی کوٹھی پر پہنچا تو مولوی صاحب کو موجود پایا۔ لاہور کے دورے کا حال سناتے ہوئے انھوں نے یک بیک کہا۔ ۔ ۔ — ہماری ٹرین شام کو حیدرآباد جاتی تھی، لہٰذا وقت کاٹنے کے لیے مولوی صاحب نے جامعہ ملیہ کا قصد کیا ۔ ۔ ۔ ہم پروفیسر مجیب کے گھر اتر گئے اور انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ کو خبر کر دی۔ باتوں باتوں میں ذاکر صاحب نے کہا کہ کل ناگپور میں گاندھی جی کا جلسہ ہے۔ آپ لوگ سرِراہ کیوں وہاں ٹھہر نہیں جاتے ۔ ۔ ۔ تا این دم مولوی صاحب گاندھی جی کے مدّاح تھے ۔ ۔ ۔ گاڑی دوسرے دن صبح اٹارسی جنکشن پہنچی، جہاں الہ آباد کی ٹرین سے سنگم ہوتا تھا۔ اس میں سے پنڈت نہرو کے ہمراہ منشی پریم چند اور اچاریہ نریندر دیو کو برآمد ہوتے ہوئے دیکھا ۔ ۔ ۔ ساہتیہ پرشد کے جلسے میں گاندھی جی نے جو گل کھلایا، وہ سب کو معلوم ہے، اور اس کی جو روداد مولوی صاحب نے قلم بند کی تھی، وہ تاریخی دستاویز ہے ۔ ۔ ۔ جو بحث یہاں شروع ہوئی، اُس نے آگے چل کر لسانی سیاست کی شکل اختیار کر لی ۔ ۔ ۔ پہلے تو سمجھ میں نہ آیا کہ گاندھی جی نے خواہ مخواہ ہندی اردو کا قضیہ کیوں شروع کیا، اور ادبی مسائل کے بجائے لسانی عداوت کیوں پیدا کی۔ بعد میں جا کر اصل بھید کھلا۔ گاندھی جی باخبر سیاست دان تھے، لیکن ادبی اور ثقافتی معاملات میں اُن کے مشیر کے۔ ایم۔ منشی اور کاکا کالیکر جیسے متعصب فرقہ پرست تھے، جن میں سے ایک گجراتی، اور دوسرا مراٹھی کا نامی گرامی مصنف تھا۔ انھوں نے گاندھی جی کو سمجھایا کہ ادب میں جدید خیالات عام ہو رہے ہیں

اگر فوری طور پر آدمیوں کو کانگریس کے جھنڈے تلے جمع نہ کیا گیا، تو وہ کسی اور طرف بہک جائیں گے۔ بنابریں گاندھی جی جلسے کی تشکیل کے لیے آمادہ ہوگئے۔ اس کی تاریخ ہندی ساہتیہ سمیلن کے سالانہ جلسے کے ساتھ رکھی گئی، جو ناگپور میں منعقد ہوا تھا۔ اس طرح ساہتیہ پرشد کے جلسے میں ہندی کے طرفدار بڑی تعداد میں جمع ہو گئے۔ اور پس پردہ یہ طے پایا کہ اسی وقت طے کر لیا جائے کہ قومی زبان ہندی الفوا (یعنی) ہندوستانی ہوگی، جس سے مراد شمالی ہند کی وہ بول چال کی زبان ہے، جو ہندی یا اردو لکھی جاتی ہے۔ ۔ ۔ ساہتیہ پرشد کے جلسے نے مولوی صاحب کی زندگی، اور انجمن کے لائحۂ عمل کو بدل کر رکھ دیا۔ حیدر آباد ہوتے ہوئے چند روز بعد ہم اورنگ آباد پہنچے تو سب سے پہلے مولوی صاحب نے اپنے کمرے سے چرخہ اٹھا کر پھینک دیا۔ اور کھادی کے کپڑے تہہ کر دیئے۔ طاق سے وہ لٹیا بھی ہٹادی، جو لوک مانیہ تلک کبھی سیاسی روپوشی کے زمانے میں چھوڑ گئے تھے۔ ان کے چہرے پر نرمی کے بجائے سختی نمایاں ہوگئی تھی اور آنکھوں میں فکر کی بدلی کے بجائے عزم کی دھوپ چمکنے لگی تھی۔ ۔ ۔"

ناگپور میں ساہتیہ پرشد کے اجلاس سے چند مہینے پہلے، سجّاد ظہیر لندن سے ہندوستان واپس آئے۔ بمبئی میں کچھ دنوں کے قیام کے دوران میں انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے سلسلہ میں گجراتی اور مراٹھی ادیبوں سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ کنھیّا لال منشی اور ان کی بیوی لیلاوتی منشی سے ملاقات کے کچھ تاثرات سجّاد ظہیر کی کتاب روشنائی (ص ص ۳۱ - ۳۲) سے:

"۔ ۔ ۔ منشی صاحب بڑے آدمی تھے، اور میں ایک طالب علم۔ میں نے جب ترقی پسند مصنفین کا مینی فسٹو انھیں دیا تو اس پر اچٹتی سی نظر ڈال کر، انھوں نے اسے الگ رکھا۔ اور جیسا کہ ہمارے لیڈروں کا عام دستور ہے، انھوں نے اپنی ادبی اور لسانی اسکیموں پر مجھے لکچر دینا شروع کیا۔ ۔ ۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ میں خود ایک ایسا ادارہ بنانے کی کوشش کر رہا ہوں جو ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادب کو ایک جگہ جمع کر کے، ایک واحد قومی زبان (ہندی) کے ذریعے سارے ملک میں پھیلائے۔ انھوں نے مجھے متنبہ کیا کہ ہمارے ملک میں مذہبی اور فرقہ وارانہ تعصب بہت ہے، چناں چہ لوگ، خاص طور پر اردو والے' ہندی کی ترویج کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور ہر ایسے پلان کی مخالفت کرتے ہیں، جس

میں قومی اتحاد کی کوشش کی گئی ہو۔ ۔ ۔ یہ ظاہر ہو گیا کہ کنہیالال منشی کا، اور ہمارا نقطۂ نظر بنیادی طور پر مختلف تھا۔ ۔ کنہیالال منشی سومناتھ کے کھنڈروں کو دوبارہ کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہماری نظر میں موجودہ انسانی جدوجہد کی فیصلہ کن عظمت پر گڑی تھیں۔ ۔ ''

گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ میں عشرت علی صدیقی نے ص ص ۵۹ - ۶۱ پر اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے عنوان سے ۱۹۳۶ء کے ناگپور کے اجلاس میں گاندھی جی کا خطبۂ صدارت درج کیا ہے، لیکن اس کے ماخذ کا کوئی اندراج نہیں ہے۔ صرف یہ اطلاع نوٹ میں ہے کہ یہ لکھی ہوئی تقریر تھی۔ خطبہ یہ ہے:

"عالم فاضل لوگ ایک دوسرے کے ادب کا کچھ علم حاصل کریں، صرف اتنے ہی سے ہمیں کوئی اطمینان نہیں ہو سکتا۔ ہمیں تو دیہاتی ادب کی بھی ضرورت ہے۔ اور دیہاتوں میں موجودہ زمانے کے ادب کے پرچار کی بھی۔ شرم کی بات ہے کہ چیتنیہ کے تبرک کا فائدہ ہندوستان کی سبھی زبانیں بولنے والوں تک نہیں پہنچ پاتا۔ تروویلوور کا نام شاید ہم سب نہیں جانتے ہوں گے اتر بھارت کی جنتا تو اس سنت کا نام جانتی ہی نہیں۔ اُس نے تھوڑے لفظوں میں جیسا گیان دیا ہے، ویسا بہت کم سنت لوگ دے سکتے ہیں۔ اس بارے میں تو اس وقت تونکارام ہی کا دوسرا نام میرے خیال میں آتا ہے۔

اگر ہم سارے ہندوستان کے ادب کے لمبے چوڑے میدان میں داخل ہوں، تو کیا اس کی کچھ قدریں اور حدیں بھی مقرر ہونی چاہییں؟ میری رائے میں ضرور ہونی چاہییں۔ مجھے کتابوں کی گنتی بڑھانے کا موہ کبھی نہیں رہا۔ میں اسے ضروری نہیں مانتا کہ ہر ایک صوبے کی زبان میں لکھی اور چھپی ہر ایک کتاب کی جانکاری دوسری سب زبانوں میں دی جائے۔ جو ادب ایکتا کو، اخلاق کو، ہمت و بہادری کو، اور دوسری اچھی باتوں اور سائنٹفک رویئے کو بڑھانے والا ہو، اس کا پرچار ہر ایک صوبے میں ہونا ضروری اور مفید ہے۔

آج کل عشقیہ رنگ والے گندے ادب کی باڑھ سب صوبوں میں آ رہی ہے۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ایک عشقیہ رنگ کو چھوڑ کر، اور کوئی رنگ ہے ہی نہیں۔ عشقیہ

رنگ کو بڑھانے کے کارن ۱ ایسے لوگ دوسروں کو تیاگی کہہ کر اُن کی مخالفت کرتے، اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں، جو سب چیزوں کا تیاگ کر بیٹھے ہیں، وہ بھی رس کا تیاگ تو نہیں کر پاتے۔ کسی نہ کسی طرح کے رس سے ہم سب بھرے ہیں۔ دادا بھائی نے دیس کے لیے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ پھر بھی وہ رس سے بھرے تھے۔ دیس سیوا ہی کو انھوں نے اپنا رس بنا رکھا تھا۔ اس میں اُن کو خوشی ملتی تھی۔ چیتنیہ کو رس سے خالی کہنا رس نہ جاننے کے برابر ہے۔ نرسنگ مہتا نے اپنے کو بھوگی (لطف و مسرت کا رسیا) بتایا ہے۔ لیکن وہ گجرات کے سب سے اونچے بھگت تھے۔ اگر آپ کو میری بات بری نہ معلوم ہو، تو میں یہاں تک کہوں گا کہ میں عشقیہ ادب کو سب سے گھٹیا قسم کا ادب سمجھتا ہوں۔ اور جب اس میں فحش پن آجاتا ہے، تب اسے بالکل ہی فضول اور چھوڑنے کے لائق مانتا ہوں۔ اگر میرا بس چلے تو میں اس سنستھا میں ایسے ادب کی ممانعت کرا دوں۔ اِسی طرح جو ادب فرقہ داری نفرت کو، دھرم کے نام پر اندھے ہو کر، بُرے سے بُرا کام کرنے کو، اور جنتا میں، یا الگ الگ آدمیوں میں دشمنی کو بڑھاتا ہے، اس کو بھی چھوڑ دینا ضروری ہے۔

یہ کام کیسے کیا جائے؟ منشی جی اور کاکا صاحب نے ہمارا راستہ ایک حد تک صاف کر رکھا ہے۔ جو ادب کے ایک بڑے علاقے کی سیوا کرنا چاہتا ہو، اُس کا پرچار بڑے پیمانے پر بولی جانے والی زبان ہی سے ہو سکتا ہے۔ ایسے کام کے لیے جو (؟) ہندی ہندستانی دوسری کسی بھی زبان سے زیادہ موزوں ہے۔ ہندی کو ہندستانی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس زبان میں فارسی محاوروں (؟) سے پرہیز نہ کیا جائے۔

انگریزی بھاشا کبھی صوبوں کے لیے آپسی تبادلۂ خیال کا ذریعہ نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم سچ مچ ہندستانی ادب کی ترقی چاہتے ہیں، اور الگ الگ زبانوں میں جو جواہرات چھپے پڑے ہیں، اُن کا پرچار ہندستان کے کروڑوں انسانوں میں کرنا چاہتے ہیں، تو یہ سب ہم ہندستانی کی معرفت ہی کر سکتے ہیں۔"

اس خطبۂ صدارت کے علاوہ صرف ہندوستانی کے بارے میں دو نوٹ / شذرے / مضامین ترجمن میں چھپے، جو بعد میں نقل کئے جائیں گے۔ قاضی عبدالغفار اور عشرت علی صدیقی کو

کچھ اور اس موضوع پر نہیں ملا جس کا تعلق ساہتیہ پرشد کے ناگپور اجلاس سے ہو۔

انڈین نیشنل کانگرس نے ۱۹۲۵ء کے کانپور اجلاس میں ہندستانی کے بارے میں جو رزولیوشن (نمبر ۸) منظور کیا تھا، اس کی حمایت میں ۷ر جون ۱۹۲۶ء کے ینگ انڈیا اور ۳ر جنوری ۱۹۲۷ء کے نوجیون میں گاندھی لکھ چکے تھے۔ (" کانگرس کی کارروائی، جہاں تک ہو سکے، ہندستانی میں چلائی جائے گی۔") اکتوبر ۱۹۱۷ء میں بھڑوچ میں گاندھی جی کہہ چکے تھے " یہ دلیل دی جاتی ہے کہ ہندی اور اردو دو الگ الگ زبانیں ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اتری ہندستان میں ہندو اور مسلمان، دونوں ایک ہی زبان بولتے ہیں۔" ذرا زیادہ تفصیل سے اقتباس نقل کیا جا چکا ہے۔ گاندھی جی ہندی ساہتیہ سمیلن کے اجلاسوں کی صدارتیں کرتے کرتے، اس تنظیم کے روحِ رواں اور ترجمان بھی بن گئے۔ اور اس کا تباہ کن نتیجہ ناگپور کا اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا اجلاس تھا۔ یہاں جو سوال کانٹے کی طرح ذہن میں چبھتا اور کھٹکتا ہے، وہ یہ ہے کہ ۱۹۳۵ء میں ہندوستان کی معروف ترین ادبی شخصیتیں تھیں رابندر ناتھ ٹیگور، اقبالؔ، منشی پریم چند، اور قاضی نذرالاسلام گاندھی جی اور جواہر لال نہرو، دونوں ٹیگور اور اقبالؔ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ لیکن اس اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے لیے انھیں نہیں بلایا گیا۔ اقبالؔ کی صحت اچھی نہیں تھی، اور علاج کے لیے (تیسری بار) بھوپال ۲ر مارچ ۱۹۳۶ء کو گئے تھے۔ بھوپال سے ناگپور بہت دور نہیں۔ اس زمانے میں ایک دن یا ایک رات کا سفر تھا۔ اگر کوشش کی گئی ہوتی تو بہت ممکن تھا اقبال ۲۴ر اپریل کے ناگپور اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے یا تو بھوپال ہیں زیادہ ٹھہر جاتے، یا پھر لاہور سے آتے، اور واپسی پر بھوپال رُک جاتے۔ نہ گاندھی جی نے، اور نہ کسی اور نے اجلاس میں ٹیگور یا اقبالؔ کا ذکر کیا۔ منشی پریم چند بھی اس لیے بلائے گئے کہ انھوں نے ہنس (بنارس) کو ہندی ساہتیہ سمیلن کا آفیشل آرگن بنا دیا تھا۔ اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد کنھیالال منشی اور کالیلکر کا اسٹیج منیجڈ شو (Stage Managed Show) تھا، اور ان لوگوں نے گاندھی جی، جواہر لال نہرو، اور اچاریہ نریندر دیو کو استعمال کیا۔

انجمن ترقی اردو کا دفتر اورنگ آباد میں تھا، اور وہیں سے اردو مجلّہ نکلتا تھا۔ ۱۶: تا ۱۸ جلد اپریل ۱۹۳۰ء میں شایع ہوئی۔ ص ۲۱۵ سے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی اصل حقیقت (از ایڈیٹر) مولوی عبدالحق کا تاریخی مضمون ہے۔ یوں تو اس مضمون کے ایک ایک لفظ کی اہمیت ہے، لیکن طوالت کے پیشِ نظر، ہم اس کے کچھ حصّے چھوڑ دیں گے۔ مولوی صاحب نے لکھا:

بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی اصل حقیقت

بہت سے اصحاب اس جملے کے معنے نہیں سمجھیں گے، اور عنوان کو پڑھ کر انھیں الجھن ہو گی۔ اس

لیے سب سے اوّل یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس کے معنے ہیں: ہندوستان بھر کی ادبیات کی انجمن۔ اس کا پہلا اجلاس ۲۴ اور ۲۵ اپریل کو ناگپور میں ہوا۔ مہاتما گاندھی اس کے صدر تھے۔ انھیں تاریخوں میں ہندی ساہتیہ سمّیلن کے اجلاس بھی مختلف اوقات میں وہیں ہوے۔ اس کے صدر بابو راجندر پرشاد تھے۔ اس سے قبل کہ میں پرشد کے اجلاس کے حالات بیان کروں، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس کی شانِ نزول سے مختصر بحث کروں یعنی یہ کہ یہ انجمن کن وجوہ سے وجود میں آئی۔ اس کا اصل مقصد کیا ہے۔ جب تک یہ نہ کیا جائے گا۔ اس کی پوری حقیقت سمجھ میں نہ آے گی۔

مسٹر کاکا کالیکر اس اجلاس کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ انھوں نے اپنے ایڈریس میں بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی پیدائش کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ میں اس کا خلاصہ یہاں لکھتا ہوں، کیوں کہ اُن کا بیان زیادہ مستند سمجھا جائے گا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ۱۹۱۹ء میں مہاراشٹ دھستا (ساہتیہ) سمّیلن منعقدہ بڑودہ میں سب سے (پہلے) یہ خیال پیدا ہوا۔ اس کے بعد کولھاپور کے اجلاس میں مہاراجہ بڑودہ نے بھارت ساہتیا پرشد کا خاکہ بہت پُرزور طریقے سے پیش کیا۔ کراچی میں کانگریس (کے اجلاس) کے موقع پر، مسٹر کنھیالال منشی سے جو میری بات چیت ہوئی، تو اس میں بھی ہم نے ایک ایسی سوسائٹی کی ضرورت کو محسوس کیا۔ پچھلے سال جب اندور میں ہندی ساہتیہ سمّیلن کا اجلاس مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہوا، اور ہم ایک جا جمع ہوے، تو ایک مفصّل تجویز اس کے متعلق منظور کی گئی، جسے عمل میں لانے کے لیے مسٹر کنھیالال منشی، ہری ہر شرما، اور گردھر شرما کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ ہندی ساہتیہ سمّیلن کے چند مہینے بعد، مہاراشٹ ساہتیہ سمّیلن کا اجلاس اندور میں ہوا۔ اس نے بھی کولھاپور کے تخیّل کو عمل میں لانے کے لیے ہندی ساہتیہ سمّیلن سے تبادلۂ خیالات کیا۔ ہندی ساہتیا سمّیلن نے کاکا کالیلکر، ہری بھاؤ اپادھیاے، اور بابا راگھوداس کو اندور بھیجا۔ اندور مہاراشٹ ساہتیہ سمّیلن نے اپنی ساہتیا پرشد کو اطلاع دی کہ بھارتیہ ساہتیہ سمّیلن قایم کرنے میں مدد دے۔ اسی طرح کرناٹک اور گجرات کی ساہتیہ سمّیلنوں نے بھی اس تحریک کو سراہا۔

یہ تو ہے، اس کی پیدائش اور ابتدا کی حقیقت۔ اب رہا اس کا مقصد، سو وہ اس قرارداد کے الفاظ ہیں۔

"اس پرشد کا ادیشس (مقصد) ہوگا کہ (الف) ہندوستان کے سب پرانتوں کی بھاشاؤں کے ساہتیوں (ادبوں) اور ساہتکاروں (ادیبوں) میں آپس میں میل کرنا، اور اس

سے بھارتیہ ساہتیوں کی ترقی اور پھیلاو میں مددگار ہونا۔ (ب) اس سبھا کا کام ' ہندی یعنی ہندستانی ' میں ہوگا۔ ۔ ۔ ۔

اس کمیٹی نے جو اس انجمن کے مقاصد کی تکمیل کے لیے مقرر کی گئی تھی، پہلا کام یہ کیا کہ ماہنامہ ہنس کو، جو کئی سال سے ملک کے قابل ادیب منشی پریم چند صاحب کی ایڈیٹری میں جاری تھا، اپنے سایہ عاطفیت میں لے لیا، اور اب اسے پرشد کا رسالہ بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اور منشی پریم چند صاحب کے ساتھ گجراتی زبان کے ادیب اور مورخ مسٹر کنھیا لال منشی بھی اس کی ایڈیٹری میں شریک ہو گئے ہیں۔"

اس مختصر تمہید کے بعد، جو بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی پیدائش کے مقاصد کے متعلق تھی۔ میں آپ کو اس کے پہلے اجلاس کی روداد سنانا چاہتا ہوں، جو ہم سب کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

۲۴/اپریل سنہ (۶) ۱۹۳ء کو تقریباً دس بجے دن کے اس کا پہلا اجلاس شروع ہوا۔ سب سے اوّل، مسٹر کاکا کالیلکر نے اپنے ایڈریس پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد صدرِ انجمن مہاتما گاندھی کا مطبوعہ ایڈریس، جو صرف ایک صفحے کا تھا، تقسیم کردیا گیا، اور مہاتما جی نے یہ کہہ کر کہ مطبوعہ ایڈریس پڑھ کر سنانا فضول ہے، وہ آپ خود پڑھ لیں گے، زبانی تقریر شروع کر دی۔ یہ ایسی آہستہ آواز میں تھی کہ پاس والے بھی اچھی طرح نہ سن سکے۔

پرشد کے اس جلسے کا سب سے بڑا کارنامہ وہ ریزولیوشن تھا جسے میں اوپر نقل کر چکا ہوں۔ زیادہ تر بحث اسی پر رہی۔ اس کے پہلے جز سے کسی کو اختلاف نہ تھا۔ البتہ دوسرے جز پر بہت کچھ گفتگو رہی۔ اصل مسودے میں یہ الفاظ تھے کہ اس پرشد (انجمن) کی ساری کارروائی "ہندی ہندستانی" میں ہوگی۔ یہ لفظ پہلی بار یہاں سننے میں آیا۔ غالباً یہ مہاتما گاندھی کے جدّت پسند دماغ کا نتیجہ تھا۔ میں نے مہاتما جی سے کہا کہ انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے ریزولیوشن میں یہ طے کیا تھا کہ اس ملک کی زبان ہندستانی ہوگی خواہ وہ ناگری حروف میں ہو یا فارسی حروف میں۔ اس کے بعد آپ نے ہنس کے متعلق جو تحریر شایع کی، اس میں آپ لکھتے ہیں کہ اس رسالے کے مضامین کی زبان ہندی (خواہ یا) ہندستانی ہوگی۔ اس کے کیا معنے؟ فرمانے لگے کہ کانگریس کا ریزولیوشن بھی میں نے ہی "بنایا تھا"۔ میں نے عرض کیا کہ یہ صحیح ہے، لیکن اس وقت ہندستانی کے معنے ہم ہرگز نہیں سمجھے تھے۔ کہنے لگے۔ اب میں نے اس کے معنے بتا دیئے ہیں، جو ہنس کی تحریر میں آپ

نے دیکھے۔ یہ گاندھی جی کی محض زبردستی ہے۔ یہ انھوں نے ایک نیا لفظ ایجاد کیا ہے۔ "ہندی ہندوستانی" جو بالکل بے معنی ہے۔ یہی لفظ پریشد کی مجلس استقبالیہ کے صدر کاکا کالیلکر صاحب نے اپنے ایڈریس میں استعمال کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے ان صاحبوں نے پہلے سے یہ طے کر لیا تھا کہ ہندستانی کا لفظ تنہا استعمال نہ کیا جائے تاکہ اس کی گنجایش ہی باقی نہ رہے کہ ہم میں سے کوئی شخص اس کا مفہوم اردو لے سکے جب گاندھی جی سے سوال کیا گیا کہ ہندی ہندوستانی سے آپ کا کیا مطلب ہے، تو فرمایا کہ وہ ہندی، جو آگے چل کر ہندستانی ہونے والی ہے۔ اس پر اعتراض کیا گیا کہ یہ تو کوئی زبان نہ ہوئی۔ یہ تو آپ کی خواہش یا منتہا ہے۔ اس سوال کے جواب میں کہ ہندی کون سی زبان ہے، اور ہندستانی کون سی، مہاتما جی نے فرمایا کہ ہندی ادبی زبان ہے، اور عام لوگ کم سمجھتے ہیں، اور ہندستانی زبان وہ ہے جو عام لوگ بول چال میں استعمال کرتے ہیں، لیکن ابھی اس کا ادب نہیں بنا۔ اپنے مطبوعہ ایڈریس میں انھوں نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ ہندی کو ہندستانی کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس بھاشا میں ان فارسی الفاظ کو، جو زبان میں رائج ہو گئے ہیں، ترک نہ کیا جائے۔ غرض صبح کا جلسہ اس پر ختم ہو گیا، اور کوئی بات طے نہیں ہوئی۔

سہ پہر کے جلسے میں پھر یہی بحث چھڑ گئی۔ جب مہاتما جی سے یہ کہا گیا کہ ریزولیوشن میں یا تو آپ ہندی کا لفظ رکھیے، یا ہندوستانی کا، ہندی۔ ہندستانی کے کوئی معنے نہیں، تو فرمایا کہ ہم یہ فیصلہ کر چکے ہیں، اور میں ہندی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے ہندی سمیلن کے ساتھ چلنا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نیشنل کانگریس کے فیصلے کے ساتھ ساتھ کیوں نہیں چلتے، جس نے یہ قطعی فیصلہ کر دیا ہے کہ ملک کی زبان ہندستانی ہوگی۔ میں نے دانستہ دوبارہ یہ بات اس لیے کہی تھی کہ صبح کی گفتگو کے وقت پنڈت جواہر لعل نہرو موجود نہ تھے۔ اس وقت وہ میرے قریب تشریف رکھتے تھے، اور خیال تھا کہ وہ بحیثیت صدر کانگریس کے ضرور میری تائید کریں گے، لیکن مجھے افسوس، اور کسی قدر مایوسی ہوئی، کہ انھوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا، اور خاموش بیٹھے رہے۔ اور ایک نہیں، وہاں اکھٹے تین کانگریس کے صدر موجود تھے (دو سابق اور ایک حال) مگر کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ گاندھی جی نے میرے سوال کے جواب میں وہی کہا جو صبح فرما چکے تھے۔ اس کے بعد جب یہ گفتگو بڑھی تو گاندھی جی نے "ہندی ہندوستانی" کو بدل کر "ہندی یعنی ہندوستانی" کے الفاظ رکھ دیئے۔ اس پر اختر حسین صاحب رائے پوری نے یہ ترمیم پیش کی کہ ریزولیوشن میں یا تو لفظ ہندی رکھا جائے یا ہندستانی، کیوں کہ مہاتما جی خود ہندی اور ہندوستانی کے دو الگ الگ مفہوم بتا چکے ہیں، اس بنا پر ہندی اور ہندی ہندوستانی

ایک زبان نہیں ہوسکتیں، اس لیے "ہندی یعنی ہندوستانی" بے معنی ہوگا۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک لفظ رکھنا مناسب ہوگا۔ میں نے یہاں تک کہا کہ آپ صرف ہندی رکھیے، اور میں اس کی تائید کروں گا۔ اس پر وہ ہنسنے لگے اور کہا کہ یہ نہیں ہوسکتا آخر مہاتما جی نے ووٹ پر آمادگی ظاہر کی۔ مسٹر کنہیالال منشی نے کہا کہ یہ عاملہ ادبی اور لسانی ہے، ووٹ سے طے نہیں ہونا چاہیے۔ مہاتما جی نے کہا کہ ووٹ کے سوا کوئی چارہ نہیں، فیصلے کی یہی ایک تدبیر ہے۔ ووٹ کا حکم صادر ہوا۔ لیکن ووٹ لینے سے پہلے بڑی ہوشیاری یہ کی گئی کہ ہندی سمیلن کے ان نمائندوں کو بھی ووٹ کا حق دے دیا گیا، جو اس جلسے میں حاضر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کثرتِ رائے اس ترمیم کے خلاف نکلی۔ اگر ہندی سمیلن کے نمائندوں کو ووٹ کی اجازت نہ دی جاتی۔ جس کا انھیں حق حاصل نہ تھا، تو ترمیم غالباً منظور کرنی پڑتی۔ مگر مہاتما گاندھی ساہتیہ پریشد کو ہندی سمیلن کا بچہ سمجھتے ہیں، اور ان کے تصور میں یہ دو مجلسیں کبھی الگ نہیں ہونے پاتیں (پائیں)، حالاں کہ بقول منشی پریم چند کے یہ خیال صحیح ہے۔ پہلے دن کی کارروائی یہیں ختم ہوگئی۔

اصل معاملہ تو پہلے ہی دن طے ہوچکا تھا۔ دوسرے دن ۲۵/ اپریل کو ایک معمولی جلسہ ہوا۔ پہلے دن سہ پہر کو ایک گفتگو یہ بھی چھڑ گئی تھی کہ ہمیں اپنی زبانوں کے ادب کا رخ بدلنا چاہیے۔ پرانے فرسودہ خیالی مضامین کو دہرانا موجودہ حالات کے بالکل منافی ہے۔ ہمیں اپنے ادب کو زندہ، اور زندگی کے حالات کے مطابق بنانا چاہیے۔ اس بحث میں پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی حصہ لیا۔ اور یہ ارادہ ہوا کہ دوسرے روز ایک ریزولیوشن اس مضمون کا پیش کیا جائے۔ کنہیالال منشی اور دو ایک اور صاحب اس خیال کی مخالفت کرتے رہے۔ پریشد کے مہا پرشوں نے اس خوف سے کہ کہیں جدید خیال والے کوئی ریزولیوشن پیش نہ کردیں رات ہی کو اس مضمون کا ایک ہلکا سا ریزولیوشن تیار کیا، اور دوسرے روز اجلاس شروع ہوتے ہی پہلے پڑھ کر سنایا جو بلا اختلاف منظور کرلیا گیا۔ لیکن یہ ریزولیوشن کچھ تصریح کا محتاج تھا، اس لیے ان صاحبوں نے، جو دیسی ادبیات کی اصلاح پر مصر تھے، ایک الگ بیان شائع کیا۔ اس کے بعد انتظامی کمیٹی کے ارکان کا انتخاب ہوا ان میں سے چند تو ہندی ساہتیہ سمیلن نے اپنے حق کی بنا پر اپنے نمائندے انتخاب کیے، اور کچھ مہاراشٹ ساہتیہ سمیلن نے، اور چند متفرق اشخاص منتخب ہوئے۔ بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے پہلے اجلاس کی کارروائی ختم ہوئی۔

اب اس کارروائی پر میں مختصر سا تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے یہ دیکھ لیا کہ ہندوستانی کو ہندی میں اور ہندی کے معنی ہندوستانی بنانے میں، پھر "ہندی ہندوستانی" کے جدید لفظ کے اختراع میں، اور

آخر میں ہندی یعنی ہندوستانی کے الفاظ میں کیسے کیسے پہلو بدلے ہیں۔ پہلے اردو کا لفظ ترک کرکے ہندوستانی اختیار کیا گیا۔ یہاں تک کچھ مضائقہ نہ تھا۔ اور اس پر ہم بھی رضامند تھے۔ اور ہمارے بعض مستند ادیبوں اور اہل الرائے اصحاب نے یہ لفظ لکھنا شروع کر دیا تھا۔ بلکہ اُن کا اصرار تھا کہ اردو کی بجائے اب ہندوستانی لکھا جائے اور اس پر ایک حد تک عمل بھی ہونے لگا تھا۔ فریقین نے یہ سمجھوتا تسلیم کر لیا تھا۔ اب ہندوستانی کا لفظ بھی متروکات میں داخل ہو گیا، اور صرف ہندی رہ گیا۔ معترض کے لیے اُن کے پاس جواب موجود ہے، وہی جو گاندھی جی نے فرمایا "ہندی یعنی ہندوستانی"۔ گاندھی جی نے رسالۂ ہنس کی زبان کو بھی ہندی الخواہندوستانی فرمایا ہے۔ جب اُن سے کہا گیا کہ ہنس کی زبان بہت کٹھن ہے، وہ ہندوستانی نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کی زبان کلکتہ کے مشہور رسالہ وشال بھارت سے بھی زیادہ مشکل ہے، تو انھیں حیرت ہوئی۔ ہنس کے ایڈیٹروں نے تو صاف صاف لکھ دیا ہے کہ "اب ہندی ملکی زبان کی صورت اختیار کر کے، خاص و عام کی زبان ہو چکی ہے۔ مہاتما گاندھی جیسے ملک کے سدھارنے والے اسے زندہ ملکی زبان بنانے کا عہد کر چکے ہیں"۔ اس کی تائید بابو راجندر پرشاد کے اس خطبۂ صدارت سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے ہندی ساہتیہ سمیلن میں پڑھا تھا۔ اس میں انھوں نے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا ذکر کرتے ہوے فرمایا کہ "خوشی کی بات ہے کہ اس کمیٹی کی کوشش سے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی بنیاد ڈالی جا رہی (ہے) اور اس کا پہلا اجلاس اس ناگپور میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہو رہا ہے۔ اس کے ذریعے سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ ہندی کے پرچار کے متعلق لوگوں میں جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ وہ بھی دور ہو جائے گی اور ہمیں امید ہے کہ اس سے ہندی پرچار میں مدد ملے گی"۔ کاکا صاحب کالیلکر نے بھی اپنے ایڈریس میں صاف طور پر اس کا اعلان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "جن لوگوں نے اس تحریک (بھارتیہ ساہتیہ پرشد) کی ابتدا کی ہے، انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہمارا سارا کاروبار راشٹر بھاشا (قومی زبان) ہندی ہندوستانی میں چلے گا۔ ہماری کوشش ہے کہ تمام ہندوستان کی بھاشاؤں کی ابجد ایک ہی ہو، اور اب سب میں ناگری ہی (رسم خط) جاری ہو جائے، تاکہ وہ اپنے اپنے صوبے کی زبان کا کام ناگری میں کریں"۔

یہ الفاظ ایسے صاف اور صریح ہیں کہ ان کے لیے کسی دلیل و حجت کی ضرورت نہیں۔ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا یہ مقصد بے شک قابلِ تعریف ہے۔ کہ وہ دیسی زبانوں کے ادبیات کی اصلاح و ترقی چاہتی ہے۔ لیکن اس کا دوسرا مقصد بلاشبہ ہندی زبان کا پرچار ہے، جس میں وہ اور ہندی سمیلن دونوں متفق ہیں۔ اور غالباً

یہی وجہ ہے کہ پرشد کے اجلاس کی تاریخیں اور مقام بدل کر انھیں ایام اور اسی مقام میں رکھا گیا، جن تاریخوں میں اور جہاں ہندی سمیلن کا اجلاس تجویز ہوا تھا، تاکہ ہندی سمیلن کے اثر اور امداد سے مستفید ہو سکے۔ غرض یہ کہ پرشد ادبیات کے مسئلے سے گزر کر زبان کی اشاعت پر آگئی، اور مختلف زبانوں کے ادب اور ادیبوں کے اتحادِ عمل سے ہندی کے پرچار کا مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔

اس ضمن میں میں اس امر کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں کہ منشی پریم چند صاحب شروع سے آخر تک ہمارے ساتھ رہے، اور وہ اس تمام گفتگو اور بحث سے بددل ہی نہیں تھے، بلکہ برہم بھی ہوئے۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ ہندی اردو کے جھگڑے کو مٹا کر کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے، جو دونوں فریقوں میں مقبول ہو سکے۔ لیکن جو کارروائی وہاں ہوئی، اس سے وہ بھی ایسے ہی مایوس ہوئے، جیسے ہم میں سے بعض لوگ

- - - - - - - - - -

میں ایک بات کہنی بھول گیا۔ وہ یہ ہے کہ پہلے دن کے اجلاس میں پروفیسر محمد مجیب (جامعہ ملّیہ دہلی) کا ایک خط انگریزی زبان میں مہاتما جی کے نام وصول ہوا۔ یہ خط نہایت معقول اور مدلل ہے، اور بہت ادب اور خلوص سے مہاتما جی سے یہ اپیل کی ہے کہ وہ نیشنل کانگریس کے فیصلے پر قائم رہیں، جس نے ملک کی زبان ہندستانی قرار دی ہے۔ انھوں نے مہاتما جی کی اندور والی تقریر، نیز "ہنس" والی تحریر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، جن میں "ہندی یا ہندستانی" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور ہندی کے معنے ہندستانی قرار دیے ہیں، جو درست نہیں۔ اردو یا ہندستانی سے بالکل قطع نظر کی گئی ہے۔ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے قائم ہونے اور ہنس کے جاری ہونے سے ان کو بہت خوشی ہوئی تھی کہ یہ مشترکہ اور عام زبان بنانے میں مضبوط بنیاد کا کام دیں گے۔ لیکن ہنس کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ اس میں زیادہ تر سنسکرت آمیز ہندی کا استعمال کیا گیا ہے، اور اس کی زبان دوسرے ہندی رسالوں سے مشکل ہے۔ مجیب صاحب ساہتیہ پرشد کے ساتھ "بھارت" کے لفظ کو بھی پسند نہیں کرتے، کیوں کہ اس لفظ کا مفہوم آریائی ہندوستان ہوتا ہے، اور اس لیے اس سے نہ صرف مسلمان اور ان کی تمام کوششیں جو ہندی زندگی (کذا) بنانے میں صرف ہوئیں، بلکہ صدہا سال کے تغیرات اور ارتقائی منازل جو ہم نے طے کیے ہیں، وہ بھی خارج ہو جاتے ہیں۔ ان کی رائے میں بھارت کے بجائے ہندستانی کا لفظ زیادہ مناسب ہوتا۔ مجیب صاحب نے ایک بات اور بھی لکھی ہے، جو صحیح معلوم ہوتی ہے، کہ اگرچہ عربی اور سنسکرت میں اصطلاحی الفاظ کا بہت بڑا خزانہ ہے، لیکن ہماری عام اور مشترکہ زبان کو ان میں سے کسی پر

بھی منحصر (انحصار) نہیں کرنا چاہئے۔ عربی اگر غیر زبان ہے تو سنسکرت بھی اس ملک میں کبھی عام طور پر نہیں بولی جاتی تھی۔ جو لوگ ہندی زبان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہندی میں سنسکرت کے الفاظ اصلی حالت میں نہیں پائے جاتے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مسٹر منشی لکھتے ہیں کہ گجراتیوں، مراٹھیوں، بنگالیوں اور کرالیوں نے جن روایات پر اپنی ادبی زبان کو بنایا ہے، اس میں اردو کا عنصر تقریباً معدوم ہے۔ مجیب صاحب اسے تسلیم نہیں کرتے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس میں مطلق شبہ نہیں کہ گجراتی، مرہٹی اور بنگالی زبانوں میں فارسی الفاظ کی بہت بڑی تعداد موجود ہے" اور "میں ہرگز اس امر کے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ انھیں آپس میں ایک دوسرے سے، نیز مسلمانوں سے قریب آنے کے لیے اپنی زبانوں کو سنسکرت آمیز بنانے کی ضرورت ہے"۔

اس کے بعد انھوں نے مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن کی اُس تقریر کا ذکر کیا ہے، جو انھوں نے الہ آباد میں ہندی میوزیم کے اختتام کے وقت فرمائی تھی، اور جس میں انھوں نے یہ کہا تھا کہ چینی زبان کے بعد ہندی زبان ایشیا میں سب سے زیادہ بولی جاتی ہے اس کے معنے یہ ہوئے کہ عام اور مشترکہ زبان کا سوال طے ہو گیا۔ یعنی وہ زبان ہندی ہوگی۔ ۔ ۔ یہ "فرقہ وارانہ تصفیہ" کی طرح ایک نئے فساد کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے۔

اجلاس کے دوران جب کہ زبان کی بحث چھڑی ہوئی تھی، گاندھی جی نے ایک ایسی بات کہی جسے سُن کر مجھے بے حد تعجب اور افسوس ہوا۔ انھوں نے فرمایا کہ اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے، قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے، اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔ حیرت ہے کہ جس شخص کی صحبت میں مدتوں مولانا محمد علی مرحوم، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر سید محمود جیسے لوگ رہے ہوں، وہ اپنی زبان سے ایسی بات نکالے، جو سر تا سر غلط، بے بنیاد اور بے اصل ہے۔ میں ہر چند یہ توجیہہ کر کے اپنی تسلی کرنا چاہتا ہوں کہ مہاتما جی نے یہ بات ناواقفیت کی بنا پر کہی ہے، لیکن دل نہیں مانتا۔

> "مہاتما جی اپنی تقریر میں، ہندی، اردو یا ہندوستانی کی بحث میں بار بار ہندو اور مسلمان کے لفظ استعمال کرتے ہیں۔ میں نے ایک آدھ بار ٹوکا کہ یہ ہندو مسلم سوال نہیں ہے، بلکہ بحث ہندی، اردو یا ہندوستانی کی ہے۔ ہزارہا ہندو ایسے ہیں، جن کی زبان اردو ہے، اور وہ اردو کے ادیب ہیں۔ اسی طرح ہزاروں مسلمان ہندی بولتے اور لکھتے ہیں۔ اس لیے اس بحث کو فرقہ وارانہ رنگ نہیں دینا چاہیئے"۔

مولوی عبدالحق نے کچھ اور باتیں بھی لکھی ہیں جو زیادہ سخت ہیں، انھیں نقل کرنا بہت مناسب نہیں معلوم ہوا کہ

موضوع کا رُخ کسی اور طرف مڑ جاتا۔ اردو کا یہ شمارہ کم یاب ہے، لیکن نایاب نہیں، اس لیے بھی کچھ حصّے چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے پروفیسر محمد مجیب کے خط کا حوالہ دیا ہے۔ اصل انگریزی میں خط فراہم نہ ہوسکا۔ البتہ اس کے دو اردو ترجمے موجود ہیں ایک: گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ میں، اور دو ،جامعہ کے مجیب نمبر میں یہ جلد ۸۳، شمارہ ۹-۱۰ ہے (ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۶ء)۔ عنوان ہے مجیب صاحب کا ایک تاریخی خط (ص ۱۵۴ سے ص ۱۶۲ تک اقتباسات ہیں) خط کے آخر میں چھ تجویزیں ہیں:

"۔۔۔ جس چیز کا میں خواب دیکھ رہا ہوں، وہ تو یہ ہے کہ آپ انھیں کی بنا پر ایک اعلان اپنی طرف سے شائع کریں۔ وہ باتیں یہ ہیں:

(۱) ہماری زبان ہندی نہیں کہلائے گی، بلکہ ہندوستانی۔

(۲) ہندوستانی کا کسی ایک مذہبی سماج کے ورثہ سے تعلّق نہ ہوگا۔

(۳) اس زبان کے لفظوں میں یہ نہ دیکھا جائے گا کہ کون دیسی ہیں، اور کون بدیسی۔ بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ کس کا رواج ہے، کس کا نہیں۔

(۴) اردو کے ہندو لکھنے والوں اور ہندی کے مسلمان لکھنے والوں نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں، وہ سب رائج مانے جائیں گے ــــ لیکن اردو اور ہندی کی جو مذہبی حیثیت ہے، اُس پر اس قاعدہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

(۵) اصطلاحیں، اور خاص طور پر سیاسی اصطلاحیں تجویز کرتے وقت سنسکرت کے لفظ اس لیے نہ پسند کیے جائیں گے کہ وہ سنسکرت ہیں، بلکہ اردو، ہندی اور سنسکرت کے لفظوں میں سے لوگوں کو چننے، اور پسند کرنے کا پورا موقعہ دیا جائے گا۔

(۶) دیوناگری اور عربی خط، دونوں رائج اور سرکاری سمجھے جائیں گے، اور ان تمام اداروں میں، جن کا رویّہ پرچارکوں کے اثر میں ہے، دونوں خط سیکھنے کا انتظام ہوگا۔[1]

---

[1] : اردو کا رسم خط نستعلیق ہے، اور فارسی سے ماخوذ ہے یہ دوسری بات ہے کہ فارسی کا رسم خط عربی سے ماخوذ ہے۔ اردو نے رسم خط عربی سے نہیں، فارسی سے، کچھ آوازوں کے لیے نقطوں اور چھوٹی ط کا اضافہ فارسی حروف میں کیا۔ عربی سے رسم خط سندھی نے مستعار لیا، اصوات کے لیے کچھ اضافوں کے ساتھ۔ حیرت کی بات ہے کہ پروفیسر محمد مجیب جیسے عالم اور خاص طور سے تاریخ داں کے قلم سے یہ بات نکلی گئی۔ (کمال)

(جامعہ: مجیب نمبر سے اقتباس)

تھوڑی دیر کے لیے ہم محمد مجیب کے خط اور اس کے مضمرات کو چھوڑتے ہیں۔ اس پر پھر واپس آئیں گے کیوں کہ اس سے کچھ اور تحریریں جڑی ہوئی ہیں۔ منشی پریم چند بھی پرشد کے اجلاس میں شریک تھے، اور بدحظ ہوئے تھے۔ اُن کا رسالہ ہنس اردو کے خلاف تحریک کا آلۂ کار بن گیا تھا۔ مولوی عبدالحق نے اپنے اداریے میں اس کا ذکر کیا۔ اردو کا یہ شمارہ، منشی پریم چند کے خط سے واضح ہوتا ہے کہ اپریل، مئی، جون (۱۹۳۶ء) کا مشترکہ شمارہ تھا۔ اسے پڑھنے کے بعد شاید منشی پریم چند کو احساس ہوا کہ ناگپور میں اردو کے ساتھ اور مولوی عبدالحق کے ساتھ جو زیادتی ہوگئی ہے، اس پر خاموش رہنا مناسب نہ ہوگا۔ چناں چہ انھوں نے ۴ر جون کو ایک خط مولوی عبدالحق کو لکھا۔ اس خط کی بڑی اہمیت ہے، اس لیے نقل کیا جاتا ہے:

دھنپت رائے: پریم چند۔ دفتر رسالہ ہنس، بنارس کنٹونمنٹ

بھائی صاحب قبلہ۔ تسلیم

۴ر جون ۱۹۳۶ء

اس ماہ کے اردو میں میں نے "بھارتیہ ساہتیہ پرشد" پر آپ کا مقالہ دیکھا تو مجھے افسوس ہوا۔ جس کام کو اتنے نیک ارادوں سے اٹھایا گیا، اس کی بسم اللہ ہی غلط ہوتی نظر آتی ہے۔ آپ نے پرشد میں حاضرین جلسہ کا رخ دیکھ کر شاید یہ اندازہ نہیں لگایا کہ مذہبی پبلک کو اس کی مطلق پرواہ نہیں ہے۔ اتنا ہی نہیں، بالعموم لوگ اسے اشتباہ کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ہر ایک زبان کی جانب سے مخالفت ہو رہی ہے۔ علانیہ نہیں تو درپردہ سہی۔ کسی زبان نے بھی اس کا خیر مقدم نہیں کیا۔ کچھ مٹھی بھر لیڈر ضرور شامل ہو گئے ہیں، شاید اس خیال سے کہ یہاں بھی کچھ شہرت کمائی جا سکتی ہے۔ ورنہ اس تحریک سے بہت کم کسی کو دلچسپی ہے۔ اردو میں جس طرح اس کا عدم و وجود برابر ہے، اسی طرح ہندی میں بھی۔ چوں کہ مہاتما جی کا اس بڑے کام سے تعلق بتایا گیا ہے، اس لیے تھوڑے سے خریدار ہو گئے ہیں۔ یہ تو ہے اصلی حالت۔ آپ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ اداروں کے پاس خوب پیسہ ہے، خوب جوش ہے۔ واقعہ اس کے خلاف ہے۔ یہ تحریک اس خیال سے جاری کی گئی تھی کہ ہندوستان کے ادیبوں میں، اور ادو ادبیات میں برادرانہ اور ہمدردانہ احساس پیدا ہو۔ زبان اس کی حتی الامکان سلیس رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ مگر چوں کہ مضامین لکھنے والے مختلف صوبوں کے لوگ ہوتے تھے، اور ہنس کا ایڈیٹوریل اسٹاف اکیلا میرا دم ہے، اس لیے ہر ایک مضمون کی اصلاح مشکل تھی۔ یہ خیال بھی تحت الشعور میں تھا ہی کہ ہنس سے دلچسپی رکھنے والے ۹۹ فیصدی غیر اردو داں ہیں، اس لیے

فارسی اور عربی کا استعمال بے محل ہوگا، کیوں کہ جیسا کہ کاکا کالیکر صاحب نے فرمایا تھا، ہماری سلیس اردو ہی غیر اردوداں اصحاب کے لیے بعید از فہم ہے۔ زبان کی اصلاح تو رفتہ رفتہ ہی ہو سکتی ہے۔ جس طرح سنسکرت سے بھری ہوئی ہندی اردو خط میں لکھی جائے، تو اُسے کوئی نہیں سمجھے گا[1] اسی طرح معرّب (اور مفرّس) اردو سمجھنے والے ہندی میں یا دیگر صوبجات میں خال خال ہیں۔ اس اعتبار سے نہ سہی، ادبی لین دین کے خیال سے ہی، یہ ضروری ہے کہ ہمارے ادیبوں میں اشتراکِ عمل ہو۔ ان میں ادبی اور علمی، اور ذوقی مسائل پر تبادلۂ خیال ہو۔ اس پرشد میں تو کچھ ہوا ہی نہیں۔ مگر آپ نے یہ تو محسوس ہی کیا کہ تین چار اردو داں اصحاب کی موجودگی نے لوگوں پر اتنا اثر کیا کہ قرار دادوں کی زبان وہ ہو گئی، جو اب ہے۔ ورنہ اس کے قبل وہ خالص ہندی زبان میں تھیں۔ اگر یہ ارتباط روز افزوں بڑھتا جاتا، تو کیا آپ کے خیال میں زبان اور ادب پر اس کا اثر نہ پڑتا۔ اور اس سے قطع تعلق کر لینے پر، یا مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہو جانے پر کہ یہ ایک پولٹیکل تحریک ہے، جو ہندی زبان کے پرچار کے لیے جاری کی گئی ہے۔ کیا صورتِ حال بہتر ہوگی؟ جو بعد فی الحال ہے، اُس کے زیادہ ہونے کا امکان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگلے سال آپ حالات میں تغیّر پاتے۔ اور دو چار سال میں جب اردو داں طبقہ کو اس تحریک سے اُنس ہو جاتا، آپ دیکھتے کہ آپ ہی اس پر قابض ہیں۔ میرے لیے تحریک سے صرف اتنی دل چسپی تھی کہ غیر ہندی اور اردو کو ہندوستانی کے گھر میں لاکر ملا دوں۔ مجھے اس سال کامیابی نہ ہوتی۔ ایک دو سال اور نہ ہوتی۔ لیکن اگر اردو داں طبقہ میری امداد کرتا، تو یہ مشکل آسان ہو جاتی۔ مگر جب آپ نے اعلان جنگ کر دیا۔ تو مجھے بھی زیادہ دل چسپی نہیں ہے۔ یہ افتراق والی پالیسی معلوم نہیں کیوں، اس قدر جلد ہمیں کھینچ لیتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ مہاتما گاندھی ہندی کے خدا نہیں، اور نہ اُن کی تاویل ماننے کے لیے ہم مجبور ہیں۔ ہمارا دعوا ہے کہ پرشد کی زبان ہندوستانی ہونا چاہیے۔ ہم ہیں، جنھیں زبان کے مسئلے سے کچھ شغف ہے۔ انھیں اپنے اثر، اور علم، اور مشورے سے اُس منزل کی طرف لے جانا چاہیے۔ اگر اردو داں طبقہ ساتھ دیتا ہے، تو وہ ہندوستانی بنے گی، سچے معنوں میں۔ وہ الگ ہو جاتا ہے، تو پھر وہ ہندی ہندوستانی

---

[1] منشی پریم چند کے اس خیال سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ اُن کے زمانے میں گیتا پریس گورکھپور سے شری مد بھگودگیتا، رامائن اور مہابھارت اردو رسم خط میں بھی چھپتی تھیں۔ آج بھی یہ صحیفے اور پریم ساگر (للّو لال جی کی) اردو رسمِ خط میں اتنی چھپتی ہیں کہ پورے صفحے کے اشتہار ہر مہینے ایک رسالے میں چھپتے ہیں (کمال)

ہو کر رہ جائے گی۔ آپ کا آخری جملہ: ہم بھی بیٹھے ہوئے ہیں، بُرا نہ مانیئے گا، آپ کے شایان شان نہ تھا۔ بھائی اختر (رائے پوری) اگر اس جملے کا استعمال کرتے، تو میں ان کی پیٹھ ٹھونکتا۔ مگر آپ کو ان ننگ خیالیوں سے بالاتر سمجھتا ہوں۔ اور وہ بھی، جب کہ آپ پریشد کی انتظامی سمتی میں ہیں، اور آپ نے ابھی اس سے استعفیٰ نہیں دیا ہے۔ یہ نعرۂ جنگ تو بغلی گھونسا جیسا لگتا ہے۔

زبان کا مسئلہ یونہی حل ہو سکتا ہے کہ دو چار اصحاب مل کر ایک سولہ صفحے کا رسالہ ہندوستانی میں نکالیں ... دو آدمیوں کو اس کا بار سونپا جائے۔ اور جو لوگ اس اسکول کے حامی ہیں، وہ اس میں ہندوستانی زبان میں لکھیں۔ اگر دلّی والے اردو میں کر لیں، تو میں یہاں اسی رسالے کا ہندی ایڈیشن ہو بہو بنارس سے نکالنے پر تیار ہوں۔ اپنے بل پر۔ حالاں کہ میری حالت فاقہ کشی سے ایک ہی قدم پیچھے ہے۔ اس طرح یہ بھوت زیر کیا جا سکتا ہے۔ الگ ہو جانے سے تو وہ اور بھی شریر ہو جائے گا۔

زبان کا مسئلہ پریشد سے بالکل الگ کر دیا جائے۔ وہ خالص ادبی تحریک ہو۔ ہندوستانی کی۔ کے لیے ایک ماہوار، سولہ صفحے کا رسالہ نکالا جائے، جس میں چار مضامین، ذمہ دار اصحاب کے قلم سے لکھے ہوئے ہوں۔ اس طرح ہماری دونوں غرضیں پوری ہو جائیں گی۔ زبان کی بھی اور ادب کی بھی۔ مجھے امید ہے آپ میری تجویز سے متفق ہوں گے۔ میں تو آپ کی رہنمائی میں دوزخ میں جانے کو بھی تیار ہوں۔ حالاں کہ وہ کام بغیر آپ کی رہنمائی (کے) میں زیادہ صفائی سے کر سکتا ہوں۔ اس کا رستہ مجھے خوب معلوم ہے۔

امید ہے آپ خوش ہیں۔

نیاز مند

پریم چند

اردو کے سلسلے میں منشی پریم چند نہایت مخلص انسان تھے۔ ان کا ایک مضمون ہندی اور اردو کا مستقبل جولائی ۱۹۳۷ء کے اردو' میں چھپا تھا۔ ص ص ۴۳۸، ۴۳۷ پر انھوں نے واضح الفاظ میں لکھا:

"مسلمانوں کے عہد میں ہندی کی تین شکلیں ہوں گی۔ ایک ناگری خط میں ٹھیٹھ ہندی، جسے بھاکھا یا ناگری کہتے ہیں۔ دوسری اردو، یعنی فارسی خط میں لکھی ہوئی فارسی آمیز ہندی اور تیسری برج بھاکھا۔ ہندی زبان کو موجودہ صورت میں آتے آتے صدیاں لگ گئیں۔ یہاں تک کہ ۱۸۰۳ء سے پہلے کوئی تصنیف دریافت نہیں ہوتی اس کتاب کا نام چندراوتی

ہے، اور اسے سدل مسر نے لکھا تھا۔ اس کے بعد ہی للّو لال جی، انشا اللہ خاں وغیرہ کا نام آتا ہے۔ مقامِ حیرت ہے کہ سوا سو سال پہلے، جس زبان کے (کی) نثر کا پتا نہیں چلتا، وہ آج ہندوستان کی قومی زبان بن رہی ہے!"

یہ اقتباس اس لیے پیش نہیں کیا گیا کہ انداز سے جو بات منشی پریم چند نے کہی وہ امرِ واقعہ ہے یا نہیں۔ اس سے صرف اُن کے بے ریا اور اردو کے تئیں مخلص ہونے کا پتا چلتا ہے۔

ہندی اتھوا ہندوستانی پر ناگپور کے اجلاس میں نزاع پیدا ہوا۔ گاندھی جی نے اس موضوع پر[1] دو مضمون لکھے۔ ایک ۹ مئی، اور دوسرا ۱۶ مئی ۱۹۳۶ء کے ہریجن میں چھپا تھا۔

(۱)

"اس پرچے میں کسی جگہ پڑھنے والوں کو ایک معزز دوست کا ایک انتہائی دلچسپ خط[2] ملے گا، جو پچھلے دنوں ناگپور میں کل ہند بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے افتتاح میں ڈیلی گیٹوں کے سامنے پڑھا گیا تھا۔ ایسا ہی ایک مسلمان دوست نے بھیجا ہے، جس کے ساتھ اسی مسئلے پر اخبار بامبے کرانیکل مورخہ ۲۷ اپریل کا ایک ایڈیٹوریل بھی نتھی ہے۔ مشترکہ مین صوبائی بول چال (؟ کذا)[3] کے متعلق میری رائے عام طور سے وہی ہے، جو ان دونوں مراسلوں، اور کرانیکل کے مضمون (کذا)[4] میں ظاہر کی گئی ہے۔ تاہم مجھے اندیشہ ہے کہ شاید ان باتوں سے میرا اتفاقِ رائے بعض باتوں ہی تک محدود ہے، اور ان حد بندیوں کو کھول کر بیان کر دینا ضروری ہے۔ ان حدوں سے ــــ اگر ان کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے، اس مقصد کا احاطہ ہوتا ہے کہ جو میرے ان دوستوں کے ذہن میں ہے۔

پہلے میں اس شبہے (؟)[5] کو الگ رکھے دیتا ہوں، جو کچھ مسلمانوں کے دلوں میں پایا جاتا ہے۔ شبہے

---

[1] گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ۔

[2] یہی محمد مجیب کا خط ہے، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے (کمال)

[3] شاید مراد رابطے کی زبان سے ہے (کمال)

[4] شاید مراد اداریہ یا شذرے سے ہے (کمال)

[5] شاید یہ کتابت کی غلطی ہے۔ لفظ شبہے ہوگا۔ (کمال)

کے گہرے بادل ساری فضا پر چھائے ہوئے ہیں۔ کسی شخص کی باتیں اور کام شک و شبہ سے بالاتر نہیں ہیں۔ جو لوگ دل سے فرقہ وارانہ اتحاد چاہتے ہیں، اور جن کے دلوں میں کوئی کینہ نہیں ہے، ان کے لیے میری رائے میں سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ وہ وقتی جذبات کسی ایک طرف یا دوسری سمت (کذا) جھکے بغیر دیانت داری کے راستے پر چلیں ـــــ خاص کر پریشد جیسے معاملہ میں، جسے جذبات سے کوئی سروکار نہیں۔ پریشد کا مقصد یہ ہے کہ ہندستان کی تمام زبانوں کی بہترین چیزوں کو یکجا کرے (کذا) اور اس طرح جو زبان بنے اس کو ہندستان کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کے سامنے پیش کر دے[1] اور اسی مقصد کو سامنے رکھ کر، اس کام میں ایسی بول چال کی زبان استعمال کرے، جو زیادہ سے زیادہ آدمی سمجھ سکیں۔ اردو بلاشبہ دوسری زبانوں میں سے ایک زبان ہے، اور اس میں ایسے خزانے موجود ہیں جن کو سارے ہندستان کی مشترکہ ملکیت ہونا چاہیے۔ کوئی ہندستانی اردو ادب کو نظر انداز نہیں کر سکتا، اگر وہ مسلمانوں کے خیال سے واقف ہونا چاہتا ہے، یا اسلام کے متعلق وہ سب کچھ جاننا چاہتا ہے، جو ہندستانی وسیلوں سے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ پریشد جو ابھی حال ہی میں قائم ہوئی ہے، اگر موجودہ اردو ادب کے خزانے کا دروازہ سارے ہندستان کے لیے نہیں کھول سکے گی، تو وہ اپنے مقصد اور فرض میں ناکام رہے گی۔

میرے مراسلہ نگار نے ایک غلطی کی ہے، جسے صاف کر دینے کی ضرورت ہے۔ اُن کے سامنے ٹنڈن جی (بابو پرشوتم داس ٹنڈن) کی اس تقریر کا، جو انھوں نے الٰہ آباد میں کی تھی، نہ کہ بنارس میں جیسا کہ مراسلہ نگار کا بیان ہے، پورا متن نہیں تھا، ورنہ یہ رائے قائم کر لینے کی غلطی نہ کرتے کہ جب ٹنڈن جی نے یہ کہا کہ ۲۲ کروڑ آدمی ہندی بولتے ہیں، تو اُن کے ذہن میں صرف وہ لوگ تھے، جو آج کی بناوٹی ہندی لکھتے ہیں۔ انھوں نے اس بات کو صاف کر دیا تھا کہ اُن کی مراد وندھیاچل کے اُتر میں بسنے والے ان بہت سے لوگوں سے تھی جن میں سے ۲ کروڑ مسلمان بھی شامل تھے، جو قریب قریب وہی زبان بولتے اور سمجھتے ہیں، جو برج بھاشا سے نکلی ہے، اور جس کی قواعد (گرامر) کا ڈھانچہ وہی ہے، جو برج بھاشا کا ہے۔ اس زبان کو ہندی کا جو نام

---

[1] لسانی نقطۂ نظر سے یہ ایسا ممکن نہیں۔ ہند آریائی زبانوں کا آمیزہ بنانا ہی ممکن نہیں، نہ کہ دراوڑی، ایسٹر کی ہند چینی وغیرہ کی جدید زبانوں اور بولیوں کو بھی اس لسانی کاک ٹیل میں شامل کیا جائے۔ شاید گاندھی جی کے مشیر بھی السنہ کے مختلف خاندان سے تعلق رکھنے والی زبانوں اور بولیوں کا کوئی تصور اپنے ذہنوں میں نہیں رکھتے تھے۔ (کمال)

دیا گیا ہے، وہ اصل نام نہیں ہے۔ مسلمان لیکھکوں نے یہ نام اُن تحریروں کو دیا تھا، جو انھوں نے اُتر کے لوگوں کے لیے لکھی تھیں، اور جو بلاشبہ ان تحریروں کے مانند تھیں جو کہ ہندو بھائی لکھتے تھے۔ اس کے بعد دو الگ الگ راہیں نکل آئیں، دیوناگری میں لکھی ہوئی ہندی اتر کے ہندوؤں کی بول چال بن گئی، اور عربی یا فارسی لکھاوٹ میں لکھی ہوئی اتر کے مسلمانوں کی بول چال کی زبان بن گئی۔ ابھی تک یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اردو سارے ہندستان کے مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے۔ میں دیکھ چکا ہوں کہ علی برادران کو اور مجھے ملابار کے موپلوں کو اردو کے ذریعے اپنی باتیں سمجھانے میں دقت ہوتی تھی، اور ہمیں ایک ملیالی ترجمان رکھنا پڑتا تھا۔ ایسی ہی دشواریوں کا ہم کو پوری (پورے) بنگال میں بھی، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے ٹنڈن جی، اور راجندر بابو نے جب ہندی کا لفظ استعمال کیا، تو اس سے ان کی مراد بالکل وہی تھی جو میرے ان دوستوں نے کی ہے۔ ہندوستانی کا لفظ استعمال کرنے سے اُن کا مطلب کوئی اس سے زیادہ واضح نہیں ہو جاتا۔

لیکن مراسلہ لکھنے والے کی یہ شکایت بالکل ٹھوس بنیادوں پر قائم ہے کہ اتری ہند کے کچھ لکھنے والے ایک ایسی زبان لکھتے ہیں جس کو وہ خود ہندی کہتے ہیں لیکن جسے اتری ہند میں بھی بہت ہی کم لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ جانسن کے طرز کی زبان کی طرح، اس کوشش کی ناکامیابی بھی یقینی ہے۔

ممکن ہے مراسلہ بھیجنے والے صاحب یہ کہیں کہ پھر ہندی یا ہندستانی پر زور کیوں دیا جائے، اور صرف ہندوستانی کا لفظ کیوں نہ استعمال کیا جائے۔ اس کا کارن صرف ایک ہے، اور وہ یہ ہے کہ میرے جیسے نووارد کے لیے یہ ایک گستاخی ہوگی کہ میں ۲۵ سال پرانی ایک انجمن سے کہوں کہ وہ اپنا نام بدل دے یا جب کہ

ل گاندھی جی کی ساری زندگی حق کی تلاش کی جد وجہد ہے۔ چناں چہ انگریزی میں ان کی سوانح حیات (ترجمہ) ہے۔ The Story of my Experiments Will Truth (صداقت کے ساتھ میرے تجربوں کی کہانی) گاندھی جی خود بھی اپنی ہر بات کو صداقت کا درجہ نہیں دیتے تھے۔ چناں چہ چوری چورا میں سیتہ گرہ کا تجربہ تشدد کے واقعات کی وجہ سے ناکام ہوا، تو انھوں نے تحریک واپس لے لی، اور اسے اپنی ہمالیائی غلطی بتایا — اور اعلانیہ۔ گاندھی جی نے بیرسٹری کا امتحان ولایت میں صرف ڈنر کھا کر پاس نہیں کیا تھا۔ اپنے حصے کی شراب وہ دوسروں کو دے دیتے تھے اس لیے ان ڈنروں میں ان کے ساتھ رہنے والے ہم جماعتوں میں ہوڑ لگی رہتی تھی (کہ ان کی میز پر ساتھ رہیں) جنوبی افریقہ میں وہ بیرسٹر تھے۔ ایک موکل نے اپنے مقدمے کے سلسلہ میں غلط اطلاعات دی تھیں۔ جب گاندھی جی کو حقیقت معلوم ہوئی تو انھوں نے اس سے حکومت کے واجبات ادا کرا دیئے۔ پرشوتم داس ٹنڈن کے مقدمے کی بھی، یہاں، انھوں نے پیروی کی ہے۔ لیکن موکل نے انھیں صحیح بات نہیں بتائی۔ زبان پہلے ہے، رسم خط بعد میں۔ اس وقت ۲۲ کروڑ لوگ ہندوستان میں تھے جی نہیں، جو خواندہ ہوں۔ کل چالیس کروڑ آبادی تھی۔ اگر کوئی رسم خط تھا تو یہ مقدمہ خود بخود خارج ہو جاتا ہے (کمال)

اس تبدیلی کی ضرورت پوری طرح ثابت نہیں ہوئی ہے۔ نئی پریشد، پرانی انجمن ہی کی اولاد ہے، اور اُتری ہند میں مشترکہ مادری زبان بولنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کی ضرورتوں کو پورا کرنا چاہتی ہے۔ اسے ہندی کہا جائے یا ہندستانی، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے نزدیک ان دونوں لفظوں سے ایک ہی چیز مراد ہے۔ لیکن اُن لوگوں سے میرا کوئی جھگڑا نہیں، جو ہندی کا لفظ استعمال کرتے ہیں، بہ شرطے کہ اُن کی مراد اُس زبان سے ہو، جو میرے ذہن میں ہے۔

اکھل بھارتیہ کے فقرے پر مراسلہ لکھنے والے صاحب نے جو اعتراض کیا ہے، وہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔[1] یہ یقینی بات ہے کہ سارے ہندستان کے ہندو اس فقرے سے واقف ہیں، اور میں یہاں تک کہنے کی جرأت کروں گا کہ اُتری ہند کے مسلمانوں کی اکثریت بھی اسے سمجھ لے گی۔ ہم میں سے بہت سے لوگ اس کوشش میں ہیں کہ ان تمام تمدنوں کا ایک مجموعہ مرتب کریں، جو آج ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ کوئی تمدن جو الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرے گا، زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہندستان میں آج کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جسے خالص آریہ تمدن کہا جا سکے۔ اس بات سے مجھے کوئی خاص دل چسپی نہیں کہ آریہ لوگ ہندستان کے پرانے باسی تھے یا باہر کے [ناپسندیدہ حملہ آور۔][2] مجھے تو دل چسپی اس بات سے ہے کہ میرے آبا و اجداد،

۱۔ : محمد مجیب نے اپنے خط میں لکھا تھا: "ساہتیہ پریشد کو بھارتیہ کہا گیا ہے، ہندستانی نہیں کہا گیا۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اگر لفظ بھارت کوئی مفہوم رکھتا ہے، تو اس سے آریوں والا ہندستان مراد ہے، جس میں نہ صرف مسلمانوں کی، اور ہندستانی زندگی میں اُن کے حصّے کی بلکہ سیکڑوں برسوں کی ترقی اور تبدیلی کی بھی کوئی جگہ نہیں ہے۔ کیا اس سے الگ تھلگ رہنے، اور پرانے زمانے کی طرف واپس جانے کی خواہش کا پتا نہیں چلتا؟"

۲۔ یہ نہایت اور قابل لحاظ نکتہ ہے، اور زبان کی سیاست سے وابستہ ہر شخص کو اس سے واقف ہونا ضروری ہے۔ گاندھی جی جیسے مرتبے کے سیاسی رہنما کے قلم سے ناپسندیدہ حملہ آور کے فقرے کے مضمرات افسوسناک بھی ہیں، اور خطرناک بھی۔ ایک اہم سوال گاندھی جی کے شعور کی کس سطح پر تھا، جس کا جواب انھوں نے شائستہ طریقے سے ٹال دیا۔ (کمال)

ایک دوسرے سے انتہائی آزادی کے ساتھ ملتے جلتے رہے[1] اور ہماری موجودہ نسل اسی میل جول کا نتیجہ ہے۔ اس بات کا فیصلہ صرف آنے والا زمانہ ہی کر سکتا ہے کہ آیا ہم اس ملک میں، جس نے ہم کو پیدا کیا، اور اس چھوٹے سے کرہ کی، جس پر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں، کوئی سیوا کر رہے ہیں، یا اُس کے لیے ایک بوجھ بنے ہوئے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، انتی پریشد اور ہندی ساہتیہ سمّیلن، ہندستان کی تمام زبانوں کی بہترین چیزوں کے میل جول سے، سب کی منتر کہ بھلائی چاہتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو یہ جماعتیں فنا ہو جائیں گی۔ لیکن میل جول ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ آریائی بو باس رکھنے والی ہر چیز کو نکال دیا جائے، یا یہ کہ عربی یا انگریزی، یا کسی اور طرح کی بو باس رکھنے والی چیزوں کو الگ کر دیا جائے۔"

(۲)

اس سے پہلے والے مضمون میں، میں یہ بتا چکا ہوں کہ میں ہندی اور ہندستانی کو کس طرح اور کیوں ہم معنی سمجھتا ہوں، اور لفظ ہندی کا استعمال جاری رکھنا کیوں ضروری ہے۔ پچھلے ہفتے جو مراسلہ نقل کیا گیا تھا[2] اُس لفظ ہندی پر اس طرح اعتراض کیا گیا ہے:

"اس زبان کو مسلمان پچھلے زمانے میں پڑھتے رہے ہیں، اور اسے ترقی دے کر ایک ادبی زبان بنانے میں انھوں نے اپنے ہندو بھائیوں سے زیادہ نہیں، تو اُن کے برابر حصہ ضرور لیا ہے[3] لیکن اس کے ساتھ ہی اس زبان سے ایسی مذہبی اور تہذیبی باتیں وابستہ ہیں،

---

[1] تاریخ کے صفحات میں کہانی اس کے بالعکس ہے۔ جب ورنوں کی تقسیم ہوئی، تو شودروں اور چنڈالوں میں رکھے گیے لوگوں کے لیے (جو پہلے بھی اکثریت میں تھے، اور آج بھی ہیں — دراوڑی لوگوں کو چھوڑ کر۔ آریہ قبائل کے ہندستان آنے سے پہلے اس ملک میں بسنے والے آدی باسی کہلائے، اور آج بھی کہلاتے ہیں۔ اور انسانی حقوق سے محروم ہیں جیسے گاندھی جی کے زمانے میں، اور اُس سے پہلے تھے۔ انھی کی محنت کے استحصال پر برہمن، کھتری اور ویش زندگی بھو گتے تھے، اور یہ اچھوت تھے! (کمال)

[2] یہ مراسلہ جامعہ ملّیہ اسلامیہ دلی کے محمد مجیب کا تھا، اور آگے اسی سے اقتباس پر بحث ہے (کمال)

[3] پہلا دوہا، گوری سووے سیج پر۔ الخ امیر خسرو کا ہے۔ رحیم (عبدالرحیم خانِ خاناں) ایسے صاحبِ طرز ہندی شاعر تھے، کہ بعض ہندی کے عالموں کے نزدیک تلسی داس نے رامائن اُس آہنگ میں لکھی جو ہندی میں سب سے پہلے رحیم نے استعمال کیا۔ ملک محمد جائیسی اور کبیر اُن چند ناموں میں سے ہیں، جن کے بغیر اردو ادب کی طرح، ہندی ادب کی تاریخ بھی نہیں لکھی جا سکتی۔ (کمال)

جن کو مسلمان مجموعی طور پر اپنا نہیں سکتے۔ اس کے علاوہ یہ زبان اب اپنے اندر بہت سے ایسے لفظ شامل کرتی جا رہی ہے جو اکیلے اُسی کے ہیں، اور جن کو اردو جاننے والے عام طور سے نہیں سمجھ سکتے "

اگر پچھلے زمانے کے مسلمانوں نے ہندی پڑھی، اور اُسے مالا مال بنایا، تو موجودہ نسل کے مسلمان اس سے دامن کیوں بچاتے ہیں؟ یقیناً پچھلے زمانے کی ہندی میں، آج کی ہندی سے زیادہ مذہبی اور تہذیبی باتیں موجود تھیں۔ ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا کسی شخص کو کسی زبان سے اس کی مذہبی اور تہذیبی باتوں کی بنا پر دامن بچانا چاہیئے۔ اگر میں ان باتوں کا اثر نہیں لینا چاہتا، اگر مجھے ناگوار ہیں، تو مجھ پر اُن کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ اگر ہمیں ایسے بھائیوں کی طرح جن کی رگوں میں درحقیقت ایک ہی خون دوڑ رہا ہے، ایک ساتھ زندگی بسر کرنا ہے، تو ہم کو ایک دوسرے کی تہذیب سے بھاگنا نہیں چاہیئے۔ اس کے علاوہ ہندی میں، سنسکرت کے لفظوں کے استعمال پر اتنا جھگڑا کیوں کیا جائے، کہ اصل زبان کے خلاف بغاوت کی صورت پیدا ہو جائے جو آسان لفظ پہلے سے رائج ہیں، ان کی جگہ سنسکرت لفظ استعمال کرنے یا سنسکرت سے بنائے ہوئے لفظوں میں ان کی اصلی سنسکرت شکل دے دینے کا طریقہ یقیناً ناپسندیدہ ہے۔ اس طرح زبان اپنے سریلے پن سے محروم ہو جاتی ہے۔ لیکن قوم جیسے جیسے ترقی کرے گی، ویسے ہی ویسے ہندو، جو صرف سنسکرت جانتے ہیں۔ سنسکرت لفظ ایک حد تک لازمی طور پر استعمال کریں گے۔ اسی طرح جس طرح کہ مسلمان، جو صرف عربی جانتے ہیں[1] عربی لفظ لازمی طور پر استعمال ہوں گے۔ چاہے لکھنے میں دونوں ایک ہی زبان استعمال کریں، اور کسی چیز کو خاص طور سے پسند یا ناپسند کرتے ہوں۔ تعلیم یافتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو زبان کی دونوں صورتوں سے جانکاری حاصل کرنی ہوگی۔ کیا یہی بات تمام ترقی کرنے والی زبانوں میں نہیں پائی جاتی؟ ایک

---

[1] شاید گاندھی جی کے تحت الشعور میں محمد بن قاسم تھا۔ سندھ پر اس حملے سے پہلے، عرب تاجروں کی حیثیت سے جنوبی ہند میں آ کر بس چکے تھے، موپلا اُنھیں کی اولادیں ہیں۔ وہ اردو نہیں بولتے، اس لیے ہندوستان میں ایسے ہندوستانی بولنے والے مسلمان نہیں تھے، جو صرف عربی جانتے ہوں۔ محمد غوری اور اس کے بعد سے جتنے بھی حملہ آور مسلمان آئے، ان کی زبانیں فارسی تھیں یا ترکی۔ فارسی میں عربی الفاظ کی آمیزش ضرور تھی، لیکن وہ فارسی کے اپنائے ہوئے الفاظ تھے۔ گاندھی جی مسلمان اور عربی کو ایک دوسرے سے جڑا ہوا کیوں سمجھتے تھے، اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ کمال

پڑھا لکھا انگریز، ہمدردی کے لیے Fellow Feeling, Sympathy یا پدرانہ برتاؤ کے لیے Fatherly یا Paternal یا سالانہ کے لیے yearly اور Annual، دونوں لفظوں سے واقف رہتا ہے۔ یہاں دشواری یہ ہے کہ ہمارے دل ایک نہیں ہوئے ہیں، اور ہم میں سے اچھے سے اچھے لوگ بھی باہمی بدگمانی کے زہر سے متاثر ہیں۔

ہندی، ہندستانی اور اردو ایک ہی زبان کے الگ الگ نام ہیں۔ آج جو مقصد سامنے ہے، وہ ایک نئی زبان کو پیدا کرنا نہیں، بلکہ اُس زبان کو، جو ان تینوں ناموں سے پکاری جاتی ہے۔ بین صوبائی زبان مان لینا ہے۔ میرے خیال میں شری منشی نے ہنس کی زبان کی جانچ بجا طور پر کی ہے۔ اس لیے کہ تامل یا تلگو کی کسی عبارت کا ہندی یا ہندستانی میں ترجمہ کرتے وقت سنسکرت کے لفظوں کے استعمال سے بچنا قریب قریب ناممکن ہے، اُسی طرح، جس طرح کہ کسی عربی عبارت کا ہندی یا ہندستانی میں ترجمہ کرتے وقت عربی لفظوں کے استعمال سے بچا نہیں جا سکتا۔ اگر رویندر ناتھ (ٹیگور) کی گیتانجلی کے ہندی یا ہندستانی ترجمے سے سنسکرت لفظ، جن سے بنگالی زبان بھری پڑی ہے[1]، چُن چُن کر نکال دیے جائیں، تو اُسے پڑھنے میں جتنا ترنم ابھی محسوس ہوتا ہے، اُس سے کہیں کم محسوس ہوگا۔ مشترکہ زبان کو خراب ہو کر محض ہندوؤں کی بول چال کی زبان بن جانے سے روکنے کے لیے ضرورت بس اس بات کی ہے کہ مولوی عبدالحق جیسے مسلمان ادیب اس میں اپنی طرف سے اضافہ کریں۔ میرا بس چلے تو میں ادیبوں کو اس نظریے سے ہٹا دوں کہ زبان کی جس شکل کو اردو کہا جاتا ہے، وہ صرف مسلمانوں کی بول چال کی زبان ہے اُسی طرح جس طرح کہ ہندو ادیبوں کو ہندی کو صرف ہندوؤں کی زبان سمجھنے کے نظریے سے ہٹا دوں[2]

---

[1] بنگالی زبان (بنگلہ) سنسکرت تت سم لدی نہیں، بلکہ سنسکرت نسل کے بنگلہ تدبھو کی زبان ہے۔ تت سم بھی جو ہیں، ان کا تلفظ بدل گیا ہے۔ فارسی (عربی اور ترکی سمیت) الفاظ بھی بنگلہ میں ہیں۔ (کمال)

[2] یہ خیال کنھیالال منشی اور کالیلکر جیسے ادیبوں کا رہا ہوگا جنھوں نے اسے پھیلایا۔ اردو والوں نے کبھی اردو کو، جس کے ادب کی آبیاری رتن ناتھ سرشار، دیا شنکر نسیم، برج نراین چکبست، درگا سہائے سرور، منشی پریم چند، دیا نراین نگم، رگھوپت سہائے فراق، آنند نراین ملا وغیرہ نے کی ہو، کبھی مسلمانوں کی زبان نہیں سمجھا۔ وہ ایسا سمجھ بھی نہیں سکتے تھے۔ لیکن کنھیالال منشی کے قبیل کے لوگوں نے ہندی، ہندو، ہندوستان کو جوڑ دیا، اور ہندی کو سنسکرت کی طرف لے جانے کو رگ وید کے زمانے میں واپس جانے کا ذریعہ بنانا چاہا۔ رگ وید پڑھنا اور سمجھنا ماضی کے سرچشمے کو سمجھنا ہے، لیکن اُس عہد کو دوبارہ لانے کی کوشش کرنا رجعت پرستی ہے (کمال)

اگر دونوں میں سے کوئی اپنے اس نظریے سے نہ ہٹا، تو اتری ہندستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان، اس کا نام چاہے جو ہو، نہیں بن سکے گی۔ اس لیے فی الحال ہمیں نام پر جھگڑنے کی ضرورت نہیں۔ آپ نام جو چاہے رکھ لیجیے، بشرطے کہ آپ پورے خلوص کے ساتھ، اس سے ایک ہی بات مراد لیتے ہوں۔

اب لکھاوٹ کا مسئلہ رہ جاتا ہے۔ اس وقت اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کے دیوناگری میں لکھنے پر اصرار کیا جائے، اور یہ بات تو خیال کی حد سے اور بھی پرے ہے کہ ہندوؤں کی بہت بڑی آبادی کو عربی لکھاوٹ اپنانے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے میں نے ہندی یا ہندستانی کے لیے یہ تشریح تجویز کی ہے کہ اس سے وہ زبان مراد ہے، جو اُتر کے ہندو اور مسلمان عام طور سے بولتے ہیں۔ چاہے وہ دیوناگری میں لکھی جائے، چاہے اردو لکھاوٹ میں۔ اس کے خلاف جو احتجاج کیا گیا، اُس کے باوجود میں اس تشریح پر قائم ہوں۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دیوناگری کی ایک تحریک سے میں نے اپنے آپ کو پورے طور پر وابستہ کر دیا ہے، اور وہ تحریک یہ ہے کہ اسے مختلف صوبوں میں بولی جانے والی تمام زبانوں کی، خاص کر ان زبانوں کی، جن کی لغت میں سنسکرت لفظ زیادہ ہیں، مشترکہ لکھاوٹ بنا دیا جائے۔ بہرحال اس بات کی کوشش ہو رہی ہے کہ ہندستان کی تمام زبانوں کے بیش بہا ذخیروں کو دیوناگری لکھاوٹ میں منتقل کر لیا جائے۔"

ہر بجن میں مہاتما گاندھی کی ان دو تحریروں کے بعد بھی مسئلہ وہیں کا وہیں رہا۔ جولائی ۱۹۳۶ء کے اردو میں مولوی عبدالحق نے افکار و واقعات کے عنوان سے اپنا نقطۂ نظر واضح کیا۔ خدا بخش اورینٹیل پبلک لائبریری میں یہ شمارہ موجود ہے۔

انجمن ترقی اُردو (ہند)

دریا گنج، دہلی

مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۹ء[1]

مکرم گاندھی جی سلامت

آپ کا خط پہنچا۔ میری تقریر کی رپوٹ جو اخبار میں چھپی ہے اُس میں ایک آدھ جگہ غلطی ہو گئی ہے۔ البتہ یہ میں نے ضرور کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں اور یہ موقع ہے کہ

---

[1] سنہ ندارد

"ابتدا میں ہندی اردو کا جھگڑا صرف بہار اور یو پی تک تھا، کبھی کم کبھی زیادہ۔ لیکن جب آپ نے اس میدان میں قدم رکھا اور یہ اعلان کیا کہ اس ملک کی عام زبان "راشٹر بھاشا" ہندی ہے اور سارے ملک اور خاص کر اُن علاقوں میں اس کے پھیلانے پر کمر باندھی جہاں کی زبان کو ہندی سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا (جیسے صوبہ مدراس) تو یہ جھگڑا آگ کی طرح سارے ملک میں پھیل گیا"

آپ کو شاید یہ معلوم ہے یا نہیں کہ ہندو مسلمانوں کے جھگڑے کی ابتدا زبان کے مسئلے پہ ہے۔ پولیٹیکل اختلاف بہت بعد کی بات ہے۔ زبان کے جھگڑے صرف بہار اور یو پی تک محدود تھے۔ لیکن جب آپ نے نئی ہندی کو "راشٹر بھاشا" بنانے کا بیڑا اٹھایا اور بڑی سرگرمی، غیر معمولی مستعدی اور لاکھوں روپیے کا صرفے سے اس مہم کو چلایا تو پرانی دبی ہوئی آگ پھر سلگ اٹھی۔ اور آپ کی کوششوں نے اس آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا۔ اور اس میں ان جھگڑوں کو کون جانتا تھا، پنجاب میں ہندی اردو کی کوئی بحث نہ تھی، بمبئی میں اس کا کبھی ذکر نہ آتا تھا۔ آپ کی بدولت یہ فساد شہر شہر گاؤں گاؤں اور گھر گھر پہنچ گیا۔ اور اس پرچار سے متاثر ہو کر ہندو دیسی ریاستوں نے بھی اردو زبان کو اپنی ریاستوں سے خارج کر دیا حالاں کہ یہ زبان وہاں بہت زمانے سے رائج تھی۔

پچیس برس کا مسلسل پرچار، سیکڑوں اور ہزاروں کارکنوں کی دن رات کی محنت منقت اور لاکھوں روپیے کے صرفے سے آپ نے وہ کام کیا جو اس جنس کے بڑے بڑے پرچی اور حامی گزشتہ اسّی سال میں نہ کر سکے۔ جب اس کی جڑیں مضبوط ہو گئیں اور آپ اس طرف سے بجنت ہو گئے تو اس وقت آپ جیتے کہ ہندستان کی "راشٹر بھاشا" ہندستانی ہونی چاہیے۔ لیکن آپ جانتے ہیں وقت ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ اگر آپ میری اس درخواست کو منظور فرما لیتے جو میں نے اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے سالانہ اجلاس ناگپور (۱۹۳۶) میں کی تھی کہ اس ملک اور پرشد کی زبان ہندستانی ہونی چاہیے تو بہت سے جھگڑوں کا خاتمہ ہو جاتا۔

پرشد کے اسی اجلاس میں جب آپ سے پوچھا گیا کہ ہندی سے آپ کی کیا مراد ہے تو آپ نے فرمایا "وہ زبان جو کتابوں میں ہے بول چال میں نہیں" ایک ایسی زبان کو جو بول چال میں نہیں "راشٹر بھاشا" قرار دینا اور اس زبان کو جو صدیوں سے بول چال میں ہے نظر انداز کر دینا بڑی ناانصافی تھی۔ اور یہی بات فساد کی جڑ بن گئی۔

یہ سچ ہے کہ آپ نے کبھی اردو دشمنی کا اظہار نہیں کیا، لیکن دانستہ یا نادانستہ ایسی تدبیریں اختیار کیں جن کی وجہ سے زبان کا مسئلہ دن بہ دن پیچیدہ اور خراب ہوتا گیا اور دلوں میں بدگمانی اور بیر بڑھتا گیا۔

میں نے یہ جو کچھ لکھا ہے وہ بحث کی غرض سے نہیں لکھا بلکہ اس زمانے میں جو واقعات گزرے اور اُن کا جو اثر ملک پر ہوا وہ میں نے صاف صاف آپ کی خدمت میں پیش کر دیا ہے تاکہ آپ کو ہر مسئلے کا دوسرا رخ معلوم ہو جائے۔

خدا آپ کو ۱۲۵ برس تک زندہ و سلامت رکھے اور آپ کی ذات سے ملک کو جو نقصان پہنچا ہے باقی عمر میں اُس کی تلافی کی توفیق عطا فرمائے۔

آپ کا خیر اندیش

عبدالحق

تلاش کے باوجود گاندھی جی کے اُس خط کی نقل نہ مل سکی، جس کے جواب میں مولوی عبدالحق نے یہ خط لکھا تھا۔ اور نہ وہ بیان ہی مل سکا، جو مولوی عبدالحق نے دیا تھا، اور جس کی پریس رپورٹ نظر سے گزرنے کے بعد گاندھی جی نے خط لکھا۔ مجھے یقین ہے کہ مولوی عبدالحق پر کام کرنے والے، کم سے کم ان کی تقریر کا متن اور تاریخ ضرور دریافت کر لیں گے۔ اس خط میں سنہ کی اکائی اور دہائی نہیں ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ستمبر ۲۷ ۶ میں یہ خط لکھا گیا ہوگا۔ ہندستانی کے بارے میں مولوی عبدالحق اور بابو راجندر پرشاد کے درمیان معاہدہ پر دستخط ہونے کے بعد۔ یہ اندازہ شاید نادرست نہ ہو، لیکن اس کی تصدیق ضروری ہے۔

"پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو" مرتبہ سید ہاشمی فرید آبادی (انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی: ۱۹۵۳ء) سے یہ عبارت (ص ص ۷۶ — ۷۸) نقل ہے:

> "۔۔۔ ۱۹۳۲ء میں، جب کہ دیسی زبانوں میں تعلیم دینے کی ضرورت اب سب جگہ تسلیم کی جارہی تھی، پٹنہ یونیورسٹی کی سنیٹ میں یہ تحریک منظور ہوئی کہ میٹرک تک ذریعۂ تعلیم ہندستانی کر دی جائے۔ اہل اردو اصولاً اسے قبول کرنے پر تیار تھے، مگر چاہتے تھے کہ ہندستانی اچھی طرح واضح کر دی جائے۔ مقامی شاخ کی تحریک پر انجمن ترقی اردو نے ایک خاص جلسہ پٹنے میں منعقد کیا۔ علی گڑھ، دہلی، لکھنؤ کے چند اساتذہ، مصنفین، و ناشرین شریک تھے۔ مولانا سلیمان صاحب نے صدارت کی (۲۸ اگست، ۱۹۳۲ء) اہلِ جلسہ ابتدائی اور ثانوی جماعتوں میں ہندستانی کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے متفق تھے۔ مگر جب تک اس زبان

کی صحیح تعریف نہ معین ہو جائے، درسی کتابوں کا اردو اور ہندی میں الگ الگ رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ ایک قرارداد (۵؟) میں انھوں نے مطالبہ کیا کہ ہندستانی زبان کے قواعد، اصطلاحاتِ لغات کے لیے (حکومتِ بہار کی طرف سے) ایک کمیٹی مقرر کی جائے، جس میں انجمن ترقی اردو، اور ہندی کی نمائندہ جماعت کے قائم مقام مساوی تعداد میں شریک ہوں۔ ایسی کمیٹی کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ جہاں تک ممکن ہو اتفاق سے کام لیا جائے، لیکن اختلاف کی صورت میں۔ ۔ ۔ اردو کتابوں کے متعلق ہندی انجمن کے قائم مقاموں کی رائے فیصلہ کن سمجھی جائے ۔ ۔ ۔"

اسی دن سہ پہر کو بابو راجندر پرشاد اور صوبائی کانگریس کے سکریٹری جلسے میں آئے، اور متعلقہ مسائل پر دوستانہ بحث و اتفاقِ رائے کے بعد یہ طے ہوا کہ ایک متفقہ اعلان، سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) اور بابو راجندر پرشاد کی طرف سے شائع کی (کیا) جائے۔ چناں چہ دونوں صاحبوں کے دستخط سے، حسبِ ذیل بیان مرتّب اور شائع کیا گیا:

"بہار کی اردو   کمیٹی کے جلسے منعقدہ ۲۸ اگست ۳۷ء میں ہمیں ہندستانی زبان کے مسئلے پر بحث و گفتگو کرنے کا موقع ملا۔

ہمیں فکر تھی کہ اردو۔ہندی۔ہندستانی کے مناقشے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، انھیں دور کیا جائے، اور خوشی کی بات ہے کہ اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس بات میں جن مباحث پر گفتگو ہوئی، تو معلوم ہوا کہ اُن میں بڑی حد تک ہم متفق الرائے ہیں۔ چناں چہ ہم کو اس پہ اتفاق ہے کہ ہندستان کی مشترکہ زبان ہندستانی ہونی چاہیئے، اور یہ اردو رسم الخط اور دیوناگری، دونوں میں تحریر، اور جملہ دفتری اور تعلیمی اغراض کے لیے سرکاری زبان تسلیم کی جانی چاہیئے۔ ہندستانی سے ہم وہ زبان مراد لیتے ہیں، جو شمالی ہند کی بولی میں سب سے بڑا مشترکہ عنصر ہے، اور ہماری دانست میں اس ذخیرے میں الفاظ کے شمول اور انتخاب کا معیار یہی عام استعمال یا رواج ہونا چاہیئے۔ مزید براں، ہماری رائے ہے کہ ہندی اور اردو، دونوں کو بحیثیت ادبی زبانوں کے، ترقی کرنے کے

پورے مواقع دیئے جانے چاہئیں۔ ہم یہ بھی تجویز کرتے ہیں کہ اردو اور ہندی اہلِ علم کے اشتراکِ عمل سے ہندوستانی الفاظ کی ایک اساسی لغت تالیف کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس لغت کی تدوین، اور اس قسم کے حل طلب مسائل کے واسطے جیسے اصطلاحی الفاظ کا انتخاب ہے، ایک مختصر نمائندہ کمیٹی کا انعقاد کسی قریبی تاریخ میں ہونا چاہیئے، جس میں اردو اور ہندی کے ایسے ذی اثر حامی شامل ہوں، جو ان دونوں زبانوں کو ترقی دینے کے قابل ہیں، تاکہ اس طرح دونوں زبانوں کے بولنے والوں میں حسنِ ظن پیدا کیا جائے۔

شرح دستخط (مولوی) عبدالحق

(بابو) راجندر پرشاد

۱۱ ستمبر ۱۹۳۶ء کے ہریجن میں ایک مبارک قدم کے عنوان سے، اس معاہدے کا متن شائع ہوا ہے۔ اس تمہید کے ساتھ:

"مولوی عبدالحق صاحب اور شری راجندر پرشاد نے ہندی اردو بحث پر جو مشترکہ بیان جاری کیا ہے، اُس سے اُمید ہو سکتی ہے کہ یہ بحث اب ختم ہو جائے گی، اور جن لوگوں کو ایک بین صوبائی زبان کے بننے سے دلچسپی ہے، وہ اس معاملے کے اچھے برے پہلوؤں پر بحث مباحثہ کر سکیں گے، اور مشترکہ کارروائی کے لیے کوئی راہ نکال سکیں گے۔"

گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ میں یہ نوٹ معاہدے کا متن، اور آخر میں گاندھی جی کے خیالات ص ص ۹۸ - ۱۰۰ ہیں۔ معاہدے کا متن اس سے کچھ مختلف ہے جو نقل کیا جا چکا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عشرت علی صدیقی نے ہریجن کی عبارت کا ترجمہ کیا ہے (جو زیادہ آسان زبان میں، اور اس لیے زیادہ رواں ہے) جو متن اوپر درج کیا گیا ہے وہ شاید اصل معاہدے کے الفاظ کے ساتھ ہے۔

گاندھی جی کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ ہندی، ہندوؤں کی زبان ہے، اور اردو، مسلمانوں کی۔ ان کے دل و دماغ میں کسی فرقے کے لیے، خاص طور سے مسلمانوں کے لیے نہ کوئی نفرت تھی اور نہ کوئی تعصب وہ خلوصِ دل سے ہندو مسلم ایکتا چاہتے تھے، اور چوں کہ ان کا خیال تھا کہ ان دونوں کی زبانیں الگ ہیں، اس لیے وہ ان دونوں زبانوں کو بھی ایک دوسری کے گلے ملوانا چاہتے تھے۔ یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ نظریہ خود انھوں نے قائم کیا تھا، لیکن قرائن اس بات کی طرف جھکاؤ رکھتے ہیں کہ یہ بات کہ اردو مسلمانوں کی

زبان ہے، اور عربی سے جڑی ہوئی ہے، اُن کے ذہن میں مدن موہن مالویہ، کنہیا لال منشی اور کاکا کالیلکر جیسے لوگوں نے ڈالی ہوگی۔ ہندی ساہتیہ سمیلن اور ناگری پرچارنی سبھا سے گاندھی جی کی وابستگی نے ہندی اور ملک کی ساری زبانوں کے لیے ناگری رسم خط اپنا لیے جانے کی تحریک نے زور پکڑا۔ گاندھی جی اگر ان تحریکوں سے وابستہ نہ ہوتے تو یہ تناور درخت نہ بنتیں، اور ان کے اکھوے مرجھا جاتے۔ گاندھی جی، مہاتما کی حیثیت سے کروڑوں لوگوں کے لیے روحانی پیشوا بھی تھے۔ جو لوگ اچھوت کہلاتے تھے، اُن کے نام سے یہ کلنک ہٹانے کے لیے بھی گاندھی جی نے تحریک چلائی تھی۔ امبیڈکر اُن کو ہندو سماج سے نکالنا چاہتے تھے، جو صدیوں سے اُن کو پسماندہ رکھے ہوئے تھا، اور اُن کے سائے کو بھی بعض علاقوں میں نجس مانا جاتا تھا۔ گاندھی جی ہندو سماج ہی میں انھیں بنیادی انسانی حقوق دلانا چاہتے تھے۔ اگر یہ طبقہ ہندو سماج سے نکل جاتا تو ہندو اس ملک میں اکثریت میں نہیں رہتے۔ اس لیے ہریجن سدھار کی تحریک سے برہمنوں، کھتریوں اور ویشوں کا مفاد بھی وابستہ ہوگیا تھا۔ ان میں کانگریسی بھی تھے، اور کٹر فرقہ پرست بھی۔ اور زیادہ تر یہی آخر الذکر، جو نام نہاد اونچی ذات کے بھی تھے، مصلحتاً گاندھی جی کو سیاسی ضرورت سمجھتے تھے۔ اور ہریجن تو گاندھی جی کو اپنا مسیحا مانتے ہی تھے۔ دیسی رجواڑے، خاص طور سے مراٹھا، گجراتی اور راجستھانی بھی ہندی اور ناگری کی تحریکوں میں شامل ہو گئے۔ اس طرح یہ دونوں تحریکیں پروان چڑھیں۔ جنوبی ہند میں ان تحریکوں کو کامیابی حاصل ہوئی، کیوں کہ ہندی کسی بھی صورت میں دراوڑی زبانوں کی جگہ نہیں لے سکتی تھی۔ دوسری زبانوں کے علاقوں میں بھی کوئی مزاحمت نہیں ہوئی، لیکن اردو کو خطرہ محسوس ہوا، کہ اس کی شناخت نابود ہو جائے گی۔

بولی جانے والی زبان، یعنی ہندستانی ایک تھی، اور آج بھی ہندستانی کی سطح پر ہندی اور اردو ایک ہیں، لیکن، فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) میں انیسویں صدی کے شروع کے برسوں میں، نثریں الگ الگ ہوئیں۔ سدل مسر (چندراوتی) اور خاص طور سے للو لال کب (کومی) [پریم ساگر]، سے کھڑی بولی سے رائج فارسی (بہ شمول عربی و ترکی) ہی نہیں بلکہ سنسکرت سے ماخوذ تدبھو ہٹا کر تت سم والی ہندی کی شیلی الگ کی گئی۔ حقیقت یہ نہیں ہے کہ اردو ایک شیلی ہے ہندی کی، کیوں کہ اب ہندی سے مراد بولی جانے والی ہندی نہیں بلکہ تت سم لدی ہندی ہے۔ تت سم لدی ہندی تو خود ایک مصنوعی شیلی ہے، اس زبان کی، جو دہلوی ہندوی، ہندی اور اردو کے ناموں سے مختلف زمانوں میں موسوم رہی۔ ابلاغِ عامہ کے ذرائع نہ گاندھی جی کے زمانے میں، اور نہ آج (رامائن اور بھارت جیسے دوردرشن مقبول سیریلوں کے باوجود) یہ تت سم لدی

شیلی، عوام کی بول چال کی زبان بنا سکے۔ لیکن مستقبل کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا۔ اگر ہندی اور اردو ایک دوسری سے مخالف سمت میں چلتی رہیں، تو یہ دو زبانیں بھی ہو جائیں گی، بول چال کی سطح پر۔ اس کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ تامل سے ملیالم الگ ہوئی۔ بنگلہ سے اسمیہ (آسامی) الگ ہوئی۔ پراکرت اور اپ بھرنش کے دور میں ایک زبان / بولی ماگدھی تھی۔ آج بہار کی بولی الگ ہے، بنگلہ، اسمیہ، اڑیہ الگ زبانیں ہیں۔

تت سم لدی ہندی اور ناگری رسم خط کے پرچار میں جب گاندھی بہت آگے نکل گئے تو انھیں احساس ہوا کہ ایکتا کا جو مقصد انھیں عزیز تھا اُس پر نہ صرف آنچ آئی، بلکہ وہ جل کر راکھ بھی ہو سکتا ہے۔ خیال ہے کہ شاید ڈاکٹر تارا چند سے گاندھی جی نے مشورہ کیا، اور ڈاکٹر تارا چند نے لسانی منظر نامہ اُن کے سامنے پیش کیا کہ کس طرح جدید ہندستانی زبانوں کا ارتقا ہوا۔ ویدی یا ویدک۔ پراکرت۔ اپ بھرنش اور جدید ہندستانی زبانیں۔ اردو ہند آریائی زبان ہے، دوسری زبانوں کی طرح۔ عربی / فارسی / ترکی اس کی قواعد کی جڑوں میں نہیں ہے، کیوں کہ ہندی اور اردو کی قواعد، صرف و نحو ایک ہے۔ دخیل الفاظ سے زبان کی ساخت پر اثر نہیں پڑتا۔ جو دخیل الفاظ اردو میں ہیں، کم و بیش وہ ہندی اور دوسری زبانوں میں بھی ہیں۔ سنسکرت کے دخیل الفاظ دراوڑی زبانوں میں بھی ہیں۔ عربی / فارسی / ترکی کے دخیل الفاظ بھی ان میں ہیں۔

گاندھی جی کے نظریے میں تبدیلی آئی۔ انھوں نے ہندستانی کا وہ تصور مان لیا، جو مولوی عبدالحق کا تھا۔ اور اکھل بھارتیہ ہندستانی پرچار سمیلن کی صدارت بھی کی۔ ہندستانی کی حمایت میں مضامین بھی لکھے۔

۲۷ / فروری ۱۹۴۵ء کو وردھا میں ہندستانی پرچار سمیلن میں اپنی تیسری صدارتی تقریر میں گاندھی جی نے یہ بھی کہا:

"میں نہیں چاہتا کہ ہندی مٹ جائے یا اردو فنا ہو جائے۔ میں صرف چاہتا ہوں کہ دونوں ہمارے کام کی ہو جائیں۔ سنیہ گرہ کا قانون ہے کہ ایک ہاتھ کی تالی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ بجتی نہیں، پر اس سے کیا۔ آپ ایک ہاتھ بڑھائیں گے تو دوسرا اپنے آپ بڑھ جائے گا۔ حق صاحب (مولوی عبدالحق) نے ناگپور میں جو بات کہی تھی، اُسے اُس وقت میں نہ سمجھ سکا۔ ہندی یعنی اردو، اسے میں نے نہیں مانا تھا۔ اس وقت اُن کی بات مان لیتا، تو اچھا ہوتا۔

دوست بننے آئے تھے، مگر مخالفت ہوئی، اور دشمن جیسے بن گئے۔ مگر میرا دشمن تو کوئی ہے ہی نہیں ۔ پھر حق صاحب ہی کیسے میرے دشمن بن سکتے ہیں۔ اس لیے آج پھر ہم ایک منچ پر کھڑے ہو گئے ہیں۔ ناگپور میں بھارتیہ ساہتیہ سمیلن کیا تھا۔ لیکن وہ وہیں شروع اور وہیں ختم ہوا۔ ہم لوگ ملنے آئے تھے، اور ہو گئے الگ الگ۔ اُس سمیلن سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا؟ وہ ہندستانی نہیں بلکہ بھارتیہ ساہتیہ سمیلن تھا۔۔''

سید شہاب الدین دسنوی

مولوی عبدالحق اور اردو تحریک

اتر پردیش کے شہر ہاپوڑ یا بعض لوگوں کے مطابق، سراوہ میں عبدالحق پیدا ہوئے۔ ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ سے بی۔ اے۔ کر کے حیدرآباد گئے تو وہاں کے سرکاری ضابطے کے مطابق "مولوی" الہ آباد یونیورسٹی کی تفویض کردہ آنریری ڈگری کے مطابق "ڈاکٹر" اور اردو دنیا کے دیئے ہوئے لقب "بابائے اردو" کہلائے۔

۱۹۰۳ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تو اس میں ایک شعبۂ علمیہ کا قیام بھی عمل میں آیا جس کا مقصد اردو میں علوم و فنون کی اشاعت تھا۔ مزید صراحت کے لیے اس شعبہ کا نام انجمن ترقی اردو رکھا گیا۔ پروفیسر آرنلڈ اس کے صدر اور مولانا شبلی نعمانی سکریٹری مقرر ہوئے۔ شبلی کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سکریٹری بنے۔ ان کے مستعفی ہونے پر یہ کام عزیز مرزا کے سپرد ہوا۔ پروفیسر آرنلڈ کے بعد سید راس مسعود صدر ہوئے۔ ۱۹۳۷ میں ان کا انتقال ہو گیا تو سر اکبر حیدری کی تحریک پر سر تیج بہادر سپرو صدر مقرر ہوئے۔

۱۹۱۲ میں دلّی دربار کے موقع پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا بھی دلّی میں اجلاس ہوا۔ عزیز مرزا کی وفات سے انجمن ترقی اردو میں جگہ خالی رہ گئی تھی، مولوی عبدالحق، عزیز مرزا کے سکریٹری رہ چکے تھے۔ اب وہی انجمن کے سکریٹری نامزد ہوئے۔ ان دنوں مولوی صاحب اورنگ آباد (دکن) میں مقبرہ رابعہ دورانی والی عمارت میں مقیم تھے اور ریاست حیدرآباد کے اورنگ آباد کے علاقے کے انسپکٹر آف اسکول۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو کا دفتر حیدرآباد سے اورنگ آباد منتقل کر دیا۔ سکریٹری کی ذمہ داری قبول کرتے وقت مولوی صاحب نے کہا تھا:

"میں نے بہت ڈرتے ڈرتے اس بار گراں کو اپنے ذمّے لیا کیوں کہ جس قدر یہ کام ضروری ہے اسی قدر مشکل بھی ہے۔ اردو زبان میں علوم و فنوں کے لیے ایسے اصحاب کی ضرورت ہے جو علوم مشرقی و مغربی دونوں میں ماہر ہوں، اور ایسے لوگ ہماری قوم میں شاذ و نادر

ہیں،، (پنجاہ صد ۲)

اس بیان سے ظاہر ہے کہ اس وقت مولوی عبدالحق کے پیش نظر انجمن کا ایک محدود دائرہ عمل تھا جس میں صرف علمی وادبی کاموں کی گنجائش تھی۔ حیدرآباد کی ریاست، اردو کی ریاست تھی۔ اس لیے وہاں مسئلہ کسی تحریک چلانے کا نہیں بلکہ صرف اردو کے علمی اور ادبی سرمائے میں اضافے کا تھا۔ چناں چہ ابتدائی دور میں انجمن ترقی اردو نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا۔ پہلے دس سال میں سات کتابیں شائع کی گئیں۔ اس دور تک اردو کا ذخیرہ مذہبی، تاریخی کتابوں، ناول، شعر و شاعری تک محدود تھا۔ علوم و فنون کی طرح تحقیقی کاموں پر توجہ کم تھی ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۵ء تک جو کتابیں انجمن نے شائع کیں ان میں زیادہ تر شعرا کے تذکروں اور بعض متون پر کام ہوا ۱۹۲۱ء سے ایک ادبی اور تحقیقی رسالہ "اردو" کا بھی اجرا کیا گیا۔

حیدرآباد ہی کی طرح ہندوستان کی بعض دوسری دیسی ریاستوں مثلاً الور، بھرت پور، بیکانیر، پٹیالہ، دھول پور، گوالیار، کشمیر، جے پور وغیرہ میں بھی ایک مدت سے سرکاری سطح پر اردو کا رواج عام تھا۔ شمالی ہندوستان کے علاقوں میں تعلیمی اور سرکاری دفتروں کی ضرورت کے لیے اردو کا استعمال ہوتا رہا۔ وثیقہ نویسی، درخواستیں اور عدالتوں میں بحث کی کاروائیاں اردو میں ہوتی رہیں۔ ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں جہاں جہاں ضرورت ہوتی، مادری زبان کی حیثیت سے اردو پڑھائی جاتی تھی۔ یونی ورسٹی سطح پر پوسٹ گریجوئٹ ڈگری اردو میں حاصل کرنا ممکن تھا۔ جو بیج فورٹ ولیم کالج میں ہندی اور اردو کے نام سے بوئے گئے تھے، ان کی کونپلوں نے ۱۸۶۷ء میں سر نکالا جب کہ بنارس کے بعض سربرآوردہ لوگوں نے یہ کوشش کی کہ تمام سرکاری عدالتوں سے اردو زبان اور فارسی رسم خط کو موقوف کر کے ہندی بھاشا اور دیوناگری رسم خط جاری کر دیا جائے۔ بقول مولانا سید سلیمان ندوی "سرسید اس وقت سے لے کر مرنے سے نو دن پہلے تک اس کے خلاف قلمی جہاد میں مصروف رہے اور ان ہی کی مخالفت کا اثر تھا کہ ان کی زندگی تک یہ تجویز سرکاری طور سے منظور نہ ہو سکی،، (نقوش ص ۶۱) اس کے چند سال بعد سرانیٹونی میکڈانلڈ، یو۔ پی کے لفٹنٹ گورنر نے اس صوبہ میں قانونی طور سے ہندی کو ممتاز مقام بخش دیا۔

۱۹۱۸ء میں مہاتما گاندھی نے آل انڈیا ساہتیہ سمیلن ناگری پرچار سبھا کے اندور والے اجلاس کے صدر کی حیثیت سے زبان کے مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا: "مغلوں کے زمانے سے ہی

ہندی اور اردو ہندوستان کی قومی زبان بننے لگی تھیں، لیکن دو سال بعد جب انھیں ہوم رول لیگ کی صدارت پیش کی گئی تو ۱۸ مارچ ۱۹۲۰ کو سرنواس شاستری کے نام انھوں نے خط لکھا:

"ہندی اور اردو کے امتزاج سے بنی ہوئی زبان "ہندوستانی" کو قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرلینا چاہیئے ۔ ۔ ۔ ۔ اسکولوں میں "ہندوستانی کی تعلیم کو ایک لازمی مضمون اور دیوناگری یا اردو رسم خط کو اختیاری حیثیت سے رائج کریں" (محمد علی جناح ص۲۹)

۱۹۳۵ء میں پھر اندور ہی میں سمیلن کے ۲۴ ویں اجلاس میں گاندھی جی نے فرمایا:

"صرف ہندی ہی قومی زبان بن سکتی تھی کیوں کہ ہندی کے سوا اور کسی دوسری زبان میں وہ فائدے نہیں جو ہندی سے حاصل ہوتے ہیں"۔

پھر گاندھی جی نے فرمایا:

"آپ نے غور کیا کہ میں نے ہندی۔ ہندوستانی کا لفظ استعمال کیا۔ میں نے ۱۹۱۸ء میں بھی کہا تھا کہ ہندی وہ زبان ہے جو ہندو اور مسلمان فطری طور پر بلا کسی تکلف کے بولتے ہیں۔ ہندی اور اردو میں کوئی فرق نہیں ہے"۔

اگلے سال ۱۹۳۶ء میں ۲۴ اپریل کو ناگ پور میں ہندوستان کی جملہ زبانوں کا ادبی اجتماع ہوا جس میں انجمن ترقی اردو کے سکریٹری کی حیثیت سے مولوی عبدالحق بھی شریک ہوئے۔ اس اجتماع میں ایک تجویز منظور ہوئی کہ اس سبھا کا کام "ہندی اتھوا ہندوستانی" میں کیا جائے گا اس پر "موجودہ سیاست اور اردو زبان" کے عنوان سے مولوی عبدالحق رسالہ "اردو" کے جون ۱۹۳۹ کے شمارے میں لکھتے ہیں:

"لیکن بڑا معرکہ بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اجلاس میں ہوا بحث یہ تھی کہ پریشد کی کاروباری زبان کیا ہو۔ گاندھی جی فرماتے تھے ہندی اور میں کہتا تھا ہندوستانی۔ میری دلیل یہ تھی کہ جب انڈین نیشنل کانگریس نے "ہندوستانی" کے متعلق فیصلہ کردیا ہے تو اسے ماننے میں کیا عذر ہوسکتا ہے۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ وہ ریزولیشن بھی تو میرا ہی بنایا ہوا تھا۔ میں نے کہا اس وقت تو اس کا یہ مطلب نہ تھا۔ فرمایا کہ میں اب بتاتا ہوں۔ میں حیرت سے ان کا منہ تکنے لگا۔ اس کے بعد انھوں نے ہندی ہندوستانی کا نیا لفظ گڑھا۔ انھوں نے فرمایا کہ میں ہندی نہیں چھوڑ سکتا۔ جب گاندھی جی ہندی چھوڑ نہیں سکتے ہیں تو ہم اردو کیسے چھوڑ دیں

اس کے بعد ہماری آنکھیں کھلیں" (خطبات ص۱۵۷)

اسی اجلاس میں گاندھی جی کی زبان سے وہ فقرہ نکلا کہ "اردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے جو قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں"

گاندھی جی کے اس بیان اور ملکی زبان کے ایک نئے نام "ہندی۔ ہندوستانی" کی تجویز سے شدید ردِعمل ہوا۔ مولوی عبدالحق کے احتجاج اور اردو داں طبقے کی طرف سے جو شورش پیدا ہوئی اس سے خود کانگریس کے حلقوں میں بھی حرکت ہوئی۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۳۸ کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے میں ڈاکٹر محمد اشرف نے تجویز پیش کی کہ ہندوستانی (دونوں رسم خط میں) ملک کی قومی زبان مانی جائے اور اس کی ترقی اور فروغ کے لیے ایک "ہندوستانی بورڈ" بنایا جائے جو اپنے لائحہ عمل کے لیے ایک جامع منصوبہ مرتب کر کے آل انڈیا کانگریس کے سالانہ اجلاس میں پیش کرے۔ مگر ڈاکٹر اشرف کی تجویز مسترد ہو گئی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں جلسے کو آگاہ کیا کہ کانگریس "ہندستانی" کے بجائے "ہندی" کا لفظ استعمال کر رہی ہے جس سے لوگوں میں غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے۔ مگر "فغانِ درویش" کسی کو سنائی نہ دی۔

مولوی عبدالحق بلاشبہہ اردو کے علمبردار تھے۔ ان کا مقولہ تھا "میری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہے، یعنی زبانِ اردو کی اشاعت اور ترقی" (ہماری زبان یکم جون ۱۹۳۹ء) اس کے باوجود انھوں نے اردو کا دوسرا نام "ہندستانی" قبول کر لیا تھا۔

"۱۹ر جون ۱۹۳۷ء میں مسلم یوتھ کانفرنس (مدراس) میں مولوی عبدالحق نے فرمایا "اردو یعنی ہندوستانی ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کا عظیم الشان نتیجہ ہے"

مولوی عبدالحق کے الفاظ میں ادیبوں اور اصحاب الرائے نے "ہندوستانی کا جس خلوص اور ولولے سے استقبال کیا۔ اس کی مثال مولانا سید سلیمان ندوی کے خطبات میں ملتی ہے :

" ہماری سب سے اہم تجویز یہ ہے کہ ہم اس زبان کا نام "اردو" جو سو ڈیڑھ سو برس سے رفتہ رفتہ ہماری زبانوں پر چڑھ گیا، یک قلم چھوڑ دیں، اس کا نام ہندوستانی رکھیں"
(نقوش ص۵۷)

ایک دوسرے جلسے میں مولانا سید سلیمان ندوی نے یہ بھی صاف صاف جتا دیا کہ،

" مسلمانوں کا یہ سمجھنا کہ یہ تجویز ہندوؤں کی خوشنودی کے لیے ہے یا ہندوؤں کا یہ سمجھنا کہ یہ ان

کو دھوکا دینے کے لیے سازش کی جارہی ہے، بدگمانی کی انتہا ہے" (نقوش صہ ۱۰۴) مولانا کا یہ فرمانا بھی صحیح تھا کہ "یہ تحریک خالص لسانی اصول ومبادی کی بنا پر اٹھائی گئی ہے جس کے بہت سے سبب ہیں" اور اس کے بعد انھوں نے وہ اسباب ایک ایک کر کے گنائے (نقوش صہ ۱۰۴ تا صہ ۱۰۹)

۱۹۳۶ میں ہندی ساہتیہ پریشد کا اجلاس ہوا تو اس کی کاروائی کے بعد یہ محسوس ہونے لگا کہ اردو والوں کو اب اپنے حق کی خاطر کمربستہ ہونے کی ضرورت ہے۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۶ میں مولوی عبدالحق نے علی گڑھ میں اردو کانفرنس بلائی جس کے اجلاس تین دن تک ہوتے رہے۔ ان میں اُن تمام محرکات کا جائزہ لیا گیا جو زبان کے بارے میں ملک میں پیش آرہے تھے۔ بھارتیہ ساہتیہ پریشد کی تجویز بھی اسی میں زیر بحث آئی۔ مولوی عبدالحق نے جلسے کو خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اب وہ انجمن ترقی اردو کو صرف علمی اور تحقیقی ادارہ کی حیثیت سے دیکھنے کے بجائے اس کے ذریعے اردو کو اس کا حق دلانے کی تحریک چلائیں گے۔ تحریک چلانے کا کام پورا وقت اور پوری توجہ چاہتا تھا۔ مولوی صاحب نے اس سلسلے میں دو اہم فیصلے کیے: انجمن کا دفتر اورنگ آباد سے راجدھانی دلّی منتقل کیا اور خود جامعہ عثمانیہ کی ملازمت ترک کر کے پنشن لے لی۔ اپنا ذاتی کتب خانہ، جو نادر کتابوں اور مخطوطات پر مشتمل تھا، انجمن کو دے دیا۔

مولوی عبدالحق چاہتے تو مسلم لیگ کی مقبولیت کے پیش نظر، اس کی حمایت حاصل کر کے اپنی تحریک کو تقویت پہنچا سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے اردو اور صرف اردو کے سپاہی کی حیثیت سے زبان کی مدافعت اور اس کا حق دلانا اپنا مقصد حیات بنایا۔ اور اپنی تحریک کو فرقہ وارانہ مسئلہ بننے کی انتہائی مزاحمت کی۔ ان کے خاص رفیقِ کار ہاشمی فرید آبادی کے الفاظ ہیں:

"وہ تعصبات سے بالکل بری تھے اور تقسیم ہند یا اس کے قریب کے زمانے تک ہندوستان کی متحدہ قومیت کے آرزومند رہے، بلکہ یہی آرزو انھیں اور طیش دلاتی رہی کہ اردو، جو اس متحدہ قومیت کی علامت تھی اور نہایت آسانی اور خوبی سے قومی زبان کا کام دے سکتی تھی، اسے فرقہ وارانہ یا تنگ نظری سے نقصان پہنچایا جارہا تھا" (پنجاہ صہ ۱۳۷)

خود مولوی صاحب نے یکم جون ۱۹۳۹ میں لکھا:

"مجھے یا انجمن ترقی اردو کو کسی سیاسی جماعت سے دور کا بھی تعلق نہیں اس کے باوجود

ہر جماعت سے تعاون کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔ بہ شرطیکہ اسے ہمارے مقاصد سے ہمدردی ہو۔" (ہماری زبان)

۱۹۳۷ء کے بعد سے ہندوستانی سیاست دو محور کے گرد پھر رہی تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ۔ ان میں مسلم لیگ نے پہلے تو اپنی ساری توجہ کانگریس کی پالیسی کی طرف اور بعد میں مطالبۂ پاکستان پر مرکوز کر رکھی ۔ ان دونوں معاملوں میں جو لوگ ہندوستان کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے یا کرنے والے تھے، ان کی رہنمائی کے لیے کسی تعمیری پروگرام ۔سیاسی، معاشی یا ثقافتی۔ کی گنجائش نہیں رکھی گئی تھی۔ اس کے برعکس چوں کہ کانگریس کے رہنماؤں کو یقین ہو چلا تھا کہ ملک برطانوی دسترس سے نکل کر خود مختاری کی طرف بڑھ رہا تھا اس لیے وہ اس کے مستقبل کے بارے میں ہر پہلو سے غور و فکر کرنے لگے تھے۔ ہندوستان میں ایک نہیں، بیسیوں زبانیں بولی جاتی تھیں اور ان میں سے کئی ایسی تھیں جو بہت کافی ترقی یافتہ تھیں۔ ان میں سے کون سی زبان ملکی زبان ہو، یہ غور طلب مسئلہ تھا۔ کانگریس کے سب لیڈر ہم خیال نہ تھے لیکن انھوں نے بہتر یہی جانا کہ سیاسی انتشار کو روکنے کی خاطر قیادت کی باگ ڈور مہاتما گاندھی کے ہاتھوں میں دے دی جائے۔ گاندھی جی کے ایما پر کئی تحریکیں شروع کی گئیں لیکن یہ کہنا دشوار ہے کہ ان سب تحریکوں پر لبیک کہنے والوں میں کتنے لوگ ایمانداری سے عمل پیرا ہوئے اور کتنے انھیں وقتی مصلحت سمجھ کر پالیسی کے تحت۔ وجہ جو بھی رہی ہو، اس میں کوئی شک نہیں کہ مہاتما گاندھی کانگریس میں بے تاج کے بادشاہ رہے۔ یہی وجہ تھی کہ مولوی عبدالحق نے اردو کی تحریک کا مخاطب گاندھی جی کو بنایا اور انھیں کے ذریعہ اسے اس کا حق دلانے کی کوشش کی۔ انھیں امید تھی کہ آئندہ جو حکومت اس ملک کی ہوگی اس میں کانگریس برسر اقتدار ہو گی اور گاندھی جی اس کے رہبر ہوں گے۔ مولوی عبدالحق نے زبان کا معاملہ گاندھی جی ہی سے طے کرنا چاہا۔

اردو کے سلسلے میں سب سے زیادہ غلط فہمی گاندھی جی کی اس تقریر سے ہوئی جو انھوں نے اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے ناگ پور والے اجلاس میں کی جس میں انھوں نے "مسلمانوں کی زبان" اور "قرآنی حروف" میں لکھی جانے والی زبان کی بات کی۔ دوسری طرف بدقسمتی سے کانگریس کے اکثر ارکان کانپور کی قرارداد جو پرشوتم داس ٹنڈن نے تیار کی تھی اور جس کا اعادہ فیض پور کے اجلاس میں ہوا تھا، یعنی ہندوستانی کو نظر انداز کر کے، ہندی اور صرف ہندی اور دیوناگری لپی کی طرف جھک گئے۔

زبان کے نام کے بارے میں گاندھی جی نے بار بار اپنا خیال نئے نئے انداز سے پیش کیا۔ کبھی "ہندی" کبھی "ہندی۔ اردو"، کبھی "ہندوستانی"، کبھی "ہندی انخوا ہندوستانی" کہا لیکن "قرآنی حروف" اور "مسلمانوں کی مذہبی زبان" والی بات سے انحراف کبھی نہیں کیا۔ ۱۹۴۲ میں گاندھی جی نے بنارس ہندو یونیورسٹی میں کنووکیشن خطبہ دیا۔ ان کے ایک مراسلہ نگار نے اس خطبہ کی طرف ان کی توجہ مبذول کراتے ہوئے انھیں لکھا:

"مہاتما جی آپ فرماتے ہیں کہ اردو کے خلاف آپ کوئی تعصب نہیں رکھتے ہیں، پھر بھی آپ اسے مسلمانوں کی قرآنی حروف میں لکھی جانے والی زبان کہتے ہیں جسے چاہیں تو مسلمان رکھیں۔"

اس کے بعد مراسلے میں جن دوسری باتوں کا ذکر ہے ان کے جواب تو گاندھی جی نے دئے مگر قرآنی حروف والی بات پر وہ مطلق خاموش رہے۔ لطف یہ کہ اسی جواب میں انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ "ہزاروں ہندو ایسے ہیں جو آج بھی صرف اردو رسم خط میں لکھتے ہیں اور دیوناگری سے قطعی ناواقف ہیں۔"

انھوں نے ہندوستانی کے نام سے ایک رسالہ نکالا جس میں اردو اور ہندی دونوں رسم الخطوں میں مضامین شائع ہوتے تھے۔ ناگ پور میں اکھل بھارتیہ پریشد کے جلسے کے بارے میں مولوی عبدالحق کا ایک طویل خط شائع ہوا۔ یہ جلسہ ۲۴، ۲۵ اپریل کو ہوا، صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد اور صدر استقبالیہ کاکا صاحب کالیکر، دونوں پکے گاندھی وادی تھے۔ جلسے کا مقصد ہندوستان کے سب علاقائی زبانوں کے ادب اور ادیبوں میں آپس میں میل ملاپ پیدا کرنا اور اس کام سے دیسی زبانوں کی ترقی اور پھیلاؤ میں مددگار ہوتا تھا۔ اسی جلسے میں کہا گیا کہ سبھا کا کام ہندی انخوا ہندوستانی میں ہوگا، جس پر مولوی عبدالحق نے شدت کے ساتھ مخالفت کی۔

مولوی عبدالحق کا خط چھپا تو گاندھی جی نے "ہریجن سیوک" کے یکم اگست کے شمارے میں ایک مضمون "غلط فہمی کی گتھی" لکھا۔ جس میں اردو اور اردو والوں پر الزامات عاید کیے گئے تھے۔ اس مضمون سے پنڈت سندرلال کافی دلگیر ہوئے۔ انھوں نے ایک طویل خط گاندھی جی کو لکھا جو "ہماری زبان" اور رسالہ "اردو" (جنوری ۱۹۳۷) میں شایع کیا گیا۔ پنڈت سندرلال کی اہمیت کے مدنظر یہ خط اس قابل ہے کہ اس کے بعض حصوں پر غور کیا جائے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ مولوی عبدالحق کو اردو کا حق دلانے میں

کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑے۔

۱۔ گاندھی جی نے لکھا: "اردو نام خاص طور سے اور خاص مطلب سے رکھا گیا۔ پنڈت سندر لال نے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا: ہندی اور اردو ان دونوں شبدوں کا جنم کبھی بھی اور کسی طرح ہوا ہو اور ان کے مصدری معنی کچھ بھی رہے ہوں، اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ آج یہ دونوں نام ہندوستانی زبان کی دو الگ الگ شکلوں کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔ اور ان کے دو صاف صاف الگ الگ مروّجہ معنی ہیں۔ ایسی صورت میں جو لوگ ان دونوں شکلوں کو پھر سے ملا کر ایک زبان بنانا چاہتے ہیں انھیں کسی تیسرے نام کا سہارا لینا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی سچائی کو محسوس کرکے آپ نے خود کچھ سال پہلے" ہندوستانی" (لفظ) کو استعمال کیا تھا اور ملک کو سکھایا تھا۔ پھر اب وہ حالت بدل گئی۔

۲۔ "آپ کے یہ الفاظ پڑھ کر: "اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ وے (یعنی اردو والے) بھاشا کا ویاکرن (قواعد) بھی بدل دیتے ہیں" مجھے اور بھی دکھ اور حیرانی ہوئی۔ ۔ ۔ ۔ ہندوستانی زبان کی مختلف شکلوں پر جتنی اچھی کھوج (تحقیق) گذشتہ تیس سال میں مولانا عبدالحق نے کی ہے، شاید کسی دوسرے نے نہیں کی۔ ۔ ۔ ۔ اگر آپ منشی پریم چند سے دریافت کر لیتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ اصلیت اس سے ٹھیک برعکس ہے"۔

۳۔ "شاید آپ کے دھیان میں یہ بات نہیں ہے کہ اس وقت کی کتابی ہندی، ہندوستان کے کسی بھی ضلع یا نگر یا گاؤں کی بول چال کی زبان نہیں ہے۔

۴۔ "ہاں کچھ مصنف ہر زبان کے ایسے ضرور ہوتے ہیں جو ویاکرن کے قاعدوں سے بندھنا نہیں چاہتے ان میں کچھ اعلا مرتبے کے مصنف ہیں جنھیں ایسا کرنے کا اختیار بھی دیا جا سکتا ہے، مثلاً ہندی میں مرحوم بال کرشن بھٹ۔ ۔ ۔ ۔ ہندی یا اردو کا کوئی قدیم یا حال کا ادیب اس معاملے میں شاید اتنا قصور وار نہیں ہے جتنا مرحوم بھٹ"۔

۵۔ "آپ نے لکھا ہے: "مولوی عبدالحق صاحب نے ہندی۔ ہندوستانی کے بجائے صرف ہندستانی یا ہندی اردو کہنے پر یوگ (استعمال) کا پرستاؤ رکھا تھا مجھے تو ان دونوں میں کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن بھارتیہ ساہتیہ پریشد اپنے جنم کو نہیں بھول سکتا۔ ۔ ۔ ۔ اسی لیے شبد (الفاظ) کا رکھنا

ضروری ہو گیا۔

۶۔ " مولانا عبدالحق کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ۔۔۔۔ جو اردو ادیب وہاں آئے تھے وہ غلط امید یں باندھ کر آئے تھے۔۔ ۔شاید انھیں دعوت دینے میں بھی بے احتیاطی ضرور ہوئی۔ ملک کی بڑی خوش قسمتی ہوتی اگر آپ کی رہنمائی میں کوئی ایسی ہندوستانی ساہتیہ پریشد قائم ہو سکتی جو اپنے رسالوں اور کتابوں میں ہندوستانی زبان لکھنے کی کوشش کرتی اور جس کی چیزیں ناگری اور فارسی دونوں حروف میں نکل کر ہندی اور اردو کو دونوں کے پڑھنے والوں کو آہستہ آہستہ ہندوستانی زبان کی طرف لائیں "۔

۷۔ " باپو جی! میں نے عبدالحق صاحب کے خط اور آپ کے لیکھ دونوں کو ملا کر پڑھا۔ جو شکوک اس خط سے پیدا ہوتے ہیں، آپ کے لیکھ سے وہ رفع نہیں ہوتے "۔

۸۔ " مولانا سلیمان ندوی جیسے وِدوان (ذی علم)۔۔۔۔ برسوں سے زوروں کے ساتھ کھلے طور پر کوشش کر رہے ہیں کہ ہمیں نہ صرف اردو کو سہل ہندوستانی بنانا چاہیے بلکہ اردو کی جگہ اسے ہندوستانی کہنا چاہیئے۔

۹۔ رسم الخط کا سوال علاحدہ ہے۔ ان قابلِ تعریف کوششوں کی کچھ جھلک آپ کو عبدالحق صاحب کے خط میں بھی مل سکتی ہے۔ یہ سب کافی حد تک آپ ہی کے پریم اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے۔ مگر ناگپور سے اب تک نہ جانے کیا ہوا، بہت سے اس طرح سچے اور سنجیدہ مسلمان کام کرنے والوں کے دل بھی شکوک اور مایوسی سے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں جو اپنے دکھ کو زبان تک بھی لانا نہیں چاہتے ہیں۔

یہ خط الہ آباد سے ۲۴ ستمبر ۱۹۳۶ء کو لکھا گیا۔

۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۸ء تک ہندوستان کی قومی زبان کے نام کی تاویل کچھ اس انداز سے ہوتی رہی کہ اس کی وجہ سے کوئی معیّن صورت سامنے آنے کے بجائے الجھنوں میں اضافہ ہوتا گیا اور یہی حال رسم خط کا بھی ہوا۔ گاندھی جی کی تحریروں اور بیانات کا جائزہ لیا جائے تو ان کا خلاصہ اس طرح نکلتا ہے:

۱۔ ہندی ہی واحد قومی زبان بن سکتی ہے (۲۰ اکتوبر ۱۹۱۷ء)

۲۔ ہندی اور اردو کے امتزاج سے قومی زبان بن سکتی ہے (اندور ۱۹۱۸)

۳۔ دیوناگری کو ہندوستان کی کل زبانوں کے لیے واحد رسم خط بنایا جائے تاکہ اس طرح "ہندوانڈیا" میں مکمل یک جہتی پیدا ہوسکے (ینگ انڈیا ۱۴ر جولائی ۱۹۲۷ء)

۴۔ ہندی اور اردو بہنیں ہیں (ہریجن ۱۶ر جون ۱۹۴۶ء)

۵۔ راشٹر بھاشا ہندستانی ہے نہ کہ ہندی (پریس رپورٹ ۲۸ر جنوری ۱۹۴۶ء)

۶۔ ہندی ساہتیہ سمیلن میں اسے ہندی اتھوا ہندوستانی بتایا (فروری ۱۹۳۵ء)

۷۔ ہندی، اردو اور ہندستانی ایک ہی زبان کے جدا جدا نام ہیں (ہریجن ۱۶ر مئی ۱۹۳۶ء

۸۔ راشٹر بھاشا کا نام صرف ایک ہے۔ ہندوستانی (۲۴ر دسمبر ۱۹ر دسمبر ۱۹۳۸ء)

۹۔ ہندی + اردو = ہندوستانی (ہریجن ۸ر فروری ۱۹۴۲ء)

۱۰۔ ہندی اور اردو دونوں کو پھولتا پھلتا دیکھنا چاہتا ہوں (پریس رپورٹ)

۱۱۔ یہ (ہندی اور اردو) دو ندیاں ہیں جن کے سنگم سے تیسری ندی نکلے گی۔ ہندوستانی کی ندی (پریس رپورٹ یکم مارچ ۱۹۴۵ء)

۱۲۔ ہندی اور اردو، گنگا اور جمنا کی طرح ہیں، ہندوستانی سرسوتی ہے جو اب تک ظہور میں نہیں آئی ہے (پریس رپورٹ ۲۸ دسمبر ۱۹۴۴ء)

۱۳۔ راشٹر بھاشا کی آئیڈیولوجی ہندی اور اردو کو بچانا ہے (پریس رپورٹ ۱۱ر جنوری ۱۹۴۶ء)

۱۴۔ راشٹر بھاشا ہندوستانی ہے، ہندی نہیں ہے (پریس رپورٹ ۲۸ر جنوری ۱۹۴۶ء)

۱۵۔ مجھے کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی یعنی۔ ہندی اور اردو کا صحیح امتزاج ہی قومی زبان ہے (ہریجن ۷ر اپریل ۱۹۴۶ء)

رسم خط کے متعلق ۲۶ر اپریل ۱۹۴۷ء کے "ہریجن" میں گاندھی جی نے لکھا " اگر ہم قومی زبان کو پوری طرح ترقی دینا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ دونوں رسم خط (دیوناگری اور اردو) کو مساوی درجہ دیا جائے" پھر اسی شمارے میں آگے چل کر تحریر فرمایا" ۱۹۲۵ء میں جب کانگریس نے قومی زبان کا نام "ہندستانی" رکھا اور دونوں رسم خط کے استعمال کیے جانے کی اجازت دی تو گویا ہندی + اردو قومی زبان قرار پائی۔ ان فیصلوں میں بلاشبہ ہندو مسلم اتحاد پیش نظر تھا۔ اس بیان سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ فیصلہ لسانی بنیاد پر نہیں بلکہ سیاسی مصلحت کی بنا پر کیا گیا۔ ایک پریس رپورٹ کے مطابق گاندھی جی نے یہ بھی کہہ دیا" اگر

تم اردو رسم خط پسند نہیں کرتے ہو تو میں اس سے یہ نتیجہ اخذ کروں گا کہ تم ہندوستانی پسند نہیں کرتے ہو۔ ۔ ۔ اس لیے خواہ تم چاہو یا نہ چاہو تمھیں اردو سیکھنی ہو گی اور اس سے پریم کرنا پڑے گا (۲۱ نومبر ۱۹۴۵)

ان مختلف فیہہ بیانات اور زاویوں کی روشنی میں مولوی عبدالحق کے لیے اردو کی آسان شکل کو جسے وہ ہندستانی کہنے پر راضی ہو گئے تھے آگے بڑھانے کا کام دشوار گزار ہو گیا۔ یکم اپریل ۱۹۴۱ء کو "افکار و واقعات" کے تحت انھوں نے لکھا:

"دو سال کے عرصے میں ۔ ۔ ۔ اردو کے خلاف جو زبردست طوفان اٹھا تھا اسے اگر ہم فرو نہیں کر سکے تو اتنی کامیابی ضرور ہوئی کہ اردو والوں کو آنے والے خطروں سے ہم نے ہوشیار کر دیا اور اس طرح اس طوفان کے اثرات زیادہ نہ ہونے پائے ۔ ۔ ۱۹۳۹ء میں اردو کانفرنس دہلی کے نام اپنے پیغام میں (گاندھی جی) اردو ہندی کا تذکرہ اس پیرائے میں کیا کہ گویا اردو صرف مسلمانوں کی اور ہندی صرف ہندوؤں کی زبان ہے۔ ہم نے انھیں پھر اپنی رائے بدلنے پر مجبور کیا اور بالآخر وہ اس حد تک آ گئے کہ "بے شک اردو ان حصوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی مادری زبان ہے جہاں اس کو یہ حیثیت حاصل ہے" ہمیں امید ہے کہ اگر ایسی رفتار رہی تو تھوڑے دنوں بعد گاندھی جی بالکل ہمارے ہم خیال ہو جائیں گے (ہماری زبان)"

اس دوران مولوی عبدالحق ریڈیو، ڈاک خانہ، اسکولوں اور کالجوں میں جہاں جہاں اردو کے خلاف کچھ دیکھا تو اس کے تدارک کے لیے کوشاں رہے۔

زبان کے مسئلے کے حل کرنے میں امید کی ایک کرن انھیں اس وقت دکھائی دی تھی جب ۱۹۳۲ء میں دیسی زبانوں میں تعلیم دینے کی ضرورت ہر جگہ تسلیم کی جانے لگی۔

انجمن ترقی اردو کی پٹنہ شاخ کی تحریک پر ۲۸ اگست ۱۹۳۷ کو ایک خاص جلسہ مولانا سید سلیمان ندوی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں علی گڑھ، دلی، لکھنؤ کے بعض اساتذہ کے علاوہ مصنفین اور ناشرین بھی شریک ہوئے۔ اس جلسے نے "ہندوستانی" کو تسلیم کرتے ہوئے حکومت بہار سے مطالبہ کیا کہ "ہندوستانی زبان کے قواعد، اصطلاحات علمی اور لغات کے لیے ایک کمیٹی بنائی

جائے جس میں انجمن ترقی اردو اور ہندی کی جماعت کے نمائندے مساوی تعداد میں شریک ہوں کمیٹی کی کوشش یہ ہو کہ ممکن حد تک اتفاق سے کام لیا جائے لیکن اختلاف کی صورت میں اردو رسم خط کی کتابوں کے متعلق انجمن ترقی اردو اور ہندی رسم خط کی ہندوستانی کی کتابوں میں ہندی انجمن کے نمائندوں کی رائے فیصلہ کن سمجھی جائے۔"

یہ محض اتفاق کی بات نہیں تھی کہ اس جلسے کی سہ پہر کی نشست میں بابو راجندر پرشاد اور صوبائی کانگریس کے سکریٹری بھی چلے آئے۔ درحقیقت وہ گاندھی جی کے ایما پر شریک ہونے آئے تھے۔ متعلقہ مسائل پر باہمی گفتگو کے بعد ایک متفقہ اعلان شایع کیا گیا جس پر بابو راجندر پرشاد اور مولوی عبدالحق سکریٹری انجمن ترقی اردو نے دستخط کیے؛ یہی راجندر۔ عبدالحق پیکٹ کہلایا۔ اس اعلان میں کہا گیا تھا۔

"بہار کی اردو کمیٹی کے جلسے منعقدہ ۲۸ راگست ۱۹۳۷ء میں ہندوستانی زبان کے مسئلہ پر بحث و گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ ہمیں فکر تھی کہ اردو، ہندی، ہندوستانی کے مناقشے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں انھیں دور کیا جائے اور خوشی کی بات ہے کہ مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس باب میں جو گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ ان میں بڑی حد تک ہم متفق الرائے ہیں۔ چناں چہ ہم کو اس پر اتفاق ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان ہندوستانی ہونی چاہیے اور یہ دونوں رسم الخط اردو اور دیوناگری میں تحریر ہو اور جملہ دفتری اور تعلیمی اغراض کے لیے سرکاری زبان تسلیم کی جانی چاہیے۔ ہندوستانی سے ہم وہ زبان مراد لیتے ہیں جو شمالی ہند کی بولی میں سب سے بڑا مشترکہ عنصر ہے اور ہماری دانست میں اس ذخیرے میں الفاظ کے شمول اور انتخاب کا معیار بھی عام استعمال میں رواج ہونا چاہیے۔ مزید براں ہماری رائے ہے کہ ہندی اور اردو دونوں کو بہ حیثیت ادبی زبانوں کے ترقی کرنے کے پورے مواقع دیے جانے چاہئیں۔"

اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بہار کے وزیر تعلیم ڈاکٹر سید محمود نے بابو راجندر پرشاد کی صدارت میں ماہرین تعلیم کی ایک کمیٹی بنائی جس میں مولوی عبدالحق مجاز کیے گئے کہ ہندوستانی زبان

کا لغت تیار کریں جس میں وہ تمام عربی و فارسی الفاظ آجائیں جو مستند ہندی کے مصنفوں نے استعمال کیے ہیں۔ اسی طرح وہ تمام ہندی اور سنسکرت الفاظ بھی شریک کیے جائیں جو مستند اردو مصنفوں کے کلام میں پائے جاتے ہیں [۱]

مولوی عبدالحق نے یہ لغت تیار کر لیا اور پٹنہ بھیج دیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہونے لگا کہ قومی زبان کا مسئلہ طے پا گیا۔ مگر نہ تو لغت کی اشاعت کی نوبت آئی اور نہ تجویز پر عمل درآمد کرنے کا۔

جب گاندھی جی کی طرف سے مایوسی ہوئی تو مولوی عبدالحق نے ۱۹۴۰ سے ملک بھر کا دورہ کر کے اردو کی تحریک کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی۔ اپنے کبرسن کے باوجود بنگال، بہار، گجرات، یو پی، راجستھان مہاراشٹر، میسور، کیرل، سی۔ پی، مدراس صوبوں کے مختلف مقامات میں جاکر انجمن ترقی اردو کی شاخیں قایم کیں، ایک جگہ بڑے درد کے ساتھ انھوں نے کہا:

"ہندوستان جو آج ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے اور ہر جماعت دوسری جماعت کو اور ہر فرقہ دوسرے فرقے کو بھنبھوڑنے اور ہضم کرنے پر آمادہ ہے، ان کے مزاج کو ٹھنڈا کرنے اور ان کو اعتدال پر لانے کے لیے یہی (زبان کا) نسخہ دے سکتا ہے۔ یہ ٹکڑے گوند یا لئی سے نہیں جڑ سکتے، کچے تاگے سے نہیں بندھ سکتے۔ ان کو یکجا کرنے اور باندھنے کے لیے شیرازے کی ضرورت ہے اور یہ شیرازہ ہماری اردو زبان ہے جس کے خمیر میں اتحاد ہے۔ یہ اتحاد سے بنی تھی اور آئندہ بھی اگر اتحاد پیدا کرے گی تو یہی کرے گی۔ وہ بقول سر تیج بہادر سپرو، ہندو، مسلمان کے آبا و اجداد کا مشترکہ اور مقدس ترکہ ہے جو قطعاً ناقابلِ تقسیم ہے۔" (ص ۱۶۰)

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند سے جو صورتِ حال پیدا ہوئی اس نے اردو کے اس بوڑھے سپاہی کی گویا کمر توڑ دی لیکن اس کی ہمت نہیں ٹوٹی۔ دلی میں فسادات ہو رہے تھے تو مولوی عبدالحق حیدرآباد تھے۔ مولوی صاحب جب دلی پہنچے تو دریا گنج میں انجمن کے دفتر کو خاک کا ڈھیر دیکھ کر ان کے دل کی کیا کیفیت ہوئی اس کا اندازہ صرف وہی لگا سکتے ہیں جو ایسے حادثے سے دوچار ہوئے ہوں گے۔ اس کے باوجود ان کے عزم اور

---

[۱] اس کی تجویز مولوی عبدالحق نے اورینٹل کانفرنس۔ بڑودہ کے اجلاس میں ۱۹۳۳ء میں پیش کی تھی۔ (خطبات ص ۱۱)

اردو کی خدمت کے ارادے میں کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوا۔ وہ اپنا کام جاری رکھنا چاہتے تھے۔ شاید وہ سمجھتے تھے کہ اس ملک میں اب ان کی زیادہ ضرورت ہے۔ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیمات، کو خط لکھا۔ اور ۱۵ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کو ان سے ملے اور اپنے ارادے سے آگاہ کیا مگر مولانا آزاد نے انھیں اس ارادے سے باز رکھنے کی تلقین کی۔ فرمایا:

"بہت بدگمانیاں ہیں۔ آپ لاہور یا کراچی کو اپنا صدر مقام بنائیے۔ یہ ٹھیک نہیں کہ آپ کی ایک ٹانگ یہاں اور ایک ٹانگ وہاں ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ موجودہ حالات ایسے نہیں کہ آپ یہاں کام کریں" (پنجاہ صفحہ ۲۰۴)

مولوی صاحب نے ۲۰ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کو مولانا آزاد کو خط لکھا:

"اس میں مطلق شبہ نہیں کہ میں بدستور یہاں کام کرنا چاہتا تھا اور اب بھی یہاں کام کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔ ۔ ۔ ۔ میں نے انڈین یونین کی سکونت (شہریت ؟) ترک نہیں کی ہے۔"

اس یقین دہانی کے باوجود مولوی عبدالحق کو ترک وطن کرنا پڑا۔ اس کے بعد ان پر کیا گزری یہ الگ داستان ہے۔

۲۶ر جنوری ۱۹۴۹ء کو دستور ساز اسمبلی نے ہندوستان کی ہندی دیوناگری رسم خط میں ملک کی قومی زبان قرار دیا اور اس طرح "ہندوستانی" کے معاملے پر آخری مہر ثبت کر دی!

نہ جانے اس فیصلے کا گاندھی جی کے دل پر کیا اثر ہوا۔ انھوں نے بمبئی کی ہندوستانی پرچار سبھا کی سکریٹری مسز پیرین کیپٹن کو اپنی پرچار سبھا کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا:

"تم نے دیکھا میں نے کل "ہندوستانی" پر کیا کہا۔ ہم کو اور تم کو اس کام کے لیے کڑی محنت کرنی ہوگی، مر جانے کی حد تک، بددل نہ ہو۔"

ہندوستان کی ملکی زبان بنانے میں مولوی عبدالحق کی کوششوں کے جائزے کے بعد یہ سوال رہ جاتا ہے کہ آخر یہ سب کیوں اور کیسے ہوا؟ قطع نظر اس سے کہ بقول اندولال یاگنک کہ "گاندھی جی جب کوئی تجویز پیش کرتے تو اپنے فرار کی صورت پہلے سے سوچ لیتے" (ہماری زبان یکم فروری ۱۹۴۶ء)، وہ کون سے اسباب تھے کہ جن کی وجہ سے گاندھی جی ملک کی مشترکہ زبان کے بارے میں اپنا موقف بدلتے رہے جس

نے معاملے کو الجھن میں ڈال دیا؟

پہلی وجہ تو یہ نظر آتی ہے کہ گاندھی جی اردو زبان سے، اس لسانی اور تاریخی پس منظر سے واقف نہ تھے انھوں نے خود تسلیم کیا:"

"اردو کا میرا علم ہندی سے بہت کم ہے اور اس کمی کی وجہ سے (اردو) پڑھنا میرے لیے اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ میری جانکاری بہت محدود ہے۔ ہندی میں نے بچپن میں سیکھی اردو مجھے سیکھنی پڑی۔ میں آسانی سے اس میں کچھ لکھ بھی نہیں سکتا" (ہریجن ۷ جولائی ۱۹۴۶)

اس کے ایک ہفتہ بعد انھوں نے لکھا:

مجھے دونوں زبانوں سے پریم ہے لیکن ان دونوں میں سے کسی کا ماہر نہیں ہوں۔ کتابوں کے ذریعے مجھے ان کے مطالعے کا موقع نہیں ملا۔ میرا اردو کا علم تو ہندی سے بھی بہت کم ہے"
(ہریجن ۱۴ جولائی ۱۹۴۶ء)

ان کو یہ غلط فہمی رہی کہ اردو زبان فارسی اور عربی سے اس قدر بوجھل ہے کہ ہندوستان میں اسے صرف عربی اور فارسی داں مسلمان ہی سمجھ سکتے ہیں۔ وہ اردو کو صرف مسلمانوں کی دلداری کی خاطر قائم رکھنے کے حامی تھے، اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے ۹ نومبر ۱۹۴۷ء کے "ہریجن" میں لکھا: دلداری (appease - ment) کی پالیسی کو ناپسندیدہ مانی جاتی ہے لیکن یہ ہمیشہ بری نہیں ہوتی"۔

اس سے پہلے بھی وہ لکھ چکے تھے کہ ۱۹۲۵ میں جب کانگریس نے "ہندوستانی" کی تجویز منظور کی تھی تو یقیناً اس معاملے میں ہندو مسلم اتحاد ہی مد نظر رہا گیا (ہریجن ۲۶ اپریل ۱۹۴۲)

دوسرے لفظوں میں گاندھی جی نے اردو، ہندی، ہندوستانی کے مسئلے کو خالص لسانی ضرورت اور تقاضے کے تحت نہیں بلکہ صرف سیاسی زاویۂ نگاہ سے دیکھا۔ اس لیے اس کی وضاحت میں الٹ پھیر کرتے رہے جو سیاست کا مسلّمہ طریقہ ہے۔

الجھن کا دوسرا سبب یہ بھی ہوا کہ گاندھی جی کے وہ رفقاء کار جو انھیں زبان کے معاملے میں مشورے دیتے رہے۔ اپنی بات دیانت داری سے کہنے کے بجائے، گاندھی جی کی اردو سے عدم واقفیت کا فائدہ اٹھاتے رہے۔ ان میں بابو راجندر پرشاد، پرشوتم داس ٹنڈن، کنہیالال منشی، کاکا کالیلکر، شری من نارائن اگروال، رتن لال پارکھ وغیرہ کے نام نمایاں طور پر آتے ہیں۔ یہ سب بہ ظاہر "ہندوستانی" کے حق میں تھے،

انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں اس عام فہم زبان کی حمایت کی تھی۔ ۱۹۲۵ء کے کانپور اجلاس میں کانگریس کے سامنے ہندوستانی زبان کی جو تعریف کی گئی تھی وہ ٹنڈن جی کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ بابو راجندر پرشاد، فارسی کے فرسٹ کلاس گریجویٹ تھے، کنہیالال منشی گجراتی کے مشہور لیکھک تھے۔ کاکا کالیلکر کو گاندھی جی نے خصوصی پرچارک بنا رکھا تھا۔ لیکن ان کی تحریروں اور بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ "ہندوستانی" کے بارے میں ذہنی تحفظ سے کام لیتے رہے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں بہار کی صوبائی ہندی ساہتیہ سمیلن کا افتتاح کرتے ہوئے ۵ فروری کو بابو راجندر پرشاد نے فرمایا:

"آج میں یہ کہتا ہوں کہ ہندی ایک زندہ زبان ہے جو سارے ہندوستان میں بولی اور لکھی جاتی ہے، ہزاروں اسے سیکھ رہے ہیں۔ یہ ایک قومی خدمت ہے کیوں کہ وہ ایک زبان کو ترقی دے رہے ہیں جو ان کے نزدیک قومی زبان ہوسکتی ہے (ہماری زبان یکم اپریل ۱۹۴۰ء)

اگلے برس "پوربا بھارت راشٹر بھاشا پرچار کانفرنس" منعقدہ ۲۲ جون ۱۹۴۱ کو کلکتہ میں انھوں نے فرمایا:

"چوں کہ ہندی سب سے بڑی زبان ہے جو شمالی ہندوستان میں بولی جاتی ہے اور قریب قریب ملک کے ہر حصے میں سمجھی جاتی ہے لہذا اس امر پر اتفاق ہے کہ صرف یہی ایک زبان ہندوستان کی قومی زبان بن سکتی ہے" (ہماری زبان یکم جولائی ۱۹۴۱ء)

ملک آزاد ہوا تو اس کی دستور ساز اسمبلی کی کانگریس پارٹی ملکی زبان کا فیصلہ کرنے بیٹھی، آدھے ارکان "ہندوستانی" کے حق میں تھے اور باقی ہندی کے حق میں۔ ووٹ لیے گئے تو برابر برابر ووٹ آئے۔ اس وقت راجندر بابو نے اپنے صدارتی حق (کاسٹنگ) ووٹ دیوناگری میں ہندی کے حق میں دے کر یہ باب ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ ایک اور صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے ہندی ہندوستان کی ملکی زبان قرار پائی۔ جمہوری طرز کا یہ فیصلہ دنیا کی تاریخ میں آپ اپنی مثال ہے!

اس واقعہ کے دو سال بعد ڈاکٹر راجندر پرشاد (صدر جمہوریہ ہند) نے بمبئی میں ہندوستانی پرچار سبھا کے نام ایک پیغام میں فرمایا:

"ہندوستانی کا مسئلہ باپو (گاندھی جی) کو دل سے عزیز تھا۔ ان کی آرزو تھی کہ ہر شخص

دونوں رسم خط میں "ہندوستانی" سیکھے۔ یہ باپو کے تعمیری پروگرام کا اہم اور لازمی جزو ہے۔
جو لوگ اس کام میں تن من سے لگے ہوئے ہیں قابل مبارکباد ہیں۔۔۔۔۔

درحقیقت دستور میں جس طرح ہندی کی وضاحت کی گئی ہے اس سے وہی ہندوستانی زبان
مراد ہے جس کی تعریف مہاتما گاندھی نے کی تھی" (ہندوستانی پرچار سبھا کا کتابچہ)
اس پیغام کی تاریخ ۲۶ رمئی ۱۹۵۱ ہے سرکاری سطح پر جو ہندی، ریڈیو، ٹی۔وی اور ابلاغ عامہ کی خاطر
استعمال کی جارہی ہے اسے دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ ناطقہ سر بہ گریباں ہے کہ اسے کیا کہیے۔

کاکا کالیلکر نے "ہریجن" کے شمارہ ۷ر نومبر ۱۹۴۶ میں لکھا:

"کچھ عرصہ تک ہم نے ہندی کو قومی زبان کی حیثیت سے مقبول کرانے کی کوشش کی۔ ہم نے
کہا کہ اردو، ہندی میں شامل ہے اور ہم نے وہ عربی اور فارسی الفاظ کو باقی رکھنے کی کوشش
کی جو ہندی میں مستعمل تھے۔ پھر وہ وقت آیا جب کہ عام فہم اردو، اردوئے معلّٰی" بن گئی۔
ہم نے اسے آسان بنانے کی کوشش کی مگر ہم نے محسوس کیا کہ یہ کافی نہیں تھا۔"

اردو کے ساتھ بابو پرشوتم داس ٹنڈن کا جو رویّہ رہا اس کا کھل کر مظاہرہ پارلمنٹ میں ہوا جب کہ
وزارت تعلیم کی دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کو ۵ ہزار روپے کی غیر اجرائی گرانٹ دینے پر بابو صاحب سخت
نکتہ چیں ہوئے۔ جس کے جواب میں مولانا آزاد نے ٹنڈن جی جیسے لوگوں کو یہ کہہ کر متنبہ کیا تھا:

"ہندی والوں کو ان کا لسانی تعصب لے ڈوبے گا۔ افسوس! جو اردو زبان اسی ملک
کی پیداوار ہے۔ آج اس کے لیے ہمارا دماغ تنگ ہو گیا ہے۔"

کنہیا لال منشی گجراتی کے مانے ہوئے ادیب تھے، ان کی "ہندوستانی" میں دلچسپی صرف سطحی رہی البتہ
ہندی کے وہ پریمی رہے۔ ان کے قایم کردہ بھارتی ودّیا بھون میں "ہندوستانی" کا نام و نشان نہیں۔

بمبئی میں دادا بھائی نوروجی کی پوتی پیرین کپٹین ہندوستانی پرچار سبھا کی سکریٹری تھیں۔ وہ شروع
سے ہی پکی نیشنلسٹ رہیں اور گاندھی جی کے تعمیری پروگرام میں زبان کی پرچارک۔ انھوں نے دونوں
رسم خط میں ہندوستانی کی تعلیم بیسیوں گجراتی اور مراٹھی اسکولوں میں رائج کی۔ بالغوں کے لیے ہندوستانی
کی کلاسیں کھولیں اور ان کے ذریعہ امتحانات لے کر سندیں دینے کا انتظام کیا۔ جب ہوا کا رخ بدلتے دیکھا
تو انتہائی کرب کے ساتھ انھوں نے گاندھی جی کو خط میں لکھا:

"انتہائی شرم، افسوس اور رنج کے ساتھ میں نے آل انڈیا ریڈیو پر سنا کہ ہماری جماعت کے لوگ اس قومی زبان کو اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کے لیے ہم اب تک کوشاں رہے۔ سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ معروف کانگریسی لیڈر بھی حالیہ واقعات سے متاثر ہوکر تعصب میں اندھے ہوتے جا رہے ہیں، اتنے اندھے کہ وہ اسی چیز کی ریختگی پر تُل گئے ہیں جسے کانگریس نے بنایا اور استوار کیا۔

"برائے کرم مجھے بتایئے کہ آپ کے وہ ہم وطن ہندو، مسلمان، عیسائی اور یہودی، جو ہندوستانی کو (قومی زبان) تسلیم کر چکے ہیں، کانگریس کے اس ریزولیشن سے کیا نتیجہ اخذ کریں،،

گاندھی جی نے ۲ راگست، ۱۹۴۷ء کے ہریجن میں شایع کر دیا خط کا جو جواب دیا اس میں اصل مسئلے سے گریز کیا۔

ریڈیو کی خبر کا ردعمل گاندھی جی کے ایک دوسرے رفیق رتن لال پارکھ پر اس طرح ہوا:

"اخباروں کی اطلاع کے مطابق کانگریس پارٹی نے (یعنی دستور ساز اسمبلی کی پارٹی) ہندی کو دیوناگری رسم خط میں ہندوستان کی قومی زبان مان لیا ہے۔ اس خبر کا عام پبلک پر زبردست اثر پڑا۔ وہ اردو رسم خط کے مخالف ہیں۔ اب ایسا لگتا ہے کہ اردو رسم خط کی ترویج و اشاعت کا مسئلہ کوئی جاندار مسئلہ نہیں ہے (ہریجن ۱۰ اگست ۱۹۴۷ء) آزادی کے اعلان سے صرف پانچ دن پہلے!

یہ تھے وہ عوامل جن میں مولوی عبدالحق اپنی تحریک چلاتے رہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ زبان کا مسئلہ صرف گاندھی جی کے ساتھ مل کر ہی طے پا سکتا ہے کیوں کہ گاندھی جی کانگریس کے بے تاج کے بادشاہ تھے، اپنی جماعت اور اس سے باہر بھی احترام و عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ جو کچھ کہیں گے ان کی جماعت اس پر عمل پیرا ہوگی۔ مگر افسوس یہ نہ ہو سکا۔ مولوی صاحب دل برداشتہ ہو گئے۔ ان کے ساتھ وہ سب لوگ جو اردو اور ہندی کی آسان شکل "ہندوستانی" کو دونوں رسم خط میں ملکی زبان دیکھنا چاہتے تھے۔

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

حوالے

"پنجاہ"۔ پنجاہ سالہ تاریخ اردو مرتبہ ہاشمی فرید آبادی (کراچی)

۲ ۔ نقوش ۔ نقوش سلیمانی، از مولانا سید سلیمان ندویؒ (دار المصنفین، اعظم گڑھ)

۳ ۔ "اردو"۔ رسالہ "اردو" (اورنگ آباد)

۴ ۔ "ہماری زبان"، انجمن ترقی اردو (ہند) دلّی

۵ ۔ ہریجن ۔

۶ ۔ On Language Problem: Edited by Anand T. Hingorani

۷ ۔ ہندوستانی پرچار سبھا" بمبئی ۔ کتابچہ

۸ ۔ محمد علی جناح ۔ سید شہاب الدین دسنوی (علمی مجلس، دلّی)

۹ ۔ خطبات"۔ خطبات عبد الحق (انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۳۹

رشید حسن خاں

مولوی عبدالحق مرحوم کی بعض تحریریں

کئی موضوعات ایسے ہیں جن سے متعلق مولوی عبدالحق مرحوم کی تحریروں کو "اوّلیات" کے عنوان کے تحت رکھا جا سکتا ہے۔ یہاں لفظِ "اوّلیات" کو ذرا وسیع مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ مطلب یہ نہیں کہ مرحوم کی سبھی تحریروں نے پہلی بار اُن خاص موضوعات کو روشناس کرایا۔ مقصود یہ ہے کہ اُن کی تحریروں نے بعض موضوعات کو اِس طرح پیش کیا ہے کہ بیسویں صدی کے نصفِ اوّل میں وہ صحیح معنی میں اُنھی کی تحریروں کے واسطے سے متعارف ہوئے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اُن کے ایسے کام بھی ہیں جو حقیقی اور قطعی مفہوم میں اوّلیت کا درجہ رکھتے ہیں۔

مثال کے طور پر میرؔ شناسی کی روایت کو لیجیے۔ میرؔ کا خدائے سخن ہونا مسلّم رہا ہے اور ہر زمانے میں خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا رہا ہے؛ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ مرحوم کے مرتّب کیے ہوئے انتخابِ میرؔ کے مقدّمے نے میرؔ کی شاعری کے مختلف پہلوؤں اور جہتوں کو اس طرح پیش کیا کہ اُس کی طرف نئے انداز سے ذہن متوجہ ہوئے۔ یہ کہنا کسی لحاظ سے بے جا نہ ہوگا کہ جس چیز کو میرؔ شناسی کی روایت کہا جاتا ہے، اُس روایت کا نقش اِسی مقدّمے سے بنا تھا۔ اثر لکھنوی مرحوم کا کام بھی اِس سلسلے میں اہمیت رکھتا ہے، مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ اُن کا مرتّب کیا ہوا "انتخابِ مزامیر"، مولوی عبدالحق کے انتخاب کے بعد اور دراصل جوابی کتاب کے طور پر سامنے آیا تھا۔ اثرؔ صاحب کو شکایت یہ تھی کہ میرؔ کے بہت سے قابلِ انتخاب اشعار کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ "مزامیر" کا مقدّمہ بھی میرؔ کی شاعری کے محاسن کو عمدہ طور پر سامنے لایا، لیکن مولوی صاحب کی تحریر میں جو تنقیدی انداز ہے، وہ اُس سے خاصا مختلف ہے اور مولوی صاحب کی یہ تحریر، بنیادی تحریر کے طور پر آج بھی اپنی حیثیت اور اہمیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔

دوسری اِس سے بھی زیادہ اہم مثال مقدّمۂ باغ و بہار کی ہے۔ باغ و بہار کوئی نئی کتاب

نہیں تھی، لیکن بیش تر لوگ اِس کتاب سے، دو نسبتوں کے واسطے سے واقف تھے۔ ایک تو فسانۂ عجائب کے واسطے سے، کہ رجب علی بیگ سرور نے میر امّن کو اور اُن کی نثر کو طنز کا نشانہ بنایا ہے اور دوسرے فورٹ ولیم کالج کے وسیلے سے، کہ گل کرسٹ کی فرمایش پر یہ کتاب لکھی گئی تھی۔ یہ کتاب جو اردو نثر کا شاہ کار ہے اور جس کو جدید اردو نثر کا پہلا صحیفہ کہا جا سکتا ہے؛ اس کی نثر میں کیا خوبیاں ہیں، اِس بات سے کم لوگ واقف تھے۔ اِس کتاب پر مولوی صاحب کا مقدّمہ بہت طویل نہیں، کُل ۲۶ صفحات کا ہے، اور اِن ۲۶ صفحوں کا بھی زیادہ حصّہ دوسرے مباحث سے متعلق ہے، مگر یہ کمالِ نقد و نظر ہے کہ چند صفحوں میں اس کتاب کی نثری خصوصیات کو اِس طرح بیان کر دیا گیا ہے کہ اُن کی تحریر کا یہ حصّہ آج بھی سرمشق کے طور پر پیشِ نظر رکھنے کی چیز ہے۔ مولوی صاحب کی اِس مختصر سی تحریر نے پہلی بار میر امّن کی نثر کی اُن خصوصیات کو روشنی بخشی جنھوں نے اِس کتاب کو بے مثالی کی سند عطا کی ہے اور اِس کتاب کی حقیقی قدر و قیمت کو روشناس کرایا۔

اس کتاب کے سلسلے میں مولوی صاحب کو ایک اور بحث میں بھی اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔ مولوی صاحب نے تفصیل کے ساتھ اِس پر بحث کی ہے کہ "باغ و بہار" کا ماخذ دراصل "نوطرزِ مرصّع" ہے، لیکن میر امّن نے اس کا حوالہ نہیں دیا۔ شیرانی صاحب نے اور بعض اور لوگوں نے اِس سلسلے میں مولوی صاحب کے اِس اعتراض کو غلط بتایا اور کہا کہ اشاعتِ اوّل کے سرورق پر یہ صراحت موجود ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اشاعتِ اوّل کے سرورق پر یہ صراحت موجود ہے، لیکن مولوی صاحب کا اعتراض اب بھی اپنی جگہ برقرار ہے کہ میر امّن نے اِس کا اعتراف نہیں کیا کہ اُن کا ماخذ نوطرزِ مرصّع ہے۔ میر امّن نے اپنے دیباچے میں واضح طور پر یہ لکھا ہے کہ میں نے فارسی کے قصّے کو اپنی زبان میں لکھا ہے۔ اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ فورٹ ولیم کی کتابوں کے سرورق مصنّفین کے تیّار کیے ہوئے ہوتے تھے؛ ہاں اِس کے متعدّد قرائن موجود ہیں کہ یہ گل کرسٹ کی نگرانی میں تیّار کیے گئے تھے۔ میر امّن نے وہی بات لکھی ہے جس پر مولوی صاحب نے اعتراض کیا تھا۔ گل کرسٹ نے اپنے پیش لفظ میں اور سرورق پر ضرور اِس کی صراحت کی ہے کہ یہ کتاب نوطرزِ مرصّع پر مبنی ہے، مگر میر امّن نے اپنے دیباچے میں واضح طور پر یہ لکھا ہے کہ یہ کتاب فارسی کے قصّۂ چہار درویش کا ترجمہ ہے۔ مولوی صاحب نے دراصل میر امّن کے اسی قول پر اعتراض کیا تھا اور شیرانی صاحب کی مفصّل جواب دہی کے باوجود مولوی صاحب کا اعتراض

آج بھی اپنی جگہ پر برقرار ہے۔

لیکن اس سے بھی اہم ایک اور بات ہے جو پہلی بار مولوی صاحب نے لکھی ہے۔ خود میر امّن نے باغ و بہار کو ترجمہ بتایا ہے اور بعض دوسرے حضرات نے یہ لکھا ہے کہ ترجمہ تو دراصل نوطرزِ مرصّع ہے؛ مولوی صاحب نے اپنے مقدّمے میں پہلے تو اس کی وضاحت کی کہ باغ و بہار ترجمہ نہیں۔ فارسی کے قصّۂ چہار درویش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "میر امّن کی باغ و بہار اسی کتاب کا ترجمہ کہی جاتی ہے اور وہ خود بھی یہی کہتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فارسی کا ترجمہ نہیں۔ قصّہ وہی ہے، مگر اس کا ماخذ بجائے فارسی کے، اردو کی کتاب نوطرزِ مرصّع ہے،،۔ اس کے بعد نوطرزِ مرصّع اور باغ و بہار دونوں کے متعلق لکھا ہے کہ: "اصل میں ترجمہ ان دونوں میں سے کوئی نہیں۔ فارسی قصّے کو اپنی اپنی زبان میں بیان کر دیا ہے"۔ صحیح بات یہی ہے جو مولوی صاحب نے لکھی ہے کہ نوطرزِ مرصّع کو بھی ترجمہ نہیں کہا جا سکتا۔

حقیقتاً تحسین فارسی کے قصّۂ چہار درویش کو، کہانی کی حد تک فارسی کے مطابق اپنی زبان میں لکھتے چلے گئے ہیں۔ یعنی انھوں نے فارسی عبارت کی پابندی نہیں کی ہے، صرف قصّے کو سامنے رکھا ہے اور میر امّن نے بنیادی طور پر نوطرزِ مرصّع کو سامنے رکھ کر، اُسی قصّے کو اپنی زبان میں اپنے انداز سے لکھا ہے۔ جس طرح نوطرزِ مرصّع زبان اور بیان کی حد تک فارسی قصّے سے بالکل مختلف ہے؛ اُسی طرح باغ و بہار بھی نوطرزِ مرصّع سے مختلف ہے؛ یوں اصولاً ان دونوں کتابوں میں سے کسی ایک کو بھی ترجمہ نہیں کہا جا سکتا۔

اس کو یوں بھی دیکھیے کہ میر امّن کی دوسری کتاب گنجِ خوبی کو ترجمہ کہا گیا ہے اور حقیقتاً ہے بھی ترجمہ۔ زبان میر امّن کی ہے اور بیان بھی اُن کا اپنا ہے؛ لیکن وہ اصل فارسی عبارت سے سرِ مو تجاوز نہیں کرتے۔ اصل سے اس قدر وفاداری نے، زبان اور بیان کی کئی خوبیوں کے باوجود، اُسے ترجمے کی سطح سے اوپر نہیں اُٹھنے دیا ہے؛ جب کہ باغ و بہار میں وہ ایک داستان کو اپنے طور پر لکھتے ہیں اور اس طرح لکھتے ہیں کہ اُس کا قالب ہی بدل جاتا ہے۔ اس عمل نے باغ و بہار کو تصنیف کے درجے پر پہنچا دیا ہے۔ غرض کہ مولوی صاحب سے پہلے کسی کی نظر اس پہلو پر نہیں پڑی تھی۔ یہاں مولوی صاحب کو حقیقی معنی میں اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔

اسی سلسلے کی ایک اور بات بھی ہے۔ مولوی صاحب نے جہاں اس کی وضاحت کی ہے کہ میر امّن کا ماخذ نو طرزِ مرصّع ہے، وہاں نوطرزِ مرصّع سے تقابل کے ساتھ ساتھ، فارسی کے قصۂ چہار درویش کی بھی بہت سی عبارتیں نقل کی ہیں؛ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ جن مقامات پر فارسی قصّے اور نوطرزِ مرصّع میں اختلاف ہے، باغ و بہار میں ایسے مقامات بہ طورِ عموم نوطرزِ مرصّع سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ پہلی بار فارسی کے ایک نسخے کی عبارتیں اردو والوں کے سامنے آئیں اور یہ معلوم ہوا کہ نوطرزِ مرصّع متعارف مفہوم میں ترجمہ نہیں۔ جو معلومات اس وقت تک سامنے آئی ہیں، اُن کی بنیاد پر ہم اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو والوں میں مولوی صاحب پہلے شخص تھے جنھوں نے فارسی نسخے کو پڑھا تھا اور نوطرزِ مرصّع سے اُس کا تقابل کیا تھا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مولوی صاحب نے اِس تقابلی مطالعہ سے جو نتائج پہلی بار نکالے تھے، اُن سے اب تک اختلاف نہیں کیا جا سکا ہے۔

لچھ چند سکندر آبادی نے ہمایوں کے زمانے میں ایک منظوم رسالہ لکھا تھا جسے اردو کا قدیم ترین نصاب کہا جا سکتا ہے۔ قدامت کی بنا پر اس مختصر رسالے کی بہت اہمیت ہے۔ آج ہم میں سے بہتوں کو یہ بات معلوم نہیں ہو گی کہ اب سے بہت پہلے مولوی صاحب نے اس بیش قیمت مخطوطے کو دریافت کیا تھا اور اس پر ایک مفصّل مضمون لکھا تھا اور اس طرح اِسے روشناس کرایا تھا۔

مولوی صاحب سے جن چیزوں کو بہ طورِ اوّلیات منسوب کیا جا سکتا ہے، ان کی اچھی خاصی فہرست بن سکتی ہے یہاں محض چند باتوں کی طرف صرف اشارے کیے گئے ہیں۔ مولوی صاحب قد آور شخصیت کے مالک تھے، ہنسی اس پر آتی ہے جب آج بعض وہ لوگ جو ان کے مقابلے میں صاف طور پر کوتاہ قامت نظر آتے ہیں، وہ اُن کی عظمت سے انکار کو بھی اپنی بڑائی کا ایک ذریعہ فرض کر لیتے ہیں۔ چاند پر خاک ڈالنا اِسی کو کہتے ہیں۔

ڈاکٹر منظر اعظمی

مولوی عبدالحق — اردو کا استعارہ

اردو زبان و ادب کے فروغ اور اس کے علمی اور فنی ارتقا کے سلسلے میں اگر اس کے محسنین کی فہرست تیار کی جائے تو اس میں کئی طرح کے لوگ نظر آئیں گے۔ کچھ وہ جنھوں نے اسکول، کالج، یونیورسٹی اور ادارے کھولے اور اس کی نشر و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کچھ نے نصابی کتابیں اور ریڈریں لکھیں کچھ نے شعر و ادب میں اپنے گراں قدر اضافوں سے اس کو سرفراز کیا۔ کسی نے محض زبان کی اصلاح کو اپنا مقصد بنایا۔ کسی نے لغات اور قواعد مرتب کیے۔ کسی نے اردو کے تناور درخت کی ایک ہی شاخ کو سنوارنے میں عمر عزیز کا بیشتر حصہ صرف کیا کسی نے دو چار شاخوں کو ہاتھ میں لیا اور عمر گزار دی اور اس طرح کسی نے علمی میدان میں نام کمایا اور کسی نے علمی سلسلے کو بلند کیا۔ اردو میں ایسی صرف ڈھائی شخص ہیں جنھوں نے اس کے تحفظ و بقا کے لیے بھی کام کیا اور اس کے علمی اور ادبی فروغ میں بھی نام کمایا۔ ایک سرسید احمد خاں اور دوسرے مولوی عبدالحق سرسید احمد خاں کی بھی پوری زندگی اردو کے علاوہ اور مختلف محاذوں پر تاریخ و مذہب اور اصلاح و ترقی کی جنگ لڑتے گزری مگر مولوی عبدالحق وہ اکیلی شخصیت ہے جو محض اردو کے لیے جیا اور اردو کے لیے مرا۔ جس نے ایک ہی انداز کے جوش و خروش کے ساتھ اس کے بقا کی بھی جنگ لڑی اور اس کے علمی اور ادبی خزانے میں بھی اضافہ کیا۔ اس کے معیار کا پیمانہ ہر جگہ بلند تھا۔ اس نے جو کام بھی کیا اعلا درجے کا کیا اور اردو کی محبت میں کیا۔ اردو سے اس کے تعلق کا یہ حال تھا کہ اس نے اسے مقصد زندگی بنا لیا تھا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے نام اپنے ایک خط میں لکھا کہ "میرے زندگی کا مقصد دنیا میں صرف ایک ہی ہے وہ یہ کہ اردو کو ترقی ہو اور علمی زبان بن جائے۔"[1] ہاشمی فرید آبادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

"یہ تم نے کیا کہا کہ میں اپنا ذاتی روپیہ کیوں بے دردی سے انجمن پر خرچ کر رہا ہوں۔ تمہارے

---

[1] مکتوبات عبدالحق، مرتبہ جلیل قدوائی، مکتوبہ اسلوب، کراچی ۱۸، ۱۹۶۳، ص ۴۴۲

بھائی یا بیٹے پر خدا نخواستہ کوئی وقت آ پڑے تو کیا تم اس کی مدد نہ کرو گے اور کیا ایسے وقت میں تم روپیہ کا منھ دیکھو گے۔ میرا تعلق انجمن سے ایسا ہی ہو گیا ہے کہ میں اسے اپنی ذات سے جدا نہیں سمجھتا اور انشاء اللہ یہ تعلق جب تک دم میں دم ہے ایسا ہی قایم رہے گا خواہ میں اس کا سیکریٹری رہوں یا نہ رہوں[1]

جو ایک زمانے میں انجمن کے خلاف سازشوں اور اس کی تباہ حالی پر اس قدر متاسف تھا کہ اس کی اپنی ذات کی منفعت اور تعظیم بھی اس کے غم کو کم نہ کر سکی اور خطاب و اعزاز سے بھی اسے کوئی خوشی نہیں ہوئی[2] میرا خیال ہے کہ اردو میں ایسی کوئی شخصیت نہیں جس کا اوڑھنا بچھونا اردو ہو۔ جس کا اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا اور چلنا پھرنا محض اس کے لیے ہو۔ انھوں نے اردو کی جڑوں کو مضبوط سے مضبوط تر کیا۔ اس کے تنے کو خوشنما بنایا۔ اس کی شاخوں کی آراستگی کی اور اس کے پھولوں میں طرح طرح کے پھول کھلا کر صرف ایک درخت سے چمن زار بنا کے دکھا دیا۔

مولوی صاحب نے ۱۸۹۸ء میں حیدرآباد میں رسالہ "افسر" کی ادارت سنبھالی اور بقول رشید احمد صدیقی اسی وقت سے اردو اور مولوی صاحب نے ایک دوسرے کی تقدیر پہچانی اور اپنائی[3] چوں کہ ایک عرصے تک وہ درس و تدریس سے بھی متعلق رہے۔ اس لیے انھیں اردو میں بنیادی کتابوں کی کمی محسوس ہوئی۔ اس کی تکمیل کے لیے بچّوں کے لیے ریڈریں لکھیں۔ میٹریکولیشن اور انٹرمیڈیٹ کے درجات کے نصابات ترتیب دیے۔ قواعد اردو، اور اردو صرف و نحو، جیسی کتابیں لکھیں۔ جیسے جیسے اردو میں جس چیز کی بھی کمی محسوس کی اس کو خود دور کرنے کی کوشش کی اور دوسرے اہلِ علم کا تعاون بھی حاصل کیا۔ اس ضمن میں دکنی اردو کی ایک لغت مرتّب کی۔ انگریزی اردو ڈکشنری ترتیب دی اور ایک جدید اردو لغت کا ڈول بھی ڈالا۔ ان کی بڑی آرزو تھی کہ اردو اتنی سربلند ہو کہ جدید تر علوم و فنون کی اعلا تعلیم بھی اس میں ہو سکے۔ اس کے لیے انھوں نے دارالترجمہ قایم کروایا۔ پھر اس کے ذریعے سائنسی اور علمی اصطلاحوں کو اردو میں منتقل کروانے کی جدوجہد

---

[1] مکتوباتِ عبدالحق، مرتبہ جلیل قدوائی، مکتبہ اسلوب، کراچی ۱۸، ۱۹۶۳ء ص ۷۷ ۔ ۷۸

[2] " " " " " " ص ۵۶۵

[3] گنج ہائے گرانمایہ، از رشید احمد صدیقی، مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، فروری ۱۹۷۶ء ص ۵۷

میں اوروں کے ساتھ خود بھی پیش پیش رہے، ان کا مضمون اردو زبان میں علمی اصطلاحوں کا مسئلہ اسی کا اشاریہ ہے۔ انہی کی کوششوں کے نتیجے میں، علمی اصطلاحات، اور اصطلاحات پیشہ وراں، جیسی کتابیں سامنے آئیں۔ مختلف علوم وفنون کی ممتاز کتابوں کے ترجموں کے علاوہ کئی نا یفات بھی سامنے آئیں اور ان ساری کوششوں کا مرکز و محور وہ خود تھے۔

ان کا ایک اہم خواب 'اردو یونیورسٹی' کا قیام تھا۔ اس کے لیے انھوں نے دوران قیام حیدر آباد ہی میں کوششیں شروع کر دی تھیں اور اس کے نتیجے میں اردو میڈیم کی ایک یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی کی شکل میں سامنے آئی جو بقول رشید احمد صدیقی "ایک مختصر مدت میں ہندوستان کی معیاری انگریزی یونیورسٹیوں کے ہم پلہ ہو گئی۔"[۱] اس میں اگرچہ کئی لوگوں کی کوششوں کا دخل تھا لیکن مولوی صاحب کا نام سب سے روشن اور سب سے پیش پیش تھا۔ پاکستان جانے کے بعد وہاں بھی انھوں نے اس کے لیے کوششیں کیں۔ اردو یونیورسٹی کی وہ شکل جو وہ چاہتے تھے اگرچہ عمل میں نہ آسکی لیکن انھوں نے اردو کالج، جو قایم کیا اس نے بڑی حد تک ان کے خواب کی لاج رکھ لی۔ اس لیے کہ اس میں اردو میڈیم کے ذریعے سماجی علوم کے علاوہ دوسرے علوم کی تدریس بھی ایم۔ اے کے درجات تک ہونے لگی۔ پھر عورتوں کے لیے ایک الگ خواتین کالج، کا قیام بھی انہی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

انجمن ترقی اردو، جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک جز تھی اور نام ہی کو زندہ تھی ۱۹۱۲ء میں مولوی صاحب اسے علی گڑھ سے حیدر آباد لائے اور آنریری سکریٹری کی حیثیت سے اکیلے ہی اس کو ایسا سجایا بنایا اور توانا کیا اور اتنی ترقی دی کہ بقول رشید احمد صدیقی وہ اردو کی بے شمار صلاحیتوں کا آئینہ، ان کو بروئے کار لانے کا وسیلہ اور اردو کی حفاظت وحمایت کا معتبر کل ہند محاذ بن گئی۔[۲] جب تک زندہ رہے اس کو اپنے سینے سے لگائے

---

[۱] گنج ہائے گرانمایہ، از رشید احمد صدیقی، مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، فروری ۱۹۷۶ء ص ۲۷۶

[۲] ؍ ؍ ؍ ؍ ؍ ص ۲۷۸

رکھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس کی وجہ سے زندہ تھے یا اس کے بغیر ان کا اپنا کوئی مقام یا شناخت نہ تھی بلکہ اس لیے کہ وہ اس کو ختم یا تباہ ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ انجمن سے ان کا کوئی مفاد وابستہ نہ تھا بلکہ انجمن کے لیے وہ اپنا ذاتی روپیہ پیسہ وقت وصحت اور اپنی ساری توانائیاں داؤ پر لگائے ہوئے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے انجمن یعنی اردو ہی ان کے ذہن میں ہوتی۔ اس کے لیے دور دراز کا سفر کرتے۔ مسلسل چلتے۔ درد ور ماندگی مجبور بھی کرتی تو بھی اس کونے کے بیٹھ جاتے۔ وہ اس کے بغیر اپنے آپ کو نہ پہچان پاتے۔

اردو زبان وادب کو درست وچست اور بلند پایہ اور توانا کرنے کی خاطر انھوں نے اخبارات ورسائل کا سہارا لیا۔ رسالہ 'افسر' کو ادبی رنگ دیا، پھر 'اردو' نکالا۔ 'ہماری زبان' اور 'قومی زبان'، کے ذریعے اس کے فروغ کی کوششیں کیں۔ اس کو ایک علمی زبان کا بلند سے بلند درجہ دینے کی خاطر رسالہ 'سائنس'، اور رسالہ 'معاشیات'، جاری کیا۔ خود بھی مضامین لکھے۔ دوسروں سے بھی لکھوائے۔ اور ایسا کیا کہ اردو کا تعلق سماج و سیاست سے اور گہرا کر دیا۔ ان کے متعدد مضامین ان رسالوں میں چھپے۔ جن میں سے کچھ کتابی شکل میں سامنے آئے۔ اور بہت سے "مقالات عبدالحق" کی صورت میں ممتاز ہوئے۔ ان میں جو تبصرے چھپے وہ تنقید اور تبصرے کی خوب صورت علمی کاوشیں ہیں۔ متوازن رائے، علم وذہانت کا امتزاج، غلطیوں کی نشان دہی اور نئی چیزوں کی ہمت افزائی۔ اس نے اردو کو بڑھاوا دیا۔ انھوں نے اردو کے لیے اور اس کے متعدد کاموں کے سلسلے میں متعدد لوگوں کو بے شمار خطوط لکھے کام کا حوصلہ دلایا۔ نئے لوگوں کی ہمت افزائی کی۔ پرانوں کو جھنجھوڑا اور بہت سے لوگوں کی علمی اور ادبی تربیت کی۔ مکتوبات عبدالحق اور ان کے خطوط کے دوسرے مجموعے مکتوب نگاری کا بھی ایک اہم حصہ ہیں۔ اور اردو سے ان کی محبت کا منھ بولتا آئینہ بھی۔

ان کی تقاریر اور خطبات کیا ہیں اردو سے ان کے عشق، الفت کے تعلق اور ان کے علم کی منھ بولتی تصویریں ہیں۔ ان کے خطبات میں نہ صرف زبان کی تاریخ ملتی ہے، نہ صرف اس کے لسانی ارتقا اور عہد بہ عہد تبدیلیوں کا سراغ ملتا ہے بلکہ اردو زبان کی ترقی اور نشر و ترویج کے لیے قابل عمل تجویزیں بھی ہیں۔ اردو کے حوالے سے شاید ہی کوئی پہلو ہو جس پر روشنی نہ پڑتی ہو۔ ان میں لسانی مسائل بھی ہیں۔ اور قومی زبان کی تعریف وتفسیر بھی۔ لفظ ومعنی کے باہمی ربط پر بھی باتیں ہیں اور اردو کے خمیر کے عناصر ترکیبی پر بھی۔ زبان کی صحت سے کیا مراد ہے اور معیاری زبان کسے کہتے ہیں۔ ملک کے تعلیمی مسائل پر بھی بحث ملتی ہے۔ اور اردو ذریعۂ تعلیم پر بھی۔ اور

ان سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک ایک لفظ ، ایک ایک بات اور ایک ایک تقریر میں اردو سے ان کی والہانہ شیفتگی کی کرنیں جگر مگر کر رہی ہیں ۔

یہ اردو سے ان کی والہانہ شیفتگی اور جوش ہی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اردو کی تیز تر ترویج کے لیے نستعلیق ٹائپ کے لیے کوششیں کیں ۔ بہتوں سے باتیں کہیں ۔ بہتوں سے خط و کتابت کی ۔ یہ انہی کی کوششوں ترغیب اور ہمت افزائی کا نتیجہ تھا کہ آج نستعلیق ٹائپ حقیقت بن چکا ہے ۔ اپنے آخری زمانے میں انھوں نے اردو کے ایک عظیم تر لسانی ، ادبی ، علمی اور تہذیبی مرکز کا خاکہ تیار کیا تھا[۱] غرض کہ جس جس طرح سے بن پڑا اردو ہی کے نام اور کام کو روشن تر کرنے میں لگے رہے ۔

ان کی بعض کتابیں ایسی ہیں جو اپنی جگہ بہت اہم ہیں ۔ اہم اس لیے بھی ہیں کہ ایک عالم کی علمیت اور اس کے ذہن کی نکتہ رسی ان میں قابل دید ہے اور اس لیے بھی ہیں کہ انھوں نے اردو شعر و ادب کی تاریخ کے ایک دور کو روشن تر اور تابندہ تر کر دیا ۔ قدیم اردو ، اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ ، نصرتی ۔ ملک الشعرائے بیجاپور ، ایسی کتابیں ہیں جنھوں نے دکنی ادب کو اردو تاریخ کا روشن باب بنا دیا ۔ ان میں تحقیق و تنقید ، تلاش و جستجو اور چھان پھٹک کر عمدہ ڈھنگ سے پیش کرنے کی خوب صورت مثالیں ملتی ہیں ۔ یہی حال ان کی بعض دوسری کتابوں کا بھی ہے جن میں "مرحوم دہلی کالج" ، اور "سرسید احمد خاں حالات و افکار" خاص طور سے قابل ذکر ہیں ۔ کچھ ایسی بھی ہیں جن میں اردو کی اثر انگیزی اور کچھ ایسی بھی جن میں اردو کی طرف لوگوں کی بے توجہی اور اس کی کس مپرسی کو بڑے درد کے ساتھ پیش کیا ہے ۔ مثلاً "اردو زبان کی فضیلت چند بنگالی اکابر کی نظر میں" اور "پاکستان میں اردو کا المیہ" وغیرہ ۔

ان میں تخلیقی اپج اور صلاحیت غضب کی تھی ۔ اس صلاحیت کا نمود کچھ تو اردو کی ترویج و ترقی کی خاطر ان کے مختلف منصوبوں ، اور رہنما خطوط میں ہوا اور کچھ چند ہم عصر ، جیسے سوانحی خاکوں اور طرز نگارش کی انفرادیت میں ۔ ان خاکوں میں مختلف اصحاب کی سیرتوں کی ایسی اصلی اور پاک و صاف تصویر سامنے آتی ہے کہ وہ جیتے جاگتے ہمارے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں ۔ صرف بڑے لوگ ہی نہیں چھوٹے بھی ۔ شاید اس لیے کہ بہت سے بڑے لوگ کہیں کہیں چھوٹے دکھائی دینے ہیں ۔ اور بہت سے چھوٹے بھی کبھی کبھی بڑے نظر آنے لگتے ہیں ۔ مولوی صاحب نے کم سے کم لفظوں ایسی تصویریں اتاری ہیں کہ وہ جامع بھی ہیں اور متاثر کن بھی ۔ مولانا محمد علی جوہر کو ایک آتش فشاں پہاڑ ، یا گلیشیر سے تشبیہ دینا انہی کا حصہ تھا ۔ نور خاں ،

---

[۱] مکتوبات عبدالحق ۔ مرتبہ جلیل قدوائی ۔ ص ۲۱۷

اور نام دیو جیسے انسانوں کے خاکے لکھ کر انھوں نے اپنے ادبی مسلک کا بھرم رکھ لیا۔

انھوں نے اپنے اسلوب کو کئی رنگوں سے سجایا تھا۔ سرسید کی سادہ بیانی اور چست نثر کو مزید نکھار کر ایک رنگ بنایا، حالی کی نثر کی سادگی، صفائی اور انکسارانہ انداز کو مزید چوکھا کیا اور شبلی کی علمی رنگین نثر سے اس کا حسن لے کر اپنے اسلوب کی تشکیل کی۔ لفظوں کی پرکھ کا انھیں خاص ملکہ تھا۔ وہ لفظوں کے ایسے پارکھ تھے کہ یہاں مقصد کے مکمل اظہار کے لیے وہ اردو میں مستعمل کسی بھی زبان کے لفظ کو استعمال کر لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں کبھی کبھی غریب اور متروک لفظ بھی مستعمل مل جاتا ہے مگر ان کی تحریروں میں خوب کھپتا ہے۔ چھوٹے جملے، متوازن انداز، خوبصورت مثالیں اور طنز و مزاح کی ہلکی سی چاشنی ان کے اسلوب کو جاندار بنا دیتی ہے۔ یہاں رشید احمد صدیقی مرحوم کا ایک اقتباس بے موقع نہ ہوگا کہ

> "سرسید نے سب سے پہلے اردو نثر کو ایسے اسلوب سے متعارف کرایا جس میں ہر طرح کے خیالات و جذبات کا اظہار و ابلاغ کیا جا سکتا تھا۔ مولوی صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سرسید کے اسلوب کی ابتدائی ناگزیر ناہمواریوں کو دور کر کے اس میں ادبی خوبیاں پیدا کر دیں۔ سبب یہ ہے کہ مولوی صاحب انگریزی، فارسی اور ہندی انداز خیال، انداز فکر و انداز بیان کے رموز سے واقف تھے۔ ان اسالیب کو انھوں نے اردو نثر میں اسی سلیقے سے سمویا کہ وہ سلیقہ اردو کا سلیقہ بن گیا۔ چناں چہ مولوی صاحب کی نثر میں مشکل سے کوئی ٹکڑا ایسا ملے گا جس کو علاحدہ کر کے آپ بتا سکیں کہ یہ انگریزی فارسی یا ہندی کا چربہ ہے ان امور کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو نثر کا جس کو خالصتاً اردو کا کہا جا سکے غالب، سرسید اور حالی کے بعد مولوی صاحب کی تحریروں میں ملتا ہے۔" [۱]

انھوں نے مختلف موضوعات پر مختلف جگہوں پر اظہار خیال کیا ہے اور جس موضوع پر لکھا ہے لگتا ہے یہ انہی کا میدان ہے۔ تنقید، تحقیق، ڈرامانگاری، سوانح نگاری، مکتوب نگاری، لغت نگاری، ترجمے کی اہمیت، زبان کیا ہے، معیاری زبان، الفاظ کیا ہیں۔ ان کی اہمیت، رسم الخط، حیات و کائنات، انسانیت کیا ہے، اخلاق اور تعلیم، جدید تعلیم، بچوں کا ادب، تہذیب و سائنس وغیرہ موضوعات ان کے خیالات ان کے وسعت علم کی گواہی دیتے ہیں۔

---

[۱] گنج ہائے گرانمایہ، ص ۸۲-۲۸۱

یہ نہیں کہ ان کے معیار کا پیمانہ کہیں پست ہوا ہو۔ وجہ یہ کہ وہ محض اردو کے مجاہد اور غازی نہیں تھے وہ اردو کے بہت بڑے عالم تھے۔ ان کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا۔ یہی نہیں کہ عالمی ادب بھی ان کی نظر میں تھا۔ متعدد زبانوں کی ادبیات پر ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ ادبیات ہی نہیں دیگر سماجی علوم سے ان کی واقفیت بھی قابل رشک تھی۔ وہ ملک میں سمٹتے پھیلتے مختلف ادبی، علمی، سماجی اور سیاسی رویوں اور تحریکوں سے خوب آشنا تھے۔ وہ نقد کا ذہن اور تبصرے کا شعور رکھتے تھے۔ "تنقیداتِ عبدالحق" اور "ادبی تبصرے" اس کے شاہد عدل ہیں۔ ان کا قول تھا کہ

"تنقید صحیح ذوق کے لیے لازم ہے۔ لیکن ایک نقاد کے لیے جو اس کٹھن اور صبر آزما کام میں ہاتھ ڈالتا ہے وسیع معلومات، گہری نظر اور ذوق سلیم کی ضرورت ہے۔ صحیح تنقید مصنف اور پڑھنے والے دونوں کے لیے مفید ہے۔" (خطبات، ص ۱۴۳)

ان کی تنقید صحیح معنوں میں "ناظفِک" تنقید ہوتی ہے۔ وہ بلا کسی رو رعایت اور جھجک کے اظہار خیال کرتے ہیں۔ اور اس طرح کہ خود ان کی نظر کی گہرائی اور وسعت مطالعہ نظروں میں آجاتے ہیں۔ "آیات و نغمات"، پر ان کے تبصرے سے ایک اقتباس دیکھیے جو نقد و تبصرہ دونوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ کیا یہ وہی باتیں نہیں ہیں جو دوسرے متعدد نقادوں نے جوشؔ کی شاعری کے حوالے سے دہرائی ہیں۔

"جوش صاحب کوئی نئے شاعر نہیں، اچھے خاصے پختہ اور پرانے شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں جوش، روانی، حسنِ بیان بدرجۂ کمال موجود ہے۔ اس میں زور بھی ہے اور شور بھی۔ وہ قدیم روایات و اخلاق، مذہب و معاشرے، اوہام و عقائد سے سخت بیزار ہیں اور مستانہ وار انھیں ٹھکراتے چلے جاتے ہیں لیکن جب وہ سلام اور نوحے یا اس قسم کی نظمیں لکھتے ہیں (جیسا کہ اس مجموعے میں پائی جاتی ہیں)، تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دل پرانے اوہام اور عقائد سے اس قدر اٹا ہوا ہے کہ روشنی کی ایک کرن کا بھی وہاں گزر نہیں۔ انقلاب، نظام جدید اور جدید رنگ پر فریفتہ ہیں۔ جوش و خروش اور انقلاب کے نغموں سے ان کا کلام گونج رہا ہے۔ لیکن انقلاب کیا ہے؟ نظام جدید سے کیا مطلب ہے؟ اس سے انھیں بحث نہیں۔ انھیں تو غارت گری سے مطلب ہے۔ اس میں تغیر تو ہے۔ ان کی حالت ایک تماشائی کی سی ہے۔ جس پر بیتتی ہے اور جو اپنے اصولوں کی خاطر سب کچھ تج دیتا ہے

اور خوشی خوشی ہر طرح کے عذاب اور اذیتیں سہتا ہے اس کی آواز کچھ اور ہوتی ہے۔ جوش کے کلام کو پڑھ کر لطف و سرور تو ہوتا ہے لیکن اس میں بلندیِ فکر اور تاثیر نہیں (ادبی تبصرے ص ۸۸)

مواد کو کھنگالنے کے بعد وہ زبان و بیان کو بھی پرکھتے ہیں۔ نئی بات کو سراہتے ہیں اور روایتی اور رسمی باتوں سے سرسری گزر جاتے ہیں۔ نئے مصنفین کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں اور معیاری تصنیفات کا احترام بھی۔ ان کے علمی اور ادبی کارناموں کا سب سے روشن باب ان کے مقدمات اور مدوّن کتابیں ہیں۔ ان مقدمات سے ان کے وسعتِ علم، تحقیقی نظر، تنقیدی بصیرت اور علمی اندازِ بیان کی روشنی پھوٹی اور انھیں میں سے بعض میں تحقیقی اغلاط کی نشاندہی بھی کی گئی۔ کچھ لوگوں نے بحیثیتِ محقق ان کے قد کو گھٹا کر اپنا قد بڑھانے کی بھی کوشش کی۔ غلطیاں بے شک ہیں مگر یہ بھی تو غور کرنے کی چیز ہے کہ کتنے مخطوطات گمنامی کے تہہ خانوں میں دفن اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے کہ مولوی صاحب کا دستِ علم پرور آگے بڑھا۔ انھیں تلاش کیا۔ ان کے گرد و غبار کو صاف کیا اور پھر مرتب کر کے اہلِ علم کے سامنے ان کو پیش کیا دوسری بات یہ کہ متعدد مقدمے ایسے ہیں جن میں بیان کیے ہوئے ان کے نکات ہی کو آج تک لوگ دہراتے آ رہے ہیں۔ مثلاً انتخاب کلامِ میر، باغ و بہار، خطباتِ گارساں دتاسی وغیرہ کے مقدمے۔ ہاں کچھ ایسے ضرور ہیں جن میں کچھ نئی باتوں کا علم ہوا ہے۔ مثلاً معراج العاشقین اور سب رس کے سلسلے میں۔ تیسرے یہ کہ اپنے دور کی معلومات کے مطابق اور تحقیق کے جتنے وسائل ان کو مہیا تھے ان کے پیشِ نظر ان کے مقدمے بے شک تحقیق کے اچھے نمونے ہیں۔ چوتھی چیز یہ کہ تحقیق و تدوین کے جو اصول آج سامنے آئے ہیں وہ مولوی صاحب کے سامنے اس وقت نہ تھے اور اس لیے بھی کہ تحقیق میں کوئی چیز حتمی نہیں ہوتی کسی وقت اگر اور چیز کا علم ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ پہلے کے کیے ہوئے کام کی اہمیت ہی نہ رہی۔ اوبڑ کھابڑ میدانوں اور گھنے جنگلوں میں جو لوگ پہلے راستہ نکالتے ہیں ان کا کام زیادہ اہم اور دقت طلب ہوتا ہے بہ نسبت ان لوگوں کے جو انھیں راستوں کو مزید ہموار اور صاف کر کے آسان سفر کے قابل بنا دیتے ہیں۔ مزید یہ کہ 'شعر العجم' کی اپنی اہمیت ہے وہ 'تنقید شعر العجم' سے کم نہیں ہوتی۔ یہ نہیں کہ مولوی صاحب تحقیق کو محض بیان آخر سمجھتے تھے اور اس کی حقیقت سے واقف نہیں تھے انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ "ادبی اور عالمی معاملات میں ایسی تحقیق جو خطا و سہو سے بھی بری ہے شاذ و نادر ہی ہوتی ہے،" ان کا کہنا تھا کہ "غلطی، تحقیق و جستجو کی گھات میں لگی رہتی ہے۔ ادب کا کامل ذوقِ سلیم ہر

ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے نقاد اور مبصر فاش غلطیاں کر جاتے ہیں۔ لیکن اس سے ان کے کام پر حرف نہیں آتا۔ غلطی ترقی کے مانع نہیں ہے بلکہ وہ صحت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ پچھلوں کی بھول چوک آنے والے مسافر کو رستہ بھٹکنے سے بچا دیتی ہے" (مقدمات دوم ص ۲۰۹)

اب اس کے دوسرے پہلو پر غور کیجیے کہ اردو میں اتنے مختلف اور متنوع موضوعات پر اتنی تفصیل اور گہرائی کے ساتھ ایسے علمی مقدمے اور اتنی تعداد میں یعنی ۷۰ مقدمے جو کم و بیش ایک ہزار صفحات پر چھپے ہوئے ہیں کسی ایک شخص نے نہیں لکھے۔ شاید ہی دوسری زبانوں میں اس کی کوئی مثال ہو۔ دوسرے یہ کہ 'مقدمہ نگاری' کے فن میں اولیت انہی کو حاصل ہے اگر حالی کے اپنے مجموعۂ کلام کے مشہور مقدمے کو جو مقدمے سے زیادہ کتاب بن گیا ہے شمار نہ کیا جائے تو۔ اس سے پہلے تقریظوں کا رواج ضرور تھا جو ایک طرح کی مداحی ہی ہوتی تھیں۔ عالمانہ تنقیدی بصیرت شاذ ہی ملتی تھی تیسرے یہ کہ بیشتر مقدموں میں خصوصاً کلاسیکی ادبی کتابوں پر جو مقدمے لکھے گئے ان میں تحقیق و تدقیق کا رنگ غالب تھا چنانچہ ۱۹۰۶ء میں جب مولانا شبلی نے لطف کا تذکرۂ 'گلشن ہند' مرتب کیا تو مولوی صاحب نے اس پر مقدمہ لکھا اور بقول ڈاکٹر گیان چند جین یہ "اردو کا پہلا جدید تحقیقی مضمون تھا۔[1] تیسرے یہ کہ مولوی چراغ علی کی تصانیف 'اعظم الکلام فی ارتقار الاسلام' اور 'تحقیق الجہاد' اور ڈاکٹر ڈریپر کی مولانا ظفر علی خاں کی ترجمہ کی ہوئی کتاب 'معرکۂ مذہب و سائنس' پر جتنے بھرپور طریقے سے اور ایک عالمانہ شان سے جس طرح مولوی صاحب نے مقدمے لکھے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ علم کا ایک دریا ہے جو بہتا چلا جاتا ہے۔ جس جس طرح کے نکات پیدا ہوتے ہیں اس سے ان کی علمیت اور ذہانت کے امتزاج کا ایک خوب صورت نمونہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے چوتھے یہ کہ مولوی صاحب اکثر و بیشتر کتاب کے مصنف یا مؤلف کا تعارف، اس کے حالات کا بیان اور اس کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ قاری اس سے اچھی طرح واقف ہو جاتا ہے اور پھر اس کے کارنامے پر اس کی نظر پڑتی ہے۔ اگر کوئی خاص موضوع ہے تو اس موضوع کے مالۂ و ماعلیہ کی ایسی دلچسپ وضاحت کرتے ہیں کہ وہ تصنیف سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ کلاسیکی ادبی کتاب کے لسانی پہلو پر بحث بھی ضرور ہوتی ہے اور بڑی معلومات افزا ہوتی ہے۔

---

[1] مضمون ہندوستان میں اردو تحقیق، مشمولہ کھوج از ڈاکٹر گیان چند جین ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی طبع اول ۱۹۹۰ء ص ۲۰۱

وہ مختلف مقدموں میں ضرورت کے تحت تاریخی اور جغرافیائی حالات بھی بیان کر دیتے ہیں۔ مثلاً مخزن شعرا کے مقدمے میں خطۂ گجرات کا، گلشن ہند، کے مقدمے میں گلکرسٹ اور فورٹ ولیم کالج کے اردو عالموں کا اور اپنے وقت کی تحقیقات کی روشنی میں ایسا تحقیقی نکتہ بیان کر جاتے ہیں جو تحقیق ہی کے نہیں ذہن کے بھی دریچے کھول دیتا ہے۔ مثلاً 'تذکرۂ ہندی' کے مقدمے میں کہتے ہیں کہ دو ایک بات اور قابل لحاظ ان تذکروں میں پائی جاتی ہے۔ جہاں تک تحقیق ہوا ہے اردو شعرا میں مصحفی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو کا لفظ زبان کے مضمون میں استعمال کیا ہے۔ لیکن زبان اردوئے معلیٰ کا لفظ سب سے پہلے میر صاحب نے اپنے 'تذکرۂ نکات الشعرا' میں لکھا ہے"۔[۱] اور پھر یہ صورت بھی ہے کہ وہ اپنی طرف سے پوری کوشش کرتے ہیں کہ تدوین و تحقیق کا حق ادا ہو جائے۔ 'گلِ عجائب' کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ "کتب خانہ آصفیہ کا نسخہ جس سے یہ تذکرہ مرتب کیا گیا ہے۔ اکثر جگہ سے بوسیدہ اور مسخ و مجروح ہے۔ اس لیے اس کی ترتیب میں بہت دقت اٹھانی پڑی۔ اس کے بعض حصّوں کا کاتب بہت غلط نویس ہے۔ اکثر املا کی غلطیاں موجود ہیں اور اشعار غلط نویسی کی وجہ سے وزن و بحر سے خارج ہو گئے ہیں۔ ان کو دوسرے تذکروں اور دیوانوں کے سیاق و سباق سے درست کرنا پڑا۔ بعض اشعار بالکل مہمل ہو گئے تھے مجبوراً خارج کرنے پڑے"۔[۲]

اس طرح ان کے مقدمے اور تدوینیں بھی جہاں موضوعات کے تنوع، گہرائی تحقیق و تنقید، علم و فن اور ان کی ذہانت کے اعلا نمونے ہیں وہیں اردو سے ان کے والہانہ جذب و شوق کے بھی غماز ہیں۔ انھوں نے جو بھی لکھا اور جتنا بھی لکھا اس کی محبت، اس کو بلند سے بلند تر کرنے کے جذبے سے لکھا۔ ایک ایسے شخص کو جس نے جہاں بھی قدم رکھا نقوش پا کر روشن تر کر دیا کس طرح اور کہاں کہاں خراج عقیدت پیش کیا جائے۔ اس کی زندگی کی داستان اردو کی داستان ہے اس میں اردو اتنی رچ بس گئی تھی کہ عبدالحق کے معنی اردو کے ہو گئے۔ وہ اردو کے مرادف ٹھہر گیا۔ وہ اردو کا استعارہ بن گیا۔ وہ سر سید احمد خاں کا شاگرد تھا۔ شاید ذہین شاگرد نے ذہین استاد کے اردو سے متعلق خواب کو پڑھ لیا تھا۔ اس لیے وہ اس کی تعبیر بن کر ابھرا۔ رشید احمد صدیقی نے غلط نہیں کہا ہے کہ "اردو کے بارے میں سر سیّد نے جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر مولوی صاحب کی خدمات میں ملتی ہے"۔[۳]

---

[۱] مقدمات عبدالحق، مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، اردو مرکز لاہور، ۱۹۶۴ء ص ۱۰۵

[۲] " " " ص ۱۱۳

[۳] گنج ہائے گرانمایہ، ص ۲۷۷

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

مقدمات عبدالحق اوران کی تنقیدی اہمیت

مولوی عبدالحق کے مقدمات سے پہلے، ہم نے زبان وادب کے توسط سے صرف دو مقدموں کے نام سنے تھے، ایک مقدمۂ ابن خلدون، دوسرے مقدمۂ شعر و شاعری۔ یہ دونوں مقدمے عرفِ عام میں مقدمے نہیں، مستقل تصنیف سمجھے گئے ہیں۔ بلکہ ان کی اہمیت اصل تصانیف سے بھی بڑھ کر ہو گئی ہے۔ ایسا ہونا زیادہ حیرت انگیز یوں نہیں ہے کہ ان مقدمات کا تعلق صاحب تصنیف ہی سے ہے یعنی یہ ایسے مقدمے ہیں جو مصنفین نے اپنی ذاتی تصانیف کے لیے قلم بند کیے ہیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ مقدمہ نگار کے ذہن میں ہر بات پوری طرح واضح رہتی ہے۔ موضوع کی اہمیت و وسعت اس کے نکات و رموز اور تصنیف و ترتیب کے دوسرے مسائل و مباحث غرض کہ کتاب کا ہر پہلو اس کے سامنے روشن ہوتا ہے۔ اس روشنی میں وہ اپنے مقدمے کی تنقیحات قایم کرتا ہے۔ ایک ایک کر کے انھیں علم و فکر کی میزان پر تولتا ہے۔ ان پر جرح و بحث کا سلسلہ چھیڑتا ہے اور اپنی تصنیف کے مقصد و غایت اور اصول و ضوابط کی ایک کارآمد دستاویز یادگار چھوڑ جاتا ہے لیکن اگر کسی شخص کو اپنی تصنیف کے بجائے کسی دوسرے کی تصنیف پر کوئی مقدمہ لکھنا ہو تو یہ کام اتنا آسان نہیں رہ جاتا۔ خصوصاً ہمارے معاشرے میں جہاں "خطائے بزرگان گرفتن خطا است" کو اخلاق کا معیار سمجھا جاتا ہے اور دروغ مصلحت آمیز کو راست گوئی پر ترجیح دی جاتی ہے وہاں دیانت کے ساتھ مقدمہ نگاری بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ اردو میں ان مقدمات کا نام آپ تعارف رکھ لیں یا پیشِ لفظ اور تقریظ کا نام دیں۔ اپنی نہج اور غرض و غایت کے لحاظ سے سب ایک سے ہوتے ہیں۔ ان پر آمد سے زیادہ آورد کا غلبہ ہوتا ہے اور عام طور پر مقدمہ کہہ اٹھتا ہے کہ

میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

یوں سمجھ لیجیے کہ یہ مقدمات، بالعموم نثر میں مصنف کا قصیدہ ہوتے ہیں جہاں معاملہ اس کے برعکس ہوگا وہاں اول تو مقدمہ کو کتاب میں جگہ ہی نہیں دی جائے گی اور اگر بادل ناخواستہ اسے کتاب میں شامل ہی کرنا پڑا تو کتاب کا مصنف ایمان کے تیسرے درجے پر اتر آئے گا یعنی کچھ اور نہ کرسکا تو دل ہی دل میں مقدمہ نگار کو عمر بھر برا سمجھتا رہے گا۔ یہ باتیں کچھ آج کل کے لیے مخصوص نہیں ہیں، اخلاقی قدروں کے احترام کے پردے میں مقدمہ نگاری کی یہ رسم ہمارے یہاں ایک مدت سے چلی آرہی ہے یہ بھی نہیں کہ اس قسم کی باتوں کا تعلق محض ہما شما سے رہا ہو۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ بڑے بڑے آزاد خیال بزرگ تک مقدمہ نگار کے دیانت دارانہ اظہار خیال کو برداشت نہیں کرسکے۔ اس کی اس جگہ صرف ایک مثال کافی ہے۔

آپ کے علم میں ہے کہ گزشتہ صدی کے سب سے بڑے آزاد خیال ادیب سرسید احمد خاں نے ابوالفضل کی تصنیف "آئین اکبری" کو نئے ڈھب سے مرتب کیا تھا۔ دہلی کے کئی بزرگ اہل قلم نے اس کی تقریظیں لکھی تھیں۔ چناں چہ مرزا غالب نے بھی اس کی ایک منظوم تقریظ لکھی اور سرسید کی خواہش پر لکھی۔ لیکن غضب یہ ہوا کہ غالب نے تعریف کرتے کرتے اس میں اپنی ذاتی رائے کا اظہار بھی اس طور پر کردیا کہ۔

مُردہ پروردن مبارک کار نیست
خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

اس کا جو نتیجہ نکلا وہ سب کو معلوم ہے۔ یہی نہیں کہ سرسید احمد نے اس تقریظ کو کتاب میں شامل نہیں کیا۔ بلکہ وہی سرسید جن کے بارے میں مرزا غالب نے آثار الصنادید کی تقریظ میں یہ دعوا کیا تھا کہ ان میں اور مجھ میں رسمی دوستی نہیں تعلق خاطر ہے اور وہی سرسید جنھوں نے خود غالب کے بارے میں لکھا تھا کہ

"راقم آثم کو اعتقاد ان کی خدمت میں ہے اس کا بیان نہ قدرت تقریر میں ہے نہ احاطۂ تحریر میں آسکتا ہے،،

مرزا سے عمر بھر بدظن رہے۔ کہا جاتا ہے کہ آخر آخر دونوں کے دل صاف ہوگئے تھے۔ **واللہ اعلم بالصواب**۔ لیکن اس سے اتنی بات تو ثابت ہے کہ ہمارے یہاں مدح سرائی کے سوا غالباً مقدمہ نگاری کا کوئی اور معیار پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ اس لیے محتاط اور دیانت دار لکھنے والے اول تو کچھ لکھنے ہی سے دور بھاگتے تھے اور اگر کچھ لکھنا ہی پڑجائے تو اصل موضوع کو ہاتھ لگانے کے بجائے اِدھر اُدھر کی

باتوں سے چند صفحے کالے کر دیا کرتے تھے۔ مولانا حالی نے یادگار غالب میں مرزا کے بارے میں لکھا ہے کہ

"تقریظ نگاری کا انھوں نے ایسا طریقہ اختیار کیا تھا کہ کوئی بات راستی کے خلاف بھی نہ ہو۔ صاحب کتاب خوش بھی ہو جائے بہت سا حصہ تمہید یا مصنف کی ذات اور اس کے اخلاق یا اس کی محبت اور دوستی کے بیان میں یا اور لطیف یا پاکیزہ باتوں کے ذکر میں جو بے محل ہوں ختم ہو جاتا تھا۔ اخیر میں کتاب کی نسبت چند جملے جو اصلیت سے خالی نہ ہوتے تھے اور مصنف کو خوش کرنے کے لیے کافی ہوتے تھے لکھ دیتے تھے۔"

ان حالات میں اگر مقدمہ نگاری کی کوئی معیاری صورت یا روایت اردو میں نظر نہ آئے تو ہمیں چنداں تعجب نہ کرنا چاہئے۔ دنیا کا ہر کام اپنے تکملے کے لیے کسی مناسب اور اہل شخص کے انتظار میں رہتا ہے۔ اردو مقدمہ نگاری بھی ایک مدت تک اس انتظار میں رہی ہے آخر کار مولوی عبدالحق کے روپ میں۔ "مردے از غیب برون آمد و کارے بکرد۔"

مولوی عبدالحق پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو مقدمہ نگاری کو ایک بلند معیار ایک دلکش اسلوب اور ایک آبرومند مقام عطا کیا۔ ان سے پہلے اردو میں مقدمہ نگاری کی روایت بڑی بے جان، رسمی اور پست تھی۔ مولوی صاحب نے اس کے مردہ جسم میں تازہ روح دوڑائی اس کی رسمی حیثیت کو ختم کر کے اسے مستقل فن کی حیثیت دی اور اسے پستی سے نکال کر بلندی پر فائز کیا۔ حتیٰ کہ مقدمہ نگاری کا فن تقریظ و پیش لفظ سے بہت آگے بڑھ کر گراں قدر تحقیق و تنقید کا مظہر بن گیا۔

یہ مانا کہ اردو کے حق میں مولوی صاحب کی دین یک گونا نہیں گوناگوں ہے انھوں نے اردو قواعد، اردو لغت اور خاکہ نویسی سب کو نئی راہیں دکھائی ہیں سب کی منزلوں کا تعین کیا ہے۔ تبصرہ نگاری کا فن بھی ان کی رہنمائی میں آگے بڑھا ہے اور اردو کے خطاباتی ادب کی سطح کو بھی انھوں نے بلند کیا ہے۔ بایں ہمہ میری ناقص رائے میں مولوی صاحب کے حقیقی ادبی منصب و قد و قامت کا تشخص ان کے مقدمات کرتے ہیں۔ مقدمات ہی کی بدولت مولوی صاحب اردو کے ایک بلند پایہ نقاد اور محقق سمجھے جاتے ہیں اور مقدمات کی روشنی میں ان کی ادبی شخصیت قد آور اور عظیم نظر آتی ہے ان کی تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں

کے نقوش و آثار ان کی دوسری تحریروں میں بھی ملتے ہیں لیکن ان صلاحیتوں کا جیسا خوب صورت اور بھرپور اظہار مقدمات میں ہوا ہے کسی اور جگہ نہیں ہوا۔

مولوی صاحب کے مقدمات پہلے پہل دو جلدوں میں مرزا محمد بیگ نے حیدرآباد دکن سے شایع کیے تھے۔ پھر انھیں ایک ہی جلد میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے یکجا مرتب کیا اور اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے شایع کیا۔ اس جلد میں ایک کم ساٹھ مقدمے شامل ہیں۔ ان پر نظر ڈالتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مولوی صاحب کی مقدمہ نگاری کا دائرہ بلحاظ موضوعات کس قدر وسیع اور متنوع ہے۔ تذکرے منتخبات۔ مسدس۔ شعری مجموعے۔ مذہبی رسائل۔ داستانیں۔ مکتوبات۔ سوانحی خاکے۔ تاریخی کتب و تراجم۔ اصطلاحات علمیہ۔ لغات۔ قواعد۔ مجموعہ مقالات، آپ بیتیاں۔ خطبات اور تحقیقی و تنقیدی مضامین غرض یہ کہ ہر صنف سخن اور موضوع کی کتابوں پر مولوی صاحب نے مقدمے لکھے ہیں لیکن کسی ایک جگہ بھی آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ مولوی صاحب سرسری گزر گئے ہیں یا کتاب کو پوری طرح پڑھے بغیر خانہ پری کے لیے مقدمے لکھے ہیں۔ ہر کتاب اور کتاب کے موضوع سے ان کی ذاتی واقفیت اور لگاؤ کا پتہ چلتا ہے۔ مقدمے کیا ہیں مولوی صاحب کے تبحر علمی۔ وسعت نظر۔ ذہنی رسائی، تصنیفی شغف، تحقیقی دسترس اور تنقیدی صلاحیتوں کا آئینہ ہیں۔ پڑھنے والے کو ہر طرح یقین ہو جاتا ہے کہ مقدمہ نگار جو کچھ لکھ رہا ہے پوری قلمی دیانت اور کامل احساس ذمہ داری کے ساتھ لکھ رہا ہے۔

مولوی صاحب کی مقدمہ نگاری کا ایک خاص ڈھب ہے۔ یہی ڈھب اب اردو میں مقدمہ نگاری کا معیار کہلاتا ہے۔ مولوی صاحب کے ادبی مقدمات، عام طور پر تین خاص منزلوں سے گزرتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ کتاب کے مصنف کا بھرپور تعارف کراتے ہیں اس کی علمی قابلیت، سیرت، تعلیم و تربیت، انداز فکر، تصنیفی شغف اور تحقیقی و تنقیدی صلاحیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ہمیں کتاب کے موضوع سے روشناس کراتے ہیں یہ روشناسی کچھ اتنی مفصل اور جامع ہوتی ہے کہ قاری اگر کتاب کے اصل موضوع سے چنداں واقف نہ ہو تو بھی مقدمے کے مطالعہ کے بعد وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ کتاب سے استفادہ کر سکے۔ اس کے بعد مولوی صاحب اصل کتاب کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ یہ مقدمے کی تیسری

اور آخری منزل ہوتی ہے۔ اس میں وہ کتاب کے سارے پہلوؤں کا ایک ایک کر کے جائزہ لیتے ہیں۔ اور اردو زبان وادب میں اس کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہیں۔ یہ سارا کام مولوی صاحب عجیب سادگی و پرکاری اور مدلل دل نشینی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ جگرؔ نے کہا تھا۔

مجھے تو کر دیا سیراب ساقی نے مرے لیکن
مری سیرابیوں کی تشنہ ساما نی نہیں جاتی

ذہن میں کچھ اسی طرح کی کیفیت مقدمات عبدالحق کے مطالعے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اگر آپ نے کسی کتاب کے سلسلے میں مولوی صاحب کا مقدمہ پڑھ لیا ہے تو پھر مطالعے کا یہ نشہ آسانی سے نہ اتریگا۔ خمار سا طاری رہے گا۔ آپ اپنے آپ کو اصل کتاب پڑھنے پر مجبور پائیں گے۔ بات یہ ہے کہ ان کا مقدمہ موضوع کی حد تک آپ کو سیراب کرے گا۔ لیکن اس درجہ نہیں کہ آپ کتاب کے مطالعہ سے غافل ہو جائیں۔ مولوی صاحب خوب جانتے ہیں کہ مقدمہ کتاب کا اصل مقصود نہیں ہے بلکہ قاری کو کتاب اور اس کے نفس مضمون تک پہنچانے کا وسیلہ ہے۔ اس وسیلے کو مولوی صاحب وسیلہ ہی رہنے دیتے ہیں نتیجۃً ان کے مقدمات کے مطالعہ کے بعد ہم میں اصل کتاب کے مطالعہ کا ذوق و شوق کم نہیں ہوتا بلکہ کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔ سچ پوچھئے تو فنی و معنوی اعتبار سے مقدمہ نگاری کا حقیقی منصب و مقصد بھی یہی ہے۔ اس منصب و مقصد کو جس خوش اسلوبی کے ساتھ مولوی صاحب نے پورا کیا ہے ابھی تک اردو میں اس کا جواب نہیں بن سکا۔

جیسا کہ ابھی میں نے کہا ہے کہ مولوی عبدالحقؒ کے ادبی سرمائے کا سب سے اہم اور قابل قدر حصہ ان کے مقدمات ہیں۔ ہر چند کہ یہ مقدمات کسی خاص کتاب اور اس کے مصنف کی علمی و ادبی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ لیکن ان مقدمات کا اس سے بھی اہم تر پہلو یہ ہے کہ خود مولوی صاحب کے ادبی کاموں کی قدر و قیمت کا تعین کرنے میں جو مدد ان مقدمات سے ملتی ہے وہ ان کی کسی اور تحریر سے نہیں ملتی۔ اردو میں ایک بلند پایہ محقق اور نقاد کا منصب مولوی صاحب کو ان کے مقدمات ہی کی بدولت ملا ہے اور مقدمات ہی نے انھیں اردو تحقیق و تنقید کی تاریخ میں زندہ جاوید بنا یا ہے۔

اردو میں ادبی تحقیق کا اعلیٰ معیار بھی اول اول مولوی صاحب کے مقدمات سے نمودار ہوا ہے ان کے مقدمات سے عملاً پہلی بار اس بات کا اظہار ہوا کہ بے مصرف کوہ کنی یا خواہ مخواہ بال کی

کھال نکالنے کا نام تحقیق نہیں ہے۔ تحقیق کا اصل کام اہم حقائق کی نشان دہی اور ادب و ادیب کی رہنمائی ہے۔ اس رہنمائی کا ادبی ذوق و شعور اور تنقیدی شعور سے گہرا رشتہ ہے۔ اگر اس رشتے سے تحقیق بے نیاز ہو جائے تو پھر اس کی تحریریں ادب نہیں رہتیں۔ میونسپلٹی کے شعبہ وفات و پیدائش کا رجسٹر بن جاتی ہیں۔ ان سے وفات و پیدائش کی صحیح تاریخیں تو معلوم ہو جاتی ہیں لیکن یہ پتا نہیں چلتا کہ موت و پیدائش کے درمیان کا فاصلہ کس نوعیت کا تھا اور مرنے والے نے اسے کس طرح طے کیا تھا۔ ادبی ذوق اور تنقیدی شعور سے بیگانہ تحقیق کی نوعیت عام طور پر یہی ہوتی ہے۔ اس قسم کی بے جان اور بے مصرف تحقیق سے مولوی صاحب کی طبیعت ہمیشہ ابا کرتی رہی ہے۔ وہ ادبی تحقیق میں انتخابی نظر کے قایل رہے ہیں۔ انھوں نے اہم اور غیر اہم میں ہمیشہ فرق کیا ہے اور کسی شخص یا موضوع کی ادبی اہمیت ہی کے پیش نظر اس پر قلم اٹھایا ہے۔ اس لیے مولوی صاحب کی تحقیقی تحریریں، واقعات کی بے روح کھتونی نہیں ہیں بلکہ ادبی ذوق کو نکھارنے اور تنقیدی صلاحیتوں کو آگہی کے ساتھ بروے کار لانے کا ذریعہ بن گئی ہیں۔

مولوی صاحب کے یہاں اعلیٰ درجے کا تحقیقی مواد و معیار زیادہ تر ان مقدمات میں نظر آتا ہے جو اردو شعرا کے قدیم تذکروں اور بعض قدیم ترین تصانیف کے لیے لکھے گئے ہیں۔ میری مراد نکات الشعرا، تذکرہ ریختہ گویان، مخزن نکات، مخزن شعرا، قطب مشتری، گلشن عشق، دیوان اثر، انتخاب میر، معراج العاشقین، سب رس، باغ و بہار اور اسی طرح کی بعض دوسری تصنیفات کے مقدمات سے ہے، یہ مقدمات مولوی صاحب کی وسعت مطالعہ، دقت نظر اور تحقیقی بالغ نظری ہی کا مظہر نہیں ہیں بلکہ وہ ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ ادب کے ایک محقق کو اپنی تحقیقی صلاحیتوں کو کس قسم کے موضوع اور کس نوع کی تصانیف پر صرف کرنا چاہیے۔ ساتھ ہی وہ اپنے انداز تحریر سے تحقیقی صلاحیتوں کے صرف کا وہ طریقہ کار بھی سمجھاتے ہیں جو حقائق تک پہنچنے کے لیے واقعات و حالات کے سارے پہلوؤں کی چھان بین تو کرتا ہے لیکن اس چھان بین میں ادب اور ادیب کا خون نہیں ہونے دیتا۔

مقدمات عبدالحق کے تنقیدی اجزا کی نوعیت بھی دوسروں سے بہت مختلف ہے۔ مولوی صاحب کے مقدمات میں تحقیق و تنقید دو الگ چیزیں نہیں رہیں بلکہ ادب کے رشتے سے دونوں ایک ہو گئی ہیں وہ اس قسم کے نقاد یا مقدمہ نگار نہیں جو واقعات و حالات سے بے خبر رہ کر صرف نظری مسائل کے سہارے کسی تصنیف یا مصنف کے بارے میں اچھے برے ہونے کا حکم لگاتے رہتے ہیں۔ اور

بزعم خود یہی سمجھتے ہیں کہ تنقید کا حق ادا ہو گیا۔ مولوی صاحب کا تنقیدی مسلک اس سے بہت مختلف ہے ان کے یہاں تنقید نام ہے شعور آگہی کو ادب کے سلسلے میں بروئے کار لانے کا اور اس کے ذریعہ زندگی کی کوکھ سے پیدا شدہ ادب کو سنوارنے بنانے اور آگے بڑھانے کا۔ چناں چہ ان کے مقدمات میں تحقیق و تنقید کے عناصر ایک دوسرے میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ آپ انھیں ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ وہ تحقیق و تنقید دونوں کو ایک ساتھ لے کر چلتے ہیں اور حسب ضرورت کہیں تحقیقی مواد سے اپنی تنقید کو اور کہیں تنقیدی شعور کی مدد سے اپنی تحقیق کو جاندار بناتے ہیں۔

کسی تصنیف پر قلم اٹھاتے وقت تصنیف کے موضوع و مواد کے علاوہ صاحب تصنیف کا خارجی ماحول اس کی سیرت۔ ذہنی محرکات، سماجی عوامل، ماحول کی تبدیلیوں کے اثرات داخلی کیفیات اور نفسیاتی پیچیدگیاں سبھی چیزیں مولوی صاحب کے پیش نظر ہوتی ہیں۔ لیکن وہ انھیں الگ الگ کر کے نہیں ایک دوسرے سے منسلک کر کے دیکھتے ہیں ان کی تنقید میں ادب کے سارے حیات افروز نظریات اور مکاتب فکر کا احترام نظر آتا ہے۔ زندگی کی ساری مثبت قدروں کی ترجمانی ملتی ہے۔ لیکن اگر آپ یہ چاہیں کہ ان کی تنقید کو کسی خاص قسم کے خانے میں رکھ دیں تو یہ ممکن نہ ہوگا۔ وہ خود کو نقاد کہلوانے کے لیے کسی خاص نظریئے کے محتاج نہیں ہیں۔ اردو میں کوئی تاثراتی نقاد ہے۔ کوئی جمالیاتی، کوئی وجدانی نقاد ہے، کوئی تاریخی، کوئی سائنٹفک نقاد ہے کوئی مارکسی، مولوی صاحب ان میں سے کسی خاص قسم کے نقاد نہیں ہیں۔ ان کی تنقید نگاری کا مقام ان سب سے الگ ہے وہ ادب کے نقاد ہیں اور سارے نظریات و افکار کو ادب کا خام مواد سمجھ کر ادب ہی کے توسط سے اسے جانچتے پرکھتے ہیں۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مولوی صاحب تنقیدی مسلکوں اور ان کے نظریات افکار سے واقف نہیں۔ وہ خوب واقف ہیں اور ایک ایک بات ان کے ذہن میں واضح ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے ادبی مباحث میں نظریات کی لمبی چوڑی خشک بحثیں چھیڑ کر ادب کو گورکھ دھندا بنانا پسند نہیں کیا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ادب و تنقید کے نظری مسائل پر انھوں نے مضامین کی شکل میں الگ سے کچھ نہیں لکھا پھر بھی اگر آپ ان کے مقدمات کو غور سے دیکھیں تو ادب اور ادبی نظریات کی جملہ اقسام و اصناف کے بارے میں نہایت واضح اور جچی تلی رائیں مل جائیں گی۔ مثلاً تنقید کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ اس کے جواب میں انھوں نے الگ سے کوئی مقالہ قلم بند نہیں کیا۔ لیکن ان کی تحریروں میں درجنوں ٹکڑے ایسے

مل جاتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی صاحب کا ذہن تنقید کے باب میں بالکل واضح ہے اس سلسلے میں صرف ایک مقدمے کی چند سطریں دیکھئے۔ لکھتے ہیں کہ

"افلاطون کے وقت سے لے کر اب تک تنقید کے بیسیوں مسلک وجود میں آچکے ہیں مثلاً جمالیاتی، وجدانی، تاریخی، حولی، تاثراتی نفسیاتی وغیرہ اور اس زمانے میں فرائڈ اور مارکس کے نظریوں نے بھی تنقید کو متاثر کیا ہے اور جیسے جیسے حالات بدلتے رہیں گے ادب اور تنقید پر نئے نظریوں اور سائنس کے انکشافات کا بھی اثر پڑتا رہے گا۔ افتادِ طبع ماحول تعلیم و تربیت و صحبت کی بنا پر انسان کا رجحان ایک خاص جانب ہو جاتا ہے اور جب اس میں غلو ہوتا ہے تو وہی مسلک یا مذہب بن جاتا ہے۔ اس لیے تنقید کا کوئی مسلک جامع نہیں۔ ایسے نقاد اپنے رجحان یا ذوق کے زیر اثر ایک طرف جھک جاتے ہیں اور دوسرے رخ پر یا تو سرسری نظر ڈالتے ہیں یا بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ صحیح تنقید اسی وقت ہوگی جب ادب کے ہر رخ کو دیکھا اور جانچا جائے گا۔ اگر ایک گروہ دوسرے کو الہامی۔ ماورائی۔ روحانی جذباتی کہتا ہے اور اسے ماضی پرستی یا روایت پرستی کا ملزم قرار دیتا ہے اور اس کی تنقید کو تنقید نہیں سمجھتا تو دوسرا گروہ جو فرائڈ اور مارکس پرستی میں مادیت پر اتنا زور دیتا ہے کہ دوسری انتہا پر پہنچ جاتا ہے تو اس کی تنقید بھی ادبی تنقید نہیں رہتی کچھ اور ہو جاتی ہے۔ بے شک ادب کا کام صرف ذوق اور وجدان کی تسکین کا سامان پیش کرنا نہیں لیکن اس کا کام محض مادیت کا پرچار بھی نہیں۔ یہ دونوں کا خادم ہے۔"

مولوی صاحب کے یہاں اس قسم کی واضح رائیں تنقید ہی کے سلسلے میں نہیں ہر صنفِ ادب اور ہر مکتبہ فکر کے بارے میں مل جاتی ہیں۔ مکتوب نگاری کے فن اور اس کی خصوصیات کے بارے میں ہمارے یہاں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آپ نے بہت کچھ پڑھا ہوگا۔ مولوی صاحب نے الگ سے اس موضوع پر بھی کچھ نہیں لکھا لیکن مکتوبات حالی اور خطوط عطیہ بیگم کے مقدمات میں انھوں نے جو کچھ ضمناً لکھ دیا ہے وہ پڑھنے کے لائق ہے اور بہت سے مقامات پر بھاری ہے اسی طرح آپ بیتی یا خود نوشت کی دل کشی اور افادیت کے بارے میں بھی آپ نے بہت کچھ سنا اور پڑھا ہوگا۔ لیکن ذرا مولوی صاحب کے چند فقرے دیکھئے لکھتے ہیں:

"آپ بیتی میں جو مزہ ہے وہ جگ بیتی (تاریخ) میں کہاں۔ مورخ ہزار بے لاگ ہو اور تحقیق و تلاش میں سر مارے۔ آپ بیتی لکھنے والے کو نہیں پہنچ سکتا۔ بعض اوقات اس کے بے ساختہ جملے سے وہ اسرار حل ہو جاتے ہیں جو مدتوں تاریخوں کی ورق گردانی کے بغیر میسر نہیں ہوتے۔ اگر ہر شخص جس نے دنیا دیکھی بھالی ہے اور کچھ کیا بھی ہے اپنی آپ بیتی لکھے یا کرے تو ادب کے خزانے میں یہ جواہرات انمول ہیں۔"

یہ سطریں مقدمہ ذکر میر سے ماخوذ ہیں اور آپ بیتی کی اہمیت کے ذکر میں مختصر ترین سہی لیکن جامع رائے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس طرح کئی اور نہ جانے کتنی رائیں جن کا تعلق ادب کے نظری مسائل سے ہے مقدمات میں بکھری پڑی ہیں۔ اس لیے یہ خیال کرنا کہ مولوی صاحب تنقید کے دبستانوں اور ان کے نظری مباحث سے واقف نہیں درست نہ ہوگا۔ صرف یہ کہ وہ تنقید کو مختلف خانوں میں بانٹنے اور کسی خاص خانے سے انتہا پسندانہ لگاؤ ہی کو تنقید نہیں سمجھتے۔ وہ تنقید کے سارے نظریوں اور دبستانوں کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ادبی تنقید ہر حال میں ادب اور ادبیت ہی کے دائرے میں رہے۔ نظریوں کی آڑ میں بے جان اور بے رس غیر ادبی تحریر کا نمونہ نہ بن جائے۔ شاید اس لیے انھوں نے نظری اور علمی تنقید کی بحثیں بھی الگ الگ اپنی تحریروں میں کہیں نہیں چھیڑیں۔ ہاں علمی تنقید کے ایسے نمونے ضرور یادگار چھوڑ دیے ہیں جن کی مدد سے تنقید کے بہت سے اصول اخذ کیے جا سکتے ہیں اور جس کی مدد سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ادب اور ادبی تنقید میں نظریات کا دخل کس انداز سے اور کس سطح پر ہونا چاہیے۔ البتہ آپ کو یہ سب کچھ جاننے اور مولوی عبدالحق کی تحقیق پرور تنقید سے واقفیت کے لیے ان کے مقدمات کا غائر مطالعہ کرنا ہوگا۔

سید جاوید اقبال (پاکستان)

مولوی عبدالحق کی تبصرہ نگاری

مولوی عبدالحق کی تبصرہ نگاری کا آغاز زمانۂ طالب علمی میں ہوا۔ ان کا پہلا تبصرہ "ریویو بدیۂ ناظر" کے عنوان سے یکم اگست ۱۸۹۳ء کے علی گڑھ گزٹ میں شائع ہوا۔

۱۸۹۳ء کے بعد بھی مولوی عبدالحق نے کئی معرکتہ الآرا تحریریں لکھیں لیکن وہ تبصرہ نگاری کی طرف بھرپور توجہ نہیں دے سکے۔ جنوری ۱۹۲۱ء میں جب رسالہ "اردو" انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کے زیرِ اہتمام منظرِ عام پر آیا تو مولوی عبدالحق اُس کے مدیر ہوئے۔ انھوں نے رسالہ "اردو" میں تبصرہ نگاری کا خاص اہتمام کیا، یہی وہ نقطۂ آغاز ہے جہاں سے مولوی صاحب کی تبصرہ نگاری کا سنہرا دور شروع ہوتا ہے۔

رسالہ "اردو" میں ابتدا ہی سے تبصرے شامل کیے گئے۔ ابتدائی دو شماروں میں صرف انجمن کی مطبوعات پر تبصرے لکھے گئے لیکن جولائی ۱۹۲۱ء میں تیسرا شمارہ منظرِ عام پر آیا تو تبصرے کے لیے ایک حصہ مخصوص کر دیا گیا اور یہ پابندی بھی نہیں تھی کہ تبصرے صرف انجمن کی کتابوں پر ہوں۔

ابتدا میں رسالہ "اردو" میں سارے تبصرے مولوی عبدالحق ہی کیا کرتے تھے۔ لیکن اکتوبر ۱۹۲۲ء سے مولوی صاحب کے اس کام میں دیگر حضرات کی معاونت بھی شامل نظر آتی ہے۔ البتہ چند ایک نام کے علاوہ مبصّر کے نام کا مخفف نظر آتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے رسالہ "اردو" میں سیکڑوں مختصر اور طویل تبصرے تحریر کیے۔ یہ تبصرے مختلف موضوعات کی کتب و رسائل پر ہیں، مثلاً فلسفہ، نفسیات، طب، قواعد تاریخ ادب، مزاح، ناول اور شاعری وغیرہ۔

ان تبصروں سے مولوی عبدالحق کی علمی و ادبی بصیرت او تبصرہ نگاری سے دل چسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی یہ دل چسپی فطری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تبصروں کا ایک اپنا فلیور ہے۔ اسی فلیور نے علماء و فضلاء کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ چناں چہ اس توجہ کے باعث انجمنِ ترقیِ اُردو ہند (دہلی) نے ۱۹۳۹ء میں "چند تنقیداتِ عبدالحق" کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ اس کتاب میں مولوی عبدالحق کے دس (۱۰) تبصرے شامل کیے گئے اور یوں اردو ادب میں پہلی مرتبہ کسی کے تبصرے یکجا کر کے شایع کیے گئے۔ یہاں پر ان کتابوں کے نام دیے جاتے ہیں جن پر کیے گئے تبصرے اس کتاب میں شامل ہیں:

۱۔ سرگزشتِ الفاظ از مولوی احمد دین۔
۲۔ مکاتیبِ امیر مینائی مرتبہ احسن اللہ ثاقب۔
۳۔ اردو زبان پر سرسری نظر از رشید احمد صدیقی۔
۴۔ اصلاحِ سخن مرتبہ محمد عبدالعلی شوق سندیلوی۔
۵۔ اُردو شہ پارے از ڈاکٹر غلام محی الدین قادری زور۔
۶۔ اکبر الٰہ آبادی از طالب الٰہ آبادی۔
۷۔ فیضانِ شوق، دیوانِ احمد علی شوق قدوائی مرتبہ شیخ رضی الدین احمد
۸۔ اردو لٹریچر از ڈاکٹر گراہم بیلی۔
۹۔ نور اللغات، از نور الحسن نیّر۔
۱۰۔ مجموعۂ نغز از میر قدرت اللہ قاسم مرتبہ پروفیسر محمود شیرانی۔

اس کتاب میں شامل تمام تبصرے رسالہ "اردو" میں شایع ہوئے۔ یہ کتاب ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۳ء تک کیے گئے تبصروں کا انتخاب ہے۔

ان تبصروں کی افادیت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے محمد تراب علی خاں باز نے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۲ء تک کے تبصروں کا انتخاب "تنقیداتِ عبدالحق" کے نام سے طبع کرایا۔ اس مجموعے میں تیئیس (۲۳) تبصرے شامل کیے گئے جب کہ دس (۱۰) تبصرے وہی ہیں جو گزشتہ مجموعے میں تھے۔

ذیل میں اُن کتب کی نشان دہی کی جاتی ہے جن پر کیے گئے تبصرے "تنقیداتِ عبدالحق" میں

شامل ہیں۔ ان کے علاوہ شامل کتب کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے:

۱۔ رُوحِ تنقید از غلام محی الدین قادری زور۔

۲۔ جامع اللغات مرتّبہ خواجہ عبد المجید۔

۳۔ گنجینۂ تحقیق از پروفیسر سید محمد احمد بےخود موہانی۔

۴۔ اربابِ نثرِ اردو از سید محمد۔

۵۔ پنجاب میں اُردو از حافظ محمود شیرانی۔

۶۔ دیوانِ ولی، از ولی مرتّبہ حیدر ابراہیم سایانی۔

۷۔ مکاتیب نواب محسن الملک مرتّبہ محمد امین زبیری۔

۸۔ شرحِ دیوان غالب از مولوی عبد الباری آسی۔

۹۔ تذکرہ اعجازِ سخن مرتّبہ شبیر علی خاں سرخوش

۱۰۔ تلخیص عروض وقافیہ مرتّبہ سید حیدر علی طباطبائی۔

۱۱۔ خطوطِ سرسید احمد خاں مرتبہ راس مسعود۔

۱۲۔ شعر الہند از مولوی عبد السّلام۔

۱۳۔ بانگِ درا از علّامہ اقبال۔

مولوی عبد الحق کے تبصروں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں دانش محل لکھنؤ سے بھی "ادبی تبصرے" کے نام سے ایک اور مجموعہ شایع ہوا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ تینوں مجموعے مولوی صاحب کی زندگی میں شایع ہوئے اور مقبول ہوئے۔

اس مجموعے میں جو تبصرے شامل ہیں وہ گزشتہ دونوں مجموعوں میں نہیں ہیں۔ ذیل میں "ادبی تبصرے" کے مندرجات پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ روحِ ادب از شبّیر حسن خاں جوش۔

۲۔ مرہٹی دِناں کوش (مرہٹی انسائیکلوپیڈیا)۔

۳۔ رسائل عماد الملک مرتّبہ مولوی سید حسن بلگرامی۔

۴۔ روحِ سیاست مترجم محمد عمر و نور الٰہی۔

۵۔ حزنِ اختر از واجد علی شاہ۔

۶۔ جواہراتِ حالی مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی۔

۷۔ افاداتِ مہدی از محمد مہدی حسن افادی۔

۸۔ انجامِ زندگی از ضیار بانو۔

۹۔ دیوانِ جان صاحب از جان صاحب۔

۱۰۔ ناٹک ساگر مترجم محمد عمر و نور الٰہی۔

۱۱۔ ہند، عہد اورنگ زیب میں از مرزا سمیع اللہ۔

۱۲۔ مکتوباتِ حالی مرتبہ خواجہ سجاد حسین۔

۱۳۔ الناظر کا انعامی مضمون۔

۱۴۔ ماورا از۔ن۔م۔راشد۔

۱۵۔ آیات و نغمات از شبیر حسن خاں جوش۔

گزشتہ مجموعوں کی طرح اس کے تبصرے بھی رسالہ "اردو" سے لیے گئے ہیں۔ اور ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۲ء تک کے تبصروں سے ان کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان تینوں کتابوں کی قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ ان میں زیادہ تر تبصرے رسالہ "اردو" کی ابتدائی دہائی سے لیے گئے ہیں اور چند تبصرے ۱۹۴۱-۴۲ء سے اس کی وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ جو تبصرے اس زمانے میں زیادہ پسند کیے گئے اور مشہور ہوئے انھیں شامل کر لیا گیا۔

(۲)

مولوی عبدالحق کے تبصرے بہت سی خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان میں لسانی مسائل، عملی تنقید، تحقیقی بحث، ملی و قومی مسائل، معاصرانہ چشمک اور مقدمہ نگاری کی خصوصیات وغیرہ ملتی ہیں۔ لیکن بہت سارے تبصرے ایسے ہیں جن میں خالص تبصرے کا مزاج ہے۔ یہی تبصرے ہر لحاظ سے اعلیٰ پائے کا نمونہ ہیں۔ ہماری ناچیز رائے میں جن کتابوں پر اعلیٰ پائے کے تبصرے کیے ان میں سے چند یہ ہیں مثلاً حافظ سید محب الحق عظیم آبادی کی کتاب "شرعۃ الحق" (بابت اکتوبر دسمبر، ۱۹۲۱ء)، "دیوانِ حسرت" از حسرت موہانی (بابت اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۲۴ء)، ماہ نامہ "المعلم" حیدر آباد دکن (بابت اکتوبر۔ دسمبر، ۱۹۲۴ء۔)،

"جواہر منظم" یعنی رباعیاتِ سرمد مترجم سید نواب علی صولت لکھنوی (جولائی۔ ستمبر ۱۹۲۲ء) رسالہ "نگار" مدیر نیاز فتح پوری (بابت جولائی ۔ ستمبر ۱۹۲۲ء) کلامِ عاصی از منشی گھنشام لال عاصی (بابت جنوری ۔ مارچ) اردو تنقید پر ایک نظر از کلیم الدین احمد (بابت جولائی ۔ ستمبر ۱۹۴۲ء زبان اور علم زبان از عبدالقادر سروری (بابت جنوری ۔ مارچ ۱۹۵۷ء) ، طرۂ امیر از امیر احمد علوی (بابت جنوری ۔ مارچ ، ۱۹۲۹ء) وغیرہ۔

مولوی عبدالحق کے بہت سے تبصرے ایسے ہیں جن کو بیش لفظ قرار دینا چاہیے مثلاً سوانح عمری از نواب مولوی تفضل حسین (بابت جولائی ۔ ستمبر ۱۹۲۲ء) قزاق (ڈراما) از محمد عمر (بابت اپریل ۱۹۲۳ء) ، کلیاتِ اسمٰعیل مرتبہ محمد اسلم سیفی (بابت اپریل ۔ جون ۱۹۲۳ء) تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام از قاری محمد طیب (بابت اپریل ۔ جون ۱۹۴۰ء) کلامِ رونق از منشی پیارے لال (بابت اپریل ۔ جون ۱۹۲۳ء) ، یادگارِ شعراء مترجم محمد طفیل (جولائی ۔ ستمبر ۱۹۴۳ء) ، مضامینِ رشید از رشید احمد صدیقی (بابت اپریل ۔ جون ۱۹۳۸ء) ، اعمال نامہ (سوانح) سید رضا علی (بابت جنوری ۔ مارچ ، ۱۹۴۴ء) بہادر شاہ ظفر سوانح از امیر احمد علوی (بابت اکتوبر دسمبر ۱۹۲۵ء) داستانِ غدر از سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی (اکتوبر ۔ دسمبر ۱۹۵۷ء)

مولوی عبدالحق زبان اردو کے سب سے بڑے وکیل اور نمائندے تھے (اس کی جھلک اُن کے تبصروں میں بھی پائی جاتی ہے) انھوں نے ساری زندگی اردو کا مقدمہ لڑا ، اردو کی تبلیغ کی ، اردو کی نشو ونما کی ، اردو کی ہی اشاعت کی ، غرض وہ کون سا اردو کا میدان ہے جہاں وہ نظر نہیں آتے ۔ ان کی ساری زندگی کی تگ ودو ، اُن کے ادبی سیاسی قومی اور ملی نظریات کی جھلک ان کے تبصروں میں بھی نظر آتی ہے ۔ مثلاً " مرقع ہند " جو ترجمہ ہے اُس رپورٹ کا جسے حکومت ہند کے لیے پرفیسر رش بروک ولیم نے پارلیمنٹ میں پیش کرنے کی غرض سے مرتب کیا تھا ۔ مولوی صاحب اُس پر (جولائی ۔ ستمبر ۱۹۲۱ء کے سہ ماہی "اردو" کے شمارے میں) تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :۔

"تعلیم کے باب میں کلکتہ یونی ورسٹی کمیشن اور اس کی رپورٹ کا مفصل ذکر کیا ہے اور اِن اصلاحات پر بحث کی ہے جو کمیشن نے تجویز کی ہیں لیکن تعجب ہے کہ اس رپورٹ میں کمیشن کی اُس خاص تجویز کا مطلق ذکر نہیں کیا جس کا قومی نقطۂ نظر سے ملک کی تعلیم سے خاص تعلق ہے۔ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اس پر زور دیا ہے کہ مدارس میں میٹرک کولیشن تک جہاں تک ممکن ہو مضامین کی تعلیم دیسی زبان کے ذریعے سے دی جائے اور کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں دیسی زبانوں کی تعلیم کا انتظام اعلا پیمانہ پر کیا جائے اور ان کی تعلیم تاریخی اور تنقیدی نظر سے ہو۔ ملک میں اس وقت جابجا قومی مدارس کھل رہے ہیں، انھیں یہ نکتہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے اور جہاں تک جلد ممکن ہو اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ ملک کی ایک زبان ہو جائے کیوں کہ ہم خیالی کا دار و مدار بہت کچھ ہم زبانی پر ہے"۔[1]

ہم زبانی کے نعرے پر وہ شروع سے آخر وقت تک ڈٹے رہے اور اردو کی خدمت کے ہر انداز کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ "اُردو کے ہندی ادیب" از سید قاسم علی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ـــــ یہ کتاب مؤلف نے ہندی زبان اور ناگری رسمِ خط میں لکھی ہے یہ بھی اردو کی خدمت ہے"۔[2]

اس کے علاوہ الفاظ کے استعمال سے متعلق ایک فارمولا بھی دیتے ہیں جو اصلاً انشا کی دریائے لطافت کا ہے۔ "روح ادب" از سید حیدر عباس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"جو الفاظ استعمال میں آ گئے ہیں اور عام و خاص کی زبان پر جاری ہیں! انھیں اردو میں صحیح اور فصیح خیال کرنا چاہیے گو اصل کے اعتبار سے غلط ہی کیوں نہ ہوں"۔[3]

---

[1] سہ ماہی "اردو" حیدرآباد دکن، جولائی۔ ستمبر، ۱۹۲۱ء، ص ۴۷۵۔

[2] سہ ماہی "اردو" حیدرآباد، دہلی، اپریل، جون، ۱۹۴۴ء، ص ۲۹۳۔

[3] سہ ماہی "اردو" حیدرآباد دکن، جنوری۔ مارچ، ۱۹۳۴ء، ص ۲۰۱۔

مولوی عبدالحق کے تبصروں میں تنقیدی عناصر بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تبصرے کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی خالص تنقیدی مضمون پڑھ رہے ہیں۔ لیکن تبصروں میں تنقید کی آمیزش قطعاً عیب معلوم نہیں ہوتی۔ کیوں کہ اس عمل سے قاری کے مزاج میں ادب کی تنقید کا ذوق بیدار ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولوی صاحب کی یہ تنقید غور و فکر کا نتیجہ اور علمی بصیرت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف کی کتاب "غالب" پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اس تمام کتاب میں کہیں اردو شاعری اور اردو شعراء سے بحث نہیں کی گئی ہے اور اس کے متعلق ڈاکٹر صاحب کی کوئی رائے یا خیال معلوم نہیں ہوتا ہے۔ انھوں نے شاعری اور شعر کی تعریف میں سب انگریزی اقوال نقل کیے ہیں، نمونے بھی انگریزی کلام کے دیے ہیں۔ جس سے قیاس ہوتا ہے کہ انھوں نے اردو شعراء کے کلام کو مطالعہ کرنے کی کبھی زحمت نہیں فرمائی اردو شاعری سے غالب کو الگ کر کے بحث کرنا اور پھر اردو شاعری میں اس کا درجہ قائم کرنا ایک مجنونانہ خیال ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ غالب کے نقادوں کی تحریر زیادہ تر ایسے ہی لوگوں کی پسند خاطر ہوئی ہیں جن کی تعلیم دیسی طریقے پر ہوئی ہے۔ اور جن کی حسِ جمالیات پر مغربی ادب کی چھینٹ تک نہیں پڑی۔ بے ادبی معاف ہمارا بھی خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ تحریر اگر ہوئی تو ایسے ہی لوگوں کی دل چسپی کا موجب ہوگی جو آپ کی طرح مغربی ادب کے تو رسیا ہیں مگر اردو شاعری ـــــ اور اس کے مختلف رنگوں اور اسلوبوں اور اس کی اندرونی حقیقت اور زبان کی نزاکتوں سے بالکل کورے ہیں"[۱]

مولوی عبدالحق تبصرہ کرتے ہوئے شخص کے بجائے فن کو سامنے رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس بات کی ہرگز پروا نہیں کرتے کہ کون بہت مشہور ہے اور کون کم مشہور اور نہایت غیر جانب داری سے تنقید کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کی کتاب "ادب کا مقصد" پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

---

[۱] سہ ماہی "اردو" جنوری مارچ، ۱۹۲۹ء، ص ۱۶۳۔

"اس مجموعے میں واجد علی شاہ کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط ان کی ایک چہیتی بیگم رشید کے نام اور رشید ابیگم کے بادشاہ کے نام ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ان خطوط کو بہت اہم خیال کرتے ہیں۔ اس نظر سے کہ وہ غیر مطبوعہ ہیں، اہم خیال کیے جا سکتے ہیں ورنہ اس مجموعے میں یہ سب سے غیر اہم ہیں۔ ان خطوط کو پڑھ کر افسوس ہوتا ہے یہ اس بادشاہ کے عامیانہ خیالات ہیں جو ملک کے ایک نہایت زرخیز اور مرکز تہذیب پر فرمانروا تھا اور بازیافتِ شاہی کا متمنی ہے۔"[1]

تبصرے کے اس اقتباس میں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی اور واجد علی شاہ دونوں پر بہ یک وقت تنقید اثر انداز ہوتی ہے۔ لیکن تحقیق کے حوالے سے ایک نکتہ یہ بھی سامنے آتا ہے کہ ہر پرانی چیز کارآمد نہیں ہوتی یا ہر بڑے شخص کے تمام پہلو قابل تقلید نہیں ہوتے۔ قدیم یا جدید میں اسی فن پارے کی اہمیت ہوتی ہے جو حقیقی معنوں میں علمی حیثیت رکھتا ہو۔

مولوی عبدالحق کے تبصروں میں جہاں کڑی تنقید ملتی ہے وہیں منصفانہ اور تعریفی انداز بھی ملتا ہے۔ جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ مولوی عبدالحق اچھے ادب کی ترقی کے خواہش مند تھے۔ اس حوالے سے ان کی نیک نیتی پر شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ایک فنی کتاب "فوٹوگرافی" پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"علاوہ بیسوں اشکال کے تقریباً پچیس ایسی عکسی تصاویر بھی دی ہیں جو فن کے لحاظ سے ضروری ہیں۔ مگر ہم کو معلوم ہے کہ ہمارے پریسوں میں کیسا کام ہوتا ہے اس لیے مصنف پر اس کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ اسی طرح کتابت میں بھی غلطیاں ہیں جو ہمارے لیتھو پریس کی خصوصیت ہے۔ اردو کی وہ کتاب ہی نہیں جو غلطیوں سے پاک ہو البتہ اکثر جگہ 'نے' کا بے جا استعمال بری طرح کھٹکتا ہے مگر کیا کیا جائے یہ لفظ پنجاب والوں کی اردو کا ایک جزو لاینفک ہو گیا ہے۔"[2]

تبصرے کے حوالے سے مولوی عبدالحق کے ہاں یہ رجحان بھی پایا جاتا ہے کہ ہر وہ کتاب جو اردو کو فائدہ پہنچا سکتی ہے اس کی تشہیر ہو اور جو کتاب غلط فہمیوں میں اضافہ کرے اس کی اور اس جیسی کتابوں کی

---

[1] سہ ماہی "اردو"، کراچی، جنوری - مارچ، ۱۹۵۷ء، ص ۱۱۹-

[2] سہ ماہی "اردو"، اورنگ آباد، جنوری - مارچ، ۱۹۳۱ء، ص ۱۹۸-

روک تھام ہو۔یہی وجہ ہے کہ رسالہ"اردو"کی ابتدائی تین دہائیوں میں مولوی صاحب نے بکثرت تبصرے کیے۔اس کے بعد کمی آگئی پھر ۱۹۵۰ء کے بعد اور کمی آجاتی ہے اور زیادہ تر زور مختصر تبصرے پر نظر آتا ہے لیکن کتاب کی تشہیر سے متعلق نظریے میں فرق نہیں آتا جو تبصرہ نگاری میں مولوی عبدالحق کی مستقل مزاجی کی دلیل ہے۔اس کے علاوہ ان کے تبصروں میں ایک نمایاں عنصر بے لاگ رائے ہے جو تبصرے کا اہم جزو ہے۔مولوی صاحب کی اس تبصرہ نگاری کو بے لاگ تبصرہ نگاری کہا گیا ہے۔مثلاً"افکارِ سلیم" پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ایک بات سلیم مرحوم کی نثر اور نظم دونوں میں یکساں پائی جاتی ہے۔اور یہی ان کی خاص انفرادیت ہے یعنی خودداری اور معقول پسندی جس کا تعلق اسلوب اور طرز بیان سے نہیں بلکہ تخیّل اور طرزِ عمل سے ہے۔متروکات کا طوفان ان کی رحلت سے بہت پہلے سر بہ فلک تھا لیکن انھوں نے اس کی ذرا پرواہ نہ کی اور یاں۔واں۔سدا۔تلک۔پہ (مگر) برابر لکھتے رہے"[1]

ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے،"مضامینِ فلک پیما" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اسلوب بیان میں بھی ایک طرح کی جدت ہے مگر دل کشی نہیں بعض جگہ طول، اجیرن ہو جاتا ہے یہ مضامین مسلسل پڑھنے کے لیے نہیں ورنہ طبیعت گھبرانے لگے گی"[2]

مولوی عبدالحق نے ادبی کتب و رسائل کے علاوہ فنی کتابوں پر بھی بے لاگ تبصرے کیے ہیں۔"تجارت کی پہلی کتاب" پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اس کتاب کے پڑھنے سے آدمی تاجر بن سکتا ہے۔لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل میں تجارت کا ولولہ ضرور پیدا ہوتا ہے۔اور ابتدائی معلومات کا بھی علم ہو جاتا ہے۔یہ ایک قسم کی ترغیبی کتاب ہے اور کارآمد و مفید ہے"[3]

عبدالحق کے تبصروں میں ایسے تبصروں کی ہرگز کمی نہیں جن میں تحقیق کا عنصر پایا جاتا ہے اور قابلِ قدر بات یہ ہے کہ تحقیق و تنقید ان کے ہاں شانہ بشانہ چلتی ہے۔اور آخر میں وہ بڑے بھرپور انداز میں نتیجہ اخذ کرتے ہیں،پھر اس نتیجے کی ضرورت و اہمیت کی وضاحت اپنے منفرد انداز میں کرتے ہیں اس کی

۱؎ سہ ماہی"اردو" دہلی، جنوری۔مارچ۔۱۹۴۰ء،ص ۱۴۹۔

۲؎ سہ ماہی"اردو" اورنگ آباد دکن، جولائی۔ستمبر،۱۹۳۶ء،ص ۴۶۵۔

۳؎ سہ ماہی"اردو" اورنگ آباد دکن، اکتوبر۔دسمبر،۱۹۲۱ء،ص ۶۴۰۔

مثال میں پروفیسر اے برانی کوف کے مقالے "اردو زبان میں فارسی عنصر" پر کیے جانے والے تبصرے سے اقتباس پیش کیا جا سکتا ہے :

"ان سب کو یہ کہہ دینا کہ اردو میں یہ عناصر فارسی سے مستعار لیے ہیں حقیقت کے خلاف ہے۔ جب ہم انیسویں صدی کے نصف اول کی اردو پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ اتنی ہندی نہیں جتنی فارسی ہے۔ فاضل پروفیسر نے اردو شعراء کے کلام سے کئی مثالیں دی ہیں اس کے بعد اُس نے نکات الشعراء سے میر تقی میرؔ کا قول ریختی کے متعلق نقل کیا ہے۔ ریختی کا لفظ اردو کے لیے ہندی یعنی غیر مخلوط زبان کے مقابلے میں استعمال کیا گیا تھا۔ درحقیقت وہ فارسی زبان تھی اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ریختی کے شاعر فارسی کے شاعر بھی تھے فارسی نے اردو کے بنانے میں اسی قدر کام کیا ہے جتنا ہندی نے اور یہ امر تاریخی واقعات سے پورے طور پر ثابت ہے۔ ایرانی بولیوں کے بولنے والے ہندوستان میں چھٹی صدی سے آباد ہیں۔ مغلوں کی حکومت میں فارسی دفتری اور درباری زبان تھی۔ اردو شاعری کے سارے ڈھنگ اور اس کا عروض اور اس کے اصطلاحات وغیرہ سب فارسی ہیں لہٰذا یہ امر قابلِ غور ہے کہ اردو ہندی کی ایک صورت ہے یا فارسی کی۔"[1]

مندرجہ بالا اقتباس میں مولوی عبدالحق نے نہایت احتیاط سے فاضل مقالہ نگار سے اختلاف کیا ہے اور ایک اور راستہ متعین کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اسی طرح حسرتؔ موہانی کی کتاب "متروکاتِ سخن" کے ایک باب پر بھی تبصرہ ملتا ہے۔ جس میں زبان سے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے :

"متروکات سخن : کتاب نکات سخن کا پہلا باب ہے اس میں اگرچہ مولانا حسرتؔ نے صرف ان متروکات کے ذکر کرنے کا دعویٰ کیا ہے، جو دوراوّل کے زمانے میں عام طور سے رائج تھے مگر ان میں کے بعض الفاظ دور دوم، سوم اور چہارم تک میں نظر آتے ہیں خیر یہاں تک درست تھا۔ لیکن غضب یہ کیا ہے کہ جو الفاظ اب تک لوگوں کی

---

[1] سہ ماہی "اردو"، اورنگ آباد دکن، جنوری۔ مارچ، ۱۹۳۰ء، ص ۱۷۰۔

زبانوں پر ہیں اور برابر استعمال میں ہیں ان کو بھی زبان سے متروک فرمادیا ہے یہ غالباً اساتذۂ لکھنؤ کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بعض جگہ مولانا حسرتؔ نے بڑی رواداری سے کام لیا ہے۔ مثلاً وہ 'مت' کو متروکات میں داخل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ ــــ 'حرف نہ میں ہ کی آواز خفیف بلکہ معدوم ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف مت کا تلفظ کامل ہوتا ہے۔ اور ضروریاتِ شعر کے لحاظ سے اس کا استعمال حرف نہ کے ناقص تلفظ کے مقابلے میں ناگزیر ہو جاتا ہے' ــــ چناں چہ اس بنا پر راقم حروف کے نزدیک مت کو فہرستِ متروکات میں داخل کرنا اس طرح سے مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ یہ کوئی معقول وجہ نہیں اس کا جواب زمانہ ہوا ایک صاحبِ ذوق یہ دے چکا ہے کہ 'شعر گفتن چہ ضرور'۔ اصل یہ ہے کہ ان دو لفظوں کے معنوں میں بھی فرق ہے اور 'نہ'، 'مت' کا کام نہیں دے سکتا۔"[۱]

مولوی عبدالحق کی تبصرہ نگاری میں نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی، پرانے لکھنے والوں کو اچھا لکھنے کی مسلسل ترغیب، اردو کی بہتر نشو و نما، قدیم کو جدید سے ملانے کی کوشش بہت واضح نظر آتی ہے۔ اس موقعے پر کبھی ان کے قلم میں گہری کاٹ، کبھی منصفانہ انداز، کبھی تعریفی طریقہ اور کبھی درگزر اور تاسف ملتا ہے۔ ان مواقع پر اکثر جگہ ان کے قلم میں بڑے خوب صورت پُر مزاح جملے بھی پڑھنے کو ملتے ہیں جو ان کے تبصروں میں شگفتگی پیدا کرتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کی کتاب یا ان کے کسی رسالے یا ان کی ترغیب پر کسی نے رسالہ یا کتاب لکھی تو مولوی صاحب اس پر ضرور تبصرہ تحریر کرتے تھے۔ گویا جب بھی خواجہ حسن نظامی کا ذکر آتا تحریر میں ایک مسکراہٹ کھیلنے لگتی تھی:

"رسالے کا پہلا مضمون خواجہ صاحب ہی کا ہے جس کا عنوان استانی کا دوسرا گھر ہے، یہ گویا اس رسالے کی تاریخ ہے اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ رسالہ خواجہ صاحب کا تھا اور وہ اور ان کی بیگم خواجہ بانو اس کے اڈیٹر تھے۔ مالی نقصان کی وجہ سے بند ہو گیا تھا (تعجب ہے) اب انھوں نے احمد وجودی صاحب کے حوالے

---

[۱] سہ ماہی "اردو"، اورنگ آباد دکن، اکتوبر۔ دسمبر، ۱۹۲۸ء، ص ۸۲۶۔

کر دیا ہے یہ ایسے نیک دل ہیں کہ انھوں نے استانی کا قرضہ بھی اپنے ذمے لے لیا ہے۔“[۱]

اسی طرح شوکت تھانوی کی کتاب ”شیش محل“ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :

” اِن کی ایمان داری میں شک نہیں مگر اُن کی نظر خطرناک ہے وہ بعض اوقات وہاں جا پہنچتی ہے جہاں ہر ایک کی ــــــ رسائی نہیں اور چھپی چوریوں کو شارع عام پر لے آتی ہے ۔ اب اس پر بے چارہ ادیب یا شاعر خفا نہ ہو تو کیا کرے ۔ کہنے والا سامنے ہو تو خیر وہ بھی ترکی بہ ترکی جواب دے یا اس کا منھ نوچ لے ۔ کتاب میں لکھا ہے تو کتاب ہی پر غصہ اتار سکتا ہے ۔ فرصت کے وقت پڑھنے کی اچھی چیز ہے“[۲]

مولوی عبدالحق کی طویل زندگی میں معاصرین کے ساتھ چشمکیں بھی رہیں ۔ یہ خود الگ سے ایک دل چسپ موضوع ہے ۔ لیکن طوالت سے بچنے کی وجہ سے صرف ایک مثال کے بعد ہم آگے بڑھتے ہیں ۔ ممتاز علی آہ کی تحریر کردہ سوانح ”امیر مینائی“ کے مقدمے پر رائے دیتے ہیں :

” مولوی عمادی کا مقدمہ پڑھ کر وہ مشہور فقرہ یاد آتا ہے کہ ’شعر مرا بہ مدرسہ کے برد‘ ۔ خوب بال کی کھال نکالی ہے اور عبث محنت کی ہے ،،[۳]

جس طرح مولوی عبدالحق نے حالی اور سر سید احمد خاں سے ادبی اور نظریاتی اثر قبول کیا اسی طرح عبدالحق سے بھی بہت سے لوگوں نے اثر قبول کیا ۔ ہم اگر صرف تبصرہ نگاری کے حوالے سے جائزہ لیں تو یہ بات بہت کُھل کر سامنے آتی ہے ۔

مولوی صاحب نے رسالہ ”اردو“ میں ہی تبصرے کیے جس میں ابتدائی دو سالوں کے بعد اور لوگوں کے بھی تبصرے شایع ہوتے تھے ۔ اگر رسالہ ”اردو“ کے تبصروں کو ایک تسلسل سے پڑھا جائے اور اگر درمیان میں کسی دوسرے شخص کا تبصرہ آ جائے تو یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ کسی اور کا تبصرہ ہے ۔ وہی زبان ، وہی اسلوب ، وہی مزاح ، وہی طنز ، وہی تنقیدی اور تحقیقی بحث کا انداز ملتا ہے ۔

---

[۱] سہ ماہی ”اردو“ ، اورنگ آباد دکن ، جنوری ۔ مارچ ، ۱۹۲۴ء ، ص ۱۶۷ ۔

[۲] سہ ماہی ”اردو“ ، دہلی ، اکتوبر ۔ دسمبر ، ۱۹۴۳ء ، ص ۵۴۳ ۔

[۳] سہ ماہی ”اردو“ ، دہلی ، اپریل ۔ جون ، ۱۹۴۲ء ، ص ۳۲۳ ۔

رسالہ اردو میں تبصرے کے لیے مخصوص حصے کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ دوسرے لوگوں کو تبصرے کے لیے کتاب خود مولوی صاحب منتخب کرکے دیتے تھے۔ "اردو کی نثری داستانیں" از گیان چند جین پر تبصرے کی ابتدا میں محمد سخاوت مرزا کہتے ہیں:

"ڈاکٹر عبدالحق صاحب مدظلہ بابائے اردو نے ہم کو بھی ایک نسخہ تحفۃً عطا فرمایا ہے اور اس پر لفظ برائے تبصرہ لکھا ہے۔"[1]

جس طرح مولوی عبدالحق تبصرے کے لیے کتابیں خود منتخب کرکے دیتے تھے اسی طرح تحریر کردہ تبصروں کی بھی نظرداری کرتے تھے۔ مولوی سعید انصاری کی ترجمہ کی ہوئی کتاب "آزادی" پر کسی صاحب نے فرضی نام "ی" سے تبصرہ کیا ہے۔ تبصرے کے آخر میں مولوی صاحب نے بھی نوٹ لگایا ہے:

"اس کتاب کا ترجمہ مدت ہوئی راجہ نرندر ونانھ صاحب نے کیا تھا، کیا اچھا ہوتا کہ مترجم صاحب اُسے دیکھ لیتے اگر اُس سے مقصد پورا ہو جاتا تو مناسب تغیر و تبدل کے ساتھ راجہ صاحب سے اجازت لے کر شایع کر دیتے اور اس زحمت سے بچ جاتے۔"[2]

مولوی صاحب نے طویل تبصرے بھی کیے اور مختصر بھی۔ دونوں طرح کے تبصروں میں وہ کتاب یا رسالے کی مکمل تلخیص پیش کرتے ہیں۔ جس سے کتاب لکھنے کا مقصد، اس کے مندرجات اور اُس کی اہمیت کا اندازہ قاری کر لیتا ہے۔ تبصرے کے دوران وہ کتاب کی ضخامت، کتابت، املا اور کتاب کی نظم و ترتیب پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ اگر ان کے تبصروں میں سے لسانی مباحث، تحقیقی و تنقیدی جائزے وغیرہ نکال بھی دیئے جائیں تو خالص تبصرہ پھر بھی مل جائے گا۔ اُن کے تبصرے معاصرین کے تبصروں کے مقابلے میں نمایاں فرق و امتیاز رکھتے ہیں۔

اس مختصر جائزے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مولوی صاحب کے تبصروں میں کتاب پر کتاب لکھنے کا رجحان نہیں پایا جاتا، وہ تبصرے کے فلیور کا ہر جگہ خیال رکھتے ہیں، تبصرے میں اختصار اور سادگی پائی جاتی ہے۔ ان کے تبصروں میں تبصرے کی ترقی یافتہ صورت ملتی ہے۔ یہ تبصرے ان

---

[1] سہ ماہی "اردو"، کراچی، اپریل۔جون، ۱۹۵۶ء، ص ۲۴۷۔

[2] سہ ماہی "اردو"، اورنگ آباد دکن، اپریل۔جون، ۱۹۲۲ء، ص ۳۴۶۔

علمی اور ادبی بصیرت کے آئینہ دار ہیں اور ان میں تعلّی نہیں پائی جاتی۔

یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر بابائے اردو مولوی عبدالحق بے لاگ تبصرہ نگار کہلائے اور بلاشبہ وہ ایک عہد ساز تبصرہ نگار ہیں۔ انھوں نے اُردو تبصرہ نگاری پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

کتابیات

کتب:

۱۔ مولوی عبدالحق: "چند تنقیداتِ عبدالحق"، دہلی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۹ء۔

۲۔ مولوی عبدالحق: "تنقیداتِ عبدالحق"، طبع چہارم، لاہور، ایسٹرن بک اسٹال، ۱۹۴۵ء۔

۳۔ مولوی عبدالحق: "ادبی تبصرے"، لکھنؤ، دانش محل، ۱۹۴۷ء۔

رسائل:

۱۔ رسالہ "اردو"، سہ ماہی، ۱۹۲۱ء تا ۱۹۶۵ء۔

۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری: مضمون بعنوان "بابائے اردو بحیثیت تبصرہ نگار"، مشمولہ ماہ نامہ "قومی زبان"، کراچی، اگست ۱۹۸۲ء۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

مولانا عبدالحق اور تحقیقی تدوین

مولانا عبدالحق کے قلم نے جن مختص ادبی خطوط پر جادہ پیمائی کی ہے اور جہاں کے تحریری آثار و نقوش رہنما روشنیوں کی طرح آگے بڑھتے نظر آتے ہیں اُن میں بعض نہایت اہم تذکروں کی بازیافت اور ادبی دنیا سے متعارف کرانے کی سعیِ مشکور کا خصوصیت سے ذکر کیا جا سکتا ہے۔

یہ تذکرے شمالی ہند میں شعرائے اردو کے ابتدائی تذکروں میں ہیں اور اردو شعر و سخن کے اُس دورِ ارتقا کے بارے میں معلومات کے بیش مستند مآخذ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اُن میں "عقد ثریا" فارسی گو شعرا سے متعلق ہے لیکن اس عہد کے سلسلے میں دید و دریافت کے نقطۂ نظر سے اس کی افادیت بھی ایک عصری دستاویز کی سی ہے۔

یہ تذکرے اُس اہم ادبی و تاریخی ماحول کی بازدید میں معاون ہوتے ہیں، شعر و سخن کے ادواری محرکات کی لسانی و ادبیاتی تفہیم اور شعری و شعوری رویوں کی شناخت میں بھی مددگار ہوتے ہیں۔ مولانا نے نہ صرف یہ کہ ان اوراقِ پارینہ کو نئی زندگی اور پایندگی بخشنے کی کوشش کی بلکہ اُن کی اور ان کے مصنفین کے لیے تعارفی نگارشیں بھی بصورت مقدمہ یا دیباچہ تحریر فرمائے۔ تحقیق و تنقید کا ایک مرحلہ کسی متن یا تصنیف کا تنقیدی و تحقیقی زاویۂ نگاہ سے تعارف بھی ہے۔

تحقیق کا منظرنامہ قوسِ قزح کے نیم دائرے کی طرح ہفت رنگ ہے۔ اس میں تعارف متنی تنقید، تصحیحِ متن، تاریخِ متن تحشیہ اور تحقیق نامہ غرض بہت سے علمی اور ادبی نوعیت کے کام آئے۔ جن کی معیار گیری اور جن پر نظر داری کے بغیر تحقیقی نوعیت کے کام ادھورے نظر آتے ہیں۔ لیکن ان میں سے معروضی نقطۂ نظر کے ساتھ ہو جائے وہ بعد میں آنے والوں کے لیے نشانِ راہ اور چراغِ نقشِ پا کی طرح منزل نمائی کرتے ہیں۔ مولانا کے کام کو بھی اسی معیار سے پرکھنا شاید زیادہ مناسب ہوگا۔

مولانا نے جو مقدمہ لکھے ہیں۔ وہ اُن کی طرف سے انجام دیے جانے کار تدوین کے ذیل میں جیسے

متنی "تنقید" کہنا چاہیے کلیدی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان مقدموں سے مولانا کے تحقیقی مطالعہ، تنقیدی زاویۂ نگاہ اور تدوینی طریقِ کار کی معیار شناسی میں بڑی مدد ملتی ہے۔

مولانا کے مرتب کردہ تذکروں میں اگر ہم تذکرۂ ریختہ گویاں کا ذکر کریں تو بیجا نہ ہوگا۔ یہ تذکرہ سنہ ۱۱۶۶ھ میں ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کے مصنف فتح علی حسینی گردیزی کا اس تذکرہ کی تالیف کے ماسوا ادبیاتِ اردو سے کوئی خاص تعلق نہیں رہا اور ایک مرتبہ اس کی تسوید و تحریر سے فراغت پانے کے بعد مصنف نے اُس کے ترجموں میں ترمیم و اضافے کے عمل کو جاری نہیں رکھا۔ جس کی وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ نظرثانی اور باز فکری (After Thought) کے اثرات سے بھی آزاد رہا جب کہ اردو کے متعدد تذکروں کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔

اس کے مقدمے میں مولانا نے مصنف کے بارے میں معلومات کی فراہمی اور مصادر کی نشان دہی سے متعلق تفکر و تجسس کی ایک اچھی مثال پیش کی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ میر قدرت قاسم کے اشعار اور ان کے تذکرے مجموعۂ نغز کے بعض حوالوں سے جس طرح اس سلسلے کی کڑیوں کو جوڑا ہے وہ بہت ہی مستحسن کوشش ہے۔ اور اس نوع کی استفادہ کاری کے لیے ایک عمدہ نمونہ قرار دی جا سکتی ہے۔

لیکن جہاں تک مولانا کی بعض مواقع پر تنقید یا تبصرہ کا تعلق ہے۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ مولانا جیسے کسی محقق اور ادبی نقاد سے جس سلامت روی کی بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے، اس کا جھکاؤ جنبہ داری اور سوگیری کی طرف ہے۔

مولانا کے تبحر علمی کی اس رویہ سے بھی نفی نہیں ہوتی لیکن تقریر کی طرح تحریر کا بھی اپنا ایک بھرم ہوتا ہے وہ قائم نہیں رہتا۔ چناں چہ مولانا نے گردیزی پر جو تنقید کی ہے۔ وہ اسی عدم توازن کا شکار نظر آتی ہے:

> "اُس نے اپنے سارے تذکرے میں کہیں کسی تذکرہ کا حوالہ نہیں دیا یہاں تک کہ خان آرزو پر خاکسار اور سودا کے حالات میں اُن کے تذکروں کا مطلق ذکر نہیں کیا البتہ قرائن سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ میر کا تذکرہ اس کی نظر سے ضرور گزرا ہے اور دیباچہ میں جو اُس نے تذکرہ نویسوں کے خلاف زہر اگلا ہے۔ اس کا ہدف کتاب الشعرا ہی ہے۔"

مولانا اپنے اس فاضلانہ مقدمہ میں خود ہی جب یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ خاکسار، سودا اور امام الدین کے تذکرے

ہنوز دستیاب نہیں تو پھر قیاس یا قرائن کو اتنا درجۂ اعتبار دینا کس حد تک قرین انصاف ہے گردیزی نے جو زہر اگلا ہے وہ دراصل میر کے خلاف ہے۔

خاکسار کے تذکرہ "بنام معشوق چہل سالۂ خود" کہہ کر میر نے جو پھبتی کسی ہے وہ اپنی جگہ پر لیکن اس کے ماسوا بھی کیا یہ واقع ہے کہ میر نے خاکسار کے رویہ کا اپنے تذکرہ میں مذاق اڑایا ہے، جس کے معنی کہ خاکسار کی معاصرانہ روشں خود میر کے نزدیک پسندیدہ نہ تھی۔ اور اس وقت نکات الشعراء کی جو روایت سامنے ہے اس سے پیشتر یہ روایت قاسم کے بیان کی روشنی میں اپنے لب ولہجہ کے اعتبار سے کچھ اور رہی تھی "ولی شاعریست از شیطان مشہورتر"، ایسی ناگوار گزرنے والی باتیں میر صاحب کی زبانِ قلم پر بھی۔

ایسی صورت میں کہ اس وقت معاصرانہ چشمکیں تذکروں کی عبارت و اشارت پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔ یہ کیسے مان لیا جائے کہ یہ زہر میر ہی کے خلاف اگلا گیا ہے۔

علاوہ بریں مولانا کا یہ بھی خیال ہے کہ میر نے اپنے معاصرین کے بارے میں جو رائیں دی ہیں وہ آزادانہ ہیں اور اُن کی بنیاد حق گوئی پر ہے۔ جس کا اندازہ مولانا کی اس عبارت سے ہوتا ہے۔

میر صاحب پہلے تذکرہ نویس ہیں جنھوں نے صحیح تنقید سے کام لیا ہے اور جہاں کوئی سقم نظر آیا ہے وہاں بے رو و رعایت اس کا اظہار کر دیا ہے اور ہر شاعر کے متعلق جو ان کی رائے ہے۔ اس کے ظاہر کرنے میں انھوں نے مطلق تامل نہیں کیا۔

شعرا کے درمیان گروہ بندیوں اور تذکرہ نگاری کے محرکات میں اُن کے اثر و نفوذ کے تاریخی عمل سے مولانا بخوبی آگاہ ہیں۔ اس پر بھی میر کے دفاع میں وہ بے تکلف یہ کہہ جاتے ہیں؛

"میر کی شان اس سے بہت ارفع تھی۔ وہ کسی جتھے سے تعلق نہیں رکھتے۔ علاوہ اس کے میر صاحب نے حالات کے بیان کرنے میں بھی تا بہ مقدور صحت سے کام لیا ہے۔

[آگے چل کر مولانا نے دبی زبان سے اس کا بھی اقرار کر لیا ہے کہ]

بعض اور اصحاب کی طرح گردیزی کو بھی یہ بات ناگوار گزری کہ اس کے بعض دوستوں پر میر صاحب نے بے باکی سے نکتہ چینی کی تھی یا اُن کی طرف سے بے التفاتی کی۔"

یہ اور اس طرح کے بعض دوسرے بیانات سچ یہ ہے غیر جانب دارانہ تنقید سے (گاہ گاہ) بہت دور جا پڑتے ہیں۔

مولانا کی طرح معروضیت سے وقتی طور پر ہی سہی کنارہ گیری کسی بھی متنی نقاد کے لیے خوش آیند بات نہیں ہے۔ میر کی شخصیت تعصب و تنافر سے بلند تھی یا نہیں۔ مولانا کو تو اس سے بہر حال بلند ہونا چاہیئے تھا۔

ممکن ہے کہ اسی نوع کے پیچ بیچاک ہیں کچھ دیر یا کچھ دور تک الجھنے کے باعث ہی شاید مولانا ایک متنی نقاد کی حیثیت سے یہ فرائض انجام نہ دے سکے کہ وہ اس تذکرہ کے قلمی نسخوں کا تعارف کراتے اور یہ بتلاتے ہوئے گزرتے کہ ترتیب اور تدوین کی روایت کے لیے ان قلمی نسخوں کی اہمیت کیا ہے۔ حواشی کا اہتمام بھی مولانا کے یہاں برائے نام ہے اشاریہ بھی نہیں جو حواشی یا اضافات کے ذیل میں ضرور آنا چاہیئے۔

مخزن نکات کی روداد میں تو یہ بات بھی شامل ہے کہ اُس کی روایت کو مولانا نے نہیں ایڈٹ کیا چنانچہ اس کی اشاعت اول کے آخری صفحہ پر جو اندراجات تھے انھیں دوسرا کاغذ چپکا کر قارئین کی نگاہوں سے چھپا دیا گیا تھا۔ اور اس اشاعت کے نسخوں میں یہ صورتِ حال ملتی ہے۔ تذکرہ نکات الشعرا کے مقدمہ کے صفحات بلکہ سطور میں بھی تقریباً وہی مباحث بزبانِ قلم پیش کیے گیے ہیں۔ جو ریختہ گویان پر دیباچہ نگاری کے وقت مولانا کے پیشِ نظر رہے ہیں، جس کی وجہ سے ان تحریروں پر دہرانے کے عمل کا اطلاق بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہ

اگرچہ مختصر ہے لیکن اس میں عموماً اور اکثر شعرا کے کلام پر منصفانہ اور بے باکانہ تنقید پائی جاتی ہے۔ یہ بات دوسرے تذکروں میں نظر نہ آئے گی۔

یہ قیاس یا پھر یہ کہ بالکل بجا ہے کہ نکات الشعرا کا سنہ تالیف ۱۱۶۵ھ ہے۔ اور چوں کہ گردیزی نے اپنا تذکرہ میر صاحب ہی کے جواب میں لکھا ہے۔ قیاس کو یقین کا درجہ دینا ایک محقق یا مرتب کے لیے جائز حدود کو توڑنے کے مترادف ہے۔ یہی صورت اُن نکات کے بارے میں مولانا کے ذہن پر مرتسم ہے۔ جو میر نے اپنے تذکرہ کے آخر میں "انداز" کے عنوان سے سپردِ قلم کیے ہیں۔ جب کہ میر کے قلم سے ان کا ذکر کچھ اس انداز کے ساتھ آیا ہے جیسے چلتے چلاتے ایک بات کہی گئی ہو اور گردیزی کے یہاں ان کی حیثیت علمی بیان اور ادبی افکار کی سی ہے۔

معاصرین کے یہاں علمی اندازِ نظر اور عصری میلانات کا پرتو آجانا۔ ایک قرین امکان بات ہے اس میں تقدیم و تاخیر کا فیصلہ مبہم صورتِ حال کی موجودگی میں آسان نہیں۔ جب کہ بنیادی روایت میں بسا اوقات ترمیم و اضافہ کا عمل جاری رہتا ہے اور میر کے یہاں ایسا ہوا بھی ہے کہ تذکرہ کی موجودہ روایت بازفکری

اور بازنگاری کے مراحل سے گزری ہے۔

بایں ہمہ میر نے جزئی جزئی باتوں اور داخلی شہادتوں پر نظر داری سے مولانا نے اخذ نتائج کا جو کام لیا ہے وہ مولانا کی علمی بصیرت کی طرف اشارہ سنج ہے۔

تذکروں میں مصحفی کا "تذکرۂ ہندی گویا" اور "عقدِ ثریا" مولانا کی نگاہوں سے مزین ہیں۔ ان میں مصحفی کے سوانح وسیرت پر مولانا نے جو نظر ڈالی ہے اس میں بھی یک رنگی ویکسانیت کے پہلو موجود ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ایک مقدمہ دوسرے مقدمہ کی تحریر کے وقت سامنے رہا اور استفادہ کی صورت نمایاں ہوتی گئی۔

سوانحی کوائف کی بات تو الگ ہے کہ ان میں اشتراک فطری امر تھا۔ لیکن فارسی شاعری اور اس کے تہذیبی محرکات وعوامل پر گفتگو اور دورِ زندگی میں ہندوستانی فارسی گوشعرا کے جو تذکرے لکھے گئے تھے ان سے استفادہ اور تقابلی اندازِ نظر کے ساتھ مصحفی کے کام کی طرف بھی ذہن منتقل ہونا چاہئے تھا کہ یہ موضوع گفتگو پر علمی تقاضے کا حصہ تھا لیکن مولانا کے یہاں نظر انداز ہو گیا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ فکر و نظر کے دائرے الگ ہونے کے باوصف مقدمہ کے صفحات وہی رہے۔

ڈاکٹر کاظم علی خاں

علی گڑھ۔ بابائے اردو کے سفرِ حیات کی ایک اہم منزل

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی زندگی کی داستان میں علی گڑھ ایک اہم عنوان کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولوی صاحب "نام ورانِ علی گڑھ" کی اُس سنہری زنجیر کی ایک اہم کڑی تھے جس کو ڈھالنے اور بنانے میں سرسید کی علی گڑھ تحریک کی ٹکسال کا کھرا سونا استعمال ہوا تھا۔ جن "نام ورانِ علی گڑھ" نے اپنے یادگار کارنامے سے علم و فن اور شعر و سخن کی وادیوں میں قدم قدم پر چراغ روشن کیے ہیں اُن میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کا نام ممتاز مقام رکھتا ہے۔

مہد سے لحد تک بابائے اردو کے عہد کی زمانی تحدید ۱۰ مارچ ۱۸۷۰ء سے ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء تک کی ۹۱ سالہ درمیانی مدت ہوتی ہے[1] اور مولوی صاحب کی اس ۹۱ سالہ داستانِ حیات میں مکانی اعتبار سے جو دیار و امصار اہم عنوان کی حیثیت رکھتے ہیں اُن میں قصبہ ہاپڑ (ضلع میرٹھ)، فیروز پور (پنجاب)، علی گڑھ، حیدرآباد، اورنگ آباد، دہلی اور کراچی (پاکستان) کے نام شامل ہیں[2]۔ زمان و مکان کے لحاظ سے مولوی عبدالحق کی ۹۱ سالہ زندگی کی اس داستان کے بیان میں سرزمین علی گڑھ پر اُن کے قیام کا عنوان زمانی اعداد و شمار کے اعتبار سے ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۵ء تک اگرچہ سات برس کی مدت سے زیادہ نہیں جو ان کی ۹۱ سالہ طویل زندگی کا محض تیرہواں حصہ ہوتا ہے لیکن قیام علی گڑھ کا یہ عنوان مولوی صاحب کی داستانِ زندگی کے تقریباً تمام یادگار کارناموں کے لیے اہم ترین بنیادی محرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم نے اس مقالے میں اپنے اسی اجمالی بیان کی تفصیل و تفسیر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ادبی، علمی اور عملی زندگی کی نشو و نما میں سرسید کی علی گڑھ تحریک نے جو یادگار کردار ادا کیا ہے اس کے تجزیاتی جائزے کے نقطۂ آغاز کی تلاش میں جب ہم نے مولوی صاحب کے صحیفۂ حیات کی ورق گردانی کی تو یہ انکشاف ہوا کہ مولوی عبدالحق اپنے قیامِ علی گڑھ سے قبل ہی سرسید

اور ان کی علی گڑھ تحریک سے ذہنی اور قلبی طور پہ وابستہ ہو چکے تھے۔ مولوی عبدالحق کا درجِ ذیل تحریری بیان ہماری اِس بات کا اثبات کرنے کے لیے ایک مضبوط ثبوت ثابت ہوتا ہے:

"میں نے جب ہوش سنبھالا تو مسلمانوں۔۔۔۔ (کے) دیوان خانوں میں۔۔۔ کسی نہ کسی طرح علی گڑھ کالج یا سید احمد خاں کا ذکر نکل آتا۔ سید احمد خاں اُس زمانے میں مسلمانوں کے ہر طبقے میں موضوعِ بحث تھے۔ اُن کی نسبت کفر و الحاد کا فتویٰ تو عام تھا۔۔۔ کوئی کہتا گردن مروڑی مُرغی کھاتا ہے اور حلال حرام میں کچھ فرق نہیں کرتا کوئی کہتا اُس نے اپنا سر بیچ دیا ہے، مرنے کے بعد انگریز اُس کا سر لے جائیں گے۔۔۔ یہ سب کچھ تھا لیکن اتنی بات ضرور تھی کہ اُن کی دانش مندی کے سب قائل تھے۔۔۔ میں یہ واہی تباہی سنتا رہتا تھا، کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا، اتفاق سے ایک روز میرے ایک ہم جماعت مجھے اپنے گھر لے گئے۔ وہاں میں نے (سید احمد خاں کے رسالے) تہذیب الاخلاق کے پرچے دیکھے اور پڑھنے شروع کیے۔ اس میں ایسا دل لگا کہ اس کے بعد میں اُن سے پرچے مانگ لاتا اور پڑھتا رہتا۔ اب میری آنکھیں کھلیں کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ تہذیب الاخلاق کا مطالعہ مجھے کھینچ کر علی گڑھ لے گیا اور میں (علی گڑھ) کالج کے اسکول میں داخل ہو گیا۔۔۔۔۔"[۳]

مولوی عبدالحق کا یہ بیان خود بتاتا ہے کہ سرسید کی علی گڑھ تحریک سے مولوی صاحب کی وابستگی ہی دراصل ان کے قیامِ علی گڑھ کا سبب بنی تھی۔ ہمارے نزدیک علی گڑھ تحریک سے بابائے اردو کی ابتدائی ذہنی قربت اُن کے قیامِ علی گڑھ کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اُن کا قیامِ علی گڑھ خود علی گڑھ تحریک سے اُن کی ذہنی وابستگی کا نتیجہ تھا۔ گویا مولوی عبدالحق اپنے قیامِ علی گڑھ سے قبل ہی سرسید کی علی گڑھ تحریک سے ذہنی طور پر وابستہ ہو چکے تھے۔

علی گڑھ میں مولوی عبدالحق ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۵ء تک محض سات سال رہے تھے۔[۴] بعض اہلِ قلم کا یہ اندراج نظرِ ثانی کا محتاج ہے کہ عبدالحق دسواں درجہ (یعنی انٹرنس) پاس کر کے علی گڑھ آئے تھے۔[۵] خود عبدالحق نے بہ تکرار لکھا ہے کہ وہ علی گڑھ کالج کے اسکول میں داخل ہوئے تھے اور علی گڑھ کالج کے اسکول سے انٹرنس پاس کر کے کالج کی جماعتوں میں پڑھتے تھے۔ مولوی عبدالحق نے اپنے قیامِ علی گڑھ کے حالات میں یہ بھی لکھا ہے کہ: "انٹرنس (یعنی دسویں درجے) میں سیٹھ یعقوب حسن

میرے ساتھ پڑھتے تھے"۔ مولوی صاحب کے یہ تمام بیانات ثابت کرتے ہیں کہ انھوں نے دسواں درجہ علی گڑھ کالج کے اسکول ہی سے پاس کیا تھا۔ علی گڑھ میں مولوی عبدالحق کے سلسلۂ تعلیم کی سنہ وار تخمینی توقیت کا درجِ ذیل گوشوارہ بھی ہمارے دعوے کے لیے ایک دل چسپ و مفید "شماریاتی شہادت" (Statistical Evidence) فراہم کرتا ہے۔

درجہ	تعلیمی سال
۱۔ نہم	۱۸۸۸-۸۹ء
۲۔ دہم	۱۸۸۹-۹۰ء
۳۔ یازدہم	۱۸۹۰-۹۱ء
۴۔ دوازدہم	۱۸۹۱-۹۲ء
۵۔ بی۔ اے (پہلا سال)	۱۸۹۲-۹۳ء
۶۔ بی۔ اے (آخری سال)	۱۸۹۳-۹۴ء

دانش گاہِ علی گڑھ کے معتبر و مستند راوی پروفیسر رشید احمد صدیقی کا یہ بیان کہ مولوی عبدالحق نے علی گڑھ کالج سے ۱۸۹۴ء میں بی۔ اے کیا تھا ہمارے پیش کردہ گوشوارے کے اندراجات کی تائید کرتا ہے[۲۵]

عبدالحق ۱۸۹۴ء میں بی۔ اے پاس کر کے ۱۸۹۵ء تک جب علی گڑھ میں مقیم رہے تھے وہ اپنی ارتقائی تاریخ کی کس منزل میں تھا۔ اس امر کا جائزہ لینا ہمارے مقالے کے موضوع کے لیے وہ ناگزیر پہلو ہے جس سے پہلوتہی کرنا نہ صرف مقالے بلکہ سامعین کے ساتھ بھی ناانصافی کرنے کے مترادف ہوگا۔ علی گڑھ میں ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۵ء تک عبدالحق کے سات سالہ قیام کا زمانہ سرسید کی علی گڑھ تحریک کی تاریخ کا وہ یادگار دور تھا جب یہ تحریک تصورات و نظریات کی سرحدوں سے گزر کر تعمیر و تشکیل کے ایک سنہرے عملی دور میں داخل ہو چکی تھی۔ سرسید کا انقلاب آفریں مجلہ تہذیب الاخلاق اپنے دو ابتدائی ادوار پورے کر کے "جریدۂ عالم" پر اپنے نام کے دوام کی مُہر ثبت کر چکا تھا۔ سرسید کے خوابوں کی تعبیر مدرسۃ العلوم علی گڑھ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو اپنے افتتاح کے بعد یکم جون ۱۸۷۵ء سے درس و تدریس کے کام کا آغاز کر کے ۸ جنوری ۱۸۷۷ء تک مدرسے سے ترقی کر کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (

(M.A.O. College) علی گڑھ کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اواخر جولائی ۱۸۷۶ء میں سر سید اپنی سرکاری ملازمت سے سُبک دوش ہو کر بنارس سے مستقل قیام کے لیے سر زمین علی گڑھ پر آ بسے تھے۔ ۱۸۸۶ء میں علی گڑھ میں سر سید کی بنا کردہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس بھی وجود میں آ چکی تھی۔ مئی ۱۸۸۸ء میں جب سر سید اپنی گراں قدر اصلاحی اور تعلیمی خدمات کی بدولت حکومتِ وقت سے K.C.S.I کا خطاب پا چکے تو عبدالحق اسی سال (۱۸۸۸ء میں) دیارِ علی گڑھ میں وارد ہوئے تھے[۹]

عبدالحق نے دیارِ علی گڑھ میں ۱۸ سال کے سن سے ۲۵ برس کی عمر تک کا جو یادگار زمانہ گزارا وہ سر سید کی علی گڑھ تحریک کے نقطۂ عروج (CLIMAX) کا دور تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یہ تحریک فکر و نظر کی تخم ریزی کی منزلوں سے گزر کر برگ و بار لانے کے دور سے ہم کنار ہو رہی تھی۔ سر زمینِ علی گڑھ پہ سر سید اور ان کے ہم نوا جدید ہندوستان کی تشکیل اور ایک نئی ذہنی تاریخ کی تحریر و تکمیل کے تاریخی کام میں سرگرمِ عمل تھے۔ دیارِ علی گڑھ میں نوجوان عبدالحق کی نظروں کے سامنے سر سید کی انقلاب آفریں اور عہد ساز تحریک کے زیرِ سایہ بطنِ تاریخ سے ایک نیا ہندوستان ابھر رہا تھا۔ ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ میں سر زمینِ علی گڑھ پر ذہنی بیداری اور روشن خیالی کا جو ایک نیا باب لکھا جا رہا تھا وہ اپنے دامن میں کن عہد آفریں انقلابات کو لیے ہوئے تھا ذرا اس پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔[۱۰]

سر سید اور اُن کی علی گڑھ تحریک نے ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کو بروے کار لانے کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کو سائنسی ایجادات کی برکتوں، روشن خیالی اور ذہنی بیداری کی نعمتوں سے مالا مال مغرب کی کروٹیں لیتی ہوئی نئی زندگی سے (جو تاریخی قوتوں کی بدولت ہندوستان کا بھی مستقبل بننے والی تھی) روشناس کرا کے قدامت پسند اور ماضی پرست ہندوستانی مسلمانوں کو مستقبل کا استقبال کرنے کا حوصلہ دے کر جو تاریخ ساز و عہد آفریں نقیبانہ بلکہ "پیمبرانہ" کردار ادا کیا وہ ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کے اسباب و محرکات کی تاریخ کا ایک نہایت اہم تاب ناک باب ثابت ہوتا ہے۔ سر سید نے ۱۸۵۷ء کے بحران کے بعد ہندوستان میں اپنے امتحانی اور بحرانی دور کے نازک تقاضوں کو سمجھا اور ہندوستانی مسلمانوں کو اُن کی مایوسی، بے عملی، ماضی پسندی، قدامت پرستی، فرسودگی، ذہنی خوابیدگی، دینی بے اعتدالی، توہم پرستی، اخلاقی زبوں حالی، سماجی بے راہ روی، اقتصادی بدحالی، تعلیمی پس ماندگی اور تقلید پروری

کے مریضانہ تاریک نہاں خانوں سے نکال کر اُن کے ان تمام مہلک امراض کے موثر علاج کے لیے علی گڑھ تحریک کا کارگر نسخہ، تیار کیا جو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اُس فوری اور ضروری طبی امداد (First AID) کی حیثیت رکھتا تھا جس سے مریض کی جان بچائی جاتی ہے۔ ذرا غور تو کیجیے کہ سرسید اور اُن کی علی گڑھ تحریک نے ہندوستانی مسلمانوں کو زوال کی پستی کے کس مقام سے کمال کی بلندی کی کس منزل تک پہنچا دیا اور اُن کا رخ کس جانب سے کس طرف موڑ دیا:

- فکر و نظر کی مایوسی و پژمردگی سے قلب و ذہن کی تازگی و بالیدگی کی سمت ۔۔۔!
- بے مقصد سستی اور بے عملی سے با مقصد چستی اور کامیاب کارکردگی کی طرف ۔۔۔!
- ماضی پسندی، قدامت پرستی و فرسودگی کے جمود سے مغرب کی اُس رواں دواں، متحرک اور فعال نئی زندگی کی جانب جو مستقبل میں ہندوستان کا مقدر بننے والی تھی ۔۔۔!
- ذہنی خوابیدگی سے بیدار مغزی کی طرف ۔۔۔!
- مذہبی بے اعتدالی اور توہم پرستی سے مذہبی رواداری اور عقلی و منطقی حقیقت پسندی کی جانب!
- اخلاقی زبوں حالی اور سماجی بے راہ روی سے صحت مند اخلاقی اور سماجی قدروں کی سمت!
- اقتصادی بدحالی، معاشی تنگ دستی اور تعلیمی پس ماندگی کے زوال سے معاشی خوش حالی اور علمی ترقی کے کمال و اقبال کی طرف ۔۔۔!
- تقلید پروری سے تجدید پسندی کی جانب ۔۔۔!

سرسید کی اسی علی گڑھ تحریک کے سایے اور سرسید کی سرپرستی میں نوجوان عبدالحق نے علی گڑھ کالج میں ۱۸۸۸ء تا ۱۸۹۵ء کے دوران ۱۸ سال کے سن سے ۲۵ برس کی عمر تک اپنا جو یادگار تعلیمی اور تربیتی دور گزارا اس کے دیرپا اور دور رس اثرات کے گہرے نقوش کی تابندگی بابائے اردو مولوی عبدالحق کی شاہ راہِ زندگی کی ہر اہم منزل میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ علم و دانش کی روشنی اور ریاضت و عمل کی سرگرمی اور گہما گہمی سے معمور دیارِ علی گڑھ کی سرزمین نوجوان عبدالحق کی حیات و شخصیت کی تشکیل و تکمیل کے لیے ایک ایسی تربیت گاہ ثابت ہوئی جس میں پروان پا کر ضلع میرٹھ کے ہاپڑ جیسے غیر اہم قصبے کا عبدالحق جیسا ۱۸ سالہ غیر معروف قصباتی نوجوان "بابائے اردو مولوی عبدالحق" بن کر علم و ادب کے میدان میں اپنی زبردست خدمت کی بدولت عالم گیر شہرت کا مالک بنا تھا۔

مولوی عبدالحق سرسید کے زیرِ نگرانی علی گڑھ میں نہ صرف پڑھے بلکہ کڑھے بھی تھے۔ انھوں نے دورانِ تعلیم علی گڑھ کالج کی تاریخ میں وہ دور پایا تھا جب علی گڑھ کی سرزمین علم و دانش اور شعر و ادب کے میدانوں کی سربرآوردہ و قد آور علمی و ادبی ہستیوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب سرسید، حالی، شبلی، مولوی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، وقار الملک، محسن الملک، عماد الملک نواب سید حسین بلگرامی، شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی، مولوی چراغ علی، مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی اور جسٹس کرامت حسین کی سبھی منتخب روزگار ہستیاں علی گڑھ تحریک کی ہم نوائی اور علی گڑھ کالج کی آبیاری کے لیے مستعد و موجود تھیں۔[۱۱] خود مولوی عبدالحق کے الفاظ میں "یہ وہ ہستیاں تھیں جن ..... میں پارس پتھر کی خاصیت تھی۔ کوئی ہو، کہیں کا ہو، ان سے چھوا نہیں اور کندن ہوا نہیں ....."[۱۲]

مولوی عبدالحق کی طبیعت میں محنت اور لگن سے ہر کام سرانجام دینے اور ہر کارآمد کام کو سیکھنے کی صلاحیت موجود تھی، علی گڑھ میں ان "پارس صفت" بزرگوں کی صحبت ان کے لیے سونے پر سہاگا ثابت ہوئی۔ مولوی صاحب میں اچھی باتوں اور عمدہ عادتوں کو سمجھنے اور سیکھنے کے لیے جو زبردست قوتِ مشاہدہ تھی اس کا اظہار ان کے لکھے ہوئے ان خاکوں میں ہوتا ہے جو بہترین انسانی عادات اور اخلاقی اقدار کے قابلِ تقلید عملی نمونوں کا حسین و دل نشین نگارخانہ معلوم ہوتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے علی گڑھ میں سات سالہ قیام کے دوران اپنے سفرِ حیات کے لیے زادِ راہ کا جو ساز و سامان حاصل کیا وہ ان کی آنے والی زندگی کی ہر اہم منزل میں قدم قدم پر ان کا رفیقِ سفر بنا رہا۔ مولوی صاحب نے علی گڑھ میں جو کچھ دیکھا، جو کچھ سیکھا اور جو کچھ پایا اس کی تفصیل کے لیے دفتر درکار ہوں گے۔ اگر ایجاز کے اعجاز کی اجازت ہو تو بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ بابائے اردو علی گڑھ کالج کی چلتی پھرتی، بولتی جالتی اور جیتی جاگتی تاریخ تھے۔ انھوں نے علی گڑھ جیسے معمولی شہر کو علم و فن اور شعر و سخن کا زبردست مرکز بنتے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ علی گڑھ کالج کے متعدد عالی شان علمی ایوان کی تعمیر و تکمیل کے عینی شاہد اور معتبر راوی تھے۔ مولوی عبدالحق نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں علی گڑھ کالج، سرسیّد اور ان کی علی گڑھ تحریک کے نامور ہم نواؤں کے آنکھوں دیکھے "یا کانوں سنے" حالات، واقعات و حکایات کو جس لطف و تفصیل سے بیان کیا ہے

اس پر یہ مثل صادق آتی ہے: ع

"لذیذ بود حکایت، دراز تر گفتم"

مولوی عبدالحق برسوں تک سرسید کی صحبت سے فیض یاب رہے ۔ سرسید سے اپنی قربت کے ضمن میں مولوی صاحب نے جو متعدد قابلِ ذکر واقعات بیان کیے ہیں ان میں سے بعض کا ذکر یہاں دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مولوی عبدالحق تقریباً ڈیڑھ سال تک سرسید کی میز پر شام کو شریک طعام ہونے کا شرف رکھتے تھے[۱۳] مولوی صاحب کو علی گڑھ میں سرسید کے گراں قدر و نادرالوجود کتب خانے میں رسائی کے بھی موقعے ملتے رہتے تھے جو بابائے اردو کے علمی اور ادبی ذوق کی آب یاری میں معاون ثابت ہوئے[۱۴] بابائے اردو نے بعد میں اپنے ذاتی اور انجمن ترقی اردو کے کتب خانوں کے لیے مطبوعات و مخطوطات کا جو زبردست علمی و ادبی ذخیرہ جمع کرنے کا کام کیا تھا اس کام میں بھی شاید سرسید کے اسی کتب خانے کی تقلید کا کرشمہ شامل ہو۔ سرسید کو جب علی گڑھ کالج کے لیے یونی فارم (Uniform) کا خیال آیا تو انھوں نے خود کپڑا خریدا اور یونی فارم سلوا کر عبدالحق کو اس غرض سے پہنوائی کہ کالج کے دوسرے طلبہ بھی اس یونی فارم کو دیکھ کر پسند کریں اور اسے سلوا کر استعمال کریں ۔ گویا عبدالحق نے سرسید کے علی گڑھ کالج کی یونی فارم کے لیے موجودہ اصطلاح میں ماڈلنگ (Modelling) کا کام بھی سرانجام دیا تھا[۱۵] سرسید نے نوجوان طالب علم عبدالحق کو علی گڑھ کالج کی یونی فارم کے سلسلے میں ماڈل (Model) یا مثالی نمونہ" بنانے کے لیے جو منتخب کیا اسے ہم سرسید کی نظرِ انتخاب کا ایک ایسا یادگار کرشمہ و کارنامہ قرار دیتے ہیں جو علامتی اعتبار سے عبدالحق کے حالات و کمالات کے لیے بہترین عنوان بنا اور بابائے اردو مولوی عبدالحق اپنی آنے والی زندگی میں واقعی علی گڑھ کالج کی "پیداوار" (Product) کا بہترین "مثالی نمونہ" (Model) ثابت ہوئے ۔ بابائے اردو کی زندگی کی عظیم الشان داستان کے ہر اہم عنوان میں سرسید اور دوسرے نامورانِ علی گڑھ کے اثرات کی جو کارفرمائی شامل ملتی ہے اس پر قدرے تصرف کے ساتھ فیض کا یہ مشہور و مقبول شعر گوش گزار کیا جاتا ہے: ؎

شمع (خرد) ، خیال کے انجم ، جگر کے داغ ___ جتنے چراغ ہیں ، (اسی) محفل سے آئے ہیں[۱۶]

علی گڑھ سے بی۔ اے کر کے نوجوان عبدالحق نے ۱۸۹۵ء کے دوران جب عملی زندگی کے میدان

میں قدم رکھا تو وہ تلاشِ روزگار کے امتحان سے دوچار ہوئے۔ ہندوستان میں ہر نوجوان اپنی عملی زندگی کے اس امتحان سے دوچار ہونے پر چار و ناچار تلخ تجربات کے ہفت خوان عام طور پر ضرور طے کرتا ہے مگر نوجوان عبدالحق کو تلاشِ معاش کے اِس امتحان میں ناموران علی گڑھ کی بدولت بمبئی اور حیدرآباد دکن میں پےدرپے اپنی زندگی کی جو ابتدائی تین ملازمتیں ملیں وہ ان کی زندگی کی بازی میں ایسی "ملازمتی ہیٹ ٹرک" کی حیثیت رکھتی ہیں جس میں تینوں بار اربابِ علی گڑھ نے نوجوان عبدالحق بی۔اے (علیگ) کی کاربراری کی تھی۔ اِس طرح مولوی عبدالحق کی عملی زندگی کی داستان میں "ملازمت" کا جو پہلا عنوان نظر آتا ہے اُس میں سرتاسر نواب محسن الملک، مولوی محمد عزیز مرزا اور نواب وقار الملک کے ایسے ناموران علی گڑھ کی عنایتوں کا بیان ملتا ہے۔ مولوی عبدالحق کی ابتدائی تینوں ملازمتوں کا احوال اجمال سے یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ عبدالحق کو اپنی زندگی کی پہلی نوکری ۱۸۹۵ء کے دوران دیارِ بمبئی میں سرسید کے نام و رہم نوا نواب محسن الملک کی بدولت ملی۔ محسن الملک اُس زمانے میں ریاست حیدرآباد دکن کے فائنَنس سکریٹری تھے اور وہ اُس زمانے میں اپنے علاج و بحالی صحت کے علاوہ علی گڑھ تحریک کو بمبئی کے متموّل طبقے میں مقبول بنانے کی غرض سے بمبئی میں مقیم تھے[۱۷]۔ محسن الملک نے عبدالحق کا تقرر اپنے پرائیویٹ سکریٹری کے اہم عہدے پر کر لیا (عبدالحق ص ۲۲۔)

۲۔ عبدالحق کو ۱۸۹۵ء ہی کے آس پاس محسن الملک کے ایک سفارشی خط کی بدولت حیدرآباد دکن میں مترجم کی دوسری ملازمت ریاستِ حیدرآباد دکن کے فرسٹ اسسٹنٹ ہوم سکریٹری مولوی محمد عزیز مرزا سے ملی جو علی گڑھ کالج ہی کے تربیت یافتہ ناموروں میں تھے[۱۸]۔

۳۔ مدرسۂ آصفیہ حیدرآباد دکن کی ہیڈ ماسٹری جو عبدالحق کی زندگی کی تیسری نوکری تھی وہ بھی انھیں سرسید کے دستِ راست اور علی گڑھ تحریک کے زبردست ہم نوا ریاستِ حیدرآباد کے معتمدِ مال نواب وقار الملک کی بدولت افسر الملک نواب افسر جنگ سے ملی تھی[۱۹]۔

مدرسۂ آصفیہ حیدرآباد کی ہیڈ ماسٹری عبدالحق کی زندگی میں اُس تعلیم و تربیت کا امتحان تھی جو انھوں نے سرسید اور ان کے رفیقوں کے زیرِ سایہ علی گڑھ کالج میں حاصل کی تھی۔ مدرسۂ آصفیہ حیدرآباد دکن کی کامیاب سربراہی کی بدولت مولوی عبدالحق ۱۹۱۱ء میں دیارِ اورنگ آباد میں مہتمم تعلیمات کے

اعلا عہدے پر فائز ہوئے۔ یہاں انھیں سر سید کی تعلیمی تحریک کے فکری اور نظریاتی کارآمد رہبر اصولوں کی عملی تعبیر و تفسیر پیش کرنے کا موقع ملا۔[۲۰] تعلیم کے میدان میں مولوی عبدالحق کے یادگار کارناموں کی طویل فہرست میں سے چند اہم کاموں کی نشان دہی کی جاتی ہے: محکمۂ تعلیم کے اسکولوں کی نگرانی، اسکولوں میں درس و تدریس کے کارآمد نئے تجربات، نصابی کتابوں کی تیاری، اردو یونی ورسٹی کے قیام کا منصوبہ، عثمانیہ کالج اورنگ آباد کی پرنسپلی، ناظم دارالترجمہ حیدر آباد کی حیثیت سے مختلف علوم و فنون کی نصابی کتابوں کے اردو میں ترجموں کا اہم کام، عثمانیہ یونی ورسٹی حیدر آباد کے شعبۂ اردو کی سربراہی اور کراچی (پاکستان) میں اردو کالج کا قیام۔[۲۱] تعلیم و تدریس کے محاذ پر بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی یہ تمام یادگار سرگرمیاں ہمارے نزدیک دراصل سر سید کی اسی علی گڑھ تحریک کی توسیعی شکل کی حیثیت رکھتی ہیں جو بابائے اردو کی زندگی کا مشن بن چکی تھی۔

مولوی عبدالحق کی زندگی کی داستان میں تعلیم و تدریس کے میدان کی سرگرمیوں کے دوش بدوش "صحافت"، کا بھی ایک اہم عنوان ملتا ہے۔ صحافت مولوی عبدالحق کے استاد معنوی سر سید کے سفر حیات میں شروع ہی سے رفیق رہی تھی۔ سر سید کی ادبی زندگی کا آغاز ہی اپنے بڑے بھائی سید محمود خاں کے سید الاخبار دہلی میں مضمون نگاری سے ہوا۔ سر سید نے اپنی زندگی کی مختلف منزلوں میں متعدد رسالے جاری کیے تھے۔[۲۲] صحافتی کارنامے سر سید کی علی گڑھ تحریک کا اہم پہلو رہے ہیں۔ صحافت اگر سر سید کی اصلاحی تحریک کی اشاعت کا ایک اہم وسیلہ بنی تو سر سید کے معنوی شاگرد مولوی عبدالحق کی زندگی میں بھی صحافت ایک ادبی مشغلہ رہی ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنی صحافتی زندگی کے لیے ابتدائی تربیت علی گڑھ ہی میں پائی تھی۔ سر سید کے رسالے "تہذیب اخلاق" اور "علی گڑھ میگزین" میں مولوی عبدالحق کے شایع ہونے والے مضامین مولوی صاحب کی صحافتی زندگی کے لیے بنیاد بنے۔ مولوی عبدالحق کے صحافتی کارناموں کی فہرست میں جو رسائل شامل ہیں ان میں سے چند یہ ہیں: رسالہ افسر حیدر آباد (۹۸-۱۸۹۷ء) رسالہ اردو (آغازِ اشاعت جنوری ۱۹۲۱ء) رسالہ نورس اورنگ آباد (۱۹۲۵ء) اور رسالہ قومی زبان کراچی پاکستان (اجرا مئی ۱۹۴۸ء)[۲۳]

صحافت کے ساتھ ساتھ خطابت بھی مولوی عبدالحق کی داستانِ زندگی کا وہ قابلِ ذکر عنوان ہے جس میں سر سید، حالی اور مولوی نذیر احمد کے ایسے نامورانِ علی گڑھ کے خطبات کے اثرات کی

کارفرمائی شامل ہے۔ مولوی عبدالحق کے خطبات کے دامن میں سرسید اور ان کی علی گڑھ تحریک یا دوسرے ناموران علی گڑھ کے کارناموں کے ذکر کی جو فراوانی ملتی ہے وہ مولوی عبدالحق کی خطابت پر ناموران علی گڑھ کی گہری چھاپ کی غماز ہے۔ مولوی صاحب کے خطبوں کی آسان زبان بھی سرسید اور حالی کی تقریروں کی آسان زبان کی آئینہ دار و ترجمان معلوم ہوتی ہے۔ بابائے اردو عام طور پر جس مقام پر تقریر کرتے اس سرزمین کی تاریخی اور ادبی روایات کے بیان سے سامعین کو محظوظ و مسرور کرنے کے ہنر سے کام لیتے تھے۔ بابائے اردو نے کامیاب خطابت کا یہ ہنر سرسید ہی سے سیکھا تھا[۲۴] مولوی صاحب اپنی تقریروں میں سرسید کے اس ہنر کی بڑی کامیاب پیوند کاری کرنے کے گُر پر پوری طرح قادر تھے۔

بابائے اردو کی ادبی زندگی کا آغاز علی گڑھ کالج میں دوران تعلیم ان ادبی مضامین سے ہوا جو "تہذیب الاخلاق" "علی گڑھ" اور "علی گڑھ میگزین" میں چھپے تھے۔ مولوی صاحب کو اپنے ایک ابتدائی مضمون پر علی گڑھ کالج میں لارڈ لٹیس ڈاؤن میڈل ملا تھا[۲۵] مولوی صاحب نے دوران تعلیم علی گڑھ میں ایک مضمون سینٹ پال پر اور ایک مضمون بابیوں کے مذہب پر بھی لکھا تھا۔ یہ شواہد اس بات کا ثبوت ہیں کہ بابائے اردو کی ادبی زندگی کی بنیادیں علی گڑھ کالج ہی میں استوار ہوئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انبار در انبار ادبی اور علمی کارناموں کی ایک قابل لحاظ تعداد ایسی ہے جس میں سرسید یا ان کی علی گڑھ تحریک کے اثرات کی کارفرمائی جلوہ گر ملتی ہے۔ یہاں تفصیل میں نہ جا کر ہم ایجاز سے کام لیتے ہوئے بابائے اردو کے علمی اور ادبی کارناموں میں سرسید یا ان کی علی گڑھ تحریک کے اثرات کا تجزیاتی جائزہ پیش کرتے ہیں۔

مولوی عبدالحق نے متعدد ایسی قدیم و نایاب علمی اور ادبی کتابوں کی ترتیب، تدوین، تقدیم و تقدیر یا اشاعت کا کام سرانجام دیا ہے جو گوشۂ گم نامی کے تاریک نہاں خانوں میں پڑی وقت کی گرد میں روپوش تھیں۔ ان کتابوں میں فارسی و اردو شاعروں کے قدیم تذکرے جنوبی و شمالی ہند کے پرانے شاعروں اور نثر نگاروں کے منظوم و منثور ادبی آثار جیسی انبار در انبار چیزیں شامل ہیں۔ ترتیب و تدوین کے علمی اور ادبی کاموں میں بابائے اردو کی یہ لگن ہمیں ان کے معنوی استاد سرسید کی یاد دلاتی ہے جو اسی قسم کے تدوینی کاموں سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے۔ سرسید کی "آثار الصنادید" اور "آئین اکبری" جیسی کتابیں ان کی اسی دلچسپی کا ثمرہ ہیں۔

بابائے اردو کی متعدد کتابیں ٹائپ میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ ٹائپ کی چھپائی مولوی عبدالحق کی پسند تھی۔ مولوی صاحب کے معنوی استاد سرسید بھی ٹائپ کی چھپائی کو پسند کرتے تھے۔ ٹائپ کی طباعت کو پسند کرنے میں بابائے اردو پر سرسید کے اثرات کی کارفرمائی نظر آتی ہے [۲۶]

مولوی عبدالحق کے ادبی کاموں میں کامیاب خاکہ نگاری ایک اہم عنوان ہے۔ مولوی صاحب نے اس میدان میں جو کامیاب مُرقعے پیش کیے ہیں ان میں نامورانِ علی گڑھ کے بھی متعدد ایسے یادگار قلمی خاکے شامل ہیں جو بابائے اردو کی خاکہ نگاری پر سرسید کی علی گڑھ تحریک کے ثبت ہونے والے اثرات کے اچھے ثبوت ثابت ہوتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی کتاب "چند ہم عصر" کا مطالعہ ہمارے ان معروضات کی تصدیق کرتا ہے۔

بابائے اُردو کی ادبی زندگی میں ان کا نثری اسلوب بھی اہم ادبی کارنامہ ہے جو سرتاسر حالیؔ اور سرسید کے نثری اسلوب سے متاثر نظر آتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے اردو کے دامن کو دوسری زبانوں کی بہت سی علمی کتابوں کے ترجموں سے مالامال کرنے کا جو زبردست کام دکن میں ناظم دارالترجمہ کی حیثیت سے سرانجام دیا وہ سرسید کی سائنٹی فک سوسائٹی کے ماتحت ہونے والے ترجموں کے کاموں کی یاد دلاتا ہے [۲۷]

سرسید نے اُردو یونی ورسٹی کا جو خواب دیکھا تھا وہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے عثمانیہ یونی ورسٹی حیدر آباد دکن کی شکل میں پورا کر دکھایا جس میں تمام مضامین کی تعلیم کا کام اُردو زبان میں ہونے لگا تھا مگر ملک کے سیاسی حالات نے مولوی صاحب کے اس کام اور سرسید کے خواب کو چکنا چور کر ڈالا۔ مولوی عبدالحق نے سرسید کے خواب اُردو یونی ورسٹی کو قائم کرنے کی کوششیں پاکستان میں بھی اپنی آخری سانس تک جاری رکھی تھیں مگر پاکستان میں ان کی یہ تمام کوششیں اُن کی زندگی میں ناکام رہی تھیں۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق ہمارے ان ادیبوں میں تھے جنھوں نے اپنی ساری زندگی اُردو زبان کی خدمت گزاری میں گزاری تھی۔ اردو زبان کی خدمت بابائے اردو کی زندگی کی داستان وہ اہم و مہتم بالشان عنوان ہے جس کے ذکر کے بغیر اُردو زبان کی نشو و نما کی تاریخ کی تکمیل ممکن نہیں۔ مولوی عبدالحق ۱۹۱۲ء سے اگست ۱۹۶۱ء میں اپنی آخری سانس تک ہندوستان اور پاکستان میں

جس انجمنِ ترقی اُردو سے سکریٹری یا صدر کی حیثیت سے وابستہ رہے وہ جنوری ۱۹۰۳ء میں اپنے قیام سے دسمبر ۱۹۹۱ء تک اب اپنی زندگی کے ۸۸ سال پورے کر چکی ہے۔ انجمن ترقی اردو کی اس ۸۸ سالہ زندگی میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی معتمدی یا صدارت کے دور کی مدّت (۱۹۱۲ء تا ۱۹۶۱ء) تقریباً پچاس سال متعین ہوتی ہے اور باقی تقریباً ۳۸ سال کا زمانہ دوسرے اصحاب کا حصّہ رہا ہے۔[28] یہ اعداد و شمار اس بات کا اثبات کرتے ہیں کہ انجمن ترقی اردو کی معتمدی یا صدارت میں تنہا بابائے اُردو کا جو پچاس سالہ زمانی حصّہ رہا ہے وہ اس انجمن کی تاریخ میں ایک ایسا یادگار ریکارڈ ہے جسے بابائے اُردو سے قبل یا بعد کے تمام معتمدینِ انجمن مل کر بھی آج تک توڑنے سے قاصر رہے ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی زندگی کے اِس یادگار کارنامے پر بے اختیار یہ اشعار یاد آتے ہیں:

۱۔ سب پہ جس بار نے گرانی کی — اس کو یہ ناتواں اٹھالایا[29]

۲۔ آسماں بارِ امانت نہ توانست کشید — قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند[30]

مولوی عبدالحق نے جب ۱۹۱۲ء میں انجمنِ ترقیِ اردو کی معتمدی کا بار سنبھالا تو ان سے قبل ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۲ء تک مولانا شبلیؔ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور مولوی محمد عزیز مرزا (متوفی ۲۶ ر فروری ۱۹۱۲ء)[31] کے ایسے تین اہم نامورانِ علی گڑھ انجمن کے سکریٹری رہ چکے تھے[32] مگر اس تلخ حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۲ء تک انجمن ترقی اردو کی تاریخ کا ابتدائی نو سالہ زمانہ ایک تاریک و ناکام دور رہا تھا اور بابائے اُردو جب ۱۹۱۲ء میں انجمن کے چوتھے سکریٹری ہوئے تو انجمن کی کشتی نامساعد حالات کے سیلاب اور ناسازگار طغیانی کے گرداب سے دوچار رہ کر غرقاب ہونے والی تھی۔ بابائے اُردو منجدھار میں پھنسی انجمن کی اس ڈولتی اور ڈوبتی ہوئی ناؤ کو پار لگانے میں پتوار ثابت ہوئے۔

انجمن ترقی اُردو کے سفینے کی کامیاب ناخدائی جو بابائے اُردو کی زندگی کا سب سے اہم و یادگار کارنامہ مانا جاتا ہے اُس کے سرے بھی سرسید کی علی گڑھ تحریک سے ملتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو کی تاریخ شاہد ہے کہ یہ انجمن علی گڑھ تحریک کے ماتحت سرسید کے ہاتھوں ۱۸۸۶ء میں قائم ہونے والی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کا ایک ایسا ذیلی ادارہ رہی ہے جس کا قیام ۱۹۰۳ء میں عمل میں آیا تھا[33] اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہندوستان و پاکستان دونوں ہی ملکوں میں انجمنِ ترقی اردو کے معتمدوں

سربراہوں اور سرپرستوں کی طویل فہرست میں ایسے ناموران علی گڑھ کا ہجوم نظر آتا ہے جو خود بھی علی گڑھ تحریک یا علی گڑھ کالج سے وابستہ رہے ہیں اور جنھوں نے علی گڑھ تحریک کے زیر اثر قایم ہونے والی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک جزیعنی انجمنِ ترقیِ اردو کو پال پوس کر پروان چڑھایا ہے۔ انجمن ترقی اردو کے عہدے داروں کی یہ مرعوب کن فہرست اپنے دامن میں جن ناموران علی گڑھ کے نام رکھتی تھی ان میں سے چند قابلِ ذکر ہستیاں یہ ہیں: مولانا شبلی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولوی عزیز مرزا، بابائے اردو مولوی عبدالحق، عماد الملک نواب سید حسین بلگرامی، سر راس مسعود (سرسید کے حقیقی پوتے) ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، آل احمد سرور، ڈاکٹر خلیق انجم اور اختر حسین وغیرہم۔

انجمنِ ترقیِ اردو ۱۹۱۲ء میں بابائے اردو کی معتمدی سے قبل تک ایک قالب بے جان تھی۔ مولوی عبدالحق نے انجمن کے اس قالبِ بے جان میں اپنی معتمدی کے دوران ایک نئی روح پھونکنے کا تاریخی کام سرانجام دے کر سرسید کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے یادگار پودے انجمن ترقی اردو کو نہ صرف مرجھانے سے بچا لیا بلکہ اس کو پال پوس کر پروان بھی چڑھایا۔ آج سرسید کی علی گڑھ تحریک کے باغ کی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی کیاری سے اگنے والا انجمن ترقی اردو کا یہ شجر سایہ دار ہندوستان اور پاکستان میں جس طرح برگ و بار لا رہا ہے اسے اس شجر سایہ دار کے مالی بابائے اردو مولوی عبدالحق کی زندگی کا ایک یادگار اور سدابہار کارنامہ قرار دیا جانا چاہیئے۔

اس مقالے کے اختتام میں پروفیسر خواجہ تنویر حسین کا یہ بیان پیش کرنا بے محل نہ ہوگا:

> "سرسید کو اردو زبان سے دلی لگاؤ تھا۔ وہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے آرزو مند تھے ورنیکلر یونی ورسٹی ان کا تعلیمی نصب العین تھا۔ عبدالحق نے بھی "خدمتِ اردو" اپنا مسلک اپنا مقصدِ حیات بنا لیا۔ جس دل جوئی اور دل سوزی سے انھوں نے ترقی اردو کے لیے جدو جہد کی اس کا اندازہ ۱۹۱۲ء کی انجمن ترقی اردو اور آج کی انجمن ترقی اردو سے ہو سکتا ہے۔ ۱۹۱۲ء میں جب مولوی صاحب کو انجمن کا سکریٹری نام زد کیا گیا تو انجمن کی کل کائنات ایک پرانا صندوق، ایک رجسٹر، چند پرانے اور غیر مرتب مسوّدات (اور) ایک قلم دوات تھی، یہی انجمن جب ۱۹۳۸ء میں اورنگ آباد سے دہلی منتقل کی گئی تو صرف انجمن کی

مطبوعات مال گاڑی کے کئی ڈبّوں میں لادی گئیں۔ جن کی قیمت کا اندازہ (۱۹۳۸ء میں) کم وبیش ایک لاکھ روپیا لگایا گیا تھا۔ آج بھی بھارت میں اور پاکستان کے ہر بڑے شہر میں اس کی شاخیں قایم ہیں"۔۳۴

اس مقالے میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی زندگی کی داستان کے ہر اہم عنوان میں جگہ جگہ سرسید اور ان کی علی گڑھ تحریک کے جو نشان پیش کیے گئے ہیں وہ اس بات کا اثبات کرتے ہیں کہ علی گڑھ بابائے اُردو کے سفرِ حیات میں ایک نہایت اہم منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔

حواشی

۱۔ پروفیسر مختار الدین احمد نے مولوی عبدالحق کی تاریخ ولادت ۲۰/ اگست ۱۸۷۰ء لکھی ہے مگر مولوی صاحب کے ہم وطن چودھری شرف الدین نے مولوی عبدالحق کے ایک قریبی دوست وصی احمد بلگرامی کے حوالے سے مولوی صاحب کی تاریخ ولادت ۱۰/ مارچ ۱۸۷۰ء قرار دی ہے جس کی تصدیق بعد کو خود مولوی صاحب نے بھی کر دی تھی۔ دیکھیے:

۱۔ عبدالحق: مختار الدین احمد۔ ساہتیہ اکادمی نئی دہلی طبع ۱۹۸۴ء ص ۱۱ نیز ص ۴۴

۲۔ مضمون "مولوی عبدالحق مرحوم": چودھری شرف الدین مطبوعہ قومی آواز لکھنؤ ہفتہ وار ضمیمہ مورخہ ۱۵/ دسمبر ۱۹۹۱ء ص ۲

۲۔ عبدالحق: مختار الدین احمد ص ۱۱ تا ۴۴

۳۔ بابائے اُردو۔ احوال وافکار: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔ نئی دہلی طبع مئی ۱۹۷۹ء ص ۲۰۳ تا ۲۰۴

۴۔ دیکھیے: ۱۔ مقالہ از پروفیسر رشید احمد صدیقی بہ عنوان "بابائے اُردو" مشمولہ کتاب بابائے اُردو مولوی عبدالحق: مرتبہ عبداللطیف اعظمی۔ ادارۂ فروغِ اُردو لکھنؤ طبع ۱۹۷۱ء ص ۸۴

۲۔ عبدالحق ص ۱۴

۵۔ دیکھیے: ۱۔ عبدالحق: مختار الدین احمد ص ۱۳

۲۔ رسالہ اُردو کراچی (بابائے اُردو نمبر ۱۹۶۲ء): مرتبہ سید وقار عظیم۔ مقالہ

شیخ احمد حسن (برادرِ مولوی عبدالحق مرحوم) بہ عنوان "ابدی بھائی" ص ۱۲

۳۔ نصابی جائزے: (کاظم علی خاں) نظامی پریس لکھنؤ طبع ۱۹۹۱ء ص ۱۷

۴۔ بابائے اردو۔ احوال و افکار ص ۲۰۴ تا ۲۰۵ نیز ص ۲۱۷

۵۔ مقالہ پروفیسر رشید احمد صدیقی بہ عنوان "بابائے اردو" مشمولہ کتاب بابائے اردو مولوی عبدالحق ص ۸۴

۶۔ سرسید احمد خاں کا مشہور و مقبول رسالہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء سے ۲ر فروری ۱۸۹۷ء تک بہ تفصیل ذیل تین ادوار میں جاری رہا تھا:

۱۔ پہلا دور ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء تا ۲۰ر ستمبر ۱۸۷۶ء

۲۔ دوسرا دور ۲۳ر اپریل ۱۸۷۹ء تا ۲۸ر جولائی ۱۸۸۱ء

۳۔ تیسرا دور ۷ر اپریل ۱۸۹۴ء تا ۲ر فروری ۱۸۹۷ء

سرسید (متوفیٰ ۲۷ر مارچ ۱۸۹۸ء) کے رسالہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ کے تیسرے اور آخری دور کے ایک سال کی جلد میرے کتب خانے میں موجود ہے جس میں یکم شوال ۱۳۱۲ھ سے یکم رمضان ۱۳۱۳ھ (مطابق ۲۸ر مارچ ۱۸۹۵ء سے ۱۵ر فروری ۱۸۹۶ء) تک کے شمارے شامل ہیں۔ تہذیب الاخلاق علی گڑھ کے ادوار مقالات سرسید مرتبہ محمد عبداللہ خاں خویشگی علی گڑھ (سنہ اشاعت ندارد) ص ۱۳ تا ۱۴ کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ سرسید کی تاریخ وفات حیات جاوید: الطاف حسین حالی۔ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی طبع ۱۹۷۹ء ص ۲۸۲ سے نقل کی گئی ہے۔ کاظم علی خاں۔

۷۔ علی گڑھ کالج اور سرسید کی حیات و خدمات کے لیے دیکھیے:

۱۔ انگریزی کتاب "سرسید اینڈ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ": کاظم علی خاں۔ پرکاشن کیندر لکھنؤ طبع ۱۹۶۷ء

۲۔ انگریزی کتاب "سرسید احمد خاں": کے۔اے۔ نظامی۔ دہلی طبع نومبر ۱۹۶۶ء

۳۔ حیاتِ جاوید: حالی

۴۔ انتخاب مضامین سرسید : مرتبہ عتیق احمد صدیقی۔ لکھنؤ طبع ۱۹۸۳ء ص ۱۹ تا ۲۲

۱۰؎ یہاں سے اگلی سطور میں ہم نے خود اپنے ایک مقالے "ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کے خدوخال"، مطبوعہ رسالہ غالب نامہ نئی دہلی۔ جنوری ۱۹۹۱ء (ص ۱۴۰ تا ۱۴۳) کے بعض حصوں سے مدد لی ہے۔ کاظم علی خاں۔

۱۱؎ رجوع کیجیے: ۱۔ انگریزی کتاب "دی اسپرٹ اینڈ سبز سٹنس آف اردو پروز انڈر دی انفلوئنس آف سرسید احمد خاں: ایس۔ ایم۔ عبداللہ۔ لاہور طبع ۱۹۴۰ء

۲۔ رسالہ فکر و نظر علی گڑھ کے "نامورانِ علی گڑھ" کے عنوان سے شایع ہونے والے پہلے اور دوسرے کارواں سے متعلق ابتدائی دو شمارے

۳۔ رسالہ "تہذیب الاخلاق" علی گڑھ مورخہ یکم شوال ۱۳۱۲ھ (مطابق ۲۸ مارچ ۱۸۹۵ء ص ۱۴ تا ۱۶) نیز "تہذیب الاخلاق" علی گڑھ مورخہ یکم ذی الحجہ ۱۳۱۲ھ (مطابق ۲۶ مئی ۱۸۹۵ء) ص ۴۳ تا ۴۶ جن میں مولوی سید کرامت حسین کے دو عدد مضامین شامل ہیں۔

۴۔ ادبی تبصرے: عبدالحق۔ دانش محل لکھنؤ طبع ۱۹۴۷ء ص ۱۸ تا ۲۶ (برائے عماد الملک سید حسین بلگرامی)

۵۔ تنقیدات عبدالحق: مرتبہ محمد تراب علی خاں باز کتب خانہ عزیزیہ حیدرآباد دکن طبع دوم ص ۷ تا ۱۰ (برائے محسن الملک و وقار الملک)

۱۲؎ چند ہم عصر: ڈاکٹر عبدالحق۔ حیدرآباد دکن طبع ۱۹۷۲ء ص ۱۳۷

۱۳؎ بابائے اردو۔ احوال و افکار ص ۲۱۱ تا ۲۱۲

۱۴؎ ایضاً ص ۲۱۵

۱۵؎ سرسید احمد خاں۔ حالات و افکار: بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق۔ اردو مرکز دہلی طبع ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۲۵ تا ۲۶

۱۶؎ فیض کا یہ شعر یہاں قدرے تصرف کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ فیض احمد فیض کے اس شعر کی

اصل شکل یہ ہے :-

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ۔ جتنے چراغ ہیں، تری محفل سے آئے ہیں

دیکھیے: ۱۔ رہ نمائے بیت بازی؛ مرتبہ کاظم علی خاں۔ نامی پریس لکھنؤ طبع جولائی ۱۹۸۲ء

ص ۱۳۷

۲۔ کلامِ فیض (عکسی) علی گڑھ طبع ۱۹۸۲ء ص ۲۱۵

۱۷ے محسن الملک مولوی مہدی علی (وفات ۱۶ر اکتوبر ۱۹۰۷) کے حالات درجِ ذیل مصادر میں موجود

ہیں :

۱۔ چند ہم عصر ص ۱۳۷ تا ۱۴۷

۲۔ تنقیدات عبدالحق ص ۷ تا ۱۰

۳۔ رسالۂ فکر و نظر علی گڑھ خصوصی شمارہ "ناموران علی گڑھ" (پہلا کارواں) :

مدیر نور الحسن نقوی طبع اگست ۱۸۹۵ء ص ۱۶ تا ۲۷

۴۔ عبدالحق ص ۲۲

۱۸ے رجوع کیجیے: ۱۔ چند ہم عصر ص ۱۷ تا ۷۷

۲۔ عبدالحق ص ۲۲

۳۔ رسالۂ فکر و نظر علی گڑھ خصوصی نمبر "ناموران علی گڑھ" (دوسرا کارواں) ص ۱۲۹

تا ۱۴۵ میں مولوی محمد عزیز مرزا (زمانہ حیات مئی ۱۸۶۴ء تا ۲۶ فروری ۱۹۱۲ء)

کے حالات موجود ہیں۔

۱۹ے وقار الملک مولوی مشتاق حسین (۱۸۴۱ء تا جنوری ۱۹۱۷ء) کے حالات کے لیے دیکھیے:

۱۔ وقارِ حیات (یہ ضخیم کتاب میری نظر سے برسوں قبل گزری تھی مگر اب پیشِ نظر نہیں ہے)

۲۔ رسالۂ فکر و نظر علی گڑھ "ناموران علی گڑھ" (پہلا کارواں) ص ۴۷ تا ۸۶

۳۔ خطوطِ وقار الملک : مرتبہ مشتاق احمد۔ علی گڑھ طبع ۱۹۷۴ء

۴۔ تنقیداتِ عبدالحق ص ۷ تا ۱۰

۵۔ عبدالحق ص ۲۲ تا ۲۳

۲۰ عبدالحق ص ۲۳، ص ۲۵ نیز ص ۲۹ تا ۳۱

۲۱ دیکھیے : ۱۔ عبدالحق ص ۳۲ تا ۴۰

۲۔ کل پاکستان انجمن ترقی اردو کا المیہ : عبدالحق۔ کراچی (سنہ اشاعت ندارد) میں مولانا عبدالحق کے قائم کردہ کالج (کراچی) کے تفصیلی حالات موجود ہیں۔

۲۲ انگریزی کتاب "سید احمد خاں" : کے۔ اے۔ نظامی ص ۱۷۳ تا ۱۷۵

۲۳ بہ حوالہ کتاب بابائے اردو مولوی عبدالحق : مرتبہ عبداللطیف اعظمی ص ۴۴ تا ۴۵، ص ۵۶ تا ۴۸، ص ۲۸۷ نیز ص ۳۱۲

۲۴ دیکھیے : ۱۔ عبدالحق ص ۴۷ تا ۸۳

۲۵ رسالہ سہ ماہی اردو کراچی بابائے اردو نمبر ۱۹۶۲ء ص ۱۳

۲۶ خطوطِ مشاہیر بہ نام سید مسعود حسن رضوی ادیب : مرتبہ نیر مسعود۔ شایع کردہ یو۔ پی۔ اردو اکادمی لکھنؤ طبع ۱۹۸۵ء (ص ۲۴۳، ۲۴۴) میں مسعود حسن رضوی ادیب کے نام اپنے ایک خط میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اردو ٹائپ کی طباعت کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار یوں کیا ہے : "۔۔۔ اس کا البتہ مجھے افسوس ہے کہ آپ ٹائپ کو پسند نہیں فرماتے۔ آپ ہی صاحبوں سے یہ توقع ہے کہ اس کے رواج کی کوشش کریں گے اور جب آپ کی طرف سے یہ خیال ظاہر ہوتا ہے تو کسی قدر مایوسی ہوتی ہے۔ اب لوگ رفتہ رفتہ ٹائپ پسند کرنے لگے ہیں۔ حال ہی میں ایک صاحب نے ایک کتاب ہمارے مطبع میں ٹائپ میں چھپوائی ہے۔ آپ اسے ملاحظہ فرمائیے۔۔۔"

۲۷ رجوع کیجیے کتاب دارالترجمہ عثمانیہ کی علمی اور ادبی خدمات : ڈاکٹر مجیب الاسلام۔ دہلی طبع مارچ ۱۹۸۷ء ص ۲۶ تا ۲۸، ص ۵۳ تا ۵۵ نیز ص ۱۵۱ تا ۱۵۲

۲۸ ر۔ ک : ۱۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق ص ۲۶۵ تا ۳۱۸

۲۔ کل پاکستان انجمن ترقی اردو کا المیہ" : عبدالحق۔ کراچی (سنہ طباعت غالباً ۱۹۵۸ء)

۳۔ سہ ماہی رسالہ "اردو" کراچی بابائے اردو نمبر ۱۹۶۲ء ص ۳۰۹ تا ۳۱۱

۲۹ کلیاتِ میر (جلد اول) : مرتبہ ظل عباس عباسی۔ ترقی اردو بیورو نئی دہلی طبع ۱۹۸۳ء ص ۱۳۹

۳۰۔ فرہنگِ امثال: مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب کتاب نگر لکھنؤ طبع ۱۹۵۸ء ص ۱۵

۳۱۔ رسالہ "فکر و نظر" علی گڑھ خصوصی شمارہ "نامورانِ علی گڑھ" (دوسرا کارواں) ص ۱۴۰ تا ۱۴۱

۳۲۔ ر۔ک: ۱۔ عبدالحق ص ۳۲

۲۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق ص ۲۶۵ تا ۲۷۲

۳۳۔ رجوع کیجیے: ۱۔ حیاتِ جاوید ص ۲۴۲

۲۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق ص ۲۶۵

۳۴۔ رسالہ سہ ماہی اُردو کراچی۔ بابائے اُردو نمبر ۱۹۶۲ء ص ۲۶۵ (مقالہ پروفیسر خواجہ تہور حسین)

ڈاکٹر سیّد حامد حسین

مولوی عبدالحق اور دیوانِ غالب

اردو پر مولوی عبدالحق کے جو احسانات ہیں اُن میں اردو ادب کے شہ پاروں کی تدوین و اشاعت سرِفہرست ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے کسی منصوبے میں دیوانِ غالب کی شمولیت کو نظر انداز کیا جانا ناممکن ہے۔ حالاں کہ انجمن ترقی اردو کے زیرِ اہتمام مولوی صاحب دیوانِ غالب شایع کروانے میں کامیاب نہیں ہوئے تاہم اس سلسلے میں انھوں نے جو کوششیں کیں وہ قابلِ ذکر ہیں۔

یوں تو کلامِ غالب کی اشاعت کا خیال مولوی عبدالحق کے ذہن میں کافی عرصے تھا اُسے انھوں نے ۱۹۱۴ء میں ایک منصوبے کی شکل دی۔ رسالہ "الناظر" (لکھنؤ) کے مدیر ظفر الملک علوی کو تحریر اپنے ایک خط میں مولوی صاحب نے (جو کہ "الناظر" کے شمارہ بابت مئی ۱۹۱۴ء میں شایع ہوا) اپنے ان خیالات کا اظہار کیا۔

"جنابِ مخدومی، تسلیم!

انجمن ترقی اردو نے ارادہ کیا ہے کہ اس مرتبہ اپنی نگرانی میں دیوانِ غالب اردو کا ایک صحیح اور عمدہ نسخہ چھپوا کر شایع کرے۔ جناب کو معلوم ہے کہ غالب کی قبولیت اور فلسفیانہ شاعری کی قدر روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور مرحوم کا کلام پسند کرنے والے پہلے کی نسبت کہیں زیادہ ہو گئے ہیں۔ پس بالکل برمحل ہے ایک جماعت کثیر کی خواہش پوری کرنے کا سامان کیا جائے اور پرانے نسخوں کے بجائے جن میں ناقص کاغذ اور غلط کتابت سے زیادہ کوئی شے نمایاں نہیں، ایک پاکیزہ اور خوب صورت مجلّد بازار میں آجائے۔ جب کہ طوطا کہانی اور دلفروش ناٹک تک سفید کاغذوں پر چھپ رہے ہیں، باعثِ حجاب ہونا چاہیے کہ اردو علم و ادب کے مایۂ ناز اور انقلاب افگن شاعر کا پُر تاثیر ترانہ مٹیالے اور بے نور کاغذوں پر شکوہ گزارِ کس مپرسی ہو!"[۱]

مولوی صاحب نے دیوان غالب کے مطبوعہ ایڈیشنوں کی جس کس مپرسی کی طرف توجہ دلائی تھی، اُس سے مشہور انگریزی ناول نگار ای ایم فارسٹر کا وہ تبصرہ یاد آتا ہے جو اس نے ۱۹۱۲ء میں دورۂ ہندوستان کے دوران کیا تھا۔ پروفیسر ہارون خاں شیرانی نے راقم الحروف کو یہ بتایا تھا کہ ایک دن دہلی کے چاندنی چوک میں اپنے دوست سر راس مسعود کے ساتھ گھومتے ہوئے فارسٹر نے اردو کے سب سے اہم شاعر کے بارے میں استفسار کیا اور جب راس مسعود نے غالب کا تذکرہ کیا اور غالب کے اشعار ترجمہ کر کے سنائے تو فارسٹر نے دیوانِ غالب کا ایک نسخہ حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن اس وقت جو مطبوعہ نسخے دستیاب تھے اُن کا کاغذ بہت معمولی تھا اور طباعت نہایت ناقص۔ اس پر فارسٹر نے اپنے تعجب کا اظہار کیا اور مسعود سے کہا کہ تم جس شاعر کو عظیم سمجھتے ہو اس کا دیوان ایسے کاغذ پر چھاپا ہے جس سے ہم اپنا بدن بھی صاف کرنا پسند نہ کریں گے۔ ظاہر ہے کہ راس مسعود اس تبصرے پر تلملا گئے اور انھوں نے اپنے کئی دوستوں اور، اردو کے ہمدردوں سے ذکر کیا جن میں پروفیسر ہارون خاں شروانی، نامی پریس کانپور کے مالک رحمت اللہ رعد، نظامی بدایونی شامل تھے۔ مولوی عبدالحق کے مذکورہ بالا تاثرات میں بھی ای ایم فارسٹر کے تبصرے کی ہی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

دیوانِ غالب کے ایک صحیح اور نفیس ایڈیشن کی اشاعت کے علاوہ مولوی صاحب نے یہ تجویز رکھی کہ ساتھ ہی ساتھ اس وقت کے مقتدر ادیبوں سے غالب حیات، شخصیت اور فن پر مضامین لکھوا کر انھیں بھی شایع کیا جائے۔ چنان چہ وہ ظفر الملک صاحب کو اپنے خط میں تحریر کرتے ہیں:

> "یہ ایما مجالس علمی کی تقلید میں ہے کہ، انجمن اساتذۂ ماضیہ پر موجودہ ارباب ذوق سے اُن کی رائے لکھوانے کی خواہاں ہے تاکہ اُس کے شایع کردہ نسخے میں خصوصیت بھی پیدا ہو جائے اور مستند ادبائے وقت کا مجموعۂ آرا اردو علم و ادب میں ایک دل کش اضافہ ہو اور اردو کی شاعری کے طلبا کو مفید اعانت بھی اس سے مل سکے۔
>
> اسی غرض سے میں نے ذیل میں چند عنوانات قایم کیے ہیں اور ہر بحث کے مقابل اُن حضرات کے نام درج ہیں جنھیں اس بارے میں زحمت دی گئی ہے۔ . .

۱۔ مرزا صاحب کے خاندانی حالات، تعلقات احباب واقربا کے ساتھ، عوام و خواص کے ساتھ ان کا برتاؤ اور عام گفتار، کردار، نشست برخاست، معاشرت کا طریقہ۔ نواب سعیدالدین احمد خاں صاحب

طالب دہلوی۔

۲۔ مرزا صاحب کی شاعری کی خصوصیات، ان کی زبان اور طرزِ بیان کی جدت: مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی نظم لکھنوی و مولوی رضا علی صاحب وحشت کلکتہ۔

۳۔ مرزا صاحب کی اردو شاعری میں فارسی کا امتزاج اور اساتذۂ فارسی سے اس کا تاثر: مولانا شبلی نعمانی

۴۔ مرزا صاحب کا فلسفۂ شاعری اور اس کا مقابلہ یورپ کے بعض نامور شعرا سے: ڈاکٹر محمد اقبال صاحب اقبالؔ لاہور۔

۵۔ مرزا صاحب کی شاعری کا اثر اردو زبان پر: مولانا عبدالحلیم صاحب شرر لکھنوی و مولوی وحیدالدین صاحب سلیم پانی پتی۔

۶۔ مرزا صاحب کی اردو نثر اور اس کی خصوصیات: مولانا فضل الحسن حسرت موہانی و راقم الحروف عبدالحق۔

(جناب مولانا حالی کی خدمت میں بھی عرض کیا گیا ہے اگر وہ کچھ تکلیف لکھنے کی فرما سکیں تو انجمن کے لیے اس سے بڑھ کر قابل رشک کوئی اعزاز نہیں)"

دیوانِ غالب کے اس ایڈیشن پر آنے والے خرچ کے لیے بھی مولوی عبدالحق نے ایک تجویز پیش کی تھی جو "الناظر" کے جون ۱۹۱۴ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔

"گزشتہ رپورٹ میں دیوانِ غالب کے ایک نفیس اور صحیح ایڈیشن کے طبع کے متعلق مسٹر محمد علی بی۔ اے (آکسن) اڈیٹر کامریڈ و ہمدرد کی خدمت میں یہ استدعا پیش کی گئی ہے کہ جو فنڈ انھوں نے مرزا صاحب کے مقبرے کی ترمیم و تعمیر کے لیے جمع کیا تھا اور اب وہ کسی وجہ سے اس کام میں صرف نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ رقم اس ایڈیشن کے طبع کے لیے بہ اجازت معطیان عنایت فرمائی جائے تو مرحوم کی ایک عمدہ یادگار ہو گی۔ ابھی اس کے متعلق موصوف کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا ہے۔"[۳۱]

مولانا محمد علی نے ۱۹۱۱ء میں غالب کے مزار کی تعمیر کے لیے پرجوش کوشش شروع کی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اس جانب توجہ دلائی تھی کہ "غالب" کی کوئی عمدہ سوانح حیات بھی مرتب نہیں ہوئی ہے۔ اگرچہ مولانا حالی کی یادگار اپنی جگہ بہت خوب ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ نہ تو وہ غالب کے شایانِ شان ہے اور نہ

خوشحالی کے۔ غالب کی نظم و نثر کا بھی کوئی اچھا ایڈیشن موجود نہیں۔ رہے غالب کے نئے اور سستے ایڈیشن تو انھیں ہم مجموعۂ اغلاط کا ایک کرشمہ کہہ سکتے ہیں"۴۴۔ مولانا محمد علی نے غالب کے مزار کی تعمیر کے لیے جو فنڈ شروع کیا تھا اس میں اگلے چھ ماہ میں ۵۷۷ روپے جمع ہو گئے تھے۔۴۵ لیکن جب ۱۹۱۴ء کے آخر میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس راولپنڈی میں منعقد ہوئی تو ۲۷ دسمبر کے اجلاس میں (مولوی عبدالحق نے بتایا کہ) مولانا محمد علی نے کہا کہ:

"غالب کا مقبرہ بنانے کے لیے جو روپیہ کامریڈ کے ذریعے انھوں نے جمع کیا ہے وہ کلام غالب کا عمدہ ایڈیشن چھاپنے کے لیے نہیں دینا چاہیے بلکہ غالب کا مقبرہ بنانے میں ہی اس کو صرف کریں گے۔ البتہ اپنی طرف سے مبلغ یک صد روپیہ عنایت فرمائیں گے"۴۶

راولپنڈی کے اسی اجلاس میں انجمن ترقی اردو کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے دیوان غالب کے بارے میں بتایا کہ

"انجمن نے ایک صحیح اور عمدہ اڈیشن چھاپنے کا ارادہ کیا ہے اور اس خیال کو اکثر اصحاب نے پسند فرمایا ہے اور اس کے ساتھ یہ جدت بھی کرنی چاہی کہ اردو زبان کے نامور اہل قلم سے مرزا صاحب کی خصوصیات شاعری پر مضامین لکھوا کر ان کے کلام کے ساتھ شایع کیے جائیں۔ چناں چہ ملک کے مشہور اور نامور انشا پردازوں سے یہ استدعا کی گئی لیکن سوائے مولوی عبدالحلیم صاحب شرر اور مولوی رضا علی صاحب وحشت کے کسی نے حامی نہ بھری۔ لیکن اب تک ان صاحبوں سے بھی مضامین حاصل نہیں ہوئے۔ خوش قسمتی سے مرزا صاحب کے دیوان کا ایک صحیح قلمی نسخہ دستیاب ہو گیا ہے۔ یہ نسخہ نواب ضیاء الدین خاں صاحب نیر نے لکھوایا تھا اور مرزا صاحب کی نظر سے گزر چکا ہے۔ جناب نواب احمد سعید خاں صاحب نے بکمال عنایت و لطف وہ نسخہ انجمن کو مستعار عنایت فرمایا اور انجمن نے اس پر سے ایک نسخہ تیار کر لیا ہے۔ لیکن چوں کہ مرزا صاحب کا کلام مشکل و دقیق ہے اس لیے یہ خیال کیا گیا کہ بعض بعض مقامات پر ضروری حواشی اور شرح بھی لکھ دی جائے۔ یہ اڈیشن تیار ہو رہا ہے اور آئندہ سال طبع کیا جائے گا۔ جناب نواب عماد الملک بہادر نے جو خود بڑے ادیب اور صاحب ذوق ہیں، از راہ قدردانی

پانسو روپیہ اس کے اخراجات کے لیے مرحمت فرمائے ہیں۔۵۷

اسی رپورٹ میں مولوی عبدالحق نے یہ بھی بتایا کہ انجمن کے لیے اس دیوان کو سید ہاشمی مرتب کر رہے تھے۔ خود سید ہاشمی نے اس سلسلے میں یہ تجویز کیا ہے:

"تجویز یہ تھی کہ دیوان غالب کو عمدہ کاغذ پر خوش خط اور صحیح طبع کرایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو مرزا صاحب کے غیر مطبوعہ یا گم شدہ کلام بھی تلاش کیا جائے۔ اس کے ساتھ چند مشہور ادیبوں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ کلام غالب کے مختلف پہلوؤں پر مضامین تحریر فرمائیں تاکہ انجمن کے نسخے میں ایک علمی شان پیدا ہو جائے۔ تجویز کے اسی آخری حصے کی بدولت کتاب کی تیاری میں بہت دیر ہوئی۔ صرف جناب رضا علی وحشت (کلکتہ) نے انجمن کی درخواست پر ایک دل چسپ مضمون ارسال فرمایا۔ لیکن دیگر حضرات نے یا تو یہ درخواست قبول ہی نہ کی اور یا قبول کی تو ایفائے وعدہ نہ کر سکے۔ دیوان کو صحیح اور جدید اصول تحریر کے مطابق لکھوانے اور غیر مطبوعہ کلام کو جمع کرنے کی خدمت راقم الحروف کے سپرد ہوئی تھی اور ۱۹۱۵ء تک کتاب کا مبیضہ تیار ہو گیا۔ نیز مختلف ذرائع سے جو کچھ غیر مطبوعہ کلام مل سکا اُسے شامل کر لیا گیا۔"۵۸

انجمن ترقی اردو کے لیے سید ہاشمی نے جو دیوان مرتب کیا تھا وہ جناب خبیر بھوروی کے پاس تھا۔ انھوں نے اس کی مختصر کیفیت اپنے مضمون "کچھ رنگین تصویر کے بارے میں" "شاعر" (بمبئی) غالب نمبر ۱۹۶۹ء (ص ۱۸۶، ۱۸۷) میں درج کی ہے۔ بعد میں یہ ڈاکٹر احمر لاری (گورکھپور) کے پاس آیا۔ انھوں نے اس کی تفصیلی کیفیت اپنے مضمون "دیوانِ غالب مرتبہ سید ہاشمی" "تحریر" دہلی، شمارہ نمبر ۲۰، ۱۹۷۱ء (صفحات ۹۸ تا ۱۱۹) میں درج کی ہے۔ ڈاکٹر احمر لاری کی اطلاع کے مطابق سید ہاشمی نے حسرت موہانی کے "دیوانِ غالب اردو مع شرح" کے متن کو بنیاد بنایا تھا جو کہ دراصل غالب کی زندگی میں شایع ہونے والے آخری دیوان پر مبنی تھا۔ اس طرح سید ہاشمی کی بنیاد بالواسطہ مطبع احمدی دہلی میں جولائی۔ اگست ۱۸۶۱ء میں چھپا دیوان تھا۔ اس متن میں نواب احمد سعید خاں کے نسخے کو سامنے رکھتے ہوئے ترمیم کی گئی اور حاشیے میں اختلاف کی صراحت کر دی گئی تھی۔ اس طرح متداول کلام کے علاوہ جو زاید کلام اس دیوان میں شامل کیا گیا تھا یا جس کی نشاندہی کی گئی تھی اس کے خاص مآخذ (۱) نواب احمد سعید خاں کا نسخہ (۲) "گل رعنا"،

کے حوالے کے ساتھ حسرت موہانی کے مرتبہ دیوان میں شامل اضافے اور (۳) حالی کی یادگار غالب میں شامل اشعار تھے۔ لیکن "یادگار غالب" کے اشعار کے سلسلے میں سید ہاشمی یکساں اصول نہیں اپنا سکے۔ دیوان کے شروع میں انھوں نے "یادگار غالب" کے چند زائد اشعار کو دیوان میں شامل کرنے کی رائے اس وجہ سے دی ہے کہ وہ نہ تو "گل رعنا" میں شامل تھے اور نہ متداول کلام میں۔ لیکن دیوان کے آخر میں انھوں نے چند اشعار صرف "یادگار غالب" کے حوالے سے شامل کر لیے تھے۔ اسی طرح نواب احمد سعید خاں کے نسخے کے حوالے سے کچھ ایسا کلام شامل کر لیا تھا جس کے استناد پر بعد میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کو شبہ ہوا۔ (اس سلسلے میں تفصیل آگے پیش کی جائے گی)۔ الغرض یہ کوشش کی گئی تھی کہ انجمن کے ذریعے چھاپے جانے والا یہ دیوان جہاں تک ہو سکے مکمل اور مستند ہو۔

انجمن ترقی اردو کی مختصر رپورٹ بابت ماہ جون ۱۹۱۵ء میں مولوی عبدالحق نے تحریر کیا کہ "مرزا غالب کے دیوان کا صحیح ایڈیشن مرتب ہو چکا ہے اور صاف کیا جا رہا ہے۔ عنقریب مطبع میں بھیج دیا جائے گا۔" ۱۹۱۵ء دسمبر میں جب ایجوکیشنل کانفرنس پونا میں منعقد ہوئی تو مولوی صاحب نے مطلع کیا کہ

> "مرزا غالب کے اردو کلام کا صحیح نسخہ مرتب ہو گیا ہے۔ اس میں مرزا صاحب کا وہ کلام بھی شامل کیا گیا ہے جو مطبوعہ دیوان میں نہیں پایا جاتا۔ اس کی ترتیب اور جمع کرنے میں بہت وقت لگا۔ سید ہاشمی صاحب نے اس کام کے انجام دینے میں بڑی محنت اور سرگرمی سے کام کیا اور اس لیے ہر طرح ہمارے شکریے کے مستحق ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ وہ اب ہر طرح سے مکمل ہو گیا ہے اور طبع کے لیے بھیج دیا گیا ہے۔ نیز یہ انتظام کیا گیا ہے کہ دیوانِ غالب کا یہ اڈیشن نہایت صحت اور نفاست کے ساتھ طبع کیا جائے اس اہتمام کے لیے انجمن ظفر الملک علوی صاحب ایڈیٹر "الناظر" کی ممنون ہے"۔

لیکن اسی زمانے میں جیسا کہ سید ہاشمی نے ذکر کیا ہے:

> "نظامی پریس بدایوں سے دیوانِ غالب کا نیا نسخہ چھپ کر شایع ہوا۔ صحت یا حسن طبع کے اعتبار سے یہ ایسا نہ تھا جیسا کہ انجمن چھاپنا چاہتی تھی۔ لیکن مروجہ نسخوں سے کہیں بہتر تھا۔ لہٰذا اس کی اشاعت نے انجمن کے ولولۂ طبع کو سرد کر دیا اور اگر اسی زمانے میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم ولایت سے تشریف نہ لاتے تو غالباً انجمن کی تجویز نسیاً منسیاً ہو جاتی مگر ان

مرحوم کو کلام غالب سے اس قدر عقیدت تھی کہ بہت سی مصروفیتوں کے باوجود وہ انجمن کی تجویز کی عملی تکمیل پر آمادہ ہو گئے اور انجمن نے بڑی خوشی سے یہ کام اُن کے سپرد کر دیا؛ ۱۱

اکتوبر ۱۹۱۶ء میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری بھوپال بحیثیت مشیر تعلیم آگئے اور مولوی عبدالحق نے ان سے ملنے کے لیے سید ہاشمی کو بھوپال بھیجا۔ جیسا کہ راقم الحروف نے اپنے مضمون "دیوان غالب اور ڈاکٹر بجنوری" "شاعر" (بمبئی)۔ اپریل ۱۹۷۱ء۔ صفحات ۸ تا ۲۰ میں تفصیلات درج کی ہیں، ۱۵ر اکتوبر ۱۹۱۶ء کو بجنوری نے مولوی عبدالحق کو اپنے خط میں لکھا:

"مولانا ہاشمی صاحب سے یہاں ملاقات ہوئی۔ . . . (اُن) کی گفتگو سے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ شاید آپ کا ارادہ ہے کہ دیوان غالب کو لکھنؤ "الناظر" پریس میں ہی طبع کرا لیا جائے۔ گو کہ مجھے اس بات کا باور نہیں ہوتا لیکن اس چیز نے مجھ کو نہایت مشوش کر دیا ہے اور میں نہایت مضطربانہ التجا کرتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہ فرمایئے گا ورنہ تمام محنت برباد ہو جائے گی۔ جو دیوان لکھنؤ میں کتابت ہوا ہے نہایت عمدہ ہے لیکن اگر اس کی چھپائی کے لیے کسی نہایت اعلیٰ درجے کی کلوں کے پریس کا انتظام نہ کیا گیا تو کتنا ہی عمدہ کاغذ لگایا جائے حروف پھیل جائیں گے۔ سطریں غیر متوازی ہو جائیں گی اور تمام صورت نقشہ بگڑ جائے گا۔

میری رائے یہ ہے کہ اوّل تو لکھنؤ کے خوش نویس کے لکھے ہوئے مسوّدہ (کاپی) کو فوٹو کرانے کی کوشش کی جائے۔ یو۔ اے کلکتہ کا کارخانہ دنیا کے عمدہ کارخانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس میں صرف ایک قباحت ہے اور وہ یہ کہ لاگت بہت بڑھ جائے گی۔ بہر حال ایک اندازہ طلب کرنے میں مضائقہ نہیں

اس کے بعد ایک پریس بمبئی میں ایک شخص ہائے نامی نے کھولا ہے جو لیتھو میں بہترین بتلایا جاتا ہے۔ ہائے نے لیتھو کا فن یورپ میں تحصیل کیا ہے۔ اس سے پتہ لگا کر اس سے طبع کرایا جائے۔ جو دیوان غالب آپ طبع کرا رہے ہیں وہ ایک کتاب کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ایک یادگار کی حیثیت رکھتا ہے"؛ ۱۲

چنانچہ دسمبر ۱۹۱۶ء میں علی گڑھ میں منعقدہ ایجوکیشنل کانفرنس میں انجمن کی سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے مولانا نے مطلع کیا:

"مرزا غالب کے اردو دیوان کے جدید اڈیشن کے متعلق گزشتہ رپورٹ میں ذکر ہو چکا ہے۔ یہ اڈیشن بہمہ وجوہ مکمل و مرتب ہو چکا ہے۔ جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری بی اے۔ ایل ایل ڈی۔ بیرسٹرایٹ لا مشیر تعلیم ریاست بھوپال، اس کے لیے عالمانہ مقدمہ لکھ رہے ہیں۔ جناب مولانا عبدالحلیم صاحب شرر نے بھی اس ایڈیشن کے لیے ایک مضمون لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اب تک بوجہ جنگ اعلا درجے کا کاغذ دستیاب ہونے میں دشواری ہے۔ دوسرے اب تک لیتھو کا کوئی ایسا مطبع نہیں ملا جو اس اعلا درجے کی نفاست کے ساتھ چھاپ سکے جو انجمن کا منشا ہے۔ بعض صاحبوں کی یہ رائے ہے کہ فوٹو گراف کے ذریعے طبع کرایا جائے۔ اس کے متعلق بھی خط و کتابت جاری ہے کوشش کی جائے گی کہ آئندہ سال یہ طبع ہو جائے۔"[۱۲]

مولوی عبدالحق کے ایما سے ڈاکٹر بجنوری نے کلامِ غالب پر ایک مقدمہ لکھنے کا کام بھی سنبھال لیا۔ حالانکہ مولانا عبدالحلیم شرر نے مضمون تحریر کرنے کا وعدہ کر لیا لیکن شاید وہ اسے پورا نہ کر سکے۔ رضا علی وحشت کلکتوی نے ضرور اپنا مضمون مولوی صاحب کو روانہ کیا، لیکن وہ بھی انھیں مطمئن نہیں کر سکا۔ بعد میں رسمی انداز میں تحریر کیا ہوا یہ مضمون "غالب کا اندازِ بیان" کے عنوان سے "نقاد (آگرہ) کے جنوری ۱۹۲۰ء کے شمارے میں شایع ہوا۔ چناں چہ مولوی صاحب ان مضامین کے ذریعے جن پہلوؤں کا احاطہ کرنا چاہتے تھے۔ ان میں سے بیش تر کو سمیٹتے ہوئے ڈاکٹر بجنوری نے اپنا مقدمہ تحریر کیا۔ اور جیسا کہ بعد میں حالات نے موڑ لیا، مولوی صاحب کو دیوانِ غالب اپنے منصوبے کے مطابق شایع کرنے کا تو موقع نہیں ملا لیکن ڈاکٹر بجنوری کے اُس مقدمے کو نمایاں طور پر شایع کرنے کی مولوی صاحب نے پوری ذمہ داری نباہی جو اُن کے ایما اور اصرار پر تحریر کیا گیا تھا۔

دیوان کی تدوین، تصحیح اور تزئین کے سلسلے میں بھی ڈاکٹر بجنوری نے اپنی کوششوں کا آغاز کر دیا۔ ۲۷ر جولائی ۱۹۱۷ء کو انھوں نے مولوی عبدالحق کو تحریر کیا:

"دیوانِ غالب کی کاپیاں پہنچ گئیں۔ ایک نمونہ تیار ہو رہا ہے۔ جب تیار ہو جائے گا۔ روانہ ہوگا۔ علاوہ اس کے زنک بلیٹ فوٹو ٹائپ کرنے کے متعلق خط و کتابت کر رہا ہوں۔ کلکتہ کی ایک کمپنی تیار ہے۔ اوروں کے جواب ابھی تک نہیں آئے۔ تخمینوں سے اطلاع دوں گا۔ اگر آپ پانچ ہزار تک صرف کرنے کو تیار ہوں تو ضرور بہترین فوٹو زنک بلیٹ ٹائپ

بہترین جلد کے ساتھ، بہترین کاغذ سمیت، ممکن ہے۔ کاپی ممکن ہے کہ اور لکھوانی پڑے۔
فوٹو ٹائپ کے لیے یہ موزوں نہیں۔ چند تصاویر متعلق مضامین دیوان وغیرہ کے بھی بندوبست
کر رہا ہوں۔ دہلی سے قبر کی تصویر بھی منگوائی ہے۔"۱۴۱

ساتھ ہی ساتھ بجنوری نے سید ہاشمی کے دیوان میں شامل کیے گئے غیر متداول کلام کی تصدیق کے بارے میں اپنی چھان بین شروع کر دی تھی۔ شعیب قریشی اس وقت دہلی میں تھے۔ انھیں بجنوری نے اپنے ایک خط میں لکھا:

"نواب احمد سعید خاں صاحب کے [دیوان کے] حاشیہ پر جو غزلیں غالب کی دوسروں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں وہ کون کون سی ہے [کذا] نوٹ کر لیجیے گا اور اگر متداولہ نسخہ سے کہیں اختلاف ہو تو وہ اختلاف نوٹ کر لیجیے گا۔ چند اشعار اور ایک آدھ قطعہ غیر مطبوعہ جس کا خط میں ذکر کیا ہے وہ کیا ہیں۔ ضرور لکھ کر لائیے اور نسخہ کا حوالہ دینے کے لیے نسخہ کے لکھنے کا سنہ، کاتب کا نام وغیرہ، اگر کوئی مہر کہیں ہے، اُس کا پتا نشان کس شخص کے خط میں اضافی غزلیں اور چند اشعار، ایک آدھ قطعہ غیر مطبوعہ تحریر ہیں (شاید نواب صاحب کو معلوم ہو) وغیرہ وغیرہ بھی یادداشت کے طور پر درج کر لیجیے گا۔

واسوخت کے متعلق میں آپ کی رائے سے متفق ہوں اور ہاشمی کے اڈٹ کیے ہوئے دیوان سے (جو انھوں نے مجھ کو دے دیا ہے) اُس کو کاٹ دوں گا۔

لیکن سب سے بڑا مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا "تکیہ" والی غزل پوری طرح لکھ کر بھیجتا ہوں۔ سید ہاشمی نے جو دیوان کا اپنا اڈٹ کیا ہوا نسخہ مجھے دیا ہے، اس میں یہ غزل نواب صاحب کے حوالے سے درج ہے۔ اس کی تحقیق نواب صاحب سے مقصود ہے جہاں تک میں مرزا صاحب کے کلام اردو سے واقفیت رکھتا ہوں، زمین آسمان ٹل جائیں لیکن یہ اُن کا کلام نہیں ہو سکتا۔ اس کی تحقیق سخت ضروری ہے۔ دوسرے نواب صاحب کو اس بارہ میں ذاتی علم کیا ہے۔ تیسرے نواب صاحب کی اس بارہ میں رائے کیا ہے۔

طائر دل جو قطعہ ہے وہ بھی مرزا کا نہیں ہو سکتا۔ اس کے بارہ میں نواب

صاحب سے جو کچھ مطابق یا مخالف معلوم ہوسکے نوٹ کر بھیجئے گا۔"۱۵۵

مولوی عبدالحق ڈاکٹر بجنوری کی اس رائے سے متفق تھے کہ اس دیوان کی حیثیت یادگاری اور دستاویزی ہو۔ چنانچہ مولوی صاحب اور اُن کے احباب ڈاکٹر بجنوری کی ان کوششوں میں برابر ممد و معاون تھے چنانچہ دیوان کو آراستہ کرنے کے لیے غالب کی قبر کی تصویر، غالب کی تصویر کا عکس اور دوسرے نوادرات کی فراہمی کی کوشش ہو رہی تھی۔ مولوی عبدالحق تحریر فرماتے ہیں:

"اس کے لیے بہت سی نئی چیزیں جمع کی گئی تھیں۔ من جملہ ان کے ایک عجیب چیز خود مرزا کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اپنے حالات تھے جو انھوں نے کسی تذکرہ نویس کی فرمائش پر لکھے تھے۔ یہ ورق کہیں سے سید افتخار عالم مرحوم کے ہاتھ لگ گیا اور انھوں نے اپنی عنایت سے مرحوم بجنوری کو بھیج دیا تھا۔ اگرچہ یہ حالات انھوں نے اس طرح لکھے ہیں جیسے غیر شخص لکھتا ہے، لیکن عبارت کا رنگ صاف بتا رہا ہے کہ پردے میں خود مرزا نوشہ باتیں کر رہے ہیں۔ سید افتخار عالم نے ان حالات کے ساتھ (ٹیر) راجستھان جلد ۳ نمبر ۱۵ کا بھی ایک مطبوعہ ورق بھیجا تھا جس میں "تذکرہ مظہر العجائب" کا اشتہار شایع ہوا تھا۔ اغلب یہ ہے کہ یہ حالات مرزا نے اسی تذکرے کے لیے تحریر کیے ہوں۔ اس تذکرے کے مؤلف مولوی محمد انوار الحق صاحب مرحوم، مولوی احتشام الدین ایم۔ اے کے والد ہیں۔ معلوم نہیں اس تذکرے کا کیا حشر ہوا۔"۱۶۱

اسی تگ و دو میں تقریباً ایک سال گزر گیا۔ اگست ۱۹۱۸ء میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے دیوانِ غالب کی اشاعت کے پروگرام کو نیا موڑ دے دیا۔ مولانا عبدالسلام ندوی اپنی تصنیف "شعر الہند" کی خاطر چھان بین کرنے بھوپال آئے ہوتے تھے کہ انھیں بھوپال کی حمیدیہ لائبریری میں دیوانِ غالب کا ایسا قلمی نسخہ نظر پڑا جس میں غالب کا محذوف کلام بڑی مقدار میں موجود تھا۔ اس کا علم ہوتے ہی ۴ اگست ۱۹۱۸ء کو ڈاکٹر بجنوری نے یہ نسخہ اپنے پاس منگوا لیا اور ۲۰ اگست ۱۹۱۸ء کو انھوں نے مولوی عبدالحق کو لکھا:

"جس دن سے وہ نسخہ دیوانِ غالب کا میرے پاس آیا ہے، شہر کے علمی طبقے میں ایک ہلچل بپا ہے۔ آدھا بھوپال میرے خلاف ہے۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ اچھا ہوا مجھ کو ملا۔۔۔ میں علی الاعلان نوٹس دے چکا ہوں کہ خواہ کھڑے کھڑے بھوپال سے نکلنا پڑے، خواہ

جان جائے، نسخہ نہیں جاتا انشاء اللہ . . . .

جب ہاشمی صاحب آویں گے، اپنی مفصل تجویز پیش کروں گا۔ آپ ان کے ہمراہ جو تصاویر، آرائش کی چیزیں وغیرہ آپ نے جمع کی ہیں اور جو مصالحہ یا خط و کتابت وغیرہ ہے سب بھیج دیجیے گا۔ شعیب میری ہدایات کے مطابق چند چیزوں کی فراہمی میں مشغول ہیں اور سراپا سعی ہو رہے ہیں۔

کاغذ کا مسئلہ سب سے ٹیڑھا ہے۔ آپ علی گڑھ لکھیے۔ اگر کلیات خسرو میں سے کاغذ بچا ہو تو سب کو انجمن کے لیے فوراً خرید لیجیے۔ کسی طرح بے کار نہیں ہو سکتا۔ اگر بچ رہا یا خدا نخواستہ کام میں نہ آیا تو بک سکتا ہے۔ اگر اخبارات میں اعلان ابھی نہ دیا ہو تو اس میں بھی ابھی توقف کیجیے۔ ہاشمی صاحب سے گفتگو کر لوں۔

دیوان کے اڈٹ کرنے کا کام شروع کر دیا ہے جب ہاشمی صاحب تشریف لائیں گے تو کافی نمونہ پیش کر سکوں گا۔ فرمائیے کتنے روپے تک انجمن خرچ کر سکتی ہے۔ کاش اس وقت کہیں سے کچھ ہاتھ لگتا۔ سیرۃ النبی کی پہلی جلد پر آٹھ ہزار روپیہ خرچ ہے، پانچ ہزار تو اس کام کے لیے ہوتا۔"[۱۵]

اس خط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت بھوپال میں تو دریافت نسخے کے پیشِ نظر دو قسم کی تجاویز تھیں۔ بعض لوگ یہ چاہتے تھے کہ اس دیوان کی اشاعت کا افتخار ریاست کو ہی ملے کیوں کہ یہ ریاست کی لائبریری سے دریافت ہوا ہے۔ لیکن دوسرے ڈاکٹر بجنوری کے ہم نوا تھے اور وہ اس دیوان کے انجمن ترقی اردو کے زیرِ اہتمام شایع کیے جانے کے حق میں تھے۔ بہر حال دیوان کے ملتے ہی ڈاکٹر بجنوری نے اس کی اشاعت کی تیاریاں برق رفتاری سے شروع کر دیں اور مولوی عبدالحق اور دوسرے رفقا بھی ان کوششوں میں سرگرم ہو گئے۔ مولوی صاحب نے فوراً سید ہاشمی کو بھوپال بھیجا اور ڈاکٹر بجنوری نے ان کو اپنی تجاویز سے آگاہ کیا۔ نئے دیوان کی کتابت شروع کر دی گئی اور دوسرے وسائل کی فراہمی پر بھی پوری توجہ دی جانے لگی۔ "یادگارِ بجنوری" کے مقدمے میں مولوی صاحب لکھتے ہیں:

"جب مرزا غالب کے کلام کا قدیم نسخہ جو مرزا صاحب نے بھوپال کے فوجدار محمد خاں کو نذر کیا تھا، مرحوم کی نظر پڑا تو مارے خوشی کے بیتاب ہو گئے اور اس اصلی نسخے کی طباعت

کے لیے بڑے بڑے سامان کیے۔ اعلا درجے کے کاتب اور خاص قسم کے نفیس کاغذ کا انتخاب، طباعت کے لیے بلاکوں کا خاص اہتمام، بعض اشعار کی تشریح کے لیے چابکدست مصوروں سے تصویروں کی فرمائش۔ ان کا یہ انہماک دیکھ کر ان کے بعض دوست بھی (ظاہر ہے ان میں پیش پیش مولوی صاحب خود بھی تھے) اس شاہکار کی تکمیل میں اُن کے ساتھ شریک ہو گئے تھے۔ لیکن افسوس موت نے اتنی مہلت نہ دی اور یہ سب ٹھاٹھ یوں ہی پڑے کا پڑا رہ گیا"۔ ۱۸۱ه

قلمی دیوان کے ملنے کے تین ماہ بعد ہی، ۷ نومبر ۱۹۱۸ء کو انفلونزا کی وبا میں ڈاکٹر بجنوری کا انتقال ہو گیا۔ دسمبر ۱۹۱۸ء میں مولوی عبدالحق نے انجمن کی سالانہ رپورٹ ایجوکیشنل کانفرنس میں پیش کرتے ہوئے بتایا:

"انجمن دو تین سال سے مرزا غالب کے اردو دیوان کا صحیح اور عمدہ نسخہ شایع کرنے کا اعلان کر رہی ہے۔ اس کا مسوّدہ بڑی تلاش اور محنت کے ساتھ مرتب کیا گیا تھا اور صرف طبع کی دیر تھی۔ غالباً اس سال طبع بھی ہو جاتا لیکن ایک خاص واقعہ کی وجہ سے ملتوی کرنا پڑا۔ اگرچہ یہ تاخیر ناگوار ہوئی لیکن حکمت سے خالی نہ تھی۔ اس لیے کہ اب انجمن کو مرزا صاحب مرحوم کے تمام (مطبوعہ اور غیر مطبوعہ) کلام کے جمع کرنے کا فخر نصیب ہو گا۔ ۔ ۔ ۔

انجمن ترقی اردو کو تلاش سے بعض غیر مطبوعہ غزلیں اور خارج شدہ اشعار ضرور مل گئے تھے لیکن اس بات کی کسی کو امید نہ تھی کہ پورا خارج شدہ کلام کبھی میسر آجائے گا۔ یہ محض حسن اتفاق اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کی سعی کا نتیجہ ہے کہ بھوپال کے ایک کتب خانے سے یہ گنج گم شدہ برآمد ہو گیا۔ (میں اس امر کا اظہار کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ سب سے پہلے کتب خانہ حمیدیہ میں اس نسخے پر مولوی عبدالسلام صاحب کی نظر پڑی) انجمن کی درخواست پر ڈاکٹر صاحب اس کی تصحیح و طبع کا انتظام فرما رہے تھے کہ ان کی بے وقت اور پُر الم موت نے اس کے ساتھ بہت سی آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا۔ ۔ ۔ ۔

جناب صاحب زادہ نواب حمید اللہ خاں بہادر بی۔ اے نے اپنی خاص عنایت اور

علمی قدر دانی کی وجہ سے اس نسخے کے استعمال کی اجازت انجمن کو عطا فرمائی۔ انجمن جناب ممدوح کی بے حد ممنون ہے"۔[۱۹]

لیکن مولوی صاحب کا یہ اظہار خیال محض ایک خوش فہمی ثابت ہوا کیوں کہ ڈاکٹر بجنوری کے انتقال کے بعد ریاست بھوپال کے بااثر حلقوں میں اس رائے نے تقویت حاصل کر لی کہ دیوانِ غالب کی اشاعت کا کام انجمن ترقی اردو کو سونپنے کی بجائے ریاست کی جانب سے کیا جائے۔ چناں چہ مفتی محمد انوار الحق جنھیں ڈاکٹر بجنوری کے بعد ایجوکیشنل ایڈوائزر (مشیر تعلیم) کا عہدہ سونپا گیا انھیں ہی دیوانِ غالب کو ایڈٹ کرنے کی ذمہ داری دی گئی۔ اس طرح انجمن ترقی اردو، مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر بجنوری کے احباب و معاونین کو دیوانِ غالب کی ترتیب و اشاعت سے بے تعلق کر دیا گیا۔ چناں چہ سید سلیمان ندوی نے اکتوبر ۱۹۱۹ء کے "معارف" میں ڈاکٹر بجنوری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

"امید تھی کہ ان کے احباب اور انجمن ترقی اردو مرحوم کی یادگار میں اس نسخے کو چھاپ کر شایع کرے گی۔ لیکن مولوی عبدالحق سکریٹری انجمن کی زبانی یہ سن کر افسوس ہوا کہ مرحوم کی محنت و کاوش ریاستوں کی پولیٹکل کشمکشوں میں ضایع ہونا چاہتی ہے"۔[۲۰]

اس کے نتیجے میں مولوی عبدالحق اس نسخے کی اشاعت سے دست کش ہو گئے۔ لیکن انجمن کے واسطے ڈاکٹر بجنوری نے جو مقدمۂ کلام غالب تیار کیا تھا اس کی اشاعت انھوں نے اپنا فرض جانا۔ چناں چہ جنوری ۱۹۲۱ء میں انھوں نے انجمن کا سہ ماہی رسالہ "اردو" جاری کیا اور اُس کے پہلے شمارے میں انھوں نے بجنوری کے مقدمے کو سرِ فہرست جگہ دی اور اُسی سال اسے "محاسنِ کلامِ غالب" کے نام سے علیحدہ کتابی شکل میں بھی شایع کر دیا۔

اس طرح انجمن دیوانِ غالب تو شایع نہ کر سکی لیکن "محاسنِ کلامِ غالب" کی اشاعت سے غالب شناسی کو ایک نئی جہت ملی اور کلام غالب کے شائقین میں ایک نیا ولولہ اور جوش پیدا ہوا۔ "دیوانِ غالب" جدید (نسخہ حمیدیہ) ۱۹۲۱ء میں شایع ہوا۔ وہ ڈاکٹر بجنوری اور مولوی عبدالحق کے خواب کی تعبیر تو نہ تھا لیکن اس نے غالب کی عظمت کو مستحکم تر بنیادوں پر استوار کرنے کے اس مقصد کو کچھ حد تک ضرور پورا کیا جو انجمن کا مطمح نظر تھا اور جو مولوی صاحب کی تمنا تھی۔

حواشی

۱۔ ضمیمہ "الناظر"، مئی ۱۹۱۴ء۔ ص ۷۔ ۲؎ راقم الحروف کا مضمون "ای۔ایم فارسٹر اور ان کی تصانیف" "ہماری زبان"، یکم جنوری ۱۹۶۹ء۔ ص ۷۔

۳۔ مختصر رپورٹ انجمن ترقی اردو بابت ماہ اپریل ۱۹۱۴ء ضمیمہ "الناظر"۔ یکم جون ۱۹۱۴ء۔

۴۔ "غالب کا مزار"، ہفتہ وار کامریڈ (کلکتہ)، ۱۷ جون ۱۹۱۱ء بحوالہ سعادت علی صدیقی "غالب کی یادگار قائم کرنے کی اولین کوشش"، "اردوئے معلیٰ" (دہلی یونیورسٹی) غالب نمبر حصہ سوم۔ ص ۳۵۳۔

۵۔ ایضاً۔ ص ۳۶۶۔ ۶؎ "الناظر"، یکم جنوری ۱۹۱۵ء۔

۷۔ رپورٹ متعلق اجلاس بست و ہشتم۔ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورنٹیل ایجوکیشنل کانفرنس بمقام پونا۔ منعقدہ ۲۷، ۲۸، ۲۹ دسمبر ۱۹۱۴ء ص ۱۴۸، ۱۴۹۔

۸۔ سید ہاشمی: تبصرہ "دیوانِ غالب جدید (نسخہ حمیدیہ)"، "اردو (اورنگ آباد)" اکتوبر ۱۹۲۳ء ص ۷۰۳۔ ۹؎ "الناظر"، یکم اگست ۱۹۱۵ء۔ ص ۵۷۔

۱۰۔ "رپورٹ انجمن ترقی اردو"، رپورٹ متعلق اجلاس بست و نہم۔ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورنٹیل ایجوکیشنل کانفرنس بمقام پونا۔ منعقدہ دسمبر ۱۹۱۵ء۔ ص ۱۵۴۔

۱۱۔ تبصرہ "دیوانِ غالب جدید (نسخہ حمیدیہ)" از سید ہاشمی۔ "اردو" (اورنگ آباد) اکتوبر ۱۹۲۳ء ص ۷۰۳

۱۲۔ نقوش (لاہور)۔ مکاتیب نمبر۔ جلد دوم۔ ص ۵۷۹، ۵۸۰۔

۱۳۔ رپورٹ متعلق اجلاس سی ام۔ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورنٹیل ایجوکیشنل کانفرنس بمقام علی گڑھ منعقدہ دسمبر ۱۹۱۶ء ص ۸۳۔

۱۴۔ "نقوش" (لاہور)۔ مکاتیب نمبر۔ جلد دوم۔ ص ۵۸۰۔

۱۵۔ ڈاکٹر احمر لاری: "ڈاکٹر بجنوری اور تدوینِ دیوانِ غالب"۔ "ہماری زبان" (علی گڑھ) ۸ دسمبر ۱۹۷۲ء۔ ص ۳، ۴

۱۶۔ "مرزا غالب کی خود نوشتہ سوانح عمری کا ایک ورق" از عبدالحق۔ "الشجاع" (کراچی)۔ غالب نمبر۔ حاشیہ بلاک (بلا نمبر ص ۶، ۵) مابین صفحات ۲۴، ۲۵۔

۱۷؎ احمر لاری ، "ڈاکٹر بجنوری اور تدوین دیوانِ غالب" ، "ہماری زبان" (علی گڑھ) ۔ ۸ ؍ دسمبر ۱۹۷۲ء ص ۵ ، ۶ ۔

۱۸؎ مولوی عبدالحق "چند ہم عصر" ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن ۔ اردو اکیڈمی سندھ (کراچی) ۱۹۶۶ء ۔ ص ۳۷۸ ، ۳۷۹ ۔

۱۹؎ رپورٹ اجلاس منعقدہ بمقام سورت ماہ دسمبر ۱۹۱۸ء ص ۱۰۴ ، ۱۰۵ ۔

۲۰؎ "معارف" اکتوبر ۱۹۱۹ء ۔

ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ

مولوی عبدالحق اور بنگال میں اُردو تحریک

مولوی عبدالحق بابائے اردو کہلائے۔ کم از کم زندگی کے پچاس سالوں تک ان کا اوڑھنا بچھونا اُردو اور صرف اردو ہی رہا ہے۔ اردو سے متعلقہ مولوی عبدالحق کی خدمات کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک ان کی ادبی خدمات کا ہے۔ وہ اردو کے صاحبِ قلم ادیب اور محقق تھے۔ انھوں نے قواعد زبان اور لغات کے سلسلے میں بھی ٹھوس کام کیے۔ ان کی یہ خدمات ایسی ہیں جو اُن کا نام دنیائے اردو میں ہمیشہ بلند مقام پر رکھنے کے لیے کافی ہیں۔

دوسرے حِصّے کا تعلق اُردو زبان کی تحریک سے ہے۔ یہی وہ حِصّہ ہے جہاں اُن کی کئی باتیں مجموعی طور پر ہندستان اور خاص کر بنگال میں اردو تحریک کے راستے میں اکثر و بیشتر ہماری راہ میں آج بھی رکاوٹیں کھڑی کر دیتی ہیں۔ خود پاکستان کو بھی اُن کی اندھی اُردو محبت سے سخت نقصان ہوا ہے اور متحدہ پاکستان جو ٹوٹ کر اب دو ملکوں میں (بنگلہ دیش اور پاکستان) بٹ گیا ہے اُس میں مولوی عبدالحق کی اردو سے اندھی محبت اور بنگلہ زبان سے سخت نفرت کے جذبات شامل ہیں۔

مولوی عبدالحق کا عشقِ اُردو ان کے سر چڑھ کر بولتا رہا ہے۔ اس عشق نے انھیں نکمّا نہیں بنایا بلکہ جس طرح ایک نادان عاشق کو اپنی محبوبہ ہی میں تمام تر حسن، تمام تر خوبیاں نظر آتی ہیں اور وہ دیوانہ عاشق اپنی محبوبہ کے سامنے دیگر تمام بتوں کے حسن کو، اُن کی خوبیوں کو نہ صرف نظر انداز کر دیتا ہے بلکہ کم تر بھی سمجھتا ہے۔ ان سب کی مخالفت کرتا ہے۔ ان کی ہر خوبی سے اِنکار کرتا ہے اور پھر آگے بڑھ کر ان سے سخت نفرت کا کھلے عام اظہار کرنے لگتا ہے اور اِس طرح اپنے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہی کرتا جاتا ہے بالکل یہی حالت عشقِ اُردو میں آخری منزل پر پہونچ کر مولوی عبدالحق کی ہوئی تھی اور یہی وجہ ہے کہ اردو کے عشق میں وہ ہوش و حواس کھو بیٹھے اور انھوں نے بار بار کئی ایسی باتیں کہی ہیں جو نہ صرف غلط اور بے بنیاد ہیں بلکہ ہمارے لیے خطرناک بھی ہیں اور آج

اردو کی بقا و ترقی کی تحریک میں وہ باتیں ہماری راہ میں سخت رکاوٹیں بن گئی ہیں۔ ہمارے مخالفین، ہمارے دشمن، ہم سے کہتے ہیں کہ آپ کے بابائے اردو نے ہی تو یہ سب باتیں کہی ہیں۔

اردو ایک کل ہند زبان ہے۔ یہ اسی دھرتی پر پیدا ہوئی اور پروان چڑھی۔ یہ کسی خاص مذہب یا فرقے کی زبان نہیں ہے بلکہ سماجی تاریخی حالات کے تحت جس مشترکہ تہذیب نے ہندوستان میں جنم لیا، اردو اس مشترکہ تہذیب کی انمول نشانی ہے۔ ہندستان ہی اس کا وطن ہے۔ یوں تو یہ پورے ہندستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے لیکن اتر پردیش اُس کا سب سے بڑا گھر ہے۔ اِن باتوں کو مولوی عبدالحق بھی خوب جانتے تھے اور تقسیم ہند سے قبل بار بار انھوں نے ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن تقسیم ہند کے فوری اثرات کا مولوی عبدالحق درست تجزیہ نہیں کر سکے اور انھوں نے ترکِ وطن کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ہندستان چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔ یہ سمجھ کر کہ اب اردو کے لیے ہندستان میں کوئی جگہ نہیں رہی۔ اس کی ترقی کے لیے کچھ کرنا تو دور کی بات ہے بلکہ اسے بچائے رکھنا اور اُس کا نام لینا بھی اِس سرزمین میں ممکن نہیں ہے یعنی وہ ہندستان میں اُردو کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے۔ یوں تو کہنے کے لیے ہندستان سے اردو کے کئی ادبا و شعرا بھی پاکستان چلے گئے لیکن وہ لوگ صرف ادیب یا شاعر تھے اور عملی میدان میں اردو تحریک سے وابستہ نہیں تھے۔ لیکن مولوی عبدالحق اردو تحریک کے سب سے اہم رہنما تھے لہٰذا ان کے ترکِ وطن کا گہرا اثر اردو تحریک پر پڑا۔ اُن کے جانے سے اردو کے دشمنوں کو سب سے بڑا فائدہ پہنچا۔ وہ یہ ڈنکے کی چوٹ پر کہنے کے قابل ہو گئے۔ کہ اردو پاکستان کی زبان ہے جب کہ خود بابائے اردو ہی پاکستان چلے گئے اور یہ اعلان بھی کیا کہ اردو نے قیامِ پاکستان کی جنگ لڑی ہے، اردو نے پاکستان بنایا ہے۔

یہی مولوی عبدالحق کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ انھوں نے اِس امر پر غور نہیں کیا کہ صرف مذہب کی بنیاد پر ایک ملک کا اتحاد پائیدار نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ایک مذہب والوں کی کوئی ایک زبان ہو سکتی ہے۔ انھوں نے نہیں دیکھا کہ وہ نیا ملک جس کا نام پاکستان ہوا ہے، اس ملک کا سب سے بڑا حصہ مشرقی پاکستان ہے اور عالم وجود میں آنے والے اِس نئے ملک میں بنگلہ زبان بولنے والوں کی اکثریت ہے۔ صرف مذہب کی بنیاد پر ایک قدم کا جوشں ٹھنڈا بھی پڑ جا سکتا ہے۔ دنیا میں کئی چھوٹے بڑے ممالک ہیں جن کا مذہب، یا جہاں کی اکثریت کا مذہب تو اسلام ہے لیکن اُن کی قومیت

الگ الگ ہے۔ اسی طرح اگر ایک مذہب ایک قوم کا جوش، نئے معاشی، سیاسی، لسانی اور تہذیبی اختلافات کی بنا پر کوئی نیا موڑ لے تو نہ پاکستان ایک ملک رہ سکتا ہے اور نہ ہی اردو اس پورے ملک کی زبان رہ سکتی ہے جب کہ اس نئے ملک میں مختلف صوبائی زبانیں اور صوبائی تہذیبوں کی جڑیں بھی مضبوط ہیں۔ اُن صوبائی زبانوں سے اردو کا رشتہ یا لگاؤ کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو، اُن لوگوں کے لیے دل کی گہرائیوں سے اردو کو قبول کر لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جن حصوں کو لے کر یہ نیا ملک پاکستان بنا، ان میں صرف پنجاب کا علاقہ ہی ایک ایسا صوبہ ہے جہاں اردو کے لئے فضا سازگار ہے اور لاہور اردو زبان و ادب کا ایک اہم مرکز ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستان میں جب اردو کو قومی زبان قرار دینے کی تحریک چلی تو پنجاب ہی نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ اِس طرف اشارہ کرتے ہوئے شاہد احمد دہلوی نے صاف لکھا ہے ـــــــ "اُس نازک وقت میں اگر اہلِ پنجاب یہ کہہ کر سامنے نہ آتے کہ ہماری زبان اردو ہے تو آج اردو صرف مہاجروں کی زبان بن کر رہ جاتی ـــــ" (بزمِ خوش نفسان۔ شاہد احمد دہلوی۔ مرتب ڈاکٹر جمیل جالبی۔ مکتبہ اسلوب کراچی۔ ۱۹۸۵ء۔ صفحہ ۱۴۴)۔

مولوی عبدالحق نے اِس پر بھی غور نہیں کیا کہ حقیقی معنوں میں نئے ملک پاکستان میں اردو صرف اُن مہاجرین مسلمانوں کی زبان ہے جو اتر پردیش، بہار، دہلی اور حیدر آباد (دکن) وغیرہ سے یعنی ہندستان کے مختلف حصوں سے پاکستان گئے ہیں یعنی پاکستان میں اردو اپنی زمین سے اکھڑے ہوئے لوگوں کی زبان ہے۔ لہٰذا پہلا اور اہم ترین مسئلہ ان اکھڑے ہوئے لوگوں کے آباد ہونے، بسنے اور روٹی روزگار سے جڑ جانے کا ہے۔ نئی آب و ہوا، اور نئے ماحول میں اپنا قدم جمانے کے لیے ایک عرصہ چاہئے۔ اس کے بعد ہی یہ آبادی کسی اور بات پر غور و فکر کرنے کے لائق ہوگی۔ یہی فطری ہے۔ مولوی عبدالحق نے یہ نہیں سوچا کہ اُن اجڑے ہوئے لوگوں لوگوں کی کل آبادی، جن کی مادری زبان اردو ہے، وہ مجموعی طور پر ہندستان کی صرف دو بڑی ریاستوں یعنی اتر پردیش اور بہار کی اردو آبادی سے بھی کم ہے۔ اور اگر وہ خود پاکستان نہ جاکر ہندستان میں رہتے اور ہندوستان سے جانے والوں کو روکنے کی کوشش کرتے، ان سے کہتے کہ یہی اردو کا وطن ہے اور ہندوستان سے اس طرح پاکستان چلے جانے پر خود اردو کے گھر میں اردو کو سخت نقصان پہنچے گا، تو یقیناً ان کی آواز ہزاروں اور لاکھوں اردو بولنے والے سنتے، ان کی ہمت بندھتی۔ اور آج کے ہندوستان میں اردو کے لیئے فضا کافی ہموار ہوتی اور اردو کے دشمنوں

کی زبانیں بند رہتیں۔ لیکن افسوس مولوی عبدالحق نے ایسی دوراندیشی سے کام نہیں لیا۔

پاکستان جانے کے بعد ان کو وہاں جو ٹھوکریں کھانی پڑی ہیں، اُس پر روشنی ڈالنا یہاں ضروری نہیں ہے لیکن اتنا سچ ہے کہ انھوں نے پاکستان کی سرزمین پر اردو کے لیے جو تاج محل تعمیر کرنے کا خواب دیکھا تھا اور جس طرح سوچا تھا کہ محض مسلمان ہونے کے ناتے سب پاکستانی اردو کو بخوشی اپنے سر کا تاج بنا لیں گے، وہ خواب چُور چُور ہو گیا، جس سے نہ صرف وہ پریشان ہوئے بلکہ اُن کو دلی صدمہ پہنچا۔ اُن کے اِس ٹوٹے ہوئے دل کی پکار ہم "پاکستان میں اردو کا المیہ میں" پاتے ہیں۔

پاکستان میں جب انھوں نے دیکھا کہ سب بخوشی اردو کو قومی اور سرکاری زبان تسلیم کر لینے کے حق میں نہیں ہیں، تب وہ آگ بگولہ ہو گئے اور دیگر زبانوں کی مخالفت پر بلا سوچے سمجھے اتر آئے یعنی اپنے ہی دیرینہ موقف سے وہ بالکل ہٹ گئے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مولوی عبدالحق نے ایسی غلط باتیں کہی ہیں جس سے نہ صرف سابق پاکستان میں اردو سے نفرت اور دشمنی بڑھ گئی بلکہ جس کا بُرا اثر ہندوستان پر بھی پڑا، خاص کر مغربی بنگال میں بھی اردو کو نقصان پہنچا۔ مثلاً مولوی عبدالحق نے اردو کی حمایت میں ایک دو بار کہا ہے [۱]:

> "جہاں جہاں جس حد اور درجہ تک اردو مروج ہے، وہاں مسلمانوں میں اُسی حد اور درجہ تک شائستگی، روشن خیالی اور قومی شعور پایا جاتا ہے، اور جہاں جہاں اردو کا رواج کم ہے یا نہیں ہے، وہاں اُسی حد اور درجہ تک شائستگی، روشن خیالی اور قومی جذبہ مفقود ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو ایک بلند تہذیب کی نشانی ہے لیکن یہ کہنا کہ جہاں اس کا رواج کم ہے وہاں شائستگی، روشن خیالی اور قومی جذبہ وغیرہ بھی کم ہے یا مفقود ہے، کیا معنی رکھتا ہے؟ چاہے مولوی عبدالحق نے یہ بات صرف مسلمانوں کو مدِ نظر رکھ کر ہی کیوں نہ کہی ہو، لیکن بنیادی طور پر یہ دیگر لوگوں اور قوموں کی تہذیب و تمدن، شائستگی اور روشن خیالی کے خلاف ہے اور اُن سب کو کمتر قرار دینا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اِس خیال کو درست قرار دینا ممکن نہیں ہے۔ دوسروں کو کمتر قرار دینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم اچھی طرح ان کی تہذیب و تمدن، خیالات اور جذبات کو جانیں، اُن کا گہرا مطالعہ کریں کیوں کہ اس کے بغیر کوئی تقابلی مطالعہ ممکن نہیں ہے۔ دوسروں کو کمتر جاننا

یا سمجھنا نہ شائستگی ہے اور نہ روشن خیالی۔ اور پھر تہذیب و تمدن کی بنیاد محض زبان پر نہیں ہوتی۔ اگر مولوی عبدالحق کا مذکورہ بالا خیال درست بھی تسلیم کر لیا جائے، تب بھی اس طرح باتیں کہنے سے اردو کا کوئی بھلا نہیں ہو سکتا، بلکہ ہر حالت میں یہ نقصان دہ ہی ہے۔ دوسروں کو بُرا سمجھنا اور کہنا، اپنے حق میں مفید کیوں کر ہو سکتا ہے ـــــ ؟ اس سے تو نفرت پروان چڑھتی ہے۔ ہم ایسی باتیں کہہ کر محض اپنے دشمنوں میں اضافہ ہی کر سکتے ہیں۔

دنیا میں ایسے کئی ممالک ہیں جہاں ایک سے زیادہ سرکاری، دفتری یا قومی زبانیں ہیں۔ اس سے یقیناً مولوی عبدالحق آگاہ تھے لیکن اردو کے اندھے عشق میں مولوی صاحب یہ کسی طور برداشت نہیں کر پائے کہ پاکستان کی کوئی اور زبان کو بھی قومی یا سرکاری زبان ہونے کا شرف حاصل ہو۔ اس کا جو بھیانک نتیجہ نکلا وہ واضح ہے۔ لیکن آج ہندستان کی مختلف ریاستوں میں جہاں وہاں کی صوبائی زبانیں سرکاری زبانیں ہیں، ہم اردو والے وہاں یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ اگر کسی صوبے میں، بلکہ صوبہ کے ایک حصّہ یا ایک ضلع میں بھی اردو والوں کی آبادی آٹھ دس فیصد ہو تو اردو کو وہاں کی حد تک دوسری سرکاری زبان تسلیم کی جائے۔ اس جد وجہد میں کہیں کہیں ہمیں مکمل کامیابی یا کچھ نہ کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے اور اگر ہماری جد وجہد جاری رہے اور جمہوریت کی جڑیں اور مضبوط ہو جائیں تو ہمیں اس کا کامل یقین ہے کہ ہندستان کے کونے کونے میں اُردو کے ساتھ انصاف ہوگا۔

مجھے پاکستان سے بحث نہیں۔ وہاں جو دانشور ہیں، اہلِ علم و قلم ہیں، وہ حالات پہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں گے کہ اردو کی ترقی کے لیے انھیں کیا کرنا چاہیے۔ مجھے ہندستان اور خاص کر مغربی بنگال کے سلسلے میں عرض کرنا ہے۔ مغربی بنگال میں بھی جب اردو والے اپنے مطالبات کے لیے تحریک چلاتے ہیں تو مفاد پرست اور دشمنانِ اُردو، بابائے اردو کی باتوں کو دھراتے ہیں اور اردو کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں۔ ان کے نعرے بھی یہی ہوتے ہیں ـــــ (۱) اردو تحریک پاکستان کی زبان ہے (۲) اُردو نے پاکستان بنایا (۳) اردو مسلمانوں کی زبان ہے (۴) اردو اسلامی زبان ہے (۵) اردو تقسیم ملک کی زبان ہے (۶) اُردو پھوٹ ڈالنے والی زبان ہے ـــــــــ چند سالوں پہلے بھی اردو والوں کے چند مطالبات کو دبانے کے لیے مفاد پرستوں نے کلکتہ شہر کے مختلف دیواروں پر راتوں رات اسی طرح کے نعرے لکھتے ہوئے عوام سے سوال کیا تھا کہ کیا وہ لوگ اردو کا نعرہ بلند کر کے

ایک اور پاکستان چاہتے ہیں۔؟ اس طرح مخالفینِ اردو نے فرقہ پرستی کو ہوا دی تھی نتیجہ وہی ہوا، جو ہونا تھا۔!

لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایسے تمام نعروں کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ صاف بتا دیں کے اردو نے پاکستان بنانے کے لیے جنگ نہیں لڑی تھی بلکہ ابتدا ہی سے تحریکِ آزادی میں اردو نے بھرپور حصہ لیا ہے۔ تحریک آزادی ایک طویل تحریک ہے۔ اس نے کئی رخ بدلے، حالات بدلے، اور ملک تقسیم ہو گیا۔ اس کی ذمہ داری اردو والوں پر ہرگز نہیں ڈالی جا سکتی۔ اگر بنگالی مسلمان نہ چاہتے تو پاکستان بننا بھی دشوار تھا۔ بنگالی مسلمان اس وقت تقسیم کے حق میں تھے۔ وہ مسلم لیگ کے ساتھ تھے۔ بنگلہ زبان بولنے والوں میں بنگالی مسلمان اکثریت میں ہیں اور بنگالی مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ اگر ملک تقسیم ہوا، پاکستان بنا، تو اس نئے ملک میں ان کی اکثریت ہوگی، ان کا راج ہوگا، وہاں کی سرکاری زبان بنگلہ ہوگی۔ پھر نئے ملک پاکستان میں اردو اور بنگلہ کا جھگڑا ہوا، اور وہ ملک ٹوٹ گیا۔ اس کا کوئی تعلق نہ ہندستان سے ہے، نہ ہندستان میں اردو سے ہے اور نہ ہی مغربی بنگال سے ہے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، ہمیں ایسی باتوں کو بار بار کہنا ہے کہ اردو ہندستان میں پیدا ہوئی۔ اردو ایک ہندستانی زبان ہے، ملن اور بھائی چارگی کی زبان ہے۔ آپسی محبت اور بندھن کی نشانی ہے۔ اس کا ادب محض اسلامی ادب نہیں ہے۔ ہر زبان میں مذہبی لٹریچر موجود ہے اور اردو میں بھی مختلف مذاہب پر کافی لٹریچر ہے۔ ہندوؤں نے اردو کی تعمیر اور ترقی میں اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے۔ لہٰذا ہندستان میں اردو کو نہ صرف زندہ رہنے بلکہ پھلنے پھولنے کا پورا پورا حق ہے اور ہماری اردو تحریک اسی حق کو حاصل کرنے کے لیے ہے ——— چاہے مولوی عبدالحق بابائے اردو ہی کیوں نہ ہوں، اُن کی ہر بات پتھر کی لکیر نہیں ہو سکتی۔ اور ہر بات سچ نہیں ہو سکتی ——— اور نہ ہی ہم ان کی ہر بات کو درست تسلیم کرتے ہیں۔

ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی کے لیے نہ صرف اردو کے ادبا و شعرا اور دانشوروں، کے دروازوں پر دستک دینی پڑے گی بلکہ دیگر زبانوں کے ادبا، شعرا اور دانشوروں کو ساتھ لینا اور انھیں ہم خیال بنانا ہوگا۔ اس سے بھی زیادہ ضروری ہے اردو بولنے والوں کے در در پر جانا، اُن کو ساتھ لینا، اور ساتھ لے کر آگے بڑھنا کیوں کہ زبان کے اصل مالک عوام ہی ہوتے ہیں اور عوامی تعاون کے بغیر کامیابی ہرگز ممکن نہیں ہے۔

کشمیری لال ذاکر

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری

میں نے اپنے بہت سے دوستوں کے خاکے لکھے ہیں لیکن وہ سب ایسے دوست تھے جنھیں میں ذاتی طور سے جانتا تھا اور ان سے ملاقاتیں بھی رہی تھیں یا رہی ہیں۔ اس لیے ان سب خاکوں میں بہت ذاتی قسم کی باتیں بھی تھیں اور ذاتی قسم کے واقعات بھی تھے۔ دراصل خاکوں میں اگر ذاتی حوالے نہ ہوں تو وہ خاکے صرف مضمون بن کر رہ جاتے ہیں اور ان میں دل چسپی کے بہت سے پہلو ابھر نہیں پاتے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ جس خاکے میں اس کا لکھنے والا خود موجود نہیں ہوتا وہ خاکہ پر اثر اور دل چسپ نہیں بن پاتا۔

لیکن بابائے اردو مولوی عبدالحق کا خاکہ لکھنا میرے لیے بڑا دشوار مرحلہ ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے بہت بڑے بزرگوں کے بارے میں بہت کم لکھا ہے۔ بزرگ لوگ تو قابلِ تعظیم ہوتے ہیں۔ وہ تحریروں کا موضوع بنانے کے لیے تھوڑی ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ میں نے مولوی عبدالحق کو کبھی دیکھا نہیں صرف تصویروں سے ہی انھیں پہچانتا ہوں۔ میں نے البتہ ان کی وہ کرسی ضرور دیکھی ہے جو ان کے استعمال میں آتی تھی اور جو اب انجمن ترقی اردو کے دفتر کی زینت ہے اور ایک تخت پر رکھی رہتی ہے جس پر گرمیوں کے دنوں میں کبھی کبھی خلیق انجم کا ہیلمٹ بھی پڑا نظر آتا ہے۔ میں تقسیم کے بعد جب ہندوستان آیا تو سال دو سال تو اپنے آپ کو سنبھالنے ہی میں لگ گئے۔ اس عرصہ میں لکھنا پڑھنا بھی بہت کم ہوا۔ اور جب میں اس قابل ہوا کہ اہلِ قلم حضرات سے رابطہ قایم کر سکوں تو اس وقت تک کئی ادیب، شاعر، نقاد پاکستان چلے گئے تھے یا جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ مولوی عبدالحق کا نام بھی اسی فہرست میں شامل ہے۔ وہ جنوری ۱۹۴۹ میں مستقل طور پر پاکستان چلے گئے لہٰذا ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ مولوی صاحب کی نگارشات البتہ نظر سے گزرتی رہیں جن میں بڑا تنوع ہے۔ یہی تنوع اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کی اردو زبان کی خدمت کا دائرہ بے حد وسیع ہے اور یہ کہ انھوں نے اردو ادب کو اپنی نگارشات کا گراں قدر سرمایہ دے کر اسے

مالا مال کیا ہے۔

مولوی صاحب کی شخصیت اور ان کی خدمات کے لاتعداد پہلو ہیں۔ میں نے صرف اپنی بات ان کی "خاکہ نگاری" ہی تک محدود رکھی ہے میرا یہ خاکہ نما مضمون صرف ان کی ایک کتاب "چند ہم عصر" کا ہی احاطہ کرتا ہے، جس میں انھوں نے اپنے چودہ ہم عصر ادیبوں اور دوستوں اور قلم کاروں کے کچھ مختصر، اور کچھ طویل خاکے تحریر کیے ہیں۔ لیکن جس بات نے ان خاکوں کو اردو ادب میں ایک بلند مقام دیا ہے وہ ہے ان کا اپنا مخصوص اسٹائل اور پرسنل ٹچ اور یہی پرسنل ٹچ دراصل ان خاکوں کی جان ہے۔

پہلا خاکہ منشی امیر احمد کا ہے جس کے نیچے سال ۱۹۰۰ درج ہے۔ شاید یہ اس خاکے کی تصنیف کا سال ہے۔ خاکہ بہت طویل نہیں۔ لیکن اس خاکے میں سلطان واجد علی شاہ کی ایک بڑی دل چسپ عادت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"واجد علی شاہ کی یہ عادت عجیب تھی کہ وہ اپنے کتب خانے میں گئے اور اِدھر اُدھر سے چند کتابیں اٹھالیں اور کتاب کہیں سے بھی کھول کر چند ورق نقل کر لیے۔ اسی طرح جو کتاب سامنے آئی اس میں سے کچھ حصہ نقل کر لیا۔ وہ اس بات کا مطلق لحاظ نہیں کرتے تھے کہ یہ کتابیں کس مضمون کی ہیں یا میں نے مختلف مضامین اور علوم کی کتابوں کے اقتباس بے ٹھکانے جمع کر لیے ہیں۔ غرض بادشاہ کی کتابیں اسی طرح تصنیف ہوتی تھیں اور وہ خود، نیز ان کے درباری ان کتابوں کو اعلا تصانیف میں سے خیال کرتے تھے۔ ایسی ان مل بے جوڑ کتابوں کی شرح لکھنا اور ان میں ربط و سلسلہ قایم کرنا منشی صاحب مرحوم ہی کا کام تھا۔"

دوسرا خاکہ پروفیسر مرزا حیرت کا ہے۔ اس کے نیچے بھی سال ۱۹۰۰ ہی درج ہے۔ مولوی صاحب ان کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "مرزا حیرت صحیح النسب سید تھے مگر وہ ہمیشہ اسے چھپاتے رہے۔ وہ ۱۸۳۷ میں پیدا ہوئے یعنی جس سال کہ ملکہ وکٹوریہ تخت نشیں ہوئیں۔ پروفیسر حیرت مئی ۱۸۷۲ء میں الفنسٹن کالج بمبئی کے پروفیسر فارسی مقرر ہوئے اور چھبیس سال تک اپنا فرض نہایت حسن و خوبی کے ساتھ ادا کیا۔" مولوی صاحب کے خاکوں کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ انھوں نے جس بھی شخص کا خاکہ تحریر کیا اس کی شخصیت کے کسی بہت ہی روشن بنیادی پہلو پر اپنی نظر رکھی اور اسے بڑے پر اثر

انداز میں قاری کے سامنے پیش کیا۔ پروفیسر مرزا حیرت کی جس بنیادی خوبیوں سے مولوی صاحب متاثر ہوئے وہ تھیں، ان کا قوی حافظہ اور ان کے علم کی وسعت۔ کس خوب صورتی سے مولوی صاحب نے پروفیسر حیرت کی ان دونوں خوبیوں کی تصویر کشی کی ہے۔ اس کا اندازہ آپ مندرجہ ذیل اقتباس سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔

"ان کا علم اس قدر وسیع اور ان کا حافظہ اس قدر قوی تھا کہ اگر حافظ اور سعدی کی تصانیف دنیا سے مٹ جائیں تو وہ صرف اپنے حافظے کے زور سے بلا کم و کاست پھر پیدا کر سکتے تھے ان کو اساتذہ کے ہزارہا عربی اور فارسی اشعار یاد تھے اور موقع پر بلا تامل سیکڑوں اشعار پڑھتے چلے جاتے تھے۔ عربی اور فارسی انشار پردازی میں وہ عدیم النظیر تھے۔ کالج میں پڑھاتے وقت وہ کبھی کتاب ہاتھ میں نہیں لیتے تھے۔ ان کا حافظہ اس قدر صحیح تھا کہ اپنی یاد سے پڑھتے چلے جاتے، اور اس خوبی سے تمام مطالب کی تشریح اور تنقید کرتے تھے کہ طلبا کو حیرت ہوتی تھی۔ ہندوستان میں وہ عربی اور فارسی کے استاد یگانہ سمجھے جاتے تھے اور ایران میں بھی ان کا شمار مشہور انشا پردازوں میں تھا۔ مگر افسوس کہ ان کی طبیعت میں کچھ ایسا حجاب تھا کہ کبھی میدان شہرت میں قدم نہ رکھا اور نہ کوئی ایسا کام کیا کہ جس سے عام طور پر لوگ ان کی اعلا قابلیت کا صحیح اندازہ کر سکتے اور یہی وجہ ہے کہ پبلک میں ان کا سکہ نہ بیٹھا اور بہت سے لوگ بمبئی سے باہر ان سے ناواقف رہے۔"

خواجہ غلام الثقلین کا خاکہ مولوی صاحب نے ۱۹۱۵ء میں لکھا۔ خاکے کے پہلے پیرا میں مولوی صاحب نے ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، جو ہمارے معاشرے کی ایک تلخ سچائی ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

"بہت سے ایسے ہیں جو ایک چک پر دستخط کر دینے سے دنیا میں یکایک نامور ہو جاتے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جنھیں اتفاقات زمانہ نے بڑا آدمی بنا دیا ہے۔ بہت سے ایسے ہیں جو محض نام و نمود کے لیے زمین و آسمان ایک کر دیتے ہیں اور شہرت یا نام حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کر گزرتے ہیں اور آخر بڑے آدمی بن جاتے ہیں۔ لیکن کم ہیں جو محض اپنی لیاقت، محنت اور خلوص کے ساتھ کام کر کے عزت اور بڑائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ بڑائی پائیدار ہوتی ہے۔ خواجہ غلام الثقلین مرحوم اسی مظلوم اور چھوٹے گروہ میں سے تھے۔ وہ طالب علمی کے زمانے میں بھی اپنے مطالعہ اور وسیع معلومات کی وجہ سے ممتاز تھے اور تمام طالب علم دسوائے

بعض کھلنڈروں کے) اور پروفیسر انھیں وقعت کی نگاہ سے دیکھتے۔ یونین کلب میں ان کی تقریروں کی آتش فشانی اور اخوان الصفا میں ان کے مضامین کی فصاحت بیانی مشہور تھی۔"

خواجہ صاحب کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے مولوی صاحب لکھتے ہیں۔

"وہ اس قدر راست باز اور بے لاگ تھے کہ سچ بات کہنے میں کبھی کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور اسی لیے بعض لوگ ان سے خوش نہیں رہتے تھے مگر ان کی لیاقت اور سچائی کے سب لوگ قائل تھے۔ خود سید مرحوم انھیں محض ان کی قابلیت کی وجہ سے عزیز رکھتے تھے مگر اختلافات کرنے میں وہ ان سے بھی نہ چوکتے تھے۔ حالاں کہ ان کے سامنے بڑے بڑوں کے پر جلتے تھے۔ علی گڑھ کالج میں ان سے پہلے اور غالباً ان کے بعد بھی کوئی ایسا طالب علم نہیں ہوا جس کا مطالعہ ایسا گہرا، معلومات ایسی وسیع اور جو کام کرنے میں ایسا ان تھک ہو۔ وہ پرلے درجے کے ذہین اور ذکی تھے۔ وہ ہمیشہ علمی معاملات میں گفتگو کرتے اور پولٹکس اور خصوصاً انگلستان کے سیاسیات سے انھیں ابتدا سے بے انتہا دل چسپی تھی اور جس قدر انھیں اس سے واقفیت تھی ہماری قوم میں شاید ہی کوئی اس قدر واقف ہو۔ وہ درحقیقت علی گڑھ کالج کے سپوت تھے، لیکن مادرِ کالج کا برتاؤ ان کے ساتھ ہمیشہ ظالمانہ رہا۔ کئی بار ان کا نام پیش ہوا مگر وہ کبھی کالج کے ٹرسٹی منتخب نہ ہوئے اور حیرت و افسوس یہ ہے کہ ان کے مقابلہ میں ایسے لوگوں کو ترجیح دی گئی جن کا نام لکھنا بھی ہم اس صفحہ کاغذ پر گوارا نہیں کر سکتے۔ کالج کے کارنامے پر یہ بڑا دھبہ رہے گا۔"

مولوی صاحب اس طرح کی دیانتدارانہ اور بے لاگ رائے کا اظہار جس جرأت اور بے باکی سے کرتے تھے بہت ہی کم اہل قلم ایسا کر سکتے ہیں۔ انھیں اپنے آپ پر اتنا بھروسہ تھا کہ وہ کھل کر بات کرنے سے کبھی گھبراتے نہیں تھے۔

مولوی عبدالحق دوسروں کی خوبیوں کا بھی کھلے دل سے اعتراف کرتے تھے اور ان خوبیوں کی قدر بھی کرتے تھے۔ مولانا وحید الدین سلیم کے مختصر خاکے میں جو بھرپور تعریف کی تھی انھوں نے مولانا سلیم کی اس کا اندازہ آپ ان سطور سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ مولانا جیسی طبیعت اور ذہانت اور جدت کے بہت کم لوگ ہوتے ہیں، ان کی تحریر میں بڑی قوت تھی اور حافظہ بھی غیر معمولی پایا تھا۔ بات کی تہہ کو خوب پہنچتے تھے اور زبان کے تو استاد تھے۔ جدید تعلیم نہیں پائی تھی، مگر مغربی تعلیم کا جو منشا ہے، اس سے ایسے واقف تھے کہ بہت کم جدید تعلیم یافتہ واقف ہوں گے۔ انگریزی نہیں جانتے تھے، مگر جب انگریزی سے اردو میں اصطلاحات یا ترجمہ کرنے کی ضرورت پڑتی تھی تو انگریزی داں بھی ان کی واقفیت کو دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے، وہ الفاظ کے کینڈوں اور ان کی فطرت کو خوب سمجھتے تھے۔ اور لفظوں کی تلاش یا نئے لفظوں کے بنانے میں کمال رکھتے تھے اور لفظ ایسے موزوں اور جلد بناتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دماغ میں سانچے بنے بنائے رکھے ہیں۔ جن میں سے الفاظ ڈھلتے چلے آرہے ہیں۔"

گدڑی کا لال ــــ نور خاں

۱۹۳۰ میں لکھا ہوا ایک بڑا ہی پر اثر خاکہ ہے جو کہ ایک معمولی سپاہی کی اعلا شخصیت کی عکاسی کرتا ہے۔ خاکے کا آغاز ہی بڑا شاندار ہے۔ مولوی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"لوگ بادشاہوں اور امیروں کے قصیدے اور مرثیے لکھتے ہیں۔ نامور اور مشہور لوگوں کے حالات قلم بند کرتے ہیں میں ایک غریب سپاہی کا حال لکھتا ہوں، اس خیال سے کہ شاید کوئی پڑھے اور سمجھے کہ دولت مندوں، امیروں اور بڑے لوگوں کے ہی حالات لکھنے اور اور پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر اور غریب کا کوئی فرق نہیں ہے۔"

لیکن خاکے کا آخری پیرا تو مولوی صاحب کی طرف سے دفعدار نور خاں کو ایک بہت بڑا خراج محبت ہے۔ اقتباس پیش خدمت ہے۔

"وہ حساب کے کھرے، بات کے کھرے، اور دل کے کھرے تھے۔ وہ مہر و وفا کے پتلے اور زندہ دلی کی تصویر تھے۔ ایسے نیک نفس، ہمدرد، مرنج و مرنجان اور وضعدار لوگ کہاں ہوتے ہیں۔ اُن کے بڑھاپے پر لوگوں کو رشک آتا تھا اور ان کی مستعدی دیکھ کر دل

میں امنگ پیدا ہوتی تھی۔ ان کی زندگی بے لوث تھی اور ان کی زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا۔ مجھے وہ اکثر یاد آتے ہیں اور یہی حال ان کے دوسرے جاننے والوں اور دوستوں کا ہے۔ اور یہ ثبوت ہے اس بات کا وہ کیسا اچھا آدمی تھا۔ قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے نور خاں ہوتے!"

زیر بحث مجموعے کا سب سے مختصر خاکہ شیخ غلام قادر گرامی کا ہے۔ لیکن اس ایک صفحے کے خاکے میں گرامی کے بارے میں مولوی صاحب نے وہ بات کہہ دی ہے جو اس ٹھیٹ پنجابی لہجے والے شاعر کے بارے میں کسی اور ادیب، شاعر یا نقاد نے نہیں کہی فرماتے ہیں۔

"گرامی سچا شاعر تھا۔ ہمارے یہاں شاعر کے لیے جو جو لوازم سمجھے جاتے ہیں وہ سب اس مرحوم میں موجود تھے۔ بے نیاز و بے پروا۔ دنیا کے معاملات سے بالکل بے خبر، لاابالی۔ اگرچہ دنیا کی نظروں میں دیوانہ تھا مگر شعر کہنے میں فرزانہ تھا۔ پہروں عالم خیال میں غرق آپ ہی آپ گنگناتا رہتا تھا۔ اس وقت جو دیکھتا سچ مچ دیوانہ سمجھتا۔ گھر کا حال گھر والے جانیں اور باہر والے جانیں۔ وہ اپنے شعر میں مگن رہتا تھا۔ شعر اس جوش سے پڑھتا تھا کہ گویا شعر کے جگر میں گھسا جاتا ہے اور پڑھتے پڑھتے بے خود ہو جاتا تھا۔ ذوق سخن ایسا اچھا تھا کہ اچھا شعر سن کر وجد میں آجاتا تھا۔ صورت شکل، وضع قطع سے کبھی یہ خیال نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ایسا اچھا شاعر اور ایسا صاحب ذوق ہوگا اگرچہ بظاہر اکھڑ تھا مگر دل میں خلوص تھا۔ تواضع اس طرح کرتا تھا کہ جیسے کوئی کسی سے لڑتا ہے اور یہ اس کے عین خلوص کی علامت تھی دوستی کا سچا اور دوستوں کا قدردان تھا۔"

سب سے آخری خاکہ حالی پانی پتی کا ہے جس کے نیچے ۱۹۳۷ درج ہے۔ یہ آخری خاکہ سب خاکوں پر سبقت لے گیا ہے۔ کیا بھرپور خاکہ ہے۔ لگتا ہے مولوی عبدالحق حالی کی شخصیت، اس کی خوبیوں اور اس کی علمی قابلیت سے بے حد متاثر تھے۔ مجھے یہ خاکہ سب خاکوں سے اچھا لگتا ہے۔ اس میں شاید میرے ذاتی تعصب کا بھی دخل ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حالی پہلا ادیب اور شاعر تھا جس نے ہندوستان میں ترقی پسندی کی تحریک کا آغاز کیا۔ کیوں کہ میرا اپنا تعلق بھی اسی تحریک سے ہے اس لیے مجھے حالی پسند ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حالی کا تعلق ہریانہ سے ہے اور پانی پت برصغیر میں اس لیے مشہور ہے کہ یہ قصبہ الطاف حسین حالی کا وطن تھا اور یہیں بوعلی قلندر کے مزار

کے قریب اس کا مقبرہ ہے۔ اس حوالے سے میری حالی سے اس لیے بھی وابستگی ہے کہ میرے دو بہت ہی قریبی دوست حالی کے ہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ میری مراد خواجہ احمد عباس اور بیگم صالحہ عابد حسین سے ہے۔

لیکن اگر حالی سے میری ذاتی وابستگی نہ بھی ہوتی میں جب بھی مولوی صاحب کے اس خاکے کو، خاکہ نگاری کی ایک لاجواب مثال سمجھتا۔ خاکے کا آغاز دیکھئے ذرا۔ اقتباس طویل ہے لیکن ان سطور میں مولوی صاحب نے حالی کی سادگی اور دردمندی کو کس خوب صورت پیرائے میں پیش کیا ہے، اس کا اندازہ آپ کو بخوبی ہو جائے گا۔

"غالباً ۱۸۹۲ یا ۹۳ کا ذکر ہے جب میں مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ میں طالب علم تھا۔ مولانا حالی اس زمانے میں یونین کی پاس کی بنگلیا میں مقیم تھے۔ میں اس سال تعطیلوں کے زمانہ میں وطن نہیں گیا تھا بورڈنگ ہاؤس ہی میں رہا۔ اکثر مغرب کے بعد کچھ دیر کے لیے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ مولوی صاحب اس زمانے میں "حیات جاوید" کی تالیف میں مصروف تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ "یادگار غالب" کو بھی ترتیب دے رہے تھے۔ انھیں دنوں میں میرے ایک عزیز میرے ہاں مہمان تھے، میں جو ایک دن مولانا کے ہاں جانے لگا تو وہ بھی میرے ساتھ ہو گئے۔ کچھ دیر مولانا سے بات چیت ہوتی رہی لوٹتے وقت راستے میں عزیز مہمان فرمانے لگے کہ ملنے سے اور باتوں سے تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ وہی مولوی حالی ہیں جنھوں نے "مسدس" لکھا ہے۔ یہ مولانا کی فطری سادگی تھی جو اس خیال کا باعث ہوئی۔

ایک دوسرا واقعہ جو میری آنکھوں کے سامنے پیش آیا اور جس کا ذکر میں نے کسی دوسرے موقع پر کیا ہے۔ یہ ۱۹۰۵ کا ذکر ہے جب غفران مآب اعلاحضرت مرحوم کی جوبلی بلدہ حیدرآباد اور تمام ریاست میں بڑے جوش اور شوق سے منائی جا رہی تھی۔ مولانا حالی بھی اس جوبلی میں سرکار کی طرف سے مدعو کیے گئے تھے اور نظام کلب کے ایک حصے میں ٹھہرائے گئے۔ زمانۂ قیام میں اکثر لوگ صبح سے شام تک ان سے ملنے کے لیے آتے رہتے تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب جو علی گڑھ کالج کے گریجویٹ اور حیدرآباد میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے مولانا سے ملنے آئے، ٹم ٹم پر سوار تھے۔ زینے کے قریب اترنا چاہتے تھے — سائیس کی جو شامت آئی تو اس نے گاڑی دو قدم آگے جا کر کھڑی کی۔ یہ حضرت اس ذرا سی چوک پر آپے سے باہر ہو گئے اور ساڑ ساڑ کئی ہنٹر غریب کے رسید کر دیئے۔ مولانا یہ

نظارہ اوپر برآمدہ میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد وہ کھٹ کھٹ کر کے سیڑھیوں پر سے چڑھ کر اوپر آئے۔ مولانا سے ملے۔ مزاج پرسی کی اور کچھ دیر باتیں کر کے رخصت ہو گئے۔ میں دیکھ رہا تھا۔ مولانا کا چہرہ بالکل متغیر تھا، وہ برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے اور کہتے تھے "ہائے ظالم نے کیا کیا" اس روز کھانا بھی اچھی طرح نہ کھا سکے، کھانے کے بعد قیلولے کی عادت تھی وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ فرماتے تھے "یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں" اس کیفیت سے جو کرب اور درد مولانا کو تھا وہ شاید اس بدنصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہوگا۔

مولانا کی سیرت میں یہ دو ممتاز خصوصیتیں تھیں۔ ایک سادگی اور دوسری درد دلی اور یہی شان ان کے کلام میں ہے۔ ان کی سیرت اور ان کا کلام ایک ہے یا یوں سمجھیے کہ ایک دوسرے کا عکس ہیں"

مولوی صاحب کو حالی کا جو وصف بہت پسند تھا وہ ان کی بے تعصبی تھی۔ اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

"تعصب ان میں نام کو نہ تھا۔ ہر قوم و ملت کے آدمی سے یکساں خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ جب کبھی ہندو مسلم نزاع کا کوئی واقعہ سنتے تھے انھیں بہت رنج و افسوس ہوتا تھا۔ تحریر و تقریر میں تو کیا نج کی اور بے تکلفی کی گفتگو میں بھی ان کی زبان سے کبھی کوئی کلمہ ایسا سننے میں نہیں آیا جو کسی فرقے کی دل آزاری کا باعث ہو۔ بلکہ اگر کوئی ایسی بات کہتا تو برا مانتے اور نصیحت کرتے تھے۔ بے تعصبی کا وصف انہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے"

میں یہ سمجھتا ہوں کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے مولانا حالی کا جو اتنا طویل خاکہ تحریر کیا ہے اس کا ایک سبب مولوی صاحب کی حالی سے ذاتی قربت اور ذاتی پسند بھی تھی جسے محبت کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ خاکے کا آخری پیرا ان کے اس ذاتی تعلق کا مضمر ہے۔

"آخر میں اُن کی دو بڑی تمنائیں تھیں۔ ایک تو اردو زبان میں تذکیر و تانیث کے اصول منضبط کرنا اور ایک کوئی اور بات تھی جو اس وقت میرے ذہن سے بالکل نکل گئی ہے۔ جب میرا تقرر اورنگ آباد پر ہوا تھا تو میں نے مولانا کی خدمت میں لکھا کہ یہاں کی ہوا بہت معتدل اور خوش گوار ہے۔ پانی بہت لطیف ہے، اور خصوصاً جس مقام پر میں رہتا ہوں وہ بہت ہی

پر فضا ہے۔ آپ کچھ دنوں کے لیے یہاں تشریف لے آئیے صحت کو بھی فائدہ ہوگا اور جو کام آپ کرنا چاہتے ہیں وہ بھی آسانی سے انجام پا جائے گا۔ کوئی مخل اوقات بھی نہ ہوگا اور یقین ہے کہ آپ یہاں آکر بہت خوش ہوں گے۔ وہ آنے کے لیے بالکل آمادہ تھے مگر ان کے فرزند خواجہ سجاد حسین صاحب اور دوسرے عزیز و اقارب رضامند نہ تھے۔ عذر یہ تھا کہ دور دراز کا سفر ہے۔ ضعیفی کا عالم ہے۔ طبیعت یوں بھی ناساز رہتی ہے، ایسی حالت میں اتنی دُور کا سفر خلافِ مصلحت ہے۔ مولانا نے یہ سب کیفیت مجھے لکھ بھیجی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ جب تم اِدھر آؤ تو دو ایک روز کے لیے پانی پت بھی چلے آنا، اس وقت میں تمہارے ساتھ ہو لوں گا، پھر کوئی چوں و چرا نہیں کرے گا۔ جب میں گیا تو وہ بیمار ہو چکے تھے اور بیماری نے اتنا طول کھینچا کہ جان لے کر گئی۔"

میرا یہ خیال ہے کہ خاکہ نگاری کا فن بہت مشکل فن ہے اور اس میں نام پیدا کرنا آسان نہیں اس کے لیے ایک خاص قسم کے ذہنی رجحان، اور ڈسپلین کی ضرورت ہے۔ یہ فن سلو سائیکلنگ ریس (SLOW CYCLING RACE) کی طرح ہے۔ اپنی حدود کا خیال بہت ضروری ہے۔ خلوص، تفصیلات کا ذخیرہ، اور ریسرچ، کا انداز، مثبت اور منفی پہلوؤں کا توازن۔ بے لاگ اور دیانتدارانہ اظہار کا حوصلہ اور ان سب کے ساتھ زبان اور اسٹائل پر عبور اور پھر دلچسپ انداز سے بات کہنے کا ایسا ڈھنگ کہ پڑھنے والا مسحور ہو کر پڑھتا جائے، کہیں رکے نہیں۔ یہ ہیں کچھ بنیادی تقاضے ایک کامیاب خاکہ نگار کے۔

میں نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کو صرف ان کے خاکوں سے جانا ہے ورنہ ذاتی طور پر میں انھیں بالکل نہیں جانتا۔ اس کے باوجود میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مولوی صاحب فن خاکہ نگاری پر کمال کی دسترس رکھتے ہیں اور لگتا ہے کہ ہم جس شخص کا خاکہ پڑھ رہے ہیں وہ شخص بذات خود ہمارے سامنے کھڑا ہے اور ہم سے گفتگو کر رہا ہے۔ اس سے زیادہ کمال اور کیا ہوگا۔

لیکن بطور خاکہ نگار میں ایک بات ضرور کہنا چاہوں گا کہ ان سب خاکوں میں بابائے اردو نے کسی خاتون کا کوئی خاکہ تحریر نہیں کیا۔ وہ تو ہمارے درمیان میں نہیں جو میرے اس سوال کا جواب دے سکیں۔ اگر آپ میں سے کوئی صاحب یا صاحبہ میرے اس سوال کا جواب دے سکیں تو میں ہمہ تن گوش ہوں۔ نہیں تو میرے شبہات بنے رہیں گے اور شبہات کا بنے رہنا کسی بھی صورت میں مناسب نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر ہارون ایوب

مولوی عبدالحق کی تبصرہ نگاری

تبصرہ نگاری کا فن اس وقت وجود میں آیا، جب تصانیف عالمِ وجود میں آنا شروع ہوئیں اور اُن کی تشہیر کی ضرورت محسوس کی گئی، بقول ڈاکٹر ظ. انصاری:

"کالرج نے تبصرہ نگاری کو مستقل فن کی صورت دی اور پھر بعد کے تبصرہ نگاروں نے کالرج کے تبصروں سے کچھ اصول مرتب کرنے کی کوشش کی، لیکن اِن سب کے باوجود، آج تک کوئی مستقل کتاب تبصرہ نگاری کے اصولوں پر مرتب نہیں کی جا سکتی۔"

یہ حقیقت ہے کہ تبصرہ کا کوئی اصول نہیں ہے لیکن پھر بھی اِس فن نے بہت ترقی کی ہے۔

مولوی عبدالحق ایک عظیم محقق، بلند پایہ نقاد، معتبر لغت نویس اور قابلِ احترام زبان شناس کی حیثیت سے اردو میں اپنا ایک اہم مقام رکھتے ہیں انھوں نے مختلف موضوعات پر کتابیں اور مضامین تحریر کیے ہیں، ان میں تبصرے بھی شامل ہیں۔ تبصروں کی خاصی بڑی تعداد مختلف رسائل میں بکھری پڑی ہے۔ البتہ کچھ تبصرے ایک کتابچہ کی صورت میں شایع ہوئے ہیں اُس کا نام ہے "ادبی تبصرے"۔ اس کتابچہ میں ۱۵ اہم کتابوں پر مولوی عبدالحق کے لکھے ہوتے تبصرے شامل ہیں۔

اِن تبصروں کے مطالعے سے ایک طرف فنِ تبصرہ نگاری کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں تو دوسرا بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب کے مزاج اور اُن کے ادبی منصب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اِن تبصروں کی نوعیت آج کے تبصروں سے بہت مختلف ہے، کیوں کہ اِن میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ سرسری نہیں ہے اور نہ ہی غیر ضروری اعتراض کا پہلو نکالا گیا ہے بلکہ مولوی عبدالحق صاحب نے جو بھی بات کہی ہے، بہت غور و فکر کے ساتھ ساتھ گہرے مطالعے کے بعد کہی ہے۔ "مکتوبات حالی" پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ادب میں سیکڑوں دلکشاں ہیں، اُس کی بے شمار راہیں اور اَن گنت گھاتیں ہیں لیکن خطوط میں جو جادو ہے (بشرطے کہ خط لکھنا آتا ہو) وہ اس کی کسی ادا میں نہیں، نظم ہو، ناول ہو، ڈراما ہو یا کوئی اور مضمون ہو، غرض ادب کی تمام اصناف میں صنعت گری کرنی پڑتی ہے اور صنعت گری کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے، بناوٹ کی باتیں جلد پرانی اور بوسیدہ ہو جاتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہماری ہر علمی اور ادبی کوشش جو قلم سے نکل کر کاغذ پر آتی ہے، غیروں کے لیے ہے اور یہ سمجھ کر لکھتے ہیں کہ غیروں کے ہاتھوں میں جائے گی اور غیروں کی نظر میں اس پر پڑیں گی، اس لیے مصلحتِ وقت کا بھی خیال ہوتا ہے، عبارت آرائی بھی کرنی پڑتی ہے، تکلفات بھی برتنے پڑتے ہیں، خیال کو صاف صاف لکھنے کے بجائے طرح طرح کے پیرائے اختیار کرنے پڑتے ہیں لیکن جب انسان اپنے کسی عزیز یا دوست کو خط لکھتا ہے تو وہاں کوئی غیریت باقی نہیں رہتی بلکہ بسا اوقات دوئی کا پردہ بھی اٹھ جاتا ہے اور ہر مسئلے اور ہر شے کے متعلق جیسا کہ اس کا خیال ہوتا ہے، صاف صاف اور سچ سچ لکھ دیتا ہے، وہ اپنی رائے میں آزاد ہوتا ہے، وہ نہ دوسروں سے چوکتا ہے اور نہ اپنے آپ کو چھوڑتا ہے، اُس وقت نہ اسے خوف لائم ہوتا ہے اور نہ نکتہ چینی کا کھٹکا، خطوط کی یہی سادگی اور بے ریائی جو دلوں کو بھاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے، وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا، ان خطوط میں وہ مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے، جو خیال اس کے دل میں ہوتا ہے، اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے۔" (ادبی تبصرے۔ صفحہ ۷۶، ۷۷)

اس اقتباس سے ایک ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے یعنی مولوی عبدالحق نے جو بات بھی کہی ہے وہ بہت وثوق اور ذمہ داری سے کہی ہے، خواہ مخواہ آنے غیر ضروری اعتراضات بھی نہیں کیے ہیں نہ بلا وجہ خامیاں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، یہی وہ خوبی ہے، جو آپ کے تبصروں کو دوسروں سے منفرد کر دیتی ہے ملاحظہ فرمائیے ایک اقتباس "روح ادب" کے تبصرے سے، جو جوش ملیح آبادی کا مجموعہ کلام۔

"بلاشبہ حضرت جوش ایک جواں طبیعت، جدت پسند اور ہونہار شاعر و ناثر

ہیں لیکن جدت کے جوش میں انھیں ذوق سلیم کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے، اُن کی نثر میں تصنع اور تکلف کا دخل زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ حصول کمال کے لیے اس سے بچنا ضروری ہے۔

لیکن سب سے زیادہ مایوسی اور رنج ہمیں ان تصویروں کو دیکھ کر ہوتا ہے، جو اس کتاب میں بعض مضامین فطرت وجذبات کے ساتھ چسپاں کی گئیں ہیں۔ اس سے مصنف کے ذوق کا ایک حد تک اندازہ ہوتا ہے، بجائے اس کے یہ تصویریں ان جذبات کی گرمی اور حسن کو بڑھائیں۔ دیکھنے والوں پر الٹا اثر کرتی ہیں تعجب ہے کہ قابل مصنف نے اس قسم کی ادنی، عامیانہ اور بازاری تصویروں کو اس مجموعہ میں داخل کرنا کیوں گوارا کیا۔ ان تصویروں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سگریٹ کے بکسوں پر جو تصویریں آتی ہیں، ان کی ہوبہو نقل کر دی ہے یا انگریزی اخباروں اور رسائل کے اشتہاروں سے لی گی ہیں اس سے تو بہتر تھا کہ تصویریں شریک ہی نہ کی جاتیں، ورنہ اس کا خاص اہتمام کیا جاتا اور نازک خیال مصوروں سے بنوائی جاتیں" (ادبی تبصرے صفحہ ۶-)

تبصرے کے لغوی معنی روشن کرنے، تعارف کرانے، کسی چیز سے پردہ اٹھانے اصل صورت دکھانے وغیرہ کے ہیں۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مادہ نقد ہے نقد کے معنی پرکھنے کے ہیں، اسی لیے تنقید اور تبصرہ ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں اور زیادہ تر لوگ تبصرے کو تنقید کے دائرے میں لے جاکر کھڑا کر دیتے ہیں، جب کہ تنقید اور تبصرے میں بہت فرق ہے، اس فرق کو مولوی عبدالحق صاحب نے سب سے پہلے محسوس کیا اور اپنے تبصروں میں اس کا پورا خیال رکھا اور ہماری آپ کی، سب کی رہنمائی کی کہ تبصرہ کیسے کرنا چاہیئے؟

گو تبصرہ اور تنقید کی سرحدیں مل جاتی ہیں لیکن پھر بھی ان میں فرق اور امتیاز کو مولوی عبدالحق صاحب نے ملحوظ رکھا اور تبصرے کے جو معنی ہیں یعنی دکھانا، بینا کرنا، جائزہ لینا، اس کا پورا خیال رکھا۔ دکھانے کے ساتھ ساتھ متعارف کرانے کا کام بھی بہت سلیقے سے کیا، کیوں کہ تعارف کرانے میں بھی ایک خاص رکھ رکھاؤ۔ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مولوی عبدالحق اپنے قارئین سے الطاف حسین حالی کا تعارف یوں کراتے ہیں۔

• دنیا میں بڑے آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کا ہم ادب و احترام کرتے ہیں، دوسرے وہ جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ ادب ہم ان اولوالعزم اور عالی حوصلہ مدبروں اور وطن پرستوں اور باکمال حکیموں اور ادیبوں کا کرتے ہیں، جن کے حیرت انگیز جدوجہد، قربانیوں اور عظیم الشان کاموں اور تدبیروں نے اور جن کے علم و کلام نے عالم کو فیض پہنچایا اور روشن سورج کی طرح تاریکی کو مٹایا۔ محبت ہم ان سے کرتے ہیں۔ جن کی پاک سیرت، خوش اطواری اور خوش اخلاقی دل کے موہنے میں وہی کام کرتی ہے، جو چودھویں رات کی چاندنی، ان کے پاس سے جو اٹھا کچھ لے کر اٹھا اور ان کے پاس جو گیا، کچھ بن کر آیا۔ مولانا حالیؔ ان پاک نفوس میں سے ہیں، جن کا ہم ادب بھی کرتے ہیں اور ان سے محبت بھی۔" (ادبی تبصرے صفحہ ۶۲)

ایک اقتباس اور ملاحظہ فرمائیے جو ناٹک ساگر کے تبصرے سے لیا گیا ہے، جس میں مولوی عبدالحق صاحب نے لغوی معنوں کا خاص خیال رکھا ہے۔

"ہمیں یقین ہے کہ اس کتاب کی اشاعت ڈرامے سے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کو رفع کرے گی اور بہت سے ایسے نکتے معلوم ہوں گے، جن سے ہم بے خبر تھے اور ملک کے انشا پردازوں کے لیے ہدایت کا کام دے گی، جو صاحب ڈرامے سے شوق رکھتے ہیں یا جن کا رجحان اس طرف ہے، ان کے لیے یہ کتاب ایک نعمت ہے نور عمر صاحبان قابلِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اردو ادب میں بہت اچھا اضافہ کیا ہے اور ایسے مضمون پر کتاب لکھی ہے، جس سے ہماری زبان خالی تھی" (ادبی تبصرے، صفحہ ۵۲)

دراصل تبصرہ نگار کا کام ابتدائی ہوتا ہے اور تنقید نگار کا کام انتہائی، مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے ہر تبصرے میں اس بات کا خیال رکھا ہے اور قارئین کے سامنے کتاب اور مصنف کا تعارف اس انداز سے کرایا ہے کہ خوبیاں اور خامیاں دونوں ہی اجاگر ہو کر سامنے آگئیں ہیں اور کتاب کے ساتھ ساتھ مصنف کی بھی صحیح تصویر قارئین کی نظروں میں ابھرتی ہے، جو تبصرہ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے اور بے اختیار اس کا جی چاہ اٹھتا ہے کہ وہ کتاب خریدے اور اس کا مطالعہ کرے۔ ن۔ م راشد کے مجموعۂ کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اب میں نیا اور پرانا کوئی چیز نہیں، جس ادب میں تازگی، جدت اور گہرائی ہے۔ خواہ دو ہزار برس پہلے کا کیوں نہ ہو، نیا ہے اور جس ادب میں یہ خوبی نہیں، خواہ وہ آج ہی کا لکھا ہوا، کیوں نہ ہو، پرانا ہے۔" (ادبی تبصرے صفحہ ۸۵)

حالاں کہ تبصرہ نگاری کے کوئی اصول ابھی تک مرتب نہیں کیے جا سکے ہیں۔ مگر فطری طور پر چند باتیں سامنے آگئی ہیں اور جس پر مولوی عبدالحق شدت سے کاربند نظر آتے ہیں، اسی لیے ان کے تبصرے عام تبصروں سے بہت مختلف ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک تبصرہ نگار کو یہ بھول جانا چاہیے کہ کتاب کا مصنف کون ہے؟ اور صرف اس بات پر توجہ دینا چاہیئے کہ کتاب میں کیا لکھا ہے، اس کی نوعیت کیا ہے، اس کی قدر و قیمت کیا ہے یعنی تبصرہ نگار اور مصنف کے ذاتی تعلقات درمیان میں نہیں آنا چاہیئے اور اس بات کا پورا پورا خیال مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے تبصروں میں رکھا ہے۔ انھوں نے اپنے ہم عصروں کی کتابوں پر بے لاگ تبصرے کیے ہیں، جوش ملیح آبادی کا مجموعہ کلام "آیات و نغمات" کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"لیکن جب سلام اور نوحے یا اسی قسم کی نظمیں لکھتے ہیں (جیسا کہ اس مجموعہ میں پائی جاتی ہیں) تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا دل پرانے اوہام اور عقائد سے اس قدر اٹا ہوا ہے کہ روشنی کی ایک کرن کا بھی وہاں گزر نہیں۔ انقلاب، نظام جدید اور ہر جدید رنگ پر فریفتہ ہیں، جوش و خروش اور انقلاب کے نعروں سے اُن کا کلام گونج رہا ہے لیکن انقلاب کیا ہے؟ نظام جدید سے کیا مطلب ہے؟ اس سے انھیں بحث نہیں" انھیں تو غارت گری سے مطلب ہے۔" (صفحہ ۸۷)

یہ ہے مولوی عبدالحق کی دیانت داری اور بے باکی، جو ان کے تبصروں میں پائی جاتی ہے اور ان کے تبصروں کو مثالی تبصرے بنا دیتی ہے۔ مولوی عبدالحق کے یہ تبصرے اردو تبصرہ نگاری کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مولوی عبدالحق صاحب نے بہت بڑی تعداد میں تبصرے لکھے ہیں، اُن کے یہ تبصرے مختلف رسائل میں شایع ہو چکے ہیں، کُل ۱۵ کتابوں پر تبصرے "ادبی تبصرے" کے عنوان سے کتابی صورت میں شایع ہوئے ہیں، اس کتاب پر کوئی دیباچہ نہیں ہے۔ کل ۸۷ صفحات کی یہ چھوٹی سی کتاب ہے،

جس کا پہلا ایڈیشن، دانش محل، لکھنؤ نے ۱۹۴۷ء میں شایع کیا تھا اور یہ دوسری بار بھی دانش محل، لکھنؤ سے ۱۹۶۴ء میں شایع ہوئی تھی۔ اب یہ کتاب نایاب ہے۔ پرانی لائبریریوں میں تو مل جاتی ہے لیکن بازار میں دستیاب نہیں ہے۔ اس لیے اس بات کی شدید ضرورت محسوس کر رہا ہوں کہ تلاش و جستجو کر کے مولوی عبدالحق کے لکھے ہوئے تمام تبصرے یکجا کیے جائیں اور انھیں پھر کتابی صورت میں شایع کیا جائے۔ یہ کام اس لیے بہت ضروری ہے کیوں کہ مولوی عبدالحق کے تبصرے آج کی مروجہ طرز تبصرہ نگاری سے بہت مختلف ہیں اور ہمیں تبصرہ کرنے کے لیے نئی راہیں دکھاتے ہیں۔

جو حضرات فن تبصرہ نگاری کے اصولوں سے آشنا ہونا چاہتے ہیں اُن کو چاہیے کہ وہ مولوی عبدالحق کے تبصروں کا ضرور مطالعہ کریں اور جس طرح کالرج کے تبصروں سے ان کے بعد کے تبصرہ نگاروں نے تبصرہ نگاری کے اصول مرتب کرنے کی کوشش کی تھی، ٹھیک اسی طرح کوئی صاحب اگر تبصرہ نگاری کے اصولوں پر کتاب مرتب کرنا چاہیں تو میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ مولوی عبدالحق کے تبصروں کو بنیاد بنائیں تو یقیناً ایک بہتر اور مفید کتاب تیار ہو جائے گی۔

یوسف ناظم

مولوی عبدالحق خطوط کے آئینے میں

ہندوستان کے محکمہ ڈاک کو اردو کے جن ادیبوں اور شاعروں سے بکثرت رقمی فایدہ پہنچا ہے اُن زعمائے مکتوب نگاری میں، میں سمجھتا ہوں بابائے اُردو مولوی عبدالحق اپنے پیشرو اسداللہ خاں غالب، اپنے ہم عصر رشید احمد صدیقی اور نیاز فتحپوری سے بھی آگے ہیں۔ وجہ ان کی سبقت کی یہ ہوگی کہ مولوی صاحب اردو کے خدمت گار ہونے کے علاوہ سرکاری ملازم بھی تھے اور وہ بھی محکمہ تعلیمات میں۔ مرحوم ریاست حیدرآباد میں مولوی صاحب کے تعلقات مہاراجہ سرکشن پرشاد سے لے کر محکمہ تعلیمات کے ادنیٰ سے ادنیٰ کارکن اور کالج کے تمام ماتحتین سے تھے۔ انجمن ترقی اردو جسے میں بنت عبدالحق کہنا پسند کروں گا کے دفتر کے تمام ساتھی مولوی عبدالحق کے ارکین خاندان تھے۔ ان تمام افراد سے مولوی صاحب کو والہانہ محبت تھی اور وہ ان سب کے گھریلو معاملات میں بھی دخیل تھے یعنی ان کے تقررات، تبادلوں، تنخواہوں وغیرہ سے متعلق سارے مسائل مولوی صاحب ہی حل کرتے تھے۔ اسی لیے مولوی صاحب کی خطوط نگاری کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ مولوی صاحب کے ایک شاگرد رشید محمد اکبرالدین صدیقی نے مولوی صاحب کے وہ خطوط کتابی صورت میں شایع کیے ہیں جو مرحوم نے اپنے نیازمندوں کے نام لکھے ہیں۔ اکبرالدین صدیقی نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے "مولوی صاحب کے خطوط کے تین مجموعے اردو سے مصفا مکتوبات عبدالحق" اور مکاتیب بابائے اردو" (امامی صاحب) منظر عام پر آئے۔ ان کے علاوہ رسایل میں بھی مولوی صاحب کے اکثر و بیشتر خطوط شایع ہوئے ہیں لیکن ان خطوط کو اگر بغور پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھیں بآسانی دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو وہ خطوط ہیں جو مولوی صاحب نے اپنے کرم فرماؤں اور ہمسادی مرتبہ رکھنے والوں کے نام لکھے ہیں دوسرے وہ خطوط ہیں جو ان کے نیازمندوں کے نام ہیں۔"

میں انھی خطوں میں سے چند خط آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ مولوی عبدالحق

بحیثیت شخص کیا اور کیسے تھے انہی خطوں کے ذریعے انھیں دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ اردو زبان جسے اس دیس کی گوری کہنا چاہیے۔ کیسے آبرو باختہ ہوئی اس کی تفصیل بھی انہی نجی خطوں میں ملے گی اور آپ کے ذہن میں میرؔ کا یہ شعر در آئے گا۔

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

وہی مولوی عبدالحق جنھوں نے کراچی سے ظفر الرحمان مرحوم کے نام ۱۹۴۸ء میں یہ لکھا تھا کہ اُردو انجمن زندہ ہے اور انشا اللہ زندہ رہے گی اور فروغ پائے گی۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ میں دکھادوں گا کہ ہم اِن ناسازگار حالات میں بھی کام کر سکتے ہیں۔ اردو ترقی کرے گی اور جتنا دبایا جائے گا اتنی ہی پھیلے گی۔[۱] انہی مولوی عبدالحق نے کراچی سے یکم نومبر ۱۹۵۸ء کو سید ساجد علی مرحوم کو اپنے خط میں لکھا "میں خیریت سے ہوں لیکن اردو کی خیریت کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ آپ نے لکھا ہے وہاں اب اس میں کچھ جان پڑ رہی ہے۔ دل کی تسلی کے لیے تو یہ بات کافی ہے لیکن حقیقت سے دور ہے۔۔۔ یہ نہ پوچھئے پاکستان میں اس کا کیا حال ہے ورنہ یہ خط میرانیس کا مرثیہ ہو جائے گا اور میرے قلم سے روشنائی کی بجائے خون ٹپکنے لگے گا۔ میں اپنا ایک کتابچہ "پاکستان میں اردو کا المیہ" بھیجتا ہوں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا موچی کو عرش پر بھی بیگار جو مثل ہے بعینہٖ میرا وہی حال ہے"[۲]۔

یہ دو اقتباسات تو میں نے صرف اس لیے نقل کیے کہ مولوی عبدالحق بابائے اردو تھے اور اپنی چہیتی بیٹی کو کسی حال میں فراموش نہیں کر سکتے تھے ورنہ میں تو اصل میں ان خطوں کا عاشق ہوں جن میں مولوی عبدالحق کی محبت ٹھاٹھیں مارتی ہے اور ان کے خلوص کی روشنی جنھیں بقعۂ نور بنا دیتی ہے گویا وہ خط نہ ہوں کوئی شادی خانہ ہوں۔ مثال کے طور پر اپنے ایک خط میں اپنے اورنگ آباد کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے "آپ کا اشفاق نامہ پہنچا۔ اسے پڑھ کر تھوڑی دیر کے لیے دوسرے عالم میں جا پہنچا۔ اورنگ آباد کی محنتوں رفیقوں اور احباب کی محبت، عنایت، کالج اور انجمن کی سرگرمیوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اس برعظیم پاک وہند کا شاید ہی کوئی بڑا چھوٹا شہر، قصبہ وقریہ

---

[۱] خطوط مولوی عبدالحق مرتبہ محمد اکبرالدین صدیقی

[۲] ایضاً ص ۱۷۵، ص ۱۷۶

ایسا ہو جس کی خاک میں نے نہ چھانی ہو۔ شہر اور قصبے تو میری جولان گاہ تھے۔ پہاڑوں، جنگلوں، دریاؤں اور سمندروں کی بھی جی بھر کے سیر کی۔ جن دنوں مجھ پر اردو زبان کا جن سوار تھا اور ہندی والوں اور کانگریس حکومتوں سے معرکہ آرائی تھی تو میں سچ مچ زمین کا گز بنا ہوا تھا۔ زندگی کا وہ دور عجیب و غریب تھا۔ اگر تحریر میں لاؤں تو الف لیلہ کی داستان معلوم ہوگی۔ اس سرگردانی اور آوارہ گردی میں کبھی کبھی میرا قیام ایسے پُرفضا، صحت افزا اور خوش منظر مقامات میں بھی رہا جنھیں دیکھ کر خدا کی قدرت نظر آتی تھی لیکن یقین جانیے اورنگ آباد کی یاد وہاں بھی مجھے گدگداتی تھی۔ اورنگ آباد کا وہ مقام جہاں میرا قیام تھا یعنی مقبرہ رابعہ دورانی اُسے میں کبھی نہیں بھول سکتا اس کی صاف ستھری ہوا، عنبری نہر کے لطیف پانی، اس کے دلربا ماحول اور قدرت و صنعت کی یکجائی میں ایسی کشش تھی کہ حیدرآباد چھوڑنے کے بعد بھی میں ہر سال وہاں جاکر کچھ دن بسر کرتا اور اسے اپنی صحت و توانائی اور مسرت کا ضامن سمجھتا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی یہ جی چاہتا ہے کہ اورنگ آباد جاؤں اور چند روز "مقبرے" میں جاکر رہوں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے یہ حسرت میرے ساتھ قبر تک جائے گی"۔[1]

مولوی عبدالحق نے اورنگ آباد کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ میں تو اسے وطن ثانی بھی نہیں کہوں گا وطن اول ہی کہوں گا۔ سارا ہندوستان یہی سمجھتا تھا کہ ایک غیر معروف قصبے ہاپڑ میں ولادت پانے والے مولوی عبدالحق اورنگ آباد دکن ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ غلط فہمی، تسامح ہونے کے باوجود کتنی صحت مندانہ تھی۔ مولوی عبدالحق کہنے کو اہل و عیال سے بے نیاز تھے لیکن انجمن ترقی اردو اورنگ آباد انٹرمیڈیٹ کالج اورنگ آباد کالج کا رسالہ "نورس" انجمن کا رسالہ اردو یہ سب اُن کی اولادیں تھیں جن پر بابائے اردو کی شفقت، مودّت و محبت، محنت اور مشقت، خلوص اور لگن کی موسلا دھار بارش ہوا کرتی تھی۔ انجمن کے کاموں کے سلسلے میں مولوی صاحب کو جگہ جگہ جانا پڑتا تھا۔ اس لیے یوں سمجھئے کہ مولوی عبدالحق نے صرف محکمہ ڈاک ہی کی کفالت نہیں کی محکمہ ریلوے اور دیگر ذرائع آمد و رفت کو بھی مالا مال کیا۔ ایک خط میں انھوں نے ظفرالرحمان صاحب کو لکھا تھا "کل صبح رام پور جارہا ہوں بھی کو ہر ایک کے پاس جانا پڑتا ہے" پہلے تو وہ اورنگ آباد کے قریب کے تمام ضلعوں، تعلقوں اور قصبوں

---

[1] خطوط عبدالحق صفحہ ۱۷۴، ۱۷۵ (۲) صفحہ ۸۲

میں گھومے پھر ہندوستان کی سرزمین کے گز بلکہ مربع گز بنے رہے، تقسیم ہند سے پہلے بھی لاہور اور کراچی آتے جاتے رہے اور بعد میں مستقل طور پر کراچی منتقل ہوئے تو وہاں بھی سفر سفر۔ بس یوسف کمبل پوش کی طرح جگہ جگہ گھومتے رہے۔ جو خط انھوں نے ظفر الرحمان، سید ساجد علی اور محمد علی صاحبان کو لکھے ہیں اگر ان خطوں کو ایک ہی نشست میں پڑھا جائے تو پھر جغرافیہ کی کتاب پڑھنے کو باقی نہیں رہتی۔ ہندوستان کے سارے شہروں اور قصبوں کے نام ان خطوں میں مل جاتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کو صرف انجمن سازی آئی، زمانہ سازی نہیں آئی۔ مولوی صاحب روزانہ ۸ خط تو لکھتے ہی ہوں گے۔ جب پاکستان منتقل ہوئے تب بھی ان کا یہی مشغلہ تھا۔ مثلاً "۲۶، ۲۷ مارچ کو لاہور میں اردو کانفرنس ہونے والی ہے۔ اصرار ہے میں اس کی صدارت کروں اس کے بعد ہماری احمد آباد کی شاخ گل گجرات اردو کانفرنس ۳، ۴ اپریل کو کر رہی ہے۔ اس کی صدارت میں نے قبول کر لی ہے کیوں کہ وہ ہندوستان میں ہوگی اور مجھے اس ناانصافی کے متعلق کچھ کہنے کا موقع ملے گا جو ہند کی حکومتوں نے اردو کے حق میں کی ہے"۔ ۱؎ اردو کے حق کے الفاظ پر ذرا غور فرمائیے۔ یہ خط فروری ۱۹۴۸ء کا ہے۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں "میں اکیلا لنگڑا مارا مارا پھرتا ہوں کسی اور کو اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ آکر ملے"۔ ۲؎ ۳، جنوری ۱۹۴۹ء کے ایک خط میں اپنے سفر تگ و دَو کے بارے میں لکھتے ہیں مسافروں کو آمد و رفت میں جو تکلیفیں دی جاتی ہیں اس کا حال میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔ اس کا مقصد سوائے تکلیف پہنچانے اور کچھ نہیں"۔ ۳؎ لیکن یہ شکوے شکایتیں صرف دوستوں سے تھیں سفر وسیلۂ ظفر ہو یا نہ ہو اس سے انھیں مفر نہیں تھا۔ ملاحظہ ہو "دلّی سے لوٹنے کے کچھ دن بعد مشرقی پاکستان کے دورے پر چلا گیا تھا۔ وہاں اردو کا کام شروع کیا ہے تیس چالیس سال جو محنت کی تھی اس پر پانی پھر گیا۔ اب اس عمر میں از سر نو کام کرنا ہے۔ "قومی زبان" بجائے ہماری زبان یہاں سے جاری کیا ہے، "اردو" جولائی سے اور معاشیات، اگست سے جاری ہو گیا۔ یہ خط ۸، جون ۱۹۴۹ء کا ہے"۔ ۴؎

مولوی عبدالحق کی زندگی میں کئی موڑ آئے۔ وہ حوادثِ زمانہ کو جزوِ حیات سمجھتے تھے اور

۱؎ خطوط عبدالحق صفحہ ۸۷ ۲؎ صفحہ ۸۸ ۳؎ صفحہ ۸۹۔ صفحہ ۹۷ ۴؎ صفحہ ۹۸

ان کے پیشانی پر جو میرے انداز پیمایش کے مطابق فراخ تھی شکنیں نہیں پڑتی تھیں لیکن ان کے تجربے تلخ بھی تھے اور وہ اپنے نجی خطوں میں اس تلخی کا اظہار کرنے سے احتراز نہیں کرتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں " دلّی جانا ممکن نہیں ہے۔ وہاں گیا تو شاید واپس نہ آسکوں۔ ایک خط سے ابھی معلوم ہوا کہ وہاں کی انجمن کے سکریٹری قاضی عبدالغفار مقرر کیے گئے ہیں۔ خدا کی قدرت ہے۔ اب کسی بات پر تعجب معلوم ہوتا ہے اور نہ کوئی نقصان۔ نقصان ــــ ہندی ساہتیہ سمیلن کا کوئی دعوت نامہ مجھے نہیں پہنچا۔ اگر آتا بھی تو میں نہ جاتا۔ اب ہندوستان ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا۔ خدا کی مرضی"۔ یہ خط بھی کراچی سے ۲۶ جولائی ۱۹۴۹ء کا لکھا ہوا ہے (صفہ ۸۹)(۳)

کراچی کی ثقافتی صورت حال ۱۴ر فروری ۱۹۵۰ء کے خط میں ان الفاظ میں ظاہر کی ہے

"یہاں زندگی کی سب آسانیاں میسر ہیں اور غذا تو یہاں اس قدر سستی اور افراط سے ہے کہ شاید دنیا کے کسی ملک میں نہ ہو۔ روزانہ بیسیوں دعوتیں ہوتی رہتی ہیں اور ان دعوتوں میں بیس پچیس یا پچاس ساٹھ آدمی نہیں ہوتے بلکہ سو سو، دو دو سو، پان پان سو۔ کھانے اعلا درجے کے نفیس مختلف قسم کے دس دس بارہ بارہ مگر جو چیز نہیں ملتی وہ کتاب ہے۔ اس لیے جہاں جہاں سے مجھے کتابیں ملتی ہیں جمع کرتا رہتا ہوں۔ بہت سے مہاجرین اپنی کتابیں ویسے ہی نذر کر گئے ورنہ تلف ہو جاتیں (۴)

اچھا ہوا کہ دعوتوں سے متعلق مولوی صاحب کا یہ خط زیادہ مشتہر نہیں ورنہ وہ بڑا آفس بہ درخواست گزاروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے۔

انجمن مولانا کی جان تھی۔ ہر خط میں ان کی اپنی صحت اور خیریت کا ذکر ہو یا نہ ہو انجمن کے ذکر کا ہونا ضروری تھا۔ ایک مرتبہ اس کا ذکر یوں کیا کہ " انجمن کی شاخ کسی نام سے ہو اور کہیں ہو۔ اردو کا حقیقی کام کرے تو ہمارے سر آنکھوں پر۔ اب تو حیدرآباد میں سب سے زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے"۔ (۵) شکر ہے کہ مولوی صاحب کی یہ آرزو کم سے کم ضرور پوری ہوئی حبیب الرحمان مرحوم جیسے اردو کے عاشق نے حیدرآباد میں "اردو گھر" تعمیر کروادیا۔ میں اسے سالار جنگ میوزیم پر بھی ترجیح دینے میں تکلف نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ حبیب الرحمان مرحوم کسی پائیگاہ کے مالک نہیں تھے مجھے نہیں معلوم کہ حیدرآباد کے علاوہ کسی اور مقام پر "اردو گھر" موجود ہے۔ دلّی کی بات اور ہے۔

اورنگ آباد کا مقبرہ اور انجمن کے علاوہ مولوی صاحب اورنگ آباد کالج کے بھی قیس و فرہاد تھے۔

اورنگ آباد کالج سے متصل بھاڑکل دروازے پر مولوی صاحب نے جو کتبہ کندہ کروایا تھا اب بھی محفوظ ہے۔ اورنگ آباد کالج کے رسالہ "نورس" کی ابتدا ابھی ہوئی بھی نہیں تھی کہ مولوی صاحب کا اس رسالے سے عشق الم نشرح ہوگیا۔ اورنگ آباد سے ۲۲ جنوری ۱۹۲۵ء کے خط میں سید ساجد علی صاحب کو اپنے رسالے کے بارے میں لکھا کہ "یہں کالج سے بھی ایک میگزین شایع کرنے والا ہوں منظوری آچکی ہے۔ امید ہے کہ مہینے ڈیڑھ مہینے میں پہلا پرچہ شایع ہو جائے گا۔ یہ دو ماہی ہوگا یعنی سال میں چھ پرچے نکلا کریں گے۔ (یہ دو ماہی ہوگا لکھنا کافی تھا۔ لیکن مولوی صاحب تفہیم اور تفصیل کے ماہرین میں سے تھے۔ ی۔ ن) اس کا نام میں نے بہت ہی اچھا رکھا ہے۔ آپ سن کر خوش ہوں گے۔ "نورس" ہر لحاظ سے مناسب ہے"[1] مولوی صاحب اپنی انجمن کے رسالے "اردو" پر جان چھڑکتے وقت تھوڑی سی جان بچا لیتے تھے اور یہ "نورس" پر چھڑکتے تھے۔ "نورس" کے ایڈیٹروں میں وہاج الدین شمیم تو تھے ہی طلبا میں شیخ چاند مرحوم، اشفاق حسین اور سکندر علی وجد بھی شامل رہے۔ یہ "نورس" حیدرآباد کے مجلۂ عثمانیہ کا برادرِ خورد تھا اور بہت سجیلا۔ یہ خاکسار بھی اسی رسالے کے صفحات سے طلوع ہوا ہے۔

مولوی عبدالحق میں حسِ مزاح اتنی تھی کہ وہ چاہتے تو دوسروں میں بھی تقسیم کر سکتے تھے۔ مجھے ان کا طالب علم ہونے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی لیکن شرفِ ملاقات سے محروم نہیں رہا۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں میں جب زیرِ تعلیم تھا اور وہاں کی بزم ادب کا معتمد تو ایک مشاعرے کی صدارت کی درخواست کے ساتھ میں مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ مشاعرے کی صدارت ایک شاعر کو کرنی چاہیئے تو میں نے جواب میں عرض کیا کہ مشاعرے کی صدارت ایک شاعر کو کرنی چاہیئے تو میں نے جواب میں عرض کیا کہ مشاعرے کی صدارت کا حق تو ایک ادیب اور نثر نگار ہی کو پہنچتا ہے جو داد دینے میں شاعروں کے ساتھ انصاف کر سکتا ہے۔ مولوی صاحب نے یہ صدارت قبول فرمائی اور شاعروں کو اتنی داد دی کہ اس داد پر داد و دہش کا گمان ہونے لگا۔ مولوی صاحب پھلوں کے علاوہ تمباکو کے بھی عاشق تھے۔ پھلوں کا معاملہ تو یہ تھا کہ ہندوستان کے ہر علاقے کا مشہور پھل ان کی قیام گاہ یعنی مقبرہ دورانی میں وقت مقررہ

---

[1] خطوط عبدالحق ص ۱۰۰۔

پر پہنچ جاتا تھا۔ تمباکو وہ فرمائش ہی نہیں فہمائش کر کے منگواتے تھے۔ اچار کے بھی شوقین تھے۔ مولوی صاحب کے حقے کی گڑگڑاہٹ کا زیروبم اور سرگم مقبرہ کی سنگی دیواروں میں اب بھی محفوظ ہے۔ اچار سے اپنی رغبت کا اظہار ایک خط میں اس طرح کیا ہے۔

"اچار پہنچا، میری بڑی مرغوب چیز ہے۔ بہت شکریہ" یہ خط ظفر الرحمان کا موسولہ ہے تاریخ درج نہیں ہے

تمباکو کا ذکر کئی خطوں میں ہے مثلاً تمباکو پہنچ گیا تھا۔ اگر یہ ... کا ہے تو بڑی نعمت ہے۔ میں نے ابھی بنوایا نہیں ہے۔ بنوانے کے بعد اطلاع دوں گا اور آیندہ کے لیے فرمایش کروں گا۔[۱] اس خط کے فوراً بعد دوسرے خط میں یہ اطلاع درج ہے "اس وقت میں حقہ پی رہا ہوں، ہر کش میں آپ کی یاد کی خوشبو آرہی ہے۔"[۲] اچھے تمباکو کے نہ ملنے پر شکایت بھی کرتے مثلاً "آپ وطن گئے مگر آپ نے اب کے پھر میرے لیے تمباکو کا کوئی انتظام نہ کیا۔ اتنے دنوں کے بعد آدمی وطن جاتا ہے تو وہاں کی خوشیوں میں ایسا مگن ہو جاتا ہے کہ ایسی ویسی باتیں اسے یاد نہیں رہتیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے آپ کے خاندان میں کوئی حقہ نہیں پیتا ورنہ پیتے دیکھ کر آپ مجھے ضرور یاد کرتے۔ یہ موسم بھی تھا۔"[۳] چلیے مولوی صاحب کے خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کھیلوں اور شادیوں کے موسم کی طرح، تمباکو نوشی کا بھی کوئی موسم ہوا کرتا ہے۔

مولوی صاحب کے خطوں میں اورنگ آباد ہی اورنگ آباد بھرا پڑا ہے۔ ان کے متعلق ہاشمی فرید آبادی نے تو یہ تک مشہور کر رکھا تھا کہ اورنگ آباد کے قدرداں اورنگ زیب عالمگیر تھے یا عبدالحق۔ اور یہ اس لیے صحیح ہے کہ جب عثمانیہ یونی ورسٹی کے قیام کا منصوبہ منظور ہوا اور یونی ورسٹی کے قیام سے پہلے دارالترجمہ قایم ہوا تو اس کی نظامت مولوی صاحب نے صرف اس شرط پر قبول کی کہ مہینے میں شروع کے دس دن وہ اورنگ آباد میں گزاریں گے اور نظامت کے فرایض بھی صرف دو سال تک انجام دیں گے۔ ان کی یہ شرط قبول کی گئی اور مولوی صاحب پابندی سے ہر مہینے اورنگ آباد آتے جاتے رہے۔ جامعہ عثمانیہ میں جب ان کا تقرر ہوا تب بھی ان کی محبت اورنگ آباد سے برقرار رہی۔ حیدرآباد سے جب بھی اورنگ آباد پہنچتے اپنے دوستوں کو لکھ بھیجتے کہ آموں کا انتظام کر رکھنا۔ تربوز اور خربوزے کی فرمایش ہوتی لیکن جہاں تک آموں کا تعلق ہے وہ بہار کے آموں کو سونے کے تمغے کا مستحق سمجھتے تھے۔ محمد علی کو جو بعد میں اورنگ آباد کالج کے منتظم ہو گئے تھے ایک خط میں انھوں نے یہ لکھا کہ "انشاء اللہ ضرور آؤں گا۔ آم نہیں تو نہ سہی۔ تم اور

---

[۱] خطوط عبدالحق خط موسولہ سید ساجد علی ۱۸۰ - ۱۱۹۰ - [۲] ۵۳ [۳] صفحہ ۱۷۷

فیستی تو ہو۔ آم کھانے تو میں بہار جاؤں گا۔ وہاں سے بہتر آم کہیں نہیں ہوتا"۔ ۱ے اس قسم کے چٹکلے ان کے خطوں میں بہت ہیں۔ ایک خط میں بیوقوفی کی صفت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے" بیوقوفی کسی خاص عمر سے مخصوص نہیں ہے۔ یہ ہر عمر میں ہوتی ہے البتہ اس کی نوعیت بدلتی رہتی ہے"۔ ۲ے قسمت اور سفارش کے بارے میں خیالات اس طرح ظاہر کیے" دو لفظوں کا مفہوم حیدر آباد ہی میں آکر سمجھ میں آیا۔ ایک قسمت اور دوسرا سفارش۔ یوں تو یہ لفظ بچپن سے پڑھتے اور سنتے آتے تھے مگر اصل معنی یہاں آکر معلوم ہوئے"۔ ۳ے لیکن مولوی صاحب خود بھی سفارشیں کرنے میں بہت مستعد تھے مثلاً" حاملِ نیاز نامہ مڈل کامیاب ہے اور منشی گری کا کام خوب جانتا ہے۔ مدرسی اور محرری دونوں کام کر چکا ہے ـــــ یہ لڑکا اس وقت بہت مشکل میں ہے۔ سارے خاندان کا بار اس پر آپڑا ہے اور کوئی ذریعۂ معاش نہیں۔ آپ سید ہیں اور یہ برہمن ہے امید ہے کہ آپ اپنے ہم پیشہ کی دستگیری میں دریغ نہ فرمائیں گے"۔ ۴ے لیکن مولوی صاحب کی سفارشیں جائز سے بھی زیادہ جائز ہوا کرتی تھیں ایک خط میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے" پھر آپ سینئر کیوں کر ہوئے۔ جب آدمی لڑنے کو تیار ہو تو اس کا دعوئی قوی ہونا چاہیئے"۔ ۵ے

مولوی صاحب کا ایک خط تو بڑے ہنگامے کا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے منڈل کمیشن کے سربراہ کا لکھا ہوا ہے۔ ملاحظ ہو!

" میں نے گزشتہ سال بار بار تاکید کی تھی اور گشتی بھی جاری کی تھی کہ نیچ اقوام کے مدارس اور ان کی تعداد وغیرہ کا خاص طور پر رپورٹ میں ذکر کیا جائے لیکن افسوس ہے کہ آپ کی رپورٹ میں ان کا نام تک نہیں۔ کیا آپ بھی انھیں ناقابلِ ذکر خیال کرتے ہیں۔ کیا سید بھی اب برہمن ہو گئے ہیں براہِ کرم جو نیچ اقوام کے مدارس اور طلبا کی تعداد اور اس کے متعلق جو قابلِ ذکر امور ہوں مطلع فرمائیے"۔ ۶ے

دلّی سے اورنگ آباد جاتے وقت لکھا" اب میں شروع برسات میں وہاں آجاؤں گا۔ صرف ایک مشکل ہے۔ وہ آموں کا موسم ہوتا ہے ایسے آم وہاں نہیں ملتے۔ برسات میں اورنگ آباد جنت ہوتا ہے اور دلّی دوزخ لیکن ایسی جنت کس کام کی جس میں آم نہ ہوں۔ اس سے تو وہ دوزخ اچھی ہے جس میں کھانے کو آم تو ملیں"۔ مولوی عبدالحق شاعر نہیں تھے لیکن آموں کی نسبت سے وہ اسداللہ خاں غالب کے رشتہ

۱ے خطوط عبدالحق۔ خط موسومہ محمد علی صفحہ ۱۸۵ ۲ے صفحہ ۱۵۳ ۳ے صفحہ ۱۵۹ ۴ے خط موسومہ سید ساجد علی صفحہ ۱۳۵
۵ے صفحہ ۱۵۸ ۶ے صفحہ ۱۹۹

دار ضرور تھے اور جو بات مولوی صاحب نے نثر میں کہی ہے وہی غالب نے ایک مصرع میں یوں کہی "دو زخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو" گو کہ مصرعہ اول میں ذکر آموں کا نہیں مے وانگبیں کا ہے۔

یہ بات مولوی صاحب کے ایک خط ہی سے معلوم ہوئی کہ انجمن کا چندہ یعنی رکنیت کی فیس ایک روپے سالانہ مولوی صاحب نے ۱۹۴۲ء میں مقرر کی تھی۔ یعنی آج سے ٹھیک ۵۰ سال پہلے۔ یہ خط فروری ۱۹۴۲ء کا ہے اسی خط میں مولوی صاحب نے انجمن کے کاموں کے لیے ایک تنخواہ دار شخص کے تقرر کی منظوری دیتے ہوئے لکھا کہ اس کی تنخواہ ۳۰ روپے ماہانہ مقرر کی جائے اور اس کے علاوہ صوبہ اورنگ آباد کے ۴ ضلعوں میں کام کرنے کے لیے ۲۰ روپے سفر خرچ ادا کرنے کی ہدایت جاری کی۔ یاد رہے یہ رقم سکہ حالی میں تھی جو ہندوستانی سکہ جسے کلدار کہا جاتا تھا کے مقابلے میں کمتر تھا یعنی اس کی قیمت ۱۶ فی صد کم تھی لیکن یہ ۳۰ روپے حالی اس صدی کے تیسری اور چوتھی دہائی میں آسودہ حالی کا سبب تھے۔ اپنے اپنے اہل خاندان کفالت کے علاوہ شرافت نبھانے کے لیے بھی کافی تھے مولوی صاحب نے یہ رقم اس شرط کے ساتھ منظور کی تھی کہ یہ تنخواہ دار شخص سال بھر میں ایک ہزار رکن بنائے۔ اس زمانے میں بے مشقت کمائی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہ ایبزی جیبز ایزی منی سب بعد کی چیزیں ہیں مولوی صاحب نے یہ بھی لکھا کہ اگر شخص مذکور ایک ہزار سے زیادہ رکن بنائے تو زاید رقم پر اسے ۱۰ فی صد کمیشن دیا جائے۔ یہ جُزرسی تھی یا جزئیات شناسی بہر حال اسی نکتہ سنجی اور باریک بینی کا نتیجہ ہے کہ آج انجمن ترقی اردو ایک مملکت میں نہیں، دو مملکتوں میں سرسبز و شاداب ہے۔

مولوی عبدالحق حساب دوستاں در دل کے قایل نہیں تھے۔ ان کی فرمایش کی ہوئی چیز کی اگر کوئی شخص قیمت ان سے نہیں لیتا تھا تو وہ اس شخص سے تو نہیں لیکن فرمایش کے تعلقات منقطع کر لیتے تھے۔ ان کے بہت ہی عزیز دوست پنڈت ونشی دھر ودّیا لنکار جو اورنگ آباد کالج میں ہمارے ہندی کے استاد تھے مولوی صاحب کے انتہا سے زیادہ عقیدت مند تھے۔ یہ عقیدت مولوی عبدالحق کی محبت کا جواب تھی مولوی عبدالحق پنڈت ونشی دھر کو اتنا چاہتے تھے کہ جب وہ خود اورنگ آباد سے حیدرآباد گئے تو پنڈت ونشی دھر کا تبادلہ بھی انھوں نے حیدرآباد میں کر والیا۔ مولوی عبدالحق چوں کہ حق گو تھے اس لیے ان کی ہر بات تسلیم کر لی جاتی تھی۔ پنڈت جی کی ساٹھویں سال گرہ پر مولوی صاحب نے خود مضمون لکھا ان کے ساتھ اورنگ آباد سے بمبئی آکر پانی کے جہاز سے کوئٹے کا سفر کیا۔ یہ سب کچھ

تھا لیکن جب بھی ان سے تمبا کو منگوایا اس کی قیمت بہر حال ادا کی۔

مولوی عبدالحق دراصل عبد اردو تھے۔ انھوں نے اردو کی جتنی خدمت کی اسے ناپنا اور تولنا ممکن نہیں ہے۔ اس کی پیمایش ایک آزمایش ہوگی۔ مکتوب نگاری کا انھیں پتہ نہیں وقت کیسے مل جاتا تھا اور یہ خط کوئی تفریحی خط نہیں ہیں انھیں مضوعات ادب میں شمار نہیں کیا جا سکتا ان خطوں میں تفنن طبع کا کوئی عنصر نہیں ہے کیوں کہ یہ مفروضات نہیں ملفوظات ہیں۔ ہر چھوٹی بڑی بات پر ان کی نظر تھی اور گہری نظر۔ ان خطوں میں جو تصویر ابھرتی ہے وہ ایک شفیق بزرگ، مہربان افسر بالادست، ضرورت مند لوگوں کے ہمدرد، سخت گیر منتظم، آرام بیزار، شب بیدار اور ہمہ وقتی کارگزار شخص کی تصویر ہے۔

آموں کے عاشق، خربوزوں کے شایق، تربوز کے مشتاق، مچھلی اور جھینگوں کے رسیا، تمبا کو کے پارکھ، اچار کے پرستار اور بادہ نوشی سے بادہ پیمائی کا لطف و سرور حاصل کرتے والے مولوی عبدالحق دوستوں کی محفل میں شاداں و فرحاں اور مخالفین کے ترغے میں مسرور و مطمئن رہنے کے عادی تھے۔ ماضی سے ان کا رشتہ نہ تھا۔ حال پر ان کی گرفت تھی اور مستقبل پر ان کی نظر۔

میں ادب کا تاریخ داں نہیں ہوں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکاتیب عبدالحق ذرا دیر سے شایع ہوئے ورنہ رشید احمد صدیقی اپنے مضمون "مکاتیب نیاز" میں، مکتوب نگاروں کی فہرست میں مولوی عبدالحق کا نام ضرور شامل رکھتے۔

میں اپنی حد تک تو مولوی عبدالحق کی خطوط نگاری کو ثبوت نگاری مانتا ہوں کیوں کہ ان کا ہر خط مدلل ہے اور شاید خط تقدیر کی طرح مسکت بھی:

طاہر مسعود

مولوی عبدالحق کے ادبی اور علمی رسائل

مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ - ۱۹۶۱) نے اپنی گوناگوں علمی، تحقیقی اور تنظیمی مصروفیات کے ساتھ چھ رسائل کی اجرا و ادارت کا بھی فریضہ انجام دیا۔ اس لحاظ سے وہ اپنے معاصر رسائل کے مدیروں میں ممتاز حیثیت کے حامل نظر آتے ہیں کہ انھوں نے کسی ایک ہی رسالے کو اپنی پہچان نہیں بنایا بلکہ اردو کے علمی و ادبی سرمایے کو وقیع اور پُرمایہ بنانے کے لیے مختلف موضوعات پر رسالے جاری کیے۔ اور اُس زمانے میں جب تحقیقی صحافت کے خدوخال ابھی پوری طرح واضح بھی نہیں ہوئے تھے، انھوں نے مخصوص موضوعات پر رسالوں کا اجرا کر کے صحافت کی اس نئی صنف کی صورت گری کی اور صوری و معنوی اعتبار سے اسے اعلا معیار بخشا۔ لسانیات، سائنس، تاریخ اور اقتصادیات جیسے سنجیدہ اور خشک موضوعات پر اردو میں لکھنے کا رجحان عام کیا۔ باذوق، باصلاحیت اور اہلِ علم اصحاب کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا، انھیں اپنے رسائل کے پلیٹ فارم پر یکجا کیا اور ایک ٹیم کی صورت دی۔ پھر ان ہی میں سے بعض کو ان رسائل کی ادارت تفویض کی۔ ان رسائل نے اردو زبان کی ترقی و توسیع کے ساتھ ساتھ اس کی بقا کی جنگ بھی لڑی۔ مولوی عبدالحق نے اردو کو ایک تحریک بنا دیا تھا چناں چہ ان کے یہ رسائل بھی تحریکی جذبے کے تحت نکالے جاتے تھے اور ان کے پسِ پشت مالی بازیافت اور منافع کی کوئی ترغیب و تحریص نہیں تھی اس لیے خسارے میں ہونے کے باوجود ان رسالوں نے کبھی "معیار" کے معاملہ میں سمجھوتہ نہیں کیا اور انتہائی کٹھن حالات میں بھی تھکن اور جمود کا شکار نہیں ہوئے۔ دو مرتبہ نقل مکانی اور ہجرت (اورنگ سے دہلی اور دہلی سے کراچی) کے جانگسل تجربے سے گزرنے کے باوجود ان رسائل کے معیار میں اضافہ ہی ہوا۔

مولوی عبدالحق کے ان چھ رسائل میں رسالہ افسر (۱۸۹۷ء) کے سوا باقی پانچوں رسالے ان ہی کا خواب تھے جن کی تعبیر بھی ان ہی کے ذریعے ممکن ہوئی۔ سہ ماہی اردو (۱۹۲۱ء)، سہ ماہی سائنس (۱۹۲۸ء)، پندرہ روزہ "ہماری زبان" (۱۹۳۹ء)، ماہنامہ "معاشیات" (۱۹۴۶ء) اور سہ ماہی "تاریخ و سیاسیات" (۱۹۵۱ء)۔ یہ وہ رسائل تھے جو موضوعات کی اہمیت، مضامین کے تنوع اور معیار کی بلندی کے لحاظ سے اردو کی مجلاتی

صحافت میں خیال افروز ہی نہیں انقلاب آفریں بھی تھے۔

مولوی عبدالحق کے رسائل کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ابتدائی صحافتی زندگی کا جائزہ لے لیا جائے۔ اسے مولوی صاحب کی خوش بختی کہیے کہ انھوں نے اپنا تعلیمی دور علی گڑھ کالج میں گزارا جہاں انھیں سرسید کی سرپرستی اور خصوصی شفقت و عنایت حاصل رہی۔ مولوی صاحب نے سرسید کو "تہذیب الاخلاق" کی ترتیب و تدوین کرتے ہوئے دیکھا اور تعجب نہیں کہ صحافتی آداب و معیار کے اولین نقوش یہیں سے ان کے ذہن پر مرتب ہوتے ہوں۔ مولوی عبدالحق کے برادر خرد شیخ احمد حسن کا بیان ہے کہ سرسید مولوی صاحب کی ادبی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے ان سے "تہذیب الاخلاق" کے لیے کام بھی لیتے رہے [۱] زمانۂ طالب علمی ہی میں عبدالحق نے علمی و ادبی رسائل کے لیے مضامین بھی لکھنا شروع کر دیے۔ ان کے مضامین" علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، سرمور گزٹ، محمڈن نیشنل میگزین، اور حیدر آباد دکن کا رسالہ "حسن" کی زینت بنے [۲] ان میں چند مضامین تو شگفتہ اور ہلکے پھلکے اسلوب میں لکھے گئے تھے جو ان کے دور طالب علمی کی نومشقی کی یاد دلاتے ہیں لیکن دو ایک مضامین ایسے بھی ہیں جو ان کی وسعت معلومات، تنقیدی بصیرت، اور دینی حمیت کا پتا دیتے ہیں۔ عبدالحق گریجویشن کے بعد نواب محسن الملک کا تعارفی خط لے کر حیدر آباد دکن گئے اور ریاست کے ہوم سیکریٹری مولوی عزیز مرزا کے دفتر میں مترجم مقرر ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ افواج آصفیہ کے سپہ سالار نواب افسر الملک نے اپنے ہی نام سے موسوم رسالہ " افسر" جاری کر رکھا تھا اور اس کی ادارت کی ذمہ داریاں مولوی محب حسین کے سپرد کر رکھی تھیں۔ ماہنامہ "افسر" ۱۵ × ½ ۲۲ سنٹی میٹر کے سائز پر ۳۲ صفحات کا مکمل فوجی رسالہ تھا جس میں فن حرب سے متعلق مضامین شایع ہوتے تھے۔ مولوی محب حسین افسر الملک کے دفتر میں ترجمے کے کام پر مامور تھے اور ساتھ ہی "معلم نسواں" اور "شفیق" کے نام سے دو رسالے بھی نکالتے تھے۔ ان مصروفیات کے ساتھ "افسر" پر یکسوئی سے توجہ دینا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ افسر الملک کو اس صورت حال کا اندازہ تھا اور وہ "افسر" کے لیے کسی دوسرے مدیر کی تلاش میں تھے۔ چناں چہ نواب وقار الملک کے ذریعے افسر الملک کی ملاقات مولوی عبدالحق سے ہوئی تو افسر الملک نے انھیں مدرسۂ آصفیہ کے ہیڈ ماسٹر کے عہدے کی پیش کش کی [۳] عبدالحق مدرسے کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے تو "افسر" کی ادارت بھی ان کے حصے میں آگئی۔

ماہنامہ "افسر" اپریل ۱۸۹۷ء میں جاری ہوا اور مولوی عبدالحق اکتوبر ۱۸۹۹ء میں اس سے

وابستہ ہوتے۔ اس وقت تک حیدرآباد دکن کا مشہور رسالہ "حسن" بند ہو چکا تھا، لہذا مولوی عبدالحق نے محسوس کیا کہ "افسر" کی پالیسی تبدیل کر کے اسے ایک اعلا درجے کا علمی اور ادبی پرچہ بنانا چاہیئے۔ افسر الملک کی جانب سے انھیں اس کی اجازت بھی مل گئی۔ چناں چہ اکتوبر ۱۸۹۹ء کے پرچے میں عبدالحق بی اے اڈیٹر رسالہ" کی طرف سے "اطلاع ضروری" شایع ہوئی جس میں اعلان کیا گیا:

"یہ رسالہ تین سال سے نواب افسر الملک کی سرپرستی میں نکل رہا ہے۔ اب تک یہ صرف فوجی مضامین کے لیے مخصوص تھا لیکن اب جناب ممدوح نے بالکلیۃ ہمارے حوالے کر دیا ہے اور ہمیں اجازت دی ہے کہ چند صفحے فوجی مضامین کے علاوہ باقی حصے کو جیسے چاہیں استعمال کریں۔ چوں کہ حیدرآباد دکن میں اس وقت ایک علمی میگزین کی بہت ضرورت ہے اس لیے ہم نے ارادہ کیا ہے کہ اسے جہاں تک ممکن ہو ایک اعلا درجہ کا علمی میگزین بنانے کی کوشش کی جائے۔ چناں چہ یکم جنوری ۱۹۰۰ء سے اس کی ہیئت بالکل بدل دی جائے گی اور اس کے قالب میں ایک علمی روح نظر آئے گی اس میں ہر قسم کے عمدہ عمدہ علمی، تاریخی، اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین لکھے جائیں گے۔ ۔ ۔ اس غرض سے اس کا حجم بڑھا دیا جائے گا یعنی بجائے ۳۲ صفحوں کے ۴۸ صفحہ کر دیے جائیں گے جن میں سے صرف ۸ صفحے میں فوجی مضامین درج ہوا کریں گے۔ ساتھ ہی ہم نے یہ بھی انتظام کیا ہے کہ ہر ماہ اعلا درجہ کے مضمون کے لیے ایک اشرفی نذر کی جائے۔"

اعلان کے مطابق نومبر ۱۹۰۰ء سے مولوی عبدالحق نے رسالے کا مزاج یکسر بدل دیا۔ جہاں پہلے رسالے کی لوح کے نیچے یہ جملہ درج ہوتا تھا: "فوجی مضامین اور فوجی نامور اشخاص کے تذکرے" وہاں اب اسی رسالے کے صفحات پر شعر و سخن، سیر و سیاحت انشائے لطیف کے نمونے اور علمی، تاریخی، اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین اشاعت پذیر ہونے لگے۔ کتابوں پر ریویو بھی کیا جانے لگا۔ ایڈیٹر کی جانب سے نئے لکھنے والوں کو ترغیب دی جانے لگی۔ چناں چہ اس شمارے میں یہ اعلان بھی نظر آتا ہے کہ مسلمانوں کی تمدنی اصلاح پر سب سے اچھا مضمون اور اردو میں چھوٹا سا ڈرامہ لکھنے والے کو ایک ایک اشرفی انعام میں دی جائے گی۔ انعام دینے کی یہ روایت رسالہ "حسن" نے شروع کی تھی اور اس کے بند ہونے کے بعد "افسر" نے اس روایت ہی کا احیا نہیں کیا، اس معیاری رسالے کی کمی بھی دور کرنے کی کوشش

کی اور بلاشبہ اس میں کامیاب رہا۔

"افسر" تقریباً پانچ سال تک جاری رہا۔ اس عرصہ میں اس نے اردو زبان و ادب کی بہت خدمت کی۔ اس کے مضمون نگاروں میں چوٹی کے اہل قلم حضرات شامل تھے۔ ان میں مولانا الطاف حسین حالی، شمس العلما مولوی ذکاء اللہ، مولوی عزیز مرزا، مولوی غلام الثقلین، مولوی چراغ علی، پروفیسر شہباز، نواب عماد الملک، مولانا ظفر علی خاں، مولانا گرامی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں[۵۵]۔ "افسر" میں خود مولوی عبدالحق کے سنجیدہ معلوماتی اور تاریخی مضامین کے علاوہ ہلکے ہلکے لطیف مضامین بھی ملتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے مولانا غلام قادر گرامی کی مثنوی کو مع اپنے تعارفی نوٹ اور "بیگم جیمن" کے عنوان سے ایک مغربی رسالے "ریویو آف ریویو" سے ماخوذ مضمون شایع کیا تو دیسی "اوپر کی آمدنی" "سنہ ہجری" "اب مردوں کی ضرورت نہیں" اور "اردو اخبار کے ایڈیٹروں کو نیک صلاح" جیسے لطیف مضامین بھی لکھے۔ مولوی عبدالحق کے آخر الذکر مضمون کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے کے اردو اخبارات کے معیار کی بابت کیا رائے رکھتے تھے:

> "عام طور پر شکایت ہے کہ اردو اخبارات کی پوری وقعت نہیں ہوتی اور اہل ملک بجائے اس کے کہ اپنے ہم وطنوں سے ہمدردی کریں، زیادہ تر انگریزی اخبارات کو خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ یہ شکایت ایک لحاظ سے بجا ہے اور ایک لحاظ سے بیجا۔ بجا اس لیے کہ درحقیقت ملک کے قابل لوگ اردو اخباروں کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں اور اس قابل نہیں سمجھتے کہ ان پر اپنا قیمتی وقت صرف کریں۔ بیجا اس لیے کہ اکثر اخبار خود اس قدر بے وقعت، کم مایہ اور لچر ہوتے ہیں کہ جو شخص اخباروں کے فرائض اور خوبی کو سمجھتا ہے ہرگز اپنا وقت اور روپیہ ان پر صرف نہ کرے گا۔"[۵۶]

اس مضمون میں انھوں نے خبروں کی اشاعت کے سلسلے میں اردو اخبارات کے غیر ذمہ دارانہ رویے، رئیسوں کو بغیر طلب کیے اخبارات جاری کرنے اور پھر چندہ نہ ملنے پر واویلا مچاتے کے طرز عمل، اخبار خریدنے والوں کو نیک اور اخبار نہ خریدنے والوں کی نیکی اور راستبازی کو مشکوک نظروں سے دیکھنے کی قبیح حرکت پر نہایت لطیف پیرایے میں طنز کیا ہے۔

"افسر" سے وابستگی کے دوران اور اس کے بعد بھی مولوی عبدالحق کے مضامین "معارف"

" دکن ریویو" اور دوسرے رسالوں میں شایع ہوتے رہے ۔ بلکہ مولانا ظفر علی خاں نے تو "دکن ریویو" ان ہی کے مشورے پر جاری کیا[۱] جس میں ان کا تین سو صفحات کا قسط وار مضمون " العالم الاسلام " شایع ہوا مولوی عبدالحق نے جب حیدرآباد دکن چھوڑنے اور ملازمت ترک کرنے کا ارادہ کیا تو ان کے ذہن میں جس متبادل ملازمت کا خیال آیا، وہ کسی اخبار یا رسالے سے وابستہ ہونے کا تھا۔ چناں چہ ایک مرتبہ انھوں نے "پیسہ اخبار"[۲] اور دوسری مرتبہ مولانا محمد علی جوہر کے "ہمدرد" میں کام کرنے کی ہامی بھرلی تھی[۳] لیکن قدرت کو شاید ان سے اردو زبان کی خدمت لینا مقصود تھا اس لیے ایسے مواقع پیش آئے کہ انھیں اپنا بندھا ہوا بستر کھول دینا پڑا۔ رسالہ " افسر" کے بند ہونے کے بعد مولوی عبدالحق کی صحافتی زندگی کا یہ مختصر دور اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔

مولوی عبدالحق کی صحافتی زندگی کا دوسرا دور کامیابیوں کا دور ہے جس میں انھوں نے پے در پے پانچ رسائل جاری کیے اور اردو کی مجلاتی صحافت کو ایک نئی راہ دکھلائی۔ مولوی عبدالحق نے یہ رسائل انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام جاری کیے اور ان میں سے رسالہ " اردو " کو چھوڑ کر باقی چاروں رسائل مختلف وقتوں میں مختلف اصحاب مرتب کرتے رہے لیکن فی الحقیقت ان کی سرپرستی اور نگرانی مولوی عبدالحق ہی کے ذمہ رہی اور وہ ان رسائل کے مزاج کی تشکیل میں اثر انداز ہوتے رہے دوسرے لفظوں میں مولوی عبدالحق کے حوالے کے بغیر ان رسائل کا تعارف اور تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔

اب ہم ان رسائل کا باری باری جائزہ لیں گے۔

سہ ماہی " اردو "

اس صدی کی ابتدا میں جب بدیسی راج کے خلاف سیاسی شعور بیدار ہوا تو چند ایسے رسائل منظر عام پر آئے جو ادب اور سیاست کا امتزاج پیش کرتے تھے۔ وہ ادب کی کلاسیکی روایات کے عکاس بھی تھے اور سیاست کے جدید رجحانات کے علمبردار بھی۔ ان میں حسرت موہانی کا " اردوئے معلی"، شیخ عبدالقادر کا " مخزن "، دیا نرائن نگم کا " زمانہ "، ظفر الملک علوی کا " الناظر"، سید سلیمان ندوی کا " معارف "، جامعہ اسلامیہ کا " جامعہ " وغیرہ شامل تھے۔ لیکن مولوی عبدالحق کا سہ ماہی " اردو " مذکورہ رسائل سے اس لحاظ سے مختلف تھا کہ یہ سیاسیات سے خالی تھا اور خالص ادبی اور تحقیقی پرچہ تھا۔ دوسرے رسائل میں سے بعض میں سیاست اور بعض میں علم السیاست، تاریخ اور عمرانیات کے موضوعات نمایاں تھے۔[۴] چناں چہ جب مولوی عبدالحق نے

رسالہ "اردو" کا ڈول ڈالا تو مختلف حلقوں کی جانب سے اس اندیشے کا اظہار کیا گیا کہ اس رسالے کی عمر بھی اکثر رسالوں کی طرح سال دو سال سے زیادہ نہ ہو گی کیوں کہ اردو زبان و ادب پر چھاپنے کے لیے اتنا مواد کہاں سے میسر آئے گا۔[۱۱۵] اس کا جواب مولوی عبدالحق نے یہ دیا:

"یہ میدان باوجود تنگی کے بہت کچھ وسعت رکھتا ہے اور بجائے خود ایک عالم ہے۔۔۔۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ بہت سے الفاظ اور محاورے ابھی تحقیق طلب ہیں، بہت سے مصنف اور شاعر ہیں جن کا کلام ابھی تک بساط قدر دانی تک نہیں پہنچا۔ بہت سی کتابیں ہیں جو لکھنے کے بعد ہی گوشۂ گمنامی میں رہ گئیں یا شایع ہوتے ہی ناپید ہو گئیں۔ زبان کے رسم الخط، املا اور انشا میں بہت سی باتیں اصلاح طلب اور مشورہ اور بحث کی محتاج ہیں۔ اردو کی تاریخ اور اس کی نشو و نما میں بہت سی منزلیں ابھی طے کرنا باقی ہیں۔۔۔۔ زبان کی ترقی و اشاعت کی بہت سی ایسی تجویزیں ہیں جو ابھی تک عالم خیال سے صفحۂ قرطاس پر نہیں آئیں۔ ان پر بحث کرنا، ان کا جانچنا اور ان کو عمل میں لانا بھی بڑا کام ہے۔ تنقید جو ادب کی جان اور ذوقِ سلیم کی روح رواں ہے ابھی ہمارے یہاں ابتدائی مرحلہ میں ہے اسے صحیح رنگ میں دکھانا بہت بڑا فرض ہے۔۔۔۔ اردو کے بہت سے ایسے محسن ہیں جن کے حالات اور کارنامے ملک کے سامنے پیش ہونے چاہیں۔۔۔۔ اس کے علاوہ غیر زبانوں کے ادب میں ایسے انمول جواہر ہیں جو صاحبِ نظر ادیب اور شائقین ادب کے لیے سب سے بڑا تحفہ ہیں۔ ضرورت ہے کہ انھیں اردو کے لباس میں پیش کیا جائے تاکہ ہمارے اہلِ ملک اسلوب بیان، طرزِ تخیل اور ادائے مطلب سے حظ حاصل کریں اور متمتع ہوں۔"[۱۱۶]

مولوی عبدالحق "اردو" کو ان عام رسائل کی روش سے ہٹ کر نکالنا چاہتے تھے جو اپنی پیشانی پر "ادبی اخلاقی، تاریخی، معاشی، سیاسی رسالہ" کا لیبل چسپاں کر کے اس میں ہر قسم کا رطب و یابس اور انمل بے جوڑ مضامین بھر دیتے ہیں۔ چناں چہ انجمن ترقی اردو کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۹۲۰ء میں رسالۂ اردو، کی پالیسی کے بارے میں درج ذیل بیان ملتا ہے: "یہ رسالہ مثل دوسرے رسالوں کے کشکول نہ ہو جس میں ہر قسم کے مضامین بلا لحاظ مناسبت و ربط درج کر دیے جاتے ہیں بلکہ اس میں زیادہ تر زبان و ادب کی بحث ہو اور اردو زبان، اس کی تاریخ، اصطلاحات، لغت الفاظ و محاورات اور تنقید کے متعلق مضامین ہوں۔ وہ نہ

صرف انجمن کے مقاصد کی اشاعت اور توسیع کا آلہ ہے بلکہ اہل ملک میں صحیح ذوقِ ادب پیدا کرنے میں بھی مدد دے۔[۱۷]

انجمن ترقی اردو کے جس اجلاس میں 'اردو' کے اجرا کا فیصلہ کیا گیا اس کی روداد کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ سہ ماہی "اردو" کو اکتوبر ۱۹۲۰ء سے جاری کرنا طے پایا تھا اور رسالہ اشاعت کے لیے تیار بھی کر لیا گیا تھا لیکن سیاسی ہنگامہ آرائی کی وجہ سے اس کا اجرا التوا میں پڑ گیا اور یوں یہ رسالہ جنوری ۱۹۲۱ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ ۱۷×۲۳ سینٹی میٹر سائز کے ۱۴۶ صفحات پر مشتمل تھا۔ سالانہ چندہ چھ روپیہ کلدار محصول ڈاک ملا کر آٹھ روپیہ کلدار (سکۂ عثمانیہ میں سات روپیہ اور مع محصول ڈاک نو روپیہ سکۂ عثمانیہ) تھا۔ پہلے شمارے کے خریداروں کی تعداد ۱۲۰۰ تک پہنچ گئی تھی۔[۱۸] محمد مقتدی خاں شروانی کے زیرِ اہتمام انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپتا تھا کیوں کہ اورنگ آباد میں، کوئی چھاپہ خانہ نہیں تھا۔ رسالے کی اشاعت کے لیے جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر کے مہینوں کا پہلا ہفتہ مقرر کیا گیا تھا۔ سرورق پر لوح کے نیچے اورنگ آباد کے مقبرۂ رابعہ دورانی کی تصویر اور اس کے نیچے "انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ" درج ہوتا تھا۔

مولوی عبدالحق نے رسالۂ اردو، کے اوّلین اداریے میں جن عزائم اور ارادوں کا اظہار کیا تھا، رسالہ ان پر پورا اترا۔ اس کے بلند پایہ علمی، تحقیقی اور ادبی مضامین نے اسے بہت جلد اردو کے علمی اور ادبی رسائل کے صفِ اوّل میں جگہ دے دی۔ یہاں تک کہ منشی پریم چند نے کہا: "رسالہ اردو، اردو رسالوں کا سالارِ کارواں ہے۔"[۱۹] "اردو" اورنگ آباد سے ۱۸ سال تک نکلتا رہا۔ اس دوران رسالے میں اہم ادبی تنقیدی مضامین کے علاوہ رسم الخط، اصطلاحات کے ترجمے، اردو کی بقا و ترقی کے اہم مسائل پر بھی علمی مضامین شایع ہوئے۔ مولوی عبدالحق نے پہلے ہی شمارے سے "اصطلاحات علمیہ" کے عنوان سے علمی اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ کرنا شروع کر دیا تھا جو قسط وار چھپتا رہا۔ رسالے کے آخر میں انجمن ترقی اردو کی کارگزاریوں کی مختصر روداد بھی شایع کی جاتی تھی جس میں پچھلی کارکردگی کا جائزہ لینے کے علاوہ آئندہ منصوبوں کا بھی تذکرہ ہوتا تھا۔ جولائی ۱۹۲۱ سے رسائل و کتب پر تبصروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ تبصرے مولوی عبدالحق کیا کرتے تھے۔ ان تبصروں کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ کتابوں کا بے لاگ تنقیدی جائزہ لیا جاتا تھا۔ جنوری ۱۹۲۳ء سے خطبات گارساں دتاسی کا ترجمہ ایڈیٹر کے نوٹ کے ساتھ شایع ہوا جس میں گارساں دتاسی کا تعارف کرانے کے بعد سر راس مسعود کا شکریہ ادا کیا گیا کہ انھوں نے ان نادر لیکچروں اور تبصروں کا مجموعہ عطا کیا۔

انجمن ترقی اردو کا دفتر ۱۹۳۸ء میں دہلی منتقل ہو گیا جہاں سے "اردو" کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۳۹ میں

نکلا۔ اس شمارے کے جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بین الاقوامی ادب اور ادیبوں کی بابت مضامین کی تعداد پہلے کے مقابلے میں بڑھ گئی۔ ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ، کے تبصرے بھی ترجمہ ہو کر چھپنے لگے۔ اس کے علاوہ عالمی ادب کی خبریں، نئی کتابوں اور نئے ادیبوں کے بارے میں معلومات افزا اطلاعات بھی شایع ہونے لگیں۔

قیام پاکستان کے بعد رسالہ "اردو" کا پہلا شمارہ کراچی سے جولائی ۱۹۴۹ء میں نکلا۔ رسالے کے لیے ایک مجلس ادارت بنائی گئی جس میں شیخ محمد اکرام، ممتاز حسین، ڈاکٹر فضل احمد، کریم فضل، مولوی سید ہاشمی فرید آبادی، عندلیب شادانی اور قاضی احمد میاں، اختر جونا گڑھی شامل تھے۔ مولوی عبدالحق کی زندگی تک 'اردو'، کراچی سے پابندی سے نکلتا رہا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ تقسیم کے ہنگاموں میں انجمن جن مصائب و آفات سے گزری تھی اور خود مولوی عبدالحق پر جو صدمے ٹوٹے تھے "اردو"، کے معیار پر ان حالات کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ حالاں کہ پاکستان آنے کے بعد "اردو" کے پرانے خریداروں کی ایک بڑی تعداد کم ہو گئی، اس کے مستقل مقالہ نگاروں میں سے بھی بہت سے بھارت اور حیدر آباد دکن میں رہ گئے۔ لیکن 'اردو'، روز اوّل کی طرح تازہ دم رہا اور بہت نئے فکر انگیز اور خیال آفریں مضامین کو اپنے جلو میں لیے طلوع ہوتا رہا۔ ان خدمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سید ہاشمی فرید آبادی نے جنوری ۱۹۵۱ء کے شمارے میں لکھا:

"انجمن کا سب سے پہلا اور ہر دلعزیز رسالہ اردو ہے جس نے پچیس برس زبان و ادب کی خدمت انجام دی اور نہ صرف انجمن بلکہ اردو زبان کا نام روشن کیا۔ یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ اس رسالے کے تحقیقی مقالات نے اردو کی عمر گزشتہ بڑھا دی اور آئندہ زندگی کے لیے اس میں نئی جان ڈال دی۔ اس کے بلند پایہ مضامین سے زبان کی وقعت بڑھ گئی۔ اس کی تنقید دقیق سے ادب کا معیار اونچا ہو گیا۔ ان ہی خصوصیات کے اعتبار سے وہ ممالک ہند ایک طرف، دنیا کے لسانی رسائل کی صف اوّل میں شمار ہونے کا مستحق ہے۔"

پاکستان آنے کے بعد "اردو"، نے دو نکاتی پالیسی کا اعلان کیا:

۱۔ آزاد اور ترقی یافتہ ممالک کے علمی و ادبی کارناموں سے 'اردو'، کے قارئین کو واقف کرا کے قوم کی تعلیمی اور دماغی پس ماندگی دُور کی جائے۔

۲۔ اعلا معیار کی درسی کتابوں پر تفصیلی اور محققانہ تبصرے لکھوائے جائیں تاکہ اردو زبان کو اعلا تعلیم میں ذریعۂ اظہار کے طور پر اپنایا جا سکے۔ ان تبصروں کے ذریعے دوسری کتابوں کے تراجم و تصانیف کی کمزوریاں

عیاں کی جائیں تاکہ طبع ثانی کے وقت ان کتابوں کی اصلاح میں سہولت ہوسکے[15]

"اردو" مولوی عبدالحق کی زندگی تک جاری رہا اور ان کے انتقال کے بعد بند ہوگیا۔ اس کی وجہ انجمن ترقی اردو کے معتمد اعزازی جمیل الدین عالی کے الفاظ میں:

"پاکستان میں چاروں طرف اردو کی علمی اہمیت بڑھ رہی تھی، نئے نئے اور وقیع پرچے نکل رہے تھے۔ علمی مضامین لکھنے والے اور اہلِ تحقیق سے کچھ حاصل کرنا آسان نہیں رہا تھا کیوں کہ مولوی صاحب کی فرمائش اور پھر تاکید اور فہمائش جیسے اثاثے ہم کہاں سے لاتے"

لیکن "اردو" کی کمی برابر محسوس کی جاتی رہی اور بالآخر ۱۹۶۶ء سے دوبارہ جاری کردیا گیا اور آج تک نکل رہا ہے۔

رسالہ "اردو" نے مولوی عبدالحق کی زیر ادارت چالیس سال تک اردو زبان و ادب کی کیا خدمت کی یہ جاننے کے لیے "اشاریہ اردو" کی سرسری ورق گردانی بھی بہت کافی ہوگی۔ تاہم ڈاکٹر انور سدید نے اپنے مقالے میں ایسے چند اہم ترین مضامین کی نشاندہی کی ہے[16]۔ ڈاکٹر صاحب کے بقول ان مضامین نے اردو دنیا میں غلغلہ برپا کر دیا تھا: (۱) محاسن کلام غالب، عبدالرحمٰن بجنوری (۲) شعرالعجم کی تنقید حافظ محمود شیرانی (۳) دلی کا یادگار مشاعرہ، فرحت اللہ بیگ (۴) سنسکرت کے عربی اور فارسی تراجم، شیخ احمد اسماعیل پانی پتی (۵) معرکہ قتیل و غالب، خواجہ احمد فاروقی (۶) دلی کی علمی استعداد اور فارسی شعرا، سید ظہیر الدین مدنی (۷) مثنوی حجاب زناں محمد عمر نورالٰہی (۸) اردو کی ابتدا سے متعلق پروفیسر محمود شیرانی کے لسانی نظریے پر تنقید، ڈاکٹر مسعود حسین خاں (۹) فارسی اور اردو میں پیروڈی کا تصوّر، ڈاکٹر محمد داؤد رہبر (۱۰) ذیلدن مراد، غلام دستگیر نامی (۱۱) مرثیہ خوانی کا اثر مرثیہ گوئی پر، ڈاکٹر محمد حسن اس فہرست میں ڈاکٹر انور سدید نے بعض نہایت اہم مضامین کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا مقالہ "ادب اور زندگی" (مطبوعہ جولائی ۱۹۳۵) جو ترقی پسند تحریک کی فکری اساس بنا۔ رسالہ 'اردو' کے مضامین کے موضوعات کی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ نادر مخطوطات اور قدیم دواوین کے نادر نسخوں سے متعلق مضامین ۲ اردو شعرا کے نئے حالات غیر مطبوعہ کلام (۳) غیر ملکی ادب، بدیسی زبان کے شعرا (۴) اردو کی کمیاب کتابوں کی بابت تحقیقی مضامین (۵) شعر و ادب کی تنقید (۶) عظیم ناولوں اور فن پاروں کا تعارف (۷) مختلف زبانوں کے ایک

دوسرے پر اثرات (۸) رسم الخط کی اصلاح (۹) اردو کے جدید میلانات (۱۰) ترقی پسند ادب (۱۱) شبلی کی خطوط نگاری (۱۲) کلاسیکی شعرا کی شاعری کی جدید علوم کی روشنی میں تفہیم (۱۳) انیسویں صدی کے اخبارات ورسائل (۱۴) اردو کی نئی انجمنیں (۱۵) لسانی بحثیں (۱۶) اردو زبان کی ترقی اور اشاعت (۱۷) دوسری زبانوں کے تنقیدی مضامین کے ترجمے (۱۸) گارساں دتاسی کے مقالات (۱۹) شخصیات (۲۰) تذکرے۔

رسالہ اردو کا نمایاں امتیاز اس کا معیار رہا غالباً یہ واحد رسالہ ہے جس کے بارے میں نہایت اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں کبھی عامیانہ اور غیر معیاری تحریر شایع نہیں ہوئی۔ اور یوں مولوی عبدالحق کی وہ پیشین گوئی پوری ہوئی جو انھوں نے پہلے شمارے کے اداریے میں یہ کہہ کر کی تھی:

"میں چاہتا ہوں (رسالہ اردو) اردو زبان اور ادب کی ایسی مفید اور محققانہ بحثوں سے مالا مال ہو کہ شائقینِ ادب اسے غور اور شوق سے پڑھیں اور فائدہ اٹھائیں اور اہلِ ملک کے ذوق پر اس کا اچھا اثر ہو اور وہ دن آئے کہ لوگ اس کے پرچے ڈھونڈتے پھریں۔"[۱۱۸]

سہ ماہی "سائنس"

مولوی عبدالحق نے جنوری ۱۹۲۸ء میں 'سائنس' جاری کیا۔ اس کے اجرا کا اصل مقصد تو یہی تھا کہ زبان اردو کے علمی سرمایے کو وسعت دی جائے لیکن ساتھ میں مولوی صاحب کو یہ بھی احساس تھا کہ سائنس میں پیچھے رہ جانا ہی ہماری پسماندگی کا اصلی سبب ہے۔ ان کے خیال میں 'سائنس' سے عدم دل چسپی اور ناواقفیت کی ذمہ داری گزشتہ تعلیم پر عاید ہوتی تھی کیوں کہ اس تعلیم کا بڑا حصہ منطق، فلسفہ، ادب اور شاعری وغیرہ کی نذر ہو جاتا تھا نتیجے میں تخیل نے عمل کی جگہ بھی گھیر لی تھی۔ مولوی صاحب کو یقین تھا کہ ایشیائی اور خاص کر ہندی دماغوں کا علاج سائنس ہے[۱۱۹] انھوں نے رسالہ 'سائنس' کے اولین شمارے کے اداریے میں لکھا:

"چشم بدور، اردو میں رسالوں کی تعداد کافی ہے اور ہر مہینے کوئی نہ کوئی نیا رسالہ جاری ہوتا رہتا ہے۔ مگر وہ زیادہ تر ادب اور تاریخ وغیرہ سے بحث کرتے ہیں۔ سائنس کے لیے کوئی رسالہ مخصوص نہیں ہے مشکل یہ پیش کی جاتی ہے کہ اور صحیح بھی ہے کہ سائنس کے مضامین کو اپنی زبان میں کیوں کر ادا کریں۔ اس مشکل کو عثمانیہ یونیورسٹی نے رفع کر دیا ہے لیکن اس کا دائرہ بھی کالج کے احاطے تک محدود ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس فیض کو عام کر دیں۔"

انھوں نے رسالے کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا:

"ایک مقصد تو یہ ہے کہ عام پڑھے لکھے لوگوں کو سائنس کے معلومات سے نیز ان خیالات اور ایجادات

واختراعات سے آگاہ کرتے رہیں جو دنیا میں سائنس کے متعلق روز بروز ہوتی رہتی ہے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ خود ہمارے لوگ اپنی تحقیقات کو ملک کے سامنے پیش کریں یا سائنس کے مختلف شعبوں پر محققانہ مضامین لکھیں۔"

[رسالہ "سائنس"، ۱۷×۲۲ سنٹی میٹر کے سائز کے تقریباً سو صفحات پر مشتمل تھا۔ قیمت سالانہ آٹھ روپے (نو روپے چار آنے سکۂ عثمانیہ) تھی۔ انجمن اردو پریس اورنگ آباد میں طبع ہوتا تھا۔ سرورق پر یہ جملہ تحریر ہوتا تھا، "سب سے خوش نصیب انسان وہ ہے جو حقائق کا انکشاف کرتا ہے اور دوسرے درجے پر وہ ہے جو پرانے تعصبات کو ترک کرتا ہے" "سائنس" جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر کے مہینوں میں منظر عام پر آتا تھا۔ مولوی عبدالحق نے اس کی تدوین وادارت کی ذمہ داری جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر ڈاکٹر مظفر الدین قریشی کو سونپ دی تھی۔ اور بلاشبہ اردو میں سائنس کا پرچہ نکالنے کے کڑے امتحان سے وہ سرخرو نکلے۔

سائنس، اردو کا پہلا رسالہ تھا جس کے لیے برطانیہ کے نامور سائنس دانوں سے قلمی تعاون کی درخواست کی گئی تھی اور اہم بات یہ ہے کہ جن سائنس دانوں سے رابطے کیے گئے ان میں سے اکثر نے رسالہ 'سائنس' کے مقاصد سے دلچسپی ظاہر کی اور چند ممتاز سائنس دانوں نے مضامین ارسال بھی کیے۔ مثلاً پروفیسر این ڈاسی انیڈریڈ نے ٹیلی وژن پر اپنا مقالہ بھیجا جو ترجمہ ہو کر "دور نمائی" کے عنوان سے چھپا۔ (اس زمانے میں ٹیلی وژن خود اہلِ مغرب کے لیے نسبتاً نئی چیز تھی، چہ جائیکہ ہندوستان میں تو ایسی کسی ایجاد کا تصور محال تھا ٹیلی وژن پر اردو میں یہ پہلا مضمون تھا۔) اسی طرح ڈاکٹر ایچ فرابندلش، پروفیسر برلن یونیورسٹی اور معروف ماہرطبعیات پروفیسر سرولیم بریگ (رائل انسٹی ٹیوشن لندن) نے بھی اپنے تازہ مضامین ارسال کیے۔ برطانیہ کے ممتاز کیمیا داں پروفیسر امی آدم اسٹرونگ نے اگلے شمارے میں لکھنے کا وعدہ کیا۔ اس کے علاوہ پروفیسر پلانک (برلن یونیورسٹی) پروفیسر اسٹین (کیمبرج یونیورسٹی) نے رسالے سے گہری دلچسپی ظاہر کی۔ غرض کہ "سائنس" کا انگلستان کے سائنس دانوں اور ہندوستان کے علمی حلقوں نے شاندار طریقے سے خیر مقدم کیا۔ "شذرات" کے عنوان کے تحت ڈاکٹر مظفر الدین قریشی نے لکھا:

"علمی مضامین میں اصطلاحات کا استعمال ناگزیر ہے اور اس تحریک کا ایک بہت بڑا مقصد اصطلاحات کو مقبول بنانا ہے جس کے بغیر علوم کا نشر ممکن نہیں۔"[۱۹]

رسالہ سائنس، میں سائنسی موضوعات پر مضامین کے علاوہ "اخبار علمیہ" کے عنوان سے سائنسی دنیا کی

تازہ ترین خبریں، ایجادات اور تحقیقات سے پڑھنے والوں کو مطلع رکھا جاتا تھا۔ سائنس اور نفسیات کی کتابوں پر عالمانہ تبصرے بھی کیے جاتے تھے، ان میں انگریزی کتابیں اور رسائل بھی شامل تھے۔ رسالے کے آخر میں انگریزی اصطلاحات اور ان کے اردو ترجمے کی فہرست بھی دے دی جاتی تھی۔ چوں کہ یہ اصطلاحات ان ہی مضامین کے لیے نئی نئی وضع کی جاتی تھیں لہٰذا ان کے بارے میں ایڈیٹر نے لکھا:

"شروع شروع میں ان کا (اصطلاحات کا) استعمال نفسِ مضمون سمجھنے میں دشواری پیدا کرے گا لیکن امید ہے کہ رفتہ رفتہ کثرتِ استعمال سے یہ دشواری خود بخود دور ہو جائے گی۔"[۱۲]

واقعہ یہ ہے کہ "سائنس" نہایت مفید، معلوماتی اور بلند پایہ رسالہ تھا۔ اس میں موضوع کے تقاضوں کے تحت چارٹ، نقشے اور تصویریں بھی شایع کی جاتی تھیں۔ کاغذ اور طباعت وغیرہ بہت عمدہ تھا۔ ایک عمدہ بات یہ تھی کہ سائنسی علوم کی اشاعت کے ساتھ مشرق کی روحانیت پر بھی یکساں زور دیا جاتا تھا۔ مثلاً دیکھیے اپریل ۱۹۲۸ء کی اشاعت میں ایڈیٹر نے سائنس کی اہمیت وافادیت پر کس توازن کے ساتھ روشنی ڈالی:

"انسانی زندگی کے دونوں پہلو بیرونی اور اندرونی یا مادّی اور روحانی ضروری ہیں اور بہترین تمدن وہ ہے جو ان دونوں پہلوؤں کے ارتقا کے مواقع بہم پہنچاتا ہے اور ان دونوں میں صحیح توازن قائم رکھتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک پہلو کی کمزوری حیاتِ انسانی کی تدریجی تکمیل کے لیے مُضر ہے اس اعتبار سے موجودہ مغربی تمدّن نامکمل ہے کیوں کہ اس تمدّن میں بیرونی زندگی کے مقابلے میں اندرونی زندگی کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے اور مغرب کے مفکّرین کو خود اس کمی کا احساس اور اعتراف ہے۔ لیکن دوسری طرف محض اندرونی زندگی بھی مکمل زندگی ہونے کا دعوا نہیں کر سکتی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اندرونی یا روحانی زندگی اس صورت میں حیاتِ انسانی کے لیے عام طور پر مفید اور نتیجہ خیز ہو سکتی ہے جب کہ اس کے اظہار کے لیے جسمانی صحت، دماغی قوت، اور ماحول پر تصرّف حاصل ہو اور یہ لوازمات مادّی ترقی اور عملی سائنس کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں۔"

"سائنس" جدید ترین سائنسی نظریات، انکشافات، معلومات اور تحقیقات کو اردو زبان میں منتقل کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ثابت ہوا۔ اس کے پرانے شماروں کو پڑھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ آج سے نصف صدی سے بھی پہلے جس معیار کا سائنسی جریدہ اردو میں شایع ہوتا تھا، آج اس معیار کے رسالے کی مثال

مشکل سے پیش کی جاسکتی ہے۔ رسالے میں مغرب کے اعلا سائنسی مجلّوں مثلاً "سائنس پروگرس" وغیرہ سے بھی مضامین ترجمہ کیے جاتے تھے۔ کتابوں پر تبصرے کے حصے میں مولوی عبدالحق کی تحریریں بھی ملتی ہیں مثلاً جولائی ۱۹۲۸ء کی اشاعت میں جارج سارٹن (GEORGE SARTON) کی فاضلانہ کتاب INTRODUCTION TO THE HISTORY OF SCIENCE, FROM HOMAR TO OMAR KHAYYAM پر مولوی صاحب نے بارہ صفحات کا نہایت مبسوط اور پُر مغز تبصرہ کیا اور آخر میں لکھا کہ رسالے کے آئندہ نمبروں میں ہم اس کتاب کے ان حصوں کا ترجمہ پیش کرتے رہیں گے جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ان کوششوں کا ذکر ہے جو انھوں نے سائنس کی تحقیقات اور ترقیوں میں کیں۔ پس معلوم ہوا کہ رسالہ کا مدیر مقرر کرنے کے باوجود عبدالحق رسالے کی نگرانی و سرپرستی کرتے تھے اور اپنی تجاویز و مشوروں سے بھی نوازتے تھے اور خود بھی رسالے کے لیے کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔
سائنس، کے لکھنے والوں میں محمد عثمان خان، محمود احمد خاں، سرآرتھر کیتھ، ڈاکٹر میجر فرحت علی، محمد عزیز احمد، صلاح الدین احمد، حبیب خاں ساندوزئی، محشر عابدی، خلیل الرحمٰن، ڈاکٹر برج موہن لال، آفتاب حسن، سراج الدین حسین نقوی، سید محمد حسن، محمد صدیق، محمد زکریا مائل، ٹی پی بھاسکرن، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، سید مصطفےٰ حسین، ڈاکٹر محمد بابر مرزا، محمد رحیم اللہ، محمد یحییٰ خان، میر اسد علی، ڈاکٹر محمد عثمان، مصطفےٰ کریم ندوی، ریاض الحسن قریشی، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر غلام دستگیر، محمد عبدالہادی، سید مقصود علی، سید ظہیر الدین حسن، سید محمد حیدر رضا زیدی، پی این پنڈت، ہتارا چند باہل اور دوسرے شامل تھے۔ دوسرے لفظوں میں سائنس، کا شاندار کارنامہ اردو زبان میں سائنسی موضوعات پر لکھنے والوں کی ایک ٹیم تیار کر دینا تھا۔
سائنس، کی کامیابی کے پیش نظر اسے جنوری ۱۹۴۱ء سے ماہانہ کر دیا گیا۔ ایڈیٹر نے سفر گزشتہ کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا:

> "ان تیرہ برسوں میں اسی رسالہ کے ذریعے بہت سے لوگ جو انگریزی نہیں جانتے تھے، سائنس سے تھوڑی بہت واقفیت پیدا کر چکے ہیں۔ جو لوگ انگریزی تعلیم یافتہ تھے، وہ شروع میں اردو میں سائنس کے کچھ زیادہ قائل نہیں تھے۔ اب یہ طبقہ بھی آہستہ آہستہ اس کی طرف توجہ کر رہا ہے اس رسالہ کے پڑھنے والوں کی تعداد خریداروں سے بہت

زیادہ ہے۔ کیوں کہ بہت سے طلبہ مدرسوں اور کالجوں کے کتب خانوں میں اسے پڑھتے ہیں۔
اس کے علاوہ اس کے مضامین بعض مرتبہ اردو اخباروں اور دوسرے رسالوں میں نقل کیے
جاتے ہیں جس سے اس رسالہ سے فائدہ اٹھانے والوں کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ علمی
اصطلاحوں کی اشاعت میں اس رسالہ کا کام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ بہت سے نئے
علمی اور فنی الفاظ جو سب سے پہلے اسی رسالہ کے مضمون نگاروں نے لکھے اب مقبول عام
ہو کر اردو زبان کا جز بن گئے ہیں۔ اس رسالہ کے جاری ہونے سے پہلے سائنس پر لکھنے
والے تعداد میں اتنے کم تھے کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے، اب لکھنے والوں کی کمی نہیں بلکہ
پڑھنے والوں کی کمی ہے۔[۲۱]

ماہانہ ہونے کے بعد رسالے میں چند نئے سلسلے شروع کیے گئے جن میں ایک تو "سوال و جواب" کا کالم
تھا۔ اس میں سائنس سے متعلق پڑھنے والوں کے استفساروں کے جوابات دیے جاتے تھے۔ دوسرا مستقل
سلسلہ "سائنس کی دنیا" تھا۔ اس کے تحت سائنس اور سائنس دانوں کے بارے میں تازہ خبریں شایع ہونے
لگیں۔ ان دونوں سلسلوں کا مقصد پڑھنے والوں کی اس شکایت کو دور کرنا تھا کہ رسالے میں عام فہم
مضامین بہت کم ہوتے ہیں۔

"سائنس" اورنگ آباد سے بیس سال سے زاید مدت تک جاری رہا۔ اور بقول ڈاکٹر انور سدید
"اردو میں تکنیکی نوعیت کا یہ سب سے طویل العمر جریدہ نظر آتا ہے"[۲۲] یہاں سے اس کا آخری پرچہ اگست
۱۹۴۸ء کو نکلا۔ قیام پاکستان کے بعد انجمن کے دوسرے رسائل تو جاری ہو گئے لیکن "سائنس" کے اجرا کی
باری سب سے آخر میں آئی۔ وجہ یہ تھی کہ اورنگ آباد میں رسالے کو جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر صاحبان کا قلمی
تعاون حاصل تھا۔ خاص طور پر اس کی کامیابی میں ڈاکٹر مظفر الدین قریشی کی اہلیت اور کوششوں کا بڑا دخل
تھا۔ گو بعد میں اس کی ادارت کے فرائض محمود احمد خان ریڈر کیمیا جامعہ عثمانیہ، نصیر احمد عثمانی ریڈر طبعیات
جامعہ عثمانیہ اور بعد میں آفتاب حسن انجام دیتے رہے لیکن مولوی عبدالحق کے الفاظ میں "حقیقت
یہ ہے کہ رسالے کے اجزا میں ان کا (ڈاکٹر مظفر الدین قریشی کا) بڑا دخل تھا۔ انھوں نے اس کی ترتیب،
مضامین کی تنقید، اصطلاحات کی تنقیح وغیرہ کے متعلق جو اسلوب قائم کر دیا تھا، رسالہ سائنس آخر تک
اس پر کامیابی سے چلتا رہا۔"

پاکستان میں 'سائنس' کا اجرا لاہور سے جنوری ۱۹۵۰ء میں ہوا۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر مظفر الدین قریشی ہجرت کر کے لاہور آ گئے تھے۔ لہٰذا مولوی صاحب نے ان کی قیام گاہ مقامی پر سائنس دانوں کا ایک اجلاس بلایا۔ ایک کمیٹی بنائی' رسالے کی مجلس ادارت قائم کی تمام امور طے کیے۔ ڈیڑھ دو ہزار روپے چندہ جمع ہوا۔ ڈاکٹر مظفر الدین قریشی مدیر اعلا تجویز ہوئے۔ مجلس ادارت میں ڈاکٹر رفعت حسین صدیقی، میاں محمد افضل حسین، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر حامد خاں بھٹی، ڈاکٹر بشیر احمد، میجر آفتاب حسین، ڈاکٹر افضال حسین قادری اور سید سبط نقوی شامل تھے۔ "سائنس" ماہانہ سے پھر سہ ماہی ہو گیا۔ پہلے شمارے میں مولوی عبدالحق نے اپنے وقیع علمی منصوبے کا خاکہ بیان کیا۔ مولوی صاحب کا منصوبہ یہ تھا کہ جامعہ عثمانیہ میں جتنی علمی کتابیں لکھی گئی ہیں اور رسالہ سائنس یا دوسرے رسالوں کے مضامین میں جو علمی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، ان سب کو جمع کیا جائے اور ان پر غور و تحقیق سے نظر ثانی کی جائے۔ اسی کام کے لیے جو مجلس قائم کی جائے اس میں صرف سائنس داں ہی نہ ہوں بلکہ اردو زبان کے ادیب بھی ہوں۔ اور جب ان اصطلاحات پر اتفاق رائے ہو جائے تو اسے کتاب کی صورت میں شایع کر دیا جائے تاکہ علمی اور سائنسی اصطلاحات پر اختلاف رائے ختم ہو سکے۔[۱]

'سائنس'، ایک سال تک لاہور سے نکلنے کے بعد فروری ۱۹۵۱ء میں کراچی منتقل ہو گیا۔ رسالے کے معتمد میجر آفتاب حسن مقرر ہوئے۔ اور جن اہلِ قلم کے مضامین شایع ہوتے رہے ان شیخ عبدالحمید، چودھری عبدالغفور، سید سبط نبی نقوی، ڈاکٹر حامد خاں بھٹی، مرزا منظور احمد، معین الدین صدیقی، ڈاکٹر رفعت حسین صدیقی، ڈاکٹر نذیر احمد، محمد اسلم فاروق فریدی، محمد انور، ڈاکٹر علی مومن نقوی، ڈاکٹر محمد افضال حسین قادری، غلام احمد، سید اسد علی انوری، شبیر احمد، چودھری سرفراز احمد، افتخار احمد اور سید قادری محی الدین وغیرہ شامل تھے۔ "سائنس" نے ایک نئی روایت کی بنیاد رکھی جس کے بعد اردو میں سائنس پر رسائل نکلنے لگے۔ گو یہ رسائل گوناگوں مسائل کا شکار ہیں اور ان کا معیار بھی اتنا بلند نہیں ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ رسائل کو مولوی عبدالحق جیسی لگن، محنت، اہلیت اور اردو زبان سے عشق رکھنے والے کوئی شخصیت میسر نہیں۔

پندرہ روزہ "ہماری زبان"

پندرہ روزہ "ہماری زبان" جس نے بعد ازاں پاکستان میں "قومی زبان" کا روپ دھارا مولوی عبدالحق اور انجمن ترقی اردو کا بازوئے شمشیر زن تھا۔ مولوی عبدالحق نے اس اخبار کو دہلی سے یکم اپریل ۱۹۳۹ء کو جاری

کیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب متحدہ ہندوستان میں اردو ہندی تنازعہ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اردو سیاسی محاذ پر اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی تھی اور اس جنگ میں اردو فوج کے سپہ سالار اعظم مولوی عبدالحق تھے۔ "ہماری زبان" نے اردو اور انجمن ترقی اردو کے ترجمان کی حیثیت میں اس تنازعے میں نہایت موثر کردار ادا کیا۔ اس زمانے کے فائلوں کا مطالعہ کیجیئے تو دو باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔

۱۔ "ہماری زبان" نے اردو زبان کو مسلمانوں اور ہندوؤں کے مشترکہ تہذیبی سرمایے کی حیثیت سے پیش کیا اور اس تاثر کی شد و مد سے تردید کی کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ "ہماری زبان" کے سرورق پر لوح کے اوپر تقسیم سے قبل تک پابندی سے سر تیج بہادر سپرو کا یہ جملہ بطور موٹو چھپتا رہا۔

"اردو زبان ہندو مسلمان دونوں کو اپنے آبا و اجداد سے ایک مشترکہ و مقدس ترکہ کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابلِ تقسیم ہے۔"

ہماری زبان، کے دوسرے شمارے کے اداریے میں اس نقطۂ نظر کی تفصیل سے وضاحت کی گئی:

"آج اردو زبان بڑے نازک دور سے گزر رہی ہے جو مختلف قومیں ہندوستان میں صدیوں سے رہتی چلی آئی ہیں ان میں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے رہتے زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایک حد تک یک رنگی اور یک سانی پیدا ہو گئی تھی۔ اس یک رنگی اور یک سانیت کا سب سے بڑا مظہر اردو زبان ہے جس کو ان مختلف قوموں نے اپنے خونِ جگر سے سینچ کر پروان چڑھایا تھا۔ یہ اردو زبان کا بڑا کرشمہ تھا اور اب بھی ہے کہ وہ ہندوستان کے بیشتر لوگوں کو باوجود نسلی اور مذہبی اختلاف کے ایک وطنی رشتہ میں گوندھے ہوئے ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی اپنے مذہبی رسوم، اپنی مذہبی زبانوں میں ادا کرتے ہیں لیکن جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو بلا تکلف اردو میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا رشتہ ہے جو مذہب کے رشتہ سے کہیں اونچا ہے اور درحقیقت ہندوستان کے اختلافات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس ملک میں کبھی متحدہ قومیت کے خواب کی تعبیر ہو گی تو وہ اردو زبان سے ہو گی۔ . . . بڑے افسوس کا مقام ہے کہ آج اردو زبان کی جڑ پر کلہاڑے پڑ رہے ہیں اور ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ کلہاڑے ان ہی لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں جو ہندوستان

میں متحدہ قومیت کے دعوے دار ہیں اور سیاسی حیثیت سے ہندوستان میں ایک ایسی ہندوستانی قوم کا خواب دیکھ رہے ہیں، جو مختلف عناصر سے بنی ہو۔ جو لوگ اردو زبان کو ہندوستان کی عام زبان ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے مٹانے کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، وہ درحقیقت ہندوستان کی موجودہ جغرافیائی وحدت کو مٹا کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں[۱۲۶]

۲۔ "ہماری زبان" نے اردو کے دفاع و حمایت کی جو جنگ لڑی اس میں کبھی صحافتی آداب و اخلاق کو پامال نہیں ہونے دیا اور نہ سنجیدگی، متانت، معقولیت اور دیانت داری کا دامن ہاتھ سے چھوڑا۔ ایک اداریے میں اسی جانب اشارہ بھی کیا گیا:

"انجمن ترقی اردو نے ایک ثقہ ادارے کی طرح اعتدال و معقولیت کو کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا اور یہی شعار "ہماری زبان" کا رہا ہے۔ ہم نے نہ کٹ حجتیوں میں پڑنا گوارا کیا۔ اور نہ دریدہ دہنوں کے منھ لگنا پسند کیا "ہماری زبان" کے "افکار و واقعات" اور اختتامی مضامین کے ساتھ ساتھ خبروں اور دوسرے مضمونوں کے انتخاب میں اس کا لحاظ رکھا گیا، ہماری مکمل صحافت نے اس شور و شغب کے زمانے میں جو ڈھنگ اختیار کر رکھا ہے، انجمن ترقی اردو کی یہ آواز اس سے الگ رہی۔ "ہماری زبان" نے صحافتی تبادلہ خیال میں صرف اس وقت حصہ لیا جب تک ذاتیات اور بدزبانی کی نوبت نہ آنے پائے۔ اس کی سادہ اور متوسط روش نے ہی صحافتی تمیز کو کھٹکھٹایا اور پھر تیز و تند مخالفتیں بھی اس کی سچی تردید کیے جانے پر نہیں اڑ سکے[۱۲۷]"

"ہماری زبان" ۲۰ × ۳۰ سنٹی میٹر کے ابتدا میں سولہ اور پھر بارہ صفحات پر نکلتا تھا۔ قیمت فی پرچہ ایک آنہ اور سالانہ چندہ ایک روپیہ تھا۔ ہر مہینے کی پہلی اور سولہویں تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ جب تک اردو ہندی تنازعہ گرم رہا، "ہماری زبان" کے صفحات کی پرجوش مگر مدلل وکالت کے لیے مخصوص رہے۔ "افکار و واقعات" کے عنوان سے ایسے اداریے نوٹ لکھے جاتے تھے جن میں اردو زبان سے تعلق رکھنے والی خبروں پر اظہار خیال کیا جاتا تھا۔ یہ اداریے تبصرے نہایت پُر مغز ہوتے تھے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی ان میں ادبیت پائی جاتی تھی۔ پھر مختلف علمی و ادبی مضامین، اخبارات و رسائل اور کتابوں پر تبصرے، "ذرا سنیے تو" کے عنوان سے مختصر اور دلچسپ خبریں اور آخری صفحے میں اشتہارات ہوتے تھے۔ "ہماری زبان" نے اس دور میں اردو زبان کی کیا خدمت انجام دی اس کا جائزہ ان اداریے شذرات میں موجود ہے جو اخبار کا ایک

سال مکمل ہونے پر پابندی سے لکھے جاتے تھے۔ ان شذروں سے چند اقتباس ملاحظہ ہوں:

۱۔ "اپریل ۱۹۳۹ء سے انجمن کی سرپرستی میں "ہماری زبان" جاری ہوا اور اردو کے علانیہ اور پوشیدہ دونوں قسم کے مخالفوں کی قلعی کھلنا شروع ہوئی۔ انجمن کی اس کوشش میں بڑی کامیابی ہوئی اور ہونا بھی چاہیئے تھی اس لیے کہ ایک بڑا طبقہ "بیّن ثبوت" کا ہی منتظر تھا۔ اور "ہماری زبان" کے کالموں میں ایسی ہی اشہادتیں پیش ہوتی رہیں جو اٹل ثابت ہوتی تھیں۔ اس نے ملک میں بڑی بیداری پیدا کی۔ شمالی ہند میں اردو کی مخالفت یکایک کم ہونا شروع ہوئی۔"[۲۵]

۲۔ "آج "ہماری زبان" کی زندگی کا تیسرا سال شروع ہوا ہے۔ اگرچہ ہمیں احساس ہے کہ ہم اس دو سال کے عرصے میں وہ سب کچھ نہ کر سکے جو کرنا چاہتے تھے لیکن ساتھ ہی اطمینان بھی ہے کہ ہم نے جو کچھ کر لیا ہے وہ کچھ کم نہیں۔ اردو کے خلاف جو زبردست طوفان اٹھا تھا اسے اگر ہم فرو نہیں کر سکے تو اتنی کامیابی ضرور ہوئی کہ اردو والوں کو آنے والے خطروں سے ہم نے ہوشیار کر دیا اور اس طرح اس طوفان کے اثرات زیادہ نہیں ہونے پائے اور اردو والوں کے بروقت بیدار ہونے سے اس کا زور بہت کچھ کم ہو گیا۔"[۲۶]

واقعہ یہ ہے کہ "ہماری زبان" نے بڑے آڑے وقتوں میں اردو کی حمایت میں آواز بلند کی۔ جب سیاسی دباؤ کے تحت سرکاری اداروں اور محکموں نے اردو کو نظر انداز کرنا شروع کیا اور خاص طور پر ریڈیو نے اردو کے عام الفاظ کو چھوڑ کر گڑھے ہوئے کریہہ لفظوں کو استعمال کرنا شروع کیا تو "ہماری زبان" نے اس روّیے پر احتجاج کیا اور سارے اردو داں طبقے کو اس کے خلاف ہموار کیا اور اکسایا کہ وہ اپنی شکایات تحریری طور پر ریڈیو کی انتظامیہ تک پہنچائیں۔ میاں بشیر احمد ایڈیٹر ہمایوں نے "ہماری زبان" کی اس خدمت پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا:

"مولوی صاحب نے (مولوی عبدالحق) انجمن کی طرف سے ایک پندرہ روزہ اخبار "ہماری زبان" جاری کیا جو بلاشبہ قومی زبان کی سب سے زیادہ خدمت انجام دے رہا ہے۔ "ہماری زبان" نے گزشتہ نو ماہ میں مختلف شعبوں اور محکموں اور اداروں میں اردو کے تحفظ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مثلاً ریڈیو، ریلوے، ڈاک خانہ، ڈسٹرکٹ بورڈ، یونیورسٹیاں، صوبوں کی حکومتیں، ریاستیں، کانگرس، مسلم لیگ وغیرہ۔"[۲۷]

"ہماری زبان" کے اجراء کا فیصلہ مولوی عبدالحق نے نہایت بروقت کیا تھا۔ لہٰذا اس کے نکلتے ہی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یکم اپریل ۱۹۴۲ء کو اس کی اشاعت چار ہزار چار سو تک پہنچ چکی تھی۔ اس تھوڑی سی مدت میں اس کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کس قدر وقت پر جاری کیا گیا جیسے لوگوں کو اس کا انتظار تھا۔ اردو کو ایک مردہ زبان اور اردو والوں کو بے یار و مددگار سمجھ کر اردو کے ساتھ جو سلوک کانگرس کی طرف سے ہو رہا تھا، سب نے دیکھ لیا کہ کانگرس حکومتوں کے استعفے دینے سے پہلے ہی اس روش میں نرمی پیدا ہو گئی تھی۔"[۲۵]

"ہماری زبان" نے مخالفین اردو کو دندان شکن جواب دینے کے علاوہ فروغ اردو اور دفاع اردو کے سلسلے میں مولوی عبدالحق اور انجمن ترقی اردو کی کارگزاریوں سے بھی اپنے پڑھنے والوں کو باخبر رکھا۔ اس پورے دور میں اردو زبان کو جن مسائل اور تنازعات کا سامنا رہا، اس کی پوری تاریخ "ہماری زبان" کی فائلوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی جا سکتی ہے۔ لیکن "ہماری زبان" کے اس ہنگامہ پرور دور میں بھی تخلیقی ادب اور ادیبوں کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اردو کے لسانی اور تہذیبی مزاج پر جہاں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، مولانا عبدالقدوس ہاشمی اور میاں بشیر احمد کے مضامین اور مولوی عبدالحق کی تقریریں ہماری زبان کے صفحات پر نظر آتی ہیں وہیں ادب اور ادیبوں کے حقیقی مسائل پر سید سبط حسن اور سجاد ظہیر کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ بدقسمتی سے یہ اخبار اپنی اشاعت کے بہترین زمانے میں بھی مالی خسارے سے دوچار رہا جس کی وجہ سے اس کے صفحات سولہ سے کم کر کے بارہ کر دیے گئے۔

۱۹۴۷ء تک "ہماری زبان" کے مزاج میں نمایاں تبدیلی آ گئی۔ اردو ہندی تنازعے کی گرد بیٹھ گئی۔ اب اس کے صفحات پر افسانے، نظمیں، غزلیں، مضامین، عورتوں اور بچوں کے لیے علیحدہ کالم چھپنے لگے۔ سرورق پر زبان کی اہمیت و افادیت کے حوالے سے مشاہیر کے اقوال اور اقتباسات دیے جانے لگے جب کہ صفحۂ تین کو باقاعدہ ادارتی صفحے کی شکل دے دی گئی۔ ادارت کے فرائض اس پورے دور میں ڈاکٹر ریاض الحسن، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اور رفیق الدین احمد انجام دیتے رہے۔

'ہماری زبان' کا دوسرا دور یکم جون ۱۹۴۸ء سے شروع ہوا جب یہ کراچی سے ماہانہ "قومی زبان" کے نام سے نکلا۔ (بعد ازاں یہ پندرہ روزہ اور پھر ماہانہ ہو گیا) اس کے سائز میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی تھی۔ البتہ جہاں سر تیج بہادر سپرو کا قول درج ہوتا تھا وہاں اب یہ لکھا جانے لگا: "قومی زبان ہی قوم کی آواز ہے۔" سرورق پر

تصویریں چھپنے لگیں، مندرجات ومشمولات میں بھی تبدیلیاں آئیں۔ "خیابانِ ادب" کے عنوان سے دلچسپ محاضرات، قصص وحکایات شایع کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ مولوی عبدالحق "زعفران" کی سرخی کے تحت اپنے دلچسپ مشاہدات قلمبند کرنے لگے۔ اخبار میں ایک سندھی صفحہ بھی شروع کیا گیا جس کا ایک کالم سندھی میں اور دوسرا اردو ترجمے کا ہوتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اردو اور سندھی بولنے والے لسانی اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب آجائیں۔ اس صفحے کو پیر حسام الدین راشدی ترتیب دیا کرتے تھے۔ "نقد ونظر" کے عنوان سے کتابوں اور رسالوں پر تبصرے اور "چیدہ خبریں" کے عنوان سے دو صفحات پر علمی وادبی خبریں درج کی جاتی تھیں۔

پاکستان میں "قومی زبان" کے ابتدائی چند سال نہایت معرکہ خیز گزرے۔ نوآزاد مملکت میں اس اخبار نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ بجائے خود ایک تاریخ ہے، جسے اختصار سے ان نکات میں سمیٹا جاسکتا ہے:

۱۔ "قومی زبان" نے پاکستان میں اردو کو قومی اور سرکاری زبان بنانے کی بھرپور جدوجہد کی۔ جب کبھی اردو کے مقابلے میں کسی علاقائی زبان یا مذہبی آڑ میں عربی زبان کو لانے کی کوشش کی گئی، یہ اخبار اردو کے حق میں سینہ سپر ہوگیا۔ اس نے اپنے اداریوں اور مضامین کے ذریعے اس سے کہیں جارحانہ انداز اختیار کیا جیسا اردو ہندی تنازعہ کے موقع پر اس نے اختیار کیا تھا۔

۲۔ اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے اور اردو کالج، اردو میڈیکل کالج اور بعدازاں اردو یونیورسٹی کے قیام کے لیے اسی اخبار نے حکومت پر دباؤ ڈالنے اور رائے عامہ ہموار کرنے کی پیہم کوششیں جاری رکھیں۔

۳۔ اردو اخبارات ورسائل کا وقار بلند کرنے، ان کے معیار کو بہتر کرنے اور حکومت کی نظروں میں انھیں باوقعت بنانے کے لیے قیمتی تجاویز ومشورے دیے۔ "قومی زبان" نے اردو اخبارات کو ٹائپ اختیار کرنے پر بھی زور دیا اور انھیں غیر ملکی خبر رساں ایجنسیوں پر انحصار کرنے کے بجائے اپنی بین الاقوامی خبر رساں ایجنسی کے قیام کی ضرورت واہمیت بتائی۔

۴۔ "قومی زبان" نے اردو کو دوسری علاقائی زبانوں سے قریب لانے اور ان کے مابین غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کے ازالے کی بھی سنجیدہ کوششیں کیں۔

۵۔ اس نے صحافیوں اور ادیبوں کے لیے آزادی اظہار رائے کی بھی جنگ لڑی۔ اور جب بھی اظہار پر پابندی عاید کرنے کی کوشش کی گئی، "قومی زبان" نے ببانگ دہل احتجاج کیا لیکن ساتھ ہی اس نے اخبارات کو بھی ذمہ دارانہ روش اختیار کرنے اور آزادی رائے کے غلط استعمال سے روکنے کی کوشش کی۔

"قومی زبان" کی ادارت کے فرائض مختلف وقتوں میں شاہد حسین رزاقی، قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، عبدالرشید فاضل، محمد مظہر الدین صدیقی، حکیم اسرار احمد کریوی، شجاع احمد زیبا اور مشفق خواجہ نے انجام دیا۔ مشفق خواجہ کی ادارت میں رسالے کا مزاج علمی اور ادبی ہو گیا۔ اور اس میں ڈاکٹر محمد اجمل، محمد حسن عسکری اور دیگر ممتاز ادیبوں اور نقادوں کے مضامین شایع ہونے لگے۔ بعد میں اس کا سائز بھی عام ادبی رسالوں جیسا ہو گیا۔ "قومی زبان" مالی طور پر کبھی اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکا۔ اس کے باوجود اس نے ہر دور میں بڑی بے جگری سے اردو کی لڑائی لڑی اردو زبان اس کا یہ احسان کبھی نہ بھولے گی۔

ماہانہ معاشیات

مولوی عبدالحق نے ماہانہ "معاشیات" دہلی سے جنوری ۱۹۴۶ء میں نکالا تھا اور یہ ڈیڑھ برس تک پابندی سے نکلتا رہا تھا اور اسے پڑھنے والوں میں کافی پذیرائی بھی حاصل ہو گئی تھی لیکن بقول مولوی عبدالحق، "۱۹۴۷ء کے وسط میں ملک کی تقسیم کے بعد حالات کا نقشہ ہی بدل گیا۔ انجمن کو بھی اس سلسلے میں بہت کچھ جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔۔۔۔ سب سے بڑھ کر نقصان یہ ہوا کہ انجمن کی ساری علمی اور عملی جدوجہد ختم ہو گئی۔"[۲۹] "معاشیات" بھی بند ہو گیا۔

پاکستان سے معاشیات اگست ۱۹۴۹ء میں جاری ہوا

"معاشیات" کیوں نکالا گیا تھا۔ مولوی عبدالحق کی زبانی سنیے:

"اردو کی اشاعت اور ترقی کے ساتھ ہی ساتھ انجمن ترقی اردو کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ وہ اردو ادب کی کمی پوری کرے، کوئی زبان شائستہ اور ادبی ہونے کا دعوا نہیں کر سکتی جو علمی خیالات ادا کرنے سے قاصر ہو اور جس میں علوم و فنون کا کافی ذخیرہ نہیں۔"[۳۰]

چناں چہ "معاشیات" کی از سر نو اشاعت کا ڈول ڈالا گیا، ایک مجلس ادارت ترتیب دی گئی جس میں ملک کے ممتاز ماہرین معاشیات کو شامل کیا گیا۔ رسالے کا معتمد محمد احمد سبزواری ار ریسرچ آفیسر منسٹری

آف اکنامکس افیئرس) کو مقرر کیا گیا۔ دیگر اراکین ادارت میں ڈاکٹر انور اقبال، سید منیر الہدیٰ، ڈاکٹر سردار محمد اختر، محمد حسن، سید عبد الصمد، حاتم علی علوی، الطاف گوہر، سید احمد، غلام محمد بدر الدین شامل تھے۔ یہ سارے اصحاب یا تو حکومت کے مالیاتی اداروں میں کسی اونچے عہدے پر فائز تھے یا پھر اعلا تعلیمی اداروں میں معاشیات و تجارت کی تعلیم و تدریس یا صحافت سے وابستہ تھے۔ "معاشیات" کا پہلا شمارہ ۴۴ صفحات پر مشتمل تھا، فی پرچے کی قیمت ۸ آنے، ششماہی تین روپے اور سالانہ چندہ چھ روپے تھا۔ مضامین کے سلسلے میں اعلان کیا گیا تھا: "رسالے میں نظری معاشیات اور پاکستان، ہندوستان، اسلامی ممالک، غیر ممالک کے معاشی مسائل، زراعت پر صحیح معلومات کے مقالے اور مضامین شامل ہوں گے۔ اسلامی معاشیات اور علمائے اسلام کے معاشی افکار کی اشاعت کے علاوہ رسالے میں معاشی خبریں اور ضروری اعداد و شمار اور علم معاشیات کی اردو اصطلاحوں کی تشریح بھی شایع ہوا کرے گی۔"[۳۱]

"معاشیات" کا پہلا پرچہ منظر عام پر آیا تو سرکاری، غیر سرکاری اور علمی حلقوں میں شاندار خیر مقدم ہوا۔ ہر جگہ اسے مضامین کے معیار، کتابت اور طباعت کے لحاظ سے پسند کیا گیا۔ چناں چہ عوام میں اس کو مزید مقبول بنانے کے لیے چندہ آٹھ روپے کے بجائے چھ روپے سالانہ کر دیا گیا۔ "معاشیات" پر انگریزی اور اردو اخبارات نے حوصلہ افزا تبصرے لکھے۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ نے تبصرہ کیا:

> "یہ رسالہ ان لوگوں کے واسطے بے حد مفید ہے جو معاشیات اور مالیات کے دشوار مسائل سمجھنا چاہتے ہیں مگر انگریزی سے نامانوس ہونے کی وجہ سے مجبور ہیں۔ انگریزی کی تعلیم بین الاقوامی روابط کے لیے ضروری ہے لیکن اس کو نقصان پہنچائے بغیر اردو کے سامنے ایک وسیع میدان ہے۔ چناں چہ انجمن اس ذیل میں ٹھوس کام کر رہی ہے اور اس کا زیر تبصرہ رسالہ بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کے سامنے ایک شاندار مستقبل ہے۔"[۳۲]

"ماہ نو" نے لکھا:

> "دہلی سے بھی انجمن اسی نام کا ایک رسالہ نکالتی تھی، موجودہ پرچہ معیار میں اس سے بہت بہتر ہے اور اس میں پاکستان کے کئی ماہرین معاشیات کے ایسے مضامین شامل ہیں جو پاکستان کی معاشی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔"[۳۳]

اگست ۱۹۴۹ء سے دسمبر ۱۹۵۰ء تک معاشیات کے سولہ شمارے شایع ہوئے۔ اس رسالے نے ایک

ہزار سے زاید صفحات پیش کیے جن میں تاریخ معاشیات، نظری معاشیات، عملی معاشیات، زراعت، صنعت وحرفت، تجارت، بینک کاری، زر، مالیات، منصوبہ بندی، نقل وحمل، گھریلو دست کاریوں وغیرہ پر ۹۲ گراں قدر مقالات شایع کیے۔ پاکستان کے علاوہ ہندوستان، ایران، دیگر اسلامی ممالک امریکہ اور روس وغیرہ کی معشیت سے متعلق بھی متعدد مضامین شایع کیے گئے۔ اسلامی معاشی کانفرنس کے موقع پر "کانفرنس نمبر" کے عنوان سے ایک خصوصی شمارہ منظر عام پر آیا۔ مستقل مضامین کے علاوہ معاشی کوائف یا ادارتی نوٹوں کے تحت ۷۶۸ اہم واقعات پر تبصرہ کیا گیا۔ مولوی عبدالحق کے دیگر رسائل کی طرح اس رسالے کے آخر میں بھی معاشیات کی انگریزی اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ درج ہوتا تھا۔

مئی ۱۹۵۰ء میں مولوی عبدالحق نے "معاشیات" میں ایک اہم تبدیلی لانے کا فیصلہ کیا۔ ماہرین کے مشوروں سے انھوں نے طے کیا کہ "معاشیات" میں سیاسیات کے موضوع پر بھی مضامین شامل کیے جائیں۔ اس فیصلے کا جواز یہ تھا کہ "سیاست جس کو سارے علوم صحیحہ (Social Science) کا سرتاج خیال کیا جاتا تھا، اب معاشیات کا ایک جزو بن گئی ہے آج معاشی مسائل سیاست کے دھاروں کا رُخ بدل لیتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ویسے بھی اب سیاست کوئی شجر ممنوعہ نہیں ہے۔ آزادی کے بعد اسی بات کی سخت ضرورت ہے کہ آزاد ملک کے باشندوں کو علم سیاست کے اصولوں اور کُلیوں سے واقف کرایا جائے تاکہ ان کی ملکی انتظام سنبھالنے کی صلاحیت میں اضافہ ہو سکے۔" ۳۴ے

"معاشیات" میں سیاسی موضوعات کی اشاعت کا دروازہ تو کُھل گیا لیکن اس کی فائلیں بتاتی ہیں کہ سیاسی مضامین کی تعداد برائے نام ہی رہی۔ اکتوبر ۱۹۵۴ء سے رسالے کے معتمد اعزازی محمد احمد سبزواری کے بجائے توفیق محمد خاں ہو گئے۔ اداریے میں محمد احمد سبزواری کی خدمات کی تعریف کرتے ہوئے لکھا گیا:

"گزشتہ پانچ سالوں میں معتمد کی حیثیت میں مضامین کی فراہمی، رسالے کی ترتیب و تدوین اور ادارت کا پورا کام سبزواری کے سپرد رہا۔ رسالے کو سرکاری امداد حاصل تھی اور نہ انجمن کے علاوہ کسی اور ادارے کی سرپرستی۔ اس وجہ سے رسالہ ہمیشہ مالی دشواریوں کا شکار رہا۔ رسالہ مضمون نگاروں کو کوئی معاوضہ پیش نہیں کر سکتا تھا جس کی وجہ سے مضامین کی فراہمی ایک مسئلہ بنی رہی۔ لہٰذا بعض اوقات شروع سے آخر تک پورا رسالہ سبزواری صاحب کو

لکھنا پڑے"۔

"معاشیات" جنوری ۱۹۵۵ء تک جاری رہا۔ ابتدا میں یہ ٹائپ میں چھپتا تھا لیکن بعد میں کم صفحات میں زیادہ مواد دینے کے خیال سے کتابت پر منتقل کر دیا گیا۔ رسالے کے چند صفحات طالب علموں کے لیے بھی مخصوص کر دیے گئے تھے۔ لیکن افسوس کہ اردو کا یہ معیاری علمی رسالہ چند برسوں تک بہار جانفزا دکھاکر مرجھا گیا۔

سہ ماہی "تاریخ و سیاسیات"

مولوی عبدالحق نے پاکستان آنے کے بعد دو علمی انجمنوں کی بنیاد رکھی۔ ایک انجمن سائنس اور دوسری تاریخ و سیاسیات۔ اس انجمن کے قیام کے سلسلے میں انھوں نے مئی ۱۹۵۰ء میں کراچی میں انجمن ترقی اردو کے دفتر میں ماہرین تاریخ اور تاریخ کے اساتذہ کرام کا ایک اجلاس بلایا جس میں انجمن کی جانب سے ایک سہ ماہی رسالہ تاریخ و سیاسیات کے موضوع پر جاری کرنا طے پایا۔

"تاریخ و سیاسیات" کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۵۱ء میں شایع ہوا۔ ۱۷×۲۲ سنٹی میٹر کے سائز کا یہ رسالہ ٹائپ کے ۱۵۲ صفحات پر مشتمل تھا۔ قیمت ڈھائی روپے فی رسالہ تھا۔ مجلس ادارت کے صدر مولوی عبدالحق تھے اور ارکین ادارت میں ڈاکٹر محمود حسین خان، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، مسٹر ایم بی احمد، ڈاکٹر معین الحق، ڈاکٹر ریاض الحسن، سید حسام الدین راشدی، قاضی احمد میاں اختر، سید ہاشمی فریدآبادی شامل تھے۔ بعد میں مولوی سید تقی الدین کے نام کا اضافہ ہو گیا۔ "تاریخ و سیاسیات" بلند پایہ علمی مجلہ تھا۔ اس میں معروف اہل قلم اور مورخین کے مضامین چھپتے تھے اس کا اندازہ پہلے شمارے کے فہرست مضامین سے لگایا جا سکتا ہے:

(۱) افتتاحیہ سر ظفراللہ خاں وزیر خارجہ پاکستان

(یہ وہ تقریر تھی جو "مجلس تاریخ" کے افتتاح کے موقع پر کی گئی تھی)

(۲) ہندی الاصل اور ہندوی مسلمان سلاطین: سید سلیمان ندوی

(۳) قانون بین الممالک کا آغاز و ارتقا: ڈاکٹر حمیداللہ

(اس موضوع پر اردو میں لکھا جانے والا یہ پہلا مقالہ ہے)

(۴) مشاہدات کابل: مولوی محمد علی (یہ مشاہدات مدیر رسالہ کی خصوصی فرمائش پر تحریر کیے گئے۔)

(۵) تبصرے:

(i) تاریخ مسلمانان پاکستان وبھارت: مبصر ڈاکٹر مولوی عبدالحق

(ii) خوارزم قدیم فم اشرف

(iii) تذکرۂ اہل دہلی قاضی احمد میاں اختر (منقول از آثار الصنادید۔ مسلسل) دیگر شماروں کے لکھنے والوں میں عبدالرحمٰن صدیقی، ڈاکٹر محمد اشرف، ڈاکٹر سید باقر علی ترمذی، مولوی اصلح الحسینی، مسز ڈاکٹر اشرف، نصیرالدین ہاشمی، سید تمکین کاظمی، مالک رام، مفتی انتظام اللہ شہابی، ڈاکٹر سید معین الحق، عبدالرافع خان، مرزا علی اظہر برلاس، عبدالماجد فاروقی، ڈاکٹر وحید قریشی، وحیدالدین قادری، پروفیسر ضیاالدین احمد، محمود احمد عباسی اور دیگر اہل قلم شامل تھے۔

"تاریخ وسیاسیات" کو کامیاب بنانے کی ڈاکٹر حمیداللہ نے حتی المقدور کوشش کی انھوں نے رسالے کے لیے خود بھی مضامین لکھے اور دوسروں کے مضامین بھی رسالے کو اشاعت کے لیے فراہم کیے۔ نومبر ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں ابوالجلال ندوی کا ایک چونکا دینے والا مقالہ "موئن جوڈرو کی زبانیں" شایع ہوا۔ فاضل مقالہ نگار کا دعوا تھا کہ اس نے موئن جوڈرو کی مہروں پر قدیم عربی کے حروف پڑھ لیے ہیں۔ اس مقالے پر ایڈیٹر نے نوٹ لکھا: "یہ انکشاف بڑی جرأت سے کیا گیا ہے۔ ہم اس کی صحت کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں پیش کرسکتے۔ مگر ان کا نظریہ غور وتحبت پر ضرور مبنی ہے"۔

جولائی ۱۹۵۱ء میں مالک رام کا تحقیقی مقالہ "حمورابی اور قانون حمورابی" اگست ۱۹۵۲ء میں عبدالماجد فاروقی کا مقالہ "ادارۂ پاپائیت وخلافت کا تقابلی مطالعہ" قسط وار شایع ہوا۔ ڈاکٹر معین الحق کی مرتبہ کتاب "تذکرۃ الواقعات" از جوہر آفتابچی مئی ۱۹۵۲ء سے سلسلہ وار چھپی۔

"تاریخ وسیاسیات" اگست سنہ ۱۹۵۴ء کے بعد پھر نہ نکل سکا اور یوں پڑھنے والوں کی کور ذوقی اور لکھنے والوں کی قلت کے سبب ایک بہت اچھا علمی رسالہ بند ہوگیا۔

حوالہ جات:

۱ ماہنامہ "ہم قلم" کراچی اگست ۱۹۶۲ء

۲ شہاب الدین ثاقب "مولوی عبدالحق حیات اور علمی خدمات" انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی

۱۹۸۵ء ص ۱۰۹

۳۔ مختارالدین احمد "عبدالحق" سلسلہ ہندوستانی ادب کے معمار ساہتیہ اکادمی دہلی ۱۹۸۴ء ص ۲۳۔۲۴

۴۔ امداد صابری "تاریخ صحافت اردو" جلد پنجم، جدید پرنٹنگ پریس ۲۲ گلی کبابیان جامع مسجد دہلی ۱۹۸۳ء ص ۳۸۷

۵۔ ماہنامہ ہم قلم اگست ۱۹۶۲ء ۶۔ شہاب الدین ثاقب، محولہ بالا ص ۱۱۰ ۷۔ ایضاً ص ۳۲

۸۔ رئیس احمد جعفری "اس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو" مشمولہ "قومی زبان" کراچی بابائے اردو نمبر ۱۹۶۶ء

۹۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید "مجلاتی صحافت میں نقوش کا مقام" مشمولہ نقوش محمد طفیل نمبر جولائی ۱۹۸۷ء

۱۰۔ سہ ماہی اردو اورنگ آباد جنوری ۱۹۲۱ء ۱۱۔ ایضاً ۱۲۔ ایضاً ۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ جمیل الدین عالی "حرفے چند" مشمولہ اشاریہ اردو مرتبہ سید سرفراز علی رضوی" انجمن ترقی اردو، کراچی ص ۴

۱۵۔ سہ ماہی اردو کراچی جنوری ۱۹۵۱

۱۶۔ ڈاکٹر انور سدید "مولوی عبدالحق کی ادبی صحافت" مشمولہ سہ ماہی ادبیات شمارہ ۱۳، ۱۴، ۱۵، جلد ۴ اسلام آباد

۱۷۔ سہ ماہی اردو جنوری ۱۹۲۱ء ۱۸۔ سائنس جنوری ۱۹۲۸ء ۱۹۔ ایضاً ۲۰۔ ایضاً ۲۱۔ سائنس جنوری ۱۹۴۱ء

۲۲۔ سہ ماہی "ادبیات" محولہ بالا ۲۳۔ پندرہ روزہ "ہماری زبان" ۱۶/ اپریل ۱۹۳۹ء ۲۴۔ ہماری زبان" اپریل ۱۹۴۰ء

۲۵۔ ہماری زبان یکم جنوری ۱۹۴۰ء ۲۶۔ ہماری زبان یکم اپریل ۱۹۴۱ء ۲۷۔ ہماری زبان یکم جنوری ۱۹۴۰ء

۲۸۔ ہماری زبان اپریل ۱۹۴۰ء ۲۹۔ معاشیات اگست ۱۹۴۹ء ۳۰۔ ایضاً

۳۱۔ معاشیات ستمبر ۱۹۴۹ء ۳۲۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ ۲۷/ اگست ۱۹۴۹ء

۳۳۔ ماہ نو لاہور اکتوبر ۱۹۴۹ء ۳۴۔ معاشیا جولائی ۱۹۵۰ء

ڈاکٹر رحیم بخش

مکاتیب عبدالحق

اُردو نثر کی اصناف میں مکتوب نگاری کی اہمیت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ کسی بڑی شخصیت کا خط محض ایک تحریر نہیں ہوتا بلکہ ایک صاف اور شفاف آئینہ تصور کیا جاتا ہے جس میں لکھنے والے کا بھرپور عکس دکھائی دیتا ہے۔ شاعر اور ادیب اپنی شخصیت کو اپنی تخلیق کے پردوں میں چھپا کر رکھتے ہیں شاید وہ کہتے ہیں کہ اگر ان کی شخصیت کے سبھی پہلو لوگوں کے سامنے آگئے تو ان کی شہرت اور مقبولیت کا سورج گہنا جائے گا۔ اس لیے کسی فن کار کے حقیقی خیالات کا مطالعہ محض اس کے فن پاروں کے ذریعے ممکن نہیں اس کے لیے ہمیں کسی دوسرے ذریعے کی جستجو کرنا چاہیے اور یہ ذریعہ شاعر یا ادیب کے خطوط ہی ہوسکتے ہیں۔

خطوط، لکھنے والے کے اصل اوصاف کو بے نقاب کر دیتے ہیں اور اس کی تہ در تہ شخصیت کو قارئین پر کھول کر رکھ دیتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ خطوط کسی اخبار یا رسالے میں اشاعت کی غرض سے نہ لکھے گئے ہوں ایسے خطوط دلچسپ بھی ہوسکتے ہیں اور معلومات افزا بھی لیکن اکثر و بیشتر یہ کاغذی پردے ثابت ہوتے ہیں جن کے پیچھے اصل شخصیت چھپ جاتی ہے، لہٰذا تحقیقی اعتبار سے وہی خطوط مفید ثابت ہوتے ہیں جو سادگی اور بے تکلفی سے لکھے گئے ہوں۔ مولوی عبدالحق خطوط کی افادیت کے اس پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "خطوں کی یہی سادگی اور بے ریائی ہے جو دلوں کو لبھاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہوسکتا۔ خطوں میں کاتب مکتوب الیہ سے بعض اوقات اپنے آپ سے بات کرنے لگتا ہے جو خیال جس طرح دل میں ہوتا ہے اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے، نہیں بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال

کر رکھ دیتا ہے۔"(۱)

یہی بات بالفاظ دیگر یوں کہتے ہیں:

"خانگی خطوط ہیں اور خاص کر ان خطوں میں جو اپنے عزیز اور مخلص دوستوں کو لکھے جاتے ہیں ایک خاص دل چسپی ہوتی ہے جو دوسری تصانیف میں نہیں ہوتی۔ ان کی سب سے بڑی خوبی بے ریائی ہے، تکلف کا پردا بالکل اٹھ جاتا ہے اور مصلحت دراندازی کا کھٹکا نہیں رہتا۔ گویا انسان اپنے سے خود باتیں کر رہا ہے جہاں اندیشہ لازم نہیں ہے یہ دلی خیالات اور جذبات کا روزنامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہے پھر کون ہے جو اس خاموش آواز کے سننے کا مشتاق نہ ہوگا؟ یہ ہماری فطرت میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم روزنامچوں، آپ بیتیوں اور خطوں کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان میں وہ صداقت اور خلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا۔ یہاں انسان بچپن کی سی سادگی سے بلا تصنع ان خیالات کو بیان کرتا ہے جو اس کے دل و دماغ میں گزرتے ہیں۔ جنھیں نہ انشا کی صنعت مسخ سکتی ہے اور نہ تشبیہات و استعارات کا بوجھ دبا سکتا ہے گویا وہ کاغذ کے صفحے پر اپنا دل اور دماغ کھول کر رکھ دیتا ہے جس میں ہر حرکت ہر خیال اور ہر تمنا جیتی جاگتی اور گھٹتی بڑھتی نظر آتی ہے۔"(۲)

مولوی عبدالحق نے خطوط کی اہمیت و افادیت کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے وہ ان کے اپنے خطوط پر بھی صادق آتی ہے۔ ان خطوں سے ان کے کردار کے مختلف گوشے اس طرح روشن ہوتے ہیں کہ مخالفوں کی اڑائی ہوئی دھول قاری اور مولوی عبدالحق کی شخصیت کے درمیان حائل نہیں ہو سکتی۔ جو لوگ اصل مولوی عبدالحق سے متعارف ہونے کے خواہش مند ہیں ان کے لیے خطوط عبدالحق سے بے نیاز رہنا ممکن نہیں، اس کے باوجود یہ بات یقیناً دل چسپ ہے کہ مولوی صاحب سے جب بھی کسی نے ان کے خطوط کی ترتیب و تدوین اور اشاعت کا ذکر کیا تو انھوں نے اس کو بالکل پسند نہیں کیا اور خواہش مند حضرات کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کی لیکن لوگ مایوس نہیں ہوئے حتیٰ کہ مولوی عبدالحق کو رضامند ہونا پڑا جیسا کہ ان کے خطوط بنام حکیم محمد امام امامی اور شبیر علی کاظمی سے ظاہر ہے جو بالترتیب ۳ر نومبر ۱۹۵۸ء(۳) اور ۱۲ر نومبر ۱۹۵۸ء کو لکھے گئے(۴)۔ ان خطوں میں انھوں نے جمع و تدوین کو ایک

بدعت، فیشن اور رواج وغیرہ کا نام دیا ہے اور لکھا ہے کہ ایسے کاموں میں وقت اور روپیہ صرف کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ قصہ کوتاہ مشفق خواجہ بابائے اردو کو قائل کرنے میں کامیاب رہے اور انھوں نے ان کے خطوط جمع کرنے اور شایع کرنے کی اجازت حاصل کر کے چند سال کی مسلسل کوشش سے ایک بڑا ذخیرہ جمع کر لیا جسے بعد ازاں جلیل قدوائی نے مکاتیب عبدالحق کے نام سے مرتب کر کے اردو اکیڈیمی سندھ کراچی سے ۱۹۶۲ء میں شایع کیا۔ اس سے قبل ایک مجموعہ مکتوبات بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق بنام حکیم محمد امام امامی سکریٹری انجمن ترقی اردو میسور بنگلور" اردو اکیڈیمی سندھ کراچی سے نومبر ۱۹۶۰ء میں شایع ہو چکا تھا، اس کے بعد اب تک مندرجہ ذیل مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں:

اردوئے مصفّیٰ مرتبہ ہاشمی فرید آبادی مطبوعہ ۱۹۶۱ء

مکتوبات بابائے اردو بنام پیر حسام الدین راشدی مطبوعہ ۱۹۶۴ء

خطوط عبدالحق مرتبہ اکبر الدین صدیقی مطبوعہ ۱۹۶۷ء

عبدالحق کے خطوط عبدالحق کے نام مرتبہ افضل العماد ڈاکٹر عبدالحق مطبوعہ ۱۹۶۸ء

موخر الذکر دونوں مجموعے ماہنامہ قومی زبان۔ کراچی نے بابائے اردو کی نویں برسی کے موقع پر اگست ۱۹۷۰ء میں شایع شدہ خصوصی شمارہ میں بھی شامل کئے، انگریزی خطوط کا ایک مجموعہ بہ عنوان Letters by Maulvi Abdul Haq ۱۹۶۶ء میں شایع ہو چکا ہے۔ خطوط عبدالحق بنام ڈاکٹر عبداللہ چغتائی "مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی دسمبر ۱۹۷۶ء میں شایع ہوئی۔

ان مجموعوں کے علاوہ مولوی عبدالحق نے "بچوں کے خطوط" کے عنوان سے دو حصوں میں ایک کتاب تیار کی جس کا پہلا حصہ مدارس تحتانیہ (پرائمری) اور دوسرا مدارس فوقانیہ کے طالب علموں کے لیے لکھا گیا تھا، دونوں حصے نومبر ۱۹۴۴ء میں عبدالحق اکیڈیمی اشاعت منزل اردو گھر حیدر آباد دکن سے شایع ہوئے۔

ان تمام مطبوعہ مجموعوں میں شامل خطوط کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں حالاں کہ اندازہ یہ ہے کہ بابائے اردو کے خطوط کی تعداد ہزاروں میں ہے جن میں سے خاصی تعداد ان خطوط کی ہے جو رسائل، اخبارات اور متفرق کتاب یا مجموعوں میں شایع ہو چکے ہیں۔ ان میں وہ دو خط بھی شامل ہیں جو انھوں نے ۱۹۲۳ء میں مولانا عثمان جعفری ایم اے پروفیسر سٹی کالج حیدر آباد دکن کو لکھے تھے اور غالباً ابھی تک ان کے

کسی مجموعۂ خطوط میں شامل نہیں ہو سکے۔ اکثر و بیشتر خطوط تاحال لوگوں کے ذاتی ذخیرہ یا برصغیر کے مختلف اداروں کی فائلوں میں کسی محقق یا محققین کی جماعت کی منظم اور مربوط مساعی کے منتظر ہیں۔

مولوی عبدالحق کے نام اقبال کے آٹھ خطوط دستیاب ہوئے ہیں یہ خطوط ڈاکٹر ممتاز حسن نے اپنی کتاب "اقبال اور عبدالحق" میں شامل کئے ہیں جن سے دونوں شخصیتوں کے مراسم کا پتہ بھی چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں عرصے تک خط و کتابت جاری رہی لیکن افسوس ہے کہ مولوی عبدالحق کا ایک خط بھی دستیاب نہیں ہو سکا۔

خطوط کا یہ بیش قیمت ذخیرہ بابائے اردو کے افکار و نظریات، واحساسات، رجحانات و میلانات عادات واطوار اور اشتغال وغیرہ کے علاوہ ان کی معاصر تاریخ کا بھی آئینہ ہے۔ اردو زبان سے ان کا لگاؤ سب پر واضح ہے لیکن اس لگاؤ کے فکری پس منظر کا علم ہمیں خطوط سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ ۲۸ اپریل ۱۹۴۲ء کو انھوں نے حکیم امامی کو خط لکھا ہے اس میں نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ بتایا ہے کہ وہ اردو زبان کی ترویج واشاعت میں اس لیے کوشاں ہیں کہ یہ زبان برصغیر کے لوگوں میں اتحاد اور یک جہتی پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ کیوں کہ یہ چیز اس کی سرشت میں داخل ہے یہ آپس کے میل جول سے پیدا ہوئی ہے اور گزشتہ زمانے کی طرح اب بھی یک ان کی اور خوش گواری پیدا کر سکتی ہے۔[5] حکیم امامی ہی کے نام یکم دسمبر ۱۹۴۸ء کو لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اس زبان کا پایہ بہت بلند ہے اور ملک کے ہر حصے اور ہر گوشے میں اس کے جاننے اور بولنے والے موجود ہیں اس کی شیرینی اور حسن وخوبی کو غیروں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اس کا ادب بہت وسیع اس کی صلاحیت بے پایاں ہے۔ ملک کے مختلف طبقوں میں اتحاد و آشتی کا بہت بڑا ذریعہ ہے اس کی خدمت درحقیقت ملک کی خدمت ہے۔[6]

اردو کی اہمیت وافادیت کے اس احساس نے انھیں ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اردو کی معتمدی قبول کرنے پر آمادہ کیا اور وہ موزوں مرکز کی تلاش میں علی گڑھ سے اورنگ آباد، وہاں سے دہلی اور پھر کراچی تک سرگرداں رہے۔

اسی پر بس نہیں بلکہ انھوں نے اپنا سب کچھ اس کے لیے وقف کر دیا، اپنے اوقات عزیز، اپنی آمدنی اور جسم وجان کی ساری صلاحتیں انجمن کے مقاصد کی تکمیل میں صرف کر دیں، ان کی خوشی اور غم، صحت اور بیماری اس ایک ادارے کی کامیابیوں اور ناکامیوں کے تابع ہو کر رہ گئی ان کے خطوں

میں بھی اردو زبان اور انجمن کا ذکر تمام امور پر حاوی ہے، کہیں کتابوں کے پروف پڑھنے کا ذکر ہے اور کہیں کتابوں کی اشاعت کی اطلاع ہے، کہیں مسودوں کے ملنے کی خبر ہے تو کہیں ان پر نظر ثانی کا تذکرہ۔ اس کے علاوہ انجمن کی شاخیں کھولنے، چندہ اور امداد حاصل کرنے، اردو کانفرنس منعقد کرنے کا ذکر بھی کثرت سے ملتا ہے، یہ اور اس قسم کے دیگر موضوعات یقیناً خشک ہیں لیکن انہی موضوعات کی بدولت خطوط عبدالحق کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے کیوں کہ ان کے مطالعہ سے مولوی عبدالحق کی وہ شاندار خدمات نمایاں ہوتی ہیں جو انھوں نے اردو زبان کی ترویج کی تحریک کی قیادت کرتے ہوئے انجام دیں۔

۲۳ راگست ۱۹۵۰ء کے خط میں حکیم امامی کو لکھتے ہیں "تمھیں معلوم ہے کہ جو کچھ پاس تھا وہ انجمن کی نذر کر چکا تھا گزر اوقات کا سہارا پنشن تھا سو وہ حکومت حیدرآباد نے بند کر دی ہے"(۷) خیال رہے کہ مولوی عبدالحق نے اپنی عمر کی کمائی ۲۴ ہزار روپے کی خطیر رقم انجمن کو بطور عطیہ دے دی تھی ظاہر کہ پنشن کی بندش نے کیا کیا ستم دکھائے ہوں گے لیکن اس پر بھی صبر وضبط اور غیرت وخودداری کا یہ عالم ہے " جہاں مصائب وآلام کے پہاڑ ٹوٹے ہوں جہاں ہماری تہذیب وروایات اور ہماری زبان کو یکسر مٹا دیا گیا ہو وہاں میں اپنی پنشن بند ہونے کی کس منہ سے شکایت کروں۔ بہت گزر گئی تھوڑی باقی ہے یہ بھی بُری بھلی گزر ہی جائے گی۔ اللہ بس باقی ہوس"(۸) یہ اور دوسری بہت سی مصیبتیں اور صدمے بابائے اردو نے محض حُبِ اردو اور خدمتِ انجمن کے جذبے کی وجہ سے برداشت کیے لیکن ماتھے پر شکن تک لانا گوارا نہیں کی۔ انجمن کی خدمت کے سلسلے میں انھوں نے جس وفاداری بشرطِ استواری" کا مظاہر کیا اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں اس معاملے میں وہ صاحب عزیمت تھے جب کسی کام کا بیڑا اٹھاتے اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے حتی الامکان کوشش کرتے اور ناموافق حالات سے بد دل نہ ہوتے۔ ۷ راگست ۱۹۵۳ء کو ڈاکٹر شوکت سبزواری کے خط میں اردو زبان کو درپیش حوادث کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اردو بہت بد نصیب ہے گھر میں درماندہ اور باہر راندہ۔ کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اب تو دوست بھی منہ چھپانے لگے یہ مخالفت آج کی نہیں سالہا سال سے چلی آرہی ہے لیکن یہ کچھ ایسی سخت جان ہے کہ ہر معرکے میں سے سرخ رُو ہو کر نکلی۔ مگر اب کے چال بے ڈھب

پڑی ہے۔ پہلے غیروں سے لڑتے رہے اب اپنوں سے لڑنا پڑا ہے یہ سخت آزمائش ہے بعض اوقات مجھے بھی مایوسی ہونے لگتی ہے لیکن میں اس پر کاربند ہوں:

دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یا جاں رسد بہ جاناں یا جاں زتن برآید (۹ الف)

۴ مئی ۱۹۴۳ء کے خط میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کو لکھتے ہیں کہ "اردو زبان کا جلسہ ضرور کرڈالو خرچ کچھ زیادہ نہ ہوگا ... اس قدر ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ کوئی نہیں دے گا تو میں دوں گا۔ میں اس کام کو کر کے چھوڑوں گا، خواہ کوئی مدد دے یا نہ دے میں کبھی کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتا، جب تک اس کی تکمیل کا تہیہ نہیں کر لیتا۔ مجھے اپنی ذات پر کامل اعتماد ہے اور میں کر کے دکھادونگا۔ اس طرح دیر تو لگے گی مگر کام نہیں رُکے گا"۔ (۹۔ب)

انجمن ترقی اردو اگر بابائے اردو کی جان تھی تو اردو ان کا ایمان بھی، نہ وہ انجمن کی مخالفت برداشت کر سکتے تھے اور نہ اردو کی۔ وہ اردو سے محبت ضرور کرتے تھے لیکن کسی دوسری زبان کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے البتہ جو شخص یا گروہ اردو کو اس کے جائز حق اور منصب سے محروم کرنے کی کوشش کرتا یا اردو دشمنی کا مظاہرہ کرتا وہ اس کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور اس سلسلے میں وہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی پرواہ نہیں کرتے تھے وہ اگر گاندھی جی کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں(۱۰) یا سر مرزا اسمٰعیل کی مذمت کرتے ہیں تو صرف اس بنا پر کہ وہ انھیں اردو کا مخالف تصور کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے ۳ جولائی ۱۹۴۶ء کے مکتوب بنام حکیم محمد امام امامی میں اپنے اس اصول زندگی کی وضاحت یوں کی ہے:

"تم نے کمال کیا جو اس ظالم سے ملاقات کی۔ تعجب ہے اس نے تمھیں دھتکار کر نکال کیوں نہیں دیا مجھے اس کی ذات سے کوئی مخالفت یا عداوت نہیں لیکن اردو کو جو کوئی بھی نقصان پہنچائے گا میں اس کا دوست نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی میرا بڑے سے بڑا بزرگ بھی یہ حرکت کرتا تو میں اس سے بھی یہی برتاؤ کرتا"(۱۱)

بابائے اردو میدانِ سیاست کے مرد کبھی نہ تھے لیکن چوں کہ اردو زبان کی تحریک قومی تحریک ہے اور اس نے برصغیر کی سیاست میں اہم کردار ادا کیا ہے اس لئے ان کے لیے ناگزیر تھا کہ وہ سیاسی ہنگاموں

کو ہمنوا بنانے اور ان کے اثر و رسوخ کو اردو کے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کریں لیکن مجموعی طور پر ان کی توقعات پوری نہ ہو سکیں اس بنا پر وہ نہ سیاست دانوں سے مایوس تھے بلکہ امیر کبیر لوگوں کے رویہ سے بھی نالاں تھے۔ ۱۹۴۹ء میں انھوں نے ہمدردان اردو کی جو اسکیم جاری کی اس میں انھوں نے لکھ پتی سیٹھوں کی بجائے غریبوں مگر مخلص محبانِ اردو سے تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے حکیم امامی کے نام ۹ر دسمبر ۱۹۴۹ء کے مکتوب میں اس اسکیم کو غریبوں کا نام دیا اور لکھا "امرار اور لکھ پتی ہمارے کام سے مطلق ہمدردی نہیں رکھتے۔ وہ جانتے ہی نہیں کہ تعلیم وتہذیب زبان و ادب کن چڑیوں کا نام ہے۔ اس لیے ہم نے غریبوں/متوسط الحال شریفوں کے آگے دست سوال پھیلایا ہے"(۱۲)

مولوی عبدالحق کے بعض معاصر یہ خیال کرتے تھے کہ وہ کسی کے ساتھ مل کر کام کرنے کا میلان نہیں رکھتے لیکن جب غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس قسم کا مزاج رکھنے والا شخص ایسی زبردست تحریک جاری نہیں رکھ سکتا جیسی بابائے اردو نے جاری رکھی اور پھر انھوں نے انجمن ترقی اردو کی تنظیم کا ڈھانچہ کھڑا کرنے اور اس کی متنوع سرگرمیوں کو منظم کرنے میں جو کامیابی حاصل کی وہ بھی مذکورہ غلط فہمی کی تردید کے لیے کافی ہے۔ ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جہاں اردو زبان کے والا و شیدا اور انجمن سے عشق کی حد تک لگاؤ رکھتے تھے وہاں فروغ اردو کی تحریک کے سلسلے میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا ان کا شعار تھا اور اپنے ساتھیوں کے انتخاب کے معاملے میں بھی وہ خاصی احتیاط سے کام لیتے تھے انھیں ہمیشہ قابل اور اہل لوگوں کی جستجو رہتی تھی وہ ان سے مشورہ کرتے اور انجمن کے معاملات میں ان سے تعارف اور امداد حاصل کرنے کی پوری پوری کوشش کرتے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولوی نصیر الدین ہاشمی، حکیم محمد امام امامی، مولوی سخاوت مرزا اور افضل العلماء عبدالحق کے نام خطوط سے بابائے اردو کے مزاج کی اس خصوصیت کا بخوبی پتا چلتا ہے، یہی نہیں بلکہ ان خطوط سے جو انھوں نے نوجوانوں کے نام لکھے ہیں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہونہار ادیبوں کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھتے تھے۔

بابائے اردو نے اردو زبان اور علم و ادب کی جو خدمت کی ہے اس کی مثال ناممکن ہے اور وہ اس پہلو سے اپنی ذات پر جس قدر فخر کریں کم ہے اس کے باوجود ان کی طبیعت میں خاص قسم کی وضع داری تھی جو انھیں احساس عظمت کے باوجود انھیں آپے سے باہر نہیں ہونے دیتی۔ ان کے خطوط سے ان کے طبعی عجز و انکسار کا دلکش اظہار ہوتا ہے جس سے ان کی عظمت شان کا نقش دل پر اور گہرا ہو جاتا ہے، انھوں نے اپنی مساعی سے اردو

کی شان بڑھائی اور اس کی ترویج و اشاعت میں جد وجہد کا حق ادا کر دیا اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو کسی اعزاز و اکرام کا مستحق نہیں سمجھتے۔ حکیم امامی کو لکھتے ہیں:

"آپ نے جن الفاظ میں میرا ذکر فرمایا ہے اس کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن جن محسنین اردو کے ساتھ آپ نے میرا نام لیا ہے میں ان کی خاکِ پا کی برابر بھی نہیں ہوں۔ میرا کیا منہ ہے کہ ان کی برابری کا دعویٰ کروں۔ میں تو اردو کا ایک ادنیٰ خادم ہوں اور بس یہ محض آپ کی قدر دانی ہے کہ مجھے ایسا سمجھتے ہیں۔" (۱۳الف)

مولوی عبدالحق نام کی بجائے کام پر یقین رکھتے تھے "چند ہم عصر" میں انھوں نے جن لوگوں کو خراج تحسین پیش کیا ہے وہی ہیں جو نمود و نمائش کی بجائے اپنے فرض کی ادائیگی کو ترجیح دیتے تھے، مولوی عبدالحق نمود و نمائش سے ہمیشہ گریزاں رہے اس لیے جب کہیں سے کسی جلسہ کی صدارت وغیرہ کی دعوت آتی تو انکار کر دیتے اس کی ایک وجہ تو منصب کی سنگینی کا احساس تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ اس کو بھی ایک قسم کی نمائش خیال کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی تو علمی مجالس میں شرکت سے احتراز کرتے تھے اور طبعی عجز و انکسار کی بنا پر اپنی علمی بے مائگی کا برملا اظہار کرتے تھے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے نام ۲۳ مارچ ۱۹۲۵ء کے خط میں ادارۂ معارف اسلامیہ کے اجلاس میں شرکت سے معذرت کے طور پر رقم طراز ہیں۔

"پروفیسر اقبال صاحب کا مطبوعہ خط اپنے ادارے (نام بھول گیا) معارف، معارف اسلامیہ کی طرف سے موصول ہوا تھا۔ میں حیران ہوں کیا جواب دوں۔ وہ علماء کی مجلس ہے۔ میں کس حیثیت سے اس میں شریک ہو سکتا ہوں۔ باہر والوں کو میری نسبت بہت بڑا مغالطہ ہے وہ سمجھتے ہیں کہ میں صاحب علم و فضل ہوں۔ اب اگر میں معذرت کرتا ہوں تو وہ انکساری خیال کریں گے اور شرکت کا وعدہ کروں تو یہ بے محل ہوگا وہاں جاؤں تو کیا لے کر جاؤں۔ عوام کا جلسہ ہوتا تو میں بھی خوشی خوشی جا پہنچتا۔ لیکن علماء کی مجلس میں جاتے ہوئے مجھے شرم معلوم ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں نے جواب نہیں دیا۔" (۱۳ب)

بابائے اردو کے خطوط کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے انداز تحریر کے بارے میں کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔ چوں کہ ان کا تعلق سید احمد خاں اور مولانا الطاف حسین حالی کے دبستان سے ہے اس لیے وہ سادگی اور سلاست کے شیدائی ہیں اور کہتے ہیں:

"بناوٹ کی باتیں بہت جلد پرانی اور بوسیدہ ہو جاتی ہیں صرف سادگی ایسا حسن ہے جسے کسی حال

ہیں اور کسی زمانے میں زوال نہیں بشرطے کہ اس میں صداقت ہو اور ہم میں سے کون ہے جس
کے دل میں سچ کی چاہ نہیں ؟" (۱۴)

ہاشمی فرید آبادی نے ان کی تحریر کی سادگی اور صفائی کے پیشِ نظر ان کے خطوط کے مجموعے کو "اردوئے معلّیٰ" کا نام دیا ہے لیکن خیال رہے کہ ان کے ہاں ان خوبیوں کے علاوہ شگفتگی اور دل چسپی کا عنصر بھی موجود ہے، یوں نظر آتا ہے کہ بابائے اردو نے سادگی اور بے تکلفی کا سبق تو سید احمد خان اور حالی سے لیا، شگفتگی اور دل چسپی کی خصوصیت مرزا غالب کے خطوط سے اخذ کی لیکن بابائے اردو کے اسلوب میں روزمرہ دفتری اور انتظامی مسائل کو عام فہم اور مختصر عبارت میں بیان کر دینے کی جو صلاحیت ہے وہ انھیں کا حصہ ہے، اس میں وہ قاری کی ذہنی سطح کے مطابق لب و لہجہ اختیار کرتے ہیں کمال مہارت رکھتے ہیں۔ انتظامی مسائل کے حوالے سے سینکڑوں خطوط بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن مکتوب الیہ کی ذہنی سطح ۔۔۔ کے مطابق تحریر کی ایک عمدہ مثال ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے بیٹے مسلم کے نام ان کا خط ہے۔ میرے علم کی حد تک کسی بزرگ عالم و فاضل شخص کی طرف سے کسی بچے کو اتنا سادہ اور خوب صورت خط شاید ہی لکھا گیا ہو۔

پیارے مُسلم۔ تمہارا ننھا منا خط پہنچا جسے پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ ماشاء اللہ اب تو تم خوب پڑھنے لکھنے لگے ہو۔ ہاں تو بتاؤ کہ تم مسلم جنگ کب سے ہو گئے؟ اگر تم شوق سے پڑھو گے تو بڑے ہو کر سچ مچ کے مسلم جنگ ہو جاؤ گے۔

میں نے تمہارا یہ خط رکھ لیا ہے۔ جب تم بڑے ہو کر اپنے ابا جان کی طرح لائق اور ڈاکٹر ہو جاؤ گے تو اس وقت تمہیں یہ خط دکھاؤں گا اور پوچھوں گا کہ بھئی مسلم دیکھنا یہ خط کس کا ہے۔ پہچانتے ہو یا نہیں یہ نواب مسلم جنگ بہادر کون ہیں؟

اب یہ لکھو کہ تم کونسی کتاب پڑھ رہے ہو۔ جواب آنے پر تمہیں کہانیوں کی کتاب بھیجوں گا۔

اچھا ایک بات تو بتاؤ، ڈھاکہ اچھا یا حیدر آباد۔ دیکھو کسی سے پوچھ کر نہ لکھنا جو تمہارے دل کی بات ہو وہ لکھنا۔ (۱۵)

تمہارا چاہنے والا
عبدالحق

مرزا غالب کو نہ صرف اس اعتبار سے اولیت حاصل ہے کہ انھوں نے خطوط میں سادہ اور سلیس

زبان استعمال کی بلکہ خطوط میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے شوخی و ظرافت سے کام لینے میں بھی انھیں سبقت حاصل ہے۔ شوخی و ظرافت ان کے مزاج کی نمایاں خصوصیت تھی، بات سے بات پیدا کرنے اور معمولی واقعات کو دلچسپ بنانے میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا بعض اوقات اپنی پریشانیوں کا نقشہ اس انداز سے کھینچتے ہیں کہ پڑھتے ہی ہنسی آجاتی ہے مولوی عبدالحق کے خطوط پر عام طور پر سنجیدگی غالب رہتی ہے یوں بھی علمی اور اور تنظیمی معاملات میں ہنسی مذاق کی گنجائش محل نظر ہے لیکن جن لوگوں سے ان کی بے تکلفی ہے ان کے نام خطوط میں ان کی طبعی ظرافت نے خوب دلچسپی پیدا کی ہے۔ افضل العلماء مولوی محمد عبدالحق، مولانا غلام رسول مہر، نصراللہ خان اور ڈاکٹر داؤد رہبر کے نام خطوط میں دفتری حبس اور انقباض کی بجائے کسی باغ کی کشادگی اور فرحت کا احساس ہوتا ہے، ان میں متعدد خطوط خوب صورت ادب پاروں کی صورت اختیار کر گئے ہیں مثال کے طور پر افضل العلماء عبدالحق کے نام ان کا خط مرقومہ ۲۷ مارچ ۱۹۴۵ء درج کیا جاتا ہے:

"حیدرآباد میں فقیروں کی ایک چھوٹی سی ٹولی ہے۔ دن بھر وہ مانگنے کھانے کا کام کرتے ہیں اور رات کو ایک تکیے میں جمع ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے منصوبے پیش کرتے ہیں اور ان پر گرما گرم بحثیں ہوتی ہیں پھر رات گئے سو جاتے ہیں۔ صبح اٹھ کر وہی کاسہ گدائی اور شہر کا گشت۔ غرض یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔

آپ جب دہلی تشریف لاتے تھے تو شب کو ہمارا بھی یہی حال ہوتا تھا۔ آپ نے کیسے کیسے منصوبے پیش کیے اور کیسے کیسے سبز باغ دکھائے۔ اردو مرکز۔ جائزۂ زبان اردو۔ اردو کانفرنس۔ اردو یونیورسٹی اور نہ معلوم کیا کیا۔ مدراس پہنچتے ہی یہ خیالات نسیاً منسیا ہو گئے اور حسب معمول چپ سادھ لی۔ اب تک انتظار کرتا رہا کہ شاید کوئی کرم نامہ آئے اور خوشخبری سنائے مگر ادھر سے سوا خاموشی کے کوئی آواز نہ آئی۔ آخر خود ہی ہار کر یہ عریضہ لکھنا پڑا۔ یہ بھی جانتا ہوں جو اس کا جواب ملے گا۔ خاموشی۔ خاموشی۔ خاموشی۔ جب بار بار خط پہنچیں گے تو برس چھ ماہی میں ایک عنایت نامہ محبت شمامہ آئے گا جس میں مصروفیت، علالت، غیر متوقع واقعات وغیرہ کے عذر اس حسن و خوبی سے سپرد قلم فرمائیں گے کہ سب شکایتیں بھول جاؤں گا اور الٹا عذر خواہ ہونا پڑے گا۔

لیکن ایک بات یاد رکھیے اور یہ میں اپنے تجربے کی اور آپ کی بھلائی کی بات کہتا ہوں۔ میرے ایک بڑے عزیز دوست تھے جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ جب مجھے یاد آتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی یاد آتا

ہے کہ کاش میں ان کی فلاں فرمائش ان کی زندگی میں پوری کر دیتا (جو میں آسانی سے کر سکتا تھا) تو وہ کتنے خوش ہوتے اگر یہ کام ان کے ہوتے میرے ہاتھوں ہو جاتا تو انھیں کتنی مسرت ہوتی۔ اس وقت میرے دل کو جو رنج اور کوفت ہوتی ہے۔ وہ میں ہی جانتا ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں میرے بعد اس قسم کے خیالات آپ کو نہ ستائیں۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ آدمی پانی کا بلبلہ ہے۔ آج موئے کل دوسرا دن۔ اس لیے میرے تجربے سے فائدہ اٹھایئے اور آئندہ کی روحانی تکلیف سے بچیئے۔ یہ میرا ہی تجربہ نہیں سب کو ہوا ہے اور آپ کو بھی ہوا ہوگا۔ لیکن انسان فطرتاً کاہل واقع ہوا ہے۔ وقت پر غفلت کرتا ہے اور بعد میں پچھتاتا ہے۔

اس کے بعد بھی آپ اپنے پرانے عزائم کی پھر ایک بار تجدید نہ کریں۔ اور بسم اللہ کر کے ان منصوبوں کو جو اب تک شیخ چلی کے خیالات رہے ہیں، عمل میں نہ لائیں تو میرا قصور نہیں، میں نے آگاہ کر دیا ہے اب آپ جانے اور آپ کا کام۔ زندہ رہا تو دیکھ لوں گا۔ خوش ہوں گا آپ کو دعائیں دوں گا۔ ورنہ جہاں اور حسرتیں ساتھ جائیں گی یہ بھی ساتھ لیتا جاؤں گا۔

بمبئی کی اردو کانفرنس دیکھنے کے قابل تھی۔ بمبئی والوں نے اردو سے جو شغف ظاہر کیا اسے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ اب میں انجمن کی عمارت ضرور بنا لوں گا۔

حضرت عبدالوہاب بخاری (رو بہمنی اللہ فداہ) کی خدمت فیض درجت میں دست بستہ آداب۔ جب ان کا خیال آتا ہے تو ان کا ہنس مکھ چہرہ سامنے آجاتا ہے جب ملتے ہیں تو کس محبت اور خلوص اور گرم جوشی سے اور اس کے بعد وہی فراموشی اور خاموشی۔ یہ جب تک وانمباڑی میں تھے تو بخاری تھے۔ اب گورنمنٹ محمڈن کالج میں آ گئے تو ان کا درجہ بڑھ گیا اور بخاری سے بخارا ہو گئے ہیں۔ پہلے میں رودکی کا مصرع بہ تصرف ان کے حق میں پڑھا کرتا تھا۔ اب صحیح طور سے پڑھتا ہوں۔ ع

اے بخارا شاد باش و شاد زی

احمد سیٹھ دلّی آئے ہوئے ہیں اس وقت میرے پاس بیٹھے ہیں۔ آپ کی خیر و عافیت معلوم ہوئی آپ کی سنّت انھوں نے بھی ادا کی یعنی پرسوں شب بیمار ہو گئے۔ اسی ڈاکٹر نے ان کا علاج کیا جس نے آپ کا کیا تھا۔ اب اچھے ہیں محمد بھوتس سلمہٗ کو دعا۔

بھولا ہوا نیاز مند عبدالحق (۱۶)

عبدالحق کے نام عبدالحق کے اس خط اور دیگر کئی خطوں کا لب ولہجہ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے انتہائی دوستانہ مراسم کا غماز ہے۔ ان خطوں میں اگر انجمن کے کسی انتظامی معاملے، دورے یا کانفرنس وغیرہ کا ذکر ہے تو وہ بھی بڑے پُر لطف انداز میں ہے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے نام خطوط میں بھی کہیں کہیں مزاحیہ جملے ملتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کے اس طرح کے خطوں کے مطالعہ سے ذہن علامہ اقبال کے ان خطوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جو انھوں نے مولانا شیخ غلام قادر گرامی کو لکھے تھے اور جو مکاتیب اقبال بنام گرامی" کے نام سے اقبال اکیڈیمی کراچی کے زیر اہتمام ۱۹۶۹ء میں شایع ہو چکے ہیں۔ علامہ اقبال کی علمی تحریروں کی طرح ان کے خطوں میں بھی سنجیدگی غالب رہتی ہے لیکن گرامی کے خطوں میں یہ سنجیدگی فکر کی جولانی اور خیال کی برجستگی کے ہمراہ ملتی ہے۔ بعض اوقات تو اقبال نثر میں شاعری شروع کر دیتے ہیں اور ایسے مقامات بھی کم نہیں جہاں اقبال گرامی کے ادب واحترام کا لحاظ رکھنے کے باوجود ان کے ساتھ لطیف نوک جھونک کرتے نظر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان خطوں میں اقبال کا ذوق شعری بھی قاری کی توجہ جذب کرتا ہے وہ کبھی تو گرامی کے اشعار پر تبصرہ کرتے ہیں اور کبھی اپنے اشعار پر ان سے مشورہ طلب کرتے ہیں جب کہ، بابائے اردو کے خطوں میں نقل اشعار کی کوشش کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایک ایسے دور میں جب ابوالکلام آزاد کی پر تکلف نثر کی دھوم مچی ہو مولوی عبدالحق کی نثر کی یہ سادگی شاید بعض لوگوں کو بے لطف نظر آتے لیکن یہی وہ نثر ہے جس کی بدولت اردو زبان عوامی ضرورتوں کی کفیل ثابت ہوئی، اس کی صلاحیتوں پر لوگوں کے اعتماد میں اضافہ ہوا اور اس کی عمل ترویج کی راہ ہموار ہوئی۔

(۱) مکتوبات بابائے اردو بنام حکیم محمد امام امامی، کراچی، اردو اکیڈیمی سندھ، نومبر ۱۹۶۰ء
ص: ۱۴۔

(۲) کتاب مذکور، ص: ۱۴-۱۵

(۳) کتاب مذکور، ص: ۱۷۷-۱۷۸

(۴) خط کے عکس کے لیے دیکھیے مکاتب عبدالحق مرتبہ جلیل قدوائی، کراچی، اردو اکیڈیمی سندھ، ۱۹۶۳ء

(۵) مکتوبات بابائے اردو، ص: ۵۰

(۶) کتاب مذکور، ص: ۱۱۳

(۷) مکتوبات بابائے اردو، ص ۱۲۵ - ۱۲۶

(۸) کتاب مذکور، ص: ۱۲۶

(۹الف) مکاتیب عبدالحق، ص: ۳۹۵ (۹ب) خطوط عبدالحق بنام ڈاکٹر عبداللہ چغتائی مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، مدپور، یونیورسٹی ارئنٹل کالج دسمبر ۱۹۷۶ء ص: ۱۴

(۱۰) کتاب مذکور، ص: ۴۰۹ - ۴۲۴ یہ مفصل خط بابائے اردو نے ۱۹۴۷ء میں حیدرآباد دکن سے لکھا تھا۔

(۱۱) مکتوبات بابائے اردو، ص: ۸۳

(۱۲) کتاب مذکور، ص: ۱۲۴

(۱۳الف) کتاب مذکور، ص: ۳۳ (۱۳ب) خطوط عبدالحق، ص: ۵۳

(۱۴) کتاب مذکور، ص: ۱۴

(۱۵) مکاتیب عبدالحق، حاشیہ ص: ۴۶

(۱۶) ماہنامہ قومی زبان کراچی، اگست ۱۹۷۰ء، ص: ۵۴ - ۵۵

ڈاکٹر مظہر احمد

مولوی عبدالحق کی تحقیق

"مرحوم دہلی کالج"

بابائے اردو مولوی عبدالحق نہ صرف شیدائی اردو تھے بلکہ ایک بڑے محقق بھی تھے۔ جہاں انھوں نے ایک طرف اردو زبان کی ترقی واشاعت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی وہیں دوسری طرف نایاب کتابوں کی بازیافت کا سہرا بھی ان کے سر ہے۔ ان کی تنقیدی و تحقیقی صلاحیتوں سے کسے انکار ہو سکتا ہے اردو کے کلاسیکی ادب کی کئی اہم کتابوں کا تعارف پہلی بار بابائے اردو کے قلم سے ہوا۔ انھوں نے ان کتابوں پر محققانہ مقدمے لکھ کر اردو تحقیق کا معیار بلند کر دیا۔ خاص طور پر دکنی ادب کے کئی گراں قدر مخطوطات کو عوام کے سامنے لائے۔ انھیں احساس تھا کہ اگر زمانے کی گرد ان خزانوں پر حاوی ہو گئی تو اردو کی عظمت کا اعتراف مشکل ہو جائے گا، نوجوان نسل اردو کو قابل اعتنا نہ سمجھے گی۔ اور زبان کی ترقی کا کام رک جائے گا۔ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ان ادبی ذخیروں کو ماضی کا حصہ بنانے کی سازشیں کی جارہی ہیں۔ لہذا انھوں نے ان کی بازیافت کے لیے کمر کس لی۔ اس سلسلے میں ایک اہم تعلیمی ادارے کی بازیافت کا کام بھی مولوی صاحب کے دستِ مبارک سے ہوا۔ جسے عوام النّاس آہستہ آہستہ بھولتے جارہے تھے۔ یہ تھا دہلی کا "قدیم دہلی کالج" جسے مولوی صاحب نے بجا طور پر "مرحوم دہلی کالج" لکھا ہے۔ مولوی صاحب دیکھ رہے تھے کہ اس کالج کی ادبی و تعلیمی خدمات سے چشم پوشی کی جارہی ہے اور دیسی زبان میں سائنس کی تعلیم دینے والا یہ ادارہ جس کے زیر اہتمام بڑی تعداد میں مختلف علوم کی کتابیں ترجمہ و تالیف ہوئیں آہستہ آہستہ گمنامی کا شکار ہوتا جارہا ہے۔ لہذا انھوں نے انجمن کے سہ ماہی رسالے "اردو" میں ۱۹۳۳ء میں مضامین کا ایک سلسلہ جاری کیا اور اس ادارے کی اہمیت پر پہلی بار قلم اٹھایا۔ یہ سلسلہ پورے سال چلتا رہا۔ مگر کتابی شکل میں "مرحوم دہلی کالج"، ۱۹۴۵ء میں سامنے آسکا اور اس طرح اس ادارے کی ادبی و تاریخی اہمیت سامنے آئی۔

جیسا کہ عرض کیا گیا "مرحوم دہلی کالج" کتابی شکل میں آنے سے پہلے ہی قسط وار رسالہ "اردو" کے صفحات کی زینت بن چکا تھا۔ اس لیے "مرحوم دہلی کالج" نام کی کتاب کو مستقل کتاب نہیں کہا جا سکتا بلکہ

یہ چاروں مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان چاروں مضامین کا موضوع ایک ہے اور یہ مضامین کالج کی ادبی و تعلیمی خدمات کے ساتھ اس کے اساتذہ و طلبار کا مکمل خاکہ پیش کرتے ہیں۔ ان چاروں مضامین کو اسی ترتیب کے ساتھ جوں کا توں کتاب میں شامل کردیا گیا ہے جیسے یہ رسالہ "اردو" میں چھپے تھے۔ پہلا مضمون بعنوان "مرحوم دہلی کالج از ایڈیٹر" جنوری ۱۹۳۳ء کے شمارے میں شایع ہوا جس میں دہلی کالج کی ابتدا اس کا پس منظر۔ تاریخ و ترقی کا سلسلہ اور تعلیمی حالات کی سلسلہ وار نشاندہی کی گئی ہے۔ دوسرا مضمون اپریل کے شمارے میں ذیلی عنوان نصاب تعلیم کے ساتھ شایع ہوا۔ جس میں بابائے اردو نے مختلف نصابات کا بھرپور حوالہ پیش کیا۔ اس میں مشرقی علوم کے نصاب کے ساتھ ساتھ انگریزی نصاب کی تفصیل بھی پیش کی گئی۔ مضمون کی تیسری قسط جولائی ۱۹۳۳ء کے شمارے میں "تالیف و ترجمہ۔ دہلی ورنیکلر سوسائٹی" کے عنوان سے شایع ہوئی اور اپنے موضوع کی افادیت واہمیت کے لحاظ سے سب سے زیادہ معتبر ثابت ہوئی۔ اس میں سوسائٹی کے قیام۔ اس کے اغراض ومقاصد، اصول ترجمہ وتالیف کے ساتھ دہلی کالج کے زیر اہتمام لکھی گئی کتابوں کی ایک فہرست بھی شامل کی گئی۔ چوتھی اور آخری قسط اکتوبر کے شمارے میں بعنوان، کالج کے اساتذہ، شایع ہوئی۔ جس میں کالج کے پرنسپلوں کے علاوہ نامور طالب علموں کے مختصر حالاتِ زندگی بیان کیے گئے ہیں اور آخر میں خاتمہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ یہی چار مضامین یکجا کرکے پہلی بار ۱۹۴۵ء میں انجمن نے "مرحوم دہلی کالج" کے عنوان سے شایع کردیئے۔

ظاہر ہے کہ ان مضامین کو لکھتے وقت مولوی صاحب کے ذہن میں یہ نہیں تھا کہ مستقبل میں اسے کتابی شکل دی جائے گی اور چوں کہ ہر مضمون اپنے عنوان کے مطابق مکمل ہے لہٰذا جب یہ مضامین کتاب میں بغیر کسی تغیر و تبدل کے، شایع کردیئے گئے تو کتاب کے تسلسل اور روانی پر اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ خاص طور پر اشخاص کے ذکر کا ایک بے ترتیب سلسلہ پوری کتاب میں پھیلا ہوا ہے جو پہلی نظر میں گراں گزرتا ہے۔ مثلاً ماسٹر رامچندر کا ذکر کتاب میں بار بار آیا ہے۔ ہمارے پیشِ نظر کتاب کے صفحہ ۵۸ پر جو انجمن سے شایع کیا گیا تیسرا ایڈیشن ہے ماسٹر رامچندر اور چمن لال کے عیسائی ہو جانے کا واقعہ درج ہے جب کہ صفحہ ۷۲۔ ۷۱ پر ۱۸۵۷ء میں آئی ان مصیبتوں کا ذکر ہے جن میں ماسٹر صاحب گھر گئے تھے۔ ص ۱۶۳ پر رامچندر بحیثیت مدرس اور صفحہ ۱۶۹ تا ۱۷۴ پر ان کے تفصیلی حالات قلم بند کیئے گئے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک ہی شخص کے حالات

زندگی اور ادبی کارنامے کتاب کے صفحات پر کس بے ترتیبی سے بکھر گئے ہیں ۔ پرنسپل ٹیلر، ڈاکٹر اسپرنگر، بتروس اور دیگر اشخاص کے سلسلے میں بھی یہی بے ربطی دکھائی دیتی ہے مگر یہ کوئی خامی نہیں ہے ۔ ہوا یوں ہے کہ پہلی قسط میں کالج کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور جہاں جہاں تاریخی اعتبار سے جن اشخاص کا ذکر ضروری تھا، وہاں ان کا ذکر معمولی تعارف کے ساتھ کیا گیا ہے ۔ اس حصہ میں کالج کے پرنسپلوں کے حوالے بکثرت ہیں ۔ تیسری قسط میں ٹرانسلیشن سوسائٹی کے سلسلے میں جن اشخاص کا تذکرہ ضروری ہے، ان کا بیان کیا گیا ہے اور چوتھے و آخری مضمون میں تو اساتذہ و طلبا کو ہی موضوع بنایا گیا ہے اور یہاں بالکل نئے سرے سے اور زیادہ تفصیل کے ساتھ تمام اشخاص کا تذکرہ کر دیا گیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ مضامین اس نیت سے نہیں لکھے گئے تھے کہ انھیں کتابی شکل دی جائے ۔ لہٰذا جہاں جس کا تذکرہ ضروری ہوا وہاں کر دیا گیا اور اسی لیے ہمارا اصرار ہے کہ اسے بنیادی طور پر چار مضامین کا ایک مجموعہ سمجھا جائے، جن کا موضوع ایک ہے ۔

جہاں تک اس کتاب کے موضوع کا تعلق ہے، اس کی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے دہلی کالج کی تاریخ اور اس کے ادبی کارناموں پر تحریر کی گئی پہلی باضابطہ کتاب خود ایک کارنامہ کہی جا سکتی ہے ۔ ۱۹۳۳ء میں مولوی عبدالحق صاحب نے اس ادارے کی اہمیت کو نہ صرف محسوس کر لیا تھا بلکہ عوام کے سامنے اس کے کارنامے پیش کرنے کی ہمت بھی کر لی تھی یہ کام اس لیے بھی مشکل تھا کہ اس سے پہلے اس ادارے پر کوئی مضمون یا کتاب شایع نہ ہوئی تھی ۔ البتہ چند حوالے ضرور ملتے تھے ۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی کا یہ بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا :

"ایک عرصے بعد سی ۔ ایف ۔ اینڈریوز (C.F. Andrews) نے اپنی مشہور کتاب (Zakaullah of Delhi) کے ذریعے دہلی کالج ۔ اس سے وابستہ شخصیات اور اس تہذیبی رجحان کو جو کہ حکومتِ برطانیہ کی حکمتِ عملی کی بدولت بھلایا جا چکا تھا پھر ملک کے سامنے پیش کیا ۔ اس کے بعد اس موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر، اس طرف تھوڑی بہت توجہ دی جانے لگی ۔ پرسی ول اسپیر (Percival Spear) نے اپنی کتاب (Twilight of Mughals) میں مغلوں

کے دورِ زوال میں جنم لینے والے اس امید افزا پہلو پر روشنی ڈالی۔" (ماسٹر رام چندر از صدیق الرحمن قدوائی۔ ص ۵۵)

مگر یہ مضامین انگریزی میں تھے اور اردو کے عام قارئین کے سامنے نہیں آئے تھے لہٰذا "مرحوم دہلی کالج" کی اوّلیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ مولوی صاحب نے اپنی تحقیقی دروں بینی اور ذہنی استدلال کو بروئے کار لاکر کھوئے ہوئے ذخیروں سے اس گوہرِ نایاب کو ڈھونڈھ نکالنے کی کوشش کی۔ دہلی کالج سے متعلق تمام معلومات، کالج کی رپورٹوں، اُس دور کے اخبارات، سرکاری دستاویزات اور دوسری یادداشتوں میں بکھری ہوئی تھیں۔ انھوں نے ان کرم خوردہ حوالوں سے طویل محنت و کاوش کے بعد دہلی کالج سے متعلق تمام تر معلومات ان مضامین کے ذریعے عوام النّاس تک پہنچانے کا ایک بڑا ہی صبر طلب اور قدرے دشوار کارنامہ انجام دیا اور اس طرح اپنی تحقیقی صلاحیتوں کا اعتراف اہلِ زبان سے کروا لیا۔ اس کتاب کے ذریعے مولوی صاحب کی حیثیت ایک صحیح اور فاضل محقق کے روپ میں ابھری۔ پوری کتاب میں انھوں نے تحقیقی تقاضوں کو مدِ نظر رکھا اور اس طرح ایک مثال پیش کی۔ گیان چند جین نے محقق اور نقاد کے فرق کو بیان کرتے ہوئے محقق کی خوبیوں کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

> "عوام فرسودہ ساز و برگ کو پھینک کر اس کی جگہ نئی چمک حاصل کرنا چاہتے ہیں محقق کرم خوردہ، گلے سڑے سرمایے سے اپنا دامن بھرتا ہے اور اپنی پرانی گدڑی سے لعل نکال کر پیش کرتا ہے۔ نقاد نئے نئے رجحانات نو بہ نو تجربوں کو پرکھ کر ان کے قابلِ قبول حصوں کو ادب میں سکہ رائج الوقت قرار دیتا ہے۔ محقق طاقِ نسیاں سے اتار کر چند مرقعے چند حسین بت ہماری نظروں کے سامنے ڈال دیتا ہے۔ نقاد ہمیں تاج محل اور مغل گارڈن کی دل فریبیوں پر لوٹنا سکھاتا ہے تو محقق اندھیرے غاروں کی بھول بھلیاں میں جاکر ہمارے واسطے اجنتا کے شاہکار دریافت کرتا ہے۔"
>
> (تحریریں۔ گیان چند جین)

مولوی صاحب کا کارنامہ دراصل گدڑیوں سے لعل ڈھونڈھ نکالنے کے مترادف ہے۔ طاقِ نسیاں سے چند حسین مرقعے، چند حسین بت ہمارے سامنے لانے میں انھوں نے جو کاوشیں کی ہوں گی، ان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ تحقیقی کارنامہ دراصل آج کل کے سہل انگار، نام نہاد نقّادوں و محققوں کے لیے جائے عبرت بھی ہے۔

اس کتاب کے تمام حوالوں کو معتبر کہا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ حوالے براہِ راست کالج کی رپورٹوں، کالج کے اساتذہ کی یادداشتوں اور سرکاری دستاویزات پر مشتمل ہیں۔ اس موضوع پر کام کرنے والے، بعد کے اشخاص نے مولوی صاحب کے حوالوں سے ہی کام لیا اور اس طرح یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک اہم واصل ماخذ کی حیثیت اختیار کر گئی۔

مذکورہ کتاب کا پہلا مضمون "مرحوم دہلی کالج" کے عنوان سے ہی شروع ہوتا ہے۔ اس میں مولوی صاحب نے کالج کی ابتدا اور تاریخ مع حوالوں کے سلسلہ وار درج کی ہے۔ لفظِ مرحوم کی توجیہہ پیش کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ :۔

"مرحوم میں اس لیے کہتا ہوں کہ وہ ایک عزیز چیز تھی جسے زمانے کے اتفاقات اور حالات نے عین ایسے وقت میں زندہ دفن کر دیا جب کہ اس کے عروج کا وقت آیا تھا اور جب کہ وہ گزشتہ تجربوں سے سبق حاصل کر کے ملک کے لیے تبلیغِ علوم وقت کا بہت بڑا مرکز بن سکتا تھا" (مرحوم دہلی کالج ص ۱۱)

بزرگ نقاد مالک رام صاحب نے اپنی کتاب "قدیم دلی کالج" کا سلسلہ موجودہ "ذاکر حسین کالج" سے جوڑنے کی کوشش کی ہے اور یہ صحیح ہے کہ دہلی کالج کی موجودہ شکل ذاکر حسین کالج ہی ہے مگر مولوی صاحب کا اشارہ جس کالج کی طرف تھا وہ ۱۸۷۷ء میں ختم کر دیا گیا تھا۔ دراصل دہلی کالج کے زیرِاہتمام دیسی زبان میں دی جانے والی تعلیم اور خاص طور پر ترجمہ وتالیف کا سلسلہ ہی دہلی کالج کی ادبی حیثیت کو واضح کرتا ہے بعد میں کالج ضرور قائم رہا۔ مگر اس کی وہ ادبی اہمیت ختم ہوگئی۔ لہٰذا مولوی صاحب کا دہلی کالج کو۔ مرحوم دہلی کالج، کہنا مناسب ہے۔

دہلی کالج کی ابتدا جیسا کہ مولوی صاحب نے لکھا ۱۸۲۵ء میں ہوئی۔ اس سے پہلے ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی گئی تھی جس کا مقصد ہندوستان میں نوکری کی غرض سے آئے انگریزوں کو دیسی زبان کی تعلیم دینا تھا۔ اس کے برعکس دہلی کالج کے قیام کے اغراض ومقاصد مختلف تھے۔ انگریزوں نے محسوس کر لیا تھا کہ وقت آگیا ہے کہ ہندوستانیوں کو مغربی علوم وسائنس کی تعلیم دی جائے تاکہ ان کے علمی استعداد میں اضافہ ہو، ان کے کند ذہن کشادہ ہو جائیں اور وہ مغربی علم وادب سے متاثر ہوں تاکہ

حکومت کا استحکام برقرار رہے ۔ اس غرض سے انھوں نے دہلی میں جو ہندوستان کا دارالخلافہ تھی۔ ایک کالج کی بنیاد رکھی جو دہلی کالج کے نام سے مشہور ہوا اور جس میں دیسی زبان (جو بلاشبہ اردو تھی) میں سائنس اور دیگر علوم کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا۔ مولوی عبدالحق اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

"اس کالج کی بڑی خصوصیت یہ تھی اور اسی میں اس کی کامیابی کا راز تھا کہ ذریعۂ تعلیم اردو تھا۔ عربی، فارسی، سنسکرت کی تعلیم تو اردو میں ہوتی ہی تھی لیکن دوسرے علوم جو داخل نصاب تھے۔ ان کی تعلیم کا ذریعہ بھی اردو ہی تھا۔" (مرحوم دہلی کالج ص ۲۵ ۔ ۲۴)

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے کالج کی ادبی و تعلیمی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے مضمون میں اس کی اہمیت پر اظہارِ خیال کیا ہے لکھتے ہیں:

"دہلی کالج کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے اردو کے ذریعے مغربی سائنس، ہیئت، ریاضی، نیچرل سائنس، فلاسفی وغیرہ کی تعلیم کا انتظام کیا اور شمالی ہند میں سب سے پہلے مشرق و مغرب کے صحت مند عناصر کو سمونے کی کوشش کی۔ اس طرح اس کالج نے نہ صرف اردو میں تعلیم کی شاندار روایات قائم کیں بلکہ ایک نئی فضا اور ایک نئی کشش جہت پیدا کی۔" (ماسٹر رام چندر از قدوائی ۔ مقدمہ از خواجہ احمد فاروقی ص ۲۴)

مگر ساتھ ساتھ انگریزی زبان و ادب کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا گیا۔ کلاسوں کو مشرقی و انگریزی شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ کالج کی سالانہ رپورٹوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشرقی شعبہ کسی بھی طرح انگریزی شعبہ سے کم تر نہیں تھا۔ طلبا کی حوصلہ افزائی کے لیے وظائف کا کام کیا گیا تھا۔ "مرحوم دہلی کالج" کے مطالعہ سے مختلف ادوار میں کالج کی پروگریس اور اس کی تعلیمی رفتار کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ کالج کے خلاف چلنے والی مہموں کا ذکر بھی ان صفحات میں آ گیا ہے۔ خاص طور پر انگریزی تعلیم کے خلاف عوام کے غم و غصہ کا تذکرہ بھی مولوی صاحب نے کیا ہے۔ ماسٹر رام چندر اور چمن لال کے عیسائی ہو جانے سے پھیلنے والے عوامی انتشار کا بیان بھی اپنے مخصوص انداز میں کرتے ہیں:

"اس سال ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے کالج کو کسی قدر دھچکا لگا۔ وہ یہ تھا کہ ماسٹر رام چندر جو اردو میں سائنس پڑھاتے تھے اور لالہ چمن لال فرسٹ اسسٹنٹ سرجن دونوں کے دونوں عیسائی ہو گئے اس سے دہلی کی مخلوق بہت

بگڑی اور شہر میں غلغلہ پیدا ہوا۔" (مرحوم دہلی کالج ص ۵۸)

۱۸۵۷ء کے غدر میں باغیوں کے ذریعے کالج، اس کے انگریز پرنسپل اور ماسٹر رام چندر پر جو مصیبتیں نازل ہوئیں اور جس طرح پرنسپل ٹیلر کی موت واقع ہوئی اس کا بیان بھی تاریخی تسلسل کے ساتھ صحیح جگہ پر کیا گیا ہے۔ ٹیلر کا میگزین سے صحیح سلامت نکل آنا۔ بڈھے خانساماں کی کوٹھری میں پناہ لینا پھر مولوی محمد باقر کے مکان پر پہنچنا۔ اگلے دن ہندوستانی لباس پہنا کر محمد باقر کا انھیں گھر سے روانہ کرنا اور پھر ان کا قتل، اس کی یادداشت میں مولوی محمد باقر کا سولی پر لٹکا دیا جانا، ماسٹر رام چندر کا بلوائیوں کے جنگل سے بچ نکلنا تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ غدر کے بعد کالج کا دوبارہ جاری ہونا اور ۱۸۷۷ء تک اس کا چلتے رہنا۔ ان سب کا بیان کتاب کے پہلے مضمون (قسط) میں تفصیل سے سلسلہ وار کر دیا گیا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ "نصابِ تعلیم" کے عنوان سے مختلف ادوار میں پڑھائے جانے والے نصاب کی تفصیل پیش کرتا ہے۔ جس کے مطالعے کے بعد کالج کے تعلیمی معیار کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ مشرقی و انگریزی شعبوں کے نصابات کے ساتھ ساتھ فارسی، عربی اور سنسکرت کے نصابات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی طلبا کو ملنے والے وظائف، مختلف کورسوں میں طلبا کی تعداد اور سنین کے مطابق اس تعداد میں کمی و اضافے کی تفصیل نقشوں کے ذریعے پیش کی گئی ہے۔ تحقیقی نقطۂ نگاہ سے یہ حصہ زیادہ محنت طلب و دشوار کُن ہے۔ خود مولوی صاحب نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ تعدادِ متعلمین کی ایک فہرست دینے کے بعد تحریر کرتے ہیں:

> "ان اعداد کے بہم پہنچانے میں بڑی دقت پیش آئی۔ سرکاری مطبوعہ رپورٹوں میں اعداد کے متعلق بہت بے احتیاطی کی گئی ہے اور اس لیے مختلف کاغذات کو دیکھ کر ان کی تصحیح کی گئی ہے۔ (مرحوم دہلی کالج ص ۱۲۰)

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مواد حاصل کرنے کے لیے مولوی صاحب نے کس جانفشانی سے کام لیا ہے۔ مضمون کے آخری حصے میں کالج کے انتظامیہ کی تفصیل اور عمارت کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے کالج کی ابتدا مدرسہ غازی الدین کی تاریخی عمارت میں ہوئی بعد میں یہ کالج کتب خانہ دارا شکوہ (نزد کشمیری گیٹ) منتقل ہو گیا۔ مگر چند سال بعد ہی اپنی پرانی عمارت

میں لوٹ آیا۔

"مرحوم دہلی کالج" کا تیسرا حصہ اپنے موضوع کی اہمیت کے سبب خاص درجہ رکھتا ہے۔ یہ حصہ کالج کے زیر اہتمام شایع۔ ہونے والی کتابوں کی فہرست کے ساتھ ساتھ دہلی ورنیکلر سوسائٹی کے اغراض و مقاصد کی تفصیل بھی پیش کرتا ہے۔ کالج کی ادبی خدمات کا صحیح اعتراف یہی حصہ کرتا ہے اور ادبی تاریخ کے تسلسل میں فورٹ ولیم کالج کے بعد دہلی کالج کا درجہ متعین کرتا ہے جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام جن کتب کے ترجمے کیے گئے ان کا تعلق قصے، کہانیوں سے تھا جب کہ کالج کی ٹرانسلیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام سائنس، ریاضی، جغرافیہ و تاریخ کی اہم کتابوں کے ترجمے عمل میں آئے اور اس طرح اردو میں سائنسی ادب کی روایت قایم ہوئی۔ مولوی صاحب نے ایجوکیشن کمیٹی، اسکول بک سوسائٹی اور ورنیکلر سوسائٹی کے قیام، ان کے طرز عمل اور ان کے بتدریج ارتقا سے مفصل بحث کی ہے۔ کالج کے دو انگریز پرنسپلوں مسٹر بتروس اور ڈاکٹر اسپرنگر کی خدمات کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اساتذہ و طلبا کے ذوق و شوق کی ایک تصویر ان الفاظ میں پیش کی ہے:

> "جب کالج کی جدید تنظیم ہوئی اور مغربی علوم کی تعلیم بھی لازم قرار پائی تو پھر وہی پرانی مشکل پیش آئی کہ کتابیں کہاں سے آئیں اور بغیر کتابوں کے تعلیم کا ہونا معلوم۔ قدیم السنہ یعنی عربی سنسکرت یا فارسی میں جدید علوم و تاریخ پر کوئی کتاب نہ تھی اور مولوی اور پنڈت ان مضامین کی تعلیم دے نہیں سکتے تھے۔ لہذا ایک صورت یہ نکالی گئی کہ تین طالب علم جن میں رام چندر پیش پیش تھے۔ کالج کے کام کے بعد فلسفہ و ریاضی وغیرہ کی کتابوں کا ایک ایک صفحہ اردو میں ترجمہ کرتے اور پرنسپل بتروس ترجمہ پڑھ کر اصلاح دیتے۔ اس طرح جب کتاب ختم ہو جاتی تو چھاپنے کو دے دی جاتی اور نیچے کی جماعتوں کے نصاب تعلیم میں شریک کر دی جاتی۔" (مرحوم دہلی کالج ص ۱۴۲)

ورنیکلر سوسائٹی نے ترجمے کے چند قواعد بھی وضع کیے جن کا تفصیلی ذکر کتاب میں سلسلہ وار پیش کیا ہے۔ ان قواعد کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج سے پونے دو سو سال پہلے بھی ان مشاہیر و ادبار نے ترجمے کے فن کی باریکیوں کو کتنی نزدیکی سے دیکھا تھا اور کتنے جامع اصول مرتب کیے تھے۔ خاص کر انگریزی الفاظ کے ترجمے کا جو طریقہ بیان کیا گیا آج تک مستعمل ہے۔ اس کے ساتھ اصطلاح سازی کے عمل

میں جس سائنسی نقطۂ نگاہ سے کام لیا گیا ہے اس سے اس سوسائٹی کی اہمیت اور سنجیدگی کا اندازہ ہوتا ہے اس حصّے کے آخر میں سوسائٹی کے زیر اہتمام ترجمہ و تالیف ہوئی کتابوں کی فہرست بھی شامل کی گئی ہے ایک سو اٹھائیس[۱۲۸] کتابوں کے صرف نام ہی گنوائے گئے ہیں ان ناموں کے مطالعے سے ہی دہلی کالج کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا جاسکتا ہے۔ مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کی کتابوں کے ترجمے بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔ مگر کیا ہی اچھا ہوتا کہ صرف نام گنوانے پر ہی اکتفا نہ کیا جاتا بلکہ ہر کتاب پر ایک تفصیلی نوٹ بھی شامل کر دیا جاتا۔ اس طرح اس کتاب کی اہمیت دوچند ہو جاتی۔ بعد کے کام کرنے والوں نے ان کتابوں کا مطالعہ کیا اور بہتر طور پر انھیں پیش کیا۔ دہلی کالج میگزین کے "قدیم دہلی کالج نمبر" صدیق الرحمٰن قدوائی اور سیدہ جعفر کی رام چندر پر تحلیقات کے ساتھ ساتھ چند پی۔ ایچ ڈی کے مقالوں میں ان کتب پر کافی تفصیل سے بحث کی گئی ہے (ڈاکٹر شکیل خاں کی کتاب' اردو میں سائنسی و تکنکی ادب" اور ڈاکٹر انتظار مرزا کی غیر مطبوعہ تھیسس دہلی کالج کی ادبی خدمات) بزرگ نقاد مالک رام کی تصنیف "قدیم دلّی کالج" میں چند کتابوں پر مختصر اضافوں کے ساتھ بابائے اردو کی فہرست دہرادی گئی ہے اور بس۔

کتاب کا آخری حصہ یعنی رسالہ" اردو" میں چھپی آخری قسط بعنوان "کالج کے اساتذہ" اپنے آپ میں نہایت اہم اور ناگزیر حصۂ کتاب ہے۔ کتاب کے ان آخری صفحات میں جگہ جگہ مولوی صاحب کے اسلوب بیان کے دلکش نمونے بھی پائے جاتے ہیں۔ دہلی کالج میں پڑھانے والے مدرسوں، پرنسپلوں کے مفصل بیان میں انھوں نے نہ صرف یہ کہ سوانحی خاکے پیش کر دیے ہیں بلکہ ان اشخاص کی ادبی خدمات کا صحیح جائزہ بھی پیش کیا ہے جنھیں زبان و ادب سے دیوانگی کی حد تک عشق تھا اور جو ہندوستانیوں کی تعلیمی کم فہمی کو دور کرنے کی بے لوث خدمت میں لگے ہوئے تھے پرنسپل ٹیلر۔ ڈاکٹر اسپرنگر اور مسٹر بتروس کے دلوں میں دہلی کالج کی محبت موجزن تھی۔ انھوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ کالج کے لیے وقف کر دیا۔ مولوی صاحب نے ان پرنسپلوں کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

"مسٹر بتروس، ڈاکٹر اسپرنگر اور مسٹر ٹیلر، یہ کالج کے تین پرنسپل ایسے گزرے ہیں کہ انھوں نے کالج کی سچی خدمت کی اور اس کی ترقی و اصلاح میں دل سے کوشش کی طلبا اور اساتذہ پر ان کا بڑا اثر تھا اور شہر والے بھی ان کا ادب کرتے تھے۔ خاص کر

مشرقی شعبے کی اصلاح اور اردو زبان میں مغربی علوم کے ترجموں کے متعلق مسٹر بتروس اور ڈاکٹر اسپرنگر نے جو بے ریا کوشش کی وہ بہت قابلِ قدر ہے" (مرحوم دہلی کالج ص ۱۶۰)

مندرجہ بالا اقتباس ان تینوں پرنسپلوں کی خدمات کا صحیح اعتراف کرتا ہے۔ پرنسپل ٹیلر نے ابتدا سے ہی دہلی کالج کی تحریک کو اپنی قیادت سے نوازا اور اسی کی خاطر ۱۸۵۷ء میں قربانی دی۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے اردو تراجم کے سلسلے میں جو محنت و کاوش کی وہ روز روشن کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ ان کا شہریوں پر بھی بہت اثر رہا۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ سر سید نے "آثار الصنادید" ڈاکٹر صاحب کی تحریک پر ہی لکھی تھی۔ مسٹر بتروس نے ورنیکلر سوسائٹی کو جو نئی آب و تاب دی وہ بھی سامنے آ چکی ہے۔ مولوی صاحب جانتے تھے کہ اس ادارے اور اس کی قیادت کرنے والوں کو لوگ بھولتے جاتے رہے ہیں۔ انھوں نے بر وقت اس مٹتی ہوئی روایت کو زندہ کیا اور اپنے زورِ قلم سے ان اشخاص کی ادبی خدمات ہمارے سامنے پیش کیں۔ کالج کے ہندوستانی اساتذہ میں مولوی مملوک علی، مولوی امام بخش صہبائی، مولوی سبحان بخش۔ ماسٹر رام چندر، مولوی ذکاء اللہ کے علاوہ کئی دیگر اساتذہ کا مختصر تذکرہ بھی کیا ہے یہاں پر ان کی ایک اور ادبی صلاحیت نے ان کے اسلوب کو شگفتگی بخشی ہے اور وہ ہے ان کی فن خاکہ نگاری پر مکمل دسترس۔ مولوی امام بخش صہبائی کے حالات لکھتے ہوئے۔ یہ ضمنی واقعہ بھی تحریر کر جاتے ہیں جس کا تعلق امام بخش صہبائی کی کالج میں تقرری سے ہے:

"ان کے تقرر کا عجیب واقعہ ہے ۱۸۴۰ء میں جب آنریبل مسٹر ٹامس لفٹیننٹ گورنر مدرسے کے معائنے کے لیے آئے تو انھوں نے یہ تجویز کیا کہ ایک مستند فارسی مدرس کا تقرر ہونا چاہیئے۔ مفتی صدرالدین خاں صدرالصدور نے عرض کی کہ ہمارے شہر میں فارسی کے استاد صرف تین شخص ہیں ایک مرزا نوشہ، دوسرے حکیم مومن خاں، تیسرے امام بخش صہبائی۔ لفٹیننٹ گورنر بہادر نے تینوں کو بلوایا۔ مرزا نوشہ بھلا یہ روگ کبھی پالنے لگے تھے۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ مومن خان نے یہ شرط کی کہ سو روپے ماہانہ سے کم کی خدمت قبول نہ کروں گا۔ مولوی امام بخش کا کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا۔ انھوں نے یہ خدمت چالیس روپئے ماہانہ کی قبول کر لی۔ بعد میں پچاس ہو گئے۔ (مرحوم دہلی کالج ص ۱۶۳-۱۶۲)

کالج کے نامور طلبا کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس زمانے میں کالج نے شخصیت سازی کی بڑی اہم خدمت انجام دی اور اردو زبان و ادب کو ایسے ہیرے تراش کر دیئے جن کی آب و تاب آج بھی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ یہ اتنی بڑی خدمت ہے کہ دوسری تمام تفصیلات اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد، ڈاکٹر ضیاء الدین، ماسٹر رام چندر، موتی لال دہلوی، میر ناصر علی، مولوی کریم الدین کے نام لے لینا ہی کافی ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے کالج کی خدمات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"یہ ادارہ نامعلوم طور پر ایک اہم فکری تحریک کا مرکز بن گیا اور اس نے قدامت کے اندھیروں کو دور کرنے اور جدیدیت کا اجالا پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس لحاظ سے دلّی کالج محض ایک تعلیمی ادارہ نہیں تھا بلکہ اسے یہ حیثیت بھی حاصل تھی کہ اس نے متوسط طبقے کے بعض چیدہ افراد کی شخصیت سازی کی اور ہندوستان کی نشاۃ الثانیہ کو قریب تر لانے میں مدد دی۔ (اردو ادب کی تحریکیں از انور سدید ص ۳۰۲)

دہلی کالج اردو ادب کی تاریخ کے ایک اہم موڑ پر استادہ ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی داستانوی نثر اور سرسید تحریک کی عقلیت پسندی و سائنسی نقطۂ نگاہ کے بیچ دہلی کالج ایک منطقی کڑی ثابت ہوتا ہے۔ اگر دہلی کالج کے زیر اثر دہلی میں ایک بڑے گروپ کی تربیت نہ ہوتی تو غالباً سرسید تحریک اتنی فعال اور جامع ثابت نہ ہوتی جتنی وہ ہوئی۔ بلاشبہ دہلی کالج نے کردار و شخصیت سازی کا ایک اہم فریضہ ادا کیا اور سرسید تحریک کے لیے راہ ہموار کی۔ مولوی عبدالحق نے کالج کے ہونہار طلبا کی جو فہرست مہیا کی ہے ان میں سے ایک (ڈپٹی نذیر احمد) کا یہ مشہور قول کالج کی تربیت پر دلالت کرتا ہے۔ مولوی صاحب نے بھی اسے نقل کیا ہے اور پھر بار بار نقل کیا جاتا رہا ہے۔ نذیر احمد لکھتے ہیں:

"اگر میں کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو کیا بتاؤں کیا ہوتا۔ مولوی ہوتا، تنگ نظر ہوتا، متعصب، اکھل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس برخود غلط"

بابائے اردو نے کتاب کے خاتمے میں دہلی کالج کی تاریخی اہمیت پر زور دیا اور اردو کے بارے میں پھیلی ہوئی اس غلط فہمی کا ازالہ کیا کہ "اردو زبان میں اتنی سکت نہیں کہ وہ مغربی علوم اور جدید سائنس کے بار کی متحمل ہو سکے" انھوں نے اراکین کالج اور طلبا کی ان تھک محنت اور روشن خیالی و بالغ نظری کی طرف توجہ مبذول

کرائی اور لکھا کہ:

"کالج نہیں رہا مگر اس کا کام زندہ ہے اردو زبان و ادب کے سنوارنے اور بنانے میں جو خدمت اس نے کی ہے وہ کبھی فراموش نہیں ہو سکتی ہم اپنی زبان کو اس وقت جو ترقی یافتہ صورت میں دیکھتے ہیں اس پر بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کا بہت کچھ اثر ہے۔ یہ پہلی درس گاہ تھی جہاں مغربی علوم کی تعلیم اردو زبان کے ذریعے دی جاتی ایک صدی پہلے اس کا خیال آنا اور اس پر عمل کرنا غیر معمولی ہمت کا کام تھا۔ (مرحوم دہلی کالج ص ۱۸۱)

غرض مولوی عبدالحق نے "مرحوم دہلی کالج" تصنیف کر کے۔ اس ادارے کو زندہ جاوید بنا دیا انھوں نے پہلی بار اس کی اہمیت کو محسوس کیا اور قلم اٹھایا۔

جہاں تک مولوی صاحب کے اسلوب بیان کا تعلق ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ وہ دبستانِ سر سید کے اسلوب نگارش سے متاثر ہیں اور ان پر سب سے زیادہ اثر مولانا حالی اور سر سید کی تحریروں کا ہے ان کا صاف ستھرا اور نکھرا ہوا اندازِ بیان ان کی تمام تحریروں میں نمایاں ہے۔ وہ فصیح طرزِ ادا پر زور دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں حقیقی سادگی و دھیما پن پایا جاتا ہے۔ سید عبداللہ نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ "مولوی عبدالحق کا اسلوب اردو نثر کا سہل ممتنع ہے"۔ جہاں تک تحقیقی زبان کا تعلق ہے۔ رشید حسن خان نے تحقیق کی زبان کے متعلق لکھا ہے کہ:

"تحقیق کی زبان کو امکان کی حد تک آرائش اور مبالغے سے پاک ہونا چاہیئے اور صفائی الفاظ کے استعمال میں بہت زیادہ احتیاط کرنا چاہیے"۔ (رشید حسن خاں۔ ادبی تحقیق روایت اور تجزیہ)

مولوی عبدالحق کی محققانہ زبان میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو اس کے لیے ضروری ہیں۔ بات کو منطقی روپ میں کہنے کا سلیقہ، مدلل اندازِ بیان، سادہ و سلیس الفاظ و محاورات کا استعمال، نپا تلا اندازِ تحریر، بے جا تفصیلات سے احتراز اور مختصر اندازِ گفتگو "مرحوم دہلی کالج" کی اسلوبیاتی خوبیاں ہیں۔ سید عبداللہ نے مولوی صاحب کی تحقیقی زبان پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"خطبوں اور تقریروں کے علاوہ عبدالحق کی تحریر کا ایک رنگ وہ بھی ہے جو ان کے تحقیقی مقدمات میں ہے، یہ مسلّم ہے کہ تحقیقی طرزِ تحریر زیادہ جچا تلا، زیادہ معین اور قطعی اور زیادہ متین

ہوتا ہے ۔ اس میں حوالے کی پابندی لازمی ہے ۔ اس میں انشا پردازی کے مواقع نسبتاً کم ہوتے ہیں اور سائنسی قسم کا رکھ رکھاؤ ناگزیر ہے ۔ اس لیے عام محققانہ مضامین شگفتہ نہیں ہوتے مگر عبدالحق کی تحقیقی تحریروں میں بھی دل چسپی کی کمی نہیں ۔ عام مضامین کی طرح ان میں بھی عام فہم روزمرہ، سلیس زبان، واقعات کی منطقی ترتیب ہر جگہ عبارت کو قوی اور دل چسپ بناتی ہے ۔ محققانہ مضامین بھی حشو و زوائد سے بالکل پاک ہوتے ہیں مگر باایں ہمہ اختصار ان سے تشفی ہوتی ہے ۔ ان سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور طبیعت کو بھی انبساط حاصل ہوتا ہے عبدالحق کی تحریر نمود و نمائش کی ہر کوشش سے آزاد ہے اور تحقیق میں تو وہ صرف ضروری بات کہنے کے قائل ہیں اور بیان کو غیر ضروری تفاصیل سے بوجھل نہیں ہونے دیتے چناں چہ واقعاتی تفصیلیں بھی کہانی کا مزہ دیتی ہیں "۔ مولوی عبدالحق کا اسلوبِ تحریر ـــ سید عبداللہ ۔ مشمولہ اردو سہ ماہی کراچی ۔ بابائے اردو نمبر ۱۹۶۲ء)

مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ بابائے اردو کا یہ تحقیقی کارنامہ، اپنے موضوع کی انفرادیت اور اولیت کے ساتھ ساتھ ان کی محققانہ صلاحیتوں کا غماز ہے ۔

محبوب احمد نقوی

مولوی عبدالحق بحیثیت شاعر

اس عنوان سے ممکن ہے کہ بعض لوگ چونکے ہوں اس لیے کہ مولوی عبدالحق، شاعر کی حیثیت سے کوئی شہرت نہیں رکھتے۔ لیکن یہ بھی شاعری نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ایک باشعور اور برجستہ گو شاعر تھے۔ ان کا باشعور ہونا ہی، آگے چل کر، ان کے دوسرے ادبی کارناموں یعنی اعلیٰ درجے کی تحقیق و تنقید، کا وسیلہ بنا اور وہ ایک بلند پایہ محقق و نقاد بن کر سامنے آئے۔ ان کی برجستہ گوئی بھی ضائع نہیں گئی بلکہ گاہے کسی خاص علمی و ادبی واقعے کی منظوم تاریخی گواہ بن گئی ہے اور گاہے، موقع محل کے اعتبار سے محفل میں شریک، صاحبانِ ذوق کے لیے سامانِ نشاط فراہم کر گئی ہے۔

مانا کہ مولوی عبدالحق اردو کے نامور نثر نگار ہیں اور نثر نگاری ہی اُن کی شناخت ہے، پھر بھی اُن کا شاعر ہونا چنداں تعجب کی بات نہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہمارے ہاں ادبی روایات کا سلسلہ نثر سے نہیں شاعری سے شروع ہوا ہے، عربی، فارسی، اردو اور ہندی، سب کا تقریباً ایک ہی حال ہے۔ شاعری کی روایت کے مستحکم ہونے کے بہت بعد، تحقیق و تنقید کا آغاز ہوا ہے۔ چناں چہ ہمارے سارے بزرگ ادیبوں کی ذہنی تربیت شاعرانہ ماحول میں ہوئی ہے۔ مولوی عبدالحق سے قبل کے ممتاز نثر نگار، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد، مولانا حالی اور مولانا شبلی چاروں شاعر تھے۔ خود سر سید احمد خاں، جنھیں جدید نثر کا بانی کہا جاتا ہے اور نثر میں جن کی خدمات غیر معمولی ہیں، وہ بھی شاعر تھے اور آہی تخلص کرتے تھے۔

سر سید اور حالی کے بعد کے نثر نگار یعنی مولوی عبدالحق، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، محمد دین تاثیر، آل احمد سرور، مولانا حامد حسن قادری، احتشام حسین وغیرہ سب کے سب طبعاً شاعر تھے یا ہیں۔ فراق نے تو خیر تنقید اور شاعری دونوں میں بڑا نام پایا لیکن دوسروں نے بھی

شاعری کا قابلِ ذکر ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے اور ان میں سے بعض کے شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ دور کیوں جائیے مولوی عبدالحق سیمنار میں آج جو لوگ بطور نقاد و محقق شریک ہیں ان میں بھی کئی بہت اچھے شاعر ہیں۔ ایسے میں مولوی عبدالحق کا شاعر ہونا چنداں حیرت کی بات نہیں بلکہ اُن کے تحقیقی و تنقیدی کارناموں سے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ان کا شعری ذوق ہی انھیں ادب کی طرف لایا ہے، اور اسی کی بدولت ان کی نثر میں وہ دل کشی پیدا ہوئی ہے جو قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہے، یوں بھی ان کے مقدمات، تبصروں اور تنقیدی مضامین پر نگاہ دوڑائیے تو اندازہ ہوگا کہ ان کی طبیعت کو شاعری سے خاص مناسبت ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کبھی اُردو شعرا کے تذکروں کو نہ ہاتھ لگاتے اور نہ اردو شعرا کے انتخاب کلام کی طرف توجہ کرتے۔ دوسرے مضامین کو چھوڑیے، صرف انتخابِ کلام میرؔ ہی کے مقدمے کو لے لیجیے تو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ شاعری کی تفہیم و تنقید کا کیسا اچھا شعور و سلیقہ رکھتے تھے۔

مولوی عبدالحق کو میں نے اُوپر باشعور شاعر کہا ہے اور وہ اس وجہ سے کہا ہے کہ وہ دوستوں کی طرح بہت دیر تک اِدھر اُدھر بھٹکے نہیں بلکہ اپنی خوش ذوقی اور شاعرانہ صلاحیت کے باوجود بہت جلد محسوس کر لیا کہ وہ شاعر سے اچھے نثر نگار ہو سکتے ہیں اور شاید یہ بھی محسوس کر لیا کہ کسی زبان یا قوم کو صرف شاعری کی نہیں بلکہ اعلیٰ درجے کی تنقیدی اور علمی و ادبی نثر کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی نظر سے غالباً مولانا روم کا یہ قول بھی گزر چکا تھا کہ

شعر گفتن گرچہ دُر سفتن بود
شعر فہمیدن بہ از گفتن بود

یعنی شعر کہنا یقیناً، موتی پرونے کا کام ہے اور بہت مشکل کام ہے لیکن شعر کی تفہیم و تنقید کا کام کچھ اس سے بھی زیادہ بہتر کام ہے۔ اسی لیے انھوں نے دانستہ شاعری کو اوروں کے لیے چھوڑ دیا اور اپنے معنوی اُستاد سر سید احمد کی طرح خود کو نثر کے لیے وقف کر دیا۔

مولوی عبدالحق کا شعری سرمایہ کسی ایک جگہ مجتمع نہیں بلکہ اُن کی تحریروں خصوصاً خطبات اور مکتوبات میں جا بجا بکھرا ہوا ہے اور ہماری نگاہوں سے عموماً اوجھل ہے۔ اُن سب کا کھوج لگانا، انھیں یکجا کرنا اور جانچنا پرکھنا کسی بلند پایہ محقق کا کام ہے، میں تو، ادب کا ایک ادنیٰ قاری ہوں اور مجھے چوں کہ اردو شاعری کے ساتھ ساتھ مولوی عبدالحق کی ذات و صفات سے خاص دلچسپی ہے، اس لیے اِس

محفل میں اُن کی شاعری کے ذکر کو ضروری جانا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے تلاش بسیار یا تحقیق واقعی کا بھی کوئی موقع نہیں ملا اور نہ شاید میں اس کا اہل ہوں نتیجۃً جو چیزیں آسانی سے ہاتھ لگ سکیں، بطور تبرک پیش کیا جا رہا ہے۔

اب سے کم و بیش پچیس سال پہلے کی بات ہے۔ میں کراچی میں تھا۔ اور انجمن ترقی اردو کے کتب خانۂ عام میں "عظمتِ رفتہ" نامی کتاب دیکھ رہا تھا۔ ضیاء الدین احمد برنی کی کتاب تھی اور اس میں اہم عصر ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں چھوٹے چھوٹے خاکے تھے۔ مجھے کتاب اچھی لگی، اپنی پسند کے سارے ادیبوں کے خاکے پڑھ ڈالے اور لطف اندوز ہوا کتاب کے آخر میں مولوی عبدالحق کا خاکہ تھا۔ اس میں ان کے چند شعر نظر آئے۔ میں نے کچھ شعر اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیے۔ اشعار یہ تھے ؎

نہ فکرِ معیشت نہ عشقِ بتاں ہے	مگر جاگتے رات کٹتی ہے ساری

تو نے حقّی کو خوب گانٹھا ہے[لے]	اپنے مطلب کو خوب چھانٹا ہے

دیکھنے میں وہ پھول ہے لیکن	درحقیقت وہ سیہ کا کانٹا ہے

عبدالحق سیمنار کے لیے مولوی صاحب کے بارے میں کچھ لکھنے کو قلم اٹھایا تو یہی اشعار میرے لیے موضوع بن گئے۔ کراچی میں دو تین دن قیام کر کے میں نے مولوی صاحب کی شاعری کے بارے میں مزید مواد فراہم کرنا چاہا۔ پہلے تو مایوسی ہوئی پھر کسی نے بتایا کہ اردو کے ممتاز محقق و ناقد ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی ایک نئی کتاب "تحقیق اور تلاش" کے نام سے بازار میں آئی ہے اس میں ایک مضمون مولوی عبدالحق کی شاعری کے بارے میں بھی ہے۔ اردو بازار گیا کتاب آسانی سے مل گئی اور میرے لیے لطف و مسرت کا باعث ہوئی۔ لندن میں رہ کر بھی ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب کے نام اور کام سے متعارف تو تھا لیکن یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ مولوی عبدالحق کی زندگی، شخصیت اور نثر نگاری کے بارے میں سند کا درجہ رکھتے ہیں اور اُن پر درجنوں مقالے ہی نہیں تین چار کتابیں لکھ چکے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی شاعری کے سلسلے کا مضمون بھی سیر حاصل اور محققانہ تھا۔ نتیجۃً اس سے آگے کھوج کرنے کی ہمت نہ ہوئی میں نے اسی کو اپنے مضمون کا اصل ماخذ بنا لیا اور اس جگہ اسی کی مدد سے مولوی عبدالحق کے جستہ جستہ اشعار، آپ کی لطف اندوزی کے لیے پیش

لے یہ قطعہ شان الحقّی کے بارے میں ہے۔ اس کے سلسلے میں برنی صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ محض مذاقاً لکھا گیا ہے۔ اس سے کسی کی تنقیص مراد نہ تھی۔ مولوی صاحب حقّی کو بہت چاہتے تھے۔ ص ۵۰۸

کر رہا ہوں ۔

اوپر، ضیاء الدین برنی کی کتاب کے حوالے سے یہ شعر نقل کیا گیا ہے

نہ عشقِ بتاں ہے، نہ فکر معیشت   مگر جاگتے رات کٹتی ہے ساری

یہ شعر، اکیلا نہیں ہے بلکہ مولوی صاحب کی مکمل غزل سے تعلق رکھتا ہے اس غزل میں گیارہ اشعار ہیں، صرف چند شعر دیکھیے ؂

ہوں آلودہ عصیاں سے گو سر بسر میں   مٹا دے گی، دھبّے مری خاکساری

نشیب و فراز اس جہاں کی ہیں ریتیں   نہ کر اے مری جان، دل اپنا بھاری

سزا چاہتا ہوں کہ پنہاں ہے جس میں   تری بردباری، مری بے قراری

کہاں تک یہ مخلوق پستی رہے گی   کہاں تک یہ آہ و بکا نالہ زاری

ترے زہر میں پاپ ہے اور نہ پن ہے   ہے اس سے بہتر مری مے گساری

خزاں کا عمل اٹھ چکا ہے چمن سے   خبر لائی اُڑتی سی بادِ بہاری

ایک اور شعر میری توجہ کا مرکز بنا۔ یہ فرد کی صورت میں ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ مولوی عبدالحق میں غزل گوئی کا بہت اچھا ملکہ موجود تھا۔ اگر وہ چاہتے تو بہت اچھی غزلیں کہہ سکتے تھے لیکن انھوں نے دانستہ شعر گوئی سے گریز کیا اور افادیت کے نقطۂ نظر سے نثر نگاری ہی کو مستقلاً اپنائے رکھا شعر یہ ہے ؂

دلوں پہ قبضہ خیالات پر حکومت ہے   اب اس سے بڑھ کے تمھیں اختیار کیا ہوگا

مولوی صاحب برجستہ گوئی اور تاریخ گوئی میں بھی طاق تھے۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اس کی بھی کئی مثالیں اپنے مضمون میں درج کی ہیں لیکن میں انھیں اس جگہ نقل کر کے مضمون کو بے جا طول نہیں دینا چاہتا۔ بتانا صرف یہ تھا کہ مولوی عبدالحق شاعر بھی تھے اور شعر گوئی کی بہت اچھی صلاحیت رکھتے تھے لیکن ان کی خود شناسی نے انھیں شاعر بننے سے روکا اور سرسید احمد خاں کی راہ پر چلنے پر مہمیز کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ سرسید احمد خاں نے جس جدید اور علمی نثر کی بنیاد ڈالی تھی مولوی عبدالحق نے اُس پر ایک تاج محل تعمیر کر دیا اور آج ہم مولوی عبدالحق سیمنار کے حوالے سے اس تاج محل کو حیرت سے دیکھ رہے ہیں ۔

URDUADAB
QUARTERLY

EDITOR
Khaliq Anjum

ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)
NEW DELHI

سہ ماہی

اردو ادب

انجمن ترقی اردو ہند

اردو ادب (سہ ماہی)

۱۹۹۳ء شمارہ (۲) تا (۴)

اردو ادب

(راج بہادر گوڑ نمبر)

اڈیٹر

خلیق انجم

انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دلّی

۱۹۹۳ء شمارہ (۲) تا (۴)

سالانہ قیمت	ـــــــــــــ	۷۵ روپے
فی شمارہ	ـــــــــــــ	۲۰ روپے
موجودہ شمارہ	ـــــــــــــ	۵۰ روپے

پرنٹر پبلشر ایم۔ حبیب خاں، اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) نے ثمر آفسیٹ پرنٹرس نئی دلی میں چھپواکر اردو گھر راؤز ایونیو نئی دلی سے شائع کیا۔

فہرست

عنوان	مصنف	صفحہ
حرفِ آغاز	خلیق انجم	۷
بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	۱۲
راج بہادر گوڑ ایک منفرد شخصیت	سید حامد	۱۸
تاثرات	پروفیسر آلِ احمد سرور	۲۳
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ پیکرِ جہدِ مسلسل	کمال الدین احمد	۲۵
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی ۷۵ ویں سالگرہ	امولک رام	۲۹
ادبی تناظر پر ایک نظر	ڈاکٹر عبد المغنی	۳۱
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی ۷۵ ویں سالگرہ	مجتبیٰ حسین	۳۷
ڈاکٹر گوڑ کی تنقیدی نگارشات	پروفیسر قمر رئیس	۴۶
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ادبی تناظر کے آئینے میں	رفعت سروش	۵۴
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ مجاہد آزادی ـــــ محب اردو	جواد رضوی	۶۶
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اردو کی ایک فعال شخصیت	ایم. حبیب خاں	۷۵
ڈ[illegible]اج بہادر گوڑ کی ۷۵ ویں سالگرہ	منوہر راج سکسینہ	۸۲
ہمارے گوڑ صاحب	شمیم جہاں	۹۳
خواتینِ ادب اور راج بہادر گوڑ	ڈاکٹر صادقہ ذکی	۹۹
ڈا[illegible] راج بہا[illegible] ـــــ ایک شخصیت منشورِ مثلثی	قمر جمالی	۱۰۸
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی تحریریں	ـــــ	۱۲۲
خطبۂ صدارت بہار ریاستی اردو کانفرنس مظفر پور	ڈاکٹر راج بہادر گوڑ	۱۲۳
خطوط گوڑ	ڈاکٹر راج بہادر گوڑ	۱۳۴

حرفِ آغاز

ہند ایرانی تہذیب نے دلی میں جنم لیا اور صدیوں تک اسی سرزمین پر پروان چڑھی۔ جب دلی اُجڑ گئی تو اودھ، حیدر آباد، رام پور اور دوسری ریاستیں اس تہذیب کی اہم مرکز بن گیئں، جہاں یہ تہذیب اپنے عروج کو پہنچی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ حید آباد کے رہنے والے اور ہند ایرانی تہذیب کے بہترین نمائندے ہیں۔ ان کی ذات ہندوستان کی رنگا رنگ تہذیب کا حسین مرقّع ہے۔

گوڑ صاحب ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۶ء تک راجیہ سبھا کے رکن رہے تھے۔ اس زمانے میں وہ اکثر راجیہ سبھا میں اردو کے بارے میں بیان دیتے تھے، جسے اُردو اخبار بہت نمایاں کرکے شائع کرتے تھے۔ ان ہی بیانات کے توسط سے گوڑ صاحب سے میرا غائبانہ تعارف ہوا تھا۔ ۱۹۷۴ء میں جب انجمن ترقی اُردو (ہند) کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے میرا تقرّر ہوا تو معلوم ہوا کہ گوڑ صاحب بھی انجمن کے رکن ہیں۔ اُردو کے اِس مجاہد سے میری پہلی ملاقات انجمن کی مجلس عاملہ کے اس جلسے میں ہوئی جو میرے تقرّر کے کچھ دن بعد منعقد ہوا تھا۔ ملاقات کے ابتدائی چند لمحوں ہی میں گوڑ صاحب نے مجھے متاثر کرلیا۔ سانولا رنگ، کھڑی ناک، کشادہ پیشانی، آنکھوں میں مخصوص چمک اور ذہانت، گھنے کھچڑی بال، سفید کم کالے زیادہ، صحت مند جسم، مسکراتا ہوا شگفتہ چہرہ، بات بات میں مذاق اور دوسروں سے چھیڑ چھاڑ۔ اس وقت گوڑ صاحب سفید شیروانی اور سفید چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ اس واقعے کو بیس سال ہوچکے ہیں۔ اب بھی گوڑ صاحب کی شخصیت ویسی ہی ہے۔ صرف بال زیادہ سفید ہوگئے ہیں اور جسم کچھ دُبلا ہوگیا ہے۔

گوڑ صاحب نے ابتدائی اور اعلا تعلیم حیدرآباد میں حاصل کی ۔ اُن کا شمار ہمیشہ بہت اچھے طلبہ میں ہوتا تھا۔ انھوں نے ہر امتحان میں امتیازی حیثیت حاصل کی ۔ ۱۹۴۳ء میں عثمانیہ میڈیکل کالج سے ایم ۔ بی ۔ بی ۔ ایس کا امتحان پاس کیا۔ لیکن ڈاکٹری کا پیشہ اختیار نہیں کر سکے ۔ کیوں کہ ہوش سنبھالتے ہی وہ مختلف سماجی اور سیاسی تحریکوں میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے ۔ اعلا تعلیم کے ابتدائی دنوں ہی میں وہ آریا سماجی تحریک کے سرگرم کارکن ہو گئے ۔ اُس کے کچھ دن بعد یعنی ۱۹۴۰ء میں کھادی تحریک سے اتنے متاثر ہوئے کہ گھر گھر جاکر کھدر تحریک کا پرچار کرتے اور لوگوں کو کھدّر کے فوائد سے آگاہ کرتے ۔ خود بھی کھدر پہنتے ۔ آج بھی اُن کا پسندیدہ لباس کھدّر کے کپڑے ہی ہیں ۔ ۱۹۴۰ء ہی کا زمانہ ہے، جب عالم خوند میری، جواد رضوی، مرزا حیدر حسن، مخدوم محی الدین اور ڈاکٹر گوڑ نے کامریڈز ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی اور کچھ ہی دن بعد گوڑ صاحب کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ ممبر بن گئے، حیدرآباد میں اس پارٹی پر پابندی عائد کردی گئی، لیکن ڈاکٹر گوڑ اور اُن کے ساتھیوں کی سیاسی سرگرمیاں جاری رہیں نتیجہ یہ ہوا کہ دسمبر ۱۹۴۶ء میں انھیں گرفتار کرلیا گیا۔ جیل میں گوڑ صاحب کی طبیعت خراب ہو گئی تو انھیں ہسپتال میں داخل کردیا گیا۔ ۷ مئی ۱۹۴۷ء کو گوڑ صاحب ہسپتال سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ۔ وہ روپوش تھے ۔ لیکن ۲۴ اپریل ۱۹۵۰ء میں ضلع نالگنڈہ کی دیور کنڈہ پہاڑیوں سے گرفتار کر لیے گئے ۔ حکومت نے انھیں نظر بند کردیا۔ ۱۹۵۲ء میں وہ راجیہ سبھا کے رکن منتخب ہو گئے ۔ حکومت کو مجبوراً انھیں رہا کرنا پڑا۔ ۱۹۵۷ء میں اُن کی راجیہ سبھا کی رُکنیت کی مدت ختم ہو گئی ۔ لیکن دوبارہ منتخب ہو گئے۔ اور ۱۹۶۲ء تک راجیہ سبھا کے رُکن رہے ۔ گوڑ صاحب کمیونسٹ پارٹی اور ٹریڈ یونین کے اہم لیڈر ہیں ۔ اگرچہ اب اُن کی عمر بچھتّر سال سے زائد ہے ۔ لیکن اُن کی سیاسی سرگرمیاں بدستور قائم ہیں، اور اب بھی وہ ٹریڈ یونین کے سلسلے میں پورے ہندوستان میں گھومتے ہیں۔

گوڑ صاحب اُردو تحریک کے ایک اہم رہنما ہیں ۔ اُردو سے متعلق دستورِ ہند

کی دفعات سے جتنی واقفیت گوڑ صاحب کو ہے، میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان میں کسی اور کو نہیں ہے۔ یہ جاننے کے لیے کہ مختلف ریاستوں نے گجرال کمیٹی کی سفارشات کو کہاں تک عملی رُوپ دیا ہے۔ مرکزی حکومت نے ۱۵ فروری ۱۹۹۰ء کو سردار جعفری کمیٹی کی صدارت میں پندرہ سولہ ادیبوں، دانشوروں اور پروفیسروں پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی تھی۔ جیسا کہ ہوتا ہے کہ کمیٹی میں صرف دو تین لوگ تھے، جو مسائل سے واقف تھے۔ ان دو تین لوگوں میں گوڑ صاحب بھی شامل تھے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ لکھنے اور سفارشات مرتب کرنے میں گوڑ صاحب کا بہت اہم رول رہا ہے۔

گوڑ صاحب گذشتہ چوالیس سال سے انجمن ترقی اُردو (ہند) کے حیاتی رکن ہیں۔ اور دو دفعہ انجمن کے نائب صدر رہ چکے ہیں۔ آج کل انجمن کی مجلسِ عاملہ کے اہم رکن اور جنوبی ہند کی شاخوں کے چیرمین ہیں۔ اس کے علاوہ انجمن ترقی اُردو (آندھرا پردیش) کے بھی نائب صدر ہیں۔ ان دونوں انجمنوں کے ذریعے وہ ہمیشہ اُردو کی بقا، ترقی اور فروغ کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ گوڑ صاحب سیاست داں ہیں۔ لیکن انھوں نے زبان کے مسائل کو ہمیشہ سیاست سے دور رکھا۔ بس ایک واقعہ سُن لیجیے۔ مالک رام مرحوم، انجمن ترقی اُردو (ہند) کے صدر تھے۔ جب اُن کی مدّتِ صدارت ختم ہوئی تو انجمن کے کچھ اراکین نے گوڑ صاحب کو صدارت کا اُمیدوار بنانا چاہا۔ لیکن گوڑ صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں سیاسی آدمی ہوں۔ میرے صدر ہونے سے انجمن کو نقصان پہنچے گا۔

گوڑ صاحب کی شخصیت کے جس پہلو نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ اُن کی وسیع القلبی، کشادہ دلی اور سیکولر رویّہ ہے۔ اُن کا سیکولرازم مصلحتوں کا پیدا کردہ نہیں ہے، بلکہ یہ اُن کا عقیدہ ہے۔ وہ بنیادی طور پر انسان دوست ہیں۔ وہ ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں، لیکن اُن کا مذہب انسانیت ہے۔ مجھے پچھلے پندرہ برسوں سے اُن سے قربت حاصل ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے کمزور سے کمزور لمحے یا مذاق میں بھی کسی مذہبی فرقے کے خلاف ایک لفظ بھی کہا ہو۔

گوڑ صاحب اُردو کے ممتاز ادیب اور نقّاد ہیں۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ اُن سیاسی سرگرمیوں میں گزرا ہے، جن کا ذکر کیا جا چکا ہے، اس کے باوجود ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ وہ تحفے میں ملنے والی کتابوں پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ کتابیں خرید کر پڑھنے کے عادی ہیں۔ جب بھی دہلی آتے ہیں تو اُردو گھر ضرور آتے ہیں۔ اردو گھر آتے ہیں تو بک ڈپو جاتے ہیں اور کتابیں ضرور خریدتے ہیں۔ وہ ہمیشہ انجمن کی بک ڈپو کے مقروض رہتے ہیں۔ جب بھی اردو گھر آتے ہیں پچھلا حساب چکاتے ہیں۔ اور قرض پر نئی کتابیں لیتے ہیں۔ حیدرآباد میں اُن کی ذاتی لائبریری میں انگریزی اور اُردو کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ ہے۔ ٹریڈ یونین کے لیڈر کی حیثیت سے گوڑ صاحب کو بہت سفر کرنا پڑتا ہے۔ یہ سفر اُن کے لیے بہت بڑی نعمت ہے۔ کیوں کہ سفر کے دوران انھیں مطالعے کا شوق پورا کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

گوڑ صاحب کی پہلی تحریر ۱۹۳۴ء میں روزنامہ "پیام" حیدرآباد میں شائع ہوئی تھی، وہ عرصے سے تنقیدی مقالے اور تبصرے لکھ رہے ہیں۔ جو ہندوستان کے مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ تنقیدی مضامین کے تین مجموعے "ادبی مطالعے" "ادبی جائزے" اور "ادبی تناظر" شائع ہو چکے ہیں، گوڑ صاحب کو اپنے مرحوم دوست مخدوم محی الدین سے بہت محبت ہے۔ انھوں نے مخدوم پر انگریزی میں کتاب لکھی ہے۔ ریاست حیدرآباد کی تحریک پر بھی اُن کی دو کتابیں ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ بڑی تعداد میں اُن کے تنقیدی اور سیاسی مضامین اور تبصرے ہیں، جو مختلف ادبی رسالوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ گوڑ صاحب کمیونسٹ پارٹی کے آرگن "کمیونسٹ جائزہ" کے چار سال اڈیٹر رہے ہیں۔ اُن کی تنقیدی کتاب "ادبی تناظر" انجمن ترقی اردو (ہند) سے شائع ہوئی تھی۔ میں نے اس کا پیش لفظ لکھا تھا۔ اِس پیش لفظ میں گوڑ صاحب کے تنقیدی رویّے کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا، اُسے ہی دُہرا دیتا ہوں۔ میں نے لکھا تھا۔

نظریاتی اعتبار سے گوڑ صاحب ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہیں۔ وہ ادب اور زندگی کے باہمی روابط اور ادب کی مقصدیت کے قائل ہیں۔ ادب کو زندگی کے معاشی

اور طبقاتی رشتوں کے پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ ادب میں صرف مقصدیت ہی کو نہیں، اُس کی ہیئت، اسلوب کی خوبصورتی اور جمالیاتی حسن کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ گوڑ صاحب قدیم ادب اور جدید ادب دونوں کا احترام کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بزرگوں، ہم عصروں اور نوجوانوں کے ادب کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اُن کا رویہ ایک سخت گیر اور اپنی علمیت کا لوہا منوانے والے نقاد کا نہیں۔ ایک ہمدرد ہم سفر کا ہوتا ہے۔ وہ غالب کے کلام میں جاگیرداری اقدار کو بنیاد بنا کر غالب کو ہدفِ ملامت بنانے کے بجائے پورے سیاسی سماجی اور تہذیبی پس منظر میں غالب کے کلام کا عالمانہ انداز میں تجزیہ کرتے ہیں۔ اپنے بزرگ مصنّفین میں وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے قائل ہیں اور خاص طور سے اُن کے سیکولر رویّے کے زبردست مدّاح ہیں۔

گوڑ صاحب کی تحریروں کو پڑھ کر اُن کی بصیرت، دقتِ نظر، وسعتِ مطالعہ، اور سلامت روی کا اندازہ ہوتا ہے۔

خلیق انجم

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا جب خیال آتا ہے یا ان کے ساتھ ملاقات ہوتی ہے تو علامہ اقبال کا یہ شعر حافظے میں چمک اٹھتا ہے۔

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

جنگ آزادی کا یہ سپاہی اور اردو شعر و ادب کا یہ نقاد اسی شعر کی تفسیر ہے۔

آج تو اس مجاہد آزادی اور اردو کے اس باعثِ فخر نقاد اور نثر نگار سے اس خاکسار کا تعلق جان اور دل کا سا ہے لیکن میں بات اس وقت سے شروع کرنا چاہتا ہوں جب راقم التحریر اس جوہر قابل کے نام اور کام سے آشنا نہیں تھا۔

۱۹۴۸ء کی بات ہے حکومت ہند نے یونائٹڈ پبلی کیشنز کا دفتر بند کر کے اس کی جگہ پبلی کیشنز ڈویژن کی بنیاد رکھی اور اردو کے ماہنامہ "آج کل" کو از سر نو جاری کرنے کے ساتھ ہی ساتھ دو اور ماہناموں کا بھی اجرا کیا تھا۔ ایک بین الاقوامی سیاست کے موضوع پر اور ایک بچوں کے لیے۔

جوش ملیح آبادی پبلی کیشنز ڈویژن میں شعبۂ اردو کے اڈیٹر مقرر ہوئے۔ ان کے ساتھ اسسٹنٹ اڈیٹر کے طور پر عرش ملسیانی، بلونت سنگھ اور راقم التحریر کا تقرر ہوا۔ کام کی تقسیم یوں ہوئی کہ "آج کل" کی ادارت عرش کے سپرد ہوئی۔ بین الاقوامی سیاست والا جریدہ "بساط عالم" راقم التحریر کے حصے میں آیا اور بچوں کے ماہنامہ "نونہال" کا کام بلونت سنگھ کے سپرد ہوا۔

ابھی ان جرائد کو منظر عام پر آئے چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ ایک دن ہمیں پتا چلا کہ ایک ممبر پارلیمنٹ نے پارلیمنٹ میں ماہنامہ "آج کل" کا مسئلہ اٹھایا ہے اور اس کی کسی

کسی ایسے مضمون کی نشاندہی کی ہے جس میں جا بجا ساقط المعیار زبان کا استعمال ہوا ہے۔ اب پینتالیس برس بعد یہ مجھے یاد نہیں آرہا ہے کہ وہ کس کا مضمون تھا۔ اور اس کا موضوع کیا تھا۔ دوسرے دن ہمیں معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ اٹھانے والے ممبر پارلیمنٹ کا اسم گرامی ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ہے۔

اس وقت تک میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے نام اور کام سے واقف نہیں تھا۔ بلونت سنگھ بھی اس نام سے آشنا نہیں تھے۔ عرش ملسیانی بھی۔ حیرت ہے کہ جوش صاحب نے بھی اس معاملے میں ہماری کوئی رہنمائی نہ کی کیوں کہ میرا اندازہ ہے کہ جوش چوں کہ اس زمانے میں ادب کی ترقی پسند تحریک کے امیر کارواں سمجھے جاتے تھے اس لیے ممکن ہے وہ راج بہادر گوڑ کے نام اور کام سے آشنا ہوں لیکن اس گتھی کو سلجھانے میں ہماری کوئی مدد نہیں کر سکے۔

دو ایک روز بعد عرش ملسیانی دور کی کوڑی لائے کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ راجستھان کے رہنے والے ایک صاحب ہیں۔ وہ ہیں تو کانگرس کے رکن لیکن اردو کے مخالف ہیں اور وہ اس کوشش میں ہیں کہ ماہنامہ "آج کل" کو بند کرا دیا جائے۔

میں نے عرش سے کہا یار ذرا "آج کل" کا وہ شمارہ تو دکھاؤ یا وہ مضمون جس پر اعتراض کیا گیا ہے کیونکہ انجام کار تو منسٹری ہمارے ڈائرکٹر سے پوچھے گی، ڈپٹی ڈائرکٹر سے، ڈپٹی ڈائرکٹر جوش صاحب سے اور جوش صاحب ہم لوگوں سے۔ اس لیے ہمیں کچھ معلوم تو ہو تا کہ ہم جوش صاحب کو مشورہ دے سکیں۔

اب جیسا کہ عرض کر چکا ہوں میں اس وقت تک اس مضمون یا اس کے موضوع سے خالی الذہن ہو چکا ہوں لیکن اتنا یاد ہے کہ مضمون پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس میں واقعی زبان و بیان کی اغلاط موجود ہیں۔ حیرت ہے کہ عرش صاحب کی ادارت میں یہ سب کیسے ہو گیا۔ ہو سکتا ہے وہ مضمون غلطی سے کاتب کے پاس چلا گیا ہو لیکن اس کے پروف تو عرش صاحب کو پڑھنا تھے۔ اور عرش ایسے محتاط اور ذمہ دار شخص سے یہ بعید تھا کہ وہ اتنی بڑی کوتاہی کے مرتکب ہوئے ——— اس صورت حال کے پیشِ نظر ہم لوگوں کی پریشانی اور بڑھی لیکن اس بات سے اطمینان ہوا کہ اردو کے جریدے میں زبان و بیان کی اغلاط پر اعتراض کرنے والا کوئی بھی شخص خواہ وہ ممبر پارلیمنٹ ہو یا نہ ہو اردو کا دشمن نہیں ہو سکتا۔ وہ اردو کا حامی اور اردو کا دوست ہی ہو سکتا ہے اس لیے یہ اندیشہ بے بنیاد ہے کہ معترض ماہنامہ "آج کل" کو بند کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔

بہر طور ہم لوگوں نے کسی قدر پریشانی کے عالم میں جوش صاحب سے جب ساری صورت حال کا ذکر کیا تو انھوں نے اس بات کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ ہم نے کہا کہ جوش صاحب، معاملہ بہت سنجیدہ ہے، پارلیمنٹ میں آچکا ہے تو وہ کہنے لگے کہ کوئی بات نہیں میں پنڈت جی سے کہہ دوں گا۔ میں نے عرض کیا جناب پنڈت جی کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سردار پٹیل کی منسٹری ہے اور سردار پٹیل تک بات پہنچے گی ہی نہیں اور ہم لوگوں پر کوئی نہ کوئی عذاب ٹوٹ پڑے گا جوش صاحب پر ہماری اس فریاد کا کوئی اثر نہ ہوا۔ کہنے لگے تو ہم سردار پٹیل سے کہہ دیں گے۔

اب اس مضمون میں یہ بتانے کی تو گنجائش نہیں ہے کہ سردار پٹیل بھی پنڈت جواہر لعل نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح جوش صاحب پر کس قدر مہربان تھے اور کس طرح ان کی ناز برداری کیا کرتے تھے لیکن اتنا یاد ہے کہ جوش صاحب کی جب دو ایک روز میں سردار پٹیل سے ملاقات ہوئی تو معلوم نہیں انھوں نے سردار پٹیل سے کیا کہا کہ وہ اعتراض ایک چھوٹے سے نوٹ کی صورت میں یا شاید ٹیلی فون کی صورت میں ہمارے ڈائرکٹر تک پہنچا اور وہاں سے جوش صاحب تک کہ اپنے اسٹاف سے کہہ دیجیے کہ "آج کل" بساط عالم" اور "نونہال" کے کام میں محتاط رہا کریں۔ گویا ع رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔

اس زمانے میں میرا قیام اپنے والدین اور بچوں کے ساتھ پُل بنگش کے محلے میں تھا۔ ساحر لدھیانوی بھی لاہور چھوڑنے کے بعد اسی پُل بنگش نامی محلے میں آکر آباد ہوئے تھے پرکاش پنڈت کے پڑوس میں۔ ایک دن میں نے ان سے برسبیل تذکرہ پوچھا کہ یار یہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ممبر پارلیمنٹ کون صاحب ہیں تو ساحر لدھیانوی نے مجھے بتایا کہ ان کا تعلق حیدرآباد سے ہے۔ راجیہ سبھا کے ممبر ہیں۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے رکن ہی نہیں ہیں عوام کے رہنما بھی ہیں، اردو کے عاشق ہیں اور ٹریڈ یونینوں میں بہت کام کر رہے ہیں۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ عرش نے ہمیں کیا بتایا تھا اور حقیقتاً معاملہ کیا ہے۔ گویا عرش صاحب ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے بارے میں جو اطلاعات فراہم کر کے لائے تھے وہ سرتاپا غلط تھیں۔ نہ یہ راجستھان کے رہنے والے تھے، نہ کانگرس کے ممبر، نہ اردو کے مخالف اور نہ "آج کل" کو بند کرانے کی کوشش کرنے والے۔

اگلے دن جب میں دفتر گیا اور جوش صاحب کے کمرے میں ہم سب لوگ جمع ہوئے تو میں نے

ساحرلدھیانوی سے اپنی بات چیت کا ذکر کیا اور بتایا کہ بقول ساحرلدھیانوی راج بہادر گوڑ اردو کے عاشق ہیں۔ کمیونسٹ رہنما ہیں'۔ اور پھر میں نے جوش صاحب سے پوچھا کہ جوش صاحب آپ کی تو ان سے واقفیت ہوگی۔ کہنے لگے ہاں، ملاقات ہو چکی ہے۔ لیکن نہ جانے کیسے حافظے سے یہ بات اتر گئی۔

بہر طور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ سے راقم کا یہ پہلا تعارف تھا۔ یک طرفہ تعارف یعنی میں ان کے اسم گرامی سے اور کسی حد تک کام سے آشنا ہوا۔ اب اخبارات میں جب کبھی ان کا نام دیکھتا تو ساری خبریں اول سے آخر تک پڑھتا۔ گویا ان کا سیاسی کام کسی حد تک سامنے آنا شروع ہو گیا تھا۔ لیکن ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اور ملاقات کی بات یہ ہے کہ میں پبلی کیشنز ڈویژن یعنی گورنمنٹ آف انڈیا کے ایک دفتر میں اسسٹنٹ ایڈیٹر تھا اور راج بہادر گوڑ ہوں یا سردار جعفری، مجروح ہوں، یا کیفی یا مخدوم ہوں، ان کا کام تھا گرفتار ہونا جیل جانا۔ رہا ہو کے آنا پھر گرفتار ہو جانا۔ ادھر صورت یہ تھی کہ کمیونسٹ پارٹی تو دور کی بات ہے۔ IPTA اور PWA تک سے قربت ہم لوگوں کے لیے ممنوع تھی۔

اس کے کافی مدت بعد جب میں ۱۹۷۶ء میں ڈائرکٹر پبلک ریلیشنز گورنمنٹ آف انڈیا کی ملازمت سے سبکدوش ہوا اور انجمن ترقی اردو کے ایک رکن کے طور پر منتخب ہوا تو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ سے ملاقاتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جو اس وقت تک جاری ہے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کی رکنیت کے دوران میں یہ بات بڑی وضاحت سے میرے سامنے آئی کہ گوڑ صاحب کے دل میں اردو کے لیے محبت اور درد کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ یہ بات میرے لیے ایک طرح سے قابلِ رشک تھی اور ہے اور مجھے یقین ہے کہ جب تک ہندوستان میں گوڑ صاحب ایسے دردمندانِ اردو موجود ہیں ہم اردو والوں کی جدوجہد میں کوئی کمزوری نہیں آسکتی اور انشاء اللہ ایک روز اس جدوجہد کا خاطر خواہ نتیجہ نکلے گا۔

ڈاکٹر گوڑ کی زندگی قید و بند کی صعوبتوں میں کٹی ہے۔ لیکن اردو اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے اقلیتوں کے جان و مال کے تحفظ کے لیے جو آواز بلند کی ہے، اور عملی طور پر جو کام کیا ہے اس کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی اور اس سلسلے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ ہماری سیاسی اور سماجی تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔

مجھے ڈاکٹر گوڑ کے ساتھ مجوزہ اردو یونی ورسٹی کمیٹی میں بھی کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ اور اگرچہ یہ یونیورسٹی کسی مذہبی اکثریت یا اقلیت کے مفادات کے پیش نظر قائم نہیں کی جار ہی ہے لیکن گوڑ صاحب نے جب بھی اس یونیورسٹی کی افادیت کے پیش نظر تجاویز پیش کی ہیں ان میں ملک کی اقلیتوں کے مفاد کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔ اردو یونیورسٹی کمیٹی نے بھی ان تجاویز کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور انھیں اپنی رپورٹ میں جگہ دی ہے۔

اسی دوران میں ڈاکٹر گوڑ کی زندگی کا ادبی پہلو بھی ہمارے سامنے آیا اور یکے بعد دیگرے ان کی تین کتابیں منظر عام پر آئیں۔ "ادبی مطالعے"، "ادبی جائزے" اور "ادبی تناظر"۔ اور ایک کتاب انگریزی میں مخدوم محی الدین کی شاعری پر۔ یوں تو ان کی دو کتابیں ریاست حیدرآباد کی تحریک سے متعلق بھی ان کے قلم سے نکلیں لیکن اول الذکر چاروں کتابیں ڈاکٹر گوڑ کی علمی، ادبی اور تنقیدی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہیں۔

جہاں تک ادبی تخلیقات کا تعلق ہے ڈاکٹر گوڑ نے ہمیشہ اس نظریے کی حمایت کی ہے کہ ادبی تخلیق میں یا کسی فن پارے میں کیا کیا ہے، اور کیوں کر کیا ہے۔ برابر کی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس موضوع پر خوب صورتی کے ساتھ بحث کرتے ہوئے آپ اپنے مضمون "روشنائی، ترقی پسند تحریک کی آپ بیتی" میں لکھتے ہیں۔

> پروپیگنڈہ بھی زندگی کا لازمی عنصر ہے اور پراپیگنڈے کا روپ بھی معیاری ادب ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ ادب کے سماجی مقاصد کے ساتھ اس کے جمالیاتی پہلو سے پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ چناں چہ یہی تبلیغی عنصر کرشن چندر کے افسانوں کی جان ہے۔ ان کے شاہکار افسانے وہی ہیں جن میں انھوں نے اپنی سماجی بصیرت کو اپنے مقصد کے موزوں فنی ہیئت میں پیش کیا ہے۔ اگر غور سے دیکھیں تو حالی سے اقبال تک اور نذیر احمد سے پریم چند تک نظم و نثر کی بے شمار تخلیقات میں پروپیگنڈا نظر آئے گا ــــ پروپیگنڈہ جسے فنی ہیئت حاصل ہو گئی ہے۔"

"روشنائی، ترقی پسند تحریک کی آپ بیتی"۔ آپ کی تصنیف "ادبی تناظر" کا پہلا مضمون ہے اس تصنیف کے تمام مقالات مثلاً "غالب اور ذہن جدید" سماجی تقاضے اور ادیب کے فرائض،

آج کا ہندوستان اور مولانا ابوالکلام آزاد کی معنویت، مولانا محمد علی، خواجا احمد عباس، مخدوم ایک پہلو دار شخصیت، راجندر سنگھ بیدی۔ ایک عظیم فن کار اور جلیل مانک پوری ـــــ عہد اور کلام جادۂ نقد و نظر پر روشن چراغوں کی مانند چمک دمک رہے ہیں۔ اور ڈاکٹر گوڑ کے ترقی پسند خیالات سے شعر و ادب کی محفل میں چاروں طرف روشنی برسا رہے ہیں۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی سنجیدہ تحریروں میں جہاں کہیں طنز و مزاح کی لہر آجاتی ہے۔ وہ ان تحریروں کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہے۔ راقم التحریر کی کتاب "محمد اقبال ـــ ایک ادبی سوانح حیات" جب شائع ہوئی تو اس سے دو چار ماہ قبل میری چند اور تصانیف بھی جو ایک مدت سے پریس میں تھیں یکے بعد دیگرے چھپ کر منظر عام پر آگئیں۔ تو "محمد اقبال ـــ ایک ادبی سوانح حیات" پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے اپنی تحریر دل پذیر کچھ اس طرح شروع کی کہ "جگن ناتھ آزاد کتابیں تصنیف کرنے کے معاملے میں فیملی پلاننگ کے قائل نہیں ہیں ـــــ" اور اس طرح اپنی نقادانہ تحریر کو آخر تک دلچسپ اور دلکش بناتے چلے گئے۔

آج ہم یہاں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی پچھترویں سال گرہ جسے ڈائمنڈ جوبلی کہا جاتا ہے۔ مبارکباد دینے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے یہ پچھتر برس انتہائی مصروف انداز سے اور بھرپور طریقے سے بسر کیے ہیں۔ مصروف زندگی کے بارے میں مجھے اس وقت اپنا ایک پرانا شعر یاد آرہا ہے۔

اے تو کہ تجھ کو ناز عبادت پہ ہے بہت
مصروف زندگی بھی عبادت سے کم نہیں

میں اس مصروف زندگی بسر کرنے پر اپنے محترم دوست، اپنے برادر معظم ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو دلی مبارکباد دیتے ہوئے اپنے اس ہدیۂ محبت و عقیدت کو غالب کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں کہ

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

سید حامد

راج بہادر گوڑ ایک منفرد شخصیت

راج بہادر گوڑ کی شخصیت تہ دار بھی ہے، پہلو دار بھی۔ ورنہ ادب کو سیاست سے بیر رہا ہے پھر بھی راج بہادر گوڑ چابک دستی کے انداز سے دونوں کو ساتھ لے کر چلے۔ پہلی نظر میں ان پر منسوڑ ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن ان کے ذہن کے نہاں خانہ میں جھانکیے تو وہ مقطع نظر آئیں گے۔ تاہم تھوڑی دیر بھی ان کے ساتھ بیٹھیے تو خندہ زیر لب سے آگے بڑھنا پڑے گا۔ نام ان کا رکھا گیا راج بہادر لیکن انھوں نے عمر عزیز راج کو بزدل ثابت کرنے، اس کے خلاف بغاوت کرنے اور اسے پسپا کرنے میں صرف کی۔ اور جس گھڑی بدیسی راج کے پاؤں اکھڑے اور دیسی راج بنام جمہوریت کے پاؤں جمے، اس گھڑی انھوں نے تجدید بغاوت کا پیماں باندھ لیا۔ حالات زیادہ سازگار اور خطرات بے شمار ہو گئے اور ہتھکڑیاں ہوا میں لہراتی ہوئی نظر آئیں تو زیر زمیں چلے گئے، قارون کے اس خزانے کی تلاش میں جو وہ راستے میں لٹاتا چلا گیا تھا۔ دریا دلی کے تحت نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اب وہ خود اس کو صرف کرنے کے لائق نہیں رہا تھا۔ لیکن ہم یہاں قارون کی پسپائی کے محرکات پر غور کرنے نہیں بیٹھے ہیں۔ ہمیں تو راج بہادر کی شاہانہ پیش قدمی کو خراج ادا کرنا ہے۔

ہندوستان کو جہد بسیار کے بعد آزادی تو مل گئی، لیکن اسے بھرپور بنانا، اسے منصفانہ رخ دینا، اس کے تحت ذرائع و اثمار پیداوار کو عادلانہ ڈھنگ سے تقسیم کرنا، یہ سب کچھ باقی تھا اور اس میں سے بہت کچھ اب بھی باقی ہے۔ راج بہادر ان بے تاب ارواح میں سے ہیں، جو سفر سے جی لگاتی ہیں اور منزل سے نہیں گھبراتی ہیں۔ انھیں ایک لمحہ بھی اس میں شک نہیں ہوا کہ آزادی مقصد نہیں ذریعہ ہے، ذریعہ سماجی اور معاشی ناانصافیوں سماجی نابرابریوں کو دور کرنے کا۔ چناں چہ انھوں نے ٹھان لی کہ سرمایہ کے ہاتھوں کے ساتھ جو زیادتیاں ہو رہی ہیں ان پر روک لگائیں گے۔ جدید صنعت نے دست دولت آفریں کو جس طرح کچلا اور کچل رہی ہے، راج بہادر نے اس کے

خلاف جہاد کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ اب اس ضمن میں کیا کر رہے ہیں، کیا اضمحلال کی گرفت میں قوا، کے ساتھ ساتھ جذبہ بھی آ گیا۔ عقیدت کہتی ہے کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ لوگ جو مظلوموں کی دست گیری کے لیے سر پر کفن باندھ کر نکلتے ہیں، وقت کا احترام ابن الوقت بن کر کبھی نہیں کرتے۔ اس سے بہتر ان لوگوں کی ترجمانی نہیں ہو سکتی جیسی لسان الغیب کر گئے ہیں۔

ازاں بہ دیر مغانم عزیز می دارند

کہ آتشی کہ نمیرد ہمیشہ در دلِ ماست

میں باوجود پرانی لکیروں پر چلنے کے عقیدت مندانہ کنکھیوں سے ان سرفروشوں کو دیکھتا رہا ہوں ایک طرف ان معدودے چند سرفروشوں کو۔ کبھی دوسری طرف ان ایمان فروشوں کو جو ماضی قریب میں انبوہ در انبوہ ایوان سیاست میں در آئے ہیں۔ تب جا کر بغاوتِ رہ کا اندازہ ہوگا۔

راج بہادر گوڑ کے سوانح حیات کی سرخیاں دیکھ رہا تھا۔ علاج معالجہ سے ان کا جو تعلق رہا ہے۔ اس کی روداد پر آ کر رک گیا۔ حکایت لذیذ تھی، نظریں اسے دیر تک دہراتی رہیں۔ گوڑ صاحب نے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کیا یعنی مجاہدے کے بعد ڈاکٹر بنے۔ معلوم نہیں ڈاکٹری سے طبیعت کیوں اچاٹ ہو گئی۔ ان کے سوانح نگار نے شاید مصلحتاً یہ صراحت نہیں کی کہ مطب ان کی آماج گاہ سرے سے بنا بھی کہ نہیں، شاید انھیں یقین نہ تھا کہ اگر وہ اس شریفانہ پیشہ کو، جس کی تیاری میں انھوں نے پانچ چھ سال کھپائے تھے۔ اختیار کریں گے تو اس کے نتیجہ میں ہندوستان کی آبادی برقرار رہے گی یا گھٹ جائے گی۔ ان لوگوں پر جو ایم بی بی ایس یا بی ایس سی (انجینیرنگ) کر کے دوسرے دھندوں میں لگ جاتے ہیں اعتراض کی انگلی اٹھا کرتی ہے کہ انھوں نے میڈیکل یا انجینیرنگ کالج کی قیمتی نشستیں ضائع کر دیں لیکن میں، جو سول سروسیز کے انٹرویو میں ان بے شمار ڈاکٹروں اور انجینیروں کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ جو شوقِ لیلائے سول سروس میں مبتلا ہو گئے تھے، راج بہادر گوڑ پر حرف گیری کیسے کروں۔ وہ سول سروس کے دام میں گرفتار ہونے سے رہے۔

برو ایں دام بر جائے دگر نہ

کہ عنقا را بلند است آشیانہ

انھوں نے تو مظلوموں اور ستم رسیدوں کی دادرسی اور یاوری کو مقصد حیات بنا لیا۔

کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ گوڑ صاحب کے علاج معالجے سے دوسروں نے فائدہ اٹھایا ہو یا نہ ہو، خود انھوں نے نظام چارہ گری سے انوکھے طور پر فائدہ اٹھایا۔ خدانخواستہ دایم المریض ہو کر نہیں بلکہ بیماری کو راہ نجات بنا کر۔ گوڑ صاحب ٹھہرے فعال اور متحرک آدمی۔ زنداں میں ان کا دل کیوں کر لگتا۔ چناں چہ خود کو علاج کا مستحق بنایا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قدرت نے ہی ان کی رہائی بیماری کے راستے لکھی ہو۔ بیماری واقعی تھی یا مصنوعی، ہمیں پردے کے پیچھے جھانکنے کی ضرورت نہیں۔ جنگی قیدیوں کی طرح سیاسی قیدیوں کے لیے فرار کی ہر راہ روا ہے۔ راج بہادر گوڑ کی تازہ تصنیف "ادبی تناظر" میں حسن بیان اور لطف زبان کی تلاش بے سود ہوگی۔ فاضل مصنف کو عبارت آرائی سے زیادہ سروکار نہیں، لیکن ان کے مضامین باوزن اور قابل قدر ہیں۔ ترقی پسند ادب اور اس کے برتنے والوں کے بارے میں انھوں نے بہت سی ایسی باتیں بتائی ہیں جنھیں وہ نہ بتاتے تو یہ داستان تشنہ رہ جاتی۔ سلسلۂ ذہب کی کئی کڑیاں خالی رہ جاتیں۔ چوں کہ وہ خود اسی دبستان ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اس دبستان کے اکابر اہل قلم کی رفاقت اور ان کی طرف سے انسیت اور احترام انھیں میسر ہوا ہے۔ اس لیے ان کی تحریر میں "شنیدہ" کی دوری اور پھیکا پن نہیں ہے۔ "دیدہ" کا قرب اور التہاب ہے۔ وہ ترجمانی اس تحریک کی کر رہے ہیں جس میں وہ گلے گلے شریک تھے۔ مصنف کے ساتھ قارئین تیسری اور چوتھی دہائی کے اس دور میں پہنچ جاتے ہیں جب ترقی پسند مصنفین ادب اور زندگی دونوں کو اپنے شدت سے محسوس کیے ہوئے نظریات کے مطابق ڈھال رہے تھے۔

راج بہادر گوڑ کی تحریر کے برعکس ان کی گفتگو رواں، شگفتہ، صاف اور دلکش ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنی تحریر کو خراد اتارتے تو بات ہی دوسری ہوتی۔ ان کی گفتگو کا ذکر آگیا ہے تو دو ایک باتیں کہہ دی جائیں۔ اول تو ان کی صحبت میں انسان ناک چڑھا کر اور تیوری پر بل ڈال کر بیٹھ ہی نہیں سکتا۔ ان میں ہر بلبلہ کو چھیدنے کی صلاحیت ہے۔ ان کی گفتگو دل کش اور بُراق ہوتی ہے۔ اسے دارالترجمہ والے حیدرآباد کا فیض کہیے کہ ان کا ذہن موزوں لفظ یا موزوں ترین متبادل تک ایک پل میں پہنچ جاتا ہے، اور یارانِ محفل تلاش میں سرگرداں رہ جاتے ہیں۔

گوڑ صاحب قانون کی بہت اچھی فراست رکھتے ہیں۔ اور انجمن ترقی اردو کو اردو زبان کے آئینی حقوق کے سلسلہ میں جتنے مرجوعات کرنے پڑتے ہیں ان میں بالعموم گوڑ صاحب انجمن کی

انگلی پکڑ کر اسے چلاتے ہیں۔

راج بہادر گوڑ کی شخصیت دل پذیر ہے۔ عام خیال یہ ہے اور صحیح ہے کہ وہ مذہبی تعصب سے بے نیاز اور بالاتر ہیں، اس زمانہ میں بھی جب یہ سکّہ رائج الوقت ہو چلا ہے۔ یوں تو ہمارا ترقی پسند طبقہ ہی ذہنی طور پر انصاف پسند اور اقلیت دوست ہے۔ راج بہادر گوڑ کی افتاد طبع عروس البلاد حیدرآباد سے ان کے تعلق، اور شریف النفس اہل سیاست و اہل قلم اور انصاف پسندوں کی صحبت نے اس پر اور جلا کر دی ہے۔ اگر آپ کو تلاش ہو کہ بے لوث اور ٹھیٹھ ہندوستانی کسے کہتے ہیں، تو جو فہرست آپ بنائیں گے اس میں راج بہادر گوڑ کا نام ضرور شامل ہوگا کہ اس کے رگ و ریشہ پر بے آمیز ہندوستانی ہونے کی مہر ثبت ہے اور اس کی رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے وہ ہر لمحہ اس کے دل کو ہندوستانیت کی صہبائے ناب میں لہلہا رہا ہے۔ گوڑ اپنی بے نفسی

سادگی اور بے ریائی میں حسرت موہانی کی یاد دلاتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس درجۂ حرارت کو نہ گوڑ پہنچتا ہے، نہ ہمارے بڑے بڑے قائدین میں سے کوئی۔ تاہم حسرت موہانی کے کردار سے قریبی مماثلت کا افتخار کیا کم ہے۔

"ادبی مناظر" ۱۹ مضامین پر مشتمل ہے۔ "روشنائی" سے اس فاصلہ پر بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کی بنا اس کے جیالوں نے کن ارادوں، اضطرابوں اور ارمانوں کے ساتھ ڈالی اس میں شک نہیں کہ ترقی پسندوں نے اردو ادب کی دیواریں جو فرسودگی اور کجی آگئی تھی اسے بیٹھ کا سہارا دے کر سیدھا کر دیا۔ مضامین اکثر ان معاصرین کا ذکر خیر کرتے ہیں جو مصنف کے ہم مشرب تھے، ان میں سر فہرست مخدوم ہیں اور خواجہ احمد عباس، اور نیاز حیدر اور باقر زیدی بھی ہیں۔ مضامین بصیرت اور ہمدردی کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ لیکن مصنف کی وسعت نظر اور فراخیٔ ترجیحات کا اندازہ بھی ان سے ہوتا ہے۔

ترقی پسند ادب عالمی مناظر اپنے ساتھ لایا، اس کی تخلیقات میں زندگی کی ندی پورے خروش و خروش کے ساتھ رواں دواں نظر آتی ہے۔ ان اوصاف کا انعکاس "ادبی مناظر" میں ہوتا ہے، جارحانہ نہیں شائستہ، متعصبانہ نہیں عادلانہ انداز سے۔ یہ کتاب قارئین کے افق کو

وسیع کرتی ہوئی چلتی ہے۔ اور جو بصیرتیں اور روشنیاں وقتاً فوقتاً حاصل ہوتی ہیں، وہ اس پر مستزاد۔ دیکھیے۔

"بغاوت اور انقلاب میں فرق ہی یہ ہے کہ بغاوت کے سامنے مستقبل کا کوئی نقشہ نہیں ہوتا اور انقلاب کے آگے سماج کی تشکیل نو کا ایک پورا منصوبہ ہوتا ہے۔"

"کسی ادب کو یا کسی ادبی دور کو اس کے اچھے اور اعلیٰ ادب کی بنا پر جانچا جاتا ہے۔"

"کرشن چندر نے اپنی سماجی بصیرت کو اپنے مقصد کو موزوں فنی ہیئت میں پیش کیا ہے۔"

"جاگیرداری سماج میں عورت محض ایک کھلونا تھی۔ سرمایہ داری نے اپنے عروج کے زمانے میں اسے آزاد تو کیا مگر وسعتِ زنجیر تک ہی۔"

"جمہوری طریقۂ کار، کھلی بحث اور ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنا پرکھنا اور مفاہمت اور مطابقت کی راہیں تلاش کرنا انجمن کا طریقۂ کار تھا۔"

"اول تو درمیانی طبقہ کا المیہ یہ ہے کہ وہ نہ تو سرمایہ دار طبقہ کی طرح سماج پر قابض ہے اور نہ مزدور طبقہ کی طرح اس پر قبضہ واقتدار حاصل کرنے کے خواب ہی دیکھ سکتا ہے۔ اس لیے مذبذب اور تشکیک کی اس کیفیت میں منزل اس کی نظروں سے اوجھل ہوتے دیر نہیں لگتی۔"

"(غالب کے دور میں) پرانی قدریں لوٹ رہی ہیں اور نئی قدریں اپنی پرچھائیاں تو ڈال رہی ہیں لیکن کسی واضح اور خوش آیند مستقبل کا نقشہ نہیں پیش کر رہی ہیں۔"

"ان (غالب) کے پاس 'غم موجود' کے ساتھ نشاط آرزو بھی ہے اور یہی غالب کو جدید ذہن سے ہم آہنگ کرتا ہے۔"

ترقی پسند ادب اور اس کے اہل قلم پر راج بہادر گوڑ کو بہت کچھ لکھنا ہے۔ اس منصفانہ روش اور عالم گیر نظر اور انسان دوستی کے ساتھ جس کا اظہار "ادبی تناظر" میں کیا گیا ہے۔ ہم ان کی اس سلسلہ کی کتابوں کا انتظار کریں گے۔

پروفیسر آل احمد سرور

تاثرات

راج کی یاد آتی ہے تو اقبال کا یہ شعر ذہن میں آتا ہے۔

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

یہ ۷۵ سال کے ہوں یا ۸۰ سال کے یا اس سے زیادہ کے ہمیشہ جوان رہیں گے ان کی فکر جوان ہے ان کے قدم زندگی کی راہوں میں اسی جوش سے پڑتے ہیں۔ جو جوانی کا خاصہ ہے۔ ان کی زندگی کی اعلیٰ قدروں سے تہذیب سے ادب سے عشق جوان ہے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ راج بوڑھے بھی ہو سکتے ہیں۔

ان سے پہلی ملاقات ۱۹۵۶ء میں مئی میں دہلی سے حیدرآباد سفر کے دوران ہوئی میں جگر صاحب، خواجہ احمد فاروقی، حمیدہ سلطان کے ساتھ حیدرآباد کی ایک اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے جا رہا تھا۔ یہ ناگپور پر مل گئے پھر مخدوم کے اشعار اور لطائف کی بھرمار رہی وقت اچھا گذر گیا۔ اس زمانہ میں یہ حضرت راجیہ سبھا کے ممبر تھے۔ چناں چہ انجمن نے جب ۱۹۵۸ء میں اردو کے حقوق کے لیے پارلیمنٹ کے ممبران سے ملاقات کا سلسلہ شروع کیا تو راج بہادر گوڑ ہمارے ساتھ تھے۔ دن بھر ہم ممبروں سے ملتے شام کو راج بہادر گوڑ چتو پادھیا سے ملاقات کر کے لسانی اقلیتوں کے مسئلے پر پارلیمانی کمیٹی کی دن بھر کی کاروائی کی ٹوہ لگاتے۔ راج بہت اچھے وکیل ثابت ہوئے۔ پارلیمنٹ کے کئی ممبروں کو ہم خیال بنانے میں وہ بہت معاون نکلے۔

پھر انجمن ترقی اردو کی مجلس عام اور مجلس عاملہ کے ممبر کی حیثیت سے انھیں دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ یہ کبھی جھنجھلاتے ہیں نہ برہم ہوتے ہیں نہ بیزار۔ یہ وہ دریا ہیں جو اپنی دھن میں بہے جاتا ہے۔ مخدوم کے یار ہی نہیں عاشق بھی تھے۔ ان کے بعد کسی سے محبت نہیں کی ان کی ایک

نظم سے اخذ کر کے مکان کا نام بھی رکھ لیا ہے۔

شخصیت باغ و بہار ہے۔ شعر ہزاروں یاد ہیں۔ اکثر جلسوں میں فریق مخالف کو انھوں نے کسی برمحل شعر سے چت کیا۔ مظفر پور میں انجمن کی ایک کانفرنس تھی مجھے ایک دن شرکت کر کے علی گڑھ واپس آنا تھا۔ چناں چہ صدارت ان کے سپرد کر کے روانہ ہونے لگا۔ ایک بقراط کارروائی آگے بڑھنے ہی نہیں دیتے تھے۔ راج نے سمجھایا کہ آپ کو بھی بولنے کا موقع دیا جائے گا۔ گاڑی کو آگے چلنے دیجیے مگر یہ حضرت کہاں مانتے تھے۔ آخر راج نے یہ شعر پڑھا۔

اتنی ہی تو بس کمی ہے تم میں
کہنا نہیں مانتے کسی کا

مجمع نے قہقہہ لگایا وہ حضرت خاموش ہو گئے گاڑی پھر آگے چلنے لگی۔

راج بہادر گوڑ ایک سیاسی کارکن بھی ہیں عام طور پر آدمی سیاست میں ڈوب جائے تو شئے لطیف اور حسِ مزاح سے عاری ہو جاتا ہے مگر اس کلیہ میں کچھ استثنیٰ بھی ہے۔ ان میں ایک راج بہادر گوڑ بھی ہے۔ سماجی انصاف کے علم بردار، مشترک تہذیب کے عاشق، شعر و ادب کے رمز شناس، اردو کے ایک مجاہد گویا ایک جام جہاں نما۔ دنیا انھیں دکن کے ایک جلیل القدر فرزند کی حیثیت سے ہی نہیں برصغیر کے ایک دانشور کی حیثیت سے بھی جانتی ہے۔

خدا اِن خضرِ طریقت کو عمرِ خضر دے۔

کمال الدین احمد

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ۔ پیکرِ جہدِ مُسلسل

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ پچھتر برس کے ہو گئے ۔ ہزاروں برس پرانی دنیا میں پچھتر برس کا عرصہ کوئی لمبا عرصہ نہیں ہوتا۔ لیکن یہ سوال یہاں صرف پچھتر برس کا نہیں ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ یہ پچھتر برس کس کے حصہ میں آئے ہیں اور اس نے ان پچھتر برسوں کو کیسے جیا ہے ۔ دیکھا جائے تو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ یوں ہی پچھتر برس کے نہیں ہو گئے ان پچھتر برسوں کے ایک ایک لمحہ کو انھوں نے کارآمد، مفید، بامقصد اور حیات آفریں بنایا ہے۔ اس طرح ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی زندگی کے پچھتر برس ان کی نجی زندگی کے پچھتر برس نہیں ہیں بلکہ یہ پچھتر برس یہ پچھتر برس ہیں۔ رواداری اور اخوت کے پچھتر برس انسان دوستی اور بھائی چارے کے پچھتر برس، گنگا جمنی تہذیب اور روشن خیالی کے پچھتر برس، مظلوموں اور بے کسوں کے حق میں گذارے ہوئے یہ پچھتر برس، ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے پچھتر برس، انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی حفاظت کرنے والے پچھتر برس۔ یہ اعزاز کسے ملتا ہے کہ ایک انسان کی زندگی بالآخر اس کے اطراف پھیلے ہوئے معاشرہ کی زندگی بن جائے ۔ ایسی زندگی جینے کے لیے پتھر کا کلیجہ اور فولاد کا جگر چاہیے۔ ایسے لوگ سمٹتے ہیں تو دل عاشق بن جاتے ہیں۔ اور پھیلتے ہیں تو زمانہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی شان محبوبی اس میں ہے کہ انھوں نے ہمیشہ ایک بے لوث بامقصد زندگی گذاری ہے۔ اپنا ایک ایک پل اپنے اطراف پھیلے ہوئے سماج کو دیا ہے۔ میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو اپنا بزرگ مانتا ہوں صرف اس لیے نہیں کہ وہ عمر میں مجھ سے بڑے ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ ایک مثالی رہنما ہیں۔ ایسے رہنما کسی بھی سیاسی پارٹی میں ہوں وہ صرف کسی مخصوص پارٹی کے نہیں ہوتے بلکہ سارے ملک کے لیے ایک اثاثہ ہوتے ہیں۔ میں ابتداء ہی سے کانگریس

پارٹی سے وابستہ رہا اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ شروع ہی سے کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ رہے۔ لیکن میں اپنے زمانہ طالب علمی سے ہی ان کی سیاسی سرگرمیوں، ملک کے لیے ان کی بے لوث خدمات اور ان کی راست بازی اور بے باکی کا قائل رہا ہوں حیدرآباد میں پولیس ایکشن سے پہلے نظام کی شخصی حکومت کے خلاف، کسانوں، مظلوموں اور بے کسوں کی حمایت میں آواز اٹھانا کوئی معمولی کام نہیں تھا ایسے وقت میں روی نارائن ریڈی، مخدوم محی الدین، راج بہادر گوڑ اور ان کے ساتھیوں نے نہ صرف اس شخصی نظام کے خلاف آواز بلند کی بلکہ تلنگانہ کی مسلح جدوجہد کا آغاز بھی کیا۔ اس وقت سابق ریاست حیدرآباد کے جو حالات تھے ان میں اس کام کا بیڑہ اٹھانے کے لیے بڑی دلیری جرأت اور حوصلہ کی ضرورت تھی۔ اس جدوجہد کے دوران انھوں نے برسوں روپوشی اختیار کی، جنگلوں کی خاک چھانی، صعوبتیں اٹھائیں، مشکلات سے گذرے لیکن کبھی اپنے نظریہ اور عقیدہ کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ مشکل حالت میں بھی انھوں نے حیدرآباد کے روشن خیال نوجوانوں کسانوں اور مزدوروں کی رہنمائی کی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے عثمانیہ یونیورسٹی سے طب کی تعلیم حاصل کی تھی۔ طب کے پیشہ کی اہمیت اس وقت بھی تھی اور آج بھی ہے۔ ڈاکٹر گوڑ کے ساتھیوں میں کئی ڈاکٹروں نے صرف اپنے پیشہ میں خوب نام کمایا بلکہ بے پناہ دولت بھی کمائی۔ چاہتے تو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ بھی ایک کامیاب ڈاکٹر بن کر ایک خوش حال، آرام دہ اور پرسکون زندگی گذار سکتے تھے۔ لیکن ملک اور سماج کے لیے خوشی خوشی اپنی شخصی خوشحالی کی قربانی دے دی، عام آدمی کی طرح زندگی گذاری۔ عوام کے مصائب میں شریک رہے اور ان کے مسائل کا حل ڈھونڈنے کی مخلصانہ کوشش کی۔ یوں تو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ فرد کی بیماریوں کا علاج کرنے کے بجائے معاشرہ کی بیماریوں کا علاج کرنے کی غرض سے میدان سیاست میں کود پڑے جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا ابتداء ہی سے عقیدت مند اور مداح رہا ہوں لیکن آج سے بیس برس پہلے جب میں آندھرا پردیش اسٹیٹ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کا چیرمین بنا تو انھیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن ملازمین کی ٹریڈ یونین کے صدر کی حیثیت سے بیسیوں بار ان سے ملاقاتیں رہیں۔ ملازمین کے مسائل کو جس طرح وہ پیش

کرتے تھے اور جس ڈھنگ سے وہ ملازمین کی نمایندگی کرتے تھے اس سے ان کی گہری سوجھ بوجھ کا پتہ چلتا تھا وہ نری نعرہ بازی کے ذریعہ مزدوروں کے مسائل کو الجھاتے نہیں تھے بلکہ انھیں پوری دانشمندی اور دیانتداری کے ساتھ سلجھانے کی کوشش کرتے تھے انتظامیہ کے تعلق سے سخت اور تنقیدی رویہ رکھنے کے باوجود وہ انتظامیہ کی دشواریوں کا بھی ہمدردانہ ادراک رکھتے تھے۔ اس معاملہ میں وہ اندھی مخاصمت کو نہیں بلکہ دانشمندانہ مفاہمت کو ترجیح دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جہاں انتظامیہ ان کی اکثر باتوں کو مان لیتا تھا وہیں ملازمین ان پر بھرپور اعتماد کرتے تھے۔ ایک ٹریڈ یونین لیڈر کی حیثیت سے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے جو مقام ملک میں حاصل کیا ہے وہ بہت کم لوگوں کے حصہ میں آیا ہے۔ ہندوستان کی ٹریڈ یونین تحریک کی کوئی بھی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر ادھوری سمجھی جائے گی۔ ڈاکٹر گوڑ نہایت اعلیٰ پایہ کے مقرر بھی ہیں۔ جہاں وہ مزدوروں اور کسانوں کے جلسوں میں گھنٹوں بول سکتے ہیں وہیں دانشوروں اور اہل علم کے سیمیناروں میں بھی اسی دسترس اور اعتماد کے ساتھ بول سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عوام اور خواص دونوں میں بے حد مقبول ہیں اور ان کی بات نہایت توجہ سے سنی جاتی ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ بہترین پارلیمنٹرین بھی رہے ہیں۔ جن دنوں وہ پارلیمنٹ کے ممبر تھے میں پارلیمنٹ کا رکن نہیں بنا تھا لیکن مختلف اہم ملکی مسائل پر پارلیمنٹ میں ان کی تحریروں اہم ملکی مسائل پر پارلیمنٹ میں ان کی تقریروں کو گہری توجہ اور دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں۔ انھوں نے نہایت موثر انداز میں عوام کی آواز کو پارلیمنٹ کے ایوان تک پہنچانے کی کوشش کی اور اس میں وہ بے حد کامیاب بھی رہے۔ ان کی تقریروں سے پتہ چلتا ہے کہ جمہوریت میں اپوزیشن لیڈر کتنی اہم خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کا رویہ تعمیری ہو۔ اگرچہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے نظام کی شخصی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ لیکن حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کے وہ سچے علمبردار رہے ہیں۔ سیکولرزم رواداری اور انسان دوستی جیسے جذبات ان کی رگوں میں خون بن کر دوڑتے ہیں۔ حیدرآباد ہی کے حوالہ سے وہ اردو زبان کے نہ صرف ایک سچے عاشق ہیں بلکہ ان کے ایک بلند پایہ ادیب بھی ہیں۔ انھوں نے سینکڑوں ادبی موضوعات پر تنقیدی اور تعارفی مضامین لکھے ہیں۔ سیاست دانوں میں ادب سے ایسی گہری دلچسپی کی مثالیں ذرا کم ملتی ہیں۔ آندھرا پردیش میں بالخصوص اور ہندوستان میں بالعموم جب

بھی اردو کا کوئی مسئلہ اٹھا ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے بڑی شدت کے ساتھ اس مسئلہ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ آج جب کہ ملک کی سیاست ایک بحران سے گذر رہی ہے۔ لوگ سیاسی پارٹیاں یوں بدل رہے ہیں، جیسے لباس بدل رہے ہیں، مسلک اور عقیدے کی اہمیت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ شخصی الزامات لگا کر سیاسی فائدہ اٹھانے کا رجحان عام ہو رہا ہے۔ جمہوریت، سیکولرازم، یکجہتی جیسے نظریات پر ضرب کاری لگ رہی ہے۔ ان حالات میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ جیسے وسیع النظر، وسیع المشرب روشن خیال اور سچے رہنما کی موجودگی ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ ڈاکٹر گوڑ نے نصف صدی پہلے جس عہدہ اور نظریہ کو اپنایا تھا آج تک اس پر ثابت قدمی کے ساتھ قائم ہیں۔ اس کٹھن سفر اور آزمائش میں ان کے پائے استقامت کبھی نہیں لڑکھڑائے۔ دنیا میں بہت کچھ بدل گیا لیکن ڈاکٹر گوڑ نہیں بدلے۔ ہم سے تو زمانہ ہے زمانہ سے ہم نہیں۔ ایسے دیانت دار اور کھرے بزرگ رہنما کا ہمارے بیچ موجود رہنا ہم سب کی خوش بختی ہے۔ پچھتر برس کے ہو جانے کے باوجود ان میں نوجوانوں کا سا جوش اور ولولہ موجود ہے۔ ہندوستانی سماج کی بہتری کے لیے آج بھی وہ ایک بھرپور اور فعال زندگی جی رہے ہیں۔ میری دعا ہے کہ ان کی صحت اور توانائی بنی رہے اور وہ اسی طرح ملک اور قوم کی خدمات انجام دیتے رہیں۔

امولک رام

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ۔ پچھترویں سالگرہ پر

سبھی حساس دلوں کے لیے آج ایک سنہرا دن ہے کہ ہم میں سے ایک نامور شخصیت کی زندگی کے ۷۵ سال بیتنے پر (جس کا بیش بہا حصہ عوامی خدمت میں گذرا ہو) ان خدمات کو سراہا جارہا ہے۔ جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ خدمات کو بھول جانے اور یادوں کو بھلا دینے کی روایت پڑ چکی ہے۔ ویسے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی خدمات کو نہ بھلایا جا سکتا ہے اور ان یادوں کو کبھی بھلایا جا سکے گا۔ کیوں کہ ڈاکٹر راج اور مخدوم نے حیدرآباد کو ایک مخصوص شخصیت بخشی تھی۔ یا یوں سمجھیے کہ سرزمین حیدرآباد کے یہ ایسے سپوت ہیں جو سیاسیات کو، ادب اور سنگیت کو، یہاں کی ہر تحریک کو حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کے بہترین اقدار دیے۔ اسی لیے تو بیرون حیدرآباد سے شاعر اور ادیب اب بھی حیدرآباد کو کھنچے چلے آتے ہیں۔ اور پرانی یادوں اور قدروں کو تازہ کرتے ہیں۔ میرے اس مقالہ کا مقصد ان کی خدمات کا کوئی جائزہ لینا نہیں بلکہ اپنا خراج تحسین پیش کرنا ہے۔ کیوں کہ میں ان سے اور مخدوم سے ابتدائی وجدان Inspiration حاصل کیا تھا اور بہت کچھ سیکھا تھا۔ جو میرا خمیر بن چکا ہے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ حیدرآباد میں ٹریڈ یونین تحریک کے مخدوم، جواد اور مہندرا کے ساتھ بانی مبانی تھے۔ اس لیے ٹریڈ یونین قائدین اور ہر پارٹی نے انھیں ٹریڈ یونین تحریک کے بھیشم پتاما کہتے ہیں۔ نئی نسل کے ٹریڈ یونین کارکنوں کو اصل میں یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ اس وقت یہ کتنا مشکل کام تھا۔ نظام شاہی اور انگریز سامراج کا دور دورہ تھا۔ جب کہ عام جلسے کرنا ایک خطرناک جرم سمجھا جاتا تھا۔ راتوں کے اندھیرے میں محفوظ مقامات اور جگہوں اور قبرستانوں میں مزدوروں کے جلسہ عام رکھتے۔ وہیں ٹریڈ یونین کے رجسٹریشن فارم پر کرتے۔ مطالبات اور میمورنڈم مرتب کرتے اور ضرورت پڑنے پر ہڑتالوں کے فیصلے بھی وہیں ہوتے۔ یہ تھے وہ حالات جن میں مزدور تحریک کی شروعات ہوئی۔ راج اور ان کے ساتھیوں کی لگن بے مثال تھی۔ ان دنوں یونین کا تصور مزدوروں کے لیے نیا نیا تھا۔ ہر چیز بڑے دھیرج سے سمجھانا پڑتا اور مزدوروں کی باتوں سے مسائل کو سمجھ کر ان کی رہنمائی کرنا پڑتا۔ راج کو میں نے کئی مزدوروں کو بڑے پیار اور دھیرج سے بات کرتے دیکھا

اس پیار کا تاثر تھا کہ مزدور اپنے گھریلو پریشانیاں بھی ان کے سامنے رکھتے اور کنبہ کا کنبہ ان کے گرد گھومنے لگتا۔ مزدوروں سے پیار کا رشتہ جو راج اور مخدوم نے جوڑا تھا اور جو پیار کمایا تھا شاید ہی کوئی اور نیتا نے کمایا ہو مزدور ہی کیا جن سے بھی ان کا واسطہ پڑتا یہی پیار کا رشتہ بن جاتا۔ اس لیے لوگ بھی ان پر پیار اور عقیدت کے پھول نچھاور کرتے۔ ٹریڈ یونین کے کام میں راج کو اولین اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے تیار کردہ میمورنڈم، سلیس زبان میں، عام فہم اور دلیلوں کے ساتھ ہوتے۔ ان مزدوروں کو اپنے مطالبات کی واجبیت پر بھروسہ ہوتا جدوجہد کے لیے مکمل تیار ہونے اور خود سرمایہ داروں کو بھی واجبیت کو تسلیم ہی کرنا پڑتا۔ راج کی ایک اور خصوصیت ہے۔ وہ روزمرہ کے مسائل اور مطالبات کو بھی اصولوں اور نظریات کی اونچی سطح پر لے جاتے اور اس طرح جدوجہد کی بھی سطح اونچی ہو کر سماجی مسئلہ بن جاتی۔ ویسے بھی وہ اعلیٰ اصولوں کو مزدور کے سمجھ بوجھ کے لیے آسان زبان میں پیش کرتے اس پہلو میں دونوں راج اور مخدوم پر کامریڈ ڈانگے کا بڑا اثر تھا راج اور مخدوم کا اپنے ساتھیوں اور ان کے ارکان خاندان کے ساتھ برتاؤ، خصوصی ذکر کا محتاج ہے شاید یہ پرانے کمیونسٹوں کے اقدار کا ایک حصہ تھا۔ جو اب دھیرے دھیرے عنقا ہو چلا ہے۔ نصرت یاد ہے کہ راب بھی راج کو اپنے مرحوم والدین کے نمائندے تصور کرتے ہیں۔ راج، ریڈی اور راجو اپنے والد سے بھی بڑا درجہ دیتے ہیں۔ خود میرا لڑکا ڈاکٹر راہول اور لڑکی ڈاکٹر رادھیکا ان کو "اپنا" سمجھتے ہیں۔ میری بیوی ڈاکٹر پدما ہمیشہ سناتی ہیں کہ کیسے مخدوم ایک دفعہ یکایک ہماری شادی کی سالگرہ پر آدھمکے اور ہم کو "مدعو" کیا جب انھوں نے دیکھا کہ میں اپنے روزمرہ کے کام میں اس دن کی خصوصیت کو بھول بیٹھا تھا۔ مزدور کو منظم کرنے راج کے ہزار جتن رہتے۔ ان کے تعلیمی معیار کو اونچا کرنے میں مدد کرتے۔ کلچرل صلاحیتوں کو ابھارنے کی مقدور بھر کوشش کرتے چناں چہ مخدوم کی سالگرہ کے موقعہ پر انھوں نے مزدور شعراء کا بھی ایک الگ پروگرام رکھا تھا۔ دو ایک ضرور شریک ہوئے لیکن ایک بڑا پروگرام نہ بن سکا۔ پارٹی اور کمیونزم کے لیے راج کی خدمات انہماک اور وابستگی بے پناہ رہی۔ مخدوم اور راج کمیونسٹوں اور انقلابیوں کے لیے ایک عظیم ورثہ چھوڑ رہے ہیں، کیا ہم سنبھال سکیں گے؟ یہ میرے چند پیار اور عقیدت کے پھول ہیں جو میں اپنے گرو اور ساتھی اور رہنما ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے بھینٹ کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر عبدالمغنی

ادبی تناظر پر ایک نظر

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صاحب اردو تہذیب کی اعلیٰ قدروں کا ایک نمونہ ہیں اور اردو تحریک تنظیم کے ساتھ ایک طویل مدت سے ذمہ دارانہ طور پر وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کے متعدد موضوعات پر وقیع مضامین بھی لکھتے رہے ہیں جو مختلف رسائل میں شائع ہو کر دل چسپی کے ساتھ پڑھے گئے ہیں۔ "ادبی مطالعے" اور "ادبی جائزے" کے بعد "ادبی تناظر" ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا تیسرا مجموعۂ مضامین ہے۔ اس پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۸ صفحات پر مشتمل ۱۸ مضامین میں ڈاکٹر صاحب نے نظم ونثر کے متنوع موضوعات اور مختلف علمی وادبی نیز قومی وسیاسی شخصیات کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ مشتے نمونہ کے طور پر بروقت تین مضامین پر تنقیدی تبصرہ کافی ہوگا۔

مجموعے کا تیسرا مضمون ہے۔ "غالب اور جدید ذہن" اس میں مختلف جہتوں سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اول تو اپنے زمانے کے لحاظ سے خود غالب کا ذہن کتنا جدید تھا؛ دوسرے یہ کہ غالب نے موجودہ دور کے جدید ذہن پر کتنا وسیع اور گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر گوڑ کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ

> "غالب کا دور انتہائی پیچیدہ اور پر آشوب ہے۔ پرانی قدریں ٹوٹ رہی ہیں اور نئی قدریں اپنی پرچھائیاں تو ڈال رہی ہیں لیکن کسی واضح اور خوش آیند مستقبل کا نقشہ نہیں پیش کر رہی ہیں۔" (ص۔ ۳۳)

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے کہ غالب اپنی تہذیب کی پسندیدہ قدروں کی شکست وریخت

سے بہت ملول تھے اور وہ اپنے اشعار سے مستقبل کے لیے لوگوں کے حوصلے بڑھانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے خیالات میں آزادگی و خود بینی اور نشاط و رجائیت کی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ "غالب نے تصوف میں پناہ لی" (ص۔ ۳۵) یہ ایک متضاد سی بات معلوم ہوتی ہے اور اس کا تضاد ڈاکٹر صاحب کے حسب ذیل بیان سے کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔

"وہ (غالب) مسائل حیات کو سمجھنے اور مذہب کی ظاہر داریوں سے بچ نکلنے کے لیے فلسفۂ وحدت الوجود کا سہارا لیتے ہیں۔" (ص۔ ۳۵)

بلاشبہ غالب کے بعض اشعار میں رسم زمانہ اور روایت شاعری کے مطابق وحدت الوجود کے کچھ اشارات موجود ہیں، مگر غالب کی توانا رجائیت وحدت الوجود کی اس تخیل پرستی کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی جو قوائے عمل کو مضمحل کر دیتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غالب کا حقیقی میلان وحدت الشہود کی طرف تھا جیسا ان کی ایک مشہور غزل کے حسب ذیل اشعار سے واضح ہوتا ہے:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود	پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں	غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکن زلف عنبریں کیوں ہے	نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں	ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

اس موضوع پر خود گوڑ صاحب کا یہ اقرار:

"پتہ چلتا ہے کہ غالب موجودات کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ اور ان کی کثافت کے بغیر لطافت تک پہنچ ممکن نہیں۔"

وحدت الوجود کے بجائے وحدت الشہود کا پتہ دیتا ہے۔

بہر حال، گوڑ صاحب نے غالب کے یہاں "تاتاری بیگن ازم" اور "لذت طلبی" کا جو سراغ کسی حوالے سے لگایا ہے وہ صحیح نہیں۔ محض چند شعروں اور مصرعوں سے وہ مطلب نہیں نکل سکتا جو غالب کے اشعار اور خطوط کے مجموعی اور عمومی مفہوم کے برعکس ہے۔ غالب بلاشبہ وسیع ترین معنوں میں ترقی پسند تھے اور گوڑ صاحب نے ان کی "تشکیک" کو "صحت مند" کے ساتھ مشروط کر کے ایک معقول بات کہی ہے۔ یہ تشکیک یقیناً قنوطیت اور کلبیت کے برخلاف رجائیت اور "نشاطِ آرزو" کی طرف مائل ہے۔ اس میں

لذت طلبی اور پیگن ازم کی گنجائش بہت ہی کم ہے، اس لیے کہ اس میں آزادگی وخود بینی کا عنصر ایک پروقار اور بہت ہی سنجیدہ جرأت مندی کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اعتراف کر کے کہ "غالب کا اسلام پر عقیدہ راسخ تھا" (ص۔ ۴۰)، ڈاکٹر گوڑ نے غالب کے یہاں اس پیگن ازم کی جسے ڈاکٹر صاحب "کفر" (ص۔ ۳۷) سے تعبیر کرتے ہیں خود ہی نفی کردی ہے، گرچہ ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد بجا اور درست ہے کہ غالب رسوم وقیود کی تقلید سے آزاد تھے۔ جب کہ اس قسم کی تقلیدی آبا پرستی خود اسلام میں روا نہیں اور اقبال بھی اجداد پرستی کے اس حد تک مخالف تھے کہ انھوں نے اعلان کردیا:

اگر تقلید بودے شیوۂ خوب
پیمبر ہم رہ اجداد رفتے

(اگر تقلید کوئی اچھا طریقہ ہوتا تو پیغمبر اسلام بھی اپنے اجداد کی (کافرانہ وجاہلانہ) روش اختیار کرتے)

مضمون کے آخر میں غالب کے بارے میں ڈاکٹر گوڑ نے سب سے سچی بات ان کی غزل گوئی کے عظیم الشان کارنامے کے متعلق ان لفظوں میں کہی ہے:

"غزل اونچ نیچ سے گزر کر نہ صرف زندہ رہی بلکہ زمانے کے نئے تقاضوں کی ترجمان بھی رہی اور ارتقا کی نئی سمتوں کی بشارت بھی دیتی رہی۔ غزل کو یہ راہ غالب ہی نے دکھائی تھی۔ اردو غزل کو اس حیات نو کے بخشنے میں غالب کی روایات کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں غالب جدید ذہن کے معمار اولیں بن جاتے ہیں۔" (ص ۴۳)

اردو شاعری اور ہندوستانی تہذیب کی تاریخ میں غالب کے فکر وفن کی اصلی اہمیت یہی ہے۔ تغزل یا شاعری میں میر کی فتوحات جو بھی ہوں وہ یقیناً ہماری تہذیبی روایات کا ایک بڑا حصہ اور ورثہ ہیں لیکن عصر حاضر میں اردو شاعری اور اس کے سرمایۂ افتخار، غزل، کو جس نادر تجربے نے زندہ وتابندہ رکھا ہے وہ ایک بلند تخیل اور اس کے محکم اظہار کا وہ انداز واسلوب ہی ہے۔ جس کی تشکیل سودا نے کی اور اسے ترقی غالب نے دی، جب کہ اس کی تکمیل اقبال کے ہاتھوں ہوئی۔

"آج کا ہندوستان اور مولانا ابوالکلام آزاد کی معنویت" میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے مولانا کی

عظمت کو جو خراج عقیدت پیش کیا ہے اس میں دو نکات بہت نمایاں ہیں۔ ایک یہ کہ ڈاکٹر صاحب کے لفظوں میں :

"صحافت کا ناطہ ادب سے جوڑنے والے غالباً وہ پہلے اردو صحافی ہیں"۔ (ص ۶۳)

حقیقت یہ ہے کہ "الہلال" اور "البلاغ" کی شاندار، معنی آفریں اور سحر انگیز زبان آج کے اردو جاننے اور پڑھنے والوں کے لیے کتنی ہی اجنبی اور مشکل ہو۔ مگر بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں اس کی فتوحات پر جو مشہور تبصرہ حسرت موہانی نے کیا ہے اور جس کے مطابق ابوالکلام آزاد کی نثر کو دیکھ کر نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا وہ بالکل صحیح ہے۔ گرچہ مولانا آزاد کی بہترین نثر کے کمالات بعد میں "ترجمان القرآن" اور "غبار خاطر" کے زیادہ محکم اسلوب نگارش میں ظاہر ہوئے۔ دوسرا نکتہ بقول ڈاکٹر گوڑ یہ ہے کہ مولانا آزاد نے موجودہ ہندوستان کے سلسلے میں اسلامی نقطہ نظر سے دیگر علمائے دین کے برخلاف "دارالسلام" اور "دارالحرب" کے مقابلے پر اور دونوں کے بیچ میں "دارالامن" کے تصور کا تاریخی اجتہاد کیا۔ لیکن ڈاکٹر گوڑ کا یہ خیال صحیح نہیں کہ سورہ فاتحہ کی تفسیر میں مولانا آزاد نے "وحدت ادیان" کی بات کی ہے اور یہ بھی غلط ہے کہ شاہ ولی اللہ نے وحدت ادیان کا تصور پیش کیا تھا۔ دراصل مولانا آزاد اور شاہ ولی اللہ دونوں نے دیگر مستند و مشہور علمائے اسلام کی طرح "وحدت دین" کے نظریے کی تشریح و توضیح کی۔ وحدت ادیان کا مطلب ہے کہ تمام مذاہب ایک اور ان کی موجودہ سب شکلیں برحق ہیں، جب کہ وحدت دین کا مفہوم یہ ہے کہ دین اصلاً ایک ہے اور وہ دین فطرت ہے جس پر حیات و کائنات کا پورا نظام مبنی ہے۔ اس ہمہ گیر دین کی تعریف قرآن کی ایک مشہور آیت میں اس طرح کی گئی ہے :

ان الدین عند اللہ الاسلام

اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے

پھر اسلام کی جو وضاحت قرآن کی متعدد آیتوں سے صریحاً ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام محض کسی ایک نسلی فرقے کا مذہب نہیں ہے بلکہ خدا کا مقرر کیا ہوا وہ قانون فطرت ہے جس کی تابعداری تمام مخلوقات کو کرنی ہے۔ چناں چہ عربی میں اسلام کا لفظی معنی بھی خدا کی بندگی اور فرماں برداری ہے۔ یہ ایک نظریۂ حیات ہے۔ جو بلا امتیاز تمام انسانوں کے لیے ہے، جو اس کو تسلیم کرے وہ مومن

ہے، جو اس سے انکار کرے وہ کافر ہے۔ وحدتِ دین کا یہی تصور اپنے اپنے وقت میں اور اپنے اپنے طور پر شاہ ولی اللہ اور مولانا ابوالکلام آزاد نیز دیگر مشاہیر علمائے اسلام سبھی نے پیش کیا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر کے ایک سوال کے جواب میں مولانا آزاد نے اس پورے مسئلے کی وضاحت خود ہی "میرا عقیدہ" کے عنوان سے کتابی شکل میں کردی ہے۔

"مولانا محمد علی جوہر ـــ ایک خراج عقیدت اور ایک تجزیہ" میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے جو حقائق پیش کیے ہیں ان میں چند کا صرف بیان کردینا یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے کتنی وسعت نظر اور بصیرت کے ساتھ مولانا محمد علی کی شخصیت اور کارناموں کا مطالعہ کیا ہے وہ کہتے ہیں:

۱۔ "علی گڑھ تحریک اور آکسفورڈ کی تعلیم نے انھیں یہ سکھایا کہ سچائی کی تلاش اور روایت کے احترام کے درمیان آویزش نہیں بلکہ رابطہ ہونا چاہیے۔" (ص ۶۹)

۲۔ "مولانا محمد علی کی اسلام پرستی اور وطن دوستی ایک دوسرے سے ستیزہ کار نہیں بلکہ ایک دوسرے کے معاون کار ہیں۔" (ص ۷۰)

۳۔ "مولانا محمد علی تعلیمی نظام کی صحت پر بہت زور دیتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں جدید تعلیم نے "مذہب پرستی سے زیادہ فرقہ پرستی" کو فروغ دیا ہے۔ ان کی رائے میں جمہوریت کے لیے ایک صحت مند تعلیمی نظام کی سخت ضرورت ہے۔ جو عوام کے ذوق اور مزاج سے ہم آہنگ ہو۔" (ص ۷۵)

میرے خیال میں یہ سچائیاں ہیں۔ جو کسی تبصرے اور تنقید کی محتاج نہیں۔ آج کے حالات میں انھیں مولانا محمد علی کے حوالے سے اجاگر کرکے ڈاکٹر گوڑ نے ایک علمی نیز عملی خدمت انجام دی ہے۔ یہ سچائیاں عصر حاضر کے ہندوستانی دانشوروں کو بلا امتیاز فرقہ وطبقہ دعوتِ فکر دیتی ہیں۔

"ادبی مناظر" کے تین اہم مضامین کے تجزیے سے آشکار ہوتا ہے کہ اس کتاب میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صاحب نے چند وسیع موضوعات پر فکر انگیز سوالات اٹھائے ہیں اور بصیرت افروز بحثیں کی ہیں، گرچہ ان کے بعض خیالات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، مگر ان کے خلوص پر شبہ نہیں کیا جاسکتا، پھر وہ اپنے افکار کی وضاحت کے لیے بہرحال دلیلیں دیتے ہیں۔ اس طرح ان کا

اندازِ نظر علمی ہے اور وہ ادبی مسائل پر بھی عالمانہ اسلوب سے گفتگو کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ زیرِ نظر کتاب کے مضامین کی فہرست کے مدِ نظر ڈاکٹر خلیق انجم نے "حرفِ آغاز" میں بالکل بجا ارشاد کیا ہے :

"گوڑ صاحب کی تحریروں کا کینوس وسیع ہے۔ انھوں نے بہت متنوع موضوعات پر مقالے لکھے ہیں۔"

ڈاکٹر انجم کا یہ خیال بھی صحیح ہے :

"ادبی تناظر۔۔۔۔ایک ایسے نقاد کی تحریروں کا مجموعہ ہے جو ادب اور سیاست دونوں میدانوں کا مرد ہے، جس کا اندازِ فکر ہمیشہ متوازن اور ہمدردانہ رہا ہے اور جس نے اپنے نظریاتی مخالفوں کو برا بھلا کہنے کے بجائے بہت نرم اور مدلل انداز میں اپنا نقطۂ نظر سمجھانے کی کوشش کی ہے۔"

مجتبیٰ حسین

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی پچھتّرویں سالگرہ

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ پچھتر برس کے ہو گئے۔ یہ بات آپ اور ہم تو اس لیے مان لیں گے کہ وہ ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے تھے لیکن شاید خود ڈاکٹر گوڑ اس بات کو نہ مانیں کیوں کہ راج بہادر گوڑ کسی بھی بات کو اتنی آسانی سے نہیں مانتے۔ مجھے اس وقت اپنے خاندان کے ایک بزرگ یاد آ گئے جنھوں نے ساری زندگی ہنستے کھیلتے، دھوم مچاتے ہوئے گذار دی، نوّے سال کی عمر میں بھی ان کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی جو عموماً نو سال کے بچے کے ہونٹوں پر دکھائی دیتی ہے۔ سچی اور خالص مسکراہٹ، مگر جب وہ اکیانوے برس کے ہو گئے اور میں ان کی سال گرہ پر مبارکباد دینے گیا تو اُداس سے نظر آئے۔ اداسی کا سبب پوچھا تو کہنے لگے "میاں! زندگی کے اکیانوے برس تو چٹکی بجانے میں گزار دیے لیکن اب احساس ہونے لگا ہے کہ مجھ میں مزید بوڑھا ہونے کی گنجائش نہیں رہ گئی ہے!"____ اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس جملہ کو ادا کرنے کے بعد بھی وہ مزید چار برس تک زندہ رہنے کی گنجائش نکالتے رہے۔ اصل میں انسان کی عمر کیلنڈروں سے طے نہیں ہوتی بلکہ اس کے اپنے احساس اور رویّہ سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اپنے جذبہ اور احساس کی سطح پر عمر کے اس منزل سے گزر رہے ہیں جہاں ان میں مزید جوان بنے رہنے کی خاصی گنجائشیں موجود ہیں۔ میرا اپنا حال بلکہ حالت یہ ہو گئی ہے کہ میں کبھی کبھی اپنے آپ کو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا بزرگ سمجھ بیٹھتا ہوں۔ حالاں کہ ڈاکٹر گوڑ ان لوگوں میں سے ہیں جنھیں میں نے غالباً اس وقت دیکھا تھا جب میں خود نو برس کا تھا۔ یہاں غالباً کا استعمال میں نے اس لیے کیا ہے کہ میں ان دنوں سابق ریاست حیدرآباد کے شہر گلبرگہ میں رہتا تھا۔ اور اپنے بڑے بھائیوں سے ملنے کے لیے کبھی کبھار حیدرآباد آجاتا تھا۔ میرے بڑے بھائی حیدر گوڑہ کے ایک مکان میں

رہتے تھے۔ ایک رات مجھے بلا کر تاکید کی گئی کہ میں مکان کے اس کمرہ میں بالکل نہ جاؤں جو مکان کے پچھلے حصہ میں واقع تھا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ وہاں ایک مہمان آیا ہوا ہے اور اسے آرام کی سخت ضرورت ہے۔ پھر یہ بھی کہا گیا کہ اگر کوئی یہ پوچھے کہ گھر میں کوئی مہمان آیا ہوا ہے تو جواب میں یہ کہہ دوں کہ کوئی بھی نہیں آیا ہے۔ ایسے مہمان کو دیکھنے کی تمنا بھلا کس بچہ کے دل میں پیدا نہیں ہو گی۔ لہٰذا سخت تاکید کے باوجود میں نے چوری چھپے درازوں میں سے جھانک کر اس مہمان کو دیکھا جو آرام تو خیر کیا کرتا کچھ لکھنے پڑھنے میں ضرور مصروف تھا۔ اس نے ایک لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ مونچھیں بھی شاید تھیں جو پتہ نہیں اصلی تھیں یا نقلی۔ یہ غالباً ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ جب مخدوم محی الدین، راج بہادر گوڑ اور ان کے دیگر کمیونسٹ ساتھی تلنگانہ کی مسلح جدوجہد کے سلسلہ میں روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اور اپنے ٹھکانے بدل بدل کر اپنے آپ کو گرفتار ہونے سے بچا رہے تھے۔ میں نے اوپر جس مہمان کا ذکر کیا ہے وہ ہمارے گھر میں رہا تو صرف ایک ہی دن لیکن اس کے گھر سے چلے جانے کے پانچ چھ برس بعد کسی نے بتایا کہ اس دن جو مہمان ہمارے گھر میں رکا تھا اس کا نام ڈاکٹر راج بہادر گوڑ تھا۔ جب مجھے اس کا پتہ چلا تو میں چودہ پندرہ برس کا ہو چکا تھا۔ اس وقت تک ڈاکٹر گوڑ جیل سے رہا ہو چکے تھے۔ میں اپنے دوستوں کو بڑے فخر کے ساتھ اس وقت بھی بتایا کرتا تھا۔ اور آج بھی بتایا کرتا ہوں کہ ڈاکٹر گوڑ نے کبھی ہمارے گھر میں بھی پناہ لی تھی۔ اگرچہ میں آج بھی پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ آج سے پچاس برس پہلے جس مہمان نے ہمارے گھر میں پناہ لی تھی کیا وہ سچ مچ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ تھے۔ میں چاہتا تو پچھلے پچاس برسوں میں اپنے بڑے بھائیوں سے اس بارے میں پوچھ سکتا تھا۔ بلکہ خود ڈاکٹر گوڑ سے اس کی توثیق حاصل کر سکتا تھا۔ مگر میں نے کبھی نہیں پوچھا اور آج بھی پوچھنا نہیں چاہوں گا۔ اس لیے کہ اگر خدانخواستہ جواب نفی میں ملے تو میری زندگی میں سے ان سے رابطہ کے عرصہ میں اچانک پانچ چھ برسوں کی کمی ہو جائے گی۔ اور میں عمر کی اس منزل میں ہوں جہاں سینت سینت کر جمع کیے ہوئے لمحوں کو تفریق کے عمل سے گزارنا میرے لیے گھاٹے کا سودا ہو گا فراق نے کچھ ایسی ہی ذہنی کیفیت کے بارے میں کہا تھا۔

؎ خود اپنے خیالوں کو ہمدم میں ہاتھ لگاتے ڈرتا ہوں

قصہ دراصل یہ ہے کہ راج بہادر گوڑ میرے لیے افسانہ بھی ہیں اور حقیقت بھی۔ یہ معاملہ صرف

میرا ہی نہیں یہ اس شخص کا ہے جس نے ملک کی آزادی سے پندرہ سولہ برس پہلے سابق ریاست حیدرآباد کے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں۔ شخصی حکمرانی کے اس دور میں جب اچھے اچھوں کے منہ بند رہتے تھے۔ مخدوم محی الدین، روی نارائن ریڈی، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور ان کے ساتھیوں نے تلنگانہ کے کسانوں اور مزدوروں کو ساتھ لے کر مسلح جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ اس تحریک نے اس وقت کے نوجوانوں میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی تھی۔ مخدوم محی الدین کا ترانہ

لو سرخ سویرا آتا ہے آزادی کا آزادی کا

گلنار ترانہ گاتا ہے آزادی کا آزادی کا

اس وقت کے نوجوانوں میں بے پناہ مقبول ہو چکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جیل سے رہائی کے بعد مخدوم محی الدین کا جو جلوس نکلا تھا۔ اس سے بڑا جلوس میں نے آج تک نہیں دیکھا بلکہ جوں جوں میری عمر میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے میرے حافظہ میں اس جلوس کی لمبائی بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔

مخدوم اور ڈاکٹر گوڑ کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں اور یہ دونوں کسی داستان افسانہ کے کردار لگتے تھے۔ ان لوگوں کی روپوشی کے بارے میں بھی طرح طرح کے قصے مشہور تھے۔ جنھیں سن کر احساس ہوتا تھا کہ یہ اس دھرتی کے باسی ہیں۔ مثلاً مخدوم نے ایک بار اپنے ایک برہمن دوست کے گھر میں پناہ لی۔ ان کا برہمن دوست تھا تو کمیونسٹ پارٹی کا ہمدرد لیکن اس کے والدین رہن سہن اور کھانے پینے کے معاملہ میں بڑے کٹر واقع ہوئے تھے۔ مخدوم کے دوست نے مخدوم کو سمجھا رکھا تھا کہ اس کے والدین کو ہرگز یہ پتہ نہ چلنے پائے کہ وہ مسلمان ہیں۔ مخدوم اس پر سختی سے عمل بھی کرتے رہے۔ ایک دن کھانے کی میز پر ان کے دوست کے والد نے باتوں باتوں میں مخدوم سے کہا: "تم لوگ کمیونسٹ پارٹی میں کام کرتے ہو۔ تم لوگوں کے دین و ایمان کا کیا بھروسہ۔ کہیں تم لوگ گوشت وغیرہ تو نہیں کھاتے؟"

اتنا سنتے ہی مخدوم نے منہ میں جاتے ہوئے نوالہ کو روکا اور کہا "نعوذ باللہ۔ لاحول ولا قوۃ" چھی چھی۔ یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ ہم گوشت کھاتے ہیں۔"

ڈاکٹر گوڑ بھی کئی نام اور کئی بھیس بدل کر روپوش رہے۔ آج یہاں کل وہاں۔ یہ بھی غالباً ۱۹۴۵ء

کی بات ہے کہ راج بہادر گوڑ ایسی ہی کسی" نعوذ باللہ" والی بات پر دھر لیے گئے۔ یہ اور بات ہے کہ جیل میں پہنچ کر انھوں نے کسی بیماری کا بہانہ کیا۔ (میڈیسن کے ڈاکٹر ہونے کا اتنا فائدہ تو وہ اٹھانا جانتے ہی تھے)۔ پھر یہ اکیلے بیمار نہیں پڑے بلکہ اپنے ایک ساتھی کامریڈ جواد رضوی کو بھی ساتھ لے کر بیمار پڑے (حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو اسی کو کہتے ہیں) نتیجہ میں دونوں قیدی علاج کے لیے عثمانیہ اسپتال لائے گئے۔ اپنا علاج کرنا وہ خود تو جانتے ہی تھے۔ لہٰذا دونوں کچھ ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ اسپتال سے فرار ہو گئے کہ ان کے فرار ہونے کے ڈرامہ کا ذکر کئی دنوں تک حیدرآباد کے گلی کوچوں میں ہوتا رہا۔ ہماری فلموں میں بھی قیدی اس طرح فرار نہیں ہوتے جیسے یہ دونوں ہوئے تھے۔ میری نسل کے لوگوں کے ذہنوں میں مخدوم اور راج بہادر گوڑ ایک عرصہ تک افسانوی کردار کی طرح ہی رہے۔ ۱۹۵۲ء میں جب یہ رہا ہوئے اور جب پہلی بار انھیں اصلی روپ میں دیکھا تو یقین نہیں آتا تھا کہ کیا یہی وہ راج بہادر گوڑ ہیں جن کے قصے الف لیلیٰ کی داستانوں کی طرح مشہور ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اصل راج بہادر گوڑ تو وہی تھے اور ۱۹۵۲ء کے بعد سے ہم جب ڈاکٹر گوڑ کو دیکھ رہے ہیں وہ اصل میں ایک بھیس بدلی ہوئی شخصیت ہے۔

معزز حضرات! آج کی محفل میں ہم جن بزرگ کی پچھترویں سالگرہ منا رہے ہیں ذرا آپ ان کے ہاتھوں کی طرف غور سے دیکھیں اور بتائیں کہ کیا کبھی ان ہاتھوں نے ہتھیار اٹھائے ہوں گے ان کے قریبی جاننے والے کہتے ہیں کہ ان ہاتھوں نے ضرور ہتھیار اٹھائے تھے۔ پتہ نہیں کیوں اٹھائے تھے۔ میرے پاس ایک نہایت بوسیدہ اور پرانی گھڑی تھی۔ ایک بار وہ ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی۔ میں اسے ٹھیک کرانے کے لیے گھڑی ساز کے پاس گیا۔ گھڑی ساز نے پہلے تو اسے حقارت سے دیکھا اور پوچھا "کیا ہوا ہے اسے؟" میں نے کہا "یہ ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی تھی"۔ گھڑی ساز نے کہا "جب یہ زمین پر گر گئی تھی تو آپ نے اسے اٹھایا ہی کیوں۔ وہیں پڑی رہنے دیتے"۔ ایسی ہی بات ڈاکٹر گوڑ کے بارے میں ذہن میں آتی ہے کہ جب آپ کو ہتھیار ڈالنے ہی تھے تو انھیں اٹھانے کی زحمت ہی کیوں کی تھی۔ پھر ذرا سوچیے کہ کیا ان ہاتھوں نے کبھی کسی پر گولی چلائی ہوگی۔ اور اگر چلائی بھی ہوگی تو کیا گولی نشانہ پر لگی ہوگی۔ آج ان

ہاتھوں کو دیکھ کر ان کہانیوں پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا جو ان ہاتھوں سے منسوب رہی ہیں۔ اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ بارہ برس پہلے جب مجھے جاپان جانے کا موقعہ ملا تو ڈاکٹر گوڑ کے تعلق سے میری غلط فہمیوں کا ازالہ ہو گیا۔ جاپانیوں کے ہاتھ بہت خوب صورت ہوتے ہیں میں ان کے ہاتھوں کو دیکھتا جاتا تھا اور گھنٹوں حیرت میں مبتلا رہتا تھا کہ کیا سچ مچ ان ہاتھوں نے دوسری جنگ عظیم میں گولیاں چلائی تھیں اور بم پھینکے تھے۔ اصل میں تاریخ مختلف ادوار میں ہاتھوں سے مختلف کام لیتی ہے اور ان کے کاموں کی نوعیت کو تبدیل کرتی رہتی ہے۔ چناں چہ تاریخ نے ڈاکٹر گوڑ کے ہاتھوں سے اب ہتھیار چھین لیے ہیں اور ان میں ایک قلم تھما دیا ہے کہ وہ اسے چلاتے رہیں۔ اس سے پہلے قدرت ان کے ہاتھوں میں اسٹیتھسکوپ تھمانا چاہتی تھی جسے پھینک کر انھوں نے ہتھیار اٹھا لیے تھے۔

مجھے اس وقت اپنے ایک دوست کی یاد آرہی ہے جو نہایت کم عمری میں کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ان کے ذمہ کام یہ تھا کہ راج بہادر گوڑ اور ان کے ساتھیوں کو ہتھیار فراہم کرتے رہیں۔ ایک بار یہ اسلحے جاتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ بعد میں پولس نے ایسی کڑی تفتیش کی کہ بیچارے کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس واقعہ کے کئی برس بعد انھیں علاج کے لیے سوویت یونین روانہ کیا گیا جہاں ان کی ریڑھ کی ہڈی کی مرمت کی گئی۔ وہ علاج سے مطمئن ہو کر خوش خوش واپس تو ہو گئے لیکن چند ہی برسوں میں خود سوویت یونین کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ان پچھتر برسوں میں نہ جانے کتنوں کی ریڑھ کی ہڈیاں ٹوٹیں لیکن ہمارے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی ریڑھ کی ہڈی اب بھی صحیح و سالم ہے۔ ورنہ ہمارے کتنے ہیرو اور کتنے محبوب تھے جن کا حشر نہ جانے کیا ہو گیا۔ ایک شعر یاد آ گیا۔

زمانہ کس قدر پامال کر دیتا ہے انساں کو
ہمارے دور کے محبوب پہچانے نہیں جاتے

اصل میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے لمحۂ موجود میں پوری شدت کے ساتھ جینے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔ ہم جیسے تو ابھی سے ساحل پر بیٹھ کر زندگی کے منجدھار کا تماشہ دیکھنے لگے ہیں۔ لیکن راج بہادر گوڑ ہیں کہ اب بھی اس منجدھار میں بہتے چلے جا رہے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہوئے پورے پچاس برس

بیت گئے۔ پچاس برس پہلے ان میں جو چیز دیکھی تھی وہ آج بھی ان کی ذات میں موجود محفوظ ہے اور اس شئے کو سیماب صفتی کہتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کے ایک لمحہ کو بھی ضائع نہیں ہونے دیتے نتیجہ میں ان کے مزاج میں بلا کی تیزی، چستی اور پھرتی نظر آتی ہے۔ جلد بازی اور عجلت ان کی شخصیت کی نمایاں خصوصیت ہے۔ مجھے یاد ہے پچھلے سال کے اواخر میں ایک دن صبح صبح چھ بجے میرے گھر کے آس پاس اچانک کسی کے پکارنے کی آوازیں آنے لگیں، میں نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تو محسوس ہوا کہ کوئی بڑی تیزی کے ساتھ میرے فلیٹ تک آنے کے لیے سیڑھیاں چڑھ رہا ہے۔ میرا مکان چوتھی منزل پر تھا۔ سیڑھیاں چڑھنے کی رفتار اور میرا نام پکارنے کی تکرار سے یوں لگتا تھا جیسے کوئی بھونچال سا آنے والا ہو۔ میں نے گھبرا کر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اپنی کزن مسز اودیش رانی کے ساتھ کھڑے ہیں۔ بولے "ابے مسخرے اتنی دیر تک سوتا ہے۔"

میں نے کہا "ایک زمانہ تک "سرخ سویرے" کے آنے کی امید میں بہت جلدی بیدار ہو جایا کرتا تھا۔ یہ تو نہیں آیا۔ اب جلدی جاگ کر کیا کروں گا۔"

یہ سن کر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ میں نے دیکھا کہ ان کی پیشانی پر ایک ہلکی سی چوٹ تھی جسے وہ بار بار سہلا رہے تھے۔ میں نے پوچھا "یہ کیا ہو گیا؟"

بولے "تمہارے گھر کے زینے کو تیزی سے طے کرنے کی کوشش میں میری پیشانی ریلنگ سے ٹکرا گئی اور کچھ نہیں۔"

میں نے کہا "آپ کو اتنی عجلت سے سیڑھیاں چڑھنے کی کیا ضرورت تھی۔"

بولے "ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔ اودیش رانی نے بالآخر شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ چنانچہ آج سے پانچ دن بعد ان کے دولہا میاں آنے والے ہیں۔ اور چھٹے دن ہر حالت میں ان کی شادی ہو جانی چاہیے۔ میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے شادی میں شرکت نہ کر سکوں گا۔ لہٰذا "کورٹ میرج" کے سارے امور تمہیں طے کرنے ہوں گے۔ کنیادان بھی تمہیں کرنا ہوگا۔

میں نے کہا "گوڑ بھائی! یہ تو سب ہو جائے گا۔ مگر آپ کو سیڑھیاں چڑھنے میں اتنی جلد بازی کا مظاہرہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یوں بھی اودیش رانی کی عمر اب پچاس برس کی ہو گئی ہے۔ جہاں اتنی تاخیر ہوئی ہے وہاں پانچ دس منٹ کی اور تاخیر ہو جاتی تو کیا فرق پڑتا۔"

ہنس کر بولے" پیارے! پچاس برس کی عمر ہو گئی ہے اسی لیے تو عجلت نہایت ضروری تھی ورنہ تیس بتیس برس کی عمر ہوتی تو مزید سال دو سال انتظار کرنے میں بھی کوئی قباحت نہیں تھی"
یہ کہہ کر وہ فوراً واپس جانے لگے ۔ میں نے انھیں بہت روکا کہ ناشتہ کر کے جائیں لیکن وہ بالکل نہیں رُکے ۔ جس تیزی سے آئے تھے اسی تیزی سے چلے بھی گئے ۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی ایک اور خرابی نما خوبی یہ ہے کہ یہ اپنے سے چھوٹوں کا بہت خیال رکھتے ہیں بلکہ اتنا خیال رکھتے ہیں کہ کچھ عرصہ بعد چھوٹے اپنے آپ کو ان سے بڑا سمجھنے کی غلطی کرنے لگ جاتے ہیں ۔ اور آپ جانتے ہیں کہ چھوٹے آدمی کا بڑا پن کتنا کھوکھلا ہوتا ہے ۔ یہ جب کسی کی ہمت افزائی کرتے ہیں تو زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں ۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۶۸ء میں جب میرے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ شائع ہوا تو ڈاکٹر گوڑ نے میری مزاح نگاری کے بارے میں ایک طویل اور جامع مقالہ لکھا ۔ میری مزاح نگاری کے بارے میں اس وقت تک کسی نے کچھ نہیں لکھا تھا ۔ مگر ان کا مضمون سن کر میں ہکا بکا سا رہ گیا کیوں کہ انھوں نے میری مزاح نگاری میں جو خوبیاں تلاش کی تھیں وہ خود مجھے نظر نہیں آ رہی تھیں ۔ چناں چہ جلسہ کے بعد میں نے ان سے شکایت کی کہ حضور آپ نے میری بہت زیادہ تعریف کر دی جس کا میں مستحق نہیں تھا ۔"

بولے" میاں! اس کو تعریف نہیں کہتے ۔ ہمت افزائی کہتے ہیں ہمت افزائی"

میں نے کہا" مگر مجھ میں اتنی ہمت افزائی کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے"

ہنس کر بولے" اپنی ذات میں تھوڑی سی خوش فہمی پیدا کر لو تو یہ ہمت بھی آ جائے گی"

چناں چہ ڈاکٹر گوڑ کا مضمون اب بھی میرے پاس محفوظ ہے جسے میں اکثر اوقات اپنے آپ میں خوش فہمی پیدا کرنے کے خیال سے پڑھ لیتا ہوں ۔ اور میری نااہلی دیکھیے کہ یہ خوش فہمی آج تک مجھ میں پیدا نہیں ہوئی ۔ یہ نہ سمجھیے کہ ڈاکٹر گوڑ نے میرے ساتھ یہ خصوصی سلوک کیا تھا ۔ پچھلے تین چار دہوں میں ڈاکٹر گوڑ نے سینکڑوں ادیبوں اور شاعروں کی ہمت افزائی کی ہے اور حتی المقدور انھیں خوش فہمی میں مبتلا کیا ہے ۔ ہر کوئی میری طرح نااہل تھوڑا ہی ہوتا ہے ۔

ڈاکٹر گوڑ کے بارے میں کہنے کو میرے پاس بہت سی باتیں ہیں ۔ لیکن اس وقت مجھے چند سال پہلے دسمبر کی ایک شام یاد آ رہی ہے ۔ حیدر آباد میں ایک دوست کی بیٹی کی شادی میں

ڈاکٹر گوڑ سے اچانک ملاقات ہوگئی۔ بابری مسجد کو گرے ہوئے سات آٹھ دن ہی بیتے تھے۔ ڈاکٹر گوڑ نے آتے ہی میزبان سے کہا "بھئی کھانا جلدی لگوادو۔ میں زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔"

میں نے کہا، "گوڑ بھائی! یہ آپ نے کب سے کھانے میں دلچسپی لینی شروع کردی۔"

بولے "نہیں! مجھے پرانے شہر میں ایک میٹنگ میں جانا ہے۔"

میں نے پوچھا "کوئی ادبی محفل ہے؟"

بولے "دیکھ نہیں رہے ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ اور تمھیں ادبی محفل کی سوجھ رہی ہے پرانے شہر میں ایک میٹنگ ہے بابری مسجد کے انہدام کے خلاف۔

میں نے کہا "گوڑ بھائی! بابری مسجد کے انہدام کے خلاف آپ کیا کہیں گے یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ لیکن یہ بتایئے کہ آج کے حالات میں کون آپ کی عقلمندی اور ہوشمندی کی باتیں سنے گا۔"

غصہ سے بولے "کسی کو، سننا ہو تو نہ سنے۔ مگر مجھے جو کہنا ہے وہ تو میں کہتا رہوں گا۔ اگر کوئی مجھے نہیں سننا چاہتا تو میں ہی اپنے آپ کو اپنی باتیں سناتا رہوں گا۔"

ایسے موڈ میں ان سے بحث کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ میں نے عافیت اسی میں جانی کہ اپنے حلوے مانڈے سے مطلب رکھوں۔

ڈاکٹر گوڑ نے آج سے پچاس پچپن برس پہلے جس عقیدہ اور مسلک کو اپنایا تھا اس پر آج تک اسی طرح قائم ہیں۔ انسان دوستی، محبت، پیار اور رواداری کا مسلک دنیا میں کیا نہیں ہوا۔ لیکن یہ بدستور اپنے مسلک کا دامن تھامے ہوئے ہیں۔ دامن بھلے ہی چاک ہوگیا ہو لیکن انھوں نے اپنے مسلک کو چاک نہیں ہونے دیا۔ کبھی کبھی ڈاکٹر گوڑ مجھے ایک ایسے عوامی رہنما نظر آتے ہیں جو انسانوں کی بھیڑ میں تنہا رہ گئے ہیں۔ ہجوم کی تنہائی کو جو لوگ محسوس کر سکتے ہیں وہ اس نکتہ کو بخوبی سمجھ پائیں گے۔ میں انھیں سچے، مخلص، بے لوث اور بے غرض رہنماؤں کی نسل کی آخری نشانی سمجھتا ہوں۔

اگر میں صاحب اقتدار ہوتا تو ایسے بچے کھچے رہنماؤں کی ایک سینکچوری **Sanctuary** بناتا تاکہ یہ یہاں محفوظ رہیں اور ہمارے موجودہ رہنما انھیں دیکھا کریں۔ کوئی سبق تو وہ خیر کیا

حاصل کر پائیں گے۔ مگر انھیں دیکھ لینے میں کیا قباحت ہے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ہندوستان کی پہلی پارلیمنٹ کے ممبر رہے۔ ایک سوال میں ڈاکٹر گوڑ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ آج کے حالات میں پھر پارلیمنٹ کے ممبر بننا پسند کریں گے؟ مجھے ڈر ہے کہ اگر کوئی انھیں پھر سے پارلیمنٹ میں بھیجنے کی کوشش کرے تو کہیں وہ پھر سے ہتھیار نہ اٹھالیں۔

میری دعا ہے کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ برسوں ہمارے درمیان رہیں اور ہماری ہمت افزائی کرتے رہیں۔ اور ہم میں وہ خوش فہمی پیدا کرتے رہیں۔ جس کے بغیر آج کے دور میں زندہ رہنا دشوار نظر آنے لگا ہے۔

پروفیسر قمر رئیس

ڈاکٹر گوڑ کی تنقیدی نگارشات

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی شخصیت کے بنیادی اوصاف کی تلاش کی جائے تو ان کی نظریاتی وفاداری، کثیر الجہت بصیرت، بذلہ سنجی اور ذکاوت، سدا بہار مستعدی اور بے کراں توانائی کو نمایاں جگہ دی جائے گی۔ وہ ہمیشہ اپنی ذات سے اور اپنے ماحول سے آمادۂ صلح رہتے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی سچ ہے کہ ان کی زندگی کا بڑا حصہ جدوجہد میں گزرا۔ لیکن چوں کہ یہ جدوجہد اپنی ذات کی فیض رسانی کے لیے نہیں تھی بلکہ اس کا مقصد انسانی حقوق کی بحالی اور ظلم واستحصال کی طاقتوں سے انسان کی نجات تھی۔ اس لیے اس طویل جدوجہد اور ڈھلتی ہوئی عمر کے باوجود ان کے مزاج میں کوئی تلخی، بیزاری اور بیگانگی پیدا نہیں ہوئی۔ باطنی ہم آہنگی اور آشتی کا یہی وہ احساس تھا جس نے انھیں شعروادب کی طرف متوجہ کیا۔ ٹریڈ یونین تحریک اور پارٹی کی ہمہ وقتی سرگرمیوں کے باوجود وہ بڑی محویت اور دلچسپی سے اردو ادب کا مطالعہ کرتے رہے۔

اردو زبان اور اس کے تہذیبی سرچشموں سے محبت ڈاکٹر گوڑ کی خاندانی وراثت کا ایک متحرک حصہ تھی۔ ان کی تعلیم کا ذریعہ بھی یہی زبان تھی۔ جو آزادی سے قبل ارض دکن کے اس خطہ میں ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کر رہی تھی۔ اس پر مستزاد مخدوم محی الدین، عابد علی خاں، ڈاکٹر حسینی شاہد اور زینت ساجدہ جیسے احباب کی رفاقت۔ جو انھیں انجمن ترقی اردو اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی تقریبوں، جلسوں اور سرگرمیوں میں کھینچ لائی تھی۔ اس طرح تواتر کے ساتھ ان کے ادبی ذوق کی تربیت ہوتی رہی اور کلاسیکی ادب کے ساتھ ساتھ ہم عصر ادب کے رجحانات اور مسائل سے ان کی واقفیت گہری ہوتی گئی۔

ڈاکٹر گوڑ کی ذہنی اور ادبی تربیت کا دور ترقی پسند تحریک کے عروج کا دور تھا۔ دوسری قومی زبانوں کی طرح اردو میں بھی یہ تحریک شعروادب کی ہر صنف اور ہر حلقہ میں اپنا سکہ جمارہی تھی۔ برطانوی سامراج اور جاگیرداری کے شکنجہ سے آزادی کی جدوجہد میں یہ تحریک عوام کو ایک نیا حوصلہ بخش رہی تھی۔ اس زمانہ میں سوویت نظریہ ساز Zhadanov کے سوشلسٹ رئیلزم کے تصور نے بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل کی جس کے تحت شعروادب کی تخلیق کو طبقاتی پیکار اور اشتراکی نظام کو تعمیر کی جدوجہد سے مربوط کردیا گیا تھا۔ اردو میں بھی کچھ ادیب اور نقاد اس نظریہ کے حامی تھے۔ اس کے نتیجہ میں ادب میں مارکسی نظریات کو متشدد اور میکانکی ڈھنگ سے نافذ کرنے کی روش بھی پیدا ہو چلی تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر گوڑ کی تحریروں میں مارکسی نظریات کا اطلاق میکانکی تفہیم اور انتہا پسندانہ تعبیر کے ساتھ کہیں نظر نہیں آتا۔ اس متوازن رویے کا ایک سبب شاید یہ ہو کہ انھوں نے کلاسیکی اردو شاعری کا مطالعہ بھی بڑے انہماک اور شوق سے کیا ہے اور کلاسیکی شعری روایت سے وہ کماحقہ، مانوس تھے۔ اس سلسلہ میں مرزا غالب، میر انیس اور جلیل مانک پوری جیسے کلاسیکی مزاج کے شعرا پر ان کے مضامین کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مارکسی فکر نے انھیں معروضی تجزیہ اور علمی استدلال کی جو روشنی دی تھی اور ادبی فن پاروں کو سماجی تہذیبی اور تاریخی حقائق کے ہمہ گیر پس منظر میں سمجھنے کا جو شعور بخشا تھا اس سے وہ دست بردار ہو گئے۔ اس کے برعکس اس شعور و آگہی نے ان کے مضامین کو تاثراتی رائے زنی کی سطح سے بلند کر کے علمی وزن و وقار عطا کیا۔

ڈاکٹر گوڑ کے مضامین اور تنقیدی تبصروں پر مشتمل اب تک تین مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ یعنی "ادبی مطالعے"، "ادبی جائزے" اور "ادبی تناظر"۔ ان کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اولاً وہ مضامین جو کلاسیکی شعرا کے بارے میں ہیں۔ دوئم وہ مضامین جن کا موضوع ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات ہیں اور سوئم ایسے مضامین جن میں انھوں نے زبان اور ادب کے نظریاتی مسائل سے بحث کی ہے۔

ایک مضمون میں ڈاکٹر گوڑ نے میر انیس کی شاعری کا ایک نئے زاویہ سے مطالعہ کرتے ہوئے اس کی سماجی غایت پر روشنی ڈالی ہے لیکن اس سے اہم مقالہ وہ ہے جس میں انھوں نے اردو اور

تیلگو شعر وادب پر واقعات کربلا کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے روایات سے ہٹ کر تاریخی شواہد کے حوالے سے بتایا ہے کہ دکن کی ابتدائی شاعری سے لے کر عہد حاضر تک کس طرح حضرت امام حسینؑ اور ان کے اعزا اور رفقا کی شہادت نے تخلیق کاروں کے فکر و تخیل کو متاثر کیا ہے۔

انھوں نے تاریخی عوامل کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اورنگ زیب کے ہاتھوں اپنے محبوب بادشاہ ابوالحسن کی شکست کے بعد دکن کے شاعروں نے اپنے غم واندوہ کے اظہار کے لیے مرثیہ کا سہارا لیا۔ اور بہت سے سنّی المسلک شعرا بھی مرثیہ گوئی میں منہمک ہو گئے اسی طرح انھوں نے شواہد سے بتایا ہے کہ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی مداخلت اور ریشہ دوانیوں کے نتیجہ میں اودھ کی حکومت کے زوال نے وہاں عزاداری اور مرثیہ گوئی کو فروغ دیا۔ وہ مرثیوں کو تہذیبی اور عوامی معنویت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"انیس کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے مرثیہ کے مضامین کو اتنی وسعت دی اور اس میں ایسی آفاقیت پیدا کی کہ وہ ایک مخصوص مذہبی دائرے سے نکل کر ہر مذہب اور ہر مسلک کے لوگوں کے دلوں کو گرمانے اور ان کو دعوت فکر ونظر دینے لگا اور یہی حق و باطل کے درمیان کربلا کے عظیم معرکے کا تقاضہ تھا۔"

ادبی مطالعہ ص ۱۲۵

"مذہبی ملاؤں کے داؤں پیچ چا ہے جو ہوں عوام تو اس میں اپنی روحانی تسکین اور تہذیبی آسودگی کی راہیں نکال لیتے ہیں۔ اس طرح واقعات کربلا میں ہندوستان کے عوام نے حق کے لیے قربانی کی عظیم مثال دیکھی اور اس سے اپنی تہذیبی تخلیقیت کو نئی آب وتاب دی۔" ص ۱۳۵

اپنے مضمون "غالب اور جدید ذہن" میں ڈاکٹر گوڑ ان عوامل اور ان عناصر کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں جو مرزا غالب کو جدید احساس وآگہی اور دانش وفکر کا پیش رو بناتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"غالب ناموافق اور ناساعد حالات دہر سے مفاہمت کے لیے تیار نہیں۔ ان کا انھیں غم ضرور ہے لیکن غم انھیں ترک دنیا کی طرف نہیں لے جاتا۔ زندگی سے مایوس نہیں کرتا بلکہ "اچھے حالات" کے تصورات ان کے لیے نشاط کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

ان کے پاس 'غمِ موجود' کے علاوہ نشاطِ آرزو بھی ہے اور یہی غالب کو جدید ذہن سے ہم آہنگ کرتا ہے۔" ادبی تناظر ص۳۶

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر گوڑ کے تنقیدی روّیے کی کچھ اصولی بنیادیں ہیں۔ جن کا اطلاق وہ قدیم کلاسیکی اور معاصر دونوں زمانوں کے تخلیق کاروں پر یکساں قدرت سے کرتے ہیں۔ وہ فن کار کے ذہنی، جذباتی اور تخلیقی روّیوں میں ایسے اوصاف وعناصر تلاش کرتے ہیں۔ جو انسانیت کی نجات کے اعلیٰ آدرشوں سے ہم آہنگ ہوں۔

معاصرین میں یوں تو انھوں نے ان گنت شاعروں اور ادیبوں کے کارناموں کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے۔ ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، سجاد ظہیر، نیاز حیدر اور ظفر گورکھپوری شامل ہیں۔ لیکن اس سلسلہ کے سب سے اہم مضامین شاید وہ ہیں جو انھوں نے مختلف موقعوں پر مخدوم محی الدین کے بارے میں لکھے ہیں۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ انھوں نے مخدوم کو زندگی کے ہر دور میں بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اپنے ان مضامین میں ڈاکٹر گوڑ نے مخدوم کا عہد، ان کی زندگی ان کی جدوجہد اور ان کی شاعری میں ایک سلسلۂ ارتباط وعمل تلاش کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دس بارہ سال پہلے کے لکھے ہوئے ان مضامین میں انھوں نے کمیونسٹ پارٹی اور بعض افراد کی افسوسناک کمزوریوں کو بے نقاب کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ اس طرح بڑی جرأت اور دیانت سے انھوں نے مخدوم کے اس کردار کو ابھارا جس کی شفاف پرچھائیاں ان کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ صرف ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"۱۹۵۰ء کے اواخر اور ۵۱ء کے اوائل میں پارٹی کے اندر پالیسی کے تعلق سے سخت بحث چھڑ گئی تھی۔ مخدوم تو پہلے فروری ۴۸ء کی پارٹی کانگرس کی لائین اور بی۔ ٹی۔ رندیوے کی تاویلات سے بالکلیہ اتفاق کرتے تھے ۵۰ء کے وسط سے یہ سوچنے لگے کہ پالیسی میں تبدیلی کی ضرورت ہے اور پھر تلنگانہ میں ہتھیار بند جدوجہد جاری رکھنے پر بھی شبہ کا اظہار کرنے لگے۔ چناں چہ اس بنا پر اس زمانہ کی پارٹی قیادت نے مخدوم کو نظر انداز کرنا شروع کیا اور یہ پارٹی کا وطیرہ سا بن گیا تھا کہ جو بھی پالیسی کے صحیح ہونے پر شبہ کا اظہار کرتا خود اس پر شبہ کیا جانے لگتا۔ اور اسے الگ

کردیا جاتا۔ اس زد میں مخدوم بھی آ گئے۔ اور یہ مخدوم کے لیے سخت کرب اور آزمائش کا دور تھا۔ اسی زمانہ میں ۴ ۲ اپریل ۱۹۵۱ء کو میں راج کونڈہ کی پہاڑیوں میں گرفتار ہوا۔ اور کچھ ہی دنوں بعد مخدوم حیدرآباد میں گرفتار کر لئے گئے۔ یہ بھی یوں ہوا کہ ایک صاحب نے جو پولس ایکشن کے بعد رضا کار دور کے اپنے کرتوتوں کی بنا پر پولس کے عہدے سے معطل کر دئے گئے تھے۔ اپنی بازماموری کے لیے حکومت کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ہی مخدوم کو گرفتار کروایا۔ لیکن ان کی اس غداری کا ان کی بیوی پر اتنا اثر ہوا کہ وہ بیمار ہوگئیں اور پھر جانبر نہ ہو سکیں۔ مخدوم کا نام لیتے ہوئے مر گئیں۔"

ادبی مطالعے ص۵۷

ان مضامین کی اہمیت کے کئی پہلو ہیں۔ گزشتہ پچاس سال میں آندھرا پردیش کے محنت کش عوام نے جو سیاسی اور انقلابی لڑائیاں لڑی ہیں مخدوم اور ڈاکٹر گوڑ نہ صرف اُن میں برابر کے شریک رہے ہیں بلکہ اکثر موقعوں پر رہنمائی بھی کی ہے۔ روپوشی اور قید و بند میں بھی دونوں اکثر ساتھ رہے۔ ان مضامین میں اس جدوجہد کی دلچسپ اور مستند تفصیلات ملتی ہیں۔ پھر یہ کہ اس عہد میں مخدوم کا تخلیقی سفر بھی جاری رہا۔ ان مضامین میں مخدوم کی بے شمار نظموں کے محرکات اور ماخذوں کا پتہ بھی چلتا ہے مثلاً حویلی، قید، آخر شب۔ اور چارہ گر جیسی نظمیں۔ صرف یہی نہیں ڈاکٹر گوڑ ان نظموں کے ایسے علامتی مفاہیم کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کی طرف عام قاری کا ذہن مشکل سے جاتا ہے۔ مثلاً 'چارہ گر' کے درج ذیل مصرعے نقل کر کے وہ لکھتے ہیں۔

یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے۔

"یہاں وہ کمیونسٹ رہنماؤں کے اس قبیلے پر چوٹ کرتے ہیں جن کو اپنی ہمہ دانی پر ناز ہے۔ اور جو سمجھتے ہیں کہ ہر مسئلے کا حل ان کے پاس موجود ہے۔"

ادبی تناظر ص۹۲

رسمی اوزاروں کے بجائے ایک سلجھے ہوئے قاری کی سوجھ بوجھ سے کام لیا۔ مثال کے طور پر اپنے مضمون "جمالیاتی حسن" میں وہ اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ جمالیاتی مسرت کا سرچشمہ وہ ترتیب و آہنگ ہے جو زندگی میں قدرت کے نظام میں یا فن و ادب میں ہمیں نظر آتا ہے۔ وہ حسن و جمال کی سماجی افادیت کو بیان کرنے کے لیے بوجھل مارکسی اصطلاحات کا سہارا نہیں لیتے۔ اسے ایک دوسرے سادہ اور عام فہم انداز سے بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ محنت اور اس کے مقصود سے انسان کا جذباتی لگاؤ اس کے وجود میں ایک خاص دل بستگی پیدا کر دیتا ہے۔ محنت کرنے والا ایک چیز تیار کرتا ہے۔ اس کی افادیت اور اس کی متناسب بناوٹ دونوں ہی اسے حسین بناتی ہیں۔ لوگ بھی اسے دیکھ کر خوش ہوتے اور بنانے والے کی محنت کی داد دیتے ہیں بس یہی وہ وصف ہے۔ جو محنت کرنے والے اور محنت کے موضوع کے درمیان جذباتی لگاؤ پیدا کرتا ہے۔ یہی لگن اور لگاؤ جمالیاتی انبساط کا داخلی سرچشمہ ہے۔

اپنے مضمون 'ادب اور تصوف' میں وہ متصوفانہ شعر و ادب کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے ملک کی عوامی اور مزاحمتی تحریکوں سے اس کا رشتہ جوڑتے ہیں۔ مثالوں کے ساتھ وہ بتاتے ہیں کہ اس تحریک نے ایک طرف ایک رابطہ کی عوامی زبان کو فروغ دیا تو دوسری طرف مختلف مذہبی اور نسلی گروہوں کے درمیان اتحاد و یک جہتی کے تصور کی آبیاری کی۔ ڈاکٹر گوڑ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔

> "اسلامی وحدانیت کی تعلیمات پر ہندو ویدانت کا پانی چڑھا کر صوفیوں اور بھگتوں نے ایک زبردست فکری لہر دوڑا دی جس نے تصوراتی اور عملی دونوں سطحوں پر عوامی اتحاد اور قومی یک جہتی کو بڑھاوا دیا۔ صوفیوں اور صوفیانہ ادب کے اس کارنامے کو ہندوستانی قومی یک جہتی کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔"
>
> ادبی مطالعہ ص ۱۹۷

ایک دوسرے مضمون میں ڈاکٹر گوڑ نے جدیدیت کی تعریف متعین کرتے ہوئے حقیقت پسندی کی روایت سے اس کی آویزش پر سوالیہ نشان لگایا ہے۔ جدیدیت کے بعض حامیوں کی طرح وہ یہ مان کر چلتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ تہذیب بحران کا شکار ہے۔ اس کے عہد عروج کی قدریں

اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر گوڑ نے بجا طور پر مخدوم کو محنت اور محبت کے نمائندہ شاعر کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اور دلائل سے بتایا ہے کہ مخدوم کی سیاسی اور شاعرانہ شخصیت کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ عوام کی انقلابی جدوجہد میں شرکت اسے مرد آہن بناتی ہے۔ لیکن خلوت میں انسان کی غریبی، غلامی اور غم و اندوہ کے بارے میں سوچ کر اس کا دل موم ہو جاتا ہے۔ یہی جذبہ انسان دوستی کے غنائی نغموں میں ڈھل جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"مخدوم نے محنت اور محبت دونوں ہی کو محروم اور مجبور دیکھا ہے۔ دونوں ہی کو مصروفِ جہاد دیکھا ہے۔ اس لیے وہ دونوں ہی کی جیت اور کامرانی کی دعا کرتے ہیں۔ یہی مخدوم کی شاعری کا مرکزی خیال ہے۔ مخدوم کے ہاں پرچم عشق اور علم بغاوت ایک دوسرے میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ وہ قلم کو تلوار اور تلوار کو قلم میں تبدیل کر دینے کے ہنر سے واقف ہیں۔ اسی لیے ان کے ہاں انقلابی مزدور تحریک کی مصروفیتیں اور شعری تخلیق کی خلوتیں ایک دوسرے سے ستیزہ کار نہیں بلکہ ایک دوسرے کی شریک کار ہیں۔" ادبی مطالعہ ص ۹۱

مخدوم کے علاوہ دوسرے معاصرین پر لکھے ہوئے مضامین بھی سرسری نہیں ہیں۔ یہاں بھی ڈاکٹر گوڑ کے تنقیدی رویئے میں علمی تلاش و جستجو کا رجحان حاوی نظر آتا ہے۔ وہ تخلیق کی اندرونی صداقتوں کو معروضی سچائیوں کے تناظر میں دریافت کرتے ہیں۔ اس طرح کہ قاری ان کے حکیمانہ لیکن شگفتہ استدلال کے ساتھ بہہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مولانا آزاد، اکبر الہ آبادی، سروجنی نائیڈو کے بارے میں ان کے مضامین۔

ڈاکٹر گوڑ نے اگرچہ نظریاتی مضامین کم لکھے ہیں لیکن جو چند مضامین ان کے مجموعوں میں شامل ہیں۔ وہ فن و ادب کے حوالے سے ان کے پاکیزہ اور متوازن ادبی ذوق کی نشاندہی کرتے ہیں یہاں بھی انھوں نے بعض دوسرے مارکسی نقادوں کی طرح کوئی میکانکی رویہ نہیں اپنایا اور نہ ہی ایسی فلسفیانہ موشگافیاں کی ہیں۔ جو عام قاری کی فہم سے ماورا ہوں۔ حالاں کہ مارکسزم کا مطالعہ انھوں نے جس دقتِ نظر سے کیا ہے وہ بجا طور پر اس کی صلاحیت رکھتے تھے کہ جدلیاتی یا تاریخی مادیت کے حوالے سے فن و ادب کے سرچشموں کا سراغ لگائیں لیکن انھوں نے نقاد کے

شکست و ریخت کے عمل سے گزر رہی ہیں۔ نتیجہ میں حساس فنکار بے یقینی پراگندگی، خوف، سراسیمگی تنہائی اور بیگانگی کے روحانی کرب سے گزر رہا ہے۔ لیکن یہ کل حقیقت تو نہیں ہے۔ اگر ایک تہذیب مر رہی ہے تو ایک نئی تہذیب ابھر بھی رہی ہے۔ شکست آرزو اور محرومیوں کے ساتھ ساتھ خواہشوں کی تکمیل کے نئے امکانات بھی جنم لے رہے ہیں۔ وہ وجودی فلسفہ پر بھی کڑی تنقید کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ماضی پرستی اور موت کا ہمہ گیر احساس، زندگی کے حسن اور حرکت کے شعور سے محروم کر دیتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

> اگر ہمارے ذہن پر ماضی مسلط رہے اور حال پر اس کے مہیب سائے پڑتے رہیں تو مستقبل نظروں سے اوجھل رہے گا۔ ناآسودگی چھائی رہے گی اور ممکن الحصول کی کشمکش بے سود معلوم ہوگی۔ یہیں سے بیزاری، یاس اور ناامیدی کا شدید غلبہ شروع ہوتا ہے اور وہ مرضیاتی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو فنکار کو تخلیقی فن کی امید افزا وادیوں سے دور کر دیتی ہے۔"
>
> (ادبی مطالعے ص ۲۰۸)

یہ مضمون سولہ سال قبل لکھا گیا تھا۔ اس دوران جدیدیت کی تحریک مسلسل روبہ زوال رہی۔ نئی پیڑھی کے ادیبوں نے جدیدیت کے توانا اور صالح عناصر سے استفادہ کرتے ہوئے معاصر زندگی کی سچائیوں سے آنکھیں چار کیں اور اس طرح ادب میں ایک نئی حقیقت پسندی اور ایک نئے جمالیاتی شعور نے فروغ پایا۔ جو توازن، ہم آہنگی اور دردمندی کے اس جذبہ سے معمور ہے جس کی طرف ڈاکٹر گوڑ نے اپنے مضامین میں اشارہ کیا ہے اور جو اُن کی عملی تنقید کی بنیاد ہے۔

مارکسی ادیبوں کے تنقیدی مضامین کی نثر اکثر بڑی بے کیف اور خشک ہوتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر گوڑ کی تحریروں میں وضاحت اور روانی کے ساتھ تازگی اور شگفتگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ان کے مطالعہ کی وسعت اور تجزیاتی قوت ان کے مضامین کو استناد عطا کرتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ اپنے ذاتی تجربہ اور ذاتی مشاہدہ کے بیان سے مضامین میں دلچسپی کے نئے عناصر پیدا کر دیتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اب جب کہ پارٹی میں ان کی عملی سرگرمیاں برائے نام رہ گئی ہیں وہ اپنے ادبی اور تنقیدی مشاغل کو زیادہ وقت دے سکیں گے۔

رفعت سروش

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ادبی تناظر کے آئینے میں ایک جائزہ

حیدرآباد۔ فرخندہ بنیاد۔ وہ شہر جس کی بنیاد قلی قطب شاہ کی محبت نے رکھی تھی۔ نظام تک آتے آتے ایک ایسا شہر بن گیا تھا جہاں اپنے وقت کا سب سے دولت مند شخص حکمراں تھا۔ وہ شہر تھا والی ریاست کی شان و شکوہ کے ناروا اظہار کا۔ وہ شہر تھا نظام کے نوکرشاہی اور "نواز جنگوں" کے تمول اور ان کے خوشامدانہ مزاج کے فروغ کا۔ وہ شہر تھا جاگیرداریت کے عروج اور رعیت کے زوال کا۔ غریبوں کے استحصال اور مزدور پیشہ طبقہ کی بدحالی کی نمائش کا ——— وہ شہر تھا حساس دلوں میں جو ہر غیرت پیدا کرنے کا۔

ہندوستان میں برطانوی سامراج کی سانس اکھڑ چکی تھی۔ ملک میں عوامی تحریکیں مختلف پارٹیوں کی سرکردگی میں سر بلند کر رہی تھیں۔ مزدور اور کسان اپنا حق مانگ رہے تھے ——— مگر حیدرآباد ——— وہ نظام شاہی کے بوجھ تلے اس قدر دبا ہوا تھا کہ مزدوروں کو سر اٹھانے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔

۴۱ء سے ۴۶ء تک ادھر ادھر اضلاع میں چھوٹے پیمانے پر مزدوروں میں بیداری کی لہریں اٹھیں اور مزدوروں نے ہڑتالیں کیں ——— ہڑتال استحصال کرنے والی قوتوں کے خلاف مزدور کا پرامن ہتھیار رہے۔ اس سے حکومتوں کی بنیادیں ہل گئی ہیں ؂

گولہ بارود ایٹم بم فولاد و آہن ایک طرف
اور ہڑتال کا عزم راسخ ایک طرف

آخر نظام شاہی کے قلعے میں پہلی درار پڑی اور ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو آل حیدرآباد ٹریڈ یونین کانگریس کی بنیاد رکھی گئی ـــــ اس کے صدر مقرر ہوئے شعلہ نوا شاعر مخدوم محی الدین. جو اس وقت ۳۸ سال کے تھے اور جنرل سیکریٹری بنائے گئے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ـــــ ایک پر جوش نوجوان جن کی عمر اس وقت صرف ۲۸ سال تھی ـــــ ظاہر ہے اس وقت تک وہ عوامی تحریکوں میں جوش وخروش سے حصہ لے چکے تھے. اور ان کی فہم وفراست اور لیڈرانہ سوجھ بوجھ کا چرچا عام ہو چکا تھا۔

آج ہم اس باحوصلہ، باعمل، جوہر کامل اور پیکر علم وعمل کا پچھترواں جشن سالگرہ منا رہے ہیں. جس نے عمر عزیز کا بہترین حصہ ملک کی آزادی، عوام کی فلاح، عوامی تحریکوں کے استحکام اور کئی نسلوں کی تربیت میں گزارا اور ساتھ ہی علم وادب کے میدان میں بھی قابل قدر کارنامے انجام دیے. ڈاکٹر گوڑ آج ۷۵ سال کے ہو گئے ہیں. مگر ان کے عزم واستقلال، ہمت اور حوصلے میں کوئی کمی نہیں آئی ہے. وہ زندگی کے مختلف مورچوں پر کام کر رہے ہیں. اور اپنی باغ وبہار شخصیت سے ہر شعبۂ حیات میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دیتے ہیں ـــــ ان کے عمل کی جولان گاہ عوامی جلسے بھی ہیں اور پارلیمنٹ ہاؤس بھی. ٹریڈ یونین کی سرگرمیاں ہوں، یا انجمن ترقی پسند مصنفین اور انجمن ترقی اردو کے جلسے. وہ ہر جگہ فعال نظر آتے ہیں۔

وہ زندگی کو مارکسی شعور کی آنکھ سے دیکھنے کے عادی ہیں اس لیے ان کے مضامین گنجلک نہیں ہیں. فکری قلابازیاں نہیں ہیں. بلکہ ایک صاف اور واضح نقطۂ نظر ہے جو ان کی ہر تحریر میں نمایاں ہے ـــــ اپنی دیگر مصروفیات کے علاوہ انھوں نے اردو میں بھی کئی کتابیں لکھی ہیں. ان کا میدان تحقیق نہیں. زندگی کی تفہیم ہے. اور یہی تفہیمی رویہ ان کی زیر نظر کتاب 'ادبی تناظر' میں جلوہ گر ہے."ادبی تناظر" میں مختلف نوعیتوں کے ۱۹ مضامین ہیں. ان سب مضامین میں جو چیز مشترک ہے وہ ہے زندگی کی اعلیٰ اقدار پر یقین. بہتر زندگی کی تلاش اور نامساعد حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھنے کا جذبہ ـــــ ان مضامین سے لطف اندوز ہونے اور کچھ اخذ کرنے کے لیے انھیں اسی طرح پڑھنا ہوگا کہ یہ ایک مجاہد آزادی اور انقلابی شعور کے پروردہ شخص کے قلم سے نکلے ہیں. ان میں پیشہ ورانہ نقادوں جیسا رویہ نہیں ہے کہ بات چبا چبا

کر کی جائے۔ کہیں کمنٹ نہ کیا جائے اور ابہامی کیفیت کو برقرار رکھا جائے۔ گوڑ صاحب نے جو کچھ کہا ہے کھل کر کہا ہے۔

اس کتاب کا سب سے پہلا مضمون "سید سجاد ظہیر کی روشنائی" پر ہے۔ جو دراصل ترقی پسند تحریک کے پس منظر، اس کے پھیلاؤ اور اس کے نشیب و فراز سے عبارت ہے۔ اور جو کچھ "روشنائی" میں نہیں لکھا گیا اس کی طرف بھی گوڑ صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ اور دراصل یہی وہ حصہ ہے جہاں گوڑ صاحب کا صاف ذہن روشنی دکھاتا ہے۔ انھوں نے بجا طور پر کہا ہے۔

"ترقی پسند ادبی تحریک و تنظیم فخر کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ نئے لکھنے والوں کو جس قدر اس تحریک نے آگے بڑھایا ہے۔ اور لکھنے والوں کی ایک پوری پود کو کھڑا کر دیا ہے۔ ایسا ادبی تاریخ کے کسی دور میں نہیں ہوا اور وہ بھی دو دہوں کے انتہائی مختصر عرصے میں ـــــ لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد اس تحریک کو بہت سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہے۔ اور اس زمانے کا صحیح اور مستند محاسبہ ابھی تک شاید نہیں ہو سکا ہے۔"

اپنے اس مضمون میں گوڑ صاحب نے بہت صاف الفاظ میں کہا ہے کہ اب ترقی پسند تحریک کو کیا کرنا چاہئے ـــــ لکھتے ہیں:

"فرد کو پھر سے ذہنی طور پر سماج سے ہم آہنگ کرنا ہے۔ پھر فرد کو اس جھول انفرادیت سے آزاد کرنا ہے جو سماج سے کٹ جانے اور اجنبی بن جانے پر اس میں پیدا ہو گئی ہے۔ اور جس کا وہ آج اسیر ہے۔ فرد اپنے آپ کو بدلنا چاہتا ہے تو اسے سماج کو بدلنا ہوگا۔"

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا یہ مضمون ۱۹، جون ۱۹۷۸ء کا لکھا ہوا ہے اور آج جولائی ۱۹۹۳ء میں عالمی سیاست اور انسانی سماج کا وہ منظر نامہ نہیں ہے۔ جو اب سے پندرہ سال پہلے تھا۔ اس لیے گوڑ صاحب کے اس نظریہ پر کسی بحث کی ضرورت نہیں۔ ممکن ہے ان کی اپنی رائے بھی کسی قدر بدل گئی ہو۔ اس کتاب کی روح دراصل مخدوم والا مضمون ہے۔ عنوان ہے۔

مخدوم ایک پہلو دار شخصیت: حیدرآباد کی سیاسی تحریکات کا پس منظر:

اس میں شک نہیں کہ حیدرآباد اور مخدوم لازم و ملزوم ہیں اور خود راج بہادر گوڑ اس مثلث کا تیسرا ضلع ہیں، مخدوم کی زندگی، ان کے محرکات شاعری، ان کے سیاسی انہماک اور عوامی تحریکوں سے والہانہ وابستگی کو گوڑ صاحب نے نہایت خوبی سے واضح کیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خود گوڑ صاحب اس جدو جہد اور مخدوم کے ہم قدم رہے ہیں۔ چاہے ہڑتالیں ہوں، قید و بند کی صعوبتیں ہوں یا انڈر گراؤنڈ رہ کر کمیونسٹ پارٹی کے کام کرنے کی تفصیلات ــــــ "مخدوم فہمی" میں یہ مضمون کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی شاعری کے جو ادوار گوڑ صاحب نے مقرر کیے ہیں وہ بہت معنی خیز ہیں۔ بنگلہ شاعر قاضی نذرالاسلام سے متاثر مخدوم ـ

آگ ہوں، آگ ہوں، ہاں ایک دہکتی ہوئی آگ
آگ ہوں آگ۔۔ بس اب آگ لگانے دے مجھے

پھر گلی سڑی جاگیرداریت کی تمثیل۔ مخدوم کی نظم ـ "حویلی"

اک مسلسل کرب میں ڈوبے ہوئے سب بام و در
جس طرف دیکھو اندھیرا، جس طرف دیکھو کھنڈر

پھر ان کی نظم ـ "جہانِ نو" ــــــ اور پھر تلنگانہ تحریک۔

۱۷ ستمبر ۱۹۴۷ء کو مسلح جدوجہد شروع ہونے کے بعد وجے واڑہ میں ایک چھوٹا سا گاؤں پرٹیالا کو آزاد کرانا ــــــ اور "جمہوریہ پرٹیالا" کا جھنڈا مخدوم کے ہاتھوں لہرایا جانا ــــــ ایک جوش و خروش پیدا کرنے والا واقعہ ہے۔ پھر مخدوم اور جیل کی سلاخیں۔ اور ۵۲ء میں اس عوامی ہیرو کی جیل سے رہائی ـ زبردست عوامی استقبال۔ پارلیمانی الکشن ہارنا ـ مگر ضمنی الکشن میں کامیاب ہو کر اسمبلی میں پہنچنا ــــــ اور تہلکہ خیز تقریریں کرنا ــــــ یہ سب کچھ راج بہادر گوڑ نے بڑے موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ گوڑ صاحب نے ایک بہت اہم بات لکھی ہے کہ مخدوم نے ۵۳ء سے ۵۷ء تک ایک بھی شعر نہیں کہا۔ اور پھر میدان شاعری میں وارد ہوئے تو ہلکی پھلکی غزلیں لیکر ـ مخدوم کی شاعری میں یہ جمالیاتی موڑ ایک خاص ادبی اہمیت رکھتا ہے۔

گل ہیں قندیل حرم، گل ہیں کلیسا کے چراغ
سوئے پیمانہ بڑھے دستِ دعا آخر شب

گوڑ صاحب کے ساتھ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ مخدوم ہماری تاریخ میں اور ادب میں زندہ رہیں گے۔

راجندر سنگھ بیدی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے گوڑ صاحب نے بیدی کے فن کا خوب صورت تجزیہ کیا ہے۔ دراصل ان کا یہ تجزیہ نئی کہانی کا دستور قرار دیا جا سکتا ہے۔

پریم چند نئی کہانی کے رہنما ہیں، انھوں نے داستان کی تخیلی اڑان کی فضا سے کہانی کو زمین پر اتارا۔ اس سے دھرتی کی سوندھی خوشبو آنے لگی۔ دھرتی کے باسیوں کی معصوم لیکن ناآسودہ آرزوؤں کی تڑپ اور فرد اور سماج کی آویزش، افلاس کے کرب میں خوش حالی کے خواب، یہی کچھ تو نئی کہانی کا مواد ہے۔ کہانی نے داستان کے پھول پتوں کے جڑاؤ چمک دمک والے سہارے کو ترک کر دیا اور زبان میں بھی ارضیت اور اس کا روزمرہ آ گیا۔

کہانی کے اس سفر کا ایک عظیم رہنما راجندر سنگھ بیدی ہے۔ اس کے پاس بھی وہی فرد اور سماج کی آویزش ہے۔ لیکن انداز دھیما اور رکا تھما سا۔ کرشن چندر کی نہ گھن گرج ہے اور نہ ہی شاعرانہ تمکنت ـــــ راجندر سنگھ بیدی کے پاس ارضیت اور عصریت کے ساتھ وہ ڈرامائی خصوصیت بھی ملتی ہے۔ جس میں کردار ابھرتے ہیں اور پڑھنے والے پر اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے جلیل مانک پوری پر بھی ایک مضمون لکھا ہے۔ مگر اس میں داغ اور امیر مینائی زیادہ ہیں۔ اور جلیل بہت کم۔ گویا جلیلؔ کے پس منظر پر نظر زیادہ گئی ہے اور جلیلؔ سے ملاقات کم ہوتی ہے۔ ایک اشارہ کرتے ہوئے گزر گئے ہیں گوڑ صاحب۔

"جلیل درباروں میں رہے۔ شاہوں اور شہزادوں کو مشورۂ سخن دیتے رہے۔"

اگر گوڑ صاحب جلیل کی درباری داری اور شاہوں کی استادی سے کچھ پردہ اٹھاتے تو واقعی لطف کی بات ہوتی۔ معلوم تو ہوتا کہ شاہوں اور شہزادوں نے کیا سلوک کیا استاد کے ساتھ ـــ اور اس سے خود جلیلؔ کی افتادِ طبع پر روشنی پڑتی۔

سروجنی نائیڈو پر مضمون معلومات کا ذخیرہ ہے۔ کچھ بڑے لوگوں کے مشورے بہت دلچسپ ہیں ـــ گوپال کرشن گوکھلے نے ۱۹۰۶ء میں کلکتہ میں سروجنی کی انگریزی تقریر سنی تو کہا۔

"سروجنی کو سننا انتہائی اعلیٰ درجے کی ذہنی تفریح ہے۔"

گاندھی جی نے سروجنی نائیڈو کو مشورہ دیا تھا۔

"غریب تک غریب ہی کی سوچ کی مدد سے پہنچنے کی کوشش کرو۔"

اور خود سروجنی نائیڈو نے ۴۸ء میں گاندھی جی کے قتل کے بعد لکھنؤ سے جو تقریر نشر کی اس کی معنویت آج پہلے سے زیادہ ہے۔

"ہنجی سوگ کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ چھاتیاں پیٹنے اور بال نوچنے کے دن بھی اب نہیں رہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم کھڑے ہو کر ان لوگوں کو للکاریں جنھوں نے مہاتما گاندھی کی نافرمانی کی ہے۔"

اس کتاب میں مولانا ابوالکلام آزاد پر ایک مختصر سا مضمون ہے۔ جس میں ان کے پیام اتحاد کو سراہا گیا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر والے مضمون سے مولانا کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان کی تشکیل میں ان کی بہادر ماں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اور وہ خود ایک جیالے مجاہد آزادی اور بے باک صحافی تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی —— مگر خلافت تحریک پر گوڑ صاحب نے کھل کر نہیں لکھا۔ اس لیے یہ مضمون بہت تشنہ محسوس ہوا۔

خواجہ احمد عباس کو گوڑ صاحب نے مناسب خراج عقیدت پیش کیا ہے، عباس کی زندگی کا خاکہ، ان کی ہمہ جہت مصروفیات، ان کی صحافت، افسانہ نگاری اور ناول نگاری —— ہر چیز کا احاطہ کر لیا ہے اس مختصر مضمون میں اور یہی گوڑ صاحب کا کمال ہے۔

مرزا غالب پر گوڑ صاحب نے قلم اٹھایا ہے۔ مگر اس قلم میں دوسروں کی روشنائی زیادہ بھری ہے۔ دیگر کئی نقادوں کے مضامین کے اقتباسات سے یہ مضمون مزین ہے۔ بہر حال مطالعہ کا پہلو یہ ہے کہ غالب جدید ذہن کے مالک تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر لکھنا تو ہے غالب پر ع

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

گوڑ صاحب نے پروفیسر محمد مجیب کے ایک سوال کو دہرایا ہے۔

"آخر غالب پر سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی اصلاحی تحریکوں کا اثر

کیوں نہیں پڑا۔"

یہ سوال آج بھی جواب چاہتا ہے کیا اچھا ہوتا اگر گوڑ صاحب اس سوال کو ذہن میں رکھ کر غالب کا تجزیہ کرتے۔

۔۔۔۔ نئے لکھنے والوں پر لکھنا دراصل مستقبل کے درخشاں کرنے کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اس نکتہ سے واقف ہیں۔ وہ عام زندگی میں بھی نئی نسل کے ادیبوں اور شاعروں سے گھل مل کر بات کرتے ہیں۔ اس کتاب میں کئی نئے ناموں کو گوڑ صاحب نے اعتبار کی سند دی ہے۔ مثلاً حیدر آباد کے نقاد مجیب الرحمان۔ بمبئی کے مزدور طبقے کا شاعر ـــــ ظفر گورکھپوری۔ حیدرآباد کی نوجوان افسانہ نگار قمر جمالی، لکھنؤ کا شاعر۔ ڈاکٹر علی باقر زیدی ـــــ اس کے علاوہ ایک لاابالی ترقی پسند شاعر نیاز حیدر پر ان کا مضمون خاصے کی چیز ہے۔

نیاز حیدر بڑا جوشیلا شاعر تھا۔ ڈرامہ نگار تھا۔ اور ان سب چیزوں سے بڑھ کر وہ ایک رند مشرب شخص تھا۔ وہ خود پرست نہیں "خود شکن" تھا۔ اپنے آپ کو طرح طرح سے تباہ کرتا رہا مگر زندگی اس سے اپنا فن منواتی رہی اور وہ مختلف کیفیتوں میں لکھتا رہا ـــــ گوڑ صاحب کے مضمون سے یوں معلومات میں اضافہ ہوا۔

"۵۲-۱۹۵۱ء میں تو ہم نے نیاز حیدر کو اردو کی معیاری کتابوں کی گٹھری لیے، انھیں بیچتے دیکھا ہے۔"

اور یہ بھی کہ "پہلے اس کا تخلص ناکام تھا بعد میں اسے ترک کر دیا۔"

نیاز حیدر ایک سیماب پا شخص تھا۔ گوڑ صاحب نے بالکل صحیح کہا ہے کہ

"نیاز حیدر کی شخصیت اور شاعری کا ارتقا صدی کی پانچویں دہائی سے آٹھویں نویں دہائی تک برابر ہوتا رہا ہے۔"

میرا خیال ہے کہ نیاز حیدر کو اگر کام کرنے کی صحیح سمت ملتی تو وہ سماج اور ادب کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوتا۔ اس کی زندگی اردو شاعری کا ایک المیہ ہے۔ اور اس کا تخلص ناکام صحیح تھا۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے نیاز حیدر پر مضمون لکھ کر اس قرض کا بوجھ ہلکا کیا ہے جو اردو تنقید کے سر ہے ـــــ اتفاق سے کچھ ماہ پیشتر میں نے بھی نیاز حیدر پر ایک مضمون لکھا تھا۔ عنوان

ہے۔" تجھے ہم ولی سمجھتے ۔ ۔ ۔ ۔"

ظفر گورکھ پوری کو گوڑ صاحب نے اردو غزل کا معتبر شاعر کہا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ظفر کی غزلوں میں اس کی اپنی زندگی کا آہنگ ہے۔

"نئے ہندوستان میں ظفر نے گورکھ پور کی دیہاتی فضا کو چھوڑ کر روٹی کی خاطر بمبئی کا رخ کیا اور بمبئی ان کے لیے اتنی ہی خیرہ کر دینے والی ثابت ہوئی جتنا غالب کے لیے کلکتہ ثابت ہوا تھا۔ پھر بمبئی صنعتوں، مشینوں کا شہر تھا۔ یہاں انسان بھی مشین کا پرزہ بن گیا تھا، اب ظفر انسان نہیں اپنے آپ کو ملبہ محسوس کرنے لگے۔"

تو مرے جسم کا ملبہ کریگا کیا لے کر

کہ اپنی روح تو میں دے چکا مشینوں کو

اور پھر مشینوں سے ذرا فرصت ملی تو

ان مشینوں نے ذرا دیر جو چھٹی دی ہے　　　بے تحاشا میں ترے گھر کی طرف بھاگا ہوں

راج بہادر گوڑ کے مضمون کا یہ اقتباس ظفر گورکھ پوری کی زندگی اور فن کی جھلک پیش کرتا ہے۔ اور مزید مطالعے کی دعوت دیتا ہے۔

اجل کی قسط بھی دے کر چکا نہیں سکتی

جناب قرض بہت ہے حیات پر میرا

نو دمر ا زخم ہے یا تیرے بدن کا صندل

جانے کیا شب کو مہکتا ہے مرے کمرے میں

علی باقر زیدی کے مجموعہ کلام "شبِ درد" پر راج بہادر گوڑ نے قلم اٹھایا ہے۔ اس کی زندگی کا اجمالی خاکہ بھی اس مضمون میں مل جاتا ہے کہ اس شاعر نے ٹریڈ یونین کے پرچم تلے زندگی بسر کرنا سیکھا۔ ملازمتیں کیں اور چھوڑیں۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ اور شاعری بھی۔ گوڑ صاحب نے علی باقر کی ذاتی زندگی کی جھلکیاں دکھاتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"باقر نے شاعری کچھ دیر سے شروع کی۔ زندگی کا سارا کرب و طرب، ہنگاموں کا تجربہ، سماج کی کشمکش، آزادی اور پھر وہ بھی داغ دار۔ محنت کشوں کی بدحالی

اور خوش حالوں کی بدمستی، نظم و نسق کی معذوری اور عوام کی مجبوری ـــــ سبھی کچھ ان کے وسیع اور عمیق تجربے میں گھل مل گئے ہیں۔"

مختصر الفاظ میں یہ بھرپور تجزیہ ہے اور راج بہادر گوڑ کی مشاقی کی دلیل ہے ـــــ باقر کی غزلوں میں پرانا پن ہے ؎

حال پوچھا تھا ذرا مونس و ہمدم کی طرح
رخِ بیمار پہ جینے کی ادا لوٹ آئی
راز دل تم سے بتاتے ہوئے ڈر لگتا ہے
تم نے ٹوٹا ہوا آئینہ بھی دیکھا ہوگا

غزل کی بہ نسبت باقر کی نظمیں زیادہ فکر انگیز ہیں۔ گوڑ صاحب نے لکھا ہے کہ "عورت خدا کی عدالت میں" باقر کی بہترین نظم ہے۔ لیکن اس کے جو اقتباسات دیے ہیں وہ عورت کی مظلومیت پر عام نظموں جیسے ہی ہیں۔ دوسری نظموں میں بھی راست انداز بیان ہے ـــــ بہر حال ایک شاعر کا اضافہ ہوا۔

قمر جمالی حیدرآباد کی نئی افسانہ نگار ہے۔ اور اس نے نئی اور چونکا دینے والی کہانیاں لکھ کر حیدرآبادی افسانہ نگار خواتین کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ جن میں زینت ساجدہ، جیلانی بانو، واجدہ تبسم اور نجمہ نکہت جیسے نمایاں نام ہیں۔ گوڑ صاحب نے قمر جمالی کی زندگی کی جھلک پیش کی ہے۔ عسرت کی گود میں پلی ہوئی یہ لڑکی، درد کی انگلی پکڑے زندگی کے راستے پر ثابت قدمی سے چلتی ہوئی اور جد و جہد کے خارزار سے گزرتی ہوئی اب اس موڑ پر آئی ہے جہاں اس کا اپنا گھر ہے، شوہر ہے، بچے ہیں، ایک معقول ملازمت ہے۔ اور اس کا قلم کہانی کے لالہ زار میں نئے نئے پھول کھلا رہا ہے، اس کی کہانیوں میں اس کی زندگی ہزار زاویوں سے جھانکتی ہے۔ گوڑ صاحب نے قمر جمالی کے افسانوی مجموعے "شبیہ" پر لکھتے ہوئے اس کے کئی افسانوں کا تجزیہ کیا ہے۔ خود قمر کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے۔

"زندگی اس کا کل سرمایہ ہے اور وہ بھرپور زندگی گزارنے کی قائل ہے، وہ افلاس اور مجبوری کو دیکھ کر مضمحل ہو جاتی ہے۔"

اس ضمن میں انھوں نے قمر کی کہانی 'فاتح عالم' کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے۔

"قمر جمالی کے نزدیک درد انسان کی تکمیل کرتا ہے اور اس کے بغیر وہ مکمل نہیں ہوتا۔"

گوڑ صاحب نے مضمون کے آخر میں ایک دلچسپ بات لکھی ہے ــــ اور میرے نزدیک وہ بڑی شاعرانہ ہے۔

"قمر کی کہانیوں میں ایک بات اور جو قاری کے ذہن میں خلش پیدا کر دے گی وہ قمر کا بارش سے لگاؤ ہے۔ روشنی میں قحط کے بعد خوشگوار بارش ہوتی ہے۔ "فاتح عالم" میں زبردست بارش ملتی ہے، "چنگاری" میں اسلم بارش میں مینڈر کے گھر آتا ہے اسے لے جانے کے لیے ــــ قمر کا بارش سے اس لگاؤ کا راز کیا ہے۔ کہانیوں سے اس کا پتہ چلانا مشکل ہے۔"

میرے خیال میں یہ قمر کے شاعرانہ مزاج کی دلیل ہے۔ بارش جلتی ہوئی زمین پر آسمان سے رحمت کی طرح برستی ہے۔ بارش میں بھیگنا ذہن کے الجھاؤ اور تناؤ کو یک لخت ختم کر دیتا ہے، اور طبیعت میں روانی اور جولانی آجاتی ہے ــــ بارش زندگی کی بنجر زمین میں نئی روح پھونکتی ہے، اس کی پوشیدہ قوتوں کو بروئے کار لاتی ہے۔

عسرت اور تنگ دستی کی چٹخنی ہوئی زمین پر سکون اور خوش حالی کی بارش ہو تو دل توانا اور احساسات شاداب ہو جاتے ہیں ــــ قمر جمالی سے زیادہ بارش کی جمالیاتی کیفیت کو اور کون محسوس کر سکتا ہے۔ وہ "شبیہ" کی مقبولیت کے بعد "سبوچہ" بدست محفلِ ادب میں آئی ہیں، اور شہرت کی نئی بارشوں کو قمر کی تلاش ہے۔

حیدرآباد کے ایک پختہ عمر کے نثر نگار مجیب الرحمٰن۔ اپنے پہلے مجموعہ مضامین "ماورائے شعور" کے ساتھ اردو تنقید کے افق پر طلوع ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے جو مجیب الرحمٰن کو بہت پہلے سے جانتے ہیں ــــ اور اتنا جانتے ہیں کہ ان کے متعلق ضروری اطلاعات ایک عام قاری تک پہنچائی ہیں ــــ ان کے مجموعۂ مضامین کو کھنگالا ہے۔ شعور، لاشعور اور تحت الشعور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس طرف

اشارہ کیا ہے کہ مجیب الرحمٰن کے شعوری ارتقا میں کن عوامل کا حصہ ہے۔ اور اس سلسلے میں وہ مجیب الرحمٰن کے ایک مضمون سے ہی اقتباس پیش کرتے ہیں جو دراصل گوڑ صاحب کے ذہن کی بھی عکاسی کرتا ہے۔

"ادیب کی تخلیق کو سمجھنے کے لیے نقاد کو اس ماحول کو معلوم کرنا چاہیے جس سے مصنف کا خمیر اٹھا ہے۔ ان مضامین کی تہہ تک پہنچنے کے لیے سماجی رشتوں اور ان سے بڑھ کر ان آویزشوں کی تفہیم ضروری ہے جنھوں نے مصنف کی شخصیت کی تعمیر، اس کے ذہن کی تربیت اور اس کے شعور کی رفعتوں پر اثر ڈالا ہے۔"

مجیب الرحمٰن کی تحریر کا یہ ٹکڑا اس غیر معروف نقاد کو ان نام نہاد نقادوں کا حریف بنا دیتا ہے جو ہر تخلیقی فن پارے کو ایک ہی ترازو میں تولتے ہیں۔ دراصل اس میکانکی تنقیدی رویے نے ہی لفظ 'نقاد' کی ساکھ کو بگاڑ دیا ہے، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے مجیب الرحمان کی کتاب پر اس انداز سے لکھا ہے کہ وہ اپنے ذہنی شعور کے ساتھ پڑھنے والوں کے سامنے آجاتے ہیں۔

"آرٹ اور افواہ" کے حوالے سے گوڑ صاحب نے جو بات کمٹ منٹ کے بارے میں کہی ہے وہ آج کے دور میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

"بھیمڑی کانفرنس نے جس تنگ نظری کو ہوا دی اس سے ادب کو نقصان پہنچا اور انقلاب کو بھی کمٹ منٹ کے دائرے کو تنگ کر کے ادبی تخلیق پر پہرے بٹھا دیے اس کا منفی ردِ عمل تو وہ ہے جو ہر قسم کی آئیڈیالوجی سے نفرت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس سے ادب نے اپنی جمالیاتی شناخت و ساخت کھو دی۔ —— لیکن صحیح رویہ تو یہ ہے کہ عصری سماجی تقاضوں کے مطابق وسیع معنوں میں انسان دوستی کی قدروں سے وابستگی آج بھی تخلیق ادب کی روح ہے۔"

'ادبی تناظر' کے حوالے سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ جو بنیادی طور پر ایک ٹریڈ یونسٹ ہیں۔ اور اپنی تعلیم کے اعتبار سے ادویات کے ڈاکٹر —— ان کا اردو سے شغف۔ اور اس درجہ شغف کہ وہ گاہے گاہے اردو میں مضامین لکھتے رہے اور ان کے مضامین کے مجموعے چھپتے رہے۔ اردو زبان کے لیے خوش آیند بات ہے۔ بہ قول

سردار جعفری "مردہ سرد اعظان کا لج" ہی تنقید کو اپنی جاگیر کیوں بنائیں۔ تنقید کے لیے صرف تخلیق اور تخلیق کار سے ہی واقفیت ضروری نہیں ہے۔ بلکہ ان لوگوں سے بھی واقفیت ضروری ہے جن کے لیے تخلیق کار لکھتا ہے۔ (چاہے وہ یہ بات مانے یا نہ مانے) تخلیق کا رشتہ تخلیق کار سے ہوتا ہی ہے۔ مگر وہ رشتہ بے معنی ہے اگر تخلیق کو عام قاری قبول نہ کرے۔ اسی لیے تنقید لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ نقاد ادب کے قاری سے واقف ہو، عوام سے واقف ہو اور اسے یہ معلوم ہو کہ سماج آج کیا چاہتا ہے۔ اور انسانی برادری کے لیے آج کیسے ادب کی ضرورت ہے۔ اس نظر سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو تنقید کرنے اور تخلیق کار کی لغزشوں کی گرفت کرنے کا پورا حق ہے ــــ اس بکھراؤ کے دور میں زندگی کو ایک مرکز پر لانے کے لیے سماج کے مزاج شناسوں کی بے حد ضرورت ہے۔ اور بلاشبہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ سماج کے مزاج شناس ہیں۔

جواد رضوی

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ: مجاہد آزادی۔ محبِّ اردو

۲۱ جولائی ۱۹۹۳ء کو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ (۷۵) سال کے ہو گئے یعنی انھوں نے اپنی پلاٹینم جوبلی منالی۔ اور اس کو حسن اتفاق ہی کہا جائے گا کہ تقریباً ایک مہینہ پہلے حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی۔ جس کے راج بہادر بھی ایک مایہ ناز سپوت ہیں، کی پلاٹینم جوبلی تقاریب کا بھی آغاز ہوا۔
اس موقع پر اس امر کا اظہار بے محل نہ ہو گا کہ ہماری دوستی کی بھی گولڈن جوبلی پوری ہو گئی اس قافلہ کے دو اور ساتھی ڈاکٹر حسینی شاہد اور سری نواس لاہوٹی تھے جو اللہ کو پیارے ہو گئے۔
سات دہے کی ان کی زندگی میں پانچ دہے یعنی ان کی عمر کا دو تہائی حصہ تو ملک اور قوم کی خدمت کے نذر ہو گیا جس میں جیل کی زندگی کے تقریباً ڈیڑھ سال بھی شامل ہیں۔ یہ بھی ایک اتفاق کی بات ہے کہ راج بہادر اور میں ۲۹ نومبر ۱۹۴۶ء کو ایک ساتھ گرفتار ہوئے اور پانچ مہینے سے کچھ زیادہ عرصہ تک حیدرآباد سنٹرل جیل میں نظر بند رہے اور ۷ مئی ۴۷ء کو ہم دونوں کو دواخانہ عثمانیہ لایا گیا جہاں سے ہم فرار ہو گئے اور تقریباً چار سال روپوش Under Ground رہنے کے بعد ۲۳ اپریل ۱۹۵۱ء کو دوبارہ گرفتار ہوتے جب وہ ہاتھ میں بندوق اٹھائے راج کنڈہ (ضلع نلگنڈہ) کی پہاڑیوں میں ہتھیار بند لڑائی Armed Struggle میں حصہ لینے کے ارادہ سے جا رہے تھے۔

۱۹۵۲ء میں جب وہ حیدرآباد سنٹرل جیل میں تھے تو ڈاکٹر رادھا کرشنن جو اس وقت نائب صدر جمہوریہ ہند اور صدر نشین راجیہ سبھا تھے۔ کی موثر مداخلت کی بنا پر انھیں جیل سے فوری رہا کر دیا گیا اور انھوں نے راجیہ سبھا کی کرسی سنبھال لی۔ جس پر وہ دس سال تک براجمان رہے۔ میں سمجھتا ہوں

کہ یہ ان کی زندگی میں بہت اہم موڑ Turning Point تھا جس کے بعد وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں مسلسل ترقی کے منازل طے کرتے رہے اور شاید ہی کبھی تنزل اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ دکھ درد کی کچھ گھڑیاں تو ہر ایک کی زندگی میں آتی رہتی ہیں۔

۲۱ر جولائی ۱۹۱۸ء کو۔ جب پہلی عالمی جنگ ختم ہو رہی تھی اور اس کی تباہ کاریوں کے بطن سے ایک نیا نظامِ حیات اور غیر طبقاتی سماج جنم لے رہا تھا۔ راج بہادر شہر حیدرآباد کے ایک قدیم اور بچھڑے ہوئے محلہ گولی پورہ میں جنم لے رہے تھے۔ اور جب ہوش سنبھالا تو اسی سوشلسٹ سماج کے آدرشوں کو پروان چڑھانے ساری عمر جدوجہد کرتے رہے۔

رائے محبوب رائے اور شریمتی امراوتی گوڑ کے اس بڑے فرزند نے متوسط طبقہ کے ایک کائستھ گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ اپنی زندگی کے ابتدائی دو دہوں میں مفید الانام، دھرونت، رفاہ عام اور شاہ علی بنڈہ کے مدارس میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ چادرگھاٹ ہائی اسکول سے ۱۹۳۶ء میں میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ جامعہ عثمانیہ سے دو سال میں انٹرمیڈیٹ کی تکمیل کی اور جب دوسری عالمی جنگ شروع ہونے والی تھی تو میڈیکل کالج میں داخلہ لیا اور ستمبر ۱۹۴۳ء میں ایم۔ بی۔ بی ایس کی ڈگری حاصل کرلی اور برائے نام ڈاکٹر تو کہلانے لگے لیکن نہ کبھی کسی مریض کی نبض دیکھی، نہ کوئی نسخہ لکھا اور نہ کبھی Stethescop کا استعمال کیا۔

آیئے اب ذرا ان کے حسب نسب پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔ راج بہادر کا آبائی وطن کشن پور ہے۔ جو گوسائی گنج تحصیل اور ضلع فیض آباد کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہ امراؤ جان ادا کا وہی فیض آباد ہے۔ جو حال ہی میں فرقہ واریت کے ایک شرمناک واقعہ کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہوا۔ ان کے حقیقی دادا شری ہری پرشاد گوڑ اپنے دو بھائیوں کے ساتھ انیسویں صدی کے پچھلے دہے میں یعنی ۱۸۵۷ء کی فوجی بغاوت کے کچھ ہی برسوں بعد حیدرآباد آکر بس گئے۔ ایک اور بھائی کامتا پرشاد نے اپنا آبائی وطن نہیں چھوڑا۔ ان کی اولاد اب بھی وہیں سکونت پذیر ہے۔

ان کی ابتدائی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو ہم یہ محسوس کریں گے کہ ان کی شخصیت میں ابتدا ہی سے دو نمایاں دھارے تقریباً ایک ساتھ ابھرتے نظر آتے ہیں۔ ایک ادبی اور دوسرا سیاسی۔ اسکول کے زمانہ میں وہ اردو کے استاد صدق جائسی سے متاثر ہوئے اور ان ہی کی بدولت راج میں

شعر و شاعری سے دلچسپی اور سخن فہمی کے شعور کی ابتدا ہوئی۔ پھر انھوں نے نیاز فتح پوری کا "نگار" پابندی سے پڑھنا شروع کیا جس کی وجہ سے ان میں حقیقت پسندی اور ترقی پسند خیالات پرورش پانا شروع ہوئے۔ اسی زمانے میں ایم۔ین۔ رائے کی انقلابی تحریروں، اشوک مہتا کے رسالہ "کانگریس سوشلسٹ" اور الہ آباد سوشلسٹ بک کلب کی جانب سے شائع کی جانے والی کتابوں کے گہرے مطالعے نے ان میں سوشلسٹ اور مارکسسٹ خیالات کی تخم ریزی کی۔ ایک اور واقعہ ان کے سیاسی رجحان کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق غالباً ۱۹۳۸ء میں انھوں نے گاندھی جی کے فلسفۂ عدمِ تشدد پر مضمون لکھا جس میں اس فلسفے کی کامیابی پر اپنے شک و شبہ کا اظہار کیا تھا۔ قاضی عبدالغفار صاحب مدیر روزنامہ "پیام" نے یہ مضمون "کس طرح اور کیوں کر" کے زیرِ عنوان اپنے اخبار میں شائع کیا جس سے ان کی بڑی ہمت افزائی ہوئی۔ ان کے ادبی ذوق کو بڑھاوا دینے اور جلا پیدا کرنے میں ان کے چچا محبوب نارائن گوڑ کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔

جب وہ میڈیکل کالج میں زیرِ تعلیم تھے تو ۱۹۴۱ء میں وہ نہ صرف کالج یونین کے نائب صدر چنے گئے بلکہ کالج میگزین کے اڈیٹر بھی بنائے گئے۔ اسی بتدریج ابھرتے ہوئے ادبی ذوق نے ان کے اندر چھپے ہوئے ادیب کو بیدار کر دیا اور اب تو ان کے ادبی اور تنقیدی مضامین پر مشتمل تین جلدیں۔ "ادبی مطالعے، ادبی جائزے اور ادبی مناظر" شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ انگریزی میں بھی انھوں نے اس دور کے سیاسی حالات اور مسائل پر کئی پمفلٹ لکھے جن میں قابلِ ذکر یہ ہیں۔ "حیدرآباد پر ترنگا جھنڈا لہرائے گا" Tricolour shall fly over Hyderabad. مخدوم اور تلنگانہ کی انقلابی تحریک کے بارے میں ایک طویل اور مبسوط مضمون لکھا جو دوسرے مضامین کے ساتھ کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ لکھنے، پڑھنے اور کتابوں سے ان کی گہری دلچسپی کا اظہار اس ریڈنگ روم سے بھی ہوتا ہے۔ جو انھوں نے ۱۹۳۴ء میں اپنے گھر پر شروع کیا تھا اور یہی دلچسپی رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ اور آج سینکڑوں اردو اور انگریزی کتابوں اور رسائل پر مشتمل ایک اچھی خاصی لائبریری ان کے گھر کی رونق بنی ہوئی ہے۔

بیسویں صدی کے تیسرے دہے کے آخری پانچ چھ سال ریاست حیدرآباد میں سیاسی اور سماجی ہل چل کا زمانہ رہا ہے۔ آریہ سماج، گنیش اُتسو، اسٹیٹ کانگریس اور وندے ماترم تحریکات

ابھر رہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ راج بہادر جیسا حساس نوجوان ان تحریکوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ ۱۹۳۹ء میں کمیونسٹ پارٹی اور ۱۹۴۰ء میں کامریڈز ایسوسی ایشن میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ ایک سرگرم اور اہم لیڈر بن گئے۔ لگ بھگ ان ہی دنوں مخدوم، عالم خوندمیری، غلام حیدر، میں اور کئی دوسرے ساتھی بھی ان تحریکوں سے وابستہ ہوگئے۔ تقریباً اسی زمانہ میں مزدور تحریک کی جانب ان کا جھکاؤ بڑھنے لگا اور کچھ ہی عرصہ میں وہ ریاست حیدرآباد کی مختلف ٹریڈ یونینوں سے وابستہ ہوگئے۔ غرض یہ کہ بیسویں صدی کے چوتھے دہے میں حیدرآباد میں جتنی بھی جمہوری اور ترقی پسند تحریکوں اور تنظیموں نے جنم لیا ان کا راج بہادر سے کسی نہ کسی حیثیت سے تعلق رہا اور بعض تنظیموں کی بنیاد رکھنے والوں یا پھر ان میں کلیدی رول ادا کرنے والوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

راج بہادر کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں، وہ ایک مشہور کمیونسٹ رہنما ہیں، چوٹی کے ٹریڈ یونین لیڈر ہیں، اردو کے ایک جانے مانے انشا پرداز ہیں، مجاہد آزادی اور مجاہد اردو بھی ہیں۔ چنانچہ ان کی ان مجاہدانہ خدمات کے اعتراف کے طور پر حال ہی میں انھیں دلی اردو اکیڈمی کی جانب سے بہادر شاہ ظفر ایوارڈ کے علاوہ بہار اردو اکادمی اور آندھرا پردیش اردو اکادمی نے بھی دو اوارڈوں سے انھیں نوازا ہے۔ لیکن میرے اس مضمون کا مقصد راج بہادر کی ان تمام مجاہدانہ سرگرمیوں کا جائزہ لینا نہیں ہے اور نہ میرے لیے یہ ممکن ہے کیوں کہ اب میرا تعلق نہ عملی سیاست سے رہا، نہ ٹریڈ یونین تحریک سے اور نہ اردو ادب سے۔ یہ سب میدان چھوڑے (۳۵) برسوں سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اب میں صرف مجاہدِ آزادی ہوں، اردو ادب اور زبان سے گہری دلچسپی رکھتا ہوں۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کا ایک حقیر کارکن ہوں، کبھی کبھار چند مضامین لکھ کر اپنی ادبی اور سیاسی تشنگی کو بجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ راج بہادر کا (۵۰) سال سے زیادہ عرصہ سے بلا فصل دوست رہا ہوں اور کوئی (۳۷) برس سے ان کا ہم محلہ بھی ہوں۔ اس لیے انھیں بہت قریب سے دیکھنے، جانچنے اور پرکھنے کا خوب موقع ملا ہے۔ اپنے دیرینہ مشاہدوں کی بنا پر ان کی نجی زندگی اور شخصیت کے روشن اور غیر روشن پہلوؤں کا صرف دوستانہ نہیں بلکہ ناقدانہ نقطۂ نظر سے جائزہ لینے کی کوشش کروں گا۔

اب تو کسی کو یہ ماننے میں تامل نہ ہوگا کہ راج بہادر ایک دانشور ہیں اور میرے خیال میں ان کے دانشور بننے میں دو عوامل زیادہ کارفرما رہے ہیں، ایک تو ان کی غیر معمولی یادداشت اور حافظہ اور دوسرے کئی برسوں سے ان کا وسیع مطالعہ اور اس مطالعہ سے پورا استفادہ حاصل کرنے ان کی انتھک محنت اور جستجو۔ انھیں سیاسی اور ٹریڈ یونین مسائل سے، اردو ادب کے مختلف موضوعات اور اردو زبان کی نشو و نما، ترقی اور تحفظ سے نہ صرف گہری دلچسپی ہے بلکہ ان تحریکوں سے والہانہ وابستگی ہے۔ اس لیے وہ ان مختلف النوع مسائل پر انگریزی اور اردو میں مسلسل مضامین، تبصرے اور خاکے لکھتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ حالات حاضرہ پر ان کے بیانات اور تقاریر کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا دماغ ایک چھوٹا سا دیسی کمپیوٹر ہے جس کے مختلف خانوں میں سیاست، ٹریڈ یونین، اردو ادب و زبان کے مختلف مسائل کو Feed کردیا گیا ہو اور حسب ضرورت اس کمپیوٹر کے سیاسی بٹن کو دبایا جائے تو حالات حاضرہ پر ایک موزوں اور مفید مضمون یا بیان تیار ہو جائے گا، یا پھر ٹریڈ یونین بٹن پر انگلی رکھی جائے تو مزدوروں اور ان کی یونینوں کے مسائل پر یادداشتیں اور میمورنڈم کی کاپیاں آپ کو مل جائیں گی، اردو زبان کے بٹن پر ہاتھ رکھا جائے تو ادبی مضامین اور تبصروں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ اس کمپیوٹر میں متفرقات کا بھی ایک خانہ ہے جس میں مذہبی، سماجی اور تہذیبی موضوعات اور معاشی مسائل پر ضروری مواد Feed کیا ہوا تیار ملے گا۔ جو خواہش مند ہوں انھیں حسب ضرورت معلومات فراہم کی جا سکتی ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ راج بڑے زود نویس واقع ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ ان تمام موضوعات پر جس سے وہ اچھی طرح واقف ہیں۔ چل رے خامہ بسم اللہ کا نعرہ لگا میز پر بیٹھ جائیں گے اور بہت کم وقت میں مطلوبہ مضامین، تبصرے، بیان اور قرارداد آپ کے ہاتھ میں تھما دیں گے۔

راج بہادر بڑے شاہ خرچ انسان ہیں۔ اگر انھیں کسی صبح اچھی خاصی رقم مل جائے تو رات ہونے تک ان کا ہاتھ خالی نظر آئے گا۔ وہ صحیح معنوں میں پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں اور ان کی یہ کوشش رہتی ہے کہ ہاتھ کی اس گندگی سے جتنا جلد ہو سکے چھٹکارہ مل جائے۔ جب وہ

کسی مارکٹ میں سبزیاں اور گوشت وغیرہ خریدنے جاتے ہیں تو ہر سبزی فروخت کرنے والی اور دوکان دار یہ آواز دے گا کہ "صاب" ہمارے پاس آؤ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ شخص جو بھی مال خریدے گا اس کے بھاؤ نہیں چکائے گا۔ تول میں ڈنڈی مارنے پر کبھی نظر نہیں رکھے گا بلکہ مطلوبہ اشیا کا اچھا خاصا آڈر دینے کے بعد صرف یہ پوچھے گا کہو کتنے پیسے ہوئے اور جلد رقم سے کچھ زیادہ پیسے دے کر چلتا پھرتا نظر آئے گا۔ جب کبھی وہ آٹو یا سائیکل رکشا میں بیٹھیں گے تو رکشا والے سے صرف یہی کہیں گے کہ بھئی فلاں مقام کو جانا ہے اور رکشا میں بیٹھ جائیں گے۔ کرایہ کے تعلق سے، رکشا والے کے پوچھنے کے باوجود کوئی بات نہیں کریں گے اور منزل پر پہنچنے کے بعد اس سے دریافت کریں گے کہ کتنا کرایہ ہوا، وہ جو کچھ بھی کہے گا اس سے زیادہ ہی دے دیں گے۔

راج بہادر بڑے مہمان نواز واقع ہوئے ہیں۔ حیدرآباد میں کسی ادبی، تہذیبی اور سیاسی تقریب اور جلسے کے سلسلہ میں جب کوئی ادیب، شاعر اور سیاسی قائد آئے تو اس کی ایک شام راج بہادر کے گھر پر ضرور گزرے گی جہاں وہ پورے لوازمات کے ساتھ دعوت کا اہتمام کریں گے اور وہ بھی دعوت تر۔ چاہے انھیں ان دعوتوں کے اہتمام کے لیے قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ ان دعوتوں میں مجھے جن دانشوروں اور ممتاز شخصیتوں سے ملنے کا موقع ملا ان میں قابلِ ذکر یہ ہیں۔ فیض احمد فیض، راجندر سنگھ بیدی، علی سردار جعفری، جگن ناتھ آزاد، مجروح سلطان پوری، قمر رئیس، کیفی اعظمی، ظفر الحسن، سی نارائن ریڈی، آئی۔ کے۔ گجرال، پی۔ شیو شنکر، مشہور فلمی اداکار ہنگل۔ ان شخصی دعوتوں کے علاوہ ان کے گھر پر عزیز احمد خاں وارثی کی قوالی، وٹھل راؤ اور ان کے ساتھیوں کی محفل نغمہ کی کئی بیٹھکیں منعقد کی جاتی رہی ہیں۔

راج بہادر بہت مصروف آدمی ہیں۔ اس کے باوجود ان کی روزمرہ زندگی میں ایک نظم و ضبط باقاعدگی اور نفاست پسندی کی بھی جھلک نظر آتی ہے۔ سیکڑوں کتابوں اور رسالوں کی ان کی لائبریری بڑی حد تک منظم کہی جا سکتی ہے۔ وہ جن اداروں اور تنظیموں میں کام کرتے ہیں ان کی درجنوں فائلیں اور کاغذات بڑی باقاعدگی سے محفوظ ہیں۔ ان کے مضامین، تبصرے اور بیانات وغیرہ جو مختلف رسائل اور اخباروں میں شائع ہوتے ہیں ان کے تراشے بڑی جتن سے فائل

کیے ہوئے ہیں۔ مختلف رسائل میں شائع ہونے والے اہم اور کارآمد مضامین کی زیراکس کاپیوں کا بھی ان کے یہاں بڑا ذخیرہ ہے۔

شاید بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہوں گے کہ راج بہادر بہت اچھے باورچی بھی ہیں اور یہ فن انھیں اپنے دادا سے ورثے میں ملا۔ وہ کوئی باقاعدہ اور تربیت یافتہ باورچی نہیں بلکہ ضرورت پڑنے پر بریانی، ہر قسم کے سالن، اچار اور میٹھا وغیرہ تیار کر لیتے ہیں۔ ان کے پکوان کا ایک دلچسپ واقعہ سن لیجیے۔ غالباً ۴۶-۱۹۴۵ء کا زمانہ ہوگا۔ راج، مخدوم، مرزا حیدر حسین اور دوسرے کامریڈ گھانس منڈی (سکندرآباد) کے پارٹی آفس میں رہا کرتے تھے۔ ایک دن مخدوم نے یہ خواہش ظاہر کی کہ انھیں بریانی اور میٹھا کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ اس زمانہ میں پارٹی کی خستہ حالی حالت کے پیش نظر مخدوم کی اس خواہش کو اس دور کے پورے لوازمات اور اہتمام کے ساتھ پورا کرنا ناممکن تھا۔ راج بہادر نے اس مشکل کا حل یہ نکالا کہ تھوڑا "بڑا گوشت" کسی طرح خرید لے آئے اور "گڈی" بریانی کا بندوبست کر دیا۔ اب سوال تھا میٹھے کا۔ ان دنوں راشن کا موٹا اور لال رنگ کا چاول ملتا تھا۔ جس کی پیچ گاڑھی اور سرخ نکلتی تھی، راج نے اس گاڑھی پیچ میں شکر ملا کر خوب ٹھنڈا کیا اور جب وہ قدرے سخت ہو کر جم گئی تو کاجو کاٹ کر اس کے اوپر پھیلا دیے اور اس طرح میٹھا بھی تیار ہو گیا۔

اب کچھ سخن گسترانہ باتیں! لیکن مشکل یہ ہے کہ مشرقی تہذیب کی یہ قدیم روایات رہی ہیں کہ کسی شخص کی کھلم کھلا عیب جوئی نہ کی جائے اور دوسری طرف جدید سوانح اور خاکہ نگاروں کا یہ نظریہ ہے کہ کسی شخصیت کا بھرپور اور مکمل جائزہ لینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی نہ صرف اچھائیوں اور خوبیوں کو اجاگر کیا جائے بلکہ اس کی خامیوں اور کمزوریوں کو بھی نظرانداز نہ کیا جائے۔ آئیے اس جدید نقطۂ نظر سے راج بہادر کی شخصیت کے کچھ غیر روشن پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے۔ راج بہادر بڑے چلبلے، اور کبھی نچلا نہ بیٹھنے والے آدمی ہیں۔ اگر آپ کسی سنجیدہ محفل یا اہم جلسہ میں بیٹھے ہوئے ہوں اور راج بہادر وہاں قدم رنجہ فرمائیں تو آپ فوراً محسوس کریں گے کہ ان کی آمد نے محفل کا رنگ ہی بدل دیا وہ اپنی بلند آواز میں مزاحیہ جملوں، دل لگی، مذاق (برمحل اور بے محل) اور چھیڑ چھاڑ سے محفل کی خاموشی اور سنجیدگی کو ختم کر دیں گے۔ ان کے بعض احباب کا خیال ہے کہ وہ مذاق کی رَو میں

کبھی حد آداب سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ جب کسی تنظیم کی کاروباری میٹنگوں میں شریک ہوتے ہیں تو ایجنڈے کے تمام مسائل پر مسلسل اپنے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ نتیجتاً دوسرے شرکائے میٹنگ کو اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ انھیں دوسروں کی باتیں سننے کی عادت کم اور اپنی ہی باتیں سنانے کی عادت زیادہ ہے۔ خود انھوں نے اپنی اسی خصوصیت کے بارے میں کہا ہے۔

کہنے پہ جب آتا ہے تو پھر بس نہیں کرتا
میٹنگ میں کبھی گوڑ کسی کی نہیں سنتا

راج بہادر گوڑ کی زندگی کے دو جزو ایمان ہیں ایک تو کمیونسٹ پارٹی اور دوسرے ٹریڈ یونین تحریک۔ وہ پارٹی کے انتہائی وفادار اور ڈسپلن کے پابند سپاہی ہیں۔ پارٹی کے ہر اعلان کردہ پالیسیوں اور پروگراموں کو چاہے وہ صحیح ہوں یا غلط ـــــ من وعن اور یقین محکم وعمل پیہم سے پورا کرنے کے قائل ہیں۔ وہ پارٹی پر کسی قسم کی اور کسی جانب سے موجودہ بدلے ہوئے حالات میں بھی تنقید کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتے اور جذباتی انداز میں برافروختہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح پرولتاریہ طبقہ کو وہ اپنی رگ جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اس جذباتی لگاؤ کی بنا پر ان کی دانست میں مزدور اور ان کی ٹریڈ یونین کسی لغزش یا غلطی کی مرتکب نہیں ہو سکتی۔ اگر بدقسمتی اور اتفاق سے ایسی کوئی بات ہو بھی جائے تو وہ اس کی بالکلیہ ذمہ داری انتظامیہ Management اور بیوروکریسی کے سر تھوپ دیتے ہیں۔

بعض صاحبان علم وحکمت کا یہ بھی خیال ہے کہ دانشوروں میں عام طور پر کچھ نہ کچھ کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ جیسے لاابالی پن، مے نوشی، عشق ومحبت کی داستانوں سے ان کی وابستگی وغیرہ، وغیرہ۔ اگر اس نقطۂ نظر کو تسلیم کر لیا جائے تو کیا پھر راج بہادر کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے؟

راج بہادر اپنی (۵۵) سالہ کامیاب عوامی زندگی میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی، آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس، انجمن ترقی پسند مصنفین اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے

چوٹی کے عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں اور ان ہی تنظیموں کے نمائندہ کی حیثیت سے انھیں ایشیا، یورپ، انگلستان اور مشرق وسطیٰ کے کئی ممالک کا سفر کرنے کا موقع ملا ہے۔

شہرت اور ترقی کے ان منازل کو طے کرنے کے باوجود گھمنڈ اور غرور جیسی برائیاں ابھی تک ان کی زندگی کا حصہ نہیں بنی ہیں۔ وہ ایک سیدھے سادے اور منکسر المزاج آدمی ہیں۔ ان کا مکان ایک دربار کا منظر پیش کرتا ہے۔ جہاں مزدور، مختلف محکموں اور بنکوں کے ملازمین، ادبی اور تہذیبی انجمنوں کے کارکن، ان کے دوست احباب اور غرض مندوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ بہرحال موجودہ حالات میں ان کی شخصیت بہت غنیمت ہے۔ اور آخر میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ:

"تم سلامت رہو ہزار برس"

ایم۔ حبیب خاں

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ــــ اردو کی ایک فعال شخصیت

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ہندوستان کے مشہور سیاست داں ہیں۔ انھوں نے عوام کے مسائل پارلیمنٹ میں نہایت موثر انداز میں پیش کیے۔ چوں کہ ان کا رویّہ ہمیشہ تعمیری رہا ہے اس لیے کامیاب بھی رہے۔ ان کی شخصیت میں کئی خوبیاں یکجا نظر آتی ہیں یعنی انتہائی کشادہ ذہن اور غیر معمولی سیکولر انسان ہیں۔ ان تمام خوبیوں سے بالاتر ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے سے چھوٹوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اور ان کی ہمت افزائی کرتے ہیں اور کچھ عرصے بعد ان کے ساتھ ایسے گھُل مل جاتے ہیں کہ ذرا بھی چھوٹے بڑے کا فرق محسوس نہیں ہونے دیتے۔ طبیعت میں خوش مزاجی، نرمی، شگفتگی اور بذلہ سنجی ان کی شخصیت کے اہم جزو ہیں۔

گوڑ صاحب کا آبائی وطن اتر پردیش میں کشن پور چھوٹا سا گاؤں ہے، جو ضلع فیض آباد کی تحصیل گوسائی گنج میں واقع ہے۔ یہ مرزا رسوا کی "امراؤ جان ادا" کا وہی فیض آباد ہے جہاں ۶؍ دسمبر ۱۹۹۲ء میں فرقہ واریت کا ایک شرمناک واقعہ وجود میں آیا تھا۔ ان کے حقیقی دادا ہری پرشاد گوڑ اپنے دو بھائیوں کے ساتھ حیدر آباد میں آکر گولی پورہ میں آباد ہوگئے۔ تب سے ان کا خاندان حیدر آباد میں آباد ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گوڑ صاحب کی ادب سے دل چسپی سیاست کے بعد پیدا ہوئی۔ ان کی ابتدائی زندگی پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ادب سے دل چسپی طالب علمی کے زمانے ہی سے پیدا ہوگئی تھی۔ ابتدا میں وہ اردو کے استاد اور شاعر صدق جائسی سے بہت متاثر تھے۔ اور ان ہی کی بدولت گوڑ صاحب میں شعر و شاعری سے دل چسپی، اور سخن فہمی میں شعور

پیدا ہوا۔ "نگار" اور بعض دوسرے معیاری رسالوں کی رہنمائی بھی ان کو حاصل رہی اور ان ہی کے مطالعے سے ان کی زندگی دو دھاروں میں بٹ گئی۔ ایک سیاسی اور دوسرا ادبی۔ اُردو ادب کا غائر مطالعہ کیا اور قدیم وجدید ادب سے واقفیت حاصل کی۔ ان کی ابتدائی زندگی پریشانیوں اور مصیبتوں میں گزری۔ ۱۹۳۶ء میں چادر گھاٹ ہائی اسکول حیدرآباد سے میٹرک کا امتحان اوّل درجے میں پاس کیا اور ستمبر ۱۹۴۳ء میں میڈیکل کالج سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری حاصل کی۔ اسی زمانے سے وہ انگریزوں کے ظلم وستم اور بے انصافیوں کے خلاف لڑتے رہے۔ پولیس ان کو پکڑنے میں لگی رہتی مگر یہ پولیس کو چکمے دیتے رہتے۔ تقریریں کرتے اور فرار ہو جاتے۔ خدا جانے فرار ہونے کی ٹریننگ حیدرآباد کے کس اسکول میں لی تھی۔ البتہ ایک دوبار فرار ہونے میں ناکامی ہوئی، گرفتار ہوئے اور جیل بھیج دیے گئے۔ ۱۹۴۰ء میں جب وہ زیر تعلیم تھے تو کامریڈز ایسوسی ایشن کی تشکیل ہوئی اور جس کے وہ اہم اور فعال رکن تھے۔ ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء میں معتمد عمومی اور صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں آزاد ہندوستان کے نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن جو صدر راجیہ سبھا بھی تھے۔ ان کی مداخلت سے گوڑ صاحب جیل سے رہا کر دیے گئے اور وہ راجیہ سبھا کے ممبر بنا دیے گئے۔ گوڑ صاحب راجیہ سبھا کے ممبر دس سال یعنی ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۲ء تک رہے۔

مخدوم محی الدین، نیاز حیدر اور جواد رضوی کی دوستی اور صحبت سے انھیں مطالعے کے شوق کو جلا ملی۔ کتابیں خرید کر پڑھنے کی عادت اُردو والوں میں کم ہوتی ہے لیکن گوڑ صاحب ہمیشہ کتابیں خرید کر ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ کتب بینی کی یہ عادت ابھی تک جاری ہے۔ ان کے تین تنقیدی مضامین کے مجموعے یکے بعد دیگرے "ادبی مطالعے، ادبی جائزے" اور "ادبی تناظر" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان مجموعوں میں "حسرت کی غزل گوئی"، "فراق گورکھپوری"، "مخدوم کی زندگی اور شاعری"، "کیفی اعظمی۔ سارے جہاں کا غم"، "جیلانی بانو کی کہانیاں"، "روشنائی ترقی پسند تحریک کی آپ بیتی"، "غالب اور جدید ذہن"، "سروجنی نائیڈو کی ہمہ گیر شخصیت"، "آج کا ہندوستان اور مولانا ابوالکلام آزاد کی معنویت"، "خواجہ احمد عباس"، "راجندر سنگھ بیدی ایک عظیم فن کار"، "جلیل مانک پوری عہد اور کلام"، "نیاز حیدر زندہ ہے۔"

اور" ایک گھر جو تقسیم ہوگیا"۔ بڑے اہم مضامین ہیں جن میں علمی بصیرت اور گہری نظر کا اظہار ملتا ہے۔ ان مضامین میں شخصیت اور فن پر ان کی بے لاگ رائے ان کی گہری سوچ اور علمیت کا پتا دیتی ہے۔" ایک گھر جو تقسیم ہوگیا" **A House Devided** امرت رائے کی انگریزی تصنیف پر تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں :

"اس طویل تبصرے کو ختم کرتے ہوئے یہ عرض کروں گا کہ امرت رائے کا مطالعہ معلومات آفریں تو ہے لیکن مکمل نہیں اور جو نتائج انھوں نے اخذ کیے ہیں وہ ہماری زبانوں کی ارتقا کی تاریخ اور عصری ہندوستان اور اس کے اُبھرتے ہوئے لسانی نقشے سے متصادم ہیں[1]"۔

اس کتاب کے مطالعے سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ امرت رائے جو اُردو کے سخت مخالفین میں سے ایک ہیں جگہ جگہ اُردو تحقیق اور اُردو کی رفتار اور اس کو ہندوستان کی تقسیم کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں یقین نہیں آتا۔ یہ عین ممکن ہے کہ امرت رائے نے اس کتاب کے لکھنے میں کسی اردو کے محقق اور ناقد سے مدد لی ہو اور اس کو اپنا شریک کار بنایا ہو۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ انتہائی سیکولر انسان ہیں۔ انھوں نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مولوی عبدالحق کے بارے میں لکھا ہے کہ :

"عبدالحق ایک غیر سیاسی انسان تھے اور اُردو سے انھیں مجنونانہ عقیدت تھی۔ وہ اُردو کی قدیم کتابوں کی تحقیق و تدوین کے بانیوں میں سے تھے۔ اردو زبان کی تعمیر میں صوفیوں کے رول پر عالمانہ مقالہ لکھا۔ انھیں بہت صدمہ تھا کہ پاکستان میں اُردو کے ساتھ بُرا سلوک کیا جا رہا تھا۔ انھوں نے تو اُردو کو اس کے ہندوستانی روپ میں متحدہ ہندوستان کی رابطے کی زبان بنانے کے خواب بھی دیکھے تھے۔ اُردو کو فرقہ پرست سیاست دانوں نے فرقہ وارانہ عصبیت کے پھیلانے کا ہتھیار بنایا۔ نظریۂ پاکستان کا پرچار ہندوستان کی سبھی زبانوں اور خاص طور پر انگریزی میں بہت ہوا ہے[2]"۔

یہ اس سیکولر انسان کے الفاظ ہیں جس نے حیدر آباد میں مولوی عبدالحق کی اردو خدمات

---

[1] و [2] ادبی تناظر۔ ص ۱۷۸۔

کے اُتار چڑھاؤ اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ پاکستان کی تقسیم اگر اردو کی بنیاد پر ہوتی تو اردو پاکستان کی قومی زبان ہوتی اور وہاں اُردو کا وہ حال نہ ہوتا جس کی طرف گوڑ صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ مولوی عبدالحق زندگی بھر اُردو کو قومی زبان کا درجہ دلانے کے لیے کوشاں رہے لیکن ناکام رہے۔

گوڑ صاحب کی تحریر نہایت دلکش اور اثر آفریں ہے۔ اپنے دلائل نہایت استدلال، منطق اور شیریں انداز میں پیش کرتے ہیں۔ مزاح ان کی شخصیت کا خاص جز ہے۔ بات بات میں جملے بازی ان کی گفتگو کو موثر بنا دیتی ہے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ انجمن ترقی اُردو (ہند) کی مجلسِ عام کے ممبر ۱۹۶۱ء سے ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں جب انجمن کا دفتر دلّی منتقل ہوگیا اس کے بعد وہ دو بار اس کے نائب صدر بھی رہے۔ ان کی دلآویز شخصیت کو دیکھنے کا موقع مجھے پہلی بار انجمن کی چوتھی آل انڈیا اُردو کانفرنس کے موقع پر جے پور میں ملا۔ یہ کانفرنس ۲، ۳، اور ۴ ر اکتوبر ۱۹۶۴ء کو جے پور کے مسلم مسافر خانے کے وسیع میدان میں ہوئی تھی۔ اس کا افتتاح موہن لال سکھاڈیا نے کیا تھا جو اس وقت راجستھان کے چیف منسٹر تھے اور صدارت پنڈت آنند نرائن ملاؔ نے کی تھی۔

گوڑ صاحب کو اُردو کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے میں نے پہلی بار جے پور کی کانفرنس میں دیکھا۔ گرج دار آواز، سفید شیروانی اور چوڑی دار پائجامہ ان کے گٹھے ہوئے جسم پر اچھا لگ رہا تھا۔ آنکھوں میں خاص قسم کی کشش اور شگفتہ انداز بیان نے ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اس تقریر سے پہلے مجھے ان کا وہ صدارتی خطبہ پڑھنے کا اتفاق ہوا جو انھوں نے ۳ ر دسمبر ۱۹۶۰ء کو بہار ریاستی انجمن ترقی اُردو کانفرنس مظفرپور کے موقع پر دیا تھا۔ اس خطبے میں انھوں نے اُردو زبان اور اس کے فروغ کا بھرپور جائزہ لیا تھا۔ وہ خطبے میں اُردو کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اُردو بہرحال ہندوستانی زبان ہے۔ اس کی بنیادیں یہیں ہیں اس کا لوک اَدھار یہیں ہے۔ اس کے بولنے والے یہیں رہتے بستے ہیں اور

وہ ان کی مادری زبان ہے۔ اس لیے انجمن ترقی اُردو (ہند) اور ہندوستان
بھر میں اردو بولنے والوں کو یو۔ پی اور بہار میں اردو کے موقف اور
مستقبل کے بارے میں گہری تشویش لاحق ہے"۔

"اُردو کو آزاد ہندوستان کے آئین میں ایک قومی زبان کا درجہ دیا گیا
ہے لیکن خود اس کے اپنے علاقے میں جو جائز مقام ملنا چاہیے ابھی تک
نہیں ملا۔ اس مقام پر بہار باسی شاید خوش قسمت ہیں۔ اصل دقتوں کا
سامنا تو اتر پردیش میں کرنا ہے۔ بہار اور یو۔ پی کے حالات کا بنیادی فرق یہ
ہے کہ یو۔ پی میں اردو کی جان بوجھ کر اور فرقہ وارانہ زاویوں سے مخالفت کی
جاتی ہے اور ہندی بھاشائیوں کو اُردو بولنے کے خلاف صف آرا کیا جاتا
ہے۔ اس کے برخلاف ریاست بہار میں اُردو بولنے والوں اور ہندی
بولنے والوں کے درمیان صحت مند اور بھائی چارہ کے روابط ہیں۔ یہاں
بہت سے ہندی پریمی اُردو کی اہمیت اور حیثیت کو مانتے ہیں[۵]"۔

گوڑ صاحب کا اُردو سے یہ جذبہ ان کی محبت کا آئینہ دار ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا
سکتا ہے کہ ان کو اُردو سے کس قدر محبت ہے۔

مئی ۱۹۷۸ء میں مجھے گوڑ صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع اس وقت ملا
جب انجمن کا دفتر علی گڑھ سے دلی منتقل ہو چکا تھا۔ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کا دفتر
اس وقت اجے بھون میں تھا اور گوڑ صاحب کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری تھے۔
انجمن کا دفتر اجے بھون سے بہت قریب ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کا ہفت روزہ آرگن "حیات"
یہیں سے نکلتا تھا۔ یہیں ڈاکٹر اجمل اجملی مرحوم اور بشیر احمد صاحب سے ملاقات ہوئی ——
حیدر آباد سے جب کسی کام سے دلی تشریف لاتے ہیں تو ان کا قیام اجے بھون ہی میں رہتا
ہے اور انجمن کا دفتر قریب ہونے کی وجہ سے یہاں ضرور تشریف لاتے ہیں۔ اور ان کی باغ و بہار
گفتگو سننے کے اکثر مواقع ملتے رہتے ہیں۔

اُردو کی بحالی اور اس کو جائز حق دلانے کے لیے گوڑ صاحب ہمیشہ کوشاں رہتے

۵۔ ادبی جائزے ص ۱۴

ہیں۔ جنتا دل حکومت کے زمانے میں علی سردار جعفری صاحب کی صدارت میں ۱۶ رکنی کمیٹی ۱۵ر فروری ۱۹۹۰ء کو تشکیل دی گئی۔ پروفیسر نامور سنگھ اس کے نائب صدر تھے اور وزارت تعلیم کے مشیر جناب کے۔ کے۔ کھلر اس کے رکن معتمد بنائے گئے تھے۔ یہ کمیٹی گجرال کمیٹی کی سفارشات کا جائزہ لینے کے لیے حکومت نے بنائی تھی۔ کمیٹی نے مختلف ریاستوں میں اُردو کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے ذیلی کمیٹیاں بنائیں۔ مثلاً گجرات، مہاراشٹر، کرناٹک اور آندھرا پردیش کے لیے جو سب کمیٹیاں تشکیل دی گئیں اس کے کنوینر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ بنائے گئے۔ گوڑ صاحب نے اردو کے سلسلے میں جو تابڑ توڑ کام انجام دیے وہ یقیناً اس قابل ہیں کہ ان کا اعتراف کیا جائے۔ جعفری کمیٹی نے ۱۱ ریاستوں کا جائزہ لے کر اپنی رپورٹ ۱۸ر ستمبر ۱۹۹۰ء کو حکومت کو پیش کردی۔ یہ رپورٹ ۲۵ر جولائی ۱۹۹۱ء کو راجیہ سبھا میں اور ۲۹ر جولائی کو لوک سبھا میں پیش کردی گئی۔ اس کمیٹی کے فعال ممبر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر خلیق انجم، کنور مہندر سنگھ بیدی، امریتا پریتم اور جناب رام لعل وغیرہ تھے۔ جعفری کمیٹی وی۔ پی سنگھ سابق وزیر اعظم کی حکومت (جنتا دل) کے دور حکومت میں تشکیل دی گئی تھی۔ اس کے بعد ابھی تک اس کمیٹی کے بارے میں حکومتِ ہند کی طرف سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ چاہے ہندوستان کا اتر پردیش کا صوبہ ہو یا جنوبی ہند کی ریاستیں اردو کے مسائل کو حل کرنے میں گوڑ صاحب کوشاں رہتے ہیں اور زبان کی صورتِ حال کا تفصیلی جائزہ لے کر اس کا حل تلاش کرتے ہیں۔ جنوبی ہند کی شاخوں کی تنظیم بھی آپ ہی کا کارنامہ ہے۔ انجمن کے دو بار نائب صدر رہے اور آج کل حیاتی ممبر ہیں۔ غرض اردو سے بے پناہ محبت ہونے کی وجہ سے اُردو کی اُلجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ گوڑ صاحب نے اُردو کی گذشتہ ۴۰ سال کی رفتار اور ترقی کا جائزہ لینے کے بعد اس بات کا اعتراف کئی بار مرکزی انجمن ترقی اُردو (ہند) کے جلسوں میں کیا ہے اور اب یہ بات دل کو لگتی ہے کہ حکومت کی نیت اُردو کے معاملے میں کتنی ہی صاف ہو اور ارادہ کتنا ہی پختہ ہو، عوام کو چاہیے کہ اب اُردو کا حل خود تلاش کریں، حکومت پر تکیہ نہ کریں۔ اس احتساب میں جتنی دیر لگے گی اُردو کے لیے مزید مشکلات پیدا

ہو سکتی ہیں۔ اُردو کی جڑیں ابھی اتنی کمزور نہیں ہیں اور پیڑ کے پتوں میں ابھی ہریالی موجود ہے۔ لیکن اگر عوام اب بھی مل کر اُردو کی تہذیب کو نہ بچا سکے اور اُردو کے لیے کام نہیں کیا تو عین ممکن ہے کہ پیڑ کے پتے سوکھنے شروع ہو جائیں اور اُردو زبان کی حیثیت کلاسیکی بن کر رہ جائے۔ گوڑ صاحب حیدر آباد کی گنگا جمنی تہذیب کی شناخت ہیں۔ انھوں نے مرکزی انجمن ترقی اُردو کی طرف سے جنوبی ہند کے دورے کیے اور عوام کو بیدار کیا کہ وہ اُردو کا حل خود تلاش کریں۔ اپنے بچوں کو اردو پڑھائیں اور اُردو تعلیم کو گھر گھر پہنچانے میں ایک دوسرے کی مدد کریں اور اُردو تحریک کو متحرک بنائیں۔ میر کا یہ شعر گوڑ صاحب کے کاموں کی یاد تازہ کرتا ہے ؎

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

منوہر راج سکسینہ

راج بہادر گوڑ کی پچھتّرویں سالگرہ

(سوانحی خاکہ)

راج بہادر گوڑ جو آج ایک عظیم سیاسی رہنما، ٹریڈ یونین لیڈر اور ایک معیاری ادیب و نقاد ہیں۔ گھر والے انھیں لاڈ پیار سے راجن پکارتے ہیں دوست احباب صرف راج سے مخاطب کرتے ہیں اور میں بھی اس مضمون میں انھیں راج ہی سے مخاطب کر رہا ہوں۔

وہ عمر میں مجھ سے پانچ یا چھ سال بڑے ہیں مگر رشتہ میں وہ میرے بھانجے اور میں اُن کا ماموں ہوتا ہوں۔ عمر کی بزرگی اور رشتہ میں تعاون برقرار رکھنے کی خاطر ہم نے یہ سمجھوتہ کر لیا کہ وہ میرے بھانجے اور میں ان کا ماموں یار۔

راج سے میری رشتہ داری کا سلسلہ اُس وقت سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ راج کی حقیقی والدہ کا انتقال راج کی کمسنی میں ہو گیا اور راج کے والد جناب محبوب رائے صاحب گوڑ نے میری بڑی ہمشیرہ صاحبہ سے بیاہ کیا۔ یہ کوئی لگ بھگ ساٹھ برس پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد جب راج شاہ علی بنڈہ وسطانیہ اسکول میں پڑھ رہے تھے مجھے بھی اسی اسکول میں شریک کیا گیا اس طرح اسکول آتے جاتے میرا ان کا سلام علیک ہو جایا کرتا تھا۔ میری کمسنی کے باعث اور میری جائیداد اور معاش کی حفاظت و صیانت کی خاطر راج کے والد محبوب رائے صاحب گوڑ میرے ہی ہاں ٹھہر کر میری سرپرستی فرماتے رہے ہیں اور آج بھی جب کہ وہ (۹۷) برس کے ہو چکے ہیں اُن کا سایۂ بزرگی قایم ہے۔ میری بڑی ہمشیرہ صاحبہ کے بطن سے تین لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ جو راج کی بھائی بہنیں ہیں۔

راج ایک ذہین طالب علم رہے ہیں ہمیشہ امتحانات درجہ اوّل و دوم ہی میں پاس کرتے رہے ان کی اس کامیابی کے باعث انھیں اعلیٰ جماعتوں میں داخلہ نہ صرف آسانی سے مل جاتا بلکہ تعلیمی وظیفہ

بھی ملا کرتا تھا۔ راج کو ان کی طالب علمانہ زندگی میں ایک اچھا تعلیمی ماحول ملا۔ رائے محبوب نارائن صاحب جو راج کے چچا تھے۔ ایک اعلیٰ علمی و ادبی ذوق کے انسان تھے اور وہ سماجی خدمات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے جس کے باعث راج میں کتب بینی اور مطالعہ کا ذوق بڑھتا گیا۔ راج کے چچا محبوب نارائن صاحب نے طلباء کے لیے دودھ گوڑہ میں ایک ہاسٹل قائم کیا جہاں راج بھی رہا کرتے تھے۔ بعد ازاں وہ اپنے چچا محبوب نارائن کے گھر گولی پورہ میں رہنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب راج ہمارے گھر واقع لال دروازہ اپنے والد جناب محبوب رائے صاحب سے ملنے آنے جانے لگے تھے۔ راج کی ذہانت اور طبیعت کی خوش مزاجی کے باعث میری والدہ اور دیگر افرادِ خاندان ان سے بہت متاثر ہوئے اور بالآخر وہ سب کے چہیتے ہو گئے۔ میری تعلیم راج کے والد کی سرپرستی میں ہی ہوتی رہی مگر والدہ محترمہ کا یہ خیال کہ مجھے کسی اعلیٰ تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ مجھے موروثی معاش منصب و سلحداری ملا کرتی تھیں۔ مگر راج کی سفارش پر میری والدہ مجھے اعلیٰ تعلیم جاری رکھنے پر راضی ہو گئیں۔ راج کے تعلیمی ماحول اور ان کے تعلیمی ذوق کا یہ اثر ہوا کہ میری دو بہنیں بھی جو پردہ کے باعث گھر سے باہر نہیں نکلا کرتی تھیں زنانی مدرسہ میں شرکت حاصل کر لیں۔

راج کے گولی پورہ کے قیام کے دوران میں تعطیلات میں وہاں پڑھنے جایا کرتا تھا۔ اور اس وقت کی چند باتیں جو مجھے یاد ہیں وہ تحریر کرنے کو جی چاہتا ہے اور یہ کہ راج کے چچا جناب محبوب نارائن گوڑ اور خود راج اور بسا اوقات بالا پرشاد صاحب گوڑ (ماہر ممکری) کے درمیان آپس میں علمی مباحث چھڑ جاتے تھے اور گھنٹوں آپس میں بحث و مباحثہ ہوتا رہتا۔ مباحث کا زور و شور رہائشی مکان کے گلی کے کونے تک بھی سنائی دیتا تھا۔ منشی پریم چند کی ناول ہو یا پھر کانگریسی رہنماؤں کی سوانح حیات یا مولانا ابوالکلام آزاد کے رسالے کا مضمون چچا و بھتیجے کے مباحث کے بغیر ان کا مطالعہ نامکمل ہی سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں میں نے یہ دیکھا کہ بعض مرتبہ راج ہی کو کھانا بنانا پڑتا تھا اور وہ بہت لذیذ اور ذائقہ دار کھانے بناتے ہیں۔

راج کو بچپن ہی سے مطالعہ کا شوق رہا ہے چناں چہ اپنے سکونتی مقام گولی پورہ میں انھوں نے ایک دارالمطالعہ قائم کر رکھا تھا۔ میں نے بھی اس کی رکنیت حاصل کر لی اور رکنیت کی ماہانہ فیس چار آنہ تھی راج۔ بحیثیت معتمد دارالمطالعہ اپنی دستخط سے رسید جاری کیا کرتے تھے اور یہ کوئی ۱۳۴۸ فصلی م ۱۹۳۸ء

کی بات ہے دارالمطالعہ کے علاوہ محلے کے نوجوانوں میں تعلیم سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے تقریری مقابلے منعقد کیے جاتے تھے۔ اور ان مقابلوں میں کامیاب ہونے والے بچوں کو چھوٹی چھوٹی کتابیں بطور انعام دی جاتی تھیں چناں چہ مجھے بھی انعام حاصل کرنے کا موقع حاصل ہوتا رہا۔

راج کی پہلی شادی موضع نظام آباد ضلع اعظم گڑھ (یوپی)، میں شریمتی سونجگتا سے رچائی گئی۔ اس میں میری والدہ کی زیادہ دلچسپی رہی اور وہ اپنے پورے پریوار کے ساتھ یوپی کا سفر اختیار کیں اور بہو کو اپنے گھر بیاہ کر لائیں۔ راج کو سونجگتا سے جو بعد میں کیلا کے نام سے پکاری جانے لگیں دو لڑکے پیدا ہوئے مگر سوئے قسمت کہ دونوں زندہ نہیں رہے۔

طالب علمانہ زندگی میں میں اور راج اس طرح ساتھ ساتھ رہنے لگے تھے کہ ہم دونوں کو اکثر لوگ بھائی بھائی سمجھتے رہے۔ پبلک میٹنگ یا سینما دیکھنے جانا ہو تو راج کی سفارش پر ہی مجھے والدہ اجازت دیتی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب راج اور میں سائیکل پر ہی گھوما کرتے تھے۔

راج کی طبیعت میں خوش مزاجی بچپن ہی سے موجود ہے وہ جہاں بھی ہوتے اور جس محفل میں شریک ہوتے ان محفلوں میں ایک جان پڑ جاتی تھی۔

راج جب ہائی اسکول میں تعلیم پا رہے تھے تو وہ مضمون کی درسی کتب کے ساتھ ساتھ اُسی مضمون کی کئی اور انگریزی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا کرتے تھے۔ جن میں سے اکثر کتب وہ خرید ا بھی کرتے تھے اس طرح درسی کتب کے ساتھ ساتھ اُسی مضمون کی دیگر کتب کی ایک علحدہ لائبریری بھی تھی۔

مجھے بھی اپنی تعلیم کے دوران ان کتب سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ راج ڈرائینگ اور خوش نویسی بھی اچھی کر لیا کرتے تھے۔ تحریر خوش خط اور پختہ ہے۔ انٹرمیڈیٹ پاس کرکے راج شروع میں آریہ سماجی تحریک سے متاثر ہوئے اس کے بعد کھادی تحریک سے جڑ گئے اور گھر گھر گھوم کر کھدر بیچا کرتے تھے اور خود بھی پہنا کرتے تھے اور اس طرح دوست احباب اور اپنے افرادِ خاندان کو بھی کھادی پہننے کی ترغیب دیتے رہے میں نے خود بھی ۱۹۴۰ء سے کھدر پہننا شروع کیا اور دیش کے آزاد ہونے تک کھدر پہنتا رہا۔

راج کا سیاسی رجحان ترقی کرتا ہوا سوشلزم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور اس زمانے میں کامریڈز ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا جس کے روح رواں جناب عالم خوندمیری مرحوم تھے۔ ایسوسی ایشن

کے بانیوں میں کامریڈ مخدوم محی الدین۔ جناب سید ابراہیم۔ جناب غلام حیدر صاحب اور مرزا حیدر حسن صاحب۔ جناب جواد رضوی صاحب اور دیگر ساتھی شامل ہیں۔ راج بھی اسی ایسوسی ایشن کے رکن بن گئے۔ لگ بھگ اسی زمانے میں راج کا کمیونسٹ پارٹی سے تعلق پیدا ہوتا ہے اور ۱۹۴۰ء سے راج کی اشتراکی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ راج کی کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی اور اشتراکی تحریک میں حصہ لینے کے باعث ان کے دوست احباب اور ان کے قریبی عزیز و اقارب راج کی اپنے گھروں پر آمد سے گھبرانے لگے۔ یہ ڈر اور خوف اس لیے پیدا ہوا کہ اکثر کائستھ گھرانوں کو اس وقت کے حکمرانوں سے کچھ نہ کچھ مراعات بشکل وظیفہ منصب و معاش جاری تھیں۔ خوف تھا کہ کہیں یہ مسدود نہ ہو جائیں۔ میری والدہ بھی اس خیال سے کبھی کبھی گھبرا جاتی تھیں مگر میری والدہ کو میرے اطمینان دلانے پر تشفی ہو جاتی تھی۔

گھر کے چھوٹے بڑے گو راج کے سیاسی خیالات سے پوری طرح متفق نہ سہی مگر راج سے ہمدردی ضرور کرنے لگے تھے۔ راج اپنی سیاسی زندگی میں کامیابی کی منزلیں طے کر رہے تھے مگر گھریلو زندگی میں انھیں سکون نہ ملا۔ اپنے دو لڑکوں کی موت کا غم دل میں چھپائے پھرتے رہے مگر ہمت و استقلال انھیں دلاسا دیتے رہے۔

کمیونسٹ پارٹی پر امتناع کے بعد اور خاص طور پر ۱۹۴۸ء میں راج اور دیگر کمیونسٹ رہنما روپوش ہونے پر مجبور ہو گئے۔ انڈر گراؤنڈ رہ کر وہ اپنی سیاسی سرگرمیوں کو جاری رکھے۔ روپوشی کے زمانہ ہی میں راج کی دوسری شادی برج رانی گوڑ سے ہوئی۔ ان کے بطن سے دو لڑکیاں تمارا اور کلارا پیدا ہوئیں۔ راج ان دونوں لڑکیوں سے بیحد پیار کرتے ہیں۔ چھوٹی لڑکی کلارا جس کی منگولین Mongolian پیدائش ہے۔ راج اس کو بہت چاہتے ہیں اور اس کی ذرا سی بھی تکلیف انھیں برداشت نہیں ہوتی۔ کلارا کی شادی ستیش سے ہوئی اور اس کو ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام امرو تا ہے۔ تمارا کی شادی شری بالاجی راؤ سے ہوئی اور انھیں اب دو لڑکے ہیں۔ جن کا نام پروین اور پلون ہیں۔ راج نے اپنے نواسہ کے اصرار پر ہی ۱۹۹۰ء میں اپنی زندگی کے کچھ حالات بیان کیے۔ جس کو ان کے نواسے نے ایک کتابچہ کی شکل میں شائع کیا۔

Nana - An interveiw with Dr. Raj Bahadur Gaur

۱۹۳۸ء میں جب کہ راج یونیورسٹی کے ہاسٹل میں مقیم تھے اس وقت "وندے ماترم تحریک"

کا آغاز ہوتا ہے اور راج ایک روزہ احتجاجی ہڑتال میں شریک ہوتے ہیں وہ جس وقت میڈیکل کالج
کے طالب علم تھے سیاسی میدان میں ہمہ وقتی کارکن کی حیثیت سے اتر جانا چاہتے تھے اس لیے
انھوں نے تعلیم ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے اس فیصلے سے خاص طور پر ان کے والد اور ہم سب
کو بڑا دکھ ہوا ہم سب نے ان سے خواہش کی کہ وہ ڈاکٹری کی تعلیم پوری کر لیں اور ڈگری حاصل
کر لیں اور پھر اس کے بعد سیاسی میدان عمل میں اتر جائیں۔ مگر راج اپنے فیصلے پر اٹل رہے۔
اس وقت اُن کے والد جناب محبوب رائے گوڑ بمبئی روانہ ہوئے اور اس وقت کی کمیونسٹ پارٹی
کے جنرل سکریٹری کامریڈ پی سی جوشی سے ملاقات کی اور انھیں اپنی خواہش سے مطلع کیا اور راج کو
اپنی تعلیم مکمل کر لینے کی ہدایت چاہی معلوم نہیں راج نے آیا کامریڈ پی سی جوشی کے کہنے پر یا میڈیکل
کالج کے اساتذہ کے مشوروں پر ۱۹۴۳ء میں ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کر لی۔

راج نے ہمیشہ ہی سے گھر کے معاملات اور بکھیڑوں سے اپنے آپ کو دور رکھا مگر جب کسی مسئلہ
کی ذمہ داری ان پر عاید کر دی جاتی تو وہ نبھانا بھی خوب جانتے ہیں۔ چناں چہ میری والدہ کے انتقال
کے بعد مجھ سے بڑی میری ہمشیرہ محترمہ لیلاوتی بی بی کی شادی کی فکر ہم سب کو کھائے جا رہی تھی۔ راج نے
اس سلسلہ میں پہل کی اور ہم دونوں رشتہ کی تلاش میں اورنگ آباد پہنچے اور کامریڈ چندر گپت
چودھری کے گھر قیام کیا۔ اورنگ آباد سے ہم تعلقہ ویجاپور روانہ ہوئے اور وہاں رائے لالہ بندو
پرشاد سری واستوا سے ملاقات کی راج کی چوں کہ ان سے پہلے ہی سے جان پہچان تھی اس لیے
رشتہ کی بات چھیڑ دی گئی۔ لالہ بندو پرشاد جی کا شمار اس وقت مہاراشٹر کے چوٹی کے کانگریسی
لیڈروں میں تھا۔ وہ سوامی رامانند تیرتھ کے گروپ سے وابستہ تھے۔ بہر حال ہمارے ویجاپور
کے قیام کے دوران رشتہ کی بات چیت ثمر آور ثابت ہوئی اور میری ہمشیرہ کی شادی لالہ جی سے
۱۹۴۵ء میں بلدہ حیدر آباد میں انجام پائی۔ اورنگ آباد کے اس مختصر قیام میں ہم دونوں نے ایلورہ اور
اجنتا کی سیر بھی کی اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم دونوں اورنگ آباد سے ایلورہ سائیکلوں پر ہی روانہ
ہوئے۔ [گو راج کو دل و دماغ پر قابو رکھنے میں کمال حاصل ہے مگر خاندان کی لڑکیاں جب بیاہی
جاتی ہیں تو بہ وقتِ رخصتی قابو کھو بیٹھتے ہیں اور رو پڑتے ہیں۔]

دیش کی آزادی سے قبل اکثر سیاسی رہنماؤں کے جلسوں کا مرکز حشمت گنج سلطان بازار رہا

کرتا تھا۔ میں بھی راج کے ساتھ اور خود راج کو سننے کئی بار حشمت گنج جاتا رہا ہوں۔ حشمت گنج کا ایک دلچسپ واقعہ جو مجھے یاد آرہا ہے وہ یہ تھا کہ روپوشی کے زمانے میں یعنی اوائل ۱۹۴۸ء میں جب کہ ان پر گرفتاری کا وارنٹ تھا۔ ایک پبلک میٹنگ کا اعلان کیا گیا کہ راج بہادر گوڑ اس جلسہ کو مخاطب کریں گے۔ اس اعلان پر پولیس نے حشمت گنج کے میدان کے دونوں جانب کے گیٹ کو بند کروادیا اور جلسہ گاہ کا محاصرہ کرلیا۔ اعلان کے مطابق راج بہادر گوڑ نے تقریر کی اور تقریر کے فوری اختتام پر روشنی بجھادی گئی اور پھر تاریکی میں جلسہ گاہ میں پبلک نے ایک اور صاحب راج ملیاجی کو گھیر کر راج بہادر گوڑ زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ اور اس دوران راج وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے اور اس طرح پولیس کو بڑی شکی ہوئی۔

ایک اور واقعہ جو مجھے یاد ہے وہ یہ تھا کہ مہاراجہ سرکشن پرشاد کا انتقال ان کی ڈیوڑھی واقع شاہ علی بنڈہ میں ۱۹۴۰ء میں ہوا اس وقت راج بہادر گوڑ ہمارے گھر ہی ٹھہرے تھے اس لیے میں اور راج مہاراجہ کی ارتھی کے جلوس میں شاہ علی بنڈہ سے پرانا پل پیدل چل پڑے۔ مجمع اتنا کثیر تھا کہ جشن کا منظر پیش کررہا تھا۔ بھجن اور اشلوک فضا میں گونج رہے تھے۔ ڈھولک جھانج مجیرے ایک خاص سماں پیدا کررہے تھے۔ بہرحال اس تاریخی جنازہ کے جلوس میں ہم اپنی شرکت کو بھول نہیں سکتے۔

راج کی روپوشی کے زمانے میں مختلف ناموں سے ہم میں خط وکتابت بھی ہوتی تھی۔ بسا اوقات مجھے تو کوریر Courier کا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ راج کی گرفتاری کے سلسلے میں کئی بار ہمارے گھر پولیس کے دھاوے ہوتے رہے۔ اور تلاشی لی جاتی رہی۔ خفیہ پولیس کے عہدہ دار تلاشی کے دوران مجھ سے یہ کہا کرتے تھے کہ تمہارا گھر عجیب بھول بھلیاں ہے۔ کیا تمہارے آباواجداد کمیونسٹوں کے روپوش ہونے اور پناہ لینے کے لیے ہی اس طرح کا مکان بنا رکھے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ میں نے وکالت شروع کردی تھی۔ اور روپوش کمیونسٹ قائدین کی وکالت کرنے لگا تھا اور ان قائدین کی رہائی کے لیے حبس بیجا کی درخواستیں ہائی کورٹ میں پیش کی جاتی رہیں۔ ان سیاسی مقدمات میں میری رہنمائی بیرسٹر عطاالرحمٰن مرحوم اور غلام پنجتن صاحب کیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ عدالت عالیہ کے اس وقت کے چیف جسٹس نے سرکاری وکیل کو اپنے اجلاس پر طلب کرکے یہ استفسار

کیا کرکیا منوہر راج سکسینہ بحیثیت وکیل کمیونسٹ رہنماؤں کی پیروی کر رہے ہیں اور اس لیے پولس ان کے گھر کی بار بار تلاشی لے کر انھیں اپنے فرض سے باز رکھنا چاہتی ہے۔ اور اگر ایسا ہے تو آپ پولس کو آگاہ کریں کہ وہ سکسینہ کو پریشان نہ کریں۔ روپوشی کے زمانے میں راج کبھی کبھار ہم لوگوں سے ملنے آیا جایا کرتے تھے ایک بار ایسا ہوا کہ وہ پہنچنے ہی والے تھے کہ پولس نے میرے مکان کو گھیرے میں لے لیا راج سائیکل پر آئے اور میرے آفس کی کھڑکی پر پیر بھی دھرنے نہ پائے تھے کہ میرا اشارہ پاکر گلی کے دوسرے سرے سے غائب ہوگئے اور پولس انھیں پہچان نہ سکی۔ راج کی روپوشی کے زمانے میں شاید فروری ۱۹۴۸ء میں ان کی بیوی کو کیلا کو انتہائی رازداری برتتے ہوئے وجے واڑہ لے گیا جہاں راج روپوش تھے اور وہاں انھیں چھوڑ کر حیدرآباد لوٹ آیا۔

راج نے کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں کے ساتھ ٹریڈ یونین تحریک میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ کامریڈ مخدوم۔ کامریڈ وی۔ ڈی دیشپانڈے۔ کامریڈ ناگاپورکر۔ جناب جواد رضوی اور دیگر احباب کے ساتھ مختلف یونینوں سے وابستہ ہوگئے۔ ٹریڈ یونین تحریک بڑھتی گئی ہڑتال جلسے جلوس ہونے لگے۔ حکومت کی طرف سے بار بار وارنٹ گرفتاری ان رہنماؤں کے خلاف جاری ہوتے رہے۔ اور گرفتاری سے بچنے کے لیے وہ روپوش ہوجایا کرتے تھے۔ اسی زمانے کا ایک اہم واقعہ جو غالباً ۱۹۴۸ء کا ہے راج بہادر گوڑ جنھیں گرفتار کر کے جیل بھیجا گیا تھا۔ جیل سے دانتوں کے علاج کے لیے عثمانیہ دواخانہ لائے گئے علاج کا بہانہ تھا اور فراری عین مقصد تھا اس لیے بڑی خوبی سے پلان بنایا گیا اور انتہائی ڈرامائی طریقہ سے راج کو دواخانہ کے مردہ خانہ کے احاطہ سے فرار کرا دیا گیا۔ اس ڈرامہ میں ڈاکٹر یس پیرا نچے۔ جناب رفیع احمد۔ کامریڈ نظام الدین اور باسط نے بڑی خوبی سے اپنا کردار نبھایا۔

اسی زمانہ میں کمیونسٹ رہنماؤں کی قانونی مدافعت کے لیے ایک کمیٹی "پیپولز ڈیفنس کمیٹی" PeoplesDefence Committee کا قیام عمل میں آیا جس کا مجھے معتمد مقرر کیا گیا۔ بحیثیت معتمد ڈیفنس کمیٹی کمیونسٹ سیاسی قائدین سے ملاقات کے لیے مجھے اکثر جیل جانا پڑتا تھا۔ اس زمانہ میں ان رہنماؤں سے ملاقات کی شرائط بھی کافی کڑی تھیں۔ ملاقات کے لیے ہوم سکریٹری

سے اجازت کا لزوم تھا اور اجازت بھی بڑی مشکل سے ملتی تھی جیل میں ہماری ملاقاتیں عہدہ دارانِ جیل کے بالمواجہ ہوا کرتی تھیں ملاقات کے لیے ایک خاص میز بنوایا گیا تھا۔ جس کے درمیان ایک جالی نصب کردی جاتی تھی میز کی ایک جانب سیاسی رہنما دوسری طرف وکیل۔ انہی ملاقاتوں کے درمیان راج کو کچھ کتب اور کھانے پینے کی چیزیں پہنچائی جاتی تھیں۔ اور اسی دوران راز کی چٹھیاں بھی ان تک پہنچا دی جاتی تھیں۔

راج بہادر گوڑ تلنگانہ ہتھیار بند لڑائی میں اپریل ۱۹۵۱ء میں راج کنڈہ کی پہاڑیوں میں گرفتار ہوئے ان کی گرفتاری کو مقامی پولس نے اپنا ایک بہت بڑا کارنامہ سمجھا اور اس گرفتاری کی خبر کو آگ کی طرح پھیلا دیا۔ اس وقت ریاست حیدرآباد میں ملٹری حکومت کا دور دورہ تھا۔ کمیونسٹ تحریک کو بُری طرح کچلا جا رہا تھا۔ اس ظلم و استبداد کی حکمرانی میں راج کی زندگی کو خطرہ تھا۔ ہم سب ان کی گرفتاری سے بہت زیادہ فکرمند اور پریشان تھے۔ میں راج کے والد کو لے کر ورنگل پہنچا جہاں راج کو بے رحم ملٹری حکمراں جس کا نام ننجپا Nanjappa تھا۔ اپنے ملٹری ہیڈکوارٹر میں قید کر رکھا تھا۔ راج کی رہائی کے لیے میں اور راج کے والد ننجپا سے ملنے ان کے ہیڈکوارٹر پہنچے۔ جب راج کے والد راج کی رہائی کی درخواست کی تو ملٹری آفیسر آگ بگولہ ہو گیا اور کہنے لگا کہ تلنگانہ کی تحریک کے سلسلہ میں جن لوگوں کا قتل ہوا ہے۔ اس کا ذمہ دار تیرا بیٹا ہے اور تو ایسے آدمی کو چھڑانے آیا ہے۔ تیرے بیٹے کو تو گرفتاری کے ساتھ ہی فوراً گولی مار دی جاتی مگر چوں کہ اس کی گرفتاری کی اطلاع حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کو پہنچ چکی تھی اور اخباروں میں بھی خبر شائع ہو چکی تھی اس لیے تیرے بیٹے کی جان بچ گئی غرض اس نے راج سے ملنے اور انھیں رہا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اسی دوران ہمیں معلوم ہوا کہ راج کو نلگنڈہ منتقل کیا جا رہا ہے۔ ہم بھی ورنگل سے نلگنڈہ پہنچے۔ راج نلگنڈہ پولس اسٹیشن میں موجود تھے۔ پولس اسٹیشن کے سلاخوں والی ایک کھڑکی سے ہم نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا میں نے فوری ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اجلاس پر ضمانت کی درخواست پیش کر دی۔ مجسٹریٹ نے درخواست ضمانت منظور کر دی مگر اسی دوران راج کو قانون نظر بندی کے تحت احکام نظر بندی تعمیل کر دیے گئے۔ اس وقت کے کلکٹر جناب ہادی جعفری تھے۔ اسی رات ان کے مکان پہنچ کر میں نے درخواستِ رہائی پیش کر دی۔ مگر کلکٹر صاحب کوئی فیصلہ صادر کیے بغیر رخصت حاصل کر کے بلدہ روانہ

ہوگئے۔ جب راج راجیہ سبھا کے لیے منتخب ہوئے تو انھیں ڈاکٹر رادھا کرشنن کی ہدایت پر جو کہ اس وقت نائب صدر جمہوریہ ہند تھے راج کو ماہ مئی ۱۹۵۲ء میں نظر بندی سے رہا کر دیا گیا۔ گو راج کا انتخاب راجیہ سبھا کے لیے چار سالہ تھا مگر میعاد کے اختتام پر انھیں دوسری بار راجیہ سبھا کا ممبر چن لیا گیا۔ اس طرح وہ ۱۹۶۲ء تک راجیہ سبھا کے رکن رہے۔

راجیہ سبھا کی رکنیت کے زمانہ میں راج کا قیام کمیونسٹ پارٹی کے ہیڈ کوارٹرس Windsor Place نئی دہلی میں رہا۔ اس زمانہ میں میں اور میری بیوی کانتا کچھ دن ان کے ہاں ٹھہرے اور دیکھا کہ راج اپنی زندہ دلی کے باعث اپنے پارٹی کے ساتھیوں اور ممبران پارلیمنٹ میں کافی مقبول نظر آئے۔ چوں کہ راج میں خاموش رہنے کی عادت نہیں ہے۔ اس لیے وہ دوسروں کو بھی خاموش نہیں رہنے دیتے تھے۔

جس زمانے میں کمیونسٹ پارٹی کانگریس اور دیگر سیاسی جماعتوں پر حکومت حیدرآباد کی جانب سے پابندی لگا دی گئی تھی چند ترقی پسند احباب نے ایک نئی جماعت ' پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی " Peoples' Democratic Party کے نام سے قائم کی۔ اس پارٹی کی عاملہ کا میں بھی ایک رکن تھا۔ بعدازاں اس پارٹی کو وسیع بنیادوں پر " پیپلز ڈیموکریٹک فرنٹ " Peoples' Democratic Front "عوامی جمہوری محاذ" میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس زمانے میں پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں کے چناؤ کا اعلان کیا گیا۔ عوامی محاذ میں شامل رہنماؤں میں قابل ذکر ڈاکٹر جے سوریہ نائیڈو۔ جناب اختر حسن۔ جناب خورشید حسن۔ جناب وی۔ڈی دیش پانڈے ہیں۔ اس وقت کے انتخابی جلسوں میں کثرت سے عوام شریک ہوتے اور محاذ۔ Front کے امیدواروں کی تائید کا اظہار کرتے تھے۔ انتخابات کے زمانے میں مجھے نظر بند رہنماؤں سے ملاقات کرنے جیل جانا پڑتا تھا۔ مرہٹواڑہ کے چند کمیونسٹ لیڈر اورنگ آباد جیل میں نظر بند تھے۔ ان کے پرچۂ نامزدگی کی خانہ پری کے لیے اورنگ آباد جیل بھی جانا پڑا۔ ۱۹۶۲ء میں راج حلقہ شاہ علی بنڈہ کے امیدوار کی حیثیت سے انتخابات میں حصہ لیا۔ تمام لوگوں کا خیال تھا کہ راج اس حلقہ سے انتخاب جیت جائیں گے۔ مگر توقع کے خلاف راج کو شکست ہوئی۔ راج کے الکشن ہار جانے پر اس حلقہ کے بیشتر احباب الکشن آفس پہنچ کر اظہار افسوس کرتے رہے۔ جس پر کامریڈ مخدوم محی الدین نے کہا کہ

جتنے لوگ اظہار افسوس کے لیے ہم سے مل رہے ہیں کاش وہی حضرات راج کو ووٹ دے دیتے تو راج جیت جاتے۔

۱۹۷۸ء میں پارلیمنٹ کے حلقہ سکندرآباد کے لوک سبھا انتخابات کے لیے راج کو کمیونسٹ پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے کھڑا کیا گیا۔ اس زمانے میں مجھے راج کے ساتھ حلقہ سکندرآباد کی اکثر بستیوں میں گھومنا پھرنا پڑتا تھا۔ وکلاء برادری اور موکلین کے علاوہ میرے دوست احباب بھی اس حلقہ میں کافی تعداد میں موجود تھے۔ جس پر راج نے ایک بار تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر میری جگہ منوہر راج کھڑے ہو جاتے تو انھیں اس حلقہ سے زیادہ ووٹ مل سکتے تھے۔

راج بہادر گوڑ اردو زبان کی بقا و ترویج میں ایک عرصہ سے لگے ہوئے ہیں۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش سے آپ کی وابستگی لگ بھگ چار دہوں سے چلی آ رہی ہے۔ اور آج اردو کی ہر مجلس اور محفل میں راج موجود نظر آتے ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے آپ ایک سرگرم رکن بھی ہیں اور رہنما بھی۔ راج انجمن ترقی اردو (ہند) کے حیاتی رکن ہیں۔ دو دفعہ نائب صدر منتخب ہو چکے ہیں اور وہ انجمن کی ادبی کمیٹی کے بھی رکن ہیں۔

راج نے اردو زبان کی بقا و ترویج کے لیے اپنی ہمہ وقتی خدمات کا نہ صرف نذرانہ پیش کیا ہے بلکہ اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بھی وقف کر دیا ہے۔

انھوں نے گجرال کمیٹی کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے سے متعلق امور کا جائزہ لینے والی سردار جعفری کمیٹی کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے اس کمیٹی کی رپورٹ کی تیاری میں اپنا زیادہ وقت اور تعاون دیا۔

اردو یونیورسٹی کے قیام کا جائزہ لینے کے لیے جو کمیٹی جناب عزیز قریشی صاحب کی قیادت میں قائم کی گئی تھی۔ راج اس کمیٹی کے بھی رکن رہے۔ اردو یونیورسٹی کے قیام سے متعلق بہتر مواد اور اعداد و شمار بھی آپ نے فراہم کیے تھے۔

راج نے اپنی عمر اور صحت کا خیال کرتے ہوئے اب کمیونسٹ پارٹی کے کسی عہدہ کو قبول نہیں کیا بلکہ نوجوان خون کو آگے بڑھنے کا موقع عطا کیا اور اس طرح اپنی مصروفیت کا زیادہ حصہ ادبی مطالعہ پر صرف کرنے لگے ہیں۔ جس کے باعث وہ مختلف ادبی کتب اور شعری مجموعوں پر

تنقید وتبصرہ فرماتے ہیں۔ راج کی تین کتابیں" ادبی مطالعے" "ادبی مناظر" اور "ادبی جائزے" شائع ہو چکی ہیں۔ راج کو چند سال پہلے دہلی اردو اکیڈمی کی جانب سے انعام سے نوازا گیا۔

ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کے پھوٹ پڑنے پر راج بہت بے چین ہو جاتے ہیں اپنی زبان وقلم سے فرقہ پرستی اور مذہبی منافرت کے خلاف آواز اٹھانے اور لڑنے نکل پڑتے ہیں۔

راج کو اپنے سیاسی مزاج ادبی ذوق سے ہٹ کر دستوری مسائل اور قانون سے بھی بڑی دلچسپی ہے وہ اکثر پارٹی سے ہمدردی رکھنے والے وکلاء صاحبان کی گروپ میٹنگ کو مخاطب کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنے وکیل دوست احباب سے سپریم کورٹ کے فیصلوں پر تبادلہ خیال بھی کرتے ہیں۔ دھرم شاستر اور شرعی مسائل پر ان کا اپنا علاحدہ نظریہ ہے ان تمام باتوں سے مجھے یہ لگتا ہے کہ راج اگر ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرنے کی بجائے وکالت کی سند حاصل کر لیتے تو ایک کامیاب ترین وکیل ثابت ہوتے۔

آخر میں اتنا عرض کروں گا کہ میں راج کے طالب علمی ہی کے زمانے سے ان کا ہم سفر رہا ہوں راج پچھترویں سال کی منزل پر پہنچ کر گو جسمانی طور پر تھکن محسوس کرنے لگے ہیں۔ مگر ان کی زبان اور قلم کبھی تھکے ہیں نہ تھکیں گے۔ راج اس مقولہ پر اپنی زندگی بتا رہے ہیں۔

"زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں"

شمیم جہاں

ہمارے گوڑ صاحب

برف کی طرح سفید بال، شام کی طرح سانولا رنگ، ذہین مسکراتی پیار بھری مشفق آنکھیں، درمیانہ قد، ہنستا ہوا چہرہ، یہ ہیں ہمارے گوڑ صاحب۔ ان کی ہمہ جہت، رنگارنگ اور باغ و بہار شخصیت کی تعریف کیا اور کیسے کروں۔ ان کی شخصیت میں اوصاف کی افراط اور میرے پاس الفاظ کا فقدان۔ بس اتنا کہہ سکتی ہوں کہ بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ مگر حکم ہے کہ اختصار سے کام لوں۔

گوڑ صاحب سے پہلی ملاقات انجمن میں ہوئی، انھوں نے بے لوث محبت، خلوص اور بے تکلفی کی ایسی فضا قائم کی کہ مجھے ان سے ایک عقیدت سی ہو گئی۔ اُن سے میرا یہ رشتہ تقریباً اٹھارہ سال پُرانا ہے، لیکن میں اس رشتے کو آج تک کوئی نام نہیں دے سکی۔ کبھی وہ بزرگ، مشفق باپ کی طرح پیش آتے ہیں۔ کبھی بڑے بھائی کی طرح ہمت و حوصلہ بڑھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کبھی ہم عمر دوست کی طرح ہنسی مذاق کرتے ہوئے ماحول کو قہقہہ زار بنا دیتے ہیں۔

اُردو گھر کی لفٹ کا دروازہ کھلتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ گوڑ صاحب تشریف لائے ہیں۔ وہیں سے آواز لگاتے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں۔ اے خلیق! سنو، تمھاری لفٹ کام نہیں کر رہی ہے۔ یا جو انھیں کہنا ہے، وہ لفٹ کے دروازے سے نکلتے ہی کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ کمرے میں پہنچتے ہی کسی بھی موضوع پر گرما گرم بحث شروع، بحث کا موضوع اکثر وہ اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ لیکن گوڑ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ بحث کا موضوع خواہ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو، تلخی پر ختم کبھی نہیں ہوتا۔

انجمن ترقی اُردو سے گوڑ صاحب کا تعلق صرف یہی نہیں ہے کہ وہ اس کے نائب صدر رہے اور اب مجلسِ عام اور مجلسِ عاملہ کے رُکن ہیں بلکہ انجمن ترقی اُردو سے ان کا روحانی تعلق ہے، جیسا کسی عابد کا مسجد سے اور پجاری کا مندر سے۔ ممکن نہیں کہ گوڑ صاحب دلی تشریف لائیں اور اُردو کے اس مندر میں حاضری نہ دیں۔

گوڑ صاحب اپنے مرتبے، علم اور اب عمر کے اعتبار سے بھی بزرگ کہلانے کے مستحق ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ان کی عزت اور احترام اس طرح کیا جائے جیسے اپنے بزرگوں کا کیا جاتا ہے، لیکن وہ بندۂ خدا موقع ہی نہیں دیتے۔ ان کی سیمابی فطرت لمحہ بھر کے لیے بھی انھیں خاموش نہیں بیٹھنے دیتی۔ زندہ دلی انھیں بوڑھا نہیں ہونے دیتی۔ ان کی خوش مزاجی زندگی کی تمام کڑواہٹوں کو پی جاتی ہے۔ وہ اپنے قہقہوں میں ہر دُکھ درد کو اس طرح اُڑا دیتے ہیں جیسے سگریٹ کا دُھواں۔ ایسا نہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو کوئی غم نہیں کوئی دُکھ نہیں۔ رنج و غم تو انسان کے پیچھے سائے کی طرح لگے رہتے ہیں۔ لیکن انھیں زندگی کو خوش اسلوبی سے جینے کا ہُنر آتا ہے۔ گوڑ صاحب خوشی بانٹتے ہیں، غم نہیں بانٹتے۔ اپنے غموں اور دُکھوں سے وہ تنہا لڑنے کے قایل ہیں۔ زندگی میں ان کا رویّہ کچھ اس طرح ہے ؎

ہم کو طوفان سے لڑنے کا ہُنر آتا ہے
آپ ساحل پہ کھڑے ہو کے تماشا دیکھیں

گوڑ صاحب کو میں نے کبھی خاموش یا اداس نہیں دیکھا۔ ماحول کتنا ہی سنجیدہ کیوں نہ ہو وہ مزاح کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ اپنے لطیفے سنانے میں تنا ہنستے اور ہنساتے ہیں کہ آدابِ محفل بھی بھول جاتے ہیں۔ ایک لطیفہ جو ڈاکٹر صاحب نے ہمیں سنایا، آپ بھی سُنیے: اُردو گھر میں ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کے کمرے میں کچھ حضرات بیٹھے تھے۔ گوڑ صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ بات چل رہی تھی عورتوں اور مردوں کے مساوی حقوق کی۔ گوڑ صاحب نے عورتوں کی حمایت میں بولتے ہوئے یہ واقعہ سنایا: ”میں اور میری بیوی ایک پارٹی میں شریک تھے۔ وہاں

یہی بحث چل رہی تھی۔ ایک صاحب کہنے لگے، بھئی! عورتیں چھوٹے موٹے کام تو کر سکتی ہیں کوئی بڑا کام کرنا عورتوں کے بس کا نہیں۔ کسی بڑی دعوت کا انتظام کرنا ہو تو مرد کرتے ہیں۔ اچھا اور زیادہ کھانا بنوانا ہو تو مردوں کو بلایا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سُن کر ہماری بیوی نے جواب دیا۔ ایک دو بچّہ پیدا کرنا ہو تو عورتیں کر دیں گی۔ اگر دس یا پانچ بچّے پیدا کرنا ہو تو مرد خود کریں۔

میں نے ہمیشہ گوڑ صاحب کو کمزوروں کی حمایت میں بولتے سُنا ہے۔ سماج میں عورتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور نا انصافیوں کے خلاف آواز اٹھاتے سُنا۔ میں گوڑ صاحب سے نہایت مؤدبانہ طور سے معذرت کے ساتھ ایک سوال (جو مجھے دسمبر ۱۹۸۸ء سے پریشان کیے ہوئے ہے اور میرے سر میں ہمیشہ سر اٹھاتا رہتا ہے) پوچھنے کی گستاخی کرنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ اپنی ازدواجی زندگی میں بھی عورتوں کے ساتھ اپنے انصاف کے اصولوں پر عمل پیرا ہیں؟ اگرچہ یہ سوال بہت نجی قسم کا ہے اور جسے اٹھانے کا مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا۔ لیکن گوڑ صاحب کوئی معمولی شخصیت نہیں ہیں اور بڑے لوگوں کی نجی زندگی میں جھانکنے کی روایت بہت پرانی ہے۔

آج فرقہ پرستی اور منافرت کے اِس دور میں ہر شخص اپنی عیاری اور نفرت کو چھُپانے کے لیے سیکولرزم کا خول پہن کر بھائی چارے کا گیت الاپ رہا ہے۔ ملک و قوم کی خدمت کا نعرہ لگا رہا ہے۔ لیکن قول و فعل کا یہ تضاد چھپا نہیں ہے۔ پنڈت آنند نرائن ملاّ صاحب کا یہ شعر ایسے ہی لوگوں پر صادق آتا ہے ؎

نعرہ گرم انقلاب میں نے بھی ہاں سُنا تو ہے
جام و سبو کے آس پاس دار و رسن سے دُور دُور

لیکن راج بہادر گوڑ صاحب ان چند لوگوں میں سے ہیں جو انسان دوستی اور سیکولرزم کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔ انسانیت ان کا ایمان ہے۔ محبت ان کا مذہب۔ گوڑ صاحب انسانیت کی اعلا قدروں کے محافظ، ملک و قوم اور اُردو زبان کے سچّے مجاہد ہیں۔ انھوں نے جام و سبو کی زندگی ترک کر کے دار و رسن کا راستہ اختیار کیا اور اپنی زندگی کا وہ خوبصورت

دورجب انسان دنیا کی ہر خوشی اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ دوسروں کے بارے میں سوچنے کی اسے کہاں فرصت ہوتی ہے، وہ تو بس اپنی خواہشات اور تمناؤں کی تکمیل چاہتا ہے۔ لیکن گوڑ صاحب نے یہ وقت ملک و قوم اور ملک کے پس ماندہ اور ظلم کی چکّی میں پستے ہوئے غریب مزدور بھائیوں کی خدمت کرنے میں گزارا۔

تلنگانہ کسان مزدور تحریک کے سلسلے میں بارہا جیل گئے۔ روپوش رہے، ہزار صعوبتیں برداشت کیں، لیکن یہ مردِ آہن اپنے موقف سے نہیں ہٹا۔ گوڑ صاحب سیاست کے میدان میں ہمیشہ سرگرم رہے۔ دوبار الیکشن بھی لڑا۔ لیکن اپنے علاقے میں انتہائی مقبول ہونے کے باوجود الکشن ہار گئے۔ چوں کہ وہ ایک صاف سچے اور کھرے انسان ہیں (اور سچائی، ایمان داری کا سیاست سے جنم جنم کا بیر ہے) اس لیے سیاسی داؤں پیچ اور اوچھے سیاسی ہتھکنڈوں کا انھوں نے استعمال نہیں کیا ورنہ وہ بھی آج منسٹر ہوتے۔ گوڑ صاحب دوبار راجیہ سبھا کے ممبر چنے گئے اور آج بھی سیاسی اور غیر سیاسی تنظیموں سے نہ صرف وابستہ ہیں بلکہ سرگرم اور فعاّل ہیں۔

اُردو زبان ڈاکٹر صاحب کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ اس کی بقاء اور فروغ کے لیے ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ جب اُردو تحریک کی تاریخ لکھی جائے گی تو گوڑ صاحب اُردو کے ان چند عاشقوں میں سے ہیں جن کے نام کے بغیر یہ تاریخ نامکمل ہوگی۔ اُردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف ان کی آواز ہندوستان کے کونے کونے میں سُنی جاسکتی ہے۔ ان کا سب سے بڑا اور قیمتی اثاثہ اُردو کی کتابیں ہیں جنھیں وہ ہمیشہ خرید کر پڑھتے ہیں۔ گوڑ صاحب جب بھی دلی تشریف لاتے ہیں انجمن کی بُک ڈپو سے خاصی تعداد میں کتابیں خریدتے ہیں۔ شاید اب ان کا سب سے بڑا شوق یہی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ مجھے اپنے بزرگوں کی محبت، شفقت اور پیار بے حساب ملا اور مجھے بھی بزرگوں کی عزت واحترام کرنے اور ان کی پیار بھری ڈانٹ کھانے

ہیں جو خوشی اور قلبی سکون حاصل ہوتا ہے، میں بیان نہیں کر سکتی۔ یہ ہمارے بزرگ ہی تو ہیں جو تھوڑی دیر کے لیے ہمارا بچپن ہمیں لوٹا دیتے ہیں۔ گوڑ صاحب ان محترم ہستیوں میں سے ایک ہیں، جو نہایت سادگی، اپنے پن اور بے تکلفی سے کچھ بھی کہہ دیتے ہیں اور بُرا نہیں لگتا۔

ایک دن ڈاکٹر خلیق انجم نے مجھے شمیم صاحبہ! کہہ کر کسی کام کے لیے بُلایا، کہنے لگے: "یہ کیا تم نے شمیم صاحبہ! صاحبہ! لگا رکھا ہے۔ یہ اپنی بچی ہے میں تو اسے کبھی صاحبہ نہیں کہوں گا۔" اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ گوڑ صاحب آتے ہی کہتے ہیں۔ "شمیم آج میں تیرے ہاتھ کی چائے پیوں گا۔" اور میں خود ان کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔

گوڑ صاحب کا بہت عرصے سے اصرار تھا کہ میں اُن کے ساتھ حیدر آباد گھوم کر آؤں۔ یہ دسمبر ۱۹۸۸ء کی بات ہے۔ میں اُردو گھر پہنچی، دیکھا گوڑ صاحب بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔ "میں طے کر کے آیا ہوں کہ اس مرتبہ تمھیں حیدر آباد لے کر جاؤں گا۔ موقع اچھا ہے۔ میری بیوی بھی ساتھ جا رہی ہیں۔ ایک دو لوگ اور ہیں۔ سفر اچھا رہے گا۔ اب نا کی گنجائش نہیں ہے۔ بس فوراً تیار ہو جاؤ۔ ذرا ہمارا حیدر آباد بھی دیکھو، تمھاری دلّی سے اچھا ہے۔" ان کے اصرار کے سامنے میں واقعی نا نہیں کہہ سکی اور رخت سفر باندھ لیا۔ کب حیدر آباد آگیا، گوڑ صاحب کی پُر لطف باتوں میں سفر کا پتا ہی نہیں چلا۔ حیدر آباد پہنچ کر ایک دن گوڑ صاحب کے یہاں قیام کیا۔ اگلے دن انھوں نے مجھے حسینی شاہد صاحب مرحوم اور ان کی بیگم ساجدہ آپا کی تحویل میں دے دیا، اور مخدوم محی الدین صاحب کے صاحبزادے نصرت محی الدین صاحب کو اور اپنی بہن اودھیش رانی کو مجھے حیدر آباد کی سیر کرانے کا چارج دے کر خود غائب ہو گئے۔ اگرچہ ان صاحبان نے میری خاطر تواضع اور سیر کرانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن جنھوں نے حیدر آباد گھمانے کا دعویٰ کیا تھا، ان سے میری ملاقات چار دن بعد انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش کے دفتر میں ہوئی۔ گوڑ صاحب نے بتایا کہ وہ کسی میٹنگ کے سلسلے میں حیدر آباد سے باہر گئے ہوئے تھے اور کل پھر جا رہے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ حیدر آباد میں ان کی مصروفیات

کچھ اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔

گوڑ صاحب عمر کی جس منزل میں ہیں اس عمر میں انسان کی دماغی اور جسمانی قوتیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ مزاج میں چڑچڑاپن آجاتا ہے۔ گویا زندہ رہ کر بھی انسان زندگی سے بہت دور ہو جاتا ہے۔ اکثر لوگ بیماری اور بڑھاپے کا رونا روتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن گوڑ صاحب جو آج سے پندرہ بیس سال پہلے تھے وہی آج بھی ہیں۔ وہی سیاسی، سماجی سرگرمیاں، محفلیں، وہی مسلسل سفر، وہی خوش مزاجی اور زندہ دلی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صاحب صحیح معنوں میں زندہ دلانِ حیدرآباد کی نمائندہ شخصیت ہیں۔

میں گوڑ صاحب کی عقیدت مند ہوں، نیاز مند ہوں اور ان کی صحت و سلامتی کی خواہش مند ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔

ڈاکٹر صادقہ ذکی

خواتین ادب اور راج بہادر گوڑ

راج بہادر گوڑ کی تنقیدی تحریروں کا ایک متواتر پہلو خواتین کی سماجی حیثیت ہے۔ انھوں نے بعض موقعوں پر سرسری طور پر اور بعض جگہ بطور خاص عورتوں کی تعلیم و ترقی کو موضوع بنایا ہے۔ دراصل راج بہادر گوڑ ادب کو سیاسی، سماجی، ثقافتی اور معاشی پس منظر کے ساتھ دیکھنے کے عادی ہیں۔ اور اس بات کے قائل ہیں کہ معاشرہ میں مرد اور عورت دونوں کو یکساں طور پر ترقی کرنے کے مواقع حاصل ہوں، لیکن تاریخی حقیقتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی دور کے فکر و فن کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے خواتین کے سماجی مرتبے، تعلیمی صورت حال، اور عام مسائل کو نظر انداز نہیں کیا۔ کسی ادیب پر لکھتے ہوئے کم از کم آزادیِ نسواں کے تعلق سے اس پر نظر ضرور ڈالی ہے۔ اور اپنی بے لاگ رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ کالی داس کی تخلیقات کے نسوانی کردار ہوں، خواتین کربلا ہوں، حضرت محل ہوں، یا "بی اماں" گوڑ صاحب ایسے تاریخی نسوانی کارناموں پر عقیدت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اردو ادب کا دور نشاۃ الثانیہ ہو یا ترقی پسند تحریک کا ذکر ہو، اقبال کے فکر و فن پر بات ہو۔ بیدی کے افسانے ہوں یا قمر جمالی پر مضمون لکھ رہے ہوں۔ راج بہادر گوڑ آزادیِ نسواں اور سماجی انصاف کے نقطہ نظر سے جائزہ لیتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ انھوں نے بطور خاص سروجنی نائیڈو کے فکر و فن کو سیاسی سماجی اور ثقافتی حالات کی روشنی میں پرکھا ہے۔ منورما دیوان کی کتاب "انقلاب زندہ باد" پر بھی انھوں نے شاعرانہ تاثرات کا اظہار کیا ہے ان کی اکثر انگریزی اور اردو تحریروں میں صنفِ نازک پر اظہار خیال ملتا ہے۔ انگریزی میں بھی

انھوں نے خواتین پر لکھا ہے۔ انگریزی میں مسلم خواتین پر کئی ماہ پیشتر ایک مقالہ تحریر کیا تھا جو سر دست سامنے نہیں ہے۔

بزرگ ادیب راج بہادر گوڑ کی تحریروں کا نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ ادب پاروں کی نبض سے روح عصر کو شناخت کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "ادب سے اس کے دور کا مزاج جھانکتا نظر آتا ہے۔ کالی داس کے ڈراموں شکنتلا اور وکرم اروشی کے متعلق ادیب کملا رتنم کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:[۱]

> دشینت کا شکنتلا کو پہچاننے سے انکار کر دینا اور اس کا واپس اپنی کٹیا میں آجانا اور بھرت کو پال پوس کر بڑا کرنا یا وکرم اروشی میں شہزادی کا اپنی داسی سے کہنا کہ اس کا شوہر اس کی بیوی کی عزت کرتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ کہیں اور آنکھیں لڑا رہا ہے۔"

اس سلسلے میں راج بہادر صاحب کا خیال ہے کہ کالی داس کے زمانے میں مرد بہت بزدل تھا۔ لیکن عورت کی انا بیدار تھی گویا کالی داس نے اپنے دور کی ایک سماجی حقیقت کو آشکار کیا جو عصری تو تھی لیکن یہ آج بھی صحیح ہے۔ اور اس وقت تک صحیح رہے گی جب تک کہ زندگی کے ہر شعبے میں مرد کی برتری باقی رہے گی اور عورت شریک حیات تو ہوگی لیکن شریک کارزار حیات نہ ہوگی۔ گوڑ صاحب کا خیال بڑی حد تک درست ہے۔ لیکن واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ آج شریک کارزار حیات ہونے کے باوجود بھی مرد کا کردار عورت کے مقابلے میں زیادہ مضبوط نہیں ہو سکا۔ یہ عظیم ادب کا ایک سماجیاتی پہلو ہی نہیں ہے بلکہ ایک دائمی حقیقت کا انکشاف بھی کرتا ہے۔ عورت ہمیشہ اپنے ایثار سے اپنی انا کی حفاظت کرتی رہی ہے۔ ہندوستانی عورت کے کردار میں یہ خصوصیت زمانہ قدیم سے تاحال دیکھی جا سکتی ہے۔ بات ماضی کی ہو یا حال کی طبقۂ نسواں ہر سطح پر درد و غم کو سمیٹے ہوئے نظر آتی ہے۔ اور زیادہ تر درد و غم کا ذخیرہ بنانے میں مرد پیش پیش ہوتا ہے اور پھر وہ خود بھی ان خود کردہ گناہوں سے آزردہ نظر آتا ہے۔ کبھی کبھار یہ تلخیاں ہمارے لوک گیتوں میں نظر آجاتی ہیں۔ گیت انسان کی معصوم تمناؤں اور زندگی کی چھوٹی موٹی حقیقتوں کو جذباتی سطح پر پیش کرتے ہیں۔ غیر مہذب تمدن میں مرد عورتوں کو مارنا بے حد ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو

ان کی فوقیت یا برتری کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ اس مقدس عمل کے فوراً بعد وہ اپنی بیوی کو مٹھائی کھلاتا ہے۔ اور ایسا ہونا کوئی غیر فطری بات بھی نہیں کہ ہر فتح اور عظیم کامرانی کے بعد انسان مٹھائی کھاتا اور کھلاتا ہے۔ راج بہادر صاحب نے دیوندر ستیارتھی کا "گاتا جائے ہندوستان" میں سے ماہی گیروں کے ایک گیت کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں "فنی کشیدہ کاری ہی کو سب کچھ سمجھنے والے اس پر ناک بھوں چڑھائیں گے۔ لیکن کیا اس گیت میں غریب محنت کش عورت کی زندگی کا کربناک کھردراپن پوری شدت سے ظاہر نہیں ہوتا؟" اس گیت میں یہ کہا گیا ہے کہ "بیوی کو نہ مارنا" ورنہ رات میں آرام نہ مل سکے گا۔ اس پر گوڑ صاحب کا یہ سوال "کیا اس سے زیادہ سخت انداز میں مرد کو شرمندہ کیا جا سکتا ہے۔" عوامی سطح کو بلند کرنے کے لیے شاید تعلیم و تہذیب اور شائستگی کے لیے سینکڑوں سال چاہئیں۔ لیکن کسی گہرے جمود پر ایک سوالیہ نشان لگا دینے سے حساس ذہن کو ٹھوکر تو ضرور لگتی ہے۔

گوڑ صاحب کے لکھنے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ خواہ کسی دور کے ادب کو اپنا موضوع بنائیں لیکن تقابلی سطح پر دنیا کے عظیم لکھنے والوں کی شمع ضرور روشن رکھتے ہیں تاکہ مجموعی طور پر ادب کی عظمت بھی سامنے رہے اور وہ سیاسی سماجی حالات بھی جو ادب کی تخلیق کا نتیجہ ہوتے ہیں کوئی زمانہ ہو اور کوئی جغرافیائی خطہ ہو۔ عورتوں کی کسمپرسی کی کہانیاں ادب کے حوالے سے کبھی کبھار ملتی رہی ہیں۔ اور وہ عام نسوانی کردار بھی جس میں حوصلہ، امنگ، تحمل، مشقت، ایثار اور نبرد آزمائی کی امتیازی قدریں ہوتی ہیں۔ اور بعض مرتبہ یہ کردار بزم حیات کی تاریخ کو بھی متعین کرتی ہیں۔ خواتین کربلا کی عظمت اور اہمیت کو انیسؔ کی شاعری کے ذیل میں جس طرح گوڑ صاحب نے دیکھا ہے۔ اس انداز سے شاید نہیں دیکھا گیا۔[۴] سترہویں صدی میں جاگیردارانہ سماج عروج پذیر تھا۔ سماجی اور ریاستی سطح پر ہنگامے ہوا کرتے تھے۔ لیکن گاؤں کی زندگی میں ایسی اتھل پتھل نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ "وادی گنگا کے کنارے زندگی ایسے ہی خراماں گزرتی جیسے گنگا کا دھارا"[۵] لیکن اٹھارویں صدی میں برطانوی سامراجی لوٹ نے ہندوستانی عوام کو جس طرح خالی کر دیا تھا اور ایک عظیم المیہ سے دوچار کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گومتی کے کنارے عزاداری حسین نے اس غم کو غلط کیا۔ نظیرؔ نے بھی یہ تباہی دیکھی تھی اور انیسؔ نے جس طرح حضرت شہربانو اور حضرت

زینب کے کردار پیش کیے ہیں ان سے نہ صرف نسوانی تاریخ کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ بلکہ مرثیہ گو کی ندرت فکر اور عصری تقاضوں سے آگہی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ انیسؔ کی عظمت بھی ہے۔ گوڑ صاحب نے اس پہلو پر جس رخ سے روشنی ڈالی ہے اس سے تحریک آزادی کے سلسلوں کو ملانا بہت آسان ہوسکتا ہے۔ حضرت زینب کم سن بچوں کو جنگ میں شامل ہونے اور ثابت قدمی سے جمے رہنے کے جو طریقے سمجھاتی ہیں۔ اس سے قوم کا نیا کردار ابھرنے میں مدد ملی ہے۔ رزمیہ روایات تازہ ہوئیں۔ اور چھاجانے والی اور ایک "عمومی غم" کو ہندوستانی سماج پر محیط کردینے والی قوت سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ ملا۔ راج بہادر صاحب نے لکھا ہے کہ انیسؔ کی عظیم شاعری کی سماجی افادیت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی عظیم جنگِ آزادی میں حضرت محل کا ایک مضبوط زبردست کردار ابھرتا ہے۔ جس کی تعمیر میں حضرت زینب کو بھی دخل ہے[۶]۔ خواتین کربلا سے حوصلہ، ہمت اور حق وجہاد کی فضا بننے میں مدد ملی۔ گوڑ صاحب کا یہ تخمینہ غلط نہیں ہے۔ تحریک آزادی میں اردو شاعری کا اپنا ایک اثر انگیز رول رہا ہے۔ دور جدید میں جوشؔ نے مرثیہ سے ایک نیا حوصلہ لینے کی مثال قائم کی۔ اسی طرح گوڑ صاحب انیسؔ کی مرثیہ نگاری میں سماجی سطح پر معنی خیز اثرات کی کارفرمائی کو محسوس کررہے ہیں۔

راج بہادر گوڑ نے بالعموم آزادی نسواں اور تحریک آزادی کے تقاضوں کے تعلق سے مختلف ادوار میں خواتین کی کارکردگی پر نظر کی ہے۔ انھوں نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ "جاگیردارانہ سماج میں عورت یا تو شمع خانہ ہے یا بازار میں شمع محفل۔ سماجی کشمکش میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔ البتہ صنعتی دور نے اسے آزاد تو کیا لیکن وسعت زنجیر تک۔ بورژوا جمالیات میں عورت کی طرف رویہ محض جنسیات کے تابع ہے۔ یہ تو ترقی پسند تحریک ہی ہے جس نے عورت کو انسان کے روپ میں دیکھا۔"[۷]

بزرگ ادیب نے کم وبیش بات صحیح لکھی ہے۔ لیکن ان کے اس خیال سے پوری طرح اتفاق کرنا مشکل ہے۔ ممکن ہے انھوں نے عالمی حالات کے پیش نظر جاگیردارانہ عہد کو دیکھنے کی کوشش کی ہو۔ ہندوستان کے سیاسی سماجی حالات اور دنیا کے سماجی حالات میں فرق ہے۔ ہندوستان کا جاگیردارانہ عہد نسبتاً طویل ہے۔ اسی جاگیردارانہ عہد میں دورِ نشاۃ الثانیہ

بھی شروع ہو جاتا ہے۔ جس کا آغاز سر سید کے دور سے ہوتا ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی سے تحریک آزادیِ نسواں کی جدوجہد شروع ہو جاتی ہے۔ اس تحریک کے تحت بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ ہندوستانی اور عالمی سطح پر رسائل کا اجراعمل میں آیا۔ یہ رسائل خواتین کے الجھے ہوئے مسائل تعلیمی جدوجہد اور آزادی سے متعلق بے چینیوں کے آئینہ دار ہیں۔ انگلستان میں عورتیں اپنے حقوق منوانے کے لیے پارلیمنٹ کے باہر توڑ پھوڑ کرتی ہیں۔ اور یہ اطلاعیں اخبارات میں چھپتی ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں خواتین جج کے عہدوں پر فائز نظر آتی ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں تحریک آزادیِ نسواں کا فروغ ہوتا ہے۔ جلسے کیے جاتے ہیں۔ آغازِ بیسویں صدی میں اسکالرشپ لے کر عطیہ فیضی لندن میں تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ ان سے بیشتر سروجنی نائیڈو انگلینڈ میں قیام پذیر تھیں۔ یہ لوگ اپنے وطن سے باہر رہ کر دنیا کے حالات کا مشاہدہ اور تجربہ کرتی ہیں۔ اور وطن میں واپس آکر تحریکِ آزادی اور تحریک آزادیِ نسواں اور تعلیم نسواں کی سرگرم کارکن بن جاتی ہیں۔ سرسید کے قیام لندن کے دوران لکھے گئے خطوط میں خواتین کی بیداری کی اطلاع ملتی ہے۔ شبلیؒ کے سفرنامے سے اٹلی اور آس پاس کی خواتین کی بیداری اور تعلیم و ترقی کے متعلق خبریں ملتی ہیں۔ حالیؔ جب چپ کی داد اور مناجات بیوہ لکھ رہے تھے تو اس وقت عالمی سطح پر حقوقِ نسواں کی تحریک چل رہی تھی۔ شروع بیسویں صدی اور اس سے بیشتر کے خواتین کے رسائل عالمی حالات کے کالم پیش کرتے تھے۔ نذیر احمد اور رسوا کے ناولوں کے نسوانی کرداروں سے لے کر پریم چند کے نسوانی کرداروں تک خواتین کی نئی تعلیم و تہذیب سے متعلق ایک نئی فضا تعمیر ہوتی ہے۔ ترقی پسند تحریک سے بیشتر تحریک آزادیِ نسواں کئی مراحل سے گزر چکی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک نے بھی عورت کو مختلف حیثیتوں سے دیکھا صرف جمالیاتی نقطۂ نظر ہی سے نہیں دیکھا۔

گوڑ صاحب یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ نشاۃ الثانیہ کی ہر تحریک کا ایک لازمی جز خواتین کی آزادی ہونا چاہیے۔ لیکن اس اعتبار سے وہ لبرل خیالات رکھنے والے ادیبوں شاعروں سے مایوس بھی نظر آتے ہیں۔ اقبال اور عورت کے ایک ذیلی عنوانؔ کے تحت انھوں نے لکھا ہے۔

"خواتین کی آزادی کے بارے میں اقبال کوئی ایسی بات نہیں کہنا چاہتے تھے۔ جو انھیں فرزندان

تمدن کے غصے کا ہدف بنادیئے وہ چاہتے تھے کہ عورت خود اس کا فیصلہ کرے کہ زمرد کا گلو بند یا آزادیٔ نسواں دونوں میں کون سی چیز زیادہ زینت بخش ہوگی۔ یا نسوانیت زن کا نگہبان ہے فقط مرد ــــ ظاہر ہے کہ اقبال کے خیالات تعلیم نسواں اور آزادیٔ نسواں کی نفی کرتے ہیں۔ اقبال کو عورت کے مسائل کا رسمی طور پر احساس ہے۔ وہ دل سے آزادیٔ نسواں کے حامی نہیں ہیں، اگرچہ تلخی حالات کو محسوس کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس عقدۂ مشکل کی کشود ممکن نہیں ہے۔ گوڑ صاحب خواتین کی پیچیدہ مسائل اور ان کی نمود سے آزردہ نظر آتے ہیں۔ معاشرہ کی ترقی اور صحت کا دارومدار عورت اور مرد دونوں کی کارکردگی پر ہوا کرتا ہے۔ جو انسانی ذہن کو انقلابی سمت کی جانب مبذول کردے۔ گوڑ صاحب ایسے ادب کو حقیقتاً عظیم ادب کے ذیل میں رکھتے ہیں گوڑ صاحب نے اپنے مضمون "بیدی ایک عظیم فن کار" میں یہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کے یہاں عورت کے کتنے روپ ہیں۔ اور کرب کے کتنے رنگ ہیں۔ بیدی کے نسوانی کرداروں پر گوڑ صاحب نے قدرے تفصیل سے قلم اٹھایا ہے۔ ان کی رائے ہے کہ بیدی کی متعدد کہانیوں میں "عورت" اپنی تمام تر نا آسودگیوں، کمزوریوں، آرزوؤں اور ارمانوں کے ساتھ بار بار آتی ہے۔ بیدی کی عورت مجاہد بھلے ہی نہ ہو لیکن بے چین ضرور ہے۔ اس کی یہ بے چینی قارئین کو سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ راج بہادر گوڑ نے ایک موقع پر کہا تھا ادب میں زندگی اپنے تمام اچھے اور برے پہلوؤں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے اور ادیب اپنی تخلیق سے ان اقدار کو ابھارتا ہے جو انسانیت کا سر اونچا کرتی ہیں۔ اور زندگی کو آگے بڑھاتی ہیں۔ یہ ارتقاء ادنیٰ سے اعلا اور اعلا سے اعلاتر کی طرف ہوتا ہے۔ عظیم ادب کی بات ہو یا زندگی کے ایثار طلب پہلوؤں کی بات ہو۔ راج بہادر گوڑ کے نوک قلم پر مخدوم کا ذکر ضرور آتا ہے۔ اردو اور انگریزی میں ایک نہیں نہ جانے کتنے مضامین انھوں نے لکھے ہوں گے۔ جو کچھ شائع ہو چکے ہیں اور کچھ باقی ہیں۔ ان کی شاعری اور حیات پر لکھتے ہوئے ان کا خیال تھا کہ مخدوم کے یہاں عورت کا وہ تصور نہیں جو داغ کے یہاں ملتا ہے۔ مخدوم کے یہاں عورت مرد کی شریک بزم حیات ہی نہیں شریک رزم حیات بھی ہے۔ دراصل حیدرآباد اور اطراف حیدرآباد میں خواتین کی تعلیم و ترقی کی بات نئی نہیں ہے بلکہ بہت پرانی ہے۔ یہاں کی مستورات نے انیسویں صدی

کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں نکلنے والے رسائل میں متواتر مضامین اور شعری تخلیقات پیش کی ہیں ــــ سروجنی نائیڈو کے والد نے اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ بنا لیا تھا کہ وہ عورتوں میں تعلیم کو عام کریں۔ راج بہادر صاحب جن کا تعلق حیدرآباد سے رہا ہے اور جو نہایت روشن اور سیکولر مزاج رکھتے ہیں ان کے ناقدانہ خیالات میں خواتین کے سماجی مرتبوں اور سماجی کاموں اور تعلیمی وسعتوں کی تلاش توقع کے عین مطابق ہے۔

انگلینڈ میں ہندوستانی تہذیب کی نقیب اور تحریک آزادی کی سپاہی سروجنی نائیڈو حیدرآباد کی سرزمین پر پیدا ہوئیں۔ اپنی تقریروں اور انگریزی شاعری کی وجہ سے بلبلِ ہند کہلائیں ان کی حیات اور ذہنی ارتقاء پر راج بہادر گوڑ نے ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے۔ ان کے کاموں اور زندگی کے تمام گوشوں کو روشن کیا گیا ہے۔ لیکن خواتین کی قیادت اور تعلیم نسواں سے متعلق ان کی سرگرمیوں کا پہلو نظرانداز ہوگیا ہے۔ راج بہادر صاحب نے ان کے والد کی تعلیم نسواں سے دلچسپی کا ذکر کیا ہے۔ بہرصورت نہ صرف اہل حیدرآباد بلکہ تمام ہندوستان کے مرد اور عورتیں ان کے کارناموں کو بہ نظر تحسین دیکھتے ہیں۔

حیدرآباد کی ایک اور خاتون افسانہ نگار قمر جمالی کی کہانیوں پر انھوں نے ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے جو ہمیں ان کی حیات کے مختلف گوشوں سے متعارف بھی کراتا ہے۔ اور ان کے فکر و فن کی نزاکتوں کو پرکھنے اور انھیں شوق کے ساتھ پڑھنے پر آمادہ بھی کرتا ہے۔ راج بہادر صاحب کا خوب صورت مضمون پڑھنے کے بعد قارئین قمر جمالی کی تخلیقات کو شاید دوبارہ پڑھنا چاہیں۔ تنقید اگر لکھنے اور پڑھنے والوں کو تعمیری قدروں کا سبق دیتی ہے تو تبصرے، کتابیں پڑھنے اور خریدنے کا شوق بھی پیدا کرتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے گوڑ صاحب اپنی مضمون نگاری اور بعض مرتبہ تبصرہ نگاری میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

"بی اماں" کی شخصیت سے کون ناواقف ہوگا۔ مولانا محمد علی جوہر پر مقالہ لکھتے ہوئے گوڑ صاحب نے جس طرح بی اماں اور ان کے مایۂ ناز فرزند کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ شاید ہی کسی نے اس انداز سے لکھا ہو۔ مولانا محمد علی کی شخصیت پر بہت لوگوں نے مضامین لکھے ہیں لیکن ان کی شخصیت کے اہم پہلوؤں یعنی اسلام اور حب الوطنی کو جس طرح انھوں نے سائنٹی فک

بنیاد پر ترتیب دیا ہے، وہ قابل قدر ہے۔ بی اماں کا کردار اور مسلمان ہند کے نام ان کا پیام پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک ضعیف خاتون کس طرح شوق جہاد سے سرشار ہے۔ لکھتی ہیں۔

"میں نے کہہ دیا تھا کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے۔۔ کوئی ایسی شرط قبول کر لیں گے جو اسلام کی شان کے خلاف اور مفاد ملک کے منافی ہوگی تو باوجود اس تمام محبت کے جو قدرتاً مجھے اپنے بیٹوں سے ہے اس سے قبل کہ وہ صراط مستقیم سے ہٹ سکیں، اپنے ضعیف ہاتھوں سے ان کا گلا گھونٹ دوں گی اگر کسی دن ہندوستان کے لیے ہوم رول کے جھنڈے کے نیچے ہم سب کو جمع کیا گیا تو انشاءاللہ وہ اس ضعیف کو طالبان ہوم رول کی صف اول میں پائیں گے۔"[۱۳]

راج بہادر صاحب کا یہ اندازہ کہ بی اماں کی مذہبی شخصیت اور حب الوطنی کو مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی شخصیتوں کی تعمیر میں بڑا دخل ہے، غلط نہیں ہو سکتا۔

"انقلاب زندہ باد" راج بہادر گوڑ کے الفاظ میں منور ماہ ولوان کی یادوں کی برات ہے جو ذہنوں میں آزادی کی جنگ کے نقشے کو ابھارتی ہے یادیں، جو تقسیم کے المیہ کا نوحہ ہیں۔ ان یادوں کے ساتھ گوڑ صاحب نے مخدوم اور فیض کی نظمیں بھی پیش کر دی ہیں کہ یہ بزرگ ادیب کے ذکر و فکر کا بیش قیمت سرمایہ بھی ہیں۔ انقلاب کی نیرنگیوں کو سمجھنے کے لیے اس سرمایہ پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ راج بہادر خود اس انقلاب کا حصہ رہے ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ "راج بہادر گوڑ ایک ترقی پسند ناقد ہیں۔ "لیکن ایسے انتہا پسند نہیں ہیں کہ صرف مقصدیت ہی کو پیش نظر رکھیں۔ انھوں نے جمالیاتی قدروں کو بھی عزیز رکھا ہے۔" خاص طور سے ان مضامین میں جہاں خواتین کو موضوع بنایا گیا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ گوڑ صاحب کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان کی تقریر و تحریر میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ جس طرح بے تکلفی کے ساتھ وہ باتیں کرنے کے عادی ہیں اسی طرح ان کی تحریریں بھی بے ساختگی اور سادگی کا لطف رکھتی ہیں۔ ان کی گفتگو عموماً گہرے تجربے، مشاہدے اور مطالعے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی لحاظ سے ان کی علمی یا ادبی نثر میں کسی

قسم کی ثقالت، ابہام یا پیچیدگی نہیں ہوتی۔ تخیل کی کارفرمائی ایسے مضامین میں نظر آئی جو کئی ہزار سال پہلے کے کسی ادب پارے سے متعلق ہوتی ہیں یا پھر کئی سو سال پہلے کسی تمدن و تہذیب کی خاص نہج پر مشتمل ہوں۔ جیسے "وادی گنگ و جمن میں زندگی ایسے ہی خراماں خراماں گزرتی جیسے گنگا کا دھارا۔" ایسے خوب صورت جملے اکثر نظر آجاتے ہیں۔ لیکن کمی کے ساتھ۔ تحریر میں ہمواری ہے۔ اور اصطلاحات کا انبار نہیں ہے۔ خواتین پر بات کرتے ہوئے انھوں نے کسی ایسی اصطلاح کا استعمال نہیں کیا جو اکثر ہم سنتے رہے ہیں۔ اور جو گزشتہ کئی صدیوں میں استعمال ہوتی رہی ہیں۔ وہ مسائل کو اپنے دور کی زبان میں اور اپنے مخصوص لب و لہجہ میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے مضامین کی پیش کش یا تنظیم اکثر چونکا بھی دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مضامین کو روایتی انداز پر لکھنے کے پابند نہیں ہیں۔ قصہ مختصر ان کے مضامین پر ان کی شخصیت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔"

حواشی

۱۔ ادبی تناظر ص ۱۵۷

۲۔ ادبی تناظر۔ ص ۴۴

۳۔ ادبی تناظر ص ۴۵

۴۔ ادبی مطالعے " انیس کی شاعری کا سماجی پس منظر۔

۵۔ 〃 〃 〃 〃 〃

۶۔ ادبی مطالعے 〃 〃 〃 ص ۹۶

۷۔ ادبی تناظر۔ "ترقی پسند تحریک کی آپ بیتی" ص ۲۲

۸۔ شبلی کا سفرنامہ "یونان و مصر و روما"

۹۔ ادبی مطالعے "اقبال، ان کا ورثہ اور ان کی کوتاہیاں" ص ۹

۱۰۔ ادبی مطالعے مخدوم کی زندگی، مخدوم کی شاعری ص ۷۸، ۷۹

۱۱۔ ادبی تناظر "مولانا محمد علی جوہر" ص ۶۹

قمر جمالی

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ: ایک شخصیت منشورِ مثلّث

حیدرآباد، فرخندہ بنیاد، ہمیشہ سے اپنی گنگا جمنی تہذیب کے لیے ہندوستان تو کیا دنیا بھر میں اپنی ایک شناخت رکھتا ہے۔ یہ بات تعجب خیز تو ضرور ہے کہ وہ خطۂ زمین جس کا درحقیقت گنگ و جمن کے سنگم سے کوئی جغرافیائی علاقہ نہیں اور وہ تہذیب تو جس کی نمو شہنشاہ اکبر نے کی تھی، وہ اپنی اصلی جغرافیائی حدوں میں زندہ ہو کہ نہ ہو ـــــ حیدرآباد کی فضاؤں میں ہواؤں میں، رودِ موسیٰ کے کنارے کنارے بسے قطب و مشتری کے لالہ زاروں میں، یہاں کی اونچی اونچی حویلیوں میں، اور ان کے زیر سایہ بسی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں ـــــ نہ صرف زندہ بلکہ پائندہ ہے۔ حیدرآباد اپنے اس خصوص کے لیے یہاں کے باسیوں کے دل میں بسی محبت، 'سلیقۂ اظہارِ محبت' اور اس اظہار کے لیے اس خوب صورت 'واسطے' کا مرہونِ منت ہے جسے ہم ایک نازک سی بیل تصور کریں جو اگرچہ کہ قرض دار کی طرح سارے معاشرے سے لپٹی ہوئی ہے، جس کے بیل ڈوروں میں رودِ موسیٰ کی مٹھاس، گنگ و جمن کی جولانی، بنارس کی پاکیزگی، لکھنؤ کا لوچ اور گداختگی، اودھ کی شائستگی، کشمیر کی موسیقیت اور دلّی کا کھری کھانٹ کھرا پن، رنگ برنگی پھولوں کی طرح ایک دوسرے میں اس طرح گتھم گتھا ہیں کہ جیسے یہ سارے مختلف النوع گل بوٹے ایک ہی جڑ کی افزائش کا نتیجہ ہیں ـــــ اور یہ سچ بھی ہے کیوں کہ ان سارے گلوں کے رنگ کچھ ہوں ـــــ ڈھنگ کچھ ـــــ مگر ان کی خوشبو سے جو عطر بیز فضا بنتی ہے اس سے یہ تجزیہ کرنا ناممکن ہے کہ کس گل نے کیا حق ادا کیا۔ اسی عطر بیز فضا کا نام ہے ـــــ 'تہذیبِ دکن'!

ارضِ دکن کی اس عطر بیز فضا نے دنیا کو اپنے وقت کے مشہور دانشور، ادیب، شاعر، سخن ور اور سخن فہموں کا تحفہ دیا، ماقبلِ آزادی بھی ـــــ اور آزادی کے بعد بھی۔

میں اپنی دانست میں خود کو اس بات کی اہل نہیں سمجھتی کہ ابوالفضل فیضی یا شاہنامہ اسلام کی روشنی میں اپنے مضمون کا متن پیش کروں۔ ہاں مگر یہ ضرور کہوں گی کہ اگر ہم حیدرآباد کی اس گنگا جمنی تہذیب کی تاریخ مرتب کریں تو اس صدی کے اوائل میں کچھ نام ہمیں ایسے جگمگاتے ملیں گے کہ جن کی روشنی میں ہم ہندوستان میں نشاۃِ ثانیہ کا تجزیہ کرسکیں گے۔ ایسے کچھ نام جنھیں حیدرآباد کا ہر چھوٹا بڑا جانتا ہے وہ ہیں: رائے جانکی پرشاد، حبیب الرحمٰن مولوی عبدالحق، آغا حیدر حسن مرزا، رائے محبوب نرائن، ہارون خاں شیروانی اور مخدوم محی الدین، جن کے بارے میں یوں کہا جاسکتا ہے ؎

ابھی پتوں پہ باقی ہیں جلے تنکوں کی تحریریں
یہ وہ تاریخ ہے بجلی گری تھی جب گلستاں پر (قمر جلالوی)

ہندوستان کی تہذیب ایک زندہ تہذیب ہے، ایسی تہذیب جو تغیر پذیر ہے ـــــ زمان و مکاں کے حالات سے اثر قبول کرتی ہے۔ یہ ایک اچھی علامت ہے۔ کیوں کہ ایسی ہی تہذیب میں ایک 'زندہ قوم' پنپ سکتی ہے، اور زندہ قومیں جلے تنکوں کی تحریروں کو مرتب کر کے واویلا نہیں مچاتیں، کہ تغیر 'نظامِ فطرت' ہے۔ جہاں ایک طاقت ناپید ہوئی کہ اس کی موزوں بدل ظہور میں آگئی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان ظہور میں آتی ہوئی طاقتوں کو محسوس کریں، اور اس کی شناخت اور سالمیت میں اپنا حق ادا کریں۔

اوپر میں نے جن ناموں کی زنجیر باندھی ہے، اسی کڑی کو اور آگے کھینچیں تو ایک نام اور ملے گا، اتنا ہی جانا پہچانا اور اتنا ہی باوقار ـــــ اور یہ نام ہے ـــــ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ۔ جنھیں ہم ارضِ دکن کی گنگا جمنی تہذیب کا 'نمک کا نگر' کہہ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا نام ہندوستان کے مہذب طبقے کے لیے محتاجِ تعارف نہیں ہے، بلکہ حیدرآباد کی تو شناخت ہے۔ ان کا شمار ہندوستان کی ان گنی چنی شخصیتوں میں کیا جاتا ہے جو اپنی پہلودار پہچان کی وجہ، اگر دکن کی تاریخ مرتب کریں تو اپنے تئیں ایک

باب کا اضافہ کر سکتی ہیں۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ہندوستان کے اس دور کی پود ہے جب ہندوستان انحطاط سے گزر رہا تھا۔ خون میں جوش اور جذبے میں سرفروشی تھی۔ شاید یہی بات ہے کہ اس دور کے جتنے بھی دانشور رہے وہ سارے کے سارے ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ بیک وقت ادیب بھی شاعر بھی، سیاسی مدبر بھی، ٹریڈ یونین لیڈر بھی۔ مزدور بھی اور استاد بھی۔ ڈاکٹر گوڑ کی شخصیت کو ہم ان ہی خصوصیات کی بنا پر 'منشور مثلثی' کہہ سکتے ہیں ــــ جو تین مختلف پہلوؤں سے رنگ و نور کی فضا باندھ رہی ہے۔ بحیثیت سیاسی مدبر، ٹریڈ یونین لیڈر اور ــــ تنقیدی ادیب۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ارض دکن کی سبک خرام، لچکیلی، چھبیلی رودِ موسیٰ کے کنارے آباد محلہ گولی پورہ کے ایک کائستھ گھرانے میں جناب محبوب رائے گوڑ اور محترمہ امراوتی گوڑ کے گھر ۲۱ جولائی ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کا گھرانہ ۱۸۵۰ء کے آس پاس گوشائیں گنج، فیض آباد، لکھنؤ سے ہجرت کر کے حیدرآباد آیا۔ اور یہیں بس گیا۔

ابتدائی تعلیم مفیدالانام، دھرماونت، رفاہِ عام اور شاہ علی بنڈہ ہائی اسکول میں حاصل کی۔ مگر ساتویں جماعت میں انھوں نے اپنا ذریعہ تعلیم اردو سے انگریزی میں تبدیل کیا۔ اور چادرگھاٹ ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں یہیں سے میٹرک امتیازی نشانات سے پاس کیا۔ ۱۹۳۸ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ کیا، اور اسی سال ڈاکٹری کے لیے عثمانیہ میڈیکل کالج میں داخل ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں وہیں سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی۔

اپنے زمانۂ طالب علمی کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

> "میں اپنے تاریخ کے استاد سے بہت متاثر تھا جنھوں نے مجھ میں چھپے ادبی اور سیاسی رجحان کی نشاندہی کی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب کہ میں پوری طرح ادب کی طرف مائل ہوگیا تھا۔ اپنے تعلیمی وظیفے سے رقم پس انداز کر کے ایک چھوٹا سا کتب خانہ چلاتا تھا۔ مطالعے کے شوق میں میں گھنٹوں اسٹیٹ لائبریری میں بیٹھا رہتا تھا۔ علاوہ ازیں اپنی ادبی زندگی کی ترویج کے لیے میں استاد

و مشہور شاعر جناب صدق جائسی اور چچا جناب رائے محبوب نرائن گوڑ کا مرہونِ منت ہوں جنھوں نے مجھ میں شاعری اور ادبِ عالیہ کے مطالعے کا ذوق پیدا کیا۔"

۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۸ء کا دور حیدرآباد کے جاگیردارانہ نظام کے لیے بڑا بدبخت ثابت ہوا۔ آندھرا پردیش خصوصاً حیدرآباد اور اس کے آس پاس کے اضلاع میں جاگیرداروں اور دیش مکھوں نے اپنی سلطنتیں قائم کر رکھی تھیں۔ عام انسانوں کے سماجی حقوق ان مٹھی بھر جاگیرداروں اور دیش مکھوں تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ اُس دور کے تمام طالبِ علم جو ذرا بھی حساس رہے ہوں اس وقت کے سیاسی اور سماجی حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ لہٰذا راج بہادر گوڑ بھی جن کی ابھی ابھی مسیں بھیگ رہی تھیں، جو اپنی عمر کے اس دور سے گزر رہے تھے، جسے حیات کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے ــــ جب بساطِ ارض کی ہر شئے پر حُسن و جمال کا تسلط نظر آتا ہے، جب فکرِ فردا سے دور سازِ زندگی کی ہر دھن مسرور کن محسوس ہوتی ہے۔۔۔۔ بقول مخدوم ؎

بلائے فکرِ فردا ہم سے کوسوں دور ہوتی تھی	سرودِ سرمدی سے زندگی معمور ہوتی تھی
ہماری خلوتِ معصوم رشکِ طور ہوتی تھی	ملک جھولا جھلاتے تھے، غزلخواں حور ہوتی تھی

اس سرودِ سرمدی کے دور میں وہ شعوری طور پر سیاست میں داخل ہو چکے تھے۔ زمانۂ شباب ان کے لیے باعثِ تسکین نشاط تو کجا باعثِ احساسِ شباب بھی نہ ہو سکا۔ اگرچہ جوانی کا شعور عام انسانوں کی طرح ان کے ہاں بھی اتنا ہی جذباتی تھا جس کا فیضؔ پر مضمون لکھتے ہوئے انھوں نے خود اعتراف کیا ہے۔

"اٹھارہ بیس سال کا سن تھا، جوانی انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی تھی۔ ایسے میں چاند چڑھتا ہے تو اس کے انداز اور ہوتے ہیں۔ دل میں طوفان امڈ آتا ہے چاند کی کرنیں مضراب بن کر دل کے تاروں کو چھیڑتی ہیں ــــ تو عشق گنگنا اٹھتا ہے۔"

میں نے انھیں کے الفاظ دہراتے ہوئے ان کی اپنی جوانی کی کسی ہوشربا کہانی کے بارے میں

پوچھا کہ جب وہ اپنے خیالوں سے سرشار، کسی پری جمال کے ساتھ بادلوں پہ سوار فضا میں تیرتے رہے ہوں، اور پیار کی قوس قزح ان پر رنگ و نور کی برسات کرتی رہی ہو۔

"جوان ــــ ! ہاں جوان تو ہم ہوئے تھے۔ مگر کب ــــ ؟ اس کا اندازہ نہ ہو سکا۔"

انھوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے

"اگر تو مجھے کچھ وقت دیتی ہے تو میں اپنی یادوں کو آواز دوں!"

ڈاکٹر گوڑ نے تو قہقہہ کے بیچ اتنی گہری بات کہہ دی اور پہلے سے نارمل دکھائی دینے لگے، مگر وہ لمحہ میرے لیے باعث فکر رہا کہ جو انسان اپنی ذات میں انجمن رہا ہے، اس کی خلوت میں جلووں کا تصور بھی مختلف رہا ہوگا۔ خصوصاً جس کا بچپن ہی سن رسیدہ رہا ہو ــــ دراصل ڈاکٹر راج بہادر اپنے بچپن ہی میں بزرگ رہے ہیں۔

بقول شخصے

بزرگی از عقل است، نہ سال
تونگری بہ دل است، نہ بہ مال

۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۸ء میں جب ریاستی کانگریس نے جاگیردارانہ نظام کے خلاف عام سماجی حقوق کی بحالی کے لیے ستیہ گرہ کی تو راج بہادر گوڑ باضابطہ اس تنظیم میں شامل ہو گئے، مگر وہ ستیہ گرہ گاندھی جی کے حکم پر درمیان ہی سے اٹھا لی گئی۔ جس سے نہ صرف راج بہادر گوڑ بلکہ تمام جوان نسل دل برداشتہ ہو گئی اور کسی اور تنظیم کی تشکیل کی منتظر رہنے لگی۔ اسی زمانے میں یعنی ۱۹۳۹ء کے اواخر میں کامریڈس اسوسی ایشن کی داغ بیل پڑی۔ بس ڈاکٹر گوڑ کے ساتھ اس وقت کے کئی ہونہار طالب علم، مخدوم محی الدین، سید ابراہیم، مانک لال گپتا، احسن علی مرزا، ناگوراؤ، غلام حیدر، مرزا حیدر حسن، عاقل رضوی سری نواس لاہوٹی، جواد رضوی اور اونکار پرشاد، کامریڈس اسوسی ایشن سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۴۰ء تک وہ باضابطہ سیاست میں داخل ہو چکے تھے اور کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب انھوں نے سیاست کے ساتھ ٹریڈ یونین ازم میں قدم رکھا، اور اس وقت سے ان کی زندگی کے یہ دونوں رخ ایک دوسرے سے متصل یوں چلتے رہے کہ ان کو الگ کر کے دیکھنا خود ڈاکٹر گوڑ کو بانٹ دینا، یا پھر انھیں ادھورا دیکھنے کے مترادف ہوگا۔

۱۹۴۱ء میں وہ کامریڈس اسوسی ایشن کے باقاعدہ رکن بن گئے، اور ۱۹۴۲ء میں اس تنظیم کے معتمد عمومی اور ۱۹۴۳ء میں صدر چنے گئے۔ ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۸ء اور پھر ۱۹۶۰ء میں وہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے سٹی سکریٹری مقرر ہوئے۔ اور ۱۹۶۹ء میں وہ ریاستی نائب معتمد۔ اس سے قبل ۱۹۶۴ء میں C.P.I کی ساتویں کانگریس میں پارٹی کے قومی کونسل کے لیے چنے گئے۔ ۱۹۷۵ء کو دسویں کانگریس وجے واڑہ میں سنٹرل ایکزیکیٹیو کے ممبر چنے گئے۔ ۱۹۶۸ء میں C.P.I کی سنٹرل ٹریڈیونین ڈپارٹمنٹ کے انچارج مقرر ہوئے ــــ تو ۱۹۸۸ء تک اسی عہدے پر قائم رہے۔ ۱۹۸۹ء میں پارٹی کانگریس کلکتہ میں اپنے عہدے سے دست بردار ہو گئے۔

اگرچہ ٹریڈیونین ازم سے ان کا تعلق ۱۹۴۰ء سے رہا۔ جب مابعد جنگ کی بڑھتی قیمتوں کے خلاف ریلوے مزدوروں نے ہڑتال شروع کی تھی۔ مگر حیدرآباد میں آل حیدرآباد ٹریڈیونین کانگریس کی داغ بیل ۱۹۴۶ء میں پڑی اور ۱۶ر اگست ۱۹۴۶ء کو جہرہ کمپونڈ سکندرآباد میں منعقدہ ایک جلسے میں مخدوم محی الدین کو صدر اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو معتمد عمومی مقرر کیا گیا۔ اپنی ٹریڈیونین ازم کے دوران سپننگ ملز مزدور یونین، ٹکسٹائل مزدور یونین، شاہ آباد سمنٹ مزدور یونین اور نہ جانے کتنی ہی مزدور یونینوں سے وابستہ رہے۔ آج بھی بحیثیت صدر

1. A.P.Land Development Bank Employees' Union
2. N.M.D.C. Staff Union
3. A.P. Govt. Press Employees' Union
4. IDPL Employees Union

سے وابستہ رہے۔

۱۶ر اکتوبر ۱۹۴۶ء کو جب ریاست گیر Anti Repression Day منایا گیا تو مخدوم محی الدین، جواد رضوی اور راج بہادر گوڑ کے خلاف وارنٹ جاری کر دیے گئے، اور کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عاید کر دی گئی۔ اس وقت مخدوم محی الدین شاہ آباد میں تھے۔ جواد رضوی اور ڈاکٹر گوڑ اگرچہ روپوش ہو گئے تھے، مگر چوں کہ پہلی بار روپوش ہوئے تھے۔ زیادہ دن چھپے نہ رہ سکے۔ لہٰذا نومبر ۱۹۴۶ء کو دھر لیے گئے، اور حیدرآباد کی سنٹرل جیل میں محبوس کر دیے گئے۔

۷ مئی ۱۹۴۷ء کو جے پرکاش نرائن کو اس وقت گرفتار کیا گیا جب کہ وہ کربلا میدان، سکندرآباد پر ایک جلسۂ عام سے خطاب کرنے والے تھے۔ تو شہر میں زبردست بدنظمی پھیل گئی۔ اس بدنظمی سے فائدہ اٹھاکر ڈاکٹر گوڑ اور جواد رضوی جیل سے فرار ہو گئے۔ اور اس طرح روپوش رہے کہ حکومت کے دانت کھٹے ہو گئے۔

۱۹۴۸ء کے اوائل میں حکومت نے ان کے خلاف ایک جال بچھایا۔ اخباروں میں یہ جھوٹا اعلان کیا گیا کہ کامریڈ گووند شراف، راوی نرائن ریڈی، مخدوم محی الدین اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے خلاف وارنٹ منسوخ کر دیے گئے ہیں۔ اگرچہ حکومت کی یہ چال بازی ان لوگوں کی سمجھ میں آ گئی تھی، پھر بھی اس ناپاک پالیسی کا پردہ فاش کرنے کے لیے انھوں نے ایک چال چلی۔ حشمت گنج پر ایک میٹنگ بلائی گئی اور یہ اعلان کیا گیا کہ اس میٹنگ کو ڈاکٹر گوڑ مخاطب کریں گے۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ڈاکٹر گوڑ سائیکل پر سوار جلسہ گاہ پہنچے مگر جوں ہی وہ جلسہ گاہ کے اندر داخل ہوئے پولس نے دروازے بند کرنے شروع کر دیے۔ کامریڈس اس چال کے لیے پہلے ہی سے تیار تھے۔ انھوں نے ایک مزدور کر راج ملیاّ کو اپنے حلقے میں لیا اور 'راج بہادر —— زندہ باد' کے نعرے لگانے لگے۔ اس طرح پولس کو غلط راہ پر لگا کر ایک بار پھر وہ سلطان بازار کوٹھی کی راہ فرار ہو گئے۔ مگر ۲۳ اپریل ۱۹۵۱ء کو دیورکنڈہ تعلقہ کی راج کنڈہ پہاڑیوں پر گرفتار کر لیے گئے۔ پھر تو ۱۳ مئی ۱۹۵۲ء کو جب وہ راجیہ سبھا کے رُکن منتخب ہوئے تو ڈاکٹر رادھا کرشنن کی ایما پر رہا کیے گئے۔ ۱۹۵۶ء کو دوسری بار بھی راجیہ سبھا کے ممبر چنے گئے تو ختم میعاد تک قائم رہے۔

۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۷ء کو انھوں نے اسمبلی چناؤ میں حصہ لیا، مگر دونوں ہی اوقات اپنے حریف کے آگے شکست کھائی۔ پہلی بار شاہ بنڈہ اسمبلی حلقے سے جناب صلاح الدّین اویسی اور محترمہ معصومہ بیگم سے، اور دوسری مرتبہ سکندرآباد پارلیمانی حلقے سے شیو شنکر سے۔ اس کے بعد انھوں نے سیاست سے کوئی رشتہ استوار نہیں رکھا۔ اب تو بس ایک طرف ٹریڈ یونین ازم سے رشتہ رہ گیا ہے جو انشاءاللہ ان کی آخری سانس تک قائم رہے گا، تو —— دوسری طرف ادب سے —— جو لازوال رہے گا۔

جیسا کہ میں نے پہلے ہی کہہ دیا کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی ہمہ رخی شخصیت، بیک وقت تین خانوں میں بٹی ہے۔ جسے ہم تین پگڈنڈیاں متصور کر سکتے ہیں۔ سیاست، ٹریڈ یونین ازم اور ادب۔ مگر جہاں یہ تینوں پگڈنڈیاں ایک سرے پر آزادانہ طور پر ان کی حیات کی متوازی دوڑ رہی ہیں وہیں دوسرے سرے پر یہ ساری ایک پل سے منسلک ہیں ——

اردو گوڑ صاحب کی مادری زبان بھی ہے، اور معشوقِ دلنواز بھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ ایک کائستھ گھرانے کے چشم و چراغ ہیں اور اردو ان کی گھٹی میں پڑی ہے، بلکہ اس لیے کہ اردو زبان کی ناز برداریاں ڈاکٹر گوڑ کے زندہ رہنے کا ایک خوب صورت بہانہ ہے۔ یہاں میں اپنے ہی ایک مضمون "ڈاکٹر راج بہادر گوڑ —— اور بہادر شاہ ظفر ایوارڈ برائے سال ۱۹۹۰ء" طبع شدہ روزنامہ سیاست مورخہ یکم اپریل ۱۹۹۱ء کے ایک فقرے کو دہرانا چاہوں گی ——" جس طرح انگریزی کے مشہور محقق و دانشور ڈاکٹر جانسن کو ان کی میلی کچیلی کنٹوپ، اور کھلے گریبان کے ہاوز کوٹ میں ملبوس، کتابوں کی انبار کے پیچھے دبکے بیٹھے رہنے کی وجہ انھیں

A Lion in the gun کہا گیا تھا، اسی طرح، آگے پیچھے، دائیں بائیں، کتابوں کی انبار کے پیچھے دبکے بیٹھے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو ہم ایک ایسے آبشار سے تعبیر کر سکتے ہیں جو نہایت اونچائی سے گر رہا ہے اور زمین پر قدِ آدم تک اطراف میں اپنی ٹھنڈک بکھیر رہا ہے۔"

دن کے بارہ گھنٹوں میں سے تقریباً نو گھنٹے بشرطیکہ انھیں کسی کام سے جانا نہ ہو، وہ یا تو کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے ہیں —— یا پھر لکھ رہے ہوتے ہیں۔ کتابوں کی انبار کے پیچھے دبکے، گھومنے والی کرسی پر بیٹھے ننھے سے معصوم بچے کی مسکراہٹ لیے چمک دار آنکھوں سے وہ ہر آنے والے سے یوں ملتے ہیں جیسے وہ کسی انسان سے نہیں مل رہے بلکہ کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ باوجود ان کی فطری بذلہ سنجی کے ان کی عمیق نگاہوں کی آندھی سامنے والے کے پیر اکھاڑ دیتی ہے۔ ہاں مگر جو کبھی کسی کو انھوں نے اپنوں میں شامل کر لیا ہو تو بس —— ان کے اندر کا 'حیدرآبادی تہذیب کا نمک کا کنکر' راج بہادر، مشہور دانشور، ادیب و ناقد، سیاسی مدبر و ٹریڈ یونین لیڈر سے اپنا رشتہ توڑ لیتا ہے —— اور اس وقت وہ صرف

ایک مشفق باپ، بزرگ ــــ یا پھر دوست رہ جاتے ہیں۔ ہاں مگر بات حق و انصاف کی ہو تو کھری کھری سناتے ہوئے وہ آؤ دیکھتے ہیں، نہ تاؤ ــــ حتیٰ کہ اگر کسی اجنبی کو ان کے اس موڈ میں شرفِ ملاقات حاصل ہو جائے، تو وہ بے اختیار کہہ اٹھے۔

دو چار ٹانکے اور، لگے ہاتھ بخیہ گر
دامن بھی کچھ پھٹا ہے، گریباں کے ساتھ ساتھ (قمر جلالوی)

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی قد آور شخصیت اسم بامسمّٰی ہے۔ اونچا قد، تیکھے نقوش، چھریرا بدن، کھلتا ہوا گندمی رنگ، قید و بند کی صعوبتیں سہنے کے باوجود، چہرے کی وہ بے داغ رنگت جسے دیکھ کر شمیم جے پوری کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے۔

گیا نہ قیدِ قفس میں بھی بانکپن اپنا
اسی طرح سے رہے جس طرح چمن میں رہے

سفید کرتا پاجامہ، یا پھر شیروانی، اور ہاتھ میں آبنوسی چھڑی میں ان کی شخصیت بڑی جاذبِ نظر معلوم ہوتی ہے۔ ادبی جائزے کے پبلشر جناب بشیر احمد صاحب نے انھیں جادو جگاتی شخصیت کہا تو مجھے لگا کہ ڈاکٹر گوڑ کے سراپا کو سراہنے کے لیے اس سے موزوں اور کوئی ترکیب نہیں ہوسکتی۔ باوجود اپنی بڑائی کا لوہا منوانے کے ان کی شخصیت میں ایک ایسی کشش ہے کہ سامنے والے کا دل موہ لیتی ہے۔ گھنٹوں ساتھ رہ کے نکل آؤ، تب بھی دامنِ دل کا ایک کنارہ وہیں کہیں اٹکا رہ جاتا ہے۔ اور یادوں کے کنج سے نکلا ایک ہلکا سا جھونکا بھی تارِ نفس کھینچنے لگتا ہے۔

بذلہ سنجی اور برجستہ کلامی ان کے مزاج کا خاصہ ہے۔ سادگی کا یہ عالم ہے کہ یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم ایک ایسے مردِ مجاہد سے مل رہے ہیں جو ہندوستان کے جاگیردارانہ نظام کے خلاف بادشاہِ وقت کے آگے صف آرا ہوگیا تھا۔ جس نے اپنی تنظیم و مقاصد کے حصول کے لیے مہینوں روپوشی کی تکالیف برداشت کیں، جیل کی صعوبتیں سہیں، جو مسلسل دس سال راجیہ سبھا کا ممبر رہا ہے، اور بحیثیت رکن اور سکریٹری کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے، نہ صرف ہندوستان کا چپہ چپہ صحرانوردی کی ہے بلکہ دو تین مرتبہ سوویت یونین، بلغاریہ، منگولیا، چیکوسلواکیہ اور شمالی کوریا۔ جیسے ممالک میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔

اردو زبان اور دکنی تہذیب سے ڈاکٹر گوڑ کا رشتہ مادری یا پدری ہو کہ نہ ہو عاشقانہ ضرور ہے۔ کیوں کہ بسا اوقات جب بھی چلے جائیے۔ آپ انھیں اپنی محبوبہ کی زلف گرہ گیر کے اسیر پائیں گے خواہ وہ کسی ادیب پر مضمون لکھ رہے ہوں کہ کسی کتاب پر تنقیدی مقالہ، کسی مزدور مسئلہ کے سوزن گری ہو کہ انتظامیہ کے خلاف رپورٹ۔ حتیٰ کہ تفریح طبع کے لیے بھی فیض، حسرت، کیفی، مخدوم یا پھر غالب کی کشیدہ شراب دو آتشہ کو گھونٹ در گھونٹ نہیں بلکہ قدح در قدح پی رہے ہوتے ہیں۔ اردو ضرورت، اردو تفریح، اردو کھانا، اردو پینا اور یہاں تک کہ اردو اوڑھنا بچھونا ـــــ اردو سے والہانہ عشق ہی کا نتیجہ ہے کہ موجودہ نظام میں اردو کے ساتھ جو ناانصافیاں کی جا رہی ہیں۔ اسے وہ محض محسوس کر کے چپ نہیں رہ سکے، بلکہ انجام و عواقب کی پرواہ کیے بغیر انھوں نے اردو کے حقوق کی بحالی کے لیے اپنی آواز اونچی رکھی ـــــ اور بحیثیت رکن 'گجرال کمیشن' اردو کو اس کا جائز حق دلانے کی حتی المقدور کوشش کی۔

ڈاکٹر گوڑ گو کہ تخلیقی ادیب نہیں ہیں مگر مختلف ادب پاروں اور مختلف رسالوں میں پھیلے ان کے بیسیوں مضامین ان کے اندر چھپے تخلیق کار کی چغلی کھاتے رہیں اور بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ اینٹی فیوڈل وار Anti Fadual War کے اس مجاہد نے پتہ نہیں کیوں کوشش نہیں کی ورنہ میکسم گورکی کی ایک ایک کہانی حیدرآباد، ورنگل، ہنمکنڈہ، بڑودہ، بمبئی، بنگلور، جے پور اور چمیلی کا منڈوہ، کی دیواروں سے ضرور پیدا ہوتی۔

یہ محض اتفاق ہے یا وقت کی ضرورت کہ اردو کا بہت سارا انقلابی ادب شعری ہیئت میں ظہور پذیر ہوا۔ اگر ڈاکٹر گوڑ اس رجحان کی نثری طبع آزمائی کرتے تو یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اردو ادب میں ایک نئے رجحان کا اضافہ ہوتا، کیوں کہ اس خصوص میں یہ بات تو طے رہی کہ ـــــ اگر ڈاکٹر گوڑ کہانی لکھتے تو ان کا کردار اپنی محبوبہ کے پہلو سے نکل کر یوں روپوشش ہو جاتا کہ خود ڈاکٹر گوڑ نوکِ قلم سے پرت در پرت اسے کھوج رہے ہوتے ـــــ اور۔ ۔ ۔ ایک نہ رکنے والا سلسلہ چل پڑتا جو زندگی سے تعبیر ہوتا۔

انجمن ترقی اردو (ہند)، کی پبلش کی ہوئی کتاب 'ادبی مناظر' کے حرف آغاز میں جناب خلیق انجم صاحب نے لکھا ـــــ "راج بہادر گوڑ نے پچھلے چند برسوں سے اردو لکھنا شروع کیا ہے۔ گویا وہ زندگی بھر پڑھتے رہے اور سنجیدگی سے لکھنا زندگی کے آخری دور میں شروع کیا۔"

خلیق انجم صاحب نے یقیناً بڑے پتے کی بات کہی ہے، مگر کچھ رد و بدل کے ساتھ کیوں کہ ڈاکٹر گوڑ تو زندگی بھر لکھتے ہی رہے ہیں۔ اردو ہی میں نہیں انگریزی میں بھی۔ ہندوستان کے بیسیوں رسائل میں ان کے بے حساب مضامین گاہے گاہے چھپتے رہے۔ مگر انھیں اپنے قد کی بلندی تسلیم کروانے کی کبھی ضرورت ہی نہیں ملی یا پھر انھوں نے ضرورت محسوس نہیں کی۔ اگر وہ چاہتے تو اپنی ذات اور اصولوں کو بے حساب کتابوں میں قید کر کے اپنا وزن بڑھواتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انھیں اپنے مضامین کو کتابی شکل دینے یا پبلشرز کو یہ خیال ہنوز اب آرہا ہے۔ ۱۹۷۸ء میں انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش حیدرآباد نے ادبی مطالعے کے نام سے ان کے (۱۳) مختلف مضامین کو ایک کتابی شکل دی، ۱۹۹۰ء میں دنیا پبلیکیشنز. نئی دہلی نے ایک اور مجموعہ ادبی جائزے کے نام سے اجراء کیا، اور ۱۹۹۱ء میں انجمن ترقی اردو (ہند، نئی دہلی نے (۱۸) تنقیدی مقالے اور تبصرے جو انھوں نے مختلف کتابوں پر لکھے، 'ادبی تناظر' کے نام سے مرتب کر کے جاری کیا۔ بدقسمتی سے ان مضامین کے آگے ان کی شانِ نزول اور تواریخ نہیں بتائی گئی، ورنہ کم از کم یہ اندازہ تو لگایا جا سکتا کہ کس موقع اور محل سے متاثر ہو کر ڈاکٹر گوڑ نے کس شاعر، ادیب، یا پھر کتاب کو چنا اور اس پر مضمون لکھا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ان سارے مضامین میں وہ ایک ناقد کی طرح محض مشعل برداری نہیں کرتے بلکہ ایک خاموش تماشائی کی طرح اپنے ہاتھ میں دوربین لیے روپوش ہیں اور وقفے وقفے سے دوربین کا رخ اور گیج Gauge کو دائیں بائیں اور آگے پیچھے ہلا ڈلا کر تا کا جھانکی کر رہے ہیں۔ وہ اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتے چپ رہتے ہیں، ہاں آنکھیں دیکھتی ہیں اور قلم ان مناظر کو مرتسم کرتا ہے۔

یہاں یہ بات ضرور کہنے کے لائق ہے کہ نظارہ کشی سے پہلے وہ اپنی 'وہ' عینک، ضرور چڑھا لیتے ہیں۔ جس کا ایک شیشہ ہمدردی سے بنا ہے تو دوسرا خلوص سے۔ ان کے تنقیدی مقالوں میں ان کی روش بے حد ہمدردانہ رہتی ہے، کسی بے جگر ناقد کی طرح عامیانہ نہیں۔ اپنی رائے ادیبوں پر تھوپ کر وہ خود کو ایک مستند ناقد ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ حق بات بھی منہ میں شکر رکھ کر کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تبصرے ہندوستان کے سبھی ترقی پسند ناقدین کے ہم رتبہ ہیں۔ جنھیں اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر گوڑ کے مضامین کی جو خاص رفتِ تحاری کا ذہن ضبط کر لیتی ہے وہ ان کی زبان کی شگفتگی اور فطری بذلہ سنجی ہے۔ کسی بھی سنجیدہ سچویشن کو وہ اپنی طرز سے پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

مضمون بھارت چند کھنہ، کتاب 'ادبی مطالعے'

"حیدرآباد میں مخدوم کی سترویں سالگرہ منائی جا رہی تھی۔ فروری کی رات، ہلکی ہلکی خوشگوار خنکی تھی۔ اردو ہال میں بڑی گہما گہمی تھی۔ مخدوم کی غزلیں اور نظمیں سنائی جا رہی تھیں اور ان پر رقص کا پروگرام بھی تھا۔ اس پروگرام کے ایک صدر تھے اور دوسرے صاحب مہمان خصوصی۔ میرے بازو میں ایک دراز ریش بزرگ بیٹھے تھے۔ انھوں نے پوچھا کہ وہ ــــ شہ نشین پر فنکاروں کے پیچھے دو حضرات دم بخود بیٹھے ہیں۔ ان میں وہ ــــ آبنوس کے بنے ہوئے بزرگ کون ہیں؟ میں نے کہا ہیل سلاسی مرحوم کے ملک سے ابھی وارد ہوئے ہیں۔ انقلاب کے بعد زرعی اصلاحات کی وجہ سے کھانے پینے کو مل گیا ہے۔ اس لیے چہرے پر چکنائی آگئی ہے۔ آ کیا گئی ہے ــــ سر کی چکنائی چہرے پر پھیل گئی ہے۔"

یہ نقاشی تھی جناب سعید بن نقش مرحوم کی۔ اسی مضمون میں ایک اور جگہ" خاموش غمگین، شرمسار، لاچار، آنکھوں میں نیند کا غلبہ، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، گالوں کی ہڈیاں اوپر کو ابھری ہوئی، بس ڈھانچے پر چمڑی مڑھ دی گئی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے اپنے نام کے ساتھ کھانا جوڑ لیا ہے۔ یہ خرابی ہو رہی تھی جناب بھارت چند کھنہ صاحب کی۔

ایک اور مضمون" جیلانی بانو کی کہانیاں ــــ میرے تاثرات"

"یہ ممکن تھا کہ جیلانی بانو نے اپنی نانی سے کہانی سن کر یہ تسلیم کر لیا ہو کہ راون کے دس سر تھے، اور وہ سیتا کو اڑن کھٹولے پر اڑا لے گیا تھا ــــ لیکن یہی کہانی جیلانی بانو کی زبانی ان کی نواسی سنے گی تو بول اٹھے گی ــــ گپ مت مارو نانی جان! کہیں کسی کے دس سر بھی ہوتے ہیں ــــ جیلانی بانو کی نانی نے جس فضا میں آنکھ کھولی تھی، اس وقت انسانی معلومات کا جو اوسط معیار تھا۔ ماحول جن مسائل سے پٹا

پڑا تھا۔ اور جن آرزوؤں کے سہارے انسانی کارواں آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ سب جیلانی بانو کی نوا سیوں کے لیے اجنبی قدریں ہوں گی۔ اس وقت نئے مسائل ہوں گے نئے معیار ہوں گے، نئی آرزوئیں، نئی امیدیں ہوں گی، جن سے کہانی اپنا مواد اپنا کس بل حاصل کرے گی۔"

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو اپنی ٹریڈ یونین سرگرمیوں، اور ادبی سرگرمیوں کے بعد اگر کسی سے محبت ہے ـــــ تو وہ ہے ـــــ مخدوم۔ مخدوم محی الدین سے دوستی اور محبت کا حق انھوں نے خوب ادا کیا۔ اپنے پہلے مجموعۂ مضامین 'ادبی مطالعے' میں منجملہ (۱۳) کے تین مضامین صرف مخدوم پر ہیں۔ اور دوسرا مجموعہ ادبی جائزے میں ایک، اور تیسرا مجموعہ 'ادبی تناظر' میں پھر ایک مضمون پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔

مخدوم سے ان کے جذباتی لگاؤ کا وہ خود اپنے ایک مضمون 'مخدوم' میں اعتراف کرتے ہیں ـــــ " مخدوم سے پہلی ملاقات کب ہوئی تھی اور کن حالات میں ہوئی تھی، یہ بتانا بہت مشکل ہے۔ مخدوم ہماری زندگی میں کچھ اس طرح بس گئے تھے کہ یہ یاد ہی نہیں آتا کہ ان کے بغیر بھی زندگی گزری۔ مخدوم کیا تھے؟ یوں لگتا تھا مقناطیس کی ایک لاٹ کھڑی ہے ـــــ بس کشش ہی کشش، ہمہ تن کشش۔"

ایک طرف تو ڈاکٹر گوڑ کی زندگی ایک مجاہد کی زندگی ہے۔ آلام و مصائب سے پُر۔ دوسری طرف ان کی آسودگی کا یہ عالم کہ دار و رسن کے قصے بھی اتنے ہی چٹخارے لے کر سناتے ہیں گویا کہ آگ ان تک پہنچتے پہنچتے پھول بن جاتی ہے۔ بخدا یہ کوئی تلمیحی اشارہ نہیں۔ لہٰذا کفر عاید نہیں ہوتا۔ یا پھر بقول فیض۔۔۔

جنوں میں جتنی بھی گزری، بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی، ہزار گزری ہے

یا پھر اقبال کے مطابق۔

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر

یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ زندگی کے مشق میں آبلہ پا کی مرہم پاشی کے لیے ہم خیال و ہم زبان ہم سفر کا ساتھ انھیں اس قدر مطمئن، قانع اور آسودہ رکھا ہے۔ یہ ساتھ ہے محترمہ برج رانی گوڑ صاحبہ کا، صبر و شکر کی پتلی، ڈاکٹر گوڑ کی جیون ساتھی جنھیں بے حد پیار یا پھر بے حد پریکٹیکل انداز میں جب وہ بے حد تیزی سے 'برج رانی' پکارتے ہیں تو لگتا ہے 'بی جانی' ـــــ دکن کی سانولی ایثار و محبت کی مورتی، جو زندگی کے ہر موڑ پر قدم سے قدم ملا کر چلتی رہی ہیں۔ لوہے کے گھروندے میں بھی اور ٹٹی کے سائبان تلے بھی۔ اور اب چنبیلی کے منڈوے، تلے جہاں دو بدن جل تو رہے ہیں مگر پیار کی آگ میں نہیں انسان دوستی کی۔

لکھنا چاہوں تو یہ قصہ اتنا طول پکڑلے کہ بحیثیت مضمون کسی رسالے میں کھپ نہ سکے۔ اس لیے یہ قصہ ناتمام یہیں تمام کیے دینا ہی بہتر ہے۔ کیوں کہ ۔ ۔ ۔ ایک طرف تو۔ ۔ ۔

ورق تمام ہوا، اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے (غالب)

تو دوسری طرف؛

اتر کر ناؤ سے بھی کب سفر تمام ہوا
زمیں پہ پاؤں دھرا کہ زمین چلنے لگی (شکیب جلالی)

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی تحریریں

۱۔ خطبۂ صدارت بہار ریاستی اُردو کانفرنس، مظفر پور

۲۔ خطوطِ گوڑ

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

خطبۂ صدارت

بہار ریاستی اردو کانفرنس

(مظفرپور۔ دسمبر ۳ر۴ر ۱۹۶۰ء)

پروفیسر سرور صاحب، صدر استقبالیہ، بزرگو اور دوستو۔

یہ ریاست بہار کے اُردو دوستوں کی کرم فرمائی ہے کہ آج میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ میں اردو کا لکھنے والا نہیں صرف پڑھنے اور بولنے والا ہوں۔ اور ایک ایسی ممتاز مجلس میں جہاں بڑے بڑے بولنے والے اور ان سے بڑے لکھنے والے موجود ہوں میری یہ جسارت صرف اس لیے قابل معافی ہے کہ میں احباب بہار اور پروفیسر آل احمد سرور کی سازشوں کا شکار ہوں۔

ادھر کچھ برسوں سے دیس بھر میں زبانوں کا بہت چرچا ہے۔ ہر زبان آزاد ہندوستان میں اپنا مقام تلاش کر رہی ہے۔ صدیوں کی غلامی نے نہ صرف ہماری اقتصادی ترقی کی راہیں بند کر رکھی تھیں بلکہ ہماری زبانوں کے نشو نما کو بھی روک رکھا تھا۔ ہماری تہذیبی زندگی بھی پابند سلاسل تھی اور اس پر پہرے بٹھا دیے گئے تھے۔

جب ملک آزاد ہوا تو ہمارے معاشی، اقتصادی ارمان انگڑائیاں لینے لگے اور نکبت و افلاس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کشمکش ہونے لگی۔ اسی کے ساتھ ہمارے تہذیبی سوتے بھی جاگنے لگے، ہماری زبانیں نئی بلندیوں کی طرف بڑھنے کے لیے نئی راہیں ڈھونڈنے لگیں۔ زنجیریں اب اور ناقابل برداشت ہوگئیں۔ دریا بند نہیں رہ سکتا تھا۔ پھوٹ نکلا۔

لسانی صوبوں کی مانگ، نظم و نسق کی زبان کا سوال، ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ اور لسانی اقلیتوں کے مطالبات سب اسی وسیع اور محیط ملک ہلچل کا حصہ ہیں۔ یہ عوامی سوال ہیں اور عوامی نقطۂ نظر ہی سے انھیں حل کرنا ہے۔ یہ تہذیبی مسائل ہیں اور انھیں اسی انداز میں سیاسی اور فرقہ وارانہ گردہ

بندیوں سے اونچا اٹھ کر دیکھنا ہے۔

چنانچہ ملک بھر میں جہاں جہاں اُردو بولنے والے خاصی تعداد میں بستے ہیں وہ اُردو کے موقف اور مستقبل کے بارے میں سوچتے ہیں، کانفرنسیں کرتے ہیں، اس کے تہذیبی ورثے کا جائزہ لیتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ خداوندانِ نظم ونسق کا اس کے ساتھ معاندانہ رویہ دیکھتے ہیں اور تشویش محسوس کرتے ہیں۔

ہم اُردو بولنے والوں کی دقتیں اس لیے بھی زیادہ ہیں کہ ملک میں کوئی علاقہ ایسا نہیں جو بلا شرکت غیرے اردو کا علاقہ قرار دیا جا سکے۔ حالانکہ مجموعی طور پر ملک بھر میں اس کے بولنے والوں کی تعداد کئی لسانی ریاستوں کی آبادی سے زیادہ ہے۔ مرہٹی، کنڑی، تلگو، تامل، ملیالم، بنگالی، گجراتی سبھی زبانیں بولنے والے اگر دوسرے مقامات پر اقلیت میں ہیں تو کم سے کم ان میں سے ہر ایک زبان کی ایک ایک ریاست بھی ہے جہاں اس کو بلا کم وکاست ترقی کے مواقع حاصل ہیں۔ لیکن اُردو کا موقف یہ ہے کہ ہر جگہ اقلیت کی زبان ہے۔ کشمیر میں وہ سرکاری زبان تو ہے لیکن کشمیری عوام کی زبان کشمیری ہے اور جموں کے لوگ ڈوگری بولتے ہیں۔

اردو بولنے والے عوام قریب قریب ہر شہر میں موجود ہیں لیکن اصل میں اس کا وطن بھی یو۔پی اور بہار کا یہی وسیع وعریض علاقہ ہے جو ہندی کی جنم بھومی بھی ہے، اردو یہیں پیدا ہوئی، یہیں پروان چڑھی، اس کی زمین یہی ہے، اس کی جڑیں یہیں ہیں۔

ذرا اردو کے عہد طفولیت کا جائزہ لیجیے۔ اس دور کا خیال کیجیے جب اردو پروان چڑھ رہی تھی بادشاہوں اور ان کے محدود نظم ونسق کی زبان فارسی تھی اور دیہاتی عوام اپنی اپنی بولیاں بولتے تھے۔ وادیٔ گنگ وجمن کی کوئی مشترکہ بولی نہیں تھی کہیں اودھی بولی جاتی تھی تو کہیں برج بھاشا۔ کوئی کھڑی بولی سے کام نکالتا تھا تو کہیں بھوجپوری کا چلن تھا۔ کوئی مگدھی کا علاقہ تھا تو کوئی متیھلی کا۔ دربار کی زبان اور عوام کی بولیوں کے درمیان ایک خلیج تھی، ناقابلِ عبور۔

ایسے میں سماج بڑھتا رہا۔ سماج کی ضرورتیں بڑھتی رہیں۔ دو عوامل تھے جو ساتھ ساتھ سرگرم عمل تھے۔ دو دھارے تھے جو ساتھ ساتھ بہتے تھے۔ ایک تصوف کا دھارا تھا، دوسرا تجارت کا۔

صوفیوں کی ضرورت تھی کہ عوام سے ناطہ جوڑیں۔ انھوں نے دربار سے بغاوت کی تھی، دولت وثروت سے منہ موڑ لیا تھا اور خدائی سے رجوع کیا تھا، انھیں عوام تک اپنا پیام پہنچانا تھا۔

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے دکن میں، نانک نے پنجاب میں، کبیر نے یو۔پی میں اور

صوفیائے بہار شریف اور پھلواری شریف ۔ نے بہار میں اور دوسرے صوفیائے کرام نے اور مقامات پر ایک ہی بات کہی اور قریب قریب ایک ہی زبان میں کہی ۔ اس لیے تعجب کا کوئی مقام نہیں کہ اُردو نثر کی پہلی کتاب آج سے پانچ سو سال پہلے ایک صوفی نے تصنیف کی اور یہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی معراج العاشقین ہے۔

معراج العاشقین کی زبان کا تجزیہ کیجیے ۔ یا حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے کلام کا ۔ یا صوفیائے بہار کی تخلیقات کا آپ کو یہی محسوس ہوگا کہ ان کی زمین ایک ہی ہے ۔ ان کی بنیادیں اسی پرانی بہار کے علاقے ہیں کہیں برج یا اودھی کی جھلک ملے گی تو کہیں ہریانوی کی، کہیں مگدھی کی۔

صوفیائے کرام نے تصوف کے پرچار کے لیے یا پھر مخصوص بیماریوں کی دواؤں کو بتلانے کے لیے شاعری سے کام لیا۔ حضرت مخدوم بہاری نے بہار والوں کو آنکھ کا علاج بتلایا۔۔۔۔۔

لودھ، پھٹکری، مردار سنگ

ہلدی، زیرہ، ایک ایک تنک

افیون چنا بھر، مرچیں چار

اور پھر موتھا اس میں ڈار

پوست کے پانی پوٹلی کرے

نیناں پیر ا پل میں ہرے

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے دکن نواسیوں کو دانتوں کی دوا بتلائی۔

زیرہ، مرچاں، سوُر، سونٹھ

کتھا اجلا لے کر گھونٹ

نیلا تھوتھا، دھنیا بھون

اس میں ملا تو سیندھا لون

پان پلاس کی کانٹھیاں آن

جاپھل، لونگ اور لوبھان

جوں جوں لگادے پادے سکھ

تجھ دانتوں کا جادے دُکھ

حضرت مخدوم بہاری کے جانشین حضرت بلخی نے فرمایا۔۔۔۔۔

جی مگن میں ہے کر آئی ہیں سہانی رتیاں

جن کے کارن تھے بہت دن سے بنائی گتیاں

اور خواجہ بندہ نواز نے دکن میں کہا ــــــ

پانی میں نمک ڈال لیاں، دیکھنا ہے

جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے

دیا گھول خودی اپنے خدا ساتھ مصطفیٰ

جب گھل گئی خودی تو خدا بولنا کسے

کلام کے یہ نمونے آپ کے سامنے ہیں۔

پندرھویں صدی عیسوی کے صوفیائے کرام کی تخلیقات کے بعد سولھویں اور سترھویں صدی تک ریختہ گو شعرا کا کلام ملاحظہ فرمائیے۔ قلی قطب شاہ کی مشہور غزل "پیا باج پیالہ پیا جائے نا۔" سے آپ واقف ہیں، اور یہ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے، جو سولھویں صدی میں گذرا ہے، غواصی اور وجہی نے اسی زمانہ میں شاعری کی۔ سترھویں صدی میں تانا شاہ کے دربار کا ایک شاعر کہتا ہے۔

ملنا تمن کا غیر سے کوئی جھٹ کوئی سچ کہتے؛

کس کس کا منہ موندوں سجن کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے

اسی زمانہ میں بہار کا شاعر بیدل جب پٹنہ چھوڑنے پر مجبور ہوتا ہے تو اپنی دیہاتی منہ بولی ماں کے پاس جا کر کہتا ہے۔

سر اوپر جب کوئی نہیں تب دشمن آپن کیس

پٹنہ نگری چھاڑ دیہن اب بیدل چلے بدیس

بہار کا ایک اور شاعر قاضی عبدالغفار کہتا ہے۔

تن کا تانبا آگ موں پانی کرے جو کوئے

ڈارے بوٹی پریم کی تب جا کنچن ہوئے

غرض پندرھویں عیسوی سے لے کر سترھویں صدی کے ختم، اٹھارھویں صدی کی ابتدا تک ہم دیکھتے ہیں کہ صوفیائے کرام ہوں کہ صوفی منش شعرا دہلی میں، لکھنؤ میں، بہار میں، دکن میں، غرض جہاں بھی وہ تھے ایک مقامی ریختہ کی تخلیق کر رہے تھے۔

قریب قریب اسی زمانہ میں ہماری سماج پر دیہی معیشت کی قبا تنگ ہو رہی تھی۔ تجارت

شروع ہو چلی تھی۔ بازار بھرنے لگے تھے۔ اور منڈیاں لگنے لگی تھیں۔ شہروں کی بنیا دپڑ رہی تھی۔ بہار اور یو، پی کے علاقوں ہی میں، پٹنہ، بنارس، الہ آباد، لکھنؤ، میرٹھ، آگرہ جیسے شہر ابھرنے لگے۔ دہلی راجدھانی تھی۔ ان سب کا راجدھانی سے علاقہ لازمی تھا۔ سڑکیں بننے لگیں جو ان شہروں کو ایک دوسرے سے ملاتی تھیں۔ وہی ریختائیں جو ان شہروں میں پیدا ہو رہی تھیں اب ایک معیاری زبان کا روپ دھارنے لگیں جو ان شہروں میں یکساں طور پر بولی جاتی تھی باوجودیکہ ان میں سے ہر شہر کے اطراف ایک بڑا دیہی علاقہ تھا جس کی اپنی الگ بولی تھی۔ پٹنہ کے اطراف مگدھی تھی تو بنارس بھوجپوری علاقہ میں واقع تھا۔ آگرہ برج کے علاقے کا شہر تھا تو لکھنؤ اودھی علاقے کا۔ یہ معیاری زبان دہلی کے اطراف واکناف کی کھڑی بولی تھی اور یہی اُردو تھی۔

اس لحاظ سے عصری اردو اور عصری ہندی دونوں کی زمین ایک ہی ہے اور دونوں کا لوک آدھار ایک ہی ہے۔ ہر زبان کا اپنا ایک لوک آدھار ہوتا ہے folk base ہوتا ہے اور زبان اپنا مزاج، اپنے الفاظ کا بیشتر ذخیرہ اسی لوک آدھار سے حاصل کرتی ہے۔ ہندستان کی ہر قومی زبان کا اپنے علاقے میں ایک لوک آدھار ہے۔ اسی طرح عصری اُردو اور عصری ہندی دونوں کا لوک آدھار اسی وادیٔ گنگ و جمن میں ہے۔ اسی لیے ادبی اسالیب کے تنوع کے باوجود دونوں کی قواعد ایک ہے اور دونوں کے الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ مشترک ہے۔

کچھ نادان حضرات یہ کہتے ہیں کہ اردو پر فارسی اور عربی جیسی بدیسی زبانوں کی چھاپ ہے اسی لیے اس کا مزاج بدیسی ہے، اس کے برخلاف ہندی، سنسکرت سے فیضان حاصل کرتی ہے اسی لیے وہ ٹھیٹ ہندوستانی ہے۔

مجھے اس استدلال سے سخت اختلاف ہے۔ اگر ملکی غیر ملکی کی بات کرنی ہے تو پھر سنسکرت بھی غیر ملکی زبان ہے کیونکہ یہ بھی تاریخ کے کسی دور میں سہی باہر ہی سے ہندوستان آئی ہے، لیکن میں اس طرز بحث کو معقول نہیں سمجھتا۔ بہت سی ہندوستانی زبانوں کی طرح ہندی بھی انڈو آرین زبان ہے اور اردو بھی۔ بنگالی بھی ہند آریائی زبان ہے اور مرہٹی بھی۔ اور ہندوستان کی کون سی زبان ہے جس کی سنسکرت سے چشمک نہیں رہی ہے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں پراکرت اور اس سے پہلے سنسکرت اس علاقہ کی سرکاری زبان رہی ہے جو تلگو کا علاقہ کہلاتا ہے۔ پھر تلگو زبان میں ترجمے کیے گئے اور ادب منتقل ہوا۔ تلگو نظم ونثر کی تخلیق ہونے لگی اور پھر تلگو بھی سرکاری زبان بنی۔ ایک بڑی تحریک تلگو کو سنسکرت کے اثر سے پاک کرنے اور کھری تلگو بولنے کی تاریخ میں چل چکی ہے۔ یہی بات اور زبانوں پر بھی صادق آتی ہے۔

اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر زبان میں "تت سم" (یعنے سنسکرت کے وہ الفاظ جو جوں کے توں استعمال ہوتے ہیں) اور "تد بھو" (یعنے سنسکرت کے الفاظ اپنی بدلی ہوئی شکل میں) الفاظ ملتے ہیں۔ کہیں "تت سم" زیادہ ہیں تو کسی زبان کی ساخت میں "تد بھو" الفاظ کی فراوانی ہے۔ خود عصری اردو میں کئی "تت سم" الفاظ ہیں۔ اور عصری ہندی کا یہ رجحان کہ اس میں "تت سم" الفاظ اور سنسکرت مشتقات ٹھونس دیے جائیں کوئی عام پسند رجحان نہیں ہے۔ اس کی مخالفت بڑھ رہی ہے، اس کی وجہ سے عصری ہندی اپنے لوک آدھار سے دور ہوتی جا رہی ہے۔

اسی قسم کا ایک تجربہ اُردو کے تعلق سے جامعہ عثمانیہ میں ہو چکا ہے۔ اردو زبان میں فارسی اور عربی الفاظ ٹھونس کر اسے ایک ایسی جناتی زبان بنا دیا گیا تھا جو عام انسان کی فہم سے بلند ہو گئی تھی۔

الفاظ فارسی ہوں کہ عربی، سنسکرت ہوں کہ انگریزی، محض لسانی عصبیت کی بنا پر نہیں ٹھکرائے جا سکتے۔ زبان کے مزاج سے اگر وہ مطابقت رکھتے ہوں تو کھپ جائیں گے ورنہ متروک ہو جائیں گے یا پھر ان میں تبدیلی پیدا کر کے انھیں زبان کے مطابق ڈھال لیا جائے گا۔ یہی اُردو کے معمار شاعروں اور ادیبوں نے کیا ہے، نظیر نے کئی الفاظ وضع کیے اور انھیں شعر میں نگینہ کی طرح جڑ دیا۔ غالب نے ع "مجھے ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا" کہہ کر انگریزی لفظ "نمبر" کی تھیند کر ڈالی۔

آپ جانتے ہیں کہ عربی میں "نقد" کے معنے "پرکھ" کے ہیں۔ لیکن بول چال کی اُردو میں اس کا مطلب بدل گیا اور وہ کیش cash کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ اور بھی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ زبان عوامی بول چال کی ٹکسال میں ڈھل کر ہی زبان بنتی ہے اور عوام الفاظ کے برتنے میں تعصب سے نہیں فراخدلی سے کام لیتے ہیں۔

پھر فارسی الفاظ عصری ہندی میں بھی تو کثرت سے ملتے ہیں۔ اور کس زبان میں نہیں ملتے ۔؟ بنگالی میں، اڑیہ میں، مرہٹی میں، گجراتی اور راجستھانی میں سبھی زبانوں میں فارسی الفاظ ملتے ہیں۔ مرہٹی، گجراتی اور پنجابی زبانوں میں تو فارسی الفاظ کی کثرت ہے۔ سوال یہ ہے کہ انگریزی جسے اتنے زیادہ لوگ پڑھتے اور بولتے ہیں اور جو آج بھی ہماری سرکاری زبان ہے، اس نے ہماری قومی زبانوں کو اتنا متاثر نہیں کیا جتنا کہ فارسی نے کیا ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ فارسی بھی ایک آریائی زبان ہے اور ہماری پڑوسن ہے۔ قدیم فارسی اور سنسکرت تو بہنیں ہی ہیں۔ اس لیے کئی ایسے الفاظ جو ہماری زبانوں کے مزاج سے مطابقت رکھتے ہیں ہماری بول چال میں آ گئے۔ اب وہ اجنبی نہیں رہے۔

پھر بھی ہم اُردو کے بولنے والوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ فارسی اور عربی الفاظ ٹھونس کر ہم اپنی

زبان کو اس کے اپنے لوک آدھار سے دور نہ ہونے دیں۔ فارسی زبان سے کینہ نہیں لیکن ان کا بے جا استعمال بھی جائز نہیں۔ ہمارے اچھے شاعروں نے ہمارے لیے بہی نقش چھوڑے، ہیں۔ مثلاً قلی قطب شاہ نے کہا۔

قطب شاہ نہ دو مجُ دِوانے کو پند
دِوانے کو کچ پند دیا جائے نا۔

یہاں فارسی کا لفظ 'پند' اس خوبی سے استعمال ہوا ہے کہ کانوں پر گراں نہیں گزرتا۔

انیس نے کہا ع "شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے" اور یہ بھی کہا۔ ع "کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا" "شبنم" فارسی ہے مگر نہایت موزوں۔ 'اوس' ہندی ہے اور نگینہ کی طرح جڑا ہوا۔

میر نے فرمایا۔

پتہ پتہ، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

یہاں 'گل' بھی ہے اور 'باغ' بھی اور 'حال' بھی۔ یہ سب فارسی الفاظ ہیں لیکن اجنبی نہیں لگتے۔

اُردو پر ایک اور اعتراض یہ ہے کہ اُردو نے اپنے ادبی اسالیب، اپنے استعارے، تشبیہات و تلمیحات سب فارسی سے حاصل کیے ہیں، جو اسے اجنبی بنا دیتے ہیں۔

یہ اعتراض بھی نہ صرف غیر صحیح ہے بلکہ یہ بھی لسانی عصبیت اور زبان کے ارتقاء کے طور طریقوں سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ عصری انگریزی پر لاطینی اور فرنچ زبانوں کا بہت اثر ہے۔ کئی ادبی اصطلاحیں، کئی تشبیہات اور تلمیحات انگریزی نے ان "بدیسی" زبانوں سے حاصل کیے ہیں لیکن ان پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ اسی طرح زبانیں ترقی کرتی ہیں اور ایک دوسرے سے فیضیاب ہوتی ہیں اور ان کا ذخیرہ بڑھتا جاتا ہے۔

اُردو نے صرف "عدل نوشیرواں" اور "جام جمشید" ہی کو تو نہیں نظم کیا ہے بلکہ "صبح بنارس"، "شام اودھ"، "شب مالوہ"، "سحر بنگال" اور "زلف بنگال" کو بھی ابدی قدریں بخشی ہیں۔ یہ سب ہندوستانی تہذیب سے ماخوذ ہیں کہ پردیسی درآمدات ہیں؟

رانی کیتکی اور اودے بھان کی کہانی اردو کے ادیب انشا نے لکھی۔ راجہ رام اور کنول دی کے عشق کو بہار کے ایک شاعر شاہ آیت اللہ جوہری نے نظم کیا ہے۔ شیریں فرہاد، اور لیلیٰ مجنوں کے

ساتھ نل دمینتی بھی اُردو ادب کے رومانی افق پر درخشاں نظر آتے ہیں۔ ہیر رانجھا اور مرزا صاحبان ہندوستانی تھے ایرانی نہیں۔ غلام نقشبند بہار کا اٹھارویں صدی کا شاعر جب یہ کہتا ہے کہ ــــــ

پرویز و نل و کوہ کن و وامق و مجنوں

جو ہے وہ میری بات کی تقلید کرے ہے

تو وہ نل کو قیس و فرہاد سے الگ اور اجنبی نہیں مانتا۔ جب نظیرؔ عالم وجد میں بول اٹھتا ہے۔

"اب آگے بات جنم کی ہے جے بولو کرشن کنہیا کی"

تو معتقدین کے سر احترام سے جھک جاتے ہیں۔ جب مخدومؔ نیلے نیلے آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں اور ناچتے ہوئے ابر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو دیکھتے ہیں تو "نیل تن کرشن کے پہلو میں مچلتی گوپیاں" یاد آجاتی ہیں۔

اردو نے اپنے ادبی خزانے کو ہندوستانی تہذیبی قدروں سے مالا مال کیا ہے۔ ہندوستانی صبح وشام، ہندوستانی دریا اور پہاڑ، ہندوستانی تہوار اور میلے سب پر اُردو شاعروں اور ادیبوں نے لکھا ہے۔ خوبانِ ہند کا حسن، ان کے حسن کا نور، ان کے زلفوں کی مہک، ان کی درخشاں جبین پر سرخ ٹیکے کی دمک، سبھی سے اُردو شاعروں نے انسپریشن لیا ہے۔ اردو پر یہ اعتراض بھی لاعلمی کا نتیجہ ہے۔

دوسرے یہ کہ اُردو نے بعض اصناف ادب فارسی سے حاصل کیے ہیں تو بعض اسلوب ہندی سے بھی لیے ہیں۔ اردو میں اگر غزل ہے تو دوہے بھی ہیں۔ قصیدے ہیں تو گیت بھی ہیں۔ بلکہ اردو کی لچک کا اندازہ بھی ان ہی اصنافِ سخن کے تنوع سے ہوتا ہے۔ اور یہی نہیں ریڈیو کی ایجاد کے بعد ڈرامے کی ایک نئی صنف کی ضرورت لاحق ہوئی جس میں اداکاری کی گنجائش نہ تھی محض مکالموں اور ان کے اداکرنے کے انداز کی اہمیت ہے۔ اس میدان میں بھی اردو نے اپنا سکّہ جمایا۔ مختصر افسانے، رپورتاژ، نظم معرا، غرض کئی اصنافِ ادب کو اردو کے ادیبوں نے خوب ترقی دی۔

کچھ کرم فرما ارشاد فرماتے ہیں کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور تقسیم ہند کے بعد اسے پاکستان الاٹ ہو گیا۔

اردو نہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور نہ سب مسلمانوں کی۔ بنگال میں، مدراس میں، کیرالا میں، آندھرا پردیش میں، میسور میں، مہاراشٹر میں اور گجرات میں ایسے کئی مسلمان گھرانے ملیں گے جو نہ صرف اردو کا ایک لفظ نہیں جانتے بلکہ جن کی مادری زبان بنگالی، تامل، ملیالم، تلگو، کنڑی، مراٹھی،

یا گجراتی ہے۔ اس کے برخلاف اتر پردیش اور بہار میں کئی غیر مسلم ایسے بستے ہیں جن کی زبان اُردو ہے۔ پھر اُردو زبان کی تعمیر میں کئی غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کا حصہ ہے۔ جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور پاکستان میں اگر بعض ارباب کرم اردو کو زبان کیا، رکن ایمان بھی سمجھیں تو بھی ہر حالت میں اُردو ان ہی حضرات کی مادری زبان ہوگی جو ہندوستان سے پاکستان گئے ہیں ورنہ وہاں کے عوام کی زبان تو سندھی، بلوچی، پشتو، پنجابی، اور بنگالی ہی ہے، پاکستان میں اردو کو وہ لوک آدھار کہاں نصیب ہے جو اسے یو، پی اور بہار میں میسر ہے۔ اردو کی نوعیت وہاں جرس بے کارواں کی سی ہے۔

اردو بہرحال ہندوستانی زبان ہے۔ اس کی بنیادیں یہیں ہیں۔ اس کا لوک آدھار یہیں ہے۔ اس کے وسیع بولنے والے یہیں رہتے بستے ہیں اور وہ ان کی مادری زبان ہے۔ اسی لیے انجمن ترقی اردو ہند اور ہندوستان بھر میں اردو بولنے والوں کو یو، پی اور بہار میں اردو کے موقف اور مستقبل کے بارے میں گہری تشویش لاحق ہے۔

اردو کو آزاد ہندوستان کے آئین میں ایک قومی زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ لیکن خود اس کے اپنے علاقے میں اسے جو جائز مقام ملنا چاہیے ابھی تک نہیں ملا، اس مقام پر بہار باسی شاید خوش قسمت ہیں۔ اصل دقتوں کا سامنا تو اتر پردیش میں کرنا ہے۔ بہار اور یو، پی کے حالات کا بنیادی فرق یہ ہے کہ یو، پی میں اُردو کی جان بوجھ کر اور فرقہ وارانہ زاویوں سے مخالفت کی جاتی ہے اور ہندی بھاشیوں کو اردو بولنے والوں کے خلاف صف آرا کیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ریاست بہار میں اردو بولنے والوں اور ہندی بولنے والوں کے درمیان صحت مند اور بھائی چارہ کے روابط ہیں۔ یہاں بہت سے ہندی پریمی اردو کی اہمیت اور حیثیت کو مانتے ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ یو، پی، اور بہار میں اُردو کو اس کی اہمیت کے لحاظ سے اور اس کے بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے ان ریاستوں کے تعلیمی نظام میں اور نظم و نسق کے ڈھانچے میں موزوں مقام ملے۔ تحتانی درجوں میں ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہی ہو، یہ تو آئین نے تسلیم کر لیا ہے۔ ثانوی درجوں میں ذریعۂ تعلیم کیا ہو، اس پر ہندوستان کی سبھی ریاستوں کے وزرائے تعلیم کی کانفرنس میں غور کیا گیا تھا جو ۱۹۴۹ء میں مولانا آزاد مرحوم کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی، اس کانفرنس نے فیصلہ کیا تھا کہ ثانوی منزل پر بھی اگر کسی علاقہ میں ایسے طالب علموں کی معقول تعداد موجود ہو جن کی مادری زبان علاقائی یا ریاستی زبان سے مختلف ہو تو ان کے لیے الگ ثانوی تعلیم کا بندوبست ہوگا جہاں ذریعۂ تعلیم اقلیتی زبان ہوگی۔ ریاستی تنظیم جدید کمیشن نے ۱۹۵۶ء میں رائے دی کہ تحتانی تعلیم کی

نوعیت الگ الگ ہے ثانوی تعلیم کے لیے آئین میں ذکر ضروری نہیں، البتہ حکومت ہند تفصیلات کا تعین کر سکتی ہے۔

اب حکومت کا اور تعلیمی بورڈ کا یہ فیصلہ ہے کہ اقلیتی زبانوں میں ثانوی تعلیم کا بندوبست اقلیتیں خود کرلیں سرکاریں امداد دیں گی، مگر وہ خود اس کی ذمّہ داری نہیں لے سکتیں۔ یہ فیصلہ ظاہر ہے ۱۹۴۹ء میں وزرائے تعلیم کے فیصلہ کے برعکس ہے۔

آج کل مہاراشٹر میں بھی قاضی اسکیم پر جو بحث چل رہی ہے اس کی بھی بنیاد یہی ہے۔ قاضی اسکیم کے مطابق اعلیٰ ثانوی مدارس میں ذریعۂ تعلیم مراٹھی ہوگی اور اردو محض ایک زبان کی حیثیت سے پڑھائی جائے گی۔

میری ناقص رائے میں انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۴۹ء کے فیصلوں پر قائم رہے اور حکومت ہند سے مطالبہ کرے کہ اس پر عمل ہونا چاہیے۔ یہ اعتراض کے اقلیتی زبان بولنے والے طلبا ریاستی زبان بولنے والے طلبا کے مقابلہ میں ریاستی زبان میں کمزور ہوں گے اور اس طرح سرکاری نوکریوں کے حاصل کرنے میں انھیں دقت ہوگی، معقول نہیں۔ سرکاری نوکریوں کے لیے یا پبلک سروس کمیشن کے یا دوسرے محکمہ جاتی امتحانات کے لیے سرکاری زبان خواہ ہندی ہو یا کوئی اور اس سے صرف اتنی واقفیت کافی ہے کہ کام چلایا جا سکے۔ اقلیتی زبان بولنے والے امیدواروں سے مہارت کا مطالبہ کرنا قرین انصاف نہیں ہے۔ اور جب اقلیتی زبان بولنے والا طالب علم تیسرے درجہ ہی سے ریاستی زبان سیکھنے لگے گا تو اعلیٰ ثانوی تعلیم ختم کرنے تک، یہ تو امید کی جا سکتی ہے کہ اسے ریاستی زبان سے اتنی واقفیت ضرور ہو جائے گی کہ کام چلایا جا سکے۔ یو۔ ڈی۔ سی اور اس سے اونچی نوکریوں کے لیے تو جامعاتی ڈگری لازمی ہے۔

اس کے علاوہ نظم و نسق میں بھی مخصوص اغراض کے لیے اقلیتی زبان کو اس کے بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے مناسب مقام ملنا چاہیے۔ انجمن ترقی اردو ہند نے اس ضمن میں معقول تجویزیں رکھی ہیں۔ اصولاً تو ان باتوں کو مان لیا گیا ہے کہ خاص خاص علاقوں میں جہاں اُردو بولنے والوں کی معقول تعداد ہے، سرکاری اعلانات اردو میں بھی شائع کیے جائیں گے۔ بعض اہم قوانین بھی اردو میں چھاپے جائیں گے۔ سرکار کو بھی بہرحال عوام کے لیے چلانا ہے کوئی وجہ نہیں کہ خود سرکاری لٹریچر عوام کو اپنی زبان میں نہ پہنچایا جائے۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ یو۔ پی، بہار کے علاقہ میں کم سے کم ایک اردو یونیورسٹی ہو اور دوسری یونیورسٹیوں میں اردو کو بہ حیثیت ایک مضمون کے پڑھایا جانے کا معقول انتظام ہو۔

میں پورے خلوص کے ساتھ یہ تجویز رکھوں گا کہ یو پی اور بہار میں وہ طلبا جن کا ذریعۂ تعلیم ہندی ہے وہ بھی اردو ضرور پڑھیں ان مدرسوں میں کم سے کم اختیاری زبان کی حیثیت سے اُردو پڑھائی جائے۔

میری یہ غور کردہ رائے ہے کہ اردو پڑھنے اور سیکھنے سے ہندی خود بھی ترقی کرے گی۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ اُردو پڑھنے والے لڑکے، لڑکیاں ہندی لازمی سیکھ رہی ہیں اور ہندی پڑھنے لکھنے سے ان کی اُردو میں اور نکھار آئے گا۔

میں پھر اس بات پر زور دوں گا کہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کا لوک آدھار ایک ہی ہے۔ دونوں کے الفاظ کا مشترکہ ذخیرہ وسیع ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے فیضیاب ہونا ہے۔ دونوں بہنیں ہیں۔ ازدواجی رشتہ ٹوٹ سکتا ہے لیکن بہنوں کا رشتہ نہیں ٹوٹ سکتا۔ یہ رشتہ ماں کی کوکھ میں ڈھلا ہے اور اس کے دودھ سے استوار ہوا ہے۔

ہندی کے بعض کرم فرما اردو کے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں لیکن ہندی پڑھنے اور بولنے والے وسیع عوام اس عصبیت سے دور ہیں۔ اسی لیے تو آپ دیکھتے ہیں کہ غالب کے ہندی نسخے ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو کر فروخت ہوتے ہیں۔ اُردو کے افسانہ نگار، اُردو کے شاعر اور اردو کے ادیب ہندی رسالوں میں خوب چھپتے ہیں اور ان کی تخلیقات بہت مقبول ہو رہی ہیں۔ ہمیں ان صحت مند تعلقات کو اور بھی استوار کرنا ہے۔ ہماری کانفرنسوں، ادبی محفلوں اور تہذیبی سرگرمیوں کو اس مقصد کی تکمیل کا آلہ بنانا ہے۔

حضرات! میں نے آپ کا بہت قیمتی وقت لیا۔ آخر میں آپ سب کا اور منتظمین کانفرنس کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مجھے یہ عزت بخشی کہ آپ کی محفل میں شریک ہو سکوں۔

خطوط ——— راج بہادر گوڑ

بنام : صالحہ عابد حسین

۲۳ ستمبر ۱۹۷۹ء

محترمہ صالحہ بیگم صاحبہ

آداب عرض ہے

آپ کی کتاب "گوری سوئے سیج پر" پر میں نے تبصرہ کیا ہے۔ "ہماری زبان" میں کتابت کی غلطیوں نے اس کا بھرکس نکال دیا۔

۳ ستمبر کے روز نامہ سیاست (حیدرآباد) میں بھی شایع ہوا ہے۔

اور ستمبر کے ماہنامہ "کمیونسٹ جائزہ" میں بھی شایع ہوا ہے۔ میں نے یہ آخرالذکر شمارہ ذریعہ ڈاک آپ کی خدمت میں بھیج دیا ہے۔

آپ مجھ سے شخصی طور پر شاید واقف نہیں۔ کبھی بات چیت کا موقع نہیں ملا۔ ویسے میں آپ کو دور سے البتہ کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ آپ کی تصنیفات تو خیر دیکھتا ہی رہتا ہوں۔ اور کچھ تو میرے کتب خانے کی زینت بھی ہیں۔

البتہ عابد حسین صاحب مرحوم سے اچھی خاصی ملاقاتیں رہی ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے جلسوں میں بھی اور یوں بھی۔ مرحوم کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اور ان کا کرم میرے لیے ہمیشہ سرمایۂ حیات رہے گا۔

انشاءاللہ چنڈی گڑھ میں انجمن کے جلسوں میں ملاقات ہوگی۔

نیازمند

راج بہادر گوڑ

بنام : پروفیسر جگن ناتھ آزاد

حیدرآباد

۱۶ ستمبر ۱۹۸۴ء

مکرمی ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ بہت ممنون ہوں۔

"آنکھیں ترستیاں ہیں" تو میں نے شروع سے آخر تک عرصہ ہوا پڑھ ڈالی۔ اس پر لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ مگر صاحب اس میں حضرت کاتب نے وہی کمال دکھلائے جو کاتب ازلی نے آپ کی 'کتابت' کے وقت دکھایا تھا۔ پنجابی تو بنایا لیکن گیسو دراز نہیں بنایا۔ اگر یہ ہوجاتا تو بادہ خواری کے باوجود آپ کا شمار صوفیوں میں ہوتا۔

'اقبال' پر آپ کی کتاب آج کل میں آجائے گی۔ انشاءاللہ آپ کو گلہ نہیں رہے گا۔

ادھر کیفی نے "ابلیس کی مجلس شوریٰ ــ دوسرا اجلاس" نظم کہی ہے۔ اس پر تبصرہ غالباً ۲۳ ستمبر کے 'حیات' میں شائع ہوگا۔ آپ کی رائے چاہوں گا۔ یہاں آپ سے معذرت کا طلب گار بھی ہوں۔ آپ نے 'اقبال اور مغربی مفکرین' کتاب میں 'اقبال اور دانتے' اپنے مقالے میں اقبال کے جس ابلیس کا تصور پیش کیا ہے وہ دانتے سے مختلف تو ہے ہی لیکن وہ اس ابلیس سے بھی مختلف ہے جو اقبال کی اردو نظموں سے ابھرتا ہے۔ یہاں وہ انسان کو راہِ مستقیم سے بھٹکانے والا ہے۔ اور اقبال ابلیس سے کہلوانے میں نظام ابلیس کا اصل دشمن مسلمان ہے۔ یہاں بھی مومن کا اُن کا تصور بہت وسیع ہے۔ وہ جس میں آفاق گم ہوں۔ کہیں وہ 'مومن' جن کا اقبال خواب دیکھ رہے تھے آپ اور ہم تو نہیں۔

دہلی جانے کے بعد آپ کے تاشقند کے دورے کے بارے میں بات کروں گا۔ کابل کی بات کا وعدہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن سلسلہ جنبانی کر چکا ہوں۔ ضرورت دوبارہ زنجیر کھٹکھٹانے کی ہے۔

آپ کا خط آتا ہے تو بڑی مسرت محسوس ہوتی ہے۔ میں نے اپنے خطوط کے صندوق میں ایک "گوشۂ آزاد" الگ بنا رکھا ہے۔

نیاز مند
راج بہادر گوڑ

بنام : پروفیسر گیان چند جین

حیدرآباد

۱۰ مارچ ۱۹۸۳ء

محترمی ڈاکٹر گیان چند صاحب

تسلیمات

میری طرف سے ساہتیہ اکاڈمی کے ایوارڈ پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ ایک عرصے کے بعد ساہتیہ اکاڈمی کو اردو کا خیال ہوا ہے۔

میں آپ سے مل کر مبارکباد دینا چاہتا تھا۔ اور پھر تہنیتی جلسے میں بھی شرکت سے اپنی غیر ادبی مصروفیتوں کی وجہ سے محروم رہا۔

ویسے اودھیش سے کہا تھا کہ آپ تک میرا پیام تہنیت پہنچا دے لیکن اس سے تشفی ممکن نہ تھی۔

کل ہی بمبئی سے حیدرآباد آیا۔

اُمید کہ آپ میری طرف سے تاخیر کو اپنی روایتی فراخدلی سے معاف فرمائیں گے اور میری ناچیز مبارکباد قبول فرمائنگے

راج بہادر گوڑ

بنام : ڈاکٹر خلیق انجم

(۱)

۳۰ جولائی ۱۹۷۶ء

مکرمی ڈاکٹر خلیق انجم

تسلیم و نیاز

آپ کے جواب کا انتظار ہی ہے ۔ آخر میرے تبصرے کا کیا حشر ہوا؟ کچھ نہیں تو واپس ہی کر دیجیے۔ ویسے اس میں کیا قباحت کی بات آگئی ہے نہ تو آپ نے بتایا اور نہ میری سمجھ میں کچھ آرہا ہے۔

ادھر روشنائی" کا مقدمہ لکھنے کی تیاری میں خلیل الرحمٰن اعظمی کی کتاب میں نے دوبارہ پڑھی ۔ ترقی پسند ادب پر۔ اب جب انجمن نے اس کا دوسرا ایڈیشن چھاپنا طے کیا ہے میری رائے میں خلیل الرحمٰن صاحب سے درخواست بھی کرنی چاہیے کہ وہ اس میں ضروری تبدیلی کرنا چاہیں تو کر دیں۔ تبدیلی ضروری ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس میں بہت سی باتیں بڑھائی ہوں گی ۔ یہ کتاب انھوں نے ۱۹۵۷ء میں لکھی تھی۔ آخری بات ۱۹۷۱ء میں اور کتاب چھپی ۱۹۷۲ء میں۔ ۱۹۵۷ء میں جب وہ لکھ رہے تھے ان کے سامنے حیدرآباد اردو کانفرنس میں بنے بھائی کی تقریر تھی جس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بجائے انجمن اردو مصنفین کی بات کی تھی۔ ان سے اس مسئلہ پر کئی ادیب متفق نہیں تھے اس وقت بھی۔ اور یہ بات خلیل الرحمٰن صاحب کے سامنے نہیں تھی۔ اردو زبان جس دور سے گزر رہی تھی اس کے لیے انجمن ترقی اردو تھی ہی۔ اردو مصنفین الگ سے کیا تنظیم بناتے ؟ سویت یونین میں صرف انجمن سویت مصنفین ہے۔ سو تو ٹھیک ہے۔ سویت سماج میں طبقاتی آویزش نہیں ہے

ایک دوسرے سے متصادم اور متحارب طبقات نہیں۔ اس لیے ادب کے سامنے وہ مسائل نہیں ہیں جو ایک طبقاتی سماج کی ناآسودگیاں پیدا کرتی ہیں۔

اس بحث کے بعد انجمن کا احیا عمل میں آیا اور کرشن چندر معتمد عمومی تھے۔ پھر دلی کانفرنس ہوئی۔ اور اب تو باقاعدہ تنظیم قائم ہو گئی ہے۔ اب اسے فیڈریشن کی شکل دے دی گئی ہے۔ ہر زبان کی الگ تنظیم ہے جو ریاستی تنظیم ہو گی۔ اردو کی کل ہند تنظیم ہے جس کی کانفرنس حال ہی میں دہلی میں ہوئی تھی۔

خلیل الرحمن اعظمی صاحب یقیناً تاریخی اعتبار سے ان حقیقتوں کا ذکر کرنا چاہیں گے تاکہ کتاب Up to date ہو جائے۔ ورنہ کتاب ایک معنی میں outof date ہو کر رہ جائے گی ان کی اپنی رائے ہو سکتی ہے اور وہ اس پر قایم رہیں۔ "تحریکی ادب" سے ان کی بدظنی باقی رہتے ہوئے ادبی تحریکیں باقی رہیں گی۔ اور آج کی دنیا میں کوئی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کی تنظیم بھی نہ ہو۔ یہ بغاوتوں کا نہیں انقلابات کا دور ہے۔ انقلاب کے پیچھے تنظیم ہوتی ہے، اس کے سامنے ممکن الحصول کا نقشہ ہوتا ہے، مستقبل کا ایک Blue Print ہوتا ہے۔ انقلاب گھونس کی طرح گھر نہیں کھود ڈالتا۔ یہ انارکسٹ آتا ہے۔ وہ معمار کی طرح کھودے گا، بنیاد ڈالے گا اور نئی عمارت بنائے گا جس کا وہ پہلے سے منصوبہ تیار کر چکا ہے

میں بہت دور نکل گیا۔ منشا صرف یہ ہے کہ خلیل صاحب کو نظر ثانی کا موقع دیا جائے۔ اضافہ کریں شاید۔ پھر اُن کی مرضی۔

بہر حال آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔ یوں بھی خط و کتابت سے مل لینے کا آدھا مزہ تو آ ہی جاتا ہے۔

آپ کا

راج بہادر گوڑ

(۲)

۱۱ فروری ۷۷ء

پیارے خلیق انجم

بچی کی شادی کے موقع پر آپ کا پیام موصول ہوا۔ بہت بہت شکریہ۔

البتہ 'روشنائی' کے مقدمہ کے سلسلے میں بڑی تشویش لاحق ہو گئی ہے۔ میں نے نوٹس ایک نوٹ بک میں رکھے تھے اور وہ نوٹ بک غائب ہے۔ تلاش کر رہا ہوں۔ پھر یہ چناؤ کی گہما گہمی الگ ہے۔ سوچ رہا ہوں کیا کروں؟ کیا کتاب بغیر مقدمہ کے ہی چھپ جائے؟

ختم مارچ تک بہر حال مصروف رہوں گا۔ لکھنا پڑھنا اپریل سے پہلے ممکن نہیں۔

آج صبح تو پہاڑ ہی ٹوٹ پڑا۔ اردو کی ایک جید شخصیت سے ہم محروم ہو گئے صدر جمہوریہ کی موت واقعی ہمارے لیے غنیمت تھی۔ وہ میرے شخصی دوست تھے۔ حمیدہ سلطانہ کو ایک خط لکھ رہا ہوں۔

میں سوچ رہا تھا کہ رشید احمد صدیقی کی کوئی یادگار قائم کرنی چاہیے اور اب یہ نیا ظلم ہو گیا۔

آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ ہماری زبان یا اردو ادب کا کوئی شمارہ ان دونوں شخصیتوں کے لیے نکالا جائے؟

'اردو گھر' میں کوئی ہال ان کے نام سے موسوم کیا جائے۔ کہیں ہم لوگ اردو کے محسنوں کو بھلا تو نہیں رہے ہیں؟ بابائے اردو کو جلا وطن کر دیا۔ قاضی عبدالغفار کو بھلا دیا۔ رشید احمد صدیقی چل بسے اور ہم نے جی کھول کر آنسو بھی تو نہ بہائے۔

کچھ سوچنا ہوگا

آپ کا

راج بہادر گوڑ

(۳)

حیدرآباد

۲۶ فروری ۱۹۷۸ء

ڈیئر خلیق انجم

بانو طاہرہ سعید، ہندستانی نژاد ایرانی ہیں۔ اور حیدرآباد کے بریگیڈیر سعید کی اہلیہ ہیں۔ اردو، فارسی اور انگریزی میں شعر کہتی ہیں۔ ان کا ایک اردو مجموعہ چھپ چکا ہے اور دوسرا زیر ترتیب ہے انگریزی میں بھی کچھ نظمیں چھپی ہیں۔

میں نے کچھ انگریزی نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔ بھیج رہا ہوں۔ چاہو تو "ہماری زبان" میں

شائع کردو۔

تمہارا
راج بہادر گوڑ

(۴)

۲ستمبر ۱۹۷۸ء

مکرمی ڈاکٹر خلیق انجم
تسلیم و نیاز

پاکستان سے مرزا ظفر الحسن کا خط آیا ہے۔ ہم نے ان کی غالب لائبریری کو کتابیں دینے کا وعدہ کیا تھا۔ انھوں نے اس کی یاد دلائی ہے۔

اب چوں کہ فیض دہلی میں مل سکتے ہیں، ان کو اردو گھر مدعو کیا جائے اور کتابوں کا تحفہ دے دیا جائے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

میرے لیے حسب ذیل کتابیں فراہم کر دیجیے۔

"نیا ادب نئے مسائل" از بشر نواز

آنگن۔	از خدیجہ مستور	(ناول)
ٹیڑھی لکیر۔	عصمت چغتائی	"
معصومہ	"	"
عجیب آدمی	"	"
شب گزیدہ۔	از قاضی عبدالستار	"
آگ	از عزیز احمد	"

میں اوائل اکتوبر میں دہلی آؤں گا۔ حاصل کر لوں گا۔

ایک بات اور

سنا ہے 'روشنائی' کا کوئی اڈیشن سبط حسن کے مقدمہ کے ساتھ پاکستان میں بھی چھپا ہے اور شاید اس میں ایک اشاریہ بھی شامل ہے جس سے ان ناولوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ جن کا کتاب میں ذکر ہے۔ اور یہ نئی نسل کے پڑھنے والوں کے لیے ضروری ہے۔ وہ ان ادیبوں سے

واقف نہیں ہیں جن کا ذکر 'روشنائی' میں ہے۔ آپ اس کتاب کا ایک نسخہ حاصل کر کے اس اشاریہ کو ہمارے اڈیشن میں بھی شامل کرلیں تو اچھا ہوگا۔ سنا ہے کہ یہ کتاب رضیہ سجاد ظہیر کے پاس ہے اور آپ ان سے حاصل کر سکتے ہیں۔

اور کیا لکھوں ؟

اردو کے تہذیبی اور آئینی موقف کے بارے میں ایک مضمون لکھا ہے۔ اگست کے 'کیمونسٹ جائزہ' میں شایع ہوا ہے۔ اس کا آف پرنٹ آپ کو ذریعہ ڈاک بھیج چکا ہوں۔ اس کے متعلق آپ کی رائے چاہوں گا۔

امید کہ آپ معہ الخیر ہوں گے۔ اور اردو کی خیریت ——!

نیازمند

راج بہادر گوڑ

(۵)

حیدرآباد

۱۵ر ستمبر ۱۹۷۸ء

مجی خلیق انجم

کل ہی آپ کو ایک شکایتی لہجہ میں خط لکھ چکا ہوں۔ اور آج آپ کا عنایت نامہ موصول ہوا۔

سیلاب کی خبر ویسے ہی بہت پریشان کن تھی۔ دہلی ٹرنک پر خبر لیتا رہا۔ لیکن آپ کے خط سے پتہ چلا کہ آپ خود بھی سیلاب کی زد میں رہے ہیں۔ کاش میں اس دکھ میں آپ کا شریک ہوتا۔

فیض کا اردو گھر میں استقبال کیا اچھا کیا۔ کتابیں بھی دیں اور بھی اچھا کیا۔ جلسہ کی رویداد "ہماری زبان" میں شائع ہوئی ہے۔ اب تو لگتا ہے آپ تصویریں بھی چھاپنے کے موقف میں آگئے ہیں۔

بمبئی میں فیض کے ساتھ جاں نثار اختر کے لڑکے کے گھر ایک محفل میں شام گزارنے کا اتفاق ہوا۔ بیدی، سردار، مجروح، سلمیٰ، رامانند ساگر، زیدی بہنیں، دلیپ کمار، جیا بھادری کیسے کیسے

آتشیں پیغمبروں کا ساتھ" تھا۔

یہاں حیدرآباد میں بھی فیض سے کافی نیاز رہا۔ میرے گھر پر بھی ایک تناول طعام کی حقیر محفل تھی۔ لیکن غیر اسلامی مشروبات کا بھی دور تھا۔ آپ اس نعمت سے محروم ہیں حالاں کہ ایک غیر مسلم کو مار رکھا ہے۔

روشنائی کب تک شایع ہو رہی ہے ؟

میں ۲۴ ستمبر کو دہلی پہنچ رہا ہوں۔ انشاءاللہ ملاقات ہوگی۔ ۵ اکتوبر تک تو رہنا ہی ہے۔

باقی خیریت۔ انجمن کے سب کارکنوں کو اور سلام

آپ کا اپنا
راج بہادر گوڑ

(۶)

حیدرآباد
۲۵ جنوری ۱۹۸۰ء

مکرمی ڈاکٹر خلیق انجم

آپ کا خط مورخہ ۱۸ جنوری کو ملا اور آج 'ہماری زبان' کی مشاورتی کمیٹی کے اجلاس کی روئیداد بھی ملی۔ اس سے قبل انجمن کے قواعد کا مسودہ بھی مل گیا تھا۔

"سہیل" پر مضمون تو لکھ سکتا ہوں لیکن محض دوستانہ روابط اور تاثرات ہی ہوں گے۔ ان کے فن پر مضمون لکھنا میرے بس کی بات نہیں۔ میں تو ان کی محض چند کہانیاں برسوں پہلے پڑھی تھیں۔ پھر کسی رسالہ کے (غالباً شاہراہ) ناولٹ نمبر میں ان کا ناولٹ "بے جڑ کے پودے" پڑھا تھا۔ اس کے بعد ان کی کتاب "تین چہرے" پڑھی تھی اور اس پر تبصرہ بھی کیا تھا۔ جو شاید 'ہماری زبان' میں شایع ہو چکا ہے۔ اپنی کم مائیگی پر نادم اور آپ سے معذرت خواہ ہوں۔

'ہماری زبان' کی مشاورتی کمیٹی کو میں حسب ذیل مشورے دینا چاہتا ہوں۔ وہ غور کرے۔

(۱) معیاری کلام ضرور شایع ہو لیکن نوجوان شاعروں کی ہمت افزائی بھی ضروری ہے۔ البتہ ان دونوں مقصدوں میں توازن کا خیال رہے۔

(۲) اردو کے تعلیمی اور اشاعتی اداروں کی خبریں شایع ہونی چاہیے۔ اس غرض سے انجمن کی

ریاستی شاخوں کو توجہ دلائی جائے اور پھر انجمن کے عام اراکین اس تعلق سے 'نامہ نگار' کے فرائض انجام دیں۔

(۳) مشاورتی کمیٹی کے ناموں کے چھاپنے کے فیصلے پر عمل آوری اور صرف پرانی مجلس مشاورت کے نام شایع کرنے کے خلاف احتجاج۔

میں پھر عرض کروں، میں اس بات پر بضد ہوں کہ انجمن کے فیصلوں کو مسخ نہ کیا جانا چاہیے۔

آپ کا

راج بہادر گوڑ

(۷)

۲۴ جون ۱۹۸۰ء

مکرمی ڈاکٹر خلیق انجم

تسلیمات

آپ کا نوازش نامہ آج ہی ملا۔

کتاب بلکہ کتابیں آپ نے پروفیسر ممتاز حسین کو بھیج دی ہیں اس کا شکریہ۔

'حیات جاوید' پر تبصرہ اتنی جلدی نہیں۔ البتہ جولائی کے تیسرے، چوتھے ہفتے تک بھیج دوں گا۔

"ہماری زبان" کی ۸ جون کی اشاعت میں صہ پر 'کچھ نایاب کتابیں' کے عنوان سے جو فہرست ہے، ان میں سے مجھے حسب ذیل کتابوں کی ضرورت ہے۔

مصیبتیں	(افسانوں کا مجموعہ)	بھارت چند کھنہ	۵/-
نئے پرانے	(" ")	سہیل عظیم آبادی	۵/-
خفیہ	(روسی ادیبوں کے افسانوں کا ترجمہ)	عشرت بخاری	۵/-
دھوپ چھاؤں	(نظموں کا مجموعہ)	فضل الرحمٰن	۵/-
مشاہیر چین		میر عابد علی خاں	۵/-
لینن گراڈ تا سمر قند		عشرت علی صدیقی	۵/-

میں ۲۶ جولائی کو دہلی آرہا ہوں۔ کتابیں حاصل کروں گا۔

نیازمند
راج بہادر گوڑ

(۸)

حیدرآباد

۲ فروری ۱۹۸۳ء

مکرمی ڈاکٹر خلیق انجم

تسلیمات

انجمن کی مجلس عام کا دعوت نامہ ملا۔ ادھر میری طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ خون میں شکر بڑھ گئی تھی۔ دواخانہ میں شریک ہوگیا تھا۔ اب نسبتاً آرام ہے۔

آج آنکھوں کا امتحان بھی کروایا ہے۔ غالباً عینک بدلنی ہوگی۔

آواز میں بھی مستقل خرابی پیدا ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا حکم ہے کہ جلسوں میں تقریر نہ کروں اور ویسے بھی بلند آواز سے بات نہ کروں۔

پھر بھی میں مجلس عام کے اجلاس میں شرکت ضرور کروں گا۔ اور ممکن ہوا تو ۱۱ فروری کی دوپہر تک ہی دہلی پہنچ جاؤں گا۔

اس جلسہ عام میں بجٹ کی پیش کش بھی ہو جاتی تو اچھا تھا۔ پھر تو مجلس عام کا اجلاس طلب نہیں کر پائیں گے۔

اور سب احباب کو سلام

آپ کا اپنا
راج بہادر گوڑ

(۹)

۲۷ دسمبر ۱۹۸۳ء

مکرمی ڈاکٹر خلیق انجم

انجمن ترقی اردو (ہند) ریاست کرناٹک کی ضلع واری شاخوں کی تفصیل اور ان کے عہدہ داروں

کے نام اور پتے منسلک ہیں۔

میں نے ان کے کام کی تفصیل مانگی تھی۔ سو تو وہ کچھ دنوں میں بھیج دیں گے۔ وہ وقت چاہتے تھے۔

انھوں نے حال ہی میں ایک کامیابی حاصل کی ہے۔ سرکار نے انتخابی مقابلوں میں کنڑی میں انٹرویو کی شرط لگائی تھی۔ اردو طلبا، کے لیے یہ رعایت حاصل کر لی گئی ہے کہ سرکاری ملازمت کے لیے انٹرویو کے وقت ان سے کنڑی کا انٹرویو نہیں لیا جائے گا۔ لیکن ایک سال میں وہ زبان سیکھ لیں۔ اگر پھر بھی وہ نہ سیکھ پائیں تو انھیں انگریمنٹ نہیں ملے گا۔ لیکن ملازمت سے علیحدہ نہیں کیے جائیں گے۔

ان کے کچھ مطالبات بھی ہیں؛

۱۔ وہ چاہتے ہیں کہ مولوی محمد علی صاحب کے انتقال کے بعد ان کا کوئی نمایندہ مرکز میں نہیں ہے۔ نامزدگی کی کوئی جگہ خالی ہو تو اس بار ان کو ترجیح دی جائے۔

۲۔ گجرال کمیٹی کی ایک رپورٹ چاہیے۔

۳۔ ان مختلف ریاستی اور مرکزی سرکاروں کے حکم ناموں کی نقل چاہیے۔ جن کی رو سے انجمن کو گرانٹ ملتی ہے۔ تاکہ وہ اس بنیاد پر اپنی سرکار سے بھی گرانٹ حاصل کریں۔

۴۔ وہ ایک ماہنامہ نکالنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ "ہماری زبان" ہی کا ایک ماہانہ اڈیشن بنگلور سے نکالا جائے۔ میں نے کہا شاید یہ ممکن نہ ہو سکے۔ تب انھوں نے کہا کہ مرکز ہی کوئی موزوں نام تجویز کر کے انھیں مطلع کرے۔ انھوں نے کچھ نام بھیجے تھے۔ لیکن رجسٹرار نے سبھی نامنظور کر دیے۔ وہ چاہتے ہیں کہ آپ ان کی مدد کریں۔

نیازمند

راج بہادر گوڑ

۱۴ اپریل ۱۹۸۶ء

حضور، تسلیم

آپ کا حکم اور میں ٹالنے کی ہمت کروں! آخرت میں کیا جواب دوں گا؟ آپ سربلند کھڑے ہوں گے اور میں سر بسجود گنہگاروں کی صف میں ہوں گا۔ یہ مجھے منظور نہیں اور نہ اس کا الٹ ہی منظور ہے۔ تار بھی کر دیا ہے، ملا ہوگا۔

میں ۲۵ اپریل کی صبح دہلی پہنچ رہا ہوں۔ شام میں عاملہ اور مجلس عام میں شریک ہوں گا ۲۶ کے سمینار میں آپ کے حکم کے مطابق مقالہ پڑھ دوں گا۔ آپ نے اپنے پہلے خط میں جو نوٹس کی حیثیت رکھتا تھا، دونوں سمینار ۲۶ اپریل ہی کو رکھے تھے اور اب لکھا ہے کہ ایک ۲۶ کو اور دوسرا ۲۷ کو ہوگا۔

۲۷ اپریل کو ۳½ بجے ایوان غالب میں دہلی کی انجمن ترقی اردو کا اجلاس ہے۔ حمیدہ سلطان صاحبہ نے شدت سے اصرار کیا ہے کہ میں وہاں حاضری دوں۔ اب انھیں ناراض کرنا کس کے بس میں ہے؟ میرے بس میں تو نہیں قدیم کرم فرما ہیں۔ اور لگتا تو یہ ہے کہ تہذیبِ مغلیہ کی باقیاتِ صالحہ میں ان کا شمار ہوگا۔ یقین نہ آتا ہے تو ثروت آرا بیگم ہی پڑھ لیجیے۔

اچھا تو خدا حافظ، شمیم کو پیار، سب احباب اردو گھر کو محبتیں
اور آپ کو "دشنام یار"

راج بہادر گوڑ

(۱۱)

حیدرآباد

۱۱ جنوری ۱۹۸۷ء

پیارے خلیق انجم

"گجراتی زبان وادب اور پنا لال پٹیل" مضمون حبیب صاحب کو دے آیا تھا۔ پنا لال پٹیل کی تصویر بھیج رہا ہوں۔ مضمون پسند آئے تو چھاپ دینا۔ اس ادیب کو گیان پیٹھ ایوارڈ ملا ہے۔ اردو کے قارئین گجراتی سے ناواقف ہیں اس لیے گجراتی زبان وادب کا مختصر پس منظر دیا ہے۔

میں اردو گھر آیا تھا لیکن تم اسی وقت ـــــ جا چکے تھے۔

موہنی کا کیا حال ہے؟ میرا پیار کہنا

تمہارا اپنا

راج بہادر گوڑ

(۱۲)

۱۹ اپریل ۱۹۸۷ء

مکرمی ڈاکٹر خلیق انجم

آپ کا بھیجا ہوا رجسٹرڈ پوسٹ ملا جس میں Seminar کا اردو نمبر، آپ کا خط اور چیک سبھی کچھ تھے۔

سیمینار کے مضامین تو خیر جیسے کچھ ہیں لیکن آخر میں چھپی ہوئی Bibliography اہم ہے۔ انگریزی میں کہاں اردو کے متعلق کیا مل سکتا ہے سبھی کچھ ہے۔ مجھے خود اندازہ نہیں تھا کہ میں نے اردو کے متعلق کیا کیا کچھ انگریزی میں لکھا ہے۔

کل ہی صبح میرے بڑے لڑکے کی بیوی کا آپریشن کروانا پڑا۔ اسے پیشاب میں رکاوٹ کی شکایت تھی، لیکن امتحان سے پتہ چلا کہ رحم میں ایک بڑا Fibroid (8cm/5.5.Cm) ہے جس کی وجہ سے مثانہ پر وزن پڑ رہا تھا اور پیشاب کے بہاؤ میں رکاوٹ پیدا ہو رہی تھی۔

آپریشن بخیر و خوبی ہو گیا۔ ایک ہفتے میں گھر آجائے گی۔ میں آج کل کچھ اسی چکر میں ہوں۔ پھر بھی ۲۳ اپریل کی صبح کلکتہ چلا جاؤں گا۔ اور وہاں سے ۲۸ یا ۲۹ اپریل کو کچھ دنوں کے لیے دہلی آؤں گا۔ انشاء اللہ ملاقات ہوگی۔

خیر اندیش آپ کا

راج بہادر گوڑ

URDUADAB
QUARTERLY

EDITOR
Khaliq Anjum

ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)
NEW DELHI